1
مرقاۃ المفاتیح
شرح اردو
مشکوۃ المصابیح
للعلامہ الشیخ القاری علی بن سلطان محمد القاری
مترجم: مولانا راؤ محمد ندیم
www.KitaboSunnat.com
مکتبہ رحمانیہ

مرقاة المفاتیح اردو
للعلامہ الشیخ القاری علی بن سلطان محمد القاری ھجری ۱۰۱۴
شرح
مشکوٰۃ المصابیح
للامام العلامۃ محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی المتوفی ۷۴۱
مترجم: مولانا راؤ محمد ندیم
جلد اول
ابن مسعود اسلامک لائبریری
کتاب نمبر: 1387
J3-504 جوہر ٹاؤن لاہور
www.KitaboSunnat.com
مکتبہ رحمانیہ
اقرأ سنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
فون: 042-37224228-37355743
MAKTABA-E-REHMANIA

بسم اللہ الرحمن الرحیم

MAKTABA-E-REHMANIA

مکتبہ رحمانیہ

نام کتاب: ---------------- مرقاۃ المفاتیح اردو (جلد اول)

مترجم: ---------------- مولانا راؤ محمد ندیم

ناشر: ---------------- مکتبہ رحمانیہ

مطبع: ---------------- لٹل سٹار پرنٹرز لاہور

استدعا

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتابت، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے۔
بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی نظر آئے یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرما دیں۔ ان شاء اللہ ازالہ کیا جائے گا۔ نشاندہی کے لیے ہم بے حد شکر گزار ہوں گے۔ (ادارہ)

عرضِ ناشر

حضور ﷺ کے ارشادات، فرمودات اور اعمال کی حفاظت حضور ﷺ کا معجزہ ہے، تاریخ انسانی میں کسی شخصیت کے اقوال واعمال کی حفاظت کا وہ اہتمام نہیں ہوا جو احادیث نبوی کے حصے میں آیا۔ ایسا کیوں نہ ہوتا کہ ارشاد ربانی ہے:

{ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ } (النجم۵۳: ۳۔۴)

''وہ خواہش کے مطابق بات نہیں کرتے بلکہ صرف اس وحی کو بیان فرماتے ہیں جو ان کی طرف بھیجی جاتی ہے''

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا:

{ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ } (الحشر ۵۹: ۷)

''جو چیز تمہیں رسول دے دیں وہ لے لو اور جس سے منع کردیں اس سے باز آجاؤ''

نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نصیحت فرمائی تھی کہ دین کی باتوں کو خوب دھیان سے ضبط کرو اور انہیں بیان کرو، امام ابوداؤد نے حضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

((تَسْمَعُونَ وَيُسْمَعُ مِنْكُمْ وَيُسْمَعُ مِمَّنْ سَمِعَ مِنْكُمْ)) (رواہ أبوداؤد باب فضل نشر العلم حدیث: ۳۶۵۹)

''آج تم مجھ سے دین کی باتیں سنتے ہو، کل تم سے دین کی باتیں سنی جائیں گی۔ پھر ان لوگوں سے دین کی باتیں سنی جائیں گی جن لوگوں نے تم سے دین کی باتیں سنی تھیں''۔

لہٰذا تم خوب دھیان سے سنو اور اس کو اپنے بعد والوں تک پہنچاؤ، پھر وہ لوگ اپنے بعد والوں تک پہنچائیں تاکہ یہ سلسلہ چلتا رہے۔

احادیث کی اسی اہمیت کے پیش نظر جن نفوس قدسیہ نے حفاظت حدیث کا بیڑا اٹھایا ان کی تعداد شمار کرنا ممکن نہیں ہے، چنانچہ ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب الفصل'' میں لکھا ہے:

''پچھلی امتوں میں سے کسی کو یہ توفیق نہیں ملی کہ اپنے رسول کے کلمات کو صحت اور ثبوت کے ساتھ پیش کرسکے، یہ صرف امت محمدیہ ﷺ کی خصوصیت ہے کہ اس کو اپنے رسول ﷺ کے ایک ایک کلمہ کو صحت اور اتصال کے ساتھ جمع کرنے کی توفیق ملی''۔

یہی وہ جذبہ تھا جس کی بدولت اسماء رجال کا فن وجود میں آیا اور پانچ لاکھ سے زائد انسانوں کے حالات محفوظ کئے گئے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر دَور میں ایسے رجال کار پیدا فرمائے ہیں جن کے ذمہ احادیث مبارکہ کی خدمت اور پاسداری کا عہدہ سپرد ہوا۔ ایسے لوگوں کے حالات کا تذکرہ تاریخ اسلام میں سنہری حروف میں ملتا ہے اور ان کی کامرانی اور جاودانی کے گن گائے جاتے ہیں کیونکہ ان لوگوں نے اپنی زندگی کو ایسی بازی میں لگایا کہ اس کی جیت تو جیت ہے، لیکن اس کی ہار بھی جیت سے کم نہیں۔

افرادِ امت نے دن رات محنت کی، دُور دراز کے سفر کئے اور جان ومال کی قربانی کے ساتھ اُمت تک ایک عظیم سرمائے کو منتقل کیا۔ کبھی حافظہ کے بل بوتے پر سخت محنت کے ساتھ ان احادیث کو محفوظ کیا گیا اور کبھی کتابت کے ذریعے ان کو باقی رکھنے کی کوشش کی گئی۔ تپتے صحراؤں کے طویل سفر، بھوک پیاس کی صعوبتیں، وسائل کی قلت، پیوند زدہ کپڑے اور غربت وافلاس کی مشقتیں برداشت کی

گئیں اور اس امانت الٰہی کو غائبین تک پہنچانے کا اہتمام کیا گیا۔

ان حضرات کی محنت کا نچوڑ اس وقت صحاح ستہ اور دوسری کتب حدیث کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ ذرا غور کیجئے یہ کتابیں اس دور میں تیار کی گئیں جب نہ کاغذ کی فراوانی تھی اور نہ آلات کتابت عام دستیاب تھے، چھاپہ خانوں کا تو وجود تک نہ تھا۔ ان نسخوں کو ہاتھ سے لکھا جاتا اور سینوں میں محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ پھر یہ نسخے امت کے افراد تک منتقل ہوتے چلے آئے۔

الحمدللہ! اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مکتبہ رحمانیہ کو بھی یہ سعادت حاصل ہوئی کہ ہمارے یہاں سے احادیث کی بہت سی کتابیں عربی متن، ترجمہ اور شرح کے ساتھ شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں صحاحِ ستہ، مسند احمد، مشکوٰۃ المصابیح، مسند امام اعظم و دیگر کتب شامل ہیں۔ یہ کتاب جو آپ کے ہاتھوں میں ہے یہ ایسے ہی موتیوں کی لڑی میں سے ایک ہے۔ امام بغویؒ نے **مصابیح السنة** کے نام سے احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا۔ اس مجموعے کو خوب پذیرائی ملی، کئی علماء نے اسے اپنا مطمع نظر بنایا۔ بالآخر خطیب تبریزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں کئی اضافہ جات کرتے ہوئے **مشکوٰۃ المصابیح** کے نام سے ایک مجموعہ تیار کیا۔ پھر اس مجموعے کی کئی علماء نے شروح لکھیں۔ لیکن جو حظ وافر ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی شرح **مرقاۃ المفاتیح** کے حصے میں آیا وہ کسی اور شرح کے حصے میں کم ہی آیا۔ کتاب مذکور عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے اردو خواں طبقے کے لیے اس سے استفادہ ناممکن تھا۔ حدیث نبوی کی اس عظیم الشان خدمت کا موقع احباب مکتبہ رحمانیہ کے حصے میں آیا اور بفضلہٖ تعالیٰ کامل تخریج اور رواۃ کے تفصیلی حالات کے ساتھ **مرقاۃ المفاتیح** کا سلیس اور شستہ زبان میں پہلا ترجمہ پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ مرقاۃ المفاتیح ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کے علم و فکر کا عظیم مجموعہ اور آپ کی حیاتِ علمیہ کا لاثانی سرمایہ ہے۔ مرقاۃ المفاتیح کو مشکوٰۃ المصابیح کی سب سے زیادہ مفصل اور مستند شرح مانا جاتا ہے۔

زیر نظر ترجمہ درج ذیل خصوصیات کا حامل ہے:

① مشکوٰۃ المصابیح کا مکمل متن، اعراب کے ساتھ۔ ② مشکوٰۃ المصابیح کی مکمل تخریج اور تحقیق، صاحب مشکوٰۃ کی مختصر تخریج کے ساتھ۔

③ ترجمہ کی سلاست اور روانی۔ ④ ترجمہ میں ہم آہنگی اور یکسانیت کا خاص اہتمام۔

جبکہ اسکے علاوہ مصنف ابن ابی شیبہ اور السنن الکبریٰ للبیہقی کا ترجمہ تکمیل کے مراحل میں ہے۔ ان کوششوں و کاوشوں کی اشاعت کے پیش نگاہ اولین مقصد مالی منفعت کی بجائے شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث شریف کی اشاعت ہے۔ اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کو عام کرنے کے لیے ہم نے اپنی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ اللہ پاک ہماری اس سعی کو قبول فرمائے اور اس خدمت حدیث کو ذریعہ نجات بنائے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطاء فرمائے اور صاحبِ کتاب ملا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ، اس کے مترجم، کمپوزر، پروف ریڈرز، ناشر اور تمام معاونین کے لئے ذریعہ نجات بنائے اور اللہ پاک سب کی کوششوں کو اپنی بارگاہ میں قبول و منظور فرما کر ہم سب کے لیے ذریعۂ آخرت بنائے۔ آمین!۔ ہم نے اپنی بساط کے مطابق تصحیح کتاب کا بھرپور اہتمام کیا ہے، پھر بھی اگر بشری تقاضے کے مطابق سہواً کوئی خطا ہو گئی ہو تو ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں اور آپ کی آراء کے منتظر ہیں۔

تمام احباب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ جن کی محنتوں کی بدولت ہم اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔

خادم العلم والعلماء

مقبول الرحمن عفی اللہ عنہ

مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

فہرست

الموضوع

انتساب

''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر''

کے پیش نظر مخلوقات میں رحمۃ للعالمین، سید الاولین والآخرین آنجناب محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ بابرکت سے اُونچی کوئی ذات نہیں، اس لئے اس کتاب کا انتساب آپ ﷺ ہی کی ذاتِ اقدس کی طرف کرتا ہوں۔ پروردگارِ عالم اس کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور دارین میں فوز وفلاح کا قوی ذریعہ بنائے۔ آمین

(راؤ ندیم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله رب العالمين ،والعاقبة للمتقين ،والصلاة والسلام على نبيه وعلى آله وصحبه أجمعين۔

حدیث کی کتابوں میں اللہ جل شانہٗ نے ''مشکوٰۃ شریف'' کو جو قبول عام عطا فرمایا ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔ یہ کتاب احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا نہ صرف بہت بڑا ذخیرہ ہے بلکہ ایک بہترین انتخاب بھی ہے جو صحاحِ ستہ اور دیگر متداول کتب حدیث کی جملہ خصوصیات کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ گویا ''مشکوٰۃ المصابیح'' کتب حدیث کا ایک عمومی تعارف بھی ہے اور احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا ایک عمومی مطالعہ بھی۔

یہ کتاب اپنے یوم تدوین ہی سے شرق و غرب کے عوام وخواص دونوں میں یکساں طور پر مقبول چلی آرہی ہے۔ مصنفین، علماء وطلباء، واعظین وخطباء سب ہی اس کتاب سے استفادہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ کتاب اپنی غایت درجہ علمی افادیت کے پیش نظر برصغیر پاک و ہند کے قدیم نصاب درس میں شامل چلی آرہی ہے، صحاح ستہ کی تعلیم و تدریس سے پیشتر ''مشکوٰۃ المصابیح'' کی تدریس لازمی قرار دی گئی ہے۔ دورۂ حدیث سے پہلے یہ کتاب طلباء کرام کو پڑھانے کا ایک مقصد ان کو دورۂ حدیث شریف کے لئے تیار کرنا اور ان میں وہ فنی مباحث اچھی طرح سمجھنے کی استعداد پیدا کرنا ہے جو دورۂ حدیث شریف کے سال بیان کی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے اس تعلیمی درجہ کو ''موقوف علیہ'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے دورۂ حدیث کے مباحث نسبتاً کم بسط وتفصیل کے ساتھ موقوف علیہ کے سال میں بیان کئے جاتے ہیں۔ اس کتاب کے بعض اجزاء سرکاری کلیات وجامعات میں بھی شامل نصاب ہیں۔

اس کی قبولیت عامہ اور داخل نصاب ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کا ایک جامع و منتخب خوبصورت مجموعہ ہے جو ایمان وعقائد، عبادات ومعاملات، اخلاق ومعاشرت، ترغیب وترہیب بلکہ زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تعلیمات وہدایات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال پر مشتمل ہے۔

''مشکوٰۃ المصابیح'' کی جمع وتدوین میں دو بزرگوں محی السنہ امام ابو محمد حسین بن مسعود فراء بغوی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ خطیب عمری تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی کاوشوں کا دخل ہے۔ کتبِ حدیث کے ضخیم اور مطول ذخیروں سے ایک عام قاری کے لئے براہ راست استفادہ بہت مشکل تھا چنانچہ عام مسلمان طبقہ کو نورِ ہدایت سے مستفیض کرنے کے لئے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''مصابيح السنة'' ترتیب دی۔

''مشکوٰۃ المصابیح'' کے منصہ شہود پر آنے کا سبب یہ ہوا کہ ابتداء میں امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث کی چودہ (۱۴) کتابوں کا ایک مجموعہ مدون کیا۔ اس کے ہر باب کے تحت دو فصلوں کا انتظام کیا۔ ''فصل اول'' کے لئے صحیحین (بخاری و مسلم) سے

احادیث کا انتخاب فرمایا جب کہ ''فصل ثانی'' میں دیگر بارہ جوامع ومسانید کا انتخاب درج کیا۔

''مصابیح السنة'' میں درج شدہ احادیث کی ''سند'' اور ''مخرِّج'' کا ذکر موجود نہ تھا جب کہ علمائے حدیث کے یہاں مراتب حدیث سے واقفیت کے لئے سند حدیث اور مخرج کا ذکر نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ علامہ تبریزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس علمی ضرورت کا شدت سے احساس کرتے ہوئے اور اس کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ کیلئے اپنی محنت کا میدان ''مصابیح السنة'' کو بنایا، بایں طور کہ اس میں کچھ اضافات وتغیرات فرما دیئے، کہ ''مصابیح السنة'' کی ہر سند کا بحوالہ مآخذ ذکر کیا، اگرچہ صاحب مشکوٰۃ نے پوری سند کی جگہ صرف صحابی کا نام ذکر فرمایا ہے مگر یہ بمنزلہ سند کامل کے ہے۔ ساتھ ہی ہر باب میں ''فصل ثالث'' کا اضافہ کیا جس میں صحیحین کے علاوہ دیگر کتب احادیث کا انتخاب درج فرما دیا۔ مصابیح میں بعض احادیث مکرر تھیں۔ مشکوٰۃ میں وہ تکرار حذف کر دیا گیا۔ امام تبریزی رحمۃ اللہ علیہ نے ''مصابیح السنة'' میں کچھ اور مفید تبدیلیاں بھی کی تھیں جن کا ذکر کتاب کے تفصیلی تعارف میں آئے گا۔ اس نو ترمیم شدہ مجموعہ کو انہوں نے ''مشکوٰۃ المصابیح'' کے نام سے موسوم کیا۔ یہ نیا مجموعہ سابقہ مجموعہ کے مقابلہ میں زیادہ جامع اور زیادہ مفید ہے۔

علماء امت نے مختلف ادوار واطوار میں اس کتاب کی خدمت کی ہے۔ خدمت کی ایک نوع شروح وحواشی لکھنا ہے۔ چنانچہ اس کتاب پر بھی کئی شروح وحواشی لکھے گئے۔ جن میں سے ایک ''مرقاۃ المفاتیح'' بھی ہے۔ یہ ''مشکوٰۃ المصابیح'' کی نہایت عمدہ عربی مبسوط مشہور ومتداول، بابرکت ونافع شرح ہے جو ایک طویل عرصہ تک نایاب رہنے کے بعد چند سال پہلے کئی مطابع سے شائع ہوئی ہے۔

قارئین کے پیش نظر کتاب حدیث کی اسی عظیم ترین عربی شرح کا محض اردو ترجمہ نہیں بلکہ ایک شرح کے انداز میں ترتیب دی گئی ہے، اس میں پوری احتیاط برتتے ہوئے تسہیل وتنظیم کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے تاکہ اخذ وضبط میں سہولت ہو۔ اپنی وسعت وطاقت کے مطابق اس کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن یہی یہ سعی کس حد تک کامیاب رہی فیصلہ قارئین ہی کر سکتے ہیں۔ بہر حال امید ہے کہ یہ پیش کش معلمین ومتعلمین دونوں کے لئے مفید تر ثابت ہوگی۔

یہ اللہ ربّ العزت کا بے پایاں خصوصی کرم واحسان ہے کہ اس نے محض اپنے فضل وکرم سے مجھ جیسے قلیل العلم والعمل شخص کو اس کارِ خیر میں شمولیت کی سعادت بخشی، کتاب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی ہمت وتوفیق عطا فرمائی، خدمت حدیث کے ایسے عظیم کام سے منسلک کیا کہ جس کا تصور کرنا بھی میرے لئے محال تھا۔ بندہ دعا گو ہے کہ اللہ اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں حسن قبولیت سے نوازے، علمی دنیا میں قبول عام عطا فرمائے، اردو داں طبقہ کیلئے اس کے ثمرات ومنافع کو عام فرمائے۔ آمین یا رب العالمین

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل ☆ نسیم صبح تیری مہربانی

تشکر

"من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ" کے تحت میں ان تمام حضرات کا تہہ دِل سے ممنون و شکر گزار ہوں جنہوں نے ''مرقاۃ المفاتیح'' (اُردو) کے سلسلے میں میرے ساتھ کسی بھی شکل میں ادنیٰ سی بھی اعانت فرمائی۔ میں ان افراد کو بھی اپنا محسن شمار کرتا ہوں جنہوں نے بڑے اشتیاق کے ساتھ بار بار اس کام کی طرف احقر کو متوجہ فرمایا اور میری حوصلہ افزائی فرمائی اور میں اپنے ان بزرگوں کا بھی احسان مند ہوں جنہوں نے اپنی دعاؤں کا مجھ پر سایہ کیے رکھا، شب و روز پر خلوص دعاؤں سے نوازتے رہے۔

میں ان حضرات کے اسمائے گرامی یہاں ذکر نہ کرنا ناسپاسی سمجھتا ہوں جنہوں نے اس کام کی بہتری کیلئے اپنا قیمتی وقت بار بار احقر کو عنایت فرمایا، اس کام کے ابتدائی کچھ حصہ کو بنظر استحسان بڑی قدر و منزلت سے دیکھا، بڑی حوصلہ افزائی فرمائی اور میری راہنمائی فرماتے ہوئے انتہائی مفید و زرّیں تجاویز سے نوازا:

① استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی صاحب حفظہ اللہ (استاذ الحدیث جامعہ دار العلوم کراچی)
② استاذ محترم حضرت مولانا رشید اشرف سیفی صاحب حفظہ اللہ (استاذ الحدیث جامعہ دار العلوم کراچی)
③ استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمد قاسم صاحب حفظہ اللہ (استاذ الحدیث جامعہ عربیہ عبیدیہ فیصل آباد)
④ استاذ العلماء محترم حضرت مولانا مفتی مولانا نور البشر صاحب حفظہ اللہ (استاذ الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی)
⑤ استاذ العلماء محترم حضرت مولانا ابن الحسن عباسی صاحب حفظہ اللہ (استاذ الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی)

میں ان حضرات کا بھی ممنون ہوں کہ جنہوں نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اس پر تقاریظ تحریر فرمائیں، رفقائے کار، کمپوزرز اور تصحیح کنندگان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ہر معاملہ میں مستعدی کے ساتھ بھرپور تعاون فرماتے ہوئے اس کتاب کو جلد از جلد منظر عام پر لانے میں ہمارے انتہائی معاون و ممد ثابت ہوئے۔

اس تمام کام کا سہرا ''مکتبہ رحمانیہ'' کے سر جاتا ہے کہ انہوں نے اس کارِ گراں کا ذمہ اٹھایا اور اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اپنے تئیں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کام کو خوب سے خوب تر شکل میں لانے کیلئے اپنے بھرپور ذرائع کا استعمال کیا، کسی بھی امکانی تعاون (چاہے وہ اخلاقی ہو یا مالی) سے دریغ نہیں فرمایا (خصوصاً بھائی ناصر مقبول حفظہ اللہ کا بندہ شکر گزار ہے کہ انہوں نے دامے درمے سخنے ہر قسم کا تعاون بہم پہنچایا) اور بالآخر کتاب کو ایک اعلیٰ معیار کے ساتھ شائع کیا۔ اللہ جل شانہ ان کی تمام مساعی جمیلہ کو شرفِ قبولیت سے نوازے، توشۂ آخرت اور ذریعۂ نجات بنائے، اپنی شایانِ شان جزائے جزیل عطا فرمائے، مزید توفیق سے ہمیشہ نوازتا ہی رہے۔

احقر ان تمام حضرات کا شکر گزار اور بارگاہِ رب العزت میں ان سب کیلئے اور اپنے لئے جزائے خیر کا طالب ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حقیری مگر مبارک خدمت وکاوش کو اپنے ہاں شرف قبولیت عطا فرمائے اور مرتب وقارئین کو اس کتاب کی برکات سے نوازے۔ اپنی عمر اور توانائیاں علوم نبوت کی خدمت میں صرف کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ جل شانہ اس کتاب کے متعلقین، معاونین، مرتب، مترجمین، تصحیح کنندگان، اور تمام مسلمانوں کی خطایا وزلات کو معاف فرماتے ہوئے ان سب کو آخرت کے عذاب اور میدانِ محشر کی ہولناکیوں سے محفوظ رکھتے ہوئے اپنی رحمت ومغفرت سے نوازے اور ہم سب کا خاتمہ ایمان پر فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

اسناد

سلسلۂ سند امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا طرۂ امتیاز اور اس کی خصوصیات میں سے ہے۔ اسلام کے علاوہ کسی بھی دین سماوی وغیر سماوی میں یہ سلسلہ نہیں پایا جاتا کہ وہ سندِ متصل کے ساتھ کسی بات کو ذکر کرتے ہوں، بخلاف امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے کہ اس کے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات سند کے ساتھ منقول ہے۔ سلسلۂ سند کا مطلب یہ ہے کہ باقاعدہ حوالہ کے ساتھ نقل در نقل از اول تا آخر اس طور پر کہ ہر زمانہ میں ہر راوی ہر حدیث کو اپنی سند سے صاحب حدیث تک پہنچائے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے مقدمۂ مسلم میں حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد نقل فرمایا ہے:

"الاسناد من الدین ، لولا الاسناد لقال من شاء ماشاء"

ابوبکر اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مجھے یہ بات پہنچی ہے:

"اللہ تعالیٰ نے اس امت کو تین چیزیں خصوصی طور پر عطا فرمائی ہیں: {۱} اسناد {۲} انساب {۳} اعراب"۔

ارسال واعضال کے ساتھ سند کا سلسلہ بہت سے یہود میں گو پایا جاتا ہے، لیکن وہ اپنی سند کو اخیر تک یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام تک اس طرح نہیں پہنچا سکتے کہ جس طرح ہم اپنی سند کو سرور دو عالم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے ہیں، بلکہ ان کے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان تقریباً تیس ادوار رہ جاتے ہیں، جو تقریباً ڈیڑھ ہزار سال سے زائد کا دورانیہ بنتا ہے۔ وہ سند کے ذریعہ شمعون کے آس پاس تک پہنچتے ہیں، اس سے اوپر تک سلسلہ سند بیان کرنا ان کیلئے ممکن ہی نہیں اور نصاریٰ تو اس انداز سے صرف اور صرف تحریم طلاق ہی بیان کر سکتے ہیں۔ یہود ونصاریٰ میں کذاب وجھوٹے راویوں کی بھرمار ہے۔

(الاسناد من الدین، ص: ۲۶۔۲۸، ملخصاً)

ہمارے حضرات محدثینؒ کے یہاں سند ذکر کرنے کا اہتمام نہ صرف احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور آثار صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے ساتھ خاص ہے بلکہ وہ اقوالِ ائمہ کو بھی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ تدوین حدیث کے بعد محدث اپنی سند حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تک بیان کرتا تھا، تالیف کتب کے بعد جب اسانید محفوظ ہو گئیں تو حضرات اساتذہ ومحدثین اپنی سندیں معروف یا مطبوع اسانید تک بیان کرنے لگے۔ اب ثبوت حدیث یا صحت استدلال بالحدیث کیلئے اتنا کافی ہے کہ مروجہ ومشتہرہ کتب حدیث میں سے کسی کتاب کا حوالہ پیش کر دیا جائے۔ لیکن سلسلۂ اسناد کی بقاء اور تبرک کی خاطر اکابر میں یہ معمول چلا آ رہا ہے کہ وہ ان کتب حدیث کی اسناد بھی محفوظ رکھتے ہیں یہ طریقہ زیادہ قابل اعتماد بھی ہے اور باعث برکت بھی۔

ہمارے اکابر۔ رحمہم اللہ تعالیٰ وجزاہم عنا خیر الجزاء۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) تک اپنی سند حدیث بیان کرتے ہیں، کیوں کہ ہندوستان میں علم حدیث کا منتہا حضرت شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کی ذاتِ گرامی ہے خواہ وہ اہلسنّت ہوں، اہلحدیث

ہوں یا کوئی اور فرقہ۔

سند کے گویا تین حصے ہیں: ایک حصہ ہم سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (رحمۃ اللہ علیہ) تک، دوسرا حصہ حضرت شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) سے صاحب کتاب تک، اور تیسرا حصہ صاحب کتاب سے لے کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک۔ تیسرا حصہ تو خود کتاب حدیث میں موجود ہوتا ہے، اگر چہ مشکوٰۃ شریف میں مذکور نہیں ہے مگر ان اصل کتب میں تو بہر حال موجود ہے جن کتب سے صاحب مصابیح نے روایات لی ہیں۔ سند کا دوسرا حصہ حضرات اساتذہ کرام کتاب شروع کرتے وقت بتاتے ہیں اور وہ مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔

حضرت شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنی تمام اسانید اپنے رسالہ "الارشاد الی مھمات الاسناد" میں، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اسانید "العجالۃ النافعۃ" میں اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اسانید "الیانع الجنی" میں جمع کردی ہیں۔ آخری دور میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنے ایک رسالہ "الازدیاد السنی علی الیانع الجنی" میں تمام اکابر علماء دیوبند کی اسانید حضرت شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تک جمع کردی ہیں۔ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے نیچے کے اساتذۂ احادیث کی اسانید بھی کم وبیش مطبوعہ شکل میں موجود ہیں جس میں ان کی حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تک کی سند متصل مذکور ہے۔

ہمیں یہاں سند کا صرف پہلا حصہ بیان کرنا ہے۔ ہمارے مدارسِ دینیہ میں عمومی طور پر مشکوٰۃ شریف پڑھانے والے اساتذہ کرام اپنی سند مشکوٰۃ شریف چند واسطوں تک ہی ذکر کرتے ہیں، پوری سند کے عدم بیان کی وجہ واضح ہے کہ مشکوٰۃ شریف دیگر کتب حدیث مثلاً صحاح ستہ کی مانند کوئی مستقل کتاب نہیں ہے۔ پس میں بھی اپنی سند مشکوٰۃ میں سے اپنے اساتذہ کرام اور پھر اساتذۃ الاساتذہ کے اسمائے گرامی ہی ذکر کرنے پر اکتفاء کر رہا ہوں۔

میں نے "مشکوٰۃ شریف" دو اساتذہ کرام سے پڑھی ہے۔ جلد اول حضرت مولانا مفتی محمود اشرف صاحب حفظہ اللہ سے، اور جلد دوم حضرت مولانا رشید اشرف سیفی صاحب حفظہ اللہ سے پڑھی ہے۔ اول الذکر استاذ محترم نے مشکوٰۃ شریف "جامعہ اشرفیہ لاہور" میں استاذ الحدیث حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب حفظہ اللہ سے پڑھی تھی۔

استاذ محترم مولانا رشید اشرف سیفی صاحب حفظہ اللہ نے "مشکوٰۃ شریف" دو اساتذہ کرام سے پڑھی تھی۔ جلد اول جامع المنقولات والمعقولات حضرت مولانا شمس الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اور جلد دوم حضرت مولانا اصغر علی صاحب حفظہ اللہ سے پڑھی جو دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور میں مدرس رہے ہیں۔

مولانا شمس الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مشکوٰۃ شریف حضرت مولانا ضیاء الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی جو کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ صاحب کے خلیفہ مجاز تھے۔

اس سے آگے کے سلسلۂ سند کیلئے کچھ مزید وقت درکار ہوگا، یہ کتاب پہلے ہی بہت التواء کا شکار ہو چکی ہے، مزید تاخیر کا تحمل بہت ہی گراں ہے۔ بہرحال جتنا کچھ پیش کر دیا ہے اُمید واثق ہے کہ وہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ طلباء کیلئے مفید ہی ہوگا۔ مجھے عمومی اجازتِ حدیث الحمدللہ! متعدد علماء کرام سے حاصل ہے۔ مشکوٰۃ شریف کی خصوصی اجازتِ حدیث مولانا عاشق الٰہی بلندشہری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا منظور احمد نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی حاصل ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اُردو ترجمہ کی ضرورت واہمیت

رسوخ فی العلم کے لئے عربی زبان میں مہارتِ تامہ بلاشبہ ضروری ہے۔ دوسری طرف مشاہدہ یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ من حیث مجموع ہر جگہ انحطاط وزوال دھیرے دھیرے بڑھتا جارہا ہے جس سے اہل علم کا طبقہ بھی محفوظ نہیں۔ اللہ ربّ العالمین ''سورۃ الحمد'' میں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ ''رب'' کے معنی پرورش کرنے والا پالنے والا ہے اور کسی کی پرورش یہ ہوتی ہے کہ اس کی ساری ضروریات کی کفالت کی جائے جیسے ماں بچے کی پرورش کرتی ہے۔ کھانا، پینا، سونا، اٹھنا، بیٹھنا، صحت ومرض کے اسباب، غرض یہ کہ ہر چیز کا خیال رکھتی ہے تو جب کہ اس ادنیٰ درجہ کے مربی کا حال یہ ہے تو جو سارے عالم کا مربی اور ربّ الارباب ہے اس کی شان تربیت کیسی کچھ ہوگی۔ من جملہ اسی شان تربیت کے یہ بھی ہے کہ جیسا جیسا زمانہ آتا گیا اسی قسم کے اسباب مہیا فرماتے رہے۔ انہی میں سے یہ ہے کہ پہلے یہ مروجہ طریقۂ تعلیم نہیں تھا بلکہ شیخ ومحدث حدیث بیان کرتا تھا اور طلبہ اس کو یاد کرلیا کرتے تھے۔ اس کے بعد جب قوی کچھ کمزور ہوگئے اور ان کے اندر ضعف آگیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ سبیل پیدا فرمائی کہ یہ علوم کتابی شکل میں آگئے۔ اللہ تعالیٰ نے متعدد کتب اور ان کی شروح پیدا فرمادیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری آسانی کے لئے یہ صورتیں بہم پہنچائی ہیں اگر ہم قدر نہیں کریں گے تو ناشکری ہوگی اور اگر اس کی قدر کریں گے تو شکر ہوگا اور یہ بات معلوم ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں شکر کا کیا مرتبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ﴾

موجودہ دَور میں علم دین سے جو بے رخی برتی جارہی ہے وہ سب ہی دیکھ رہے ہیں اور جن کو اس علم کے حاصل کرنے کی توفیق ہوتی بھی ہے ان میں سے اکثر وبیشتر بے شوقی کا شکار ہیں، خصوصاً نصاب کی ابتدائی کتب میں جن سے استعداد پیدا ہوتی ہے اس کی حالت اور بھی زیادہ قابل شکایت ہے۔ کچھ نفوس ایسے ہوتے ہیں جن کو تعلیم کے ابتدائی درجات عبور کرنے کے بعد درجہ علیا میں پہنچ کر اپنی حالت کا احساس ہوتا ہے اور اس درجہ میں پہنچ کر وہ کسی قدر کتاب دیکھنے اور مطالعہ کرنے کی طرف متوجہ ہونے لگتے ہیں، اب ظاہر ہے اس وقت کی توجہ اور محنت سے حل کتاب کی استعداد پیدا ہونا تو بہت مشکل ہے۔ اب وہ زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے ہیں کہ وہ غیر عربی کتب سے استفادہ کریں۔ اسی تسہیل زبانی کی ضرورت کے پیش نظر علمی ذخیرے بالخصوص علوم اسلامیہ دیگر زبانوں میں منتقل ہوتے دکھائی دے رہے ہیں، عمومی طور پر تراجم قومی اور علاقائی زبانوں میں کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ہماری قومی زبان اردو ہمہ گیری شان رکھنے کے علاوہ ہمارے دیار میں کثیر الرائج بھی ہے، چنانچہ اردو زبان کی تفاسیر اور قرآن وحدیث کے تراجم آئے دن منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں جن کا مطالعہ کسی خاص طبقہ تک محدود نہیں ہے، چونکہ دین کے اہم احکام ومسائل کا معلوم کرنا ہر مسلمان کی دینی ضرورت ہے۔ ان تسہیلی امور کے ذریعہ لوگوں کو بے کار بنانا مقصود نہیں ہے، بلکہ درحقیقت یہ ہماری اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے۔

یہ ہماری اسلامی تعلیمات کا تقاضا اس طرح ہے کہ اسلام کے ہر کام میں ہمیشہ عسر سے احتراز کر کے حتی المقدر یسر کا لحاظ رکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ اور حالات کے کروٹ بدلنے کے ساتھ ساتھ متقدمین ومتاخرین ہوائے نفسانی کی بناء پر نہیں بلکہ اپنے اپنے زمانے کے اقتضاء کے موافق ''الدین یسر'' کے تحت اسلام اور اسلامیات کو دنیا کے سامنے سہل تر صورت میں پیش کرتے رہے۔ جس کی سدہا نظیریں ہیں۔ سردست ایک نظیر پیش خدمت ہے کہ عہد رسالت میں قرآن کریم مکتوب تو تھا مگر یکجا کتابی شکل میں نہ تھا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے قرآن کریم کی منتشر آیات کو یکجا طور پر جمع کرنے کے لئے حکم صادر فرمایا۔ پھر مزید سہولت کی خاطر خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے موجودہ خاص ترتیب کے ساتھ قرآن کریم کو دنیا کے سامنے پیش فرمایا، مگر مصحف عثمانی نقطوں اور حرکات وغیرہ سے خالی تھا، اس کے بعد مزید سہولت کیلئے اس میں نقطے لگائے گئے، حرکات لگائی گئیں، احزاب ومنازل مقرر کی گئیں، اجزاء، سور ورکوع کی تعیین کی گئی، رموز واوقاف لکھے گئے۔

ایسے ہی حدیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے متعلق بھی قرنا بعد قرن اسی سہولت کا معاملہ رونما ہوتا گیا حتیٰ کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے مشورہ بلکہ ان کے حکم سے ابتداء قرن ثانی (سن ۱۰۰ھ تا ۱۲۵ھ) میں ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۶۰ھ) اور ابوبکر بن حزم رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۶۰ھ) نے احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو جمع کرنے کا کام شروع کیا تھا۔ پھر بقول حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ قرن ثانی کے نصف (یعنی سن ۱۲۵ھ تا تقریباً ۱۵۰ھ) میں ربیع بن صبیح رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۶۰ھ)، سعید بن ابی عروبہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۵۶ھ) وغیرہم نے اس تسہیل کی خاطر ہر باب کو علیحدہ علیحدہ ذکر کر کے کتب احادیث تصنیف فرمائیں مثلاً کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ وغیرہ۔ چونکہ ان کتابوں میں صحت وسقم کا امتیاز ایک دشوار عمل تھا، اس میں سہولت پیدا کرنے کی خاطر طبقہ ثالثہ میں ابن جریج، معمر بن راشد، اوزاعی، سفیان ثوری وغیرہم (رحمۃ اللہ علیہم) نے پھر طبقہ رابعہ میں نعیم بن حماد، عثمان بن ابی شیبہ، امام احمد بن حنبل وغیرہم (رحمۃ اللہ علیہم) نے، پھر طبقہ خامسہ میں امام بخاری، امام مسلم، امام نسائی وغیرہم (رحمۃ اللہ علیہم) نے جمع احادیث صحیحہ کی طرف اپنی اپنی توجیہات مبذول فرمائیں۔ جزاھما اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔

تسہیل عملی کے لئے فقہاء کرام نے بھی ایسا ہی کیا کہ ہر مسئلہ کا قرآن وحدیث سے استنباط کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیا۔ غرض یہ کہ ائمہ حدیث وفقہ بمقتضائے زمانہ دین کے ہر شعبہ کو برابر آسانی کی طرف لاتے رہے۔ چودہویں صدی ہجری میں برصغیر پاک وہند کے علماء نے اس علم کی جو خدمات سرانجام دی ہیں ان کا اعتراف بلاد عرب کے بہت سے علماء کرام نے بھی کیا ہے۔

چنانچہ پیش نظر اردو کتاب اسی سلسلۂ آسانی کی ایک کوشش کی ہے۔ ''مرقاۃ المفاتیح'' (عربی) ہمارے اسلاف کے علمی شاہ پاروں میں سے ایک پرمغز اور نسبتاً مشکل عبارات والی بلند پایہ کتاب ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اور مکانت علمی اہل علم پر مخفی

نہیں۔اس شرح سے کماحقہ استفادہ کے لئے بھرپور علمی استعداد ضروری ہے۔اس اہم علمی کام کا اردو ترجمہ ایک علمی اور دینی ضرورت تھی۔ چونکہ اس دور انحطاط میں اساتذہ اور ذکی شمار ہونے والے طلبہ بھی ''مرقاۃ المفاتیح'' (عربی) سے استفادہ بہت محدود پیمانے پر کرتے ہیں۔جب کہ کمزور اور متوسط طلبہ بوجہ استعداد کی کمزوری کے عربی کتب سے عموماً اور ''مرقاۃ المفاتیح'' جیسی دقیق کتاب سے خصوصاً کتراتے ہیں۔اس ترجمہ کا داعیہ یہی تھا کہ طبقہ علم کی طرف منسوب ہر شخص علوم عالیہ سے متعلقہ اس کتاب یعنی ''مرقاۃ المفاتیح'' سے فائدہ اٹھائے۔بہرحال افادہ کی خاطر یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

احقر نے جس افادہ و استفادہ کی خاطر اس اہم بارِ گراں کو اپنے ناتواں شانوں پر اٹھایا ہے امید قوی ہے کہ استفادہ کرنے والے قدردان حضرات ناکارہ کو دعائے خیر سے یاد فرماتے ہوئے حسنِ عمل و مزید توفیق خدمتِ دین کیلئے دعا فرمائیں گے۔

تذکرۂ مرتب ومترجمین

یہ کتاب کئی مراحل سے گزر کر آپ کے ہاتھوں میں پہنچی ہے۔اس کے زیورِ طباعت سے آراستہ وپیراستہ ہونے سے پہلے جن اصحاب علم نے اس پر کام کیا ان کا مختصر سا تعارف ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

اس کتاب کے ساتھ لگے ہوئے مشکوۃ شریف کے متن کی تصحیح اور اس کا ترجمہ ''مکتبہ رحمانیہ'' کے ایک قدیم رفیق مولانا عبدالمنان صاحب حفظہ اللہ نے کیا ہے۔

''مرقاۃ المفاتیح'' کے اردو ترجمہ کی تصحیح کا کم وبیش سارا کام مفتی عبدالرحمٰن صاحب حفظہ اللہ اور مولانا طارق اسماعیل صاحب حفظہ اللہ نے سرانجام دیا ہے۔ان حضرات نے کمپوزنگ کی اغلاط کی تصحیح کے ساتھ ساتھ نفس مضامین پر بھی نظر ڈالی ہے۔اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے ایسے مقامات کی نشاندہی بھی جن کا ترجمہ مترجمین سے چھوٹ گیا تھا اور بعض مقامات پر اس کی از خود تکمیل بھی فرما دی اور بعض مضامین پر اعادۂ نظر کیلئے مرتب کو توجہ دلائی۔

''مرقاۃ المفاتیح'' کے اردو ترجمہ کے کام کا آغاز تو سن ۲۰۰۰ء سے پہلے ہوا تھا جس کی ذمہ داری سات علماء کرام کی ایک جماعت نے لی تھی۔ترتیب یہ طے پائی تھی کہ ہر ساتھی ایک ایک جلد کا کام کرے، جب وہ اپنی جلد سے فارغ ہو جائے تو باقی ماندہ چار جلدوں میں سے کسی جلد پر کام شروع کر دے،لیکن یہ ترتیب بہت جلد ہی متاثر ہوگئی، یہ رفقائے کار دن بہ دن کم ہوتے چلے گئے،، حتیٰ کہ کچھ عرصہ کے بعد یہ کام تقریباً رک گیا،کوئی بھی ساتھی اپنی متعلقہ جلد مکمل نہ کر سکا۔مگر نوشتہ تقدیر میں اس کتاب کا وجود میں آنا لکھا جا چکا تھا۔

یہ ترجمہ کا کام طویل بھی بہت تھا اور مشکل بھی، دوران کام مجھے اپنی نا اہلی کی بناء پر شرم دامن گیر رہی۔یہ ایک حقیقت ہے جس کا اعتراف میں بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کے اردو ترجمہ میں کئی مقامات پر دانتوں کو پسینہ آتا معلوم ہوا۔جس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ مرتب ایک ایسے گھرانے کا فرد ضرور ہے جس کی مادری زبان اردو ہے، مگر نہ ادیب ہے اور نہ لکھاری۔ اپنی بے بضاعتی وکم استطاعتی کا میں معترف ہوں، بالخصوص اردو ادب ومحاورات کے اعتبار سے مجھ جیسے نا اہل سے غلطی کا وقوع ایک ناگزیر عمل ہے۔خصوصاً زبان وبیان کی خامیاں اصحابِ ذوق پر بار ہو سکتی ہیں۔

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

اگر تعمق وتدبر کے بعد ناظرین کرام کسی لغزش پر مطلع فرمائیں تو ان شاء اللہ اس کو قبول کرتے ہوئے اصلاح وترمیم سے گریز نہیں ہوگا،اہل علم کی آراء اور مشوروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا بلکہ تا دمِ حیات اس دینی وعلمی خیرخواہی کا

شکر گذار رہوں گا۔

اگر مصروفیت صرف ترجمہ کی ہوتی تو معاملہ نسبتاً سہل تھا، پہلے وقت میں تدریسی ذمہ داری تھی تو بعد از مغرب طلبہ کے تکرار و مطالعہ کی نگرانی تھی۔ تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف ایک مشکل امر ہے، کیونکہ مدرس کو کئی علوم و فنون کی تدریس کرنی ہوتی ہے، نیز متعلقہ کتابوں کا مطالعہ بھی کرنا پڑھتا ہے اور ترجمہ و تصنیف کا موضوع علیحدہ ہوتا ہے اس وجہ سے ذہن کام نہیں کرتا۔

''مرقاۃ المفاتیح'' کے اردو ترجمہ کی مکمل ترتیب و تہذیب، راقم الحروف نے دی ہے۔ ترتیب و تہذیب کی تفصیل آگے آ رہی ہے اب ''مرقاۃ المفاتیح'' کے ان مترجمین کا ذکر کیا جا رہا ہے جنہوں نے اپنی متعلقہ جلد کے تقریباً نصف یا اس سے زائد حصہ کا کام مکمل کیا۔

جلد اول: معتد بہ حصہ کا کام راقم الحروف (راؤ محمد ندیم) کا ہے۔

جلد دوم: ترجمہ مولانا اویس سرور صاحب حفظہ اللہ نے کیا ہے۔ موصوف پہلے بھی متعدد کتب کے مترجم ہیں۔

جلد سوم: اس پر کام مولانا محمد عمران صاحب حفظہ اللہ نے کیا ہے۔

جلد چہارم: اس کے ترجمہ نگار مولانا حافظ محمد ثناء اللہ صاحب حفظہ اللہ ہیں۔

جلد پنجم: اس کا متفرق طور پر نصف سے زائد کام احقر (راؤ محمد ندیم) نے کیا ہے۔

جلد ششم از ابتداء تا تقریباً اختتام کتاب النکاح کا ترجمہ مولانا محبوب زادہ صاحب حفظہ اللہ نے کیا ہے۔ موصوف نے ۱۴۲۳ھ بمطابق ۲۰۰۲ء میں جامعۃ العلوم الاسلامیۃ بنوری ٹاؤن سے درس نظامی کی تکمیل اور ''دورۂ تقابل ادیان'' کیا۔ فراغت کے بعد سے ''ادارہ علوم اسلامی اسلام آباد'' میں تدریسی فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ فاضل مترجم ادارہ ہذا کے اساتذۂ حدیث میں سے ہیں۔

جلد ہفتم: اس کے نصف سے کچھ زائد حصہ کا کام مولانا رفیع اللہ صاحب حفظہ اللہ نے کیا ہے۔

موصوف نے ۱۴۲۳ھ میں ''ادارہ علوم اسلامی اسلام آباد'' سے درس نظامی کی تکمیل کی۔ فراغت کے بعد دو سال ''ادارہ علوم اسلامی اسلام آباد'' میں تدریس کی۔ یہاں سے مستعفی ہونے کے بعد سے تا حال اپنے آبائی شہر پشاور میں تدریس کر رہے ہیں۔

جلد ہشتم: اس کا متفرق طور پر تین چوتھائی سے کچھ زائد کام احقر (راؤ محمد ندیم) نے کیا ہے۔

جلد نہم: از ابتداء تا تقریباً اختتام کتاب الفتن کا ترجمہ مولانا محمد الیاس صاحب حفظہ اللہ نے کیا ہے اور باقی ترجمہ احقر کا ہے۔

مولانا موصوف نے ۱۴۲۲ھ بمطابق ۲۰۰۱ء میں دار العلوم فیصل آباد سے درس نظامی، اور اگلے سال یہیں ''تخصص فی الفقہ'' کی تکمیل کی۔ فراغت کے بعد تین سال ''ادارہ علوم اسلامی اسلام آباد'' میں منصب تدریس فائض رہے۔ اس کے بعد سے تا حال

پشاور میں درجہ تخصص وغیرہ کے اسباق کی تدریس میں مشغولیت ہے۔

جلد دہم: نصف سے کچھ زائد حصہ کا کام مفتی سیف الرحمٰن صاحب حفظہ اللہ کا ہے اور باقی ترجمہ احقر کا ہے۔ مفتی صاحب نے ۱۴۱۷ھ بمطابق ۱۹۹۶ء میں جامعۃ العلوم الاسلامیۃ بنوری ٹاؤن سے درس نظامی کی تکمیل اور ''تخصص فی الفقہ'' کیا۔ فراغت کے بعد سے ''ادارہ علوم اسلامی اسلام آباد'' میں موقوف علیہ تک کے اسباق کی تدریس کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

جلد یازدہم: اس جلد کی ترجمہ بھی احقر نے خود کیا ہے۔

تذکرۂ مرتب:

ارادہ تو یہی تھا کہ دیگر اصحاب کی طرح اپنے احوال بھی دو چار سطروں میں رقم کر دوں، مگر مکتبہ کی طرف سے اصرار تھا کہ اتنا اختصار بھی اچھا نہیں، ذرہ تفصیلی ہو جائیں تو مناسب رہے گا۔ اسی تعمیل خواہش میں یہ پانچ صفحات سیاہ کر ڈالے۔ میرے والدین اور اکثر و بیشتر اقرباء ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ میرے والد صاحب قیام پاکستان سے پہلے بھارتی بری فوج میں تھے، قیام پاکستان کے بعد پاکستانی فوج میں شامل رہے۔ پاکستان میں پہلے پہل میرے والد صاحب کی تعیناتی کاکول ایبٹ آباد میں ہوئی، سن ۶۵ کی جنگ میں شمولیت کے بعد ریٹائر ہو گئے مگر اے کی جنگ میں دوبارہ طلب کر لئے گئے۔ ریٹائرمنٹ پر والد صاحب نے حکومت کی طرف سے ملنے والی صوبہ پنجاب کے ضلع ''خوشاب'' کی زمین کو مسکن کے طور پر اختیار فرمایا۔ میں نے یکم جنوری ۱۹۷۶ء کو یہیں آنکھ کھولی۔ بچپن اسی گاؤں میں گذرا۔ دس سال کا تھا کہ تمام اہل خانہ کراچی منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد سے تا حال میرے باقی سب اہل خانہ کراچی میں اور میں اپنے اہل و عیال سمیت گزشتہ گیارہ سال سے اسلام آباد میں ہوں۔

علوم دینیہ میں میری پہلی درسگاہ ''جامعہ فاروقیہ کراچی'' کی ملیر ہالٹ رفاہ عام والی شاخ ہے۔ شوال المکرم ۱۴۱۲ھ بمطابق ۱۹۹۲ء یہاں شعبہ حفظ میں داخلہ لیا۔ میرے حفظ کے استاذ قاری عبداللہ صاحب حفظہ اللہ تھے۔ دوران تعلیم میں بہت زیادہ بیمار ہو گیا، طویل علالت کے باعث میرا یہ تعلیمی سال ضائع ہو گیا۔

اگلے سال یعنی ۱۴۱۳ھ بمطابق ۱۹۹۲ء میرے درس نظامی کی ابتداء ''جامعہ دارالعلوم کراچی'' سے ہوئی۔ یہاں مجھے درجہ متوسطہ میں داخلہ دیا گیا۔ ''وفاق المدارس العربیہ پاکستان'' کے امتحان میں بتقدیر جید جدا کامیابی حاصل کی۔ یہاں میرے اسباق مندرجہ ذیل اساتذہ کرام کے پاس تھے:

① حدر و تجوید۔ قاری عبدالرشید صاحب حفظہ اللہ

② بہشتی گوہر، اردو۔ مفتی مولانا بدر عالم صاحب حفظہ اللہ

③ فارسی (تسہیل المبتدی، کریما، پند نامہ، گلستان، بوستان) مولانا طاہر کوثر صاحب حفظہ اللہ

''گلستان'' کا دیباچہ مولانا راحت علی ہاشمی صاحب ﷾ سے پڑھا تھا۔ فارسی اگرچہ صرف ایک سال ہی پڑھی، مگر اس کا بے حد فائدہ آج تک محسوس ہوتا ہے اور استاذ محترم کے لئے دل سے بے ساختہ دعا نکلتی ہے۔

۴ ریاضی۔ مفتی مولانا محمد زکریا صاحب ﷾

۵ معاشرتی علوم۔ مفتی یحییٰ عاصم صاحب ﷾

۶ انگریزی۔ مفتی مولانا زبیر اشرف عثمانی صاحب ﷾، مفتی مولانا ڈاکٹر عمران اشرف صاحب ﷾

تمام اساتذہ کو انتہائی مشفق و محنتی پایا۔ الحمد للہ! انیس (۱۹) سال پورے ہونے کو ہیں میرے ابتدائی درجات کے یہ اساتذہ کرام مجھ پر آج بھی روزِ اول کی طرح شفقت فرماتے ہیں۔

کراچی کے طلبہ میں یہ بات مشہور تھی کہ پنجاب کے مدارس میں عمومی طور سے نحو صرف دیگر صوبوں کے مدارس کے مقابلہ میں زیادہ بہتر انداز سے پڑھائی جاتی ہے۔ چنانچہ مجھے بھی شوق ہوا کہ میں بھی ابتدائی نحو صرف پنجاب کے کسی اچھے مدرسہ میں پڑھوں۔ بعض احباب نے مجھے فیصل آباد کے ایک مدرسہ ''جامعہ عربیہ عبیدیہ'' جانے کی تجویز دی، میں اپنے بڑوں کے مشورہ سے ''جامعہ دار العلوم کراچی'' سے ایک سال کی رخصت لے کر مدرسہ ہذا چلا گیا اور تعلیم کا سلسلہ یہاں جاری کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے آج اس عظیم الشان کتاب پر کام کرنے کی توفیق عنایت فرمائی ہے تو بلا مبالغہ ظاہری اسباب میں ایک بڑا کردار میرے ان مشفق و محنتی تجربہ کار اساتذہ نحو و صرف مولانا مفتی قاسم صاحب ﷾، مولانا محمد اکرم جوئیہ صاحب اور مولانا ظفر اقبال صاحب ﷾ کا ہے جس کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ درجہ اولیٰ کے اسباق کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱ علم النحو، شرح مائۃ عامل مولانا مفتی قاسم صاحب ﷾

۲ نحو میر۔ مولانا محمد اکرم جوئیہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

۳ صرف میر، صرف بہائی، ارشاد الصرف۔ مولانا ظفر اقبال صاحب ﷾

یہاں میرا اصلاحی تعلق اسی جامعہ کے بانی (سابق شیخ الحدیث جامعہ دار العلوم فیصل آباد) محترم و مکرم مفتی سید جاوید حسین شاہ صاحب ﷾ سے قائم ہوا۔ اللہ تعالیٰ یہ تعلق و تا حیات قائم رکھے اور مجھے حقیقی معنی میں اپنے پیر و مرشد سے کسب فیض کی توفیق عطا فرمائے۔

اگلے سال پھر میں واپس ''جامعہ دار العلوم کراچی'' آ گیا۔ درجہ ثانیہ میں بتقدیر جید جدا کامیابی حاصل کی۔ یہاں میں نے جن اساتذہ سے جو پڑھا اس کی تفصیل یہ ہے:

۱ تفسیر عم پارہ، فوائد مکیہ۔ قاری عبد المالک صاحب ﷾

۲ زاد الطالبین، قراءۃ راشدہ، معلم الانشاء۔ مفتی مولانا مسیح اللہ صاحب ﷾

③ مختصر القدوری، تیسیر المنطق، ایساغوجی، مرقاۃ۔ مفتی مولانا ڈاکٹر زبیر اشرف عثمانی صاحب حفظہ اللہ

④ ہدایۃ النحو۔ مفتی مولانا ڈاکٹر عمران اشرف صاحب حفظہ اللہ

⑤ علم الصیغہ۔ مولانا یوسف کرخی صاحب حفظہ اللہ

کراچی خصوصاً کورنگی کے حالات کی خرابی کے باعث اگلے تین درجات کی تعلیم میں یہاں جاری نہ رکھ سکا۔ اسی سال کے آخر میں "جامعہ دار العلوم کراچی" کے صدر دروازہ پر رات گیارہ بجے کے قریب فائرنگ ہوئی، اس فائرنگ کے واقعہ کا اثر عمومی طور پر کئی ہفتوں قائم رہا۔ بھائیوں نے مشورہ دیا کہ ان حالات میں بہتر ہوگا کہ تم واپس فیصل آباد چلے جاؤ اور وہیں اسی مدرسہ میں پڑھو۔ چنانچہ درجہ ثالثہ اپنے سابقہ مادر علمی "جامعہ عربیہ عبیدیہ" میں مکمل کیا۔ یہاں اصول الشاشی مولانا مفتی قاسم صاحب حفظہ اللہ، ترجمہ قرآن کریم اور کافیہ مولانا محمد اکرم جوئیہ صاحب رحمہ اللہ سے اور کنز الدقائق، شرح تہذیب اور نفحۃ العرب مولانا ظفر اقبال صاحب حفظہ اللہ سے پڑھی۔

سالانہ امتحان میں بتقدیر ممتاز کامیابی حاصل کی۔ اگلے سال درجہ رابعہ میں جب میں یہاں آیا تو پتہ چلا کہ درجہ رابعہ میں تاحال صرف ایک طالب علم آیا ہے۔ مجھے اختیار دیا گیا کہ اگر میں ایک ہم جماعت کے ساتھ یہاں پڑھنا چاہوں تو مدرسہ کی انتظامیہ اس کے لئے تیار ہے، اگر کسی اور مدرسہ میں جا کر پڑھنا چاہو تو وہاں داخلہ دلوا دیتے ہیں۔ قصہ مختصر میں احباب کے مشورہ سے لاہور آ گیا۔

درجہ رابعہ اور خامسہ کی تعلیم "جامعہ دار العلوم اسلامیہ لاہور" میں حاصل کی۔ یہاں درس نظامی کے ساتھ ساتھ بحمد للہ! باضابطہ طور پر تجوید پڑھنے کا موقع بھی ملا۔ درجہ رابعہ کے اسباق کی تفصیل حسب ذیل تھی:

① ترجمہ قرآن کریم، ریاض الصالحین، شرح الوقایہ۔ مفتی انیس صاحب حفظہ اللہ

② نور الانوار، شرح ملا جامی۔ مولانا محمد انس چترالی صاحب حفظہ اللہ

③ مقامات حریری مولانا عبد الرحمٰن صاحب حفظہ اللہ

④ قطبی۔ مفتی محمد مبشر صاحب حفظہ اللہ

درجہ خامسہ کے اسباق کی تفصیل:

① ہدایہ اول۔ مفتی انیس صاحب حفظہ اللہ

② حسامی، مختصر المعانی۔ مولانا محمد منظور صاحب حفظہ اللہ

③ سلم العلوم، دیوان متنبی۔ مولانا عبد الرحمٰن صاحب حفظہ اللہ

④ تجوید۔ قاری نور محمد صاحب حفظہ اللہ

مدرسہ اور ''وفاق المدارس العربیہ پاکستان'' کے زیر انتظام ہونے والے درجہ رابعہ کے سالانہ امتحان میں بتقدیر ممتاز کامیابی حاصل کی اور تجوید کے امتحان میں بتقدیر جید جدا کامیابی حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی جو اساتذہ کرام مجھے عنایت فرمائے بلاشبہ اپنی نظیر آپ ہیں۔ جب بھی ان کی خدمت میں حاضری دیتا ہوں تو شفقت و محبت دیکھ کر کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ اتنے سال بیت چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر ایک خصوصی فضل یہ بھی رہا کہ ان دونوں تعلیمی سالوں میں مجھے بعد نمازِ عشاء مختلف درجات کے طلبہ کی ایک بڑی جماعت کو نحو و صرف کا اجراء کرانے کا موقع ملا۔ علاوہ ازیں خارجی اوقات میں طلبہ کو کچھ دیگر کتب بھی پڑھائیں۔

اس جامعہ کی ایک نمایاں خوبی کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ یہاں ہر ماہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک وعظ شائع کیا جاتا ہے، اس وعظ کی خاص بات یہ ہے کہ جامعہ کے شعبے کتب کے تمام طلبہ ہر مہینہ اس وعظ کا باضابطہ امتحان دیتے ہیں۔ ہر امتحان کے مستقل نمبر ہوتے ہیں، اور فائق طلبہ کو انعامات سے بھی نوازا جاتا ہے۔ یہ انعام مجھے بھی ملا ہے۔ اس انوکھے امتحان کا مجھے ایک فائدہ یہ ہوا کہ الحمد للہ! اپنی اصلاح کی فکر پہلے سے زیادہ دامن گیر ہوگئی۔ دوسرا فائدہ جو میں محسوس کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں سے کافی حد تک مناسبت پیدا ہوگئی۔ اور ایک تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ اپنے اساتذہ کو تحقیقی و تصنیفی کام کرتے شب و روز اپنی آنکھوں سے دیکھا، چند بار بعض کاموں میں معمولی سا ہاتھ بٹانے کا موقع بھی دستیاب آیا۔ شاید یہیں سے ملنے والا کوئی ذوق شوق تھا کہ اللہ رب العزت نے میرے دل میں خدمت حدیث کا جذبہ پیدا فرما کر یہ موقع مجھ ناچیز کو بھی عنایت فرما دیا۔

پھر آخری تینوں درجات درجہ سادسہ، سابعہ اور دورہ حدیث شریف کی تکمیل ''جامعہ دارالعلوم کراچی'' میں کی۔ درجہ سادسہ میں اسباق حسب ذیل تھے:

① تفسیر جلالین، آثار السنن۔ مولانا رشید اشرف سیفی صاحب حفظہ اللہ

② شرح العقائد، میبذی۔ مفتی محمد عبداللہ (برمی) صاحب حفظہ اللہ

③ ہدایہ ثانی، التوضیح والتلویح۔ مولانا راحت علی ہاشمی صاحب حفظہ اللہ

④ سراجی۔ مفتی عبدالمنان صاحب حفظہ اللہ

⑤ دیوان حماسہ، متن الکافی۔ مولانا اسحاق صاحب حفظہ اللہ

درجہ سابعہ میں اسباق کی تفصیل یوں تھی:

① تفسیر بیضاوی (سورہ فاتحہ) علوم القرآن۔ مولانا شمس الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ

② تفسیر بیضاوی (سورہ بقرہ)، ہدایہ رابع، عقود رسم المفتی۔ مفتی عبداللہ (برمی) صاحب حفظہ اللہ

③ مشکوۃ المصابیح (جلد اول) مولانا مفتی محمود اشرف صاحب حفظہ اللہ

④ مشکوۃ المصابیح (جلد دوم)، نخبۃ الفکر۔ مولانا رشید اشرف سیفی صاحب حفظہ اللہ

⑤ ہدایہ ثالث، اسلام اور جدید معیشت وتجارت، ہیئت وسطیٰ۔ مولانا عزیز الرحمٰن صاحب حفظہ اللہ

تفسیر بیضاوی کا درس اصالۃً تو مولانا شمس الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد تھا، مگر آپ کی علالت کے باعث عارضی طور پر مفتی عبداللہ (برمی) صاحب حفظہ اللہ کو مفوض کر دیا گیا تھا۔

دورۂ حدیث شریف کے اسباق یوں تھے:

① بخاری شریف (کامل)۔ شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ

② مسلم شریف (مقدمہ، کتاب الایمان) مفتی اعظم مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب حفظہ اللہ

③ مسلم شریف (مذکورہ بالا مباحث کے علاوہ باقی کتاب) مولانا عزیز الرحمٰن صاحب حفظہ اللہ

④ سنن ابی داوٗد، جامع ترمذی (ہر دو کتب کا حصہ اول) مولانا شمس الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ

⑤ سنن ابی داوٗد (حصہ دوم) مفتی عبداللہ (برمی) صاحب حفظہ اللہ

⑥ جامع ترمذی (حصہ دوم، شرح شمائل) مولانا مفتی محمود اشرف صاحب حفظہ اللہ

⑦ سنن ابن ماجہ، سنن نسائی، طحاوی شریف، مؤطان، تدریب الراوی۔ مولانا افتخار احمد اعظمی صاحب حفظہ اللہ

سنن ابی داوٗد مولانا شمس الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مفوض تھی، سال کا اکثر حصہ آنجناب ہی درس دیتے رہے، مگر اخیر سال میں آپ کی شدید علالت کے باعث یہ سبق مفتی عبداللہ (برمی) صاحب حفظہ اللہ کو تفویض کر دیا گیا تھا۔

ان آخری تینوں سالوں میں بھی بتقدیر جید جداً کامیابی حاصل کی۔ یہ بات محتاج بیان نہیں کہ ہر جامعہ اور ہر معلم کا اپنا ایک خاص رنگ ہوتا ہے جو متعلّم پر اپنا اثر چھوڑے بنا نہیں رہتا۔ عمومی طور پر مدرسہ تبدیل کرنے سے طالب علم کی تعلیم میں کچھ نہ کچھ حرج واقع ہوتا ہے۔ میں نے جتنے بھی مدارس میں پڑھا بحمد للہ! ہر جگہ سے بہت کچھ حاصل کیا۔ کہاں سے کیا حاصل کیا تعبیر مافی الضمیر کے لئے الفاظ سجھائی نہیں دے رہے۔ کبھی سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ جہاں سے جو حاصل ہوا یہ مجھے شاید کسی دوسری سے حاصل نہ ہو پاتا۔ "جامعہ دار العلوم کراچی" کا مجموعی مزاج لاریب وہ زندگیوں میں انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ جو نظام تربیت ہے وہ مدارس دینیہ میں خال خال ہی دکھائی دیتا ہے۔ یہاں کی نمایاں خوبیوں میں ایک خوبی جس کا اعتراف واظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اعتدال کی جو دلکش تصویریں یہاں جا بجا سالہا سال سے ہر کس وناکس شب وروز بکثرت دیکھ رہا ہے دوسری جگہوں پر اس کی نظیر بہر حال ڈھونڈے سے ہی ملتی ہے۔

شعبان المعظم ۱۴۲۱ھ بمطابق نومبر ۲۰۰۰ء میں مادر علمی "جامعہ دار العلوم کراچی" کی طالب علمی سے رسمی فراغت کے

اگلے ہفتہ ''ادارہ علوم اسلامی اسلام آباد'' میں بطور مدرس تقرر رہوا۔ وہاں درجہ متوسطہ تا موقوف علیہ کم وبیش تمام درجات میں مختلف علوم وفنون پڑھانے کا موقع ملا۔ اسی عرصہ میں ایک جامعہ میں ظہر کے بعد بخاری شریف کی تدریس بھی شروع ہوگئی جو تقریباً دو سال جاری رہی۔ ہجوم مشاغل کی وجہ سے حدیث کی اس خدمت کو خیر باد کہنا پڑا۔

''ادارہ علوم اسلامی اسلام آباد'' میں کم وبیش سات سالہ تدریسی خدمات سرانجام دینے کے بعد مستعفی ہوکر ''ادارہ دراسات دینیہ اسلام آباد'' کے شعبہ تدریس وانتظام سے منسلک ہوگیا۔ اس تعلیمی ادارہ سے میری باضابطہ متفرق وابستگی کم وبیش تین سال رہی۔

باضابطہ تدریس کے شعبہ سے وابستگی کو کم وبیش گیارہواں سال ہے۔ اس طویل دورانیہ میں متعدد کتب کی تدریس بار بار کی۔ جن کتب کی تدریس مجھے تفویض ہوئی ان میں سے چیدہ چیدہ کتب حسب ذیل ہیں:

① تفسیر الجلالین	② بخاری شریف	③ ریاض الصالحین	④ مناهل العرفان
⑤ تیسیر فی مصطلح الحدیث	⑥ الهدایه	⑦ شرح الوقایة	⑧ الفقه الحنفی و ادلته
⑨ مختصر القدوری	⑩ شرح ابن عقیل	⑪ هدایة النحو	⑫ جامع الدروس العربیة
⑬ اعراب القرآن	⑭ اصول الشاشی	⑮ قطبی	⑯ مرقات

تدریس کے ساتھ چند کتابوں پر کچھ تحقیق وترجمہ کا کام کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ تا حال صرف ایک رسالہ ''علم النحو'' مؤلفہ مولانا مشتاق احمد چرتھاولی رحمۃ اللہ علیہ طبع ہوا ہے۔ اس کو حواشی کے ساتھ مزین کرنے کے ساتھ ساتھ ترتیب جدید وتہذیب سے آراستہ وپیراستہ کیا ہے، باقی کتب زیر تکمیل ہیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی تعارف طویل ہوگیا، مزید کچھ لکھ کر میں اصل کتاب کے منافع سے زیادہ دیر تک آپ کو روکے رکھنا مناسب نہیں سمجھتا اور اسی پر اکتفاء کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين.

پہلے زمانے کے محدثین کا طریقہ و دستور یہ تھا کہ احادیث "کیف ما اتفق" اور بلا کسی خاص ترکیب کے لکھا کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرلیا کرتے تھے کہ اگر کوئی لفظ محتاج تفسیر و قابل تشریح ہوتا تو اس کو حاشیہ پر تحریر کردیا کرتے تھے۔ اس کے بعد جب متاخرین کا دور دورہ ہوا تو انہوں نے اس کو مرتب و مہذب بنایا۔ ترتیب و تہذیب کا یہ سلسلہ چلتے چلتے ہمارے دور کو پہنچ چکا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش کا یہ سفر جاری و ساری ہے۔ یہ اردو کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

"آمدم برسر مطلب" جاننا چاہئے کہ مقدمہ کی دو قسمیں ہیں: ① مقدمۃ العلم ② مقدمۃ الکتاب

متقدمین کے نزدیک صرف "مقدمۃ العلم" تھا۔ "مقدمۃ الکتاب" کی اصطلاح بعد کی ایجاد ہے۔ یہ علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ کی اختراع ہے۔ یہ بات تو بدیہی ہے کہ "مقدمۃ العلم" کا تعلق فن سے ہوتا ہے اور "مقدمۃ الکتاب" کا تعلق کتاب سے ہوتا ہے۔

مقدمۃ الکتاب کا خلاصہ و حاصل صرف دو چیزیں ہیں: ① مصنف کا تعارف ② کتاب کا تعارف۔

اس کے ذیل میں جتنے بھی امور بیان کئے جائیں گے وہ "مقدمۃ الکتاب" کہلائیں گے۔

جملہ صحاح ستہ ایک ہی فن یعنی فن حدیث کی کتابیں ہیں، لہذا یہ "مقدمۃ العلم" جو یہاں بیان کیا جارہا ہے اس کا تعلق ان تمام کتب حدیث سے ہوگا اور یہ مقدمہ سب جگہ کام دے گا بخلاف "مقدمۃ الکتاب" کے، کہ وہ ہر کتاب کا الگ الگ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے "مقدمۃ العلم" عام ہوا اور "مقدمۃ الکتاب" خاص ہوا، اور ترتیب میں باعتبار ذکر کے "عام" کو "خاص" پر مقدم کیا جاتا ہے، اس لئے "مقدمۃ العلم" کو پہلے ذکر کریں گے۔

﴿مقدمة العلم﴾

اہلِ علم کا طریقہ یہ ہے وہ ہر علم کے شروع میں اس علم کے مبادی سے متعلق کچھ مباحث بیان کرتے ہیں۔ جن سے اس علم کے متعلق ضروری معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بعض اہل علم اس موقع پر صرف تین امور بیان کرتے ہیں:

① تعریف ② موضوع ③ غرض وغایت

ان تین امور کو سمجھ لینے سے شروع فی العلم میں بصیرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے بطور تمہید ان تینوں چیزوں کو عام طور پر ہر علم وفن کے شروع میں بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن اکثر اہلِ علم اس موقع پر تین کی بجائے مندرجہ ذیل آٹھ امور کو بڑے اہتمام سے بیان کرتے ہیں جن کو ''رؤوس ثمانیہ'' اور ''بحوث ثمانیہ'' بھی کہتے ہیں:

① علم کی تعریف ② علم کی وجہ تسمیہ ③ علم کا موضوع
④ علم کی غرض وغایت ⑤ اجناس علوم ⑥ علم کی فضیلت ومرتبہ
⑦ علم کے مصنفات وتدوین ⑧ علم کا حکم شرعی

بعض حضرات ''بحوث ثمانیہ'' کی بجائے ''امور عشرہ'' بیان فرماتے ہیں۔

﴿پہلی بحث: علم حدیث کی تعریف﴾

پہلی بحث میں مندرجہ ذیل امور کا بیان ہوگا:

① حدیث کی لغوی واصطلاحی تعریف ② حدیث کے معنی میں چند متقارب الفاظ
③ علم حدیث کی تعریف ④ علم روایت حدیث کی تعریف
⑤ علم درایت حدیث کی تعریف ⑥ علم اصول حدیث کی تعریف

حدیث کے لغوی معنی:

لغت کی مشہور کتاب ''الصحاح'' میں ''حدیث'' کے لغوی معنی لکھیں ہیں:

''الحديث الكلام قليله و كثيره'' یعنی حدیث ہر قسم کے کلام کو کہا جاتا ہے۔

حافظ سخاوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: الحديث لغة ضد القديم کہ ''حدیث'' لغوی اعتبار سے ''قدیم'' کی ضد ہے۔

حدیث کے اصطلاحی معنی:

یہ عنوان بہت ہی طویل الذیل ہے۔ ''حدیث'' کی اصطلاحی تعریف کے بارے میں اہل علم کا بہت ہی اختلاف ہے، لیکن بغور دیکھا جائے تو یہ اختلاف حقیقی کم اور لفظی واعتباری زیادہ ہے۔ علمائے اصول فقہ اور علمائے حدیث کی اصطلاحات میں فرق

ہے، چونکہ اہل علم کے ان دونوں طبقات کا مقصود جدا جدا ہے۔ علم اصول فقہ کا مقصود مسائل کا استنباط ہوتا ہے اور محدثین کا مقصود ہر اس روایت کو جمع کرنا ہوتا ہے جو بھی نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب ہو۔ اس لئے ان دونوں طبقات کی ذکر کردہ تعریفات میں فرق ہے۔

علماء اصول کے نزدیک حدیث کی تعریف یہ ہے: اقوال رسول اللہ ﷺ وافعالہ

یہ تعریف تقریر اور احوال اختیاریہ کو تو جامع ہے، لیکن آنحضرت ﷺ کے احوال غیر اختیاریہ کو جامع نہیں ہے۔

محدثین نے "حدیث" کی تعریف یہ بیان فرمائی ہے: اقوال رسول اللہ ﷺ وافعالہ واحوالہ

حافظ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ حدیث کی اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے اپنی مشہور کتاب "فتح المغیث" کے صفحہ: ۱۲ پر لکھتے ہیں:

" اصطلاحا ما اضیف الی النبی ﷺ قولا له او فعلا اوتقریرا اوصفة حتی الحرکات والسکنات فی الیقظة والمنام"۔

یہ تعریف آنحضرت ﷺ کے احوال غیر اختیاریہ کو بھی شامل ہے۔

علم الحدیث کی تعریف:

① "علم حدیث" کی ایک مشہور تعریف یہ ہے جو علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے:

" هو علم يعرف به اقوال رسول الله ﷺ وافعاله واحواله"

② حافظ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "فتح المغیث" میں "علم الحدیث" کی تعریف یہ بیان فرمائی ہے:

" معرفة ما اضيف الى النبى ﷺ قولا له او فعلا او تقريرا او صفة "

انواعِ علم الحدیث:

علم الحدیث کی ابتداً دو قسمیں ہیں: ① علم روایت حدیث ② علم درایت حدیث

علم روایت حدیث کی تعریف:

① علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اپنی شہرہ آفاق کتاب "تدریب الراوی" کے صفحہ: ۷ پر لکھتے ہیں کہ علامہ ابن الاکفانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "ارشاد القاصد الی اسنی المطالب" میں "علم روایت حدیث" کی تعریف یہ بیان فرمائی ہے:

" هو علم يشتمل على اقوال النبى ﷺ و افعاله وروايتها وضبطها وتحرير الفاظها "

یعنی علم روایت حدیث وہ فن ہے جس میں آنحضرت ﷺ کے اقوال وافعال کو صحت الفاظ اور تحقیق سند کے ساتھ نقل کیا جائے۔

غالباً اس تعریف میں ''احوال'' کو اختصاراً حذف کر دیا گیا ہے اور حضور ﷺ کی ''تقریر'' جو ''حدیث'' کی تعریف میں داخل ہے گو یہاں مذکور نہیں ہے لیکن آپ ﷺ کی ''تقریر'' افعال میں آسکتی ہے، اس لئے کہ ''تقریر'' کہتے ہیں ''سکوت'' کو، اور ''ترک نکیر'' بھی ''فعل من الافعال'' ہے۔

۲ بعض حضرات نے ''علم روایت حدیث'' کی تعریف یہ لکھی ہے:

"هو علم بنقل اقوال النبى ﷺ و افعاله بالسماع المتصل وضبطها وتحريرها"

مشکوٰۃ شریف اور دورۂ حدیث کی تمام کتابیں علم روایت حدیث سے تعلق رکھتی ہیں۔

علم درایت حدیث کی تعریف:

''علم درایت حدیث'' کی ایک مفصل تعریف علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بحوالہ علامہ ابن الاکفانی رحمۃ اللہ علیہ یہ بیان فرمائی ہے:

"هو علم يعرف منه حقيقة الرواية، وشروطها، وانواعها، واحكامها، وحال الرواة، وشروطهم، واصناف المرويات، وما يتعلق بها۔ (تدریب الراوی، ص:۷)

یعنی وہ علم جس کے ذریعہ روایت حدیث کی حقیقت معلوم ہو کہ روایت کیسے کی جائے؟ اس کے معتبر طرق کیا ہیں؟ شرائط وانواع کیا ہیں؟ نیز ان کے احکام کہ کون سی روایت مقبول ہے اور کونسی مردود ہے؟ اسی طرح رواۃ کے جرح وتعدیل کے اسباب، طرق اور دیگر اصطلاحات فن معلوم ہوں۔

''علم درایت حدیث'' کی ایک دوسری تعریف یہ ہے:

"هو علم يتعرف به انواع الرواية واحكامها وشروط الرواة واصناف المرويات واستخراج معانيها"

''علم درایت حدیث'' کی دو شاخیں ہیں: ۱ علم اصول حدیث ۲ علم فقہ حدیث

علم اصول حدیث کی تعریف:

''علم اصول حدیث'' میں روایت کی اسنادی حیثیت سے بحث کی جاتی ہے۔ ''علم اصول حدیث'' کی نہایت مختصر، جامع ومانع بہترین تعریف حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں: "معرفة القواعد المعرفة بحال الراوى والمروى"۔ (تدریب الراوی، ص:۹)

یعنی علم اصول حدیث ان قواعد واصول کا جاننا ہے جن کے ذریعے سے رواۃ اور روایات کے احوال پہنچانے اور پرکھے جاسکیں۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ''علم اصول حدیث'' کی تعریف اپنے الفیہ میں اس طرح بیان کی ہے:

"علم الحديث ذو قوانين تحد يدرى بها احوال متن وسند"

یعنی علم (اصول) حدیث ان چند قوانین کا نام ہے جن سے حدیث کی سند اور متن کے احوال معلوم ہوں۔

علم اصول حدیث کی غایت:

اس علم کی غایت یہ ہے کہ حدیث کے احوال معلوم کر کے حدیث مقبول پر عمل کیا جائے اور غیر مقبول سے بچا جائے۔

علم فقہ حدیث کی تعریف:

علم فقہ حدیث وہ علم ہے جس میں حدیث سے احکام ومسائل کا استنباط کیا جاتا ہے۔

فائدہ: بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ "علم درایت حدیث" کو "علم مصطلح الحدیث"، "اصول حدیث" اور "علوم الحدیث" بھی کہا جاتا ہے۔

صاحب منہل رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

"علم درایت حدیث اور علم اصول حدیث دونوں ایک ہی ہیں۔ علم روایت حدیث کا موضوع "الروایات المرویات من حیث الاتصال والانقطاع" (یعنی آپ ﷺ کی احادیث سند کے اتصال وانقطاع وغیرہ اوصاف وکیفیات سند کے لحاظ سے) ہے۔"

﴿ دوسری بحث: وجہ تسمیہ ﴾

حدیث کی وجہ تسمیہ:

یعنی "حدیث" کو "حدیث" کیوں کہتے ہیں؟ "حدیث" کی وجہ تسمیہ کے بارے میں متعدد اقوال ہیں:

امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"و اما الحديث فاصله ضد القديم، وقد استعمل في قليل الخير و كثيره لانه يحدث شيئا فشيئا"

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے دو وجوہ تسمیہ ذکر فرمائی ہیں جن کا حاصل یہ ہے:

① "حدیث" کے معنی "حادث" کے آتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات کے اعتبار سے "قدیم" ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کا کلام (قرآن کریم) بھی "قدیم" ہے، اس کے بالمقابل رسول اللہ ﷺ کی ذات "حادث" ہے، اس لئے آپ ﷺ کا کلام بھی "حادث" ہے، اس لئے نبی کریم ﷺ کے کلام کو "حدیث" (بمعنی حادث) کہا جاتا ہے۔

② "حدیث" کہتے ہیں "بات" کو، اور "حدیث" چونکہ حضور ﷺ کی بات ہوتی ہے اس لئے اس کو "حدیث" کہا جاتا ہے۔

ایک اشکال: اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ "حدیث" میں صرف باتیں کہاں ہیں، اس میں تو آپ ﷺ کے احوال وافعال بھی داخل ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے احوال وافعال کو بطور تغلیب "احادیث" کہا جاتا ہے۔

﴿تیسری بحث: علم حدیث کا موضوع﴾

اس سلسلہ میں علماء کے متعدد اقوال ہیں:

① بعض علماء فرماتے ہیں کہ علم حدیث کا موضوع آپ ﷺ کے اقوال افعال اور احوال ہیں۔

② بعض کا کہنا ہے کہ علم حدیث کا موضوع سند اور متن ہے۔

③ علامہ کرمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: علم حدیث کا موضوع رسول اللہ ﷺ کی ذات بحیثیت رسول اللہ (ﷺ) ہے۔

امام سیوطی رحمہ اللہ کے ان دو اشعار میں علم اصول حدیث کی تعریف، موضوع اور غرض و غایت تینوں چیزوں آ گئی ہیں:

علم الحدیث ذو قوانین تحد　　　یدری بها احوال متن وسند

فذانك الموضوع و المقصود　　　ان یعرف المقبول و المردود

یعنی علم اصول حدیث ان چند قوانین کا نام ہے جن سے حدیث کی سند اور متن کے احوال معلوم ہوں اور یہی دو چیزیں یعنی متن اور سند اس علم کا موضوع ہیں، اور اس فن کی غرض یہ ہے کہ مقبول اور مردود روایات کی معرفت حاصل ہو جائے۔

محقق بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات بحیثیت رسول اللہ علم حدیث کا موضوع ہے۔ آپ ﷺ کے اقوال وافعال علم روایت حدیث کا موضوع ہیں اور سند و متن علم درایت حدیث کا موضوع ہیں۔

واضح رہے کہ ذات رسول میں دو چیزیں ہیں: ایک وصف انسانیت اور ایک وصف رسالت۔ ذات رسول وصف رسالت کے اعتبار سے علم حدیث کا موضوع ہے نہ کہ وصف انسانیت اور بدن کے اعتبار سے۔ انسان و بدن انسان صحت و مرض کے لحاظ سے ''علم طب'' کا موضوع ہے۔ یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔

﴿چوتھی بحث: غرض و غایت﴾

''غرض'' کہتے ہیں: ''ما لاجله الفعل'' کو، یعنی اس نتیجہ و شے کو کہتے ہیں جس کو حاصل کرنے کیلئے کوئی کام کیا جائے۔

''غایت'' وہ نتیجہ ہے جو غرض پر مرتب ہو۔ مثلاً بازار جا کر کوئی چیز خریدنا۔ لہٰذا بازار کسی چیز کی خریداری کیلئے جانا تو غرض ہے اور اس شیء کی خریداری غایت ہے۔ پس غرض و غایت مصداق کے اعتبار سے ایک ہیں، صرف ابتداء اور انتہا کا فرق ہے۔

اگر وہ مرتب ہونے والی شی آدمی کے منشا و مقصود کے مطابق ہے تو وہ غرض بھی ہے اور غایت بھی، اور اگر مرتب منشا کے خلاف ہے تو اس کو غایت یعنی نتیجہ تو کہا جائے گا لیکن غرض نہیں کہیں گے، لہٰذا غرض ''خاص'' اور غایت ''عام'' ہوئی، جیسے تاجر تحصیل نفع کیلئے تجارت کرتا ہے پھر اس تجارت پر کبھی نفع مرتب ہوتا ہے اور کبھی نقصان، تو اس نقصان کو ''غایت'' تو کہیں گے لیکن ''غرض'' نہیں کہہ سکتے۔

علم حدیث کی غرض وغایت:

تمام علوم دینیہ کی غرض وغایت اجمالی طور پر ''فوز فی الدارین'' ہے۔ چنانچہ علم حدیث کی غرض وغایت بھی واضح ہے۔

علم حدیث کی خاص غرض وغایت کیا ہے؟ تو اس کے بارے میں اہل علم کی عبارات مختلف ہیں۔ چند آراء حسب ذیل ہیں:

① علم حدیث کی غرض ان دعاؤں، بشارتوں اور فضائل کا مصداق بننا ہے جو حدیث شریف پڑھنے پڑھانے والوں کے لئے احادیث میں وارد ہوئے ہیں۔

ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''نضر اللہ امرأ سمع مقالتی فوعاھا واداھا فرب حامل فقه غير فقيه ورب حامل فقه الی من ھو ا فقه منه''

''اللہ تعالیٰ تروتازہ خوشحال اور سرسبز وشاداب رکھے اس شخص کو جو میری بات کو سنے اور پھر اس کو محفوظ رکھے اور دوسروں تک پہنچائے۔''

ابوداؤد شریف میں یہی مضمون حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی حدیث مرفوع میں وارد ہے۔

اس حدیث کے ذیل میں علماء نے لکھا ہے:

''جو شخص حقیقی معنی میں طالب حدیث ہوتا ہے اس کے چہرے پر رونق اور تروتازگی کے آثار ہوتے ہیں۔''

اور اگر کسی طالب حدیث میں یہ صفت نہ پائی جاتی ہو تو اس کو اس کی طلب کی کمی پر محمول کیا جائے گا یا یہ کہ اس کی طلب طلب صادق نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اللھم ارحم خلفائی'' ''اے اللہ! میرے خلفاء کے ساتھ رحم کا معاملہ فرما۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: ''یا رسول اللہ ! ومن خلفائك؟'' ''اے اللہ کے رسول! آپ کے خلفاء کون ہیں؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الذین یروون احادیثی ویعلمونھا الناس

''(میرے خلفاء وہ لوگ ہیں) جو میری احادیث کو روایت کرتے ہیں اور لوگوں کو ان کی تعلیم دیتے ہیں۔''

اس حدیث پاک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علم حدیث سے شغف رکھنے والوں کو اپنا نائب اور خلیفہ قرار دیا ہے۔ اور اس کے علاوہ دعائے رحمت فرما رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا فضیلت وسعادت کی بات ہوگی۔

② اس علم کی غرض وغایت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قیامت میں زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرنا ہے۔ وہ اس طرح کہ علم حدیث میں ایک امتیازی خصوصیت یہ کہ اس میں کثرت سے درود پڑھنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے، ہر حدیث میں ایک دو جگہ کم از کم ضرور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی مع درود کے آتا ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب روحانی کا سبب ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث کافی ہے جو امام ترمذی رحمہ اللہ نے نقل فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا:

" اولى الناس بى يوم القيامة اكثر هم على صلاة "

''تمام لوگوں میں سب سے زیادہ میرے قریب قیامت کے روز وہ شخص ہوگا جو سب سے زیادہ مجھ پر درود پڑھتا ہوگا۔''

یعنی قیامت میں حضور اقدس ﷺ کا قرب ان لوگوں کو زیادہ نصیب ہوگا جو آپ ﷺ پر زیادہ درود بھیجنے والے ہونگے، ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کا تقرب الی اللہ کا سبب ہے۔ لہذا کہا جا سکتا ہے کہ اس علم کی غرض وغایت حضور اکرم ﷺ کا قیامت میں زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرنا ہے۔

۳ اس علم کی غرض وغایت فہم قرآن اور عمل بالقرآن ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دین اور شریعت کا مدار قرآن پاک پر ہے اور قرآن پاک میں اصول بیان کئے گئے ہیں جزیات کی تفصیل اور تشریح اس میں نہیں ہے۔ حدیث پاک قرآن کریم اور اس کے مجملات کی تشریح ہے۔ لہذا احدیث پاک کے بغیر نہ صحیح معنی میں فہم قرآن حاصل ہو سکتا ہے اور نہ اس پر صحیح عمل ممکن ہے۔

۴ اس علم کی غرض وغایت آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے کلام سے لطف اندوز ہونا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہم سب مسلمانوں کو حضور ﷺ سے محبت ہے اور ہر شخص آپ ﷺ کی محبت کا دعویدار ہے تو حضور ﷺ ہمارے محبوب ہوئے اور محبّ کو محبوب کی ہر ادا اور اس کی ہر بات پسند ہوتی ہے یہ احادیث طیبہ آپ ﷺ ہی کے الفاظ اور آپ ﷺ کی باتیں ہیں پس آپ ﷺ کی محبت حدیث پاک پڑھنے پڑھانے کو مقتضی ہے۔

۵ علم حدیث پڑھنے کی غرض ''معرفة كيفية الاقتداء بالنبی ﷺ'' ہے، یعنی نبی کریم ﷺ کا اتباع اور آپ ﷺ کے نقش قدم پر کیسے چلا جائے، اس کا طریقہ معلوم ہو اس لئے ہم حدیث پڑھتے ہیں۔ یہ غرض صاحب مشکواۃ رحمہ اللہ کے کلام سے جو خطبہ مشکواۃ میں ہے مستفاد ہوتی ہے۔ صاحب مشکوٰۃ مقدمہ میں لکھتے ہیں:

'' اما بعد، فان التمسك بهديه لايستتب الا باقتفاء لما صدر من مشكوته "

اسی مضمون کو صاحب'' مفتاح السعادۃ'' نے اس طرح لکھا ہے:'' التحلی بالآداب النبوية والتوقى عما يكرهه وينهاه''، یعنی حضور ﷺ کے اخلاق واوصاف کے ساتھ اپنے آپ کو آراستہ کرنا اور جو چیزیں آپ ﷺ کو ناپسند تھیں ان سے بچنا۔

۶ صاحب منہل رحمہ اللہ نے غرض یہ بیان کی ہے:'' الاحترازعن الخطا فی الانتساب الى النبی ﷺ'' یعنی حضور ﷺ کی طرف کسی چیز کے غلط انتساب ہونے سے محفوظ ہونا۔ اس لئے کہ یہ بات کہ فلاں بات حضور ﷺ نے ارشاد فرمائی ہے یا نہیں؟ اس کو اچھی طرح محدثین ہی سمجھ سکتے ہیں۔ حدیث وغیر حدیث، کلام رسول اور کلام غیر رسول میں امتیاز

وہی حضرات کر سکتے ہیں جو فن حدیث سے واقف ہوں۔

فائدہ: ان بیان کردہ اغراض میں کوئی تضاد و تباین نہیں ہے، چونکہ علم حدیث کے فوائد بے شمار ہیں چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ یہ سب چیزیں حدیث پاک میں مشغول ہونے کے فوائد و ثمرات ہیں، جو انسان کی حسب حیثیت و صلاحیت اس کے اندر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ایک شئے کے بہت سے فوائد اور منافع ہو سکتے ہیں۔

تنبیہ: طالب حدیث کو اپنے فضائل سن کر مغرور اور اپنے بارے میں زیادہ خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے بلکہ اپنے اندر تواضع کی صفت پیدا کرنی چاہئے۔

﴿ پانچویں بحث: اجناسِ علوم ﴾

''رؤوس ثمانیہ'' میں یہ بحث بھی شامل ہے کہ یہ علم کس جنس سے تعلق رکھتا ہے۔ علماء نے اجناس علوم کے سلسلہ میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ اجناس علوم کے سلسلہ میں سب سے جامع کتاب محدث مولانا محمد اعلیٰ تھانوی رحمہ اللہ کی ''کشاف اصلاحات الفنون'' ہے۔ اس فن میں سب سے جامع کتاب یہی ہے۔ اس میں اجناس کے ساتھ کتابوں کا بھی ذکر ہے۔ اس فن میں امام اہل حدیث نواب صدیق حسن خان صاحب بھوپالی رحمہ اللہ نے بھی ایک عظیم کتاب لکھی ہے جو ''ابجد العلوم'' کے نام سے معروف ہے۔ اس سلسلہ کی کتب میں ایک نام ''کشف الظنون'' کا بھی ہے۔ اس میں اصل تذکرہ تو کتابوں کا ہے مگر تبعاً اجناس پر بھی بحث کی گئی ہے۔

اجناس العلوم میں بھی کئی طرح کی تقسیمات بیان کی گئی ہیں:

پہلی تقسیم: علم کی ایک تقسیم باعتبار عقلیت و نقلیات کے ہے کہ یہ عقلی ہے یا نقلی۔

اس معنی کے اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ علوم کی اولاً دو قسمیں ہیں: ① علوم نقلیہ ② علوم عقلیہ

پھر علوم نقلیہ کی دو قسمیں ہیں۔ وہ دو قسمیں کیا ہیں؟

بعض نے کہا کہ وہ دو قسمیں ''عالیہ'' اور ''آلیہ'' ہیں۔ بعض نے کہا کہ وہ دو قسمیں ''شرعیہ'' اور ''غیر شرعیہ'' ہیں۔

پھر علوم نقلیہ شرعیہ کی دو قسمیں ہیں۔ (ان کا بیان عنقریب آرہا ہے۔)

❀ تفسیر، حدیث و فقہ یہ علوم نقلیہ عالیہ مقصودہ شرعیہ میں داخل ہیں۔ علوم کی یہ قسم اشرف ترین ہے۔ علم حدیث اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

❀ علوم عربیت مثل نحو، صرف، ادب، معانی و بیان اور لغت علوم نقلیہ آلیہ غیر مقصودہ غیر شرعیہ ہیں، ان کا شمار وسائل میں ہوتا ہے، چونکہ یہ علوم قرآن و حدیث سمجھنے کیلئے آلہ ہیں۔

❀ حکمت و فلسفہ، منطق، رمل، جعفر و نجوم وغیرہ علوم عقلیہ ہیں۔

بعض اہل علم نے علوم عقلیہ کی بھی دو قسمیں بیان کی ہیں: ① آلیہ ② غیر عالیہ۔ان کے نزدیک فلسفہ، رمل، جعفر و نجوم علوم عالیہ عقلیہ ہیں اوران کا شمار وسائل میں ہے۔اور منطق علوم آلیہ عقلیہ میں سے ہے۔

دوسری تقسیم: علم کی ایک تقسیم باعتبار فرعیات واصلیات کے ہے۔

اس اعتبار سے علوم عالیہ کی دو قسمیں ہیں: ① علوم اصلیہ ② علوم فرعیہ

کتاب اللہ اوراحادیث ''علوم اصلیہ'' میں شامل ہیں اور فقہ ''علوم فرعیہ'' میں داخل ہے۔

تیسری تقسیم: علم کی ایک تقسیم باعتبار شرعی غیر شرعی ہونے کے ہے۔اس اعتبار سے علوم حدیث علم شرعی ہے۔

﴿چھٹی بحث علم حدیث کی فضیلت و مرتبہ﴾

علم حدیث کا مرتبہ دو اعتبار سے ہے:

① باعتبار فضیلت کے۔ ② باعتبار تعلیم کے۔

فضیلت کے اعتبار سے تو یہ دوسرے مرتبہ میں ہے کیونکہ اول مرتبہ پر قرآن کریم ہے۔چنانچہ ''علم حدیث'' کی شرافت و فضیلت کسی طویل بیان کی محتاج نہیں ہے۔قرآن وحدیث کی بے شمار نصوص اس علم کی فضیلت ثابت کرتی ہیں۔اس موضوع سے متعلق حافظ ابن عبدالبر اندلسی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''جامع بیان العلم وفضلہ'' اپنے موضوع پر انتہائی مفید ہے۔اس علم کی فضیلت کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ اس کی بدولت بکثرت درود شریف پڑھنے کا موقع ملتا ہے جس کے بے شمار فضائل ہیں۔

بعض علماء کے نزدیک تو فضیلت کے اعتبار سے علم حدیث افضل العلوم الشرعیہ ہے۔امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''لا اعلم علمًا افضل من علم الحديث''

علوم شرعیہ پانچ ہیں: ① علم عقائد ② علم تفسیر ③ علم حدیث ④ علم فقہ ⑤ علم اصول فقہ

اور بعض علماء نے ''علم تصوف'' کو مستقل شمار کر کے علوم دینیہ پانچ کے بجائے چھ قرار دیئے ہیں۔شرح عقائد کی مشہور شرح ''شرح النبر اس'' کے مصنف نے ایسا ہی کیا ہے۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ ''تدریب الراوی'' میں علم حدیث کی شرافت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''تمام علوم شرعیہ کیلئے یہ علم وسیلہ ہے۔فقہ کا محتاج ہونا تو ظاہر ہے (کہ زیادہ تر فقہی مسائل حدیث اور پھر دوسرے درجہ میں قیاس ہی سے ثابت ہیں) اور تفسیر کی احتیاج اس علم کی طرف ایسے ہے کہ (مفسرین نے تصریح فرمائی ہے)'' اولى ما فسر به كلام الله تعالى ما ثبت عن نبيه صلی اللہ علیہ وسلم '' کہ بہترین تفسیر وہ ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔'' اور یہ معرفت حدیث پر موقوف ہے۔

باعتبار تعلیم کے اس کا مرتبہ سب علوم سے آخر میں ہے، جیسا کہ ہم سب دیکھتے ہیں کہ ہمارے مدارس عربیہ میں دورہ حدیث شریف کو جملہ درجات کے آخر میں رکھا گیا ہے، ابتدائی درجات میں سب سے پہلے صرف، نحو اور دوسرے علوم کی تعلیم دی جاتی ہے، اس لئے کہ ہم عجمیوں کیلئے ان علوم کے بغیر حدیث کا سمجھنا مشکل ہے کیونکہ یہ سب علوم آلیہ ہیں اور ''آلہ'' مقدم ہوا کرتا ہے اور اصل مقصد مؤخر ہوا کرتا ہے۔

﴿ساتویں بحث: تقسیم کتب حدیث اور تدوین حدیث﴾

علم حدیث انتہائی مخدوم علم ہے۔ اس علم میں مختلف حیثیتوں سے کتابیں لکھی گئی ہیں، چنانچہ کتب حدیث کی اپنے موضوع اور ترتیب کے لحاظ سے بہت سی اقسام ہیں جن میں سے ہر قسم کا ایک خاص اصطلاحی نام ہے، حدیث کے طالب علم کو کتب کی طرف مراجعت کیلئے ان اقسام کو بھی تفصیل سے سمجھ لینا چاہئے۔ کتب حدیث کی متعدد قسمیں ہیں:

① الجوامع	② المسانید	③ المعاجم	④ الاجزاء
⑤ الرسائل	⑥ الاربعینات	⑦ کتاب العقائد	⑧ کتاب الاحکام
⑨ کتاب التاریخ	⑩ کتاب الزہد	⑪ کتاب الآداب	⑫ کتاب الفتن
⑬ مشیخہ	⑭ افراد وغرائب	⑮ کتاب العلل	⑯ الاطراف
⑰ کتب الغریب الحدیث	⑱ کتب مشکل الحدیث	⑲ اسباب حدیث	⑳ الترتیب
㉑ الزوائد	㉒ الامالی	㉓ التجرید	㉔ التخریج
㉕ المستدرکات	㉖ السنن	㉗ المستخرجات	㉘ الموضوعات
㉙ التراجم	㉚ الثلاثیات	㉛ کتب احادیث مشتہرہ	㉜ شروح الحدیث
㉝ الاذکار	㉞ ترغیب وترہیب	㉟ المصاحف	㊱ المسلسلات
㊲ کتب الجمع	㊳ کتاب المناقب	㊴ الفہارس	㊵ الوحدان
㊶ تعالیق	㊷ تراجم		

① جوامع: یہ ''جامع'' کی جمع ہے۔

فائدہ: جس طرح کتاب کی تقسیم وتبویب ہوتی ہے اسی طرح تقسیم وتبویب علم کی بھی ہوتی ہے۔ علم حدیث کے مضامین ''ابواب ثمانیہ'' میں منحصر ہیں۔ یعنی کتب حدیث میں آٹھ قسم کے مضامین بیان کئے جاتے ہیں، جس حدیث کو بھی آپ دیکھیں گے

اس کا مضمون ان ''ابواب ثمانیہ'' سے خارج نہیں ہوگا بلکہ ان ہی میں سے کوئی مضمون اس میں پایا جائے گا۔ وہ ابواب ثمانیہ یہ ہیں:

سیر، آداب، تفسیر وعقائد فتن، احکام، اشراط ومناقب

چنانچہ جوامع کی (ایک مشہور) تعریف یہ ہے:

''جوامع'' ان کتب حدیث کو کہتے ہیں جن میں مندرجہ بالا آٹھ مضامین کی احادیث پائی جائیں۔

''سیر'' سے مراد وہ مضامین ہیں جن کا تعلق حضور ﷺ کی حیات طیبہ از ولادت باسعادت تا وفات سے ہو۔

☆ سیر ''سیرۃ'' کی جمع ہے۔

''ادب'' سے مراد معاشرت سے متعلق احادیث ہیں۔

''تفسیر'' سے مراد وہ روایات ہیں جو تفسیر قرآن کریم سے تعلق رکھتی ہیں۔

''عقائد'' سے مراد وہ روایات ومضامین ہیں جن کا تعلق ایمانیات یعنی عقائد سے ہو۔

''فتن'' میں وہ احادیث بیان کی جاتی ہیں جن میں حضور اکرم ﷺ نے امت میں پیش آنے والے فتنوں کی نشاندہی اور پیشینگوئی فرمائی ہے۔

☆ فتن یہ ''فتنۃ'' کی جمع ہے۔

''احکام'' سے مراد وہ احادیث ہیں جو احکام فقہیہ کے متعلق ہیں۔

''اشراط'' میں علامات قیامت کی احادیث بیان کی جاتی ہیں۔

''مناقب'' میں آپ ﷺ کے آل وصحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مختلف قبائل وطبقات کے مناقب کا ذکر ہوتا ہے۔

☆ مناقب یہ ''منقبۃ'' کی جمع ہے۔

فوائد شتی: ❶ چند مشہور جوامع یہ ہیں:

① امام بخاری کی ''الجامع الصحیح'' ② امام مسلم کی جامع ③ امام ترمذی کی جامع ترمذی

④ جامع ابن عیینہ ⑤ جامع عبدالرزاق ⑥ جامع ثوری

❷ صحیح بخاری وسنن ترمذی بالاتفاق ''جامع'' ہیں۔ صحیح مسلم کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک وہ ''جامع'' نہیں ہے مگر صحیح یہ ہے کہ صحیح مسلم بھی ''جامع'' ہے، چونکہ ''ابواب ثمانیہ'' پر مشتمل ہے۔ صاحب ''کشف الظنون'' اور صاحب ''قاموس'' نے بھی مسلم کو ''جامع'' قرار دیا ہے۔ سنن ابوداؤد ''جامع'' نہیں ہے چونکہ اس میں تمام ابواب ثمانیہ نہیں

ہیں گو اکثر مضامین ہیں، اس میں تفسیر، تاریخ، مغازی ورقاق کے ابواب نہیں ہیں۔

❸ بعض حضرات اہل علم نے ابواب ثمانیہ میں ''اشراط'' کی بجائے ''رقاق'' کا ذکر کیا ہے۔

احادیث رقاق کو ''علم سلوک وزہد'' کہا جاتا ہے۔ اس موضوع پر حضرت امام احمد بن حنبل اور عبداللہ بن مبارک محدثین کی ''کتاب الزہد'' مشہور ہے جامع ترمذی میں بھی زہد کی روایات کا کافی طویل باب موجود ہے۔

❹ حضرات محدثین نے ابواب ثمانیہ میں سے ہر مضمون پر الگ الگ مستقل تصنیفات بھی کی ہیں۔ مثلاً:

''سیر'' کے موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں چند ایک یہ ہیں:

① زاد المعاد فی ھدی خیر العباد ② حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی سیرت ابن اسحاق

③ سیرت ابن ہشام ④ قسطلانی رحمہ اللہ کی ''مواہب لدنیہ''

⑤ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کی ''مدارج النبوۃ'' ⑥ مجدالدین فیروز آبادی صاحب قاموس کی ''سفر السعادۃ''

⑦ ''سفر السعادۃ'' کی شرح جو شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ''شرح سفر السعادۃ'' کے نام سے لکھی ہے۔

احادیث تواریخ وسیر کے ایک حصہ کا تعلق آسمان، زمین، ملائکہ، انبیاء سابقین وامم سابقہ، جنات وشیاطین اور دیگر حیوانات کی تخلیق سے ہے۔ اس حصے کا نام محدثین کی اصطلاح میں ''بدء الخلق'' ہے، صحیح بخاری میں بھی ایک کتاب اسی عنوان سے موجود ہے۔

''تفسیر'' کے موضوع پر حدیث کی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جیسے:

① تفسیر ابن مردویہ ② تفسیر ابن جریر ③ تفسیر ابن ماجہ ④ تفسیر ابن کثیر ۴) الدر المنثور

''فتن'' پر ایک طویل اور قدیم تصنیف نعیم بن حماد رحمہ اللہ کی ہے۔

''اشراط'' (یعنی علامات قیامت) کے موضوع پر کئی کتب لکھی گئی ہیں، جیسے:

①: سید شریف محمد البرزنجی رحمہ اللہ کی کتاب '' الاشاعة لاشراط الساعة ''

② شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ کی اردو کتاب ''علامات قیامت''

③ نواب صدیق حسن خان بھوپالی رحمہ اللہ کی کتاب '' الاذاعة ''

''مناقب'' کے بارے میں بھی بہت سی تصانیف ہیں:

① القول الصواب فی مناقب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ② القول الجلی فی مناقب امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ

③ مناقب قریش ④ مناقب انصار رضی اللہ عنہم ⑤ مناقب عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم

مناقب علی رضی اللہ عنہ (اس رسالہ پر امام نسائی رحمہ اللہ کی شدید مخالفت کی گئی تھی جس کا واقعہ مشہور ہے۔)

② مسانید: ان کتب حدیث کو "مسانید" کہا جاتا ہے جن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ترتیب کے مطابق روایات ذکر کی جاتی ہیں۔

☆ "مسانید" مسند کی جمع کے طور پر مستعمل ہے۔

صحابہ کرام کی رضی اللہ عنہم ترتیب مختلف اعتبارات سے ہوسکتی ہے:

❶ حروف تہجی کے اعتبار سے۔ایسی کتب میں سرخی میں صحابی کا نام لکھا جاتا ہے۔مثلاً مسند انس بن مالک رضی اللہ عنہ۔

❷ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ترتیب تقدم فی الاسلام کے اعتبار سے۔

❸ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ترتیب مراتب و درجات کے اعتبار سے۔اس صورت میں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی روایات کو مقدم کیا جاتا ہے۔مسند احمد اور مسند ابوداؤد الطیالسی یہ دونوں کتب مراتب صحابہ کے اعتبار سے ہیں۔

☆ کبھی مسند میں صرف ایک صحابی روایات جمع کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔مثلاً مسند ابی بکر رضی اللہ عنہ

☆ کبھی احادیث مرفوعہ کی کتاب پر بھی "مسند" کا اطلاق کردیا جاتا ہے۔جیسے مسند بقی بن مخلد اندلسی

امام بخاری رحمہ اللہ کے اکثر اساتذہ نے مسانید ترتیب دی ہیں۔

چند مشہور مسانید یہ ہیں:

① مسند ابی داؤد الطیالسی (متوفی ۲۰۴ھ) ② مسند حمیدی (متوفی ۲۱۹ھ)

③ مسند ابویعلی ④ مسند احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ)

⑤ مسند ابن ابی شیبہ ⑥ مسند عبد بن حمید (متوفی ۲۲۹ھ)

③ معاجم: یہ "معجم" کی جمع کے طور پر مستعمل ہے۔

"معاجم" ان کتب احادیث کو کہا جاتا ہے جن کی تصنیف میں حروف تہجی کی رعایت رکھتے ہوئے راویان حدیث کی روایات کو جمع کیا گیا ہو۔اس کی ترتیب میں خواہ صحابہ کی ترتیب کا اعتبار کیا گیا ہو،خواہ مشائخ کی ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہو،خواہ شیوخ کے علم و فضل کا اعتبار گیا ہو۔اس موضوع پر بھی کافی کتب لکھی گئی ہیں۔اس سلسلہ میں امام طبرانی رحمہ اللہ (متوفی ۳۶۰ھ) کی معاجم ثلاثہ بہت مشہور ہیں۔ان کی کتاب "المعجم الکبیر" کی ترتیب اسمائے صحابہ کے اعتبار سے ہے اور "المعجم الاوسط" اور "المعجم الصغیر" کی ترتیب شیوخ کے اعتبار سے ہے۔

④ الجزء :اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں کسی ایک جزوی مسئلہ سے متعلق تمام احادیث یکجا کردی گئی ہوں۔

جیسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا ''جزء رفع الیدین'' اور ''جزء القراءۃ خلف الامام'' مشہور ہے۔

⑤ الرسالہ: وہ کتاب حدیث جس میں کسی ایک شیخ کی روایات جمع کی گئی ہوں۔

صحیح یہ ہے کہ رسالہ کوئی مستقل نوع نہیں ہے، بلکہ ''الجزء'' کا مترادف ہے۔ متقدمین جس کو ''الجزء'' سے تعبیر کرتے تھے متاخرین نے اس کو ''الرسالۃ'' سے تعبیر کیا ہے۔

⑥ اربعینات: حدیث کی ان کتابوں کو کہا جاتا ہے جن میں (کسی ایک باب ومسئلہ سے متعلق یا چند ابواب ومسائل سے متعلق) چالیس حدیثیں لکھی گئی ہوں (خواہ وہ سب ایک سند سے مروی ہوں یا متعدد اسانید سے)۔

☆ اربعینات ''اربعین'' کی جمع ہے۔ اس کو ہمارے ہاں ''چہل حدیث'' کہتے ہیں۔

اس تصنیف کا سلسلہ اس حدیث کی بناء پر قائم ہوا ہے جس کو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب شعب الایمان میں روایت کیا ہے:

" من حفظ علی امتی اربعین حدیثا فی امر دینها بعثه الله فقیها و کنت له یوم القیامة شافعا و شهیدا "

''جو شخص میری امت کیلئے چالیس حدیثوں کو محفوظ کرلے وہ قیامت کے دن علماء کے زمرہ میں ہوگا۔''

یہ حدیث تمام طرق کے اعتبار سے اگرچہ ضعیف ہے لیکن حضرات محدثین نے اس مختصر سے عمل پر اتنا بڑا ثواب اور فضیلت حاصل کرنے کی حرص میں اربعینات تصنیف کی ہیں۔ علماء فرماتے ہیں کہ کوئی محدث ایسا نہیں جس نے چہل احادیث نہ لکھی ہوں۔ اربعینات کے لکھنے والوں نے مختلف انداز اختیار کئے ہیں۔ مثلاً حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اربعین میں تمام احادیث صحیحین سے اس طرح لی ہیں کہ جن میں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی سند امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے عالی ہے۔

چہل حدیث لکھنے والے چند محدثین کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

① حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ② امام نووی رحمۃ اللہ علیہ ③ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

⑦ کتاب العقائد: کتب حدیث کی وہ قسم جس میں عقائد کی روایتیں ذکر کی جاتی ہیں۔ جیسے:

① امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الاسماء والصفات، اس کتاب میں امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث عقائد کو جمع کیا ہے۔

② ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب التوحید

③ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب خلق افعال العباد

⑧ کتاب الاحکام: یہ وہ کتب ہیں جن میں فقہی مسائل سے متعلق روایات ذکر کی جاتی ہیں۔

جیسے: ① صحاح ستہ ② احکام صغریٰ ③ احکام کبریٰ ④ عمدۃ الاحکام

⑨ کتاب التاریخ: یہ کتب حدیث کی وہ قسم ہے جس میں تاریخی مواد سے متعلق روایات کو درج کیا جاتا ہے۔

جیسے: ① بدء المخلوقات ② سیرت ابن ہشام ③ مغازی محمد بن اسحاق

⑩ کتاب الزہد: یہ کتب حدیث کی وہ قسم ہے جس میں ایسے مضامین کی روایات کو درج کیا جاتا ہے جن سے قلب میں رقت پیدا ہوتی ہے اور فکر آخرت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔

⑪ کتاب الآداب: کھانے پینے، سونے جاگنے، چلنے پھرنے کے آداب سے تعلق روایتیں ذکر کی جائیں تو اس پر ''کتاب الآداب'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الادب المفرد"

⑫ کتاب الفتن: فتنوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی احادیث جن کتب میں درج کی جاتی ہیں ان کتب کو " کتاب الفتن" کہا جاتا ہے۔

⑬ مشیخہ: وہ کتابیں کہلاتی ہیں جن میں ایک یا چند شیوخ کی روایات جمع کی جائیں، خواہ وہ روایات کسی بھی مسئلے سے تعلق رکھتی ہوں۔

جیسے: ① مشیخة ابن البخاری ② مشیخة ابن القاری ③ مشیخة عبدالله بن حیدر قزوینی

☆ ''مشیخہ'' لفظ ''شیخ'' کی جمع ہے اور ''مشیخہ'' کی جمع ''مشیخات'' مستعمل ہے۔

⑭ الافراد والغرائب: ان کتب حدیث کو کہتے ہیں جس میں کسی ایک شخص کے تفردات کو جمع کیا گیا ہو۔

جیسے: ''کتاب الافراد للدارقطنی''

⑮ العلل: وہ کتب حدیث جن میں ایسی احادیث ذکر کی گئی ہوں جن کی سند پر کلام ہو۔

یہ فن ایک عظیم الشان اور انتہائی دقیق فن ہے۔ اس فن کی بنیاد اسباب وعلل خفیہ پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس فن پر ائمہ فن میں سے چند حضرات ہی نے قلم اٹھایا ہے۔ مثلاً ابن مدینی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام ابوحاتم، امام دارقطنی رحمہم اللہ

اس فن کے چند اہم ومشہور مصنفات یہ ہیں:

① امام ابن مدینی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۳۴ھ) کی ''کتاب العلل"

② امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۴۱ھ) کی '' العلل ومعرفة الرجال"

③ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی ''کتاب العلل"

④ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی ''کتاب العلل"

⑤ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۷۰ھ) کی ''علل صغیر'' جو ترمذی شریف کے آخر میں ملحق ہے۔

⑥ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی ''علل کبیر، یہ ایک مستقل کتاب ہے۔

⑦ خلال رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۱۱ھ) کی ''کتاب العلل''

⑧ امام بن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۲۷ھ) کی ''علل الحدیث''

⑨ امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۸۴ھ) کی ''العلل الواردة فی الاحادیث النبویة'' اس فن کی جامع ترین کتاب ہے۔

⑩ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کی ''العلل المتناهية فی الاحادیث الواهية'' بھی اس سلسلہ کی مشہور و معروف کتاب ہے۔

⑯ الاطراف: وہ کتب حدیث جن میں احادیث کے صرف اول و آخر الفاظ ذکر کیے گئے ہوں، جن سے پوری حدیث کو پہچانا جا سکے، اور آخر میں اس حدیث کا حوالہ ذکر کر دیا گیا ہو کہ فلاں فلاں کتب حدیث سے یہ حدیث لی گئی ہے۔

اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات ایک شخص کو کسی حدیث کے اول یا آخر الفاظ تو یاد ہوتے ہیں لیکن نہ پوری حدیث ذہن میں آتی ہے نہ اس کی اسنادی حیثیت کا علم ہوتا ہے، ایسے موقع پر اطراف کی کتب بے حد کام دیتی ہیں۔

اس موضوع پر چند مشہور کتب یہ ہیں:

① ''اطراف الصحیحین'' یہ حافظ ابراہیم بن محمد ابو مسعود دمشقی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ہے۔

② ''الاشراف علی معرفة الاطراف'' یہ علی بن حسین بن عساکر رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ہے جو سنن اربعہ سے متعلق ہے۔

③ ''تحفة الاشراف بمعرفة الاطراف'' یہ ابوالحجاج مزی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ہے جو صحاح ستہ سے متعلق ہے۔

⑰ غریب الحدیث: یعنی وہ کتابیں جن میں احادیث میں وارد ہونے والے کلمات کی لغوی و اصطلاحی تحقیق و تشریح کی گئی ہو۔

اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب امام نظر بن شمیل رحمۃ اللہ علیہ اور ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، ان کے بعد امام اصمعی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ابن قتیبہ دینوری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی قلم اٹھایا، اس موضوع پر منصۂ شہود پر آنے والی چند کتب کے نام حسب ذیل ہیں:

① علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''الفائق'' ② ابو عبید قاسم بن سلام رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''الغریب''

③ ابو عبید ہروی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''الغریبین'' ④ علامہ ابن الاثیر جزری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''النهاية''

۵) شیخ محمد طاہر پٹنی رحمۃ اللہ علیہ کی ''مجمع البحار'' (مؤخر الذکر دونوں کتب کی پانچ پانچ جلدیں ہیں۔)

⑱ مشکل الحدیث: اس نوع کو ''شرح الآثار''، ''علم تاویل الحدیث'' اور ''مختلف الحدیث'' بھی کہتے ہیں۔ ان کتب کا موضوع وہ روایات ہیں جو بظاہر متعارض ہیں۔ ان کتب میں متعارض احادیث کی تطبیق اور مشکل المراد احادیث کے محمل کی تعیین کی گئی ہے، ان میں کوئی خاص ترتیب نہیں ہوتی، بلکہ مؤلف کیف ما اتفق احادیث کو ذکر کر کے ان کی تشریح کرتا ہے۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جس کو علم حدیث و فقہ اور اصول تینوں پر مہارت تامہ ہو۔ اس نوع کی بعض کتب یہ ہیں:

① امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی ''اختلاف الحدیث'' ② ابن قتیبہ دینوری رحمۃ اللہ علیہ کی ''تاویل مختلف الحدیث''

۞ امام طحاوی رحمہ اللہ کی "شرح معانی الآثار" ۞ امام طحاوی رحمہ اللہ کی ایک اور کتاب "مشکل الآثار"

⑲ اسباب الحدیث: حدیث میں ان کی وہی حیثیت ہے جو تفسیر میں اسباب النزول کی ہے، یعنی اس میں قولی حدیث کا سبب ورود بیان کیا جاتا ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کونسا ارشاد کن حالات میں فرمایا۔

اس نوع میں بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں، اس میں سب پہلی تصنیف امام ابوالحفص العکبری رحمہ اللہ کی ہے، ان کے بعد حامد بن کرزنی (رحمہ اللہ) اور امام سیوطی (رحمہ اللہ) نے بھی اس پر قلم اٹھایا۔

⑳ الترتیب: یعنی وہ کتاب جس میں کسی دوسری غیر مرتب کتاب کی احادیث کو کسی خاص ترتیب سے جمع کر دیا گیا ہو۔

مثلاً امام ابن کثیر رحمہ اللہ کی " ترتیب مسند احمد "اسی طرح ابن مجیب رحمہ اللہ نے بھی مسند احمد کو حروف کے اعتبار ترتیب دیا ہے۔ آخری دور میں علامہ ابن الساعاتی رحمہ اللہ نے مسند احمد کو "الفتح الربانی" کے نام سے ابواب کی ترتیب پر مرتب کیا ہے۔

㉑ الزوائد: اس سے مراد وہ کتاب ہے جس میں کسی دوسری کتاب کی صرف وہ احادیث جمع کی گئی ہوں جو صحیحین میں موجود نہیں۔

مثلاً حافظ مغلطائی رحمہ اللہ کی کتاب" زوائد ابن حبان علی الصحیحین"

㉒ الامالی: پہلے زمانہ میں تدریس کا طریقہ یہ تھا کہ استاذ اپنی یاد کی ہوئی حدیثیں شاگردوں کو املا کراتا تھا، اسی طرح شاگرد کے پاس جو مجموعہ تیار ہوتا تھا اسے شیخ کی "امالی" کہتے تھے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی امالی مشہور ہیں۔ جب طباعت کا رواج عام ہو گیا تو احادیث کی تدریس کے لئے املاء کی ضرورت باقی نہ رہی۔

㉓ التجرید: کسی کتاب حدیث سے سند اور مکررات کو حذف کر کے صرف صحابی کا نام اور حدیث کا متن بیان کر دیا جائے تو وہ "التجرید" کہلاتی ہے۔ جیسے: تجرید البخاری للزبیدی ، تجرید مسلم للقرطبی ،تجرید الصحیحین وغیرہ

㉔ کتب تخریج: وہ کتب حدیث جن میں کسی دوسری کتاب کی معلق یا بے حوالہ حدیث کی سند اور اس کا حوالہ بیان کیا جائے۔ خواہ وہ کتاب تفسیر وفقہ میں ہو یا کسی دوسرے فن میں۔ مثلاً "ہدایہ" میں ساری حدیثیں بلا حوالہ ہیں، ان احادیث کی سند اور حوالہ تلاش کرنے کی غرض سے جو کتابیں لکھی گئی وہ ہدایہ کی تخریج کہلاتی ہیں۔

چند مشہور تخریجات یہ ہیں:

۞ امام زیلعی رحمہ اللہ کی "نصب الرایۃ فی تخرج احادیث الهدایۃ"۔ یہ "ہدایہ" کی احادیث کو جامع ہے۔

۞ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی "الدرایۃ فی تخریج احادیث الهدایۃ" یہ کتاب بھی "ہدایہ" کی احادیث کی تخریج ہے۔

۞ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی "التلخیص الحبیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر"

④ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی ''الکافی الشاف فی تخریج احادیث الکشاف '' اس میں تفسیر کی مشہور کتاب کشاف کی احادیث کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ تفسیر کشاف کے ساتھ مطبوع ہے۔

⑤ حافظ عبدالرحیم بن حسین عراقی رحمہ اللہ کی ''المغنی عن حمل الاسفار'' یہ امام غزالی رحمہ اللہ کی ''احیاء العلوم'' کی احادیث کی تخریج ہے۔

⑥ عبدالرؤف مناوی رحمہ اللہ کی ''الفتح السماوی بتخریج احادیث البیضاوی'' یہ تفسیر بیضاوی کی احادیث کی تخریج ہے۔

㉕ مستدرکات: ''مستدرکات'' ان کتب حدیث کو کہا جاتا ہے جن میں کسی مؤلف کی شرط کے مطابق ان چھوٹی ہوئی روایات کو ذکر کیا جائے جن کو مصنف نے عمداً چھوڑ دیا ہو یا وہ سہواً رہ گئی ہوں۔ جیسے: مستدرك حاكم على الشيخين۔

یہ حافظ وثقہ امام حاکم ابو عبداللہ نیسابوری رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔ جن صحیح حدیثوں کو امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ نے چھوڑ دیا ہے ان کو انہوں نے اپنی اس کتاب میں بیان کر کے اس کی تلافی کی ہے۔ ان کے علاوہ بعض وہ احادیث بھی بیان کی ہیں جو ان دونوں کی شرطوں یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کو مطابق ہیں اور کچھ ایسی احادیث بھی اس میں لائے ہیں جو شیخین کے علاوہ دیگر ائمہ کی شرائط پر ہیں۔ مستدرک حاکم میں تکرار کے ساتھ بیان کی ہوئی احادیث کی تعداد سات ہزار دو صد پچھتر (۷۲۷۵) ہے اور حذف تکرار کے بعد چار ہزار (۴۰۰۰) ہے۔ اس کتاب میں کچھ تساہل رہ گیا ہے جس پر لوگوں نے گرفت کی ہے۔

مشکوۃ شریف بھی اسی قبیل سے ہے بایں طور کہ یہ علامہ بغوی رحمہ اللہ کی ''مصابیح'' پر تخریج ہے اور ''فصل ثالث'' اس پر استدراک ہے۔

㉖ سنن: سنن ان کتب حدیث کو کہا جاتا ہے جن میں فقہی ابواب کی ترتیب کے موافق (یعنی كتاب الطهارة سے كتاب الفرائض تک) روایات ذکر کی جاتی ہیں۔ جیسے: سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ وغیرہ۔

☆ جامع ترمذی ''جامع'' بھی ہے اور سنن بھی، چونکہ اس میں مصنف رحمہ اللہ نے فقہی ابواب کا اہتمام کیا ہے۔

㉗ مستخرجات: ''مستخرجات'' ان کتب حدیث کو کہا جاتا ہے جن میں مصنف کسی سابق مصنف کی روایت کو اپنی سند سے نقل کرتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ سابق مؤلف کا واسطہ درمیان میں نہ آئے یہاں تک کہ سابق مصنف کے شیخ یا اس کے استاد یا اس سے اوپر کے کسی استاذ سے اپنی سند کو ملا دے۔ بہت سی کتب پر مستخرجات لکھی گئی ہیں۔ مثلاً:

① مستخرج اسماعیلی: یہ ابو بکر احمد بن ابراہیم اسماعیلی (رحمہ اللہ) کی کتاب ہے جو بخاری شریف پر ہے۔

۲ المسند الصحیح: یہ کتاب ابوبکر محمد بن محمد بن رجاء اسفرائینی (رحمۃ اللہ علیہ) کی ہے جو مسلم شریف پر ہے۔

۳ المسند الصحیح: یہ کتاب ابوعوانہ اسفرائینی (رحمۃ اللہ علیہ) کی ہے، یہ بھی مسلم شریف پر ہے۔

۴ المسند المخرج علی صحیح مسلم: یہ ابونعیم اصفہانی کی کتاب ہے یہ بھی مسلم شریف پر ہے۔

۵ الصحیح المستخرج علی صحیح مسلم: یہ کتاب قاسم بن اصبغ قرطبی نے لکھی ہے، یہ بھی مسلم شریف پر ہے۔

مستخرج کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے اصل کتاب کی احادیث کی تائید وتوثیق ہوتی ہے۔

۲۸ الموضوعات: یعنی وہ کتابیں جن میں احادیث موضوعہ کو جمع کر دیا گیا ہو یا متہم بالوضع احادیث کی تحقیق کی گئی ہو، شروع میں کتب موضوعہ اس انداز پر لکھی جاتی تھیں کہ ضعیف راویوں کا ذکر کیا جاتا تھا اور ان سے موضوع یا ضعیف احادیث مروی ہیں، ان کی نشاندہی کی جاتی تھی۔ حافظ ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ کی ''الکامل''، امام عقیلی رحمۃ اللہ علیہ کی ''الضعفاء'' اور امام جوزقانی رحمۃ اللہ علیہ کی ''الاباطیل'' اسی انداز پر ہیں۔

۲۹ التراجم: ان کتب حدیث کا کہتے ہیں جن میں ایک طریق سند کی تمام احادیث ایک باب میں یکجا کر دی گئی ہوں۔

مثلاً اس میں باب اس طرح قائم کیا جاتا ہے ''ذکر ما روی مالك عن نافع ابن عمر'' اور اس کے تحت وہ تمام احادیث نقل کی جاتی ہیں جو اس سند سے مروی ہیں، اسی نوع میں وہ کتابیں بھی داخل ہیں جو ''من روی عن ابیه عن جده'' کہلاتی ہیں۔

۳۰ الثلاثیات: یعنی وہ کتب حدیث جن میں صرف وہ احادیث ذکر کی گئی ہوں جو مصنف کو صرف تین واسطوں سے پہنچیں، یعنی جس کی سند میں مصنف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک تین واسطے ہوں، جیسے: ثلاثیات بخاری، ثلاثیات دارمی، ثلاثیات عبد بن حمید وغیرہ۔

۳۱ کتب الحدیث المشتہرۃ: یعنی وہ کتابیں جن میں ان احادیث کی تحقیق کی گئی ہو جو عام سے مشہور وزباں زد ہوتی ہیں، لیکن ان کی سند کا علم عام طور سے نہیں ہوتا۔ اس موضوع پر سب سے پہلے کتاب علامہ زرکشی رحمۃ اللہ علیہ نے ''التذکرة فی الاحادیث المشتهرة'' لکھی، اس کے بعد حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''اللآلی المنثورة فی الاحادیث المشهورة'' اس کے بعد علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "الدرر المنتشرة فی الاحادیث المشتهرة" لکھی۔

۳۲ شروح الحدیث: یعنی وہ کتابیں جن میں کسی حدیث کی کتاب کی شرح کی گئی ہو۔ مثلاً فتح الباری، عمدۃ القاری وغیرہ۔

۳۳ کتاب لاذکار: یہ وہ کتاب حدیث ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول دعاؤں اور اذکار کو جمع کیا گیا ہے۔

جیسے: ۱ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ کی ''عمل الیوم واللیلۃ'' ۲ امام سنی رحمۃ اللہ علیہ کی ''عمل الیوم واللیلۃ''

۳ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الاذکار ۴ علامہ ابن الجزری رحمۃ اللہ علیہ کی ''الحصن الحصین من کلام سید المرسلین''

۵ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی ''الحزب الاعظم'' ۶ محمد بن سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کی ''دلائل الخیرات''

⑳ الترغیب والترہیب: یہ وہ کتب حدیث ہیں جن میں صرف ترغیب وترہیب کی احادیث جمع کی گئی ہوں۔

اس میں سب سے زیادہ جامع کتاب حافظ منذری رحمہ اللہ کی "الترغیب و الترھیب" ہے۔

㉕ کتب المصاحف: ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں قرآن کریم جمع وترتیب، اختلاف وقراءات اور اختلاف نسخ کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ بہت سے لوگوں نے کتب المصاحف کے نام سے کتابیں لکھی ہیں جن میں زیادہ مشہور کتب یہ ہیں:

① ابن عامر رحمہ اللہ کی کتاب المصاحف ② ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ کی کتب المصاحف

③ ابن ابی داؤد رحمہ اللہ کیکتب المصاحف ④ ابن الانباری رحمہ اللہ کیکتب المصاحف

㉖ المسلسلات: ان کتابوں کو کہا جاتا ہے جن میں صرف احادیث مسلسلہ ذکر کی جائیں۔

<u>حدیث مسلسل</u>: وہ حدیث ہے جس کی سند کے تمام راوی کسی ایک وصف یا خاص لفظ یا کسی خاص فعل پر متفق ہو گئے ہوں۔

حدیث مسلسل کے چند نمونے یہ ہیں:

① حدیث مسلسل بالاولیۃ۔ یعنی وہ حدیث کہ جس کو ہر شاگرد نے اپنے استاذ سے سب حدیثوں سے پہلا سنا ہو۔

② حدیث مسلسل بالمصافحہ۔ یعنی وہ حدیث جس کو ہر شاگرد نے اپنے استاذ سے مصافحہ کے ساتھ سنا ہو۔

③ حدیث مسلسل بقراءۃ سورۃ الصّف۔ یعنی ہر شاگرد نے اپنے استاذ سے جب یہ حدیث سنی تو استاذ نے بوقت تحدیث سورہ صف کی تلاوت کی۔

احادیث مسلسلہ کے موضوع پر حضرت شاہ ولی محدث دہلوی رحمہ اللہ کی کتاب "الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین" مشہور ہے۔

㉗ کتب الجمع: ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں ایک سے زائد کتب حدیث کی روایتوں کو بحذف تکرار جمع کر دیا جائے۔

اس نوع کی سب سے پہلی کتاب امام حمیدی رحمہ اللہ کی "الجمع بین الصحیحین" ہے، ان کے بعد حافظ رزین بن معاویہ رحمہ اللہ کی "تجرید الصحاح ستہ" ہے جس میں صحاح ستہ کی تمام احادیث کو جمع کیا ہے، البتہ ان کی اصطلاح میں صحاح ستہ میں سنن ابن ماجہ کے بجائے مؤطا امام مالک شامل تھی۔

㉘ کتاب المناقب: کسی قوم یا جماعت یا فرد وغیرہ سے متعلق فضائل کی روایات جن کتابوں میں جمع کی جاتی ہیں ان کتابوں کو "کتاب المناقب" کہا جاتا ہے۔

جیسے: ① امام نسائی رحمہ اللہ کی کتاب خصائص علی رضی اللہ عنہ

② محب الدین طبری رحمہ اللہ کی کتاب الریاض النضرۃ فی فضائل العشرۃ۔

۳۹ الفہارس: وہ کتب حدیث جن میں ایک یا زائد کتابوں کی احادیث کی فہرست جمع کر دی گئی ہو، تا کہ حدیث کا نکالنا آسان ہو۔ مثلاً علامہ زاہد الکوثری رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد نے ''فہارس البخاری'' کے نام سے ایک بڑی مفید کتاب لکھی جس کے ذریعے بخاری سے حدیث نکالنا بہت آسان ہو گیا ہے۔

۴۰ الواحدان: یعنی ان راویوں کی احادیث کا مجموعہ جن سے صرف ایک ایک حدیث مروی ہے۔

۴۱ تعالیق: وہ کتب حدیث کہ جن میں صرف متون احادیث بیان کئے جائیں اسانید کو حذف کر دیا جائے۔ جیسا کہ ''مشکوۃ شریف'' اور ''مصابیح السنہ'' ہیں۔ تعالیق بہت سی ہیں، چند یہ ہیں:

① امام حمیدی رحمۃ اللہ علیہ کی ''جمع بین الصحیحین'' ② امام رزین بن معاویہ العبدری رحمۃ اللہ علیہ کی ''تجرید الصحاح''
③ امام ابن اثیر الجزری رحمۃ اللہ علیہ کی "جامع الاصول" ④ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی ''جمع الجوامع''

امام سیوطیؒ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''جمع الجوامع'' میں پچاس (۵۰) سے متجاوز کتابوں سے احادیث لی ہیں۔ یہ کتاب صحیح حسن، ضعیف حدیثوں پر مشتمل ہے۔ ان کا قصد تمام احادیث کو بالاستیعاب لینے کا تھا لیکن موت نے مہلت نہ دی۔

اس کتاب کے بارے میں امام سیوطی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

''میں اس کتاب میں کوئی ایسی حدیث نہیں لایا جو وضع کے ساتھ موسوم ہو اور جس کے رد و ترک پر محدثین کا اتفاق ہو۔''

۴۲ تراجم: یہ ہے کہ کسی خاص سند کو لے کر اس کی سند کی روایات مرویہ کو جمع کر دیا جائے۔

جیسے: شافعی عن مالك عن نافع عن ابن عمر عن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم

طبقات کتب حدیث باعتبار صحت

حدیث کے طالب علم کیلئے یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ حدیث کی کونسی کتاب صحت کے اعتبار سے کیا درجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ بہت سی کتب ایسی ہیں جو صحیح تو خوب ہیں مگر درجہ شہرت کو نہیں پہنچیں جیسے صحیح ابن خزیمہ، اور بعض کتب ایسی ہیں جو زیادہ صحیح تو نہیں لیکن شہرت ان کی خوب ہے جیسے ابن ماجہ وغیرہ۔ حضرت شاہ عبدالعزیز (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنے رسالہ ''مایجب حفظه للناظر'' میں کتب حدیث کو پانچ طبقات پر منقسم کیا ہے جو یہ ہیں:

پہلا طبقہ:

پہلا طبقہ ان کتب حدیث کا ہے جن کے مصنفین نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ ان کی کتاب میں تمام احادیث صحیح کی شرائط پر پوری اترتی ہیں، ایسی کتابوں کو ''صحاح مجردہ'' کہتے ہیں، چنانچہ اس طبقے کی کتابوں میں موجود ہر حدیث کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس مؤلف کے نزدیک صحیح ہے، لیکن نفس الامر میں ان کا صحیح ہونا ضروری نہیں ہے۔ صحیحین اور موطا کے

بارے میں اتفاق ہے کہ ان کی تمام احادیث نفس الامر میں بھی صحیح ہیں۔اس طبقہ کی کتب میں وارد احادیث حجت اور قابل استدلال ہیں بلکہ رتبہ صحیح کو پہنچی ہوئی ہیں جو حدیث قوی کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔اس طبقہ میں تقریباً وہ تمام کتابیں داخل ہیں جو اسم صحیح کے ساتھ موسوم ہیں۔اس طبقہ میں مندرجہ ذیل کتابوں کو شامل کیا جاتا ہے:

① صحیح بخاری ② صحیح مسلم ③ مؤطا امام مالک ④ مستدرک حاکم

⑤ صحیح ابن حبان ⑥ صحیح ابن خزیمہ ⑦ صحیح ابن العوانہ ⑧ صحیح ابن السکن

⑨ ابو محمد عبداللہ ابن الجارود کی ''المنتقی'' ⑩ قاسم بن اصبغ کی ''المنتقی'' ⑪ ضیاء الدین مقدسی کی ''المختارۃ''

☆ اعتراض: مستدرک حاکم کے بارے میں یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی بہت سی روایات پر نقد و استدراک کیا ہے تو اس کو طبقہ اولیٰ میں شمار کرنا کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے؟

جواب: یہ حکم ان احادیث کے بارے میں ہے جن احادیث پر امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے سکوت کیا ہے۔اور جس پر کلام کر دیا وہ طبقہ ثالثہ میں داخل ہے۔اس لئے کہ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں صحاح کے ساتھ ساتھ ضعاف پر بھی صحت کا حکم لگا دیا ہے۔

☆ صحیح ابن حبان: ابن حبان (رحمۃ اللہ علیہ) ابن خزیمہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے شاگرد ہیں۔یہ ثقہ، ثابت، فاضل و فہیم تھے، امامت کے درجہ پر فائز تھے۔

امام حاکم (رحمۃ اللہ علیہ) ان کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''ابن حبان علم، لغت، حدیث اور وعظ کا خزینہ تھے اور اپنے زمانے کے عقل مند شمار کئے جاتے تھے۔''

☆ صحیح ابن خزیمہ: ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ کو ''امام الائمۃ'' کہا جاتا ہے۔یہ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ و استاد ہیں۔ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں یوں رطب اللسان ہیں:

''میں روئے زمین پر کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا جو علم حدیث میں ان سے بڑھ کر ہو اور حدیث کے صحیح الفاظ ان سے زیادہ رکھنے والا ہو، گویا تمام احادیث ان کی نظروں کے سامنے تھیں۔''

☆ مختارہ: حافظ ضیاء مقدسی رحمۃ اللہ علیہ نے ''مختارہ'' (مجموعہ حدیث) میں وہ صحیح احادیث بیان کی ہیں جو بخاری و مسلم میں نہیں ہیں۔محدثین نے ان کی کتاب ''مختارہ'' کو ''مستدرک'' سے اچھا قرار دیا ہے۔

یہ وہ کتابیں ہیں جن میں بطور خاص صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں، تاہم بعض لوگوں نے ان کتابوں پر غلط یا صحیح تنقید بھی کی ہے۔ ''و فوق کل ذی علم علیم'' ہر صاحب علم سے بڑھ کر صاحب علم ہیں۔

دوسرا طبقہ:

یہ طبقہ ان کتب حدیث کا ہے جن کے مؤلفین نے یہ التزام کیا ہے کہ کوئی حدیث درجہ حسن سے کم نہ آنے پائے، اور اگر کوئی حدیث ضعیف آگئی ہو تو انہوں نے اس کے ضعف پر تنبیہ کرنے کا اہتمام کیا ہے، لہذا جس حدیث سے یہ لوگ سکوت کریں تو وہ ان کے نزدیک کم از کم حسن ضرور ہوگی، چنانچہ اس طبقہ کی کتب میں درج احادیث کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ قابل استدلال ہیں اگرچہ ساری صحت کے درجہ کو نہ پہنچی ہوں، کیونکہ استدال کے لئے صحیح کا ہونا ضروری نہیں بلکہ "حسان" سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے۔

اس طبقہ میں سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور سنن ترمذی وغیرہ داخل ہیں۔ سنن ابوداؤد اور سنن نسائی تو بالیقین داخل ہیں مگر سنن ترمذی کے داخل ہونے میں کلام ہے، اس لئے کہ اس کی بہت سی روایات متکلم فیہ ہیں۔

اس طبقہ میں سب سے اعلیٰ مقام "سنن نسائی" کا ہے چنانچہ اس میں کوئی حدیث ایسی نہیں ہے جو امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حسن سے کم ہو، الا یہ کہ انہوں نے خود اس کے ضعف پر تصریح کر دی ہو۔

شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"البتہ میرے نزدیک طحاوی اس طبقہ میں داخل ہیں، کیونکہ سلف میں سے بعض نے طحاوی شریف کو سنن ابوداؤد کے درجہ میں رکھا ہے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طبقہ میں مسند احمد بن حنبل کو بھی شمار کیا ہے۔"

مسند احمد بن حنبل غالباً اس وقت موجودہ کتب حدیث میں سب سے ضخیم اور بڑی ہے، اس میں تیس ہزار (۳۰۰۰۰) کے لگ بھگ احادیث ہیں۔ اور بہت بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ باوجود کثرت تعداد روایت کے اس کی روایات قوی ہیں اور جو بعض روایات ضعیف ہیں وہ حسن کے قریب ہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کو طبقات کتب حدیث میں سے دوسرے طبقہ میں شمار فرمایا ہے، یعنی سنن ثلاثہ (ابی داؤد، ترمذی، نسائی) کے درجہ میں لیا ہے۔

فائدہ: صاحب مصابیح رحمۃ اللہ علیہ نے صحیحین کی حدیثوں کے علاوہ دیگر کتابوں کی حدیث کا نام "حسن" رکھا ہے جو بطور تغلیب ہے یا معنوی لغوی کے قریب ہے یا ان کی اپنی کوئی نئی اصطلاح ہے۔

تیسرا طبقہ:

اس طبقہ میں وہ کتابیں ہیں جن میں ہر طرح کی روایات ملتی ہیں، یعنی صحیح و حسن، ضعیف و منکر اور موضوع روایات، غرض یہ کہ ہر طرح کی احادیث موجود ہیں قابل استدلال بھی اور غیر قابل استدلال بھی۔ اس طبقہ کی کتابوں میں کوئی حدیث دیکھ کر اس وقت تک اطمینان نہ کرنا چاہئے جب تک اس کی سند کی مکمل تحقیق نہ ہو جائے، خواہ اس کے مؤلف کتنے ہی جلیل القدر ہوں۔

مندرجہ ذیل کتب وہ ہیں جو بہت زیادہ مشہور ہیں تاہم ان کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں شہرت کی حامل ہیں:

① سنن ابن ماجہ ② سنن دارقطنی ③ سنن کبریٰ ④ مصنف عبدالرزاق
⑤ مصنف ابن ابی شیبہ ⑥ مسند ابوداؤد طیالسی ⑦ سنن سعید بن منصور ⑧ مسند حمیدی
⑨ معاجم طبرانی ⑩ زوائد مسند ⑪ مسند بزار ⑫ مسند ابویعلی الموصلی
⑬ مسند عبد بن حمید ⑭ شعب الایمان للبیہقی ⑮ مسند احمد بن منیع ⑯ حلیۃ الاولیاء لابی نعیم
⑰ دلائل النبوۃ لابی نعیم ⑱ دلائل النبوۃ للبیہقی ⑲ مسند ابن جریر ⑳ تہذیب الآثار لابن جریر
㉑ التاریخ

اسی طرح تفسیر کی بیشتر کتب بھی اسی طبقہ میں داخل ہیں:

مثلاً ① الدرالمنثور فی التفسیر بالمأثور ② تفسیر القرآن ③ تفسیر ابن مردویہ

البتہ تفسیر ابن کثیر اس سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ حافظ ابن کثیر حدیث کے محقق نقال ہیں اور وہ عموماً ضعیف احادیث پر تنبیہ کرنے کے عادی ہیں۔ وہ کتب حدیث بھی اسی طبقہ میں شامل ہیں جو تفسیر میں لکھی گئی ہیں۔

اس طبقہ کی ان چند کتابوں کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے جن کے حوالے بکثرت آتے ہیں۔:

① سنن ابن ماجہ: یہ اگرچہ صحاح ستہ میں شامل ہے لیکن اس میں ضعیف ومنکر احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے، اس میں کم از کم انیس روایات موضوع ہیں۔ اسی بناء پر علماء کی ایک بڑی جماعت نے اس کو صحاح میں شامل نہیں کیا۔ اس بارے میں مزید کلام آگے آئے گا۔

② سنن دارقطنی: یہ امام ابوالحسن الدارقطنی رحمہ اللہ کی تصنیف ہے جو اونچے درجے کے حافظ حدیث ہیں۔ انہوں نے ہر اس کتاب میں ہر فقہی باب کے تحت تمام متعلقہ احادیث کو اختلاف متن وسند کے ساتھ جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس لئے یہ کتاب احادیث احکام کا جامع ذخیرہ ہے، امام دارقطنی رحمہ اللہ ہر حدیث ذکر کرکے اس کی سند پر مختصر کلام بھی کرتے ہیں، اس میں بھی ہر قسم کی رطب ویابس احادیث موجود ہیں، لیکن عموماً امام دارقطنی رحمہ اللہ حدیث کے ضعف پر تنبیہ کردیتے ہیں۔ اس کتاب پر مشہور اہل حدیث عالم مولانا شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ نے ایک حاشیہ لکھا ہے جس کا نام "التعلیق المغنی علی سنن الدارقطنی" ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ سے حدیث کی سند پر کلام کے سلسلے میں جو کمی رہ جاتی ہے، عموماً یہ اس کو پورا کردیتے ہیں، یہ حاشیہ اصل کتاب کے ساتھ چھپا ہوا ہے۔

③ سنن کبریٰ: امام بیہقی رحمہ اللہ کی یہ کتاب فقہ شافعی کے مشہور متن "مختصر المزنی" کی ترتیب پر ہے۔

④ مصنف عبدالرزاق: یہ امام عبدالرزاق بن ہمام الصغانی رحمہ اللہ کی تالیف ہے جو امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں اور امام بخاری رحمہ اللہ کے استاذ الاستاذ ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے احادیث مرفوعہ کے علاوہ صحابہ وتابعین کے فتاویٰ بھی

بکثرت نقل کیے ہیں۔ اس میں بھی ہر طرح کی احادیث ملتی ہیں۔

۵ مصنف ابن ابی شیبہ: یہ امام ابوبکر بن ابی شیبہ رحمہ اللہ کی تالیف ہے جو ائمہ صحاح ستہ میں سے اکثر کے استاذ ہیں، اور اس کا طرز تالیف "مصنف عبدالرزاق" کی طرح ہے۔ ان دونوں کتابوں میں حنفیہ کے دلائل کا ایک بڑا ذخیرہ ملتا ہے۔

ان دونوں کتابوں پر ایک اشکال ہوتا ہے کہ ان میں عمومی طور پر صحابہ اور تابعین کے آثار مذکور ہیں، مرفوع احادیث کا ذخیرہ بہت ہے تو پھر ان کتب کو کتب احادیث میں کیونکر شمار کیا جا سکتا ہے؟ جبکہ حدیث کا لفظ مرفوع الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

مذکورہ اشکال کے تین جواب دیئے گئے ہیں:

پہلا جواب: صحابی اور تابعی کے آثار دو حال سے خالی نہیں یا وہ مدرک بالقیاس ہونگے یا غیر مدرک بالقیاس ہونگے، اگر وہ غیر مدرک بالقیاس ہیں تو ان کا حکم حدیث مرفوع کا ہوتا ہے لہٰذا حدیث کی کتابوں میں ان کے ذکر پر اشکال وارد نہیں ہوگا۔

اگر وہ مدرک بالقیاس ہیں تو بر بنائے حسن ظن یہ تصور کیا جائے گا کہ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) اور تابعین (رحمہم اللہ) نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا اور اپنی طرف سے بیان نہیں کیا، اگر چہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت نہیں کی۔ لہٰذا اس صورت میں بھی حدیث کی کتاب میں ان کو ذکر کرنے پر اشکال نہیں ہونا چاہئے۔

دوسرا جواب: شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ "حدیث" کا اطلاق جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور تقاریر و صفات پر ہوتا ہے اسی طرح صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) اور تابعین عظام (رحمہم اللہ) کے آثار پر بھی حدیث کا اطلاق کیا جاتا ہے یہ اور بات ہے کہ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو قول و فعل منسوب ہوتا ہے اس کو "مرفوع"، صحابی کی طرف منسوب قول و فعل کو "موقوف" اور تابعی کی طرف منسوب قول و فعل کو "مقطوع" کہا جاتا ہے۔ اصلاً یہ تینوں "حدیث" میں داخل ہیں اور ان تینوں میں فرق کرنے کے لئے ایک کو "حدیث" دوسرے کو "موقوف" اور تیسرے کو "مقطوع" کہا جانے لگا ہے۔

تیسرا جواب: مصنف ابن شیبہ اور مصنف عبدالرزاق جیسی کتابیں جن میں صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) اور تابعین عظام (رحمہم اللہ) کے آثار کی کثرت ہے "کتب الآثار" کہلاتی ہیں نہ کہ کتب الحدیث، گویا کہ اس جواب میں "حدیث" اور "اثر" کے فرق کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

۶ مسند ابوداؤد طیالسی: یہ امام ابوداؤد طیالسی رحمہ اللہ کی تصنیف ہے جو امام ابوداؤد سجستانی رحمہ اللہ سے مقدم ہیں۔

۷ سنن سعید بن منصور: اس کتاب میں معضل، منقطع اور مرسل احادیث بکثرت موجود ہیں۔

۸ مسند حمیدی: اس کے مؤلف امام بخاری رحمہ اللہ کے استاذ ہیں، اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے سخت مخالفین میں سے ہیں۔ یہ کتاب دو جلدوں میں "مجلس علمی" سے شائع ہو چکی ہے۔

⑨ معاجم طبرانی: ان کا تعارف پہلے آچکا ہے۔

⑩ زوائد مسند: یہ کتاب امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے ترتیب دی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے مسند احمد پر کچھ روایات کو زیادہ فرمایا ہے۔

چوتھا طبقہ:

کتب حدیث کا یہ طبقہ پہلے طبقہ کے بالکل برعکس ہے۔ اس طبقۂ کتب کی اکثر احادیث ضعیف ہیں، بلکہ حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "ان کی ہر حدیث ضعیف ہے۔" یعنی بشرطیکہ وہ حدیث صرف اسی کتاب میں ہو، ورنہ ان میں بعض احادیث ایسی بھی ہیں جو صحاح ستہ میں مروی ہیں۔ ایسی احادیث کو علی الاطلاق ضعیف نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات حکیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور عقیلی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کے بارے میں کافی حد تک درست ہے۔

☆ واضح رہے کہ صحاح ستہ میں سے کوئی بھی کتاب طبقۂ رابعہ کی نہیں ہے۔

اس طبقہ میں شامل کتب میں سے چند ایک یہ ہیں:

① امام دیلمی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور زمانہ کتاب "مسند فردوس" یہ کتاب دس ہزار مختصر قولی احادیث باعتبار حروف تہجی پر مشتمل ہے۔

② حکیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی "نوادر الاصول فی احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"

مذکورہ بالا دونوں وعظ کی کتابیں ہیں، ان میں کثرت سے روایات ضعیفہ شامل ہیں۔

③ ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ کی "الکامل"۔ ساٹھ (۶۰) اجزاء پر مشتمل یہ کتاب بارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ مرتضی رحمۃ اللہ علیہ کی شرح قاموس میں ہے کہ یہ آٹھ (۸) جلدوں میں ہے، کتب جرح میں ابن عدی کی "الکامل" کا مقام بہت بلند ہے۔ یہ جامع ترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ کتاب بھی مخدوم ہے۔

④ امام عقیلی رحمۃ اللہ علیہ کی "کتاب الضعفاء"۔

⑤ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی "تاریخ الخلفاء" یہ کتاب بھی علمی دنیا میں بہت معروف ہے۔

⑥ حافظ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور زمانہ کتاب "تاریخ دمشق"۔ یہ اسی (۸۰) مجلدات پر مشتمل ہے۔

⑦ خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرۂ آفاق کتاب "تاریخ بغداد"۔ یہ کتاب بھی لگ بھگ بیس (۲۰) جلدوں میں ہے۔

پانچواں طبقہ:

یہ طبقہ ان کتب پر مشتمل ہے جو موضوعات کے تذکرے میں لکھی گئی ہیں۔ اس طبقہ کی چند مشہور کتب یہ ہیں:

① ابوالفضل مقدسی کی کتاب "تذکرۃ الموضوعات" اس فن کی قدیم کتب میں سے ہے۔

② عبدالرحمٰن ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۵۶۷ھ) کی "کتاب الموضوعات"۔ اس فن کی قدیم و وسیع ترین کتب میں سے

ہے۔ یہ کتاب اپنے تسامحات کی وجہ سے علماء میں بہت سخت تنقید کا شکار ہوئی ہے۔

③ ''المنار المنيف في الصحيح والضعيف'' یہ کتاب حافظ ابن قیم جوزی رحمۃ اللہ کی لکھی ہوئی ہے۔

④ امام سیوطی رحمۃ اللہ (متوفی ۹۱۱ھ) کی سب سے زیادہ مشہور کتاب "اللآلی المصنوعة في الاحاديث الموضوعة" ہے۔ یہ ابن جوزی رحمۃ اللہ کی کتاب کی تلخیص اور اس پر تنقید و اضافہ ہے۔

⑤ امام سیوطی رحمۃ اللہ کی ''ذیل اللآلی'' یہ کتاب دراصل "اللآلی المصنوعة في الاحاديث الموضوعة" پر اضافہ ہے۔

⑥ ''التعقبات على الموضوعات'' اس کتاب میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ نے وہ احادیث جمع فرمائی ہیں جن کو لوگوں نے موضوع بتلایا ہے حالانکہ وہ موضوع نہیں ہیں۔

⑦ ''تنزيه الشريعة المرفوعة عن الاخبار الشنيعة الموضوعة'' علامہ ابن عراق کتانی رحمۃ اللہ (متوفی ۹۶۳ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب درحقیقت تلخیص ہے۔ بہت ہی جامع، مرتب، مہذب و مفید ہے۔

⑧ ''الموضوعات الكبرىٰ'' مصنف ملا علی قاری رحمۃ اللہ (متوفی ۱۰۱۴ھ)

⑨ ''المصنوع في معرفة الحديث الموضوع'' یہ کتاب بھی ملا علی قاری رحمۃ اللہ کی تصنیف ہے۔

⑩ ''الفوائد المجموعة في الاحاديث الموضوعة'' یہ کتاب علامہ محمد بن علی شوکانی رحمۃ اللہ (متوفی ۱۲۵۵ھ) کی ہے۔

⑪ علامہ عبدالحیٔ لکھنوی رحمۃ اللہ کی کتاب ''الاحاديث المرفوعة في الاخبار الموضوعة'' بھی اسی سلسلہ کی تصنیف ہے۔

⑫ شیخ محمد طاہر پٹنی رحمۃ اللہ کی ''تذكرة الموضوعات''

⑬ قزوینی رحمۃ اللہ کی ''موضوعات المصابيح''

⑭ امام جوزقانی رحمۃ اللہ کی ''الاباطيل''

⑮ امام صغانی رحمۃ اللہ کی "الموضوعات"

﴿ آٹھویں بحث: علم حدیث کا حکم شرعی ﴾

علم حدیث کا شرعی حکم یہ ہے کہ جس مقام پر صرف ایک مسلمان (اس کی صلاحیت رکھتا) ہو وہاں علم حدیث کا حاصل کرنا فرض عین ہے اور اگر کسی علاقہ میں بہت سے مسلمان (اس کی صلاحیت رکھتے) ہوں تو وہاں علم حدیث کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے۔ یہی حکم علم فقہ کا ہے کیونکہ احادیث کی تفصیل و تبیین فقہ پر ہی موقوف ہے۔

الحمدللہ! کہ مباحث ثمانیہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہیں۔

﴿ تتمہ: حدیث کی تدریس کا طرز ﴾

تدریس کسی بھی علم و فن کی ہو اس میں طرز تدریس بہت ہی اہمیت رکھتا ہے، چنانچہ یہ بھی ایک اہم بحث ہے جس سے صرف

نظر ممکن نہیں۔طرز تدریس پر علماء نے مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں۔اس وقت کوئی سیر حاصل بحث مقصود نہیں بس موضوع پر سردست چھنی چھنائی چند باتیں پیش کرنا مقصود ہیں، امید ہے کہ ان شاء اللہ مفید ثابت ہوں گی۔مذکورہ ذیل تحریر میں حدیث کا صرف وہ طرزِ تدریس بیان کیا ہے جو حرمین اور پاک وہند میں رائج ہے۔ان دوخطوں کی وجہ تخصیص بالذکر واضح ہے کہ حرمین شریفین مہبط وحی ہیں اور پاک وہند کے مدارس تعلیمی دنیا میں اپنا ایک مسلّم تشخص رکھتے ہیں۔

حرمین شریفین میں طرز درس حدیث:

علمائے حرمین شریفین میں درس حدیث کے تین طریقے رائج تھے:

① سرد کا طریقہ ② بحث وحلق کا طریقہ ③ امعان وتعمق کا طریقہ

① سرد کا طریقہ:

''سرد'' کا مطلب یہ ہے کہ بس روایات صحت کے ساتھ پڑھ لی جائیں خواہ استاذ پڑھے یا طالب علم پڑھے، اور لغوی وفقہی مباحث اور اسمائے رجال سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔اگر طالب علم کوئی بات دریافت کرے تو بتادی جائے ورنہ سمجھتے ہوئے مسلسل عبارت خوانی کی جائے۔یہ طریقہ صاحبانِ علم وفضل کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

② بحث وحلق کا طریقہ:

''بحث وحل'' کا مطلب یہ ہے کہ روایات پڑھتے ہوئے مشکل الفاظ کی تشریح کی جائے، مغلق تراکیب کی وضاحت کی جائے اور ارشاد نبوی کا مدعیٰ سمجھا جائے، جن رُوات کا تذکرہ کم آتا ہے ان کا تعارف پیش کیا جائے اور کوئی سوال یا اشکال پیدا ہوتا ہوا نظر آئے تو اس کا جواب دیا جائے، یہ طریقہ مبتدی اور متوسط درجہ کے طلبہ کے لئے مفید ہے۔

③ معان وتعمق کا طریقہ:

"امعان و تعمّق " کا مطلب یہ ہے کہ ہر حدیث کے''ماله وماعليه''پر کلام کیا جائے تمام متعلقہ ابحاث کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا جائے، فقہی مسائل کا استنباط کیا جائے، مجتہدین کی آراء ذکر کی جائیں اور ان کے مستدلات سمجھائے جائیں، موافق ومخالف روایات کی ممکنہ توجیہات ذکر کی جائیں نیز مدارک اجتہاد پر کلام کیا جائے کہ مجتہدین میں اختلاف کی بنیاد کیا ہے؟ غرض تحقیق کا کوئی گوشہ مخفی نہ رہنے دیا جائے یہ طریقہ فن میں گہرائی پیدا کرنے کے لئے معین سمجھا گیا ہے۔

حرمین شریفین میں طرز درس حدیث:

برصغیر پاک وہند کے مدارس دینیہ اور خصوصاً دار العلوم دیوبند اور اس کے نہج پر چلنے والے مدارس وجامعات میں حدیث

شریف تینوں طریقوں سے پڑھائی جاتی ہے۔ کتب حدیث میں سب سے پہلے مشکواۃ شریف پڑھائی جاتی ہے۔ یہ کتاب پڑھانے کا طریقہ بحث وحل کا ہے۔ ہونا یوں چاہئے کہ پہلے استاذ محترم عبارت کی تصحیح کریں پھر ضروری لغات اور نحوی تراکیب بیان کریں، پھر سلیس ترجمہ کر کے مختصر جامع الفاظ میں مراد نبوی واضح کریں۔ اگر حدیث میں کوئی فقہی مسئلہ ہو تو اس کو اختصار کے ساتھ بیان کریں اور مسئلہ اختلافی ہو تو ضروری اختلاف بیان کریں اور قول فیصل ذکر کریں تا کہ طالب علم کیلئے عمل کی راہ ہموار ہو۔ اس طرح مکمل کتاب یکساں طور پر بحث وحل کے طریقے سے پوری کی جائے۔

دورہ حدیث شریف میں درس حدیث کے تینوں طریقے جمع کئے جاتے ہیں۔ بعض کتابیں صرف سرداً پڑھائی جاتی ہیں، اور بعض امعان وتعمق کے ساتھ پڑھائی جاتی ہیں، مگر نصف سال کے بعد عام طور پر طرز بدل دیا جاتا ہے، کہ بحث وحل پر اکتفاء کیا جاتا ہے، بلکہ بالکل اخیر سال میں وہی کتابیں سرداً پوری کی جاتی ہیں، علاوہ ازیں امعان وتعمق میں بھی مضامین کی تقسیم ملحوظ رکھی جاتی ہے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ نے صحاح ستہ کی تدریس کا طریقہ یہ بیان فرمایا ہے:

''چونکہ فقہی مباحث ''ترمذی شریف'' میں مکمل طور پر آجاتے ہیں اس لئے ''بخاری شریف'' میں تراجم ابواب وغیرہ کو بیان کیا جاتا ہے۔ ''ابوداؤد'' میں فقہی بحث مختصر طور پر کافی ہے، باقی سندوں پر بحث کرنا اس میں زیادہ ضروری ہے، ''مسلم شریف'' میں اس کا مقدمہ اور کتاب الایمان زیادہ اہم ہے، باقی جگہ مختصر بحث کافی ہے۔ ''نسائی'' اور ''ابن ماجہ'' میں عبور علی الاحادیث مقصود ہوتا ہے۔'' (ملخصاً از دروس مدنیہ، ص ۱۳۔۱۴)

مصطلحاتِ حدیث

اس فصل میں علم اصول حدیث کی مندرجہ ذیل اصطلاحات کا بیان آئے گا:

① حدیث ② سند ③ متن ④ طبقات رواۃ ⑤ القاب اہل فن

① حدیث:

جمہور محدثین کی اصطلاح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب اقوال، افعال، احوال اور تقریرات کو "حدیث" کہا جاتا ہے۔

اقوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات مبارکہ ہیں۔

افعال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ افعال ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوئے۔

واضح رہے کہ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) اور تابعین عظام (رحمہم اللہ) کے قول، فعل اور تقریر پر بھی "حدیث" کا اطلاق ہوتا ہے۔ مگر اس میں کچھ تفصیل ہے جو فصل دوم میں آرہی ہے۔

تقریر باتفاق محدثین واصولیین "حدیث" کی تعریف میں داخل ہے۔

"تقریر" سے مراد تائید سکوتی ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کسی شخص نے کوئی کام کیا یا کچھ کہا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاننے کے باوجود نہ اس وقت اور نہ بعد میں اس سے منع فرمایا بلکہ سکوت اختیار فرما کر اسے برقرار رکھا اور اس طرح سکوت کے ذریعہ اس کی تصویب وتوثیق کردی۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ اس کے سامنے کوئی ناجائز کام کیا جائے یا اس کے علم میں آئے اور وہ اس پر نکیر نہ فرمائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جس طرح اقوال وافعال امت کے لئے حجت ہیں اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سکوت بھی حجت ہے۔ پس جو چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سے ثابت ہوگی اس کو کہہ سکتے ہیں کہ یہ چیز حدیث سے ثابت ہے۔

احوال رسول اللہ ﷺ سے مراد آپ ﷺ کے جسمانی واخلاقی احوال ہیں۔یعنی حلیہ اور اخلاق وعادات وغیرہ، خواہ ان کا تعلق بیداری کی حالت سے ہو یا نیند کی حالت سے ہو۔

احوال دو قسم کے ہیں: (۱) اختیاریہ (۲) غیر اختیاریہ۔

بعض حضرات نے (اختیاریہ وغیر اختیاریہ کی بجائے) خُلقیہ اور خِلقیہ کی تعبیر اختیار کی ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں دونوں قسمیں حدیث میں داخل ہیں، بلکہ ہر وہ چیز جو آپ ﷺ کی طرف منسوب ہو حدیث ہے۔ اور اصولیین کی اصطلاح میں احوال غیر اختیاریہ "حدیث" کی تعریف میں داخل نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ تو اس چیز سے بحث کرتے ہیں جو حجت اور دلیل کے قبیل سے ہو۔ اور اوصاف خلقیہ یعنی احوال غیر اختیاریہ کا تعلق کسی کسی حکم شرعی سے نہیں ہے لہٰذا وہ حجت بھی نہیں۔

﴿معنیٰ "حدیث" کے چند متقارب الفاظ کا بیان﴾

حضرات محدثین کے یہاں ایک بحث یہ بھی ہے کہ روایت، حدیث، خبر، اثر، سنت، یہ الفاظ مترادفہ ہیں یا ان میں کچھ فرق ہے۔ ان الفاظ کو محدثین بھی استعمال کرتے ہیں اور اصولی بھی۔ بعض حضرات نے ان اصطلاحات میں فرق کیا ہے اور بعض ان اصطلات میں فرق نہیں کرتے۔

روایت: جہاں تک "روایت" کا تعلق ہے اس کا اطلاق بالاتفاق "حدیث" کے لغوی مفہوم پر ہوتا ہے۔ یعنی کوئی بھی واقعہ یا کوئی بھی قول خواہ وہ کسی کا ہو "روایت" کہلاتا ہے۔ باقی چار الفاظ کے بارے میں اختلاف ہے۔

خبر اور حدیث: خبر اور حدیث میں کیا نسبت ہے؟ چند علماء کی آراء حسب ذیل ہیں:

1. ایک قول یہ ہے کہ یہ دونوں مترادف ہیں، ایک ہی معنی میں مشہور ہیں۔
2. بعض محدثین کی رائے یہ ہے کہ دونوں میں تساوی کی نسبت ہے، کہ حدیث آپ ﷺ کے اقوال وافعال کا نام ہے اور خبر آپ ﷺ کے سوا دوسرے لوگوں کے اقوال وافعال کا نام ہے۔
3. بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ دونوں میں عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے۔ وہ اس طرح کہ "حدیث" خاص ہے، اس کا اطلاق رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال پر ہوتا ہے اور "خبر" عام ہے اس کا اطلاق احادیث نبوی ﷺ اور اخبار سلاطین و ملوک دونوں پر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اخبارِ ملوک کو "اخبار" ہی کہہ سکتے ہیں "حدیث" نہیں کہہ سکتے۔
4. بعض لوگ حدیث صرف اس کو کہتے ہیں جو نبی کریم ﷺ، صحابہ اور تابعین سے منقول ہو اور "خبر" اس کو کہتے ہیں جو ملوک و سلاطین اور گزشتہ زمانے کے حالات وواقعات پر مشتمل ہو۔

حدیث اور اثر: اس بارے میں کئی اقوال ہیں:

1. شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے "حدیث" اور "اثر" کو مترادف قرار دیا ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ جمہور خلف وسلف کے نزدیک حدیث واثر میں کوئی فرق نہیں ہے، دونوں

کا اطلاق احادیث مرفوعہ وموقوفہ ومقطوعہ سب پر ہوتا ہے۔

مندرجہ ذیل مثالوں میں مرفوع حدیث پر ''اثر'' کا اطلاق ہوا ہے:

① نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول دعاؤں کو ''ادعیہ ماثورہ'' کہا جاتا ہے۔

② امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کا نام ''شرح معانی الآثار'' ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آثار صحابہ پر مشتمل ہے۔

③ بقول امام سخاوی رحمۃ اللہ علیہ ''امام طبرانی کی ایک کتاب کا نام ''تہذیب الآثار'' ہے۔'' حالانکہ وہ مرفوع احادیث کے لئے خاص ہے اور اس میں موقوف روایات محض ضمنی طور پر ہی لائے ہیں۔

❷ مشہور یہ ہے کہ ''حدیث'' کا اطلاق ''مرفوع الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم '' پر ہوتا ہے، اور اثرِ صحابی کو ''موقوف'' کہا جاتا ہے اور تابعی کے اثر کو ''مقطوع'' کہا جاتا ہے۔

❸ مرفوع الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابی کے اثرِ موقوف کو ''حدیث'' کہا جاتا ہے، اور تابعی کے اثر کو ''مقطوع'' کہا جاتا ہے۔

❹ محدثین کے یہاں ''اثر'' کا اطلاق ''حدیث مرفوع'' اور ''حدیث موقوف'' دونوں پر ہوتا ہے (یعنی مقطوع کو حدیث میں شمار نہیں کیا ہے۔)

❺ بعض علماء نے ''اثر'' کو ''موقوف'' کے ساتھ خاص قرار دیا ہے۔ وہ اس کا طلاق ''مرفوع'' پر نہیں کرتے۔ چنانچہ فقہائے خراسان کی اصطلاح میں ''حدیث'' کا اطلاق مرفوع الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ''اثر'' کا اطلاق صحابہ وتابعین کے آثار موقوفہ پر ہوتا ہے۔ حتی کہ اسی نسبت سے امام محمد بن الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے آثار موقوفہ پر مشتمل اپنی کتاب کا نام ''کتاب الآثار'' رکھا ہے۔ اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''احیاء العلوم'' میں فقہائے خراسان ہی کی اصطلاح کو اختیار کیا ہے۔

سنت اور حدیث: اس بارے میں مختلف آراء ہیں:

❶ بعض نے ان کو ایک دوسرے کے مرادف کہا ہے۔

❷ ایک قول یہ ہے کہ ''حدیث'' کا اطلاق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف اقوال پر ہوتا ہے اور ''سنت'' عام ہے اس کا اطلاق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور احوال سب پر ہوتا ہے۔

❸ بعض حضرات کا خیال ہے کہ ''سنت'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے صرف عمل کا نام ہے ''احادیث'' ان میں شامل نہیں۔

صحیح یہ ہے کہ یہ تمام الفاظ علمائے حدیث کی اصطلاح میں مرادف ہیں، استعمال عام میں حدیث، خبر، اثر اور سنت میں کوئی فرق نہیں ہے اور انہیں ایک دوسرے کے معنی میں بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔

امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام بیہقی، امام دارقطنی اور امام دارمی (رحمۃ اللہ علیہم) ان تمام محدثین نے اپنی کتب کو ''سنن'' کے نام سے موسوم کیا حالانکہ ان میں قولی احادیث بکثرت موجود ہیں۔ محدثین کا یہ طرزِ عمل بتاتا ہے کہ محقق بات یہ ہے کہ عام استعمال میں یہ تمام الفاظ مرادف ہیں اور ایک کو دوسرے کی جگہ بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔

ایک اشکال:

اگر حضور ﷺ کی احادیث پر لفظ ''خبر'' کے اطلاق کا ماٗخذ اس کا معنی لغوی (یعنی بات) ہے تو ''کلام'' بھی ''بات'' کے معنی میں ہے لہٰذا ''حدیث'' کو ''کلام'' کیوں نہیں کہتے؟

جواب یہ ہے کہ ''کلام'' تو خبر و حدیث دونوں سے عام ہے مگر چونکہ عرف میں لفظ کلام کو ایک خاص علم وفن (یعنی عقائد) کے ساتھ خاص کر دیا ہے اس لئے ''کلام'' کا اطلاق بخوف التباس ''حدیث'' پر نہیں کیا جاتا۔ ان دونوں میں عموم وخصوص کی نسبت ہے۔

② سند:

تمہید: یہ ایک بدیہی بات ہے کہ کوئی حدیث خواہ مرفوع ہو یا موقوف ہو بغیر سند کے ثابت اور معتبر نہیں ہو سکتی۔ کسی شخص، عالم ومحدث کی جلالت شان اس کو بیان سند سے مستغنی نہیں کر سکتی۔ بعض صحابہ کا حال تو یہ تھا کہ اگر ان سے کوئی صحابی رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کرتا جس کو اس نے آپ ﷺ سے براہ راست سنا ہے تو اس سے سماع پر استحلاف کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مشہور ہے۔

''حدیث'' کے دو حصے ہوتے ہیں: ① متن ② سند

''حدیث'' کے طریق کا نام ''سند'' ہے۔

وضاحت: جو لوگ حدیث کو روایت کرتے ہیں ان روایت کرنے والوں کے سلسلے کو ''سند'' کہتے ہیں۔

فوائد:

1. ''اسناد'' بھی اسی معنی (یعنی سند) میں ہے، اور کبھی یہ سند کے ذکر اور طریق متن کے ذکر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔
2. وسائط (یعنی رجال سند) کا کم ہونا محدثین کی اصطلاح میں ''علو سند'' کہلاتا ہے۔ اور جس سند کے راوی کم ہوتے ہیں اس کو ''سند عالی'' کہتے ہیں۔ سند عالی کا مقابل ''سند سافل'' ہے اس کو ''سند نازل'' بھی کہتے ہیں۔
3. اگر کسی حدیث میں مصنف کتاب اور حضور ﷺ کے درمیان صرف دو راویوں کا واسطہ ہو تو اس حدیث کو ''ثنائی'' کہیں گے، اور اگر یہ درمیانی واسطے تین ہیں تو اس حدیث کو ''ثلاثی'' کہیں گے۔ باقی (یعنی رباعی، خماسی وغیرہ) کو اسی پر قیاس کر لیا جائے۔

③ متن:

''متن'' وہ ہے جس پر سند کا سلسلہ منتہی ہو۔

وضاحت: حدیث کے روایت کرنے والوں کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد جہاں سے حدیث کا اصل مضمون شروع ہوتا

ہے اس کو ''متن حدیث'' کہتے ہیں۔ سند اور متن کی مزید تشریح اس مثال سے ہوگی:

حدثنا ابو الیمان قال اخبرنا شعیب قال حدثنا ابو الزناد عن الاعرج عن ابی هریرہ ان رسول الله ﷺ قال:

" والذی نفسی بیدہ لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من والدہ وولدہ "

اس روایت میں ''حدثنا'' سے ''ابو ھریرۃ'' تک ''سند'' ہے اور ''ان رسو ل الله ﷺ'' سے آخر تک ''متن'' ہے۔

④ **طبقات رواۃ:**

صحابی: وہ ہیں جن کو ایمان کی حالت میں آپ ﷺ سے ملاقات یا آپ ﷺ کی دید نصیب ہوا اور ایمان ہی پر ان کی وفات ہوئی ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے تمام صحابہ ''عادل'' ہیں۔ ان کے عادل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف جان بوجھ کر انہوں نے کبھی کوئی غلط بات منسوب نہیں کی۔

تابعی: وہ ہیں جن کو بحالت ایمان صحابی کی ملاقات یا دید حاصل ہوئی ہو اور وفات بحالت ایمان پائی ہو۔

مخضرمین: صحابہ کرام اور حضرات تابعین کے درمیان ایک طبقہ مخضرمین کا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام دونوں کو دیکھا، مگر آپ ﷺ سے شرف ملاقات نہ حاصل کر سکے۔ ان کا شمار بڑے درجہ کے تابعین میں ہے، خواہ عہد نبوی ﷺ میں ایمان لائے ہوں یا بعد میں جیسے نجاشی۔

تبع تابعی: وہ ہیں جن کو صرف تابعی سے بحالت ایمان ملاقات یا دید حاصل ہوئی ہو۔

⑤ **القاب اہل فن**

۱) **حافظ:** جس کو ایک لاکھ حدیثیں یاد ہوں اس کو ''حافظ'' کہتے ہیں۔

۲) **حجت:** جس کو تین لاکھ حدیثیں یاد ہوں اس کو ''حجت'' کہتے ہیں۔

۳) **حاکم:** جس کو تمام احادیث مرویہ مع متن وسند وتاریخ وجرح وتعدیل معلوم ہوں اس کو ''حاکم'' کہتے ہیں۔

اقسام خبر

''خبر'' کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: مسند الیہ کے اعتبار سے۔ دوسری قسم: نقل کے اعتبار سے۔

خبر کی پہلی قسم: مسند الیہ کے اعتبار سے

مسند الیہ کے اعتبار سے حدیث کی چار اقسام ہیں:

① حدیث قدسی ② حدیث مرفوع ③ حدیث موقوف ④ حدیث مقطوع

③ حدیث قدسی: وہ حدیث جو حضور ﷺ کی زبان سے اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کر کے منقول ہو۔

④ مرفوع: وہ حدیث جو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب ہو خواہ وہ آپ ﷺ کا قول و فعل ہو یا تقریر و حال ہو۔

حدیث مرفوع کی دو اقسام ہیں: (الف) مرفوع حقیقی (ب) مرفوع حکمی

(الف) مرفوع حقیقی: وہ حدیث جو نبی کریم ﷺ کی طرف صراحت کے ساتھ منسوب ہو۔

مرفوع حقیقی کی چار اقسام ہیں:

① مرفوع قولی ② مرفوع فعلی ③ مرفوع تقریری ④ مرفوع وصفی

① مرفوع قولی: وہ حدیث جس میں حضور ﷺ کا کوئی ارشاد منقول ہو۔

② مرفوع فعلی: وہ حدیث جس میں حضور ﷺ کا کوئی عمل منقول ہو۔

③ مرفوع تقریری: وہ حدیث جس میں حضور ﷺ کی مجلس و موجودگی میں کسی کام کے کئے جانے کا ذکر ہو اور آپ ﷺ کا (اس کام پر) انکار مذکور نہ ہو۔

④ مرفوع وصفی: وہ حدیث جس میں حضور ﷺ کے جسمانی یا روحانی و اخلاقی اوصاف و احوال میں سے کسی کا ذکر ہو۔

(ب) مرفوع حکمی: وہ حدیث جو ظاہراً نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب نہ ہو لیکن حکماً کسی وجہ سے آپ ﷺ کی طرف ہی منسوب ہو۔

③ موقوف: وہ حدیث جو صحابی کی طرف منسوب ہو۔ خواہ وہ قول و فعل ہو یا تقریر ہو۔

حدیث موقوف کی تین اقسام ہیں: ① موقوف قولی ② موقوف فعلی ③ موقوف تقریری

① موقوف قولی: وہ حدیث جس میں کسی صحابی کا کوئی ارشاد منقول ہو۔

② موقوف فعلی: وہ حدیث جس میں کسی صحابی کا کوئی فعل منقول ہو۔

③ موقوف تقریری: وہ حدیث جس میں کسی صحابی کی تائید سکوتی منقول ہو۔

جیسے کسی تابعی کا یہ کہنا کہ میں نے فلاں صحابی کی موجودگی میں فلاں کام کیا اور انہوں نے مجھے منع نہیں فرمایا۔

④ مقطوع: وہ قول و فعل جو تابعی کی طرف منسوب ہو۔

حدیث مقطوع کی دو اقسام ہیں: ① مقطوع قولی ② مقطوع فعلی

فوائد:

❶ مرفوع، موقوف اور مقطوع کی ایک عام تعریف یہ ہے:

جس حدیث کی سند نبی کریم ﷺ تک پہنچے اسے ''مرفوع'' کہتے ہیں۔

جس حدیث کی سند صحابی تک پہنچے اسے ''موقوف'' کہتے ہیں۔

جس حدیث کی سند تابعی تک پہنچے اسے ''مقطوع'' کہا جاتا ہے۔

❷ مذکورہ بالا نسبت کو حسب ذیل عنوانات سے تعبیر کیا جاتا ہے:

حضور ﷺ کی طرف نسبت کر کے کسی چیز کو نقل کرنے کو ''رفع'' سے تعبیر ہیں۔

کسی صحابی کی طرف نسبت کر کے کسی چیز کو نقل کرنے کو ''وقف'' سے تعبیر ہیں۔

❸ کبھی کبھی موقوف کا اطلاق غیر صحابہ سے منقول امور پر بھی ہوتا ہے۔

مثلاً کہتے ہیں: هذا حديث وقفه فلان على الزهري۔

❹ مرفوع کی تعریف (وہ حدیث جو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب ہو) میں عموم ہے بایں معنی کہ نسبت کرنے والا خواہ صحابی ہو، خواہ تابعی ہو، خواہ بعد کے لوگ ہوں۔ نسبت کی کیفیت میں بھی عموم ہے کہ خواہ اس کی سند مذکور ہو یا نہ ہو، سند خواہ مکمل ہو یا ناقص ہو، بہر حال وہ حدیث ''مرفوع'' کہلائے گی۔ یہ عموم کم وبیش ''موقوف'' کی تعریف میں بھی ہے۔

خبر کی دوسری قسم: نقل کے اعتبار سے اقسام خبر

نقل (یعنی ہم تک پہنچنے) کے اعتبار سے حدیث کی دو بنیادی اقسام ہیں:

① خبر متواتر ② خبر واحد

① خبر متواتر: وہ حدیث کہ جس کے رواۃ کی کثرت اس حد کو پہنچ جائے کہ ان کا کذب پر متفق ہونا محال ہو۔

یعنی وہ حدیث ہے کہ جس کو ہر طبقہ میں ایک بڑی جماعت نے روایت کیا ہو۔ وہ جماعت اتنی زیادہ ہو کہ ان سب کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا عقل سلیم کیلئے ناممکن بلکہ محال ہو اور روایت کرنے والوں کی یہ کثرت شروع سے آخر تک ہر زمانہ میں پائی جائے۔

② خبر واحد: وہ حدیث جو تواتر کی حد کو نہ پہنچے۔

ان میں سے ہر ایک کی مختلف اقسام ہیں، تفصیل آگے آرہی ہے۔

خبر متواتر کی اقسام:

① متواتر لفظی ② متواتر معنوی ③ متواتر عملی ④ متواتر طبقہ ⑤ متواتر استدلالی

خبر واحد کی اقسام:

''خبر واحد'' کی کئی تقسیمات ہیں، یہاں پانچ تقسیمات بیان کی جائیں گی:

پہلی تقسیم: ''خبر واحد'' منتہٰی کے اعتبار سے ہے۔

دوسری تقسیم: ''خبر واحد'' عدد رواۃ کے اعتبار سے ہے۔

تیسری تقسیم: ''خبر واحد'' راویوں کی صفات کے اعتبار سے ہے۔

چوتھی تقسیم: ''خبر واحد'' سقوط وعدم سقوط راوی کے اعتبار سے ہے۔

پانچویں تقسیم: ''خبر واحد'' صیغۂ اداء کے اعتبار سے ہے۔

خبر واحد کی پہلی تقسیم:

''خبر واحد'' اپنے منتہٰی کے اعتبار سے تین قسم پر ہے:

① مرفوع ② موقوف ③ مقطوع

ملاحظہ: ان تینوں کی تعریفات وتفصیلات ماقبل میں گذر چکی ہیں۔

خبر واحد کی دوسری تقسیم:

''خبر واحد'' راویوں کی تعداد کے اعتبار سے تین قسم پر ہے:

① مشہور ② عزیز ③ غریب

① مشہور: وہ حدیث ہے جس کو روایت کرنے والوں کی تعداد کسی بھی طبقہ میں تین سے کم نہ ہو اور ان کی کثرت متواتر کی حد کو نہ پہنچے۔

خبر مشہور کو بعض حضرات حدیث ''مستفیض'' بھی کہتے ہیں۔

② عزیز: وہ حدیث ہے جس کو روایت کرنے والوں کی تعداد کسی بھی طبقہ میں دو سے کم نہ ہو۔

③ غریب: وہ حدیث ہے جس کو کم از کم ایک طبقہ میں ایک ہی فرد نے روایت کیا ہو۔

وضاحت: یعنی روایت کرنے والا کسی بھی طبقہ میں ایک ہی ہو، خواہ ہر طبقہ میں ایک ہو، خواہ کسی طبقہ میں زائد ہو جائیں۔

''غریب'' کو ''فرد'' بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ ''فرد'' کی دو قسمیں ہیں:

① فرد مطلق ② فرد نسبی

اس موقع پر ''غریب مطلق'' اور ''غریب نسبی'' کی تعبیر بھی اختیار کی جاتی ہے۔

① فرد مطلق: وہ حدیث ہے جس کو صحابی سے روایت کرنے والا ایک ہی فرد ہو۔ خواہ کسی اور طبقہ میں کوئی راوی تنہا ہو یا نہ ہو۔

② فرد نسبی: وہ حدیث ہے جس کو صحابی سے روایت کرنے والا فرد تو تنہا نہ ہو، بلکہ اس کے بعد کا کوئی راوی تنہا ہو۔

''فرد مطلق'' کو عموماً ''فرد'' اور ''فرد نسبی'' کو ''غریب'' کہا جاتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرد مطلق کے تمام راوی یا اکثر راوی تنہا ہوتے ہیں۔ مسند بزار اور معجم اوسط طبرانی میں اس کی بہت مثالیں موجود ہیں۔ جیسے حدیث نہی عن بیع الولاء۔ کہ اس حدیث کو عبداللہ بن دینار نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے۔

فوائد:

1. معلوم ہوا کہ غرابت صحت کے منافی نہیں اور یہ ممکن ہے کہ حدیث صحیح غریب ہو بایں طور کہ اس کے سب راوی ثقہ ہوں۔
2. غریب کبھی ''شاذ'' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اس شذوذ کے معنی میں جو حدیث میں طعن کی اقسام میں سے ہے۔
3. صاحب المصابیح رحمۃ اللہ علیہ جب کسی حدیث میں بطریق طعن ''هذا حديث غريب'' کہتے ہیں تو ان کی مراد یہی شذوذ ہوتا ہے۔
4. خبر متواتر کے علاوہ اقسام حدیث (مشہور، عزیز، غریب) کو ''احاد'' کہتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کو ''خبر واحد'' کہتے ہیں۔

''فرد نسبی'' کی دو قسمیں ہیں: ① متابع ② شاہد

① متابع: (بصیغۂ اسم مفعول) وہ فرد نسبی ہے کہ جس کے موافق دوسری سند بھی ہو، بشرطیکہ دونوں روایتیں ایک ہی صحابی سے ہوں۔

یعنی اگر ایک راوی ایک حدیث بیان کرے اور دوسرا راوی دوسری حدیث بیان کرے جو اس کے موافق ہو تو اس (دوسری) حدیث کو متابع (بصیغۂ اسم فاعل) کہتے ہیں۔

متابع اگر لفظ (اور معنی دونوں) میں اصل کے موافق ہو تو ''مثله'' کہتے ہیں، اور اگر لفظوں میں نہیں صرف معنی میں موافقت ہو تو ''نحوه'' کہا جاتا ہے۔

اور محدثین جو کہتے ہیں: ''تابعه فلان'' ''وله متابعات'' تو اس کے معنی بھی یہی ہیں۔

متابعت کا حکم:

متابعت تقویت اور تائید کو واجب کرتی ہے۔

۲ شاہد: وہ فرد نسبی ہے جس کے موافق دوسری سند بھی ہو لیکن کسی اور صحابی سے ہو۔

جیسے کہا جائے: **له شاهد من حديث ابن هريرة** یا یوں کہا جائے: **له شواهد ، يا يشهد به حديث فلان**۔

فوائد:

١ یہ ضروری نہیں کہ متابع مرتبہ میں اصل کے برابر ہو۔ متابع کم مرتبہ رکھنے کے باوجود متابعت کی صلاحیت رکھتا ہے۔

٢ متابعت کبھی نفس راوی میں ہوتی ہے اور کبھی راوی کے شیخ میں ہوتی ہے۔

٣ بعض لوگ "متابع" کو لفظوں میں موافقت کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور شاھد کو معنوی موافقت کے ساتھ خاص کرتے ہیں خواہ وہ ایک صحابی سے منقول ہوں یا دو صحابیوں سے منقول ہوں۔

٤ کبھی شاھد اور متابع ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں وجہ اس کی ظاہر ہے۔

٥ "متابع" اور "شاھد" کے جاننے کی غرض سے طرق حدیث اور اس کے اسناد کے تتبع اور تلاش کو "اعتبار" کہا جاتا ہے۔

خبر واحد کی تیسری تقسیم:

"خبر واحد" اپنے راویوں کی صفات کے اعتبار سے سولہ قسموں پر ہے:

① صحیح لذاتہ	② حسن لذاتہ	③ صحیح لغیرہ	④ حسن لغیرہ
⑤ ضعیف	⑥ موضوع	⑦ متروک	⑧ شاذ
⑨ محفوظ	⑩ منکر	⑪ معروف	⑫ معلل
⑬ مضطرب	⑭ مقلوب	⑮ مصحف	⑯ مدرج

صحیح لذاتہ: وہ حدیث ہے جس کے تمام راوی عادل وتام الضبط ہوں، اس کی سند متصل ہو اور اس میں علت اور شذوذ نہ ہو (یعنی وہ روایت معلل وشاذ نہ ہو)۔

فوائد:

مذکورہ بالا تعریف سے حدیثِ صحیح کی پانچ شرائط مستفاد ہو رہی ہیں:

(الف) عدالت رواۃ (ب) ضبط رواۃ (ج) اتصال سند (د) عدم علت (ھ) عدم شذوذ

(الف) عدالت رواۃ: ہر راوی کا مسلمان، بالغ وعاقل ہونے کے ساتھ ساتھ متقی وباوقار ہونا۔

''عدالت'' اس ملکہ کا نام ہے جو انسان کو تقویٰ اور مروءت کے التزام پر آمادہ کرتا ہے۔

واضح رہے کہ ''روایت'' کی ''عدالت''، ''شہادت'' کی ''عدالت'' سے عام ہے۔ اس لئے کہ عدلِ شہادت ''آزاد'' کے ساتھ مخصوص ہے اور عدل روایت آزاد اور غلام دونوں کو شامل ہے۔

''تقویٰ'' سے مراد شرک فسق اور بدعات جیسے برے اعمال سے بچنا ہے۔

گناہ صغیرہ سے اجتناب کے بارے میں اختلاف ہے۔ مختار مذہب یہ ہے کہ یہ شرط نہیں، اس لئے کہ اس سے بچنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ بجز اس صورت کے کہ گناہ صغیرہ پر اصرار کیا جائے کہ اس طرح وہ بھی کبیرہ گناہ بن جاتا ہے۔

''مروءت'' سے مراد ان بعض خسیس اور بری باتوں سے بچنا ہے جو گو مباح ہیں مگر ہمت اور مروءت کے خلاف ہیں۔

جیسے: بازار میں کھانا پینا اور راستے میں پیشاب کرنا وغیرہ۔

(ب) ضبط رواۃ: ہر راوی کا حدیث کو حاصل کرنے کے بعد دوسروں تک پہنچانے کے وقت تک اس کو خلل اور ضیاع سے محفوظ رکھنے کا پورا اہتمام کرنا، خواہ یادداشت کے ذریعہ ہو خواہ تحریر کے ذریعہ ہو۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ''ضبط'' کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ضبط صدر (۲) ضبط کتاب

(ج) اتصال سند: شروع سے اخیر تک ہر راوی کا اپنے اوپر والے راوی سے روایت کو براہ راست حاصل کرنا۔

(د) عدم علت: ظاہری صحت کے ساتھ ساتھ ایسے مخفی عیب سے خالی ہونا جو صحت پر اثر انداز ہو۔

(ھ) عدم شذوذ: ثقہ راوی کا خود سے فائق راوی کی مخالفت نہ کرنا۔

(۲) حسن لذاتہ: وہ حدیث ہے جس میں صحیح لذاتہ کی تمام صفات پائی جاتی ہوں لیکن اس کے رواۃ میں حفظ وضبط کی کچھ کمی ہو۔

وضاحت: یعنی راوی تام الضبط یا کامل الحفظ نہ ہوں۔

(۳) صحیح لغیرہ: وہ حدیث ہے جس میں کسی قسم کا نقص ہو لیکن کثرت طرق سے اس نقصان کی تلافی ہو جائے۔

(۴) حسن لغیرہ: وہ ضعیف حدیث ہے جو متعدد طرق سے مروی ہو اور اس کے ضعف کی تلافی ہو گئی ہو۔

(۵) ضعیف: وہ حدیث ہے کہ جس میں وہ شرائط کلی طور پر یا جزوی طور پر مفقود ہوں جو صحیح (اور حسن) کیلئے معتبر ہیں۔

اس (تعریف کے) اعتبار سے ضعیف حدیث کی متعدد قسمیں ہو جاتی ہیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''حدیث کی اصل تین قسمیں ہیں: (۱) صحیح (۲) حسن (۳) ضعیف۔

''صحیح'' سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے ''ضعیف'' ادنیٰ ہے اور ''حسن'' متوسط درجہ ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صفات جو ''صحیح'' کیلئے ضروری ہیں وہ ''حسن'' میں ناقص ہوتی ہیں، لیکن تحقیق یہ ہے کہ ''حسن'' میں جس نقصان کا اعتبار کیا گیا ہے وہ صرف حفظ وضبط ہے، ورنہ باقی صفات اپنی جگہ بحال رہتی ہیں۔اھ۔

حضرت شاہ صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہ آگے چل کر ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''اسی طرح (یعنی ضعیف کی طرح) صحیح لذاتہ اور صحیح لغیرہ ان کمال صفات میں مختلف مراتب ودرجات کی حامل ہوں گی جن کا ان دونوں کے مفہوم میں اعتبار کیا جاتا ہے، درآں حالیکہ اصل صحت اور حسن میں ان کے مابین اشتراک ہے۔محدثین نے مراتب صحت کا انضباط اور تعیین کردی ہے اور اس کی مثالیں بھی دی ہیں اور کہا ہے کہ عدالت اور ضبط تمام رجال حدیث کو شامل ہے، تاہم بعض بعض پر فوقیت رکھتے ہیں۔(اھ)

صحیح، حسن اور ضعیف کا حکم:

حدیث صحیح کا احکام میں حجت ہونا تمام محدثین، معتمد اصولیین وفقہاء سب کے نزدیک متفق علیہ ہے۔صرفِ نظر کی گنجائش نہیں ہے۔

اسی طرح عام علماء کے نزد ''حسن لذاتہ'' ہے، کہ وہ بھی قابل حجت ہونے میں ''صحیح'' کے ساتھ ملحق ہے گو رتبہ میں وہ صحیح سے کم ہے۔ایسے ہی اس حدیثِ ''ضعیف'' کے قابل احتجاج ہونے میں بھی اتفاق ہے جو تعدد طرق کی وجہ سے ''حسن لغیرہ'' کے درجہ کو پہنچ جائے۔

یہ جو مشہور ہے ''کہ حدیث ضعیف فضائل اعمال میں معتبر ہے اس کے سوا میں نہیں۔'' تو اس سے مراد مفرد احادیث ہیں نہ کہ وہ احادیث جو متعدد طور سے مروی ہوں، اس لئے کہ ایسی احادیث ضعیف میں نہیں بلکہ حسن کے درجہ میں داخل ہیں اس کی صراحت ائمہ حدیث نے کردی ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ اگر ''ضعیف'' سوء حفظ یا اختلاط یا تدلیس کی وجہ سے ہو گو اس کا راوی صدق ودیانت سے متصف ہو تو اس کی تلافی تعدد طرق سے ہو جائے گی اور اگر اس کا ضعف اتہامِ کذب یا شذوذ یا خطائے فحش کی بناء پر ہو تو تعدد طرق سے اس کی تلافی ممکن نہیں، ایسی حدیث ''ضعیف'' ہی قرار پائے گی جو صرف فضائل اعمال میں ہی کارآمد ہو گی۔یہی حکم محدثین کے اس مقولے کیلئے بھی ہوگا: ''ضعیف کا ضعیف کے ساتھ ملنا قوت کیلئے مفید نہیں۔''

یعنی اس سے بھی وہی ضعیف روایات مراد ہیں جن کے ضعف کی تعدد طرق سے تلافی نہیں ہوتی، اگر یہ مطلب نہ لیا جائے تو محدثین کا یہ قول لغو قرار پائے گا۔فتدبر۔

اصح الاسانید کا بیان:

مطلقاً کسی خاص سند کو اصح الاسانید (سب سے زیادہ صحیح سند) کہنے میں اختلاف ہے۔

① بعض نے اشخاص کے اعتبار سے یہ حکم لگایا ہے۔مثلاً:

بعض نے ''زھری زین العابدین عن ابیه عن جده'' کو ''اصح الاسانید'' کہا ہے۔

بعض نے ''مالك عن نافع عن ابن عمر'' کو ''اصح الاسانید'' کہا ہے۔

بعض نے ''سالم عن ابن عمر'' کو ''اصح الاسانید'' کہا ہے۔

② بعض نے کسی علاقہ کے اشخاص ورواۃ کے اعتبار سے یہ حکم لگایا ہے۔

③ بعض نے صحابہ اور مخصوص اساتذہ وشیوخِ حدیث کے اعتبار سے یہ حکم لگایا ہے۔

یہ حکم ہر ایک نے اپنی معلومات وتحقیقات مختلف ہونے کی بنیاد پر لگایا ہے۔لیکن صحیح بات یہ ہے کہ کسی ایک مخصوص سند پر'' اصح الاسانید'' ہونے کا مطلقاً حکم لگا دینا ٹھیک نہیں، کیونکہ صحت میں بہت سے مراتب ہیں اور صحت مراتب کا فرق شروطِ صحت کے پائے جانے اور نہ پائے جانے پر ہے۔اور کسی سند کے تمام رواۃ کا شروط صحت میں سے ہر ایک کے اعلیٰ درجہ پر ہونا شاذ ونادر ہی ہوتا ہے۔البتہ اس میں اس انداز کی قید لگا دی جائے کہ ''یہ فلاں شہر میں اصح الاسانید ہے۔'' یا ''فلاں باب یا فلاں مسئلہ میں اصح الا سانید ہے۔'' تو یہ صحیح ہے اور جن اسانید کے متعلق ائمہ حدیث نے کسی اعتبار سے یہ فیصلہ دیا ہے وہ ان اسانید پر راجح قرار پائیں گی جن کے متعلق ان سے یہ فیصلہ منقول نہیں ہے۔(واللہ اعلم)

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عادت کا بیان:

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی عادت ہے کہ وہ اپنی ''جامع ترمذی'' میں ایک ایک حدیث پر بیک وقت کئی کئی حکم لگا دیتے ہیں۔ مثلاً: ''یہ حدیث حسن صحیح ہے''۔ ''یہ غریب حسن ہے''۔ ''یہ حدیث حسن غریب اور صحیح ہے''۔جہاں تک تعلق ہے حسن اور صحت کے اجتماع کا تو حسن اور صحیح کے جواز میں بایں طور شبہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی حدیث ''حسن لذاته'' اور ''صحیح لغیرہ'' بھی ہو۔اور جہاں تک تعلق ہے غرابت اور صحت کے اجتماع کا تو اس میں بھی شبہ نہیں۔

غرابت اور حسن کے اجتماع میں لوگوں کو کچھ اشکال ہے، اس لئے کہ اصطلاحاً دونوں میں فرق بلکہ تباین ہے۔مزید یہ کہ امام ترمذی (رحمۃ اللہ علیہ) نے حسن میں تعدد طرق کا اعتبار کیا ہے تو پھر وہ غریب کیونکر ہوسکتی ہے (غریب میں تو طرق متعدد نہیں ہو سکتے۔)

چنانچہ علماء نے اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں:

① محدثین اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ان میں تعدد طرق کا اعتبار علی الاطلاق نہیں ہے بلکہ اس کی ایک قسم میں ہے اور جب حسن اور غرابت کے اجتماع کا حکم لگایا جائے تو اس سے مراد دوسری قسم ہوگی۔

② بعض نے اس کی توجیہ یہ پیش کی ہے کہ امام ترمذی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس طرح کی عبارات سے اختلاف طرق کی طرف اشارہ

کیا ہے کہ بعض طریق میں یہ حدیث غریب ہے اور بعض طریق میں حسن ہے۔

واضح رہے کہ یہ توجیہ صرف ان روایات میں ہی چل سکتی ہے جن کی دو یا دو سے زائد اسناد ہوں۔ اگر یہ عبارت، ایک ہی سند سے مروی حدیث کے بارے میں ارشاد فرمائی ہو تو توجیہ یہ ہوگی کہ بعض محدثین کے نزدیک یہ حدیث غریب ہے اور بعض کے نزدیک حسن ہے۔

۳) بعض نے اس کی توجیہ یہ پیش کی ہے کہ ایسے مواضع میں واؤ ''او'' کے معنی ہیں۔ یعنی امام ترمذی (رحمۃ اللہ علیہ) کو اس بارے میں یقینی علم نہ ہونے کی وجہ سے شک اور تردد ہے کہ آیا یہ حدیث غریب ہے یا حسن ہے۔

۴) بعض نے اس کی توجیہ یہ پیش کی ہے کہ یہاں ''حسن'' سے اس کے اصطلاحی معنی نہیں بلکہ لغوی معنی مراد ہیں، یعنی جس کی طرف طبیعت مائل ہو۔ لیکن یہ قول بہت مستبعد ہے۔

(۶) موضوع: وہ حدیث ہے جس کا راوی ''کذب علی النبی ﷺ '' کا مرتکب ہو اور اس حدیث کا من گھڑت ہونا معلوم ہو۔

(۷) متروک: وہ ضعیف حدیث ہے جس کا راوی متہم بالکذب ہو، یعنی جھوٹ بولنے کی تہمت اس پر عائد کی گئی ہو یا وہ روایت دین کے قواعد معلومہ کے خلاف ہو۔

(۸) شاذ: وہ حدیث ہے جس کا راوی ثقہ ہو مگر وہ ایسے ثقہ راویوں کی بڑی جماعت کی روایت کے خلاف کر رہا ہو جو اس سے زیادہ ثقہ ہیں۔

☆ شاذ کے لغوی معنی ہیں ''وہ شخص جو جماعت سے الگ ہو گیا ہو اور اس سے نکل گیا ہو۔''

''شاذ'' کی ایک تعریف دوسرے اعتبار سے یہ بھی ہے کہ وہ راوی ہے جو ایسے راوی کے خلاف بیان کرے جو اس سے زیادہ معتبر ہے۔

(۹) محفوظ: وہ حدیث ہے جو ''شاذ'' کے مقابل ہو۔

(۱۰) منکر: وہ حدیث ہے جس کو کوئی ضعیف راوی روایت کرے اور وہ ثقات کی مخالفت کرے۔

(۱۱) معروف: وہ حدیث ہے جو ''منکر'' کے مقابل ہو۔

منکر و معروف اور شاذ و محفوظ میں فرق:

☆ ''شاذ'' اور ''منکر'' مرجوح ہوتے ہیں اور ''محفوظ'' و ''معروف'' راجح ہوتے ہیں۔

☆ ''شاذ'' اور ''محفوظ'' میں راوی قوی ہوتے ہیں لیکن ایک زیادہ قوی ہوتا ہے۔

☆ ''منکر'' اور ''معروف'' دونوں روایتوں کے راوی ضعیف ہوتے ہیں لیکن ایک زیادہ ضعیف ہوتا ہے۔

(۱۲) معلل: (بفتح لام) وہ حدیث ہے جس کی اسناد میں علت خفیہ قادحہ پائی جائے۔

جیسے: موصول حدیث کو مرسل کر دینا اور مرفوع کو موقوف کر دینا۔

☆ علت خفیہ قادحہ سے مراد سند حدیث میں پائے جانے والی وہ علتیں اور خفی اسباب ہیں جو صحت حدیث کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان علل وخفی اسباب پر علم حدیث کے ماہر ہی خبر دار ہو سکتے ہیں۔

☆ کبھی معلل (بکسر لام) کی عبارت اپنے دعوے پر دلیل قائم کرنے سے قاصر رہتی ہے جس طرح دینار و دراہم کے پرکھنے میں صراف اپنے دعویٰ پر دلیل نہیں پیش کر سکتا۔

(۱۳) مضطرب: وہ حدیث ہے جس کے اسناد یا متن میں راوی اس طرح تبدیلی کر دے کہ اس میں ترجیح یا تطبیق ممکن نہ ہو۔

اس اختلاف کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں:

❶ اسناد یا متن میں تقدیم وتاخیر یا کمی بیشی ہو۔

❷ ایک راوی کی جگہ دوسرا راوی ہو یا ایک متن کی جگہ دوسرا متن ہو۔

❸ اسمائے سند یا اجزائے متن میں تصحیف ہو یا اختصار ہو یا حذف ہو۔

حدیث مضطرب کا حکم: اگر ان احادیث کے درمیان جمع وتوفیق ممکن ہو تو راجح کو مقبول اور مرجوح کو غیر مقبول کہیں گے۔ اگر ترجیح ممکن نہ ہو تو اس کا حکم توقف ہے۔

(۱۴) مقلوب: وہ حدیث ہے جس کے متن یا سند میں تقدیم وتاخیر واقع ہوئی ہو یا ایک راوی کی جگہ دوسرے راوی کو ذکر کیا جائے۔

(۱۵) مصحف: وہ حدیث ہے جس کی خطی صورت برقرار رہنے کے باوجود نقطوں یا حرکت وسکون میں تغیر کی وجہ سے تلفظ میں غلطی واقع ہو رہی ہو۔

(۱۶) مدرج: وہ حدیث ہے جس میں کوئی راوی کسی جگہ اپنا یا کسی صحابی وتابعی کا کلام شامل کر دے۔

عام طور پر اس درج کلام کی غرض لغت کے مفہوم یا معنی کی وضاحت یا مطلق کی تقیید مقصود ہوتی ہے۔

☆ اگر راوی متن حدیث میں اپنی طرف سے کوئی چیز اس طرح بڑھا دے کہ اصل حدیث اور اس زائد عبارت میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے تو جان بوجھ کر ایسا کرنا حرام ہے۔

خبر واحد کی چوتھی تقسیم:

''خبر واحد'' سقوط وعدم سقوط راوی کے اعتبار سے سات قسم پر ہے:

① متصل ② مسند ③ منقطع ④ معلق ⑤ معضل ⑥ مرسل ⑦ مدلس

① متصل: وہ حدیث ہے جس کی سند کے درمیان سے کوئی راوی ساقط نہ ہو۔

عدم سقوط کو "اتصال" کہا جاتا ہے اور سقوط کو "انقطاع" کہا جاتا ہے۔

② مسند: وہ حدیث ہے جس کی سند حضور اکرم ﷺ تک متصل ہو۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے "مسند" کی مندرجہ ذیل تین تعریفات ذکر کی ہیں:

1. ہر وہ مرفوع حدیث جس کی سند متصل ہو "مسند" ہے۔ "مسند" کی یہی مشہور اور معتمد علیہ تعریف ہے۔
2. بعض کے نزدیک ہر متصل السند "مسند" ہے چاہے موقوف ہو یا مقطوع۔
3. بعض کے خیال میں ہر مرفوع "مسند" ہے چاہے وہ مرسل ہو، یا معضل ہو یا منقطع ہو۔

③ منقطع: وہ حدیث ہے جس کی سند کے درمیان سے کوئی راوی ساقط ہو۔

فوائد:

1. منقطع کی مذکورہ بالا تعریف میں "منقطع" مطلقاً غیر متصل کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اس صورت میں یہ ایک مقسم قرار پائے گا جو تمام اقسام (یعنی معلق، معضل و مرسل) کو شامل ہوگا۔

اور اگر مذکورہ بالا تعریف پر یہ اضافہ کیا جائے کہ خواہ ایک راوی ساقط ہو یا ایک سے زیادہ راوی ساقط ہوں لیکن پے در پے نہ ہوں بلکہ مختلف جگہوں سے ہوں۔ تو اس معنی میں "منقطع" غیر مفصل حدیث کی ایک قسم بن جاتی ہے۔

2. انقطاع اور سقوطِ راوی کا علم، راوی اور مروی عنہ کے درمیان عدم ملاقات سے ہوتا ہے، اور عدم ملاقات ہم عصر نہ ہونے یا اجتماع نہ ہونے کے سبب سے ہوگی یا اس وجہ سے کہ روایت حدیث کی اجازت نہ ملی ہو، اور ان سب چیزوں کا علم راویوں کی تاریخ ولادت، ان کی تاریخ وفات، ان کے طلب علم اور سفر کے اوقات کے تعین ہی سے ہوسکتا ہے، اسی لئے محدثین کے نزدیک "علم تاریخ" بھی ایک بنیادی اور ضروری علم ہے۔

④ معلق: وہ حدیث ہے جس کی سند کی ابتداء ہی میں کوئی راوی ساقط ہو۔ اس سقوط کا نام "تعلیق" ہے۔

ساقط ہونے والا کبھی ایک ہوتا ہے، کبھی ایک سے زیادہ ہوتا ہے اور کبھی پوری سند حذف کر دی جاتی ہے، جیسا کہ عام مصنفین کی عادت ہے کہ وہ اس طرح روایت کرتے ہیں: قال رسول اللہ ﷺ کہ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا"۔

تعلیقات بخاری کا حکم:

تراجم صحیح بخاری میں بکثرت تعلیقات ہیں لیکن یہ سب تعلیقات "اتصال" کے حکم میں ہیں۔ اس لئے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی اس کتاب میں صحیح احادیث ہی لانے کا التزام کیا لیکن ان تعلیقات کے سوا جن کی سند اپنی کتاب میں دوسری جگہ بیان کر دی ہے یہ تعلیقات ان کے مسانید کے درجے کے نہیں ہیں۔

اور بعض لوگوں نے اس میں یہ فرق کیا ہے کہ جس کو امام بخاریؒ رحمہ اللہ نے جزم اور یقین کے صیغہ کے ساتھ بیان کیا ہے اور

وہ دلالت کرتا ہوا اس بات پر کہ اس کی سند امام بخاری (رحمہ اللہ) کے نزدیک ثابت ہے تو وہ قطعاً صحیح ہے۔

جیسا کہ امام صاحب (رحمہ اللہ) کا یہ کہنا: قال فلان اوذکر فلان (فلاں نے کہا یا فلاں نے ذکر کیا۔)

اور اگر صیغۂ تمریض و مجہول کے ساتھ بیان کیا ہو، جیسے: قیل یایقال یاذکر (یعنی کہا گیا ہے یا کہا جاتا ہے یا ذکر کیا جاتا ہے) تو اس کی صحت میں ان کے نزدیک کلام ہے، لیکن جب وہ اپنی کتاب (بخاری شریف) میں لائے ہیں تو وہ اس کی اصل ان کے نزدیک ثابت ہے، اس لئے محدثین کا قول ہے کہ بخاری شریف کی تعلیقات متصل اور صحیح ہیں۔

۵ معضل: وہ حدیث ہے جس کی سند کے درمیان سے پے در پے دو راوی ساقط ہوں۔

۶ مرسل: وہ حدیث ہے جس کی سند کی انتہا میں تابعی کے بعد کوئی راوی ساقط ہو۔ اس فعل کا نام "ارسال" ہے۔

جیسے کوئی تابعی خواہ چھوٹا ہو یا بڑا یوں کہے: قال رسول الله ﷺ کذا (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔)

☆ کبھی محدثین کے نزدیک مرسل اور منقطع کا ایک ہی مفہوم ہوتا ہے لیکن پہلی اصطلاح زیادہ مشہور ہے۔

مرسل روایت کا حکم:

اگر یہ معلوم ہو کہ تابعی کی عادت ثقہ ہی سے ارسال کرنے کی ہے تو اس کی روایت قبول کرنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس لئے کہ یہ غیر معلوم ہے کہ ساقط ہونے والا ثقہ ہے یا غیر ثقہ، بعض اوقات ایک تابعی دوسرے تابعی سے بھی روایت کرتا ہے اور تابعین میں ثقہ وغیر دونوں ہوتے ہیں۔

جمہور احناف، مالکیہ اور محدثین کی ایک جماعت کے نزدیک مرسل روایت مقبول ہے۔

امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اسلاف میں سے اکثر علماء مثلاً امام سفیان ثوری، مالک اور اوزاعی کے نزدیک مرسل مقبول ہے، اور حقیقت میں جنہوں نے مرسل کو ترک کیا ہے وہ یحی بن قطان اور ابن مہدی وغیر ہم ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر "مرسل" کی تائید کسی دوسری مرسل یا مسند سے ہو، اگرچہ وہ ضعیف ہے تو وہ مرسل مقبول ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے "شرح المھذب" میں لکھا ہے:

"ہمارے شافعیہ اور جمہور محدثین و بعض فقہاء و اصولیین کے نزدیک مرسل سے احتجاج کرنا صحیح نہیں۔"

امام احمد (رحمہ اللہ) سے اس بارے میں دو قول منقول ہیں، ان سے منقول قبول مرسل والی روایت غریب ہے۔

اگر یہ معلوم ہو کہ تابعی کی عادت بغیر کسی امتیاز کے ثقات وغیر ثقات دونوں سے ارسال کرنے کی ہو تو پھر بالاتفاق اس کا حکم توقف کا ہے۔

۷ مدلَّس: وہ حدیث ہے کہ جس کے راوی کی عادت اپنے شیخ یا شیخ کے شیخ کے نام کو چھپا لینے کی ہو۔

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ راوی اپنے اس شیخ (استاذ) کا نام تو نہ لے جس سے اس نے یہ حدیث سنی ہے، البتہ اس کے

اوپر کے راوی سے ایسے الفاظ میں روایت کرے جس سے یہ وہم ہوتا ہو کہ اس نے اسی اوپر والے راوی سے سنا ہے۔ جیسے: عن فلانٍ، یا قال فلان کہے۔ اس فعل کا نام ''تَدلِیس'' ہے، اس فعل کا مرتکب ''مُدَلِّس'' (بضم میم وبکسر لام) کہلاتا ہے اور وہ حدیث جس میں یہ فعل واقع ہوا ہو ''مُدَلَّس'' (بضم میم وفتح لام مشددہ) کہلاتی ہے۔

وجہ تسمیہ:

''تدلیس'' کے لغوی معنی ہیں: بائع کا خریدار سے سودے کے عیب کو بیع کے وقت چھپانا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ''دلس'' سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں: تاریکی، پوشیدگی، دھوکہ۔ اس حدیث کو ''مدلس'' کہنے کی وجہ واضح ہے کہ اس میں یہ معنی پائے جاتے ہیں۔

تدلیس کا حکم:

شمنی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ائمہ فن کے نزدیک تدلیس حرام ہے۔ امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جب تدلیس کپڑوں میں جائز نہیں تو حدیث میں کس طرح جائز ہوسکتی ہے اور شعبہ رحمۃ اللہ علیہ نے تو اس کی بہت زیادہ مذمت کی ہے۔

مدلس کی روایات قبول کرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔

اہل حدیث وفقہ کے ایک گروہ کے نزدیک یہ تدلیس جرح (عیب) ہے اور جس شخص کے متعلق معلوم ہو جائے کہ وہ تدلیس کرتا ہے اس کی حدیث مطلقاً غیر مقبول ہے۔ اور بعض کے خیال میں مقبول ہے۔

جمہور کے نزدیک اس میں تفصیل ہے:

1. اس شخص کی تدلیس قابل قبول ہے جس کے متعلق معلوم ہو کہ وہ ثقہ ہی سے تدلیس کرتا ہے۔ جیسے ابن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔
2. اس شخص کی تدلیس مردود ہے جو ضعیف وغیرہ ضعیف سب سے تدلیس کرتا ہے، الا یہ کہ وہ الفاظ سماع ''سمعت'' یا ''حدثنا'' یا ''اخبرنا'' کے ذریعے سے سماعت کی صراحت کردے۔ چنانچہ شیخ (حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ) کہتے ہیں:

''جس سے تدلیس ثابت ہو اس کا حکم یہ ہے کہ اس سے حدیث قبول نہ کی جائے گی الا یہ کہ وہ تحدیث کی صراحت کردے۔''

اسباب تدلیس:

تدلیس کے مختلف اسباب ہوتے ہیں:

بعض مرتبہ اس کے پس پردہ کوئی غرض فاسد ہوتی ہے۔ جیسے کوئی راوی اپنے شیخ کی نوعمری کے باعث اس سے اپنے سماع کو چھپانے کی کوشش کرے۔

بعض مرتبہ اس وجہ سے تدلیس کرتا ہے کہ وہ شیخ لوگوں میں کوئی خاص شہرت ومقام نہیں رکھتا۔

فوائد:

1. بعض اکابر محدثین (مثل ابن عیینہ رحمہ اللہ وغیرہ) سے جو تدلیس واقع ہوئی ہے اس کی حیثیت یہ نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہیں حدیث کی صحت پر کامل اعتماد تھا اور وہ شہرت وغیرہ سے بے نیاز تھے۔
2. خبر واحد کی تیسری اور چوتھی تقسیم کو خلط کرتے ہوئے بعض اہلِ علم نے یوں بھی بیان کیا ہے کہ ''خبر واحد'' اپنے ثبوت وعدم ثبوت کے اعتبار سے دو اقسام پر ہے: (۱) مقبول (۲) مردود

اقسام مقبول:

''خبر مقبول'' میں دو تقسیمات جاری ہوتی ہیں۔

(اول) قوت میں فرق مراتب کے اعتبار سے ہے۔ (ثانی) خبر واحد مقبول کی باعتبار عمل کے ہے۔

پہلی تقسیم: حدیث مقبول کی باعتبار فرق مراتب دو بنیادی قسمیں ہیں:

(۱) صحیح (۲) حسن

پھر ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں۔ یوں مقبول کی چار قسمیں بن جاتی ہیں:

(۱) صحیح لذاتہ (۲) حسن لذاتہ (۳) صحیح لغیرہ (۴) حسن لغیرہ

ملاحظہ: ان چاروں اقسام کی تعریفات ابھی ماقبل میں گذری ہیں۔

دوسری تقسیم: خبر واحد مقبول کی باعتبار عمل دو قسمیں ہیں:

(۱) معمول بہ (۲) غیر معمول بہ

اقسام مردود:

علماء نے خبر مردود کی بہت سی قسمیں ذکر کی ہیں۔ کسی بھی خبر کے مردود ہونے کا کوئی نہ کوئی سبب ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اسباب رد کئی ہیں جن کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

(۱) سقوط از سند (۲) طعن بر راوی

انواع سقوط:۔ سقوط از سند کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ظاہری سقوط (۲) مخفی سقوط

ظاہری سقوط کی بنیاد پر حدیث مردود کی چار اقسام ہیں:

(۱) معلق (۲) مرسل (۳) معضل (۴) منقطع

ملاحظہ: ان چاروں اقسام کی تعریفات پچھلے صفحات پر گذری ہیں۔

''سقوط خفی'' پر مشتمل حدیث کے دوعناوین ہیں:

(۱) مُدَلَّس (۲) مرسل خفی

(۱) مُدَلَّس: (اس کی تعریف ابھی ماقبل میں گذری ہے۔)

(۲) مرسل خفی: وہ حدیث جس کو راوی کسی ایسے شخص سے نقل کرے جس سے اس کی معاصرت کے باوجود ملاقات یا سماع ثابت نہ ہو۔

مرسل خفی کا حکم:

یہ ضعیف ہے، اس لئے کہ اس میں انقطاع ہے۔

مردود بسبب طعن در راوی: اسباب طعن دس ہیں جو دو حصوں میں تقسیم ہیں:

(۱) اسباب طعن متعلق بعدالت (۲) اسباب طعن متعلق بضبط

﴿متعلق بعدالت اسبابِ طعن﴾

''عدالت'' سے متعلق طعن کی وجوہ پانچ ہیں:

① کذب ② اتہام کذب ③ فسق ④ جہالت ⑤ بدعت

ان اسباب طعن سے متصف راوی کے اعتبار سے حدیث کو مختلف عنوان دیئے جاتے ہیں جو کہ آگے آرہے ہیں۔

(۱) کذب:

محدثین کی اصطلاح میں کذبِ راوی سے مراد یہ ہے کہ حدیث نبوی ﷺ میں اس کا جھوٹ بولنا ثابت ہو گیا ہو۔ یہ ثبوتِ کذب یا تو خود واضع کے اقرار سے ہو یا دیگر قرائن سے ہو۔ مطعون بالکذب راوی کی حدیث کو ''موضوع'' کہا جاتا ہے۔

کاذب کی روایت کا حکم:

جس شخص کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے حدیث میں عمداً جھوٹ سے کام لیا ہے گو اس پوری عمر میں صرف ایک مرتبہ ہی ایسا کیا ہے اور پھر اس سے تائب بھی ہو گیا ہو اس کی حدیث پھر کبھی قابل قبول نہ ہوگی، بخلاف جھوٹے گواہ کے، کہ وہ توبہ کرلے تو اس کے بعد اس کا قول مقبول ہو جاتا ہے۔

یہ مسئلہ ظنی ہے۔ وضع اور افتراء کا حکم ظن غالب پر ہوتا ہے اس میں قطعیت اور یقین ممکن نہیں، اس لئے کہ جھوٹے سے بھی کبھی سچ کا صدور بھی ہو جاتا ہے۔ اس سے اس قول کا بھی رد ہو جاتا ہے کہ وضع حدیث کا علم واضع کے اقرار کی بناء پر ہو۔

وجہِ رد یہ ہے کہ ممکن ہے کہ وہ اس اقرار میں بھی کاذب ہو اس کا سچ ہونا ظن غالب کی بناء پر سمجھا جائے گا، اگر ایسا نہ ہوتا تو قتل کرنے کا اقرار کرنے والے کا قتل اور زنا کا اعتراف کرنے والے رجم جائز نہ ہوتا۔

۲ اتہام کذب:

راوی کے کذب ہونے کے ساتھ متہم کی صورت یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ عام گفتگو میں اس کا جھوٹا ہونا مشہور و معروف ہو۔ تاہم حدیث نبوی ﷺ میں اس کذب کا ہونا ثابت نہ ہو۔ تہمتِ کذب سے متصف راوی کی حدیث کو ''متروک'' کہا جاتا ہے۔

اسی حکم میں اس شخص کی روایت بھی داخل ہے جو شریعت کے قواعد ضروریہ معلومہ کے خلاف ہو۔ اس قسم کے راوی کا نام ''متروک'' ہے۔ جیسے کہا جائے: ''اس کی حدیث متروک ہے'' اور ''فلاں متروک الحدیث ہے''۔ اگر اس شخص نے صدق دل سے توبہ کر لی ہو اور علاماتِ صدق اس کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوں تو اس سے حدیث کا سماع جائز ہے۔

وہ شخص جس سے حدیث نبوی ﷺ کے علاوہ گفتگو میں کبھی کبھی کذب واقع ہو تو یہ اس کی حدیث کو ''موضوع'' یا ''متروک'' کہنے کے لئے کافی نہ ہوگا اگرچہ (عام گفتگو میں کسی بھی وقت کذب بیانی) معصیت ہے۔

۳ فسق:

''فسق'' سے مراد عملی فسق ہے۔ فسق سے متصف راوی کی حدیث کو ''منکر'' کہا جاتا ہے۔

یہاں ''فسق اعتقادی'' مراد نہیں ہے، چونکہ اعتقادی فسق تو بدعت میں داخل ہے۔ اکثر بدعت کا استعمال اعتقاد ہی میں ہوتا ہے اور ''کذب'' اگرچہ فسق میں داخل ہے لیکن اس کو علیحدہ مستقل شمار کیا ہے، چونکہ ''کذب'' انتہائی شدید طعن ہے۔

۴ جہالت:

راوی کی جہالت بھی حدیث میں طعن کا سبب ہے۔ اس لئے کہ جب راوی کا نام اور اس کی ذات معلوم نہ ہو تو اس کے حالات بھی معلوم نہ ہوں گے اور نہ اس کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کا پتہ چلے گا۔ جیسے کوئی شخص کہے: ''حدثني رجل'' یا ''اخبرني شيخ'' (مجھ سے کسی آدمی نے حدیث بیان کی، یا مجھے ایک شیخ نے خبر دی)

جہالت سے متصف راوی کی حدیث کا کوئی خاص نام نہیں ہے۔ ہاں البتہ جہالت سے متصف راوی اور اس کی حدیث (یعنی دونوں میں سے ہر ایک) کو ''مجہول'' اور ''مبہم'' کہہ سکتے ہیں۔

اور حدیث مبہم غیر مقبول ہے۔ الا یہ کہ راوی صحابی ہو، اسلئے کہ صحابی سب کے سب عدول ہیں۔ اگر تعدیل کے لفظ کے ساتھ بیان کیا جائے تو جس طرح کے کوئی کہے: ''اخبرني عدل'' یا ''حدثني ثقة'' تو اس میں اختلاف ہے، لیکن صحیح تر بات یہی ہے کہ غیر مقبول ہے، اس لئے کہ ممکن ہے کہ راوی کے خیال میں تو عادل ہو لیکن نفس الامر میں عادل نہ ہو۔ البتہ کوئی امام حاذق بیان کرے تو مقبول ہے۔

⑤ **بدعت:**

''بدعت'' سے مراد یہ ہے کہ دین کی معروف باتوں کے خلاف اور اس کے خلاف جو رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) سے منقول ہیں۔ کسی امر محدث (نو ایجاد کام) کا اعتقاد دو شبہ اور تادیل کی بناء پر کرنا، بطریق جحد وانکار نہیں، اس لئے کہ ایسا انکار تو کفر ہے۔ بدعت سے متصف راوی کی حدیث کا کوئی خاص نام نہیں ہے۔

بدعتی کی حدیث کا حکم:

❶ بدعتی کی حدیث جمہور کے نزدیک مردود ہے۔

❷ بعض کے نزدیک مقبول ہے بشرطیکہ صدق لہجہ اور زبان کی حفاظت کے ساتھ متصف ہو۔

❸ بعض کہتے ہیں کہ اگر وہ کسی ایسے تواتر شرعی کا انکار کرے جس کے متعلق یقینی علم ہو کہ وہ امر دین میں سے ہے تو وہ مردود ہے اور اگر اس طرح پر نہ ہو تو وہ مقبول ہے گو مخالفین اس کی تکفیر کریں، بشرطیکہ اس میں ضبط وورع ،تقویٰ واحتیاط اور صیانت کی صفات پائی جائیں۔

❹ بدعتی کے بارے میں مذہب مختار یہ ہے کہ اگر وہ بدعت کا داعی اور اس کا رائج کرنے والا ہو تو وہ مردود ہے، ورنہ مقبول ہے، بشرطیکہ وہ ایسی چیز روایت نہ کرتا ہو جس سے اس کی بدعت کو تقویت پہنچتی ہو۔ کیونکہ اس صورت میں وہ قطعا مردود ہے ۔مختصر یہ کہ اہلِ بدعت وہوا اور باطل مذاہب والوں سے حدیث اخذ کرنے میں اختلاف ہے۔

صاحب جامع الاصول نے کہا ہے:

محدثین کی ایک جماعت نے خوارج، قدریہ، روافض ،شیعہ اور دیگر اصحاب بدعت سے احادیث اخذ کی ہیں، اور ایک دوسری جماعت نے احتیاط سے کام لیا ہے اور ان تمام بدعتی فرقوں سے اخذِ حدیث میں اجتناب کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی نیت ہے۔''

بلاشبہ ان فرقوں سے حدیثوں کا اخذ کرنا بہت زیادہ تلاش وجستجو کے بعد معلوم ہوتا ہے، تاہم پھر بھی احتیاط اسی میں ہے کہ ان سے حدیث اخذ نہ کی جائے، اس لئے کہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ یہ فرق مبتدعہ اپنے مذاہب کی ترویج کیلئے حدیثیں گھڑا کرتے تھے اور توبہ ورجوع کے بعد اس کا اقرار کر لیتے تھے۔ (واللہ اعلم)

﴿متعلق بضبط اسبابِ طعن﴾

ضبط سے متعلق اسباب طعن بھی پانچ ہیں:

① زبانی اغلاط ② فرطِ غفلت ③ کثرت وہم ④ مخالفتِ ثقات ⑤ سوءِ حفظ

(الف) کثرتِ وہم سے متصف راوی کی حدیث کو ''معلل'' کہا جاتا ہے۔

فرطِ غفلت اور کثرتِ غلط دونوں قریب المعانی ہیں۔ ''غفلت'' کا تعلق سماع اور تحصیلِ حدیث سے ہے۔ ''غلط'' کا تعلق بیان کرنے اور پہنچانے سے ہے۔

زبانی اغلاط کرنے والے راوی اور غفلت سے متصف راوی کی حدیث کو (بھی) ''منکر'' کہا جاتا ہے۔

④ مخالفت ثقات:

اسناد یا متن میں ثقات کی مخالفت چند طریقوں پر ہوتی ہے جو شذوذ کا باعث ہوتی ہے۔ اسے (یعنی مخالفت ثقات کو) ضبط سے متعلق وجوہ طعن میں اس لئے شمار کیا گیا ہے کہ ثقات کی مخالفت کا سبب عدم ضبط وحفظ اور تغیر وتبدل سے محفوظ ہونا ہے، اور طعن وہم اور نسیان کے سبب ہوتا ہے، کہ راوی ان دونوں کی وجہ سے غلطی کر کے وہم کے طور پر روایت کرتا ہے، اس وہم کی اطلاع اگر ایسے قرائن سے ہوجائے جو اس کی غفلت اور قدح کے اسباب وعلل پر دلالت کرتے ہوں تو وہ حدیث معلل ہوگی۔

مخالفت ثقات سے متصف راوی کی حدیث کا کوئی مستقل عنوان نہیں ہے، ایسی حدیث شاذ، منکر، مدرج، مقلوب، مضطرب ومصحف وغیرہ میں سے ہوتی ہے، اور وجہ واضح ہے کہ ان تمام میں مختلف نوعیت کی مخالفتِ ثقات پائی جاتی ہے۔

علم حدیث میں یہ زیادہ دقیق اور غامض مسئلہ ہے اس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے فہم ثاقب اور وسیع حافظہ عطا کیا ہو اور وہ اسانید ومتون کے احوال اور رواۃ کے مراتب کی معرفت تامہ رکھتے ہوں جیسے متقدمین میں اس فن کے ارباب کمال ہیں جن کا سلسلہ امام دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچ کر ختم ہوجاتا ہے کہ ان کے بعد اس فن میں ایسا صاحب کمال پیدا ہی نہیں ہوا۔ (واللہ اعلم)

⑤ سوءِ حفظ:

سوءِ حفظ سے مراد محدثین کے نزدیک یہ ہے کہ راوی کی اصابت اس کی خطا پر غالب نہ ہو اور اس کا حفظ واتقان سہو ونسیان سے زیادہ نہ ہو۔ یعنی اگر خطا ونسیان اس کے صواب واتقان کے مساوی ہو یا غالب ہو تو یہ سوءِ حفظ میں داخل ہوگا۔ پس معتمد علیہ صواب واتقان اور ان کی کثرت ہے۔

سوءِ حفظ سے متصف راوی کی حدیث کا کوئی خاص نام نہیں ہے، بلکہ اس کے بارے میں تفصیل ہے۔

حافظہ کی خرابی (سوءِ حفظ) اگر ہر وقت مدت العمر راوی کے شامل حال رہی ہو تو اس کی حدیث غیر معتبر ہوگی۔ بعض محدثین کے نزدیک یہ بھی ''شاذ'' میں داخل ہے۔

اگر سوءِ حفظ کسی عارض کے سبب داخل ہو۔ جیسے کبرسنی، بینائی کے جاتے رہنے یا کتابوں کے ضائع ہوجانے کے سبب حافظہ میں خلل پیدا ہوجائے تو اسے ''مختلط'' کہا جائے گا۔

پس ایسے راوی کی اختلاط واختلال سے قبل روایت کردہ احادیث مقبول ہونگی بشرطیکہ وہ روایات اس حالت کے طاری ہونے کے بعد والی روایتوں سے ممتاز ہوں۔ اگر ممتاز نہ ہوں تو توقف کیا جائے گا۔ اگر مشتبہ ہو تب بھی یہی حکم ہے۔ اور اگر ایسے

مختلط راوی کی بیان کردہ حدیثوں کیلئے متابعات اور شواہد ہوں تو پھر بجائے وہ مردود ہونے کے قبولیت ورجحان کا درجہ پائیں گی اور یہی حکم مستور، مدلس، اور مرسل احادیث کا ہے۔

سوء حفظ طاری وعارضی سے متصف راوی کی حدیث ''مختلط'' کہلاتی ہے۔اس نوع کی حدیث مقبول ومردود بھی ہوسکتی ہے اور متوقف فیہ بھی ہوسکتی ہے۔

☆ بعض حضرات کی رائے کے مطابق سوءِ حفظ لازمی سے متصف راوی کی حدیث ''شاذ'' کہلاتی ہے۔

خبر واحد کی چوتھی تقسیم:

''خبر واحد'' کی صیغہ ادا کے اعتبار سے دو قسمیں ہیں: ① معنعن ② مسلسل

① معنعن: وہ حدیث ہے جو ''عنعنه'' کے طور پر بیان کی جائے۔

☆ معنعن ''عنعنة'' سے ماخوذ ہے، اس کا معنی ہے: عن فلان عن فلان کے الفاظ کے ساتھ حدیث بیان کرنا۔

☆ عنعنہ میں امام مسلم (رحمۃ اللہ علیہ) کے نزدیک معاصرت (ہم زمانہ ہونا)، امام بخاری (رحمۃ اللہ علیہ) کے نزدیک ملاقات اور دوسرے محدثین کے نزدیک اخذ شرط ہے۔امام مسلم (رحمۃ اللہ علیہ) نے دونوں فریقوں کا بڑے شدّ ومدّ سے رد کیا ہے۔

حدیث معنعن کا حکم: مدلس کا عنعنہ غیر مقبول ہے۔

② حدیث مسلسل: وہ حدیث ہے جس کی سند کے تمام راوی کسی ایک وصف یا خاص لفظ یا کسی خاص فعل پر متفق ہوگئے ہوں۔

﴿روایت بالمعنی کا بیان﴾

روایت بالمعنی کے بارے میں کافی اختلاف ہے۔

اکثر اس بات کے قائل ہیں کہ ایسا اس شخص کے لئے جائز ہے جو عربی زبان کے اسلوب کلام کا عالم وماہر ہو ترکیبوں کے خواص اور خطاب کے مفہومات سے واقف ہوتا کہ زیادتی اور کمی کے ذریعے غلطی نہ کرسکے۔

بعض کہتے ہیں یہ مفرد الفاظ میں جائز ہے، مرکبات میں نہیں۔

بعض کے نزدیک اس کے لئے جائز ہے جس کو حدیث کے الفاظ زبانی یاد ہوں تاکہ اس میں تصرف پر وہ پوری طرح قادر ہو۔

بعض کہتے ہیں کہ اس کے لئے جائز ہے جسے حدیث کے معنی تو یاد ہوں لیکن الفاظ بھول گیا ہو، کیونکہ ایسا کرنا تحصیل احکام کی بناء پر ضروری ہے اور جسے الفاظ حدیث یاد ہوں اس کیلئے روایت بالمعنی جائز نہیں اس لئے کہ اس کو اس کی ضرورت ہی نہیں۔

یہ اختلاف جواز اور عدم جواز میں ہے۔جہاں تک بغیر کسی تصرف کے الفاظ حدیث روایت کرنے کا تعلق ہے تو اس کی افضلیت میں سب کا اتفاق ہے، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''نضر الله امرأ سمع مقالتي فوعاها واداها فرب حامل فقه غير فقيه ورب حامل فقه الى من هو افقه منه''

''اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز وشاداب رکھے جس نے میری باتیں سنی انہیں یاد رکھا اور اس کو دوسروں تک پہنچایا جس طرح مجھ سے سنا''۔

روایت بالمعنی صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث میں بکثرت موجود ہیں۔

﴿صحتِ حدیث کے معیار کا بیان﴾

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے طبقات کتب کے جو مراتب قرار دیئے ہیں ان میں حدیث کی صحت وقوت کا مدار گویا کتب پر رکھا ہے، چنانچہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ صحیحین کی احادیث کو غیر صحیحین پر مقدم رکھتے ہیں، اور گویا کسی حدیث کا بخاری ومسلم میں ہونا ہی ترجیح کیلئے کافی ہے۔ یہی مسلک محدث ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے صحت حدیث کا مدار کتب پر نہیں رکھا بلکہ صحت حدیث کا مدار رجال سند اور اصول نقد پر رکھا ہے۔ محقق علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک بھی یہی ہے۔

﴿صحاح ستہ کا بیان﴾

واضح رہے کہ متقدمین کے ہاں ''امہات کتب'' پانچ ہی ہیں۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ''تقریب'' میں انہی پانچ کتب کو کتب صحاح میں شمار کیا ہے۔ بعض علماء نے ''امہات کتب'' بجائے پانچ کے چھ قرار دی ہیں جو ''صحاح ستہ'' اور ''اصول ستہ'' کے نام سے مشہور ہیں۔ ان چھ کتابوں کو ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔

صحاح ستہ: وہ چھ مشہور کتابیں جو اہل اسلام میں پڑھائی جاتی ہیں۔ وہ کتابیں یہ ہیں:

❶ صحیح بخاری ❷ صحیح مسلم ❸ جامع ترمذی ❹ سنن ابی داؤد ❺ نسائی ❻ سنن ابن ماجہ۔

علماء کے نزدیک اول الذکر پانچ کتابیں اجماعی طور پر صحاح میں داخل ہیں لیکن چھٹی کتاب میں اختلاف ہے کہ وہ کونسی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سنن ابن ماجہ کو کتب صحاح میں سب سے پہلے ابن طاہر المقدسی رحمۃ اللہ علیہ نے داخل کیا۔ یہ ابن طاہر مقدسی رحمۃ اللہ علیہ وہی ہیں جن کی دو کتابیں ''شروط الائمة الستة'' اور ''اطراف الكتب الستة'' بہت مشہور ہیں۔ ان دونوں کتب میں ابن ماجہ کو صحاح میں بطور چھٹی کتاب کے شامل کیا ہے۔ بعض کے نزدیک چھٹی کتاب سنن ابن ماجہ کی جگہ مؤطا امام مالک ہے۔ صاحب ''جامع الاصول لاحادیث الرسول'' نے بھی مؤطا کو ہی اختیار کیا ہے۔ لیکن بعض حضرات نے مؤطا کا اعتبار نہیں کیا ہے کیونکہ مؤطا کے اندر حدیث کم ہیں اور آثار صحابہ زیادہ ہیں اگرچہ سند کے اعتبار سے سب صحیح ہیں۔

ابوسعید العلائی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر بعض علماء کے خیال میں سنن دارمی کو چھٹی کتاب شمار کیا جانا زیادہ مناسب اور لائق ہے۔ اس

لئے کہ اس کے رجال میں ضعف کم اور اس کی احادیث میں منکر وشاذ حدیثیں نادر ہیں اس کی سندیں عالی ہیں اور اس کی ثلاثیات بخاری کی ثلاثیات سے زیادہ ہیں۔

ابوالحسن سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ طحاوی کی شرح معانی الآثار صحاح ستہ میں شمار کئے جانے کی زیادہ حقدار ہے۔

صحیحین: یہ اطلاق بخاری شریف اور مسلم شریف پر ہوتا ہے۔

سنن اربعہ: صحیحین کے علاوہ باقی چار کتابوں (یعنی ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ) کو ''سنن اربعہ'' کہتے ہیں۔

بعض عرب علماء تو ''صحاح ستہ'' کہنا ہی درست نہیں سمجھتے۔ ان کی رائے میں مبنی بر حقیقت تعبیر ''کتب ستہ'' ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ صحیح تو ان میں سے صرف دو کتابیں ہیں جن کو ''صحیحین'' کہا جاتا ہے۔ باقی چار کتابوں میں صحت کا التزام نہیں ہے۔ ان میں ہر طرح کی حدیثیں ہیں اگرچہ ان کے مؤلفین نے ضعف وغیرہ علل قادحہ کو بیان کر دیا ہے مگر بہر حال ان کی تمام حدیثیں صحیح نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں تغلیبا بھی صحاح ستہ کہنا درست ہے کیونکہ زیادہ تر احادیث سنن اربعہ میں صحیح ہیں۔

﴿صحیحین کی فضیلت کا بیان﴾

حدیث کی صحت وقوت کا مدار کتب کو قرار دینے والے حضرات فرماتے ہیں کہ جب مراتبِ صحیح میں تفاوت ہے کہ بعض بعض سے زیادہ صحیح ہیں تو معلوم ہونا چاہئے کہ نہ صرف جمہور محدثین کے نزدیک یہ طے شدہ امر ہے بلکہ سارے ہی مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ''صحیح بخاری'' حدیث کی تمام تصنیف شدہ کتابوں میں مقدم ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے:

اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح البخاری

''کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب صحیح البخاری ہے۔''

بعض علماء نے ان دونوں کتب میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے میں توقف کیا ہے، لیکن شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پہلا مسلک صحیح ہے (جس کی رو سے صحیح بخاری کو ترجیح حاصل ہے۔)

ایک اشکال:

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے: ''ما تحت ادیم السماء اصح من المؤطا''۔ اس سے معلوم ہوا کہ مؤطا امام مالک'' بخاری

شریف'' سے بھی اصح ہے اور اگر اصح وافضل نہیں تو کم از کم اس کے درجہ میں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمان ''بخاری شریف'' کی تصنیف سے پہلے کا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ''بخاری شریف'' کی تصنیف سے قبل سب سے اصح ''مؤطا امام مالک'' ہی تھی۔

واضح رہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا سن وفات ۲۰۴ ہجری ہے، اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا سن ولادت ۱۹۴ ہجری ہے۔ اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے وقت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی عمر صرف دس سال تھی۔

ایک اشکال:

صاحب مستدرک رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ ابوعلی نیشا بوری رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے:

''ما تحت ادیم السماء کتاب اصح من مسلم''۔

اس سے معلوم ہوا کہ ''بخاری شریف'' کا اصح ہونا متفق علیہ نہیں ہے بلکہ مختلف فیہ ہے۔

علماء نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں:

پہلا جواب: یہ قول شاذ ہے اس لئے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

دوسرا جواب: ''مسلم شریف'' کے افضل اور اصح کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلم شریف ترتیب کی جودت اور حسن سلیقہ کے لحاظ سے اقدم ہے اس صورت میں کوئی اشکال نہیں کیونکہ بخاری شریف کے اندر اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث بخاری کے اندر اگر تلاش کرنا چاہیں تو اپنے موقع پر نہیں ملے گی الا قلیلا، بخلاف مسلم شریف کے، کہ اس میں ایک مضمون کی احادیث ایک جگہ جمع کر دی ہیں۔

جمہور کہتے ہیں کہ ایسے لوگوں نے صرف حسن بیان، وضع و ترتیب کی خوبی، دقیق اشارات کی رعایت اور اسناد میں نکات کی خوبیوں کو ہی پیش نظر رکھا ہے حالانکہ اس بناء پر ترجیح وغیر ترجیح خارج از بحث ہے۔ اصل گفتگو صحت و قوت اور اس سے تعلق رکھنے والی چیزوں میں ہے اور اس لحاظ سے کوئی کتاب ان شرائط اور کمال صفات کی بناء پر صحیح بخاری کے برابر نہیں جن کا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحت کے متعلق رجالِ حدیث میں خیال رکھا ہے۔

☆ کیا بخاری شریف مسلم شریف پر فائق ہے؟

بخاری شریف ہر اعتبار سے خصوصاً صحت کے اعتبار سے مسلم شریف پر فائق ہے۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ ''بخاری شریف'' کی متکلم فیہا روایات ''مسلم شریف'' کی متکلم فیہا روایات سے کم ہیں اگر چہ جواب سب کا دیا گیا ہے۔ چنانچہ ''بخاری شریف'' کی متکلم فیہ روایات ۷۸ ہیں اور ''مسلم شریف'' کی متکلم فیہ احادیث ۱۰۰ ہیں اور ۳۲ احادیث ایسی ہیں جن میں بخاری اور مسلم دونوں مشترک ہیں تو خلاصہ یہ نکلا کہ بخاری کی کل متکلم فیہ احادیث ۴۶ ہیں اور مسلم کی ۶۸ ہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح کا انتخاب چھ لاکھ احادیث میں سے فرمایا ہے جبکہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے صرف تین لاکھ احادیث سے انتخاب فرمایا۔

﴿صحیحین کی روایات کے مراتب﴾

متفق علیہ: وہ حدیث جس کی تخریج میں شیخین (یعنی امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ) متفق ہوں اسے ''متفق علیہ'' کہا جاتا ہے۔ شیخ (حافظ ابن حجر رحمہ اللہ) کہتے ہیں: بشرطیکہ وہ ایک ہی صحابی سے ہوں۔

محدثین نے کہا ہے کہ ''متفق علیہ'' احادیث دو ہزار تین سو چھبیس (2326) ہیں۔

مختصر یہ کہ جس حدیث پر شیخین متفق ہوں وہ حدیث دوسری حدیثوں پر مقدم ہیں۔

دوسرے نمبر پر وہ احادیث ہیں جنہیں صرف امام بخاری (رحمہ اللہ) نے روایت کیا۔

تیسرے نمبر پر وہ احادیث ہیں جنہیں امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا۔

چوتھے نمبر پر وہ احادیث ہیں جو بخاری و مسلم کی شرطوں کے مطابق ہیں۔

پانچویں نمبر پر وہ احادیث ہیں جو صرف امام بخاری (رحمہ اللہ) کی شرط پر ہوں۔

پھر وہ احادیث ہیں جو امام مسلم رحمہ اللہ کی شرط کے مطابق ہوں۔

اس کے بعد ان کے علاوہ ان ائمہ کی روایت کردہ حدیثیں ہیں جنہوں نے صحت کا التزام کیا اور ان کی تصحیح کی ہے۔

اس طرح یہ سات قسمیں ہوں گی۔

''بخاری و مسلم کی شرط'' سے کیا مراد ہے؟

''بخاری و مسلم کی شرط'' سے مراد یہ ہے کہ رجال حدیث ان صفات کے ساتھ متصف ہوں جن کے ساتھ بخاری و مسلم کے رجال ضبط، عدالت، عدم شذوذ و نکارت اور عدم غفلت میں متصف ہیں۔

اور بعض کے نزدیک ''شرط بخاری و مسلم'' سے مراد یہ ہے کہ اس کے رجال وہی ہوں جو بخاری و مسلم کے ہیں۔ بہر حال یہ ایک طویل بحث ہے جس کو ہم نے مقدمہ ''شرح سفر السعادۃ'' میں بیان کیا ہے۔

﴿غیر صحیحین کی صحت روایات کا بیان﴾

صحیح احادیث بخاری و مسلم میں ہی محصور نہیں، نہ ان دونوں نے صحیح احادیث کا استقصاء ہی کیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان میں جو احادیث ہیں وہ سب صحیح ہیں اور بہت سی ایسی احادیث ہیں جو ان کے نزدیک صحیح تھیں اور ان کی شرائط کے مطابق بھی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنی کتابوں میں نہیں لائے۔ چہ جائے کہ ایسی احادیث لاتے جو ان کے علاوہ دوسروں کے نزدیک صحیح تھیں۔

چنانچہ امام بخاری (رحمہ اللہ) فرماتے ہیں:

''میں اپنی اس کتاب (جامع صحیح) میں صرف صحیح احادیث ہی لایا ہوں اور بہت سی صحیح احادیث چھوڑ بھی دی ہیں۔''

اس صحیح سے ان کی مراد بظاہر (واللہ اعلم) وہ صحیح ہے جو ان کی شرطوں کے مطابق ہو۔

ایک موقع پر امام بخاری (رحمہ اللہ) فرماتے ہیں: ''مجھے ایک لاکھ صحیح احادیث اور دو لاکھ غیر صحیح احادیث یاد تھیں۔''

نیز بخاری و مسلم کی احادیث کے صحیح ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ بقیہ کتابوں میں جو احادیث ہیں وہ غلط ہیں بلکہ وہ بھی صحیح ہیں فرق صرف شرائط کا ہے۔ چنانچہ امام مسلمؒ رحمہ اللہ کا قول ہے:

''میں اپنی اس کتاب میں جو احادیث لایا ہوں وہ سب صحیح ہیں۔ تاہم میں یہ نہیں کہتا کہ جن احادیث کو میں نے چھوڑ دیا ہے وہ ضعیف ہیں۔''

البتہ اس ترک و اخذ میں وجوہ صحت اور دیگر مقاصد کو سامنے رکھا گیا ہے اور انہی کے مطابق ایسا کیا گیا ہے۔

امام حاکمؒ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب کے آغاز میں کہا ہے:

''امام بخاری و مسلم نے یہ فیصلہ کبھی نہیں دیا کہ ان کی کتابوں میں بیان کردہ احادیث کے علاوہ جو احادیث ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔''

بخاری شریف میں حدیث ہونے کیلئے یہ ضروری نہیں کہ وہ حدیث تعارض سے بھی سالم ہو۔

﴿صحاح ستہ کے باہمی مراتب کا بیان﴾

جمہور کے نزدیک پہلا درجہ بخاری شریف کا، دوسرا درجہ مسلم شریف کا، تیسرا درجہ سنن ابی داؤد کا ہے۔

ایک مختصر سی جماعت یہ کہتی ہے کہ مسلم اور ابوداؤد دونوں برابر ہیں کوئی ایک افضل نہیں۔ ابن سید الناس رحمہ اللہ کی رائے بھی یہی ہے۔ برابری کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ مسلم شریف کے خطبہ میں اس کے مصنف نے خود یہ فرمایا ہے کہ ''تمام احادیث کے رواۃ کا امام مالک و سفیان جیسا (ذمہ دار) ہونا ضروری نہیں بلکہ ان سے بھی کم درجہ روات سے روایات اس کتاب میں آئیں گی۔''

ایسے ہی امام ابوداؤد (رحمہ اللہ) نے اپنے اس خط میں جو اہل مکہ کو لکھا ہے تحریر فرماتے ہیں:

''وماکان فیه وهن شدید بینته '' یعنی جن روایات میں وہن شدید (کمزوری) ہے اس پر میں نے متنبہ کر دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ دونوں کتابوں میں جہاں اعلیٰ قسم کی احادیث ہیں وہاں کم درجہ کی احادیث بھی ہیں۔ مگر جمہور کی رائے یہ کہ ابوداؤد شریف مرتبہ ثالثہ میں ہے۔ طحاوی شریف بھی مرتبہ ثالثہ (یعنی ابوداؤد) کے درجہ میں ہے، کیونکہ ابن حزم ظاہری جیسے متشدد نے بھی طحاوی کو ابوداؤد کے درجہ میں رکھا ہے۔

چوتھا مرتبہ نسائی شریف کا ہے، قرین قیاس بھی یہی ہے اس لئے کہ ترمذی کی ایسی متکلم فیہا روایات تیس ہیں جن پر ابن الجوزی رحمہ اللہ نے وضع کا حکم لگایا ہے جبکہ نسائی شریف میں ایسی متکلم فیہا روایات صرف دس ہیں جن پر ابن الجوزی رحمہ اللہ نے وضع کا حکم لگایا ہے۔

بعض علماء نے نسائی کو ابوداؤد پر فوقیت دی ہے، ان شرائط کو دیکھتے ہوئے جن کا امام نسائی رحمہ اللہ نے التزام کیا ہے اور جن کو

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "زھر الربا" میں ذکر فرمایا ہے۔علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے بھی یہی ہے۔مگر اکثر کی رائے اس کے خلاف ہے۔

علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ امام نسائیؒ رحمۃ اللہ علیہ کا خود کا ارشاد ہے:

"ما اخرجت في الصغری فصحیح "۔یعنی میں نے اس سنن صغری میں جتنی روایات ذکر کی ہیں وہ سب صحیح ہیں۔

اور امام ابوداؤدؒ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن کے بارے میں فرمایا ہے:

" ما لم اذکر فیه شیئا فهو صالح " یعنی جس روایت پر میں کلام نہ کروں وہ صالح ہے۔

(اور ایسی روایات سنن ابی داؤد میں بہت ہیں) اور صالح عام ہے صحیح وحسن دونوں کو شامل ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ سنن صغری افضل ہے سنن ابوداؤد سے۔

بلکہ بقول علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ بعض مغاربہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ نسائی شریف کا درجہ بخاری سے بھی اونچا ہے۔

ان چاروں کے بعد ترمذی شریف ہے لیکن اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔بعض حضرات نے ترمذی شریف کو مسلم شریف کے بعد رکھا ہے اور بعض محدثین نے اس کو نسائی کے بعد رکھا ہے۔ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ترمذی کے اندر حدیث ضعیفہ ہیں جس کی وجہ سے اس کی اہمیت کچھ کم ہوگئی ہے۔

لیکن جو لوگ اس کو تیسرا مرتبہ دیتے ہیں وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اگر چہ ترمذی میں ضعیف حدیث ہیں لیکن وہ اس پر ساتھ ساتھ متنبہ بھی تو کر دیتے ہیں،لہٰذا جب متنبہ کر دیا تو اب کتاب پر کیا اشکال رہا۔

تحقیقی بات یہ ہے کہ سنن ترمذی میں کوئی بھی حدیث موضوع نہیں ہے۔

ان سب کے بعد ابن ماجہ ہے اور اس کو سب سے مؤخر اس وجہ سے کرنا پڑا کہ اس کے اندر احادیث ضعیفہ ہی نہیں بلکہ احادیث موضوعہ بھی ہیں۔حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ ناقابل حجت وناقابل استدلال روایات کی تعداد ابن ماجہ میں ایک ہزار ہے اور ایسی احادیث جو بالکل مطروح اور ساقط الاعتبار ہیں وہ تیس کے قریب ہیں اور ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے تو ان کو موضوعات میں داخل کیا ہے۔

حافظ مزی رحمۃ اللہ علیہ نے قاعدہ کلیہ ذکر فرمایا ہے: " کل ما انفرد به ابن ماجه فهو ضعیف "

"ایسی ہر وہ روایت جو صرف ابن ماجہ میں ہو (صحاح ستہ کی کسی دوسری کتاب میں نہ ہو) وہ ضعیف ہے۔"

لیکن ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس قاعدہ کلیہ کو تسلیم نہیں کیا ہے اور کہا ہے کہ علی الاطلاق ایسا نہیں ہے گو یہ صحیح ہے کہ اس میں بہت سی حدیثیں ضعیف اور منکر ہیں۔

﴿صحاح ستہ کی ثنائیات وثلاثیات وغیرہ کا بیان﴾

صحاح ستہ میں سے کسی بھی کتاب میں ثنائیات نہیں ہیں۔البتہ مؤطا امام مالک میں بعض ثنائیات پائی جاتی ہیں۔

ثلاثیات صحاح ستہ میں سے بعض میں ہیں بعض میں نہیں ہیں، تفصیل حسب ذیل ہے:

① بخاری شریف میں سب سے زیادہ ثلاثیات ہیں،اس میں بائیس احادیث ثلاثی ہیں جن میں سے بیس احادیث امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کے طرق سے مروی ہیں۔

② مسلم شریف میں کوئی بھی حدیث ثلاثی نہیں ہے۔

③ سنن ابی داؤد: اس میں بھی کوئی حدیث ثلاثی نہیں ہے۔علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے "فتح المغیث" میں لکھا ہے کہ "سنن ابوداؤد میں ایک حدیث ثلاثی ہے۔" لیکن یہ علامہ کا تسامح ہے، چونکہ وہ حدیث رباعی فی حکم الثلاثی ہے۔

④ نسائی شریف میں بھی کوئی حدیث ثلاثی نہیں ہے۔

⑤ ترمذی شریف میں صرف ایک حدیث ثلاثی ہے جو "کتاب الفتن" میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

⑥ سنن ابن ماجہ میں پانچ احادیث ثلاثی ہیں۔

⑦ مسند دارمی کی ثلاثیات بخاری کی ثلاثیات سے زیادہ ہیں،اور کشف الظنون میں ہے کہ دارمی کی ثلاثیات پندرہ ہیں۔ ⑧ مسند احمد کی ثلاثیات تین سو سے زائد ہیں۔

ملاحظہ: صحاح ستہ میں زیادہ سے زیادہ نزولِ سند بشکل عشاری ہے، چنانچہ ترمذی اور نسائی میں ایک حدیث عشاری ہے۔نسائی ومسلم شریف میں زائد سے زائد علو سند بشکل رباعی ہے اور باقی چار کتابوں میں رباعی بکثرت ہیں۔

﴿صحاح ستہ کی موضوع روایات کا بیان﴾

محدث ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ جو مشہور حافظ حدیث ہیں بعض امور میں بہت ہی متشدد ہیں۔ان کے تشدد کی حالت یہ ہے کہ ایسی بہت سی احادیث پر موضوع ہونے کا حکم لگا دیا جو موضوع نہیں تھیں، چنانچہ صحاح ستہ کی ایک سو سے زائد روایات کو موضوع قرار دیا ہے۔خلاصہ حسب ذیل ہے:

① بخاری شریف:۱ ② مسلم شریف:۱ ③ سنن ابوداؤد:۰۹ ④ نسائی شریف:۱۰

⑤ سنن ترمذی:۲۳ ⑥ سنن ابن ماجہ:۳۰ ⑦ مسند احمد بن حنبل:۳۸

حافظ سراج الدین قزوینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ ترمذی میں تین حدیثیں موضوع ہیں، لیکن محدثین کو ان کا موضوع ہونا تسلیم نہیں ہے، ہاں البتہ ان روایات کا شدید یضعیف ہونا تسلیم کیا ہے۔علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے مختلف مقامات پر کیے گئے کلام

کا حاصل یہ ہے کہ ترمذی کی ایسی احادیث تیس (۳۰) ہیں جن کو ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے موضوع قرار دیا ہے۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''القول المسدد فی الذب عن المسند'' میں مسند احمد کی چوبیس (۲۴) احادیث کا غیر موضوع ہونا ثابت کیا ہے۔ سیوطی نے اپنی کتاب ''القول الحسن فی الذب عن السنن'' میں ایک سو بیس (۱۲۰) احادیث کا غیر موضوع ہونا ثابت کیا ہے۔ جن میں سنن ابی داؤد کی چار (۴)، جامع الترمذی کی تیئس (۲۳)، سنن نسائی کی ایک، سنن ابن ماجہ کی سولہ (۱۶) روایات کا غیر موضوع ہونا ثابت کیا ہے۔ اور ''التعقبات علی الموضوعات'' نامی کتاب میں ان کے مذکور کلام کا حاصل یہ ہے کہ (ابن جوزی نے) تین سو احادیث کو بلاوجہ موضوع قرار دیا ہے جن میں حذف مکررات کے ساتھ مستدرک کی بھی ساتھ روایات شامل ہیں۔ لیکن علماء نے ان روایات کے موضوع ہونے کا انکار کر دیا اور ان کا رد لکھا۔ اس کے بالمقابل امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ تصحیح میں بہت متساہل ہیں۔

ضروری وضاحت:

مصطلحات حدیث کی بحث کا اصل ماخذ چار کتب ہیں: پہلا ماخذ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ ہے، ''مقدمۃ العلم'' کے تقریباً تمام مضامین ومباحث اسی سے ماخوذ ہیں۔ دوسرا ماخذ ''تدریب الراوی'' ہے، تیسرا ماخذ ''نخبۃ الفکر'' ہے اور چوتھا ماخذ تیسیر مصطلح الحدیث ہے۔ اس کے علاوہ جن کتب سے استفادہ کیا ہے اس کا حوالہ ساتھ ہی دے دیا ہے۔

ومن اللّٰہ التوفیق وھو المستعان فی المبدأ والمعاد

تراجم ائمہ حدیث

کتاب کے باقاعدہ آغاز سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صاحب ''مرقاۃ المفاتیح'' ملا علی بن سلطان محمد قاری رحمۃ اللہ علیہ، صاحبِ ''مشکوٰۃ المصابیح'' امام محمد بن عبداللہ خطیب تبریزی رحمۃ اللہ علیہ، صاحبِ ''مصابیح السنۃ'' امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان ائمہ حدیث رحمۃ اللہ علیہم کا مختصر ذکرِ میمون کر دیا جائے جن سے صاحب مشکواۃ نے اپنی اس کتاب میں بکثرت استفادہ کیا ہے، مثلاً امام بخاری، امام مسلم، امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام دارمی، امام دارقطنی، امام بیہقی، امام رزین وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم۔

لیکن یہاں ان تمام حضرات کا تذکرہ تکرار محض ہوگا، چونکہ ان سب کے حالات آگے خطبہ مشکوٰۃ کی شرح میں تفصیلاً آ رہے ہیں۔

''مرقاۃ المفاتیح'' کے ہمیں دستیاب مطبوعہ نسخہ جات میں سے ایک نسخہ میں مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب حفظہ اللہ کا مقدمہ ہے جو ''البضاعۃ المزجاۃ لمن یطالع المرقاۃ فی شرح المشکوٰۃ'' کے نام سے ہے۔ اس مقدمہ پر خود مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب حفظہ اللہ کا اپنا حاشیہ بھی ہے جو اس مقدمہ کے ساتھ ہی اس کتاب میں آ رہا ہے۔ چنانچہ کتاب اور صاحب کتاب یعنی ''مرقاۃ المفاتیح'' اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کا تفصیلی تعارف مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب حفظہ اللہ کے اس مقدمہ میں بہت تفصیل کے ساتھ آ گیا ہے۔

اس کے بعد ''مرقاۃ المفاتیح'' کا خطبہ ابتدائیہ ہے۔ اس میں ملا علی قاری نے حمد وثناء کے بعد اولاً مشکوٰۃ کے دستیاب نسخوں

پر صحت کے حوالہ سے روشنی ڈالی ہے، ثانیاً اپنی سند کتب خصوصاً سند مشکوٰۃ ذکر فرمائی ہے۔ ثالثاً اپنے ذہن میں موجود شرح کا خاکہ بیان کیا ہے، بعدہ ''مرقاۃ المفاتیح'' کا سبب تالیف رقم کیا ہے۔

اس کے بعد ''مشکوٰۃ شریف'' کا خطبہ ہے جس میں امام تبریزی رحمۃ اللہ علیہ نے حمد وثناء کے بعد ان اسباب کا ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے ''مصابیح السنۃ'' کے ہوتے ہوئے ''مشکوٰۃ المصابیح'' تصنیف کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس کے بعد اپنا اسلوب بیان کیا ہے کہ میں نے اس کتاب میں کیا کام کیا ہے، پھر ان ائمہ حدیث کے صرف اسمائے گرامی ذکر کئے ہیں جن کی کتب سے صاحب مشکوٰۃ نے اپنی اس کتاب میں بکثرت استفادہ کیا ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شرح کے خطبہ میں ان حضرات کے حالات نسبتاً تفصیل کے ساتھ ذکر فرما دیئے ہیں۔

''مرقاۃ المفاتیح'' کے شروع میں مذکور ان مقدمات وخطبات میں کم وبیش تمام ضروری مباحث آگئی ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے مزید کسی تفصیلی مقدمہ کی حاجت نہیں۔ مزید یہ کہ روایتی مقدمہ لکھنے کیلئے بہت تفصیلی وقت درکار ہے، یہ کتاب بہت ہی تاخیر کا شکار ہو چکی ہے مزید تاخیر کا تحمل بہت مشکل ہے۔ چنانچہ وقت کے تناسب سے جو ہو سکا وہ پیش کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو شرف قبولیت سے نوازے۔ آمین

''مرقاۃ المفاتیح'' کی گیارہ جلدوں کا تعارف

مرقاۃ المفاتیح (اردو) کی گیارہ (۱۱) مجلدات کے کتب کی تفصیل حسب ذیل ہے:

جلد اول: ①	کتاب الایمان تاکتاب العلم	۱ تا حدیث:۲۸۰
جلد دوم: ②	کتاب الطهارة تاكتاب الصلوٰة	۲۸۱: تا حدیث:۹۱۸
جلد سوم: ③	تابع کتاب الصلوٰة	۹۱۹ تا حدیث:۱۵۲۲
جلد چہارم: ④	كتاب الجنائز تاكتاب الصوم	۱۵۲۳ تا حدیث:۲۲۲۲
جلد پنجم: ⑤	كتاب فضائل القرآن تا كتاب البيوع	۲۲۲۳ تا حدیث:۲۷۵۸
جلد ششم: ⑥	ک[illegible] النكاح تا كتاب الايمان والنذور	۲۷۵۹ تا حدیث:۳۴۴۵
جلد ہفتم: ⑦	كتاب القصاص تا كتاب الجهاد	۳۴۴۶ تا حدیث:۴۰۶۳
جلد ہشتم: ⑧	كتاب الصيد والذبائح تا كتاب الاداب	۴۰۶۴ تا حدیث:۴۷۴۴
جلد نہم: ⑨	كاب الآداب تا كتاب الرقاع	۴۷۴۵ تا حدیث:۵۳۷۸
جلد دہم: ⑩	كتاب الفتن تا الفضائل والشمائل	۵۳۷۹ تا حدیث:۵۸۶۷
جلد یازدہم: ⑪	تابع كتاب الفضائل والشمائل تا كتاب المناقب	۵۸۶۸ تا حدیث:۶۲۹۴

''مرقاۃ المفاتیح'' (عربی) کا اسلوب ایک نظر میں

''مرقاۃ المفاتیح'' (عربی) کا تفصیلی اسلوب محقق مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب حفظہ اللہ کے مقدمہ میں آرہا ہے، سو اس کا ذکر یہاں تحصیل حاصل ہے، مگر ''مرقاۃ المفاتیح'' کا اسلوب مختصراً ذکر کرنا فائدہ سے خالی نہیں۔ چنانچہ نہایت اختصار کے ساتھ ''مرقاۃ المفاتیح'' عربی کا عام اسلوب یہ ہے کہ جب کوئی نئی ''کتاب'' یا ''باب'' شروع ہوتا ہے تو وہ اس ''ترجمۃ الکتاب'' پر نحوی، صرفی، بلاغی، فقہی کئی زاویوں سے تفصیلی کلام فرماتے ہیں۔ بعض مواضع پر چند سطروں پر اکتفاء کرتے ہیں۔

بعض مواقع پر ایک آدھا جملہ ہی ارشاد فرماتے ہیں۔ مثلاً ملاحظہ فرمائیے: باب في الوسوسة، جلد اول۔ کہ بمشکل دو سطروں کا کلام فرمایا ہے۔ اور بعض مقامات پر ایک آدھا جملہ بھی ارشاد نہیں فرماتے بلکہ بلا تمہید خاموشی سے حل حدیث میں مگن ہو جاتے ہیں اور باب ختم ہو جاتا ہے مگر اس باب یا کتاب کے مبادیات کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ کئی جگہ ایسا کرتے ہیں کہ باب یا کتاب کے مبادیات اس باب یا کتاب کے بالکل آخر میں جا کر ذکر فرماتے ہیں۔

اس سے ایک بات مفہوم ہوتی ہے کہ ملا علی قاری کی کلام کے سلسلہ میں عادت یکساں نہیں۔ جس کی ایک بڑی وجہ موقع محل کی مناسبت ہے تو دوسرا بڑا سبب طبیعت کا قبض وانشراح بھی ہو سکتا ہے۔ ملا علی قاری کا یہ مجموعی اسلوب تراجم کتب وابواب کے ساتھ خاص نہیں بلکہ دیگر مقامات پر بھی صاف صاف دکھائی دیتا ہے۔

حدیث کی شرح سے پہلے عام طور پر راوی حدیث کا مختصر یا مفصل تعارف کرواتے ہیں۔ اس بارے میں ان کی عادت شریفہ کا تفصیلی بیان آگے ''حالات راوی'' کے عنوان کے ذیل میں آرہا ہے۔

بعض مسائل ومباحث میں جب شراح کا کلام نقل کرتے ہیں تو ایک انبار لگا دیتے ہیں چنانچہ بہت سارے مقامات پر مباحث کا تکرار نمایاں ہے۔ اور ایسا بھی کرتے ہیں کہ کسی شارح کا کلام نقل کرنا شروع کرتے ہیں مثلاً ابن ہمام کا کلام نقل کرتے ہیں تو مسلسل صفحات کے صفحات نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ لاریب ایک مثبت پہلو ہے، لیکن اسی میں اس کا ایک برعکس پہلو بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے کہ قاری کا مطالعہ تو خوب ہو جاتا ہے مگر اس کو ساری بحث کا خلاصہ نکالنے کیلئے اس کو ساری بحث کا کم از کم دو تین بار مطالعہ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور کئی جگہ یہ بات بھی نظر آتی ہے کہ اتنی طویل مباحث کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی قاری تشنہ ہی رہتا ہے۔

حل لغات کے سلسلہ میں ملا علی قاری رحمہ اللہ کی عادت شریفہ کم وبیش وہی ہے جو بھی اوپر گذری کہ کہیں انتہائی اختصار سے اور کہیں انتہائی بسط کے ساتھ کلام فرماتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مرتب کی کاوش کا بیان آگے چل کر ''حل لغات'' کے

زیرِ عنوان آئے گا۔

صاحب مرقاۃ کی ایک عادت کہا جاسکتا ہے کہ پوری مرقاۃ میں یکساں نظر آتی ہے کہ اختلاف نسخ پر بہت گہری نظر رکھتے ہیں خواہ اختلاف بظاہر بہت ہی قلیل کیوں نہ ہو بلکہ بعض مواقع پر دیگر شراح کے نسخوں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

تخریج حدیث کا عمومی اسلوب یہ ہے کہ وہ کم وبیش ہر حدیث کی شرح کے آخر میں روایتِ باب کی تخریج کرتے ہیں۔ بعض مقامات پر اسنادی حیثیت کی بھی وضاحت فرماتے ہیں۔

''مرقاۃ المفاتیح'' (اردو) کے حوالہ سے کچھ باتوں کا ذکر سمجھتا ہوں سو وہ ترتیب وار پیش خدمت ہیں۔

① یہ کتاب کوئی باقاعدہ تصنیف ہے نہ جزوی تصنیف، بلکہ اصل کے اعتبار سے یہ ''مرقاۃ المفاتیح'' کا ترجمہ ہے۔ اس لئے ہم نے دیگر کتب سے استفادہ کم ہی کیا ہے اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں کئی کئی کتابوں کو کھنگالا ہے۔ البتہ ترتیب و تہذیب کے ذریعہ اس ترجمہ کو شرح کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ مرقاۃ کے مباحث ومسائل میں جابجا تکرار و تشتت نمایاں ہے، ترجمہ میں کم وبیش اس تکرار کو بوجوہ برقرار رکھا گیا ہے۔ البتہ بعض ایسے مواقع سے تکرار کو احتیاط کے ساتھ حذف کر دیا ہے جہاں ہمیں وہ تکرار تکرار محض محسوس ہوا۔ کئی مواضع پر تقدیم وتاخیر کے ذریعہ تشتت ختم کرنے کی سعی کی ہے۔ قصہ مختصر بحث کو ایسی مرتب صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ موضوع سے متعلقہ متفرق و مجتمع مباحث مع مالھا وما علیہا جامع ومانع دکھائی دیں۔

② موقع محل کی مناسبت سے اور اختصار کی خاطر کئی جگہ یوں کیا ہے کہ ''مرقاۃ المفاتیح'' کی مختصر تفسیری وتوضیحی عبارات کا ترجمہ ''مشکوٰۃ شریف'' کے متن کے ترجمہ میں بین القوسین ذکر کر دیا ہے۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ ''مشکوٰۃ شریف'' کے متن کے ترجمہ میں بین القوسین ذکر کی جانے والی عبارات درحقیقت ''مرقاۃ المفاتیح'' کے مختصر تفسیری وتوضیحی جملے ہیں۔

③ نفس ''مرقاۃ المفاتیح'' پر کوئی اضافہ بغیر حوالہ کے نہیں کیا۔ البتہ انتہائی معمولی اضافہ جات کو بین القوسین کر دیا ہے۔ ضرورت کے مطابق بہت سی جگہوں پر اضافات وتعلیقات بھی کی ہیں، جن کا انتخاب نہ صرف متقدمین بلکہ متاخرین مشاہیر علماء کی کتب سے بھی کیا ہے۔ فہرست ماخذ ومراجع اس کی کھلی شہادت ہے۔ ان اضافات وتعلیقات پر ''عرض مرتب'' کا عنوان قائم کیا ہے۔

④ مرقاۃ کے ٹائپ کے نسخہ میں آیتوں کے حوالہ جات مذکور نہیں ہیں اور کمپیوٹرائز نسخہ میں آیتوں کے حوالہ جات عمومی طور پر مذکور تو ہیں مگر ان میں غلطیاں پائی جاتی ہیں اور بعض جگہوں پر آیت کا کوئی حوالہ نہیں ہیں۔ چنانچہ ہم نے کم وبیش تمام آیات کے مکمل حوالہ جات ''تاج کمپنی'' کے مطبوعہ قرآن مجید سے تقابل کر کے ذکر کر دیئے ہیں۔

⑤ قرآنی آیات کا ترجمہ بیان کرنے کا مستقل اہتمام والتزام نہیں کیا گیا ہے، البتہ جن آیات کا ترجمہ کرنے کی ضرورت سمجھی

ان کا ترجمہ فتح محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ کے اردو ترجمہ سے لیا ہے۔

⑥ کم وبیش ہر حدیث پر مختصر و جامع مانع ''ترجمۃ الحدیث'' قائم کیا ہے تا کہ ہر قاری کتاب کے آغاز میں دی گئی فہرستِ مضامین پر ایک نظر ڈالتے ہی اپنی مطلوبہ حدیث کی شرح تک جلد بآسانی رسائی حاصل کر سکے۔

⑦ ''الا کمال فی اسماء الرجال'' کے سلسلہ میں اس نسخہ پر اعتماد کیا ہے جو'' التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح'' کے ساتھ ''مکتبہ رشیدیہ'' سرکی روڈ، کوئٹہ سے شائع ہوا ہے۔ یہ نسخہ صحت کے معاملہ میں بہت عمدہ ہے۔

⑧ جیسا کہ پیش لفظ میں گذر چکا ہے کہ اس شرح کے اردو ترجمہ میں ابتدائی طور پر کئی افراد نے کام کیا ہے، اور عجیب اتفاق یہ کہ تمام شرکائے کار مختلف زبانوں اور مختلف خطوں والے تھے، میرے علاوہ کسی کی بھی مادری زبان اردو نہ تھی۔ سو ترجمہ کی روانی، شگفتگی وغیرہ میں فرق کا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ البتہ مرتب نے اپنے تئیں بھر پور کوشش کی ہے کہ یہ کام خوب سے خوب تر ہو اور از روئے ترتیب وتہذیب پوری کتاب کا منہج یکساں رہے۔

⑨ کتاب کا حسن مزید اجاگر کرنے کیلئے مقام کے مناسب حال جابجا عنوانات قائم کئے ہیں تا کہ ہر بحث نمایاں ہو سکے۔ عمومی وکثیر الاستعمال عنوانات یہ ہیں: حالاتِ راوی، عرضِ مرتب، فائدہ، تنبیہ، تعارض، دفع تعارض، اسنادی حیثیت، تخریج وغیرہ وغیرہ۔ ان عنوانات کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے:

❶ احکام الباب:

ہر باب کے شروع میں باب کے مبادیات کو ''احکام الباب'' کے عنوان کے تحت ذکر کیا ہے۔

احکام الباب کے عنوان تلے تین طرح کے مسائل ہیں:

① زیادہ تر مسائل تو ایسے ہیں جو نفس کتاب میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے آغاز باب میں بطور مبادیات ومتعلقاتِ باب ذکر کئے ہیں۔

② ''احکام الباب'' میں وہ مسائل بھی آ گئے ہیں جو ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے پورے باب میں متفرق یا یکجا ذکر کئے ہیں۔ ایسے تمام مسائل کے ساتھ ''ماخوذ از حدیث فلاں'' بطور علامت کے لکھ دیا ہے۔

③ کچھ مسائل دیگر کتب معتبرہ سے لئے ہیں۔ ایسے مسائل کو حتی الوسع باحوالہ درج کرنے کی کوشش کی ہے۔

❷ حالات راوی:

راوی حدیث کے حالات اس عنوان کے تحت ذکر کئے ہیں۔ اس سلسہ میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کا عام طرز یہ ہے کہ جس راوی سے جہاں پہلی حدیث آتی ہے اس کے حالات بھی وہیں ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ بکثرت یوں بھی کرتے ہیں

کہ تھوڑے تھوڑے حالات مختلف احادیث کے تحت ذکر فرماتے ہیں۔اس اسلوب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پوری ''مرقاۃ المفاتیح'' (عربی) میں شاید ہی کہیں کسی راوی کے مکمل حالات یکجا طور پر آئے ہوں۔اس تشنگی کو مرتب نے یوں دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر راوی کے حالات اس راوی سے مروی پہلی حدیث کے تحت بایں طور ذکر کئے ہیں کہ اس راوی کے جس قدر حالات ''مرقاۃ المفاتیح'' کی گیارہ جلدوں بشمول ''الا کمال فی اسماء الرجال'' میں پھیلے ہوئے تھے یکجا کر دیئے ہیں۔

دیگر اغلاط کے علاوہ حالاتِ رواۃ کے سلسلہ میں بھی ''الا کمال فی اسماء الرجال'' اور ''مرقاۃ المفاتیح'' میں جا بجا ٹائپنگ اور کمپوزنگ کی غلطیاں پائی جاتی ہیں، چنانچہ رجال سے متعلقہ ایسے مواضع کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ان کی تصحیح بھی کر دی گئی ہے۔مزید یہ کہ ہر جلد کے شروع میں اس جلد کے رواۃ کی مکمل فہرست شامل کر دی گئی ہے۔

۳ حل لغات:

حل لغات کے سلسلہ میں ملا علی قاری رحمہ اللہ کی عادت شریفہ یہ ہے کہ کہیں انتہائی اختصار سے کام لیتے ہیں اور کہیں انتہائی بسط کے ساتھ کلام فرماتے ہیں۔ایسا بہت کم جگہ پر ہوا ہے کہ کلام بسط کے ساتھ مرتب انداز میں کیا ہو۔ایسی مباحث کو احقر نے یوں ترتیب دیا ہے کہ تمام اقوال کو سطر جدید سے نمبر وار اس طرح ذکر کیا ہے کہ قاری اول وہلہ میں جان لیتا ہے کہ اس سلسلہ میں کتنی آراء ہیں اور کیا کیا ہیں۔اکثر و بیشتر مقامات پر آراء کو ''من و عن'' ذکر کرنے کے بعد ''خلاصۃ الآراء'' کا عنوان باندھا ہے تا کہ قاری ان تمام آراء کا خلاصہ جان سکے اور جلد کسی نتیجہ تک پہنچ سکے۔

۴ احادیث متعارضہ:

اس عنوان کے تحت احادیث متعارضہ کو نمایاں انداز میں ذکر کرنے کی کوشش کی ہے۔تفصیل اس کی یہ ہے کہ ملا علی قاری بعض احادیث پر کلام کرتے ہوئے کہیں معارض احادیث ذکر کر جاتے ہیں اور کہیں بس اتنا کہنے پر اکتفاء کرتے ہیں کہ یہ حدیث فلاں راوی کی حدیث کے معارض ہے،اور وہ حدیث ذکر نہیں فرماتے۔اگر قاری کو وہ فلاں راوی کی حدیث مستحضر نہ ہو تو تعارض سمجھنے میں بہت ہی دقت ہوتی ہے۔اور بعض مرتبہ حدیث تو ذکر کرتے ہیں مگر وجہ تعارض کی وضاحت نہیں فرماتے۔

چنانچہ دفع تعارض کیلئے ترتیب یوں رکھی ہے کہ سب سے پہلے احادیث متعارضہ کو حسب مضمون نمبر وار ذکر کیا ہے، پھر تشریح تعارض کا عنوان دے کر تعارض کی وضاحت کی ہے کہ تعارض کیا ہے؟ اور کیسے ہے؟ بعدہ اس تعارض کے نمبر وار جوابات ذکر کئے ہیں۔

۵ تخریج:

''مرقاۃ المفاتیح'' کے کمپیوٹرائزڈ نسخہ میں دو طرح کی تخریج ہے۔ایک وہ جو ملا علی قاری رحمہ اللہ کم و بیش ہر حدیث کے عموماً

آخر میں ذکر کرتے ہیں، دوسری وہ تخریج ہے جو حاشیہ میں درج ہے۔ اکثر و بیشتر مقامات پر دونوں تخریجات مشترک ہوتی ہیں مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر تخریج بہت مختصر ہے اور ثانی تفصیلی ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ صرف متعلقہ کتاب حدیث کا حوالہ دینے پر اکتفاء کرتے ہیں، مثلاً رواہ الترمذی۔ اور صاحب تخریج اس کی جلد، صفحہ اور حدیث نمبر بھی بتا دیتے ہیں۔ کئی مواقع پر ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ ایک دو کتابوں کی تخریج پر اکتفاء کرتے ہیں تو اگر وہ حدیث دیگر کتب حدیث میں بھی موجود ہو تو صاحب تخریج ان متعدد کتب کا تفصیلی حوالہ دے دیتے ہیں۔

اس شرح میں بھی دونوں تخریجات کو شامل کیا گیا ہے بایں طور کہ صاحب مرقاۃ رحمۃ اللہ علیہ کی تخریج کو ہم نے ''تخریج'' کے عنوان کے تحت ذکر کیا ہے اور ''مرقاۃ المفاتیح'' کے حاشیہ میں درج تخریج جوں کی توں حاشیہ میں بلا عنوان آ گئی ہے۔

شرح کے ذیل میں آنے والی احادیث کی کم و بیش تخریج بھی حاشیہ میں موجود ہے۔ بعض احادیث کی تخریج حاشیہ میں نہیں ہے، ایسی احادیث کی تخریج دستیاب حالات میں مرتب کے لئے نا صرف مشکل بلکہ انتہائی طویل کام بھی تھا، سو تخریج میں اگر کچھ تشنگی محسوس ہو یا کوئی غلطی نظر آئے تو اسے مرتب کی طرف منسوب نہ کیا جائے کیونکہ یہ چیز مرتب کے اصل موضوع سخن سے خارج تھی۔

☆ شرح کے ذیل میں آنے والی جن روایات کا ادنی تامل سے متکلم فیہا ہونا معلوم ہوا ان روایات پر، موضوع احادیث کے موضوع پر

لکھی گئی کتابوں سے باحوالہ نقد نقل کر دیا گیا ہے۔

❻ اسنادی حیثیت:

مشکوۃ شریف کی کئی احادیث کی اسنادی حیثیت صاحب مشکوۃ نے ذکر فرمائی ہے۔ بعض روایات متن کی اسنادی حیثیت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمائی ہے۔ مرتب نے ان دونوں طرح کی اسنادی حیثیتوں پر ''اسنادی حیثیت'' کا عنوان قائم کر کے سطر جدید میں ذکر کر دیا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ملاّ علی قاری

آپ کا نام نامی علی، اور آپ کے والد گرامی کا نام سلطان محمد (۱) ہے۔ ابو اسحاق ابراہیم بن عبداللہ ساقزی رومی نے ملا علی قاری کی کتاب "فيض الأرحم وفتح الأكرم في شرح الحزب الأعظم والورد الأفخم" کے مقدمہ میں (ان کا نام یوں) ذکر کیا ہے: علی بن سلطان محمد القاری، (حرم کے) مجاورین میں سے تھے۔ اپنے شہر ہرات سے ہجرت کر گئے تھے۔ عجمیوں کی عادت یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کا جڑواں نام رکھتے ہیں۔ جیسے فاضل محمد اور صادق محمد (وغیرہ)۔ آپ کے والد کا نام سلطان محمد بھی اسی قبیل سے ہے جیسا کہ سنا

۱: مؤرخ عبدالملک عصامی شافعی (ت ۱۱۱۱ھ) نے "سمط النُّجوم العَوالي والتَّوالي (٤: ٣٩٤) میں ملا علی قاری کے والد کا نام ذکر کرتے ہوئے فقط لفظ "سلطان" پر اکتفا کیا ہے۔ اور ایسے ہی حافظ محب الدین ابو الفیض محمد مرتضی بلگرامی زبیدی حنفی (ت ۱۲۰۵ھ) نے اپنی کتاب "تاج العروس من جواهر القاموس" (۱: ۳) کے مقدمے میں، اور شیخ محمد عبدالحئ لکھنوی نے اپنی کتاب "طرب الأماثل بتراجم الأفاضل (ص ۲۲۵) میں بھی اسی لفظ پر اکتفا کیا ہے، جس کی بنیاد نام رکھنے میں عربوں کی اس عادت کی اتباع ہے کہ وہ مفرد نام رکھا کرتے ہیں۔ لیکن جس نے سلطان محمد کے درمیان لفظ ابن بڑھا کر سلطان بن محمد ذکر کیا ہے، اس نے صحیح نہیں کہا۔

صحیح نام وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ سندھ میں ٹنڈو سائیں داد کے علاقے میں ہم نے عالم کبیر شیخ محمد ہاشم جان مجددی کے پاس موجود مصحف پر ملا علی قاری کے اپنے قلم سے لکھا ہوا نام ہم نے خود دیکھا ہے۔ ایسے ہی آستانہ، ہند اور مصر میں ان کی مطبوعہ تمام کتب پر بھی یہی نام ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔

گیا۔ اور باقی رہی بات ان کے بادشاہ ہونے کی، تو ایسی کوئی بات کبھی نہیں سنی گئی۔ (۲)

اس کتاب کی شرح کی تالیف مالک اور وہاب کی مدد سے رجب کے مہینے کی چھے تاریخ ۱۱۳۴ھ، کو مکمل ہوئی۔ جب کہ اس کی کتابت کی ابتدا چھے رمضان ۱۱۳۳ھ کو ہوئی تھی۔ اول و آخر اللہ تعالیٰ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں، اس پر کہ اسی نے اس کتاب کو مکمل کرنے کی توفیق دی۔ اور اللہ کی مخلوق میں ظاہراً و باطناً سب سے زیادہ شرافت و نجابت والی ہستی پر صلاۃ و سلام ہو۔

تمام تعریفیں اس اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے اس بات کی توفیق دی کہ اس شرح کی کتابت کی تکمیل اس فقیر حقیر پر تقصیر محمد حافظ کے ہاتھوں ہو، جو مولدًا اعشاقی، اور مذہبًا حنفی ہے۔ کتابت کا اختتام بروز سوموار قسطنطنیہ میں ۱۱۷۰ھ، ماہ ربیع الآخر میں ہوا۔ اے اللہ درود و سلام ہمارے سردار حضرت محمد ﷺ پر اور ان کی آل پر بھیج۔ آمین۔

اس شرح کا ایک نسخہ سندھ میں پیر جھنڈ و بستی میں صاحب علم کے کتب خانے میں محفوظ ہے، اور ہم نے اسی سے یہ عبارت نقل کی ہے۔

اور ملا علی قاری رحمہ اللہ علیہ کی کنیت: ''ابو الحسن'' ہے جیسا کہ حافظ سید عبد الحیٰ کتانی فاسی (ت ۱۳۸۱ھ) نے اپنی مشہور کتاب "التَّراتِيبُ الإدارية والعمالات والصَّناعات والمَتَاجر والحَالَةِ العلمِيَّة التي كانت علىٰ عَهدِ تَأسِيسِ المَدينة المُنَوَّرَة" میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

اور مسند ابو حنیفہ کی روایت حصکفی کی ایک شرح ابو الحسن علی قاری کے قلم سے ہے، جو ابن سلطان مکی کے نام سے معروف ہیں۔

(التَّراتيب الإداريه (ج۱، ص ۱۷) الرباط ۱۳۴٦ھ)

اور ملا علی قاری کا لقب نور الدین ہے۔

ملا علی قاری کی پیدائش ہرات میں ہوئی (۴) (مجھے ابھی تک ان کا سنِ پیدائش نہیں مل سکا)، اور وہیں پلے بڑھے۔ وہیں جامع ہرات میں ابن خطیب شیخ عالم قاری معین الدین بن حافظ زین الدین ہروی سے قرآن مجید حفظ کیا اور علم تجوید حاصل کیا۔ جیسا کہ انہوں نے اپنے رسالہ: "شَمُّ العَوَارِض فِي ذَمِّ الرَّوَافِض" میں خود تصریح کی ہے۔ چنانچہ ان کی عبارت یہ ہے:

علم قراءت میں میرے مرحوم استاد مولانا معین الدین بن حافظ زین الدین رمان گاہ (۵) (گازرگاہ) کے رہنے والے تھے۔

---

۲ : اس کے مؤلف نے آخر میں کہا ہے:

۴ : یہ خراسان کے شہروں میں سے ایک بہت بڑا اور مشہور شہر ہے، جہاں بہت سے مؤرخ، لغوی، فقہاء اور نحوی علماء پیدا ہوئے ہیں۔ (دیکھیے: معجم البلدان، لياقوت حموي)۔

۵ : دیکھیے: شَمُّ العوارض في ذَمِّ الرَّوافِض. اس کتاب کا جدید خط نسخ میں لکھا ہوا ایک واضح مخطوطہ ملا علی قاری کے ایک جلد میں اکٹھے کیے گئے ترپین رسائل کے مجموعہ میں شامل ہے۔ اور یہ مجموعہ کلیہ شرقیہ پشاور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ مجھے اس کی اطلاع شیخ بحاثہ عبد القدوس قاسمی نے دی تھی۔

"البضاعة المزجاة" کی تکمیل کے بعد میں نے مغربی پاکستان کا ایک علمی سفر کیا تھا۔ جب میں پشاور پہنچا، اور کلیہ شرقیہ پشاور کے کتب خانہ کو دیکھا، اور شیخ عالم بحاثہ عبد القدوس قاسمی کی زیارت کی، جو کہ کلیہ شرقیہ میں استاد تھے تو دورانِ گفتگو "البضاعة المزجاة" کے بارے میں بھی بات چیت ہوئی۔ شیخ قاسمی نے کہا کہ: کلیہ شرقیہ کے مکتبہ میں ایک مجموعہ کتب ایسا ہے جس میں ملاعلی قاری کے ترپن رسائل ہیں، کیا تم نے ان کا مطالعہ کیا ہے؟ میں نے کہا: نہیں، تو انہوں نے بتایا کہ: ان رسائل میں ملاعلی قاری نے اپنے بعض اساتذہ کا تذکرہ کیا ہے، اور وہ نسخہ اس وقت میرے پاس موجود ہے۔ ان کی اس بات سے میرا اشتیاق اور بڑھا۔ اور شیخ نے مجھے اس سے استفادہ کا موقع دیا۔ ان کی اس عنایت پر میں ان کا نہایت شکر گزار ہوں، اللہ تعالیٰ انہیں میری طرف سے بہترین بدلہ عطا فرمائے۔

آپ نے درسی کتب اور متعارف علوم ہرات ہی میں اپنے زمانے کے ماہر شیوخ سے حاصل کیے۔ اور جب پہلے صفوی رافضی بادشاہ سلطان اسماعیل بن حیدر صفوی موسوی نے ہرات پر تسلط قائم کر لیا، اور ان پر ظلم ڈھاتے ہوئے انہیں قتل، اور ان کے مالوں کو لوٹا، اور ہرات میں روافض کے شعائر کو پھیلانا شروع کیا، اور اپنی وسعت کے باوجود وہاں کی زمین مسلمانوں کے لیے تنگ ہوگئی تو مسلمان وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ اور ملاعلی قاری نے بھی وہاں سے حرم اللہ کی طرف ہجرت کی۔ اور وہیں مکہ مکرمہ میں قیام کیا، اور اسے ہی وطن بنا لیا۔ اور اس (حرمِ مکہ میں) اقامت پذیر ہونے (کی نعمت) پر اللہ کی تعریف کرتے ہوئے اپنے رسالہ: "شَمُّ العوارض" میں یوں رقم طراز ہیں:

احادیث میں وارد ہوا ہے کہ: شیطان کو گالیاں نہ دو، اور اس کے شر سے اللہ کی پناہ چاہو۔

اس میں اس تفرقہ سے، جسے دوئی کا مقام کہا جاتا ہے، توحیدِ محض اور جمعیت کے مقام کی طرف ترقی کرنے پر تنبیہ ہے۔ اور اللہ نے مجھے بدعت کے مرکز سے سنت کے مرکز کی طرف ہجرت کرنے کی جو قدرت اور توفیق بخشی ہے اس پر اللہ ہی کی حمد و تعریف بیان کرتا ہوں۔ یہ ایسا علاقہ ہے جو مہبطِ وحی ہے، اور یہیں نبوت کا ظہور ہوا اور اس نے مجھے یہاں قیام کی مستقل توفیق بخشی، من غير حولٍ منّي ولا قُوّة (٦)"۔ اس میں نہ تو میرا کوئی کمال ہے، اور نہ ہی میری کوئی خوبی۔

آپ نے قرآن مجید مکہ مکرمہ کے اجل قراء کرام سے پڑھا، اور انتہائی پختہ حفظ کیا۔ علاوہ ازیں شاطبیہ کو بھی زبانی یاد کیا، ساتوں قراءتوں کو شاطبیہ کے طریق سے پڑھا اور اس کی قراءات میں انتہائی اتقان حاصل کیا۔ قرآن مجید کو حسنِ ترتیل سے اس قدر پڑھا کہ "قاری" کے لقب سے ہی شہرت پائی۔ ملاعلی قاری نے علم قراءات میں اپنی سند کو ایک تو اپنی کتاب: "المِنَحُ الفِكرِيَّة على متن الجزريَّة"، کے آخر میں نقل کیا ہے، اور دوسرے اپنی "شاطبیہ" کی شرح میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

جہاں تک قراءات کی تحقیق اور روایات کی چھان بین میں میری سند کا تعلق ہے، تو وہ مشائخ عظام اور قراء کرام تک پہنچتی ہیں۔ اور میرے ایسے قراء اساتذہ میں سب سے بڑے استاد، اس فن میں کامل، مکہ مکرمہ میں شیخ القراء، یگانہء روزگار، عالم بے بدل، نیکوکار عامل، یکتا وکامل شیخ سراج الدین عمر یمنی شوافی ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ انہیں بلند مراتب تک پہنچائے، اور میری اور پوری امت کی طرف سے

٦: دیکھیے: "شَمُّ العوَارِض" (ص ٣٠٠)، ضمن مجموعه رسائل مخطوطه در مکتبه کلیه شرقیه، پشاور۔

پوری پوری جزاء خیر دے۔

انہوں نے علم قراءت ایک ایسی جماعت سے حاصل کیا، جنہوں نے مدینہ منورہ کے خطیب و امام علامہ محمد بن یقطان کے سامنے علم قراءت میں زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اور انہوں نے مصر کے رہنے والے شیخ زین الدین عبد الغنی ہیثمی سے علم قراءت کو حاصل کیا، اور انہوں نے علم قراءت خاتمة القُرّاءِ والمُحَدِّثین شیخ شمس الدین محمد بن محمد بن محمد جزری قُدِّسَ سِرُّہُ السِّرِّیُّ سے حاصل کیا۔ (۷)

ملا علی قاری تحصیل حدیث میں مشغول ہوئے تو مکہ کے شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا، اور انہیں میں مکہ کے مفسر، اور اپنے زمانے کے فقیہ، شیخ زین الدین عطیہ بن علی بن حسن سلمی مکی بھی ہیں۔ موصوف کی وفات ۹۸۳ھ میں ہوئی۔ ملا علی قاری اپنی کتاب "مرقاۃ المفاتیح" کے مقدمہ میں کہتے ہیں:

میں نے یہ عظیم کتاب (مشکاۃ المصابیح) حرم محترم کے شیوخ سے پڑھی۔ اللہ ہمیں ان سے، اور ان کی علوم کی برکات سے متنفع فرمائے۔ انہی اساتذہ میں یکتائے زمانہ، نابغہء روزگا مولانا علامہ شیخ عطیہ سلمی بھی ہیں، جو کہ شیخ الاسلام اور راہنمائے خلق مولانا شیخ ابو الحسن بکری (۸) کے شاگرد ہیں۔

---

۷ : دیکھئے: "المنح الفکریہ" (ص ۷۳، ۷٤، طبع مصر ۱۳٦۷ھ). مزید دیکھئے: "شرح الشاطبیہ" (طبع مجتبائي، دهلي، هند ۱۳٤۸ھ).

۸ : علی پاشا مبارک (ت ۱۸۹۳ھ) نے اپنی کتاب: "الخطط الجدیدة لمصر" (۳ : ۱۳۷، القاهرة) میں بکری کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

سید محمد ابو الحسن (بن جلال الدین محمد ابی البقاء بن عبد الرحمٰن بن احمد) بکری صدیقی شافعی مفسر اور شیخ الاسلام زکریا کے تلامذہ میں سے تھے۔ تمام فنون کے عالم، اور تقوی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ اپنی تفسیر کی تالیف سے ۹۲٦ھ میں جمادی الثانیہ کے آخر میں فراغت حاصل کی، اور اس وقت ان کی عمر اٹھائیس سال، ایک مہینہ اور اٹھارہ دن تھی۔ اس لیے کہ ان کی ولادت ۸۹۸ ھ میں ہوئی تھی۔ (یہ تفصیل ان کی تفسیر کے آخر میں مترجم کے والد صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر کا اختصار ہے، جو کہ انکے اپنے خط سے نقل کی گئی ہے اور یہ تحریر کتب خانہ مصریہ "خدیویہ" میں موجود ہے)..... ان کے سفید رُو بیٹے نے مغرب کے سلطان، جن کا تذکرہ پہلے گزر چکا، کی جانب بھیجے جانے والے اپنے خط میں ذکر کیا ہے کہ انکے والد کی وفات ۹۵۲ ھ میں چون سال کی عمر میں ہوئی اور وہ ایک سال مصر میں قیام کیا کرتے تھے اور ایک سال مکہ مکرمہ میں۔

ان کے شاگرد شیخ حافظ نجم الدین محمد بن احمد غیطی مصری شافعی (ت ۹۸۱ھ، یا ۹۸۲ھ) اپنے "ثبت" میں رقم طراز ہیں:

ہمارے شیخ فردِ فرید، نادرہء روزگار، عجوبہء زمان یکتا عالم ابو الحسن بکری صدیقی شافعی ہیں۔ اللہ تعالی ان کی برکات کو نافع بنائے، اور ان سے راضی ہو۔ میں نے ان سے تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف کو حاصل کیا ہے۔ ان کی تفسیر وفقہ وغیرہ میں بہت سی تصنیفات ہیں۔ اور تصوف میں اوراد کے موضوع پر ان کے کئی رسائل ہیں۔ موصوف کی وفات ۹۵۲ ھ میں ہوئی۔

اس ثبت کا ایک نسخہ صاحبِ علم وہب اللہ شاہ کے ہاں بستی پیر جھنڈو، سندھ میں محفوظ ہے۔

مزید دیکھئے: "مرقاۃ المفاتیح" (۲ : ۵۷۵، و ٤ : ٦۹۸، و ۷۰۲).

ملا علی قاری اپنی کتاب مرقاۃ میں ان سے (یعنی شیخ عطیہ سے) اور ان کی تفسیر سے جا بجا فوائد نقل کرتے ہوئے، کبھی تو انہیں ''ہمارے شیخ'' (۹)، ''ہمارے استاذ'' (۱۰) اور ''مولانا'' (۱۱) کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، اور کبھی ''عُمدَۃُ المُفَسِّرِین'' (۱۲) کا لقب دیتے ہیں۔ ایسے ہی اپنے رسالہ ''شمُّ العَوَارِض'' میں انہیں: علم تفسیر میں میرے استاد شیخ عطیہ مکی سلمی، کے الفاظ سے ذکر کیا ہے۔

ملا علی قاری کے اساتذہ میں مسند مکہ، علامہ شیخ زکریا بھی ہیں۔ چنانچہ ملا علی قاری اپنی کتاب ''اَلمِرْقَاۃ'' کے مقدّمہ میں رقم طراز ہیں:

اور میرے ان مشائخ میں سے، جن سے میں نے علم حدیث (قراءۃً) حاصل کیا ہے، نام وَر فاضل، اور بہترین عالم مولانا سید زکریا (۱۳) بھی ہیں، جو کہ عالم ربانی مولانا اسماعیل (۱۴) شروانی کے شاگرد ہیں۔ اور وہ عارف باللہ، مرجع خاص وعام خواجہ عبید

۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ : دیکھئے: ''مرقاة المفاتيح'' (۱ : ٤٦٢، و ۲ : ٥٢، و ۳ : ١١٦، و ٥ : ٦٦١، طبع مصر)، مزید دیکھیں: ''الكواكب السائرة للغزي'' (١: ١٩٤-١٩٨)، ''النُّورُ السَّافِر لِلعيدرُوسِي'' (ص٤٢٧- ٤٢٩)، '' شَذراتُ الذَّهَب لابن العماد الحنبلي'' (٨ : ٢٩٢)، اور ہماری کتاب فوائدِ جامعہ بر عجالہ نافعہ (ص ۳۴۹ - ۳۵۲)۔

۱۳ : ان کے بارے میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی اپنی فارسی کتاب ''زاد المتقين في سلوك طريق اليقين'' میں فرماتے ہیں:

''سید زکریا انتہائی بزرگی اور شرافت والے تھے۔ ان سے برکت حاصل کی جاتی تھی۔ نادرۂ روزگار، کبیر السنّ، میٹھی طبیعت والے اور تکلف سے دور تھے۔ ان کا اصلی وطن تو ہند تھا، لیکن نشو ونما اور تربیت یمن کے علاقے میں ہوئی۔ اور جب مکہ مکرمہ پہنچے تو پھر اسی کو وطن بنا کر وہیں درس حدیث دینے اور افادہ کا سلسلہ قائم فرمایا۔ اکثر عجمی حضرات ان سے علم اور برکت حاصل کرتے تھے۔ شیخ اپنی کبر سنی اور جسمانی کمزوری کے باوجود جبل ابی قبیس پر واقع اپنے گھر سے بیت اللہ الحرام آیا کرتے، اور نماز ادا کیا کرتے۔ شیخ اپنے ہاتھ کی کمائی سے ہی کھایا کرتے تھے، اور اپنے تمام ذاتی اعمال، اور اہل وعیال کی ذمہ داریوں کو بڑی سختی اور اصرار سے خود ہی نبھایا کرتے تھے۔ ان کی قبر جنت معلّی میں ہے، جس کی لوگ زیارت بھی کرتے ہیں، اور ان سے برکت بھی حاصل کرتے ہیں۔ اللہ تعالی کی ان پر اور تمام صالحین پر رحمت ہو''۔

(ورقہ ۱۲۳، فارسی کی تعریب اور تلخیص کے ساتھ)۔

۱۴ : نجم الدین محمد بن محمد غزی (ت ۱۰۶۱ ھ) اپنی کتاب ''الكَوَاكِبُ السَّائِرَة، بأعيان أئمة العاشرة'' (٢: ١٢٣، ١٩٤٥ھ بيروت، لبنان) میں رقم طراز ہیں:

''شیخ امام علام محقق مدقق، صالح زاہد، عارف باللہ تعالی مولی اسماعیل بن عبد اللہ شروانی حنفی، نامِ نامی تھا۔ اپنے زمانے کے علماء سے علم حاصل کیا، جن میں علامہ جلال الدین تھے۔ پھر اپنے شیخ عارف باللہ تعالی خواجہ عبید اللہ سمرقندی کی خدمت میں آگئے اور ان کے ہاں تربیت کروائی، اور ان کے کامل تلامذہ میں شمار ہونے لگے۔

جب خواجہ عبید اللہ کی وفات ہوئی تو مولی اسماعیل مکہ مکرمہ کی جانب کوچ کر گئے اور اسی کو اپنا وطن بنا لیا۔ پھر سلطان ابی یزید خان کے دور حکومت میں روم میں داخل ہوئے۔ پھر مکہ کی طرف واپس ہوئے اور وفات تک وہیں مستقل قیام کیا۔ شیخ الاسلام نے مکہ مکرمہ کے جن مجاور اولیاء اللہ کی صحبت اٹھائی، اُن میں اِن کا شمار کیا ہے۔ اور میں نے اپنے شیخ کو اپنے والد صاحب سے نقل کرتے سنا کہ: وہ ان کی بہت تعریف ....

اللہ (۱۵) سمرقندی کے شاگردوں میں سے ہیں، جو کہ خواجہ بہاء الدین نقشبندی (۱۶) رحمھم اللہ کے متبعین میں سے ہیں۔ اللہ ان کی روحوں کو سرسبز وشاداب رکھے، اور ان کی برکات وفتوحات سے ہمیں بھی نوازے۔

..........کیا کرتے تھے، اس لیے کہ وہ دمشق سے آئے تھے اور نوریہ میں قیام پذیر ہوگئے تھے۔ فاضلین کی ایک جماعت آپ کے پاس آیا جایا کرتی تھی۔ انہوں نے آپ سے تفسیر بیضاوی پڑھی۔ اس کے بعد آپ جامع مسجد تکیہ سلیمیہ میں گوشہ نشین ہوگئے۔ چنانچہ ابن طولون نے کہا ہے:

میری ان سے وہاں ملاقات ہوئی ہے۔ اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے حدیث امیر جمال الدین خراسانی محدث سے حاصل کی۔ کہتے ہیں: میں نے ایک مرتبہ انہیں (یعنی امیر خراسانی کو) دیکھا کہ وہ مفسر قرآن امام بغوی کی تنقیص کر رہے تھے، جس کے سبب میرے جی میں ان سے نفرت آ گئی۔ اس لیے کہ امام بغوی تو ائمہ سنت میں سے ہیں۔

میں کہتا ہوں: شاید ان کے اس بغض کا سبب یہ ہو کہ عجمی علماء کا اسلوب یہ ہے کہ وہ دقیق مباحث کی طرف مائل ہوتے ہیں، اور ان پر عقلی خامہ فرسائی بھی کرتے ہیں، جب کہ ماثورات کا اس قدر اہتمام نہیں کرتے۔ اور تفسیر بغوی کا غالب حصہ مذکورہ بالا مباحث سے خالی ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے تنفر کا سبب ہماری بیان کردہ وجہ ہو، نہ کہ وہ جس کا وہم ابن طولون کو ہوا ہے کہ وہ بدعات وغیرہ کی طرف مائل تھے۔ اور ان کی صفائی کے بارے میں شیخ الاسلام الجد کا قول تمہارے لیے کافی ہے"۔

صاحب شقائق نعمانیہ نے کہا ہے:

"وہ معمر، صاحب وقار، صاحب ہیبت، لوگوں سے الگ تھلگ، اپنے کام سے کام رکھنے والے، عادتاً مروّجہ تکلف سے دور اور لوگوں سے بہت اچھا معاملہ کرنے والے شخص تھے۔ لوگوں میں سے چھوٹا ہو یا بڑا، غنی ہو یا فقیر، ان کے ہاں برابر تھا۔ ظاہری علوم میں بھی انہیں فضل وکمال حاصل تھا۔ موصوف نے تفسیر بیضاوی پر ایک حاشیہ لکھا تھا، اور مکہ مکرمہ میں اس حاشیہ اور بخاری شریف کا درس دیا کرتے تھے۔ مکہ مکرمہ ہی میں دس ذوالحجہ ۹۴۲ ھ کو وفات ہوئی"۔

ابن طولون نے کہا ہے:

"ان کی وفات دس ذوالقعدہ کو تقریباً اکیاسی سال کی عمر میں ہوئی۔ اور ربیع الاول کے شروع میں، جمعہ کے دن، جامع دمشق میں ۹۴۳ ھ کو ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی"۔ رحمہ اللہ۔

ان کے حالاتِ زندگی کے لیے دیکھیے: "طاش کبریٰ زادہ، الشّقائق النعمانیه في عُلَمَاء الدَّولَةِ العُثمَانیه" (۱: ۳۹۷)، طبع علیٰ هامش "وفَیات الأعیَان" طبعة مصر، ۱۳۱۰ھ، و "مِرقاةُ المفاتیح" (۳ : ٤٤) طبع مصر، و "شذراتُ الذّهب لابن العماد" (۸ : ۲٤۷).

۱۵ : ابو الخیر احمد معروف بہ طاش کبریٰ زادہ (ت ۹۶۸ھ) نے "الشَّقَائِقُ النُّعمَانِیَة فِي عُلَمَاءِ الدَّولَةِ العُثمَانِیة" میں کہا ہے:

"شیخ، عارف باللہ، خواجہ عبید اللہ سمرقندی رحمہ اللہ تعالیٰ تاشقند کے علاقے میں پیدا ہوئے، جو کہ شاش کی ولایت کا حصہ ہے۔ یہ بات ان کے بعض احفاد سے روایت کی گئی ہے۔ اور وہ خواجہ محمد قاسم بن خواجہ عبد الہادی بن خواجہ محمد عبد اللہ بن خواجہ عبید اللہ ہیں، جن کا سلسلۂ نسب امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا ملتا ہے"۔

مزید کہتے ہیں: میرے دادا جان کے حوالے سے یہ بھی منقول ہے کہ:

''خواجہ عبید اللہ نے کہا: میں ایک مرتبہ کے علاوہ کبھی بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں ہوا۔ اور اس غفلت کا قصہ یہ ہے کہ: ان دنوں میں سولہ سال کا تھا، اور تاشقند میں اپنے معلم کے پاس جایا کرتا تھا۔ ان علاقوں میں زمین نرم ہونے کے وجہ سے بعض جگہ کیچڑ اور پھسلن بہت زیادہ تھی، اور کہیں کہیں دلدل بھی ہوا کرتی تھی۔ ایک جگہ بے دھیانی میں میرا پاؤں دلدل میں پھنس گیا، اور میں اسے کھینچ کر باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی میں میرا دھیان اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہٹ گیا، اور غفلت ہوگئی''۔

مزید کہتے ہیں: ''میرے دادا جان نے طریقِ تصوّف کو مولیٰ یعقوب چرخی سے حاصل کیا تھا، اور انہیں نے دادا جان کو ذکر کی ترتیب تلقین کی تھی''۔

مزید یہ بھی بتاتے ہیں کہ: ''میرے دادا جان سے یہ بھی منقول ہے کہ انہوں نے کہا: جب میں بیس سال کا تھا، اس وقت مجھ پر تحصیلِ علم کا داعیہ بہت غالب ہوا، چنانچہ میں تاشقند سے مولیٰ نظام الدین خامرس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ ان دنوں سمرقند کے، مدرسہ الغ بیگ میں مدرس تھے۔ میں نے ان کے حالات اور کیفیاتِ جذب واستغراق کے بارے میں سن رکھا تھا۔

جب وہ مدرسے میں درس دے رہے تھے، میں بھی وہیں چلا گیا، اور مدرسے کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ جب وہ درس سے فارغ ہوئے، اور مجھے دیکھا تو فرمایا: تم نے خاموشی کیوں اختیار کیے رکھی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، خود ہی جواباً کہنے لگے: خاموشی کی دو قسمیں ہیں: ایک تو ان لوگوں کی خاموشی ہے جو دنیا کو عبور کر کے جلدی سے گزر جانے والے ہیں۔ ان خاموش رہنے والوں کی خاموشی ان کے لیے باعثِ برکت ہے۔ اور دوسرے ان لوگوں کی خاموشی ہے جو اسی دنیا میں اٹکے ہوئے ہیں۔ ان کی خاموشی ان کی چال ہے۔

خواجہ عبید اللہ فرمایا کرتے تھے: میں نے مذکورہ بالا استاد (یعنی مولیٰ نظام الدین خامرس) کے کلام سے ان کی جلالتِ قدر کو پہچانا''۔

خواجہ عبید اللہ کا مسلک اہل السنۃ والجماعۃ کے اعتقادات کو اپناتے ہوئے، احکامِ شریعت کے سامنے انقیاد، اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کی کامل اتباع کے ساتھ ساتھ دوامِ عبودیت تھا۔

دوامِ عبودیت: جنابِ حق تعالیٰ کے ماسویٰ کے شعور سے ہٹ کر، بس جنابِ حق کے ملاحظہ کا نام ہے۔

آپ ہی کا قول ہے: ''توحید اسے کہتے ہیں کہ: اللہ کے ماسویٰ کے شعور سے قلب کو بالکل خالی کر لیا جائے''۔

مزید کہتے ہیں: ''وحدت تو یہ ہے کہ: دل کو اللہ کے ماسویٰ موجودات کے علم سے بھی خالی کر لیا جائے''۔

آپ ہی کا کہنا ہے: ''حق سبحانہ وتعالیٰ کے وجود میں استغراق کا نام استغراق ہے''۔

مزید فرماتے ہیں: ''سالک کا اللہ تعالیٰ کے مشاہدے میں اپنے آپ سے بھی خالی دل ہونا سعادت کی علامت ہے، اور حق سے منقطع ہو کر نفس کی طرف ملتفت ہو جانا شقاوت کی علامت ہے''۔

اور فرماتے ہیں: ''نورِ حق کے مشاہدے میں انسان اپنے آپ کو بھی بھول جائے، اسے وصل کہتے ہیں۔ اور اللہ کے ماسویٰ سے مخفی باتوں کو قطع کر دینا فصل کہلاتا ہے''۔

مزید کہتے ہیں: ''سکر: دل پر ایسے غلبۂ حال کو کہتے ہیں کہ جس کے ہوتے ہوئے آدمی ان چیزوں کو چھپانے پر قادر نہیں رہتا، کہ جنہیں چھپانا ضروری ہوتا ہے''۔

...... موصوف کی وفات ۸۹۵ھ میں ہوئی۔ آپ کی قبر شریف سمرقند میں ہے۔
(الشَّقَائِقُ النُّعمَانِيه ۱: ۲۷۸ - ۲۹۳، سے مختصر حالات کا تذکرہ مکمل ہوا)۔

۱۶ : طاش کبریٰ زادہ نے اپنی کتاب: الشَّقَائِقُ النُّعمَانِيَة" میں کہا ہے:

"خوب جان لو کہ: طریقۂ نقشبندیہ کی انتہا شیخ خواجہ بہاء الدین نقش بندی رحمہ اللہ تک ہے۔ اس مقام پر ہم اس طریق کے بعض مناقب وفضائل ذکر کرتے ہیں۔ .... چنانچہ ہم کہتے ہیں:

اس طریقِ تصوُّف کی بنیاد خواجہ بہاء الدین نقش بندی قُدِّس سرُّہ العزیز ہیں۔ آپ کا اسمِ گرامی محمد بن محمد بن محمد بخاری ہے۔ طریقت میں آپ کی نسبت سید امیر کلال کی طرف تھی، اور آپ نے انہیں سے ذکر کی تلقین حاصل کی تھی۔ مزید برآں آپ نے شیخ عبد الخالق غجدوانی کے روحانی فیوضات سے بھی تربیت پائی۔

آپ کے طریق کے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ: کسبی ہے، اور یہ بھی کہ: موروثی ہے۔ جب آپ سے اس بارے میں پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا: "کششِ حق کا کچھ ایسا حصہ مجھے عطا کیا گیا ہے جو جن وانس کے عمل کے مساوی ہے"۔

اور جب آپ سے آپ کے طریق کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا: "کثرت میں خلوت، باطن کی توجہ حق کی جانب اور ظاہر کی توجہ مخلوق کی طرف ہونا اس طریق کی حقیقت ہے"۔

پھر ارشاد فرمایا: "اس طرف اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی اشارہ کرتا ہے: "رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ"، یعنی: وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی"۔

آپ اعلانیہ ذکر (یعنی بالجہر) نہیں کیا کرتے تھے۔ اور اس پر معذرتاً کہتے تھے کہ "درحقیقت شیخ عبد الخالق غجدوانی نے مجھے عزیمت پر عمل کرنے کا تاکیدی حکم دیا تھا، اسی لیے میں نے اعلانیہ ذکر (بالجہر) چھوڑ دیا ہے"۔

آپ کے پاس کوئی غلام تھا نہ باندی۔ جب آپ سے اس بارے میں کہا گیا تو فرمایا: "بندہ اس لائق نہیں ہے کہ سید (وآقا) بنے"۔

آپ (دوسروں پر تہمت دھرنے کی بجائے) اپنے آپ کو الزام دینے کی نصیحت کے ساتھ ساتھ، نفس کے مکر وفریب اور چالوں سے ہوشیار رہنے کی تاکید کیا کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ "نفس کی چالبازیوں کی معرفت کے بعد ہی آدمی طریقِ تصوُّف کی حقیقت تک پہنچ پاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے قول: يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا آمِنُوْا بِاللّٰهِ، میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ: مؤمن کو چاہیئے کہ ہر دم طبعی وجود کی نفی کرتے ہوئے اپنے حقیقی معبود کا اثبات کرتا رہے"۔

مزید فرمایا کرتے تھے: "میرے نزدیک طریقت کا قریبی ترین راستہ وجود کی نفی ہے، لیکن یہ مرتبہ اختیار کے ترک اور اپنے اعمال میں کمی کوتاہی دیکھتے رہنے سے ہی حاصل ہوتا ہے"۔

مزید فرمایا کرتے تھے: "اللہ تعالیٰ کے ماسویٰ سے تعلق رکھنا، سالک کے لیے بہت بڑا حجاب ہے"۔

اور فرمایا کرتے تھے: "ہمارے طریقہ تو بس صحبت اختیار کرنا ہے، اور جمعیت میں اس شرط کے ساتھ خیر ہے کہ ساتھی آپس میں ایک دوسرے کی نفی کرتے رہیں۔ اور خلوت میں شہرت ہے، اور شہرت میں آفت ہے"۔

ں قاری نے انہیں اپنی کتاب "المرقاة" میں: "ہمارے شیخ" (۱۷) "سید" کے الفاظ سے ذکر کیا ہے۔

ملا علی قاری کے اساتذہ میں مشہور و معروف عالم، مسند حرم شیخ علی بن حسام الدین متقی حنفی بھی ہیں۔ان کا انتقال ۹۷۵ھ ہجری میں ہوا۔ ملا علی قاری نے مرقاۃ المفاتیح کے مقدمہ میں بایں اوصاف یاد کیا ہے: باعمل عالم، باکمال فاضل، عارف باللہ، ولی کامل مولانا علی۔ اللہ ان کی رفیع المرتبت برکات میں سے ہمیں بھی حصہ عطا فرمائے۔ مزید برآں ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اپنی شرح میں ان کی بعض عادات کے بارے میں بڑی عجیب وغریب حکایات نقل کی ہیں۔(۱۸)

......آپ ہی کا ارشاد ہے: "ہمارا طریقہ تو بہت مضبوط کڑا ہے، اس لیے کہ اس کی بنیاد رسول اللہ ﷺ، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے آثار، اور آداب کی متابعت پر ہے"۔

یہ بھی فرمایا: "طالب کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ: سب سے پہلے اپنے احوال کو پہچانے۔ پھر جب اہلِ طریق میں سے کسی کی صحبت اختیار کرے اور اپنے احوال میں (مثبت) زیادتی محسوس کرے، تو رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کرتے ہوئے اسے مضبوطی سے پکڑ لے کہ: "أَصَبْتَ فَالْزَمْ". یعنی: تم ٹھیک راہ پر ہو، اسے مضبوطی سے تھامے رہو"۔

آپ کی وفات پیر کی شب، ۳ ربیع الاول ۹۷۱ ھ، کو ہوئی۔

(الشقائق النعمانیہ ۱: ۲۸٤ - ۲۸٦).

۱۷ : دیکھیے: "مرقاة المفاتیح" (۳ : ۲۱۱، طبع مصر).

۱۸ : دیکھیے: "مرقاة المفاتیح" (۲ : ٤۷۰). چنانچہ آپ نے حدیث: "اُذْكُرْ هَاذِمَ اللَّذَّاتِ" کی شرح میں کہا ہے:

"ہمارے شیخ عارف باللہ تعالیٰ مولانا نور الدین علی متقی ایک تھیلی بنوا کر، اس پر لفظ: "موت" لکھ کر، مریدین کی گردن میں ڈال دیتے تھے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ: انہیں یہ دھیان رہتا کہ: موت قریب ہی ہے، دور نہیں، چنانچہ وہ امیدیں گھٹا کر، عمل زیادہ کرتے"۔

کئی ائمہ نے آپ کے حالاتِ زندگی پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے علامہ شیخ عبد القادر بن احمد فاکہی (ت ۹۸۹ ھ) ہیں، جن کی کتاب کا نام "اَلْقَوْلُ النَّقِي فِي مَنَاقِبِ الْمُتَّقِي" ہے۔ چنانچہ شیخ عبد القادر عیدروسی (ت ۱۰۳۸ ھ) نے اپنی کتاب: "اَلنُّورُ السَّافِرُ عَنْ أَخْبَارِ الْقَرْنِ الْعَاشِرِ" میں آپ کے حالات ذکر کرتے ہوئے فَاكِهِي کی کتاب سے نقل کیا ہے۔ آپ کے حالات پر تصنیف کرنے والوں میں سے شیخ عبد الوہاب (ت ۱۰۰۱ ھ) بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب کا نام "اِتِّحَافُ التَّقِيِّ فِي فَضْلِ الشَّيْخِ عَلِيِّ الْمُتَّقِي" رکھا تھا۔

مؤرخ صدیق حسن قنوجی (ت ۱۳۰۷ھ) اپنی کتاب "أبجدُ العُلوم" میں رقم طراز ہیں:

"أَبَانَ فِيْهِ عَنْ فَضَائِلِهِ الْكَثِيْرَةِ، وَهُوَ حَقِيْقٌ بِذٰلِكَ".

کہ: "شیخ عبد الوہاب نے اپنی کتاب "اِتِّحَافُ التَّقِي" میں، شیخ علی متقی کے بہت سے فضائل کا ذکر کیا ہے، اور وہ واقعی اس لائق بھی تھے"۔

محدث فقیہ شیخ عبد الحق بن سیف الدین بخاری دہلوی نے بھی آپ کے حالاتِ زندگی کو قلم بند کیا تھا۔ چنانچہ قنوجی نے کہا ہے:

"ذَكَرَ لَهُ الشَّيْخُ عَبْدُ الْحَقِّ الدَّهْلَوِيُّ تَرجَمَةً حَافِلَةً فِي الْمَقْصَدِ الأَوَّلِ مِنْ كِتَابِهِ "زَادِ الْمُتَّقِيْنَ فِي سُلُوكِ طَرِيْقِ الْيَقِيْنِ" وأَثْنىٰ عَلَيْهِ كَثِيْراً وَحَرَّرَ أَحْوَالَهُ الشَّرِيْفَةَ فِي أَبْوَابِ خَمْسَةٍ تَامٍّ". ......

ملا علی قاری کے اساتذۂ حدیث میں مسند حرم، خاتمة المحققين، حافظِ حرم علامہ شیخ ابو عباس شہاب الدین احمد بن محمد سعدی انصاری شافعی مکی بھی ہیں جو کہ ابن حجر (۱۹) ہیثمی کے نام سے معروف ہیں۔ موصوف کی وفات ۹۷۳ھ میں ہوئی۔ ان کا ذکر "مرقاةُ

......کہ: شیخ عبدالحق دہلوی نے اپنی کتاب "زَادِ المُتَّقِيْنِ فِي سُلوكِ طَرِيقِ اليَقِيْنِ" کے مقصدِ اوّل میں آپ کا تفصیلی ترجمہ لکھا ہے۔ (ترجمہ لکھنا حالاتِ زندگی بیان کرنے کو کہتے ہیں)۔ اور آپ کی انتہائی تعریف کرتے ہوئے مکمل پانچ ابواب میں آپ کے احوال تحریر فرمائے ہیں۔
آپ کے حالاتِ زندگی کے لیے درج ذیل کتب دیکھیے:

۱ : شعراني، لواقح الأنوار في طبقات الأخيار ۱: ۱۸۵، مصر، ۱۳۷۳ھ.

۲ : الغزي، الكواكب السائرة في أعيان المئة العاشرة ۲ : ۱۲۲ - ۲۲۲، بيروت، ۱۹۵۸ھ.

۳ : غلام علي آزاد، سبحة المرجان في آثار هندوستان ص ٤٣، بمبئي، هند، ۱۳۰۳ ھ.

٤ : عبد الحَيّ حسني، نزهة الخواطر ٤ : ۲۳٤ - ۲٤٤، حيدر آباد، الدكن، ۱۳۷٤ھ.

۱۹ : مشہور مؤرخ محی الدین عبدالقادر عیدروسی نے اپنی کتاب: "اَلنُّورُ السَّافِرُ عَنْ أَخْبَارِ القَرْنِ العَاشِرِ" میں ابن حجر مکی کے حالات بایں الفاظ نقل کیے ہیں:

"آپ کی ولادت رجب ۹۰۹ ہجری میں ہوئی۔ آپ کے بچپن ہی میں آپ کے والد کی وفات ہوگئی تھی۔ چنانچہ آپ کی کفالت کی ذمہ داری علم وعمل کے دو کامل اماموں نے اٹھائی۔ ایک تو عارف باللہ شمس الدین ابن ابی حمائل تھے، اور دوسرے شمس الدین شناوی تھے۔

پھر شیخ شمس شناوی آپ کو آپ کے آبائی علاقہ: (محلۂ ابی ہیتم) سے، قطب شریف سیدی احمد بدوی (اللہ تعالیٰ ان کی ذات سے نفع پہنچائے) کے پاس لے گئے۔ آپ نے وہاں مذکورہ بالا دونوں حضرات سے ابتدائی علوم کی تحصیل مکمل کی۔

جب آپ کی عمر تقریباً چودہ سال کی ہوئی، تو شیخ شناوی نے ۹۲۴ھ میں، آپ کو جامع از ہر میں ایک ایسے صالح عالم کے سپرد کیا جو شیخ شناوی اور ابن ابی حمائل دونوں کے شاگرد رہ چکے تھے۔ انہوں نے آپ کی خوب نگہداشت کی، اور آپ کو صغر سنی ہی میں مصر کے علماء کی ایک جماعت کے پاس لے گئے۔ چنانچہ آپ نے ان علماء سے علوم وفنون کو حاصل کیا۔ قرآن مجید تو آپ بالکل بچپنے ہی میں حفظ کر چکے تھے۔ وہ مشائخ جن سے آپ نے استفادہ کیا، ان میں شیخ الاسلام قاضی زکریا شافعی، معمر شیخ امام زینی عبدالحق سنباطی، شہاب رملی، امام ابوالحسن بکری وغیرہ جیسے اساطین شامل ہیں۔ ان علماء میں سے بعض نے بیس برس کی عمر سے بھی کم میں، آپ کو افتاء اور تدریس کی اجازت دے دی تھی۔

آپ تفسیر، حدیث، علم کلام، اصول فقہ اور فروع وغیرہ جیسے بہت سے علوم میں ماہر تھے۔ علمِ فقہ میں آپ کی محفوظات میں سے "المنهاج للنووي" بھی ہے۔ آپ کی قراءت شدہ چیزیں اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کی گنتی بھی دشوار ہے۔ جن مشائخ نے آپ کو روایتِ علوم وفنون کی اجازات دی ہیں، وہ بھی بہت زیادہ ہیں، جنہیں آپ نے خود ہی اپنے مشائخ کی معجم میں جمع کر دیا ہے۔

آپ ۹۳۳ھ میں مکہ آئے اور حج کیا۔ اور آئندہ سال حرم مکہ ہی کی مجاورت میں گزاری۔ پھر مصر واپس لوٹے، اور ۹۳۷ھ کے آخر میں اپنے اہل وعیال سمیت حج کیا۔ اگلا حج آپ نے ۹۴۰ھ میں کیا۔ اس کے بعد مکہ مکرمہ ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی، اور اس قیام کے دوران تالیف وتصنیف اور فتویٰ نویسی کے ساتھ ساتھ، موت تک تدریس میں مشغول رہے۔ اس لحاظ سے آپ کی مکہ میں اقامت کی مدت تینتیس (۳۳) سال بنتی ہے۔ آپ کی زندگی کے مزید حالات کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں ملاحظہ کریں:

المفاتیح لمشکاة المصابیح" میں ان کا تذکرہ ان الفاظ سے موجود ہے: ''ہمارے شیخ، عالمِ بے بدل، شیخ الاسلام، مفتیٔ خلق، کثیر کتب اور مشہور تالیفات والے ہمارے علم کی سند، مولانا سیدنا شیخ شہاب الدین ابن حجر مکی'' (۲۰)۔ باایں ہمہ ملا علی قاری اپنی اسی شرح میں جا بجا ان پر تعقب کرتے اور مناقشہ کرتے ہیں۔

ملا علی قاری کے اساتذہ حدیث میں مشہور عالم، محدث اور مسند حجاز شیخ عبداللہ سندی (۲۱) بھی ہیں۔ موصوف کی وفات ۹۹۶ھ میں ہوئی۔ ملا علی قاری نے اپنی کتاب "فتح المغطأ شرح الموطأ للإمام محمّد" میں ان کا تذکرہ ''میرے استاذ'' کہہ کر کیا ہے۔ چنانچہ مذکورہ کتاب کے مقدمے میں کہتے ہیں:

......

۱ : غزّي، الكوَاكِبُ السَّائرة ۳ : ۱۱۱.

۲ : خفاجي، ريحانة الألباء ص ۲۱۱ - ۲۱۲.

۳ : ابن عماد، شذراتُ الذَّهَب ۸ : ۳۷۰ - ۳۷۲.

۴ : اس کے علاوہ ہماری کتاب: فوائدِ جامعہ بر عجالۂ نافعہ (ص ۳۳۳) ملاحظہ کریں، اس میں کئی قیمتی فوائد ہیں۔

۲۰ : دیکھیے: "مرقاة المفاتيح" (۱ : ۲۵، طبع مصر).

۲۱ : شیخ عبدالحق محدث دہلوی (ت ۱۰۵۲ھ) نے اپنی فارسی کتاب: "أخبارُ الأخيَار في أسرَارِ الأبرَار" (المطبعة المجتبائية ۱۳۳۲ھ، ص ۲۸۰) میں موصوف کے ترجمہ میں کہا ہے:

''شیخ عبداللہ اور شیخ رحمۃ اللہ - اللہ کی ان دونوں پر رحمتیں ہوں -، دونوں سندھی علماء میں سے ہیں، لیکن مدینہ منورہ (میں مستقل رہائش اختیار کر لینے کی وجہ سے مدینہ منورہ ہی) کی جانب منسوب ہیں۔ یہ دونوں حضرات فقہاء صوفیہ میں سے تھے، اور مدینہ مطہرہ سے ہندی دیار کی جانب چلے گئے تھے، اور حدیث نبوی شریف کے طلبہ کو بہت فائدہ پہنچایا، حتیٰ کہ طلبہ انہیں ''شیخین'' کے نام سے جانتے پہچانتے اور پکارتے تھے۔

خواجہ عبدالشہید عبیداللہ رحمۃ اللہ علیہ ان دونوں کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ: یہ دونوں حضرات تو ہمیں شیخین یعنی حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی یاد تازہ کرا دیتے ہیں۔

یہ دونوں عالم علم و عملِ صالح اور تقویٰ میں اپنی مثال آپ تھے، کسی کا ان کے قریب پہنچنا بھی محال سمجھا جاتا تھا۔ ان کے بارے میں طلبہ کا یہ اعتقاد تھا کہ: حرمین شریفین سے ان دونوں حضرات جیسا کوئی بھی عالم ہندوستان میں نہیں آیا۔ دونوں ہی علی متقی کے رفقاء اور خلفاء میں سے تھے۔ عثمانی خلیفہ کی جانب سے مکہ مکرمہ میں تعینات شدہ حکام شیخ علی متقی کے پاس آیا کرتے تھے، اور آپ انہیں، اپنے بعض مریدین اور فقراء خدام کے لیے کچھ وظائف دینے کی ترغیب دے دیتے تھے۔ مگر آپ نے ایسے وظائف اور عطیات کبھی بھی نہ تو شیخین کے لیے قبول کیے اور نہ ہی سید عبد الوہاب کے لیے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ایسے وظائف عموماً شک و شبہ سے خالی نہیں ہوتے۔

شیخ رحمت اللہ کے والد قاضی عبداللہ، بعض حوادث کی بنا پر اہل و عیال سمیت مدینہ منورہ کی طرف جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں احمد آباد نامی شہر میں کچھ عرصہ ٹھہرے اور وہیں شیخ علی متقی سے ملاقات ہوگئی، اور بس پھر تو انہی کے ہو کے رہ گئے۔ جب حجازِ مقدس پہنچے تو مدینہ منورہ کو......

میں نے اس کتاب (یعنی موطا امام محمد) کی پشت پر اپنے استاد شیخ عبداللہ سندی رحمہ اللہ کی یہ تحریر دیکھی ہے کہ: یہ موطا مالک بن انس، محمد بن حسن والی روایت ہے۔ جبکہ یہ بات قابل اشکال ہے۔ اس لیے کہ امام محمد اس کتاب میں امام مالک (۲۲) کے علاوہ دوسرے

......اپنا وطن بنالیا، اور کچھ ہی عرصہ بعد اپنے رب تعالیٰ سے جا ملے۔

شیخ عبداللہ موصوف، قاضی عبداللہ کے رفیق اور ساتھی تھے۔ ان کی نشو ونما اور پرورش مدینہ منورہ ہی میں ہوئی، اور وہیں افادۂ علمی اور عبادت میں مشغول رہنے لگے۔ پھر بعض حوادث کی بنا پر مدینہ منورہ سے ۹۷۷ھ میں واپس دیارِ ہند کی طرف لوٹ آئے۔ مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد، ایک مدت تک احمد آباد نامی شہر ہی میں قیام پذیر رہے، کیونکہ ان کے آباء واجداد کا وطن یہی تھا۔

کئی سال اسی طرح گزرنے کے بعد شیخ عبداللہ اور شیخ رحمت اللہ کسی لاعلاج قسم کی بیماری میں مبتلا ہوگئے، جس سے جسم کے اعضاء کو حرکت دینے کی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ (غالباً فالج کی کوئی قسم ہوگی)۔ بہرحال، تب یہ دونوں حضرات احمد آباد سے حجاز چلے گئے۔ ان دونوں اصحاب کے مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد ان دونوں کی وفات ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ ان پر اور تمام نیکوکار لوگوں پر رحمت نازل کرے۔ آمین۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب "زَادِ المُتَّقِيْنِ فِي سُلُوكِ طَرِيقِ اليَقِيْنِ" میں ان کے حالات کو بایں الفاظ نقل کیا ہے:

عبداللہ سندی از اصحاب علی متقی ست، وشاگرد ابن حجر مکی در علم عربیت استفادہ می کرد، واکثر احوال می گفت: اعربوا لنا هذا الكلام. دانش مند بود و مرد خدا از ہیچ کس طمع و باہیچ کس کارے نداشت، برائے خدا درس وافادہ نمودے، وتصحیح کتب حدیث کردے، نسخہ مشکاتے بدست خود بغایت تصحیح نمودہ وتحشیہ کردہ، وورق ورق ساختہ تا بسیار کس در یک مجلس از اں استفادہ می کردند، وانتساخ می کرد، ودر حواشی اثبات مذہب حنفی نمودہ ودلائل آن آوردہ است، می گفت من مشکاۃ را حنفی ساختہ ام، ومی گفت کہ در تمام عمر خود کارے کہ کردہ ام ایں مشکاۃ است۔ امید دارم کہ خدائے تعالیٰ مرا بداں بخشد۔ مَاتَ رَحِمَهُ اللهُ فِي ۹۹۶ھ۔

ترجمہ: عبداللہ سندی، شیخ علی متقی رحمہ اللہ کے اصحاب میں سے تھے۔ انہوں نے ابن حجر مکی سے علم حاصل کیا، اور ابن حجر مکی عربیت میں ان سے رجوع کیا کرتے تھے، اور کئی مرتبہ کہا کرتے: ہمیں اس کلام کی عربی عبارت بنادو۔

موصوف عالم اور اللہ والے آدمی تھے۔ لوگوں سے کنارہ کش اور محض اللہ کے لیے درس وتدریس میں مشغول رہتے ہوئے طلبہ کو فائدہ پہنچاتے۔ حدیث کی کتب کی تصحیح کرتے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے مشکاۃ المصابیح کا نسخہ لکھا تھا جو صحت کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ پھر اس نسخے پر حاشیہ بھی لکھا، اور اسے ایک ایک علیحدہ علیحدہ ورق پر نقل کیا، جس کی بنا پر کئی لوگ اس سے ایک ہی مجلس میں استفادہ کر سکتے تھے۔ موصوف نے اس کے حواشی میں مذہب حنفی کے اثبات کے دلائل نقل کیے تھے۔

آں موصوف اس نسخے کا حاشیہ لکھتے ہوئے کہا کرتے تھے: ''میں نے اس حاشیے سے "مشكاة المصابيح" کو حنفی بنادیا ہے''۔

کہا کرتے تھے: ساری عمر میں ایسا عمل جو میں نے کیا ہو اور مجھے اس کی بنا پر اللہ سے مغفرت کی امید ہو، وہ یہی "مشكاة المصابيح" کی خدمت کا عمل ہے۔ آپ کی وفات ۹۹۶ھ میں، مکہ مکرمہ میں ہوئی۔

مزید دیکھیے: "تقصار جيود الأحرار للنواب صديق حسن خان قنوجي، المطبعة الشاهجهانية، بھوپال، ہند: ۱۲۹۸ھ، ص۱۰۰.

۲۲ : دیکھیے: "فَتحُ المُغَطَّا شَرْحُ المُوَطَّا". اس کتاب کا ایک خطی نسخہ ''پیر وہب اللہ شاہ''، صاحبِ عَلَم کے کتب خانہ میں، سندھ کی بستی پیر جھنڈو میں محفوظ ہے۔ اور ہم نے اس کتاب کا ایک دوسرا، مذکورہ بالا نسخہ سے بہتر مخطوط سندھ میں، عالمِ کبیر محمد ہاشم جان مجددی کے ہاں، بستی ٹنڈو سائیں داد میں دیکھا ہے۔

محدثین، جیسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان جیسے مزید محدثین سے بھی روایت کرتے ہیں۔ شاید انہوں نے اغلب روایات پر نظر کر کے یہ حکم لگا دیا ہے۔

ملا علی قاری نے مسند امام اعظم بروایت حصکفی پر اپنی شرح میں انہیں: ''ہمارے شیخ، مولانا'' کے الفاظ سے ذکر کیا ہے (۲۳)۔

ملا علی قاری کے اساتذۂ حدیث میں علامہ حافظ اپنے زمانے کے مسند حدیث، صاحب طبقات حنفیہ، مفتیٔ مکہ شیخ قطب الدین (۲۴)

۲۳: دیکھیے: "مسندُ الإمامِ الأعظم، بروایة حصکفي، مع شرح ملا علي قاري": (ص ٤، المطبع المجتبائية، دهلي هند ١٣١٣ ھ.

۲۴: غزی "الكَواكِبُ السَّائِرَة بأعيانِ المِئَةِ العَاشِرَة (۳:۴۴) میں آپ کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''محمد بن احمد علاء الدین بن محمد بن قاضی خان بن بہاء الدین بن یعقوب بن حسن بن علی نہروانی۔ (النہروالی: اگر لام کے ساتھ ہو تو ''نہر والہ'' کی طرف نسبت ہے، جو ہندوستان میں گجرات میں واقع شہر کا نام ہے)۔ موصوف شیخِ وقت، امام، علامہ، محقق مدقق، ذی فہم، شیخ قطب بن شیخ علاء الدین، اصلاً نہروانی (نہروالی) ہندی، مکی، حنفی تھے۔ اور میں نے ان کے نسب کے بارے میں جو کچھ نقل کیا ہے وہ میں نے ان کے اپنے قلم کی اس تحریر میں پڑھا ہے، جس میں انہوں نے شیخ الاسلام سے یہ استدعاء کی ہے کہ ...، ان کی شہرت شیخ قطب الدین ہندی سے تھی۔ ان کی پیدائش ۹۱۷ ھ میں ہوئی، جیسا کہ میں نے ان کی اپنی تحریر میں پڑھا ہے۔

آپ نے جن مسندینِ حدیث سے روایت کی ہے، ان میں سب سے بڑے شیخ عبد الحق سنباطی ہیں۔ اور ان کے مشایخ میں سے سب سے عظیم القدر عالم ان کے والد اور شیخ محمد تونسی، شیخ ناصر الدین لقانی، شیخ احمد بن یونس بن شلبی اور شیخ جمال الدین حرباتی ہیں۔ آپ شیخ الاسلام کے ساتھ مکہ اور شام میں مجتمع ہوئے۔ پھر انہیں کتابی طور پر اجازتِ حدیث کی استدعاء ۹۷۷ ھ میں لکھی، کہ وہ انہیں اور ان کی اولاد کو اجازتِ حدیث دے دیں، چنانچہ انہوں نے انہیں اس کی اجازت دی تھی.... ابن حنبلی نے اپنی تاریخ میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی بہت تعریف کی ہے۔ کہتے ہیں: انہیں دو زبانوں ترکی اور فارسی میں بھی مہارت تھی۔ آپ کی تالیفات میں سے ایک "طَبقَاتُ الحَنَفِيَّة" ہے، جو ان کی باقی کتب کے ساتھ جل گئی تھی''۔

میں کہتا ہوں: مکہ مشرفہ میں مجھے ان کی کتب کی تاریخ ملی تھی۔ موصوف فقہ، تفسیر، عربیت اور نظمِ شعر میں ماہر تھے۔ آپ کی نظم انتہائی رقیق القلب ہوا کرتی تھی۔

عبد الحیٔ حسنی اپنی کتاب: نزهة الخواطر (٤ : ٢٨٦) میں رقم طراز ہیں:

''آپ کی ولادت لاہور میں ہوئی، .....علم کی تحصیل اپنے والد صاحب سے کی۔ پھر مکہ مشرفہ کا سفر کیا، اور خطیبِ عصر احمد محب الدین ابن ابی القاسم محمد عقیلی نویری مکی، محدث یمن وجیہ الدین عبد الرحمٰن بن علی ربیع شیبانی زبیدی، نزیلِ حرمین شیخ شہاب الدین احمد بن موسے بن عبد الغفار، اصلاً مغربی، پھر مصری، اور شیخ محمد بن محمد بن عبد الرحمٰن خطاب مالکی، اور ان کے والد شیخ محمد بن عبد الرحمٰن وغیرہ جیسے اجل علماء سے علم حاصل کیا۔

اس کے بعد ۹۴۳ ھ میں مصر چلے گئے، اور وہیں متوکل علی اللہ ابوعبد اللہ محمد بن یعقوب عباس سے ۹۵۰ ھ میں ملاقات ہوئی۔ اس بات کی صراحت انہوں نے تاریخ مکہ میں کی ہے۔

مزید کہتے ہیں: میں اور شیخ عباسی مصر میں اکٹھے ہوئے، اور میں نے ان سے ۹۴۳ ھ میں، مصر کی جانب طلب علم کی خاطر کیے......

......جانے والے سفر میں حدیث کو اخذ کیا۔ ان دنوں مصر بڑے بڑے علماء کی آماجگاہ تھا، فضلاء سے بھرا ہوا، اور مشائخ کرام کی برکات کی وجہ سے ایسے بابرکت بقعہ تھا، گویا کہ ایک دلہن چاند تاروں کے درمیان گھری ہوئی ہو۔

اب مرورِ زمان کے ساتھ، وہ سال، اور ان دنوں کے بسنے والے لوگ ایسے بھولے بسرے ہو گئے ہیں گویا وہ ایام اور وہ بابرکات ہستیاں، سب ایک خواب تھا جو کسی نے کبھی دیکھا تھا۔

اور تاریخ مکہ میں انہوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ: انہوں نے طریقِ تصوف کو شیخ علاء الدین کرمانی نقش بندی (ت ۹۳۹ ھ) سے حاصل کیا تھا۔ شاید یہ ان کے مصر کے سفر سے پہلے کا قصہ ہو۔

موصوف کی صحیح بخاری کی سند اتنی عالی ہے کہ ساری دنیا میں اس قدر عالی سند والا کوئی عالم میرے علم میں نہیں ہے"۔ (حافظ سید عبدالحئی کتانی نے اپنی کتاب "فَهرِسُ الفَهَارِسِ وَالأثبَات" میں، موصوف کے ترجمہ میں اس سند پر ایسی سیر حاصل بحث کر دی ہے کہ اس کے بعد مزید کلام کی گنجائش باقی نہیں ہے)۔

میں کہتا ہوں: قاضی محمد بن علی شوکانی نے "البدر الطّالع" میں ان کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"آپ شرفاءِ مکہ کو انشاء پردازی لکھ کر دیا کرتے تھے، اور آپ فصاحت و بلاغت میں فائق تھے، جسے ہر وہ آدمی جان سکتا ہے جس نے ان کی تالیف: "البَرقُ اليَمَانِي في الفَتحِ العُثمَانِي" دیکھ رکھی ہو۔ اس تالیف میں بیت اللہ الحرام کی جلیل القدر ہستیوں کے حالات کو جمع کیا گیا ہے۔ ترکوں کے ہاں آپ کی انتہائی قدر و منزلت تھی۔ اور ان کے سرداروں میں سے کوئی بھی اس وقت تک حج نہیں کرتا تھا جب تک کہ آپ ان کے ساتھ نہ ہوتے، اور آپ کے علاوہ کسی دوسرے کے ساتھ وہ تیار نہ ہوتے تھے۔

ترک آپ کی خدمت میں بڑی لمبی رقمیں ہدیۃً پیش کرتے تھے، اور اس طرح جو رقم حاصل ہوا کرتی تھی، آپ اس سے عمدہ عمدہ کتب خریدتے، یا ضرورت مندوں پر خرچ کر دیتے۔ اسی بنا پر نادر کتب کا ایسا ذخیرہ آپ کے پاس جمع ہو گیا تھا، جو کسی دوسرے کے پاس کم ہی جمع ہوا ہو گا۔ آپ کی عادت تھی کہ: اکثر باغوں میں تفریح کے لیے جایا کرتے۔ اکثر علماء اور ادباء کی ایک جماعت کے ساتھ طائف کی جانب نکل جاتے، اور ان سب کا خرچہ آپ خود اٹھاتے۔

آپ کی تصانیف کئی ہیں، ان میں سے بہترین کتاب: "الإِعلَام، بِأعلَامِ بَيتِ اللهِ الحَرَامِ" ہے۔ آپ نے اسے ۹۵۸ ھ میں تصنیف کیا تھا.... آپ کی تصنیفات میں سے: "البَرقُ اليَمَانِي في الفَتحِ العُثمَانِي" بھی ہے، جس میں وزیر سلیمان پاشا کے ہاتھوں پہلی عثمانی فتح کے بعد سے لے کر مؤلف کے زمانے تک کی یمن کی تاریخ ہے۔ موصوف نے اسے وزیر سنان پاشا کی فرمائش پر اس کے لیے تصنیف کیا تھا۔ اس کتاب کا نام: "الفتوحات العثمانية، للأقطار اليمنية" بھی ہے"۔

آپ کی چند مزید تصنیفات یہ ہیں: "منتخب التاريخ في التَّراجم"، "تمثال الأمثال النادرة والتمثيل والمُحاضرة بالأبيات المُفرَدَةِ النَّادِرَة" اور "الكَنزُ الأسمىٰ فِي فَنِّ المُعَمّىٰ"۔

عبدالقادر عیدروسی نے "النُّورُ السَّافِر" میں کہا ہے:

"شیخ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ کے افادات میں سے یہ بھی ہے کہ: لفظ "ابن خلّكان" کا ضبط دو فعلوں کی صورت پر کیا گیا ہے،......

مکی حنفی بھی ہیں۔موصوف کی وفات ۹۹۹ھ میں ہوئی۔چنانچہ اپنی: "بَيَانُ فِعْلِ الخَيْرِ إِذَا دَخَلَ مَكَّةَ مَنْ حَجَّ عَنِ الغَيْرِ" نامی کتاب میں انہیں "عُمْدَةُ الْمُتَأَخِّرِين، زُبْدَةُ الْمُتَبَحِّرِين، ہمارے شیخ، اللہ کے امن والے حرم میں مسلمانوں کے مفتی مولانا قطب الدین (۲۵) " جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

یہ ضبط واتقان میں مشہور محدثین کی ایک جماعت ہے جنہوں نے ملاعلی قاری کو اپنی مرویات کی اجازت دی، اور ملاعلی قاری نے ان سے استفادہ کیا ہے۔اس کے علاوہ بھی مسندین حدیث علماء سے ملاعلی قاری کو اجازت حدیث حاصل ہے۔

اوران علماء میں سے عارف باللہ، فقیہ، محدث شیخ محمد بن ابوالحسن بکری (۲۶) مصری شافعی ہیں، جن کی وفات ۹۹۴ھ میں ہوئی۔ملا علی قاری نے اپنے رسالہ: "شَمُّ العَوَارِض" میں انہیں: "ہمارے نیکوکار، مغفور شیخ محمد بن ابی الحسن بکری" کے الفاظ سے ذکر کیا ہے۔

......ایک تو لفظ: "خَلِّ" ہے، جو "خَلِّيْ" یعنی: "تَرَكَ" فعل ماضی سے امر کا صیغہ ہے۔اور "کان" ناقصہ ہے۔یہ نام رکھے جانے کی وجہ یہ ہوئی کہ: آپ اکثر یوں کہا کرتے تھے: "كَانَ وَالِدِيْ كَذَا"، اور "كَانَ جَدِّي كَذَا" یعنی: میرے والد یوں ہوا کرتے تھے ....، اور میرے دادا جان جو برامکہ میں سے تھے، وہ یوں ہوا کرتے تھے ....، تو ان سے کہا گیا: "خَلِّ كَانَ"، کہ: یہ "كَانَ" چھوڑ دے"۔

کہتے ہیں: "میں نے اس کا ضبط: لام کے سکون اور باقی حرکات کے اسی حال پر رہنے کے ساتھ بھی دیکھا ہے"۔واللہ اعلم۔

عصامی نے "سِمْطُ النُّجُوْمِ العَوَالِي" (٤ : ٣٣٧) میں کہا ہے:

اس سال (یعنی ۹۹۰ھ) میں، ۲۶ ربیع الثانی، بروز ہفتہ، فجر ثانی کے قریب، اذان کے وقت، علامہ شیخ قطب الدین نہروالی کی بھی وفات ہوئی۔موصوف حنفیہ کے مفتی تھے۔

۲۵ : اس کے لیے ان کا یہ رسالہ دیکھیے: "بَيَانُ فِعْلِ الخَيْرِ، إِذَا دَخَلَ مَكَّةَ مَن حَجَّ عَنِ الغَيْرِ" (ورقہ ۲۲۶)، ضمن مجموعۂ رسائلِ مخطوطہ، درمکتبہ کلیۃ شرقیہ، پشاور۔

۲۶ : ان کے بارے میں مؤرخ عبدالقادر عیدروسی (ت ۱۰۳۸ھ) اپنی کتاب: "النُّور السَّافر عن أخبار القرن العاشر" میں یہ الفاظ کہے ہیں:

وفي ربيع الثَّاني سنة ثلاثٍ وَّتسعين تُوفِّي الأستاذ الأعظم، قطبُ العارفين الشَّيخ محمَّد بن الشيخ أبي الحسن محمد ....، ابن أبي بكر الصديق ... البكري الصديقي الشافعي الأشعري المصري .... كان هذا الشيخ من آيات اللّٰه في الدرس والإملاء. فكانَ إذا تكلم فيه تكلم بما يُحَيِّر العقولَ ويُذهل الأفكار، بحيث لا يرتاب سامعه في أن ما يتكلم به ليس من جنس ما ينال بالكسب.وربما كان يتكلَّمُ فيه بكلام لا يفهمه أحدٌ من أهل مجلسه، مَعَ كون كثير منهم أو أكثرهم على الغاية من التَّمكُّن في سائر مراتب العلوم الإسلامية، والإحاطة بفنونها.

فيذكر له ذلك بعد القيام من المجلس، فيقول: ليس ذلك بأعجب من حال المتكلِّم به، فإني فيه مثلهم، كان إليه النِّهاية في العلم، حتى كان بعض أئمة العلوم والمعارف هناك ممن أفنىٰ عمره في كسب العلوم الدينية والمعارف الربانية، يقول: واللّٰه لا ندري من أين هذا الكلام الذى نسمعه من هذا الأستاذ؟ ولا نعلم له أصلا يؤخذ منه، ولو لا العلم يسد باب النبوة ، ......

......لاستدللنا بما نسمعه منه علیٰ نبوته.

اس سال، یعنی ۹۹۳ھ میں، ربیع الثانی میں عظیم استاد قطب العارفین شیخ محمد بن شیخ ابوالحسن محمد.....بن ابی بکر صدیق....بکری صدیقی شافعی اشعری مصری، کا انتقال ہوگیا۔ موصوف درس واملاء میں اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔ چنانچہ جب وہ بات کرتے تو عقلوں کو حیران کردینے والی اور افکار کو تعجب میں ڈالنے والی ایسی گفتگو کرتے، جسے سننے والے کو اس امر میں کوئی شبہ باقی نہ رہتا کہ جو باتیں آپ کررہے ہیں، ایسی نہیں ہیں جنہیں کوشش سے حاصل کیا جاسکتا ہو۔

بعض اوقات آپ ایسی باتیں کرجاتے، جنہیں اہل مجلس میں سے شاید کوئی بھی سمجھ نہ پاتا، باوجودیکہ آپ کے پاس حاضر ہونے والوں میں سے بہت سے، بلکہ اکثر لوگ ایسے ہوتے تھے جو تمام اسلامی علوم وفنون کی باریکیوں کے انتہائی ماہر، جید استعداد کے مالک، اور پختہ علم والے ہوا کرتے تھے۔

اور اختتامِ مجلس کے بعد، جب آپ سے کسی بیان شدہ بات کے بارے میں کچھ کہا جاتا تو فرماتے: یہ بات مجھے بھی اتنی ہی حیران کن معلوم ہو رہی ہے، جتنی سننے والوں کو ہو رہی ہے، اور اس معاملے میں میرا حال بھی ان جیسا ہی ہے۔

اس زمانے میں آپ کو علم کا منتہیٰ شمار کیا جاتا تھا، حتیٰ کہ بعض ائمۂ علوم معارف ایسے بھی تھے جنہوں نے علومِ دینیہ اور معارفِ ربانیہ کی تحصیل میں عمریں فنا کردی تھیں، مگر وہ بھی یہ کہنے پر مجبور تھے: اللہ کی قسم! جو کلام ہم اس استاد سے سنتے ہیں، ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کہاں سے اخذ کردہ ہے؟ اور نہ ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے اس کلام کی اصل کیا ہے۔ اور اگر علم، نبوت کا دروازہ بند ہونے کے ساتھ ہی مخصوص نہ ہوگیا ہوتا، تو ہم ان سے سنی ہوئی باتوں کی وجہ سے ان کی نبوت پر استدلال کرتے''۔

مزید کہتے ہیں:

''آپ کی تفسیرِ قرآن کی مجالس، اس میں بیان ہونے والے دقیق معانی، اور گہری ابحاث کے ساتھ ساتھ سلف وخلف ائمۂ تفسیر کے اقوال کا استیعاب، پھر ان میں سے موصوف کے ہاں معتمد علیہ اقوال کا بیان، آیات اور سورتوں کے درمیان ربط اور مناسبت، ذاتِ مقدسہ کے اسماء وصفات کے درمیان مناسبت اور اس کے مواضع کا ذکر، اور تزکیہ وتصوّف کی رہنمائی کا حامل ہونے کی وجہ سے قرآن مجید کی ہر آیت کے ذیل میں ائمۂ طریقت کے بیان کردہ علومِ اشارہ کی توضیح وغیرہ، یہ سب ایسے امور ہیں جس سے عقلیں حیران، اور انسان ششدر رہ جاتا ہے۔

اور مستزاد یہ کہ جب آپ ان سب امور کو بیان کرتے تو خداداد فصاحت وبلاغت، روانی وجزالت اور انتہائی وضاحت سے، ایسے نپے تلے اور منتخب الفاظ سے بیان کرتے کہ اس کے بعد مزید توضیح وتشریح کا کوئی گوشہ باقی نہیں رہتا تھا۔

پھر یہ بھی آپ کی امتیازی خصوصیت تھی کہ: آپ کی یہ ساری، یا اکثر تقریر مقفّع مسجّع برجستہ عربی اور اقتضائے مقام کے اتنا مطابق ہوتی کہ اس سے زیادہ موزوں الفاظ کا انتخاب ناممکن ہی ہوتا۔ مختلف علوم پر تقریر کے دوران، کوئی شخص، کبھی بھی آپ کے کلام میں اعراب، صرف ونحو، تقدیم وتاخیر یا ایسی کوئی دوسری لسانی غلطی نہیں نکال سکا۔ آپ کے ہر درس کی ابتدا ایک فی البدیہہ خطبہ سے ہوا کرتی تھی۔ اور اگر خطبہ فی البدیہہ نہ بھی ہوتا، تو بھی اس میں آئندہ بیان کیے جانے والے درس سے متعلق براعتِ استہلال کے انداز پر اشارات ضرور ہوتے تھے۔ آپ کی علم حدیث اور فقہ کی مجالس ایسی ہوا کرتی تھیں۔......

اورانہی اساتذہ میں عالم کبیر شیخ فقیہ بدرالدین شہاوی حنفی حرم مکہ کے مفتی بھی ہیں۔ ملاعلی قاری نے ان کا تذکرہ اپنے رسالہ :"لسان الاهتداء في بيان الاقتداء" میں، بایں الفاظ کیا ہے:

ہمارے شیخ بدرالدین شہاوی حنفی، حرم مکہ کے مفتی ......"۔(۲۷)

انہی اساتذہ میں سے ایک مشہور واعظ، فقیہ شیخ سنان الدین یوسف بن عبداللہ اماسی روحی حنفی ہیں۔ موصوف مکہ میں آ گئے تھے۔ اور سنان الواعظ کے لقب سے مشہور تھے۔ مناسک حج کے موضوع پر ان کی ایک کتاب "قرة العين" نامی بھی ہے۔ تقریباً ۱۰۰۰ھ میں وفات پائی۔ ملاعلی قاری نے اپنے رسالہ: بیان فعل الخیر اذا دخل مکۃ من حج عن الغیر، میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے: ہمارے شیخ، علماء کے لیے قابل فخر اور صالحین کا سرمایہ، مولانا سنان الواعظ رومی ......"۔(۲۸)

اور ان میں شیخ مسند محمد بن علی بن احمد بن سالم جناحی بھی ہیں۔ ملاعلی قاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب: "مرقاة المفاتيح" کے مقدمہ میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

مجھے شیخ علامہ علی بن احمد جنانی ازہری شافعی اشعری انصاری سے اجازت عامہ اور رخصت تامہ حاصل ہے۔ اور انہوں نے

...... آپ جس علم پر بھی تقریر شروع کرتے، آپ کے درس میں اُس فن کے اصول وفروع کے حافظ اور پختہ کار ماہر سامعین بھی یہی رائے قائم کرتے کہ: آپ نے کسی بھی بحث میں، کسی دوسرے بولنے والے کے لیے کوئی نکتہ باقی نہیں چھوڑا۔ اور اس فن میں آپ کے اختیارات اور ذاتی آراء مستزاد ہوا کرتیں۔

فضلاء مصر شعراء، علوم لغت، شعری قواعد اور مذاہب انشاء کے ماہرین آپ کی اختتامی مجالس میں شامل ہوا کرتے، آپ کی تعریف میں نئے نئے قصائد لکھتے، اور آپ کی ایسی مجالس جن میں خواص وعوام موجود ہوتے، ان سب ظاہری وباطنی نعمتوں، یا کچھ مہتم بالشان احسانات کا علی رؤوس الأشہاد تذکرہ کرتے جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر کرر کھے تھے۔

آپ کے بارے میں جو کچھ بھی بیان ہوتا، آپ اس میں کہنے والوں کے پاس بیٹھتے، انہیں انعام بھی دیتے، اور اپنے ان احباب کی خوشی، اور ان کے حسن ظن کی رعایت کرتے ہوئے خوشی کا اظہار بھی فرماتے۔ اللہ تعالیٰ ان کی برکات سے ہمیں بھی متمتع فرمائے۔

عیدروسی نے ان کے حالاتِ زندگی بہت بسط وتفصیل سے لکھے ہیں۔ مزید دیکھیے:

۱ : غزی، الكواكب السائرة ۳ : ۶۷ - ۷۲.

۲ : ہماری کتاب: فوائد جامعہ بر عجالۂ نافعہ (اردو)

۳ : دہلوی، شیخ عبدالحق: زَادُ المُتَّقِيْن فِي سُلوكِ طَرِيقِ اليَقِيْن (فارسی).

۲۷ : دیکھیے: لسان الاهتداء في بيان الاقتداء: ورقه ۲۵۷، ضمن مجموعہ رسائل ملاعلی قاری مخطوط، در مکتبہ کلیۃ شرقیہ، پشاور۔

۲۸ تا ۳۲ : دیکھیے: بيان فعل الخير إذا دخل مكة مَن حجَّ عن الغير: ورقه ۳۳۶، ضمن مجموعہ رسائل ملاعلی قاری مخطوط، در مکتبہ کلیۃ شرقیہ، پشاور۔

کہا: میں نے شیخ الاسلام اور بڑے ائمہ کے امام شیخ جلال الدین سیوطی سے حدیث کی کئی کتب صحیح بخاری، صحیح مسلم، ان کے علاوہ کتب ستہ کے علاوہ دوسرے کئی علوم کی کتابیں بھی بعض تو قراءۃً، اور بعض سماعاً پڑھیں۔ اور انہوں نے مجھے اپنی تمام مرویات کی، اور جو کچھ ان پر پڑھا گیا سب کی اجازت دی۔ اور ان سب علوم کی بھی اجازت دی جس کی اجازت انہیں "خاتمة المحدثین مولانا شیخ ابن حجر عسقلانی نے قراءۃً، سماعاً، اجازتاً اور روایۃً دی تھی۔ اور علامہ علی جنانی نے مجھے ان کتب وعلوم کی بھی اجازت دی ہے، جو انہوں نے صاحبِ "المواهب" اور شارحِ بخاری شیخ قسطلانی کے سامنے پڑھی تھیں، اور وہ ابنِ حجر عسقلانی کے اجل تلامذہ میں سے تھے اور انہوں نے مجھے اپنی مرویات اور مؤلفات کی اجازت دی تھی۔ اور یہ اس معتمد سند کے مطابق ہے جو ایسے زمانے میں پائی جا رہی ہے جو بے لطف و بے مزہ ہے اور جس میں جینا دوبھر ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ میں نے مشکاۃ کی بعض احادیث بحر عرفان کے منبع، مشہور عالم مولانا میرکلاں (۳۳) کے سامنے بھی پڑھی تھیں اور انہوں نے مشکاۃ شریف بہترین محقق، بے بدل نکتہ رس عالم میرک شاہ (۳۴) سے پڑھی، اور انہوں نے اپنے والد صاحب محدث مولانا

---

۳۳ : علامہ شریف عبدالحئی بن فخر الدین حسنی نے اپنی کتاب: "نُزهَةُ الخَواطر و بهجة المَسَامِع والنَّواظِر" (٤ : ٣٣١) میں ان کے بارے میں یہ کہا ہے:

"موصوف مشہور شیخ، عالم، محدث محمد سعید بن مولانا خواجہ حنفی خراسانی تھے۔ آپ کی شہرت "میرکلاں" کے نام سے تھے۔ کبار علماء میں سے تھے۔ آپ کی ولادت، نشو ونما اور دینی وعلمی تربیت علمی ماحول میں ہوئی۔ آپ نے علامہ عصام الدین ابراہیم بن عرب شاہ اسفرائینی اور دوسرے علماء سے علم حاصل کیا۔ پھر سید نسیم الدین میرک شاہ بن جمال الدین حسنی ہروی سے حدیث کا علم حاصل کیا اور ایک عرصے تک بالالتزام انہی کی خدمت میں رہے۔ پھر حرمین شریفین کا سفر کیا۔ حج کیا، مدینہ منورہ کی زیارت کی، اور ایک مدت تک مکہ مکرمہ میں ہی سکونت پذیر رہے۔ ان سے شیخ علی بن سلطان قاری ہروی (صاحب مِرقَاةُ المَفَاتِيح)، اور سید غضنفر بن جعفر حسنی نہروالی اور علماء کی ایک بڑی جماعت نے علم حاصل کیا۔

آپ کے علمی فوائد کی نقول سے پتہ چلتا ہے کہ آپ بہت بڑے عالم اور محقق محدث تھے۔ علوم وفنون میں آپ کو خوب مہارت تھی، خصوصاً علمِ حدیث میں تو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ آپ تمام عمر طریقِ ظاہر اور اصلاح کی رعایت کے ساتھ پڑھاتے ہوئے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچاتے رہے۔ آپ کی وفات ۹۸۱ھ کو، اسی سال کی عمر میں آگرہ میں ہوئی۔ یہ تمام تفصیل بدایونی نے ذکر کی ہے"۔

۳۴ : میرزا محمد باقر خوانساری اپنی کتاب "رَوْضَاتُ الجَنَّات" (١ : ٤٥٠) میں، شیخ محدث جمال الدین کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"آپ کے باہمت بیٹے (یعنی جمال الدین محدث) جو امیر نسیم الدین کے نام سے مشہور، اور میرک شاہ سے ملقب ہیں، علوم وفنون کی تکمیل، اور خصوصاً علمِ حدیث میں نادرِ روزگار، اور معاصرین میں یکتا تھے۔ آپ اپنے والدِ معظم کے مقبرے کے پاس (آگرہ میں) قائم شدہ درس گاہ میں اُن کے قائم مقام بنے۔ اور اس ادارے کے بانی کی شرائطِ وقف کے مطابق تدریس اور افادے میں مشغول رہے"۔

مؤرخ میر خالد نے اپنی کتاب "روضةُ الصَّفا" میں آپ کا سنِ وفات ذکر نہیں کیا، اور نہ ہی اب تک مجھے مل سکا ہے۔

سید جمال الدین (۳۵) سے پڑھی، جن کی کتاب "روضة الأحباب" ہے۔ اور انہوں نے اپنے چچا سید اصیل الدین شیرازی سے

۳۵ : میرزا محمد باقر خوانساری نے اپنی کتاب "رَوْضَاتُ الجنّات في أحوَالِ العُلَمَاءِ وَالسَّادَات" (۱ : ٤٤٩) میں آپ کے حالات ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

''سید فاضل، سنی محدّث جمال الدین میرزا عطاء اللہ بن امیر فضل اللہ شیرازی، دشتکی، ملقّب بہ جمال حسینی، صاحب کتاب: "رَوْضَةُ الأحباب في سيرةِ النَّبيِّ والآلِ والأصحاب". صاحب "مَجَالِسُ المُؤْمِنِيْن" نے آپ کے جلیل القدر چچا امیر اصیل الدین عبداللہ حسینی دشتکی شیرازی، (جنہوں نے "درجُ الدُّرَر في أحوَالِ سيِّدِ البشَرِ" اور "رِسَالَةُ مِزَارَاتِ هَرَات" جیسی کتب لکھی ہیں) کا ترجمہ لکھنے کے بعد آپ کے حالاتِ زندگی کا تذکرہ کیا ہے۔

موصوف (یعنی صاحبِ "مَجَالِسُ المُؤْمِنِيْن") نے سیرت کی کتابوں سے نقل کیا ہے کہ: ان کی وفات ۱۷ ربیع الاول ۸۰۳ ھ کو ہوئی۔ مزید ان کا یہ اعتراف بھی نقل کیا ہے کہ:

ان کے خاندان کا یہ رفیع المنزلت سلسلہ، تقیہ کی انتہائی رعایت کرتے ہوئے، اہلِ سنت کی کتبِ احادیث کی تدریس میں مشغول چلا آتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے اکابر میں سے کسی نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی اور دیکھا کہ: انہوں نے آپ ﷺ کو کتاب: "مشکاۃ" دکھلائی اور اس کی احادیث کی صحت اور ضعف کے بارے میں پوچھا۔ اس پر آپ ﷺ نے کتاب ان کے ہاتھ سے لے کر ورقہ ورقہ پلٹنا شروع کیا۔ جہاں کہیں موضوع حدیث نظر پڑتی، وہاں انکار کے طور پر انگلی پھیر دیتے، جس سے وہ حدیث مٹ جاتی۔

حضرت رسالت مآب ﷺ کے اس مٹانے کا اثر ان کے حقیقی نسخہ پر بھی ظاہر ہوا، اور اس کا نشان اس زمانے تک بھی موجود رہا ہے، اور وہ بعینہ مرجع زائرین ہے۔ اب بھی لوگ طہارت، حمد و صلاۃ اور اس جیسے مزید آداب کی تکمیل کے بعد اس نسخے کی زیارت کرتے ہیں۔

اس خواب کی وجہ سے، جاری ہونے والے بابرکت سلسلے سے کٹ کر، علیحدہ اور گمراہ ہونے کے بعد، سب سے پہلے جس نے احادیث کا مطالعہ چھوڑ کر، نری حکمت اور نری کلامی ابحاث کا اشتغال شروع کر دیا، وہ امیر صدر الدین محمد حسینی دشتکی شیرازی ہے۔ اور یہی امیر غیاث الدین منصور کا باپ ہے، جیسا کہ ابھی ان کے حالات میں آئے گا، إن شاء الله.

جب کہ اس سلسلے کے باقی حضرات، اپنے اکابر کے ہاں پیش آنے والے اس واقعہ کے حالات و اَخبار کے تذکرہ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں قرب حاصل ہونے کا ذریعہ سمجھتے تھے، اور پیش آمدہ حالات میں انہیں، اسی کے وسیلے سے آسودگی و خوش حالی حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ موصوف نے آپ کے فارسی میں ذکر کردہ حالاتِ زندگی کے ذیل میں اسی کے ہم معنیٰ بات کہی ہے۔

مذکورہ بالا شیخ امیر جمال الدین عطاء اللہ حقیقتاً "عُلَمَاءُ أُمَّتِي كَأَنْبِيَاءِ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ" کا مصداق تھے، اور اُن لوگوں میں شمار ہوتے تھے جن کی شان میں تعظیم و اکرام کے طور پر "اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ" وارد ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کمالِ تنسیق کے ساتھ ساتھ احوالِ اخبار اور احادیث کی تحقیق کی خصوصی توفیق و تائید عطا فرمائی تھی۔ چنانچہ آپ نے اپنی عمر نبی اکرم ﷺ کے اقوال و افعال کے تتبّع میں کھپا دی، حتیٰ کہ عالم بھر میں آپ کے پھیلے ہوئے منتشر اقوالِ زریں، اہلِ علم اصحاب کے لیے تحفہ، آپ کی سیرت و شمائل کی پھلواری اور آپ کی مطبوعات "رَوْضَةُ الأحبَابِ" وغیرہ کی زینت ہیں۔ اور جیسا کہ صاحبِ سیَر نے ذکر کیا ہے، آپ کے اقوال قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔

اور آپ اپنی قابلِ قدر کوششوں سے اپنے محترم چچا امیر سید اصیل الدین ہی کی طرح علمِ حدیث میں یکتا، اور علوم دینیہ کی تمام اقسام......

......اور فنونِ یقینیہ کی جمیع انواع میں ماہر تھے۔ آپ کا تدریس میں اشتغال اور افادہ واستفادہ کا سلسلہ مدرسہ سلطانیہ کے اس قبہ میں بھی تھا جس میں خاقان منصور کا مقبرہ ہے، اور خانقاہ اخلاصیہ میں بھی تھا۔ ہر ہفتے میں ایک روز آپ شہر ہرات کی جامع اعظم جایا کرتے اور نجات کی طرف لے جانے والی ہدایت وارشاد پر وعظ فرماتے تھے۔ لیکن اب سابقہ معمول کے خلاف مخلوقِ خدا سے کنارہ کش ہو کر، گوشہ نشین ہیں، اور اخروی زندگی کی تیاری کے لیے اس کے شایانِ شان تیاری کی کوشش میں مشغول ہیں۔ اسی لیے تو دیکھے گا کہ آج کل کے سلاطین اور باقی سارے حکام اور بڑے عہدوں پر فائز لوگ بڑی عقیدت کے ساتھ ان سے ملنے کی کوشش کرتے اور ان کی بابرکت صحبت مل جانے کو غنیمت خیال کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: موصوف کا یہ کہنا کہ: ''وہ تقیہ کی رعایت کرتے ہوئے ... اہلِ سنت کی کتب کی تدریس کرتے تھے''، جھوٹ اور نرا بہتان ہے۔ اس صاحبِ شرافت خاندان کے افراد کا شعار ہرگز تقیہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی آپ رافضی تھے۔ محقق سیرت نگاروں نے آپ کا اہلِ سنت والجماعت علماء میں تذکرہ کیا ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔

قاضی نور اللہ تستری (ت ۱۰۱۴ھ) غالی قسم کا رافضی تھا۔ اور یہی وہ پہلا رافضی ہے جس نے شیخ جمال محدث کو رافضی شیعہ میں شمار کیا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر آپ کے اَسلاف واَخلاف کو بھی روافض میں شمار کیا ہے۔ اور یہ تستری کی مشہور عادت ہے۔ خاص طور پر اہلِ سنت والجماعت کے علماءِ کبار کے ساتھ وہ یہی رویہ اپناتا ہے۔ اور اس خباثت سے اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان ابتری، بے چینی اور پھوٹ ڈال کر، ان کے معاملات کو بگاڑ کر مغالطات میں مبتلا کر دے۔ تستری کے بعد مزید شیعہ لوگوں نے اس کی نہج کو اپنایا اور اس کے قدم بہ قدم چلے، اور اُس کی کتاب ''مجالس المؤمنین'' سے اِن کے حالاتِ زندگی اپنی کتابوں میں درج کیے، اور انہیں رافضہ میں ذکر کر دیا۔

اہل سنت مؤرخین، جیسے فاضل غیاث الدین بن ہمام الدین ہروی (ت ۹۴۴ھ) وغیرہ۔ نے ان کے حالات میں کوئی ایسی بات ذکر نہیں کی جس سے ان کے شیعہ یا رافضی ہونے کا سراغ لگ سکے۔ شیخ جمال محدّث کے تلامذہ میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے ان کی جانب تشیُّع یا رِفض کی نسبت کی ہو۔ مستزاد یہ کہ متقن محدّثین نے آپ سے حدیث روایت کی ہے، اور آپ سے بہ حیثیتِ شیخ علم حاصل کرنے پر فخر کرتے تھے۔ ان سبھی لوگوں نے آپ کا تذکرہ صرف اچھائی سے کیا ہے، اور آپ کو ائمۂ اہلِ سنت والجماعت میں شمار کیا ہے۔

جہاں تک آپ کی کتاب "رَوْضَةُ الأَحباب في سِيَرِ النَّبيِّ والآلِ والأصحاب" کا تعلُّق ہے، تو اس میں آپ کی وفات کے بعد کئی چیزیں داخل کر دی گئی ہیں۔ آپ نے یہ کتاب اپنے شیخ اور چچا سید اصیل الدین (ت ۸۸۳ھ - ۸۸۴ھ) کی زندگی میں تصنیف کی تھی، اور اس کے بعد آپ تقریباً اڑتالیس سال زندہ رہے۔ اور اس کتاب کو قبولِ عام حاصل ہوا اور متداول رہی۔ اس سب کے باوجود آپ کی کتاب میں کہیں بھی رفض نظر نہیں آتا۔ اگر آپ میں کہیں رفض موجود تھا تو آپ کی زندگی میں ظاہر ہو کر مشہور ہو جاتا۔ بہ ہر حال! یہ اس بات کی انتہائی مضبوط دلیل ہے کہ مخدوم الملک کے ذکر کردہ اَشعار (جیسا کہ ان کا ذکر ابھی آئے گا) ان کی کتاب "رَوْضَةُ الأَحباب" میں شامل کیے گئے ہیں، اور یہ کوئی مقامِ تعجب نہیں ہے، کیونکہ رافضہ اس قسم کی حرکتوں میں معروف ہیں۔ ہندوستان کے متکلمین وفقہاء کے رئیس، علامہ شیخ عبد العزیز دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب: "التُّحفَةُ الاِثنَا عَشَرِيَّة" میں:

"وَمِن مَكَايِدِهِم: أَنَّهم يزيدُون بعضَ الأبيات في شِعْرِ أَحَدِ أَئِمَّةِ أَهلِ السُّنَّة، مِمَّا يوذِنُ بتشَيُّعِه، كما فعَلُوا في "دِيوَان حافِظِ الشِّيرَازِيِّ"، و "دِيوَانِ مَولاَنا الرُّومِيِّ" و "الشَّيخ شَمسِ الدِّين تَبرِيزِيِّ" - قُدِّسَ سِرُّهُ -".

کہ: رافضہ اور شیعہ کے مکر وفریب کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ وہ ائمہ اہل سنت کے اَشعار میں چند ایسے اشعار کی زیادتی کر دیتے ہیں جن سے ان......

......کا شیعہ ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسی حرکت دیوانِ حافظ شیرازی، دیوانِ مولانا رومی اور شیخ شمس الدین تبریزی قدّس سرُّہ کی کتب میں کی ہے''،

کہہ کر ان کی اس شنیع عادت کا تذکرہ کیا ہے۔

چونکہ آپ کی کتاب: "رَوْضَةُ الأَحباب في سيرةِ النَّبيِّ والآلِ والأصحاب" میں بعض خبیث شیعہ لوگوں کی طرف سے ایسے اَشعار کی زیادتی کر دی گئی تھی، اسی لیے مخدوم الملک نے اس کتاب کے سید جمال الدین محدّث کی تصنیفات میں سے ہونے کا انکار کیا ہے، اور اس پر اختلافی نوٹ لکھا ہے۔ مؤرخ بدایونی نے مشہور فقیہ ومحدّث شیخ عبداللہ بن شمس الدین انصاری سلطان پوری (ت ۹۰۰ھ، ۹۰۱ھ) جو مخدوم الملک کے نام سے مشہور ہیں، سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ: وہ فرمایا کرتے تھے:

"رَوْضَةُ الأَحبَابِ" امیر جمال الدین محدث کی تصنیفات میں سے نہیں ہے''۔ اور اس پر یہ دلیل پیش کیا کرتے تھے کہ: انہوں نے اپنی کتاب کی تیسری جلد میں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں یہ شعر نقل کیا ہے:

ہمیں بس بود حق نمائیِ اُو که کردند شک در خدائیِ تو

پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: دیکھو، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کیسا مبالغہ کیا ہے؟ حتی کہ رفض کے عقیدے سے تجاوز کرتے ہوئے حلول کے عقیدے تک جا پہنچے ہیں۔ اللہ تعالی ہم سب کو اس سے بچائے۔ میں نے عرض کیا: یہ تو حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے اس قول سے ماخوذ ہے:

لو أنَّ المُرتضىٰ أبدًا محله لصار الناس طرا سجدا له

كفى في فضل مولانا علي وُقوعُ الشَّكِّ فيه: أنَّه الله

اس پر انہوں نے غضب ناک آنکھوں سے مجھے دیکھا، اور میرے پیش کردہ شعر کی صحتِ نقل پر بحث کرنے لگے۔ میں نے کہا: یہ شعر میر حسین میذی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شعری دیوان کی شرح میں نقل کیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا: میذی بھی تو انہی میں سے ہے۔ تو میں نے عرض کیا: میں نے بعض قابلِ بھروسہ لوگوں سے سنا ہے کہ "رَوْضَةُ الأَحباب" کی تیسری جلد امیر جمال الدین محدث کی اپنی تصنیف نہیں ہے، بلکہ ان کے بیٹے میرک شاہ کے قلم سے ہے۔ تو کہنے لگے: میں نے ایسی بعض ناپسندیدہ باتیں دوسری جلد میں بھی دیکھی ہیں، اسی لیے میں نے ان پر حاشیے لکھ دیے ہیں''۔ ان کا کلام پورا ہوا۔

یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ: مخدوم الملک کو اس بات کا یقین تھا کہ جمال الدین محدث اور ان کے بیٹے میرک شاہ، دونوں ہی اہل سنت میں سے ہیں۔

(سید اصیل الدین شیرازی کے نام کے ساتھ بھی اسی حاشیے کو پڑھا جائے)۔

میر خواند (ت ۹۰۳ھ) نے اپنی: "رَوْضَةُ الصَّفا فِي سِيرَةِ الأَنبِيَاءِ وَ المُلوك والخُلَفاء" (۷: ۷۲، طبع بمبئي ۱۲٦٦هج) نامی فارسی کتاب میں کہا ہے:

''امیر سید اصیل الدین عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن عبداللطیف بن جلال الدین یحییٰ حسینی۔ اپنی اصالت، جلالتِ علمی اور نباہت وذکاوت کی وجہ سے ممتاز شخصیت کے مالک اور ہم عصر لوگوں پر فائق تھے۔ صحفِ الٰہیہ کے حقائق واسرار کی تشریح، اور ان کے دقائق ومعارف کی توضیح......

پڑھی۔ روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے تقریباً اکیاسی (۸۱) اکابر علماء کو پایا ہے، جن میں مولانا محمد (۳۶) بن محمد بن محمد جزری، قاموس

......کیا کرتے تھے۔ آپ کی زبان علم وحکمت کے موتی بکھیرا کرتی تھی۔ آپ علمِ تفسیر وجدل اور انشاء میں عدیم النظیر تھے۔ ملک خاقان سعید کے عہدِ حکومت میں آپ اپنی جائے پیدائش شیراز کو چھوڑ کر ہرات آ گئے، اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ ہفتے میں ایک دفعہ "مدرسہ مہد علی گوہر شاہ آغا" میں وعظ دیا کرتے، اور لوگوں کو رشد وہدایت کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ آپ ماہِ ربیع الاوّل میں رسول اللہ ﷺ کی سنن اور سیرت کا اکثر تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے لوگوں کو بہت زیادہ فائدہ پہنچایا۔ آپ کی وفات ۱۷ ربیع الاوّل ۸۸۳ھ، یا ۸۸۴ھ کو ہوئی۔

آپ کی تالیفات میں سے "دَرْجُ الدُّرَرِ فِي مِيْلَادِ سَيِّدِ الْبَشَرِ" اور "حصنِ حصین" کی شرح ہے"۔

۳۶ : شیخ ابوالخیر طاش کبریٰ زادہ "الشَّقَائِقُ النُّعمانِيَّة" میں رقم طراز ہیں:

"شیخ محمد بن محمد بن محمد بن علی بن یوسف جزری۔ آپ کی کنیت ابوالخیر ہے۔ آپ کی ولادت کی جہاں تک آپ نے خود تحقیق کی ہے، آپ کے والد صاحب کے بقول: ہفتہ کی رات، ۲۵ رمضان المبارک ۷۵۱ھ کو دمشق میں ہوئی۔ آپ نے ۷۶۴ھ میں قرآن مجید حفظ مکمل کیا، اور ۷۶۵ھ میں تراویح میں سنایا۔ محدثین کی ایک جماعت سے حدیث سنی۔ اور بعض شیوخ سے باقاعدہ علمِ قراءت حاصل کیا۔ ۷۶۸ھ میں قراءتِ سبعہ کی تکمیل کی، اور اسی سال حج بھی کیا۔

اس کے بعد آپ دیارِ مصر تشریف لے گئے اور وہاں اصول، معانی اور بیان وغیرہ کی کتب پڑھیں۔ پھر اسکندریہ کا سفر کیا اور ابن عبدالسلام وغیرہ کے تلامذہ سے حدیث سنی اور شیخ الاسلام ابوالفداء اسماعیل بن کثیر نے ۷۷۴ھ میں آپ کو فتویٰ دینے کی اجازت دی۔ اس کے علاوہ شیخ ضیاء الدین نے ۷۷۸ھ میں، اور شیخ الاسلام بلقینی نے بھی ۷۸۵ھ میں آپ کو فتویٰ نویسی کی اجازت عطا فرمائی۔

اس کے بعد آپ نے پڑھانا شروع کیا۔ قراء کی ایک کثیر تعداد نے قراءات کا علم آپ سے حاصل کیا۔ آپ ۷۹۳ھ میں شام کے عہدۂ قضا پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد آپ روم چلے گئے، جس کی وجہ یہ بنی کہ ۷۹۸ھ میں، دیارِ مصر میں آپ اور آپ کے علاوہ دوسرے بہت سے لوگوں کا مال ظلماً چھین لیا گیا۔ بہر حال، پھر آپ بروسا نامی شہر میں آ بسے جو ملکِ کامل مجاہد بایزید بن عثمان کا علاقہ تھا۔ وہیں پر اس اور بعض دوسرے علاقوں کے بہت سے لوگوں نے آپ سے قراءاتِ عشر کی تکمیل کی۔

پھر جب ۸۰۵ھ میں بہت عظیم اور مشہور فتنہ ظہور پذیر ہوا، تو تیمور خان آپ کو لے کر ماوراء النہر کی طرف نکل گیا، اور آپ کو پہلے "کش" نامی شہر میں، اور پھر سمرقند لے گیا۔ ان سب جگہوں پر بہت سے لوگوں نے آپ سے قراءات کے علم کو حاصل کیا۔ پھر جب امیر تیمور کی شعبان ۸۰۷ھ میں وفات ہو گئی تو آپ ماوراء النہر کے علاقے سے نکلے، خراسان پہنچے اور ہرات میں داخل ہوئے۔ پھر "یزد" نامی شہر میں گئے، وہاں سے اصبہان ہوتے ہوئے شیراز پہنچے۔ اور ہر شہر میں طلبہ کی ایک بڑی جماعت میں سے بعض نے آپ سے سبعہ، اور بعض نے عشرہ قراءات حاصل کیں۔ شیراز کے گورنر پیر محمد نے شیراز اور اس کے نواح کا عہدۂ قضا آپ کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ آپ کافی عرصہ نہ چاہتے ہوئے بھی شیراز میں فروکش رہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے کشادگی کی اور آپ وہاں سے بصرہ چلے گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی سکونت کی توفیق بخشی۔ آپ کی مدینہ منورہ میں رہائش کے دوران شیخ حرم نے آپ کے پاس پڑھا اور آپ نے علمِ قراءت میں "النشر في القراء ات العشر" دو جلدوں میں، پھر اس کا اختصار بنام "التَّقريب" علمِ قراءاتِ عشرہ میں، "تحبير التَّيسِير" اور "طبقاتُ القُرَّاء" پھر ان کی تاریخ "کبریٰ" اور "صُغریٰ" لکھی"۔......

موصوف کے مزید حالاتِ زندگی کے لیے دیکھیے: "الشقائق النُّعمانية" (۱: ۳۹ - ۴۰) اور "غاية النّهاية" (۲: ۲۴۸ - ۲۵۱).

والے شیخ مجد الدین (۳۷) فیروز آبادی، اور علامہ سید شریف (۳۸) جرجانی ہیں۔ اور شیخ شیرازی سے مولانا نور الدین (۳۹) جامی قدس سرہ، (جنہوں نے ۸۸۴ھ میں وفات پائی) اور دوسرے علماء نے حدیث سنی ہے۔

...... میں نے آپ کے حالاتِ زندگی آپ کی اسی تاریخ صُغریٰ سے نقل کیے ہیں۔

جب امیر تیمور آپ کو اپنے ساتھ ماوراء النہر لے گیا تھا، تو آپ نے وہیں تین اسفار میں "مصابیح" کی شرح بھی لکھی تھی۔ آپ نے تفسیر، حدیث اور فقہ میں بھی لکھا۔ اور بہت پہلے "غاية المَهَرَة فِي الزِّيادة علىٰ العَشَرَة" کو منظوم کیا۔

اس کے علاوہ "طيبة النشر في القراء ات العشر" اور "الجَوْهَرَةُ فِي النَّحْوِ" اور "المقدِّمة فيما علىٰ قَارِئِ القُرآنِ أن يَعْلَمَه" کے علاوہ مزید کئی فنون کی دوسری کتب کو بھی منظوم کیا۔

امام جزری کے یہ حالاتِ زندگی موصوف نے اپنی کتاب "اَلطَّبَقَاتُ الصُّغریٰ" میں خود ذکر کیے ہیں، جنہیں میں نے (یعنی شیخ طاش کبریٰ زادہ نے) ان کے اپنے قلم سے تحریر کردہ عبارت سے نقل کیا ہے۔

میں نے امام جزری کی کتاب "الطّبقاتُ الصُّغریٰ" میں، ان کے اپنے قلم سے، اپنے ذکر کردہ حالاتِ زندگی کو یہاں نقل کیا ہے۔

آپ کے کسی شاگرد کی تحریر آپ کی وفات کے بارے میں یہ ہے:

علامہ جزری کے علمی سمندر سے چند گھونٹ پینے والا عرض پرداز ہے کہ: ہمارے شیخ رحمہ اللہ نے ۵ ربیع الاوّل ۸۳۳ھ کو، جمعہ کے روز بوقت دوپہر، شیراز میں وفات پائی، اور اسی دار القراء میں مدفون ہوئے جس کی بنیاد آپ ہی نے رکھی تھی۔ آپ کا جنازہ بھی یادگار تھا۔ کیا اشراف، کیا خواص، سبھی آپ کے جنازے کو اٹھانے، آپ کو بوسہ دینے اور تبرکاً چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور جو شخص خود یہ حاصل نہ کر سکا، وہ اس شخص کو تبرکاً چھو رہا تھا جس نے آپ کو چھو لیا تھا۔ آپ کی موت سے اسلام کی ایک بہت بڑی شخصیت کا نشان مٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ سے، آپ کے اسلاف اور اخلاف سے راضی ہو۔

آپ کی تصنیفات میں سے ایک "اَلحِصْنُ الحَصِيْن" ہے، جو نبی اکرم ﷺ سے منقول شدہ ماثور دعاؤں کا مجموعہ ہے۔ انتہائی نفیس کتاب ہے۔ موصوف نے پھر خود ہی اس کا غیر مخل اختصار بھی کیا تھا۔

۳۷ : طاش کبریٰ زادہ نے اپنی کتاب "الشَّقائقُ النُّعمانية" میں کہا ہے:

مولوی فاضل، صاحبِ "اَلقَامُوس" مجدُ الدّین ابو طاہر محمد بن یعقوب بن محمد شیرازی فیروز آبادی۔ کبھی تو آپ اپنا نسب ابو اسحاق شیرازی، صاحبِ "التّنبيه" کی طرف کرتے تھے اور کبھی اپنا نسب نامہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تک بھی پہنچاتے تھے۔ اور اپنے خطِ صدیقی سے لکھا کرتے تھے۔ بلادِ روم میں گئے۔ سلطان کی خدمت میں جا پہنچے، اور اس کے ہاں جاہ و مرتبہ حاصل کر لیا۔ سلطان نے آپ کو بہت سا مال دیا۔ امیر تیمور نے بھی آپ کو پانچ ہزار دینار دیے تھے۔

بعد ازیں، آپ شرق و غرب کے بلاد میں پھرے اور وہاں کے علماء سے علم حاصل کیا، حتیٰ کہ آپ تمام علوم و فنون، خصوصاً حدیث، تفسیر اور لغت میں ماہر ہو گئے۔ آپ کی تصنیفات بہت زیادہ ہیں جو چالیس سے متجاوز ہیں۔ آپ کی تصنیفات میں سے اہم ترین تصنیف یہ ہے: "اَللّامِعُ المُعلِمِ العُجَاب، الجَامِع بَيْنَ المُحْكَمِ وَالعُبَاب"، یہ کتاب ساٹھ جلدوں میں مکمل ہوئی تھی۔ پھر آپ نے اس کی تلخیص دو جلدوں میں......

.....کر کے اس کا نام "اَلقَامُوسُ المُحِيط" رکھا۔ آپ کی تصنیفات میں ایک تفسیر، بخاری شریف کی شرح اور "المَشَارِق" ہے۔

آپ جس شہر میں بھی جاتے، شہر کا والی آپ کا اکرام کرتا۔ آپ بہت جلد حفظ یاد کر لیتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے: ''میں جب بھی سوتا ہوں، دو سوسطریں یاد کرنے کے بعد ہی سوتا ہوں''۔ آپ عجیب وغریب معارف کے کثیر الاطلاع عالم تھے۔ بالجملہ آپ حفظ، اطلاع اور تصنیف میں ایک نشانی تھے۔

آپ کی پیدائش ۷۲۹ھ کو، کازرین میں ہوئی۔ اور آپ کی وفات ۲۰ شوال ۸۱۶ھ، یا ۸۱۷ھ کو، بلادِ یمن میں اس وقت ہوئی جب کہ آپ زبید کے قاضی تھے۔ آخر تک آپ کے تمام قویٰ سلامت تھے۔ آپ کی تدفین شیخ اسماعیل جبرتی کی قبر کے پاس ہوئی۔

آپ آٹھویں صدی کے اخیر میں مرنے والے ان علماء میں سے آخری عالم تھے جن میں کا ہر ایک تمام فنون وعلوم میں اپنے تمام اقران سے فائق تھا۔ ان علماء کی فہرست میں شیخ سراج الدین بلقینی مذہب امام شافعی میں، شیخ زین الدین عراقی حدیث میں، شیخ سراج الدین ابن المُلَقّن فقہ و حدیث پر کثرتِ تصانیف میں، شیخ شمس الدین فناری تمام عقلی ونقلی علوم اور عربیت میں، شیخ ابو عبداللہ بن عرفہ مالکی فقہ میں اور مغرب میں پڑھائے جانے والے باقی تمام علوم میں اور شیخ مجد الدین لغت میں فائق تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔ (۱ : ۳۲ - ۳٤)

مزید دیکھیے: "الضَّوءُ اللَّامِع" للسَّخاوي (۱۰ : ۷۹ - ۸۰)، "بُغيَةُ الوُعَاة" للسُّيوطي (ص ۱۱۷ - ۱۱۸)، "شذرات الذَّهَب" لابنِ العِمَاد (۷ : ۱۲٦ - ۱۳۱)، اور "مُقَدِّمَةُ تَاجِ العُرُوس"۔

۳۸ : قاضی محمد بن علی شوکانی (ت ۱۲۵۰ھ) "البَدرُ الطَّالِع، بِمَحَاسِنِ من بعد القَرنِ السَّابع" (۲ : ٤۸۸ - ٤۹۰) میں رقم طراز ہیں:

سید علی بن محمد بن علی حسینی جرجانی۔ مشرق کے عالم تھے اور سید شریف کے نام سے جانے جاتے تھے۔ موصوف محمد بن زید داعی کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے اور ان کے درمیان تیرہ پشتیں ہیں۔ آپ کی ولادت ۷٤۰ھ کو ہوئی۔ اپنے ہی علاقے میں علم حاصل کرنا شروع کیا۔ "المفتاح" کی قراءت اس کے شارح کے سامنے کی۔ ایسے ہی قطب کی "شَرحُ المِفتَاح" کو، اس کے مؤلف کے بیٹے مخلص الدین بن ابی الخیر علی سے پڑھا۔ پھر مصر آ گئے اور وہاں اکمل الدین وغیرہ سے علم حاصل کیا۔ "سَعِيدُ السُّعَدَاء" نامی جگہ پر چار سال قیام کیا۔

پھر بلادِ روم گئے اور وہاں سے بلادِ عجم چلے گئے، اور تحصیلِ علم کے بعد جمیع علوم عقلیہ وغیرہ میں امام اور یکتا ہو گئے تھے۔ آپ نے جمیع انواع میں تصنیفات یادگار چھوڑیں۔ علوم وفنون کے دقائق اور جلیل القدر مباحث کے متبحر عالم تھے۔

آپ کی شہرت آفاق میں پھیل گئی اور تمام بلاد کے لوگوں نے آپ کی تصنیفات سے نفع اٹھایا۔ ہر فن میں آپ کی کتب مشہور ہیں، اور اکابر علماء بھی ان سے احتجاج کرتے ہیں، اور ان کی عبارات کو نقل کرتے ہوئے، استفادہ کرتے ہیں۔

آپ کی تصنیفات میں سے مشہور "شَرحُ المِفتَاح"، "شَرحُ المَوَاقِفِ العَضُدِيَّة"، علمِ ہیئت میں "شَرحُ الجَغمِينِي"، اور "شَرحُ الفَرَائِضِ الحَنَفِيَّة" ہیں۔ آپ کی ان کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں ہیں۔

آپ درس وتدریس اور افتاء سے بھی منسلک رہے۔ آپ سے بہت سے اکابر نے علم حاصل کیا، اور آپ کی تعظیم وتکریم میں انتہائی مبالغہ کیا ہے۔ خصوصاً علماءِ عجم کا تو یہ حال تھا کہ انہوں نے شیخ جرجانی اور سعد الدین تفتازانی، دونوں کو ان حضرات کے علوم میں حجت قرار دیا ہے۔

ان دونوں حضرات کے درمیان تیمور لنگ کی مجلس میں مباحثات بھی ہوتے رہے ہیں۔ اور اسی وقت سے بعد تک کے زمانوں میں......

.....لوگوں کا اختلاف رہا ہے کہ ان مباحثات میں حق پر کون تھا۔ اور علماء کے درمیان یہ اختلاف تمام زمانوں میں چلا آ رہا ہے۔ خصوصاً علماءِ روم میں تو ان ابحاث کا اس قدر چرچا تھا کہ: جہاں وہ اپنے اکابر علماء کے باقی اوصاف بیان کیا کرتے تھے، وہیں ان کا یہ موقف بھی بیان کیا کرتے تھے کہ: وہ سید شریف جرجانی کو ترجیح دینے کی جانب مائل تھے یا سعد تفتازانی کو ترجیح دینے کے قائل تھے اس لیے کہ انہیں ان کے اختلافات سے خصوصی دلچسپی تھی۔ صاحبِ ترجمہ سید شریف جرجانی کے ہم عصر لوگ آپ سے علم حاصل کرنے کی سعادت کو قابلِ فخر سمجھتے تھے، اور آپ کے بعد آپ کے تلامذہ سے علم حاصل کرنے کو سعادت گردانتے تھے۔

آپ کی تصنیفات بہت نافع ہیں۔ بہت سی ابحاث کو سمیٹے ہوئے، واضح الفاظ کی حامل، بہت کم تکلف والی اور ایسی تعقید سے خالی ہیں جس میں عجمی زبان والے اکثر ملوث ہوتے ہیں اور بہت سے عجمی مصنفین کی تصنیفات میں ایسا ہے۔

آپ کی وفات ۶ ربیع الاوّل ۸۱۶ھ کو، بدھ کے روز، شیراز میں ہوئی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ: ۸۱۴ھ کو آپ کی وفات ہوئی"۔

مزید دیکھیے: "الضَّوءُ اللَّامِع" لِلسَّخَاوِي (۵: ۳۲۸ - ۳۳۰)، اور "بُغيَةُ الوُعَاة" لِلسُّيُوطِي (۱: ۲۹۳).

۳۹: طاش کبریٰ زادہ نے اپنی کتاب "الشَّقَائِقُ النُّعمَانِيَّة" میں کہا ہے:

"شیخ عارف باللہ عبدالرحمٰن بن احمد جامی۔ آپ کی ولادت خراسان کے جام نامی قصبہ میں ہوئی۔ پہلے تحصیلِ علم میں مشغول ہوئے، حتی کہ اَفاضلِ عصر میں شمار ہونے لگا۔ پھر مشائخ صوفیہ کی صحبت اختیار کی۔ کلمۂ توحید کی تلقین عارف باللہ شیخ سعد الدین کاشغری سے حاصل کی، اس کے بعد خواجہ عبیداللہ سمرقندی کی صحبت اختیار کی اور انہی کی طرف مکمل طور پر منسوب ہو گئے۔ آپ نے اپنی کئی کتب میں خواجہ عبیداللہ رحمہ اللہ کے اوصاف، اور ان کے ساتھ اپنی محبت کا ذکر کیا ہے۔

آپ کا علم وفضل شہرہ آفاق تھا۔ حتی کہ سلطان بایزید خان نے آپ کو اپنی قلمرو میں بلوایا۔ آپ کے لیے قیمتی تحائف بھجوائے۔ جس شخص نے ان تحائف کو آپ تک پہنچایا تھا، اس کا بیان ہے کہ:

آپ نے سفر کا سامان تیار کیا اور خراسان سے بلادِ روم کی جانب سفر شروع کر دیا۔ جب آپ ہمذان تک پہنچے، تو تحائف پہنچانے والے سے کہا: میں نے ان کے حکم کو پورا کر دیا، یہاں تک کہ ہمذان تک آ پہنچا ہوں۔ اس کے بعد میں معذرت چاہوں گا اور مجھے امید ہے کہ وہ میرا عذر قبول کر لیں گے کہ میں بلادِ روم میں داخل نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ میں نے سنا ہے وہاں مرضِ طاعون پھیلا ہوا ہے۔

مولیٰ اعظم سیدی محی الدین فناری اپنے والد مولیٰ علی فناری سے حکایت نقل کرتے ہیں کہ:

ان کے والد صاحب، جو کہ سلطان محمد خان کے لشکر کے قاضی تھے، نے کہا کہ: ایک دن سلطان نے مجھ سے کہا کہ: حقیقت کی معرفت کے بارے میں بحث وغور کرنے والے صرف متکلمین، صوفیہ اور حکماء ہیں۔ لہٰذا، ان شعبے والوں کے مابین محاکمہ کروانا چاہیے۔ کہتے ہیں: میرے والد صاحب نے کہا: میں نے سلطان محمد خان سے کہا: ان سب کے درمیان محاکمہ صرف مولیٰ عبدالرحمٰن جامی ہی کر سکتے ہیں۔ کہتے ہیں: اس پر سلطان محمد خان نے ان کی طرف مختلف تحائف بھجوائے، اور ان سے مذکورہ بالا محاکمہ کی التماس کی۔ چنانچہ شیخ عبدالرحمٰن جامی نے ایک رسالہ لکھا جس میں ان طائفوں کے مابین چھ مسائل کے بارے میں محاکمہ کیا۔ ان میں سے ایک مسئلہ وجود کا بھی تھا، اور یہ رسالہ سلطان محمد خان کو بھجوا دیا، اور کہا: اگر یہ رسالہ قبول کر لیا گیا تو باقی مسائل کی ابحاث کو بھی روانہ کر دیا جائے گا، ورنہ وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

اور انہوں نے کہا: میں نے یہ کتاب "مشكاة المصابيح" مولانا شرف الدین (۴۰) جرہی سے روایت کی ہے اور وہ اسے امام

...... چنانچہ یہ رسالہ بھیج دیا گیا، مگر یہ رسالہ سلطان محمد خان کی وفات کے بعد روم پہنچا۔ مولیٰ محیی الدین فناری کہتے ہیں: یہ رسالہ میرے والد صاحب کے پاس محفوظ تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے کہا تھا: وہ اب میرے پاس ہے۔

آپ نے فارسی میں نظم بھی کہی ہے، جسے علماء نے بعض سلف کی نظم پر بھی ترجیح دی ہے۔ فارسی زبان میں آپ کے بعض تحقیقی مضامین بھی ہیں، جو اہلِ اِنشاء کے درمیان غایتِ حسن وقبول کا درجہ حاصل کیے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی مزید منظوم ومنثور تصنیفات بھی ہیں، جن میں سے ایک کافیہ کی شرح بھی ہے۔ آپ نے اس میں کافیہ کی باقی شروح میں موجود فوائد ونکات کو بہت ہی خوبصورت طریقے سے، اپنی جانب سے زیادات کے ساتھ ملخصاً جمع کر دیا ہے۔

آپ نے قرآن مجید کے اوائل پر تفسیری رنگ میں لکھا، جس میں بعض کو تو بطونِ قرآن مجید ہی سے اخذ کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی ایک فارسی کتاب "شواهد النُّبوَّة" ہے۔ علاوہ ازیں "نفحات الأنس" بھی فارسی ہی میں ہے۔ مزید برآں "سلسلة الذَّهب" بھی آپ ہی کے قلم سے ہے۔ آپ نے اس میں رافضیوں کے مختلف فرقوں پر اعتراضات کیے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ آپ کی ان کتب کے علاوہ بھی کئی تصنیفات ہیں جیسے "رسالة المعمَّیٰ والعروض والقافية"۔ آپ کی تمام کتب علماء وفضلاء کے ہاں مقبول ہیں۔

آپ کی وفات ۸۹۸ھ کو ہرات میں ہوئی۔ مؤرخ نے آپ کی تاریخِ وفات کے بارے میں کہا ہے: "وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ آمِناً"۔

کہا گیا ہے کہ: جب اردبیلی سرکش ٹولے نے خراسان کا رخ کیا، تو آپ کے بیٹے نے آپ کی قبر سے میت کو نکال کر کسی دوسری جگہ (دوسرے شہر لے جا کر) دفن کر دیا۔ پھر جب مذکورہ بالا ٹولے کا تسلط قائم ہو گیا تو انہوں نے آپ کی قبر مبارک کو کھود ڈالا، مگر انہیں اس میں سے کچھ بھی نہ ملا۔ چنانچہ انہوں نے اس میں موجود لکڑیوں کو ہی جلا ڈالا۔

مزید دیکھیں: "شذرات الذَّهب" لابن العماد (٧: ٣٦٠) اور "روضات الجنات" للخوانساري (١ : ٤٣٧ - ٤٣٨).

۴۰ : حافظ سخاوی نے اپنی کتاب: "الضوء اللامع" (٤: ١٨١ - ١٨٢) میں کہا ہے:

شیخ عبد الرحیم بن عبد الکریم بن نصر اللہ ... جمال الدین قرشی، بکری، صدیقی، جرہی الاصل، اور شیرازی المولد، مسلکاً شافعی تھے۔ (جرھ: جیم کے کسرہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے)۔

جوہرینی نے کہا ہے:

آپ کی ولادت جمعرات کی رات، ۳ صفر، ۷۴۴ھ کو، شیراز میں ہوئی۔ آپ نے صرف چھ سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا۔ آپ نے روایت ودرایت کو اپنے والد صاحب سے اخذ کیا، اور فقہی تربیت اپنے مددگار بھائی ابو محمد عبد اللہ اور ان کے استاذ فخر احمد بن محمد سمرقندی... اور عبد اللہ بن محمود بن نجیم شیرازی سے حاصل کی۔ قاضی عضد سے کشاف کو سنا۔ اور ان کے ساتھ ساتھ قوام اور معمر امام الدین حمزہ بن محمد تبریزی، سعد الدین محمد بن مسعود بلیانی، فرید الدین عبد الودود بن داود شیرازی، اور مجد اسماعیل الفالی شیرازی سے حدیث سنی۔

اور ان صفِ اوّل کے محدثین میں سے آخری ابو الفتوح طاؤسی سے بھی آپ نے استفادہ کیا۔ بلکہ ان کے ساتھ تو حج کا فریضہ بھی ادا کیا۔ امام الدین علی بن مبارک شاہ صدیقی ساوی سے بہت پہلے ۷۵۰ھ میں صحاح وغیرہ کا سماع کیا تھا۔ پھر آپ نے علمی سفر کیا اور مکہ مکرمہ میں عفیفین سے روایت کیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ: آپ کی ان سے روایتِ حدیث اجازۃً ہے۔ مزید برآں آپ نے مجد فیروز آبادی سے ......

ملّت ودین خواجہ علی (۴۱) بن مبارک شاہ صدیقی سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ اسے مؤلف سے (۴۲) روایت کرتے ہیں۔ اور یہ ایسی سند ہے کہ اعتماد کے لیے اس سے اعلیٰ سند نہیں مل سکتی۔

......اور صاحب شرف ابوروح عیسیٰ عجلونی سے علم حاصل کیا۔ اور شیخ عجلونی سے تو وہ خرقہ بھی پہنا جو انہوں نے شمس محمد خابوری سے سے حاصل کیا تھا۔ سہروردی نے کہا ہے کہ:

آپ کے شیوخ میں سے غازی بن عبداللہ مزی بھی ہیں، جو فخر بن بخاری کے تلامذہ میں سے ایک ہیں۔ اور اصبہان میں جن شیوخ نے آپ کو اجازت دی، ان میں ابوالفتوح محمد بن محمد الالیسی بھی ہیں۔ وہ مسموع اور شیوخ، ہر دو کے اعتبار سے اپنی بستی والوں سے کہیں زیادہ مکثر ہیں۔ حتی کہ انہوں نے صحیح بخاری کو ستر سے زائد شیوخ کے ہاں سنا، ...اور صحیح مسلم کو دس سے زیادہ شیوخ سے سنا۔ آپ نے کتب ستہ، موطأ، مسند شافعی، سنن دارمی اور ان کے علاوہ دیگر کتب کا سماع مکمل کیا۔ میں نے اس کی کچھ تفصیل تاریخ مدینہ میں ذکر کی ہے۔

آپ نے حرمین میں بہت کثرت سے مجاورت وسکونت اختیار فرمائی، حتی کہ آپ نے تیس سے زیادہ مرتبہ حج کیا اور حرمین اور بلادِ فارس میں بہت کثرت سے حدیث بیان کی، حتی کہ اپنی مرض الموت میں بھی حدیث بیان کرتے رہے۔ آپ سے بہت سے ائمہ نے حدیث کا سماع کیا۔ انہیں میں سے ایک عفیف کے بیٹے محمد بھی ہیں، انہوں نے آپ سے بہت کچھ پڑھا اور آپ کا ذکر اپنے "مَشْيَخَة" میں کیا ہے، چنانچہ آپ کی انتہائی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''آپ بہت بڑے عالم، شیخ کبیر اور مسائلِ حج کے ماہر تھے۔ آپ نے تقریباً پچاس حج کیے۔ اکثر حرمین میں سکونت پذیر رہے۔ آپ کئی سال حدیث سنتے اور سناتے رہے۔ خود کہتے ہیں: ''میں نے شیراز، عراق، مصر، شام اور حجاز میں تین سو مشایخ سے سماعاً، قراءتاً اور اجازتاً حدیث حاصل کی ہے''۔ کہتے ہیں: آپ کی شہرت اتنی زیادہ ہے کہ آپ کے بارے میں کوئی تفصیلی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور جنہوں نے آپ سے حدیث سنی ان میں تقی ابن فہد اور ان کے دونوں بیٹے بھی ہیں۔ آپ سے ابوالفرج مراغی نے ۸۲۱ھ میں، روضۂ نبوی کے پاس "المصابیح" پڑھی اور آپ سے حدیث کی یہ کتاب سنی۔

آپ بہت زیادہ عبادت اور تلاوت فرماتے۔ بڑھاپے کے باوجود بھی اہتمام سے روزے رکھتے تھے۔ پانچوں نمازیں پابندی سے جماعت کے ساتھ ادا کرنے کے عادی تھے۔ آپ کی وفات ہفتے کی رات ۲۷ صفر ۸۲۸ھ کو ''لار'' نامی قصبے میں ہوئی''۔

۴۱ : حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب "الدُّرَرُ الكَامِنَة فِي أعيَانِ المِئَةِ الثَّامِنَة" (۲:۸۵، مطبوعہ حیدر آباد، دکن، ھند، ۱۳۷۳ھ) میں علی بن مبارک شاہ ساوی کے حالات نقل کرتے ہوئے کہا ہے:

''علی بن مبارک شاہ بن ابوبکر ساوی شیرازی۔ آپ کا لقب امام الدین تھا۔ آپ کی ولادت ۷۰۹ھ کو ہوئی۔ آپ نے حافظ مزی وغیرہ سے حدیث سنی۔ ابنِ جزری نے "مَشْيَخَةُ الجُنَيْد البَلْيَانِي" میں کہا ہے: ''آپ علوم وفنون کے امام اور علامہ تھے۔ آپ نے علم وعمل کو جمع کیا۔ دمشق، مصر اور قدس وغیرہ میں آپ نے حدیث سنی، اور بہت زیادہ علم حاصل کر کے شیراز کی جانب لوٹے''۔ موصوف نے آپ کی تاریخِ وفات ذکر نہیں کی۔

۴۲ : یعنی ولی الدین، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ خطیب عمری تبریزی، جو آٹھویں صدی ہجری کے رجال میں سے ہیں۔ موصوف باعمل متقن محدثین اور اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں میں سے تھے۔ آپ نے مشہور فقیہ ومحدث، مفسر، متکلم، علامہ شرف الدین حسین بن محمد بن عبداللہ طیبی (جن کا......

.....ذکر ابھی آتا ہے) سے علم حاصل کیا۔ عرصہ تک ان کے پاس رہے، اور علوم وفنون میں کمال حاصل کیا۔ ہمارے سامنے جو کتب تراجم ہیں، ہمیں ان میں آپ کے حالاتِ زندگی نہیں ملے۔ بس اتنا ہی ملتا ہے کہ آپ "مِشْكَاةُ الْمَصَابِيْح" کے شارحین میں سے ایک ہیں، اس کے علاوہ ایک دو جملے مزید حالات پر ہیں۔ آپ کے شیخ امام، عالمِ ربانی، احکام ومعانی کے جاننے والے، مشکاۃ کی سب سے پہلے شرح کرنے والے حسین بن محمد طیبی، آپ کا ذکر کرتے ہوئے، رقم طراز ہیں:

''دلوں کی تمنا، صلحاء کے قطب، زہاد وعباد کے لیے باعثِ شرف ولی الدین محمد بن عبداللہ خطیب''۔

آپ کے بارے میں حافظ ابن حجر ہیثمی مکی شافعی نے اپنی کتاب "فَتْحُ الإِلٰهِ فِي شَرْحِ المِشْكَاةِ" میں یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

''علامہ، محقق، ولی الدین محمد بن عبداللہ تبریزی شافعی''۔

ملا علی قاری نے آپ کے بارے میں کہا ہے:

''مولانا، حبر، علامہ، کثیر العلم، فہامہ، حقائق کے مظہر، باریکیوں کی وضاحت کرنے والے، شیخ تقی، نقی ...''

مزید محدث فقیہ شیخ عبدالحق دہلوی نے اپنی شرح "لمعاتُ التّنقيح في شرح مشكاة المصابيح" میں کہتے ہیں:

''یہ کتاب شیخ باعمل عالم، راہِ تصوف کے راہرو، تارک دنیا، دنیا سے بچنے والے، ماہر، فاضل کامل ولی الدین عبداللہ بن محمد بن عبداللہ خطیب عمری تبریزی کے قلم سے ہے۔ اللہ تعالی ان کی قبر کو منور، اور جنت کو ان کا ٹھکانا بنائے''۔

ہمارے پاس آپ کی تصنیفات میں سے "مشكاةُ المصابيح" اور "الإكمَال فِي أسمَاءِ الرِّجَال" ہی پہنچی ہیں۔ جب علامہ طیبی نے کشاف کا حاشیہ "فُتُوحُ الغَيْبِ فِي الكَشْفِ عَن قِنَاعِ الرَّيْبِ" لکھنا شروع کیا، وُجوہِ قراءات کی تبیین، احادیث و روایات کی تصحیح، اس کی لغات کی تحقیق اور اس کے نکات کی باریکیوں کو بیان کرنا شروع کیا، تو آپ کے دل میں یہ بات جم گئی کہ رسول اکرم ﷺ کے کلام کو جمع کریں، اور پھر اس کی شرح کریں، جیسا کہ کلام اللہ کی شرح بیان کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس ارادے کا تذکرہ اپنے شاگرد خطیب تبریزی کے سامنے کرتے ہوئے ان سے مشورہ کیا۔ اور ان دونوں شیوخ کا اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ امام بغوی رحمہ اللہ کی "مصابيحُ السُّنَّة" کی تہذیب اور استدراک کا کام کیا جائے، اس لیے کہ جمع وترتیب کے اعتبار سے یہ کتاب بہت بہترین ہے، اور انہوں نے احکام کے دلائل کو فقہاء کی پسندیدہ ترتیب کے موافق درج کیا، اور مقتضائے علم کے موافق ترغیب وترہیب کی احادیث کو نقل کیا۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ کسی باب کو اس کی جگہ سے ہٹا دے، تو غور وفکر کے بعد اسے سابقہ جگہ سے زیادہ کوئی دوسری موزوں جگہ نہ مل سکے گی۔ بہرحال، خطیب تبریزی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا، اور اس کی تکمیل کے لیے کمرِ ہمت باندھی۔ اور مقدور بھر وسعت وطاقت اور احتیاط کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ اگر کہیں خلل تھا تو اس کی اصلاح کی، متفرق چیزوں کو اکٹھا کرتے ہوئے ان پر استدراک کیا۔ اور اسے حسن کی انتہا تک پہنچا دیا اور اس کا نام "مشكاةُ المصابيح" رکھا۔ آپ اس کی تالیف اور جمع وترتیب سے ۷۳۷ھ کو، رمضان المبارک کے آخری جمعہ کے دن، شوال کا چاند نظر آنے کے ساتھ فارغ ہوئے، اور عید کے تحفے کے طور پر اپنے شیخ کی خدمت میں پیش کیا، تو انہوں نے اسے بہت پسند کیا، اور علامہ طیبی نے خود اس کی بہت نفیس شرح لکھی۔

بعد ازیں، خطیب تبریزی نے اس کتاب کو پڑھانا شروع کیا، اور افادہ واستفادہ کا سلسلہ جاری ہوا، تو آپ کے شاگرد علی بن مبارک شاہ صدیقی نے اس کتاب کو آپ سے روایت کیا۔ روایتی اعتبار سے اس کتاب کی متصل سند جو مؤلفِ کتاب تک پہنچتی ہے، وہ یہی واحد سند ہے، جو تمام اقطارِ اسلامیہ میں مشہور اور عام ہے۔......

......اس کے بعد خطیب تبریزی نے ایک کتاب "مِشكَاةُ المصابيح" کے رجال کے بارے میں لکھ کر، اس کا نام "الإِكْمَال فِي أَسْمَاءِ الرِّجَال" رکھا۔ یہ کتاب دو بابوں پر مشتمل ہے۔ موصوف اس کی ترتیب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

پہلا باب: مرد صحابہ کرام اور مستورات صحابیات رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ ساتھ، ان تابعین وغیرہ کے ذکر پر مشتمل ہے جن کا اس کتاب میں ذکر آیا ہے یا "مِشكَاةُ المَصَابِيح" میں ان کی روایت موجود ہے۔ اسماء کی ترتیب حروفِ تہجی کے مطابق ہے۔ میں نے کنیت سے مشہور رجال کا ذکر حروف کنیت میں کیا ہے، اور اسماء میں اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ جیسے ابو ہریرہ، کہ آپ کا نام عبداللہ، یا عبدالرحمٰن ہے۔ اسے حرف "ھا" میں ذکر کیا ہے، حرف عین میں نہیں کیا۔

دوسرا باب: ان لوگوں کے تذکروں پر مشتمل ہے جو (نسب کے اعتبار سے) مشکاۃ کے بابِ اوّل میں مذکور شدہ لوگوں کے اصول میں سے ہیں، اگر چہ ہم نے ان کا تذکرہ بابِ اوّل میں نہیں کیا۔

پھر آخر میں کہا ہے:

''میں اس کتاب کی تصنیف، جمع وتہذیب اور کانٹ چھانٹ سے جمعہ کے دن، ۲۰ رجب الفرد، ۷۴۰ھ کو فارغ ہوا ہوں۔ (اس کے بعد مؤلف کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملتی۔ اور گمان ہے کہ آپ کی وفات اس کے بعد ہوئی۔

اسماعیل پاشا نے اپنی کتاب "هدية العارفين" (۲ :۱۵٦، طبع استنبول ۱۹۵۵م) میں بڑے جزم سے یہ بات کہی ہے کہ آپ کی وفات ۷۴۹ھ کو ہوئی ہے۔ لیکن(۱) کی یہ بات صحیح نہیں ہے، کیونکہ موصوف کے حالات زندگی ذکر کرنے والوں نے یہ بات کہیں ذکر نہیں کی)۔ اور میں اللہ کے بندوں میں سے ایک کمزور، اللہ تعالیٰ سے عفو ومغفرت کا خواستگار بندہ محمد بن عبداللہ الخطیب بن محمد ہوں۔ اور اس کتاب کی تالیف میں مجھے اپنے شیخ اور مولانا، مفسرین کے سلطان، محققین کے امام، ملت ودین کی شرافت کے علم بردار، مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت: حسین بن عبداللہ بن محمد طیبی کی معاونت حاصل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی لمبی عمر سے ہمیں نفع پہنچائے۔ تالیف سے فراغت کے بعد میں نے کتاب ان کے سامنے پیش کی، جیسا کہ میں نے مشکاۃ المصابیح کو بھی پیش کیا تھا، تو آپ نے اسے بھی بہت پسند کیا، جیسا کہ آپ نے مشکاۃ شریف کو پسند فرمایا تھا۔ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں۔ اور حضرت محمد ﷺ اور آپ کی آل واصحاب پر اللہ کی طرف سے رحمتِ کاملہ اور سلامتی نازل ہو۔

آپ کی یہ کتاب "الإکمال" مختصر، مگر بہت مفید ہے۔ بعض اسماء کا ذکر آپ سے رہ گیا ہے، جن پر ملا علی قاری نے اپنی شرح میں تنبیہ بھی کی ہے۔ ہندوستان میں "الإکمال" کئی مرتبہ "مشكاة" کے ساتھ ہی چھپ چکی ہے۔

موصوف کی یہ تالیف اس بات کی بڑی واضح دلیل ہے کہ آپ صناعتِ حدیث، وسعتِ علمی اور وفورِ فضل کے ساتھ ساتھ حسن نیت کے ساتھ متصف تھے۔

موصوف کی کتاب "مشكاة المصابيح" کا بخطِ مؤلف نسخہ ۹۵۵ھ تک موجود رہا، پھر تلف ہو گیا۔

مشہور مؤرخ عبداللہ محمد بن عمر الشہیر بالحاج دبیر آصفی الغ خانی مکی نے اپنی کتاب "ظفر الواله بمظفر وآله" (۲ : ۲۸۸ - ۲۸۹، لندن ۱۹۱۰م) میں، جہاں اپنے مربی عبدالعزیز آصف خان (ت ۹٦۱ھ) کا تذکرہ کیا ہے، وہاں رقم طراز ہیں:

''میرے ولی نعمت، میری تربیت کرنے والے اور مسند عالی کی برکت کا سبب شیخ عبدالعزیز آصف خان (کہ جن کے گن گانے ......

ملا علی قاری نے مشہور شیخ عالم کبیر عبداللہ ہندی سے بھی استفادہ کیا ہے، جو کہ مخدوم الملک (۴۳) سلطان پوری کے نام سے مشہور تھے۔ چنانچہ "تَحقِيقُ أَحْوَالِ المَهْدِي" نامی اپنے رسالہ میں کہتے ہیں:

......اور فضل واحسان کے شکرانے، بلکہ اظہارِ فخر کے طور پر میں نے اپنے نام کے ساتھ آصفی کی نسبت شامل کر لی ہے) ۹۵۵ھ میں گجرات پہنچے۔

آپ کے مکہ مکرمہ سے گجرات آنے کا سبب یہ تھا کہ سلطان نے آپ کو بلایا تھا...۔ چنانچہ آپ نے (آصف خان) نے ہندوستان کا سفر کیا۔ سمندر طغیانی پر تھا، جس کی وجہ سے آپ کا جہاز بنگلور کی بندرگار پر جالگا....۔ جب آپ نے سلامتی کے ساتھ اپنا قدم ساحل سمندر پر رکھا تو سجدۂ شکر ادا کیا۔ اگر سمندر کچھ پرسکون ہو جاتا تو وہ مال اسباب بھی بچ جاتا، جو بچ نہ سکا۔ آصف خان کو اپنے اسباب میں سے صرف کتابوں کے ضائع ہونے کا صدمہ تھا۔ اس کے علاوہ لوہے کی ڈھالی ہوئی اس تلوار کا بھی افسوس تھا جو مکہ کے گورنر سلطانِ حجاز ابو یمنی محمد بن برکات کے جملہ ذخائر کا حصہ رہی تھی، اور اس نے شیخ آصف کو ترجیح دیتے ہوئے آپس کی محبت واخلاص کے اظہار کے لیے ان کے حوالے کی تھی۔

مزید برآں اس گھوڑے کے ضائع ہونے کا بھی آپ کو افسوس تھا جو مذکورہ بالا ذخیرہ ہی کا حصہ تھا اور اعلیٰ عربی اور تیز رفتار گھوڑوں کی نسل سے تھا، اور اس کا سوار، عربوں کی عادت کے موافق مقابلے کی دوڑ میں حصہ لے کر گوئے سبقت لے گیا تھا۔ اور کتب کے ضائع ہونے پر جو افسوس تھا، وہ تو ظاہر ہی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر "مشكاة المصابيح" کے جامع ولی الدین خطیب تبریزی (اللہ ان کی جمع وترتیب کی کوششوں کو بار آور کرے) کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے کے ضائع ہونے کا افسوس تھا۔

۴۳: سید عبدالحئی حسنی نے اپنی کتاب "نزهة الخواطر" (٤:٢٠٦) میں کہا ہے:

شیخ، عالم کبیر عبداللہ بن شمس الدین انصاری سلطان پوری، جن کی شہرت مخدوم الملک کے لقب سے تھی۔ آپ اصلاً ٹھٹھہ کے رہنے والے تھے، جو سندھ کا علاقہ ہے۔ آپ کے دادا جان ٹھٹھہ سے جالندھر منتقل ہو گئے تھے۔ عبداللہ کی پیدائش سلطان پور میں ہوئی، جو پنجاب کا علاقہ ہے۔ بچپن ہی سے علم حاصل کرنے میں مشغول ہو گئے تھے۔ آپ نے سرہند کا سفر کیا، اور درسی کتب علامہ عبداللہ سرہندی کے پاس پڑھیں۔ پھر آپ دہلی گئے اور شیخ ابراہیم بن معین حسین ایرجی سے حدیث حاصل کی۔ پھر اپنے علاقے میں واپس آکر تدریس وتصنیف اور وعظ وتذکیر میں مشغول ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قبولیتِ عامہ بخشی، چنانچہ ہمایوں شاہ تیموری نے شیخ الاسلام کا منصب آپ کے سپرد کیا، اور آپ اس کے اور اس کے بعد اس کے بیٹے اکبر شاہ کے عہد کے ابتدائی ایام میں اس عہدے پر فائز رہے۔ تمام ملوک وسلاطین آپ کا انتہائی اکرام کرتے تھے، اور آپ کے اشارے بھی قبول کرتے تھے۔ حتیٰ کہ شیر شاہ نے آپ کو "صَدرُ الإِسلَام" کا لقب دیا تھا، اور اس کا بیٹا سلیم شاہ آپ کو اپنے تخت پر بٹھایا کرتا تھا، اور آپ کے سامنے بہت قیمتی نذریں پیش کی جاتی تھیں۔ اور جب ہمایوں شاہ ایران سے واپس لوٹا اور دوبارہ بادشاہت کی کرسی پر بیٹھا، تو آپ کو "شَيخُ الإِسلَام" کا لقب دیا۔ اکبر شاہ نے آپ کو "مَخدُومُ المَلِك" کا لقب دیا۔ اور آپ کا وظیفہ ایک لاکھ درہم مقرر کیا۔

یہ معاملہ کئی سال تک یونہی چلتا رہا۔ پھر جب شیخ مبارک بن خضر ناگوری نے اکبر شاہ کے دل میں یہ فاسد عقیدہ گھسا دیا کہ وہ مجتہد فی المذہب ہے، اور اسے علماء وقضاۃ کی تقلید اور رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے، تو اس نے آپ کو حرمین شریفین کی طرف نکال دینے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ آپ نے ۹۸۷ھ میں حرمین شریفین کا سفر کیا۔ جب آپ مکہ مبارکہ پہنچے تو مکہ کے اکابر علماء نے آپ کا استقبال کیا، شیخ شہاب الدین احمد ابن حجر مکی نے بڑی تعظیم اور ادب کے ساتھ آپ سے ملاقات کی۔ اس کے بعد آپ ایک مدت تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے، پھر آپ واپس ہندوستان گئے۔......

میں نے علامہ فہامہ شیخ عبداللہ ہندی جو کہ خاص وعام میں مخدوم الملک کے نام مشہور ہیں، سے سنا...''۔(۴۴)

آں موصوف نے طریقہءعلیہ نقشبندیہ، قادریہ اور چشتیہ وغیرہ کو اپنے زمانے کے مشائخ سے حاصل کیا۔ایک عرصہ تک ان کے ساتھ رہے۔ان کی خدمت کا حق ادا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، اسی لیے یہ سارے انوارات اور برکات حاصل کیں۔ملا علی قاری کی ولایت زبان زد خاص وعام تھی۔اور لوگوں میں ان کی فضیلت کی شہرت تھی۔چنانچہ شیخ مستقیم زادہ سلیمان سعد الدین آفندی (ت ۱۲۰۲

......جب آپ گجرات پہنچے تو زہر سے آپ کی وفات ہوگئی۔

بدایونی نے کہا ہے کہ: آپ بہت مضبوط عالم تھے۔فقہ واصول، تاریخ وحدیث اور باقی تمام علومِ نقلیہ میں ماہر اور یکتا تھے۔اہلِ بدعت اور نفسانی لوگوں خصوصاً شیعہ (رافضہ) کے ساتھ آپ کا معاملہ بہت متعصبانہ تھا۔کہتے ہیں: آپ فرمایا کرتے تھے کہ: "رَوْضَۃُ الأَحْبَاب" شیخ امیر جمال الدین محدث کی تصنیف نہیں ہے۔ اور اس کی دلیل میں وہ اشعار پیش کیا کرتے تھے جو اس کتاب کی تیسری جلد میں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں نقل کیے گئے ہیں۔شعر یہ ہیں:

ہمیں بس بود حق نمائی او   کہ کردند شک در خدائی تو

کہتے ہیں: یہ فرمانے کے بعد آپ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا: دیکھو، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کیسا مبالغہ کیا ہے؟ حتی کہ رفض کے عقیدے سے تجاوز کرتے ہوئے حلول کے عقیدے تک جا پہنچے ہیں۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے بچائے۔میں نے عرض کیا: یہ تو حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے اس قول سے ماخوذ ہے:

لو أنَّ المُرتضیٰ أبدًا محله   لصار الناس طرا سُجَّدًا له

كفى في فضل مولانا علي   وُقوعُ الشَّكِّ فيه: أنَّه الله

اس پر انہوں نے غضب ناک آنکھوں سے مجھے دیکھا، اور میرے پیش کردہ شعر کی صحتِ نقل پر بحث کرنے لگے۔میں نے کہا: یہ شعر میر حسین میبذی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شعری دیوان کی شرح میں نقل کیا ہے۔تو آپ نے فرمایا: میبذی بھی تو انہی میں سے ہے۔تو میں نے عرض کیا: میں نے بعض قابلِ بھروسہ لوگوں سے سنا ہے کہ "رَوْضَۃُ الأَحباب" کی تیسری جلد امیر جمال الدین محدث کی اپنی تصنیف نہیں ہے، بلکہ ان کے بیٹے میرک شاہ کے قلم سے ہے۔تو کہنے لگے: میں نے ایسی بعض ناپسندیدہ باتیں دوسری جلد میں بھی دیکھی ہیں، اسی لیے میں نے ان پر حاشیے لکھ دیے ہیں۔ان کا کلام پورا ہوا۔

شیخ عبداللہ کی کئی تصنیفات ہیں۔ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں: "كشفُ الغُمَّة" "منهاجُ العَابِدِين"، "عصمة الأنبياء"، "شرح الحافظية" اور "رسالةٌ فِي تَفضِيْلِ العَقْلِ عَلىٰ العلمِ". ان کے سوا بھی آپ کے کئی ایک رسائل ہیں۔

آپ کی وفات سرزمینِ گجرات میں زہر کے اثر سے ہوئی، جو اکبر شاہ کے حکم سے آپ کو دیا گیا تھا، جیسا کہ خوافی نے "مآثرُ الأمَراء" میں اس کی صراحت کی ہے۔یہ واقعہ ۹۹۰ھ، یا ۹۹۱ھ کا ہے۔

۴۴ : امام مہدی کے احوال کی تحقیق میں لکھے گئے موصوف کے رسالے کا ورقہ ۴۳، دیکھیں، جو کلیہ شرقیہ، پشاور کی لائبریری میں آپ کے مخطوط رسائل کے ضمن میں موجود ہے۔

ہجری) اپنی ترکی کتاب تحفہ خطاطین میں رقم طراز ہیں: ملا علی مذہباً حنفی، اور مشرباً نقشبندی تھے۔(۴۵)

ملا علی قاری نے لکھائی مشہور خطاط شیخ حمد اللہ اماسی (۴۶) سے سیکھی، اور خط ثلث اور خط نسخ میں کامل مہارت حاصل کر لی تھی۔ خط نسخ اور ثلث میں انتہائی خوبصورت لکھائی کیا کرتے تھے۔ اور اپنے ہاتھ کی کمائی، کتابت کی مصروفیت سے گزر بسر کیا کرتے تھے۔ شیخ محمد طاہر بن عبد القادر کردی مکی نے اپنی کتاب: "تاریخُ الخطِّ العَرَبِيِّ و آدَابِهِ" میں کہا ہے: "ملا علی قاری بہت خوبصورت لکھا کرتے تھے، اور غالباً انہوں نے لکھائی شیخ حمد اللہ اماسی سے سیکھی تھی۔ اور ایک سال میں قرآن مجید کا ایک نسخہ لکھا کرتے، اور بیچ دیتے۔ اور اسی کی قیمت سے پورا سال گزارا کرتے"۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب "زادُ المُتَّقِيْن" میں شیخ علی متقی کے حالاتِ زندگی میں کہا ہے: وہ ایک عجمی شخص تھے۔ انتہائی خوشخط تھے۔ لوگ انہیں ملا علی قاری کہتے تھے۔ شیخ علی متقی نے ان کے فضل و کمال کے اعتراف کے طور پر، اور ان کی حاجت کے پیش نظر، ان سے بارہ "جَدِید" (کرنسی کے روپیوں) کے عوض تفسیر جلالین کا ایک ایسا نسخہ خریدا تھا جو انہوں (ملا علی قاری) نے خود لکھا تھا۔ اور شیخ علی متقی ان کے بارے میں کہتے تھے: اس نے تو خوبصورت کتابت میں جان ہی کھپا دی ہے۔ اور اس کتابت والی تفسیر کا حق تو یہ ہے کہ جتنے پیسے میں نے اسے دیے ہیں، اس سے بھی زیادہ میں اسے خریدا جائے۔ اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب اہل مکہ کا لکھا ہوا تفسیر جلالین کا ایک نسخہ بس ایک جدید (روپے) میں مل جاتا تھا۔(۴۷)

وہ عبارت جو سید صدیق حسن قنوجی نے "اِتِّحافُ النُّبلَاءِ المُتَّقِيْن عَن زَادِ المُتَّقِيْن" میں شیخ علی متقی کے حالات زندگی میں نقل کی

---

۴۵ : تحفۂ خطاطین ص ۳۲۴، استنبول، ۱۹۲۸ء۔

۴۶ : آپ شیخ حمد اللہ بن شیخ مصطفیٰ دده اماسی ہیں، جو ابن شیخ کے نام سے معروف تھے۔ آپ کے والد شیخ مصطفیٰ نے بخارا سے اماسیہ کی طرف ہجرت کی، اور اسی کو وطن بنا لیا۔

شیخ حمد اللہ کی پیدائش ۸۴۰ھ کو ہوئی۔ آپ نے علم حاصل کیا، پھر خوش نویسی کی طرف راغب ہوئے، چنانچہ آپ نے استاذ خیر الدین مرعشی سے کتابت سیکھی۔ یہ سلطان سلیم خان اور سلطان سلیمان خان کے عہد کی بات ہے۔ ان دنوں اکثر خطاط لکھائی میں شیخ مرعشی ہی کے قواعد اور طریقے کی اتباع کیا کرتے تھے۔ آپ نے کتابت میں انتہائی مہارت حاصل کر لی تھی، چنانچہ آپ کے خطی آثار اور یادگاریں کافی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ آپ نے چھوٹے بڑے خط میں سینتالیس (۴۷) مصاحف لکھے۔ مزید "مشارق الأنوار" کو لکھا۔ سورۃ الانعام، سورۃ الکہف اور پارۂ عمّ کے تقریباً ایک ہزار نسخے لکھے۔ بہت سارے رقعات و قطعات بھی لکھے۔ جامع سلطان بایزید کی محراب، اس کے قبے، اس کے درمیانی دروازے اور اس کے علاوہ اور کئی جگہوں پر آپ نے کتابت کی ہے..... آپ نے ایک سو دس سال عمر پائی، اور اسکدار میں مدفون ہوئے۔ ترکی زبان میں لکھی گئی بہت ساری کتب میں آپ کے حالاتِ زندگی موجود ہیں، جیسے: "کدوحة الکتاب"، کتاب "هنروران"، کتاب "گلزار صواب"۔ تحفہ سے مختصراً آپ کے حالات نقل کیے گئے"۔

محمد طاہر کردی کی تالیف: "تاريخ الخط العربي" (صفحه ۳۲۱، مصر، سنة ۱۳۵۸هج) کی عبارت مکمل ہوئی۔

۴۷ : ایضاً ص ۲۹۲۔

ہے بکسل جوگئی۔(۴۸)

میں نے خود ۱۳۷۷ھ میں، ملا علی قاری کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قرآن مجید، عالم کبیر شیخ محمد ہاشم مجددی کے پاس مغربی پاکستان، سندھ کے علاقے ٹنڈو سائیں داد میں دیکھا تھا۔

ملا علی قاری اپنی کتابوں کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم پر ہی قناعت کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں زہد وعفت اور بقدر کفایت پر راضی رہنے کی صفت بہت نمایاں تھی۔ لوگوں سے بہت کم ملتے، انتہائی متقی، اور عبادت میں مشغول رہنے والے تھے۔ اور ہر وقت پوشیدہ وسرگوشی کو جاننے والی ذات میں مگن رہتے۔

ملا علی قاری سن رشد ہی سے استفادہء علمی اور طلب علم میں مشغول رہے۔ اکابر علماء کے ساتھ طویل وقت گزارا۔ حتیٰ کہ اصول، حدیث، تفسیر، تصوف، اور معقولات میں انتہائی ماہر ہو گئے، اور اپنے ہم عصر علماء سے فائق شمار ہونے لگے، اور ان کی شہرت امام، علامہء کبیر اور مفکر کی حیثیت سے ہونے لگی۔ اور یہ بھی کہ وہ بہت سے علوم عقلیہ ونقلیہ میں ماہر ہیں، فن حدیث وتفسیر، قراءت واصول، اور علم کلام پر دسترس رکھتے ہیں۔ عربیت، علم لسانیات، اور بلاغت میں سے ہر ایک پر مکمل گرفت ہے۔ اور ان تمام فنون وعلوم کی باریکیوں کو خوب جانتے ہیں، اور ان کے محاسن وغوامض کی پرکھ کے ساتھ ساتھ، عمیق مباحث اور مشکل مقامات کے حل پر قادر ہیں۔ انہی صفات کی وجہ سے ان کا شمار کامل اور راسخین فی العلم علماء میں ہونے لگا۔ آپ میں اتنے کمال جمع تھے کہ آپ کا ذکر ضرب المثل کے طور پر کیا جانے لگا۔ مؤرخین نے آپ کے بہت سے اوصاف کا تذکرہ کیا ہے۔

چنانچہ محمد امین بن فضل اللہ دمشقی محبی (ت ۱۱۱۱ھ) نے "خُلَاصَةُ الْأَثَرِ فِي تَرَاجِمِ أَعْيَانِ الْقَرْنِ الحَادِي عَشَر" میں کہا ہے:

"علی بن سلطان محمد، ہروی، جو قاری کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ مکہ میں آ کر رہنے لگے تھے۔ علم کے ستون، یگانہء عصر، تحقیق علم، اور تنقیح عبارات کے فن میں ایک نشان کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی شہرت اس قدر ہے کہ ان کے اوصاف بیان کرنے سے کفایت کر جاتی ہے"۔(۴۹)

عبد الملک بن حسین عصامی مکی شافعی نے "سِمْطُ النُّجُوْمِ وَالعَوَالِي فِي أَنبَاءِ الأَوَائِلِ وَالتَّوَالِي" میں کہتے ہیں:

---

۴۸ : اس کی فارسی عبارت درج ذیل ہے:

در "زاد المتّقین" بذکر شیخ علي متقی نوشته که مردے بود از اهل عجم، خوش خط، او را ملا علی قاری گویند. بملاحظه فضیلت واهلیت وافلاس او تفسیر جلالین بدوازده جدیده خریدند، وهنوز می گفتند که عجائب مشقت کشیده است، بزیاده می توان گرفت۔ وتفسیر مذکور بخط اهل مکه بیك جدید بهم می رسد. انتهیٰ.

دیکھیے: إتحافُ النُّبلَاء المُتَّقِين بمَآثِر الفُقَهاء المُحدِّثين: ص ۳۲٦، مطبع نظامی، کان پور، سنه ۱۲۸۸ھ۔

۴۹ : خلاصة الأثر ۳ : ۱۸٥، مصر سنة ۱۲۸٤ ھ۔

''شیخ ملا علی قاری .... علوم عقلیہ ونقلیہ کے جامع، سنت نبویہ کے ماہر، حفظ وتفہیم کے ماہر لوگوں میں سے ایک تھے''۔(۵۰)

سید صدیق حسن قنوجی نے اپنی کتاب "اتحاف النُّبلاءِ المُتَّقِین" میں ملا علی قاری کے حالات زندگی ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

''سید محمد بن ابی بکر باعلوی نے اپنی کتاب "عَقْدُ الجَوَاهِرِ وَالدُّرَر" میں ان کے حالات زندگی کے بارے میں کہا ہے:

''وہ علوم عقلیہ ونقلیہ کے جامع تھے۔ سنت نبویہ کے ماہر، اور حفظ وتفہیم کے ماہر لوگوں میں سے ایک تھے''۔(۵۱)

انہی کے بارے میں حافظِ عصر علامہ شیخ محمد عابد سندی مدنی (ت ۱۲۵۷ھ) اپنی کتاب: "المَوَاهِبُ اللَّطِيفَة عَلىٰ مُسْنَدِ الإمَامِ أبِي حَنِيفَة" میں کہتے ہیں:

''شیخ، علامہ، گہرے عالم، انتہائی زیرک، شیخ ملا علی قاری ....''۔(۵۲)

اور ان کے بارے میں شیخ علامہ ابو الحسنات محمد عبد الحئی لکھنوی (ت ۱۳۰۴ھ) اپنی کتاب "اَلتَّعْلِیْقُ المُمَجَّد عَلیٰ مُوَطَّأ مُحَمَّدٍ" کے مقدّمے میں لکھتے ہیں:

''صاحب علم، ظاہر وباہر فضل ولیاقت والے علی قاری ہروی، مکی ....''۔(۵۳)

آں موصوف مزید اپنی کتاب: "السِّعاية فِي كَشْفِ مَا فِيْ شَرْحِ الوِقَايَة" کے مقدّمے میں رقم طراز ہیں:

''وہ جلیل القدر محدث، اور زیرک محقق ہیں ....''۔(۵۴)

شیخ عالم فقیہ حسین بن محمد سعید عبد الغنی مکی حنفی، اپنی کتاب: "إِرْشَادُ السَّارِي إِلىٰ مَنَاسِكِ المُلاَّ عَلِيٍّ القَارِيِّ" میں بہ ایں عبارت رقم طراز ہیں:

''علی بن سلطان محمد قاری: اپنے زمانے کے علامہ، یگانۂ عصر، یکتائے روزگار، انواع واقسام کے علوم عقلیہ ونقلیہ کے جامع، قرآن اور سنت نبویہ کے علوم کے ماہر، بلد اللہ الحرام اور مشاعر عظام سے پُر شہر کے عالم، اور بڑے علماء میں سے ایک، اور اہل تحقیق وافہام مشاہیر میں سے ایک تھے''۔(۵۵)

---

۵۰ : سمط النُّجوم العوالي ٤ : ٣٩٤.

۵۱ : اتحاف النبلاء المتقين ص ٣٢٥.

۵۲ : المواهب اللطيفة على مسند الإمام أبي حنيفة: ورقة ٢. ہم نے اس کا بخط المؤلف مخطوط، سندھ میں چوتھے حاملِ پرچم کے کتب خانے: کتب خانہ پیر جھنڈو، سید محب اللہ شاہ، میں خود دیکھا ہے۔ اور اس کتاب کا ایک ناقص نسخہ اہل علم سے محبت رکھنے والے، کراچی کے شیخ بشیر محمد کے پاس بھی ہے، جو کارخانہ تجارتِ کتب، کراچی کے مالک ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے۔

۵۳ : التعليق الممجَّد علىٰ موطأ محمد: ص ١٩، المطبعة اليوسفي لكهنئو هند، سنة ١٣٤٦هج.

۵۴ : مقدمۂ سعاية في كشف ما في شرح الوقاية: ص ٣٩، المطبعة المصطفائية، لكهنئو، هند، سنة ١٣٠٦هج.

۵۵ : إرشاد الساري إلىٰ مناسك الملاّ عليٍّ القاري: ص ٥.

اور مشہور محقق، ماہر محدّث شیخ محمد ادریس کاندھلوی اپنی کتاب: "التَّعْلِيْقُ الصَّبِيْحُ عَلىٰ مِشْكَاةِ المَصَابِيْح" میں کہتے ہیں کہ:

"محدّث جلیل، زیرک فاضل، یگانۂ عصر، یکتائے روزگار شیخ نور الدّین علی بن سلطان محمد ہروی قاری ..."۔(۵۶)

ملا علی قاری حنفی انتہائی دین دار، متقی، پرہیزگار، فقیہ، علوم کے ماہر، وسیع روایت والے، وسیع معلومات والے اور گہری فہم وفراست والے تھے۔ مکمل آزادیٔ رائے سے کام لیتے، اور وہی کچھ کرتے اور کہتے تھے جو ان کے نزدیک کتاب وسنت اور اجماع کی دلیل سے ثابت ہو جاتا۔ اور اس کے خلاف جو کچھ بھی ہوتا اسے رد کر دیتے، خواہ اس کا قائل کوئی چھوٹا ہوتا یا بڑا ہوتا، امام ہوتا یا مجتہد ہوتا۔ اور اس کی غلطی کو ظاہر کر دیتے۔ اور اس ایک قول کی تائید کرتے جو قرآن وحدیث اور اصول کے موافق ہوتا۔ تحقیقات ومباحثات میں ان کا طریق کار یہی تھا۔ چنانچہ اسی وجہ سے ان کے بعض معاصر مالکی اور شافعی علماء نے ان کے مقابلے کی ٹھان لی۔ اور تعصب مذہبی نے انہیں اس حد تک پہنچا دیا کہ انہوں نے ملا علی قاری کی تصانیف کے مطالعہ اور ان کے کلام کو دیکھنے سے منع کر دیا۔

علامہ محبی نے "خُلَاصَةُ الأَثَر" میں کہا ہے:

"لیکن وہ ائمہ، خصوصاً امام شافعی اور ان کے اصحاب رحمہم اللہ پر علمی تنقید کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا ہوئے۔ انہوں نے نماز میں ہاتھ لٹکانے کے بارے میں امام مالک پر اعتراض کرتے ہوئے، ان کے خلاف ایک رسالہ لکھا۔ اور اس کا جواب شیخ محمد مکین نے دیا، اور ان کے جواب میں ایک رسالہ لکھا جس میں ان کے تمام اقوال کا جواب دیا، اور ان کے تمام اعتراضات کا رد کیا"۔(۵۷)

مؤرّخ عبد الملک عصامی نے کہا ہے:

"وہ ائمہ کرام، خصوصاً امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب پر (علمی) تنقید کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا ہوئے۔ اور انہوں نے امام مالک پر (نماز میں) ہاتھ لٹکانے کے بارے میں اعتراض کیا۔ اسی لیے تم دیکھو گے کہ ان کی تالیفات میں علم کا نور نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے بہت سے علماء اور اولیاء نے ان کی کتابیں پڑھنے سے منع کیا ہے"۔(۵۸)

یہ بات کسی پر مخفی نہیں ہے کہ شریعت اسلامیہ میں علماء کے اختلاف کے کئی درجات ہیں۔ حمد بن محمد خطابی (ت ۳۸۸ھ) نے کہا ہے:

"نبی اکرم ﷺ سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میری امت کا اختلاف رحمت ہے" اور دین میں اختلاف کی تین قسمیں ہیں:

۱ : ان میں سے ایک تو صانع اور اس کی واحدانیت کے اثبات میں ہے۔ اس کا انکار تو کفر ہے۔

۲ : دوسرا اللہ کی صفات کے بارے میں ہے، اور اس کا انکار کفر ہے۔

---

۵۶ : التعليق الصّبيح علىٰ مشكاة المصابيح: مقدمة ص ٦، طبع دمشق.

۵۷ : خلاصة الأثر ٢ : ١٨٦.

۵۸ : سمط النجوم العوالي ٤ : ٣٩٤.

۳ : اور تیسرا فروع کے ایسے احکام کا اختلاف ہے جس میں کئی ایک وجوہ کا احتمال ہوتا ہے۔ بس یہی وہ اختلاف ہے جسے اللہ تعالیٰ نے رحمت اور کرامت کا ذریعہ بنایا ہے''۔(۵۹)

امام نووی کہتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے ایسے اختلاف سے منع فرمایا ہے جو کفر اور بدعت تک پہنچا دے، جیسے کہ یہود و نصاریٰ کا اختلاف ہے۔ اور اس کی مثال خود قرآن میں اختلاف کرنا ہے، یا اس کے معنی میں ایسا اختلاف کرنا ہے جس میں اجتہاد کا کوئی دخل نہیں ہے، یا (شریعت کی) کسی ایسی چیز میں اختلاف کرنا ہے جو شک وشبہ اور فتنے میں مبتلا کر دے۔ اور جہاں تک ایسے اختلاف کا تعلق ہے جو دین کے کسی فرعی مسئلہ میں استنباط کے وقت ہو، اور کسی فائدے، یا حق کے اظہار کے لیے اہل علم کے مناظرہ کے وقت ہو، تو وہ نہ صرف یہ کہ ممنوع نہیں ہے بلکہ یہ تو مامور بہ ہے۔ اور اس کی فضیلت بالکل ظاہر ہے۔ اور اس کے جواز پر عہد صحابہ سے آج تک کے تمام مسلمانوں کا اجماع ہے''۔(۶۰)

اور ملا علی قاری نے بھی بعینہ وہی بات کہی ہے جو امام خطابی اور نووی نے کہی ہے۔ چنانچہ اس حدیث: ''اِتَّبِعُوْا السَّوَادَ الْأَعْظَمَ'' کی شرح میں کہتے ہیں:

''بڑی جماعت کو سوادِ اعظم سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس سے مراد وہ بات ہے جس پر اکثر مسلمان ہوں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: یہ اصول اعتقاد کے بارے میں ہے، جیسا کہ ارکان اسلام ہیں۔

اور باقی رہے فروعی مسائل، جیسے (ذکر کو) چھونے سے وضو ٹوٹ جانا وغیرہ، تو ان میں اجماع کی چنداں حاجت نہیں ہے۔ بلکہ ائمہ اربعہ میں سے کسی بھی ایک مجتہد کی اتباع کر لینا جائز ہے۔

اور وہ اختلاف جو ماتریدیہ اور اشعریہ کے درمیان چند مسائل میں واقع ہوا ہے، تو در حقیقت وہ بھی فروعی نکات ہی میں ہے۔ کیونکہ وہ مسائل ظنیات میں سے ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ: یہ اختلاف اعتقادیات کے ایسے مسائل میں نہیں ہوا جن کی بنیاد یقینیات پر ہے؛ بلکہ بعض محققین خلف نے تو یہاں تک کہا ہے کہ: ان دونوں (اشاعرہ وماتریدیہ) میں تمام اختلافات لفظی ہی ہیں''۔(۶۱)

ملا علی قاری کی اس تصریح، اور امام خطابی اور نووی کی نقل سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ: وہ اختلافی مسائل میں وسیع الصدر تھے۔ اور ان کے نزدیک فروعی اختلاف میں بہت گنجائش ہے۔ بلکہ ایک دوسری جگہ انہوں نے بڑی صراحت سے یہ بات کہی ہے کہ: کسی شخص کا اپنے اقران سے کسی فن میں زیادہ کامل و ماہر ہونا اجتہاد کی علامت ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

''اور صحیح بات یہی ہے کہ ہر وہ شخص جو فقہی فروع کی تخصیص کے بغیر، علوم شرعیہ میں سے کسی بھی فن میں اپنے معاصرین پر فائق ہوا،

---

۵۹ : مرقاۃ المفاتیح ۵ : ۴۹۹، طبع مصر.

۶۰ : أیضًا ۱ : ۱۸۹.

۶۱ : مرقاۃ المفاتیح ۱ : ۲۰۵، طبع مصر.

وہ ائمہ مجتہدین اور علماء راسخین وکاملین ومکملین میں سے ہوا ہے"۔(۶۲)

اوراس میں کوئی شک نہیں ہے کہ علوم شرعیہ میں ان کی جلالتِ شان، اور علوم نقلیہ میں ان کا یدِ طولیٰ حاصل ہونا، اس بات پر صاف دلالت کرتا ہے کہ وہ علماء راسخین میں سے تھے۔ دیارِ یمن کے محدث شیخ الاسلام محمد بن علی شوکانی کے قربان جاؤں، کہ انہوں نے ملا علی قاری کے ائمہ کے ساتھ اختلاف کو ان کے حدیث وفقہ اور علم کلام میں ماہر وکامل ہونے، اور ان علوم وفنون میں مجتہد ہونے کی دلیل شمار کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے (ملا علی قاری کے بارے میں) عصامی کے گذشتہ (تنقیدی) کلام کو نقل کرنے کے بعد یہ کہا ہے:

"میں کہتا ہوں: یہ تو ان کی علوّ منزلت کی دلیل ہے۔ کیونکہ مجتہد کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ صحیح دلیل کے خلاف کی جانے والی بات کو واضح کر کے، اس پر اعتراض کرے۔ برابر ہے کہ اس کا قائل کوئی بڑا ہو یا چھوٹا ہو۔

تِلْكَ شَكَاةٌ ظَاهِرٌ عَنْكَ عَارُهَا

ترجمہ: یہ لوگ جو تیرے شکوے کر رہے ہیں، ان کا عیب وطعنہ ہونا ظاہر ہی ہے۔ (۶۳)

ہندوستان میں اہل حدیث حضرات کے بلا مدافعت امام سید صدیق حسن خان قنوجی نے "اِتحَافُ النُّبَلَاءِ" میں عصامی کا مذکورہ قول نقل کرنے کے بعد کہا ہے:

"ان سطور کا لکھنے والا کہتا ہے: جس نے بھی ملا علی قاری پر اعتراضات کیے، انہوں نے اس کا رد لکھا ہے۔ اور وہ میرے پاس موجود ہے۔ بلکہ میرے پاس ان کی فقہ اور حدیث میں لکھی ہوئی تقریباً چالیس کتابیں ہیں۔ اور ان کی تصانیف میں سے ہر ایک، غایت تحقیق اور اس علم کے ساتھ اچھی مناسبت پر دلالت کرتی ہے۔ اور ان کی تمام کتابیں تلقی بالقبول کا درجہ حاصل کر چکی ہیں، اور اہل علم کے ہاں متداول ہیں۔ لہٰذا یہ بات کہنے کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ: ان کی تالیفات میں علم کا نور نہیں ہے۔ بلکہ اس زمانہ میں کوئی حنفی ملا علی قاری جیسا منصف محقق، کم ہی ہوگا..... انہیں فقہ وحدیث میں تحقیق کا یدِ طولیٰ، اور علم کلام ومعقولات کی باریکیوں پر اچھی گرفت حاصل تھی۔

اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ انہوں نے نماز میں ہاتھ لٹکانے کے معاملے میں امام مالک پر اعتراض کیا ہے، اور ایسے ہی بعض مسائل میں بعض اصحاب شافعی پر تنقید کی ہے، تو اس کی بنا عصبیت مذہبی اور نری خواہش نفسانی نہیں ہے، بلکہ اس کی بنیاد اس مسئلہ کے خلاف دلائل کا واضح ہو جانا ہے۔ اور ایسا اختلاف تو متقدمین ومتاخرین علما میں پہلے بھی، اور اب بھی چلا آ رہا ہے، اور کوئی انہی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ ان کا کلام مکمل ہوا۔ (۶۴)

محرر سطور گوید: ملا علي قاري را جواب الجواب اين رسالها واز تصانيف او قريب چهل رساله بخط خاص وے در

---

۶۲ : أيضًا ۱ : ۱۸۸.

۶۳ : البدر الطّالع ۱ : ۴۴۳ – ۴۴۵، طبع مصر.

۶۴ : اس کی فارسی عبارت درج ذیل ہے:

......

...... فقه وحديث نزد فقير ست .... همه تواليفش مقبول ست، ودر اهل علم متداول. پس نبودن نور علم بران يعنى چه بلكه در فقهائے حنفيه كم كسے مثل او منصف مزاج محقق طبع درين دور بر خاسته .... ودر تحقيق فقه وحديث ودريافت علوم كلام ومعقول يد طولىٰ دارد از هر كتاب اور رتبۂ تحقيق نمايان ست دستگاه او دران علم عيان واعتراض او بر ارسال مالك واصحاب شافعى در بعض مسائل نه از راه عصبيت وهواست، بلكه بر بنا وضوح ادلّه بر خلاف آن. واين قسم اختلاف در جميع اصناف علماء قديماً وحديثاً موجود ست، مخصوص بوے نيست.

اتحاف النبلاء المتقين ص ۳۲۵ - ۳۲٦.

لیکن ابوالحسنات محمد عبدالحیٔ لکھنوی اپنی کتاب "التعليق الممجّد علىٰ موطأ محمّد" میں رقم طراز ہیں:

"آپ کی تمام تصنیفات جامع، مفید اور لطیف فوائد پر مشتمل ہیں۔ اگر ان میں سے بعض میں تعصبِ مذہبی کی بو نہ ہوتی تو بہت ہی اچھی بات ہوتی"۔

ان قیمتی تالیفات اور انوکھی تحقیقات کے باوجود، ان کی بعض تالیفات میں، بعض جگہوں پر زیرِ بحث مسئلہ کی کافی وافی شرح اور سیر حاصل بحث نہیں ہوتی۔ اسی لیے شیخ محدث فقیہ محمد حسن سنبھلی (ت ۱۳۰۵ھ) اپنی کتاب "تنسيق النظام في مسند الإمام" میں آپ ﷺ کی اس حدیث:

"انصَرَفَ النبيُّ ﷺ من صلاة الظُّهر أو العصر، فقال: "مَن قرأ منكم بسَبِّح اسم ربِّكَ الأعلىٰ" فسكت القومُ، حتّى سأل عن ذلك مراراً. فقالَ رجلٌ من القومِ: أنا يا رسولَ الله ﷺ! قال: لقد رأيتُك تنازعُني أو تُخالجُني القرآن"،

کے ذیل میں رقم طراز ہیں:

إن القاري الحنفي، حالُه عجيب جدا، يورد وينقل الروايات الموافقة والمخالفة رطباً ويابسا، صحاحا وضعافاً، ولا ينقح الأحاديث، ولا يميز بينهما، ولا يرفع التدافع والتعارض، ولايحملها علىٰ محامل صحيحة، لا علىٰ مقتضىٰ مذهبه، ولا علىٰ غيره، مع تصلُّبه في مذهب الحنفية.

فأورد ههنا مع الرواية الأولىٰ رواية ابن حبان عن أنس في قراءة الفاتحة خلف الإمام، ومنع غيرها، ورواية أبي داود عن عبادة نحو ذلك، ورواية أحمد وعبد بن حميد وأبي يعلىٰ وابن ماجة في قراءة الفاتحة سراً، ورواية أبي هريرة في قراءة الفاتحة في سكتات الإمام، ورواية الترمذي وأبي داود عن عبادة في وجوب الفاتحة خلف الإمام أيضًا، في الجهرية أيضًا.

ولم يجب بعد هذا الإيراد بشيء، وسكت عنه. ومع الرواية الأخيرة رواية الحاكم عن عبادة في وجوب قراءة الفاتحة خلف الإمام أيضًا، فلعله فهم أن هذه الروايات مؤيدة بما رواه عن هٰذه الكتب، حتىٰ لم يجب عنه بشيء. وهذا عجيب عن مثله ونحن نشمر الذيل للجواب عنه من قبل الحنفية - فيما سيأتي -.

میں کہتا ہوں: بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی مسئلہ پر تفصیلی بحث کے لیے تیار نہیں ہوتا، بلکہ محض سرد وذکر پر اکتفا کر کے بغیر کوئی نقد کیے گزر جاتا ہے۔ اور مسند امام اعظم کی مذکورہ بالا شرح متوسط شرح ہے، جس میں ملا علی قاری نے زیرِ بحث مسائل کی تمام جوانب کا احاطہ کرنے، اور ان کا ناقدانہ جائزہ لینے کا التزام ہی نہیں کیا۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ ملا علی قاری رحمہ اللہ کا تمام تالیفات میں وہ اسلوب نہیں ہے جو شیخ سنبھلی نے بیان کیا ہے۔ ملا علی قاری ہی نے مشکوۃ کی شرح میں اس مسئلہ پر بڑا تفصیلی کلام کیا ہے، اور اس کے ما لها وما عليها پر بڑی مبسوط بحث کی ہے۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جو کچھ محمد مکین اور ان کے علاوہ دوسرے معاصرین نے ان کے بارے میں کہا ہے، ان کی بنیاد محض تعصب ہے۔ اور معاصرت کی وجہ سے جو خلاف ظاہر ہو، اس کی بنیاد یا تو دنیوی منافست ہوتی ہے، یا مذہبی عصبیت ہوتی ہے ۔اور مثل مشہور ہے کہ: صرف معاصرت ہی منافرت کے لیے کافی سبب ہے۔ اسی وجہ سے حافظ ابن حجر عسقلانی نے کہا ہے :

''ہم عصر لوگوں میں بعض کا بعض کے بارے میں جرح کرنا غیر مقبول ہے۔ اور مجھے صحابہ و تابعین کے سوا کوئی زمانہ ایسا معلوم نہیں ہے جس کے لوگ اس سے محفوظ رہے ہوں'' (۶۵)۔ حافظ صاحب کا کلام مکمل ہو گیا۔

اور جہاں تک ارسال کے مسئلے کا تعلق ہے تو یہ بات کسی سے پوشیدہ نہ ہو گی کہ عام اہل علم کے ہاں یہ قول ضعیف ہے۔ اور بہت بعید سی بات ہے کہ وہ امام مالک کے حق میں ایسے مسئلہ کے بارے میں کلام کریں جس سے وہ بری ہیں۔

اور باقی رہی بات ملا علی قاری کے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پر اعتراض کرنے کی، تو اس بارے میں شیخ جمیل بک عظم نے اپنی کتاب: "عُقُودُ الجَوْهَرِ فِي تَرَاجِمِ مَن لَهُم خَمْسُوْنَ تَصنِيْفاً فَمِئَةٌ فَأَكْثَر" میں کہا ہے:

''میں یہ کہتا ہوں: ان کا امام شافعی رحمہ اللہ پر اعتراضات کے درپے ہونا محل نظر ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے ایک رسالہ تالیف کیا تھا، جس میں انہوں نے اس شخص کا رد کیا تھا جو ان کی طرف اس بات کی نسبت کرتا ہے کہ انہوں نے امام شافعی کی تنقیص کی ہے اور ان پر اعتراضات کیے ہیں۔ ہاں! انہوں نے: "تَشْيِيْعُ فُقَهَاءِ الحَنَفِيَّةِ لِتَشْنِيْعِ سُفَهَاءِ الشَّافِعِيَّةِ" نامی ایک رسالہ ضرور تصنیف کیا تھا، جس میں انہوں نے ان بعض مسلکاً شافعی لوگوں کا رد کیا ہے جنہوں نے امام اعظم رحمہ اللہ کے مذہب، بلکہ امامِ اعظم رحمہ اللہ کی ذات کو نکتہ چینی کا نشانہ بناتے ہوئے زبان کھولی ہے''۔ (۶۶)

اور ملا علی قاری نے اس معاملے کی تفصیل، اپنے رسالے "تَشْيِيْعُ فُقَهَاءِ الحَنَفِيَّةِ لِتَشْنِيْعِ سُفَهَاءِ الشَّافِعِيَّةِ" کی ابتدا میں بایں الفاظ ذکر کی ہے:

''جب میں نے بعض شافعی حضرات کے رسائل میں ائمہ حنفیہ رحمہم اللہ کے بارے میں طعن تشنیع، اور انتہائی ناگوار قسم کی ردوقدح کی باتیں دیکھیں تو اس موضوع پر ان کے رد کے لیے میں نے "تَشْيِيْعُ فُقَهَاءِ الحَنَفِيَّةِ لِتَشْنِيْعِ سُفَهَاءِ الشَّافِعِيَّةِ" نامی ایک رسالہ لکھا ۔پھر یہ رسالہ مکہ کے فقہاء و عوام میں پھیل گیا، تو بعض لوگوں پر تو گویا قیامت ہی قائم ہو گئی، اور ان کی جاہلیت کی رگ پھڑکی، اور ہمیں

---

۶۵ : محبی نے "خلاصة الأثر" (۲: ۴۶۴) میں یہ کلام نقل کرنے کے بعد کہا ہے:

میں کہتا ہوں: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے اس قول کہ: ''صحابہ و تابعین کا زمانہ اس سے مستثنیٰ ہے''، میں مجھے تامل ہے۔ اس لیے کہ وہ بھی اس سے محفوظ نہیں تھے۔ جیسا کہ ان حضرات کی سیرت کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص جانتا ہو گا۔ اس لیے ظاہر اور متبادر یہی ہے کہ: حافظ صاحب کا قول عمومی حالات پر محمول ہے۔ اور شاید ان کا یہ کلام اکثری اور غالب احوال پر مبنی ہے، اس لیے کہ بعد میں آنے والے حضرات کی بہ نسبت ان میں یہ بات بہت ہی کم پائی جاتی ہے۔ واللہ اعلم''۔

۶۶ : "عقود الجوهر في تراجم من لهم خمسون تصنيفاً فمئة فأكثر" صفحه ۲۶۴، بيروت، سنة ۱۳۲۶ هج.

ملامت کرنے کے لیے، انہوں نے ہر خاص وعام، جاہل، شیخی باز، اور بازاروں میں چیخنے والے بازاری قسم کے لوگوں کے سامنے زبان طعن دراز کرنی شروع کی، اور کہنے لگے کہ: فلاں آدمی نے امام شافعی رحمہ اللہ کو گالی دی ہے۔ اور ان کے مذہب کے، امام نووی اور رافعی جیسے متبعین کو طعن وتشنیع کی ہے .....، اور ان موضوعات پر گفتگو اور تحقیق کرنے میں میرے سامنے آنے سے عاجز ہو گئے، .... اور (اس فتنہ بازی کی وجہ سے) عوام الناس میں بھی جھگڑے، اور بحث ومناظرے ہونے لگے، حتیٰ کہ قتل وقتال تک کا خطرہ پیدا ہو گیا، تو مجھے اپنے کمزور متقدمین کا قول یاد آ گیا، اور میں نے دعا کی: "رَبَّنَا لَا تُخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا، وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيْرًا.

مذکورہ بالا صورت حال میں، قابل احترام شیخ الحرم، بہت ہی اچھے خصائل کے مالک اور پرکشش عادات کے مالک جناب مولانا بدرالدین حسن (اللہ ان پر بہت فضل واحسان کرے)، نے میرے معاملے کو سنبھالا، اور مولانا ومقتدا، ماہر محقق، نکتہ رس، کئی مفید کتابوں کے مصنف، جادہ نبوی پر مستقیم کئی قابل قدر تصنیفات کے مؤلف، اور راہ مصطفوی ﷺ پر قائم رہنے والے، مولانا قاضی حسین کفوی (۶۷) نے میری نصرت وحمایت کا بیڑا اٹھایا، (اللہ انہیں دنیاوی انعامات کے ساتھ ساتھ اخروی اکرام واعزاز بھی عطا فرمائے)۔ اور انہوں نے ان (معترض) لوگوں کے لیے چمکتی ہوئی کاٹنے والی تیز تلوار سونتی، اور یہی بات میرے اور ان کے درمیان جامع مانع حد بن گئی۔ اور ان دونوں حضرات کو اللہ تعالیٰ کی رضا ونصرت ملے، ان کی طرف سے میری حمایت کا اظہار، اسی وجہ سے تھا کہ ظل سلطانی، سیف برہانی، کی حکومت ان دونوں کی نظر میں بڑی قوت میں تھی۔ اللہ ان کی حکومت کو، اور ظالم وکافر، دین کے دشمنوں کے خلاف ان کے مددگار دوستوں کی نصرت ومدد کو دوام بخشے۔ اور ان دونوں حضرات کا میری مدد کرنا، اہل حرمین شریفین کے حامی، اور ان بابرکت مقامات کے سکونت پذیر لوگوں کے ذمہ دار مولانا کی رعایت کی وجہ سے تھا۔ (اللہ انہیں سید الثقلین ﷺ کی برکت سے، دارین کی آفات سے محفوظ رکھے)۔

۶۷: آپ کے بارے میں مؤرخ محبی (ت ۱۱۱۱ھ) نے "خلاصة الأثر في أعيان القرن الحادي عشر" (۲: ۱۲۱-۱۲۲) میں یہ کہا ہے:

"حسین بن رستم کفوی، رومی حنفی۔ روم کے موالی میں سے ایک تھے۔ علم وفضل اور فنون میں مہارت رکھنے کی وجہ سے مشہور تھے۔ ابن نوعی نے آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ کی بہت تعریف کی ہے۔ پھر کہا ہے: آپ قسطنطنیہ آئے اور شہر کے قاضی داود زادہ کے پاس حاضر باش رہنے لگے۔ ان سے پڑھتے رہے حتیٰ کہ مدرسہ سلیمانیہ میں جا پہنچے۔ پھر شعبان ۱۰۰۷ھ میں وہاں سے قدس کی قضاء کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ پھر آپ شوال ۱۰۰۸ھ میں مکہ مکرمہ کے قاضی بنائے گئے۔ صفر المظفر ۱۰۱۰ھ میں قضاء کی ذمہ داری کو چھوڑا۔

آپ صاحب لطائف وفضائل تھے۔ اپنے زمانے میں اہل معرفت میں سب سے زیادہ نکتہ رس اور ذہین تھے۔ اب تک ان کے لطائف اور اشعار وآثار زبان زد عام ہیں۔

آپ کی جلیل القدر تالیفات میں سے بخاری ومسلم شریف پر آپ کی تعلیقات ہیں۔ اس کے علاوہ ترکی زبان میں آپ نے گلستانِ سعدی کی شرح بھی لکھی، جس میں گلستان کے شارحین سروری اور شمعی سے بھی تعرض کیا ہے۔ آپ کی ایک کتاب 'فالنامہ' بھی ہے جس میں ان لوگوں .....

چنانچہ میں نے اس حمایت کے ظاہر ہونے پر الحمد للہ کہا، اور یہاں جو کچھ بھی ہوا، اس میں ثابت قدم رہنے پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس کے بعد دشمن بھاگنے لگے، اور ذلت وہلاکت میں پڑ کر خائب وخاسر ہوئے۔ جیسا کہ کسی کہنے والے نے کہا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَاحَ البَاغِضُوْنَ وهُمْ ☆ بِكَيْدِهِمْ، فِي اعْتِذَارٍ لَا يُفِيْدُهُمْ

ترجمہ: الحمد للہ، بغض ودشمنی رکھنے والے اپنی ہی چال میں پھنس کر ایسے عذر کر رہے ہیں، جو انہیں ہرگز فائدہ نہ دیں گے"۔

اور محبی نے "خُلَاصَةُ الأثَر" میں کہا ہے:

.....کو پیش آنے والے بہت ہی عجیب وغریب واقعات ذکر کیے ہیں جو قرآن مجید اور دیوانِ حافظ وغیرہ سے فال نکالا کرتے تھے۔ یہ چھوٹی سی پر لطف کتاب ہے، میں نے اسے دیکھا اور اس کا مطالعہ کیا ہے۔ اور اس سے بعض چیزیں نقل بھی کی ہیں۔

منجملہ ان واقعات کے ایک وہ واقعہ بھی ہے جسے انہوں نے قطب العارفین یعقوب چرخی سے حکایت کیا ہے کہ: انہوں نے اپنی بعض تصنیفات میں ذکر کیا ہے کہ عنایتِ الٰہی انہیں کھینچ کر خواجہ بہاء الدین نقشبند کے ہاں لے گئی۔ کہتے ہیں: میں نے دیکھا کہ: اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کے ساتھ انتہائی کرم اور غایتِ التفات کا معاملہ ہے۔ اور مجھ پر ظاہر ہوا کہ آپ خواص اولیا میں سے، اور کامل ومکمل شیخ ہیں۔ چنانچہ میں نے آپ کے بارے میں قرآن مجید سے فال نکالی، تو یہ آیت نکلی: أُولَئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ".

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ: جب مولی سنان، محشّی بیضاوی اور محشّی ہدایہ کا انتقال ہو گیا، تو بعض اہلِ دل حضرات نے قرآن مجید اٹھایا اور مولیٰ سنان کے حسب حال فال نکالی تو اللہ تعالیٰ کا یہ قول سامنے آیا: "وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا، وَإِنَّهُ فِي الآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِيْنَ".

اور خود اپنی بات نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں: میں نے اور میری والدہ نے ۹۸۵ھ میں، اپنے شہر "کفّہ" سے رحلت کا ارادہ کیا۔ لیکن اس امر میں تردد تھا کہ بحری راستہ اختیار کروں یا خشکی کا راستہ؟ میرے ذہن میں ایک طرف تو غرق ہونے کے خوفناک وساوس گردش کرنے لگے اور دوسری جانب انتہائی تھکاوٹ کا ڈر لگنے لگا۔ میں قرآن مجید سے فال نکالی، تو اللہ تعالیٰ کا یہ قول سامنے آیا: "لَا تَخَافَا إِنَّنِي مَعَكُمَا، أَسْمَعُ وَ أَرَى". اس کے بعد ایک دوسری فال نکالی، تو یہ آیت نکلی: "أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الأَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ". میں نے اسے نیک فال سمجھا اور ہم سمندری جہاز میں سوار ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے صحیح سلامت منزل پر پہنچ گئے۔

یہ حکایت بھی بیان کی ہے کہ: مولی معروف جو چند صاحبِ خیر عظیم المرتبت موالی میں سے ایک تھے، کہتے ہیں: میں نے ایک رات بہت ہی عظیم المرتبت قسم کا خواب دیکھا، جس کی وجہ سے میں بہت ہی خوش ہوا۔ جب نیند سے جاگا تو اس سوچ میں پڑ گیا کہ یہ خواب رحمٰن کی طرف سے تھا یا شیطان کی طرف سے تھا۔

چنانچہ میں نے علامہ سیوطی کی "الجامع الصّغير" سے فال نکالی، تو رسول اللہ ﷺ کا یہ قول سامنے آیا: "رُؤْيَا المُؤمِنِ الصَّالِحِ بُشْرَى مِنَ اللّٰهِ، وهِيَ جُزْءٌ مِن خَمْسِيْنَ جُزْءاً مِنَ النُّبُوَّةِ". قصہ مکمل ہوا۔

آپ کے اور نکساری زادہ کے درمیان ایک مرتبہ گفتگو بھی ہوئی تھی، جس کے بارے میں آپ نے بعد میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ اس میں انہیں مطعون بھی کیا تھا۔ آپ علمِ موسیقی میں نہایت ماہر تھے۔ آپ نے بعض اغانی مرتب کیے تھے جو مقبول ومتداول ہیں۔

آپ کی وفات ۱۰۱۰ھ میں ہوئی۔

''اس سے بھی عجیب تر وہ بات ہے جسے سید محمد بن عبد الرسول برزنجی حسینی نے اپنی: "سِدَادِ الدِّيْنِ فِي إِثْبَاتِ النَّجَاةِ لِلوَالِدَيْنِ" نامی کتاب میں نقل کیا ہے کہ:

''ملا علی قاری نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف منسوب "الفِقْهُ الأَكْبَر" کی شرح کی ہے۔ اور اس میں والدین مکرمین کے حق میں حدِّ ادب سے ہٹ کر، بے ادبی میں بہت زیادہ آگے بڑھ گئے ہیں۔ اور پھر انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس موضوع پر ایک رسالہ بھی تصنیف کیا ہے(٦٨)، اور قاضی عیاض کی "الشِّفَا، بتعْرِيْفِ حُقُوْقِ المُصْطَفى" کی شرح میں بڑے فخر و ناز سے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

''میں نے ان دونوں کے کفر پر مرنے کے بارے میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے''۔

اے کاش! جب اس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق کی کوئی رعایت ہی نہیں کی تھی، اور مذکورہ رسالہ لکھ کر آپ ﷺ کو تکلیف پہنچائی ہی تھی تو کم از کم اس کا ذکر "اَلشِّفَا" جیسی کتاب کی شرح میں تو نہ کرتا، کہ جس کا موضوع ہی نبی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف اور افتخار کا بیان کرنا ہے''۔ اھ.

ملا علی قاری نے اس قول کو اس صحیح روایت کی وجہ سے اختیار کیا ہے جو حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ انہوں نے کہا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی، تو رو پڑے، اور اپنے ساتھیوں کو بھی رلا دیا۔ پھر ارشاد فرمایا: میں نے اپنے رب سے اس کی اجازت چاہی تھی کہ اپنی والدہ کے لیے استغفر کروں، لیکن مجھے اجازت نہیں ملی۔ پھر میں نے اپنے رب سے اس بات کی اجازت چاہی کہ ان کی قبر کی زیارت کرلوں، تو اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ تم بھی قبروں کی زیارت کیا کرو، کیونکہ یہ موت کی یاد دلاتی ہیں''۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کی شرح میں کہا ہے کہ:

ابن جوزی نے "كِتَابُ الوَفَاء" میں ذکر کیا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ اپنے والد صاحب کی وفات کے بعد، اپنی والدہ آمنہ کے

٦٨: حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ ان مسائل میں سے ایک ہے جن میں کوئی فائدہ نہیں، اور ان میں سکوت اختیار کرنا ہی مناسب ہے۔ اسی لیے شاہ عبد العزیز دہلوی نے اپنے رسالہ ''عجالۂ نافعہ'' میں کہا ہے:

پھر یہ بھی ہے کہ انتہائی نادر قسم کے مسائل، جیسے نبی اکرم ﷺ کے ابوین کریمین کے اسلام کا مسئلہ، پاؤں پر مسح کرنے کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی شدہ روایات، اور ان جیسے دوسرے مسائل کی ابحاث انتہائی نادر الوقوع ہیں۔ اور ان میں سے اکثر کی تخریج ان کتب (یعنی طبقۂ رابعہ کی کتب) میں کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ شیخ جلال الدین سیوطی کی اکثر جمع پونجی، اور رسائل و نوادر کی تصنیف میں ان کا اکثر راس المال، یہی مذکورہ بالا کتب ہیں۔ لہٰذا، ان کتب کی احادیث سے اشتغال، اور ان احادیث سے احکام کے استنباط کا کام ایسا عمل ہے جس کا کوئی بھی فائدہ نہیں۔ اس سب کے باوجود بھی اگر کسی کو ان احادیث کی تحقیق کرنا پسند ہو تو اسے چاہیے کہ حافظ ذہبی کی ضعیف رُوات کے احوال بیان کرنے والی کتاب "مِيزَانُ الِاعتِدَال" اور حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتاب "لسان الميزان" کو حرزِ جان بنائے۔

مزید دیکھئے: "الحطه في ذكر الصحاح الستة" (ص ٥٨)، المطبع النظامي، كان پور، ١٢٨٣ هجرى.

ساتھ رہتے تھے۔ جب آپ ﷺ کی عمر مبارک چھ سال ہوئی، تو آپ کی والدہ آپ کو، آپ کے ماموؤں کے ہاں بنو عدی بن نجار کے پاس مدینہ میں ملانے لے گئیں۔ اور انہیں میں سے ابو ایوب بھی تھے۔ پھر آپ ﷺ کو لے کر مکہ کی طرف واپس روانہ ہوئیں۔ جب ''ابواء'' مقام پر پہنچیں، تو وہیں وفات ہوگئی، اور ان کی قبر بھی وہیں ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ: جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ کو فتح کیا، تو ابواء میں ان کی قبر کی زیارت کی۔ جب قبر کے پاس کھڑے ہوئے تو آنکھیں اشک بار تھیں۔ پھر ارشاد فرمایا: ''میں نے اپنے رب سے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کی اجازت چاہی، تو مجھے اجازت مل گئی۔ اور استغفار کی اجازت چاہی تو مجھے اجازت نہیں دی گئی۔ اور یہ آیت نازل ہوئی: "مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنْ يَسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْا أُوْلِيْ قُرْبٰى". الآية.

اس سے بھی عجیب تر بات حافظ ابن حجر نے کہی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

شاید ان کے لیے استغفار کی اجازت نہ دیے جانے کی حکمت آپ ﷺ پر اتمام نعمت ہو۔ بایں طور کہ بعد میں ان کو آپ ﷺ کے لیے زندہ کر دیا گیا، تا کہ ان کا شمار بڑے مؤمنین میں ہو۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ: ان کے زندہ کیے جانے کے بعد ایمان لانے کے وقت تک استغفار سے منع کیا گیا ہو۔ اور یہ اس لیے تا کہ تب وہ کامل استغفار کی حق دار ہو جائیں۔

اس میں یہ نکتہ ہے کہ: ایمان سے پہلے مطلقاً کسی کے لیے بھی استغفار کرنا جائز نہیں ہے۔ پھر جمہور کا کہنا یہی ہے کہ: آپ ﷺ کے والدین کی وفات کفر کی حالت میں ہی ہوئی ہے۔ اور ان دونوں کے بارے میں جو روایات وارد ہوئی ہیں، ان میں زیادہ صحیح روایت یہی ہے۔

اور باقی رہا ابن حجر کا گذشتہ قول کہ: ''ان کو زندہ کر دیا گیا تھا تا کہ وہ ایمان لے آئیں، اور پھر دوبارہ ان کی وفات ہوئی''، تو یہ بھی صحیح ہے۔ اور اس کی تصحیح کرنے والوں میں امام قرطبی اور حافظ ابن ناصر الدین آتے ہیں۔

اور اگر اس کی صحت تسلیم کر لی جائے تو بھی وہ مسلم کی روایت کے معارض نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ حفاظ نے ایک تو اس (کی سند) پر طعن کیا ہے، اور اس بات کو بھی اجماعی طور پر جائز نہیں سمجھا کہ ایمانِ یأس مقبول ہو۔ (ایمانِ یأس کا لفظی معنی ہے: خوف کا ایمان۔ اور یہاں یہ مراد ہے کہ جس نے آخرت کے احوال کا مشاہدہ کر لیا ہو، اس کا ایمان مقبول نہیں ہے)، جیسا کہ اس پر کتاب وسنت دلالت کرتے ہیں۔ اور یہ بھی ہے کہ مکلف شخص کا جو ایمان مطلوب ہے، وہ تو مغیبات پر ایمان ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ". کہ: اگر انہیں واپس دنیا میں بھیج دیا گیا، تو وہ دوبارہ وہی کچھ کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے۔

یہ صحیح اور صریح حدیث اس موقف کو بھی کلیتاً رد کرتی ہے جسے بعض لوگوں نے باوجود مختلف فیہ ہونے کے اختیار کیا ہے کہ: ''وہ دونوں اہل فترت میں سے تھے، اور انہیں کوئی عذاب نہ ہوگا''۔ اور امام سیوطی رحمہ اللہ نے آپ ﷺ کے والدین کی نجات کے بارے میں تین رسالے لکھے ہیں، اور جانبین کے دلائل بھی ذکر کیے ہیں۔ اگر تفصیل چاہتے ہو تو ان رسائل کو دیکھو۔ (۶۹)

---

۶۹ : مرقاة المفاتيح ٢ : ٤٠٦.

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ملا علی قاری اس بارے میں ابتداءً اتنے متشدد نہ تھے۔ لیکن بعد میں حد سے زیادہ شدت میں آ گئے، چنانچہ "شَرْحُ الفِقْهِ الأَكْبَر" میں کہتے ہیں:

''رسول اکرم ﷺ کے والدین کی وفات کفر پر ہوئی۔ اور اس میں ان لوگوں کا رد ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ: ان دونوں کی وفات ایمان پر ہوئی ہے۔ یا یہ کہا ہے کہ: ان کی وفات تو کفر پر ہوئی تھی، لیکن ان دونوں کو اللہ تعالی نے زندہ فرمایا، اور پھر ایمان وایقان کے ساتھ ہی ان کی وفات ہوئی۔ میں نے اس مسئلہ پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اپنے تین رسالوں میں اس مقالے کی وکالت میں جو کچھ ذکر کیا ہے، کتاب وسنت، قیاس اور اجماع امت کے جامع دلائل سے ان کا رد کیا ہے۔

اور عجیب وغریب بات تو اس قضیہ میں یہ ہے کہ: بعض لاعلم حنفیہ نے بھی اس مسئلہ کی تفصیلی ابحاث کے باوجود اس قضیہ (یعنی والدینِ مکرمین کی کفر پر وفات) کا انکار کیا ہے۔ بلکہ اس طرف اشارہ کیا ہے کہ: ایسی بات کہنا امام اعظم رحمہ اللہ کی شان کے لائق نہیں ہے۔ اور یہ بعینہ ویسی ہی بات ہے جو گمراہ جہم بن صفوان نے کہی ہے کہ: میں چاہتا ہوں کہ قرآن مجید سے اس آیت: "ثُمَّ اسْتَوىٰ عَلَى العَرْشِ" کو مٹا دوں۔ اور ایک دوسرے گمراہ احمد بن داود قاضی کی بات جیسی بات ہے کہ جس نے خلیفہ مامون کو یہ کہا تھا کہ: خانہ کعبہ کے پردوں پر یہ لکھوا دو: "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ". اور اس بڑے رافضی کی کہی ہوئی بات جیسی بات ہے جس نے کہا تھا کہ: وہ قرآن مجید کے ایسے نسخے سے بَری ہے جس میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تعریف بیان ہوئی ہو۔ (۷۰)

ملا علی قاری نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ میں یہ کہا ہے:

میرے بعض مخلص اور قریبی ساتھیوں نے مجھ سے یہ کہا کہ: میں معتبر ترین امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بیان کردہ مسئلے کی وضاحت میں ایک رسالہ لکھوں جسے انہوں نے اپنی کتاب "الفقهُ الأكبر" کے آخر میں ذکر کیا ہے اور اسی پر اکثر لوگوں کے عقائد کا مدار ہے۔ اور اس مسئلہ میں امام اعظم رحمہ اللہ کی مخالفت علامہ جلال الدین سیوطی اور امام شافعی کے متبعین کی ایک بڑی جماعت نے کی ہے۔ اور بعض حنفی علماء وفضلاء نے بھی انہی کی تقلید میں اس بات کو اختیار کر لیا ہے۔

میں ان ساتھیوں کی بات پر متردد رہا کہ ان کی بات مانوں یا انکار کر دوں، چنانچہ میں کسی اور فتنے کے اٹھ کھڑے ہونے اور کسی بڑی مصیبت میں پڑ جانے کے خوف سے ایک قدم بڑھاتا، اور دوسرا پیچھے کر لیتا تھا۔ لیکن پھر میں نے اپنے رب پر توکل کرتے ہوئے: "حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلَ" کہہ کر کام شروع کر دیا۔ چنانچہ میں نے تمام بندوں کے رب کی ذات پر اعتماد کرتے ہوئے، آپ ﷺ کے آباء واجداد کے اعتقاد کے بارے میں یہ کتاب لکھنی شروع کی ہے۔ رحیم وکریم اللہ سے ہی سیدھے راستے، اور ٹھیک راہ پر ثابت قدم رہنے کی توفیق چاہتا ہوں۔ وہی ہے جو کریم ہے، سخی ہے، بندوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرتا ہے، اور لوگوں پر رحم کرتا ہے۔

ملا علی قاری نے اس بحث میں خطا یہاں کی کہ: انہوں نے اپنی شرح کی بنیاد "الفقه الأكبر" کے ایک محرّف نسخہ پر رکھی۔ چنانچہ محدث ناقد شیخ محمد زاہد الکوثری (ت ۱۳۷۱ھ) نے کتاب: "العالِم والمتعلّم" کے مقدمے میں یہ بات ذکر کی ہے کہ:

۷۰: شرح فقه أكبر: ص ۱۳۰، المطبع المجتبائية دهلي، ۱۳۱٤ هج.

"الفقه الأكبر" کا وہ نسخہ جس کی روایت: حماد بن ابی حنیفہ نے، اپنے والد صاحب (یعنی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ) سے کی ہے، اس کی بہت سی شروح ہیں۔ اور کئی ملکوں میں خود یہ کتاب کئی مرتبہ چھپ چکی ہے، جیسا کہ اس کی کئی ایک شروح بھی چھپ چکی ہیں۔ اور اس کتاب کی سند کا ذکر اس خطی نسخے میں ہے جو مدینہ منورہ (اللہ تعالیٰ اس کی قدر و منزلت میں اور زیادتی کرے) میں شیخ الاسلام عارف حکمت کے کتب خانے میں (۲۲۶) نمبر پر موجود مجموعۂ کتب کے ضمن میں ہے۔ اس نسخے کے شروع میں سند کا بیان یوں ہے:

سندُ الشَّيخ إبراهيم الكورانيّ في الكتاب إلىٰ عليٍّ بنِ أحمدَ الفارسيِّ عن نصير بن يحيىٰ عن ابن مقاتِلٍ (محمَّد بنِ مقاتِلٍ الرَّازيِّ) عن عصام بن يُوسُفَ عن حمَّاد بنِ أبي حنيفةَ - رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الجَمِيْعِ.

یعنی: اس کتاب میں ابراہیم کورانی کی سند یوں ہے کہ: انہوں نے علی بن احمد فارسی سے، انہوں نے نصیر بن یحییٰ سے، انہوں نے محمد بن مقاتل رازی سے، انہوں نے عصام بن یوسف سے، اور انہوں نے حماد بن ابی حنیفہ سے روایت کی ہے۔ (اللہ ان سب سے راضی ہو)۔

شیخ الاسلام کے اس کتب خانے میں حماد کی روایت کے دو قدیم اور صحیح نسخے موجود ہیں۔ اے کاش! کہ کوئی علم کا جویا "الفقه الأكبر" کے ان دو نسخوں کو سامنے رکھ کر، اور "دارُ الكتُبِ المِصْرِيَّة" والے نسخے سے مقابلہ کر کے نئے سرے سے طبع کرے۔

اس کتاب کے بعض نسخوں میں عبارت یوں ہے:

"وَأَبَوَا النَّبِيِّ ﷺ مَاتَا عَلىٰ الفِطْرَةِ. وَ"الْفِطْرَةُ" سَهلَةُ التَّحرِيفِ إلىٰ الْكُفْرِ" في الخَطِّ الكُوفِيِّ. یعنی:

نبی اکرم ﷺ کے والدین کی وفات فطرت پر ہوئی۔ اور فطرت ایسا لفظ ہے کہ خط کوفی میں اس کی تحریف ہو کر کفر بن جانا بالکل قرین قیاس ہے۔

اور اکثر نسخوں میں عبارت یوں ہے: "مَاتَا عَلىٰ الْكُفْرِ". کہ: ان دونوں کی وفات کفر پر ہوئی۔

امام اعظم رحمہ اللہ اس مقام پر ان لوگوں کا رد فرما رہے ہیں جو اس حدیث: "أَبِيْ وَأَبُوْكَ فِي النَّارِ" کو روایت کر کے، یہ نظریہ قائم کیے ہوئے ہیں کہ: ''وہ اہلِ جہنم میں سے ہیں''۔ کیونکہ کسی شخص کے لیے جہنم کا حکم کسی یقینی دلیل ہی کی وجہ سے تو ہوتا ہے۔ اور میرا موضوع اس عنوان پر کام کرنا نہیں ہے، کہ اس میں دلیل ظنی چل سکے''۔

شارحِ "إحياء العلوم" اور صاحبِ "القاموس": حافظ محمد مرتضیٰ زبیدی، اپنے: "الانتِصَار، لِوَالِدَي النَّبِيِّ الْمُخْتَار" نامی رسالے میں، (میں نے ان کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ رسالہ معمر عالم مفتی عسکر شیخ احمد بن مصطفیٰ عمری حلبی کے ہاں دیکھا تھا) کہتے ہیں جس کا معنی یہ ہے کہ: جب ناسخ نے کتاب کی عبارت "مَا مَاتَا" میں لفظ: "مَا" کا تکرار دیکھا تو خیال کیا کہ ان میں سے ایک "مَا" زائدہ ہے، چنانچہ اس نے ایک "مَا" کو حذف کر دیا، اور اس طرح یہ غلط نسخہ فروغ پا گیا۔ اور اس کی دلیل اس خبر کا سیاق و سباق ہے۔ اس لیے کہ ابو طالب اور والدین مکرّمین، سبھی کی ایک سی حالت ہوتی، تو تینوں کو ایک حکم میں ایک ہی جملے میں جمع کر دیتے، نہ یہ کہ دو جملے بنائے جاتے۔ خصوصاً جب کہ مقصود بھی سب کا ایک ہی حکم بیان کرنا ہو۔

حافظ زبیدی کی یہ رائے بہت وزنی ہے، مگر انہوں نے "اَلفِقهُ الأَکبَر" کا کوئی ایسا نسخہ دیکھا نہیں تھا جس کی عبارت میں "مَا مَاتَا" کا لفظ ہو۔ اور انہوں نے یہ حکایت ایسے شخص سے کی ہے جس نے ایسا نسخہ دیکھا تھا۔ اور اللہ کا شکر اور اسی کی حمد و تعریف ہے کہ میں نے "دَارُ الکُتُبِ المِصرِيَّة" کے دو قدیم نسخوں میں: "مَا مَاتَا" کا لفظ خود دیکھا ہے، جیسا کہ میرے بعض دوستوں نے "مَا مَاتَا" اور: "عَلیٰ الفِطرَةِ" کے دونوں لفظ شیخ الاسلام عارف حکمت کے مکتبہ کے دونوں نسخوں میں دیکھے ہیں۔ اور ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اپنی شرح کی بنیاد کسی خطا والے نسخے پر رکھ لی، اور سوءِ ادب کا شکار ہو گئے۔ اللہ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے۔ (۷۱)

آپ کے انہی تسامحات کے بارے میں محبی نے کہا ہے کہ: اگر اُن سے اِن مسامحات کا صدور نہ ہوتا، تو ان کی کتابیں کثرت فوائد اور حسنِ عبارت کی وجہ سے مشہور ہو کر پوری دنیا میں پھیل جاتیں۔

بالجملہ، موصوف ان علما میں سے تھے جنہوں نے سنت کی حمایت، بدعت کا قلع قمع کرنے، اور علوم ظاہرہ و باطنہ کی نشر و اشاعت میں زندگی کھپا دی۔ اور ان کی ذات سے عام نفع ہوا۔ اور لوگوں کو ان کی کتابوں کی احتیاج بہت زیادہ رہی ہے۔ اسی وجہ سے محدث مؤرخین نے انہیں گیارہویں صدی کا مجدد قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ فقیہ محدث شیخ محمد عبدالحیٔ لکھنوی اپنے فتاوی میں نقل کرتے ہیں:

''جو شخص بھی "خُلَاصَةُ الأَثَرِ فِي أَعيَانِ القَرنِ الحَادِي عَشَر" کا مطالعہ کرے گا، اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ شیخ شہاب الدین رملی اور ملا علی قاری رحمہما اللہ تعالیٰ مجددین میں سے تھے''۔ (۷۲)

ایسے ہی اپنی کتاب: "التَّعلِيقَاتُ السَّنِيَّة" میں رقم طراز ہیں:

''میں نے ان کی مذکورہ سبھی کتب کا مطالعہ کیا ہے ....، انتہائی مفید کتب ہیں۔ اور ایک ہزار سال کے سرے پر ان کتابوں نے انہیں مجددیت کے درجے تک پہنچا دیا ہے''۔ (۷۳)

اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ: آپ قرن عاشر کے مجددین (۷۴) میں سے تھے۔ آپ نے علم تفسیر و قراءات، اور حدیث و فقہ

---

۷۱ : العالم والمتعلّم ص ٦، بتحقيق الشيخ محمد زاهد الكوثري، مطبعة الأنوار، القاهرة ١٣٦٨ هج.

۷۲ : جس کی فارسی عبارت یہ ہے:

از معائنۂ خلاصة الأثر في أعيان قرن الحادي عشر وغيره واضح است كه از مجددين ألف شهاب الدين رملي وملا علي قاري وغيره بودند.

مجموعة الفتاوى ١ : ٦٧، مطبع يوسفي، لكهنو ١٣٤٤هج.

۷۳ : دیکھئے: الفوائد البهية مع التعليقات السنية ص ٩، طبع مصر ١٣٢٤.

۷۴ : علماء شافعیہ تو اس معاملے میں حد سے ہی تجاوز کر گئے ہیں، چنانچہ انہوں نے مجددین کی فہرست کو شوافع ہی میں محصور کر دیا ہے۔ اور اگر کسی دوسرے کا ذکر کیا ہے تو بس قسم توڑنے کے سے انداز میں کیا ہے، جیسا کہ حافظ سیوطی کے اس ارجوزہ سے واضح ہے جس کا نام انہوں نے "تحفة المهتدين بأخبار المجددين" رکھا ہے، اور مؤرخ محبی نے اپنی کتاب "خلاصة الأثر" (٢: ٣٤٤ - ٣٤٥) میں اسے من و عن مکمل نقل کر دیا ہے۔ مزید شیخ محمد عبدالرؤف مناوی نے اپنی کتاب "فيض القدير في شرح الجامع الصغير" (١: ٢٨٧) میں نقل کیا ہے۔ یہاں ہم......

......وہ ارجوزہ خلاصۃ الأثر سے نقل کررہے ہیں:

ألحمد لله العظيم المنة — المانح الفضل لأهل السنة

ثم الصلاة والسلام نلتمس — على نبي دينه لا يندرس

لقد أتى في خبر مشتهر — رواه كل حافظ معتبر

بانه في رأس كل مئة — يبعث ربنا لهذه الأمة

منا عليها عالما يجدد — دين الهدى لأنه مجدد

فكان عند المئة الأولى عمر — خليفة العدل بإجماع وقر

والشافعي كان عند الثانية — لما له من العلوم السارية

وابن سريج ثالث الأئمة — والأشعري عده من أمه

والباقلاني رابع أو سهل أو — الإسفرايني خلف قد حكوا

والخامس الحبر هو الغزالي — وعده ما فيه من جدال

والسادس الفخر الإمام الرازي — والرافعي مثله يوازي

والسابع الراقي إلى المراقي — ابن دقيق العيد باتفاق

والثامن الحبر هو البلقيني — أو حافظ الأنام زين الدين

وعد سبط الميلق الصوفية — لو وجدت مائته وفيه

والشرط في ذلك أن تمضي المئة — وهو على حياته بين الفئة

يشار بالعلم إلى مقامه — وينصر السنة في كلامه

وأن يكون جامعا لكل فن — وأن يعم علمه أهل الزمن

وأن يكون في حديث قد روى — من آل بيت المصطفى وهو قوى

وكونه فردا هو المشهور — قد نطق الحديث والجمهور

وهذه تاسعة المئين قد — أتت ولا يخلف ما الهادي وعد

وقد رجوت أنني المجدد — فيها ففضل الله ليس يجحد

وآخر المئين فيها يأتي — عيسىٰ نبي الله ذو الآيات

يجدد الدين لهذى الأمة — وفي الصلاة بعضنا قدامه

مقررا لشرعنا ويحكم — بحكمنا وفي السماء يعلم

وبعده لم يبق من مجدد — ويرفع القرآن مثل ما بدى

وتكثر الأشرار والأضاعه — من رفعه إلى قيام الساعة

وأحمد الله على ما علما — وما جلا من الخفا والغما

مصليا على نبي الرحمة — والآل ما أصحابه المكرمه

وغیرہ کو بایں طور زندہ کیا کہ ان علوم کو جمع کیا، اور اپنی مشہور و مقبول کتب میں ان کی شروح لکھیں۔ لیکن بایں ہمہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ متقدّم مجتہدین کے پائے کے تھے، جیسا کہ ملا علی قاری نے خود، رسول اکرم ﷺ کی اس حدیث: "إِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ، عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِئَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا" کی شرح کرتے ہوئے کہا ہے:

(ان اشعار کا ترجمہ کرنے کی بجائے انہیں بعینہ ویسے ہی نقل کر دیا گیا ہے، جیسے استادِ محترم ڈاکٹر عبد الحلیم چشتی صاحب نے نقل کیا تھا)۔

"مَنْ يُجَدِّدُ": یعنی جو تجدید کرے گا: سے مراد کوئی ایک شخص نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد ایک ایسی جماعت ہے، جن میں سے ہر شخص کسی علاقے یا ملک میں مہیا شدہ اسباب و عوامل کی بنا پر علوم شرعیہ کے کسی ایک فن، یا کئی ایک فنون کی تجدید کرے گا۔ خواہ وہ تقریر کے ذریعہ ہو، خواہ تحریر کے ذریعہ سے۔ اور ہر ایسے شخص کی یہ خدمات اس کی بقاء، نام نہ مٹنے اور یادگار رہنے کا سبب بن جایا کرتی ہیں، حتّٰی کہ اللہ کا اَمر آ جائے، (یعنی قیامت آ جائے)۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تجدید کی یہ صفت ایک امر اضافی ہے۔ کیونکہ علم میں تنزّل ایسے ہی روز افزوں ہے جیسے کہ جہل میں ترقی۔ اور ہمارے آج کے اس دور کے علماء کی ترقی کا سبب اس زمانے میں علم کا تنزّل ہی تو ہے۔ ورنہ عصر نبوی ﷺ سے بُعد اور دُوری کو دیکھیں تو عمل و عمل، حلم و فضل، تحقیق و تدقیق میں کہاں متقدمین کا درجہ، اور کہاں متاخرین (اور خصوصاً ہمارے زمانہ کا علم)۔ بالکل ایسے ہی جیسے نور کے منبع اور مرکز سے دور ہوتے جائیں تو ظلمت بڑھتی جاتی ہے، اور حقیقت کا ظہور ماند پڑتا جاتا ہے۔ اور بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت میں اس کی طرف بڑا واضح اشارہ ہے کہ: آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لَا يَأْتِيْ عَلٰى أُمَّتِيْ زَمَانٌ إِلَّا الَّذِيْ بَعْدَهُ شَرٌّ مِنْهُ". کہ میری امت پر جو زمانہ بھی آئے گا، اس کے بعد والا اس سے بھی زیادہ شر والا ہوگا۔

اور معجم طبرانی کبیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: "مَا مِنْ عَامٍ، إِلَّا وَيُحْدِثُ النَّاسُ بِدْعَةً، وَيُمِيْتُوْنَ سُنَّةً، حَتّٰى تُمَاتُ السُّنَنُ وَتُحْيَا الْبِدَعُ"، کہ ہر آنے والے نئے سال میں، لوگ بدعتیں ایجاد کرتے رہیں گے، اور سنتوں کا جنازہ نکالتے رہیں گے، حتی کہ سنتیں مردہ ہو جائیں گی اور بدعتیں زندہ ہو جائیں گی۔

اور یہ جو تھوڑا بہت اثر نظر آتا ہے، یہ بھی متقدّمین کے علوم و برکات کا اثر ہے۔ لہٰذا، ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کریں کہ: اَولویّت و فضیلت متقدّمین ہی کو حاصل ہے۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ أَجْمَعِيْنَ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ۔ (۷۵)

بالجملہ، اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مختلف علاقوں میں علمِ دین میں مشغول طلبہ کے لیے ملا علی قاری کی قابل قدر خدمات ہیں۔ اور ملاّ علی قاری کے کام کا زیادہ تر حصہ تلخیص و تجرید، اور خوب صورت انداز میں شرح کرنا ہے۔ اور ان کی محنت کا بنیادی نکتہ اور انتہائی دائرہ کار یہی ہے کہ انہوں نے اپنی عمر (متقدمین کے علوم و فنون کی) تائید و تاکید میں گزار دی۔ اور متقدمین و متاخرین کے عمل میں یہی فرق ہے، جیسا کہ ملا علی قاری نے خود قاضی ابو الخیر ناصر الدین عبد اللہ بن عمر بیضاوی (ت ۶۵۸ھ) کا قول متقدّمین و متاخّرین کے مزایا اور اسلوب کے بیان میں نقل کیا ہے، کہ انہوں نے کہا:

۷۵: دیکھئے: مرقاۃ المفاتیح ۱: ۲۴۸، طبع مصر۔

''متقدمین نے اساس قائم کی اور (اساسی اینٹ رکھنے کے بعد) تمہیدی قواعد بیان کر کے راہ دکھائی۔ اور متاخرین نے ان کی تلخیص و تجرید کی، اور اپنی زندگیوں کو انہی علوم وفنون کی تائید و تاکید میں کھپا دیا۔(۷۶)

مناسب ہے کہ اس مقام پر ہم ایک ضروری نکتے پر متنبہ کر دیں۔ اور وہ یہ کہ فقہ الحدیث ایک گہرا علم ہے۔ اس علم کی طرف توجہ دینے والے اور اس کے ماہر، متقدمین ہوں یا متاخرین، بہت ہی تھوڑے رہے ہیں۔ اور ملا علی قاری رحمہ اللہ کو اگر ان میں شمار کیا جاتا ہے، تو ان کے فخر کے لیے تو یہی بس ہے۔

مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ اپنے رسالہ ''عجالۂ نافعہ'' میں رقم طراز ہیں:

''علم حدیث کا تعلق: خبری علم سے ہے۔ اور خبر میں سچ اور جھوٹ، دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ تو اس علم کو حاصل کرنے والے کے لیے دو باتوں میں مہارت حاصل کرنا بہت ضروری ہے:

۱ : راویوں کے حالات کی چھان بین

۲ : احادیث کے سمجھنے میں انتہائی احتیاط کرنا۔

اس لیے کہ پہلی بات میں سستی کی وجہ سے سچا اور جھوٹا خلط ملط ہو جائے گا۔ اور دوسری بات میں احتیاط نہ کرنے سے جو مراد نہ ہو، اسے مراد سمجھ لیے جانے کا اشتباہ ہو سکتا ہے۔ اور دونوں ہی صورتوں میں علم حدیث کا وہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا جس کی امید پر یہ علم حاصل کیا جاتا ہے۔ بلکہ بالعکس اس کا الٹا نتیجہ نکلتا ہے، اور ضَلَال و إضلَال (یعنی گمراہی، اور گمراہ کرنا) سامنے آتا ہے۔ اللہ ہم سب کو اس سے بچائے۔

اور پہلی بات: یعنی حدیث روایت کرنے والے راویوں کے حالات کی چھان بین کا صدر اول میں، تابعین اور تبع تابعین سے لے کر امام بخاری و مسلم کے زمانے تک طریقہ اور تھا۔ چنانچہ وہ ہر علاقے اور زمانے کے رجال کے حالات سے بحث کرتے تھے۔ ان کے بارے میں معلومات بہم پہونچاتے تھے۔ اور جب کبھی ان میں سے کسی سے بھی جھوٹ کی، یا سوءِ حفظ اور بے دینی کی بو محسوس کرتے، تو اس کی حدیث کو قبول نہ کرتے تھے۔ اسی وجہ سے رجال کے احوال میں بڑی تفصیلی کتب لکھی گئیں۔

رہی بات آج کل کے حالات کی، تو اس کا طریق کار دوسرا ہے۔ اسی وجہ سے اب تو قابلِ اعتماد اور صرف صحیح روایات بیان کرنے والی کتب کی ان کتابوں سے تمیز ضروری ہو گئی ہے جن کو رد کرنا اور چھوڑنا واجب ہو گیا ہے۔ اور یہ اس لیے تاکہ طالب علم ورطۂ حیرت و تخلیط میں نہ پڑ جائے۔ اور بہت سے متاخر محدثین سے کتابوں کی یہ تمیز اور فرق اور ان کی رعایت رہ گئی ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنے رسائل میں جمہور سلف صالحین کی مخالفت کی ہے۔ اور ایسی کتب سے تمسک و استدلال کیا ہے جن کا ماہر محققین کے ہاں کوئی اعتبار ہی نہیں ہے۔

اور جہاں تک دوسری بات، یعنی احادیث کے معانی سمجھنے میں احتیاط برتنے کا تعلق ہے، تو اس سلسلے میں قاضی عیاض کی ''مَشَارِق

---

۷۶ : دیکھئے: مرقاۃ المفاتیح ٥ : ٦٥٧.

'الأنوار (۷۷) صحیحین (یعنی بخاری ومسلم) اور "موطأ الإمام مالك" کے معانی کی توضیح وتشریح کے لیے کافی ہے۔ اور ابن اثیر کی "جَامِعُ الأُصُوْل" (۷۸) چھے بنیادی کتابوں سے مستغنی کر دیتی ہے۔ اور "مَجْمَعُ البِحَار" (۷۹) مذکورہ چاروں طبقات کی تمام کتبِ حدیث کی تحقیق سے مستغنی کر دیتی ہے۔

---

۷۷ : قاضی القضاۃ برہان الدین ابن فرحون مالکی (ت ۷۹۹ھ) نے اپنی کتاب: "الديباج المذهب في معرفة أعيان علماء المذاهب" (صفحة ۱۷۰، مصر، ۱۳۵۱هج) میں قاضی عیاض کے حالات بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

''کتاب "مشارق الأنوار" ، موطأ، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث کے غریب الفاظ کی تفسیر، الفاظ کے ضبط، اوہام وتصحیفات کے مقامات پر تنبیہ، اور اسماء رجال کے ضبط کے بیان میں لکھی جانے والی کتاب ہے۔ اور یہ ایسی کتاب ہے کہ اگر سونے کے پانی سے لکھی جائے، یا جواہرات سے تولی جائے، تو اس کے حق کی ادائیگی کے مقابلے میں پھر بھی کم ہے۔ کسی نے اس کے بارے میں یہ شعر کہے ہیں:

مَشَارِقُ الأَنْوَارِ تَبَدَّتْ بسبته ومِن عَجَبٍ كونُ المَشَارِق بالغَرْبِ

کہ: مشارق الأنوار ایک عرصے میں ظاہر ہوئی ہے۔ اور تعجب تو اس بات پر ہے کہ مشارق کا ظہور مغرب میں ہوا ہے۔

مذکورہ بالا کتاب دو مرتبہ طبع ہو چکی ہے۔ ایک مرتبہ تو فاس میں، اور دوسری مرتبہ مصر میں طبع ہوئی تھی۔

۷۸ : یاقوت بن عبد اللہ حموی رومی (ت ۶۲۶ھ) نے اپنی کتاب "معجم الأدباء" (۶:۲٤۱، القاهرة ۱۹۲۳م) میں ابن اثیر جزری شافعی (۶۰۶ھ) کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

کتاب: "جامع الأصول في أحاديث الرسول" دس جلدوں میں ہے، جس میں آپ نے بخاری، مسلم، موطأ، سنن ابی داود، سنن نسائی اور سنن ترمذی کو حروفِ معجم کی ترتیب پر جمع کیا ہے، اور غریب الاحادیث اور اس کے معانی کی شرح، اور اس کے احکام کے بیان کے ساتھ ساتھ اس کے رجال کے اوصاف کو بیان کیا ہے۔ اور مزید جن چیزوں کی ضرورت محسوس ہو سکتی ہے، ان پر تنبیہ بھی کی ہے۔

مؤلف کا کہنا ہے: میں پورے وثوق اور قطعیت کے ساتھ کہتا ہوں کہ: اس جیسی کتاب کبھی بھی تصنیف نہیں کی گئی، اور نہ ہی کی جا سکے گی۔ جامع الأصول مصر سے چھپ چکی ہے۔

۷۹ : شیخ عبد العزیز محدث دہلوی نے اپنے رسالہ ''عجالۂ نافعہ'' میں اس کے بارے میں کہا ہے:

شیخ محمد طاہر گجراتی کی ''مجمع البحار'' غریب الفاظ کی شرح اور ان کی عبارات کی توجیہ کی وجہ سے ہر قسم کے مواد سے مستغنی کر دیتی ہے۔ (دیکھیں: الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۵۸)

سید عبد الحی حسنی نے اپنی کتاب "نزهة الخواطر" (٤ : ۳۰۱) میں شیخ محمد بن طاہر پٹنی (ت ۹۸۶ھ) کے حالات میں کہا ہے:

آپ کی کئی جلیل القدر تصنیفات ہیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور اور بہترین کتاب: "مجمع بحار الأنوار فِي غَرائبِ التَّنْزِيْلِ ولَطَائِفِ الأَخبَار" ہے۔ آپ نے اپنی اس کتاب میں تمام غریب الحدیث اور اس موضوع پر لکھی جانے والی تمام کتب کے مواد کو جمع کر دیا ہے۔ چنانچہ اب اس کی حیثیت صحاحِ ستہ کی شرح کی ہوگئی ہے۔ موصوف کی یہ کتاب ایسی ہے کہ لکھے جانے کے وقت ہی سے اہلِ علم کے ہاں متفق علیہ طور پر اسے قبول کر لیا گیا ہے، اور علامہ طاہر پٹنی نے اس عمل سے اہلِ علم پر بہت بڑا احسان کیا ہے......

علامہ سیوطی کی "الجَامِعُ الصَّغِير" پر شیخ عبد الرَّؤف مناوی کی شرح اکثر احادیث کی تشریح کے لیے کافی وافی ہے۔ لیکن احادیث

کی شرح میں شراح کا کلام بہت متنوع ہے، اوران کی توجیہات میں بہت سا رطب ویابس بھی راہ پا گیا ہے۔ لہٰذا طالب علم کے لیے ان رجال کی معرفت بہت ضروری ہے جن پر احادیث کی تشریح کرنے کے باب میں اعتماد کیا جاتا ہے۔ مزید برآں ان تالیفات کی پہچان بھی بہت ضروری ہے جن پر یقین واعتبار کیا جاتا ہے، اور ایسے معتمد علماء میں سے صحیح مسلم کے شارح امام نووی (۸۰) اور بغوی ہیں۔ علامہ بغوی کی کتاب "شَرْحُ السُّنَّة" (۸۱) فقہ الحدیث اوراس کی مشکلات کی توجیہ کے بارے میں کافی ہے، اور یہ ایسی کتاب ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ: اس کے ذریعے "مَصَابِيح" اور "مِشْكَاةُ الْمَصَابِيح" دونوں ہی کی شرح ہو جاتی ہے۔ اور ایسے ہی ان میں سے "سُنَن أبِي دَاود" کے شارح علامہ خطابی (۸۲) ہیں۔ یادر ہے یہ تمام علماء مسلکاً شافعی ہیں۔

...... سید صدیق حسن خان قنوجی اپنی کتاب "أبجد العلوم" (۸۹۶:۳) میں رقم طراز ہیں:

آپ کی کتاب "مجمع البحار" کچھ عرصہ پہلے ہی ہندوستان میں طبع ہوئی ہے، اور نصف النہار میں سورج کے چمکنے کی طرح مشہور ہوگئی ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جس میں مؤلف نے ہر غریب الحدیث اوراس موضوع پر لکھی جانے والی تمام کتب کو سمیٹ لیا ہے۔ لہٰذا، اب یہ صحاحِ ستہ کی شرح کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اگر کسی کے پاس امہاتِ ستہ میں سے کسی کتاب کی شرح نہ ہو، تو معانی کے حل، اور پیچیدگیوں کی وضاحت کیلئے یہی ایک کتاب کافی ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے کہ جس کے مقبول ہونے پر اتفاق ہے، اور پردۂ ظہور میں آنے کے بعد سے، اہلِ علم کے ہاں متداول ہے۔ وباللّٰهِ التَّوفِيق.

۸۰ : علامہ شرف الدین طیبی نے اپنی کتاب "الكاشف عن حقائق السنن" میں امام مسلم بن حجاج کی کتاب "الصحيح" کی امام نووی کی "المنهاج" نامی شرح کی انتہائی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

''میرا زیادہ تر اعتماد، اور انتہائی اہتمام امام نووی کی شرح مسلم کی طرف مراجعت کا رہا ہے، اس لیے کہ وہ فوائد کی جامع ترین، اور کثیر نکات سے پُر ہے''۔

۸۱ : محیی السنۃ حسین بن مسعود بغوی نے اپنی مشہور کتاب "شرحُ السُّنَّة" کے مقدمے میں کہا ہے:

''یہ کتاب نبی اکرم ﷺ سے مروی احادیث کے علوم، اور اخبار کے بہت سے فوائد پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اس میں مشکلاتِ حدیث کا حل، غریب الحدیث کی تفسیر، اس کے احکام کا بیان، اس پر مترتب ہونے والے فقہی مسائل اور اختلاف علماء کے ذکر کے ساتھ ساتھ ایسے کئی دوسرے امور کو بھی بیان کیا گیا ہے جن سے مستغنی نہیں رہا جاسکتا۔ احکام میں اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ میں نے اس میں صرف وہی کچھ نقل کیا ہے جو اہل سنت علماء کے ہاں مسلم ہے اوراس پر ائمۂ سلف نے اعتماد کیا ہے، اوران کی کتابوں میں موجود ہے۔ باقی وہ باتیں جن کا شمار مقلوب، موضوع یا مجہول چیزوں میں ہوتا ہے اوران کے چھوڑنے پر اکابرینِ امت کا اتفاق ہے، میں نے اس کتاب کو ان سے پاک رکھا ہے''۔

حکیم الامت علامہ محدث فقیہ شاہ ولی اللہ دہلوی نے موطأ امام مالک کی فارسی زبان میں جو شرح لکھی ہے اس میں "شرحُ السُّنَّة" پر اعتماد کیا ہے۔ ہم نے "شرح السُّنَّة" کا کچھ حصہ علامہ محدث، محقق بارع، شیخ مفضال محمد یوسف بنوری کے پاس دیکھا اوراس کا مطالعہ کیا ہے۔

۸۲ : یاقوت رومی نے اپنی مشہور کتاب "معجم الأدباء" میں امام حسن بن محمد صغانی لاہوری (ت ۶۵۰ھ) کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''عدن میں آپ کے سامنے خطابی کی "معالمُ السُّنَن" پڑھی گئی۔ آپ کو یہ کتاب اوراس کے مصنف کا کلام بہت بھایا۔ آپ فرمایا کرتے تھے: ''خطابی نے تو اس کتاب میں سبھی کچھ سمیٹ لیا ہے''۔

احادیث کی شرح کرنے والے معتبر علماء میں سے ایک امام طحاوی (۸۳) بھی ہیں۔ان کی کتاب "مَعَاني الآثار" سے ہی حنفیہ

۸۳ : امام طحاوی ان ائمہ میں سے ہیں جو فقہ وحدیث کے جامع تھے۔اور یہ اتنی واضح بات ہے کہ معاند کے سوا کوئی اس کا انکار نہیں کرسکتا۔میرے بڑے بھائی ماہر وباکمال محدث، محقق مفضال شیخ محمد عبد الرشید نعمانی نے اپنی کتاب "ما تمسُّ إليه الحاجة لمن يطالع سنن ابن ماجه" (ص ۲۹، طبع کراچی) میں کہا ہے:

"علامہ محدث، فقیہ، اصول امیر کاتب عمید اتقانی ہدایہ کی شرح "غاية البيان" میں، امام طحاوی کی "معاني الآثار" کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"میں کہتا ہوں: ابو جعفر طحاوی کے علم وفضل کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔کیونکہ وہ اپنی غزارتِ علمی، ورع وتقویٰ، اور فقہی مذاہب کی معرفت کی شہرت کے ساتھ ساتھ امانت داری میں بھی مشہور ہیں، اور انہیں متہم نہیں سمجھا گیا۔خود ہی "شرح معاني الآثار" کو دیکھ لیجیے۔ہمارے مذہب کو تو چھوڑیے، بھلا اس کے علاوہ باقی مذاہب میں بھی کہیں اس کی نظیر ملتی ہے؟

حافظِ مغرب، اہلِ ظاہر کے امام شیخ ابن حزم ظاہری کا طرزِ عمل بہت ہی منصفانہ ہے، چنانچہ انہوں نے صحیحین کے ساتھ امام نسائی اور امام ابو داود کی کتاب کا ذکر کرنے کے بعد امام طحاوی کا بھی ذکر کیا ہے۔

حافظ ذہبی "سيَر أعلام النُّبلاء" میں آپ کے ترجمہ میں یہ بات نقل کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

میں نے انہیں اس موقف کے قائلین کا ہم نوا پایا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ: حدیث کی تصنیفات میں سب سے جلیل القدر تصنیف موطأ امام مالک ہے۔چنانچہ کہتے ہیں:

صحتِ حدیث کے اعتبار سے سب سے زیادہ قابلِ تعظیم کتب (بالترتیب) صحیح بخاری، صحیح مسلم، صحیح ابن سکن، منتقیٰ ابنِ جارود، منتقیٰ قاسم بن اصبغ ہیں۔ان کے بعد امام ابو داود، اور امام نسائی کی کتب، مصنَّف قاسم بن اصبغ اور مصنَّف ابی جعفر طحاوی ہیں۔

علامہ ذہبی کہتے ہیں: ابنِ حزم نے سنن ابن ماجہ اور جامع ترمذی میں سے کسی کا بھی تذکرہ نہیں کیا، کیونکہ انہوں نے ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں دیکھی۔اور یہ دونوں کتابیں آپ کی وفات کے بعد اندلس پہنچی ہیں"۔انتہیٰ۔

حافظ علامہ بدر الدین عینی اپنی کتاب "نُخبُ الأفكار في شرح معاني الآثار" میں رقم طراز ہیں:

"علمِ حدیث اور تاریخ کا ماہر، ہر وہ شخص جس نے آپ کا تذکرہ کیا ہے، اس نے آپ کی اس کتاب کی تعریف ہے، جیسے طبرانی، ابو عبد اللہ حمیدی، اور حافظ ابن عساکر، اور ان کے علاوہ دوسرے متقدمین ومتاخرین جیسے حافظ ابو الحجاج مزی، حافظ ذہبی، عماد الدین ابن کثیر، اور ان کے علاوہ دوسرے اصحابِ تصانیف۔

اور اس بات میں کسی عاقل اور منصف شخص کو شک نہیں ہوسکتا کہ امام طحاوی نے قرآن مجید اور احادیث نبویہ سے احکام کے مسائل کے استنباط کے عمل کو بڑے واضح انداز میں پایۂ ثبوت تک پہنچایا ہے۔اور اپنے ہم عمر معاصرین، اور اصحابِ صحاح وسنن سے روایتِ حدیث کرنے میں اپنے شریکِ درس لوگوں کو فقہ کے معاملے میں بے فکر کر کے یہ سارا بوجھ اپنے ذمہ لے لیا ہے۔اور یہ بات آپ کی اور اُن دوسرے حضرات کے کلام کو ملاحظہ کرنے سے بخوبی سامنے آجاتی ہے۔اس کی مزید دلیل، اور ہمارے اس دعوے کی مزید تائید، تمام نقلی وعقلی علوم وفنون میں آپ کی مفید و پُر علم تصانیف سے بھی ہوتی ہے......

...... اور جیسا کہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں، حدیث کی روایت اور رجال کی معرفت میں آپ عظیم امام، قابلِ بھروسہ، ثقہ، اور امام بخاری ومسلم اور دوسرے اصحابِ صحاح وسنن کی طرح حجت ہیں۔ اور جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، روایت میں مشہور ائمۂ حدیث کے ساتھ شرکت اور وسعتِ روایت اس پر بہترین دلیل ہیں۔

رہی بات آپ کی تصنیفات کی، تو وہ بہت ہی اچھی اور کثیر الفوائد کتب ہیں، خصوصاً کتاب "معاني الآثار" کے تو کیا ہی کہنے ہیں۔ جو بھی منصف شخص اس کو دیکھے اور بنظرِ تأمّل اس کا مطالعہ کرے گا، تو حدیث کی کئی مشہور ومقبول کتب پر اسے راجح محسوس کرے گا۔ اور اس کتاب کے کلام اور ترتیب میں غور وفکر کرنے اس کی ترجیح ظاہر ہو جائے گی۔ یہ ایسی بات ہے جس میں کسی جاہل یا معاند قسم کے متعصب شخص کو ہی شک ہو سکتا ہے۔

باقی امام طحاوی کی کتاب کا سنن ابوداود، جامع ترمذی اور سنن ابنِ ماجہ جیسی کتب پر فائق اور راجح ہونا ایسی کھلی بات ہے جس میں جاہل کے سوا کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔ اس ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب میں وجوہِ استنباط، وجوہِ معارضات کا اظہار، ناسخ ومنسوخ کی تمیز جیسی خوبیوں کا موجود ہونا، ایسے اوصاف ہیں جو کسی دوسری کتاب میں نہیں ہیں۔ یہ ایک بنیادی کتاب ہے، اور حدیث کی معرفت میں اس پر مکمل اعتماد کیا جاتا ہے۔ جب کہ باقی کتب میں یہ باتیں موجود نہیں ہیں۔ اور یہ فرق آپ خود دیکھ اور پرکھ سکتے ہیں۔

اگر کوئی شخص یہ دعوی کرے کہ: یہ کتاب اس لیے باقی کتب سے مرجوح ہے کہ اس میں بعض ضعیف اور ساقط الاعتبار قسم کے راوی موجود ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ: باقی کتبِ سنن بھی تو اس قسم کے راویوں سے بھری پڑی ہیں۔ بلکہ ان کے بارے میں تو یہ بھی کہا گیا ہے کہ: وہ کتب، بعض باطل اور موضوع احادیث سے بھی خالی نہیں ہیں۔ رہی بات ضعیف احادیث کی، تو ان کے ہاں وہ بھی بہت زیادہ ہیں۔

اگر امام طحاوی کی کتاب کا موازنہ سنن دار قطنی، سنن دارمی یا سنن بیہقی جیسی کتب کے ساتھ کیا جائے تو وہ اس کے برابر چلنا تو درکنار، پاسنگ بھی نہیں ہیں۔ اور مذکورہ بالا کتب نہ تو میدان میں اس کی برابری کر سکتی ہیں، اور نہ ہی میزان میں اس کے ہم پلہ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کا مخفی خزانے اور چھپے ہوئے دفینے کی طرح ہونا ایسا حجاب ہے جس کی وجہ سے بہت سی کتب حدیث پر اس کا راجح ہونا، کئی ایک لوگوں پر واضح نہیں ہو سکا۔ ہر وہ شخص جو اس کتاب سے استخراج کی کوشش کرے، اس کے عجائبات اس کے سامنے اچانک اور خود بخود نہیں آ جاتے، اور نہ ہی استنباط کی کوشش کرنے والا ہر کوئی ان غرائب کو اتفاقاً پا سکتا ہے۔ ہمیشہ سے اس پر یک گونہ اختفاء کا پردہ ہی پڑا رہا، اور کبھی یہ منصۂ شہود پر جلوہ گر نہیں ہوئی۔ یہ معاملہ یونہی چلتا رہا حتی کہ اس کا سورج غروب ہونے، اور چاند ڈوبنے کے قریب ہو گیا۔ اور یہ سب متاخرین کے قصورِ فہم، اور اس کتاب کو توجہ نہ دینے کے ساتھ ساتھ ایسی چیزوں میں مشغول ہونے کے سبب تھا جو اس باب میں قطعاً فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتی تھیں۔ اور اس سب پر مستزاد متعصب مخالفین کا اس کتاب کے ساتھ جانبدارانہ رویہ، اور ان کی یہ کوششیں تھیں کہ اس کتاب کے آثار اور نام ونشان ہی مٹ جائے۔ لیکن اللہ تعالی حق کو حق، اور باطل کو باطل کی صورت میں واضح کر کے رہتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالی نے بعض ایسے لوگوں کو پیدا کیا جو اس کتاب کا حق ادا کرنے کھڑے ہوئے، اور انہوں نے اس قریب المرگ کتاب کو زندہ کر دیا۔ اور اس کے وہ محاسن جو مٹنے کو تھے انہیں پھر سے واضح کر دیا۔ اس طرح اپنی ہم مثل کتابوں پر اس کی ترجیح اور ان کی اشکال پر اس کا تفوق ظاہر ہو گیا"۔

"ما تمسُّ إليه الحاجة" کی عبارت مکمل ہو گئی۔

میں کہتا ہوں: امام ابو عبد اللہ ذہبی (ت ۷۴۸ھ) نے اپنی کتاب "تذكرة الحفاظ" میں حافظ ابن زبر ربعی (ت ۳۷۹ھ) ......

......رحمہ اللہ کے حالات میں کہا ہے:

علی بن موسیٰ سمسار کہتے ہیں: ابوسلیمان نے کہا: ابو جعفر طحاوی نے میری تصنیفات میں بعض چیزیں دیکھیں، ان کے بعض ورق پلٹے، پھر کہنے لگے: اے ابوسلیمان! تم پنساری ہو، جب کہ ہم طبیب ہیں''۔

حافظ سید عبدالحیٔ کتانی نے اپنی کتاب "فهرس الفهارس والأثبات" (۱: ٤٣) میں حافظِ حدیث کے بارے میں کہا ہے:

حافظ ابنِ حجر نے "ابناء الغمر" میں حافظ تقی الدین بن رافع کے حالات میں کہا ہے: علامہ سبکی نے آپ کو ابن کثیر وغیرہ پر مقدم قرار دیا ہے ۔اور مجھ سے ہمارے شیخ عراقی نے کہا ہے: تقی الدین بن رافع کو رحلت وطلب کا جو اہتمام اور اجزاء کی جو معرفت حاصل تھی، اس کی وجہ سے موصوف نے ان کو دوسروں پر مقدم قرار دیا ہے۔

میں کہتا ہوں: انصاف کی بات یہ ہے کہ: ابن کثیر کی بہ نسبت ابن رافع اہل حدیث کے طریقِ حفظ کے زیادہ پابند تھے۔ اس لیے کہ وہ عوالی، اجزاء، وفیات اور مسموعات کو، بخلاف ابن کثیر، خصوصی توجہ دیتے تھے۔ اور حافظ ابنِ کثیر، ابنِ رافع کی بہ نسبت فقہاء کے طریقِ حفظ کے زیادہ قریب تھے۔ چنانچہ ان کے ہاں فقہی وتفسیری متون کی معرفت کا اہتمام زیادہ تھا۔ اب جو محدث ان دونوں اسالیب کا جامع ہو، وہی حافظِ کامل ہوگا، لیکن عصرِ اوّل میں پائے جانے والے حفاظ جیسے ابن خزیمہ، طحاوی، ابن حبان اور بیہقی، کے بعد بہت کم ہی کسی کے ہاں ایسی جامعیت پائی جاتی ہے، یا متاخرین میں ہمارے شیخ عراقی ہیں۔

امام عصر، نخبۂ دہر، حافظِ عصر علامہ سید انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں:

امام طحاوی تمام لوگوں سے زیادہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کو جانتے تھے۔ بلکہ تمام لوگوں سے زیادہ تمام مذاہب کے عالم تھے۔ اور وہ امام شافعی سے بیک واسطہ اور امام مالک سے دو واسطوں سے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے تین واسطوں سے روایت کرتے ہیں اور "شرح معاني الآثار" میں کتاب الحج میں، امام احمد رحمہ اللہ سے بیک واسطہ روایت کی ہے۔

اور جیسا کہ ابن اثیر جزری نے کہا ہے: آپ مجتہد امام اور مجدد تھے۔ مزید کہتے ہیں: میں نے جو انہیں مجدد کہا ہے تو وہ شرحِ حدیث، اس کے محال وغوامض اور بحث وتحقیق کے اعتبار سے ہے۔ آپ اپنی انوکھی طرز کے امام تھے۔ چنانچہ قدماء محدثین تو اپنی کتب میں روایتِ حدیث پر قناعت کرتے تھے، اور تفصیلی بحث وتحقیق سے تعرض نہ کرتے تھے۔

دیکھیے: مَعَارِفُ السُّنَن (١ : ١١٤)، طبع كراجي، العَرفُ الشَّذِي، (ص ٤٥) طبع الهند.

میں کہتا ہوں: حافظ شمس الدین ابن جزری (ت ۸۳۳ھ) نے اپنی کتاب "غاية النهاية" میں محمد بن سنان بن سرح بن ابراہیم ابو جعفر تنوخی شیزری ضریر قاضی، کے حالات بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

امام طحاوی نے آپ ہی سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب اخذ کیا تھا۔ انہوں نے اپنے شیخ عیسیٰ شیزری سے، اور انہوں نے محمد بن حسن شیبانی سے حاصل کیا تھا۔

شیخ ابوالحسنات محمد عبدالحیٔ لکھنوی اپنی کتاب "الفوائد البهيّة في تراجم الحنفية" (طبع مصر، ص ٣٢) میں کہتے ہیں:

امام طحاوی نے فقہ کا علم ابو جعفر احمد سے حاصل کیا۔ پھر شام جا کر ابو خازم عبد الحمید سے ملے جو شام کے قاضی القضاۃ تھے، اور ان......

......سے پڑھا۔ اور وہ فقہ میں عیسیٰ بن ابان کے، اور وہ امام محمد رحمہ اللہ کے شاگرد تھے۔

حافظ عصر سید انور شاہ کشمیری نے صحیح مسلم کے امالی میں امام طحاوی کی شرح معانی الآثار کے بارے میں یوں کہا ہے:

میرے نزدیک طحاوی شریف کا مرتبہ، کسی طرح بھی سنن ابوداود سے فروتر نہیں ہے۔ بلکہ سنن ابوداود مرتبہ میں اس کے قریب پہنچتی ہے، کیونکہ طحاوی شریف دو وجہوں سے صحیح ہے۔ ایک تو سند کے اعتبار سے، اور دوسرے متن کے اعتبار سے صحیح ہے۔

جہاں تک سند کا تعلق ہے، تو اس کے اکثر راوی سنن ابی داود ہی کے راوی ہیں، سوائے جابر جعفی کے، کہ امام ابوداود نے ایک روایت ان سے بھی لی ہے۔ بعض لوگوں نے جابر پر جرح کی ہے، اور بعض نے اس کی توثیق کی ہے۔ حتیٰ کہ جب شعبہ نے سفیان ثوری پر یہ اعتراض کیا کہ: آپ جابر جعفی سے روایت نہیں کرتے، تو انہوں نے کہا: میں بعض غلطیوں پر مطلع ہوں۔ اور وہ صرف صحیح احادیث ہی بیان کرتا ہے۔

خوب جان لو کہ: وہ لوگ جو احادیث سے اشتغال رکھتے ہیں، دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ پہلا گروہ صحیح احادیث کے سوا دوسری احادیث کو نہ تو قابلِ اعتناء سمجھتا ہے، اور نہ ہی اسے بیان کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔ اور صحیح کے سوا جتنی احادیث ہیں انہیں ترک کر دیتا ہے۔ یا ان کے ساتھ تذبذب اور شک کا معاملہ کرتا ہے کہ پتہ نہیں یہ صحیح ہے یا نہیں؟

جب کہ دوسرا گروہ محدثین کی ذکر کردہ شروط کو اپنی کتاب میں مدِّ نظر رکھتا ہے۔ پھر اس قسم کے محدثین اگر صحیح اور سقیم کی پرواہ نہ کرتے ہوں، تو ان کی بیان کردہ اسناد کو دیکھنا ضروری ہے۔

اور وہ محدثین جنہوں نے بعض شرائط کا التزام کیا ہے، ان کے بارے میں ہماری ذمہ داری ہے کہ ان کی شرائط نقل کر کے ان پر اعتماد کریں۔ عام ہے کہ وہ امام بخاری ہوں یا امام مسلم، یا امام ابوداود ہوں یا ان کے علاوہ کوئی اور ہو۔ ابن تیمیہ وغیرہ نے اسی موقف کو اپنایا ہے۔

استاذ انور شاہ نے کہا ہے:

ہمیں تو ان پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی۔ کیا ہم ابن حجر پر تو بھروسہ کر لیں، اور امام نسائی، ابوداود اور امام طحاوی کو چھوڑ دیں، حالانکہ یہ ائمہ تو اجلہ محدثین میں سے ہیں۔ یہ مشورہ تو جاہل، لاعلم اور متعصب لوگوں کی طرف سے ایک دھوکہ ہے۔ ورنہ اگر کسی مسلَّم چیز کو نظری بنانا ہی ہے، تو پھر صحیح بخاری اور مسلم کی کیا خصوصیت ہے۔ انہیں بھی نظری قرار دینا چاہیے۔ اور بحث وتمحیص اور تفتیش کے بعد تمہیں پتہ چل جائے گا کہ صحیحین کے رُواۃ بھی جرح اور تقدیح سے سالم نہیں ہیں۔

ہم نے شاہ صاحب کی یہ تقریر، صحیح مسلم پر موصوف کے ان امالی سے نقل کی ہے، جنہیں ان کے تلمیذ سید مناظر احسن گیلانی (ت ۱۳۷۵ھ) نے ضبط کیا تھا۔ یہ تقریر صاحبِ "فتح الملهم" علامہ شبیر احمد عثمانی (ت ۱۳۶۹ھ) کے پاس محفوظ تھی، جس سے انہوں نے اپنی مذکورہ بالا مبسوط شرح میں استفادہ کیا ہے۔ ہم نے شاہ صاحب کے تلمیذ رشید محقق مفضال شیخ محمد یوسف بنوری سے مانگ کر ان امالی کا مطالعہ کیا تھا۔ اور انہوں نے یہ امالی شیخ عثمانی کے بھائی سے کچھ عرصہ کے لیے مانگے تھے۔

امام طحاوی کے حالاتِ زندگی کو شیخ محمد زاہد کوثری نے مستقل رسالے میں جمع کیا ہے اور اس رسالے کا نام "اَلْحَاوِي فِي سِيرَةِ الإِمَامِ الطَّحَاوِيِ" رکھا ہے۔ اس کے علاوہ شیخ مرحوم محمد یوسف بن محمد الیاس کاندھلوی، ثم دہلوی نے بھی (جو ہند میں تبلیغی جماعت کے رئیس تھے)، اپنی کتاب "أماني الأحبار في شرح معاني الآثار" میں آپ کے حالات ذکر کیے ہیں، اور امام طحاوی کی کتاب "شرح معاني الآثار" کی بڑی خوبصورت تعریف کی ہے۔

تمسک کرتے ہیں۔ اور ابن عبد البر مالکی تو اس جماعت کے سرخیل ہیں، ان کی دو کتابیں "الِاسْتِذْکار" (۸۴) اور "التَّمْہِیْد" ان کی یادگار کتب ہیں۔

بالجملہ، یہ تمام ائمہ ایسے ہیں جن کے اقوال معتمد علیہ ہیں اور ان کا کلام مرجع کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، ورنہ کتبِ حدیث کے شارحین کی تعداد تو اس قدر زیادہ ہے کہ ان کے اور ان کی کتب کے، صرف نام شمار کرنا بھی بہت مشکل ہے، اور ان میں سے ہر ایک کی شان نرالی ہے۔ لیکن (یہ متاخر شارحینِ حدیث) گوناگوں خصوصیات کے حامل ہونے کے باوجود ائمہ متقدمین ہی سے اخذ کرتے ہیں۔ اور اگر کسی کو ان متقدمین کی جماعت کی کتابیں مل جائیں، تو متاخرین کی تشویش ناک ابحاث اور دین میں ان کے بودے تکلفات کی حقیقت واضح ہو جائے گی، اور وہ ان ابحاث کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائیں گے۔

اور احادیث کے معانی سمجھنے اور ان میں تعارض دور کرنے کے موضوع پر شیخ شاہ ولی اللہ (۸۵) محدث دہلوی رحمہ اللہ کے قواعد بڑے عجیب اور فوائد بڑے انوکھے ہیں اور مختلف الحدیث کے موضوع پر "کِتَابُ الْمُغِیْث" بہت اچھی اور اس باب میں قابل تقلید نمونہ قرار دیے جانے کے لائق ہے۔

---

۸۴ : الاستذكار لمذاهب أئمة الأمصار وفيما تضمنه الموطأ من معاني الرأي والآثار، اور التَّمهيد لما في الموطأ من المعاني والأسانيد. ابن حزم نے کہا ہے:

"ہمارے شیخ ابو عمر کی ایک کتاب "التمہید" ہے۔ فقہ الحدیث پر جس قدر بہترین کلام اس کتاب میں کیا گیا ہے اس جیسی کوئی دوسری کتاب میرے علم میں نہیں ہے۔ اور جب اس جیسی نہیں ہے تو اس سے بہتر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ موصوف کی کتاب: "الاستذکار" مذکورہ بالا کتاب "التمہید" ہی کا اختصار ہے۔ آپ کی دوسری کئی تالیفات بھی ہیں، کہ جمع معانی میں ان کی مثل کوئی کتاب نہیں ہے۔

۸۵ : شیخ ولی اللہ دہلوی فقہاء محدثین میں سے تھے۔ چنانچہ آپ نے خود "الجزء اللَّطيف في ترجمة العبدِ الضَّعيف" نامی اپنے رسالے میں کہا ہے:

"اس فقیر نے مذاہب اربعہ اور ان کے اصولِ فقہ کے سمندر میں بہت گہری غوطہ زنی کی ہے۔ مزید برآں ان احادیث میں بھی خوب غور و فکر کیا ہے جو احکام میں ائمہ مذاہب کا مستدل اور متمسکات ہیں۔ اور غیبی نور کی تائید سے فقیر نے احادیث میں سے فقہاء محدثین کے طریق کو منتخب کر لیا"۔ آپ ہی اپنی ایک دوسری کتاب "الفوزُ الكبير في أصول التَّفسير" (ص ۵۲، كراچي مغربي پاكستان ۱۳۸۰ هج) میں رقم طراز ہیں:

"الحمد للہ، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے فقیر کو تمام فنون سے مناسبت حاصل ہے۔ اور میں نے فنون کے اکثر اصول اور ان کی فروع کی ایک بڑی مقدار کو حاصل کیا ہے۔ چنانچہ مجھے ہر باب میں اجتہاد فی المذہب کی طرح کا تحقیقی ذوق اور آزاد بلند نظری حاصل ہو گئی ہے۔ فیضِ الٰہی کے سمندر سے میرے جی میں مذکورہ بالا فنون کے علاوہ، تفسیری فنون میں سے دو یا تین فن خصوصاً القاء کیے گئے ہیں۔ اور اگر تم مجھ سے سچی بات پوچھو تو میں بلا واسطہ قرآن عظیم کا شاگرد ہوں، جیسا کہ میں حضرتِ رسالت مآب ﷺ کی ذاتِ اقدس، جو تمام فتوح کا منبع ہیں، کی روحِ انوار (سے استفادہ) کی وجہ سے اویسی ہوں۔ اور میں کعبہ مشرفہ سے بھی بلا واسطہ مستفید ہوا ہوں، جیسا کے بلا واسطہ نماز جیسی نعمتِ عظمیٰ سے متأثر ہوں۔ ......

ولو أن لي في كل منبت شعرة لساناً لما استوفيتُ واجِبَ حَمدِه

ترجمہ: اگر میرے ہر بنِ مو میں ایک زبان ہوتی، اور میں ہر زبان سے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا، تو بھی اس کی شان کے لائق واجب ادائیگی شکر ادا نہ کر سکتا۔

اسی لیے آپ کے شیخ اجل ابو طاہر محمد عبدالسمیع کردی مدنی (ت ۱۱۴۵ھ) فرمایا کرتے تھے: یہ تو مجھ سے سنداً الفاظ حاصل کرتا ہے، اور میں اس سے معانی و مفہوم کی تصحیح کرتا ہوں۔

شیخ کردی نے آپ کو جو اجازتِ روایت یہ کہہ کر:

"وعند ما تشرّفتُ بلقائه، وأشرقت أضواء وفائه، فإنّه طلب مني أمرا، هو أحرى أن يقتبس من مشكاته وسني شهباته".

دی ہے، اس میں آپ سے ملنے کو "شرفِ ملاقات حاصل ہونا" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

مزید شیخ کردی فرماتے ہیں:

میں چاہتا ہوں کہ وہ اشعار بھی لکھ دوں جو شیخ عبداللہ بن محمد بن ابی بکر عباس مغربی نے لکھے تھے، اور وہ اجازت جو انہوں نے میرے والد صاحب رحمہ اللہ کو دی تھی، اور اس وقت کہا تھا:

أجزتُك لكن مثلك من يُجيزني ولم يستفد مني ولكن يفيدني

ترجمہ: میں تمہیں اجازت دے تو رہا ہوں، لیکن آپ جیسے لوگ تو مجھے اجازت دیتے ہیں، کہ جنہوں نے مجھ سے کوئی استفادہ نہیں کیا، بلکہ میں نے ان سے استفادہ کیا ہے۔

ان تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ فقہاء محدثین میں شمار کیے جانے کے پورے حق دار ہیں۔ اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جنہوں نے آپ کو صرف حفاظ محدثین میں شمار کیا ہے، چنانچہ سید عبدالحیٰ کتانی فاسی (ت ۱۳۸۱ھ) اپنی کتاب "فهرس الفهارس والأثبات" (۲: ۴۳۸) میں رقم طراز ہیں:

میں کہتا ہوں: جو بات مجھ پر ظاہر ہوئی ہے، وہ یہ کہ آپ کا شمار بارہویں صدی کے حفاظ میں ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ نے احادیث کے لیے اسفار کیے، اور پھر آپ کی طرف سفر کیا جانے لگا۔ آپ نے حدیث روایت کی، تصنیف و تالیف کی۔ آپ کے اپنے اختیارات اور ترجیحات تھیں۔ آپ نے ہند میں علم کا بیج بویا۔ اس کا درخت اگا، اس پر پھل آئے، پھر ان میں ذائقہ پڑا، اور کھجوروں کی طرح پک جانے کے بعد مخلوق خدا نے اسے کھایا۔

پہلی جلد کی ابتدا میں (صفحہ ۴۹ پر) گذشتہ پروگرام میں ان کا تذکرہ ہم سے رہ گیا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے حالات جاننے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ جن لوگوں نے آپ سے علم حاصل کیا ہے، ان میں حافظ زبیدی بھی تھے۔ انہوں نے بلادِ عربیہ کے اسفار سے پہلے ہند میں آپ سے حدیث اخذ کی ہے۔

مذکورہ بالا نقل میں جو کچھ کتانی نے کہا ہے (یعنی یہ کہ شاہ صاحب صرف حافظ محدث تھے) وہ بلا دلیل ہے، لہٰذا، وہ قابلِ اعتماد بات نہیں ہے، اور نہ ہی اس کا کوئی بھروسہ ہے۔......

ایسے ہی جس نے سرے سے انکار کرتے ہوئے شاہ صاحب پر لفظ ''محدث'' کے اطلاق کو بھی ناجائز قرار دیا ہے، جیسے سید محمد صدیق حسن القنوجی، تو اس نے بھی حد سے تجاوز کیا ہے۔ چنانچہ قنوجی نے اپنی کتاب "سلسلة العسجد في ذكر مشايخ السند" میں کہا ہے:

''میں کہتا ہوں: یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ محدث کے نام کا استحقاق جہدِ بلیغ کے ساتھ طلب حدیث کے لیے لمبے سفر طے کرنے اور اس کے ٹھوکریں کھانے کا تقاضا کرتا ہے۔ اور ہر فقیہ، اور مشکاۃ المصابیح اور مشارق الانوار کا قاری ہرگز اس بات کا حق دار نہیں ہے کہ اسے ''محدث'' کے نام سے پکارا جائے۔ لیکن عامة الناس ان باریک فروق میں تمیز نہیں کرتے۔ جب وہ کسی شخص کو دیکھتے ہیں کہ وہ حدیث کی کسی کتاب کے درس وتدریس میں مشغول ہے تو اسے ''محدث'' کے نام سے پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ عوام الناس کی کوتاہی ہے، حدیث کا اشتغال رکھنے والی کی نہیں۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی مذہبِ حنفی کے فقیہ تھے۔ اور اسی قبیل (یعنی صرف حدیث کی کسی کتاب سے اشتغال رکھنے کی وجہ) سے انہیں ''محدثین'' میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اور ہمارے علم کے مطابق حضرت شیخ (یعنی عبد الحق محدث دہلوی) نے صحاح ستہ کو اہلِ اثر کے ہاں معتبر طریق کے موافق نہیں پڑھایا۔ اگرچہ انہوں نے تبرک کے لیے ان کتب کی اجازت حاصل کر رکھی تھی۔ بلکہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کی اولادِ امجاد کا مرتبہ ان سے بلند اور زیادہ ہے، اگرچہ یہ سب حضرات بھی اہلِ اثر کے معیار کے موافق تحدیث کے عالی معیار تک نہیں پہنچ پائے''۔

قنوجی کی اس عبارت پر تعجب بالائے تعجب ہے۔ انہی نے "أبجد العلوم" (ص ۸۷۷) میں اپنے شیخ کے شیخ، جناب قاضی شوکانی کے بارے میں:

"شيخنا الإمام العلامة الرباني، والسهيل الطالع من القطر اليماني، إمام الأئمة ومفتي الأمة، بحر العلوم، وشمس الفهوم، سند المجتهدين الحفاظ، فارس المعاني والألفاظ، فريد العصر، نادر الدهر، شيخ الإسلام، قدوة الأنام، علامة الزمان، ترجمان الحديث والقرآن، علَم الزُّهاد، أوحد العباد، قامع المبتدعين، آخر المجتهدين، رأس الموحدين، تاج المتبعين، صاحب التصانيف التي لم يسبق إلىٰ مثلها قاضي الجماعة، شيخ الرواية والسماعة، عالي الإسناد، السابق في ميدان الاجتهاد علىٰ الأكابر الأمجاد المطلع علىٰ حقائق الشريعة ومواردها، العارف بغوامضها ومقاصدها"

کہہ کر تعریف کے جو پُل باندھے ہیں، ان کا مبالغہ اور افراط ہونا محتاجِ بیان نہیں ہے۔

اس قدر مبالغہ کرنے کے باوجود بھی وہ راضی نہیں ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ: اس قدر مکھن لگانے کے بعد بھی تعریف کا حق ادا نہیں ہو پایا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ طیبی، ملا علی قاری، شیخ عبد الحق اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی طرح، علامہ شوکانی، فقہاء محدثین میں سے نہیں ہیں۔ اور اپنی جلالتِ شان کے باوجود بھی ان حضرت کے بلند مرتبے کو چھو نہیں سکے۔ ان کی نظر صرف چھلکے پر ہے، مغز تک ان کی رسائی نہیں۔ جب کہ شیخ عبد الحق اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، دونوں ہی فقہاء اور متقن محدثین میں سے ہیں۔ اور برعایتِ شرائطِ محدثین، تحدیث میں آپ کا قدم انتہائی راسخ ہے۔ دونوں حضرات صاحبِ ثبت ہیں، اور انہیں تلقی بالقبول الحسن حاصل ہے۔ اور قنوجی کے قلم سے جو کچھ نکلا ہے، وہ حنفیہ کی ضد میں ان کے تعصب کے سبب ہے، ورنہ کہاں زمیں اور کہاں فلک۔

حق تو یہ ہے کہ: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی قدر و منزلت علامہ طیبی جیسی ہے۔ اور علامہ محمد بن عبد الباقی زرقانی نے حافظ سیوطی سے علامہ طیبی کے حق میں جو کچھ نقل کیا ہے، بعینہ وہ سب شاہ صاحب پر بھی صادق آتا ہے۔ چنانچہ علامہ زرقانی (شرح الزرقاني علىٰ المواهب ......

...... اللدنیة" (٥: ٧٧، طبع مصر) میں کہتے ہیں:

''سیوطی نے کہا ہے: علامہ طیبی کو حدیث میں مہارت تھی، لیکن آپ حفاظ کے درجہ تک نہیں پہنچے۔ آپ کی منتہائے نظر صحاح ستہ، مسند احمد اور سنن دارمی تھی۔ چنانچہ آپ ان سے باہر نہیں نکلتے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ صاحبِ کشاف کسی معروف حدیث کو نقل کرتے ہیں، لیکن علامہ طیبی اس کی تخریج بھی اچھے طریقے سے نہیں کرتے، اور ان کتب میں موجود بالمعنی حدیث کی طرف عدول کر جاتے ہیں۔ اور یہ طرزِ عمل تخریج میں کمی رہ جانے کا آئینہ دار ہے''۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ظاہری و باطنی فضائل و کمالات، دقّت نظر اور گہرائی جیسی صفات کے جامع ہونے میں سلفِ صالحین جیسے تھے۔ چنانچہ اپنے بارے میں خود ہی رقم طراز ہیں:

''اس فقیر پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے اسے خلعتِ فاتحیت سے نوازا، اور اس فقیر کو جمع فقہ و حدیث، اسرارِ سنن اور احکام کے ساتھ ساتھ ان تمام چیزوں کی مصالح کا علم الہامی طور پر عطا فرما دیا، کہ جنہیں رسول اللہ ﷺ، اپنے رب سے لے کر آئے۔ حتیٰ کہ اس فقیر نے اہلِ سنت کے عقائد کو دلائل و حجج سے ثابت کر کے، اہلِ معقول کی گرد سے پاک کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس فقیر کو اِبداع، خلق، تدبیر، طول و عرض کے ساتھ تدلی اور انسانی نفوس کی استعداد کے تمام علوم عطا کیے۔ پھر اس فقیر کو حکمتِ علمیہ اور توفیق کے ساتھ ساتھ ابحاث کو کتاب و سنت سے مدلل کر کے مضبوط کرنا، علومِ نقلیہ کو محرف و مدخول باتوں سے واضح اور متمیّز کرنا اور ناپسندیدہ بدعات اور سنّتِ محمودہ میں فرق کرنا بھی وافر مقدار میں عطا کیا گیا''۔

شاہ عبد العزیز دہلوی اپنی کتاب "بستان المحدّثين في تذكرة كتب الحديث و المحدثين" میں رقم طراز ہیں:

ہمارے شیخ اور تمام علوم و امور میں ہمارے لیے قابلِ تقلید نمونہ، شیخ شاہ ولی اللہ دہلوی قدّس سرُّہ نے "الموطأ" بہ روایتِ یحییٰ بن یحییٰ اللیثی کی احادیث اور آثار کی دو شرحیں لکھی ہیں۔ اور اس میں سے امام مالک کے اقوال کے ساتھ بعض بلاغات کو بھی حذف کر دیا۔ ان شروح میں سے پہلی تو مجتہدین کے اسلوب پر ہے۔ یہ شرح فارسی زبان میں ہے، اور موصوف نے اس کا نام "المصفّٰی" رکھا ہے۔

دوسری شرح مختصر ہے، جس میں شیخ نے فقہاءِ حنفیہ اور شافعیہ کے مذاہب کو بیان کرتے ہوئے، بس بقدرِ ضرورت غریب الفاظ کی شرح اور مشکل الفاظ کے ضبط پر اکتفا کیا ہے۔ آپ نے اس شرح کا نام "المسوّى من أحاديث الموطأ برواية يحيىٰ بن يحيىٰ" رکھا ہے۔ یہ شرح عربی میں ہے''۔

میں کہتا ہوں: آپ کی کتاب "حجّةُ الله البالغة في أسرار الحديث وحكم الشرعية" کا موضوع اگرچہ اسرارِ شرعیہ اور اس کے معارف کا بیان ہے، مگر یہ کتاب گذشتہ پانچ مباحث سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ یہ کتاب مشکاۃ المصابیح کی احادیث کی شرح ہے، جس میں آپ نے ایسے محیر العقول اسرار و معارف کو بیان کیا ہے کہ جن کے اظہار سے متقدمین و متاخرین بھی عاجز نظر آتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسی فضیلت ہے جس میں کوئی ان کا ثانی نہیں ہے۔ آپ کی یہ کتاب آپ کے تنقیح شدہ علوم کی جامع اور آپ کی تصانیف میں سے بہترین ہے۔

سید عبد الحی حسنی اپنی کتاب "نزهة الخواطر" (٦ : ٤٠٢) میں رقم طراز ہیں:

''آپ کے بیٹے شاہ عبد العزیز نے امیر حیدر بلگرامی کو بھیجے جانے والے خط میں کہا ہے:......

والد صاحب کی کتاب "حجة الله البالغة" علمِ حدیث کے اسرار میں آپ کی تصانیف میں سے عمدہ ترین ہے۔ آپ سے پہلے اس فن میں، اس اسلوب سے کسی نے لب کشائی نہیں کی، کہ اصول بھی وضع کیے ہوں، فروع کی تفریع بھی کی ہو، مقدّمات ومبادی کی تمہید بھی باندھی ہو، اور پھر ان مقدمات سے مقصودی نتائج بھی اخذ کیے ہوں۔ اس علم کی کسی قدر خوشبو غزالی کی "إحياء العلوم" اور شیخ عز الدین عبدالسلام مقدسی کی "القواعد الكبرىٰ" میں سونگھنے کو ملتی ہے۔ اس علم کے بعض مزید فوائد، شیخ اکبر کی "الفتوحات المكية"، شعرانی کی "الكبريت الأحمر في علوم الشيخ الأكبر" اور ان کے تلمیذ شیخ کبیر شیخ صدر الدین قونوی قدس سرہ کی تالیفات میں ملتے ہیں۔ اور شیخ عبدالوہاب شعرانی نے "كتاب الميزان" میں ان سب کو جمع کر دیا ہے"۔

وليس على الله بمستنكر أن يجمع العالَم في واحِد

صدیق حسن خان قنوجی نے اپنی کتاب "أبجد العلوم المسمّى بالسّحاب المركوم في بيان أنواع الفنون وأقسام العلوم" میں کہا ہے:

علم تبيين المصالح المرعية في كل بابٍ من الأبواب الشّرعية:

یعنی: ابوابِ شرعیہ میں سے ہر باب میں جن مصالح کی رعایت کی جاتی ہے، یہ باب ان مصالح کی وضاحت کے بارے میں ہے۔

مذکورہ بالا عنوان ذکر کرنے کے بعد، یوں رقم طراز ہیں:

"اس علم میں شیخ اجل ولی اللہ بن عبدالرحیم عمری دہلوی (ت ۱۱۷۶ھ) کی کتاب "حجة الله البالغة" ہے۔ بہت کم علماء نے اس موضوع پر تصنیف کی یا اس کی بنیادیں اٹھانے میں غور وفکر کیا، یا اس کے اصول وفروع کو مرتب کیا ہے۔ اور بہت کم کسی نے اس موضوع پر ایسی تحریر کی ہے جو طبیعت کو سیر کر دے۔ اور اس موضوع میں کثرت کیسے ہو سکتی ہے، جب کہ ابوابِ شرعیہ کے اسرار کو وہی شخص جان سکتا ہے جو تمام علوم شرعیہ میں پوری طرح ماہر ہو، اور فنونِ الٰہیہ میں اخیر تک رسوخ حاصل کرنے کی وجہ سے منفرد ہو۔ اور ایسی صفائیِ مشرب اسی شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جس کے سینہ کو اللہ تعالیٰ نے علمِ لدنی کے لیے کھول دیا ہو، اور وہبی اسرار سے اس کا دل بھر دیا ہو۔ اور اس سب کے ساتھ وہ طبیعتاً ہی بلا کا ذہین اور فطرتاً ذہنی صلاحیتوں میں بہاؤ کا مالک ہو۔ تقریر میں ماہر، تحریر میں پختہ کار ہو۔ توجیہات اور خوش بیانی میں انوکھا ہو۔ یہ بھی جانتا ہو کہ اصول کیسے بنائے جاتے ہیں، اور ان کی بنا پر فروع کی تخریج بھی جانتا ہو، قواعد کی بنیاد رکھنے کا طریقہ پتہ ہو، اور پھر ان کے معقول ومسموع شواہد تک ان کی نظر ہو۔ میرے علم کے مطابق ایسا شخص کہ جسے اللہ تعالیٰ نے ان تمام صلاحیتوں سے نوازا ہو، صاحبِ حُجّہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ موصوف اس علم میں تالیف کرنے والے منفرد مصنف ہیں، اور آپ نے اس تالیف سے لوگوں کو دلائل وحجج کی راہ دکھا دی ہے۔ واللہ اعلم"۔

اپنی جلالتِ قدر اور علوم ومعارف میں بلند مرتبہ کے باوجود آپ سے بعض ایسے شذوذ اور زلاّت کا صدور ہوا ہے، جن سے احتراز واجب ہے۔ محدث ناقد شیخ محمد زاہد کوثری نے اپنی کتاب "حسن التقاضي" (ص ۹٦ طبع مصر ۱۳٦۸ھ) میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

"آخر میں مناسب سمجھتا ہوں کہ عالمِ خبیر شیخ احمد بن عبدالرحیم دہلوی رحمہ اللہ کے بارے میں چند باتیں اس وجہ سے گوش گذار کر دوں کہ آپ نے اپنی کتب میں بڑی سیلانیِ طبع اور جرأت کے ساتھ، اجتہاد اور تاریخ فقہ وحدیث کی مباحث سے بہت زیادہ تعرض کیا ہے، جب کہ آپ......

کے اندازِ فکر میں تکدُّر اور اجتہادی مباحث کی تصویر کشی میں خود رائی پائی جاتی ہے، حالانکہ ان موضوعات پر لکھی گئی متقدمین کی کتب کے بارے میں آپ کا دائرۂ اطلاع بہت تنگ، اور احوالِ رجال کے ساتھ ساتھ علوم و مذاہب کی تاریخ کے بارے میں آپ کا مطالعہ بھی بہت تھوڑا ہے۔ آپ اپنے مخصوص ذہنی سانچے اور خیال میں بہتے چلے جاتے ہیں، جس نے کئی ابحاث اور تقریرات میں آپ کو بہت دور پہنچا دیا ہے۔

آپ کی کتب حسن و جمال سے پُر ہیں اور ان میں کئی قسم کی فائدہ مند باتیں بھی ہیں۔ لیکن ان میں آپ کے بعض ایسے تفردات بھی ہیں جن کی متابعت ہرگز صحیح قرار نہیں دی جاسکتی، جس کی وجہ یہی ہے کہ آپ کے ہاں ایسا فکری اضطراب ہے جس سے آپ کسی موضوع کی تحقیق میں اصابتِ رائے سے ہٹ گئے ہیں، اور ان اقوال کی اتباع سے تابع اور متبوع دونوں ہی شطحیات کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اور کئی جگہوں پر تمہیں ان کی ایسی مسلسل عبارتیں مل جائیں گی جن کا اہل تحصیل کے ہاں کوئی حاصل نہ ہوگا۔ میں یہاں آپ کے فکری اضطراب کی طرف اجمالی اشارہ کر دیتا ہوں، تاکہ جس نے آپ کی زندگی کا گہرا مطالعہ نہیں کیا، وہ آپ سے پوری طرح واقف ہو جائے۔ اور جہاں تک آپ کے حد سے بڑھے ہوئے تفردات کا تعلق ہے، تو ان کا تفصیلی تجزیہ بھی خاص فراغت کا تقاضا کرتا ہے۔

ہندوستان میں علمِ حدیث کی ترویج میں آپ کی خدمات اور جد و جہد پر ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ لیکن جن مقامات پر آپ صواب رائے سے ہٹ گئے ہیں، بایں ہمہ جلالتِ علمی، آپ کا مرتبہ ہمیں ان مقامات کی نشان دہی سے سکوت کو مباح نہیں کرتا، چنانچہ میں کہتا ہوں:

آپ کی اعتقادی اور فروعی مسائل میں نشو و نما مذہبِ حنفیہ کے عین مطابق، اور توحیدِ شہودی کے قول میں عارف باللہ امام ربانی شیخ احمد بن عبد الاحد سرہندی کے مذاق پر ہوئی تھی۔ آپ نے اپنے دیار کے عرف کے موافق حدیث اور فلسفہ کا علم حاصل کیا۔ پھر حجاز کا سفر کیا اور مدینہ منورہ میں شیخ ابوطاہر بن ابراہیم کورانی شافعی سے صحاحِ ستہ پڑھیں اور ان کے ساتھ ایک عرصہ گذارا، اور ایک عرصہ تک ان کے والد کی کتب کا مطالعہ کرتے رہے، جن میں حشویہ، اتحادیہ، فلاسفہ اور متکلمین کی ایسی آراء کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی تھی جن میں آپس میں ایک دوسرے کو دولتیاں جھاڑی گئی تھیں۔ چنانچہ آپ فقہ و تصوف میں ان کے مذہب کی طرف مائل ہو گئے۔

اس کے بعد جب آپ ہندوستان واپس آئے تو تصوف، فقہ اور اعتقاد میں اپنے گھر والوں کے مشرب اور اپنے خانوادے کے مذہب سے منحرف ہو کر توحیدِ وجودی کی رائے کے حامل ہو چکے تھے۔ اور بزبانِ حال آپ کہہ رہے تھے:

عقَدَ الخلائقُ في الإلٰه عَقَائدًا ☆ وأنا اعتقدت جميع ما اعتقدوه

چنانچہ اس واپسی کے بعد جب آپ نے فقہی مذاہب میں اپنی آراء کی دعوت، اور حشویہ، فلاسفہ اور وحدت الوجود کے قائلین کی آراء کو جمع کرنے کی کوشش شروع کی، اور اکابر کا عقیدہ سمجھتے ہوئے، صورتوں میں تجلی اور مظاہر میں ظہور کے قول کو پھیلانے جیسی کوششوں میں ہمہ تن مصروف ہوئے، تو مسلمانوں کی وحدتِ کلمہ پارہ پارہ ہونے لگی۔ حالانکہ عقائد کے بارے میں حشویہ و فلاسفہ وغیرہم کی آراء حلول کا قائل ہو جانا ہی ہے۔ چنانچہ اربابِ عقول میں سے بلند پایہ اہلِ علم کے ہاں ایسے اقوال کو کوئی توجہ ہی نہیں دی گئی۔ عہدِ قدیم میں ایسے کمزور اقوال کے بہت سے نظائر موجود ہیں۔

آپ کے نواسے کی ایک کتاب "عبقات" ہے، جس میں انہوں نے گندھی مٹی میں مزید پانی ملا کر، رہتی دنیا تک کے لیے، کلمۂ ملت کو پارہ پارہ کر کے لامذہبیت اور حشویت کے فروغ کے ساتھ ساتھ اصول و فروع میں حنفیت کو نظر انداز کرنے اور ان سے لڑتے جھگڑتے رہنے کی......

......داغ بیل ڈال دی۔ چنانچہ اب دیارِ ہند یہ میں لا مذہبیت کا پودا نشوونما کے ساتھ بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ اگر چہ ان کے دادا جان (یعنی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ) نے بعد میں اپنے بعض مبشرات کی وجہ سے، جسے انہوں نے "فیوض الحرمین" اور "تفہیمات الإلٰهیة" میں ذکر کیا ہے، مذہب معین کی طرف رجوع کر لیا تھا۔ (مزید دیکھیے: "فیض الباري" کا مقدمہ: ص ۲۴)۔

اور دادا (یعنی شاہ ولی اللہ دہلوی) احادیث کے اصولِ ستہ کے متون کا بہت اہتمام کرتے تھے، لیکن ان کی اسانید پر نظر کیے بغیر صرف متون ہی پر اکتفا کر لیتے تھے۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ صرف متون پر ہی اقتصار کر لیا جائے تو تمام متونِ حدیث صرف ایک جلد میں سمٹ سکتے ہیں۔ لیکن اہلِ علم کو اس بات کی ضرورت ہوا کرتی ہے کہ وہ فروعی مسائل میں متونِ احادیث کی سند کو بھی دیکھیں، خواہ وہ حدیث صحیحین میں کیوں نہ ہو، چہ جائیکہ سننِ اربعہ۔ اہلِ علم کا معروف طریقہ یہی ہے۔ جب فروع میں اس قدر احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، تو عقیدے کے ابواب میں اسانید سے قطع نظر کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ اسناد کو دیکھے بغیر، صحاح ستہ کے صرف متون پر اکتفا کر لینے ہی کی وجہ سے موصوف کو مذاہبِ فقہاء اور ائمہ کی مسانید کے بارے میں خود رائی کی جرأت ہوئی۔ لیکن یہ تو بس ایک ہوائی قلعہ ہے جو اس لائن کے اہلِ تحقیق و تاریخ کے سامنے پر کاہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔

آپ کے عجیب و غریب تفردات میں سے یہ بھی ہے کہ: آپ انشقاقِ قمر کے معجزے کے بارے میں کہتے ہیں کہ: وہ تو بس دیکھنے والوں کو یوں نظر آیا تھا۔ حالانکہ نظر بندی اللہ کے رسولوں صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَ سَلَامُه علیهم أجمعین کے شایانِ شان ہرگز نہیں ہے۔

ایسے ہی اخبار و آثار میں وارد شدہ کئی باتوں کو آپ ایسی صورتوں پر محمول کرتے ہیں جو عالمِ تخیُّل پر مبنی ہیں۔ اور اس عالم کو عالمِ مثال کا نام دے کر کہتے ہیں کہ اس میں معانی اجسام کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جو کہ بعض ایسے متصوفہ کا خیال ہے جنہوں نے یہ باتیں افلاطونی مثالوں سے اخذ کی ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ عالمِ خیال ایک ایسی چیز ہے جس کا شرع اور عقل میں کوئی وجود نہیں ہے۔ چنانچہ ایسی علمی مشکلات کے حل کو اس عالم پر محمول کر دینا، مسائل کو محض خیالی چیز پر محمول کر دینا ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو نامعلوم عالمِ مثال کے کھاتے میں ڈال دینے سے ان آثار کے معانی کی نفی کر دینا ہی لازم آ جاتا ہے۔ حالانکہ کسی بات کو ایسی چیز پر محمول کرنا جسے صدرِ اول کے مخاطبین کی فہم قبول نہ کر سکتی ہو، محض ہلاکت اور گمراہی ہی ہو سکتا ہے۔

چنانچہ حلِ مشکلات کا صرف یہی راستہ بچتا ہے کہ اسانید اور اس کے رجال کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ ائمۂ مبرزین کے ہاں معتبر وجوہِ دلالت کو دیکھا اور ان میں غور و فکر کیا جائے۔

موصوف کے مزید تفردات اور اخطاء میں سے یہ بھی ہے کہ: آپ چشمۂ صافی سے قریب تر اور متقدم کی روایت کو گدلا خیال کر لیتے ہیں، جب کہ گدلے گھاٹ سے پیاس بجھانے والے متاخر کی روایت کو صاف شفاف سمجھ لیتے ہیں۔ اور یہ بھی ہے کہ آپ علم میں روایۃً اور درایۃً ماہر اہلِ مذہب علماء، خواہ وہ کتنی ہی قدر و منزلت کے حامل ہوں، کے بیان کردہ ایسے مضبوط و مستحکم اصولوں، کہ جنہیں اپنانے سے متاخرین کی مخالفت ممکنہ حد تک کم ہو سکتی ہو، اور وسعتِ اطلاع سے کورے، ناتجربہ کاروں کے بیان کردہ کثرتِ اضطراب سے بھرے ہوئے ایسے اصولوں، جو کہ مذہب کے پابند متاخر علماء کی بہت زیادہ مخالفت کو مستلزم ہوں، کے درمیان تمیز بھی نہیں کر پاتے۔

انہی قابلِ گرفت باتوں میں سے آپ کا اصولِ مذہب میں تحکُّم اور دھونس جمانا اور یہ کہنا ہے کہ: ایسا تو متأخرین کے ہاتھوں بھی ہوا ہے۔

مزید برآں آپ کا خبرِ واحد کے ذریعے نص پر زیادتی کرنا بھی اسی صف میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی موصوف نے اس......

.....موضوع پر امام شافعی کا امام محمد رحمہما اللہ سے ہونے والا مناظرہ بھی ذکر کیا ہے، جو ایک تو ان کے مذکورہ بالا دعوے کی نقیض ہے، اور دوسرے اس کے بھی بالکل خلاف ہے جس کو ایک لحظہ قبل ہی مستحکم و مضبوط بنا رہے تھے۔ یہ سب باتیں اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ آپ باتوں کی تہہ تک کتنا پہنچ پاتے تھے۔ اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا دائرۂ اطلاع بہت چھوٹا تھا، اور متقدمین کی ان کتب کے بارے میں آپ کو کچھ خبر نہیں تھی جن میں ہمارے ائمۂ قدماء سے منقول مذہب کے اصول جا بجا پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ کو عیسیٰ بن ابان کی "الحجج الكبير" اور "الحجج الصغير"، ابوبکر رازی کی "الفصول في الأصول"، اتقانی کی "الشامل" اور کتبِ ظاہر الروایۃ کی شروح کی اطلاع کہاں ہو سکی ہوگی؟ حالانکہ ان کتب میں ہمارے ائمہ سے منقول، مذہب کے بہت سارے اصول موجود ہیں۔ چنانچہ اس موضوع میں آپ پر اعتماد کرنا بالکل صحیح نہیں ہے۔

اس کے علاوہ آپ کی قابلِ مؤاخذہ باتوں میں سے ایک آپ کا "قِدَمِ عالَم" کا قائل ہونا بھی ہے۔ جیسا کہ محقق کشمیری نے "فيض الباري" کی کتاب "بدء الخلق" میں شاہ صاحب کے بعض رسائل سے اسے نقل بھی کیا ہے۔ اور یہ انتہا درجے کی خطرناک بات ہے۔

اور تعجب بالائے تعجب تو یہ ہے کہ: انہوں نے اپنے اس موقف پر، سنن ترمذی میں موجود، ابو رزین کی "عماء" والی حدیث سے استدلال بھی کیا ہے۔ اور حدیث کے راوی نے اس کا جو معنیٰ بیان کیا ہے، اس سے بالکل اعتناء نہیں کیا۔

مزید یہ کہ: اس حدیث کی سند میں "حماد بن سلمہ" اور "وکیع بن حدس" ہیں۔ حماد کے ہاں تو اختلاط پایا جاتا ہے۔ ان کے دونوں سوتیلے بیٹوں نے تشبیہ کے بارے میں اباطیل کو ان کی کتب میں جیسے جی چاہا، داخل کر دیا۔ اور امام بخاری نے ان سے بالکلیہ، جب کہ امام مسلم نے ثابت کے علاوہ دوسروں سے مروی روایات میں پرہیز کیا ہے۔ اس کا شیخ یعنی "یعلیٰ بن عطاء" کوئی اتنا خاص قوی راوی نہیں ہے۔ اور "وکیع بن حدس"، یا "عدس" (علی اختلاف الآراء) مجہول الصفۃ آدمی ہے۔ اور اس جیسے آدمی کی روایت سے عورتوں کے حیض کے مسائل میں بھی احتجاج درست نہیں ہے، تو اس جیسے آدمی کی خبر میں اتنی قوت کہاں سے آ گئی کہ عقائد کے باب میں، اللہ تعالیٰ کے لیے مکان ثابت کرنے، یا اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتب کے بالکل منافی قِدَمِ عالَم کے عقیدہ کے اثبات کے لیے حجت بن سکے۔

حدیث نبوی کے بارے میں جس شخص کی بضاعتِ علمی اس قدر ہو، احکام کے دلائل کے باب میں اس شخص سے فیصلہ کیسے کروایا جا سکتا ہے؟ ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ: آپ بعد میں اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ گئے تھے، اور ان مبشّرات کی وجہ سے، جنہیں مدینہ منورہ میں دیکھا تھا، آخر میں جادۂ حق کی طرف لوٹ آئے تھے۔ چنانچہ اپنی کتاب "فيوض الحرمين" (ص ٤٨) میں رقم طراز ہیں:

"مجھے رسول اللہ ﷺ نے یہ بات جتلا دی تھی کہ مذہب حنفی بہت مرتب، باسلیقہ اور پسندیدہ مذہب ہے۔ اور یہ سنت کے طرق کے سب سے زیادہ موافق ہے ...".

بہر حال، جو لوگ شاہ صاحب کی کتابوں "الإنصاف"، "عقد الجيد"، اور "حجة الله البالغة" وغیرہ کے حوالے دے دے کر مذہب حنفی کو منہدم کرنے کی سعی کر رہے تھے، ان کی تمنا خاک میں مل گئی۔ اس مقام پر، ان کی شطحیات پر متنبہ کرنے کے لیے انہی سرسری اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیقِ ارزانی ملے تو کسی دوسری فرصت میں اس بکھری پھیلی بحث کے بارے میں آراء کی چھان بین کی

جائے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ.

صحیح اور سقیم میں سے کسی ایک صحیح کی تمیز کا ملکہ، مستقیم ذہن، سلامتِ طبع، غلطی کی طرف طبیعت کا میلان نہ ہونا اور تھوڑی سی تنبیہ اور اشارے سے ہی صحیح بات کو قبول کر لینا ایسی صفات ہیں جو نعمتِ عظمیٰ، دولتِ کبریٰ اور بہت بڑی عطاء ہیں۔ دنیا میں علم کے گھاٹ تو بہت سے ہیں، لیکن جو چیز نہایت ہی نادر ہے وہ مذکورہ بالا ملکہ کا حاصل ہونا ہے، کہ یہ تو بالکل ہی کبریتِ احمر ہے۔ شعر:

رَسَائِلُ إِخْوَانِ الصَّفَاءِ كَثِيْرَةٌ وَلٰكِنَّ إِخْوَانَ الصَّفَاءِ قَلِيْلُ (۸۶)

اہل صفا (یعنی صاف باطن والوں) کے رسائل تو بہت سے ہیں، لیکن خود اہل صفا (یعنی صاف باطن والے) بہت ہی تھوڑے ہیں۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "مِرْقَاةُ الْمَفَاتِيْحِ" میں جمیع شروح وحواشی کو جمع کر دیا ہے، اسی لیے ان کی یہ شرح حدیث کے معارف ومسائل کی فہم اور اس میں رسوخ حاصل کرنے کے لیے تمام کتابوں کی جامع اور نافع ترین شرح شمار کی جاتی ہے۔

ہمارے پیشِ نظر یہاں ایک تو یہ ہے کہ علماء متاخرین نے اپنی کتب میں انتخابِ احادیث اور ان کی تبویب کا جو کام کیا ہے اسے سامنے لائیں۔ اور دوسرے وہ انتہائی عظیم الشان کام جو علامہ بغوی نے "مَصَابِيْحُ السُّنَّةِ" کے نام سے کیا اور خطیب عمری نے اس کی اصلاح واستدراک کے بعد اس کا نام "مِشْكَاةُ الْمَصَابِيْحِ" رکھا ہے، ان کے بارے میں اور ان دونوں کتابوں (یعنی مَصَابِيْحُ السُّنَّةِ اور مِشْكَاةُ الْمَصَابِيْحِ) کے بارے میں بتائیں۔ مزید برآں ملا علی قاری رحمہ اللہ کی شرح کی کچھ ایسی خصوصیات ذکر کریں جو اس کتاب کا امتیاز ہیں۔ اس قدر تفصیلی گفتگو اس لیے ناگزیر ہے تاکہ علماء متاخرین کی امتیازی خدمات عموماً، اور ملا علی قاری کی امتیازی خدمات خصوصاً نکھر کر سامنے آجائیں۔

ہم کہتے ہیں کہ مسانید اور ابوابِ فقہ کی صورت میں سنت کی تدوین، اور کتابی صورت میں جمعِ حدیث کے فوراً بعد کے زمانے میں حدیث کی ترتیب وتہذیب کا عظیم کام وقوع پذیر ہوا، اور اسی کے ساتھ متقدمین کا زمانہ گزر گیا۔ بعد ازیں پانچویں صدی شروع ہوئی جو کہ متاخرین کے زمانے کی ابتدا ہے۔ اس دور میں مشرق ومغرب سے روایت ودرایت کے ماہر فقہاء محدثین کی ایسی جماعتیں اٹھیں جنہوں نے تلخیصِ متون اور خوبصورت انداز میں ان کی کانٹ چھانٹ کا کام کیا۔ اور اپنی ان خدمات میں انوکھی طرز، حسنِ ترتیب، تہذیب واختصار، استنباطِ احکام اور شرح غریب کے علاوہ ان تمام عصری تقاضوں کو مدِّ نظر رکھا، جن کی رعایت، زمانے کے کروٹ لینے کی وجہ سے ضروری ہو جایا کرتی ہے۔ چنانچہ تدوین وتہذیب حدیث کے اس تاریخی موڑ پر وہ محدثین تمام ضروری اور مناسب تدبیروں کو بروئے کار لائے۔ اور اس نہج پر تدوینِ حدیث کا کام تسلسل سے جاری رہا۔

خدمتِ حدیث کے جویا، ماہر محدثین میں سے ایک ایسی جماعت سامنے آئی جنہوں نے امام بخاری اور امام مسلم کی دونوں کتابوں کو جمع کیا، اور انہوں نے ان کی کتابوں کے ابواب کی ترتیب چھوڑ کر، انہیں مسانید پر مرتب کیا، جیسا کہ ابو مسعود ابراہیم بن محمد دمشقی (ت ۴۰۱ھ) اور ابو عبد اللہ محمد بن ابی نصر حمیدی (ت ۴۸۸ھ) نے یہ کام کیا ہے۔

---

۸۶ : دیکھیے: "الحطّة في ذكر الصحاح الستة، للقنوجي" (ص ۵۸، المطبعة النظامية، كانهور، هند ۱۲۸۳هج)

اور انہیں محدثین میں سے ایسے بھی ہوئے ہیں جنہوں نے اصول ستہ (یعنی تین صحیح کتابیں: بخاری، مسلم اور موطأ، اور تین سنن: یعنی سنن ابو داؤد، سنن ترمذی اور سنن نسائی) کو جمع کیا۔ اور یہ کام ابو الحسن رزین بن معاویہ عبدری اندلسی (ت ۵۳۵ ھ) نے اپنی کتاب "التَّجْرِيْد لِلصِّحَاحِ وَالسُّنَنِ" میں کیا ہے۔

اور انہیں محدثین میں ایسے بھی ہوئے ہیں جنہوں نے آداب واخلاق اور ترغیب وترہیب کی احادیث کو جمع کیا، جیسے امام اسماعیل بن محمد اصبہانی (ت ۵۳۵ ھ) اور حافظ عبد العظیم منذری (ت ۶۵۶ ھ)۔

اور انہیں محدثین میں سے ایسے بھی ہوئے ہیں جنہوں نے احادیث کو اوائل کلمات میں آنے والے متشابہ حروف کی ترتیب پر مدون کیا ہے، جیسا کہ قاضی ابو عبد اللہ محمد بن سلامہ قضاعی شافعی (ت ۴۵۴ ھ) نے اپنی کتاب: "شَهَابُ الأَخبَارِ فِي الحُكمِ وَالآدَابِ" میں، اور امام ابو العباس احمد بن معدّ أقليشي (ت ۵۵۰ ھ) نے اپنی کتاب: "النَّجْمُ مِن كَلَامِ سَيِّدِ العَرَبِ وَالعَجَم" میں کیا ہے۔ مؤخر الذکر نے اپنی کتاب کو دس ابواب پر مرتب کیا ہے، اور دسواں باب نبی اکرم ﷺ سے منقول اَدعیہ کے بیان کے لیے مختص کیا ہے۔ مزید اس موضوع پر علامہ حسن بن محمد صغانی لاہوری (ت ۶۵۰ ھ) نے "مَشَارِقُ الأنوَارِ النَّبَوِيَّة" مرتب کی ہے۔

اور ان محدثین میں سے ایسے بھی ہوئے ہیں جو احادیث کو اخلاق وصفات کے اعتبار سے لائے ہیں، جیسے امام محی الدین ابو زکریا یحیٰی ابن شرف النووی (ت ۶۷۶ ھ) نے اپنی کتاب "رِياضُ الصَّالحين" میں کیا ہے۔

اور انہی محدثین میں ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے احکام کی احادیث کو یکجا کرنے پر اکتفا کیا ہے، جیسا کہ حافظ علامہ عبد الحق بن عبد الرحمٰن ازدی اشبیلی مالکی معروف بابن خرّاط (ت ۵۸۱ ھ) نے اپنی کتاب "الأحكامُ الصُّغرىٰ" میں اور شیخ تقی الدین عبد الغنی بن عبد الواحد مقدسی (ت ۶۰۰ ھ)، اور شیخ الاسلام مجد الدین عبد السلام بن عبد اللہ الحرانی (ت ۶۷۱ ھ) نے اپنی کتاب: "المُنْتَقىٰ مِنَ الأحكَامِ الشَّرعِيَّةِ مِن كَلَامِ خَيرِ البَرِيَّة" میں کیا ہے۔

اور انہی محدثین میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے ازمنہ اور اوقات کے اعتبار کے احادیث کو جمع کیا ہے، جیسا کہ امام نووی نے اپنی کتاب: "الأَذْكَارُ المُنْتَخَبَةُ مِن كَلَامِ سَيِّدِ الأَبرَارِ ﷺ" میں کیا ہے۔

اور انہی محدثین میں سے ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے متفرق ابواب جیسے عقائد، احکام، سِیَر، آداب، فتن، اشراط ساعت اور مناقب کی احادیث کا استخراج کیا ہے جیسا کہ امام محی السنہ محدث فقیہ شیخ حسین بن مسعود فرّاء (ت ۵۱۶ ھ) نے اپنی کتاب "مَصَابِيحُ السُّنَّة" میں کیا ہے۔

اور انتہائی افسوس کی بات ہے کہ ان جہابذہ محدثین نے اپنی محنتوں کے دائرہ کار کو حدیث نبوی کی کسی ایک خاص نوع کے ساتھ مخصوص کر لینے پر اکتفا کر لیا۔ اور اگر چہ ان کتب کی شرح وتشریح کا بیڑہ بڑے علماء نے اٹھایا، لیکن اس تحدید کی وجہ سے ان کی کتب کا رواج اور چلن صرف ایک محدود اور مختصر دائرے تک محدود ہی رہا۔ بخلاف ان متقن محدثین کی کتابوں کے، جنہوں نے کسی ایک نوع کو چھوڑ کر کسی نوع کی تقیید، یا ایک صنف کو چھوڑ کر دوسری صنف کی تخصیص کیے بغیر، عوامی صورت میں پیش کر کے، حدیثِ نبوی کی بنیادوں کو استوار

کیا۔ اور حدیث شریف کے باب میں ان کی شہرت اور ان کی کتب کے پھیلاؤ کا راز، ان کی یہی عمومیت اور ہمہ گیریت تھی۔

چنانچہ اس عمومی طرز پر کام کرنے کے سلسلے میں سب سے پہلے، اور سب سے مشہور محدث محی السنۃ امام محدّث فقیہ حسین بن مسعود فرّاء بغوی ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب "مَصَابِیْحُ السُّنَّۃ" میں متفرق ابواب سے احادیث کا انتخاب کیا ہے اور اسے بہت ہی بھلے اور خوبصورت نظم ونسق اور دلچسپ طرز سے ایسے مرتب کیا ہے کہ یہ کتاب دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے اور اہل فراست کی نگاہوں کو بھلی لگتی ہے۔ اس کتاب کے بعد جتنی بھی کتب نے شہرت پائی ہے یا تو اسی کے اختصار کی وجہ سے پائی ہے، یا کسی اور طرز کی وجہ سے پائی ہے تو وہ "مَصَابِیْحُ السُّنَّۃ" کے نہ تو برابر ہو سکتی ہیں اور نہ اس کے قریب۔

آئندہ سطور میں محی السنۃ علاّمہ بغوی نے اس بارے میں جو لکھا ہے، وہ ملاحظہ کیجیے۔ فرماتے ہیں:

یہ کتاب ان الفاظ کا مجموعہ ہے جو علوم ومعارف سے پُر سینۂ نبوی ﷺ کے چشمہ سے ابلے ہوئے ہیں، اور ان سنتوں کا بیان ہے جن کا منبع چشمۂ رسالت ہے، اور یہ سید المرسلین اور خاتم النبیین ﷺ سے مروی احادیث کا مجموعہ ہے۔ یہ احادیث گھٹا ٹوپ اندھیرے کے لیے چراغ (۸۷) ہیں، جو تقوی وطہارت کے طاقچہ سے نکلی ہیں۔ اور ان کا ماخذ ائمہ محدثین کی وہ کتب ہیں جن میں انہوں نے ان احادیث کو (سند کے ساتھ) درج کیا ہے۔ میں نے اس مجموعۂ احادیث کو عبادت کے لیے یکسو ہو جانے والے لوگوں کے لیے جمع کیا ہے، تاکہ یہ ان لوگوں کے لیے اللہ تعالی کی کتاب کے بعد سنت کا ذخیرہ بنے۔ اور جس اطاعت میں وہ مشغول ہوئے ہیں، اس میں ان کا مددگار ہو۔

میں نے اس مجموعے میں احادیث کی سندوں کا ذکر ایک تو اس لیے نہیں کیا کہ کتاب لمبی نہ ہو جائے، اور دوسرے اس لیے کہ میں نے ان ائمہ کی نقل پر اعتماد کیا ہے جنہوں نے ان احادیث کو اپنی کتابوں میں سند کے ساتھ درج کیا ہے۔ اور بعض جگہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کرنے والے صحابی کا نام کسی ضرورت کی وجہ سے درج کر بھی دیا ہے۔ اور تم دیکھو گے کہ: ہر باب کی احادیث دو قسم کی

---

۸۷ : مصطفیٰ بن عبداللہ حاجی خلیفہ (ت ۱۰۶۷ھ) نے اپنی کتاب "كشف الظنون عن أسامي الكتب والفنون (۲: ۱۶۹۸ طبع استنبول ۱۳۶۲ھج) میں کہا ہے:

کہا گیا ہے کہ: مؤلف نے اس کتاب کا نام "المصابیح" نہیں رکھا تھا بلکہ غلبۂ استعمال کی وجہ سے یہ نام اس کا علم بن گیا تھا۔ جس کی صورت یہ ہوئی کہ: آپ نے ابتداءِ کتاب میں خطبہ اور "أمّا بعد" کہنے کے بعد:

"إن أحاديث هذا الكتابِ مصابيحُ ..."

(کہ اس کتاب کی احادیث چراغ ہیں ...) کہا تھا۔

اس کتاب میں مذکورہ احادیث کی تعداد چار ہزار چار سو چوراسی حدیثیں ہے۔ ان میں سے حسن درجے کی احادیث دو ہزار پچاس حدیثیں ہیں۔ "ابن ملک"۔

نوٹ: صاحب مرقات (۱۰:۱) کا کہنا ہے کہ: کہا گیا ہے کہ: اس کتاب کی احادیث کی تعداد چار ہزار چار سو چونتیس حدیثیں ہے۔

ہیں۔ایک تو صحاح اور دوسری حسان۔

صحاح سے میری مراد وہ احادیث ہیں جنہیں شیخین یعنی ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل جعفی بخاری، اور ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیری نیشاپوری - رحمہما اللہ تعالی - نے اپنی اپنی جامع اور صحیح میں درج کیا ہے، یا ان میں سے کسی ایک نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔

اور حسان سے میری مراد وہ احادیث ہیں جنہیں ابوداود سلیمان بن اشعث سجستانی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ ترمذی وغیرہ ائمہِ حدیث نے اپنی اپنی تصانیف میں درج کیا ہے۔(۸۸)

---

۸۸ : یہ مزید ایک ایسی اصطلاح ہے جو انہی کے ساتھ خاص ہے۔علامہ محمد بن اسماعیل امیر (ت۱۱۸۲ھ) نے اپنی کتاب "توضیح الأفكار لمعاني تنقيح الأنظار" (۱ : ۱۱٦، طبع قاهرة ١٣٦٦هج) میں کہا ہے:

''صحیح اور حسن حدیث کے بارے میں، "المصابیح" میں بغوی نے ایک خاص اصطلاح استعمال کی ہے۔چنانچہ انہوں نے کہا ہے کہ: صحیح حدیث وہ ہے جسے شیخین نے، یا ان میں سے کسی ایک نے اپنی کتاب میں روایت کیا ہو۔اور حسن وہ حدیث ہے جسے ان کے علاوہ دوسرے محدثین نے روایت کیا ہو۔حافظ ابن صلاح اور نووی وغیرہ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ: صحاح کو شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی کتب میں مروی شدہ احادیث کے ساتھ خاص کرنا، اور حسان کو امام ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی کی روایت کردہ احادیث کے ساتھ خاص کرنا ایک ایسی اصطلاح ہے جو معروف نہیں ہے۔بلکہ یہ صواب کے خلاف بھی ہے۔اس لیے کہ علمِ حدیث کے ماہرین کے نزدیک ''حسن'' ان احادیث سے عبارت نہیں ہے، جنہیں انہوں نے ذکر کیا ہے۔اس لیے کہ کتبِ سنن میں بہت سی صحیح احادیث بھی موجود ہیں، اور بہت سی ضعیف روایات بھی موجود ہیں''۔

تاج تبریزی نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ: یہ اعتراض بھی عجیب ہے۔اس لیے کہ اربابِ علومِ نقلیہ وعقلیہ کے ہاں یہ مشہور اور طے شدہ اصول ہے کہ: اصطلاح میں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔اس لیے اب کسی شخص کی اصطلاح کا تخطئہ کرنا صواب طریق سے بہت دور ہے۔

اور ان کے علاوہ دوسرے بعض محدثین جیسے حاکم اور خطیب ہیں، انہوں نے اس کے لیے ایک اور اصطلاح اختراع کی ہے۔چنانچہ انہوں نے سنن ابوداود، اور سنن نسائی میں موجود تمام احادیث پر صحت کا اطلاق کیا ہے۔اور سنن نسائی کے بارے میں ان حضرات کی موافقت ایک جماعت نے کی ہے، جن میں ابوعلی نیشاپوری، ابواحمد بن عدی اور دارقطنی ہیں''۔

ابنِ حجر ہیتمی کی فہرست کی منتخب عبارت مکمل ہوگئی۔

میں نے یہ تمام تفصیل اس لیے نقل کی ہے تاکہ دیکھنے والا ترمذی کی تصحیح، بغوی کی تحسین یا مصنف وغیرہ کے بتائے ہوئے معنی کے اعتبار سے صحیح احادیث کی تحسین پر رک کر یہ گمان نہ کر بیٹھے کہ: یہ سب ایسی احادیث ہیں جن کی تصحیح ائمہ میں سے ایک امام نے کی ہے۔بلکہ ہر اس امام کی اصطلاح کا جاننا ضروری ہے جس نے ان سے پہلے بھی احادیث کو صحیح یا حسن کہا ہے۔

یہ علیحدہ بات ہے کہ تبریزی نے علامہ بغوی پر جو اعتراض کیا ہے، اس کا تعقب حافظ ابن حجر (ہیتمی) نے خوب کیا ہے۔اور ان کا مقصد اس سے یہی ہے کہ: یہ پتہ چل جائے کہ علامہ بغوی نے اپنی ایک اصطلاح ایجاد کی ہے کہ: سننِ اربعہ کو ''حسان'' کا نام اس لیے دیتے ہیں تاکہ اس اصطلاح کی بدولت ہر ہر حدیث کے بعد یہ بتانے کی زحمت سے بچ جائیں کہ اسے ''تمام اصحابِ سنن'' یا ''بعض اصحابِ سنن'' نے ......

اس قسم میں اکثر احادیث ایسی صحیح ہیں جنہیں عادل راویوں نے عادل رُوات ہی سے نقل کیا ہے۔ ہاں یہ بات ہے کہ اس قسم کی احادیث علوِّ درجہ میں، سند کی صحت کے اعتبار سے شیخین کی شرائط کو نہیں پہنچتیں۔ چنانچہ بہت سے احکامات اپنے ثبوت میں جن دلائل سے مزین ہیں وہ حسن درجے کی احادیث ہیں۔ اور اگر کسی حدیث میں ضعف ہے، یا وہ غریب ہے، تو میں نے اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اور میں نے منکر اور موضوع حدیث کو درج کرنے سے احتراز کیا ہے۔ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ، وَعَلَيْهِ التُّكْلَانُ۔(۸۹، ۹۰)

یہی وہ اہداف ہیں جن کی رعایت کی وجہ سے فن حدیث کے ماہرین کے ہاں یہ کتاب انتہائی پسندیدہ، دلکش اور دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ حسنِ ترتیب کی وجہ سے ممتاز ہے۔ اس کتاب کی حسین تنسیق وترتیب، ابواب کے تنوع، اور صنعت کی جُودتِ طبع کی تعریف، مشہور شیخ علامہ حافظ محمد بن عتیق بن علی تُجَیبِی غَرْنَاطِي، معروف بہ لاردی (ت ۶۴۲ ھ) نے اپنی کتاب "أنوَارُ المَصَابِيْح في الجَمْعِ بَيْنَ الكُتُبِ السِّتَّةِ الصِّحَاحِ" کے مقدمے میں کی ہے، جہاں انہوں نے کتاب "مَصَابِيْحُ السُّنَّةِ" کا اُن دوسری کتابوں سے مُقارنہ کیا ہے، جو حدیثِ نبوی شریف کے باب میں انوکھے طرز پر تصنیف کی گئی ہیں۔ چنانچہ موصوف کہتے ہیں:

''ابن اَثیر نے احادیث کو حروفِ تہجی پر مرتب کیا۔ صغانی، قضاعی اور اِقْلِيشِي نے کلمات کے اوائل میں آنے والے الفاظ متشابہات کے لحاظ سے مرتب کیا، جب کہ امام نووی اور مدینی وغیرہ نے احادیث کو اخلاق وصفات اور اَوقات واَزمنہ کے اعتبار سے مرتب کیا۔ اور "مَصَابِيْحُ السُّنَّة" ترتیب کے اعتبار سے ان سب سے بہترین ہے، کیونکہ علامہ بغوی نے اس کتاب میں احکام کے دلائل ایسے

......روایت کیا ہے۔ اور ان کا کلام اس بارے میں بالکل صریح ہے کہ: ''وہ ایسی اصطلاح ہے جو معروف نہیں ہے''۔ چنانچہ انہوں نے خود ہی یہ کہہ دیا ہے کہ: ایک تو یہ اصطلاح ہے، اور دوسرے یہ کہ: وہ نئی ہے۔ پھر کہتے ہیں: اہلِ حدیث کے ہاں حسن ایسی احادیث سے عبارت نہیں ہے'' تاکہ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ ان کتب میں صرف ویسی حسن احادیث ہی ہیں جن کی تعریف پہلے گزری۔ پھر حافظ ابن حجر (ہیتمی) کہتے ہیں:

''خلاصۂ کلام یہ ہے کہ: ہمیں یہ بات ہی تسلیم نہیں ہے کہ: بغوی نے گذشتہ تعریف والی حسن حدیث مراد لی ہے، اور نہ ہی ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ابن صلاح نے ان پر اعتراض کیا ہے''۔

۸۹ : علامہ ابراہیم بن عمر بقاعی شافعی (ت ۸۸۵ھ) رقم طراز ہیں:

''بغوی جن احادیث کو اپنی کتاب میں درج کرتے ہیں، ان میں صحیح اور حسن کی وضاحت نہیں کرتے۔ وہ اکثر تو غریب حدیث کے بارے میں بتاتے ہیں اور کبھی کبھی ضعیف حدیث کے بارے میں''۔

شیخ احمد شاکر نے، ابنِ کثیر کی "الباعث الحثیث شرح اختصار علوم الحدیث" (ص ۴۳، طبع قاهرة، ۱۳۷۰ هج) پر اپنی تعلیقات میں کہا ہے:

''میں کہتا ہوں: موصوف نے اپنی کتاب کے خطبہ میں بھی کہا ہے: اس میں اگر کوئی ضعیف حدیث تھی تو میں نے اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ انتہی۔ تو یہ اعتراض تو اپنی جگہ باقی رہا کہ انہوں نے سنن میں موجود صحیح احادیث کو، ان میں موجود حسان کے ساتھ ملا جلا دیا ہے۔ اور گویا انہوں نے اس کی وضاحت کرنے سے اس لیے سکوت کیا ہے کہ احتجاج کی صلاحیت میں دونوں مشترک ہیں''۔

۹۰ : دیکھیے: مصابیح السنة (۱: ۲)، طبع بولاق، مصر ۱۲۹٤.

اسلوب سے درج کیے ہیں جنہیں فقیہ بنظرِ استحسان دیکھتا ہے۔ اور تقاضائے علم کے موافق ترغیب وترہیب کے ابواب قائم کیے ہیں، اور عالم انہیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ کسی باب کو اس کی جگہ سے بدل کر کسی دوسری جگہ منتقل کرے، تو اسے علامہ بغوی کی رائے کے موافق وضع کردہ جگہ کے سوا کوئی دوسری مناسب جگہ نظر نہ آئے گی۔

اس کتاب کی تعریف وتوصیف میں شاعر شیخ ابوتراب عبدالحیٔ بن حیدر نے چند اشعار کہے ہیں، جو یہ ہیں:

كتاب المصابيح الحسان صحاح مفاتيح خيرات لكل مغلق

منير لأحكام الشريعة كلها منار لمنهاج الهدى بالتحقيق

إمام لأقوال الأنام وأسوة به يستبين الحق من كل منطق

به أس أرباب العلوم مشيد به شمل أصحاب الهوى في التفرق

سعى في مصابيح الدُّجى نور قصده بتهذيب أحكام لكل موفق

ترجمہ: کتاب: "مَصَابِيحُ السُّنَّة" حسان اور صحاح احادیث کا مجموعہ ہے، جو کہ ہر قسم کی خیر کے بند دروازے کے لیے چابیاں ہیں۔ یہ کتاب تمام احکام شریعت کو منور کرنے والی ہے، اور یقیناً ہدایت کے راستے کا مینار ہے۔ علماء کے اقوال کو بیان کرنے میں اس کی حیثیت امام کی سی ہے۔ اور یہ کتاب ایک ایسا نمونہ ہے جس کے ذریعے سے ہر قسم کے کلام سے حق پہچانا جا سکتا ہے۔ اربابِ علم نے اسی کتاب سے مضبوط ومحکم بنیادیں اٹھائیں، اور افتراق وانتشار میں پڑے ہوئے اہلِ حرص وہوا کے لیے یہی کتاب اجتماعیت اور شیرازہ بندی کا ذریعہ ہے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اس کتاب کے نور نے ہر توفیق یافتہ کے لیے احکام کی تہذیب کی کوشش کی ہے۔

اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ابواب کے تنوّع، جودت ترتیب اور وسعت مواد کی وجہ سے علامہ بغوی کے معاصرین میں سے کسی کی کتاب ان کے ہم پلہ نہیں سمجھی گئی۔ امام فراء کی کتاب: "المَصَابِيح"، علاّمہ بغوی کی کتاب کے مقابلے میں بالکل اس چلتی ہوئی مثال کی سی ہے کہ "كُلُّ الصَّيْدِ فِي جَوْفِ الْفَرَاءِ" (جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ہر شکار گورخر سے کم تر ہے)۔ چنانچہ "مَصَابِيحُ السُّنَّة" کو اہلِ نظر نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے، اور علماء امصار نے مطالعہ کرنے، پڑھنے، پڑھانے، تلخیص وشرح اور تعلیق وغیرہ مختلف جہات سے اس کتاب کی خدمت کی ہے۔ اسی لیے یہ کتاب مختلف علاقوں میں ایسے ہی پھیل گئی ہے، جیسا کہ سورج کی دھوپ دوپہر کو پھیل جاتی ہے۔

سب سے پہلے جس نے اس کتاب کی تلخیص کی، وہ علامہ بغوی کے شاگرد عارف فقیہ شیخ ابونجیب عبدالقاہر بن عبداللہ سہروردی ہیں، جن کی وفات ۵۶۳ھ میں ہوئی۔

اور سب سے پہلے جس نے اس کی شرح کی، وہ علامہ امام سنّت شیخ شہاب الدین فضل اللہ تورپشتی حنفی تھے۔ انہوں نے اپنی شرح کا نام: "المُيَسَّر" رکھا تھا، اور ۶۶۱ھ میں اپنی یہ شرح مکمل کر لی تھی۔ پھر ان کے بعد قاضی ناصر الدین عبداللہ بن عمر بیضاوی (ت ۶۸۵ھ) نے "تُحْفَةُ الأَبْرَار" نامی شرح لکھی، اور فضل اللہ تورپشتی کے شاگرد شیخ صدر الدین ابوالمعالی مظفر عمری (ت ۶۸۸ھ) نے ایک شرح لکھی جس کا نام "اَلتَّلْوِيح فِي شَرْحِ المَصَابِيح" رکھا۔ اور ابوالفرج محمد بن داود بن یوسف تبریزی نے اس کی شرح سے ۶۸۰ھ

میں فراغت پائی۔

یہاں ہم نے صرف ان علماء کے نام ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے جنہوں نے چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں، شرح یا تلخیص کی صورت میں اس کتاب کی خدمت کی ہے۔ ورنہ اس کتاب کی شرح، تعلیق، ترتیب، تہذیب اور تنقیح کی صورت میں اس کتاب کی خدمت کا سلسلہ گیارہویں صدی ہجری تک چلتا رہا ہے۔ چنانچہ حاجی خلیفہ کی کتاب "كَشْفُ الظُّنُوْنِ عَنْ أَسْمَاءِ الْكُتُبِ وَالْفُنُوْنِ" میں اس کی تفصیل ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

انہی وجوہات کی بنا پر اس کتاب کی شہرت آفاق میں پھیل گئی، اور اہل عجم نے تو اسے خوب ہی مضبوطی سے پکڑ لیا، اور ان کا گمان یہ ہو گیا تھا کہ: ''جو اس کتاب کو امعان نظر سے پڑھے گا، تو وہ محدثین کے درجہ تک جا پہنچے گا''۔ چنانچہ تاج الدین عبد الوہاب سبکی (ت ۷۷۱ ھ) اپنی کتاب "مُعِيْدُ النِّعَمِ وَمُبِيْدُ النِّقَمِ" میں اس نظریہ کا تعقّب کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اور ان علماء میں ایک طبقہ ایسا بھی پایا جاتا ہے جن کا منتہائے نظر صاغانی کی "مَشَارِقُ الأنوار" ہے۔ اور اگر زیادہ ہی نظر بلند کریں تو بغوی کی "مَصَابِيْحُ السُّنَّة" تک نگاہ جاتی ہے اور بس۔ اور ان کا گمان یہ ہے کہ: اسی قدر علم حدیث حاصل کرنے سے محدثین کے درجہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اور ان کا یہ گمان، حدیث سے ان کی جہالت کی وجہ سے ہے۔ (ایضا ص ۱۶۹۸)

جس قسم کے لوگوں کا ہم نے تذکرہ کیا ہے، اگر یہ لوگ ان دونوں کتابوں کو زبانی یاد کر لیں، اور اسی قدر متون مزید بھی اس کے ساتھ شامل کر لیں، تو نہ تو وہ محدّث ہوں گے، اور نہ اس طرح آئندہ کبھی محدّث ہو سکیں گے، حتی کہ اونٹ سوئی کے ناکے سے گزر جائے''۔ (۹۳)

اور آٹھویں صدی ہجری میں جب علامہ شرف الدین طیبی نے ایک ایسی کتاب لکھنے کا ارادہ کیا جس میں منتخب اور صحیح احادیث ہوں، تو انہوں نے علامہ بغوی کی "مَصَابِيْحُ السُّنَّة" کو مختصر اور لوگوں کے لیے بہت مفید اور ان کے ہاں مقبول پایا۔ غور و فکر کے بعد، اس میں کمی دیکھتے ہوئے اس پر مزید ایک ذیل لکھنے کی ضرورت کو محسوس کیا تو اپنے شاگرد خطیب تبریزی سے اس بارے میں مشورہ کیا، اور دونوں استاد شاگرد اس کتاب کی اصلاح، تہذیب اور تذییل پر متفق ہو گئے۔ اور خطیب تبریزی نے اس میں خوب جان کھپائی، حتی کہ اس کام کو مکمل کر کے اپنے شیخ علامہ طیبی کے سامنے پیش کیا، تو انہوں نے اسے بنظرِ استحسان دیکھا، اور بہت پسند کیا۔

اور اسی صدی میں ان کے ایک معاصر علامہ صدر الدین ابو عبد اللہ محمد شرف الدین بن ابراہیم سلمی مناوی شافعی (ت ۷۴۸ ھ) نے "مَصَابِيْحُ السُّنَّة" کی اصلاح کی کوشش کرتے ہوئے، اس کی احادیث کی تخریج، ہر حدیث کی اس کے مخرج کی طرف نسبت اور شرح کرنے کا بیڑہ اٹھایا، چنانچہ اپنی کتاب "كَشْفُ الْمَنَاهِيْجِ وَالتَّنَاقِيْحِ فِي شَرْحِ أَحَادِيْثِ الْمَصَابِيْحِ" میں کہتے ہیں:

"مَصَابِيح السُّنَّة" ایسی کتاب ہے کہ جس کی طرف بڑے عبادت گزار بندے متوجہ ہوئے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے پیش نظر اختصار تھا لہٰذا انہوں نے بہت سے صحابہ کرام، اور اَخبار و آثار کے رُوات کے حالات زندگی ذکر نہیں کیے، اور نہ ہی ان اَخبار و آثار کی تخریج کی

۹۳: دیکھیے: "معيد النعم ومبيد النقم" (ص ۸۱، القاهرة ۱۳۶۷ هج).

ہے۔ بلکہ ایک نئی اصطلاح قائم کی کہ: صحاح (یعنی صحیح حدیثیں) وہی ہیں جو صحیحین، یا ان میں سے کسی ایک میں ہوں۔ اور حسان (یعنی حسن حدیثیں) وہ ہیں جو ان دونوں میں سے کسی ایک میں بھی نہ ہوں۔ موصوف نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ جو حدیث ضعیف ہو، اس کے ضعف پر متنبہ کر دیں، اور جو منکر اور موضوع حدیث ہو، اسے ذکر نہ کریں، اور (اگر کہیں ذکر ہو جائے تو) اس کی طرف اشارہ نہ کریں۔ چنانچہ اس التزام کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے صحیح احادیث بھی نقل کی ہیں، اور وہ بھی جو صحیحین میں سے کسی ایک میں بھی نہیں ہیں۔ اور حسن احادیث بھی نقل کی ہیں۔ اور اس قسم کے مجموعے میں وہ احادیث بھی ہیں جو صحیحین میں سے کسی ایک کتاب میں ہیں۔ اور موصوف نے حسان میں ایسی احادیث بھی داخل کر دی ہیں جو ضعیف اور واہی ہیں، اور ان پر متنبہ بھی نہیں کیا۔ اور بعض اوقات ایسی موضوع احادیث بھی ذکر کر دی ہیں جو درجۂ سقوط کے لحاظ سے انتہا کو پہنچی ہوئی ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنی اس کتاب کا موضوع ہی یہ قرار دیا ہے کہ اس کی احادیث کی تخریج کروں، اور حدیث کی نسبت اصحابِ کتب میں سے اس کے مخرج کی طرف کر دوں۔ اور اگر حدیث کتب ستہ میں سے کسی میں بھی موجود نہ ہو، تو اس کی تخریج ان کے علاوہ مسند شافعی اور موطأ امام مالک وغیرہ جیسی دوسری کتب سے کروں''۔

(دیکھئے: ''کشف الظنون'' (۲: ۱۷۰۰)۔)

شیخ سلمی اگر متن کی اصلاح کرتے اور اسی پر استدراک کرتے، تو اس کا نفع عام اور تام ہو جاتا، جیسا کہ ان کے معاصر خطیب عمری نے کیا ہے، اور خطیب اسی وجہ سے مشہور بھی ہوئے ہیں کہ انہوں نے اس کتاب ''مَصَابِیح'' کی اصلاح اور تہذیب کی اور ذیل کے طور پر اس میں (باب ثالث کا) اضافہ بھی کیا، اور اس کا نام ''مِشْکَاۃُ المَصَابِیْح'' رکھا۔ شیخ ابو بکر زہیر شاویش نے ''مشکاۃ المصابیح'' پر جو مقدمہ لکھا ہے، اس میں اس کتاب کے مقدمے کی بڑی اچھی تلخیص کی ہے۔ اس کی عبارت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

''کتاب کے شروع میں جو مقدمہ آپ مصنف کے قلم سے پڑھیں گے اس میں خطیب نے ہمیں ''مِشْکَاۃ'' کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ اہم کام جو انہوں نے اس کتاب میں کیے ہیں یہ ہیں کہ: صاحبِ ''مَصَابِیْح'' جن باتوں کو نظر انداز کر گئے ہیں، انہیں بیان کیا ہے۔ اور جن احادیث کو بلا سند چھوڑ دیا ہے، ان احادیث کے راوی کا نام اور حدیث کے مخرج کا ذکر کیا ہے۔ اور عموماً ہر باب کو تین فصول پر تقسیم کیا ہے:

پہلی فصل: (یہ فصل ''مصابیح'' میں علامہ بغوی کے کہے ہوئے قول: ''مِنَ الصَّحَاحِ'' کے بدل کے طور پر ہے) میں وہ احادیث ہیں جو شیخین کے، یا ان میں سے کسی ایک کے ہاں ہیں۔ اور خطیب تبریزی نے تخریج کرتے ہوئے روایت میں علوِّ درجہ کی وجہ سے انہی دونوں کے ذکر پر اکتفا کیا ہے، اگر چہ اس میں ان کے علاوہ دوسرے محدثین اور مخرجین بھی شریک ہوں۔

دوسری فصل: (یہ فصل ''مَصَابِیح'' میں علامہ بغوی کے کہے ہوئے قول: ''مِنَ الحِسَانِ'' کے بدل کے طور پر ہے)، میں وہ احادیث ہیں جنہیں ان دونوں کے علاوہ دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے، اور وہ محدثین یہ ہیں: ابو داود، ترمذی، نسائی، دارمی اور ابن ماجہ۔ ''مَصَابِیْح'' کی احادیث ان نو ائمہ کی کتب سے باہر نہیں ہیں۔

تیسری فصل: مذکورہ باب کی مفید مطلب ایسی احادیث کے انتخاب پر مبنی ہے، جنہیں علامہ بغوی نے بعض مناسب ملحقات کی وجہ

سے ذکر نہیں کیا۔ خطیب نے ایسی احادیث کو زیادتِ فائدہ کے لیے اس باب کے ساتھ ملحق کر دیا ہے، اور اس میں علامہ بغوی کی شرط کی رعایت کرتے ہوئے حدیث کی نسبت راوی صحابی کی طرف بھی کی ہے، اور ائمہ متقدمین وغیرہ میں سے جس سے یہ حدیث لی ہے، اس کی طرف بھی نسبت کی ہے۔ اگر چہ صرف مرفوع احادیث کے انتخاب کا ویسا التزام نہیں کیا جیسا کہ علامہ بغوی نے کیا ہے۔ اور اس طرح انہوں نے مصابیح کی احادیث پر پندرہ سو گیارہ حدیثوں کی زیادتی کی ہے۔ بہ ہر حال، خطیب نے کتاب کی تہذیب کی، اور علامہ بغوی سے جہاں کہیں سہو ہو گیا تھا، اس پر استدراک کیا ہے۔ اس لیے کہ بسا اوقات علامہ بغوی کسی ایسی حدیث کو صحاح میں شمار کر لیتے ہیں جسے شیخین یا ان میں سے کسی ایک نے بھی روایت نہیں کیا ہوتا۔ اور بعض مرتبہ ایسی حدیث کو حسان میں ذکر کر دیتے ہیں جسے شیخین یا ان میں سے کسی نے روایت کیا ہوتا ہے۔ (دیکھیے: "مشكاة المصابيح" (ص ة، دمشق ۱۳۶۱ھج)۔)

موصوف کے اس طویل اور مشقت طلب کام کی وجہ سے کتاب ایسی مہذب، منقّح، کامل اور کافی وافی صورت میں جلوہ گر ہوئی جس سے اخروی مقاصد اور ابدی سعادت کی تحصیل کی جا سکتی ہے۔ مشہور شیخ فقیہ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی "لَمَعَاتُ التَّنْقِيحِ شَرْحُ مِشْكَاةِ الْمَصَابِيحِ" نامی شرح میں اس کتاب کی ایسی جامع تعریف کی ہے کہ اس کے بعد مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ چنانچہ رقم طراز ہیں:

"شیخ ... تبریزی کی کتاب "مِشْكَاةُ الْمَصَابِيحِ" بہت پاکیزہ اور مبارک ہے۔ خلل وزلل سے پاک اور علم وعمل سے متعلق احادیث وآثار سے لبریز ہے۔ آں موصوف نے اس کی ترتیب وتہذیب اور تنقیح وتصحیح میں اتنی جان کھپائی ہے کہ اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دینی مطالب کے حصول اور اخروی مقاصد کے ادراک کے طالب کے لیے اس میں وہ تمام سامان موجود ہے جس کے ذریعے وہ کامیابی پا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوشش مقبول فرمائے، اور ان کو جزائے خیر عطا فرمائے"۔

انہی خصوصیات کی وجہ سے "مشکاۃ" کا متن ایسی تمام خوبیوں کا حامل ہے جن کی بنا پر حسن تلقی اور قبولیت حاصل ہوتی ہے اور اسی وجہ سے معقولات ومنقولات کے بڑے ماہر اور فاضل علماء نے اس کتاب کے پڑھانے، حفظ کرنے اور شرح کرنے پر خصوصی توجہ دی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے جس نے اس کتاب کی شرح کی، وہ مؤلف کے شیخ علامہ طیبی ہیں جنہوں نے بڑی تفصیلی شرح لکھی، اور اس کا نام "الكاشف عن حَقَائِقِ السُّنَنِ" ہے۔ موصوف نے کتاب کی خوبیوں، اس کے نکات ومحاسن، اور لطائفِ معانی کے استخراج پر خوب محنت کی ہے۔ ایسے ہی حدیث کے معارف وحقائق، فقہ الحدیث، اس کی باریکیوں اور درایتِ حدیث کے متعلقات پر بھی اچھی دادِ تحقیق دی ہے، چنانچہ ان کی یہ کتاب اپنے موضوع پر نادرِ روزگار شمار ہو کر مشہور ہوئی ہے۔ آئندہ سطور میں علامہ طیبی کی زبانی ان اسباب وعلل کا بیان ملاحظہ کیجیے جن کی بنا پر انہوں نے یہ شرح لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

حمد وصلاۃ کے بعد: اللہ کے کرم کا امیدوار بندہ حسین بن عبداللہ بن محمد طیبی (اللہ اس کے اعمال کا خاتمہ بالخیر کرے) عرض پرداز ہے کہ: جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے ساتھ توفیقِ ارزانی اور حسنِ عنایت کا معاملہ ہوا، بایں طور کہ باریکیوں میں غور وخوض کر سکوں اور چھپی باتوں کے چہرے سے نقاب اتار کر پھینک سکوں، اور اس کارگزاری کے ذریعے سے میں اللہ کے اس کلامِ مجید کے دقائق کی تحقیق

تک رسائی حاصل کرسکوں کہ جس کے نہ تو سامنے باطل ٹِک سکتا ہے، اور نہ ہی پیچھے سے حملہ آور ہوسکتا ہے، اور وہ کلام حکمت والے قابل تعریف اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے میرے لیے اسے پورا کرنا آسان کر دیا، تو میری طبیعت میں اس بات کا داعیہ بڑی شدت اختیار کرگیا کہ میں اللہ کا تقرب بایں طور حاصل کروں کہ متقین کے امام، قائد غر المحجّلین، حبیب رب العالمین، سید المرسلین، خاتَمُ النَّبِیِّین - صلوات اللہ وسلامہ علیہ - کی احادیث کے بعض معانی بیان کروں اور ان کی تشریح کروں۔

اس سے پہلے میں نے اپنے ایک دینی بھائی، ایمان ویقین میں کامل، کلیجے کی ٹھنڈک، قطب الصلحاء، زاہدین وعابدین کے لیے باعث عزّ وشرف، یعنی شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب دامت برکاتہ سے اس بارے میں مشورہ کیا تھا کہ احادیث نبوی علی صاحبہا افضل التحیۃ والسلام کا ایک مجموعہ جمع کیا جائے۔ چنانچہ "مصابیح" کے تکملہ، اس کی تہذیب وتشذیب، اس کے رواۃ کی تعیین، اور ائمہ متقنین کی طرف احادیث کی نسبت کر دینے کے کام پر ہمارا اتفاق رائے ہوگیا۔ جس نہج پر احادیث جمع کرنے کے خاکے کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا، اسے پورا کرنے میں خطیب نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میری تمنا پوری کرنے میں وہ اپنی ہمت وطاقت کے بقدر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے، اور جب انہوں نے اس کام کو پورا کرلیا، تو میں نے ائمہ کی طرف منسوب کتب کے تتبع کے بعد، اس کے معضلات کی شرح، مشکلات کے حل، طویل ابحاث کی تلخیص، غریب اللغۃ اور نحو کے لحاظ کے ساتھ ساتھ، علم معانی اور علم بیان کے تقاضوں کے مطابق اس کے نکات ولطائف بیان کرنے پر کمر ہمت باندھی۔ اللہ ان تمام ائمہ کرام کی کوششوں کو ثمر آور بنائے۔

مزید یہ کہ مراجعت وتحقیق میں جو کتابیں میرے پیش نظر رہی ہیں، میں نے کسی علامت کے ذریعے ان کی نشان دہی بھی کر دی ہے، چنانچہ "مَعَالِمُ السُّنَنِ وأعلامُها" کے لیے (خط)، "شَرْحُ السُّنَّة" کے لیے (حس)، "شرح صحیح مسلم" کے لیے (مح)، زمخشری کی "الفائِق" کے لیے (فا)، راغب اصفہانی کی "مُفرَدَاتُ القُرآن" کے لیے (غب)، ابن اثیر جزری کی "النِّهَاية" کے لیے (نہ)، شیخ تورپشتی کے لیے (تو)، قاضی ناصرالدین کے لیے (قض)، "المظهر" کے لیے (مظ)، اور "الأشرف" کے لیے (شف) کی علامت استعمال کی ہے۔

ان کتب سے نقل کرنے میں میرا طریقہ اختصار کا رہا ہے، اور میرا زیادہ تر اعتماد امام مسلم کی کتاب صحیح کی امام نووی کی شرح پر رہا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی یہ کتاب اکثر فوائد کی جامع ہے۔ اور جس جگہ تمہیں کوئی علامت نظر نہ آئے، تو اس کا اکثر حصہ میرے غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ اگر تمہیں اس میں کوئی خلل نظر آئے تو اسے ٹھیک کر دینا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا اچھا بدلہ دے۔

اگر تم بنظرِ انصاف دیکھو گے تو تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ کوئی تصنیف ایسی نہیں ہے جو سنت کے حقائق اور دقائق بیان کرنے میں اس قدر جامع اور تحقیقی ہونے کے باوجود اس قدر وجیز اور مختصر عبارات پر مشتمل ہو۔ میں نے اس کتاب کا نام: "الكاشِف عَن حَقَائِقِ السُّنَن" رکھا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ میری اس کوشش کو خالص اپنی ذات کے لیے بنائیں، میری اس محنت کو قبول فرمائیں، اور اسے میرے لیے ذخیرہ کے طور پر جمع کر دیں، جس کا بدلہ مجھے آخرت کے گھر میں ملے۔ اس لیے کہ وہ تمام بھیدوں سے

واقف، اور دلوں کے پوشیدہ رازوں کو جانتا ہے۔ میں اسی پر توکل کرتا ہوں، اور اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہوں"۔

میرزا محمد باقر خوانساری اصبہانی (ت ۱۳۱۳ ھ) اپنی مشہور کتاب "رَوْضَاتُ الجنَّات فِي أحوَالِ العُلَمَاءِ وَالسَّادَات" میں رقم طراز ہیں:

من جملہ ان کی تصنیفات کے، ایک بڑی تفصیلی شرح علامہ حسین ابن مسعود بغوی کی "مصابیح" کی "مِشْكَاةُ المَصَابِيْح، لِلخَطِيْب تَبْرِيْزِي" نامی تہذیب پر ہے۔ انہوں نے اس کا نام "اَلكَاشِفُ عَن حَقَائِقِ السُّنَن" رکھا ہے، اور اس کے مقدمے میں علوم حدیث کے فوائد پر تفصیلی بحث کی ہے، اور سند و متن کے اعتبار سے حدیث کی تقریباً تین کے قریب قسمیں کی ہیں۔ اور ان کے معانی کو بڑے واضح، کامل اور خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔

محدث بارع، محقق مفضال شیخ محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ اپنی کتاب: "التعليق الصبيح على مشكاة المصابيح" میں لکھتے ہیں:

قسم بخدا! سنت کے حقائق و دقائق بیان کرنے، اس کے لطائف و معارف ظاہر کرنے اور اس کے اسرار و غوامض کھولنے میں اس سے زیادہ جامع تحقیق کتاب تمہیں نظر نہ آئے گی۔ انہوں نے کیسی ہی عجیب و غریب نادر المثال شرح لکھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی بھی شارح نے اس اسلوب پر شرح نہیں لکھی۔

میں کہتا ہوں: ان کے بعد جو بھی آیا ہے، اور اس نے فقہ الحدیث اور اس کے معانی کی شرح پر کلام کیا ہے، اس نے انہیں کے چشمے سے پانی پیا، اور انہیں کے انوار و برکات سے استفادہ کیا ہے"۔

ہم نے اس کتاب "شَرْحُ الطِّيبِي" کا ایک صحیح خوبصورت خطی نسخہ، سندھ میں پیر جھنڈو محب اللہ شاہ راشدی کے کتب خانہ میں دیکھا ہے، جو چوتھے صاحبِ علم ہیں۔ اور اس کتاب کی جلد اول کا ایک خوبصورت خطی نسخہ علامہ محدث بارع محقق مفضال سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کے پاس ہے، اور اس پر افغانستان کے مشہور علماء کی مہریں بھی ہیں۔ اس کتاب کا ایک اور خطی نسخہ مغربی پاکستان میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

پھر ان کے بعد علامہ سید شریف علی بن محمد جرجانی (ت ۸۱۶ ھ) نے "مِشْكَاةُ المَصَابِيْح" پر بڑی اچھی تعلیق کی ہے۔ شیخ محمد عبد الحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"علامہ جرجانی کی تصانیف میں سے ایک "مشکاۃ" کا حاشیہ بھی ہے۔ یہ شرح، علامہ طیبی کے حاشیہ کا خلاصہ ہے، ہاں اس میں بعض جگہ چند چیزوں کی زیادتی بھی ہے، جب کہ ملا علی قاری نے اس بات کا کہ علامہ جرجانی کا کوئی حاشیہ "مشكاة المصابيح" پر ہے، انکار کیا ہے۔ چنانچہ "اَلمِرقَاة شَرحُ المِشْكَاة" میں جب یہ حدیث آئی ہے کہ: "رسول اللہ ﷺ ایک حلقے والوں کے پاس آئے اور ان سے پوچھا: تمہیں کس شے نے یہاں بٹھایا ہوا ہے"؟ تو انہوں نے عرض کیا: ہم تو بس اللہ کا ذکر کرنے کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کیا اللہ کی قسم! تمہیں بس اسی چیز نے بٹھا رکھا ہے... ؟ الخ۔

تو اس مقام پر ملا علی قاری لکھتے ہیں: ''سید جمال الدین نے آپ ﷺ کے قول: "آللہ" کو جَر کے ساتھ پڑھا ہے، اور ان کے قول کی بنیاد محقق شریف جرجانی کا اپنے حاشیہ میں یہ کہنا ہے کہ: ہمزہ ءِ استفہام یہاں حرفِ قسم کے بدل کے طور پر آیا ہے، اور اس کی وجہ سے بھی جر دینا واجب ہوتا ہے''۔ اھ۔

اس بات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ طیبی کے مشکاۃ شریف کے حاشیہ کا خلاصہ محقق شریف جرجانی کے قلم سے ہے، اور یہ بات لوگوں میں مشہور بھی ہے۔ لیکن یہ بہت ہی بعید ہے۔

اولاً: تو اس لیے کہ اس خلاصہ کا تذکرہ ان کی تالیفات میں کہیں نہیں ہے۔

ثانیاً: اس لیے کہ اپنی جلالت شان کے ساتھ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ علامہ طیبی کی شرح کا بس ایک نرا اختصار ہی کریں، اس میں تفصیل وزیادت جیسا کوئی تصرف مطلقاً نہ ہو۔ جیسا کہ یہ بات کسی پر مخفی نہ ہوگی۔ ملا علی قاری کا کلام پورا ہوا۔

میں کہتا ہوں: ان کی یہ بات محل تأمل ہے۔ اس لیے کہ ایک جماعت نے ان کی جانب اس حاشیہ کی نسبت کی ہے، جیسے حاجی خلیفہ "كَشْفُ الظُّنُونِ عَن أَسَامِي الكُتُبِ وَالفُنُون" میں، اور حافظ سخاوی، ابنِ سبطِ سید شریف سے نقل کرتے ہوئے "اَلضَّوْءُ اللَّامِع" میں رقم طراز ہیں:

''علی بن محمد بن علی سید الزین ابو الحسن حسینی جرجانی حنفی۔ اہل مشرق کے عالم تھے، اور سید شریف کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ ان کے نواسے کے بیٹے نے جب مجھ سے ۸۸۶ ھ میں علم حاصل کیا، تو اس نے ان کا نام ونسب یوں بیان کیا: علی بن علی بن حسین۔ لیکن مشہور نام ونسب پہلا ہی ہے۔ موصوف کی تصنیفات وتالیفات کی تعداد پچاس سے زائد ہے۔

اس کے بعد علامہ جرجانی کے تحصیل علم کا تذکرہ ہے، پھر ان کی تالیفات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: مجھے ان کے نواسے کے بیٹے نے متعین طور پر بتایا کہ ان کی تصنیفات میں "تفسیر الزهراوین" ہے، ... اور تفسیر بیضاوی اور "مشکاۃ" میں سے ہر ایک کے حواشی ہیں، اور علم حدیث میں طیبی کا خلاصہ بھی ہے''۔

یہ ان کے پڑنواسے ہیں جو صاف طور پر یہ خبر دے رہے ہیں کہ: ان کا "مِشْكَاة" پر ایک حاشیہ بھی ہے۔ اس کی موجودی میں ملّا علی قاری کا یہ قول کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ اس کا ذکر ان کی تصانیف میں نہیں ہے۔ اور انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ علم حدیث میں خلاصہ طیبی پر، اور ہدایہ پر ان کا حاشیہ ہے۔ لہٰذا جس کا گمان یہ ہے کہ سید شریف جرجانی کو فقہ وحدیث اور ان کے متعلق فنون سے کوئی مس نہ تھا۔ (دیکھیے: "الفوائد البهية مع التعليقات السنية" (ص ۱۳۱، مصر ۱۳۲٤)۔) اس کا قول باطل ہے۔ ہم نے اس کتاب کا ایک خطی نسخہ مغربی پاکستان کی پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانے میں دیکھا ہے۔

ان کے بعد محدث عماد الدین عبد العزیز بن محمد بن عبد العزیز ابہری (ت ۸۴۳ھ) نے "مشکاۃ" کی شرح کی، اور اس کا نام "مِنْهَاجُ المِشْكَاة عَلىٰ مِشْكَاةِ المَصَابِيح" رکھا۔ اور یہ نام ہی اس کتاب کی تاریخ تالیف بھی ہے۔ چنانچہ حاجی خلیفہ نے کہا ہے:

اور اس کی شرح عبد العزیز بن محمد بن عبد العزیز اَبہری نے، جن کی وفات ۸۹۵ ھ کی حدود میں ہوئی ہے، امیر علی شاہ کی فرمائش پر

کی تھی، اور اس کا نام "منهاج المشكاة" رکھا، اور یہ اس کتاب کی تاریخ تالیف بھی ہے۔

مزید شیخ شمس الدین احمد بن سلیمان، شہیر بہ ابنِ کمال پاشا (ت ۹۴۰ھ) اور حافظ ابن حجر ہیتمی مکی شافعی (ت ۹۷۳ھ) نے بھی "مشکاۃ" کی شرح کی ہے، اور انہوں نے شافعی المذہب ہونے کی وجہ سے شافعی مذہب کی تائید ونصرت کی انتہائی کوشش کی ہے۔ موصوف نے متن کی تصحیح کا خاص اہتمام کیا ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب "فَتْحُ الإِلٰه فِي شَرْحِ المِشْكَاة" کے مقدمہ میں بایں الفاظ رقم طراز ہیں:

"فنون میں ابواب پر مرتب شدہ انداز میں کی جانے والی تالیفات میں سب سے زیادہ جامع، اور اہل علم کے لیے سب سے زیادہ نافع کتاب "مِشْكَاةُ المَصَابِيح" ہے، جو علامہ محقق ولی الدین محمد بن عبداللہ تبریزی شافعی کی تالیف ہے۔ ان پر اللہ کی کروڑوں رحمتیں ہوں۔ اور انہوں نے جس طرح "مَصَابِيحُ السُّنَّة" میں وارد شدہ احادیث کو جمع کیا، اس پر زیادات کیں اور ان کی تہذیب اور تخریج احادیث کی خدمت سرانجام دی، اس پر اللہ انہیں جزائے خیر دے اور ان کی اس محنت کو بار آور بنائے۔ ... اور میں نے عالی مطالب پر مشتمل مضامین کے تتمات کا بیان کیا، ....اور اس میں نادر قسم کے ایسے فوائد ہیں جن کے بیان کرنے میں منفرد ہوں، ... اسی وجہ سے ۹۵۴ھ کے موسم حج میں مکہ معظمہ میں ماوراء النہر کے بعض فضلاء وصلحاء، اور محققین وراسخ علماء کی ایک جماعت نے مجھ سے یہ کہا کہ: میں اس کتاب کی ایک ایسی معتدل ومتوسط شرح لکھوں جو نہ تو بہت مختصر ہو، اور نہ ہی بہت طویل ہو، تاکہ اس کتاب کا نفع عام ہو جائے۔ اور لوگ اس کی وجہ سے دارین میں خیر حاصل کر سکیں۔

اور وہ حضرات جنہوں نے اس کتاب (یعنی "مشكاة المصابيح")، اور اس کی اصل (یعنی "مصابيح السُّنَّة) پر لکھا ہے۔ انہوں نے ابحاث کو بہت زیادہ پھیلا دیا، شرح کے مقصد سے دور نکل گئے، اور حد سے زیادہ تفصیل میں پڑ گئے، اور اس سب کے باوجود بھی انہوں نے فقہ الحدیث اور اس کے معانی پر سیر حاصل بحث نہیں کی، ... اور نہ ہی قابل ترجیح فروع کی تحقیق پر کماحقہ توجہ دی، تو اس جیسی چال چلنے سے میں نے باز رہنے کا ارادہ کر لیا، ... میں ایک قدم آگے بڑھاتا اور دوسرا پیچھے ہٹا لیتا۔

اور یہ کتاب ایسی ہے کہ ابھی تک کسی فقیہ نے اس کے چراغ کو روشن ہی نہیں کیا، نہ ہی اس کے اسلوب کو واضح کیا، ... پھر کچھ ایسے اسباب پیش آئے جنہوں نے اس کتاب کی شرح لکھنے پر ابھارا، اگرچہ اس وقت اس راہ کی دشواریوں کے باعث ایسے اچھوتے کام کے ظاہری اسباب میسر نہ تھے۔ اور کیسے میسر ہو سکتے تھے، جب کہ جوانی گزر چکی تھی، اور مسلسل مشغولیت کے باعث نئی تصنیف کے اسباب منقطع تھے، مزید برآں اپنے اکابرین کی فقہی کتب کی تحریر، مختلف آفاق سے آئے فتاوی کی گتھیاں سلجھانے کا کام الگ، اور ان کی تحریر وتقریر کی ذمہ داری مستزاد، ... ان سب مشغولیتوں کے باوجود میں نے اس شرح کے لیے روزانہ ایک گھنٹہ فارغ کر کے کام شروع کرنے پر کمر ہمت باندھی، ....اس میں میرے پیش نظر اجنبی، نامانوس اور متروک وغیر معمول بہا مسائل کا ایسے اسلوب سے بیان کرنا رہا جس سے نگاہوں کو ٹھنڈک ملے، اور طبیعت ادھر کو کھنچے۔ خاص طور پر عقائد کے باب کی طرف خصوصی توجہ دی ... ۔

مزید یہ کہ متن اور اسناد کی تصحیح کا خاص اہتمام کیا، اس لیے کہ اوروں میں سے کسی نے اس طرح توجہ نہیں دی، حالانکہ تمام احوال

ومسالک میں یہ نکتہ خصوصی توجہ کا زیادہ حق دار تھا، اس لیے کہ حدیث سے استدلال کرنا حدیث کی صحت وحسن پر موقوف ہے، اِلَّا یہ کہ فضائل کا باب ہو تو اس میں ضعیف حدیث پر بھی اکتفا کیا جا سکتا ہے، جب کہ اس کا ضعف بہت شدید نہ ہو۔ اور ان اصولی باتوں پر ان تمام علماء کا اتفاق ہے جن کی آراء کا علم وفن کی دنیا میں کوئی وزن ہے۔

اور میں نے اس کتاب کا نام "فَتْحُ الإِلٰهِ فِي شَرْحِ المِشْكَاة" رکھا ہے۔ میں اللہ کی مخلوق میں بہترین ہستی کے واسطے سے، اللہ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے اس کی تکمیل کی توفیق دے، اس کے ذریعے سے نفع عام کرے اور مجھے اپنی رضا اور فضل عطا فرمائے۔ ہر خیر کا کفیل وہی ہے۔ وہی مجھے کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ مجھے اللہ ہی کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں اسی پر توکل کرتا ہو، وہ عرش عظیم کا رب ہے۔ مجھے ملی ہوئی یہ توفیق اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہے۔ میں اسی پر توکل کرتا ہوں، اور اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نرمی کرنے والا، رحم کرنے والا، عطا کرنے والا، سخاوت کرنے والا، برداشت کرنے والا اور کرم کا معاملہ کرنے والا ہے۔ نیکی کرنے کی قوت اور برائی سے بچنے کی ہمت اسی اللہ کی توفیق سے ہے جو بلند وبرتر اور عظمت والا ہے"۔

انتہائی افسوس اس بات کا ہے کہ موصوف صرف نصف حصے کی شرح کر پائے اور ان کی وفات ہوگئی، اور اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ نا تمام رہ جانے کی وجہ سے، نہ تو یہ مشہور ہوئی، اور نہ ہی اسے قبولِ عام حاصل ہوا۔ میں نے اس شرح کا ایک خطی نسخہ جو "كتاب الجنائز" تک کا ہے، مَكْتَبَةُ الْكُلِّيَةِ الشَّرقِيَّة، پشاور میں دیکھا ہے۔

ان تمام شروحات کے بعد "مشكاة المصابيح" کی شرح ملا علی قاری نے کی اور اس کا نام "مِرْقَاةُ المَفَاتِيح" رکھا۔

اب ہم ان خصائص کی طرف اشارہ کریں گے جن کا التزام ملا علی قاری نے اپنی اس شرح میں کیا ہے، اور ان اسباب پر نظر ڈالیں گے جنہوں نے ملا علی قاری کو اس کتاب کی شرح کرنے پر ابھارا۔ چنانچہ ہم کہتے ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ شرحِ حدیث، بیانِ معانی اور ضبطِ اثر ومبانی وغیرہ میں ملا علی قاری رحمہ اللہ کی گرد پا کو بھی نہیں پہنچا جا سکتا۔ اور ان کے بعد کے محدثین ان کے محتاج ہیں۔ چنانچہ صحاح ستہ، موطأ، مشکاۃ اور ریاض الصالحین کی شروح اور ان کے حواشی ملا علی قاری کی ان نقول سے بھرے ہوئے ہیں، جو ملا علی قاری کی "مِرْقَاةُ المَفَاتِيح"، "مُوَطَّأُ الإِمَامِ مُحَمَّد" اور "مُسْنَدُ أَبِي حَنِيفَة" کی شروح اوران کی دوسری تصنیفات سے لی گئی ہیں۔ ان کی بڑی خوبی اور علمی خدمت کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ: انہوں نے مذہب حنفی کو کتاب وسنت پر پیش کیا، اور پھر جیسا کہ انہوں نے "شَرْحُ النُّقَايَة" کے مقدمہ میں بتایا ہے کہ: ان کے سامنے یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی کہ بہ نسبت اوروں کے، حنفیہ رحمہم اللہ، سب سے زیادہ سنت کی اتباع کرنے والے ہیں۔

خوب سمجھ لیجیے کہ ہمارے حنفی علماء بہ نسبت دوسروں کے سب سے زیادہ سنت کی اتباع کرنے والے ہیں۔ اور یہ کہنا اس وجہ سے صحیح ہے کہ: انہوں نے مراسیل کو مسند کی طرح قابل اعتماد قرار دے کر قبول کیا ہے۔ اور یہ بات تو اجماعی طور پر تسلیم شدہ ہے کہ مراسیلِ صحابہ بغیر کسی نزاع کے مقبول ہیں۔ امام طبری نے کہا ہے: علماء امت کا مرسل احادیث کے مقبول ہونے پر اجماع ہے۔ اور دوسری صدی کے آخر تک ان میں سے کسی ایک سے بھی اس مسلمہ کا انکار مروی نہیں ہے۔ بعض رواۃ کا کہنا ہے کہ ان کے اس قول سے مراد امام شافعی رحمہ

اللہ ہیں، اور حافظ ابو عمر ابن عبد البر نے بھی "التمھید" میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ لہٰذا جس کسی نے ہمارے اصحابِ حنفیہ کو، سنت کی مخالفت اور رائے اور قیاس کے اعتبار کی طرف منسوب کیا ہے، وہ بہت بنیادی غلطی کا شکار ہے۔ اس لیے کہ ہمارے نزدیک صحابہ پر موقوف روایت بھی قیاس پر مقدم ہے، اور یہی حال ضعیف حدیث کا ہے (کہ وہ بھی رائے اور قیاس سے مقدم ہوا کرتی ہے)۔ لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ: جس شخص نے بھی مذکورہ مسائل میں ہمیں خطا کار کہا ہے، دراصل وہ اس کی اپنی غلط رائے اور فاسد قیاس ہے۔

حاصل بحث یہ ہے کہ: حدیث مرسل جمہور کے ہاں حجت ہے۔ اور ان میں سے امام مالک بھی ہیں۔ حافظ ابو الفرج ابنِ جوزی نے "اَلتَّحقِیْق عَن أَحمَد" میں نقل کیا ہے، اور خطیب نے اپنی کتاب "الجامع" میں روایت کیا ہے کہ: امام مالک کا فرمان ہے: "بسا اوقات مرسل حدیث مسند سے بھی قوی تر ہوتی ہے"۔

ہمارے اصحاب میں سے عیسیٰ بن اَبان اور اصحاب مالک کی ایک جماعت نے اس بات پر قطعیت کا اظہار کیا ہے کہ مرسلات، مسندات سے بھی اولیٰ ہوتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس نے سند کے ساتھ حدیث بیان کر دی، اس نے جن راویوں کے نام ذکر کیے ہیں، ان کی چھان بین اور بحث کی ذمہ داری تمہارے سپرد کر دی۔ اور جس نے علمی دیانت، دین داری اور ثقاہت کی وجہ سے ائمہ سے کوئی حدیث مرسلاً روایت کی، تو گویا اس نے اس حدیث کی یقینی صحت کا اظہار کر دیا۔ اور تمہارا، اُسے مرسلاً دیکھ لینا ہی تمہیں کفایت کرتا ہے۔

ہمارے اور امام مالک کے اصحاب کی ایک دوسری جماعت کا کہنا یہ ہے کہ: ہم یہ تو نہیں کہتے کہ مرسل حدیث، مسند سے زیادہ قوی ہے، لیکن مرسل اور مسند احادیث وجوبِ حجت میں برابر ہیں۔ ان حضرات کا استدلال اس بات سے ہے کہ سلف نے احادیث کو مرسلاً بھی بیان کیا ہے، موصولاً بھی بیان کیا ہے، مسنداً بھی بیان کیا ہے۔ یعنی ان حضرات کے مختلف اسلوب رہے ہیں، لیکن اس سب کے باوجود کبھی کسی نے کسی پر کوئی الزام نہیں دھرا کہ اس نے فلاں نہج کیوں اختیار کی ہے۔

ہاں، امام شافعی رحمہ اللہ نے مرسل روایت کو رد کیا ہے، اِلَّا یہ کہ وہ مرسل روایت کسی دوسری سند سے مسنداً مل جائے، یا وہ ایسی مرسل روایت ہو جسے پہلی سند کے رجال کے سوا کسی دوسرے نے بھی مرسلاً روایت کیا ہو، یا وہ مرسل کسی صحابی کے قول سے تائید یافتہ ہو، یا اکثر اہل علم کے قول سے اس کی تائید ہوتی ہو، یا اِرسال کرنے والا ہمیشہ عادل راوی ہی سے مرسلاً روایت کرتا ہو۔ اس مسئلے کو امام فخر الدین اور آمدی نے یونہی بیان کیا ہے۔

ابن حاجب نے کہا ہے کہ: امام شافعی رحمہ اللہ کے اس اصول پر گرفت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: اگر یہی شرط ہو کہ مرسل تب ہی مقبول ہوگی جب کہ کوئی مسند آ جائے، تو پھر تو عمل اس مسند پر ہوا، جو کہ وارد شدہ ہے، نہ کہ اس مرسل روایت پر۔ اور اگر کوئی دوسری مسند روایت نہ ملے، بلکہ اس جیسی دوسری مرسل ہی ملے، تو مآل یہی تو ہے کہ ایک غیر مقبول روایت کے ساتھ دوسری غیر مقبول روایت شامل ہو گئی ہے۔ ابنِ حاجب کا کہنا ہے کہ: دوسری شق پر اعتراض وارد کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ بسا اوقات ظن کی شمولیت سے قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ واللّٰهُ سُبحَانَهُ وتَعَالَىٰ أَعلَمُ بِحَقَائِقِ المَرَام.

پھر یہ بھی اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ: متأخر محدثین نے حدیث کی تقسیم میں صحیح، حسن، ضعیف، مرسل، منقطع اور معضل وغیرہ کی وہ اصطلاحات قائم کی ہیں جو اصولِ حدیث کی معروف انواع ہیں، اور ہم نے اس کی مکمل تحقیق حافظ ابن حجر عسقلانی کی "شَرْحُ النُّخْبَة" پر لکھی ہوئی اپنی شرح میں کردی ہے۔ اور مذکورہ بالا تقسیم کے بعد متاخرین نے مرسل اور اس کے بعد ذکر کی جانے والی اقسام کو مردود قرار دے دیا، جب کہ سلفِ متقدمین نے ان اقسام میں سے کسی ایک کو بھی رد نہیں کیا ہے، چنانچہ امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی موطأ میں یہی نہج اپنایا ہے۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ: متقدمین سلَف کے نزدیک مرسل، صحیح اور حسن احادیث کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، اور ان کے ہاں "منقطع" اور "معضل" پر بھی مرسل کا اطلاق کردیا جاتا ہے۔

ہمارے مخالفین نے جب یہ دیکھا کہ ہم احادیث مرسلہ سے احتجاج کرتے ہیں تو اپنی قائم کردہ اصطلاح کی بنیاد پر یہ کہنے لگے کہ: یہ احادیث تو ضعیف ہیں۔ اور اسی وجہ سے ہمیں ایسی ضعیف احادیث پر عمل کی طرف منسوب کرنے لگے جو ان کے زعم میں حدیث صحیح اور حسن کے معارض ہیں۔ پھر ہمارے متقدمین اصحاب جیسے امام طحاوی، ابوبکر رازی اور امام قدوری وغیرہ، اپنی کتب میں اس بات کا اہتمام کرتے رہے کہ سنت کے ثابت شدہ دلائل اور ان کی تحقیق کے ساتھ ساتھ، حدیث کے صحیح، حسن اور ضعیف ہونے کی وضاحت بھی کرتے رہیں۔ جب کہ ہمارے متاخرین نے اس باب میں اتنی زیادہ تفصیل سے کام اس لیے نہیں لیا کہ ان کو متقدمین کے ہاں طے شدہ دلائل، ان کی تحقیق اور وضاحت پر پورا اعتماد تھا۔ چنانچہ (اس جوہری فرق کی حقیقت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے) انہوں نے سنت و شریعت کو چھوڑ دینے کا الزام ہمارے سر تھوپ دیا۔ حالانکہ کسی کے لیے بھی یہ جائز نہ تھا کہ وہ ہمارے اصحاب کو اس شنیع خصلت کی جانب منسوب کرتا۔ جب کہ حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے مخالف شافعی علماء ایک ایسے نکتے کی بنیاد پر ہماری عیب جوئی کر رہے ہیں جس میں خود شافعی علماء ملوث ہیں۔

چنانچہ امام ابو اسحاق نے "المُهَذَّب" میں، اور امام الحرمین نے "النِّهَايَة" میں، اور ان کے علاوہ دوسرے علماء نے بکثرت احادیثِ ضعیفہ سے استدلال کیا ہے۔ متقدمین شافعیہ میں سے امام بیہقی نے، اور متاخرین شافعیہ میں سے امام نووی اور منذری نے کئی جگہوں پر یہ بات بتائی ہے۔ بلکہ امام الحرمین جوینی نے تو ایک جگہ ضعیف حدیث کو صحیح کہہ دیا ہے، جس پر شیخ تقی الدین، ابن صلاح، امام نووی اور ان کے علاوہ دوسرے علماء نے ان کی تغلیط کی ہے۔

اب ہمارے ذمہ یہی باقی رہ جاتا ہے کہ ہم احادیث ذکر کرکے، ان کی تحقیق و تبیین کریں، اور ان احادیث کی تخریج کرنے والوں کا پتہ بتا کر ان کی تعیین کریں۔ صاحب ہدایہ جب کسی مسئلہ کے درایتی پہلو کو روایتی پہلو سے تقویت دینے کے لیے مجمل احادیث کو بایں طور ذکر کرتے ہیں کہ ان احادیث کی تخریج کرنے والوں کی اسناد نقل نہیں کرتے، تو ان کا یہ اسلوب ان کی ذکر کردہ بعض احادیث کے لیے سببِ طعن بن جاتا ہے۔ وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ وَالْمُعِيْنُ۔

(دیکھیے: "شرح النقاية مع حاشية محمود الرواية" (ص ۱، و ۲، هند ۱۳۵۱هج)۔)

علم حدیث جیسے عظیم الشان علم کی خدمت میں ان کی، کی ہوئی قابلِ قدر کوششوں کے بارے میں بتاتے ہوئے ہم خوشی اور سعادت

محسوس کر رہے ہیں۔ احادیث کے متون کو ضبط کرنے میں عموماً، اور خصوصاً مشکاۃ شریف کی احادیث کو ضبط کرنے میں، متاخرین پر ان کا بڑا احسان ہے۔ ضبط سے یہاں ہماری مراد محدثین متقدمین اور متوسطین کا ضبط نہیں ہے۔ بلکہ علماء متاخرین کے ہاں متعارف ضبط ہے۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں:

''کسی بھی حدیث کی صحت کے لیے پائے جانے والے ضبط کے تین احوال امت میں پائے جاتے ہیں:

اوّل: یہ کہ صحابہ و تابعین کے زمانہ میں وہ احادیث کو زبانی یاد کر کے اسی پر اکتفا کرتے تھے، اور ان دنوں ان کی قوتِ حافظہ انتہائی اچھی تھی۔

دوم: یہ کہ تبع تابعین کے زمانہ میں، اور ساتویں اور آٹھویں طبقہ کے ابتدائی محدثین کے زمانے تک وہ احادیث کو لکھا کرتے تھے۔ ان دنوں ضبطِ حدیث میں خط و کتابت کی وضاحت، نقاط، حرکات و سکنات اور حروف لکھنے کے انداز میں احتیاط، اور کتابت شدہ مواد کے صحیح اصول کے ساتھ مقابلہ کرنا اور پھر اس لکھے ہوئے کو یاد کرنا جیسے امور داخل تھے۔

سوم: یہ کہ حفاظ محدثین نے اسماءِ رجال، غریبِ حدیث، اور مشکل الفاظ کے ضبط پر بڑی بڑی کتب تصنیف کیں۔ کتب احادیث کی تفصیلی شروح لکھیں اور علم حدیث میں جو جو باتیں قابلِ بحث تھیں، اور جن جن نکات کی تحقیق ضروری تھی، ان سب سے تعرض کیا۔

لیکن جہاں تک آج کل کے ضبط کا معاملہ ہے، تو اس میں ضبط کا دائرہ یہی ہے کہ علم حدیث کی رغبت رکھنے والا طالب علم ان اَعلام محدثین کی تصانیف اور شروحات کو بنظرِ اِمعان دیکھے۔ اور صحت و اتقان کے ساتھ احادیث کو ان کی اصلی حالت پر باقی رکھتے ہوئے روایت کر دے۔ یہیں سے وہ دور شروع ہوتا ہے جس میں اہلِ علم محدثین نے تساہل برتا، اور اس زمانے میں ان امور میں تسامح سے کام لیا جس میں متقدمین نے شدت سے کام لیا تھا۔ جیسا کہ محدثین متوسطین نے حفظ میں تساہل سے کام لیا اور صرف لکھنے پر ہی اکتفا کر لیا تھا۔ اسی وجہ سے متوسطین کے ہاں "وِجادۃ" اور مجرد "مُنَابَذَۃ" اور اس جیسی دوسری چیزیں رواج پا گئی تھیں، بخلاف پہلے طبقات کے، کہ ان کے ہاں ایسی باتیں مروّج نہ تھیں''۔ (دیکھیے: "الحِطّة ص ٦٢")

ملا علی قاری رحمہ اللہ ضبط کی تیسری قسم میں انتہائی کامل اور ماہر تھے، چنانچہ انہوں نے جب مشکاۃ شریف کو لکھا تو صحیح اور معتبر نسخوں کو انتہائی محنت سے جمع کیا اور بہت عرق ریزی سے اس کی تصحیح کی۔ اپنی کتاب "مِرْقَاۃُ المَفَاتِیح" کے مقدمے میں اپنی ان کوششوں کا تذکرہ کرتے ہوئے خود ہی رقم طراز ہیں:

''یہ سب اکابر علماء، جن کے سامنے میں نے مشکاۃ شریف کی قراءت کی، حدیث شریف کے حفاظ میں سے نہیں تھے، اور نہ ہی ان کے ہاں کوئی ایسا صحیح نسخہ تھا جس پر بندۂ ضعیف اعتماد کر سکتا۔ اور شراح مشکاۃ شریف نے ضبط کلمات کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ ان کا مطمح نظر تو بس احادیث کی وضاحت تھی۔ چنانچہ ان کے ذکر کردہ متن پر نہ تو میرا دل مطمئن ہوا، اور نہ ہی مجھے اس سے کم پر شرح صدر ہوا کہ میں علماء کے سامنے پڑھے اور سنے گئے تصریح شدہ اور تصحیح شدہ ایسے نسخے جمع کروں جو اعتماد کیے جانے کی صلاحیت رکھتے ہوں، اور استناد میں اختلاف کے وقت صحیح قرار دیے جا سکتے ہوں۔ چنانچہ جو نسخے میں نے جمع کیے ان میں سے بعض یہ ہیں:

پہلا نسخہ : جو سید اصیل الدین، سید جمال الدین اور ان کے پوتے میرک شاہ کا ہے، اور یہ سب مشہور محدثین گزرے ہیں۔

دوسرا نسخہ : وہ ہے جو شیخ الاسلام ہروی (۹۹) کے سامنے پڑھا گیا۔

---

۹۹ : موصوف نے جو یہ کہا ہے کہ: ''وہ نسخہ جو شیخ الاسلام ہروی کے سامنے پڑھا گیا''۔ میرا خیال ہے کہ اس سے مراد علامہ شیخ احمد ابن یحییٰ بن محمد سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی ہروی ہیں، جو شیخ الاسلام کے لقب سے مشہور ہیں۔ میرزا محمد باقر موسوی خوانساری اصبہانی (ت ۱۳۱۳ھ) اپنی کتاب "روضات الجنات في أحوال العلماء والسّادات" میں کہتے ہیں:

''احمد بن یحییٰ بن سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی ہروی، جو شیخ الاسلام کے لقب، اور ''احمد الحفید'' کے نام سے بایں وجہ مشہور ہیں کہ آپ محقق تفتازانی کے احفاد میں سے تھے۔ جیسا کہ معروف ہی ہے''۔

آپ اکثر علوم میں نادرِ روزگار اور یکتائے زمانہ تھے، خصوصاً فقہ و حدیث اور تفسیر میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ عام قضاۃ اور مشائخ میں بہت بڑے درجے کے حامل تھے۔ آپ سلطان حسین مرزا "بایقرا" کے دورِ حکومت میں ۳۰ھ سے، ہرات کے عہدۂ قضا پر اس وقت تک فائز رہے جب کہ پہلے صفوی بادشاہ سلطان اسماعیل بن سلطان حیدر صفوی موسوی کے لشکر نے وہاں کا رخ کیا، ... اور انہوں نے .... ۹۱۶ھ کے کچھ مہینوں میں اس شہر کو فتح کرلیا۔ اس کے بعد مذکورہ بالا سلطان کا ہرات کے علماء کی ایک جماعت جس میں آپ بھی شامل تھے، کے بارے میں یہ حکم صادر ہوا کہ: انہیں قتل کردیا جائے۔ چنانچہ مذکورہ بالا شیخ کو رمضان المبارک مذکورہ بالا فتح کے سال ہی رمضان المبارک میں مذکورہ بالا سلطان کے جلادوں کے ہاتھوں قتل کردیا گیا۔

اس شہید شخصیت کی تصنیفات میں سے ایک متفرق فوائد کا مجموعہ ہے، جو حلِ مشکلات سے متعلق فوائد، مغلقات کی توضیح، آیات و احادیث کے درمیان موہومہ منافات کے دور کرنے اور ملح و حکایات کے نوادرات، اکثر لوگوں سے مخفی امور پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ میں تقریباً تین سو فوائد کا تذکرہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو علیحدہ ایک فصل کے تحت ذکر کیا ہے، جیسے دسترخوان کے کناروں پر مختلف رنگوں کے کھانے چنے ہوئے ہوں۔ اس کے علاوہ درج ذیل کتب بھی آپ کے قلم سے ہیں: "حاشية علیٰ مختصر شرحي التلخيص"، آپ کی جانب ہی منسوب ہے۔ اپنے دادا کی "تهذيب المنطق" کی ایک شرح بھی لکھی تھی۔ اس کا سن تالیف ۸۸۲ھ ہے۔ اس کے علاوہ علم کلام میں "العقَائِدُ النَّسَفِيَّة" کی تفتازانی کی شرح پر بڑی لطیف تعلیقات بھی لکھی تھیں۔

ملا علی قاری نے شیخ الاسلام ہروی اور ان کے شیخ کے والد مقری شیخ معین الدین کی شہادت کا قصہ اپنے رسالہ "شمُّ العَوارض في ذَمِّ الرّوافض" میں یوں ذکر کیا ہے:

''خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ کے دین میں خواہ مخواہ شدت اور سلب کے ساتھ تعصب ممنوع ہے جس کے چھوڑ دینے کی تاکید کی گئی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر کئی ایسے امور مترتب ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک میں ضرر، اور ممنوعہ اعمال کا ارتکاب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کہا ہے:

اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو، اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں صرف حق سچ بات کہو۔

اور مزید ارشاد فرمایا:

اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو........

......

...... ہمارے بزرگ اور مغفور شیخ محمد بن ابوالحسن بکری نے مکہ مکرمہ میں، مقامِ حنفی پر جو معروف طور پر منع کیا تھا، اس میں انہی آیات سے استدلال کیا تھا۔ اور بڑی واضح آواز میں کہا تھا: اوباش رافضی پر اللہ کی لعنت ہو، اور قزلباش کے گروہ پر اللہ کی مار پڑے۔ اس کے بعد کہا: یہ خبیث لوگ جو اہل سنت والجماعت کے گروہ کو گالیاں نکالتے ہیں، یہ برا بھلا کہنا اسی کے سبب سے ہے۔ اور اہلِ عناد کا طرزِ عمل یہی رہا ہے۔

اور شیخ محمد بن ابوالحسن صدیقی نے اپنے مقام حقیقی میں بالکل سچ کہا ہے، اور ان کا کلام قراءت میں میرے مرحوم استاذ مولانا معین الدین بن حافظ زین الدین، جو زیارت گاہ کے رہنے والے تھے، کے کلام کے بالکل موافق ہے۔ اور وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے رافضہ کے غلبے کے زمانے میں فی سبیل اللہ شہادت کا رتبہ پایا۔

اس کا قصہ یہ ہوا کہ: جب رافضیوں کے بادشاہ شاہ اسماعیل کا ظہور ہوا، تو اس نے بہت قیل وقال کے بعد ملک عراق کو فتح کر لیا، اور ہر طرف قتال اور اس میں قتل ہونے والوں کی لاشیں پھیلا دیں، تو اس کے بعد خراسان کے رہنے والوں کی طرف ایک خط لکھا، جس میں اپنے اس قبیح طریقے سے غلبے کا اظہار تھا۔ اور آخر میں اس نے بعض اکابر صحابہ کو سب وشتم بھی کیا تھا۔ حافظ صاحب مذکور ہرات کے شہر میں جامع مسجد کے مشہور خطیب تھے۔ ان ملعون روافض نے علماء ومشائخ اور امراء کے بھرے مجمع میں آپ کو منبر پر چڑھ کر وہ خط پڑھنے کا حکم دیا۔ ان حاضرین میں علامہ ولی شیخ الاسلام ہروی بھی تھے، جو کہ محقق ربانی مولانا سعد الدین تفتازانی کے پوتے تھے۔

جب خطیب پڑھتے پڑھتے سب وشتم کے مقام پر پہنچا تو اس عبارت کو چھوڑ کر ان کا ادب سے تذکرہ کیا، تو ان رافضی کتوں نے بایں سبب آپ کے ساتھ اور بھی تعصب برتا، اور بولے: بڑا مقصود اور مطلوب حصہ تو تم نے چھوڑ ہی دیا ہے۔ اس کلام کو دوبارہ دہراؤ، تاکہ یہ پوری طرح ظاہر ہو جائے۔ اس صورتِ حال میں خطیب صاحب خاموش ہو گئے، تو شیخ الاسلام نے انہیں اشارے سے کہا کہ: جو بھی لکھا ہوا ہے، وہ پڑھ دو۔ کیونکہ اِکراہ اور مجبور کیے جانے پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ مگر وہ سب وشتم کرنے پر راضی نہ ہوئے، اور قابلِ مذمت رخصت کی بجائے عزیمت اختیار کرنے کا عزمِ مصمم کر لیا۔ چنانچہ انہوں نے آپ کو منبر سے نیچے اتارا، انہیں قتل کیا اور ان کی میت کو جلا ڈالا۔

بعد میں جب ملعون رافضی سلطان، خراسان آیا تو اس نے سب اکابر زمانہ اور شیخ الاسلام کو بلوایا، اور شیخ کو حکم دیا کہ وہ اسی جگہ صحابہ کو سب وشتم کریں۔ مگر- اللہ ان سے راضی ہو-، وہ بھی اس پر تیار نہ ہوئے۔ اس پر ان معلونوں نے کہا کہ: اب سے پہلے، آپ ہی نے تو خطیب کو پڑھ دینے کا حکم دیا تھا، اب اپنے حکم کی مخالفت کیسے کر رہے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: وہ تو فتویٰ تھا، اور یہ، جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، تقویٰ ہے ..... اس پر ملعون سلطان نے آپ کو قتل کر کے شہید کر دیا، مگر آپ اس شہادت سے یقیناً خوش بخت ہو گئے۔

شیخ ابوالحسنات محمد عبدالحی لکھنوی (ت ۱۳۰۴ھ) نے اپنی کتاب "السعایة" کے مقدمے میں کہا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

"الوقایة" کے شراح اور حاشیہ نگاروں میں شیخ الاسلام احمد بن یحییٰ بن محمد بن سعد الدین عمر بن مسعود تفتازانی بھی ہیں جو حفید تفتازانی کے نام سے مشہور تھے۔ میں نے ان کا حاشیہ از اوّل تا آخر مطالعہ کیا ہے۔ موصوف "مختصر الوقایة" کے شارح الیاس زادہ کے تلامذہ میں سے تھے، جیسا کہ انہوں نے خود ہی وضوء کی بحث کے ذیل میں بتایا ہے۔ اس حاشیہ کے آخر میں انہوں نے کہا ہے کہ: وہ اس حاشیہ کی تالیف سے ربیع الاول ۹۰۰ھ میں فارغ ہو رہے ہیں۔

آپ کی تصنیفات میں سے "شرح تهذيب المنطق"، "حواشي التلويح" اور "شرح السراجية" ہے"۔ ......

اور ان کے علاوہ ایسے مزید صحیح اور معتمد علیہ نسخے جمع کیے جن پر صریح صحت کی علامات تھیں۔ لہٰذا میں نے تمام نسخوں کے مجموعے سے ایک بنیادی متن تیار کیا، اور اس طرح میں نے اپنے لیے اخروی ثواب حاصل کرنے کا سبب تلاش کیا ہے''۔

ملا علی قاری کی اس کتاب کی طرف خصوصی توجہ، معرفت، ضبط اور اتقان کی وجہ سے، بعد میں ''مشکاۃ'' کا یہی نسخہ تمام نسخوں کی بنیاد قرار پایا اور اس نے مشکاۃ کی تصحیح کے لیے کسی نئی کوشش کرنے سے علماء کو مستغنی کر دیا۔ اور یہی وہ بنیادی خصوصیت ہے جو نہ تو ان کے شیخ، شارحِ ''مِشکاۃ'' حافظ ابنِ حجر ہیتمی مکی کے ہاں پائی جاتی ہے، اور نہ ہی ان کے دوسرے شیخ عبد اللہ سندی کے ہاں موجود ہے، باوجودیکہ ثانی الذکر نے مشکاۃ شریف کی تصحیح میں عمر کھپا دی تھی۔

ملا علی قاری کی شرح کی دوسری خصوصیت ان کا شرح حدیث سے خصوصی اعتنا ہے۔ انہوں نے انتہائی محنت سے کتاب کی تصحیح کرنے کے بعد بقدرِ فہم ایسی شرح کی ہے جو مکمل معانی کو بیان کرتی ہے، اور حدیث کے متون کے ضبط کو بتانے کے ساتھ ساتھ اس میں موجود غریب الحدیث، اعراب، معانی، فقہ، تفسیر، اشارات، کلام اور اس سے استنباط شدہ احکام کی اس طرح تفصیل بتاتی ہے کہ فقہی آراء میں سے قابلِ ترجیح رائے کی وجوہات سے بھی بحث کرتی ہے۔

...... ''حبیب السِّیَر'' میں ہے:

''آپ دنیا بھر کے بڑے علماء میں سے ایک، علماء بنی آدم کی پناہ گاہ اور اپنے زمانے میں علمِ حدیث وفقہ اور باقی نقلی و عقلی علوم وفنون میں فائق تھے۔ جب ۲۴ ذوالحجہ، ۸۸۷ھ کو، بروز سوموار، آپ کے والد صاحب قطب یحییٰ کی وفات ہوئی، جو کہ مرزا شاہ رخ بن تیمور کے عہد سے لے کر مرزا سلطان حسین کے عہد تک ''مشیخۃ الإسلام'' کے منصب پر فائز رہے تھے، تو ان کے مناصب کی ذمہ داری آپ کے سپرد کر دی گئی۔ آپ خطۂ خراسان میں تقریباً تیس سال تک تدریس بھی کرتے رہے۔ حتیٰ کہ ۹۱۶ھ میں جب ان کی معزولی کا حکم سلطان حسین کی جانب سے آ گیا، تو آپ نے ان مناصب کو چھوڑا۔ آپ کی وفات بھی اسی سال ہو گئی۔

میں نے ان کے والد صاحب، دادا جان اور پڑدادا جان سعد الدین تفتازانی کے تفصیلی حالات کو ''الفوائد البهية و تعليقاته السنية'' (ص ۱۶) میں ذکر کیا ہے''۔

میں کہتا ہوں: مصر سے ۱۳۲۲ھ میں مصر سے علامہ حفید کی کتاب ''الدُّرُّ النَّضید من مجموعة الحفید'' چھپی تھی، جو کہ چودہ علوم کے اہم مسائل پر مشتمل تھی۔

عبد الحئی لکھنوی ہی نے ''التعليقات السنية'' میں کہا ہے:

''میں کہتا ہوں: آپ حفیدِ تفتازانی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی کئی تصنیفات متداول ہیں، جن میں سے ایک اپنے دادا کی ''التلويح حاشية التوضيح'' پر حواشی ہیں۔ مزید آپ نے صدر الشریعہ کی ''شرح الوقاية'' پر بھی حواشی لکھے تھے جو کہ حواشی شیخ الاسلام کے نام سے مشہور ہیں۔ اس کے آخر میں کہتے ہیں کہ: ''ان حواشی کے لکھنے سے فراغت ۹۰۰ھ میں ہوئی ہے''۔ میں نے ان حواشی کا مطالعہ کیا ہے۔ آپ کی تصنیفات میں ''تهذيب المنطق'' کی شرح، اور اپنے جدِّ امجد پر کلام بھی ہے۔ علاوہ ازیں ''شرح الفرائض السراجية'' وغیرہ بھی آپ کی تالیفات میں سے ہے۔

ملا علی قاری نے اپنی اس شرح میں سابقہ لکھی گئی تمام شروح کے تمام فوائد کو بایں طور جمع کر دیا ہے کہ اگر کہیں استدراک کی ضرورت تھی تو بقدر استطاعت اس طرح استدراک کیا کہ احادیث میں موجود موضع اشکال کو اس کے مالہ وماعلیہ کے ساتھ بیان کرنے کے بعد، متقدم مفسرین کے اجمال کی مکمل تشریح کی۔ اور اس کوشش میں ان کا اسلوب بہت ہی بہترین ہے، چنانچہ انہوں نے دونوں اسالیب، یعنی روایت اور درایت کو بطریق احسن ایسے ہی جمع کر دیا ہے جیسا کہ علامہ تورپشتی (۱۰۰) اور علامہ طیبی (۱۰۱) نے کیا ہے۔ موصوف نے معانی کی توضیح اور مقصود کی وضاحت میں شرح کو متن کے ساتھ ممزوج ذکر کیا ہے، اور اطناب مُمِل اور اختصار مُخِل سے اجتناب کیا ہے۔ موصوف اپنی اس نہج کے بارے میں خود ہی "مُقَدِّمَةُ الكِتَاب" میں کہتے ہیں:

---

۱۰۰ : آپ شہاب الدین ابوعبداللہ فضل اللہ بن تاج الدین ابوسعید حسن بن حسین بن یوسف حنفی ہیں۔ آپ کی ولادت تورپشت میں ہوئی۔ وہیں پلے بڑھے اور شیراز کے کبارِ علماء سے علوم کی تحصیل کی۔ علم وفضل وکمال کی کئی ایسی اقسام کو جمع کیا کہ آپ کے زمانے میں کسی نے اتنی اقسام کو جمع نہیں کیا تھا۔ آپ نے اپنی عمر کو علوم کی نشر واشاعت، تدریس اور تصنیف وارشاد میں گزارا۔

آپ امام، ذہین، ثاقب الذہن، ماہر فقیہ، ماہر محدث، اسماءِ رجال کی بصیرت رکھنے والے، علم کلام اور سنن، تفسیر، بلاغت اور ادب جیسے علوم میں متبحر تھے۔ آپ نے فقہ الحدیث کی طرف اس کے شایانِ شان توجہ دی، حتی کہ انتہا کو جا چھویا۔ پھر علوم کی نشر واشاعت میں مشغول ہوئے تو ان پر فوقیت لے گئے۔ آپ نے تصنیف وتالیف کے ساتھ تدریس بھی کی، اور آپ کا نفع عام ہوا۔

سبکی نے آپ کو "الطبقات الشافعية الكبرىٰ" کے چھٹے طبقہ کے ان لوگوں میں ذکر کیا ہے جو چھ سو اور سات سو کے درمیان فوت ہوئے۔ موصوف نے ان کے شافعی المسلک ہونے پر فخر کرتے ہوئے کہا ہے:

''توربشت: اوپر کے دونقطوں والی تاء کے ضمہ، اس کے بعد ساکن واو، پھر راء مکسورہ، پھر ایک نکتے والی باء مکسورہ، پھر نقطوں والی شین اور آخر میں اوپر کے دونقطوں والی تاء کے ساتھ ہے''۔

آپ شیراز کے رہنے والے محدث فقیہ تھے۔ آپ نے بغوی کی "المصابيح" کی بہت اچھی شرح کی تھی۔ بخاری شریف کو عبدالوہاب ابن صالح بن محمد بن معزام سے روایت کیا، جو کہ جامع عتیق کے امام تھے۔ اور وہ حافظ ابوجعفر محمد بن علی سے روایت کرتے ہیں، اور انہوں نے کہا کہ: ہمیں ابوالخیر محمد بن موسیٰ صفار نے خبر دی، وہ کہتے ہیں: ہمیں ابوالہیثم کشمهيني نے خبر دی، وہ کہتے ہیں: ہمیں فربری نے خبر دی۔ میرا خیال ہے کہ مذکورہ بالا شیخ کی وفات ۶۰۲ھ کے لگ بھگ ہوئی، اور فتنۂ تاتار نے آپ کے حالات کی معرفت پر دبیز پردے ڈال دیئے''۔

اس کے بعد سبکی نے آپ کی کتاب "الميسّر" سے فوائد کے چند منتخب ٹکڑے اپنی کتاب "الطبقاتُ الكبرىٰ" میں نقل کیے ہیں۔

مشہور مؤرخ ابوالخیر احمد بن مصطفیٰ معروف بہ طاش کبریٰ زادہ (ت ۹۶۲ھ) نے اپنی کتاب "مفتاحُ السَّعَادَة ومِصبَاحُ السِّيَادَة" میں آپ کے حنفی ہونے کی تصریح کی ہے۔ علاوہ ازیں، ملا علی قاری بھی آپ کو کبار ائمہ حنفیہ میں شمار کرتے ہوئے اپنی کتاب: "مرقاة المفاتيح" (۵۳۸:٤، طبع مصر) میں رقم طراز ہیں:

''ہمارے ائمہ میں سے علامہ تورپشتی نے کہا ہے: ....''۔

حافظ عصر نخبۂ دہر علامہ سید انور شاہ کشمیری نے بخاری شریف پر "فيض الباري" نامی اپنے امالی میں (۲:۳۰، طبع القاہرہ) کہا ہے:......

...... ''ابن دقیق العید رحمہ اللہ (میرا خیال ہے کہ: اس مقام پر آپ کے تلمیذ شیخ محمد بدر عالم میرٹھی جنہوں نے آپ کے امالی ضبط کیے ہیں، سے بھول ہوگئی ہے، اور صحیح تاج الدین سبکی ہے) نے کہا ہے: اگر اس فاضل محدث کی کتب امت کو مل جاتیں، تو بہت نافع ثابت ہوتیں، لیکن فتنۂ تاتار نے ان کو ضائع کر دیا۔ اور لوگوں کا خیال ہے کہ آپ شافعی المذہب تھے۔

میں (یعنی شاہ انور کشمیری) کہتا ہوں: بلکہ یہ خلاف واقعہ ہے، کیونکہ وہ حنفی تھے...، اور جس نے طبقات شافعیہ میں ان کا تذکرہ موجود ہونے اور محدث ہونے کو دیکھ کر شافعی المسلک ہونا سمجھا ہے، وہ وہم کا شکار ہوا ہے''۔

مزید فرماتے ہیں:

''اور علامہ طیبی کے قلم سے بھی ایک شرح ہے، اور اس کے مصنف اگرچہ حافظ نہیں تھے، لیکن عربی نکات کے اعتبار سے تمام شروح سے بہتر ہے۔ اور جہاں تک فضل اللہ تورپشتی کا تعلق ہے تو وہ کبار حفاظ میں سے اور حنفی المسلک تھے، شافعی المسلک نہ تھے، جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے۔ (دیکھیے: "فيض الباري" (٢ : ١٦١).

اور اپنی کتاب "العَرفُ الشَّذي علىٰ جامع التِّرمذي" (طبع هند ص ٤٦٠) میں رقم طراز ہیں کہ: تورپشتی نے کہا ہے کہ مرجئہ فرقہ کے لوگ جبریہ ہیں۔ اور وہ حافظ ہیں۔ اور فضل اللہ تورپشتی کلام میں حاذق ہیں۔

ان کے بارے میں فقیر محمد جہلمی نے اپنی اردو کتاب "حدائق الحنفية" (ص ٢٥٨، طبع لكهنئو ١٩٠٦ م) میں کہا ہے:

شہاب الدین فضل اللہ بن حسین تورپشتی اپنے زمانے کے امام، محقق، باریک بیں، محدث، قابلِ بھروسہ اور ماہر فقیہ تھے۔ آپ کی تصنیفات بہت زیادہ ہیں۔ انہی میں سے ایک بغوی کی "مصابيح السُّنَّة" کی شرح ہے جس کا نام انہوں نے "المُيَسَّر" رکھا ہے۔ اور وہ مصابیح کی بہترین شرح ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے "كتاب المَسَالِك فِي عِلْمِ المَنَاسِك" کے نام سے چالیس ابواب میں ایک کتاب لکھی تھی۔ آپ کی وفات ۶۱۶ ھ کو ہوئی۔ آپ کی تاریخ وفات ''محدّثِ زیبا'' کے لفظ سے نکلتی ہے۔

مؤرخ محمد قزوینی نے "شدُّ الإزار في حطِّ أوزار عن زوّار المَزَار" (ص ١٩٠، طبع طهران) پر اپنی تعلیقات میں کہا ہے:

فصیح خوافی نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ شیخ تورپشتی شروع شروع میں شیراز میں قیام پذیر رہے۔ اس کے بعد ۶۵۵ ھ میں ملکہ قتلغ ترکان کے حکم کو مان کر ''کرمان'' میں سکونت پذیر ہوگئے۔ اور یہ ملکہ کرمان کے قرا ختائیائی بادشاہوں میں سے تھی۔ آپ کی وفات بھی وہیں پر ۶۶۱ ھ میں ہوئی۔ (اور صحیح یہ ہے کہ آپ کی وفات ۶۶۲ ھ کے بعد ہوئی)۔ فصیح خوافی نے جو کچھ کہا ہے، اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ آپ کی جائے پیدائش ''تورپشت'' یا اس کی کوئی نواحی بستی رہی ہوگی۔

کئی کبار علماء نے آپ کے پاس پڑھا۔ چنانچہ صاحب "التلويح في شرح المصابيح" صدر الدین ابو المعالی مظفر بن محمد عمری عدوی اور امیر اصیل الدین عبد اللہ بن علی علوی محمدی وغیرہ آپ کے تلامذہ میں سے ہیں۔

علامہ تورپشتی اپنے زمانے کے طریقت کے مشائخ میں سے ایک تھے۔ آپ نے تصوف و طریقت کو شیخ شہاب الدین ابو حفص عمر سہروردی (ت ۶۳۲ ھ) سے حاصل کیا تھا، جو بلند پایہ صاحب طریقت تھے۔ آپ نے ان سے خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا اور آپ کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ جن لوگوں نے علامہ تورپشتی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا اور ان کے بعد گدی سنبھالی، ان میں آپ کے بیٹے مجد الدین تورپشتی ہیں۔ ان کا سلسلہ......

......بھی کافی پھیل گیا تھا۔

حافظ شمس الدین سخاوی شافعی نے علی بن مبارک شاہ ساوی کے شاگرد، علامہ محدث شیخ عبدالرحیم بن عبدالکریم بکری صدیقی جرہی شیرازی کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے اپنی کتاب "الضَّوءُ اللامع" (٤ : ١٨١) میں کہا ہے:

ایسے ہی آپ نے شیخ نور محمد بن عبداللہ کرمانی سے خرقۂ خلافت پہنا، اور انہوں نے مجد بن شہاب فضل اللہ تورپشتی سے حاصل کیا۔ انہوں نے اپنے والد صاحب سے اور انہوں نے سہروردی سے حاصل کیا۔

میرا خیال ہے کہ فضل اللہ تورپشتی ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے "مَصَابیحُ السُّنَّة" کی شرح کی۔ آپ نے اس کی تکمیل ٦٦٦ھ میں کی۔ (اس کے بعد وہ کب تک جئے، اس بارے میں اب تک کوئی خبر نہیں مل سکی۔ گمان کیا جا سکتا ہے کہ آپ کی وفات اس کے بعد ہوگئی ہوگی)۔ اور آپ نے اس شرح کا نام "المیَسَّر" رکھا۔ یہ نام یقیناً اسم بامسمّٰی ہے، اس لیے کہ جو شخص حدیث کے معانی، اس کی فقہی بصیرت اور اس کے معارف و مغز کو پانا چاہے، یہ شرح اس کے اس مقصد کو واقعۃً آسان کر دیتی ہے۔

جس نے اس شرح کا مطالعہ کیا ہوگا، اسے اس بات کا یقین حاصل ہو گیا ہوگا کہ فضل اللہ تورپشتی تحقیق اور دقتِ نظر کے ساتھ ساتھ کمالِ قدرت اور باریک بینی میں علمِ راسخ کے مالک تھے۔ موصوف نے فقہ الحدیث کے استخراج، حدیث کے اسرار، اس کے محامل کے بیان، اور اس کے مقاصد کے ادراک کے ساتھ ساتھ اس کے لغوی معانی کی بدرجۂ کمال مختصر عبارت کے ساتھ تشریح و توضیح میں مقدور بھر صلاحیتیں اس طرح جھونک دی ہیں کہ آپ اپنے پیش رو علماء پر بھی فوقیت لے گئے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ آپ نے یہ شرح ایسے مرتب کی ہے کہ اس نے عقلوں کو مدہوش اور لوگوں کو پر کیف اور آسودہ کر دیا ہے۔

آپ کے بعد آنے والوں میں بہت کم کوئی آپ کا ہم سر اور برابر کا ہوا ہوگا۔ بلکہ آپ کے بعد آنے والے تو آپ کے نقشِ قدم پر چلے ہیں، اور انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ آپ اس باب میں ان کے لیے نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آپ کی قدر و منزلت اور علوِّ شان کی معرفت کے لیے یہ جلیل القدر اور عدیم النظیر کتاب ہی کافی ہے، جو کہ آپ کی زندہ و تابندہ یادگار ہے اور فقہ الحدیث اور اس کے معارف میں آپ کی عظمتِ شان کی یاد تازہ کرتی ہے۔ علامہ محقق مفضال شیخ محمد ادریس کاندھلوی نے اپنی شرح "التعلیق الصبیح" میں آپ کی کتاب کی ایسی تعریف کی ہے کہ جس کے بعد اس پر مزید کسی تقریظ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"اس شرح کے لکھنے میں میرا زیادہ تر اعتماد "مصابیح السُّنّة" کی اس شرح پر رہا ہے جو شیخ شہاب الدین فضل اللہ بن حسین تورپشتی حنفی رحمہ اللہ نے لکھی ہے۔ بجانِ من! یہ تو بہت ہی لطیف شرح اور پر شکوہ تصنیف ہے، جو حسین فوائد اور ایسے معانی پر مشتمل ہے جو اب تک ایسے خیموں میں بند تھے کہ جنہیں اب تک نہ تو کسی انسان نے چھوا تھا اور نہ ہی کسی جن نے۔

علامہ تورپشتی کی یہ شرح ملا علی قاری رحمہ اللہ کے سامنے نہیں تھی۔ اسی لیے وہ اس کی عبارات کو طیبی کی شرح کے واسطے سے اپنی شرح "مرقاة المصابیح" میں نقل کرتے ہیں اور طیبی نے نقل میں ان کی عبارات کا اختصار کیا ہے۔ اسی وجہ سے لوگوں نے اس کتاب کی کما حقہ قدر نہیں کی۔ جب کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے کتب خانے میں "المیسر" موجود تھی، اور وہ اپنی عربی کتاب: لمعات التنقیح في شرح مشكاة المصابیح اور فارسی کتاب "أشعّةُ اللمعات في شرح المشكاة" میں اس کتاب کے حوالے نقل کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ "المنهج القويم ......

......في الصراط المستقيم" جو فارسی میں ہے اس میں بھی اس کی نقول موجود ہیں۔ بہرحال، انہی وجوہ سے ان کی شرح حسنِ اقتباس اور جودتِ اختصار کی وجہ سے ملا علی قاری کی شرح سے ممتاز ہے۔

محقق و محدث شیخ محمد ادریس کاندھلوی اپنی کتاب "التَّعلِيقُ الصَّبِيح" میں ان کی کتاب سے نقول تامہ لیتے ہیں اور یہ اقتباسات علامہ تورپشتی کی غزارتِ علمی، حسنِ اسلوب، دقتِ نظر اور فقہ الحدیث اور اسرار الحدیث پر کلام میں ان کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس باب میں ان کی کہی ہوئی باتیں ابحاث کالبِّ لباب ہیں، اور وہ تحقیق کی انتہا اور اہلِ تحقیق کے ہاں قبولیت کے درجے کو پہنچی ہوئی کتاب ہے۔

اے کاش! اگر شیخ محمد ادریس کاندھلوی "التعليق الصبيح علىٰ مشكاة المصابيح" کی بجائے، علامہ تورپشتی کی "الميسّر" کو چھپوا دیتے تو یہ امت کی ایسی امتیازی خدمت ہوتی جو کبھی نہ بھلائی جا سکتی۔ بلادِ عربیہ میں ایک دَارُ النَّشر نے یہ ارادہ کیا تو ہے کہ وہ اس کام کو سرانجام دے گا۔ اگر تمہیں قدر ہو تو یہ بڑی قابلِ قدر کوشش ہے۔

"المُيَسَّر" کا دو جلدوں میں، ایک قدیم خطی نسخہ، حکومتِ آصفیہ، حیدر آباد، دکن، ہند کے کتب خانے میں موجود ہے۔

فضل اللہ تورپشتی نے اپنی شرح "اَلمُيَسَّر" کے شروع میں کہا ہے:

"تمام تعریفیں اسی اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے ہمیں حق راستہ دکھا کر اس کے دلائل ہم پر واضح کر دیے۔ ہمارے لیے ہدایت کا راستہ کھول دیا، اور اس کے راستوں کو بیان کر دیا۔ اور ہماری طرف اپنے بندے اور رسول، چنے ہوئے فرد اور خلیل کو مبعوث کیا۔ چنانچہ ہم نے اس ہدایت کی نشانیوں کو پہچان لیا، اس کی وحی اور نازل شدہ احکام کو جان لیا۔ تمام تعریفیں اسی ذات کے لیے ہیں جس نے تھوڑا تھوڑا کر کے قرآن مجید ہم پر نازل کیا، اور علم کے کسی قدر حصے کا واقف کار بنا کر اس کے معانی الہام کیے۔

اور تمام تعریفیں اسی اللہ کے لیے ہیں جس نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی کتاب کا نگران بنا کر، اور وجوہِ خطاب اور مورِدِ وحی و الہام کا بیان کرنے والا بنا کر بھیجا۔ اور اپنے رسول کو شرائع اور احکام کا مصدر، حلال و حرام کی تفصیل بیان کرنے والا، ہدایت کے راستوں کا بیج، سیدھے راستوں کا حامی، شرک و الحاد کا مٹانے والا، اللہ تعالیٰ کا فضل اور عباد و بلاد پر رحمت اترنے کا سبب بنا کر بھیجا"۔

اور کتاب کے آخر میں کہا ہے:

"اس کتاب کے لکھنے سے، صفر ٦٦٦ ھ کو، دن کے آخری حصے میں فراغت نصیب ہوئی۔ الحمدُ لله ربِّ العالمين أوّلا وآخرا. والصَّلاة والسَّلام علىٰ رسولِه محمَّدٍ، ظاهراً وباطناً، وعلىٰ أولادِه وأصحابِه - رضوان الله عليهم -".

اس نسخے کے کاتب نے کہا ہے:

"اس کتاب کی کتابت سے چھوٹے فقیر بندے علی بن حسین بن محمد کرمانی - اللہ تعالیٰ اس کے کام سیدھے کرے، اور دارین میں اس کی تمنائیں پوری کرے -، کو منگل کے روز، ۲۴ رمضان المبارک ۷۷۳ھ میں، کرمان کے علاقے میں، فراغت ملی"۔

آپ کی تالیفات میں سے "المعتمد" اور "المعتقد" ہندوستان میں چھپ چکی ہیں۔

۱۰۱ : آپ شرف الدین حسین بن محمد بن عبداللہ طیبی ہیں۔ آپ مفسر، محدث، متقن، ضابط، ادیب، نحوی، لغوی، وسیع المعرفت، کثیر العلم، صاحبِ فضل، خوب سیرت، اپنے ملکیت کے سخی، اور طلبہ و غرباء کا اکرام کرنے والے تھے۔ آپ قراءات، حدیث اور ادب کی خوب......

...... معرفت رکھتے تھے۔ آپ کے تمام اوقات میں تدریس، افادے اور تالیف کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

آپ کو فقہ الحدیث اور اس کے خزانوں اور مخفی باتوں کے اظہار میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ ان معاملات میں کوئی بھی آپ کا ثانی نہ تھا۔ اور اس سب کے ساتھ آپ کو زبان دانی کے علم میں سے بھی وسیع حصہ ملا تھا۔ آپ شذوذ اختیار کرنے والوں کے لیے ننگی تلوار تھے اور سنت کا دفاع ایسے کرتے کہ مخالف کا ابطال کر کے چھوڑتے۔ صلاح وتقویٰ اور عفت سے متصف ہونے کے باوصف بحث میں منصف اور عادل تھے۔

آپ کے شاگرد ولی الدین خطیب نے "الإكمال في أسماء الرّجال" میں آپ کے بارے میں کہا ہے:

"آپ مفسرین کے سلطان، محققین کے امام، ملت ودین کے لیے باعثِ شرف وافتخار، مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت، حسین بن عبداللہ بن محمد طیبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی درازیٔ عمر سے سب کو متمتع ہونے کی توفیق عطا فرمائے"۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (ت ۸۵۲ھ) اپنی کتاب "الدُّرر الكامنة" میں رقم طراز ہیں:

"آپ میراث میں ملنے والے مال اور تجارت کے اشتغال کی وجہ سے صاحبِ ثروت آدمی تھے۔ ہمیشہ مقاماتِ خیر میں خرچ کرتے رہنے کی وجہ سے آخری عمر میں فقیر ہو گئے تھے۔

آپ ذی عزت، متواضع، عقیدے کے اچھے، فلاسفہ اور مبتدعہ پر شدت سے ردّ کرنے والے تھے۔ اور باوجودیکہ ان دنوں مسلمانوں کے کئی علاقوں پر ایسے ہی لوگوں کا قبضہ تھا، پھر بھی آپ ان کے فضائح وقبائح کا برملا اظہار کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے بے حد محبت کرنے والے، انتہائی شرمیلے، آخری عمر میں ضعفِ بصر کے باوجود، دن ہو یا رات، گرمی ہو یا سردی جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کے پابند رہے۔ بغیر کسی طمع کے علومِ اسلامیہ کے طلبہ کی معاونت میں مصروف رہتے۔ بلکہ آپ انہیں حدیث پڑھاتے، ان کی مدد کرتے، اور اپنے علاقے کے علاوہ دوسرے علاقوں کے جاننے اور نہ جاننے والے لوگوں سے بھی کتابیں عاریتاً لے کر، پڑھنے کے لیے طلبہ کو لے دیتے۔ اور اس کے پیچھے صرف ان لوگوں کی محبت کا جذبہ ہی کارفرما ہوتا تھا جو شریعت کی تعظیم کرتے ہیں اور دینی علوم کے پھیلانے میں مشغول ہیں۔

آپ قرآن وسنت سے دقائق کے استخراج میں انتہائی مشہور تھے۔ کشاف کی ایک مبسوط شرح لکھی، جس میں اہل سنت کے مذہب کے مخالفین کو خوب خوب جواب دیے ہیں۔ جو شخص اس کتاب کو پڑھے گا، وہ آپ کے فضل وعلم کا معترف ہو جائے گا۔ آپ نے اپنے کسی شاگرد کو تاکید کی تھی کہ وہ "المصابیح" کا اختصار آپ کے منہاج پر کر دے، اور اس کا نام "مشکاۃ" رکھا تھا۔ آپ نے اس کی بڑی بہترین شرح کی۔ پھر تفسیر کے موضوع پر ایک کتاب جمع کرنا شروع کی، اور امام بخاری کی صحیح کی قراءت کے لیے ایک مجلس کا نظم بنایا۔ چنانچہ آپ صبح سے ظہر تک تو تفسیر میں مشغول رہتے، اور ظہر سے عصر تک بخاری شریف کے سماع کی مجلس قائم رہتی۔ آپ کا یہ معمول وفات کے دن تک چلتا رہا، چنانچہ آپ تفسیر کی مشغولیت سے فارغ ہو کر فریضۂ ظہر کی اقامت کے لیے کھڑے ہو ہی رہے تھے کہ قبلہ رُو ہونے کی حالت میں آپ کا وقتِ رحلت آ گیا۔ یہ ۲۳ شعبان ۷۴۳ھ، اور منگل کا دن تھا"۔

حافظ سیوطی (ت ۹۱۱ھ) نے اپنی کتاب "بغية الوُعاة في طبقات اللُّغويِّين والنُّحاة" میں کہا ہے:

"آپ حسین بن محمد بن عبداللہ طیبی (طاء کے کسرے کے ساتھ) ہیں۔ آپ مشہور امام، علومِ عقلیہ، عربیت، معانی اور بیان میں علامہ تھے۔ میں کہتا ہوں: آپ نے اپنی کشاف کی شرح میں ذکر کیا ہے کہ: آپ نے ابوحفص سہروردی سے علم حاصل کیا تھا۔ ......

جب میں نے ... فلاں اور فلاں ... نسخہ حاصل کر لیا، تو میرا ارادہ یہ بنا کہ میں اس متن کو ایک ایسی لطیف شرح اور نہج کے ساتھ ضبط کروں جو الفاظ کے ساتھ اس کے معانی کو بھی ضبط کرے۔ اس کی روایات کے ساتھ اس کے معانی کی بھی تحقیق کرے۔ اس لیے کہ آج کل کے لوگوں کی ہمتیں پست ہو گئی ہیں، اور علوم کی تحصیل، خصوصاً اس فن حدیث شریف میں لوگوں کی مشقت اٹھانے کی عادت اور مجاہدہ بہت کمزور پڑ گیا ہے اور ایسا ہونا یقیناً اس وقت کا تقاضا ہے جو کہ زمانہء نبوت سے ایک ہزار سال سے تجاوز کر چکا ہے۔

مصطفیٰ بن عبداللہ (ت ۱۰۶۷ ھ) جو حاجی خلیفہ کے نام سے مشہور ہیں، اپنی کتاب "کَشْفُ الظُّنُوْن" میں اس کتاب کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"شیخ نورالدین علی بن سلطان محمد ہروی، معروف بہ قاری (ت ۱۰۱۴ھ) نے "مِشْکَاۃُ الْمَصَابِیْح" پر "مِرْقَاۃُ الْمَفَاتِیْح" نامی ایک عظیم ممزوج شرح، چار جلدوں میں لکھی ہے، جس میں تمام شروح وحواشی کو جمع کر دیا ہے"۔

...... آپ ہی کے بارے میں محدث محمد بن عبدالباقی زرقانی نے اپنی "الْمَوَاهِبُ اللَّدُنِّيَّة" کی شرح میں کہا ہے:

علامہ شرف الدین حسین بن محمد بن عبداللہ طیبی۔ طیبی: طاء کے کسرے کے ساتھ ہے، اور بلدِ واسط اور اہواز کے علاقے کے درمیان واقع "طیب" کی جانب منسوب ہے۔

سیوطی کا کہنا ہے کہ: آپ کو علمِ حدیث میں خاص مہارت تھی، لیکن آپ حفاظ کے درجہ تک نہیں پہنچ پائے۔ اور کتب ستہ، مسند احمد اور سنن دارمی جیسی کتب ہی آپ کی منتہائے نظر تھیں۔ تخریج کرتے وقت ان کتب سے باہر نہیں جاتے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ صاحبِ کشاف کوئی معروف حدیث ذکر کرتے ہیں، مگر علامہ طیبی اس کی ٹھیک سے تخریج نہیں کر پاتے، اور ان کتب میں موجود اس کی ہم معنیٰ حدیث کو ذکر کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تخریج کی کوتاہی ہے۔

شیخ عبدالوہاب شعرانی (ت ۹۷۳ھ) نے اپنے استاذ شیخ الاسلام زکریا انصاری (ت ۹۲۶ھ) سے اپنی کتاب "لواقح الأنوار القدسية في بيان عهود المحمدية" (ص ٦٣٢ طبع مصر ١٣٨١هج) میں نقل کیا ہے:

میں نے اپنے استاذ شیخ الاسلام زکریا انصاری رحمہ اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

کسی بھی زمانے میں یہ بات بہت کم پائی جاتی ہے کہ: کسی شخص میں فقہ وحدیث اور تصوف جمع ہو جائیں۔ کہتے ہیں: ہمیں "الکشاف" کا حاشیہ لکھنے والے علامہ طیبی کے بعد سے اب تک کسی اور کے بارے میں یہ بات نہیں پہنچی کہ اس میں یہ سب باتیں جمع ہو گئی تھیں۔ اور جس شخص میں یہ تین علوم جمع ہو جائیں، وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اسے اس کے زمانے میں "شيخ أهل السنة والجماعة" کا لقب دیا جائے۔ اور ایسے شخص کو جو کوئی یہ لقب نہ دے، تو اس نے یقیناً ظلم کیا۔

علامہ شعرانی اپنی کتاب "لطائف المنن والأخلاق في بيان وجوب التحدُّث بنعمة الله على الإطلاق" (ص ٤٠، طبع مصر) میں رقم طراز ہیں:

"علامہ طیبی محدث، صوفی، نحوی، فقیہ اور اصولی تھے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک عالم میں یہ سب صفات جمع ہو جائیں"۔

علامہ طیبی کے بعد یہ تمام صفات ملا علی قاری، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہم اللہ میں بھی جمع تھیں، اسی لیے ہم نے انہیں ان کے زمرے میں ذکر کیا ہے۔

اور اس شرح کو اللہ تعالی نے شرف قبولیت سے نوازا ہے۔ اور اسی لیے یہ شرح علماء وطلباء کے ہاں متداول ہے۔ اور بہت کم ایسا دیکھنے میں آئے گا کہ کوئی محدث ہو اور وہ اس کتاب سے رجوع اور استفادہ نہ کرتا ہو۔

اس شرح کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ: انہوں نے مذہب حنفی کا دفاع کیا ہے، اور حدیث وسنت سے اس کا اثبات کیا ہے۔ شیخ ولی الدین خطیب عمری تبریزی، جو "مِشْکَاۃُ الْمَصَابِیْح" کے مؤلف ہیں، وہ شافعی المذہب تھے، لہٰذا ہر باب میں انہوں نے وہی احادیث وآثار نقل کیے ہیں جن سے شافعیہ استدلال کرتے ہیں۔ اور ان نصوص سے اعراض کیا ہے جو حنفیہ کا مستدل ہیں۔ اور مستزاد یہ کہ ان کی یہ کتاب رواج بھی پا گئی اور اہل علم کی ایک جماعت نے اس کی شرح بھی کی، جن میں سے اکثر شافعیہ تھے۔ ان شراح میں سے پہلے شارح تو صاحب "مشکاۃ" کے شیخ علامہ طیبی ہیں، اور آخری حافظ ابن حجر ہیتمی مکی ہیں، جو ملا علی قاری کے شیخ تھے۔ چنانچہ شافعی المذہب ہونے کی وجہ سے انہوں نے اپنی شروح میں اپنے مذہب کی خدمت کی، اور حنفیہ کے دلائل کو جیسے ذکر کیا جانا چاہیئے تھا، اس کی طرف توجہ نہیں دی۔

ملا علی قاری نے جب یہ صورت حال دیکھی تو انہوں نے مذہب حنفیہ کے دلائل کی توضیح اور علی وجہ الاتم اور بطریق احسن انہیں بیان کرنے پر کمر ہمت باندھی، چنانچہ کہتے ہیں:

"اس کتاب کی شرح لکھنے کا باعث یہ بات بھی تھی کہ اکثر شراحِ "مِشْکَاۃ" شافعی المذہب تھے جس کی وجہ سے انہوں نے کتاب کے متعلقہ مسائل کو اپنے مذہب کی نہج پر ذکر کیا۔ اور اپنے مشرب کے مقتضی کی وجہ سے ظواہر احادیث سے استدلال کیا اور اصحاب حنفیہ کو اصحاب رائے کا لقب (۱۰۲) اس گمان پر دے دیا کہ وہ حدیث پر عمل نہیں کرتے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انہیں روایت اور حدیث بیان کرنے کا نہ پہلے کچھ پتہ تھا، نہ اب تک کچھ درک ہے۔

۱۰۲: تعجب کی بات ہے کہ شافعی علماء، حنفی علماء کو رائے کا طعنہ دیتے ہیں، حالانکہ حنفیہ تو شافعیہ کی بہ نسبت رائے سے زیادہ دور ہیں۔ خاص اس موضوع پر مشہور گہرے اصولی قاضی محب اللہ عثمانی صدیقی حنفی بہاری نے ایک رسالہ بھی لکھا تھا، جس کی مؤرخ کبیر سید عبد الحی بن فخر الدین حسنی نے اپنی کتاب "نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنّواظر" (٦ : ٢٥١) میں ان کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے تلخیص کر دی ہے۔ چنانچہ رقم طراز ہیں:

موصوف کا ایک رسالہ اس بات کے اثبات میں ہے کہ: حنفیہ کا مذہب، شافعیہ کے مذہب کی بہ نسبت رائے سے زیادہ دور ہے۔ جبکہ اس کے خلاف کی شہرت ہوگئی ہے۔ موصوف نے اس پر کئی وجوہ سے استدلال بھی کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

ان وجوہ میں سے یہ بھی ہے کہ: حنفیہ اس کے قائل ہیں کہ کتاب وسنت کا عموم قطعی ہے، لہٰذا قیاس کے ذریعہ اس کے خلاف کرنا صحیح نہیں، بخلاف شافعیہ کے کہ وہ حنفیہ کے اس اصول کے برخلاف قیاس کو جائز جانتے ہیں۔ حنفیہ عام کو رائے سے خاص نہیں کرتے، بلکہ اس مقام پر محض رائے سے خاص کرنے کو باطل قرار دیتے ہیں۔

انہی وجوہ میں سے یہ بھی ہے کہ: شافعیہ قیاس سے مطلق کو مقید پر محمول کر لیتے ہیں، جب کہ حنفیہ قیاس سے مطلق کو مقید پر محمول نہیں کرتے۔

انہی وجوہ میں سے یہ بھی ہے کہ: مرسل احادیث حنفیہ کے ہاں مقبول ہیں۔ چنانچہ وہ مراسیل کو رائے پر ترجیح دیتے ہیں، بخلاف ......

......شافعیہ کے، کہ وہ رائے کو مراسیل پر مقدم کرنے کے قائل ہیں، الا یہ کہ مرسل کو کوئی دوسری مسند یا مرسل روایت تقویت دیتی ہو، یا وہ مرسل بھی قولِ صحابی ہو، یا اکثر علماء بھی اس کے قائل ہوں، یا اتنا یقینی ہو کہ راوی ثقہ سے ہی ارسال کرتا ہے۔

انہی وجوہ میں سے یہ بھی ہے کہ: اگر صحابی کا قول غیر مدرک بالرائے ہو، تو تمام حنفیہ کے ہاں وہ حجت اور سنت کے ساتھ ملحق ہوگا اور قیاس پر مقدم ہوگا، جب کہ امام شافعی صحابی کے ایسے قول کو رائے پر مقدم اور حجت نہیں سمجھتے، بلکہ وہ اپنی رائے کو صحابی کے قول پر مقدم سمجھتے ہیں۔

انہی وجوہ میں سے یہ بھی ہے کہ: ایسی عبارت جو مطلق ہو، اس میں کسی شرط یا کسی جزء کی زیادتی کے بارے میں امام شافعی کہتے ہیں کہ: رائے سے بھی جائز ہے، کیونکہ وہ بس تخصیص اور تقیید ہے، جب کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس طرح کرنا گویا کتاب کے اطلاق کو منسوخ کرنا ہے۔

انہی وجوہ میں سے یہ بھی ہے کہ: حنفیہ نے رائے کی صحت کے اثبات میں انتہائی احتیاط برتی ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ: علت (یعنی اصل اور فرع کے درمیان پایا جانے والے وصفِ جامع) کا مؤثر ہونا ضروری ہے۔ یعنی نص یا اجماع سے اس کی تاثیر ظاہر ہوئی ہو۔ جب کہ شافعیہ نے صرف احالہ اور مناسبتِ علیہ پر ہی اکتفا کر لیا ہے، اگرچہ اس کی تاثیر شرعاً ظاہر نہ ہوئی ہو۔ بلکہ شافعیہ نے تو اسے تب بھی صحیح قرار دیا ہے جب کہ وصف اور حکم میں مناسبت تک ظاہر نہ ہوئی ہو۔

انہی وجوہ میں سے یہ بھی ہے کہ: شافعیہ حدود و کفارات کو رائے سے ثابت کر دیتے ہیں، جب کہ حنفیہ حدود کو رائے سے قطعاً ثابت نہیں کرتے، اس لیے کہ حدود ایسی تحدیدات پر مشتمل ہیں جو عقل کے دائرۂ کار میں نہیں آتیں۔

فقیہ و مسندِ ہند شیخ علامہ شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ فاروقی حنفی دہلوی (ت ۱۲۳۹ھ) نے دو رسالے لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک تو ائمہ اربعہ کے مذاہب کے مآخذ کے بیان میں ہے، جب کہ دوسرا رسالہ مذہب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصولوں کے بارے میں ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان دونوں مکمل رسالوں کو یہاں نقل کر دیں۔ پہلا رسالہ یہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمَدُه ونُصَلِّي عَلىٰ نَبِيِّه الكَريم، وعَلىٰ آلِه وصَحْبِه ذَوِي الفَضْلِ الجَسِيْم.

اللہ تم پر رحم کرے، خوب جان لو کہ: احکام شرعیہ کے دلائل اور مآخذ سے بحث کرنے والے مجتہدین نے جب دیکھا کہ: رسول اللہ ﷺ کی بعض احادیث متعارض ہیں، اور صحابہ و تابعین کے بعض آثار بھی باہم مختلف ہیں۔ اور صورتِ حال یہ ہے کہ احکام میں یہی مآخذ سب سے عام اور زیادہ ہیں، تو وہ متحیر ہوئے، اور اس تعارض و اختلاف کی تحقیق و چھان بین میں انکی مختلف آراء سامنے آئیں اس تعارض سے بچنے کی کیا صورت ہے۔

چنانچہ امام مالک رحمہ اللہ نے تو اسے اختیار کیا کہ: اہلِ مدینہ کے عمل کو حکم قرار دینا چاہیے۔ اس لیے کہ مدینہ منورہ رسول اللہ ﷺ کا گھر، آپ کے خلفاء کا وطن اور صحابہ و اہلِ بیت کا مسکن ہونے کے ساتھ ساتھ مہبطِ وحی بھی رہا ہے، اور وہاں کے لوگ وحی کے معانی کی سب سے زیادہ معرفت رکھتے ہیں، چنانچہ ہر وہ حدیث جو اہلِ مدینہ کے عمل کے خلاف ہوگی، اس کے بارے میں ضروری ہے کہ یا تو وہ منسوخ ہو، یا مؤوّل ہو، یا مخصوص ہو، یا محذوف القصہ ہو۔ لہٰذا، کوئی بھی مذکورہ بالا قسم کی حدیث قابلِ اعتناء نہیں ہوگی، اور اس پر احکامِ شرعیہ کا مدار نہیں ہوسکتا۔......

...... امام شافعی نے اسے اختیار کیا کہ: ایسی صورتِ حال میں اہلِ حجاز کو فیصل قرار دیتے ہوئے، درایت کو بھی کام میں لانا چاہیے۔ چنانچہ آپ بعض روایات کو ایک حالت پر، اور بعض دوسری روایات کو کسی دوسری حالت پر محمول کرتے ہیں، اور جہاں تک ممکن ہو تطبیق کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر جب آپ مصر اور عراق تشریف لے گئے، اور ان بلاد کے ثقہ رواۃ سے بہت سی روایات سنیں تو ان کے نزدیک ان روایات میں سے بعض اہلِ حجاز کے عمل پر قابلِ ترجیح قرار پائیں۔ اسی وجہ سے ان کے مذہب میں قدیم اور جدید، دو قسم کے اقوال پیدا ہو گئے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مختار یہ ہے کہ ہر حدیث کو اس کے ظاہر پر ہی رہنے دیا جائے، لیکن انہوں نے اتحادِ علت کے باوجود کئی ایک موارد کے ساتھ تخصیص کی ہے۔ چنانچہ ان کا مذہب علیٰ خلاف القیاس، اور فارق نہ ہونے کے باوجود اختلافِ حکم پر مشتمل ہو کر سامنے آیا۔ اسی وجہ سے ان کے مذہب کو ظاہریہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متبعین کا مختار طریقہ بہت ہی واضح ہے۔ جس کا کسی قدر تفصیلی بیان یہ ہے کہ جب ہم تتبع کرتے ہیں تو ہمیں شریعت میں دو قسم کے احکام ملتے ہیں۔

ایک قسم تو ایسے قواعد کلیہ کی ہے جو مطرد و منعکس یعنی جامع و مانع ہے۔ جیسے ہمارا یہ کہنا: "لا تزرُ وازرةٌ وزرَ أُخرىٰ"، کہ کوئی شخص کسی بھی دوسرے شخص کے گناہ میں ماخوذ نہ ہوگا، یا ہمارا یہ کہنا کہ: "الغُنْمُ بِالغُرْمِ"، کہ غنم بسبب غرم ہے۔ یا یہ کہنا: "الخراج بالضَّمان"، کہ خراج تو ضمان کے سبب ہے۔ یا ہمارا یہ قول: "العتاق لا يحتمل الفسخ" کہ آزاد کرنا فسخ نہیں ہو سکتا، اور یہ کہنا: "البيعُ يتمُّ بالإيجاب والقبول"، کہ بیع ایجاب وقبول سے کامل ہوتی ہے۔ اور یہ کہنا: "البيِّنةُ علىٰ المُدَّعي واليمينُ علىٰ مَن أنكر"، کہ گواہ مدعی کے ذمہ ہے، اور قسم منکر پر ہوتی ہے۔ اور اس جیسے لاتعداد اقوال مزید بھی ہیں۔

دوسری قسم ان قواعد کی ہے، جو جزئی حوادث اور مخصوص اسباب کے پس منظر میں وارد ہوئے ہیں۔ گویا کہ یہ قواعد ان کلی قواعد سے بمنزلہ استثناء کے ہیں۔ چنانچہ مجتہد پر واجب ہے کہ ان کلیات کی محافظت کرے اور ان کے ماسوا جو بھی ہے، اسے چھوڑ دے، اس لیے کہ درحقیقت شرائع انہیں کلی قواعد سے عبارت ہیں۔

اور جہاں تک ان کلیات کی مخالفت کرنے والے ایسے احکام کا تعلق ہے کہ جن کے یقینی اسباب اور مخصصات کا ہمیں پتہ نہیں ہے، تو ان کی طرف کوئی التفات نہیں کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر: یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ: فاسد شروط کی بنا پر بیع باطل ہو جاتی ہے۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے قصے میں جو یہ وارد ہوا ہے کہ انہوں نے اونٹ کی بیع میں مدینہ منورہ تک سواری کرنے کی شرط لگائی تھی، تو یہ ایک شخصی اور جزئی قصہ ہے۔ لہٰذا، یہ قصہ مذکورہ بالا کلی قواعد کا معارضہ کرنے کی اہلیت وقوت نہیں رکھتا۔ ایسے ہی "حدیثِ مصرّاۃ" شریعت سے ثابت شدہ اس قطعی قاعدہ کلیہ کے معارض ہے، جو یہ ہے کہ: "الغنم بالغُرم"۔ اس جیسے دوسرے بھی کئی مسائل ہیں۔

ان کلی قواعد کی رعایت کرنے سے، بہت ساری ایسی احادیث جو اسی پس منظر میں وارد ہوئی ہیں، کا ترک کرنا لازم آتا ہے۔ لیکن حنفیہ ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتے اور اجتہاد کرتے ہوئے ان کلی قواعد کی محافظت کے ساتھ، جزئیات کو ان کلیات کے تحت درج کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ مجمل سا کلام ہے، جس کی تفصیل بہت طویل ہے، جس کی اس وقت گنجائش نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی ہدایت دینے والے ہیں۔

دیکھیے: الفتاویٰ العزیزیّة في المسائل المشكلة: ص ۷۶، طبع دهلي. ......

......دوسرا رسالہ جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کے اصول کے بارے میں وہ درج ذیل ہے:(استادِ محترم ڈاکٹر محمد عبد الحلیم نعمانی صاحب دامت برکاتہم نے یہاں فتاویٰ عزیزی کی جس عبارت کا عربی ترجمہ کیا ہے، ہم اس کا اردو ترجمہ خود کرنے کی بجائے، فتاویٰ عزیزی (اردو) سے اس کا ترجمہ نقل کر رہے ہیں۔ مزید یہ کہ ابتداء میں وہ سوال بھی نقل کر رہے ہیں جس کے جواب میں شاہ صاحب نے یہ تحریر لکھی تھی، اور اسے استادِ محترم نے نقل نہیں کیا)۔

سوال: حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کے وہ مسائل جن سے ہر اعتراض رڈ ہوتا ہے، بیان فرمائیے؟

جواب: علماءِ متاخرین نے بغرض محفوظ رہنے مذہب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے، چند قواعد جمع کیے ہیں، اس غرض سے کہ ان قواعد سے وہ لوگ رڈ کرتے تھے جملہ ان اعتراضات کو جو اس بناپر ہوتے تھے کہ مثلاً فلاں مسئلہ اس مذہب کا حدیث صحیح کے خلاف ہے۔

قاعدۂ اوّل: خاص کے بارے میں حکم ہے کہ وہ صاف طور پر بیان کیا ہوا ہے تو اس کے ظاہر معنی کے سوا دوسرے کوئی معنی نہیں کہا جا سکتا۔ علماءِ متاخرین نے اس قاعدہ سے اِن امور کو رد کیا ہے: فرضیت سورۂ فاتحہ کی نماز میں، اور فرضیت تعدیلِ ارکان وغیرہ کی۔ اور علماءِ کرام کا بیان ہے کہ لفظ: "اُسْجُدُوْا" اور "اِقْرَؤُوْا" کا خاص ہے۔ اس کے معنی صاف طور پر بیان کئے ہوئے ہیں، تو اگر اس کے معنی میں کچھ اور بڑھا کر بیان کیا جائے تو یہ لازم آئے گا کہ اس کے ظاہر اً اصل معنی کے علاوہ کوئی دوسرا معنی بیان کیا گیا۔

قاعدہ دوسرا: زیادت، کتاب پر بمنزلہ نسخ کے ہے۔ تو یہ زیادت نہ ہوگی مگر آیتِ صریح یا حدیثِ مشہور سے۔

قاعدہ تیسرا: حدیث مرسل: مانند حدیثِ مسند کے ہے۔

قاعدہ چوتھا: ترجیح نہ ہوگی کسی حدیث کو بسبب کثرت راویوں کے، بلکہ ترجیح بسبب فقہِ راوی کے ہوگی۔

قاعدہ پانچواں: جرح قابل قبول نہیں، مگر جب اس کی تفسیر کی جائے۔ اور یہ قاعدہ اس سبب سے ثابت ہے کہ جرح اور تعدیل اکثر اجمالی ہے۔

قاعدہ چھٹا: ابن ہمام نے اپنی بعض کتابوں میں لکھا ہے، جس روایت کو صحیح کہا، امام بخاری اور مسلم نے اور ان لوگوں نے جو، اُن کے مانند ہوئے، تو ہم لوگوں پر واجب نہیں کہ ہم لوگ اس کو قبول کریں اور کس طرح ہم لوگ اس کو قبول کر سکتے ہیں۔ اس واسطے کہ اکثر راویوں میں لوگوں نے اپنے اجتہاد کی بناء پر اختلاف کیا ہے۔ کسی راوی کے بارے میں بعض نے جرح کی ہے اور بعض نے تعدیل کی ہے، تو ممکن ہے کہ جس راوی کو لوگوں نے مجروح کیا ہو، وہ ہمارے امام کے نزدیک عادل ہو۔ اور ایسا ہی یہ بھی ممکن ہے کہ جس راوی کو لوگوں نے ضعیف کہا ہو، یا اس کے بارے میں وضعِ حدیث کی تہمت لگائی ہو، وہ راوی ہمارے امام کے نزدیک مستوجب اس طعن کا نہ ہو، تو ہم لوگوں پر واجب نہیں کہ ان لوگوں کا قول قبول کریں۔ اور کس طرح ہم لوگ قبول کر سکتے ہیں، اس واسطے کہ ممکن ہے کہ جس راوی کو لوگوں نے مجروح کیا ہو، وہ عادل ہو، قابلِ اعتبار ہو۔ تو اب ہم لوگ اسی قول پر اعتماد کریں گے، جو ہمارے مذہب کے اصحاب نے ذکر کیا ہے۔

قاعدہ ساتواں: کہا بعض صاحبِ فتاویٰ نے کہ: جب کسی مسئلہ میں قول امامِ اعظم اور صاحبین کا ہو، اور اس مسئلہ میں کوئی حدیث بھی ہو، اور اس حدیث کے بارے میں حکم صحت کا دیا گیا ہو، تو واجب ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ اور صاحبین کے قول کی اتباع کی جائے، نہ حدیث کی۔ اس واسطے کہ ہم جانتے ہیں شان میں حضرت امام اعظم رحمہ اللہ اور صاحبین کے یہ کہ: باوجود صحیح ہونے احادیث کے، آپ صاحبوں نے یہ دریافت......

......فرمایا ہے کہ کس حدیث میں معارضہ ہے، اور کس حدیث سے استنباط صحیح ہے۔ یعنی یہ سب تحقیق کر کے ان حضرات نے کسی مسئلہ میں حکم فرمایا ہے کہ ان ائمہ کا قول حدیث کے خلاف نہیں ہے۔ اور ان ائمہ کرام کی شان میں ہمارا گمان نہیں کہ ان ائمہ کو حدیث نہ پہنچی ہو۔ اس واسطے کہ ان ائمہ کا زمانہ قریب ہوا ہے، زمانہ سے آنحضرت ﷺ کے، اور ان ائمہ کا علم وسیع تھا۔

قاعدہ آٹھواں: جس روایت کو راوی غیر فقیہ نے روایت کیا ہو، اور وہ ایسی روایت نہیں کہ اس میں رائے کو دخل ہو سکے تو اس کو قبول کرنا واجب نہیں۔

قاعدہ نواں: عام قطعی ہے مانند خاص کے، تو تخصیص نہیں ہو سکتی عام میں خاص کے ذریعے سے۔ مگر اس وقت میں ایسی تخصیص ہو سکتی ہے کہ وہ خاص قطعی ہو۔ تو یہ تخصیص بمنزلہ نسخ کے ہوگی۔ البتہ جب عام مخصوص منہ البعض ہو تو تخصیص میں یہ شرط نہیں کہ خاص قطعی ہو۔ روایت ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "من ماتَ وهو يعلمُ أن لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، دَخَلَ الجَنَّةَ".

ترجمہ: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جو شخص فوت ہوا، اور وہ یہ جانتا ہے کہ نہیں ہے۔ کوئی معبود قابلِ پرستش سوا اللہ کے تو وہ بہشت میں داخل ہو گا۔ روایت کیا اس کو مسلم نے۔

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ ایمان سے مراد صرف تصدیق ہے، اور یہی مذہب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "الوُضُوءُ مِن كلِّ دمٍ سائِلٍ". (رواه الدارقطني) یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ: وضو لازم ہوتا ہے خون بہنے والے سے۔ روایت کیا ہے اس حدیث کو دارقطنی نے۔

اور استدلال کیا حنفیہ نے اس حدیث سے اس مسئلہ میں کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے، اس نجاست کے نکلنے سے بھی جو غیر سبیلین سے خارج ہو۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إذا أتيتُم الغائِطَ فلَا تَسْتَقْبِلُوْا القِبلَةَ، ولا تَسْتَدْبِرُوْهَا، ولٰكِنْ شَرِّقُوْا أو غَرِّبُوا". (متفق عليه). یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ: جب جاؤ پائے خانہ کے لیے، تو قبلہ کی طرف منہ کر کے نہ بیٹھو، بلکہ پورب رُخ یا پچھم رُخ بیٹھا کرو۔ روایت کیا اس حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم نے۔

آنحضرت ﷺ نے یہ حدیث مدینہ منورہ میں فرمائی، اور وہاں پورب رُخ اور پچھم رُخ بیٹھنے میں قبلہ کی طرف نہ رُخ ہوتا ہے اور نہ پیٹھ ہوتی ہے۔ اس واسطے وہاں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: پورب یا پچھم رُخ بیٹھا کرو۔ تو ہر جگہ قبلہ کا لحاظ چاہیئے کہ پائخانہ بیٹھنے میں منہ یا پیٹھ قبلہ کی طرف نہ ہو۔ یہ حدیث بھی موافق مذہب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ہے۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُقَبِّلُ بَعْضَ أزْوَاجِهِ، ثُمَّ يُصَلِّي وَلَا يَتَوَضَّأُ". (رواه الترمذي). یعنی آنحضرت ﷺ بوسہ لیتے تھے بعض ازواج کا، پھر نماز پڑھتے تھے اور وضو نہ کرتے تھے۔ روایت کیا ہے اس حدیث کو ترمذی نے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اس حدیث کی بابت فرمایا ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَن مَسِّ الرَّجُلِ ذَكَرَهُ، بعدَ ما يتوَضَّأُ. قالَ: وَهَلْ هُو إِلَّا بَضْعَةٌ مِنْكَ". (رواه النَّسائيُّ والتِّرمذيُّ وأبو داود). یعنی پوچھا گیا آنحضرت ﷺ سے مسئلہ اس بارے میں کہ کوئی شخص بحالتِ وضو اپنا ذَکر چھوئے، تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ:......

......وہ کیا ہے، سوا اس کے کہ ایک پارہ گوشت ہے تمہارا۔

روایت کیا ہے اس حدیث کو نسائی اور ترمذی اور ابوداود نے۔ یہ حدیث دلیل ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی، اس مسئلہ میں کہ مسِّ ذکر ناقضِ وضو نہیں۔ یعنی ذکر کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "أسْفِرُوْا بالفَجْرِ، فإنَّهُ أعظَمُ لِلأجرِ". (رواه الترمذيُّ).

یعنی روشنی میں پڑھو فجر کی نماز، اس واسطے کہ اس میں زیادہ ثواب ہے۔

ظاہر ہے کہ اس حدیث شریف سے تائید ہوتی ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی۔

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "الإمامُ ضامِنٌ. المُؤذِّنُ مُؤتَمِنٌ. اللّٰهُمَّ أرشِدِ الأئمَّةَ، وَ اغفِرْ لِلمُؤَذِّنينَ". (رواه أبو داود وأحمد والتِّرمذيُّ). یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ: امام ضامن ہے اور مؤذن امانت دار ہے۔ اے پروردگار! رہنمائی فرما ائمہ کی اور مغفرت فرما مؤذنین کی۔ روایت کیا اس حدیث کو احمد اور ابوداود اور ترمذی نے۔

ظاہر ہے کہ اس حدیث سے تائید ہوتی ہے مذہب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی اس مسئلہ میں کہ: نماز مقتدی کی موقوف ہے امام کی نماز پر۔

إنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ صلَّى المَغرِبَ بسُورَةِ الأعراف، فِي رَكعَتَيْنِ". (رواه النَّسائيُّ). یعنی پیغمبر ﷺ نے نماز پڑھی مغرب کی، اور دونوں رکعات میں سورۂ اَعراف پڑھی۔ روایت کیا ہے اس حدیث کو نسائی نے۔

یہ حدیث دلالت کرتی ہے اس امر پر کہ وقت مغرب کا بہت تنگ نہیں، اور یہی مذہب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے۔

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "إنَّما جُعِلَ الإمامُ لِيُؤتَمَّ بِهِ، فإذا كَبَّرَ فكبِّرُوا، وإذا قرَأَ فَأَنْصِتُوْا. (رواه أبو داود والنَّسائي). یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ: امام اس غرض کے لیے ہے کہ اس کی تابعداری کی جائے۔ تو وہ جب "اللہ اکبر" کہے، تو تم لوگ بھی "اللہ اکبر" کہو۔ اور جب وہ قرآن شریف پڑھے تو تم لوگ چپ رہو۔ روایت کیا اس حدیث کو ابو داود اور نسائی نے۔

اس حدیث سے تائید ہوتی ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی، یعنی امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنا چاہیے۔

نَهىٰ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أن يَعْتَمِدَ الرَّجُلُ عَلىٰ يَدَيْهِ إذَا نَهَضَ فِي الصَّلَاةِ". (رواه أبو داود). یعنی: منع کیا رسول اللہ ﷺ نے کہ مرد زمین پر ٹیک لگا کر نماز میں اٹھے، یعنی کھڑا ہو۔ روایت کیا اس حدیث کو ابوداود نے۔

یہ حدیث دلیل ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی۔

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ كَانَ مِنكُمْ مُصَلِّياً بعدَ الجُمُعَةِ، فَلْيُصَلِّ أرْبَعاً". (رواه مسلم). یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ: جو شخص تم لوگوں سے نماز پڑھتا ہو، بعد جمعہ کے، تو چاہیے کہ وہ نماز پڑھے چار رکعت۔ روایت کیا اس کو مسلم نے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سنت بعد فرض جمعہ کے چار رکعت ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہی ہے۔

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "مَن نامَ عَنْ وِترِهِ، فَلْيُصَلِّ إذَا أصبَحَ". (رواه التِّرمذيُّ).

یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جو شخص سو جائے نماز وتر میں، تو چاہیے کہ صبح کو پڑھے۔ روایت کیا ہے اس حدیث کو ترمذی نے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس سے ثابت کیا ہے کہ نماز وتر کی واجب ہے۔ ......

......قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِذْ أَحْدَثَ أَحَدُكُم، وقد جَلَسَ فِي آخِرِ صَلاتِه، قبلَ أن يُسَلِّمَ، قَد جَازَتْ صَلاتُه".(رواهُ التِّرمذيُّ)
یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ: جب بے وضو ہو کوئی تم لوگوں میں سے، اخیر قعدے میں، قبل سلام پھیرنے کے، تو اس کی نماز ہو جائے گی۔ روایت کیا اس حدیث کو ترمذی نے۔

یہی مذہب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے۔ اس واسطے کہ لفظ سلام کا کہنا آخر نماز میں امام اعظم کے نزدیک فرض نہیں۔

عَن عَلقَمَةَ قَالَ: قَالَ لَنا ابنُ مَسعُودٍ: أَلا أُصَلِّي بِكُمْ صَلاةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، فَصَلّٰى وَلَمْ يَرْفَعْ يَدَيْهِ إِلَّا مَرَّةً وَاحِدَةً، مَع تَكبِيرِ الافتِتَاحِ".(رواهُ التِّرمذيُّ والنَّسائيُّ). یعنی روایت ہے علقمہ سے کہ کہا علقمہ نے ہم لوگوں سے کہ: کہا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہ: کیا نماز پڑھوں ساتھ تم لوگوں کے، کہ مثل نماز پیغمبر خدا ﷺ کے، پھر نماز پڑھی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے، اور نہ اٹھائے اپنے دونوں ہاتھ، مگر ایک مرتبہ ساتھ تکبیر افتتاح کے۔ روایت کیا اس حدیث کو ترمذی اور نسائی نے۔

اس حدیث سے تائید ہوتی ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی اس امر میں کہ تکبیر افتتاح کے سوا اور کسی تکبیر میں رفع یدین نہیں۔

إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ وأبا بكرٍ وعُمَرَ - رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُمَا - كَانُوْا يَفْتَتِحُوْنَ الصَّلاةَ بِ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ العَالَمِيْنَ".(رواه مسلم). یعنی: پیغمبر خدا ﷺ سے اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما شروع کرتے تھے نماز، ساتھ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ العَالَمِيْنَ" کے۔ روایت کیا اس حدیث کو مسلم نے۔

اس حدیث سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تائید ہوتی ہے، اس مسئلہ میں کہ بسم اللہ سورۃ فاتحہ سے نہیں۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ صَلّٰى صَلاةً لَم يَقرَأْ فِيهَا بِأُمِّ القُرْآنِ، فَهِيَ خِدَاجٌ"، ثلاثًا، "غَيْرُ تَامٍّ".(رواهُ التِّرمَذِيُّ). یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جس نے ایسی نماز پڑھی کہ اس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو وہ نماز ناقص ہوگی۔ یہ تین مرتبہ فرمایا، یعنی وہ نماز ناتمام ہوگی۔ روایت کیا اس حدیث کو ترمذی نے۔

اس حدیث سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے۔ اس واسطے کہ جس نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو اس نماز کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے لفظ "خداج" کا فرمایا۔ اور خداج ناقص کو کہتے ہیں۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ پڑھنا سورۂ فاتحہ کا نماز میں واجب ہے، فرض نہیں۔ اس واسطے کہ فرض چھوڑ دینے سے نماز میں صرف نقصان نہیں ہوتا، بلکہ وہ نماز باطل ہو جاتی ہے۔

عَن أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ: "مَنْ أَدْرَكَ الرَّكْعَةَ أَدْرَكَ السَّجْدَةَ. وَمَنْ فَاتَتْهُ أُمُّ القُرْآنِ فَاتَهُ خَيرٌ كَثِيرٌ".(رواه مَالِكٌ). یعنی: روایت ہے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہ وہ کہتے تھے کہ: جس نے پایا رکوع کو، پس پائی اس نے وہ رکعت، اور جس سے فوت ہوئی سورۂ فاتحہ تو اس سے فوت ہوگئی بہت نیکی۔ روایت کیا اس حدیث کو امام مالکؒ نے۔

یہ بھی دلیل ہے اس مسئلہ کے لئے کہ سورۃ فاتحہ نماز میں فرض نہیں۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَا صَلاةَ لِمَنْ لَمْ يَقرَأْ بِأُمِّ القُرْآنِ فَصَاعِدًا.(رواه مسلم) یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ نہ ہوگی نماز اس کی جس نے سورۂ فاتحہ اور اس سے زیادہ نہ پڑھا۔ روایت کیا اس حدیث کو مسلم نے۔

اس حدیث سے بھی ظاہر تائید ہوتی ہے مذہب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی۔ اس واسطے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: لا صلاۃ، تو اگر اس......

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حنفیہ کا موقف یہ ہے: ضعیف حدیث کو اس مجرد قیاس پر، جو محتمل خطا بھی ہوسکتا ہے، مقدم کیا جائے گا۔ ہاں ان کی ثاقب رائے، جو ان کے بڑے مناقب میں سے شمار کی جانی چاہیئے، یہ ہے کہ وہ نصوص کے ظواہر پر ہی جمے نہیں رہتے، بلکہ وہ چھپی ہوئی باتوں کی تحقیق میں غور وفکر کرتے ہیں، اور مسائل کے چہروں سے پردوں کے نقاب کو نوچ ڈالتے ہیں۔ اسی وجہ سے امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا تھا: تمام مخلوق فقہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی محتاج ہے۔ ان کا یہ قول ان کے علوم کی گہرائی اور کمال انصاف پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالی ان دونوں ائمہ سے راضی ہو اور ہمیں ان کے علوم سے نفع پہنچائے۔

بہر حال! میں نے چاہا کہ میں ان کے دلائل کا ذکر کروں، ان کے مسائل کی وضاحت کروں، اور ان کے جواب میں، مخالفت کرنے والوں کے مقابل ہو کر دفاع کروں، تاکہ عوام جو فقہی مسائل کے دلائل کی کامل معرفت نہیں رکھتے، اس وہم میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ حنفیہ کے مسائل، حنفیہ کے دلائل کے خلاف ہیں۔ اور میں نے اس کا نام "مِرقَاةُ المَفاتِيح لِمِشْكَاةِ المَصَابِيح" رکھا ہے۔

اور جب ملا علی قاری یہ محسوس کرتے ہیں کہ: علامہ طیبی اور ابن حجر ہیتمی ہمارے مذہب پر اعتراض کر رہے ہیں تو اس کا تعقب کرتے ہیں، اور اپنے علوم کے ذریعے اپنے موقف کو بڑی فصاحت سے بیان کرتے ہیں۔ (۱۰۳)

...... سے یہ مراد کہی جائے کہ اصل نماز نہ ہوگی، تو لفظ: ''فصاعداً'' کا درست نہیں ہوتا۔ اس واسطے کہ بالا جماع اس کا کوئی قائل نہیں کہ سورۃ فاتحہ سے زیادہ پڑھنا واجب ہے، تو معلوم ہوا کہ اس حدیث میں مراد نفی نماز سے: نفی کمال ہے۔

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ أَفْطَرَ فِي تَطَوُّعِهِ فَلْيَقْضِه". (رواه أحمد). یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ: جس نے افطار کیا روزہ نفل میں، تو اس پر لازم ہے کہ اس کا قضا روزہ رکھے۔ روایت کیا اس کو احمد نے۔ یہ دلیل ہے مذہب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی، اس مسئلہ میں کہ نفل لازم ہو جاتی ہے شروع کر لینے سے۔

(نوٹ: مذکورہ بالا اردو ترجمہ لفظی ترجمے کا رنگ لیے ہوئے ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ مترجم نے اردو فتاویٰ عزیزی کی عبارت کو من وعن نقل کر دیا ہے۔ کوئی تبدیلی نہیں کی)۔

۱۰۳: اس کا نمونہ علامہ طیبی کا وہ قول ہے جو انہوں نے رسول اکرم ﷺ کے اس ارشاد "لا يمنعنَّ رجلٌ أهلَه أن يأتوا المساجدَ" کی شرح میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے صاحبزادے نے کہا تھا کہ: ہم تو انہیں منع کریں گے، تو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا: میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی حدیث سنا رہا ہوں اور تم آگے سے یہ بات کہہ رہے ہو۔ کہتے ہیں: اس کے بعد حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے موت تک اس بیٹے سے بات نہیں کی۔

مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو اپنے آپ کو سنی کہتا ہے۔ اور جب رسول اللہ ﷺ کی سنت کی کوئی بات سنتا ہے، اور اس کی اپنی بھی کوئی رائے ہوتی ہے، اور وہ اپنی رائے کو سنت پر ترجیح دیتا ہے۔ بھلا اس کے اور بدعتی کے درمیان فرق ہی کیا ہے؟ کیا ایسے شخص نے یہ نہیں سنا کہ: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس کی خواہشات تک میرے لائے ہوئے دین کے تابع نہ ہو جائیں۔ اور یہ دیکھو، عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں، جو اکابر صحابہ اور فقہاء میں سے ہیں۔ کیسے اللہ اور اس کے رسول کی وجہ سے غضب ناک ہوئے، اور اہل خرد......

انہی جلیل القدر اہداف کی وجہ سے موصوف کی یہ شرح ان نافع کتب میں شمار کی جاتی ہے جن کا دقت نظر اور گہرائی سے مطالعہ کرنا ہر محدث کے لیے ضروری ہو گیا ہے۔

......کی عبرت کے لیے اس ایک بات پر ساری عمر کے لیے اپنے جگر کے ٹکڑے کو چھوڑ دیا۔

ملا علی قاری نے اس پر تعقب کرتے ہوئے کہا ہے:

طیبی کے کلام سے علماءِ حنفیہ کے بارے میں معترضانہ کنایہ کی بو آتی ہے، جس کی بنیاد ان کا یہ گمان ہے کہ حنفیہ رائے کو حدیث پر مقدم کرنے کی وجہ سے اصحاب رائے کے نام سے موسوم ہیں۔ حالانکہ موصوف کو یہ معلوم نہیں کہ: انہیں ان کی رائے میں باریک بینی اور حذاقتِ عقل کی وجہ سے ''اصحابِ رائے'' کا نام دیا گیا ہے۔ اسی لیے امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''تمام لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے محتاج ہیں''۔

اور ابن حزم نے کہا ہے: تمام حنفیہ اس کے قائل ہیں کہ: ان کے امام کا مذہب یہ ہے کہ: حدیث اگرچہ ضعیف ہی ہو، رائے اور قیاس سے اولیٰ ہے۔ اس بات کا تذکرہ سخاوی نے کیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے ''المناقب الحسان'' میں کہا ہے:

خوب جان لو کہ: بعض علماء نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کے بارے میں جو ''اصحابِ رائے'' ہونا نقل کیا ہے، کہیں ایسا نہ سمجھ لینا کہ اس سے اُن کا مقصد اِن حضرات کی تنقیص کرنا ہے۔ ان کا مقصد نہ تو تنقیص ہے اور نہ ان کی طرف کوئی ایسی نسبت کرنا ہے کہ وہ اپنی رائے کو رسول اللہ ﷺ کی سنت، اور آپ کے اصحاب کے اقوال پر مقدّم کرتے ہیں۔ اور ائمۂ حنفیہ اس الزام سے بالکل بری ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے یہ بات طرقِ کثیرہ سے منقول ہے کہ: وہ سب سے پہلے قرآن مجید سے استدلال کرتے ہیں۔ اگر مسئلہ قرآن میں نہ ہو تو سنت کو لیتے ہیں۔ اور اگر وہاں بھی نہ ملے تو پھر صحابہ کے قول کو لے لیتے ہیں۔ اور اگر صحابہ کی آراء کسی مسئلہ میں مختلف ہوں تو وہ رائے لے لیتے ہیں جو ان کے اقوال میں قرآن وسنت کے زیادہ قریب نظر آئے۔ اور اگر صحابہ میں سے کسی کا بھی قول نہ ملے تو پھر کسی تابعی کا قول نہیں لیتے، بلکہ ان کی طرح خود ہی اجتہاد کرتے ہیں۔

ابن مبارک کہتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ سے منقول حدیث آ جائے، تو سر آنکھوں پر۔ اگر صحابہ کے اقوال آ جائیں، تو ہم ان میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اگر تابعین کی بات آ جائے تو ہم خود ہی اس کا مقابلہ کر لیتے ہیں۔

آپ ہی کا قول ہے کہ: لوگوں کی باتوں پر تعجب ہوتا ہے۔ کہتے ہیں: رائے سے فتویٰ دیا، حالانکہ کسی اثر کی بنیاد پر فتویٰ دیا ہوتا ہے۔ مزید کہتے ہیں: کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ: کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کے ہوتے ہوئے اپنی رائے پیش کرے۔ اور نہ ہی صحابہ کے متفق علیہ اجماعی مسائل کے ہوتے ہوئے رائے پیش کی جا سکتی ہے۔ ہاں، اگر کسی مسئلے میں صحابہ کی آراء مختلف ہو جائیں، تو ہم اجتہاد کرتے ہوئے، ان آراء میں سے کسی ایسے قول کو اختیار کر لیتے ہیں جو کتاب وسنت کے زیادہ قریب ہو۔ اور جب معاملہ اس سے بھی آگے چلا جائے تو جو شخص اختلاف کی معرفت رکھتا ہے، اس کو چاہیے کہ رائے سے اجتہاد کرے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قیاسات کی باریک بینی کی وجہ سے امام مزنی آپ کے کلام کو بہت کثرت سے دیکھتے تھے۔ حتیٰ کہ آپ کے بھانجے امام طحاوی کو آپ کے اسی عمل نے اس پر ابھارا کہ وہ امام شافعی کے مذہب سے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی طرف منتقل ہو گئے تھے، جیسا کہ امام طحاوی نے خود بھی اس کی صراحت کی ہے۔ ملا علی قاری کا کلام مکمل ہو گیا۔

محدث شیخ عبدالباری بن عبدالوہاب انصاری لکھنوی اپنی بے مثل کتاب: "التَّعلِيقُ المُخْتَار عَلىٰ كِتَابِ الآثَار" کے مقدّ مے میں رقم طراز ہیں:

یہ وہ کتب ہیں جن کا مطالع اور درس وتدریس ہر حنفی محدث کے لیے انتہائی ضروری ہے:

۱ : "موطأ الإمام مالك، رواية الإمام محمّد بن الحسن الشّيباني" رَحِمَهُ الله: امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اللہ کی کتاب کے بعد سب سے صحیح ترین کتاب یہی ہے۔ اور نمونہ کے اعتبار سے ہمیں یہ کافی ہے۔

۲ : "مسند الإمام أبي حنيفة، رواية الإمام محمّد بن الحسن الشّيباني: جو کتاب الآ ثار کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب میں امام محمد نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے مروی احادیث کو جمع کیا ہے، جن میں سے اکثر "عن حمّاد عن إبراهيم عن أصحاب عبد الله بن مسعود عن ابن مسعود، وغيره من الصّحابة رَضِي اللّٰهُ عنهم، جیسی اصح الاسانید والی روایات ہیں۔ اور یہ ایسی روایات ہیں جن کا درجہ تحقیق کے وقت صحاح ستہ کی روایات سے کسی طرح بھی فروتر نہیں ہے۔

۳ : كتاب الحجج للإمام محمد بن الحسن الشّيبانيّ رحمه الله: اس کتاب میں امام محمد نے اہل مدینہ اور امام مالک کے اساتذہ کے مقابلے میں اہل عراق اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اساتذہ کے درمیان تقابل اور محاکمہ کیا ہے۔

۴ : جامع المسانيد: اس کتاب کو امام، محدث، فقیہ، قاضی القضاۃ ابو مؤید محمد بن محمود بن محمد خوارزمی رحمۃ اللہ علیہ نے جمع کیا ہے۔

۵ : معاني الآثار: للإمام ہمام حافظ، نقاد اعلام، شیخ الحدیث ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامہ ابن عبدالملک بن سلمۃ بن سلیمان بن خباب ازدی حجری مصری طحاوی۔

۶ : مُشكِلُ الآثار للإمَام الطَّحاوي : اور یہ کتاب ابھی تک چھپی نہیں ہے۔

میں (یعنی عبدالحلیم نعمانی) کہتا ہوں کہ: اس کتاب کے چار اجزاء طبع ہو چکے ہیں، جو مکمل کتاب کا نصف حصہ بنتا ہے۔ ہاں مشکل الآ ثار کا اختصار طبع ہوا تھا، لہٰذا جسے مشکل الآثار نہ مل سکے، اس کے لیے یہ اختصار بھی غنیمت ہے۔

اس کے بعد انتہائی ضروری ہے کہ صحیحین، جامع ترمذی، سنن اربعہ (یعنی سنن ابن ماجہ، سنن نسائی، سنن دارمی، سنن ابو داؤد سجستانی)، سنن ابوداؤد طیالسی اور سنن دارقطنی کا سرسرا مطالعہ کیا جائے۔ اور اگر مل سکے تو مصنف ابن ابی شیبہ، مسند عبدالرزاق، طبرانی کی کتب اور جامع الاصول کا مطالعہ کیا جائے۔ اور اگر کنز العمال مل جائے تو اس کا مطالعہ اکثر ابواب میں ان تمام کتب سے مستغنی کر دے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کی فتح المنّان، عقود الجواهر المنيفة، مسند الإمام برواية سندي، بخاری شریف پر علامہ عینی کی شرح، اور مشکاۃ شریف پر ملا علی قاری اور محدث دہلوی کی شروحات بہت نافع ہیں (۱۰۴)۔

ملا علی قاری مذکورہ بالا اہداف ہی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اپنی اس شرح میں دینی و اجتماعی معاملات کے ساتھ ساتھ مکہ مکرمہ میں عام روزمرہ کی زندگی کے تغیرات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:

۱۰۴ : دیکھیے: محمد عبدالباری انصاری، مقدمۃ التعلیق المختار علیٰ کتاب الآ ثار ص ۱۰۰۔

ہمارے زمانے میں چوتھی اذان بھی شروع ہوگئی ہے، اس اذان کا مقصد مسجد میں خطیب کے داخل ہونے کی اطلاع دینا ہے۔(۱۰۵)

نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث: مَهلاً، فوَالَّذِي نَفسِي بِيَدِهِ! لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً، لَو تَابَهَا صَاحِبُ مَكْسٍ لَغُفِرَ لَهُ، کی شرح میں فرماتے ہیں:

تعجب بالائے تعجب ہے ہمارے زمانے کے ان علماء اور ہمارے وقت کے ان مشائخ پر، کہ وہ لوگوں سے یہ حقیر مال لیتے ہیں، اور پھر اسے مناصب کی تحصیل میں خرچ کرتے ہیں، اور انجام کے بارے میں کچھ نہیں سوچتے۔ ہم اللہ تعالیٰ ہی سے عافیت اور رزق حلال اور اچھے اعمال کی توفیق کا سوال کرتے ہیں(۱۰۶)۔

مزید اس حدیث: أمَّا إبل الشَّياطين : فقد رأيتُها، يخرج أحدكم بنجيبات معه، قد أسمنها، فلا يعلو بعيرا منها، ويمُرُّ بأخيه قد انقطع به، فلا يحمِلُه" کی شرح میں فرماتے ہیں:

ہمارے زمانے میں تو اس سے بھی بڑی بات ظہور پذیر ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ آج کل کے اکابر کے ساتھ بہت سے اونٹ ہوتے ہیں، اور کمزور لوگوں کے (لاغر) اونٹوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اونٹ حج کے راستے میں کرایے پر لیے گئے ہوتے ہیں، اور وہ ان کے سامان کو (استہزاءً) نیچے گرادیتے ہیں، اور کبھی (جبراً) لے ہی لیتے ہیں۔ ولاحول ولاقوۃ الا باللہ(۱۰۷)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ملا علی قاری نے اپنی اس کتاب میں اختلافی مسائل میں انتہائی وضاحت وبیان کا طریقہ اپنایا ہے، اور ایسی مباحث میں مکمل انصاف سے بحث کی ہے، تاکہ بقدرِ امکان حدیث کے معانی سمجھنے میں آسانی ہو اور بہت خوبصورتی سے ایسی ابحاث کو مکمل کیا ہے۔ اور احسان وافادہ کے ساتھ تحقیق واستدلال میں انتہائی اچھی بحث وتنقید کی ہے۔ علامہ محقق محدث بارع شیخ محمد ادریس کاندھلوی نے، اپنی کتاب "التعليق الصَّبيح علىٰ مشكاة المصابيح" میں موصوف کی شرح کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

ملا علی قاری کی یہ لطیف شرح ہے، جس کی نہج ضبط الفاظ کے ساتھ مبانی کے مکمل ضبط، اور روایات کی معانی کے ساتھ مکمل تحقیق ہے۔ موصوف نے اس میں تمام شروح وحواشی کو جمع کر کے ان کا استقصاء کیا ہے، اور کوئی چھوٹی اور بڑی بات ایسی نہیں ہے جس کو انہوں نے سمیٹ نہ لیا ہو۔ اور میں کھلے لفظوں میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اس تعلیق سے بہت استفادہ کیا ہے۔

اور میرے نزدیک شرح حدیث میں یہ سب سے زیادہ نافع اور جامع کتاب ہے۔ اور یہ ایسی ضخیم کتاب ہے کہ "مشكاة المصابيح" کی مطبوعہ شروحات میں سے کوئی بھی بحث واستدلال اور تحقیق وتنقیح میں اس پائے کی نہیں ہے۔ موصوف نے اس میں متفرقات کو جمع اور محفوظ کیا ہے، اور مباحث کو مکمل طور پر گرفت میں لے لیا ہے۔

---

۱۰۵ : دیکھیے: مرقاۃ المفاتیح (۲:۲۵۲)۔

۱۰۶ : دیکھیے: مرقاۃ المفاتیح (۴:۷۱)۔

۱۰۷ : دیکھیے: مرقاۃ المفاتیح (۴:۲۱۹)۔

اکیلی یہی کتاب فہم حدیث میں تمہیں اچھا ملکہ حاصل کرا دینے کی کفیل ہے، بشرطیکہ تم اس سے خصوصی اور کثیر تعلق رکھو۔ کوئی بھی محدث اور فقیہ اس سے مستغنی نہیں ہوسکتا، اسی وجہ سے عالم اسلام میں اس سے انتفاع عام اور شائع وذائع ہے۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ نے علم، اور تصنیف وحسن تالیف سے حظ وافر پایا تھا۔ ان کی تصنیفات مشرق ومغرب میں مشہور ہوگئی ہیں۔ اور دنیا میں شاید ہی کوئی عربی یا عجمی کتب خانہ ایسا ہو جس میں ملا علی قاری کی کئی ایک کتابیں موجود نہ ہوں، بخلاف ان کے اقران ومعاصرین کی کتب کے، کہ وہ سفید اونٹنی (کی نایاب نسل) سے بھی زیادہ کم یاب ہیں۔ علامہ محبی فرماتے ہیں:

''ملا علی قاری کا تذکرہ مشہور، اور ان کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ انہوں نے جلیل القدر فوائد پر مشتمل بہت زیادہ کتب تالیف کی ہیں''۔

متاخرین کے ہاں ملا علی قاری کی تصانیف کی روایت کا چلن بھی رہا ہے، چنانچہ بعض محدثین نے ان سے ان کی تالیفات کی روایت کی اجازت لی۔ اور وہ علماء جنہیں موصوف نے اپنی کتب کی روایت کی اجازت دی، بہت زیادہ ہیں، اور انہوں نے ان کی کتب کی روایت کے سلاسل کو اپنی معاجم اور اثبات میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ حکیم الامت، محدث الہند علامہ شیخ قطب الدین ولی اللہ بن عبد الرحیم عمری دہلوی (ت ۱۱۷۶ھ) اپنی کتاب الاِنتِبَاہ فِي سَلاَسِلِ أولِيَاء اللّٰه وأسَانِيْدِ وَارِثِي رَسُولِ اللّٰه میں رقم طراز ہیں:

ان میں سے ملا علی قاری ہیں۔ ان کے قلم سے مشکاۃ کی شرح اور بہت سے دوسری مشہور کتب ہیں جو میں نے شیخ اسعد عتاقی مکی کے ہاں دیکھی تھیں جن کی روایت وہ "عَن أبیه عَن جدّہ" کے طریق سے کرتے ہیں اور ان کے جدّ امجد کو شیخ علی قاری نے اپنی تمام کتب کی روایت کی اجازت کی وصیت کی تھی۔ چنانچہ ان کے پاس موصوف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسوّدات موجود تھے (۱۰۸)۔

علامہ محدث فقیہ شیخ محمد امین بن عمر حسینی جنہیں عموماً ابن عابدین کے نام سے پکارا جاتا ہے، نے اپنے مشہور ثبت: "عُقُودُ اللّآلي فِي الأَسَانِيْدِ العَوَالِي" میں ملا علی قاری کی تصانیف کا تذکرہ کرتے ہوئے ان تک اپنی سند بایں الفاظ بیان کی ہے: ملا ابراہیم کورانی، عن ملا محمد شریف بن ملا یوسف کورانی صدیقی، عن سید معظم حسینی بلخی، عن مؤلفہا ملا علی بن سلطان محمد قاری (۱۰۹).

اس مقام پر ہم سمجھتے ہیں کہ موصوف کی علمی میراث کی طرف اشارہ کر دینا چاہیئے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ کی مطبوع کتب کے نام درج ذیل ہیں:

الأحادیث القدسیة

الشماء الحنیة فی أسماء الحنفیة

---

۱۰۸ : دیکھیے: شاہ ولی اللہ کی فارسی کتاب: الانتباہ في سلاسل أولیاء اللّٰه وأسانید وارثي رسول اللّٰه. اس کتاب کا وہ خطی نسخہ، جو ان کے پوتے شیخ عمر بن محمد اسماعیل بن عبد الغنی دہلوی کے نسخہ سے نقل کیا گیا ہے، میرے بڑے بھائی محدثِ بارع، محقق مفضال، شیخ محمد عبد الرشید نعمانی (اطال اللہ بقاءہ) کے پاس محفوظ ہے۔

۱۰۹ : "عقود اللّآلي في الأسانید العوالي" (ص ۱٤۲، مطبعة المعارف، بولایة سوریة ۱۳۰۲هج)

جمع الوسائل فی شرح الشمائل

الحرز الثمین للحصن الحصین

الحزب الأعظم والورد الأفخم لانتسابه واستناده الی الرسول الأكرم

شرح الشفاء (للقاضی عیاض)

الضابطية للشاطبية وهو شرح على الشاطبية

عين العلم وزين الحلم

فتح الرحمان بفضائل شعبان

المبين المعين لفهم الأربعين

مرقاة المفاتيح لمشكاة المصابيح

المشرب الوردى فى حقيقة (مذهب) المهدى

مصطلحات أهل الأثر على نخبة الفكر

منح الروض الأزهر فى شرح الفقه الأكبر

المنح الفكرية بشرح المقدمة الجزرية

الموضوعات

نزهة الخاطر الفاتر فى ترجمة سيدى الشريف عبد القادر

اور موصوف کی وہ کتب جو اب تک طبع نہیں ہو سکیں، درج ذیل ہیں:

اتحاف الناس بفضل و ج وابن عباس

الأجوبة المحررة فى البيضة الخبيثة المنكرة

الأدب فى فضائل رجب۔ چار مقالے ہیں۔

الأزهار المنثورة فى الأحاديث المشهورة

الاستئناس بفضائل ابن عباس

الاستدعاء فى الاستسقاء

الأسرار المرفوعة فى الأخبار الموضوعة

الاصطناع فى الاضطباع

الأصول المهمة فى حصول المتمة

إعراب القاری علی أول باب البخاری

الإعلام لفضائل بيت الله الحرام

الاعتناء بالغناء فی الغناء

الانباء بان العصا من سنن الأنبياء

أنوار الحجج فی أسرار الحج

أنوار القرآن وأسرار الفرقان

الاهتداء فی الاقتداء

بداية السالك فی نهاية المسالك فی شرح المناسك

البرة فی حب الهرة

البرهان الجلی علی من تسمی من غير مسمی بالولی

بهجة الإنسان ومهجة الحيوان

بيان فعل الخير إذا دخل مكة من حج عن الغير

البينات فی بيان تباين بعض الآيات

التائبية فی شرح التائية لابن المقری

التبيان فی بيان ما فی ليلة النصف من شعبان وليلة القدر من رمضان

تبعيد العلماء عن تقريب الأمراء

التجريد فی إعراب كلمة التوحيد

تحفة الحبيب فی موعظة الخطيب

تحقيق الاحتساب فی تدقيق الانتساب

تزيين العبارة فی تحسين الإشارة

تسلية الأعمی عن بلية العمی

تشييع فقهاء الحنفية فی تشنيع سفهاء الشافعية

التصريح فی شرح التسريح

تطهير الطوية فی تحسين النية

تعليقات القاری علی ثلاثيات البخاری

توضيح المبانی وتنقيح المعانی، وهو شرح مختصر المنار لزين الحلبی.

التهدين ذيل التزيين على وجه التبيين. هی رسالة فی الإشارة بالمسبحة فی التشهد كالمتقدمة

الجمالين على تفسير الجلالين

جمع الأربعين فی فضل القرآن المبين

حاشية على فتح القدير

حاشية على المواهب اللدنية

حاشية على شرح رسالة الوضع للسمرقندی

حدود الأحكام

الحظ الأوفر فی الحج الأكبر

دامغة المبتدعين وناصرة المهتدين

الدرة المضية فی الزيادة المصطفوية

دفع الجناح وخفض الجناح فی فضائل النكاح

الذخيرة الكثيرة فی رجاء المغفرة للكبيرة

ذيل الرسالة الوجودية فی نيل مسألة الشهودية

ذيل الشمائل للترمذی

رد الفصوص

رسالة فی الأبوين الشريفين

رسالة فی إفراد الصلاة عن السلام

الرسالة العطائية فی الفرق بين صفد وأصفد

رسالة فی بيان التمتع فی أشهر الحج

رسالة فی كرامات الأولياء

رسالة فی الرد على من نسبه إلى تنقيص الإمام الشافعی

رسالة فی مناقشة البيضاوی فی الحديث الذی ذكره فی رفع العذاب عن أهل القبور

الرهص والوقص لمستحل الرقص

زبدة الشمائل وعمدة الوسائل

الزبدة فی شرح قصیدة البردة

سلاسة الرسالة فی ذم الروافض من أهل الضلالة

شرح الجامع الصغیر للسیوطی

شرح حزب البحر

شرح رسالة بدر الرشید فی ألفاظ الکفر

شرح الرسالة القشیریة

شرح صحیح مسلم

شرح مسند الإمام الأعظم

شرح الوقایة فی مسائل الهدایة

شفاء السالك فی إرسال مالك

شم العوارض فی ذم الروافض

الصلاة والجوائز فی صلاة الجنائز

صنعة الله فی صبغة الله

الضیعة الشریفة فی تحقیق البقعة المنفیة

الطواف بالبیت ولو بعد الهدم

العفاف عن وضع الید فی الطواف، أی: فی وضع الید علی الصدر

العلامات البینات فی فضائل بعض الآیات

عمدة الشمائل

غایة التحقیق فی نهایة التدقیق. یہ رسالہ ان مسائل کے بارے میں لکھا گیا تھا جن میں اہل حرمین اس وجہ سے مبتلا ہوئے تھے کہ انہیں مخالف مذہب کے امام کی اقتدا میں نماز ادا کرنی پڑتی تھی۔ اور اس وجہ سے ایک ہی مسجد میں تکرار جماعت کی صورت پیش آتی تھی۔ اور ایسے ہی عصر کی نماز کا وقت، قراءت خلف الامام اور جمعہ کی نماز کے بعد کی چار رکعتوں جیسے مسائل اس رسالہ میں زیر بحث ہیں۔

فتح أبواب الدین فی شرح آداب المریدین

فتح الأسماع فی شرح السماع

فتح باب الاستسعاد فی شرح قصیدة بانت سعاد

فتح باب العنایة شرح کتاب النقایة

فتح المغطا شرح الموطأ للإمام(۱۱۰)

فرائد القلائد على أحاديث شرح العقائد

فر العون ممن يدعى إيمان فرعون

الفصل المعول فى الصف الأول

الفصول المهمة فى حصول المتمة

رسالة فى إتمام الركوع

فيض الفائض فى شرح الروض الرائض فى الفرائض

القول الجائز فى صلاة الجنائز

قوام الصوام للقيام بالصيام

القول الحقيق فى موقف الصديق

القول السديد فى خلف الوعيد

كشف الخدر عن حال الخضر

كنز الأخبار فى الأدعية وما جاء من الآثار

لب لباب المناسك فى نهاية المسالك

لسان الاهتداء فى بيان الاقتداء

المختصر الأوفى فى شرح الأسماء الحسنى

المرتبة الشهودية فى منزلة الوجودية

المسلك الأول فيما تضمنه الكشف للسيوطى

المسلك المتقسط فى المنسك المتوسط

المسألة فى شرح البسملة

معرفة النساك فى معرفة المسواك

المقالة العذبة فى العمامة والعذبة

---

۱۱۰ : شیخ محمد عبدالحیٔ لکھنوی نے "التعليق الممجّد" میں کہا ہے:
موطأ محمد پر آپ کی شرح دو جلدوں میں ہے، جو لطیف نفائس وغرائب پر مشتمل ہے۔ بس یہ ہے کہ اس میں رجال کی تنقید کے بارے میں کافی تسامحات ہیں، جیسا کہ مختلف مواضع میں آپ ان پر مطلع ہو جائیں گے۔

المقدمة السالمة فی خوف الخاتمة

ملخص البيان فی ليلة النصف من شعبان

الملمع فی شرح لغت المرضع

المعدن العدنی فی فضل أويس القرنی

المنح علی حزب الفتح لأبی الحسن البكری

الناموس فی تلخيص القاموس

النسبة المرتبة فی المعرفة والمحبة (المسألة المشكلة فی المعرفة والمحبة والخلة).

النعت المرصع فی المجنس المسجع فی مشكلاة الصلاة.

المورد الروی فی المولد النبوی

الوقوف بالتحقيق علی موقف الصديق فی ان وقوف الصديق وعمر رضی الله عنهما ما كان إلا فی عرفة.

الهيئة السنيات فی تبيين أحاديث الموضوعات

الهبة السنية العلية علی أبيات الشاطبية الرائية

شیخ محمد طاہر بن عبد القادر کردی مکی اپنی کتاب "تَارِيخُ الخَطِّ العَرَبِيِّ وآدَابِه" (ص۲۹۳) میں کہتے ہیں: آستانہ کے کتب خانہ علی پاشا میں ملا علی قاری کی تمام تصنیفات موجود ہیں۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ کی وفات مکہ مکرمہ میں شوال ۱۰۱۴ھ میں ہوئی، اور جنت المعلاۃ میں تدفین عمل میں آئی۔

مشہور مؤرخ مولی محمد محبی (متوفی ۱۱۱۱ھ) اپنی کتاب "خلاصة الأثر في أعيان القرن الحادي عشر" میں فرماتے ہیں:

جب ان کی وفات کی خبر مصر کو علماء کو پہنچی، تو انہوں نے ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی، اور مجمع تقریباً چار ہزار سے بھی زیادہ افراد کا تھا۔

شیخ عبد الحی لکھنوی رحمہ اللہ نے "اَلسِّعَايَة" کے مقدمے میں کہا ہے: میں نے جنت المعلی میں موصوف کی قبر کی زیارت کی ہے۔

والحمدُ لِلّٰه عَلٰى ذٰلِكَ.

محمد عبد الحليم بن محمد عبد الرحيم چشتی

۱۷ . ۷ . ۱۳۸٦ھ

پہلی حدیث: (ملاحظہ ہو: جلد۱، حدیث: ۱۰۵)

صنفان من امتی لیس لهما فی الاسلام نصیب: المرجئة والقدریة۔ غریب

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: اس حدیث کو امام ترمذی اور امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہما نے نقل کیا ہے۔

حدیث کا مدار نزار بن حبان پر ہے۔ اس کی سند یوں ہے: نزار بن حبان عن عکرمة عن ابن عباس رضی اللہ عنہ۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن غریب ہے۔

''نِزار'' نون مکسور اور رائے مخففہ کے ساتھ ہے اور اس کے آخر میں رآء ہے۔ یہ محدثین کے ہاں ضعیف ہیں۔

شواہد: اس حدیث کو ان سے اِن کے بیٹے علی بن نزار نے بھی روایت کیا ہے، اور یہ بھی ضعیف ہیں۔ لیکن قاسم بن حبیب نے اِن کی متابعت کی ہے۔ اور جب حدیث ایسے دو طرق سے آئے کہ اُن میں سے ہر ایک ضعیف ہو تو دونوں طرق ایک دوسرے کے ذریعے قوی ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

اس کے حسن ہونے کی تائید حضرت جابر رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ اور دیگر صحابہ کے طرق سے بھی ہوتی ہے۔ ان طرق کی اسانید بھی ضعیف ہیں۔

روایت از روئے درایت:

اس (روایت) میں موضوع ہونے کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی، چونکہ دونوں گروہوں سے اسلام کی نفی کرنے سے کفر کا اثبات لازم نہیں آتا چونکہ یہ ایمانِ کامل کی نفی پر محمول ہے، یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا عقیدہ کافر کے عقیدہ کی طرح ہے۔ نفرت میں مبالغہ مراد ہے۔ حقیقی کفر مراد نہیں ہے۔ (کیونکہ اس کا حمل ان دونوں معنیٰ پر ہوتا ہے)۔ اس (مفہوم) کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان دونوں کو (من امتی فرما کر) اپنی اُمت میں سے قرار دیا ہے۔

دوسری حدیث: (ملاحظہ ہو: جلد۲، حدیث: ۱۰۷)

"القدرية مجوس هذه الامة۔"

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: اس حدیث کو امام ابوداؤد، امام ترمذی اور امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہم نے نقل کیا ہے۔ ان سب نے یہ حدیث "عبد العزیز بن ابی حازم عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم" روایت کی ہے۔ (اس حدیث کی اسنادی حیثیت کے بارے میں) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے، اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد "صحیح الاسناد" قرار دیا ہے۔

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: اس کے راوی صحیح کے راویوں میں سے ہیں، لیکن ابن حازم کا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اِس حدیث کا سماع محلِ نظر ہے۔ ابن ابی حازم کا نام سلمہ بن دینار ہے۔

منذری رحمۃ اللہ علیہ نے ابن حازم کے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے عدم سماع پر جزم کیا ہے۔

ابوالحسن بن القطان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابن ابی حازم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو پایا ہے، وہ ان کے ساتھ مدینے میں تھے۔ پس امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کے مطابق یہ روایت متصل ہے۔

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: یہ سند پہلی سے زیادہ قوی ہے اور یہ حسن کی شرط ہے۔

روایت از روئے درایت:

شاید جو اس حدیث پر موضوع ہونے کا اطلاق کرتا ہے وہ اس بات سے سند پکڑتا ہو کہ قدریہ کو (اس حدیث میں) مجوس کہا گیا ہے حالانکہ وہ مسلمان ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ (حرف تشبیہ محذوف ہے) مراد یہ ہے کہ قدریہ اثباتِ فاعلین میں مجوس کی طرح ہیں، مجوس کے تمام اعتقادات میں ان کے مشابہ ہونا مراد نہیں ہے، اس وجہ سے قدریہ کی نسبت اس اُمّت کی طرف کرنا جائز ہے۔

تیسری حدیث: (ملاحظہ ہو: جلد ۳، حدیث: ۱۳۲۸)

حدیث صلاۃ التسبیح۔

اس حدیث کا امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہونا محلِ نظر ہے۔ اس لئے کہ اس بارے میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے مختلف کلام منقول ہے، اور کسی نے بھی اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر موضوع ہونے کا اطلاق کیا ہے۔

شیخ موفق بن قدامہ نے ابوبکر اَثرم سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

میں نے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے صلاۃ تسبیح کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا: "مجھے پسند نہیں۔ اس بارے میں کچھ بھی صحیح نہیں ہے۔" اور انہوں نے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا، گویا کہ وہ اس کا انکار کررہے ہیں۔

موفق فرماتے ہیں کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے صلاۃ تسبیح کے بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں کی، اور نہ ہی اُسے مستحب سمجھا۔ اگر انسان صلاۃ تسبیح پڑھ لے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے اس قول سے رجوع کرلیا تھا۔ چنانچہ علی بن سعید نسائی فرماتے ہیں: میں نے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے صلاۃ التسبیح کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا: اس بارے میں

میرے پاس کوئی صحیح حدیث نہیں ہے۔ میں نے کہا: مستمر بن ریان عن ابی حریراء عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے (طریق سے مروی روایت) کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ تو اُنہوں نے فرمایا: تمہیں حدیث کس نے بیان کی؟ میں نے کہا: مسلم بن ابراھیم نے۔ تو انہوں نے فرمایا: مستمر ثقہ ہیں۔ گویا امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو اچھا سمجھا۔ اھ۔

پس امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول یہ کلام مقتضی ہے کہ اُنہوں نے صلاۃ التسبیح کے مستحب ہونے کی طرف رجوع کر لیا تھا۔

البتہ جو کلام امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ حضرات سے منقول ہے، وہ معارض ہے اس شخص کے جس نے صلاۃ تسبیح کی حدیث کو تقویت دی ہے اور اس پر عمل کیا ہے۔

اہل علم کا اتفاق ہے کہ موضوع حدیث پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ ضعیف حدیث پر عمل صرف فضائل اور ترغیب وترہیب میں کیا جائے گا۔ صلاۃ تسبیح کی حدیث کئی ائمہ اسلام وحفاظ نے نقل کی ہے۔

شواہد: امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے "السنن" میں، امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے "الجامع" میں اور امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی "صحیح" میں روایات نقل کی ہیں۔ لیکن کہا ہے کہ اگر حدیث ثابت ہو۔ اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے "مستدرك" میں روایت نقل کی ہے اور صحیح الاسناد کہا ہے۔ امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے تمام طرق کو ایک جزء میں الگ کیا ہے، پھر خطیب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کیا، پھر حافظ ابوموسیٰ مدینی نے اس کے تمام طرق کو ایک جزء میں جمع کیا جس کا نام اُنہوں نے "تصحیح صلاة التسبیح" رکھا ہے۔ میرے پاس اس کے طرق کا ایک مجموعہ ہے جو دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرق موصولہ اور متعدد تابعین کے طرق مرسلہ پر مشتمل ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے "الجامع" میں ایک باب "ماجاء فی صلاة التسابیح" باندھا ہے اور اس میں اُنہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث نقل کی ہے جو نماز میں مطلق تسبیح کے بارے میں ہے، یہ حدیث رکوع وسجود میں کئے جانے والے ذکر کی احادیث پر اضافہ ہے۔ اور پھر فرمایا:

"وفی الباب عن عبد الله بن عباس وعبد الله بن عمرو والفضل بن عباس، وابی رافع"

ہمارے شیخ ابوالفضل بن العراقی حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر بن الخطاب سے بھی مروی ہے، اور میں نے ان دونوں پر چند احادیث کا اضافہ کیا ہے جو شیخ محی الدین النووی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الاذکار" میں حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، ان کے بھائی حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، ان کے بھتیجے حضرت عباس بن جعفر، اُمّ المومنین، حضرت اُمِ سلمۃ سے اور ایک بے نام انصاری سے مروی ہیں۔ حافظ مزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ انصاری حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہیں۔ پس دس اشخاص یہ ہیں۔ دو افراد مزید ہو گئے: (۱) حضرت امّ سلمۃ (۲) انصاری صحابی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث اس کے علاوہ ہے جس کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔

اس حدیث کو مرسل روایت کرنے والوں میں محمد بن کعب قرظی، ابوجوزاء، مجاھد، اسماعیل بن رافع اور عُروۃ بن رویم شامل ہیں۔ پھر ان میں سے بعض حضرات سے مرسلاً روایت کی گئی ہے، جیسا کہ ان میں سے بعض سے موصولاً روایت کی گئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کئی طرق سے مروی ہے۔ان طرق میں سے قوی ترین وہ طریق ہے جس کی تخریج امام ابوداؤد، امام ابن ماجہ، ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے علاوہ دیگر محدّثین نے بطریق حکم بن اَبان عن عکرمۃ کی ہے۔حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے اور بھی طریق ہیں، جن میں عطاء، ابوالجوزاء اور دیگر محدثین شامل ہیں۔

خلیل کی اس روایت کے بارے میں کہ جس کو انہوں نے ان کی سند سے ''الارشاد'' میں نقل کیا ہے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اس حدیث میں اس سے زیادہ حسن سند روایت نہیں کی گئی ہے۔''

ابوبکر بن ابی داود اپنے والد سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''صلاۃ التسبیح میں اس حدیث کے علاوہ صحیح حدیث کوئی نہیں ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی حدیث امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے ''سنن'' میں ابوالجوزاء کے طریق سے یوں نقل کی ہے: ''مجھے ایک ایسے شخص نے حدیث بیان کی جس کو شرف صحابیت حاصل ہے۔''

محدّثین کا گمان ہے کہ وہ صحابی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔

اس حدیث کو ابن شاہین رحمۃ اللہ علیہ نے ''الترغیب'' میں ''عمرو بن شعیب بن محمد بن عبد اللہ بن عمرو عن ابیہ عن جدہ'' کے طریق سے روایت کیا ہے۔

حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث ابونعیم الاصبہانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''قربان المتقین'' میں ذکر کی ہے۔

حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ کی حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔امام ابوبکر بن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں کو قبول کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث کو امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے:

''یہ روایت صحیح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو یہ نماز (صلاۃ التسبیح) سکھائی تھی۔''

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں کہ ''اس حدیث کی سند صحیح ہے بے غبار ہے۔''

اسی حدیث کو محمد بن فضیل رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب الدعاء'' میں ایک اور طریق سے بروایت حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ موقوفا نقل کیا ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ابونعیم الاصبہانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''قربان المتقین'' میں نقل کیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کو امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ابراہیم بن احمد بن جعفر خرقی رحمۃ اللہ علیہ نے ''فوائد'' میں نقل کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کی حدیث کو بھی امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔

حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کو ابونعیم الاصبہانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''قربان المتقین'' میں نقل کیا ہے۔

جہاں تک بات ہے مراسیل کی تو مراسیل کو سعید بن منصور، ابوبکر بن ابی داؤد، خطیب اور دیگر نے اپنی مذکورہ تصانیف میں نقل کیا ہے۔میں نے ایک الگ جزء میں اس کے طرق کو مع بیان علل و تفصیل احوال رواۃ جمع کیا ہے۔اور اس جزء میں وہ مثال

بھی مذکور ہے جس (مثال) میں تاویل کرنے والے دو شخصوں کا تصحیح وتضعیف کی بابت اختلاف ہے۔ وہ دو اشخاص امام حاکم اور ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہما ہیں۔ چونکہ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ صحیح قرار دینے میں متساہل مشہور ہیں، اور امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ دعوی وضع میں متساہل مشہور ہیں۔ ان دونوں نے یہ حدیث روایت کی ہے۔ چنانچہ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح کی ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ اور ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح کی ہیکہ یہ موضوع ہے۔ حق بات یہ ہے کہ یہ حدیث اپنے ان طرق کی کثرت کی وجہ سے کہ جن سے پہلا طریقہ قوی ہو جاتا ہے، حسن کے درجہ میں ہے۔ واللہ اعلم۔

چوتھی حدیث: (ملاحظہ ہو: جلد ۴، حدیث: ۱۷۳۷)

"من عزّی مصاباً فله مثل أجره۔"

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: اس حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے باحوالہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ اس کے رجال صحیحین کے رجال ہیں سوائے علی بن عاصم کے، کیونکہ یہ محدّثین کے ہاں ضعیف ہیں۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد (اس کی اسنادی حیثیت کے بارے میں) فرماتے ہیں:

"ہم اس حدیث کے مرفوع ہونے سے واقف نہیں ہیں سوائے علی بن عاصم سے۔"

بعض نے اس حدیث کو علی بن عاصم کے شیخ محمد بن سوقہ سے بروایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ موقوفاً روایت کیا ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں: "محدّثین نے علی بن عاصم کی حدیث کو ناپسند کیا ہے، اور اس کو اُن کی غلطیوں میں شمار کیا ہے۔"

احمد بن عدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ایک جماعت نے علی بن عاصم کی متابعت کرتے ہوئے روایت کیا ہے۔ ان میں سے بعض نے اس حدیث کو علی بن عاصم سے چرایا ہے، اور ان میں سے بعض سے اس میں خطا ہوئی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

"من عزّی اخاه المسلم من مصيبته كساه الله حلة۔"

اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔

ابوالشیخ رحمۃ اللہ علیہ نے "کتاب الثواب" میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اس کے ہم معنی حدیث نقل کی ہے اور ابو یعلی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کو دوسرے الفاظ میں نقل کیا ہے۔

اور ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ جب حدیث کے طرق متعدد ہو جائیں تو بعض بعض کے ذریعے قوی ہو جاتے ہیں۔ اور جب حدیث قوی ہو جائے تو اس پر یہ اطلاق کیسے مستحسن ہو سکتا ہے کہ "یہ مختلق ہے۔"

پانچویں حدیث: (ملاحظہ ہو: جلد ۷، حدیث: ۳۵۶۹)

اقيلو ذوی الهيئات عثر اتهم الاّ الحدود

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام نسائی رحمۃ اللہ علیہما نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے، اور ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو اسی طریق سے نقل کیا ہے جس طریق سے امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ طریق یہ ہے: عبد الملك بن زيدمن ولد ابی بکر عن عمرة عن عائشه رضی اللہ عنہا۔ اور فرمایا:

''اس سند کے ساتھ یہ حدیث منکر ہے، اس حدیث کو عبدالملک کے علاوہ کسی اور نے روایت نہیں کیا ہے۔''

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو ایک اور طریق سے بروایت'' عطاف بن خالدعن عبد الرحمن بن ابی بکر عن ابیه عن عمره ''نقل کیا ہے۔ اس حدیث کو عمرہ سے ایک دوسرے طریق سے بھی نقل کیا ہے۔ اور اس طریق کے راویوں پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ البتہ اس حدیث کے وصل وارسال میں اختلاف ہے۔ پس مناسب نہیں کہ کسی بھی ایسی حدیث کو موضوع کا نام دیا جاوے جو ان طرق سے مروی ہو۔

چھٹی حدیث: (ملاحظہ ہو: جلد ۸، حدیث: ۴۴۵۲)

''یکون فی آخر الزمان قوم یخضبون بهذا السواد کحواصل الحمام لا یجدون رائحة الجنة۔''

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام نسائی رحمۃ اللہ علیہما نے'' عبد الكريم عن عكرمة عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ''نقل کیا ہے۔ عبدالکریم کی طرف (السنن) میں (کسی بھی حدیث کی) نسبت نہیں کی گئی ہے۔ ان کے طبقہ میں ایک اور عبدالکریم ہیں وہ بھی عکرمہ سے روایت کرتے ہیں۔

اول الذکر (عبدالکریم) ابن مالک جزری ثقہ راوی ہیں، ان پر سب کا اتفاق ہے۔ امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے ان سے (روایات کی) تخریج کی ہے۔ اور دوسرے (عبدالکریم) ابن ابی المخارق ہیں۔ ان کی کنیت ابوامیہ ہے۔ یہ ضعیف ہیں۔ چنانچہ حفاظ میں سے ابوالفضل بن طاہر، ابوالقاسم بن عساکر، ضیاء ابوعبداللہ مقدسی، ابومحمد منذری اور دیگر حضرات نے جزم کیا ہے کہ یہ (عبدالکریم نامی راوی) جزری ہیں۔ مزید یہ کہ یہ حدیث بعض طرق میں انہی کی نسبت سے وارد ہے۔

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: اور یہی تقاضا ہے اس شخص کے صنیع کا جس نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ جیسے ابن حبان اور امام حاکم۔

ساتویں حدیث: (ملاحظہ ہو: جلد ۸، حدیث: ۴۵۰۶)

''(انّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم رای رجلاً یتبع همامةً، فقال شیطان یتبع شیطانًا وفی روایة: شیطانة))۔''

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: اس حدیث کو امام ابوداؤد، امام ابن ماجہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم نے نقل کیا ہے، اور امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ ان سب محدثین نے اس حدیث کو'' محمد بن عمرو بن علقمة عن ابی سلمة عن ابی هريره رضی اللہ عنہ'' نقل کیا ہے۔

(اس حدیث کے راوی) محمد صدوق ہیں، ان کے حفظ میں کچھ فرق ہے، ان کی حدیث حسن کے مرتبہ میں ہے۔ اور جب (ایسی حدیث) معتبر کے تابع لائی جائے تو اس کو قبول کیا جائیگا۔ اور کبھی (ایسی حدیث سے) احتجاج میں توقف کیا جاتا ہے، جب راوی ایسا تفرد اختیار کرے جس کی متابعت نہ کی گئی ہو بلکہ اس میں اس کی مخالفت کی گئی ہو۔ پس اس کی حدیث شاذ ہوگی لیکن

وہ (رُوبہ زوال ہوکر) ضعف کے درجے تک نہیں پہنچے گی چہ جائیکہ وہ موضوع کے رتبہ کو پہنچ جائے۔

بعض محدثین نے اس کی سند میں ایک راوی کا اضافہ کیا ہے۔ چنانچہ اس حدیث کو امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے شریك عن محمد بن عمرو عن ابی سلمة عنیحییٰ بن عبد الرّحمن بن حاطب عن عائشه رضی اللہ عنہا اور پہلے طریق کی طرح'' حمّاد بن سلمةعن محمد بن عمر و'' بھی نقل کیا ہے۔

اور یہ قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ اس لیے کہ حماد ضبط میں شریک سے زیادہ پختہ ہیں۔ اور احتمال اس بات کا بھی ہے کہ ابوسلمہ نے اس کو دو طرح سے روایت کیا ہو۔

آٹھویں حدیث: (ملاحظہ ہو: جلد ۸، حدیث: ۴۶۵۷)

(اذا کتب أحدکم کتاباً فلیتبر به، فانه أنجح للحاجة) ثم قال: هذا منکر۔

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: اس حدیث کی تخریج امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حمزه عن ابی الزبیرعن جابر رضی اللہ عنہ کے طریق سے کی ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ (اس حدیث کی اسنادی حیثیت کے بارے میں) فرماتے ہیں: یہ حدیث منکر ہے اور ہم سوائے اس طریق کے اس حدیث سے واقف نہیں ہیں۔ اور میرے نزدیک حمزہ یعنی ابن عمرو نصیبی حدیث میں ضعیف ہیں۔

امام عقیلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''یہ حمزہ ابن ابی حمزہ ہیں، ابی حمزہ کا نام میمون ہے۔ روایات میں اکثر جو حمزہ نصیبی آتا ہے اس کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔''

امام ابن عدی، امام ابن حبان اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ شخص موضوعات کو ثقات سے روایت کرتا ہے۔

شواہد: میں (ابن حجر) کہتا ہوں: یہ (راوی) ضعیف ہونے کے باوجود (اس حدیث کی روایت میں) اکیلا نہیں ہے، بلکہ ابواحمد بن علی الکلاعی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوالزبیر سے ان کی متابعت کی ہے۔ امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تخریج کی ہے۔

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: اس حدیث پر موضوع کا حکم نہیں لگ سکتا، جب کہ یہ دوسرے طریق سے بھی مروی ہے۔ اس کو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ''عمربن ابی عمرعن ابی الزبیر'' کے طریق سے بھی نقل کیا ہے۔

نویں حدیث: (ملاحظہ ہو: جلد ۸، حدیث: ۴۸۵۶)

(لا تظهر الشماتة لاخیك فیرحمه الله ویبتلیك)۔

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: اس حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے'' مکحول عن واثلة بن الأسقع ''روایت فرمایا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ (اس حدیث کی اسنادی حیثیت کے بارے میں) فرماتے ہیں: ''یہ حدیث حسن غریب ہے۔ مکحول نے واثلہ سے سماع کیا ہے۔''

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ایک ہم معنی شاہد پیش کیا ہے:

عن ثور بن یزید عن خالد بن معدان عن واثلة قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم :

''من عیر اخاہ بذنب لم یمت حتی یعمله۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو حسن غریب بھی کہا ہے۔ اسی طرح ان دونوں حدیثوں کو حسن اور غرابت کے وصف سے متصف کیا ہے۔ غرابت کی وجہ تو یہ ہے کہ ان دونوں کے راویوں نے اپنے شیخ سے تفرد اختیار کیا ہے، یہ غرابت نسبیّہ ہے، اور حسن اس بناء پر ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے تقویت حاصل ہو رہی ہے۔

امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی مخالفت کی ہے، چنانچہ وہ (اس حدیث کی اسنادی حیثیت کے بارے میں) فرماتے ہیں:

لا اصل له من كلام النبی ﷺ

"نبی کریم ﷺ کے کلام میں اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے۔"

دسویں حدیث: (ملاحظہ ہو: جلد ۸، حدیث: ۴۹۰۸)

(حبك الشئى يعمى ويصم)۔

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: اس حدیث کو امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے "خالد بن محمد الثقفی عنبلال بن أبی الدّرداء عن ابیه عن النبی ﷺ" نقل کیا ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کو اسی طریق سے مرفوع اور موقوف نقل کیا ہے اور موقوف اشبہ ہے۔ یہ بات امام منذری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمائی ہے۔

اس کی سند میں ابوبکر بن ابی مریم ہیں، وہ شامی ہیں اور صدوق ہیں۔ رات کے وقت ان کے ہاں چور آئے تو وہ گھبرا گئے چنانچہ ان کی عقل میں تغیر آ گیا۔ پس محدثین نے ان کا شمار ان لوگوں میں کیا ہے جو اختلاط (عقل کی خرابی) کا شکار ہو گئے تھے۔

اس حدیث کی تشریح یہ ہے کہ یہاں خبر بمعنی نہی ہے، کہ خواہشات کی اتباع سے روکنا مراد ہے، چونکہ جو شخص یہ کام کرتا ہے وہ نہ اپنے اس فعل کی بُرائی کو دیکھتا ہے اور نہ اپنے اصلاح کرنیوالے کی نصیحتوں کو سُنتا ہے۔ یہ اسی شخص کے ساتھ ہوتا ہے جو اپنے احوال نفس کی خبر نہ لیتا ہو۔ (واللہ اعلم)

گیارہویں حدیث: (ملاحظہ ہو: جلد ۸، حدیث: ۵۰۱۹)

(المرء علی دین خلیله فلینظر احدکم من یخالل)۔

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: اس حدیث کو امام احمد، امام ابوداؤد اور امام ترمذی رحمہم اللہ نے نقل کیا ہے۔ اِن سب نے اس حدیث کو موسیٰ بن وردان عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ (اس حدیث کی اسنادی حیثیت کے بارے میں) فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن غریب ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں: **(الرّجل علی دین خلیله)**

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے، اور اس کے راوی ثقہ ہیں، سوائے اس راوی کے جس نے اس حدیث کو موسیٰ سے روایت کیا ہے، کہ ان کے بارے میں اختلاف ہے۔

بارہویں حدیث: (ملاحظہ ہو: جلد ۸، حدیث: ۵۰۵۵)

(لا حکیم الاّ ذو تجربة، ولا حلیم الاّ ذو عثرة)۔

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: اس حدیث کو امام احمد، امام ترمذی اور امام حاکم رحمہم اللہ نے "عمرو بن الحارث عن دراج أبی السمح عن ابی الھیثم عن ابی سعید رضی اللہ عنہ" روایت کیا ہے۔

(اس حدیث کی اسنادی حیثیت کے بارے میں) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "یہ حسن غریب ہے"۔ اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: "یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔"

شواہد: میں (ابن حجر) کہتا ہوں: امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اس نسخہ کو بروایت ابن وہب "عن عمرو بن الحارث عن دراج عن ابی الھیثم عن ابی سعید رضی اللہ عنہ" صحیح قرار دیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس نسخہ کی بہت سی احادیث کو اپنی "صحیح" میں نقل کیا ہے۔

تیرہویں حدیث: (ملاحظہ ہو: جلد ۸، حدیث: ۵۰۸۵)

(المؤمن غرّ کریم، والفاجر خبٌّ لئیم)۔

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: اس روایت کو امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے "یحی بن ابی کثیر عن ابی سلمه عن ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ" کے طریق سے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ (اس حدیث کی اسنادی حیثیت کے بارے میں) فرماتے ہیں:

غریب لا نعرفه الا من هذا الوجه۔

شواہد: میں (ابن حجر) کہتا ہوں: یہ روایت ان دونوں کے ہاں بشر بن رافع عن یحی کے طریق سے ہے، اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے "حجاج بن فرافصة عن یحیٰ" کے طریق سے موصولاً نقل کی ہے، اور کہا ہے اختلف فی وصله وارساله "اس حدیث کے موصول و مرسل ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔"

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: حجاج کو محدّثین نے ضعیف قرار دیا ہے، اور بشر بن رافع تو حجاج سے بھی زیادہ ضعیف ہے، اس کے باوجود اس پر وضع کا حکم نہیں لگایا گیا، چونکہ اس میں شرطِ حکم مفقود ہے۔

چودھویں حدیث: (ملاحظہ ہو: جلد ۹، حدیث: ۵۲۴۴)

اللهم احینی مسکینا ...... یوم القیامة ۔

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: اس روایت کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے "حارث ابن اخت سعید بن جبیر عن انس رضی اللہ عنہ" نقل کیا ہے، اور (اس کی اسنادی حیثیت کے بارے میں) کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

شواہد: اس حدیث کو امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی روایت کیا ہے، اور (امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے) اس کو بروایت حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ صحیح قرار دیا ہے۔ البتہ یہ روایت پہلی روایت کے مقابلہ میں مختصر ہے۔

پندرھویں حدیث: (ملاحظہ ہو: جلد ۹، حدیث: ۵۴۳۳)

ان الناس ...... قردة وخنازیر۔

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: اس حدیث کو امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے "کتاب الملاحم" میں **موسی الحناط**۔ حائے مہملہ اور نون کے ساتھ۔ کے طریق سے نقل کیا ہے، اور کہا ہے:

لا أعلمه، الا عن موسٰی بن أنس عن أنس أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: یا أنس! ان الناس یمصرون۔ ورجاله ثقات لیس فیه الا قول موسي: لا أعلمه الا عن موسی بن أنس۔

اپنے اس شیخ کہ جس نے حدیث کو اس سے بیان کیا ہے، کے بارے میں شک ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ شیخ اس میں ضعیف ہو چہ جائیکہ کذاب و متفرد ہو۔

شواہد: امر واقع یہ ہے کہ وہ متفرد نہیں ہے بلکہ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی اصل کا ایک شاہد سند صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

سولھویں حدیث: (ملاحظہ ہو: جلد ۱۰، حدیث: ۶۰۹۴)

کان عند النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم...... فأکل معه: غریب۔

ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ حدیث موضوع ہے، اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ حدیث موضوع نہیں ہے۔ اھ۔

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: اس حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے " عیسی بن عمر عن اسماعیل بن عبد الرحمن السدی عن أنس رضی اللہ عنہ " نقل کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ (اس حدیث کی اسنادی حیثیت کے بارے میں) فرماتے ہیں:

غریب لا نعرفه من حدیث السدی الا من هذا الوجه۔

حالانکہ اس روایت کو ان کے علاوہ دوسرے حضرات نے بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ (اسی حدیث کے ایک راوی کے بارے میں) فرماتے ہیں:

"سدی کا نام اسماعیل بن عبدالرحمٰن ہے، ان کو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے شرف سماع حاصل ہے۔"

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: ان (سدی) سے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تخریج کی ہے، ایک جماعت نے ان کی توثیق کی ہے، جن میں شعبہ، سفیان اور یحی قطان رحمہم اللہ جیسے محدّثین شامل ہیں۔

شواہد: اس حدیث کو امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے سلمان بن بلال عن یحی بن سعید عن انس رضی اللہ عنہ بایں الفاظ نقل کیا ہے:

"کنت أخدم رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم فقدم له فرخ مشوی فقال: اللهم ائتنی بأحب خلقك الیك یأکل معی هذا الطیر فقلت: اجعله رجلا من أهلی من انصار، فجاء علی فقلت: ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم علی حاجة، ثم جاء فقلت ذلك فقال: اللهم ائتنی کذلك، فقلت ذلك فقال لی رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم: افتح، فدخل، فقال: ما حبسك یا علی؟ فقال: ان هذه آخر ثلاث کرات یردنی أنس، فقال: ما حملك علی ما صنعت؟ فقلت: أحببت أن یکون رجلا من قومی، فقال: ان الرجل محب قومه"۔

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس روایت کو تیس سے زائد افراد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ اور پھر صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے اس کے شواہد ذکر کئے ہیں۔طبرانی شریف میں ان (شواہد) میں سے حضرت سفینہ اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے، دونوں کی سند متقارب ہے۔

سترہویں حدیث: (ملاحظہ ہو: جلد ۱۰، حدیث: ۶۰۹۶)

أنا دار الحكمة وعلي بابها۔

غريب لا يعرف عن أحد من الثقات الا عن شريك وسنده مضطرب ۔

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: اس حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے "محمد بن عمر الرومی عن شريك بن عبد الله القاض عن سلمة بن كهيل عن سويد بن غفلة عن الصنابحی عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ" روایت کیا ہے۔صنابحی کا نام عبدالرحمٰن ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **غريب ورواه غيره عن شريك، ولم يذكروا فيه الصنابحي، ولا نعرف هذا الحديث عن أحد من الثقات غير شريك، وفي الباب عن ابن عباس۔** انتهى كلام الترمذی۔

شواہد: حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث کو ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب صحابہ "استیعاب" میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: **"أنا مدينة العلم وعلي بابها، فمن اراد العلم فليأته من بابه"۔**

اس حدیث کو امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح قرار دیا ہے۔امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کو حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ان ہی الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے، اس روایت کے رجال صحیح کے رجال ہیں سوائے عبدالسلام کے، محدّثین کے نزدیک یہ ضعیف راوی ہیں۔

ابواحمد بن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے، کہ محدّثین ان کو متہم ٹھہراتے ہیں، ضعفاء کی ایک جماعت نے ان سے سرقہ کیا ہے۔ لیکن امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو بروایت عبدالسلام مذکور ذکر کیا ہے، اور عباس دوری سے منقول ہے کہ میں نے ابو معین رحمۃ اللہ علیہ سے ابوصلت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ ثقہ ہے۔

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: ان سے ابومعاویہ نے "**أنا مدينة العلم**" والی حدیث روایت کی ہے۔چنانچہ فرمایا:

"اس حدیث کو محمد بن جعفر الفیدی نے بھی روایت کیا ہے، اور یہ ثقہ راوی ہیں۔"

پھر امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی حدیث کو الفیدی مذکور کے طریق سے نقل کیا ہے۔"الفیدی" میں فاء مفتوح اور اس کے بعد یاء ہے جس کے نیچے دو نقطے ہیں۔اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث اس کے شاہد کے طور پر نقل کی ہے۔

اٹھارویں حدیث: (ملاحظہ ہو: جلد ۱۰، حدیث: ۶۰۹۸)

ان النبی صلی الله علیه وسلم، لعل: یا علی! لایحل لأحد...... غريب۔

میں (ابن حجر) کہتا ہوں: امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کو "عطية العوفی عن أبی سعيد الخدری رضی اللہ عنہ" نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: **حسن غريب لا نعرفه الا من هذا الوجه۔**

علی بن منذری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے ضرار بن صرد سے پوچھا: اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ تو انہوں نے فرمایا:

لا يحل لأحد يستطرقه غيرهما، والسبب في ذلك أن بيته مجاور المسجد، وبابه من داخل المسجد كبيت النبي ﷺ۔

بہت سے صحیح طرق میں مروی ہے کہ جب نبی کریم علیہ السلام نے مسجد میں کھلنے والے دروازوں کے بند کرنے کا حکم دیا، سوائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دروازے کے، تو بعض اصحاب پر یہ بات گراں گزری، چنانچہ نبی کریم علیہ السلام نے اس حدیث میں اس سلسلہ میں ان کا عذر بیان فرمایا۔

یہی کچھ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں بھی وارد ہوا ہے جس کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے سند جید کے ساتھ نقل کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کے بعض طرق میں ہے:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سکونت نبی کریم علیہ السلام کے ساتھ مسجد میں یعنی مسجد کے جوار میں تھی۔''

اس کو ابو یعلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت کا اسی جیسا ایک شاہد بھی ہے، جو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ امام بزار رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ''خارجة بن سعد عن أبيه'' کے طریق سے روایت کیا ہے۔ اس کے رواۃ ثقات ہیں۔ واللہ اعلم۔

تلخیص

اٹھارہ روایات کی سندی حیثیت صحاحِ ستہ کی روشنی میں

حدیث نمبر	صاحب تخریج	اسنادی حیثیت
پہلی حدیث:	امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ، امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ	ضعیف
دوسری حدیث:	امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہم	حسن
تیسری حدیث:	امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہم	صحیح
چوتھی حدیث:	امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ	ضعیف
پانچویں حدیث:	امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ، امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ	حسن
چھٹی حدیث:	امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ، امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ	صحیح
ساتویں حدیث:	امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ، امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ	حسن
آٹھویں حدیث:	امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ	ضعیف
نویں حدیث:	امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ	حسن
دسویں حدیث:	امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ	ضعیف
گیارہویں حدیث:	امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ، امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ	حسن
بارہویں حدیث:	امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ	حسن
تیرہویں حدیث:	امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ، امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ	حسن
چودھویں حدیث:	امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ	ضعیف
پندرہویں حدیث:	امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ	حسن
سولہویں حدیث:	امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ	حسن
سترہویں حدیث:	امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ	ضعیف، حسن
اٹھارویں حدیث:	امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ	ضعیف، حسن

قصہ مختصر یہ تمام روایات صحاحِ ستہ میں موجود ہیں۔ان میں سے نصف روایات کو امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔چودہ روایات امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہیں۔دو روایتیں امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کی ہیں۔چھ احادیث کو امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ائمہ ستہ کے علاوہ محدثین مثلاً امام احمد بن حنبل، امام ابن خزیمہ، امام ابن حبان، امام حاکم وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم نے بھی اپنی صحاح میں ذکر کیا ہے جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ان احادیث میں سے کسی ایک حدیث کا بھی موضوع ہونا واضح نہیں ہوتا۔
والعلم عنداللہ

مقدمة المؤلف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ الذی فتح قلوب العلماء بمفاتیح الایمان، و شرح صدور العرفاء بمصابیح الایقان، وافضل الصلوات واکمل التحیات علی صدر الموجودات،وبدر المخلوقات،احمد العالمین، وامجد العالمین، محمد المحمود فی اقواله و افعاله و احواله، المنور مشکاةصدره بانوار جماله، و اسرار کماله، وعلی آله واصحابه، جملة علومه و نقله آدابه۔

امابعد! اللہ تعالیٰ کی ذات غنی وباری ہے،اس کے بندوں میں سے حقیر ترین بندہ علی بن سلطان محمد ہروی قاری۔ اللہ تعالیٰ ان (یعنی باپ اور بیٹا) دونوں سے لطف خفی کا معاملہ فرمائے اور اپنے بے پناہ کرم سے ان دونوں کی لغزشوں سے درگزر فرمائے۔ کہتا ہے کہ ''مشکاۃ المصابیح'' احادیث نبویہ میں جامع ترین اور اسرار مصطفویہ کے باب میں نافع ترین کتاب تھی جس کے مؤلف مولانا، حبر علامہ، بحر فہامہ، مظہر حقائق، موضح دقائق شیخ تقی نقی ولی الدین محمد بن عبداللہ خطیب تبریزی رحمہ اللہ ہیں۔ ارباب حال میں سے کسی نے کہا ہے:

لئن کان فی المشکاة یوضع مصباح ☆ فذالك مشکاة وفیها مصابیح

''اگر طاق میں کوئی چراغ رکھا ہوا ہو تو یہ ایک ایسا طاق ہے کہ اس میں کئی چراغ ہیں۔''

وفیها من الانوار ما شاع نفعها ☆ لهذا علی کتاب الانام تراجیح

''اس میں ایسے انوار ہیں کہ جن کا نفع پھیلا ہوا ہے۔اس (کتاب) کو کتب مخلوقات پر کئی ترجیحات حاصل ہیں۔''

فیه اصول الدین والفقه والهدیٰ ○ حوائج اهل الصدق منه مناجیح

''اس میں دین، فقہ اور ہدایت کے اصول ہیں۔ اس سے اہل صدق کی حاجتوں کی حصول یابی ہوتی ہے۔''

تو اس کی قرأت، اس کے لفظ و روایت کی تصحیح اور اس کے بعض معانی و درایت کا اہتمام کرنے کا خیال میرے کمزور دل میں گھر کر گیا اس امید پر کہ میں دنیا میں اس کے علوم پر عمل کر کے آخرت میں باعمل علماء کے زمرے میں داخل ہو جاؤں گا۔

پس میں نے اس عظیم الشان کتاب کی قرأت حرم محترم کے مشائخ پر کی۔ اللہ ان سے اور ان کے علوم کی برکات سے ہمیں نفع مند بنائیں۔ ان مشائخ کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

① فرید عصر وحید دہر مولانا علامہ عطیہ سلمی رحمۃ اللہ علیہ جو شیخ الاسلام مرشد الانام مولانا شیخ ابوالحسن بکری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔

② زبدۃ الفضلاء عمدۃ العلماء مولانا سید زکریا رحمۃ اللہ علیہ جو عالم ربانی مولانا اسماعیل شروانی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں جو قطب عارفین غوث سالکین خواجہ عبید اللہ سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب میں سے ہیں جو خواجہ بہاء الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں کی روح کو سکون بخشے اور ان کی فتوح سے ہمیں بھی نوازے۔

③ عالم، عامل، فاضل، کامل، عارف باللہ، ولی مولانا شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں مستفیض فرمائے۔

یہ اکابر نہ حدیث شریف کے حافظ تھے اور نہ ہی ان کے پاس کوئی ایسی اصل (کتاب) تھی جس پر ضعیف بندہ (یعنی میں ملا علی قاری) اعتماد کرتا اور شراح نے صرف بعض کلمات کے ضبط کرنے کی طرف ہی توجہ دی تھی، بقیہ (کلمات و معانی) ان کے نزدیک واضحات میں سے تھے (اس لئے اس سے زیادہ اپنی شروح میں بیان کرنے کی حاجت نہیں سمجھی) میرا دل کسی صورت مطمئن نہ تھا اور مجھے شرح صدر نہیں ہو رہا تھا سوائے اس بات پر کہ میں ایسے نسخے جمع کروں جو تصحیح شدہ ہوں، مقروءہ، مسموعہ مصرحہ ہوں، قابل اعتماد ہوں، بوقت اختلاف ان سے استناد صحیح ہو۔ چنانچہ وہ ایسے نسخہ یہ تھے:

ایک نسخہ مشہور محدثین سید اصیل الدین رحمۃ اللہ علیہ، سید جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے نیک بخت بیٹے میرک شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔

ایک نسخہ وہ تھا جس کی قرأت ہمارے شیخ المشائخ فی القراۃ والحدیث النبوی مولانا شیخ شمس الدین محمد بن جزری رحمۃ اللہ علیہ پر کی گئی تھی۔

ایک نسخہ وہ تھا جس کی قرأت شیخ الاسلام ہروی رحمۃ اللہ علیہ پر کی گئی تھی۔

ان (مذکورہ بالا نسخوں) کے علاوہ بھی کچھ ایسے صحیح و معتمد نسخے تھے جن پر میں نے صحت کے واضح آثار پائے۔ چنانچہ تمام نسخوں کے مجموعہ سے میں نے اخروی ثواب کا ضامن ایک اصل اصیل (نسخہ) تیار کیا۔

مؤلف رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت حدیث:

مجھے شیخ علامہ علی بن احمد جنانی ازہری شافعی اشعری انصاری رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت عامہ ورخصت تامہ حاصل ہے۔

عرض مرتب: شیخ کے نام میں کچھ تسامح ہے۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیے البضاعة المزجاة کا حاشیہ: ۳۰۔

شیخ جنانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے حدیث وغیرہ شیخ الاسلام، امام ائمہ اعلام شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی۔ کتب حدیث میں صحاح ستہ وغیرہ سے بخاری، مسلم و دیگر کتب پڑھیں۔ بعض کی قراءت کی اور بعض کا سماع کیا۔

انہوں (یعنی سیوطی رحمۃ اللہ علیہ) نے مجھے (یعنی جنانی رحمۃ اللہ علیہ کو) اجازت دی ہے اپنی تمام مرویات کی، اور جن کی اجازت ان

(یعنی سیوطی رحمہ اللہ) کو خاتمہ المحدثین مولانا شیخ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے قراءت، سماع، روایت اور اجازت کے اعتبار سے دی ہے۔ اور میں نے شیخ قسطلانی رحمہ اللہ صاحب المواہب پر بھی قراءت کی ہے جو شارح بخاری ہیں اور علامہ عسقلانی رحمہ اللہ کے اجل تلامذہ میں سے ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنی تمام مرویات وتالیفات کی اجازت دی ہے۔ یہ وہ معتمد سند ہے جو اس مکدر و بے فیض زمانے میں پائی جاتی ہے۔

پھر میں نے مشکاۃ کی بعض احادیث کی قرأت منبع بحر عرفان پر کی جو میر کلاں کے نام سے مشہور ہیں۔ انہوں نے زبدۃ المحققین، عمدۃ المدققین میرک شاہ رحمہ اللہ سے پڑھی، انہوں نے اپنے والد صاحب روضۃ الاحباب سید سند مولانا جمال الدین محدث رحمہ اللہ سے پڑھی، انہوں نے اپنے چچا سید اصیل الدین شیرازی رحمہ اللہ سے پڑھی۔ مروی ہے کہ انہوں نے اکیاسی (۸۱) اکابر علماء کو پایا ہے جن میں مولانا شیخ محمد بن محمد بن محمد جزری، صاحب قاموس شیخ مجد الدین فیروز آبادی، علامہ سید شریف جرجانی رحمہ اللہ شامل ہیں۔ اور ان سے مولانا نور الدین عبدالرحمٰن جامی قدس سرہ السامی وغیرہ نے سماع کیا ہے۔ ان کی وفات ۸۸۴ھ میں ہوئی۔

وہ فرماتے ہیں: میں مشکاۃ شریف مولانا شرف الدین جرمی رحمہ اللہ سے روایت کرتا ہوں، وہ خواجہ امام ملت ودین علی بن مبارک شاہ صدیقی رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں اور وہ مؤلف رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ قابل اعتماد کوئی سند موجود نہیں ہے۔

مرقات کا باعث تالیف:

جب مجھے یہ نسخہ مذکورہ حاصل ہو گیا اور میں نے ان مذکورہ نسخوں سے اس کی تصحیح کر لی تو خیال ہوا کہ میں اس کی ایک عمدہ شرح اس طرز پر لکھوں جو اس کے الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کے مبانی کو بھی ضبط کرے اور اس کی روایات ومعانی سے بحث کرے، کیونکہ اہل زمان کی ہمتیں کوتاہ ہو چکی ہیں، اور تحصیل علوم خصوصاً اس فن شریف میں ان کے مجاہدے ضعیف ہو چکے ہیں ، اور یہ اس وقت کا تقاضا ہے جو ہزار سے متجاوز ہو چکا ہے اور ضعف علم وعمل باقی رہ گیا ہے، بلکہ ضعف ایمان ضعف در ضعف کو پہنچ چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کا کارساز اور اپنے نبی کا حامی وناصر ہے۔ وہ ہر حسن سلوک کا کفیل ہے۔ اللہ ہی ہمیں کافی ہے اور اچھا کارساز ہے۔

من جملہ بواعث کے ایک باعث یہ بھی تھا کہ اس کتاب کے اکثر شراح (مذہباً) شافعی تھے۔ انہوں نے اس کتاب کے متعلقہ مسائل کو اپنے مذہب کے طریقہ پر ذکر کیا، اور احادیث کے ظاہر سے اپنے مسلک کے مقتضیٰ پر استدلال کیا اور حنفیہ کا نام ''اصحاب رائے'' رکھا تھا اس گمان کی بنیاد پر کہ وہ حدیث پر عمل نہیں کرتے بلکہ وہ تو روایت وتحدیث کو نہ پہلے جانتے تھے اور نہ اب جانتے ہیں۔ مزید یہ کہ ان کا مذہب قوی یہ ہے کہ ضعیف حدیث ایسے قیاس مجرد پر مقدم ہے جو بطلان کا احتمال رکھتا ہو۔

ہاں ان کی رائے ثاقب جو ان کے بڑے مناقب میں سے ہے وہ یہ ہے کہ حنفیہ (عبارات کے) ظاہر سے نہیں چمٹتے بلکہ مخفی (مسائل) کے بارے میں بحث کرنے کے لئے ان میں چھان بین کرتے ہیں اور مسائل کے چہروں سے پردوں کے نقاب

ہٹاتے ہیں۔اس وجہ سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"الخلق کلھم عیال ابی حنیفہ فی الفقه۔ساری مخلوق فقہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا کنبہ ہے۔"

ان کا یہ اعتراف ان کے اکتساب فیض اور کمال انصاف پر دلالت کرتا ہے۔اللہ ان دونوں سے راضی ہو جائے اور ہمیں ان دونوں کے علوم وفیوض سے مستفید فرمائے۔پس میں نے اس بات کو پسند کیا کہ حنفیہ کے دلائل کو ذکر کروں،ان کے مسائل کو واضح کروں اور ان کی مخالفت کا دفعیہ کروں،تا کہ اس عوام کو جو فقہی دلائل کی معرفت نہیں رکھتے یہ شبہ نہ ہو کہ حنفیہ کے مسائل صحیح دلائل کے خلاف ہیں۔میں نے اس کتاب کا نام "مرقاۃ المفاتیح لمشکاۃ المصابیح" رکھا ہے۔

میں اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہوں کہ وہ اس (کتاب) کو اپنے فضل سے خالص اپنی ذات کے لئے بنا لے اور اس کتاب سے مسلمانوں کو ایسے نفع دے جیسے اس کی اصل (یعنی مصابیح السنہ) اور فضل (یعنی مشکوۃ شریف) سے ان کو نفع دیا ہے۔پس میں کہتا ہوں کہ توفیق اللہ تعالیٰ ہی سے ملتی ہے اور اللہ ہی کے ہاتھ میں تحقیق کی لگامیں ہیں۔

خطبة الكتاب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شیخ نے اپنی کتاب کے آغاز ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سے فرمایا۔ (ایسا کرنا کئی وجوہ کے پیش نظر تھا:)

① قرآن عظیم کی اقتداء کی غرض سے ہے۔

② اللہ عزیز و علیم ذات کے اخلاق اپنانے کی خاطر ایسا کیا۔

③ نبی کریم ﷺ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ابتداء کی ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''کل امر ذی بال لا یبدأ فیه ببسم الله الرحمن الرحیم فهو ابتر۔''

''ہر شان والا کام جو بسم اللہ سے شروع نہ کیا جائے وہ (دم کٹا) نا تمام ہے۔''

''ابتر'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ کام تھوڑی برکت والا ہے یا معدوم البرکۃ ہے۔

کہا گیا کہ یہ بتر سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے تام و کامل ہونے سے پہلے کاٹنا۔

''ذی بال'' سے مراد ''ذو شان'' ہے جو فی الحال ذی شان ہے یا فی المآل ذی شان ہوگا۔

خطیب رحمہ اللہ اس روایت کو اپنی جامع میں ان الفاظ کے ساتھ لائے ہیں۔

کتب اشعار کے شروع میں بسم اللہ کی کتابت کے بابت سلف صالحین کا اختلاف ہے۔ چنانچہ شعبی اور امام زہری نے اس کو ممنوع قرار دیا ہے اور سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے جائز قرار دیا ہے۔ خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اس مسئلہ میں تفصیل احسن ہے بلکہ یہی صحیح ہے، چونکہ اچھا شعر اچھا ہے اور قبیح شعر قبیح ہے۔ لہٰذا ہجویات، ہذیان اور مدحت ظلمت وغیرہ (کی کتب) میں بسم اللہ کو لانے سے بچا جائے جیسا کہ حالتِ اکل حرام و شربِ خمر، مواضع گندگی اور حالت ہمبستری وغیرہ میں بسم اللہ پڑھنے سے بچا جاتا ہے۔

زیادہ ظاہر یہ ہے کہ مسائل منطق کی حرمت کے قول کے مطابق کتب منطق کے شروع میں بھی بسم اللہ نہ لکھی جائے۔ اور

اسی طرح کسی بھی قسم کے جھوٹے قصوں کی کتب کے شروع میں بھی بسم اللہ نہ لکھی جائے۔ یہ سب کچھ آپ ﷺ کے ارشادگرامی "ذی بال" سے مستفاد ہے۔اور حقیقت حال کو اللہ ہی زیادہ جانتا ہے۔

یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے: "كل كلام ذى بال لا يبدأ فيه بالحمد لله فهو اقطع۔"

"ہر شان والا کلام جو الحمدللہ سے شروع نہ کیا جائے وہ ناقص ہے۔"

اس حدیث کو امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ اور امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے "عمل الیوم واللیلۃ" میں روایت کیا ہے۔

امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

"كل امر ذى بال لا يبدأ فيه بالحمد لله فهو اقطع۔"

دونوں حدیثوں میں تطبیق کی کئی صورتیں ہیں:

۱) دونوں سے مراد اللہ کے ذکر سے ابتداء ہے۔ چاہے وہ ابتداء بسم اللہ کے ضمن میں ہو یا الحمدللہ کے ضمن میں ہو۔

اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس کو رہاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی چہل حدیث میں روایت کیا ہے اور ابن صلاح رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن قرار دیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: "كل امر ذى بال لا يبدأ فيه بذكر الله فهو اقطع"

۲) بسم اللہ والی حدیث کو ابتداء حقیقی پر محمول کیا جائے اس طور پر کہ اس سے پہلے کچھ نہ ہو، اور الحمدللہ والی حدیث کو ابتداء اضافی پر محمول کیا جائے کہ وہ بسم اللہ کے بعد ہو۔

کہا گیا ہے کہ اس کے برعکس نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ حدیث بسملہ کا طرز، کتاب اللہ میں وارد طرز کے موافق ہونے کی وجہ سے زیادہ قوی ہے۔

میرے دل میں آتا ہے۔ حقیقت حال اللہ ہی زیادہ جانتا ہے۔ کہ بسم اللہ سے آغاز کرنا چونکہ بڑی نعمتوں میں سے ہے پس مناسب یہ ہے کہ الحمدللہ اس کے بعد ہو، تاکہ وہ اس خوبصورت عطیہ پر شکر کو متضمن ہو جائے۔

۳) کہا جاتا ہے کہ ابتداء سے مراد ابتداء عرفی ہے جس میں بہت وسعت ہے۔ اس کا اطلاق مقصود کو شروع کرنے سے پہلے پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: اوّل الليل، اوّل النهار، اوّل الوقت، اوّل الديار

اس صورت میں مصنف پر یہ اعتراض نہیں ہوگا کہ ایک روایت میں یہ آیا ہے:

"كل امر ذى بال لم يبدأ فيه بذكر الله ثم بالصلاة على فهو اقطع"

"ہر شان والا کام جس کو اللہ کے ذکر اور پھر مجھ پر درود سے شروع نہ کیا جائے وہ ناتمام ہے۔"

ناتمام سے مراد یہ ہے کہ اس کام سے ہر برکت مٹادی جاتی ہے۔ اس حدیث کو رہاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے۔ اگرچہ کہا گیا ہے کہ یہ ضعیف ہے۔

ترمذی شریف کی ایک مرفوع حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:

"كل خطبة ليس فيها تشهد فهى كاليد الجذماء"

"ہر وہ خطبہ جس میں شہادت نہ ہو وہ تو جذام والے ہاتھ کی طرح ہے۔"

اس روایت کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حسن قرار دیا ہے۔اس روایت میں لفظ ''خطبة'' خاء کے ضمہ کے ساتھ ہے، جیسا کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے صنیع سے ظاہر ہو رہا ہے چونکہ وہ اس روایت کو ''باب خطبة النكاح'' میں لائے ہیں۔اور یہی کچھ شیخ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس اعتراض سے سمجھ آتا ہے جو انہوں نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ پر کیا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کے شروع میں شہادت چھوڑ دی ہے۔اگرچہ ان کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ حدیث صحیح نہیں یا یہ کہ ان کی روایت خاء کے کسرہ کے ساتھ ہے ضمہ کے ساتھ نہیں۔واللہ اعلم۔

''باء'': چودہ معانی کیلئے آتا ہے۔ان میں سے یہاں ''الصاق'' اور ''استعانت'' کے معنی مناسب ہیں۔

اس (حرف جر) کا متعلق مقدر ہے۔(اس کو مقدم ماننا بھی جائز ہے اور مؤخر ماننا بھی جائز ہے۔) مختار مذہب کے مطابق یہ مقدر آخر میں ہے۔آخر میں مقدر ماننے میں کئی مقاصد ہیں:

(۱) حقیقی ابتداء متحقق ہو جائے۔ (۲) اسم خاص (یعنی اللہ تعالی کے نام) کی تعظیم اسی میں ہے۔

(۳) مفید اہتمام ہے۔ (۴) یہ مقام اختصاص ہے اس کا تقاضا و مقصود یہی ہے۔

(۵) مشرکین کی عادت کا رد ہے، کیونکہ وہ (اکثر و بیشتر) بتوں (کے ناموں) سے ابتداء کرتے تھے اور بعض باتوں میں اللہ کے ذکر سے ابتداء کرتے تھے۔

لیکن عارف جامی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ عارفین کے نزدیک اللہ سبحانہ کے نام سے حقیقی ابتداء کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے نام کے علاوہ کسی کو بھی ابتداء میں ذکر نہ کیا جائے، نہ زبان پر آئے، نہ دل میں لائے، نہ اثباتاً آئے، نہ نفیاً آئے، اس لئے کہ غیر کی نفی کی صورت میں بھی غیر ملحوظ ہوتا ہے اور وہ بھی ابتداء میں ملحوظ ہے، لہٰذا (تاخیر کی صورت میں) ابتداء اللہ سبحانہ کے نام کے ساتھ مخصوص نہ ہوگی۔اس لئے محذوف کے موخر مقدر ماننے کی کوئی ضرورت نہیں الا یہ کہ اللہ سبحانہ کا نام تقدیر میں بھی مقدم ہو جیسا کہ ذکر میں مقدم ہے۔اھ۔

اور معنی یہ ہوگا: ''باسم الله ابداء تصنيفي (اللہ کے نام سے میں اپنی تصنیف کی ابتداء کرتا ہوں۔)

یا معنی یہ ہوگا: ''ابتدائي في جميع اموري متبركاً باسمه و مستعيناً برسمه'' (میرے تمام امور میں میری ابتداء اللہ کے نام سے برکت حاصل کرتے ہوئے اور اس کے نقش سے مدد چاہتے ہوئے ہے۔)

''اسم'': ان اسماء میں سے ہے جن کا شروع سکون پر مبنی ہے، چنانچہ اس سے ابتداء کرتے وقت ہمزہ وصل بڑھا دیتے ہیں۔زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ ''الاسماء المحذوفة الاعجاز'' (وہ اسماء جن کے آخر کو حذف کیا گیا ہو) میں سے ہے۔جیسے ید اور دم، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کی گردان ''سمیت'' وغیرہ آتی ہے اور اس کا اشتقاق ''السمو'' سے ہے جس کا معنی ہے ''بلند ہونا''۔(وجہ مناسبت واضح ہے) اس لئے کہ نام رکھنا مسمی کو بلند کرتا ہے اور اس کی قدر کو اونچا کرتا ہے۔

کوفیوں کے نزدیک اس کی اصل ''وسم'' ہے جس کا معنی ''علامت'' ہے، اس لئے کہ اسم علامت ہوتا ہے جو مسمی پر دلالت کرتا ہے، پھر تخفیف کی وجہ سے حرف علت کو حذف کر دیا گیا پھر اس پر ہمزہ وصل داخل کر دیا گیا۔

کثرت استعمال کی وجہ سے صرف ''بسم اللہ'' میں ہمزہ کتابت میں رسم خط کے خلاف گر گیا (بسم اللہ کی وجہ تخصیص یہ ہے

کہ) بسم اللہ اسم جلالہ کے ساتھ خاص ہے، اور اس پر دلالت کے لئے اسم کا ذکر کرنے سے پہلے باء کو لمبا کر دیا، تا کہ ''یمین'' اور ''تیمّن'' میں فرق ہو جائے۔

کہا گیا کہ ''اسم'' صلہ ہے۔ اگر اس سے مراد لفظ ہو تو یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ عین مسمی ہے، اور اگر اس سے مراد ذات حق اور وجود مطلق ہو بشرطیکہ اس کا اعتبار معین صفت کے ساتھ کیا گیا ہو تو وہ بحسب تحقق و وجود عین مسمی ہے۔ جیسے ''الرحمٰن'' مثلاً وہ ذات الٰہیہ صفت رحمت کے ساتھ ہے اور ''القہار'' صفت قہر کے ساتھ ہے۔ اگرچہ سمجھ میں آنے کے اعتبار سے اس کا غیر ہے، اور وہ اسماء جن کا تلفظ کیا جاتا ہے وہ ان اسماء کے اسماء ہیں۔

یہاں اضافت میں دو احتمال ہیں۔

(۱) یہ اضافت لامیہ ہے۔ (اس صورت میں معنی مرادی میں دو احتمال ہیں:)

(الف) تمام افراد میں سے ان کے بعض افراد مراد ہیں اور وہ اللہ، الرحمٰن اور الرحیم ہیں۔

(ب) اس سے مراد خصوصیت سے یہ اسماء ہیں، اس پر قرینہ ان ناموں کی تصریح ہے۔

(۲) ماقبل میں گذرے کلام پر بناء کرتے ہوئے ہوسکتا ہے کہ اضافت بیانیہ ہو۔ بعض محققین نے اسی طرح کہا ہے۔

جان لیجئے کہ اس مسئلہ میں مختلف مذاہب ہیں:

❶ اسم مسمی اور تسمیہ کا عین ہے۔

❷ اسم دونوں (یعنی مسمی و تسمیہ) کا غیر ہے۔

یہ جہمیہ، کرامیہ اور معتزلہ کا مذہب ہے۔ علامہ عز بن جماعہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہی حق ہے۔

❸ اسم مسمی کا عین اور تسمیہ کا غیر ہے۔

بعض حنفیہ کے نزدیک یہی صحیح ہے اور اس مقولہ ''اسم مسمی کا غیر نہیں ہے'' کے قائل کا مقصود بھی یہی ہے۔

❹ (اسم) نہ عین ہے اور نہ غیر ہے۔

تیسرا مذہب امام اشعری رحمہ اللہ سے منقول ہے جو خاص طور پر کلمہ جلالہ یعنی اسم اللہ کے بارے میں ہے، چونکہ اس اسم کا مدلول ذات من حیث ھو ہے بخلاف اس کے علاوہ دیگر اسماء کے۔ جیسا کہ ''عالم''، کہ اس کا مدلول صفت کے اعتبار سے ذات ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ اور امام آمدی رحمہ اللہ نے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی ایسی چیز نہیں جو علماء کے لئے محل نزاع بن سکے۔ واللہ اعلم۔

''التعرف'' میں اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ صفات نہ عین ذات ہیں اور نہ غیر ذات ہیں اور اس بات پر بھی اجماع ہے کہ صفات متغائر نہیں ہیں، اس کا علم نہ اس کی قدرت ہے اور نہ اس کی قدرت کا غیر ہے، اور نہ اس کی قدرت اس کا علم ہے اور نہ اس کا غیر ہے اور اسی طرح اس کی تمام صفات جیسے سننا اور دیکھنا وغیرہ ہیں۔

اہل علم کا اسماء باری تعالیٰ میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء نہ اللہ ہیں اور نہ اللہ کا غیر ہیں۔ جیسا کہ

ان کی یہی رائے صفات باری تعالیٰ کے بارے میں ہے۔اور بعض نے کہا کہ اللہ کے اسماء اللہ ہیں۔واللہ اعلم۔

جانئے کہ علماء ''اللہ'' کے اسم کی تدقیق میں حیران ہیں جیسا کہ عارفین ''اللہ'' کے مسمی کی تحقیق میں حیران ہیں۔منزہ ہے وہ ذات (یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ) کہ جس کے بارے میں اس کا غیر (یعنی مخلوق) حیران ہے۔

لفظ ''اللہ'' کس زبان کا لفظ ہے؟:

کہا گیا ہے کہ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے، اس لئے کہ اہل کتاب ''الاھا'' کہا کرتے تھے، عرب نے تخفیف کے لئے اخیر کے الف کو حذف کر دیا۔جیسا کہ انہوں نے لفظ ''النور''، ''الروح'' اور ''الیوم'' میں کیا تھا، یہ عبرانی زبان میں ''نورا''، ''روحا'' اور ''یوما'' تھا۔

یہ ان کی توجیہ ہے جو کہتے ہیں کہ یہ معرب ہے۔

حق یہ ہے کہ یہ عربی لفظ ہے، اس لئے کہ دونوں لغتوں کا جو توافق انہوں نے ذکر کیا ہے یہ اس پر دلالت نہیں کرتا کہ ان دونوں میں سے متاخر کونسا ہے اور کون کس سے ماخوذ ہے۔

پھر اس میں اختلاف ہے کہ کیا یہ اسم ہے یا صفت مشتق ہے، اکثر اس کے مشتق ہونے کے قائل ہیں۔مزید یہ کہ اگر یہ غیر مشتق ہے تو کیا یہ علم ہے یا غیر علم ہے اور اشتقاق کی صورت میں اس کی اصل کیا ہے۔(اس سلسلہ میں آراء حسب ذیل ہیں:)

① صاحب کشاف کے نزدیک مختار یہ ہے کہ وہ اصل میں اسم جنس تھا پھر علم بن گیا، اس کی اصل ''الالہ'' ہے، ''الہ'' سے مشتق ہے بمعنی ''تحیر'' (حیران ہونا) اس لئے کہ اللہ کے بارے میں لوگ حیران ہیں چونکہ وہ علمی اعتبار سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

② سیبویہ اور مبرد نے خلیل رحمۃ اللہ علیہ سے حکایت کیا ہے کہ لفظ ''اللہ'' اسم خاص ہے، اللہ کا علم ہے، کسی بھی شیء سے مشتق نہیں ہے اور نہ ہی صفت ہے۔پس اس صورت میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور نعوت وصفات کو جامع ہوگا۔

③ ایک قول یہ ہے کہ یہ ''الهت الى فلان'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے ''پناہ لینا''۔لفظ جلالہ سے اس کی مناسبت واضح ہے کہ مخلوق مصائب میں اللہ ہی کی پناہ لیتی ہے۔شاعر نے کہا ہے:

الهت اليكم في بلايا تنوبنى فالفيتكم فيها كريما ممجدا

''جو مصیبتیں مجھ پر آئیں ان میں میں نے تم لوگوں کی پناہ لی۔پس میں نے تم لوگوں ان میں کریم وعظیم پایا۔''

④ بعض کا قول ہے کہ یہ ''اله الفصيل'' سے ماخوذ ہے۔''فصیل'' اونٹنی کا وہ بچہ جو اپنی ماں سے مانوس ہو۔

وجہ تسمیہ یہ ہے کہ عبادت کرنے والے اللہ سے اور اس کے ذکر سے انس حاصل کر ہوتے ہیں۔

⑤ کہا گیا ہے کہ یہ ''تالهت'' بمعنی ''تضرعت'' سے بنا ہے جس کا معنی ہے ''گڑگڑانا'' چنانچہ اللہ ہی وہ ذات ہے جس کے سامنے گڑگڑایا جاتا ہے۔

⑥ بقول بعض یہ اہل عرب کے قول ''لاه يلوه لوها ولاها'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے چھپ جانا اور بلند ہو جانا۔ایک شاعر کہتا ہے:

لاہ ربی عن الخلائق طرا فھو اللہ لا یری و یری ھو

''میرا رب مخلوقات سے کنارہ میں چھپ گیا۔ وہ اللہ ہے وہ دکھائی نہیں دیتا اور وہ دیکھ سکتا ہے۔''

⑦ کہا گیا ہے کہ یہ ''الھت بالمکان'' سے مشتق ہے جس کا معنی ہے ''مقیم ہونا''، چنانچہ ''اللہ'' کا مطلب ہے وہ ذات جو اپنی صفت سے نہ بدلے جس طرح کہ مقیم اپنی جگہ سے نہیں پھرتا۔ شاعر کا یہ قول اسی معنی میں ہے:

الھنا بدار لا تبین رسومھا کان بقایا ھا و شام علی الایدی

''ہم ایسے گھر میں ٹھہرے جس کے نقوش واضح نہیں، گویا کہ اس کا بقایا ہاتھوں پر علامت ہے۔''

⑧ بعض کا کہنا ہے کہ یہ ''الولہ'' بمعنی ''طرب'' سے ماخوذ ہے۔ پس اللہ وہ ذات ہے کہ جس کے ذکر سے بندے بے حد خوش ہوتے ہیں اور وجد میں آجاتے ہیں۔ اسی معنی میں کمیت کا یہ شعر ہے:

ولھت نفسی الطروب الیکم ولھاحال دون طعم الطعام

⑨ بعض کا کہنا ہے کہ یہ ''الولہ'' بمعنی محبت شدیدہ سے لیا گیا ہے۔

⑩ ایک قول یہ ہے کہ ''الہ'' بمعنی ''عبد'' سے مشتق ہے۔ لہٰذا ''الالہ'' فعال بمعنی ''معبود'' ہے جیسے ''کتاب'' بمعنی ''مکتوب'' ہے۔ اس پر حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت دلالت کرتی ہے: ﴿ویذرك والاھتك﴾ ای عبادتک۔

لفظ اللہ کی اصل:

(اس بارے میں بھی اہل علم کی آراء مختلف ہیں جو حسب ذیل ہیں:)

﴿۱﴾ الالہ اصل میں ''ولاہ'' تھا، جیسا کہ اسادۃ، اشاح اور اجوہ اصل میں وسادۃ، وشاح اور وجوہ تھا۔

﴿۲﴾ سیبویہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لفظ ''اللہ'' اصل میں ''الہ'' تھا۔ جب ہمزہ کو حذف کیا تو اس کے عوضِ لازم کے طور پر اس کے شروع میں الف لام لے آئے تو لفظ ''اللہ'' بن گیا۔

﴿۳﴾ مبرد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ''لاہ'' اصل میں ''لوہ'' بروزن ''دور'' تھا۔ واؤ متحرک ماقبل مفتوح ہونے کی وجہ سے واؤ کو الف سے بدلا تو ''لاہ'' بروزن ''دار'' ہو گیا پھر اس پر لام تعریف کا داخل کر دیا۔

﴿۴﴾ ابوالہیثم رازی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ لفظ ''اللہ'' اصل میں ''الالہ'' تھا، ہمزہ کی حرکت ماقبل لام ساکن کو دیتے ہوئے ہمزہ کو مخفف کر دیا، پھر اس کو حذف کر دیا تو ''اللاہ'' ہو گیا، پھر اصلی کی جگہ حرکت عارضی لے آئے اور پہلے لام کو دوسرے لام میں مدغم کر دیا۔

کہا گیا ہے کہ یہاں ایک صرفی اشکال ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر قیاس کے مطابق اولاً ہمزہ کی حرکت نقل کر کے ماقبل کو دی گئی پھر اس کو حذف کیا گیا ہے تو اس سے وجوب ادغام کا غیر قیاسی ہونا لازم آتا ہے۔ کیونکہ یہ بات اپنی جگہ طے شدہ ہے کہ دو ایک جیسے حروف متحرکہ جب دو کلموں میں ہوں تو ان میں ادغام واجب نہیں ہوتا، جیسے ''ما سلککم'' اور ''مناسککم''۔ اور اگر ہمزہ کو حرکت سمیت حذف کیا گیا ہے تو اس کی تخفیف میں قیاس کی مخالفت لازم آئے گی اگرچہ لزومِ ادغام قیاس کے مطابق ہو۔

اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ یہ اسم قیاس کے مقتضی سے خارج ہے جس طرح کہ اس کا مسمّی لوگوں کے قیاس کے دائرہ سے

خارج ہے۔ پہلے (اشکال) کو اختیار کرتے ہوئے اور دو کلموں میں ادغام کے ممنوع ہونے کی صورت کا، جواب یہ دیا گیا ہے کہ جب لام کو ہمزہ کا عوض بنایا اور یہ اس کے درجہ میں ہو گیا تو گویا کہ یہ ایک کلمہ ہو گئے، مزید یہ کہ ایسا جائز ہے کہ ادغام کا وجوب علمیت کے بعد ہو، لہٰذا یہ اجتماع قطعی طور پر ایک کلمہ میں ہو جائے گا۔

میں کہتا ہوں تحقیقی بات یہ ہے کہ جس طرح اس میں نقل قیاس غیر مطرد ہے اسی طرح دو کلموں میں ادغام بھی (قیاس غیر مطرد ہے) اور اس کا جواز ہی کافی ہے اس کے وجوب کی ضرورت ہی نہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ﴿لا تامنا میں﴾ کی بابت دو کلموں میں ادغام پر قراء کا اتفاق ہے۔ اور حق یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ﴿لکنا هو الله ربی﴾ کی نظیر ہے۔ اس لئے کہ اصل ''لکن انا'' ہے، فتحہ نقل کر کے ماقبل نون کو دیا، دو نون متحرک جمع ہو گئے، پہلے کو ساکن کر کے دوسرے میں ادغام کر دیا۔ یہ قول فراء سے منقول ہے۔

﴿۵﴾ ایک قول یہ ہے کہ اصل میں اس کی ھاء غائب سے کنایہ ہے، یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنی عقلوں کی نظر میں موجود ثابت کیا ہے اور اس کی طرف حرف کنایہ سے اشارہ کیا ہے۔ پھر اس میں لامِ ملک زیادہ کیا۔ جب انہوں نے یہ جانا کہ وہ اشیاء کا خالق و مالک ہے تو یہ'' له ''ہو گیا۔ پھر ھاء کو چھوٹا کیا اور لام کے فتحہ میں اشباع کیا تو ''لاہ'' ہو گیا۔ پھر اضافت کے معنی سے نکل کر اسم مفرد بن گیا، پھر تعظیم کے لئے اس میں الف لام تعریف کا زیادہ کیا۔ پھر اس معنی کی تاکید کے لئے اس کو پُر کیا تو ''اللہ'' ہو گیا جیسا کہ تو دیکھتا ہے اور یہ تحقیق عربی لغت کے مقابلہ میں صوفیہ کے اشارات کے زیادہ قریب ہے۔

﴿۶﴾ ایک قول یہ ہے کہ یہ مشتق نہیں بلکہ معانی مذکورہ کو ملاحظہ کئے بغیر ابتداء ہی سے ذات مخصوصہ کا علم ہے۔ بعض عارفین کی ذکر کردہ یہ بات اس مذہب سے مناسبت رکھتی ہے کہ یہ ذات الٰہیہ کا اسم علی الاطلاق ہے، نہ کہ اس اعتبار سے کہ وہ ذات صفات سے متصف ہے، اور نہ اس اعتبار سے کہ وہ ذات صفات سے متصف نہیں ہے، اسی لئے جمہور نے کہا کہ یہی اسم اعظم ہے۔

فائدہ: قطب ربانی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اسم اعظم ''اللہ'' ہے بشرطیکہ تو ''اللہ'' اس حال میں کہے کہ تیرے دل میں اس کے سوا کوئی اور نہ ہو۔

لفظ اللہ کے خواص:

اس اسم کے ایسے خواص ہیں جو اس کے علاوہ کسی بھی دوسرے اسم میں نہیں پائے جاتے جیسا کہ اہل عربیت نے ذکر کئے ہیں:

﴿۱﴾ سارے اسماء کی نسبت اس کی طرف ہوتی ہے اور اس کی نسبت ان میں سے کسی کی طرف نہیں ہوتی۔

﴿۲﴾ مخلوق میں سے کسی کا نام اللہ نہیں رکھا جاتا بخلاف باقی تمام ناموں کے۔

﴿۳﴾ اس کے شروع سے یا کو حذف کر کے اس کے آخر میں میم زیادہ کرتے ہوئے ''اللھم'' کہتے ہیں، اس کے علاوہ کسی بھی اسم کے ساتھ ایسا نہیں کیا جاتا۔

﴿۴﴾ اس میں ہمزہ کے عوض میں لازمی طور پر الف لام لاتے ہیں، اس کے علاوہ کسی اسم میں ایسا نہیں کیا جاتا۔

⑤ اس کے ہمزہ کو قطعی بناتے ہوئے ''یا اللہ'' کہتے ہیں۔

⑥ اس کے شروع میں یاء حرف نداء اور الف لام کو جمع کرتے ہیں، نثر میں اس کے علاوہ کسی اسم کے ساتھ ایسا نہیں کیا جاتا۔

⑦ اہل عرب قسم کی صورت میں تاء، ایمن اور ایم صرف اسی اسم پر کا داخل کرتے ہیں۔ جیسے تاللہ، ایمن اللہ، ایم اللہ

⑧ جب اس کا ماقبل مفتوح یا مضموم ہو تو اس کا لام پُر پڑھا جاتا ہے۔ یہ طریقہ عربوں میں آباؤ اجداد سے چلا آ رہا ہے اور قراء کرام نے اس کو پُر پڑھنا رسول اللہ ﷺ سے تواتر کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس کے الف کو حذف کرنا ایسا لحن ہے مفسد صلوۃ ہے۔

''الرحمن'': فعلان کے وزن پر ''رحم'' سے مشتق ہے جیسے ''غضبان'' یہ ''غضب'' سے ماخوذ ہے۔ صفت مشبہ کا صیغہ ہے فعل متعدی کو لازم بنا کر فعل -عین کے ضمہ کے ساتھ- کی طرف منتقل کیا پھر اس سے صفت مشبہ مشتق ہوا۔

''الرحیم'': اگر اس کو مبالغہ کا صیغہ بنایا جائے جیسا کہ سیبویہ نے عرب کے قول ''ہو رحیم'' میں اس کی تصریح کی ہے تو پھر اس پر کوئی اشکال نہیں۔ اگر اس کو صفت مشبہ قرار دیا جائے جیسا کہ کشاف کے کلام سے پتہ چلتا ہے تو اس کی توجیہ وہی ہوگی جو ''الرحمٰن'' کے بارے میں ذکر کی گئی۔

''الرحمٰن'' میں ''الرحیم'' سے زیادہ مبالغہ ہے، اس لئے کہ الفاظ کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے۔ زیادت معنی کئی اعتبار سے ہو سکتی ہے:

① ''الرحمٰن'' دارین کو شامل ہے اور ''الرحیم'' دنیا کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ بعض آثار میں وارد ہوا ہے:

''یا رحمن الدنیا والآخرۃ و رحیم الدنیا''

② افراد مرحومین کی کثرت و قلت کے اعتبار سے ہے جیسا کہ وارد ہوا ہے: یا رحمٰن الدنیا ورحیم الآخرۃ

③ نعمتوں کی جلالت و دقت شان کے اعتبار سے ہے۔

④ ایک قول یہ ہے کہ ''الرحمٰن'' کی رحمت کا تعلق مومن و کافر سے دنیا و آخرت دونوں میں ہے اور ''الرحیم'' کی رحمت صرف مومنین کے ساتھ آخرت میں خاص ہے۔

بہر حال فی الجملہ ''الرحمٰن'' میں رحمت کے معنی میں جو مبالغہ ہے وہ ''الرحیم'' میں نہیں۔ پس اس میں کسی بھی صورت میں رحمت زائدہ مقصود ہے، چنانچہ یہ ان کے قول ''یا رحمٰن الدنیا والآخرۃ ورحیمھما'' کے منافی نہیں کیونکہ ان دونوں کو جلائل (بڑی نعمتوں) اور دقائق (چھوٹی نعمتوں) پر محمول کرنا جائز ہے۔

غیر اللہ پر رحمٰن و رحیم کا اطلاق:

''الرحمٰن'' کا اطلاق اللہ کے غیر پر جائز نہیں بخلاف ''الرحیم'' کے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤوف رحیم﴾

(آیا ہے تمہارے پاس رسول تم میں کا بھاری ہے اس پر جو تم کو تکلیف پہنچے حریص ہے تمہاری بھلائی پر ایمان والوں پر نہایت شفیق مہربان ہے)

اسی وجہ سے کہا گیا کہ ''الرحمٰن'' لفظ خاص ہے اور اس کا معنی عام ہے اور ''الرحیم'' لفظ عام ہے اور اس کا معنی خاص ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت رحمت:

''رحمت'' لغت میں رقت قلب کو کہتے ہیں اور انعطاف فضل واحسان کا تقاضا کرتا ہے، اور یہ ان کیفیات میں سے ہے جو مزاج کے تابع ہوتی ہیں اور اللہ سبحانہ اس سے منزہ ہیں۔ (تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف رحمت کی نسبت کیونکر درست ہوسکتی ہے؟)

(تو اس اشکال کا جواب یہ دیا گیا ہے) کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر اس کا اطلاق غایات کے اعتبار سے ہے جو کہ افعال ہیں، نہ کہ مبادی کے اعتبار سے ہے جو کہ انفعالات میں سے ہیں۔ پس اگر یہ انعام سے عبارت ہے تو افعال کی صفات میں سے ہے، اور اگر ارادۂ احسان سے عبارت ہے تو ذات کی صفات میں سے ہے۔ چونکہ ان میں سے ہر ایک رقت قلب اور انعطاف کا مسبب ہے لہٰذا سبب کے مسبب پر اطلاق کے باب سے مجاز مرسل ہوگا۔

لفظ ''رحمٰن'' کی لفظ ''رحیم'' پر وجہ تقدیم:

''الرحمٰن'' کو ''الرحیم'' پر مقدم کیا ہے حالانکہ قیاس یہ ہے کہ صفات میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہوتی ہے۔

پہلی وجہ: یہ ہے کہ ''الرحیم'' لفظ ''الرحمٰن'' کے لئے تتمہ اور ردیف کی طرح ہے۔

دوسری وجہ: الرحمٰن کی اللہ کے ساتھ مشابہت زیادہ ہے کیونکہ یہ اللہ ہی کے ساتھ خاص ہے۔ حتیٰ کہ کہا گیا ہے ''الرحمٰن'' اللہ کا علم ہے۔

تیسری وجہ: دنیا کی رحمت پہلے ہے (اور آخرت میں رحمت بعد میں ہوگی۔)

صفت ''رحمٰن'' و ''رحیم'' کی وجہ تخصیص:

صفات جمال میں سے انہیں دو پر اکتفاء کرنا اور صفات جلال میں سے کسی صفت کو ذکر نہ کرنا، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ ہے جو حدیث قدسی میں وارد ہوا ہے: ﴿غلبت رحمتي غضبي﴾ ''میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے''۔

اختتام میں ''الرحیم'' کو ذکر کرنے میں مؤمنین کے حسن خاتمہ کی طرف اشارہ ہے اور اس طرف بھی کہ اللہ تعالیٰ کی عام رحمت ساری مخلوق کو حاصل ہو چکنے کے بعد عاقبت متقین کے لئے ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ

''تمام تعریفیں اللہ ہی کو زیبا ہیں، ہم اسی کی تعریف کرتے ہیں، اسی سے مدد طلب کرتے ہیں اور اسی سے بخشش کے خواستگار ہیں''۔

قوله: الحمد لله:

حمد، مدح اور شکر مترادف الفاظ ہیں۔ محققین ان میں فرق کرتے ہیں، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ''حمد'' وہ ثناء ہے جو جمیل اختیاری پر بیان کی جائے چاہے نعمت کی وجہ سے ہو یا اس کے بغیر ہو، اور ''مدح'' عام ہے چاہے جمیل اختیاری پر ہو یا غیر اختیاری

پر ہو۔اس وجہ سے" مدحته علی حسنه " (میں نے اس کے حسن کی تعریف کی) تو کہا جاتا ہے، لیکن" حمدته علیه " نہیں کہا جاتا۔اور" شکر" وہ فعل ہے جو تعظیم منعم کا پتہ دے،اور نعمت کے مقابلہ میں ہو، چاہے (یہ فعل) زبان سے ہو یا اعضاء وجوارح سے صادر ہو۔لہٰذا حمد کا مورد خاص اور اس کا متعلق عام ہے اور شکر اس کے خلاف ہے۔شکر کی حقیقت وہ ہے جو جنید رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے:

"شکر یہ ہے کہ بندہ ان تمام نعمتوں کو جو اللہ نے اس پر کی ہیں اس مقصد میں خرچ کرے جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہیں۔"

الحمد: مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور اس کی خبر "للہ" ہے۔

یہ اصل میں منصوب پڑھا گیا تھا، نصب سے رفع کی طرف عدول دوام اور ثبوت پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔

دال کو (مابعد) لام کے تابع کرتے ہوئے بھی پڑھا گیا ہے،اور ان دونوں کے بکثرت معاً استعمال ہونے کے ان کو بمنزلہ ایک کلمہ قرار دیتے ہوئے اس کے برعکس قرأت بھی کی جاتی ہے۔

یہ جملہ لفظ کے اعتبار سے خبریہ ہے اور معنی کے اعتبار سے انشائیہ ہے کیونکہ اس کے قائل کو" حامد" کہہ سکتے ہیں۔اگر معنی کے اعتبار سے خبریہ ہوتا تو اس کے قائل کو صرف "مخبر" ہی کہہ سکتے تھے۔اور یہ بات معلوم ہی ہے کہ مخبر کے لئے اس سے اسم فاعل مشتق نہیں ہوتا۔اس لئے کہ" الضرب مولم " کے قائل کو" ضارب" نہیں کہا جاتا۔

اگر یہ کہا جائے: یہ بات جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے حمد ثابت ہونے کی خبر دینے والے شخص کو شرع" حامد" شمار کرے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خلاف اصل ہے اور اصل اس کا عدم ہے۔

(الحمد کے لام تعریف کے بارے میں تین احتمال ہیں:)

(۱) لام استغراق کے لئے ہے۔ای کل حمد صدر من کل حامد فهو ثابت للہ (یعنی ہر وہ حمد جو ہر حامد سے صادر ہوئی ہے وہ اللہ کے لئے ثابت ہے۔)

(۲) لام جنس کے لئے ہے،اور عموم کا فائدہ لام اختصاص سے حاصل ہو رہا ہے، دونوں صورتوں میں حمد کے تمام افراد حقیقتاً اللہ کے لئے خاص ہیں اگرچہ صورتاً اس کے بعض افراد کبھی دوسروں کیلئے بھی پائے جاتے ہیں۔

" الحمد " مصدر ہے اسم فاعل (حامد) یا مفعول (محمود) کے معنی میں یعنی حامدیت اور محمودیت اللہ کے لئے ثابت ہیں۔پس وہ حامد (بھی) ہے اور وہ محمود (بھی) ہے۔

(۳) لام عہد کا ہے۔اس لئے اس کی حمد اسی کے لائق ہے۔اسی وجہ سے" احمد الخلق" (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) نے اللہ جل شانہ کی تعریف سے عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: لا احصی ثناء علیك انت کما اثنیت علی نفسك

"میں اس طرح آپ کی ثناء کا احاطہ نہیں کرسکتا جس طرح آپ نے خود اپنی ثناء بیان فرمائی ہے۔"

قوله: نحمده: یہ جملہ مستانفہ ہے۔

اولاً اللہ تعالیٰ کے لئے حمد جملہ اسمیہ سے ثابت کی ہے جو ثبوت و دوام پر دلالت کرتا ہے، چاہے اس کی تعریف بیان کی گئی یا نہ کی گئی۔پس یہ اخبار ہے جو انشاء کو متضمن ہے۔

ثانیا اس (اللہ) کی حمد اور اس کے غیر (یعنی مخلوق) کی حمد کے بارے میں جملہ فعلیہ کے ذریعے خبر دی جو تجدد و حدوث کے لئے ہے، اس اعتبار سے کہ مختلف وقتوں میں نعمتوں کا تجدد، تعدد اور حدوث ہوتا رہتا ہے۔

یا (یہاں حمد بمعنی شکر ہے) مراد یہ ہے کہ ہم اس کا مطلقاً شکر ادا کرتے ہیں یا پہلی حمد کی توفیق پر ہم اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔

قولہ: ونستعینہ :یعنی امور دنیویہ میں سے حمد وغیرہ پر اس سے مدد کے طالب ہیں، یا اخروی کاموں میں اس سے مدد چاہتے ہیں۔ لہٰذا یہ ذاتی طاقت وقوت سے اظہار براءت ہے۔ اس میں قدریہ کے رد کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ ماقبل کلام میں جبریہ کا رد تھا۔

مصنف نے ''وایاہ نستعین'' نہیں کہا، اس لئے کہ مقام اختصاص کا ادراک صرف خواص ہی کر سکتے ہیں۔ اس لئے ابن دینار رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر سورۂ فاتحہ کی قرأت واجب نہ ہوتی تو میں اس کو نہ پڑھتا کیونکہ میں اس (سورت) میں سچا نہیں ہوں۔

قولہ: ونستغفرہ :یعنی ہم سیئات اور تقصیرات سے اللہ تعالی کی بخشش کے خواستگار ہیں اگرچہ تقصیر حمد، استعانت اور عبادات میں ہو۔

وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا

''اور ہم اپنے نفس کی برائیوں اور اپنی بداعمالیوں سے اللہ تعالی کی پناہ چاہتے ہیں''۔

یعنی ہم اپنے نفس کی ان برائیوں کے ظہور سے اس کی مدد وحفاظت کا سہارا اور پناہ لیتے ہیں جو نفوس کی جبلت میں رکھی گئی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ وہ حمد بھی اسی قبیل (یعنی نفس کی برائیوں میں) سے ہے جو ریاء اور دکھلاوے کے ساتھ ہو اور اسی طرح وہ حمد بھی اسی قبیل سے ہے جو طاقت وقوت کے اثبات کے ساتھ ہو۔

اور ہم ان ظاہری بداعمالیوں کے ارتکاب سے بھی اللہ تعالی کی پناہ چاہتے ہیں جو ہمارے نفس کی برائیوں سے پیدا ہوتی ہیں۔

اس میں اس بات کا اعتراف ہے کہ باطن وظاہر عیوب اور گناہوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے کہا گیا: ''تیرا وجود ایسا گناہ ہے جس پر کسی گناہ کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔''

کہا گیا ہے کہ وہ تصنیف بھی اسی قبیل سے ہے جو بغیر اخلاص اور عدم رؤیت توفیق کے، کی گئی ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ ساتھ اس کی جانب سے حفاظت عطا نہ ہو تو کوئی بھی اس کے راستے پر ثابت قدم نہیں رہ سکتا۔ اگر اللہ تعالی نہ ہوتا تو ہمیں نہ ہدایت ملتی، نہ ہم صدقہ کر سکتے تھے اور نہ ہم نماز پڑھ سکتے تھے۔

مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ

''جس کو اللہ نے سیدھا راستہ دکھا دیا اس کو کوئی بھٹکانے والا نہیں ہے اور جس کو اللہ نے بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا اس کو سیدھا راستہ دکھانے والا کوئی نہیں ہے''۔

واضح رہے کہ "یھدہ" میں ضمیر بارز موجود ہے، البتہ اکثر نسخوں میں "یضلل" کے ساتھ ضمیر بارز موجود نہیں، یہ دونوں طریقے جائز ہیں۔ پہلا اصل ہے اس میں وصل ہے اور دوسرا فرع ہے اس میں فصل ہے۔ اس میں ایک اور نکتہ ہے جو اخلاص والوں پر مخفی نہیں۔

یعنی جس کو اللہ تعالیٰ ایسی ہدایت عطا کرنے کا ارادہ کرے جو اس کو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والی ہے، اور ایسی عنایت عطا کرنے کا ارادہ کرے جو اس کے قریب کرنے والی ہے تو شیاطین اور انس و جن میں سے کوئی بھی گمراہ اس کو گمراہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

اور اللہ تعالیٰ جس کی جہالت کا اور راہِ حق سے بھٹکانے کا ارادہ کرلے تو انبیاء و مرسلین میں سے کوئی ہادی اس کی ہدایت پر قادر نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿**انك لا تهدى من احببت ولكن الله يهدى من يشاء وهو اعلم بالمهتدين**﴾ "آپ جسے چاہیں اسے ہدایت نہیں دے سکتے لیکن اللہ جسے چاہے ہدایت دے سکتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو زیادہ جانتا ہے"۔

اور اس میں اس بات کا اعلان ہے کہ ہر کام اللہ ہی کی قدرت میں ہے، اس کے ماسویٰ کے لئے نہیں ہے مگر وہی کچھ جو اس کے مقدر میں ہے، اور قضاء کسب و اختیار سے ہے، اور تیرا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اختیار کرتا ہے، اس لئے کہ ہماری فانی عقلیں دائمی احکام کے اسرار کا ادراک نہیں کرسکتیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں:

"قضاء و قدر کے راز قیامت کے دن ہی ظاہر ہوں گے"۔

وَاَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ شَهَادَةً تَكُوْنُ لِلنَّجَاةِ وَسِيْلَةً وَلِرَفْعِ الدَّرَجَاتِ كَفِيْلَةً وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهُ الَّذِیْ بَعَثَهٗ وَطُرُقُ الْاِيْمَانِ قَدْ عَفَتْ اٰثَارُهَا وَخَبَتْ اَنْوَارُهَا وَوَهَنَتْ اَرْكَانُهَا وَجُهِلَ مَكَانُهَا

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ گواہی جو نجات کے لئے وسیلہ اور بلندی درجات کی ضامن ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اس وقت اپنا رسول بنا کر بھیجا جب ایمان کی راہوں کے نشان مٹ چکے تھے اس کی روشنیاں بجھ چکی تھیں، اس کے آثار ہلکے پڑ گئے تھے اور اس کی بتائی ہوئی منزل نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی"۔

قوله: واشهد ان لا الله الا الله شهادة تكون...... كفيلة:

یعنی میں خبر دیتا ہوں اور واضح کرتا ہوں کہ اربابِ شہود کی نظر میں کوئی معبود نہیں یا کوئی مقصود نہیں یا کوئی موجود نہیں سوائے اس ذات کے کہ جو واجب الوجود اور صاحبِ کرم و جود ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرماتے ہیں: مقام توحید میں ضمیر کو مفرد لائے اس لئے کہ یہ اسقاط حدوث اور اثبات قدم ہے، پس پہلے "تفرقہ" کی طرف اشارہ کیا اور پھر "جمع" کی طرف اشارہ کیا اھ۔ (یہ دونوں صوفیاء کی اصطلاحات ہیں۔)

کہا جاتا ہے کہ افعال متقدمہ یہ امور ظاہرہ ہیں ان کے وجود سے غیر پر بھی حکم لگایا جاتا ہے بخلاف شہادت کے، اس لئے

کہ وہ امر قلبی غیبی ہے اس کی حقیقت بس اللہ ہی جانتا ہے۔

شهادة: مفعول مطلق ہے، "تکون" کا موصوف ہے۔

یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہ ہونے کی میں ایسی گواہی دیتا ہوں جو خلوص کے باعث دارین میں عذاب سے چھٹکارے کا سبب ہے، نا کہ علت۔ اور ہمیشہ باقی رہنے والی بلند و بالا جنتوں کی ضامن و کفیل ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ شہادت جب متکرر ہو اور اعمال صالحہ کی انجام دہی، اور افعال سیئہ کے اجتناب پر منتج ہو تو یہ علو درجات کا سبب ہے اور وقوع درکات سے مانع ہے۔

ہماری اس تقریر سے مصنف پر وارد ہونے والا یہ اعتراض دور ہو گیا کہ دخول جنت ایمان کی وجہ سے ہے اور رفع درجات اعمال کی وجہ سے ہے اور اس سبب پر اس کے فضل سے توفیق کا ہونا حضور ﷺ کے اس قول کے منافی نہیں:

"لن ينجي منكم احد بعمله"۔ "تم میں سے کوئی بھی اپنے عمل سے نجات نہیں پائے گا۔"

قوله: واشهد ان محمدا عبده ورسوله:

"**محمدا**": یہ اصل میں حمد سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، اس میں حمد کا مبالغہ ہے۔ وصفیت سے اسمیت کی طرف منتقل ہو کر

آپ ﷺ کا اسم گرامی ہو گیا۔ اسماء آسمان سے نازل ہوتے ہیں، آپ ﷺ کے نام کی وجہ مناسبت یہ ہے کہ آپ ﷺ مقام محمود تک پہنچے ہیں جس کی اولین و آخرین نے تعریف کی ہے۔

"**عبده**": اس میں اضافت برائے تشریف و تخصیص ہے، اس میں اشارہ ہے کہ آپ ﷺ حق ربوبیت کی ادائیگی میں مقام عبودیت کے مرتبۂ کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ یہ وصف آپ ﷺ کے اوصاف میں اشرف، اعلیٰ، افضل و اعلیٰ ترین وصف ہے، اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کا یہ وصف کئی مقامات پر بیان فرمایا ہے:

(۱) ﴿سبحان الذی اسری بعبده﴾

(۲) ﴿تبارك الذی نزل الفرقان علی عبده﴾

(۳) ﴿فاوحی الی عبده ما اوحی﴾

اور قائل کا یہ شعر کس قدر خوب ہے!:

لا تدعني الا بيا عبدها — فانه اشرف اسمائيا

"تو مجھے صرف اس کا بندہ کہہ کر پکارنا، اس لئے کہ یہ میرے ناموں میں سے اشرف ترین نام ہے۔"

اور قاضی عیاض کے اس شعر کا کیا کہنا!:

ومما زادني عجبا و تيها — وكدت باخمصي أطا الثريا

"اور ان چیزوں میں سے جنہوں نے مجھ میں عجب و تکبر زیادہ کیا اور قریب تھا کہ میں اپنے پاؤں سے ثریا (ستارے) کو روندتا۔"

دخولي تحت قولك يا عبادي — وان صيرت احمد لي نبيا

"(ان چیزوں میں سے ایک چیز) تیرے فرمان "یا عبادی" میں میرا داخل ہونا ہے اور (ان چیزوں میں سے ایک چیز)

یہ (ہے) کہ تو نے احمد کو میرا نبی بنایا۔"

"ورسوله": اس میں اشارہ ہے کہ "رسالت" قرب کے مراتب میں اعلیٰ ترین اور محبت کی منازل میں اولیٰ ترین رتبہ ہے، اور آنحضرت ﷺ فرد اکمل ہیں اور افضل ترین مقام کو پہنچے ہوئے ہیں۔

دو وصفوں (نبوت ورسالت) کے جمع کرنے میں نصاریٰ پر تعریض ہے کیونکہ انہوں نے اپنے دین میں غلو کیا اور اپنے نبی کی مدح میں حد سے آگے بڑھ گئے۔

نبی اور رسول میں فرق:

کہا گیا کہ نبی اور رسول دونوں مترادف ہیں۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ نبی بنی آدم میں سے وہ آزاد مرد ہوتا ہے جس کی طرف شرع کی وحی آئی ہو، اگرچہ اسے اس کی تبلیغ کا حکم نہ کیا گیا ہو، اور اگر اسے اس کی تبلیغ کا حکم کیا گیا ہو تو وہ (نبی ہونے کے ساتھ ساتھ) رسول بھی ہے۔ لہٰذا دوسرا پہلے سے زیادہ عام ہے چنانچہ ہر رسول نبی ہے اس کے برعکس نہیں۔ اس مقام پر اخص کو ذکر کرنا معنی مقصودی کے سلسلہ میں زیادہ صریح ہے۔

قوله: الذی بعثه و طرق الایمان قد عفت آثارها...... جهل مكانها:

"الذی بعثه": ایک نسخہ میں "الله" کا اضافہ ہے۔

(آپ ﷺ کی بعثت کس کس کی طرف ہوئی؟ اس میں کئی آراء ہیں:)

(۱) آپ ﷺ کو جن وانس کی طرف بھیجا گیا تھا۔

(۲) کہا گیا ہے کہ ملائکہ کی طرف بھی بھیجا گیا تھا۔

(۳) ایک قول یہ ہے کہ تمام حیوانات کی طرف بھیجا گیا تھا۔

(۴) ایک قول یہ ہے کہ تمام مخلوقات کی طرف بھیجا گیا تھا۔ جیسا کہ اس پر مسلم شریف کی حدیث دلالت کرتی ہے:

"وارسلت الى الخلق كافة"

"طرق الایمان": اس سے مراد انبیاء کرام، کتب اور علماء ہیں۔ اور "قد عفت آثارها" یہ جملہ حالیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بھیجا اور ظاہر فرمایا اس حال میں کہ لوگوں کو حضور ﷺ کی کامل احتیاج تھی۔ چونکہ لوگ انتہائی ضلالت وجہالت میں تھے اس لئے کہ روئے زمین پر اس وقت آپ ﷺ کی معرفت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چند متبعین کے علاوہ کسی کو نہ تھی، جنہوں نے گمنام گوشوں اور پہاڑ کی چوٹیوں کو اپنا وطن بنا لیا تھا، تنہائی کو اور مخلوق سے چھپ کر عزلت نشینی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دی ہوئی تھی۔

وخبت انوارها ووهنت اركانها: یعنی اس کے انوارات اس قدر بجھ چکے تھے کہ وہ علم حاصل کرنا ممکن نہ رہا تھا جو کمال ظہور میں نور کے مشابہ ہے۔ اور اس کے ارکان کمزور ہوتے ہوتے معدوم ہو گئے تھے۔ "ارکان" سے مراد اساس توحید، نبوت، بعث بعد الموت پر اور قیامت پر ایمان ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ "ارکان" سے مراد نماز، زکوٰۃ اور تمام عبادات ہیں۔

"جهل": صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ ظلمتِ جہالت، غلبۂ فسق، کثرت ظلم اور قلتِ عدل کے ظہور میں مبالغہ ہے۔

فَشَيَّدَ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِ مِنْ مَعَالِمِهَا مَا عَفَا وَشَفٰى مِنَ الْعَلِيْلِ فِىْ تَاْيِيْدِ كَلِمَةِ التَّوْحِيْدِ مَنْ كَانَ عَلٰى شَفَا۔

''پس نبی کریم ﷺ نے ان مٹے ہوئے نشانوں کو ازسرنو نمایاں کیا اور کلمہ توحید سے اس بیمار کو شفاء پہنچائی جو ہلاکت کے کنارے پہنچ چکا تھا۔''

یعنی ان علوم ومعارف کو بلند وبالا اور ظاہر وقوی کیا جو صرف آپ ﷺ ہی کو عطا ہوئے تھے، آپ سے پہلے کسی کو اس جیسے علوم ومعارف نہیں دیئے گئے تھے۔

صلوات الله وسلامه عليه: جار مجرور ''نازلة'' محذوف کے متعلق ہو کر خبر ہے۔ یہ پورا جملہ معترضہ اخبار یہ ہے یا دعائیہ ہے۔ یہی زیادہ ظاہر ہے۔ ''صلوات'' سے مراد رحمت اور عنایت کی انواع واقسام ہیں، کہ یہ آپ پر نازل ہوں، آپ کی طرف متوجہ ہوں اور اللہ کی سلامتی آپ پر نازل ہو کہ دارین کی ہر آفت سے آپ کی حفاظت ہو۔

☆ سید عفیف الدین رحمہ اللہ کی طرف منسوب ایک نسخہ میں ''وسلامه عليه'' کا اضافہ ہے۔

صلاۃ وسلام پر ایک اشکال:

ایک نسخہ میں صرف صلاۃ کا ذکر ہے، سلام مذکور نہیں ہے۔ اس مشہور نسخہ پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ امام نووی رحمہ اللہ نے علماء سے نقل کیا ہے کہ دونوں میں سے صرف ایک کو لانے میں کراہت ہے۔

(اس اعتراض کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں:)

(۱) احتمال ہے کہ اس کراہت کا محل وہ لوگ ہوں جو اس کی عادت بنا لیتے ہیں۔ یہ جواب ظاہر ہے۔

(۲) ایک احتمال یہ ہے کہ مصنف نے زبان سے دونوں کو ادا کیا ہو اور کتابت میں صرف ایک پر اکتفاء کیا ہو (لہذا کسی ایک کے ذکر پر اکتفاء کا اشکال سرے سے وارد نہیں ہوتا۔) یہ بعید ہے۔

(۳) کراہت بمعنی خلاف اولیٰ ہے، کیونکہ کراہت کا اس معنی پر اطلاق بکثرت ہوتا ہے۔ یہ جواب زیادہ بہتر ہے۔

من معالمها: معلم کی جمع ہے، اس کا معنی ہے ''علامت''۔

ما عفا: ''ما'' موصولہ ہے یا موصوفہ ہے جو ''شيد'' کا مفعول ہے اور ''من'' بیانیہ متقدمہ کا۔ اور مطلب یہ ہے کہ ایمان کے راستوں کے نشان اور عرفان وایقان کے اسباب کی علامات جو ماند پڑ گئی تھیں، مٹ چکی تھیں ان کو واضح فرمایا۔

وشفى: اس کا عطف ''شيد'' پر ہے۔

من العليل: ''من كان'' کا بیان مقدم ہے، سجع کی رعایت کے لئے مقدم کیا گیا ہے۔

''في تائيد'': یہ جار مجرور ''شفى'' کے متعلق ہے اور ''من كان على شفا'' اس کا مفعول ہے۔

سید جمال الدین رحمہ اللہ نے ناقابل فہم بات کہی ہے کہ ہمارے اصل سماع اور موجود تمام نسخوں میں ''العليل'' عین مہملہ کے ساتھ ہے، اور یہ بھی جائز ہے کہ عین معجمہ کے ساتھ پڑھا جائے اور یہ ''الغل'' بمعنی ''کینہ'' سے ہو۔

غرابت کی ایک وجہ لفظی ہے کہ ''شفا'' اور ''علت'' کے درمیاں مناسبت فوت ہو جائے گی اور معنوی وجہ یہ ہے کہ علتوں کا وہ

عموم ختم ہو جائے گا جو جنس علیل سے مستفاد ہو رہا ہے اور صرف کینہ کی علت پر اکتفاء کرنا پڑے گا جب کہ یہ اس مقام سے بھی مناسبت نہیں رکھتا ہے۔

في تائيد كلمة التوحيد: تائید کا مطلب ہے تاکید، تقویت، نصرت واعانت۔

مصنف کے کلام میں دو صنعتیں ہیں: (۱) صنعت جناس (۲) صنعت طباق۔ ''صنعت جناس'' کا مطلب ہے دو کلموں کا لفظوں میں مشابہ ہونا اور ''صنعت طباق'' کا مطلب ہے جملہ میں دو ضدوں کو جمع کرنا۔

من كان على شفا: یعنی اور جو شخص جہنم کے گڑھے اور کھولتے پانی کے کنویں میں گرنے کے قریب تھا وہ نجات پا گیا۔ یہ کلام اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے: ﴿وكنتم على شفا حفرة من النار فانقذكم منها﴾ کہا گیا ہے کہ اس آیت میں ''من'' ''تبعیض کے لئے ہے۔ یعنی بیماروں میں سے ہلاکت کے دھانہ پر کھڑے شخص کو بچالیا۔ اس میں اشارہ ہے کہ آپ ﷺ عیوب کے طبیب اور قلوب کے حبیب ہیں۔

وَاَوْضَحَ سُبُلَ الْهِدَايَةِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّسْلُكَهَا وَاَظْهَرَ كُنُوْزَ السَّعَادَةِ لِمَنْ قَصَدَ اَنْ يَّمْلِكَهَا

''اور (آنحضرت ﷺ) نے اس شخص کے لئے ہدایت کے راستہ کو روشن کیا جو اس پر چلنے کا ارادہ کرے اور اس شخص کے واسطے نیک بختی کے خزانے ظاہر کیے جو ان کا مالک ہونے کا قصد کرے''۔

ان يسلكه: لفظ ''سبیل'' مذکر بھی مستعمل ہے اور مؤنث بھی (اس لئے ضمیر منصوب ''سبیل'' کی طرف راجع ہے۔)

واوضح سبيل الهداية: یعنی محبوب تک پہنچنے اور مطلوب تک راہنمائی دینے کا راستہ متعین و واضح کیا اس شخص کیلئے جو اس کو طلب کرے اور از خود اس مٰیں داخل ہونا چاہے۔ اور بندہ کا ارادہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے تابع ہے:

﴿وما تشاؤون الا ان يشاء الله﴾ اور تم جب ہی کہ چاہے اللہ۔

واظهر كنوز السعادة: مراد نیک بختی کے معنوی خزانے ہیں، یعنی معارف، علوم، اعلیٰ اعمال، اخلاق، شمائل اور عمدہ احوال جو ابدی و سرمدی خزانوں تک پہنچانے والے ہیں۔

لمن قصدان يملكها: یعنی جو ایسے ملکہ (استعداد) کے ذریعے اس کے مُلک تک پہنچنا چاہے اور اس کو اس کی مِلک کا ذریعہ بنانا چاہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿واذا رايت ثم رايت نعيما وملكا كبيرا﴾ یہاں ''کبیر'' سے مراد ''کثیر'' ہے۔

اور مصنف کے قول ''اراد'' اور ''قصد'' سے بعض مشائخ کے قول کی طرف اشارہ ہے: لابد من السعي ولايحصل بالسعي

(کوشش ضروری ہے اور کوشش سے حاصل نہیں ہوتا۔) اور وجہ تخصیص یہ ہے کہ یہ لوگ ایضاح واظہار سے نفع اٹھاتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ﴿هدى للمتقين﴾

اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ التَّمَسُّكَ بِهَدْيِهٖ لَا يَسْتَتِبُّ اِلَّا بِالْاِقْتِفَاءِ لِمَا صَدَرَ مِنْ مِّشْكٰوتِهٖ وَالْاِعْتِصَامَ بِحَبْلِ اللّٰهِ لَا يَتِمُّ اِلَّا بِبَيَانِ كَشْفِهٖ۔

''بعد ازاں جاننا چاہئے کہ نبی کریم ﷺ کے اسوہ کو اختیار کرنا اسی وقت معتبر ہوسکتا ہے کہ اس چیز پر (کامل) اعتماد کیا جائے

جو آپ ﷺ کے سینہ مبارک سے ظاہر ہوئی تھی (یعنی آپ ﷺ کے ارشادات واحکام) اور اللہ کی رسّی کو تھامنا جب ہی ممکن ہوسکتا ہے کہ اس کی تشریح وتوضیح ہو۔

اما بعد: مصنف یہ الفاظ حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کی اقتداء کرتے ہوئے لائے ہیں کیونکہ وہ اسے اپنے خطبوں میں ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف منتقل ہوتے ہوئے لایا کرتے تھے۔ اس کو ''فصل الخطاب'' کہا جاتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ''امابعد'' کا تکلم سب سے پہلے حضرت داؤد علیہ السلام نے کیا تھا۔

''اما'': مجمل کی تفصیل کے لئے ہے، کلمہ شرط ہے، اس کا فعل وجوبی طور پر حذف کیا گیا ہے۔

''بعد'': ظروف زمان میں سے ہے، شرط محذوف کے متعلق ہے، اس کا مضاف الیہ کے منوی ہے، مضاف الیہ سے قطع ہونے کے باعث یہ ضمہ پر مبنی ہے، اور تقدیری عبارت یوں ہے: **"مهما يذكر شئ من الاشياء بعد ما ذكر من البسملة و الحمدلة و الصلاة و الثناء"** (یعنی جب بھی چیزوں میں سے کوئی چیز بسم اللہ، الحمد للہ، صلاۃ اور ثناء کے بعد ذکر کی جائے)

فان التمسك بهديه: تمسک کا معنی ہے کسی چیز کے ساتھ لٹک جانا وابستہ ہوجانا چمٹ جانا اور ''ھدی'' سے مراد طریقہ ہے۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ''ہدیہ'' میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو اور ''ہدی'' سے مراد توحید ہے۔ اگلا جملہ ''**والاعتصام بحبل الله**'' کا عطف اس کی تائید کرتا ہے۔

''**لا يستتب**'': ایک نقطہ والی باء کی تشدید کے ساتھ، یعنی درست نہیں ہوتا، برقرار نہیں رہتا، آمادہ نہیں ہوتا، موافق نہیں ہوتا

من مشكاته: مشکوۃ سے مراد آپ ﷺ کا سینہ اطہر، قلب منور یا دہن مبارک ہے۔ پہلی مراد زیادہ ظاہر ہے۔

''مشکاۃ'' لغت میں اس طاقچہ کو کہتے ہیں جو بغیر کھڑکی والی دیوار میں ہو جس میں چراغ رکھا جاتا ہے۔

''مشکوۃ'' کو حضور ﷺ کے سینہ اطہر کے لئے بطور استعارہ استعمال کیا گیا۔ اس لئے کہ وہ روشن دان کی مانند ہے دو جہتوں والا ہے، کہ ایک جہت سے قلب مستنیر (کے ذریعہ) سے روشنی حاصل کرتا ہے اور دوسری جہت سے اس حاصل شدہ نور کا فیضان مخلوق پر کرتا ہے۔ اور ''لطیفہ قدسیہ'' یعنی دل کو روشن چراغ سے تشبیہ دی۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے اقتباس ہے:

﴿الله نور السموت والارض مثل نوره﴾

(اس آیت مبارکہ کے بارے میں) کہا گیا ہے (کہ مثل نورہ کی ضمیر کا مرجع محمد ﷺ ہیں یعنی) محمد ﷺ کا نور ایسے طاقچہ کی مانند ہے جس میں چراغ ہو۔

یہاں (یعنی بحبل اللہ میں) ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو لانا (اولاً) وہم کو دور کرنے کے لئے ہے اور (ثانیاً) اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی اتباع میں ہے: **﴿واعتصموا بحبل الله﴾** اور پہلے (فقرہ) میں اس کے برعکس کیا گیا ایک تو اس لئے کہ وہ واضح تھا اور دوسری بات یہ کہ مقام بھی اس پر دلالت کررہا ہے۔ اگر ضمیر کی جگہ صریح اسم لاتے تو زیادہ بہتر ہوتا خصوصاً جب کہ ''فصل الخطاب'' کی وجہ سے فصل پایا جارہا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

"والاعتصام": نصب کے ساتھ ہے، اس کا رفع بھی جائز ہے۔ اس کا معنی ہے "مضبوط تھامنا"

"حبل اللّٰه": اللہ کی رسی سے مراد قرآن کریم ہے، چونکہ ایک روایت میں ہے کہ "قرآن اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے۔" اللہ کی رسی کے ساتھ تشبیہ دی، چونکہ اس کے ذریعے سے مقصود تک پہنچا جاتا ہے اور اس کے ذریعے بلند مرتبوں تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ قرآن ہی تعلّی و تدلّی کے قابل ہے۔ اس وجہ سے حدیث میں آیا ہے:

((القرآن حجة لك او عليك)) "قرآن تیرے لئے حجت ہے یا تیرے خلاف حجت ہے"۔

پس قرآن ایسے ہے جیسے دریائے نیل محبوبوں کے لئے پانی اور محروموں کے لئے خون ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿يضل به كثيرا و يهدى به كثيرا﴾

"گمراہ کرتا ہے خدا تعالیٰ اس مثال سے بہتیروں کو اور ہدایت کرتا ہے اس سے بہتیروں کو۔"

﴿وننزل من القرآن ما هو شفاء و رحمة للمومنين ولا يزيد الظلمين الا خسارا﴾

"اور ہم اتارتے ہیں قرآن میں سے جس میں روگ دفع ہوں اور رحمت ایمان والوں کے واسطے اور گنہگاروں کو تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے۔"

الا ببيان كشفه: اس میں اضافت بیانیہ ہے۔ بیان کشف سے مراد سنت نبویہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لتبين للناس ما نزل اليهم﴾ "تاکہ تو کھول دے لوگوں کے سامنے وہ چیز جو اتری ان کے واسطے"۔

اس میں کوئی خفا نہیں کہ قرآن میں اجمال ہے اور حدیث میں تفصیل و تبیین ہے، کیونکہ نماز مجمل ہے، نمازوں کے اوقات، ان کی تعداد، ارکان، شرائط، واجبات، سنن، مکروہات اور مفسدات کو سنت ہی نے بیان کیا ہے۔

اس طرح زکوۃ کی مقدار، اس کے نصاب کی تفصیل اور اس کے مصارف حدیث سے ہی معلوم ہوئے ہیں۔ اسی طریقے سے روزہ، حج، تمام امور شرعیہ، قضایا، دینی احکام، حلال و حرام کی تمیز اور آخرت کے احوال کی تفاصیل ہے۔ لہٰذا کتاب، سنت اور اجماع امت کو لازم پکڑو، اربابِ خواہشات اور بدعتیوں سے بچ، تاکہ تو اس نجات یافتہ گروہ میں سے ہو جو استقامت کے ساتھ تابعداری کے راستے پر گامزن ہے۔ کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے:

كل العلوم سوى القرآن مشغلة الا الحديث والا الفقه فى الدين

"قرآن، حدیث اور دین کی فقہ کے علاوہ تمام علوم مشغلہ ہیں"

العلم متبع ما فيه حدثنا وما سوى ذاك وسواس الشياطين

"قابل اتباع علم وہ ہے جس میں ہمیں حدیث بیان کی جائے اور اس کے علاوہ جو بھی ہے وہ شیاطین کے وسوسے ہیں۔"

صوفیاء کرام کے ایک قول کی وضاحت:

بعض صوفیاء نے یہ جو کہا ہے کہ "حدثنا" دنیا کے ابواب میں سے ایک باب ہے۔ تو اس کی مراد یہ ہے کہ جب اس سے مولیٰ کی مرضی مقصود نہ ہو۔ اسی وجہ سے بعض علماء محدثین نے کہا ہے کہ "ہم نے علم غیر اللہ کیلئے سیکھا تھا پھر وہ اللہ ہی کیلئے ہو کر رہ گیا۔"

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے کہا گیا: کب تک علم حاصل کرو گے پھر عمل کب کرو گے تو انہوں نے کہا کہ ہمارا علم ہی وہ عمل

ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کیا ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرہ شریفہ سے باہر تشریف لائے اور فرمایا: ”اے اللہ میرے خلفاء پر رحم فرما“ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کے خلفاء کون ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میرے خلفاء وہ ہیں جو میری احادیث اور سنن کی روایت کرتے ہیں اور اسے لوگوں کو سکھلاتے ہیں۔“

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث کو حاصل کرنے کے لئے مدینہ سے ایک ماہ کی مسافت کا سفر کیا۔

وَكَانَ كِتَابُ الْمَصَابِيحِ الَّذِي صَنَّفَهُ الْإِمَامُ مُحْيِ السُّنَّةِ قَامِعُ الْبِدْعَةِ أَبُوْ مُحَمَّدٍ الْحُسَيْنُ ابْنُ مَسْعُوْدٍ الْفَرَّاءُ الْبَغَوِيُّ رَفَعَ اللّٰهُ دَرَجَتَهُ أَجْمَعَ كِتَابٍ صُنِّفَ فِيْ بَابِهٖ وَأَضْبَطَ لِشَوَارِدِ الْأَحَادِيْثِ وَأَوَابِدِهَا۔

”امام محی السنۃ (سنت کو زندہ کرنے والے) قامع البدعۃ (بدعت کو دور کرنے والے) ابو محمد حسین الفراء بغوی – اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے – (اور ان پر اپنی کامل رحمت کرے) نے جو کتاب (مصابیح) تالیف فرمائی تھی وہ اپنے فن (یعنی حدیث) کی جامع، اور منتشر و متفرق احادیث کو منضبط کرنے والی کتاب تھی۔

و کان کتاب المصابیح: کان کی خبر "اجمع" ہے۔

کہا گیا ہے کہ مشکوۃ میں چار ہزار چار سو چونتیس (۴۴۳۴) احادیث تھیں، صاحب مشکاۃ نے اس میں ایک ہزار پانچ سو گیارہ (۱۵۱۱) احادیث کا اضافہ کر دیا تو مجموعہ پانچ ہزار نو سو پینتالیس (۵۹۴۵) ہو گیا۔ تعداد کا ضبط بیان کرتے ہوئے ”پچپن کم چھ ہزار“ کی تعبیر بھی اختیار کی جاتی ہے۔

الامام: وہ شخص جس کی اقتداء تمام احکام میں کی جائے۔

آپ مفسر، محدث اور فقیہ تھے، اصحاب وجوہ میں سے تھے۔ ہمارے بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ ان کا کوئی بھی قول ساقط نہیں ہے، وہ علم قرأت میں ماہر تھے، عابد و زاہد تھے، سلف صالحین کے طریقے پر علم و عمل کو جامع تھے۔ روٹی بغیر سالن کے کھایا کرتے تھے، بوڑھا اور کمزور ہونے کے باعث روٹی تیل کے ساتھ کھایا کرتے تھے، بعض کا کہنا ہے کہ روٹی کشمش کے ساتھ کھاتے تھے۔

اکابر کی ایک جماعت نے ان سے حدیث کی روایت کی ہے جس میں حافظ ابو موسیٰ المدینی اور صاحب ”العوارف“ کے چچا شیخ ابو النجیب سہروردی سرفہرست ہیں۔ مصابیح کے علاوہ ان کی اور بھی مشہور تصانیف ہیں۔ جیسے حدیث میں ”شرح السنۃ“، فقہ میں ”کتاب التھذیب“ اور تفسیر میں ”معالم التنزیل“ ہے۔

محیی السنۃ: یہاں سنت سے مراد ادلہ حدیث ہیں، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال، تقریر اور احوال ہیں۔

مروی ہے کہ جب انہوں نے اپنی کتاب ”شرح السنۃ“ کو جمع کیا تو خواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے۔

فرمایا:"احیاك الله كما احييت سنتي" ''اللہ تجھے زندگی دے جیسے تو نے میری سنت کو زندگی دی''۔اس کے بعد سے یہ'' لقب'' غلبہ کی وجہ سے آپ کا نام بن گیا۔آپ ۵۱۶ھ کو مرو میں فوت ہوئے۔اپنے شیخ واستاذ فقیہ خراسان قاضی حسین مروزی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس دفن ہوئے۔

قامع البدعة: یعنی بدعت کو کاٹنے والا، اہل بدعت کو دور کرنے والا، بدعت کو باطل قرار دینے والا، بدعت کو مارنے والا۔

''ابو محمد''ان کی کنیت ہے۔

''الحسین''ان کا نام ہے جو بدل یا عطف بیان ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے،''ابن مسعود''اس کی صفت ہے۔

''الفراء'': جر کے ساتھ ہے، یہ ان کے والد کی صفت ہے۔یہ پوستین بنایا کرتے تھے یا اس کی تجارت کیا کرتے تھے۔یہ وہ فراء (رحمۃ اللہ علیہ) نہیں ہیں جو مشہور نحوی ہیں جیسا کہ بعض کو وہم ہوا ہے کیونکہ وہ ان سے تفسیر میں روایت نقل کرتے ہیں۔

البغوی: رفع کے ساتھ ہے، اور اس میں جر بھی جائز ہے۔یہ''بغ'' کی طرف نسبت ہے۔کہا جاتا ہے کہ یہ''بغشور'' کی طرف نسبت ہے جو مرو اور ہرات کے درمیان حدود خراسان میں ایک بستی ہے۔

یہ مرکب منع صرف ہے۔اس کی اپنے پہلے جزء کی طرف نسبت کی جاتی ہے جیسے''معدیکرب'' سے''معدی''اور''بعلبک'' میں پہلے جزء کی طرف نسبت ہے۔البتہ نسبت میں واؤ آتی ہے لفظ''بغ'' کو''اسمائے محذوفۃ الاعجاز'' کا قائم مقام بناتے ہوئے جیسے (دم سے)"دموی"۔ یہاں نسبت میں واؤ لانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ''بغی''، بمعنی''زانی'' سے التباس لازم نہ آئے۔بعضوں نے کہا کہ یہ خلاف قیاس منسوب ہے۔

رفع الله درجته: یہ جملہ دعائیہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے:

﴿یرفع الله الذین امنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات﴾

''اللہ بلند کرے گا از روئے درجات ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں تم میں سے اور جن کو علم دیا گیا ہے''۔

اجمع كتاب صنف فی بابه: یہ کتاب باب حدیث میں جامع ترین ہے چونکہ انہوں نے (اس کتاب میں) بہت اہم اور ضروری احادیث کو جمع کیا ہے کہ جن سے آخرت کے راستے پر چلنے والا- چاہے وہ امام ہو- مستغنی نہیں ہوسکتا۔اس کو کتب فقہیہ کی ترتیب پر مرتب کیا ہے تاکہ آسانی رہے، بعض احادیث بعض اجمال احادیث کی تفسیر بیان کریں اور اختلافی مسائل حسبِ دلالتِ احادیث واضح ہو جائیں۔

واضبط: اس کا عطف''اجمع'' پر ہے۔یہ کتاب منضبط بایں طور ہے کہ جب مصنف نے اسانید، الفاظ کے اختلاف اور مسانید کے تکرار کو حذف کر دیا تو یہ کتاب حفظ اور ضبط کے قریب تر اور غلط وخبط سے بعید تر ہوگئی۔

لشوارد الاحادیث: شاردۃ کی جمع ہے، اس کا معنی ہے''ذہن سے نکل جانے والی''۔یہ''اضافة الموصوف الی الصفة'' کے قبیل سے ہے۔

واوابدها: عطف تفسیری ہے، اس کا معنی ہے''نامانوس''۔

''احادیث'' کو''وحوش'' سے تشبیہ دی، چونکہ یہ ضبط وحفظ سے بہت تیزی سے اور دور نکل جاتی ہیں۔اسی وجہ سے کہا گیا ہے

:"والعلم صيد والكتابة قيد" کہ "علم شکار ہے اور کتابت اسے قید کرنا ہے۔"

وَلَمَّا سَلَكَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ طَرِيْقَ الْإِخْتِصَارِ وَحَذَفَ الْأَسَانِيْدَ تَكَلَّمَ فِيْهِ بَعْضُ النُّقَّادِ

"اور جب مصنف (امام بغویؒ) نے (اپنی اس تصنیف میں) اختصار کے طریقہ کو اختیار کیا (کہ احادیث کے متون پر ہی اکتفاء کیا) اور اسناد کو حذف کر دیا تو اس (کتاب کی کچھ احادیث) پر بعض محدثین و ناقدین نے طعن کیا"۔

"رضي الله عنه" جملہ معترضہ دعائیہ ہے۔

وحذف الاسانيد: اس کا عطف "سلک" پر ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ مصدر مضاف ہے اس کا عطف "طریق" پر ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ عطف تفسیری ہے۔

یہاں "اسناد" سے مراد کیا ہے اس میں دو احتمال ہیں:

(الف) ہر حدیث میں حذفِ صحابی اور ترکِ صاحب تخریج۔ یہ مجازی معنی ہے، جو "اطلاق الکل علی البعض" کے باب سے ہے، یعنی سند کے دو اطراف مراد ہیں۔ مصنف کی مراد یہی ہے جیسا کہ ان کے قول "لکن لیس ما فیہ اعلام کالاغفال" سے ظاہر ہوتا ہے۔

(ب) حقیقی معنی مراد ہے یعنی محدثین کی یہ اصطلاح مراد ہے: حكاية طريق متن الحديث بحيث يعلم رواته۔ مصنف نے اسانید کو حذف کر دیا چونکہ ان کے ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، اس لئے کہ ان کے ذکر سے مقصود یہ تھا کہ تعارض کے وقت راویوں کے زیادہ عادل ہونے اور بعض کے بعض پر مقدم ہونے کی وجہ سے راجح و مرجوح اور ناسخ و منسوخ حدیث کی شناخت ہو جائے اور اس جیسے دیگر امور پیش نظر تھے جو مجتہد کے لئے ضروری ہیں۔ جب مجتہد معدوم ہو گئے اور شہروں میں ان کا وجود نادر ہو گیا اور یہ کتاب نیک صالح لوگوں کے لئے لکھی گئی تو اسانید کے ذکر کرنے کا زیادہ فائدہ نہ رہا، اس لئے اجمالی طور پر صحیح اور حسن کہنے پر پورا اکتفاء کیا۔

تكلم فيه النقاد: یہ جملہ "لما" کا جواب ہے۔ اور "النقاد" نون کے ضمہ اور قاف کی تشدید کے ساتھ ہے۔

ناقدین سے مراد وہ علماء ناقدین ہیں جو صحیح و ضعیف کے درمیان تمیز کرتے ہیں۔ بعض شراح نے "نقاد" کا مطلب یہی ذکر کیا ہے لیکن یہ مفہوم صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ حدیث کے رجال میں طعن صرف اس کی اسناد کی وجہ سے ہوتا ہے، اور وہ اسناد کے ذکر کرنے یا نہ کرنے سے نہیں بدلتا۔ الا یہ کہ یوں کہا جائے کہ اس کا تصور حدیث کے بعض افراد میں ہوتا ہے اور وہ اس طرح متصور ہو سکتا ہے کہ حدیث کی دو سندیں ہوں اور اس کی وہ اسناد ذکر کی جائے جو ثابت ہو تو طعن کرنے والے کو اس میں طعن کا موقع نہیں ملے گا۔ اس بات کی تائید مصنف کے قول "وان كان نقله الخ" ہو رہی ہے۔ اس وقت کلام کا معنی یہ ہوگا کہ اگرچہ ان بعض احادیث پر ہونے والا یہ اعتراض بھی ختم ہو جاتا ہے چونکہ ان (متکلم فیہا روایات) کے رجال ثقہ ہیں اور جب حدیث کی نسبت مع اسناد اصحاب تخریج ائمہ کی طرف کر دی تو یہ اسناد کے حکم میں ہے۔ جیسا کہ اس طرف "الصحاح ما فيه حديث الشيخين او احدهما" کے الفاظ سے اشارہ کیا ہے۔ اور اس میں جو احادیث حسن ہیں وہ کتب سنن سے ماخوذ ہیں وہ اسناد کے حکم میں ہیں۔

سید جمال الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یعنی بعض مبصرین نے اس میں کلام کیا ہے۔اس پر اعتراض یہ کیا ہے کہ حدیث کی صحت وسقم کا معاملہ معرفت اسناد پر موقوف ہوتا ہے اور جب اسناد ذکر نہیں کی تو صحیح کی ضعیف سے پہچان نہیں ہوئی لہٰذا یہ نقص ہوا۔

ہمارے شیخ علامہ ابن حجر مکی رحمہ اللہ نے اپنی شرح مشکاۃ میں "قد تکلم فیه بعض النقاد" کے تحت لکھا ہے:

"اس حذف کی وجہ سے بعض ناقدین مثلاً امام نووی اور ابن صلاح وغیرہ نے کلام کیا ہے کہ مصنف پر لازم تھا کہ وہ اپنی طے کردہ اصطلاح کے بارے میں یہ صراحت کرتے کہ یہ میری اپنی تعبیر ہے۔یہ حضرات فرماتے ہیں کہ مصنف نے اپنی کتاب مصابیح میں احادیث صحاح اور حسان کی تقسیم کی ہے:

"صحاح وہ احادیث ہیں جن کو شیخین یا ان میں سے کسی ایک نے اپنی صحیحین میں روایت کیا ہے اور حسان وہ احادیث ہیں جن کو امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی، امام دارمی اور امام ابن ماجہ وغیرہ نے روایت کیا ہے۔"

یہ تقسیم معروف نہیں ہے، بلکہ ان کی یہ اصطلاح خلاف صواب ہے، اس لئے کہ محدثین کے نزدیک حسن کا مفہوم یہ نہیں ہے، چونکہ جن کتب سنن کی طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے ان میں حسن ہی نہیں بلکہ صحیح اور ضعیف احادیث بھی ہیں، لیکن مولف کی یہ بات "لا مشاحة في الاصطلاح" ان کی تائید کرتی ہے۔ بلکہ کسی آدمی کو اس کی اپنی اصطلاح میں قصور وار ٹھہرانا درست نہیں اور امام بغوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں صراحت کی ہے کہ میری مراد صحاح سے یہ یہ ہے اور حسان سے یہ یہ ہے، بغوی نے یہ نہیں کہا کہ "محدثین کی ان دونوں سے مراد یہ یہ ہے" لہٰذا انہوں نے جو ذکر کیا ہے اس پر اعتراض وارد نہیں ہوتا حالانکہ ان کا کہنا ہے کہ "اس میں جو ضعیف وغریب احادیث تھیں ان کی طرف میں نے اشارہ کر دیا ہے اور جو روایات منکر وموضوع تھیں ان سے میں نے اعراض کیا ہے۔"

اور یہ بات مخفی نہ رہے کہ "تکلم فیہ" کو اس معنی پر محمول کرنا، نہ مصنف کی اس عبارت "وان کان نقله الخ" سے مناسب رکھتا ہے اور نہ اس عبارت سے: "لکن لیس ما فیه اعلام" چونکہ ان دونوں میں سے پہلی عبارت جواب بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور دوسری عبارت صحیح استدراک بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

وَاِنْ كَانَ نَقْلُهٗ وَاَنَّهٗ مِنَ الثِّقَاتِ كَالْاَسْنَادِ لٰكِنْ لَّيْسَ مَا فِيْهِ اِعْلَامٌ كَالْاِغْفَالِ

"اگرچہ مصنف کا حدیث کو ثقہ حضرات سے (بغیر سند کے) نقل کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ سند کے ساتھ نقل کیا ہو (کیونکہ وہ نقل حدیث اور بیان صحت، حسن وضعف کے معاملہ میں معتمد محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں) لیکن پھر بھی جو چیز بے نشان ہو وہ نشان والی چیز کے درجہ میں نہیں ہو سکتی۔"

وان کان نقله: واؤ "وصلیہ" ہے۔

وانه من الثقات: ایک روایت میں "انه" کا ہمزہ مکسور ہے کیونکہ "نقله" کے مضاف الیہ سے حال ہے۔

ایک روایت کے مطابق "انه" کا ہمزہ مفتوح ہے اس صورت میں اس کا عطف "کان" کے اسم یعنی "نقله" پر بتاویل مصدر ہوگا۔ای "وان کان نقله و کونه من الثقات کالاسناد" کیونکہ یہ اس کی شان ہے جس کی امانت مشہور ہے اور جس کی

عدالت وصیانت معروف ہے پس اس کی نقل پر اعتماد کیا جاتا ہے اگر چہ اس کی اسناد ذکر نہیں کی۔

اعلام :ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ۔کسی چیز کے اعلام وہ علامات ہوتی ہیں جن کے ذریعے اس چیز کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

کالاغفال :ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ، ایسی مجہول زمینیں جن میں پہچان کی کوئی نشانی نہیں ہوتی۔

اور بعض نسخوں میں ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ چنانچہ لفظاً یہ دونوں مصدر ہوں گے اور معناً ایک دوسرے کی ضد ہوں گے۔ پہلے سے ان کی مراد ''مشکاۃ شریف'' ہے اور دوسرے سے ''مصابیح السنۃ'' ہے۔

ان کا حق یہ تھا کہ یوں کہتے: ''لکن لیس ما فیه اغفال کالاعلام''۔ ممکن ہے کہ انہوں نے امام کے ساتھ تواضع کی وجہ سے کلام میں قلب کیا ہو اور بلوغ المرام (مقصد تک رسائی) میں اپنے آپ کو کوتاہ سمجھا ہوئے یہ تعبیر اختیار کی ہو۔

حاصل کلام یہ ہے کہ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ امام بغوی کے صنیع میں فی الجملہ نقص ہے، اور وہ نقص یہ ہے کہ آغاز حدیث میں صحابی کا ذکر نہیں کیا اور اختتام پر صاحب تخریج کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ ان دونوں امور کا ذکر کئی فوائد پر مشتمل ہے۔

صحابی کا ذکر کرنے کا (پہلا) فائدہ یہ ہے کہ کبھی حدیث کے راوی اور طریق متعدد ہوتے ہیں، جن میں سے بعض صحیح اور بعض ضعیف ہوتے ہیں، چنانچہ صحابی کا ذکر اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ ضعیف روایت اور صحیح روایت میں امتیاز ہو جائے۔

صحابی کا ذکر کرنے میں (دوسرا) فائدہ یہ ہے کہ حالات راوی مثلاً زیادت فقہ وورع کی بنیاد پر راجح حدیث کا پتہ چل جاتا ہے۔ نیز راوی کے قبول اسلام کے زمانہ کی بنیاد پر ناسخ ومنسوخ کی پہچان ہو جاتی ہے۔

صاحب تخریج کا ذکر کرنے میں (پہلا) فائدہ یہ ہے کہ الفاظ حدیث کی تعیین ہو جاتی ہے اور اس کے رجال اسناد کی وضاحت ہو جاتی ہے، اس کے مخرجین کی کثرت وقلت کا پتہ چلتا ہے کہ اس کی روشنی میں (کسی ایک روایت کو دوسری روایت پر) ترجیح دی جاسکتی ہے، نیز زیادت تصحیح کا علم ہو جاتا ہے۔

اس ذکر کا ایک فائدہ ارباب وصول کے نزدیک یہ ہے کہ فصول وغیرہ میں اختلاف کے وقت اصول کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

فَاسْتَخَرْتُ اللّٰهَ تَعَالٰى وَاسْتَوْفَقْتُ مِنْهُ فَاَوْدَعْتُ كُلَّ حَدِيْثٍ مِنْهُ فِيْ مَقَرِّهٖ فَاَعْلَمْتُ مَا اَغْفَلَهٗ كَمَا رَوَاهُ الْاَئِمَّةُ الْمُتْقِنُوْنَ وَالثِّقَاتُ مِثْلُ اَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ مُحَمَّدِ بْنِ اِسْمَاعِيْلَ الْبُخَارِيِّ وَاَبِي الْحُسَيْنِ مُسْلِمِ بْنِ الْحَجَّاجِ الْقُشَيْرِيِّ وَاَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ مَالِكِ بْنِ اَنَسٍ الْاَصْبَحِيِّ وَاَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ مُحَمَّدِ بْنِ اِدْرِيْسَ الشَّافِعِيِّ وَاَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ اَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلٍ الشَّيْبَانِيِّ وَاَبِيْ عِيْسٰى مُحَمَّدِ بْنِ عِيْسٰى التِّرْمِذِيِّ وَاَبِيْ دَاوُدَ سُلَيْمَانَ بْنِ الْاَشْعَثِ السِّجِسْتَانِيِّ وَاَبِيْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَحْمَدَ بْنِ شُعَيْبٍ النَّسَائِيِّ وَاَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ مُحَمَّدِ بْنِ يَزِيْدَ ابْنِ مَاجَةَ الْقَزْوِيْنِيِّ وَاَبِيْ مُحَمَّدٍ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ الدَّارِمِيِّ وَاَبِي الْحَسَنِ عَلِيِّ بْنِ عُمَرَ الدَّارَقُطْنِيِّ وَاَبِيْ بَكْرٍ اَحْمَدَ بْنِ الْحُسَيْنِ الْبَيْهَقِيِّ وَاَبِي الْحَسَنِ رَزِيْنِ بْنِ مُعَاوِيَةَ الْعَبْدَرِيِّ وَغَيْرِهِمْ وَقَلِيْلٌ مَاهُوَ۔

پس میں نے اللہ تعالیٰ سے مدد چاہی اور اس کی توفیق کا طلبگار رہا۔ میں نے (مصابیح کی) ہر حدیث کو جس باب سے اس کا تعلق تھا اسی باب میں نقل کیا اور علماء و محدثین نے جس طرح اس کو روایت کیا اسی طرح میں نے بھی مع سند اور حوالۂ کتاب کے اس کو ذکر کیا۔ مثلاً امام بخاری، امام مسلم، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام دارمی، امام دارقطنی، امام بیہقی، امام رزین بن معاویہ عبدری۔ ان ائمہ اور محدثین نے جس طرح اپنی کتابوں میں حدیث کو نقل کیا ہے اسی طرح میں نے ان کی کتابوں سے حدیث کو لے کر اس کتاب میں جمع کر دیا۔ ان ائمہ اور محدثین کے علاوہ کچھ دوسرے محدثین بھی ہیں جن کی کتابوں سے احادیث نقل کی گئی ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے''۔

فاستخرت الله تعالىٰ: مصنف کا اللہ تعالیٰ سے مدد چاہنا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کی بناء پر تھا:

﴿وربك يخلق ما يشاء ويختار ما كان لهم الخيره﴾

''اور تیرا رب پیدا کرتا ہے جو چاہے اور پسند کرے جس کو چاہے، ان کے ہاتھ میں نہیں پسند کرنا''۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی بناء پر تھا جس کو امام طبرانی نے مرفوع روایت کیا ہے:

((ما خاب من استخار، ولا ندم من استشار، ولا عال من اقتصد))

'جو استخارہ کرتا ہے وہ نامراد نہیں ہوتا، جو مشورہ کرتا ہے وہ نادم نہیں ہوتا، اور جو میانہ روی اختیار کرتا ہے وہ محتاج نہیں ہوتا۔

اور تیسری بات یہ کہ بندہ یہ جانتا کہ کونسی چیز اس کیلئے خیر ہے اور کونسی چیز اس کیلئے شر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿عسٰى ان تكرهوا شيئا وهو خير لكم و عسى ان تحبوا شيئا وهو شر لكم والله يعلم وانتم لا تعلمون﴾

''شاید کہ تم کو بری لگے ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمہارے حق میں اور شاید تم کو بھلی لگے ایک چیز اور وہ بری ہو تمہارے حق میں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے''۔ اور خیر اس میں زیادہ ہے جسے ہمارے خالق نے پسند کیا۔

واستوفقت منه: اکثر تصحیح شدہ نسخوں میں فاء، قاف پر مقدم ہے، چنانچہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے توفیق طلب کی اور استقامت پر توثیق کا راستہ طلب کیا۔

ایک نسخہ میں اس کے برعکس (قاف، فاء پر مقدم) ہے (یعنی ''استوقفت'' ہے) اس صورت میں معنی یہ ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے انکارِ منکر اور معرفتِ معروف پر واقفیت طلب کی۔ (یعنی مجھے یہ توفیق عطا فرما کہ میں منکر و غیر منکر روایت کی پہچان کر سکوں)

ایک نسخہ میں ثاء اور قاف کے ساتھ (استوثقت) ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے وثوق و ثبوت طلب کیا کہ میں مردود و مثبوت (روایت) کے درمیان تمیز کر سکوں۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یعنی میں نے مصابیح سے وہ احادیث لی ہیں جو قابل اعتماد اور مقصود بالذات ہیں، اور یہ وہ احادیث ہیں جو صحاح اور حسان کی علامت سے خالی ہیں۔

فاودعت كل حديث منه في مقره: بعض نسخوں میں یہ فقرہ اسی طرح موجود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے کتاب کی

ہر حدیث کو (مصابیح کی ترتیب کے مطابق) اس کے محل موضوع کتاب اور باب میں ذکر کیا ہے۔ نہ کوئی تقدیم وتاخیر کی ہے، نہ کوئی کمی بیشی کی ہے اور نہ کوئی تبدیلی کی ہے۔

فاعلمت ما اغفله: یعنی میں نے وہ چیز بطریق التزام ہر حدیث میں بیان کردی ہے جس کو (صاحب مصابیح نے) جان بوجھ کر چھوڑ دیا تھا، کہ حدیث کے شروع میں صحابی کا نام چھوڑ دیا تھا، اور آخر میں صاحب تخریج کا نام چھوڑ دیا تھا۔

الائمة: امام کی جمع ہے۔ یہ اصل میں ''**ائممة**'' بروزن ''**افعلة**'' تھا۔ اس میں تعلیل ہوئی ہے کہ پہلے نقل حرکت ہوئی پھر ادغام ہوا۔ دوسرے ہمزہ کو باقی رکھنا، اس میں تسہیل اور ابدال بھی جائز ہے۔

یہاں ائمہ سے مراد وہ ائمہ حدیث ہیں جن کی زمانۂ قدیم وجدید میں اقتدا کی جاتی ہے۔

المتقنون: مراد اہلِ ضبط، حفاظ حدیث اور مرویات کے ماہر ہیں۔

یہ " **اتقن الامر** " سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے مضبوط کرنا۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے:

﴿**صنع الله الذی اتقن کل شیء**﴾ ''کاری گر اللہ کی جس نے درست کیا ہر چیز کو''۔

الثقات: ثاء کے کسرہ کے ساتھ، یہ ثقہ کی جمع ہے۔ مراد عادل وثبت ائمہ ہیں۔

الراسخون: علم حدیث شریف کے محافظ، اور اس فن کے طرق کی رعایت رکھنے والے علماء مراد ہیں۔

قوله: مثل ابی عبدالله محمدبن اسماعیل البخاری:

(آپ کا نام محمد اور آپ کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔) آپ کی ولادت شوال ۱۹۴ھ میں بروز جمعہ بعد نماز عصر ہوئی۔

''البخاری'': بخاریٰ کی طرف نسبت ہے، چونکہ آپ یہاں پیدا ہوئے تھے۔ یہ ماوراء النہر کے علاقوں میں سے ایک بڑا شہر (علاقہ) ہے۔ پھر یہ ان کا اور ان کی کتاب کا نام بن گیا۔

سید جمال الدین محدث رحمہ اللہ نے آپ کو ان القابات سے موسوم کیا ہے:

" **امیر المؤمنین فی الحدیث، ناصر الاحادیث النبویة، ناشر المیرایث المحمدیة** "

کہا گیا ہے کہ حفظ حدیث، اتقان، کتاب اللہ اور سنت رسول کے معانی کی فہم، حدت ذہنی، دقت نظر، وفور فقہ، کمال زہد، غایت تقویٰ، طرق حدیث کی کثرت، علل حدیث کی معرفت، اور قوت اجتہاد واستنباط میں ان کے زمانے میں ان جیسا کوئی نہیں دیکھا گیا

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ان کے والد (اسماعیل) باعمل علماء میں سے تھے۔ حماد بن زید اور امام مالک سے روایت کرتے تھے، ابن مبارک کے صحبت یافتہ تھے۔ ان سے عراق والے روایت کرتے ہیں۔ آپ کا کہنا ہے کہ میرے علم کے مطابق میرے سارے مال میں کوئی مشتبہ درہم نہیں ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا بچپن:

ان کی والدہ مستجاب الدعوات خاتون تھیں۔ آپ چھوٹے ہی تھے کہ والد وفات پا گئے، چنانچہ آپ والدہ کی گود میں پلے بڑھے۔ پھر آپ نابینا ہو گئے۔ اطباء آپ کے علاج سے عاجز آ گئے۔ ایک رات آپ کی والدہ نے خواب میں حضرت ابراہیم

خلیل علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کو دیکھا وہ ان سے فرمارہے تھے کہ تمہاری دعاؤں کی کثرت سے اللہ نے اس کی بینائی لوٹادی ہے۔ جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ بینائی واپس آچکی ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی طلب علم:

امام بخاری علم کی گود میں فضل کے پستان سے دودھ پی کر پروان چڑھے تھے، آپ کے دل میں حدیث کی طلب گھر کر چکی تھی، مکتب سے نکلے تو آپ کی عمر دس سال تھی۔ جب عمر گیارہ سال ہوئی تو آپ نے بخاریٰ میں اپنے ایک شیخ کی بیان کردہ سند حدیث میں غلطی نکالی۔ حتی کہ شیخ نے امام بخاری کے حفظ سے اس غلطی کی اصلاح کی۔

اس کا بیان یوں ہے کہ ان کے ایک شیخ (محدث داخلی) نے حدیث کی کسی مجلس میں حدیث کی اسناد میں کہا: حدثنا سفیان عن ابی الزھیر عن ابراھیم تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے عرض کیا کہ ابوالزہیر سے ابراہیم کا سماع نہیں ہے۔ تو شیخ نے (ان کو بچہ سمجھ کر جھڑک دیا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے کہا کہ اگر آپ کے پاس اصل موجود ہے تو اس کی طرف رجوع فرمالیجئے۔ شیخ مجلس سے اٹھے، اپنے گھر میں داخل ہوئے اور اپنی اصل کا مطالعہ کیا اور اس میں کماحقہ غور وخوض کیا پھر اپنی مجلس کی طرف لوٹ آئے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ یہ روایت کیسے ہے؟ تو آپ نے کہا کہ ابوالزہیر ھاء کے ساتھ نہیں بلکہ باء کے ساتھ ابوالزبیر ہے اور وہ زبیر بن عدی ہیں۔ شیخ نے کہا کہ تو نے سچ کہا اور قلم لے کر اپنی کتاب میں درستگی فرمالی۔

جب سولہ سال کے ہوئے تو ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اور وکیع رحمۃ اللہ علیہ کی کتب کو حفظ کیا اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب کے کلام کی معرفت حاصل کی۔ پھر اپنی والدہ اور (بڑے) بھائی احمد بن اسماعیل کے ساتھ مکہ چلے گئے ان کے بھائی تو واپس آ گئے مگر وہ وہاں طلب حدیث کے لئے ٹھہر گئے۔ جب مکہ سے واپس لوٹے تو اکثر شہروں کے تمام مشائخ الحدیث کی خدمت میں گئے اور ان سے روایت کی۔

فرماتے ہیں کہ حدیث کے استفادہ کے لئے میں نے مصر اور شام کا دو مرتبہ اور بصرہ کا چار مرتبہ سفر کیا، بغداد اور کوفہ کے محدثین کی خدمت میں بے شمار بار حاضر ہوا اور حجاز میں علم حدیث کی طلب کے لئے چھ سال رہا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا آغاز دور تصنیف:

جب عمر کے اٹھارہویں سال میں قدم رکھا تو "قضایا الصحابۃ والتابعین" لکھی۔ اور مدینہ منورہ میں روضہ مبارکہ کے پاس چاندنی راتوں میں "التاریخ الکبیر" لکھی، ابھی آپ کی عمر اٹھارہ سال ہی تھی کہ کئی لوگوں نے آپ سے سماع کر کے آپ کے علمی افادات کو لکھنا شروع کر دیا۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "ایسا بہت کم ہی ہوگا کہ تاریخ کبیر کے اسماء الرجال میں سے کوئی نام ایسا ہو جس کے بارے میں میرے پاس کوئی حکایت یا قصہ نہ ہو مگر طوالت کے خوف سے میں نے وہ چھوڑ دیا۔"

بخاری شریف کا سبب تالیف:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس تالیف پر اس خواب نے ابھارا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا ہوں، میرے ہاتھ میں ایک پنکھا ہے جس سے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اوپر سے مکھیوں کو ہٹا رہا ہوں۔ تو مجھے اس کی یہ

تعبیر بیان کی گئی کہ میں آپ ﷺ سے جھوٹ کو ہٹاؤں گا۔

یہ بھی مروی ہے کہ امام بخاری نے خود فرمایا کہ ایک دن ہم اپنے شیخ اسحٰق بن راہویہ رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر تھے انہوں نے ہم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''اے کاش کہ تم ایسی مختصر کتاب لکھو جس میں حضور ﷺ کی صحیح احادیث ہوں!!''

ان کی یہ بات میرے دل کو لگی اور اس طرح اس کتاب کی تالیف شروع ہوگئی۔ جب آپ نے یہ کتاب مکمل فرمائی تو اپنے مشائخ اسحٰق بن راہویہ، علی بن مدینی، امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین وغیرہ کی خدمت میں پیش کی تو انہوں نے اس کو پسند کیا اور اس کے صحیح ہونے کی گواہی دی اور یہ کہ اپنے باب میں اس کتاب کی کوئی نظیر نہیں اور ان حضرات نے اس کتاب کی چار احادیث کا استثناء کیا اور ان کی صحت میں توقف کا اظہار فرمایا۔ عقیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس بابت بھی حق بخاری کے ساتھ ہے چونکہ وہ چاروں بھی صحیح ہیں۔

<u>بخاری شریف کی تصنیف میں امام بخاری رحمہ اللہ کا اہتمام:</u>

امام بخاری فرماتے ہیں: اس کتاب میں ہر حدیث درج کرنے سے پہلے میں نے غسل کر کے دو رکعت نفل نماز پڑھی پھر حدیث کو لکھا۔ میں نے جامع کی تصنیف چھ لاکھ احادیث میں سے انتخاب کر کے سولہ سال میں کی ہے۔ میں نے اس کو اپنے اور اللہ کے درمیان حجت بنایا ہے۔ میں نے اس کتاب میں صرف صحیح احادیث کو ہی شامل کیا ہے اور جو صحیح احادیث میں نے چھوڑی ہیں وہ اس سے زیادہ ہیں تاکہ کتاب طویل نہ ہو جائے۔ اس کتاب کی تصنیف میں نے مسجد حرام کے پاس کی تھی۔ اس میں ہر حدیث کیلئے اللہ سے استخارہ کیا، دو رکعت نماز پڑھی اور جب اس کی صحت کا یقین ہو گیا تو اس کو درج کر دیا۔۔اھ۔

یہ (آخری بات) ابتداء اور ابواب کی ترتیب کے اعتبار سے ہے، بعد میں تو آپ نے اپنے شہر اور دوسرے شہروں میں احادیث کی تخریج کی۔ اور یہ روایت کہ ''آپ نے اس کتاب کی تصنیف کئی علاقوں میں فرمائی'' بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ کیونکہ اس کی مدت تصنیف سولہ سال ہے اور وہ اس مکمل مدت میں مکہ میں مقیم نہیں رہے۔ ان سے ایک روایت یہ ہے کہ صحیح بخاری کی تصنیف انہوں نے بصرہ میں کی اور ایک روایت کے مطابق اس کی تصنیف انہوں نے بخاری رہ کر کی۔

وراق بخاری سے روایت ہے کہ میں نے امام بخاری رحمہ اللہ سے پوچھا: جتنی احادیث آپ نے اپنی تصنیفات میں جمع کی ہیں کیا آپ کو زبانی یاد ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: ''ان میں سے کوئی چیز بھی مجھ پر مخفی نہیں چونکہ میں نے اپنی کتب تین مرتبہ تصنیف کی ہیں۔''

گویا امام بخاری کی سہ بار سے مراد مسودہ کی تبییض و تسوید تھی۔ اور شاید کہ بخاری شریف کے بہت زیادہ نسخے اسی وجہ سے ہیں۔

اور یہ روایت کہ امام بخاری نے اس کے تراجم روضہ شریفہ میں بیٹھ کر لکھے تھے، اس پر محمول ہے کہ آپ نے اس کو مسودہ سے مبیضہ کا روپ دیا۔ اور ممکن ہے کہ یہ حقیقت پر محمول ہو۔

<u>بخاری شریف کے خواص:</u>

ابی جمرہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ ان کی ملاقات کسی عارف سے ہوئی، ان کا کہنا تھا کہ بخاری شریف جب بھی کسی مصیبت میں پڑھی گئی تو وہ مصیبت ٹل گئی اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ کتاب کسی کشتی میں ہو پھر وہ کشتی غرق ہو گئی ہو۔ امام بخاری

رحمۃ اللہ علیہ مستجاب الدعوات تھے انہوں نے اس کتاب کے پڑھنے والے کے لئے دعا فرمائی تھی۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بخاری شریف پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے بارش طلب کی جاتی تھی۔

کہا گیا ہے کہ اس کا نام ''تریاق مجرب'' رکھا گیا ہے۔

سید جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے چچا سید اصیل الدین رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

میں نے اپنے اور غیروں کے بڑے اہم امور و حوادث میں بخاری شریف کو ایک سو بیس دفعہ پڑھا، چنانچہ مرادیں اور حاجات پوری ہوئیں۔ یہ سب کا سب سید السادات اور منبع سادات یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی برکات سے ہے۔

محمد بن مروزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں رکن اور مقام ابراہیم کے درمیان سویا ہوا تھا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ''اے ابوزید! تو کب تک شافعی کی کتاب پڑھتا رہے گا؟ ہماری کتاب نہیں پڑھتے ہو؟''

میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کی کون سی کتاب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جامع محمد بن اسماعیل البخاری''۔

عبادت کا شغف:

بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی عادت تھی کہ رمضان میں ہر روز ایک قرآن ختم کرتے تھے، اور ہر شب سحری میں ایک تہائی قرآن کی تلاوت فرماتے تھے۔

ان کو ایک دفعہ دوران نماز بھڑ نے سولہ یا سترہ جگہوں پر کاٹا۔ کہا گیا کہ جب آپ کو پہلی دفعہ کاٹا تھا تو آپ نے نماز کیوں نہ چھوڑی۔ آپ نے فرمایا میں ایک سورت پڑھ رہا تھا، میں نے پسند کیا کہ میں اس کو پورا کرلوں۔

آپ فرماتے تھے: مجھے اللہ سے امید ہے کہ وہ میرا محاسبہ نہیں کریں گے، میں نے زندگی بھر کسی کی غیبت نہیں کی۔ تو ان سے کہا گیا کہ بعض لوگ آپ کے علم تاریخ کو پسند نہیں کرتے اس لئے کہ یہ تو غیبت ہے تو آپ نے فرمایا: ہم تو یہ بطور روایت نقل کرتے ہیں، اپنی طرف سے تو نقل نہیں کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بئس اخو العشيرة

آپ رحمۃ اللہ علیہ قلیل الاکل تھے۔ مروی ہے کہ وہ روزانہ دو یا تین باداموں پر قناعت کیا کرتے تھے۔ کہا گیا ہے کہ آپ نے چالیس سال تک سالن نہیں کھایا۔

کچھ لوگوں نے آپ کو آپ کے کسی سامان کا نفع پانچ ہزار درہم دینا چاہا ان لوگوں نے تاخیر کردی، تو دوسرے لوگوں نے آپ کو بیس ہزار درہم دینا چاہے۔ آپ نے فرمایا: میں نے پہلوں کو بیچنے کی نیت کی ہے اور مجھے یہ پسند نہیں کہ میں اپنی نیت بدلوں۔

بخاریٰ کے ساتھ مسافر خانہ تعمیر ہو رہا تھا بہت سے لوگ اس کی تعمیر میں حصہ لے رہے تھے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کے ساتھ اینٹیں منتقل کررہے تھے۔ آپ سے کہا گیا کہ آپ کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ آپ نے فرمایا: یہی تو وہ چیز ہے جو مجھے نفع دے گی۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا جود وسخا:

امام بخاری رحمہ اللہ کو اپنے والد کی طرف سے وراثت میں بہت سا مال ملا آپ نے وہ صدقہ کر دیا۔ آپ کے پاس ہر ماہ پانچ سو درہم آمدنی آتی تھی جسے آپ فقراء اور طلباء پر خرچ کر دیتے تھے۔ طلباء کو تحصیل حدیث کی ترغیب دیتے تھے، طلبہ پر بہت زیادہ احسان وکرم نوازی فرماتے تھے۔

ایک دن آپ کی ایک باندی کو آپ کے سامنے رکھی دوات سے ٹھوکر لگ گئی۔ آپ نے اس سے فرمایا: تو کیسے چلتی ہے؟ تو وہ بولی: جب راستہ نہ ہو تو میں کیسے چلوں۔ آپ نے فرمایا: جا، تو اللہ کے لئے آزاد ہے۔ آپ سے کہا گیا: اے ابو عبداللہ! کیا آپ نے غصہ میں آکر اسے آزاد کیا؟ آپ نے فرمایا: میں نے اپنے اس فعل سے اپنے آپ کو خوش کیا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا حافظہ:

آپ فرماتے تھے کہ مجھے ایک لاکھ صحیح احادیث اور دو لاکھ غیر صحیح احادیث زبانی یاد ہیں۔

اس تعداد میں روایات کے طرق کثیرہ، مکرر، موقوف، آثار صحابہ و تابعین اور ان کے فتاویٰ بھی شامل ہیں جن پر سلف ''حدیث'' کا اطلاق کرتے تھے۔ کہا گیا ہے کہ بچپن ہی میں آپ نے ستر ہزار احادیث حفظ کر لی تھیں، کتاب پر ایک نظر ڈالتے تو سب کچھ یاد ہو جاتا تھا۔

آپ فرماتے تھے کہ میں بلخ گیا تو اہل بلخ نے مجھ سے مطالبہ کیا میں انہیں ان تمام محدثین کی روایات املاء کرواؤں جن سے میں نے احادیث لکھی ہیں تو میں نے ان کو ایک ہزار حدیث ایک ہزار راویوں سے املاء کروائیں۔

آپ رحمہ اللہ علل حدیث کی معرفت میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے، اسی وجہ سے امام مسلم بن حجاج رحمہ اللہ ان سے فرماتے تھے:

''اے استاذ الاساتذہ، محدثین کے سردار، اے حدیث کی علل کے طبیب! آپ مجھے اجازت دیجئے میں آپ کے پاؤں چوم لوں۔''

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں نے عراق اور خراسان میں ان سے بڑھ کر علم والا نہیں دیکھا۔''

امام بخاری رحمہ اللہ کے علمی امتحانات:

پہلا امتحان: سمرقند میں چار سو محدثین آپ کو مغالطہ میں ڈالنے کیلئے نو دن تک جمع رہے، انہوں نے اسانید کو خلط ملط کر دیا۔ عراقیوں کی اسناد کو شامیوں میں، شامیوں کی اسناد کو عراقیوں میں، اہل حرم کی اسناد کو یمنیوں میں اور اس کے برعکس کر کے امام پر پیش کیں۔ اس کے باوجود وہ امام صاحب کو کسی بھی اسناد یا متن میں مغلوب نہ کر سکے۔

دوسرا امتحان: جب امام بخاری بغداد آئے تو یہاں کے محدثین نے بھی ان کے ساتھ ویسے ہی کیا۔ انہوں نے سو احادیث کی اسناد اور متون کو الٹ پلٹ دیا۔ ہر ایک محدث نے دس احادیث پیش کیں تاکہ لوگوں کی بھری مجلس میں ان کو امتحان میں ڈالا جائے۔ ان میں سے ایک کھڑا ہوا، اس نے ان دس احادیث میں سے ایک حدیث کے بارے میں پوچھا، آپ نے کہا میں یہ نہیں پہچانتا۔ پھر اس نے دوسری حدیث کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے پھر وہی جواب دیا حتی کہ دسویں حدیث تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ پھر دوسرا محدث کھڑا ہوا چنانچہ اسی طرح ہوا جس طرح پہلے محدث کی باری میں ہوا تھا، پھر تیسرا محدث کھڑا

ہوا اور وہی کچھ ہوا، یہاں تک وہ تمام محدثین فارغ ہو گئے، پھر وہ علماء جو اصل قضیہ سے اور امام کے حافظہ سے بھی واقف تھے انہوں نے کہا کہ یہ آدمی ساری بات سمجھ چکا ہے، اور وہ لوگ جو معاملہ سے ناواقف تھے ان کو یہ وہم ہوا کہ امام صاحب عاجز آ گئے ہیں۔ اور اس ''لا اعرف'' کو ان کے قصور ضبط اور سوء حافظہ پر محمول کیا۔

پھر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ پہلے شخص کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ آپ کی پہلی حدیث اس اسناد کے ساتھ غلط ہے (جو سند آپ نے بیان کی تھی) اور درست یوں یوں ہے، اس طرح ایک ایک کر کے سو حدیثیں (پہلے غلط سنائیں پھر صحیح کر کے) سنائیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر لوگ ہکا بکا رہ گئے اور آپ کے مطیع ہو گئے۔ اس لئے کہ امتحان کے وقت آدمی کا اکرام کیا جاتا ہے یا اس کی اہانت کی جاتی ہے۔ اس فن کے مبصرین کے نزدیک یہ بات عجیب نہیں کہ ان کی خطا کو درست کر دیا، کیونکہ امام صاحب احادیث کے ساتھ ساتھ اسانید کے بھی حافظ تھے بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ ان کی باطل اسانید کو صرف ایک دفعہ سنتے ہی یاد کر لیا اور اسی ترتیب سے ان کو دہرا دیا، یہ خلاف عادت اور محض کرامت ہے۔ یہ الہامات الٰہیہ اور عنایات رحمانیہ کے بغیر متصور نہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی بصرہ آمد:

جب وہ بصرہ آئے تو ایک اعلان کرنے والے نے ان کی آمد کا اعلان کر دیا۔ لوگوں نے ان کو گھیر لیا اور ان سے ایک مجلس املاء کے انعقاد کی درخواست کی۔ آپ نے درخواست قبول کر لی۔ لوگوں میں اعلان کر دیا گیا کہ امام صاحب نے درخواست قبول کر لی ہے۔ اگلے دن ہزاروں محدثین وفقہاء جمع ہو گئے۔ امام بخاری نے بیٹھتے ہی پہلی بات یہ کہی:

اے بصرہ والو! میں جوان ہوں، تم لوگوں نے مجھ سے حدیث بیان کرنے کو کہا ہے، میں تمہیں تمہارے علاقہ والوں کی وہ احادیث سناؤں گا جن سے تم استفادہ کرو گے۔ یعنی وہ احادیث بیان کروں گا جو تمہارے پاس نہیں ہیں۔

پھر انہوں نے ان کے علاقہ والوں کی وہ احادیث املاء کروائیں جو ان کے پاس نہیں تھیں۔ اس بات نے لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا، اسی وجہ سے ائمہ نے ان کی بہت مدح بیان کی ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اہل علم کی نظر میں:

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''خراسان میں کوئی ان جیسا پیدا نہیں ہوا''

متعدد حضرات کا بیان ہے کہ امام بخاری اس امت کے فقیہ تھے۔

اسحٰق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اے محدثین کی جماعت! اس نوجوان کو دیکھو اور اس سے حدیث لکھو، چونکہ اگر یہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں ہوتا تو وہ بھی ان کی معرفت حدیث وفقہ کے باعث ان کے محتاج ہوتے۔''

بعض نے ان کو حدیث اور فقہ میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ پر فضیلت دی ہے۔

ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ آسمان تلے ان سے بڑا حدیث کا کوئی عالم نہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی بخارٰی آمد اور آزمائش:

جب امام بخاری بخارٰی لوٹے تو لوگوں نے بخارٰی سے ایک فرسخ تک ان کیلئے خیمے لگائے۔ وہاں کی اکثریت نے آپ کا

استقبال کیا، آپ پر دراہم و دینار نچھاور کئے۔ ایک مدت تک آپ وہاں لوگوں کو حدیث بیان کرتے رہے۔

حاکم شہر خالد بن محمد ذہلی کہ جو خلافت عباسیہ کا نائب تھا، اس نے آپ کی طرف قاصد بھیجا، اس نے نرمی کے ساتھ آپ سے یہ درخوست کی حاکم کے محل میں بخاری شریف لائیے اور ان لوگوں کو حدیث بیان کیجئے۔ آپ نے انکار کر دیا اور قاصد سے کہا:

''ان سے کہہ دو میں علم کو ذلیل نہیں کروں گا، اور نہ اس کو بادشاہوں کے دروازوں تک لے جاؤں گا، اگر اسے اس علم کی ضرورت ہے تو وہ میری مسجد یا میرے گھر میں آئے، اگر تجھے یہ بات اچھی نہ لگے تو تو سلطان ہے مجھے مجلس سے روک دے تا کہ قیامت کے دن اللہ کے ہاں میرے پاس عذر ہو، اس لئے کہ میں علم کو چھپاتا نہیں ہوں۔''

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: العلم يؤتى و لايأتي (علم دیا جاتا ہے از خود نہیں آتا) اس نے دوبارہ قاصد بھیجا کہ میری اولاد کے لئے مجلس منعقد کیجئے جس میں کوئی اور شریک نہ ہو۔ تو آپ نے اس کا بھی انکار کر دیا اور کہا: میں یہ نہیں کر سکتا کہ سماع کو کچھ لوگوں کے لئے خاص کر دوں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: علم کا روکنا جائز نہیں۔

چنانچہ دونوں کے درمیان وحشت پیدا ہوگئی، حاکم نے بخاری کے علماء سے ان کے خلاف مدد حاصل کی، حتی کہ انہوں نے آپ کے مذہب کے بارے میں طعن کیا۔ پس حاکم نے ان کو بخارا سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان پر یہ بددعا کی:

" اللهم ارهم ماقصدوني به في انفسهم واولادهم واهاليهم "

یعنی اے اللہ ان لوگوں نے میرے ساتھ جو کچھ کرنے کا ارادہ کیا تھا تو ان کو، ان کی اولاد کو اور ان کے گھر والوں کو وہ دکھلا دے۔ آپ مستجاب الدعوۃ تھے۔ ابھی ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس کی خلافت چھن گئی، اس کو گدھے پر سوار کرایا گیا اور قید کر دیا گیا حتی کہ وہ اسی حال میں مر گیا۔ جتنے بھی علماء نے اس کی مدد کی تھی ان میں سے کوئی بھی نہ بچا، ہر ایک کسی نہ کسی شدید مصیبت میں مبتلا ہوا۔

جب آپ بخارا سے نکلے تو اہل سمرقند نے آپ کو خط لکھ کر سمرقند تشریف لانے کی دعوت دی۔ آپ اس طرف چل دیئے، جب آپ ''خرتنگ'' نامی جگہ پہنچے تو آپ کو خبر پہنچی کہ ان کے درمیان آپ کی وجہ سے فتنہ کھڑا ہو گیا ہے، بعض لوگ ان کی آمد کے خواہاں تھے، اور بعض ان کی آمد سے ناخوش تھے۔ وہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ رشتہ دار تھے آپ ان کے پاس ٹھہر گئے کہ معاملہ واضح ہو تو کوئی فیصلہ کریں۔ آپ نے وہاں کئی دن قیام کیا اسی اثناء میں آپ بیمار ہو گئے۔

خرتنگ: مشہور قول کے مطابق خائے معجمہ کے فتحہ کے ساتھ ہے یا کسرہ کے ساتھ ہے، اس کے بعد راء ساکنہ، پھر تائے فوقیہ مفتوحہ، پھر نون ساکن اور اس کے بعد کاف ہے۔ سمرقند کے قریب ایک جگہ تھی جو اس سے دو فرسخ کے فاصلہ پر تھی، اور بعض کا کہنا ہے کہ وہاں سے تقریباً تین دن کی مسافت پر تھی۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات:

ابھی آپ روبہ صحت نہ ہوئے تھے کہ اہل سمرقند کا ایک قاصد ان کے پاس آیا اور آپ سے سمرقند تشریف آوری کی

درخواست کی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے قبول فرمالی آپ سواری کے لئے تیار ہو گئے، موزے پہن لئے اور عمامہ باندھ لیا۔ جب آپ سواری پر سوار ہونے کے لئے بیس قدم چلے تو فرمایا مجھے چھوڑ دو مجھے کمزوری لاحق ہو رہی ہے۔ لوگوں نے آپؒ کو چھوڑ یا پھر آپ نے کئی دعائیں مانگیں، اس کے بعد جب آپ لیٹے تو آپ کی روح پرواز کر گئی۔ انتقال کے بعد آپ کے جسم سے اتنا پسینہ بہا کہ بیان سے باہر تھا، پسینہ رکا نہیں یہاں تک کہ اسی حالت میں ان کو کفن پہنایا گیا۔ کہا گیا ہے کہ آپ ایک رات بہت ہی کبیدہ خاطر ہوئے، نماز تہجد سے فارغ ہو کر اللہ سے دعا کی: ''اے اللہ زمین اپنی وسعت کے باوجود مجھ پر تنگ ہو گئی ہے، مجھے اپنے پاس بلا لے۔''

آپ کی وفات ۲۵۶ھ میں عید الفطر کی رات ہوئی، اس وقت آپ کی عمر باسٹھ (۶۲) سال تھی۔ آپ کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ جب ان کی نماز جنازہ ہو چکی اور قبر میں رکھا گیا تو ان کی قبر کی مٹی سے مشک کی مانند بہت عمدہ خوشبو آنے لگی۔ ایک مدت تک لوگ ان کی قبر پر آتے جاتے رہے اور مٹی لے جاتے رہے۔ لوگ اس پر تعجب کرتے تھے۔

کسی نے کہا (خطیب بغدادی نے عبدالواحد بن آدم طوادیسی سے نقل کیا ہے) ایک روز میں سویا تو خواب میں دیکھا کہ حضور ﷺ صحابہ کرام کی ایک جماعت کے ساتھ کھڑے ہیں۔ میں نے آپ ﷺ کو سلام کیا، آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول آپ یہاں کیسے کھڑے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں محمد بن اسماعیل کا انتظار کر رہا ہوں۔ فرماتے ہیں کچھ دن بعد امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی خبر پہنچی تو وہ بعینہ وہی وقت تھا جس وقت میں نے حضور ﷺ کو منتظر دیکھا تھا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے موت کے تقریباً دو سال بعد سمرقند والوں نے کئی مرتبہ بارش کی دعا کی لیکن بارش نہ ہوئی۔ کسی صالح آدمی نے سمرقند کے قاضی سے کہا: میرا خیال ہے کہ آپ لوگوں کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر لے جائیں، ہم وہاں بارش کی دعا مانگیں گے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر مینہ برسا دے گا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا، لوگ ان کی قبر کے پاس رو پڑے، اور صاحب قبر کا وسیلہ پیش کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے موسلا دھار بارش برسائی، اس قدر بارش ہوئی کہ تقریباً سات دن تک کوئی ایک بھی سمرقند نہ پہنچ سکا۔

آغاز تدوین حدیث اور بخاری شریف:

جان لیجئے کہ صحابہ اور کبار تابعین کے زمانہ میں احادیث مدوّن نہیں تھیں کیونکہ حضور ﷺ نے اپنے صحابہ کو حدیث لکھنے سے منع فرمایا تھا کہ کہیں احادیث مبارکہ قرآن کریم کے ساتھ خلط نہ ہو جائیں اور ویسے بھی حضور ﷺ کی صحبت کی برکت اور قرب مدت کی وجہ سے ان کے حفظ کا دائرہ بہت وسیع تھا نیز اکثر لوگ لکھنے سے ناآشنا تھے۔

تابعین کے آخری زمانے میں احادیث و اخبار کی تدوین اور سنت و آثار کی تصنیف کا معاملہ سامنے آیا تو امام زہری، ربیع بن صبیح اور سعید بن ابی عروبہ وغیرہ اس مبارک کام کے درپے ہو گئے۔ ان کا طرز تصنیف یہ تھا کہ تیسرے طبقہ والوں کے بڑوں کے زمانے تک ہر باب کو علیحدہ تصنیف کیا۔ پھر انہوں نے حدیث کی تالیف فقہی ابواب کے اعتبار سے کی۔ چنانچہ مدینہ والوں میں سب سے پہلے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا تصنیف کی۔ اس میں اہل حجاز کی وہ احادیث جمع کیں جو ان کے نزدیک ثابت اور

صحیح تھیں، اس میں اقوال صحابہ وتابعین اور بعد والوں کے فتاویٰ درج کئے، اہل مکہ میں سے ابوحامد عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج نے، اہل شام میں سے ابوعمرو عبدالرحمٰن بن عمرو اوزاعی نے، اہل کوفہ میں سے سفیان ثوری نے، اہل بصرہ میں سے ابوسلمہ حماد بن سلمہ نے تصانیف کیں اور ان کے بعد بڑے بڑے علماء مجتہدین نے کتابیں تالیف کیں، امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور عثمان بن ابی شیبہ وغیرہ بڑے محدثین نے اپنی مسانید لکھیں، بعضوں نے فقہی ابواب کی ترتیب پر لکھیں لیکن کتب مذکورہ میں صحیح و ضعیف کے درمیان تمیز نہیں کی۔ جب امام بخاری رحمہ اللہ ان کی تصانیف پر مطلع ہوئے تو انہوں نے پختہ ارادہ کیا کہ وہ ایسی کتاب تالیف کریں گے جس میں تمام احادیث صحیح ہوں گی۔

تعداد روایات بخاری:

علماء حدیث اور شراح بخاری کا اس میں اختلاف ہے کہ اس میں مکرر اور مکرر کو گرا کر کتنی احادیث ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی شرح بخاری میں تحقیق یہ ہے کہ تمام تعلیقات، متابعات، شواہد اور مکررات سمیت نو ہزار بیاسی (۹۰۸۲) احادیث ہیں اور مکررات کو گرا کر کل مرفوع احادیث دو ہزار چھ سو تیئس (۲۶۲۳) ہیں۔ اس کی احادیث میں سب سے اعلیٰ اسناد والی حدیث وہ ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک تین واسطے ہیں۔ بخاری شریف میں اس قسم کی احادیث مکرر سمیت بائیس ہیں اور اسقاط مکرر کے ساتھ سولہ احادیث ہیں۔ بعض علماء نے ان کو الگ بھی ذکر کیا ہے۔

صحیحین کا باہم تقابل:

علماء کا اتفاق ہے کہ صحیحین کو تلقی بالقبول حاصل ہے اور یہ کہ دونوں کتابیں تمام کتب مؤلفہ میں سب سے زیادہ صحیح ہیں۔ پھر جمہور کا مذہب یہ ہے کہ دونوں میں سے بخاری شریف راجح ترین اور اصح ہے۔ کہا گیا ہے کہ کسی ایک نے بھی اس کے خلاف کی تصریح نہیں ہے، اس لئے کہ ابوعلی نیساپوری رحمہ اللہ کے قول ''آسمان تلے مسلم شریف سے اصح کوئی کتاب نہیں'' میں مسلم شریف کے بخاری شریف سے اصح ہونے کی کوئی تصریح نہیں اس لئے کہ اصحیت کی نفی، مساوات کی نفی نہیں کرتی۔

بعض مغاربہ نے صحیح مسلم کو افضل قرار دیا ہے، سو صحیح مسلم کی فضیلت حسن سیاق اور عمدہ وضع و ترتیب پر محمول ہے، اس لئے کہ اہل علم میں سے کسی نے بھی یہ واضح نہیں کیا کہ اس مقولہ کا تعلق اصحیت سے ہے۔ اور اگر علماء اس کی صراحت کر بھی دیتے تو شاہد وجود اس کی تردید کر رہا ہے۔ اس لئے کہ وہ صفات جن پر صحت کا دارومدار ہے اور صحیح مسلم میں موجود ہیں، وہ صحیح بخاری میں علی وجہ الکمال والتمام موجود ہیں، اس لئے کہ صحت کے سلسلہ میں امام بخاری رحمہ اللہ کی شرط بہت زیادہ قوی اور بہت ہی سخت ہے۔

اور جہاں تک تعلق ہے اتصال کی وجہ سے بخاری شریف کے راجح ہونے کا تو امام بخاری رحمہ اللہ نے شرط لگائی ہے کہ راوی کی اپنے مروی عنہ سے ملاقات ثابت ہو چاہے ایک ہی دفعہ (کی ملاقات) ہو، اور امام مسلم رحمہ اللہ نے امکان لقاء کی طرف نظر کرتے ہوئے صرف معاصرت پر اکتفاء کیا ہے۔

رہی بات عدالت وضبط کے اعتبار سے بخاری شریف کے ہونے کی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلم کے متکلم فیہم رجال، بخاری کے متکلم فیہم رجال سے زیادہ ہیں، علاوہ ازیں امام بخاری کی اکثر احادیث اپنے ان مشائخ سے ہیں جن سے آپ نے (علم

حدیث) اخذ کیا تھا، جن کی احادیث سے آپ کو ممارست تھی، جن کی جید وغیر جید احادیث کی تمیز آپ کو حاصل تھی۔ بخلاف مسلم کے، چونکہ امام مسلم جن رواۃ سے تخریج میں متفرد ہیں ان میں سے اکثر متکلم فیہ ہیں جن کا زمانہ امام مسلم سے پہلے کا ہے جو تابعین اور تبع تابعین میں سے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ محدث اپنے مشائخ کی احادیث کی معرفت، اپنے شیوخ سے پہلوں کی بنسبت زیادہ ہوتی ہے۔

عدم شذوذ وعلل کے اعتبار سے بخاری شریف کے راجح ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بخاری کی وہ احادیث کم ہیں جن پر تنقید ہوئی ہے جب کہ مسلم کی ایسی احادیث ان سے زیادہ ہیں۔ مطعون راوی کی کی حدیث کو صحیحین میں لانا ان کیلئے قادح نہیں، چونکہ صاحب صحیح خواہ کسی بھی راوی کی حدیث کی تخریج کرے، یہ اس کے نزدیک اس راوی کی عدالت، صحت ضبط اور اس کی عدم غفلت کا تقاضا کرتی ہے بشرطیکہ صاحب تخریج نے اس کی تخریج ''اصول'' میں کی ہو۔ اگر تخریج متابعات، شواہد اور تعلیقات میں کی ہے تو اس کے درجات ضبط وغیرہ میں متقارب ہوں گے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ وصف صدق کے ساتھ متصف ہو۔ پس ایسے راوی میں طعن کہ جس سے شیخین میں میں سے ایک نے تخریج کی ہے، وہ اس کی تعدیل کے مقابل ہے، پس جرح مفسر ہی مقبول ہوگی جو راوی کی عدالت میں یا اس کے ضبط میں مطلقا، یا کسی متعین حدیث میں قادح ہو۔ اس لئے کہ ائمہ کو جرح پر ابھارنے والے اسباب مختلف ہوتے ہیں، چونکہ ان میں سے بعض قادح ہوتے ہیں اور بعض قادح نہیں ہوتے۔

ابوحسن مقدسی رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے: کہ جس سے ان دونوں میں سے ایک نے تخریج کیا ہے: هذا جاز القنطرة: یعنی اس کی طرف التفات نہ کیا جائے جو کچھ اس میں کہا گیا ہے۔

اس لئے کہ یہ دونوں صحیح وعلل کی معرفت میں اپنے اور اپنے بعد کے زمانہ کے ائمہ پر مقدم ہیں۔ پس قرآن عزیز کے بعد سب سے صحیح کتاب یہی ہے۔ اس کی تائید امام حاکم ابی احمد شیخ حاکم ابی عبداللہ نیساپوری رحمۃ اللہ علیہ کے منقول اس کلام سے ہوتی ہے:

''امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ محدثین کے امام ہیں، ان کے بعد جو بھی آیا اور اس نے حدیث کی کتاب تصنیف کی، تو حقیقت میں اس نے انہی سے اخذ کیا ہے۔ پس فضیلت متقدم کیلئے ہے یہاں تک کہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنی کتاب میں کئی جگہ ان کی حدیث لائے ہیں اور انہوں نے انتہائی ہمت کی کہ ان کو آپ کی طرف منسوب نہیں کیا۔

امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

''اگر بخاری نہ ہوتے تو مسلم بھی نہ ہوتے، مسلم نے بخاری شریف کو لے کر اس پر اپنے ابواب کا اضافہ کر دیا ہے۔''

تصنیفات امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ:

صحیح کے علاوہ بھی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات ہیں:

① الادب المفرد ② رفع اليدين فی الصلاة ③ القرأة خلف الامام ④ بر الوالدين
⑤ التاريخ الكبير ⑥ الاوسط ⑦ الصغير ⑧ خلق افعال العباد
⑨ كتاب الضعفاء ⑩ الجامع الكبير ⑪ المسند الكبير ⑫ التفسير الكبير

⑬کتاب الاشربة ⑭کتاب الهبة ⑮اسامي الصحابة ⑯کتاب الوجدان
⑰کتاب العلل ⑱کتاب الکنی ⑲کتاب المبسوط ⑳کتاب الفوائد

امام بخاری رحمہ اللہ کے شیوخ وتلامذہ:

آپ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: میں نے اٹھارہ سو محدثین سے حدیث روایت کی ہے۔
امام بخاری رحمہ اللہ سے بہت مخلوق روایت کرتی ہے۔ جیسے امام مسلم، کہ وہ اپنی صحیح کے علاوہ میں آپ سے روایت کرتے ہیں ،امام ترمذی ،امام ابن خزیمہ، امام ابی زرعہ، امام ابو حاتم اور امام نسائی وغیرہ بھی آپ سے روایت کرتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق آپ سے ایک لاکھ محدثین نے روایت کی ہے۔
یحیٰ بن جعفر بن اعین رحمہ اللہ مروی سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا:
''اگر میں اپنی عمر امام بخاری رحمہ اللہ کو دے کر ان کی عمر میں اضافہ کرنے پر قادر ہوتا تو میں ایسا کر گزرتا، کیوں کہ میری موت انسانوں میں سے ایک آدمی کی موت ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ کی موت علم کا چلا جانا اور عالم کی موت ہے۔''
کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے:

اذا ما مات ذو علم و فتوٰی فقد وقعت من الاسلام ثلمة

''جب کوئی علم اور فتویٰ والا مرتا ہے تو اسلام میں رخنہ واقع ہو جاتا ہے۔''

قوله: و ابی الحسین مسلم بن الحجاج القشیری:

''القشیری'': تصغیر کے ساتھ، عرب کے ایک قبیلے بنی قشیر کی طرف نسبت ہے۔ نیشاپوری ہیں۔ علماء میں یکتا امام تھے۔

امام مسلم رحمہ اللہ کے شیوخ وتلامذہ:

امام بخاری رحمہ اللہ کے اساتذہ اور دیگر کئی محدثین سے سماع کیا ہے جن میں امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، قتیبہ بن سعید اور قعنبی سرفہرست ہیں۔ آپ کے زمانے کے بڑے بڑے ائمہ وحفاظ مثلاً ابو حاتم رازی وابن خزیمہ وغیرہ آپ سے روایت کرتے ہیں۔

تصنیفات امام مسلم رحمہ اللہ:

جامع الصحیح کے علاوہ بھی جلیل القدر تصانیف ہیں:

① المسند الکبیر۔ اس کو انہوں نے فقہی ابواب کی بجائے رجال کے اسماء کی ترتیب پر تصنیف کیا ہے۔
② الجامع الکبیر علی ترتیب الابواب ③ کتاب العلل
④ کتاب اوهام المحدثین ⑤ کتاب التمییز ⑥ کتاب من لیس له الا راو واحد
⑦ کتاب طبقات التابعین ⑧ کتاب المخضرمین

تعداد روایات مسلم شریف:

امام مسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے تین لاکھ مسموع احادیث سے باسقاط مکرر چار ہزار احادیث پر اپنی صحیح کو تصنیف

کیا ہے۔

اس کی اعلیٰ اسناد وہ ہے جس میں ان کے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان چار (۴) واسطے ہیں اس طریقے پر ان کی اسی (۸۰) سے کچھ زیادہ احادیث ہیں۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا سبب:

آپ نے عراق، حجاز، مصر اور شام کا سفر کیا۔ بغداد کئی مرتبہ تشریف لائے اور وہاں حدیث بھی بیان کی۔ بغداد میں آپ کی آخری تشریف آوری ۲۵۷ھ میں ہوئی۔ آپ کے لئے نیشاپور میں ایک مجلس مذاکرہ منعقد کی گئی۔ آپ کے سامنے ایک حدیث بیان کی گئی آپ وہ حدیث نہ پہچان پائے اور اپنی قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔ آپ کی خدمت میں کھجوروں کا ایک ٹوکرہ پیش کیا گیا، آپ حدیث تلاش کرتے رہے اور ایک ایک کھجور کھاتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی، کھجوریں ختم ہوگئیں اور حدیث بھی مل گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہی ان کی موت کا سبب بنا۔ اسی وجہ سے ابن صلاح رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ان کی وفات کا سبب بہت عجیب تھا جو بہت زیادہ علمی فکر سے پیدا ہوا تھا۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ووفات:

آپ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے سال ۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور رجب ۲۶۱ھ میں فوت ہوئے۔ ایک قول کے مطابق ان کی عمر پچپن سال تھی۔ ابن صلاح رحمۃ اللہ علیہ نے اسی پر جزم کیا ہے اور امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں توقف کیا ہے اور کہا کہ ان کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ یہ قول بنسبت اس قول کے اشبہ ہے کہ جس میں ان کی عمر بالجزم ساٹھ سال مذکور ہے۔

ہمارے شیخ المشائخ علامۃ العلماء المتبحرین شمس الدین محمد جزری رحمۃ اللہ علیہ مصابیح کی شرح "**تصحيح المصابيح**" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ میں نے نیشاپور میں ان کی قبر کی زیارت کی تھی، برکت کیلئے میں نے ان کی قبر کے پاس ان کی صحیح کے کچھ حصہ کی قرأت کی۔ میں نے ان کی قبر کے پاس قبولیت کی امید اور برکت کے آثار دیکھے تھے۔

قوله: وابى عبدالله مالك بن انس الاصبحى:

یہ وہ انس بن مالک نہیں ہیں (جو صحابی ہیں) جیسا کہ بعض کو وہم ہوا۔ "**الاصبحى**" یہ "ذی اصبح" کی طرف نسبت ہے جو یمن کا ایک بادشاہ تھا، صاحب المذہب امام مالک بن انس کے آباؤاجداد میں سے تھا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت:

مشہور قول کے مطابق آپ ربیع الاول ۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ کہا گیا ہے کہ آپ اپنی والدہ کے پیٹ میں تین سال تک رہے ایک قول اس سے بھی زیادہ کا ہے اور ایک قول دو سال کا ہے۔ تبع تابعین میں سے ہیں اور ایک قول تابعی ہونے کا بھی ہے اس لئے کہ مروی ہے کہ آپ نے عائشہ بنت سعد بن ابی وقاص سے روایت کی ہے، اور عائشہ کی صحابیت ثابت ہے۔

شیخین کی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ پر وجہ تقدیم:

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کا ذکر امام بخاری اور امام مسلم کے بعد کیا ہے اگرچہ آپ وجود، رتبہ اور اسناد کے اعتبار سے ان دونوں پر مقدم ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بخاری شریف و مسلم شریف کو ان کی کتاب پر تقدم و ترجیح ہے کیونکہ آپ نے اپنی کتاب

میں تصحیح کا التزام نہیں کیا۔

مؤطا امام مالک کا رتبہ:

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مالک کی کتاب خود ان کے اور ان کے مقلدین کے نزدیک بھی صحیح ہے کیونکہ وہ مرسل اور منقطع وغیرہ سے استدلال جائز سمجھتے ہیں۔

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: موطا کی مراسیل امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بلا شرط حجت ہیں، اور ان ائمہ کے نزدیک بھی حجت ہیں جو مرسل سے حجت پکڑتے ہیں، اور ہمارے نزدیک بھی حجت ہیں بشرطیکہ مرسل کو تقویت حاصل ہو جائے۔ مؤطا کی کوئی بھی مرسل حدیث ایسی نہیں کہ اس کی کوئی ایک یا کئی مؤید احادیث نہ ہوں۔ پس علی الاطلاق درست بات یہ ہے کہ مؤطا بلا استثناء صحیح ہے۔

ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں موجود مرسل، منقطع اور معضل روایات کے وصل میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔

ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے کہ ثقہ کی مرسل سے حجت پکڑنا واجب ہے اور اس پر عمل کرنا ویسا ہی لازم ہے جیسا کہ مسند پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو "امام الصنعۃ" کہا ہے۔

مالک عن نافع عن ابن عمر اصح الاسانید ہے۔ اس مسئلہ میں اختلاف مشہور ہے۔ اس مذہب کی بناء پر اہل علم نے کہا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے تمام اسانید کو صحیح قرار دیا ہے، اس لئے کہ محدثین کا اس پر اجماع ہے کہ وہ علی الاطلاق ان کے بڑے اصحاب میں سے ہیں۔ اسی وجہ سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ میں نے مؤطا کا سماع امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے حفاظ اصحاب میں سے سترہ افراد سے کیا اور پھر امام شافعی سے کیا، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو سب سے مضبوط پایا، اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرنے والوں میں اصح الاسناد امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی سند ہے۔ اس سند میں تین ائمہ کے اکٹھا ہو جانے کی وجہ سے اس سند کو "سلسلۃ الذہب" کہا جاتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ اس کے منافی نہیں کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی اکثر احادیث امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ طرق سے نقل کی ہیں، چونکہ ہوسکتا ہے کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند کو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے سماع سے پہلے ترتیب دیا ہو۔

اور نہ اس بات کے منافی ہے کہ اصحاب اصول نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی احادیث امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق سے نقل نہیں کی ہیں چونکہ محدثین کے نزدیک اعلیٰ ترین غرض علو سند ہے سو وہ مقدم ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی جلالت شان:

بکر بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ہم امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے تو وہ ہمیں ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن سے روایت کرنے لگے ہم ان سے ربیعہ کی مزید احادیث کا مطالبہ کر رہے تھے، ایک دن انہوں نے ہم سے فرمایا: تم ربیعہ سے کیا کام ہے وہ اس طاق میں سوئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہم ربیعہ کے پاس آئے اور ان کو بیدار کیا اور ان سے پوچھا: آپ ربیعہ ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ ہم نے کہا آپ وہ ربیعہ ہیں جن سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ روایت حدیث کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ ہم نے کہا کیا

بات ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ آپ کی وجہ سے کیسے نصیبہ ور ہو گئے اور آپ اپنی ذات کی وجہ سے نصیبہ ور نہیں ہوئے؟ انہوں نے کہا: کیا تم نہیں جانتے کہ ایک مثقال دولت، علم کے بہت بڑے بوجھ سے بہتر ہے۔ گویا کہ دولت سے ان کی مراد لطف ربانی اور توفیق الٰہی تھی۔

ابن مہدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ثوری رحمۃ اللہ علیہ حدیث کے امام ہیں، اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سنت کے امام ہیں اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ دونوں کے امام ہیں۔ جب آپ کے پاس خواہش پرستوں میں سے کوئی آتا تو آپ اس سے فرماتے: میں تو اپنے دین کے سلسلہ میں دلیل پر ہوں، البتہ تم شک کرنے والے ہو، لہٰذا تم اپنے جیسے شک کرنے والوں کے پاس جا کر اس سے جھگڑو۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی سخاوت و تعظیم رسول:

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے دروازے پر خراسان کے گھوڑے اور مصر کے خچر دیکھے، اس سے خوبصورت (گھوڑے اور کچر) میں نے نہیں دیکھے تھے، تو میں نے کہا: کتنے خوبصورت ہیں یہ!۔ تو انہوں نے فرمایا: اے ابو عبداللہ! میری طرف سے یہ آپ کو ہدیہ ہے۔ تو میں نے کہا: آپ اپنی سواری کے لئے تو ایک جانور چھوڑ دیجئے۔ تو آپ فرمایا: مجھے اللہ سے حیا آتی ہے کہ میں جانور کے کھر سے ایسی مٹی کو روندوں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم (مدفون) ہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ادب حدیث:

امام مالک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی تعظیم میں بہت مبالغہ کیا کرتے تھے، حتی کہ جب حدیث بیان کرنے کا ارادہ فرماتے تو وضو کرتے، اعلیٰ بستر پر بیٹھتے، داڑھی میں کنگھی کرتے، خوشبو لگاتے، وقار اور ہیبت سے بیٹھتے پھر حدیث بیان فرماتے۔

آپ سے اس بارے میں جب کہا گیا تو آپ نے فرمایا: مجھے یہ محبوب ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی تعظیم کروں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال زریں:

جب انسان کی اپنی ذات میں خیر نہ ہو تو لوگوں کے لئے بھی اس میں خیر نہیں ہوتی۔

علم کثرت روایت کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ تو وہ نور ہے جس کو اللہ تعالیٰ (اپنے بندہ کے) دل میں رکھتا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور ہارون الرشید:

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مجھ سے ہارون الرشید نے کہا: اے ابو عبداللہ! مناسب ہوگا کہ آپ ہمارے ہاں تشریف لایا کیجئے تا کہ ہمارے بچے امین اور ہارون آپ سے مؤطا کا سماع کریں۔ تو میں نے کہا: اللہ تعالیٰ امیر المومنین کو عزت بخشے۔ یہ علم آپ لوگوں سے نکلا ہے، اگر آپ لوگ اس کی عزت کریں گے تو یہ عزیز ہوگا اور اگر آپ اس کی تذلیل کریں گے تو یہ ذلیل ہوگا۔

اور ایک روایت میں ہے: چھوڑیئے اے امیر المؤمنین! اس شی ء کی عزت کو پست نہ کیجئے جس کو اللہ نے بلند کیا ہے اور علم آتا نہیں بلکہ عطا کیا جاتا ہے۔ ہارون الرشید نے کہا: آپ نے سچ فرمایا۔

اور ایک روایت میں ہے: اے شیخ! آپ نے درست فرمایا، یہ لغزش میری طرف سے تھی اور میں اسے اپنے اوپر ڈھانکوں

گا۔ (اپنے بیٹوں وغیرہ سے کہا) مسجد کی طرف چلو، لوگوں کے ساتھ (بیٹھ کر) سماع کرو۔
ہارون الرشید نے آپ سے پوچھا: کیا آپ کا گھر ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ رشید نے آپ کو تین ہزار دینار دیئے اور کہا: ان سے کوئی گھر خرید لیجئے۔ آپ نے وہ دینار لے لئے اور انہیں خرچ نہیں کیا۔

امام مالک رحمہ اللہ کا مدینہ سے لگاؤ:

جب رشید نے روانہ ہونے کا ارادہ کیا تو امام مالک رحمہ اللہ سے کہا مناسب ہوگا کہ آپ کو میرے ساتھ نکلنا چاہئے، کیونکہ میں نے عزم کیا ہے کہ میں لوگوں کو مؤطا پر (عمل کیلئے) ابھاروں جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو قرآن پر ابھارا تھا۔ آپ نے فرمایا: لوگوں کو موطا پر ابھارنے کا کوئی راستہ نہیں، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے صحابہ مختلف علاقوں میں پھیل گئے ہیں اور احادیث بیان کر رہے ہیں، لہٰذا ہر علاقہ والوں کے پاس علم موجود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: **اختلاف امتی رحمة**: میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ اور رہی بات آپ کے ساتھ جانے کی، تو اس کی بھی کوئی صورت نہیں، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''**المدینة خیر لهم لو کانوا یعلمون**۔ مدینہ ان کے لئے بہتر ہے اگر وہ سمجھ رکھتے ہیں۔'' اور یہ رہے آپ کے دینار ویسے کے ویسے ہیں، اگر آپ چاہیں تو لے لیجئے، اور اگر چاہیں تو چھوڑ دیجئے۔ یعنی تم مجھے مدینہ چھوڑنے کا مکلف اسی معاملہ کی وجہ سے بنا رہے ہے۔ میں دنیا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر پر ترجیح نہیں دوں گا۔

امام شافعی رحمہ اللہ سے یہ قول صحیح مروی ہے کہ انہوں نے (مؤطا مالک کے متعلق) فرمایا:
''روئے زمین پر کوئی علمی کتاب مؤطا مالک سے زیادہ درست نہیں۔''
اور ایک روایت میں یوں ہے کہ ''آسمان کے نیچے کوئی کتاب موطا مالک سے زیادہ صحیح نہیں۔''
علماء نے کہا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ قول صحیحین کی تصنیف سے پہلے کا ہے ورنہ تو یہ دونوں بالاتفاق صحیح ہیں۔
ایک آدمی ان کے پاس چھ ماہ کی مسافت سے آیا، اس کے علاقہ والوں نے ایک مسئلہ پوچھنے کے لئے اس کو بھیجا تھا، اس نے اپنا سارا قصہ بیان کیا تو امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: ''لا احسن''۔ اس نے کہا: میں اپنے علاقہ والوں سے کیا کہوں؟ آپ نے فرمایا: ان سے کہنا کہ مالک کہتا ہے: ''لا احسن''۔

امام مالک رحمہ اللہ کے شیوخ وتلامذہ:

آپ نے علم تین سو تابعین اور چار سو تبع تابعین سے حاصل کیا ہے۔ کہا گیا ہے امام مالک رحمہ اللہ زہری، ابن المنکدر، نافع، یحییٰ بن سعید، ہشام بن عروہ اور ربیعہ وغیرہ کے اصحاب میں سب سے زیادہ ثبت تھے۔ امام زہری نے ان سے روایت کی ہے باوجودیکہ وہ ان کے شیوخ اور اجل تابعین میں سے تھے۔ یہ ''روایة الاکابر عن الاصاغر'' کے قبیل سے ہے۔ ابن جریج، ابن عیینہ، ثوری، اوزاعی، شعبہ، لیث بن سعد، ابن مبارک، امام شافعی، ابن وہب اور بے شمار لوگوں نے امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کی ہے۔
امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ایسا کم ہی ہوا کہ جس سے میں نے حدیث حاصل کی وہ میرے پاس فتویٰ لینے نہ آیا ہو۔''

امام مالک رحمہ اللہ کی وفات:

زیادہ صحیح قول کے مطابق انہوں نے ربیع الاوّل ۱۷۸ھ یا ۱۷۹ھ میں وفات پائی۔ آپ کی تدفین "جنۃ البقیع" میں ہوئی۔ ان کی قبر وہاں مشہور ہے۔ واقدی رحمہ اللہ نے کہا وہ نوے سال کے ہو کر فوت ہوئے۔

قوله: وابی عبداللّٰہ محمد بن ادریس الشافعی:

"الشافعی": شافع کی طرف نسبت ہے جو ان کے آباؤ اجداد میں سے تھے۔ کہا گیا ہے کہ بدر کے دن بنی ہاشم کا جھنڈا شافع کے ہاتھ میں تھا، پھر وہ قید ہو گئے اور اپنے نفس کو قربان کیا اور اسلام لے آئے۔

ایک قول کے مطابق شافع نے تقریباً دس سال کی عمر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی تھی، ان کے والد سائب بدر کے دن اسلام لائے تھے۔ بدر کے دن بنی ہاشم کا جھنڈا سائب کے ہاتھ میں تھا، پھر وہ قید ہو گئے، اپنے نفس کو قربان کر کے اسلام لے آئے۔

ان کی طرف نسبت کی وجہ تخصیص، دونوں قولوں کے مطابق واضح ہے۔ ان کے مذہب والوں کی نسبت بھی "شافعی" ہے اور عامۃ الناس کا "شافعوی" کہنا غلط ہے۔

وہ مطلبی، حجازی و مکی تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں "عبد مناف" پر ان کا نسب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل جاتا ہے۔

ایک روایت میں ہے: "قریش کا ایک عالم زمین کی ایک تہہ کو علم سے بھر دے گا۔"

اس کے طرق متماسک ہیں، یہ موضوع نہیں ہے بخلاف ان کے جن کو اس میں وہم ہوا ہے جیسا کہ ائمہ حدیث امام احمد، ابی نعیم، امام بیہقی اور امام نووی رحمہ اللہ نے اس کو بیان کیا ہے۔ اور فرمایا: یہ حدیث مشہور ہے۔ امام احمد اور ان کے متبع علماء نے اس کو امام شافعی رحمہ اللہ پر حمل کیا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی ولادت و وفات:

(آپ رحمہ اللہ کی جائے پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے۔) اس سلسلہ میں عسقلان، یمن، منیٰ اور بحر کا نام ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن اصح قول کے مطابق آپ کی جائے پیدائش غزہ ہے۔ البتہ سن ولادت میں اتفاق ہے کہ آپ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے، یہ وہی سال تھا جس سال امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی وفات ہوئی۔ ایک قول کے مطابق آپ ان کی وفات کے دن پیدا ہوئے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قید مجھے صرف بعض روایات میں ملی ہے، البتہ سال اہل تاریخ میں مشہور ہے۔ ۲۰۴ھ میں رجب کی آخری تاریخ کو شب خمیس یا شب جمعہ کی نماز مغرب پڑھ کر فوت ہوئے۔ ان کی قبر مصر کے قبرستان میں ہے۔ آپ چون (۵۴) برس زندہ رہے۔

آپ یتیم پیدا ہوئے تھے۔ تنگ دستی اس قدر تھی کہ ان کی والدہ کے پاس معلم کی اجرت تک نہ تھی۔ وہ ان کی تعلیم میں کوتاہی کرتا تھا۔ وہ جو کچھ دوسرں کو پڑھاتا امام شافعی رحمہ اللہ جلدی سے (سن کر) یاد کر لیتے تھے۔ جب وہ چلا جاتا تو امام شافعی رحمہ اللہ ان کو وہی کچھ سکھاتے رہتے۔ دیگر بچوں کی تعلیم کے لئے معلم کی جگہ آپ کفایت کرتے تھے۔ معلم کیلئے یہ بات آپ کی اجرت سے بڑھ کر تھی اگر آپ اس کو اجرت دیتے۔ چنانچہ اس نے اجرت چھوڑ دی، آپ مسلسل لگے رہے یہاں تک کہ

سات سال میں قرآن سیکھ لیا۔ پھر آپ کو علماء کی ہم نشینی محبوب ہونے لگی، آپ علماء سے جو استفادہ کرتے اسے ہڈیوں وغیرہ پر لکھتے تھے چونکہ آپ کو ورق دستیاب نہ ہوتا تھا۔

امام شافعی شعر وادب کو ترجیح دیتے تھے یہاں تک کہ ایک بیت لکھ لیا۔ ان کے پاس مفتی مکہ استاد مسلم بن خالد زنجی کا ایک کاتب تھا۔ اس نے آپ کو کوڑا مارا اور کہا: تیرے جیسے اپنی مروءت کی وجہ سے اس جیسے میں چلے جاتے ہیں۔ تم فقہ سے کتنا دور ہو۔ پس اس نے جھنجھوڑ کر آپ کو مسلم کی مجلس میں لے جا بٹھایا۔ ان کے اشعار میں سے دو شعر یہ ہیں:

یا اهل بیت رسول الله حبکم فرض من الله فی القرآن انزله

''اے رسول اللہ کے اہل بیت تمہاری محبت منجانب اللہ فرض ہے اللہ نے اسے قرآن میں نازل کیا ہے۔''

کفاکم من عظیم القدر انکم من لم یصل علیکم فلا صلاۃ له

''تم لوگوں کے بلند مرتبے کے لئے اتنی بات ہی کافی ہے کہ جو تم پر رحمت نہ بھیجے تو اس کی نماز ہی نہیں ہے۔''

تحصیل علم کی خاطر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی مدینہ آمد:

تیرہ سال کی عمر میں مدینہ آئے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس کو لازم پکڑا، انہوں نے آپ کا بہت اکرام کیا، آپ کے نسب، علم، فہم، ادب اور عقل کی وجہ سے آپ کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو آپ دونوں کے لائق تھا۔ آپ نے مکہ میں مؤطا (اس وقت) حفظ کر لی جب آپ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آنے کا ارادہ کیا جس وقت ان کے بارے میں سنا کہ وہ امام المسلمین ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے چاہا کہ آپ مزید قرأت کریں کیونکہ ان کو آپ کی قرأت پسند تھی۔ یہاں تک کہ آپ نے تھوڑے ہی دنوں میں پر قرأت کر لی۔ امام مالک نے جب آپ میں نجابت وامامت کے آثار دیکھے تو ایک دفعہ آپ سے فرمایا: اللہ سے ڈرتے رہو، عنقریب تمہاری ایک شان ہوگی اور دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ پر ایک نور ڈالا ہے تو اس کو معصیت سے بجھا نہ دینا۔ آپ فرماتے ہیں: ''پس میں نے کبھی کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہیں کیا۔'' امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد آپ مدینہ سے یمن چلے گئے، وہاں آپ کو قاضی بنا دیا گیا، پھر آپ عراق روانہ ہو گئے، وہاں علم کی تحصیل میں بڑی محنت کی اور محمد بن الحسن وغیرہ سے بحث مباحثہ کیا۔ علم حدیث کی اشاعت کی، حتیٰ کہ آپ کا ذکر وفضل چہار سو پھیل گیا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا علمی شغف:

محمد بن الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی مدح میں کہا ہے:

''انہوں نے مجھ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''الاوسط'' عاریتاً لی اور ایک دن رات میں حفظ کر لی۔''

جب آپ نے کتاب الرسالۃ لکھی تو ان کے اہل زمانہ نے اسے بہت پسند کیا، اور اس پر اجماع کیا کہ یہ مستحسن وخرق عادت ہے۔ یہاں تک کہ مزنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

''میں نے اسے پانچ سو دفعہ پڑھا، جب بھی اسے پڑھا کوئی ایسا نیا فائدہ حاصل ہوا جو میں پہلے نہیں جانتا تھا۔''

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا نصرتِ حدیث کا اہتمام دیکھا تو اپنی نماز میں ان کے لئے دعاؤں کا اہتمام شروع کر دیا۔

عراق میں اپنی قدیم کتاب ''الحجۃ'' تصنیف کی، پھر ۱۹۹ھ میں مصر تشریف لے گئے تو اپنی نئی کتابیں وہاں تصنیف کیں اور

قدیم سے رجوع کیا۔آپ کی کل کتابیں ۱۱۳ تک پہنچی ہیں، ان کا ذکر شہروں میں عام ہوگیا، دور دراز سے لوگ ان کے پاس علم حاصل کرنے کے لئے آنے لگے، اسی طرح اس کے بعد آپ کے اصحاب بھی آپ کی کتب کا سماع کرنے کے لئے آنے لگے۔
یہاں تک کہ ایک دن ایسا بھی آیا کہ باب ربیع پر نو سو سواریاں جمع ہوگئیں۔ابتداء میں اصول الفقہ، کتاب القسامہ، کتاب الجزیہ اور قتال اہل البغی تصنیف کیں۔آپ لغت اور نحو میں حجت تھے۔

مفتی مکہ مسلم بن خالد نے آپ کو مکہ میں افتاء کی اجازت دی تھی اس وقت آپ کی عمر پندرہ سال تھی۔

کبھی کبھی ایک رات میں ان کے لئے تیس مرتبہ چراغ جلایا جاتا تھا، وہ چراغ کو مسلسل جلتا ہوا نہیں چھوڑتے تھے۔ان کی ماں شریک بہن کے بیٹے کا کہنا ہے: اس لئے کہ اندھیرا دلوں کو بہت جلا بخشتا ہے۔

فرمایا کرتے تھے: جب کوئی صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے اور میرے قول کو دیوار پر دے مارو۔

فضائل کے علاوہ میں ضعیف حدیث سے استدلال کرنے سے گریز کیا کرتے تھے۔

ارشادات امام شافعی رحمۃ اللہ:

☆ان کا یہ کلام ان کے اخلاص پر دلالت کرتا ہے:

''مجھے یہ بات محبوب ہے کہ جو کچھ لوگوں نے مجھ سے سیکھا ہے اس پر مجھے صرف اجر دیا جائے اور وہ کبھی میری تعریف نہ کریں اور مجھے یہ بات بھی پسند ہے کہ جب میں کسی سے مناظرہ کروں تو حق ان کے ہاتھوں پر ظاہر ہو۔''

☆علم کا طلب کرنا نفلی نماز سے افضل ہے۔

☆جو دنیا اور آخرت کو چاہتا ہو اس پر علم لازم ہے۔مراد یہ ہے کہ علم کے ساتھ عمل بھی لازم ہے۔اور علم میں کوئی کامیاب نہیں ہوا مگر وہ جس نے اس کو ذلت میں حاصل کیا۔میں کاغذ تلاش کیا کرتا تھا مجھے اس کی تلاش گراں گزرتی تھی۔اور کوئی بھی اس علم کو ملک اور عزت نفس کے ساتھ سیکھ کر کامیاب نہیں ہوا، مگر جس نے ذلت نفس اور تنگی معیشت میں سیکھا وہ کامیاب ہوگیا۔

☆بڑا بننے سے پہلے فقاہت حاصل کرلے، جب تو بڑا بن جائے گا تو پھر فقاہت حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

☆علم کی زینت پرہیزگاری اور بردباری ہے۔

☆علماء میں اس سے برا کوئی عیب نہیں کہ وہ اس چیز کی رغبت کریں جس سے اللہ نے روکا ہے اور اس چیز سے رک جائیں جس کی اللہ نے ترغیب دی ہے۔لہٰذا علماء کا فقر فقر اختیاری ہے اور جاہلوں کا فقر فقر اضطراری ہے۔

☆لوگ سورۃ ﴿والعصر ان الانسان لفی خسر﴾ سے غفلت میں ہیں۔

☆جس کو تقویٰ نے معزز نہیں کیا اس کا کوئی تقویٰ نہیں۔

☆میں کبھی بھی علم سے فارغ نہیں ہوا۔

☆فضول دنیا کا طلب کرنا سزا ہے، اللہ اس کے ذریعہ توحید والوں کو سزا دیتا ہے۔

☆جس پر دنیا کیلئے شدت شہوت غالب ہوجاتی ہے اس پر اہل شہوت کی عبودیت لازم ہوجاتی ہے۔

☆جو تھوڑے پر راضی ہوجاتا ہے اس سے خضوع زائل ہوجاتا ہے۔

☆ ریاء کو صرف مخلص لوگ ہی پہچان سکتے ہیں۔

☆ اگر تم سارے لوگوں کو راضی کرنے کیلئے اپنی ساری کوشش صرف کر دو تو اس کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی، لہٰذا اپنا عمل اور نیت اللہ کے لئے خالص کر لے۔

☆ اگر کوئی آدمی (مرتے وقت کسی چیز کی) سب سے عقلمند آدمی کے لئے وصیت کرے تو وہ زہاد کو دی جائے۔

☆ لوگوں کے معاملات سنبھالنا چوپایوں کو سدھانے سے زیادہ مشکل ہے۔

☆ عقلمند وہ ہے جس کی عقل اسے تمام برے کاموں سے روک دے۔

☆ جو تمہارے سامنے کسی کی چغلی کھاتا ہے وہ تمہاری چغلی کسی اور کے سامنے کھائے گا۔

☆ جس نے اپنے بھائی کو چپکے سے نصیحت کی اس نے اس کے ساتھ خیر خواہی کی اور جس نے اپنے بھائی کو علانیہ نصیحت کی اس نے اس کو رسوا کیا۔

☆ تواضع کریم لوگوں کے اخلاق میں سے ہے اور تکبر کمینوں کی عادت ہے۔

☆ لوگوں میں سب سے بلند مرتبے والا وہ ہے جو اپنا مرتبہ نہ دیکھے۔

☆ سفارشیں مروءت کی زکوۃ ہیں۔

☆ جس کو عہدۂ قضا سونپا گیا پھر وہ فقیر نہ ہوا تو وہ چور ہے۔

☆ فقیہ کے لئے اس میں کوئی حرج نہیں کہ اس کے ساتھ کوئی احمق ہو جو اس کے ساتھ گالی گلوچ کرے۔

☆ احمق کی دلجوئی کرنا ایسی غایت ہے جو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

☆ لوگوں کے ساتھ بے تکلفی برے ساتھیوں کا سبب ہے اور ان سے الگ رہنا دشمنی کا ذریعہ ہے پس تو تکلف اور بے تکلفی کے درمیان رہ۔

آدمی کا شرک کے علاوہ ہر گناہ میں مبتلا ہو جانا ''کلام'' میں غور کرنے سے بہتر ہے، اس لئے کہ اللہ کی قسم میں اہل کلام کی ایسی باتوں پر مطلع ہوا ہوں جس کا میں نے کبھی بھی گمان نہیں کیا تھا۔

یہ مقولہ بھی آپ ہی کا ہے: اگر علماء اولیاء نہیں تو اللہ کا کوئی ولی نہیں، اس لئے کہ اللہ جاہل کو ولی نہیں بناتا۔

کرابسی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں نے ان کو فرماتے ہوئے سنا:

''آدمی کے لئے یہ ناپسندیدہ ہے کہ وہ ''قال الرسول'' کہے، بلکہ وہ ''قال رسول اللہ ﷺ'' کہے۔

اوصاف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ:

وہ ایک تہائی رات تک لکھتے تھے، ایک تہائی میں نماز پڑھتے تھے اور ایک تہائی میں سوتے تھے۔ ہر روز ایک قرآن ختم کرتے تھے۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ یہ ترتیب ایام رمضان کے علاوہ کی ہو۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، کبھی بھی سچی یا جھوٹی قسم نہیں کھائی، جمعہ کا غسل کبھی نہیں چھوڑا اور سولہ سال سے میں کبھی شکم سیر نہیں ہوا، صرف اتنا پیٹ بھرا جو میرا کچھ وقت نکال دے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ واقعات:

آپ رحمۃ اللہ علیہ کو سخاوت میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ صنعاء سے مکہ دس ہزار دینار لائے، ایک مجلس میں لوگ آپ کو سلام کر رہے تھے، آپ نے وہ سارے دینار اس ایک مجلس میں تقسیم کر دیئے۔

ایک مرتبہ ان کا کوڑا گر گیا تو کسی آدمی نے اٹھا کر آپ کو پکڑا دیا۔ آپ نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ تیرے پاس جتنے بھی دینار ہیں اس کو دے دو۔ وہ سات یا نو دینار تھے۔

ان کی چپل کا تسمہ ٹوٹ گیا، ایک آدمی نے اس کی مرمت کر دی، آپ نے کہا: اے ربیع! کیا تمہارے پاس ہمارے خرچہ میں سے کچھ ہے؟ میں نے کہا: سات دینار ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو دے دو۔

مزنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے ان سے زیادہ اکرام کرنے والا نہیں دیکھا۔ میں چاندرات کو ان کے ساتھ مسجد سے نکلا، میں ان سے ایک مسئلہ میں مذاکرہ کر رہا تھا یہاں تک کہ میں ان کے گھر کے دروازے تک پہنچ گیا، ایک غلام ان کے پاس ایک تھیلی لایا اور کہا کہ میرے آقا آپ کو سلام کہہ رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ ''آپ یہ تھیلی ہماری طرف سے بطور ہدیہ قبول فرما لیجئے، آپ کا ہمارے اوپر احسان ہوگا۔'' آپ نے اس سے وہ تھیلی لے لی۔ اسی اثناء میں ان کے پاس ایک آدمی آیا اور بولا: اے ابوعبداللہ! میری بیوی نے ابھی بچہ جنا ہے اور میرے پاس (زچہ و بچہ کی ضرورت کی) کوئی چیز نہیں۔ آپ نے وہ تھیلی اس کو دے دی اور گھر اس حال میں گئے کہ آپ تہی دست تھے۔

وہ اپنے اصحاب کی پسندیدہ چیز کھاتے تھے۔ وہ اپنے گدھے پر سوار ہوئے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ان کے برابر میں چلتے ہوئے ان سے مذاکرہ کر رہے تھے۔ یہ بات یحییٰ بن معین کو پہنچی تو وہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ پر برہم ہوئے اور یہ پیغام بھیجا کہ اگر تم ان کے گدھے کی دوسری جانب ہوتے تو یہ تمہارے لئے بہتر تھا۔

ان کو تیر اندازی میں پوری پوری مہارت تھی۔ یہاں تک کہ دس کے دس نشانے درست لگاتے تھے۔ گھوڑ سواری کے بھی ماہر تھے۔ حتیٰ کہ سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے کا ایک کان اور اپنا ایک کان پکڑ لیتے تھے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور خشیت الٰہی:

روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے ایک قاری کو پڑھتے ہوئے سنا: ﴿**هذا يوم لا ينطقون ولا يؤذن لهم فيعتذرون**﴾ ''وہ دن ہے کہ نہ بولیں گے اور نہ ان کو حکم ہو کہ توبہ کریں۔''

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا رنگ متغیر ہو گیا، جسم کانپنے لگا اور غش کھا کر گر گئے۔ جب ان کو افاقہ ہوا تو کہا: اے اللہ میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں جھوٹوں کے مقام سے اور جاہلوں سے اعراض سے، مجھے اپنی رحمت عطا فرما دیجئے۔ میری پردہ پوشی فرما دیجئے، اپنے کرم سے مجھے معاف فرما دیجئے، مجھے اپنے غیر کے حوالے نہ کیجئے اور مجھے اپنی خیر سے ناامید نہ فرمائیے۔

مزنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں ان کے پاس مرض موت میں گیا میں نے ان سے پوچھا: آپ کیسے ہیں؟

فرمایا: دنیا سے کوچ کرنے والا ہوں، اپنے بھائیوں سے جدا ہونے والا ہوں، آرزوؤں کے پیالے کو پینے والا ہوں، برے اعمال سے ملاقات کرنے والا ہوں، اللہ کے پاس پہنچنے والا ہوں اور یہ نہیں جانتا کہ میری روح جنت کی طرف جائے گی کہ

اس کو مبارکباد دی جائے گی یا جہنم کی طرف جائے گی کہ اس کی تعزیت کی جائے گی۔ یہ کہہ کر رونا شروع کر دیا اور یہ اشعار پڑھنے لگے:

ولما قسا قلبي وضاقت مذاهبي　　　جعلت رجائي نحو عفوك سلما

''جب میرا دل سخت ہو گیا اور میرے راستے تنگ ہو گئے تو میں نے اپنی امید کو آپ کے عفو کی طرف ذریعہ بنا لیا۔''

تعاظمني ذنبي فلما قرنته　　　بعفوك ربي كان عفوك اعظما

''میرا گناہ مجھے بڑا لگا، اے میرے رب! جب میں نے اس کو آپ کے عفو کے ساتھ ملایا تو آپ کا عفو عظیم ترین تھی۔''

قوله: وابي عبدالله احمد بن حنبل: ایک صحیح نسخہ میں ''احمد بن محمد بن حنبل'' ہے، لہٰذا پہلی نسبت مجازی ہے۔

الشيباني: قبیلہ کی طرف نسبت ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ مروزی اور بغدادی ہیں۔

ولادت ووفات:

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بغداد میں ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴۱ھ میں بعمر ۷۷ سال وفات بھی بغداد میں پائی۔

وہ فقہ، حدیث، زہد، پرہیز گاری اور عبادت میں امام تھے۔ انہی کی وجہ سے صحیح وسقیم حدیث اور مجروح ومعدل راوی کی پہچان حاصل ہوئی۔ بغداد میں پرورش پائی اور (ابتداء میں) علم بھی یہیں حاصل کیا اور مشائخ حدیث سے حدیث کا سماع کیا، پھر مکہ، کوفہ، بصرہ، مدینہ، یمن، شام اور جزیرہ کا سفر کیا، یزید بن ہارون، یحییٰ بن سعید القطان، سفیان بن عیینہ، محمد بن ادریس شافعی اور عبدالرزاق بن ہمام وغیرہ سے حدیث کا سماع کیا۔ ان سے ان کے دو بیٹوں صالح اور عبداللہ، چچازاد بھائی حنبل بن اسحاق، امام محمد بن اسماعیل بخاری، امام مسلم بن حجاج نیشاپوری، امام ابوزرعہ، امام ابوداؤد سجستانی اور بہت سی مخلوق نے حدیث روایت کی ہے، مگر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ان سے صرف ایک حدیث ''باب الصدقات'' کے آخر میں تعلیقاً ذکر کی ہے۔

علمی مقام:

احمد بن الحسن رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے بہت سے فضائل اور مشہور مناقب مروی ہیں۔ وہ ان مجتہدین میں سے ہیں جن کے قول، رائے اور مذہب پر بہت سے علاقوں میں عمل کیا جاتا ہے۔

ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کو دس لاکھ حدیث حفظ یاد تھی۔ ان سے کہا گیا: آپ کو کیا معلوم؟ انہوں نے فرمایا: میں نے ان سے مذاکرہ کیا اور ابواب سے ان پر گرفت کی۔

یہ بیان بھی ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے:

''میں نے ان کی کتابوں کا اندازہ لگایا وہ تقریباً بارہ اونٹوں کے بوجھ کے برابر تھیں اور یہ ساری ان کے دل میں محفوظ تھیں۔''

سخاوت وخشیت:

امام ابوداؤد سجستانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس آخرت کی مجلس ہوتی تھی، وہ اس میں دنیا کی کسی چیز کا تذکرہ نہیں کرتے تھے۔''

محمد بن موسیٰ کا کہنا ہے کہ حسن بن عبدالعزیز کے پاس ان کی مصر کی میراث سے ایک لاکھ دینار آئے۔ وہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تین تھیلے لے کر گئے، ہر تھیلے میں ایک ہزار دینار تھے۔ امام صاحب کی خدمت میں یہ دینار پیش کرتے ہوئے عرض کیا: اے ابوعبداللہ! یہ حلال میراث ہے، آپ یہ لے لیجئے اور اس کو اپنے عیال پر خرچ کر لیجئے۔ آپ نے فرمایا: ''مجھے اس کی ضرورت نہیں، میں کفایت میں ہوں۔'' چنانچہ آپ نے وہ لوٹا دیئے اور ان میں سے کچھ بھی قبول نہیں کیا۔

عبداللہ بن احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں بکثرت اپنے والد کو نماز کے بعد یہ کہتے ہوئے سنا تھا:

''اے اللہ! جیسے تو نے میرا چہرہ اپنے غیر کو سجدہ کرنے سے بچایا، ایسے ہی میرا چہرہ اپنے غیر سے سوال کرنے سے بچا۔''

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی آزمائش:

میمون بن اصبغ رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں بغداد میں تھا، میں نے چیخ و پکار سنی، میں نے کہا: یہ کیا ہے؟ تو لوگوں نے کہا امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو آزمایا جا رہا ہے۔ پس میں ان کے پاس پہنچ گیا جب ان کو (پہلا) کوڑا مارا گیا تو انہوں نے کہا: بسم اللہ۔ جب دوسرا (کوڑا) مارا گیا تو کہا: لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ جب تیسرا مارا گیا تو کہا: قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں۔ جب چوتھا مارا گیا تو کہا: ہمیں وہی کچھ پہنچے گا جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دیا۔ ان کو انتیس کوڑے لگائے گئے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ازار بند کپڑے کے پلّے کا تھا وہ ٹوٹا تو ان کی شلوار زیر ناف تک اتر آئی۔ اس پر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی، اپنے ہونٹوں کو ہلایا، چنانچہ ان کی شلوار دیکھتے ہی دیکھتے بہت تیزی سے اوپر کو سرک گئی، پھر وہ دوبارہ نہیں اتری۔ سات دن کے بعد میں ان کے پاس گیا اور کہا: اے ابوعبداللہ! میں نے آپ کو دیکھا تھا تو آپ کے ہونٹ حرکت کر رہے ہیں آپ کیا کر رہے تھے؟ انہوں نے کہا: میں کہہ رہا تھا: ''اے اللہ! میں آپ کے اس نام کا واسطے سے سوال کرتا ہوں جس سے تو نے عرش کو بھر دیا ہے اگر تو جانتا ہے کہ میں درست ہوں تو میری پردہ دری نہ کرنا۔''

احمد بن محمد الکندی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا۔ میں نے پوچھا: اللہ تعالیٰ نے آپ سے کیا معاملہ فرمایا؟ انہوں نے فرمایا کہ مجھے بخش دیا اور فرمایا: اے احمد! تجھے میری وجہ سے مارا گیا؟ میں نے عرض کیا: ہاں میرے رب۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے احمد! یہ میرا چہرہ ہے تو اس کو دیکھ، میں نے تیرے لئے اس کو دیکھنا مباح کر دیا۔

ایک روایت میں ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قمیص کو منگوانے کے لئے بغداد خط بھیجا جس میں ان کو مارا گیا تھا۔ تو انہوں نے وہ قمیص ان کو بھیجی دی۔ چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو دھو کر اور اس کا پانی پیا۔ یہ ان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

ان کے بیٹے صالح کا کہنا ہے کہ آپ نے پانچ حج کیے، ان میں سے تین پیدل تھے، اکثر سرکہ بطور سالن کھاتے تھے۔

ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ خلیفہ متوکل نے اس جگہ کی پیمائش کا حکم دیا تھا جہاں لوگوں نے ان کا جنازہ پڑھا تھا تو وہ جگہ پچیس لاکھ افراد کیلئے تھی۔ ان کی وفات کے دن بیس ہزار آدمی اسلام لائے، آپ کی قبر بغداد میں ہے جس کی لوگ زیارت کرتے ہیں اور برکت حاصل کرتے ہیں۔ آپ کی وفات کے دو سو تیس سال بعد جب آپ کی قبر کے برابر میں کسی بڑے کو دفن کیا جانے لگا تو آپ کی قبر کھل گئی، چنانچہ آپ کا کفن بالکل صحیح تھا پرانا نہیں ہوا تھا اور جسد خاکی میں بھی کوئی

تبدیلی نہیں آئی تھی۔

مسند امام احمد بن حنبل اور کتب سنن:

تنبیہ: ابن صلاح رحمۃ اللہ علیہ پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ انہوں نے کتب سنن کو مسند احمد پر فضیلت کیوں دی حالانکہ وہ مسانید میں سب سے بڑی اور عمدہ کتاب ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں صرف وہی احادیث شامل کی ہیں قابل استدلال ہیں مزید یہ کہ انہوں یہ کتاب ساڑھے سات لاکھ احادیث میں سے اختصار کر کے لکھی ہے اور کہا ہے کہ جس حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مسلمانوں کا اختلاف ہو جائے تو تمہیں چاہئے کہ مسند کی طرف رجوع کرو، پس اگر تم اس کو پالو تو اچھا ہے ورنہ وہ حجت نہیں۔ اسی وجہ سے بعضوں نے اس میں مبالغہ کرتے ہوئے اس کی تمام احادیث کو صحیح کہا ہے، حالانکہ حق یہ ہے کہ اس میں بہت سی احادیث ضعیف ہیں اور ان میں سے بعض تو بہت ہی زیادہ ضعیف ہیں یہاں تک کہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی بہت سی احادیث کو موضوعات میں شمار کیا ہے۔ لیکن بعض علماء نے اس کی کچھ احادیث کے سلسلہ میں ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ پر گرفت کی ہے اور شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ایسی تمام احادیث میں ان کا تعقب کیا ہے اور اس کی تمام احادیث سے وضع کی نفی ثابت کی ہے۔ انتقاء و تحریر کے اعتبار سے یہ ان کتابوں سے عمدہ ہے جن کے مؤلفین نے تمام احادیث صحیح لانے کا التزام نہیں کیا جیسے سنن اربعہ۔ فرمایا: اور اس کی وہ احادیث جو صحیحین سے زائد ہیں سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی کی ان احادیث سے زیادہ ضعیف نہیں ہے جو صحیحین سے زائد ہیں۔

بالجملہ جو آدمی سنن خصوصاً سنن ابن ماجہ، مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبدالرزاق کی کسی ایسی حدیث سے استدلال کرنا چاہے جس کا معاملہ بہت سنگین ہو، یا مسانید کی کسی بھی حدیث سے استدلال کرنا چاہیے تو اس کا ایک ہی حل ہے، چونکہ ان سب کے مصنفین (میں سے کسی) نے (بھی) اپنی جامع میں صحت اور حسن کی شرط نہیں لگائی۔ اور وہ حل یہ ہے کہ اگر استدلال کرنے والا شخص نقل و تصحیح کا اہل ہو تو اس کے لئے مناسب نہیں کہ وہ ان دونوں قسموں کی کسی شیء سے استدلال کرے یہاں تک کہ وہ اس کا احاطہ کر لے۔ اور اگر وہ (استدلال کرنے والا شخص) اس کا اہل نہیں تو اگر وہ کسی صاحب تصحیح و تحسین کو پائے تو اس کی تقلید کرے، وگرنہ استدلال کیلئے آگے نہ بڑھے، ورنہ وہ رطب و یابس کلام کرنے والے کی مانند ہوگا۔ اور ہو سکتا ہے کہ لاشعوری میں باطل سے استدلال کر بیٹھے۔

قوله: وابى عيسى محمد بن عيسى الترمذى:

بعضوں نے کہا ہے کہ "ابوعیسیٰ" یہ کنیت ناپسندیدہ ہے۔

"الترمذی" تاء اور میم کے کسرہ کے ساتھ، دونوں کے ضمہ کے ساتھ، تاء کے فتحہ، میم اور ذال (نقطے والی) کے کسرہ کے ساتھ۔ نہر بلخ کے کنارے پر واقع پرانے شہر کی طرف نسبت ہے۔ آپ امام و حجت تھے، اپنی نظیر آپ تھے، فن حدیث میں ثقہ تھے، حافظ حدیث تھے، اتقان میں مشہور تھے۔ آپ کی وفات بمقام ترمذ ۲۷۹ھ میں ہوئی۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے شیوخ:

امام بخاری، قتیبہ بن سعید، محمود بن غیلان، محمد بن بشار، احمد بن منیع، محمد بن مثنی اور سفیان بن وکیع وغیرہ سے حدیث حاصل

کی۔اوران سے خلق کثیر نے روایت کی ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور خدمت حدیث:

علم حدیث میں ان کی بہت سی تصانیف ہیں۔ان میں سے ایک کتاب ''الشمائل'' ہے۔امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب یعنی

''الصحیح'' سب سے اچھی کتاب ہے۔اس کی ترتیب بہت اعلیٰ اوراس میں تکرار سب سے کم ہے۔اس میں کئی ایسی چیزوں کا بیان ہے جس سے دوسری کتب عاری ہیں مثلاً بیان مذاہب، وجوہ استدلال اورانواع حدیث صحیح ،حسن اورغریب کی وضاحت ہے،اس میں جرح وتعدیل بھی مذکور ہے،اس کتاب کے آخر میں ''کتاب العلل'' بھی ہے۔اس میں ایسے بہترین فوائد جمع کیے ہیں جن کی قدراس آدمی پر مخفی نہیں جوان سے واقف ہے۔اس وجہ سے کہا گیا کہ یہ کتاب مجتہد کیلئے کافی اور مقلد کومستغنی کردینے والی ہے بلکہ ابواسماعیل ہروی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''یہ میرے نزدیک صحیحین سے بھی زیادہ نفع بخش ہے، چونکہ اس سے ہر شخص فائدہ حاصل کرسکتا ہے جب کہ صحیحین سے صرف متبحر عالم ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔امام حاکم اورخطیب نے پوری سنن ترمذی کوصحیح قرار دیا ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے اس کتاب یعنی سنن کوعلمائے حجاز، عراق اورخراسان پر پیش کیا توانہوں نے اس کوپسند کیا۔اورجس کے گھر میں یہ کتاب ہے تواس گھر میں (گویا) نبی بول رہا ہے۔

تنبیہ: ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا کہ ''انہ مجھول'' (کہ امام ترمذی مجہول شخص ہیں) جھوٹ پرمبنی ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عادت کا بیان

ہاں تصحیح حدیث کے معاملہ میں ان میں ایک قسم کا تساہل ہے،لیکن یہ ان کیلئے مضر نہیں ہے۔امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن کی بعض احادیث پرحسن ہونے کا حکم لگایا ہے حالانکہ ان میں انقطاع پایا جاتا ہے۔اوراسی طرح بعض احادیث کوحسن قرار دیا ہے باوجودیکہ ان میں سے بعض روایات کے راوی منفرد ہیں جیسا کہ انہوں نے خوداس کی صراحت کی ہے۔چونکہ وہ حدیث ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے، یا حسن صحیح غریب ہے ہم اس حدیث کوصرف اسی طریق سے پہچانتے ہیں۔لیکن اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ جدید اصطلاح ہے اوراصطلاح میں کوئی مناقشہ نہیں ہے۔

ترمذی شریف کی اعلیٰ ترین اسناد

ان کی اعلیٰ ترین اسناد وہ ہے جس میں امام ترمذی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف دوواسطے ہیں۔ان کی سنن میں اس طریق سے صرف ایک حدیث ہے، جو یہ ہے: **يأتي على الناس زمان الصابر فيهم على دينه كالقابض على الجمر** اس کی اسناد بخاری، مسلم اورابوداؤد کی اسناد سے زیادہ قریب ہے۔چونکہ ان سب کی (روایات زیادہ سے زیادہ) ثلاثیات ہیں (ثنائی کوئی روایت نہیں ہے)۔امام ترمذی نے اپنی جامع میں اسی سند سے ایک حدیث ذکر کی ہے:

"يا علي لا يحل لاحد ان يجنب في هذا المسجد غيري وغيرك"

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کونقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"یہ حدیث غریب ہے، یہ امام بخاری رحمہ اللہ نے مجھ سے سنی ہے۔"

عرض مرتب: ملا علی قاری رحمہ اللہ کی یہ بات محل نظر ہے کہ ترمذی کی یہ روایت ثنائی ہے، چونکہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہ حدیث اپنی جامع کی کتاب الفتن میں اس سند سے ذکر کی ہے:

حدثنا اسماعيل بن موسى الفزاري نا عمربن شاكر عن انس بن مالك قال: قال رسول الله ﷺ الحديث

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ اور نبی کریم ﷺ کے درمیان دو نہیں بلکہ تین واسطے ہیں، لہذا یہ حدیث ثنائی نہیں بلکہ ثلاثی ہے۔ علاوہ ازیں ملا علی قاری کا یہ کہنا بھی محل نظر ہے کہ مسلم اور ابوداؤد کی بعض روایات ثلاثی ہیں، تحقیقی بات یہی ہے کہ مسلم شریف، سنن ابوداؤد اور نسائی میں کوئی بھی حدیث ثلاثی نہیں ہے جیسا کہ مقدمہ میں بھی بیان کیا جاچکا ہے۔ اھ۔

قوله: وابی داود سليمان بن الاشعث السجستانی:

السجستانی: پہلی سین کے کسرہ وفتحہ، جیم کے کسرہ اور دوسری جیم کے سکون کے ساتھ سیستان کا معرب ہے، خراسان کے شہروں میں سے ہرات کے نواح میں ہے۔ آپ کی ولادت ۲۰۲ ہجری میں ہوئی اور وفات سن ۲۷۵ میں بصرہ میں ہوئی۔ آپ کے فضائل ومناقب بہت زیادہ ہیں۔ عبادت، عفاف، صلاح وورع کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز تھے۔ آپ امام، حافظ اور حجت تھے۔ ایک جماعت کا کہنا ہے کہ امام ابوداؤد کیلئے حدیث اس طرح نرم ہوگئی تھی جس طرح حضرت داؤد کیلئے لوہا نرم ہوگیا تھا۔ بصرہ میں اقامت پذیر رہے، بغداد تشریف آوری کئی بار ہوئی۔ یہاں آپ نے اپنی سنن کی روایت کی اور لوگوں نے آپ سے سنن نقل بھی کی۔

امام ابوداؤد رحمہ اللہ کی ایک آستین کشادہ تھی اور ایک آستین تنگ تھی۔ ان سے سوال کیا گیا کہ یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: "جہاں تک تعلق ہے کشادہ آستین کا تو وہ کتابوں کیلئے ہے اور رہی بات تنگ آستین کی تو اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

امام ابوداؤد رحمہ اللہ کے شیوخ وتلامذہ:

آپ نے احمد، یحیٰ بن معین، قعنبی، سلیمان بن حرب، قتیبہ اور ان گنت محدثین سے کسب فیض کیا۔ آپ سے استفادہ کرنے والوں میں امام نسائی وغیرہ شامل ہیں۔

انتخاب سنن ابی داؤد:

آپ فرمایا کرتے تھے: میں نے رسول اللہ ﷺ کی پانچ لاکھ احادیث لکھیں، ان میں سے ان احادیث کا انتخاب کیا جو کتاب السنہ میں شامل ہیں، میں نے اس میں چار ہزار آٹھ سو احادیث جمع کی ہیں، میں نے اس میں صحیح، اس کے مشابہ اور اس کے قریب احادیث ذکر کی ہیں۔ انسان کیلئے ان میں سے چار احادیث کافی ہیں۔

ان میں سے پہلی حدیث یہ ہے: انما الاعمال بالنیات

دوسری حدیث یہ ہے: من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ

تیسری حدیث یہ ہے: لا یکون المؤمن مؤمنا حتی یرضی لاخیہ مایرضی لنفسہ

چوتھی حدیث یہ ہے: لان الحلال بين والحرام بين۔ الحديث

امام شافعی کے اشعار ہیں:

عمدة الدين عندنا كلمات　　　اربع قالهن خير البرية

اتق السيئات وازهد ودع ما　　　ليس يعنيك واعمل بنية

"ازھد" سے گویا ان کی مراد یہ اربعین کی یہ حدیث ہے:

" ازهد في الدنيا يحبك الله، وازهد فيما عند الناس يحبك الناس"

سنن ابی داؤد کا علمی مقام:

آپ نے اپنی سنن امام احمد کی خدمت میں پیش کی تو انہوں نے اسے پسند فرمایا اور عمدہ بتلایا۔

شارح سنن ابی داؤد امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

علم دین میں اس کے مثل تصنیف (آج تک) نہیں کی گئی، یہ کتاب اپنی حسن وضع اور فقہی اعتبار سے صحیحین سے بڑھ کر ہے۔

ابن اعرابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"جس کے پاس قرآن کریم اور کتاب ابوداؤد ہو تو ان دونوں کے ہوتے ہوئے اس کو کسی اور علم کی بالکل ضرورت نہیں۔"

ناجی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "کتاب اللہ اصل اسلام ہے اور کتاب ابوداؤد اسلام کی عید ہے۔" اسی وجہ سے حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے مجتہد کیلئے احادیث میں اس پر اکتفاء کرنے کی تصریح کی ہے۔ ائمہ شافعیہ نے بھی اس میں غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی اتباع کی ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: فقہ وغیرہ میں مشغول ہونے والے کو چاہیئے کہ اس کتاب کی طرف توجہ کرے۔ اس لئے کہ احکام کی وہ اکثر احادیث کہ جن سے استدلال کیا جاتا ہے اس کتاب میں موجود ہیں نیز با آسانی مل جاتی ہیں۔

روایات سنن ابی داؤد کی اسنادی حیثیت:

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "میں نے اس کتاب میں کوئی ایسی حدیث ذکر نہیں کی جس کے ترک پر لوگوں کا اجماع ہو۔"

منذر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جس حدیث پر امام ابوداؤد نے سکوت کیا ہے وہ حسن کے درجہ سے کم نہیں ہوتی۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جو حدیث انہوں نے اپنی سنن میں روایت کی ہے اور اس کے ضعیف ہونے کا ذکر نہیں کیا وہ حدیث ان کے نزدیک صحیح ہے یا حسن ہے۔

ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"جس پر امام ابوداؤد نے سکوت کیا وہ ان کے نزدیک صحیح ہے، خاص طور پر اگر باب میں اس کے علاوہ کوئی اور حدیث نہ ہو۔"

ابن مندہ اور ابن سکن نے جمیع ما فی سنن ابی داؤد پر صحیح ہونے کا اطلاق کیا ہے۔ اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں کی موافقت کی ہے۔

قوله: وابی عبدالرحمن احمد بن شعیب النسائی:

"النسائی": نون کے فتحہ اور مد کے ساتھ ہے جیسا کہ جامع الاصول میں ہے۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اسی پر اکتفاء کیا ہے۔ یہ قصر کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے جیسا کہ طبقات الفقہاء میں ہے۔ یہ مرو کے قریب خراسان کے ایک علاقہ کی طرف نسبت ہے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ یہ نیشاپور یا فارس کا کوئی قصبہ ہے۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ کے شیوخ واساتذہ:

آپ رحمۃ اللہ علیہ ائمہ حفاظ میں سے تھے۔ اسحاق بن راہویہ، سلیمان بن اشعث، محمود بن غیلان، قتیبہ بن سعید، محمد بن بشار، علی بن حجر، ابوداؤد اور بہت سے دوسرے علاقوں اور ملکوں والوں سے سماع کیا۔ آپ سے خلقِ کثیر نے علم حاصل کیا ہے جس میں امام طبرانی، طحاوی اور ابن سنی بھی شامل ہیں۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا بیان:

جب آپ دمشق گئے تو ان سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان سے افضل قرار دیا۔ پس آپ کو مسجد سے نکال کر رملہ بھیج دیا گیا، اور پھر یہیں وفات پائی۔ ایک قول کے مطابق ان کی وفات مکہ میں ہوئی اور صفا ومروہ کے درمیان دفن کیا گیا۔

بعض حفاظ نے کہا ہے کہ اہلِ شام نے ان سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل کے بارے میں سوال کیا۔ لوگ چاہتے تھے کہ امام نسائی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ترجیح دیں۔ جب آپ نے یہ جواب دیا: "کیا معاویہ برابری سے راضی نہیں ہوتے یہاں تک کہ ان کو فضیلت ہی دی جائے۔" تو لوگوں نے اس وقت آپ کو لاتیں مار مار کر مار ڈالا۔

اور ایک روایت میں ہے: "میں یہی جانتا ہوں کہ اللہ نے ان کو شکم سیر کر دیا تھا۔" لوگ ان کو لاتیں مارنے لگے یہاں تک کہ مسجد سے نکال دیا پھر ان کو اٹھا کر مکہ لے جایا گیا۔ اسی سبب سے آپ مقتول وشہید فوت ہوئے۔

امام دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ رملہ میں ہوا تھا۔ اور اسی طرح عبدری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ وہ فلسطین کے شہر رملہ میں فوت ہوئے تھے اور دفن بیت المقدس میں کئے گئے تھے۔ امام ذہبی اور ان کے متبعین نے کہا ہے کہ وہ (بوقت وفات) اٹھاسی برس کے تھے۔ اور مصنف نے اس بات پر اظہار جزم کیا ہے کہ وہ ۳۰۳ھ کو مکہ میں فوت ہوئے اور وہیں دفن ہوئے تھے۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ اور نسائی شریف اہل علم کی نظر میں:

تاج سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ حافظ ذہبی اور اپنے والد شیخ امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ امام مسلم سے زیادہ حفظ والے تھے اور ان کی سنن میں صحیحین کے بعد باقی تمام سنن سے کم ضعیف احادیث ہیں۔ بلکہ بعض مشائخ نے تو کہا ہے کہ یہ تمام تصانیف میں سب سے زیادہ شرف والی ہے۔ اسلام میں ایسی تصنیف نہیں کی گئی۔

ابن مندہ، ابن سکن، ابوعلی نیشاپوری، ابواحمد بن عدی، خطیب اور دار قطنی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ اس میں تمام احادیث صحیح ہیں۔

لیکن اس میں واضح تساہل ہے۔ اور بعض مغاربہ نے شذوذ اختیار کرتے ہوئے اس کو بخاری شریف پر ترجیح دی ہے۔ اور

ممکن ہے کہ یہ فضیلت کمال صحت کے علاوہ بعض خارجی حیثیات کی وجہ سے ہو۔ واللہ اعلم۔

سید جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

جب یہ کتاب تصنیف ہوئی تو اس کو ''السنن الكبير النسائی'' کہا جاتا تھا۔ یہ بہت عظیم الشان کتاب ہے طرق حدیث کو جمع کرنے اور بیان تخریج میں اس جیسی کتاب پہلے نہیں لکھی گئی۔ بعد میں اس کو مختصر کیا اور اس کا نام ''مجتنیٰ'' نون کے ساتھ رکھا۔

اس کو مختصر کرنے کا سبب یہ ہوا، اس کے زمانہ کے امراء میں سے کسی نے امام نسائی سے سوال کیا: کیا آپ کی اس کتاب میں تمام احادیث صحیح ہیں؟ تو امام نسائی نے اس کے جواب میں فرمایا کہ نہیں۔ تو امیر نے ان کو صحاح الگ کر کے صحیح مجرد احادیث لکھنے کا حکم دیا تو اس سے انہوں نے مجتبیٰ کا انتخاب کیا۔ ہر وہ حدیث جس کی سند میں کلام تھا اس کو امام نسائی نے ساقط کر دیا۔

جب محدثین ''رواہ النسائی'' کہتے ہیں تو اس سے مراد یہی مختصر کتاب ''المجتنیٰ'' ہوتی ہے نہ کہ بڑی کتاب کبیر۔ اسی طرح جب محدثین ''کتب خمسہ'' یا ''اصول خمسہ'' کہتے ہیں تو اس سے مراد صحیح بخاری، مسلم شریف، سنن ابی داؤد، جامع الترمذی اور ''مجتبی النسائی'' ہوتی ہیں۔

قوله: وابی عبد الله محمد بن يزيد بن ماجه القزوينی:

''ابن ماجہ'' میں ابن کے الف کو باقی رکھنا غلط ہے کیونکہ یہ ''ابن یزید'' سے بدل ہے۔ قاموس میں ہے کہ ''ماجہ'' صاحب السنن محمد بن یزید کے والد کا لقب ہے نا کہ ان کے دادا کا۔ شرح الاربعین میں ہے کہ ''ماجہ'' ان کی والدہ کا نام ہے۔

''القزوینی'' قاف کے فتحہ کے ساتھ، معروف شہر کی طرف نسبت ہے۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ امام، حافظ حدیث اور صاحب سنن ہیں آپ کی کتاب سنن کی بدولت ہی کتب صحاح ستہ اور صحیحین کے بعد سنن اربعہ مکمل ہوئیں۔ آپ نے اصحاب امام مالک اور لیث سے سماع کیا ہے۔ ابوالحسن القطان اور ان کے علاوہ بہت سے لوگ اپ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ رمضان ۲۷۳ھ میں چونسٹھ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔

<u>سنن ابن ماجہ کا علمی مقام:</u>

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ کتب خمسہ کے ساتھ سنن ابن ماجہ کو جس نے سب سے پہلے شامل کیا وہ فضل بن طاہر ہیں کہ انہوں نے کتب خمسہ کے اطراف میں اور اس طرح ائمہ ستہ کی شرائط میں بھی اس کو درج کیا ہے، ان کے بعد حافظ عبد الغنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الاکمال فی اسماء الرجال'' میں۔ جس کی تہذیب و تنقیح حافظ مزی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے۔ اس کو شامل کیا۔

محدثین نے سنن ابن ماجہ کو مؤطا پر مقدم کیا ہے کیونکہ اس میں کتب خمسہ کے علاوہ بہت سے زوائد ہیں جو مؤطا میں نہیں ہیں جیسا کہ ابن الاثیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

''یہ مفید کتاب ہے، فقہ میں ابواب کے اعتبار سے قوی ہے لیکن اس میں بہت سی احادیث ضعیف بلکہ منکر بھی ہیں۔''

بلکہ حافظ مزی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ جن احادیث میں ابن ماجہ منفرد ہیں وہ اکثر ضعیف ہیں، اسی وجہ سے ایک کے علاوہ کسی نے بھی اس کو پانچ کتابوں کے ساتھ شمار نہیں کیا بلکہ انہوں نے چھٹی کتاب مؤطا کو قرار دیا ہے۔ ان میں رزین اور مجد بن اثیر رحمۃ اللہ علیہ شامل ہیں۔

عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مناسب یہ ہے کہ (صحاح ستہ میں) پانچ کے ساتھ چھٹی کتاب سنن ابن ماجہ کی بجائے مسند دارمی شمار کی جائے۔ اس لئے کہ اس میں ضعیف رجال کم ہیں، احادیثِ منکرہ اور شاذہ بہت نادر ہیں۔ اگرچہ اس میں احادیث مرسلہ اور موقوفہ بھی ہیں اس کے باوجود یہ اس سے اَوْلیٰ ہے۔

جبارۃ بن مغلس کے طریق سے ان کی کئی ثلاثیات بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی سنن میں ایک حدیث قزوین کی فضیلت کے بارے میں ذکر کی ہے اس وجہ سے ان پر اور ان کی کتاب پر بھی طعن کیا گیا ہے کیونکہ وہ حدیث منکر نہیں بلکہ موضوع ہے۔

قوله: وابی محمد عبد الله بن عبد الرحمن الدارمی؛

آپ سمرقندی و تمیمی ہیں۔ ''دارمی'' راء کے کسرہ کے ساتھ، دارم بن مالک تمیم کی طرف نسبت ہے جو تمیم کا ایک بڑا بطن ہے۔

امام، حافظ اور سمرقند کے عالم ہیں۔ تفسیر، جامع اور مشہور مسند تصنیف کی۔ یہ مسند ابواب کے مطابق ہے نہ کہ صحابہ کے مطابق، (اس لئے کہ اس کو مسند کہنا محدثین کی اصطلاح کے خلاف ہے) بخلاف اس کے جس کو اس بارے میں وہم ہوا ہے۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے امام بخاری، یزید بن ہارون اور نضر بن شمیل وغیرہ سے روایت کی ہے۔ ان سے امام مسلم، امام ابوداؤد اور امام ترمذی وغیرہ نے روایت کی ہے۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''میں نے حرمین، حجاز، شام اور عراق میں بہت سے علماء کو دیکھا لیکن محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ جامع کسی کو نہ دیکھا۔''

ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وہ اپنے اہلِ زمانہ کے امام تھے۔ آپ ۱۸۱ھ کو پیدا ہوئے تھے۔ ترویہ (آٹھ ذی الحجہ) کے دِن وفات پائی اور عرفہ (نو ذی الحجہ) کے دِن ۲۵۵ھ آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ ۷۴ سال عمر پائی۔ ان کی پندرہ احادیث ثلاثی ہیں۔

قوله: وابی الحسن علی بن عمر الدار قطنی

راء کے فتحہ و سکون، قاف کے ضمہ، طاء کے سکون اور نون کے ساتھ، دارقطن کی طرف نسبت ہے۔ یہ بغداد کا ایک بڑا محلہ تھا۔

وہ اپنے زمانے کے امام، حافظ حدیث، صاحب سنن اور صاحب علل وغیرہ تھے۔ علم الآثار، معرفت علل حدیث، معرفت اسماء الرجال، احوال رواۃ مع صدق، امانت، ثقاہت، عدالت، صحت اعتقاد میں آپ منتہی تھے۔ مختلف علوم جیسے قرأت وغیرہ میں آپ انتہائی مہارت رکھتے تھے۔ قراءت میں آپ کی ایک کتاب ہے جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی۔

ان سے بہت سے ائمہ نے علم حاصل کیا جس میں ابونعیم، امام حاکم ابی عبداللہ نیشاپوری، برقانی، شیخ ابوحامد اسفرائینی، قاضی ابوطیب طبری اور جوھری وغیرہ شامل ہیں۔

آپ کی ولادت ۳۰۵ھ میں اور وفات بغداد میں ۳۸۵ھ میں ہوئی۔

قوله: ابی بکر احمد بن الحسین البیهقی:

"بیہق" بروزن "صَیقَل" نیشا پور کے قریب ایک شہر کی طرف نسبت ہے۔

آپ جلیل القدر امام، حافظ حدیث، فقیہ، اصولی، زاہد و پرہیز گار ہیں۔ امام حاکم ابوعبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے شاگردوں میں سے ہیں۔ آپ نے ابن فورک اور ابوعبدالرحمٰن سلمی سے علم حاصل کیا۔ طلب علم کیلئے حجاز اور عراق کا سفر کیا پھر یکتائے زمان اور اس میدان کے شاہسوار ہو جانے کے بعد تصنیف میں مشغول ہو گئے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات:

ایک قول کے مطابق ان کی تصانیف ایک ہزار اجزاء تک پہنچتی ہیں۔ ان کی تصانیف میں سے چند مشہور کتب یہ ہیں:

① السنن الكبرى ② كتاب المبسوط فی نصوص الشافعی ③ كتاب معرفة السنن و الآثار

④ دلائل النبوة ⑤ كتاب البعث و النشور ⑥ كتاب الآداب

⑦ كتاب فضائل الصحابه ⑧ فضائل الاوقات ⑨ شعب الایمان

⑩ كتاب الخلافيات

روایت کیا گیا ہے کہ امام حاکم ابوعبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں علماء کا بہت بڑا اجتماع تھا۔ امام حاکم نے ایک حدیث کی سند سے ایک راوی ترک کر دیا، امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر تنبیہ کی تو امام حاکم کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اصل کی طرف رجوع ضروری ہے۔ چنانچہ اصل لائی گئی تو ویسا ہی تھا جیسا امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔

مناظرہ اور مباحثہ میں انتہا کے انصاف پسند تھے۔ وہ علماء کی سیرت کے مطابق تھوڑے پر قناعت کرنے والے تھے، زہد و ورع کے زیور سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ موت سے تین سال پہلے تک صائم الدہر تھے۔

امام الحرمین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کوئی شافعی ایسا نہیں کہ جس پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا احسان نہ ہو سوائے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کے کہ ان کا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پر احسان ہے کیونکہ آپ نے ان کے مذہب اور اقوال کی نصرت میں کئی تصانیف کی ہیں۔"

ایک قول کے مطابق ان کی ولادت ۳۸۴ھ میں ہوئی۔ آپ کی وفات ۴۵۸ھ میں نیشا پور میں ہوئی۔ ان کا تابوت "بیہق" کے قریب ایک بستی میں لایا گیا۔ انہوں نے ۷۴ سال عمر پائی۔

قوله: وابی الحسن رزین بن معاویه العبدری۔

"رزین" راء کے فتحہ اور زاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

"العبدری" عین کے فتحہ، باء کے سکون، دال کے فتحہ اور راء مخففہ (بغیر تشدید) کے ساتھ ہے۔ قریش کے ایک بطن "عبد الدار بن قصی" کی طرف منسوب ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ جلیل القدر حافظ حدیث تھے۔ "کتاب التجرید" کے مصنف ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے موطا مالک اور صحاح خمسہ کو جمع کیا ہے۔ آپ کی وفات ۵۴۰ھ کے بعد ہوئی۔

قوله: وغیرهم، وقلیل ما هو:

"وغیرهم": جَر کے ساتھ "ابی عبد الله" پر عطف ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ رفع کے ساتھ اس کا عطف "مثل" پر

اوزاعی رحمہ اللہ نے ان سے کہا: یہ جواب کہاں سے ہے؟ آپ نے فرمایا: ان احادیث سے جو آپ لوگوں نے روایت کی ہیں اور ان اخبار و آثار سے جو آپ لوگوں نے نقل کیے ہیں۔ اور پھر آپ نے ان کی وجوہات دلالت اور احادیث سے استنباط کا طریقہ بیان کیا تو اوزاعی رحمہ اللہ نے انصاف سے کام لیا اور بے جا بات نہیں کی، اور کہا: ہم تو محض پنساری ہیں، اطباء تو آپ ہیں، یعنی بیماری اور دواء کو سمجھنے والے ہیں۔

امام صاحب کے نزدیک صرف روایت باللفظ جائز ہے، روایت بالمعنی جائز نہیں، پس اعتبار سے روایت باللفظ کم ہے، اگرچہ آپ کی متعدد مسانید اور معتمد اسانید ہیں جنہیں محدثین جانتے ہیں اور آپ پر اہلِ نصرت ہونے کا حکم لگاتے ہیں۔

آپ کے علوِ سند پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں محمد بن الحسن سے اور انہوں نے ابو یوسف سے اور انہوں نے عبداللہ بن دینار سے اور انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"الولاء لحمة كلحمة النسب لا يباع ولا يوهب"

"ولاء نسب کے گوشت کی طرح گوشت کا ٹکڑا ہے جو نہ بیچا جاتا ہے اور نہ ہبہ کیا جاتا ہے۔"

النقایہ کے شارح تمیمی نے "ولاء" کی فصل میں اسی طرح ذکر کیا ہے اور امام نووی رحمہ اللہ نے تہذیب الاسماء میں خطیب بغدادی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے محمد بن الحسن رحمہ اللہ سے روایت کی ہے۔

فاضل امام ابن ہمام رحمہ اللہ کے شاگرد نے "شرح التحریر" میں لکھا ہے کہ اصحاب شافعی وغیرھم نے ذکر کیا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: حملت عن محمد بن الحسن وقری بخطی كتبا۔

ابواسحاق رحمہ اللہ طبقات میں فرماتے ہیں: ربیع نے روایت کیا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے محمد بن الحسن رحمہ اللہ کو خط لکھا اور ان سے وہ کتابیں مانگیں جو وہ لکھ رہے تھے تو انہوں نے اِن کو اُن سے مؤخر کر دیا۔

قل للذی لم ترعینا من رآه مثله   ومن كان من رآه قد رأى من قبله

"اس سے کہو جس نے ایسی آنکھ نہیں دیکھی کہ جس نے اس کے مثل کو دیکھا ہو، اور جس نے اس جیسا دیکھا ہے تحقیق اس سے پہلے دیکھا ہے۔"

العلم ينهى اهله ان يمنعوه اهله   لعله يبذله لا هله لعله

"علم اپنے اہل کو منع کرتا ہے کہ وہ اس کو اس کے اہل سے روکے، ممکن ہے کہ وہ اس کو اس کے اہل کیلئے خرچ کرے۔"

منظومہ کی شرح حقائق میں ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تمام تعریفیں اس اللہ کیلئے ہیں جس نے محمد بن الحسن رحمہ اللہ کے ذریعے فقہ میں میری مدد کی۔ اھ۔ امام محمد رحمہ اللہ، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں جس پر موطا امام محمد دلالت کرتی ہے۔

جب ہمارے شیخ، عالم، علامہ، بحر، فہامہ، شیخ الاسلام، مفتی الانام، صاحب تصانیف کثیرہ و تالیف شہیرہ مولانا، سیدنا، سندنا شیخ شہاب الدین بن حجر مکی رحمہ اللہ اپنی شرح مشکاۃ میں امام مالک، امام احمد بن حنبل اور امام شافعی رحمہ اللہ کے مناقب ذکر کر چکے تو فرمایا:

اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے کہا: یہ جواب کہاں سے ہے؟ آپ نے فرمایا: ان احادیث سے جو آپ لوگوں نے روایت کی ہیں اور ان اخبار و آثار سے جو آپ لوگوں نے نقل کئے ہیں۔ اور پھر آپ نے ان کی وجوہات دلالت اور احادیث سے استنباط کا طریقہ بیان کیا تو اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے انصاف سے کام لیا اور بے جابات نہیں کی، اور کہا: ہم تو محض پنساری ہیں، اطباء تو آپ ہیں، یعنی بیماری اور دواء کو سمجھنے والے ہیں۔

امام صاحب کے نزدیک صرف روایت باللفظ جائز ہے، روایت بالمعنی جائز نہیں، پس اعتبار سے روایت باللفظ کم ہے، اگر چہ آپ کی متعدد مسانید اور معتمد اسانید ہیں جنہیں محدثین جانتے ہیں اور آپ پر اہلِ نصرت ہونے کا حکم لگاتے ہیں۔

آپ کے علوّ سند پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں محمد بن الحسن سے اور انہوں نے ابو یوسف سے اور انہوں نے عبداللہ بن دینار سے اور انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"الولاء لحمة كلحمة النسب لا يباع ولا يوهب"

''ولاءنسب کے گوشت کی طرح گوشت کا ٹکڑا ہے جو نہ بیچا جاتا ہے اور نہ ھبہ کیا جاتا ہے۔''

النقایہ کے شارح تمیمی نے ''ولاء'' کی فصل میں اسی طرح ذکر کیا ہے اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے تہذیب الاسماء میں خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن الحسن رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے۔

فاضل امام ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد نے ''شرح التحریر'' میں لکھا ہے کہ اصحاب شافعی وغیرھم نے ذکر کیا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: **حملت عن محمد بن الحسن وقری بخطی کتبا۔**

ابو اسحاق رحمۃ اللہ علیہ طبقات میں فرماتے ہیں: ربیع نے روایت کیا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن الحسن رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا اور ان سے وہ کتابیں مانگیں جو وہ لکھ رہے تھے تو انہوں نے اِن کو اُن سے مؤخر کر دیا۔

قل للذی لم ترعینا من رآه مثله ومن کان من رآه قدرای من قبله

''اس سے کہو جس نے ایسی آنکھ نہیں دیکھی کہ جس نے اس کے مثل کو دیکھا ہو، اور جس نے اس جیسا دیکھا ہے تحقیق اس سے پہلے دیکھا ہے۔

العلم ینھی اھله ان یمنعوه اھله لعله یبذله لا ھله لعله

''علم اپنے اہل کو منع کرتا ہے کہ وہ اس کو اس کے اہل سے روکے ممکن ہے کہ وہ اس کو اس کے اہل کیلئے خرچ کرے۔''

منظومہ کی شرح حقائق میں ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: تمام تعریفیں اس اللہ کیلئے ہیں جس نے محمد بن الحسن رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے فقہ میں میری مدد کی۔ اھ۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں جس پر مؤطا امام محمد دلالت کرتی ہے۔

جب ہمارے شیخ، عالم، علامہ، بحر، فہامہ، شیخ الاسلام، مفتی الانام، صاحب تصانیف کثیرہ و تالیف شہیرہ مولانا، سیدنا، سندنا شیخ شہاب الدین بن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اپنی شرح مشکاۃ میں امام مالک، امام احمد بن حنبل اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب ذکر کر چکے تو فرمایا:

''جب ہم ان ائمہ ثلاثہ کے تراجم ذکر کر چکے تو ہمارے اوپر یہ بات متعین ہوگئی کہ ہم برکت حاصل کرنے کیلئے اختتام اس چوتھے امام پر کریں جو ان سے مقدم ہیں، چونکہ ان کا رتبہ بلند ہے، علم وافر اور تقویٰ و پرہیزگاری سے متصف ہیں، علوم باطنی سے محلی و مجلی ہیں، علوم ظاہری میں اپنے زمانہ والوں پر فائق ہیں، جو حسن ثناء اور نیک نامی میں بازی لے جا چکے ہیں، اور وہ ہیں امام اعظم، فقیہ اہلِ عراق، تابعی کبیر ابوحنیفہ نعمان بن ثابت بن زوطی - زاء کے ضمہ اور طاء کے فتحہ کے ساتھ - ابن ماہ مولی تیم اللہ بن ثعلبہ کوفی۔

خطیب رحمہ اللہ نے اپنی سند سے ان کے پوتے عمر بن حماد بن ابی حنیفہ سے روایت کیا ہے کہ ''ثابت'' مسلمان پیدا ہوئے اور ''زوطی'' بنی تیم کے غلام تھے، پھر انہوں نے ان کو آزاد کر دیا تو زوطی کی ولاء ان کے لئے ہوگئی۔

عمر کے بھائی اسماعیل نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ ''ثابت'' کے والد فارس کے رہنے والے تھے اور وہ آزاد تھے، اللہ کی قسم ہمارے اوپر کبھی بھی غلامی نہیں آئی، میرے دادا ۸۰ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنے والد ثابت کے ساتھ بچپن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے لئے اور ان کی اولاد کیلئے برکت کی دُعا کی تھی۔ ہم اللہ سے اُمید رکھتے ہیں کہ ہمارے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دُعا شرف قبولیت پا چکی ہے۔'' اھ۔

اور پھر ان کی امید کے مطابق ہی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو بے انتہاء برکت عطا فرمائی، آپ کے متبعین کو بھی برکت سے نوازا کہ ہر سو کثرت میں ہیں، اور امام صاحب کے صدق و اخلاص کی برکت سے سب پر غالب آ گئے۔

<u>اساتذہ و تلامذہ کا بیان:</u>

آپ نے فقہ حماد بن ابی سلیمان سے حاصل کی۔

امام صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں بصرہ آیا تو میرا گمان تھا جو بھی مجھ سے سوال کرے گا میں اس کا جواب دوں گا تو لوگوں نے مجھ سے بعض ایسی چیزوں کے بارے میں سوال کیا جن کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا تو میں نے اپنے اوپر یہ لازم کر لیا کہ میں حماد کی موت تک ان سے جدا نہیں ہوں گا، پس میں ان کے ساتھ اٹھارہ سال رہا، ان کے فوت ہو جانے کے بعد سے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے نماز پڑھی ہو اور اپنے والدین سے پہلے ان کے لئے استغفار نہ کیا ہو، یا یہ فرمایا کہ اپنے والدین کے ساتھ ان کے لئے استغفار نہ کیا ہو۔ اور میں اس کیلئے بھی استغفار کرتا تھا جس سے میں نے علم حاصل کیا اور اس کیلئے بھی جس نے مجھ سے علم حاصل کیا۔

فرمایا: میں منصور کے پاس گیا تو اس نے مجھ سے پوچھا: آپ نے علم کس سے حاصل کیا؟

میں نے کہا: حماد (رحمہ اللہ) سے، انہوں نے ابراہیم نخعی (رحمہ اللہ) سے، انہوں نے حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے۔ منصور نے کہا: واہ واہ! اے ابوحنیفہ! آپ نے تو احاطہ کر لیا۔

آپ نے چار بلکہ آٹھ صحابہ کرام کو پایا (ان میں سے چند یہ ہیں:)

① حضرت انس رضی اللہ عنہ ② حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ ③ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ ④ حضرت ابوالطفیل رضی اللہ عنہ

بعضوں نے کہا ہے کہ ان میں سے کسی سے بھی نہیں ملے۔ میں کہتا ہوں:

"لیکن جس نے محفوظ کیا وہ حجت ہے ان کے خلاف جنہوں نے اس کو محفوظ نہیں کیا اور مثبت، نافی پر مقدم ہوتا ہے۔"
آپ نے عطاء اور ان کے اہل طبقہ سے سماع کیا ہے، آپ سے عبد اللہ بن مبارک، وکیع بن جراح اور بے شمار مخلوق نے روایت کی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بڑے بڑے ائمہ مجتہدین اور علماء راسخین نے امام ابوحنیفہؒ رحمۃ اللہ علیہ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ مثلاً عبد اللہ بن مبارک، لیث بن سعد اور امام مالک بن انس اھ۔ آپ کے تلامذہ میں داؤد طائی، ابراہیم بن ادھم اور فضل بن عیاض وغیرہ جو بڑے صوفیوں میں سے ہیں۔ اللہ ان سب سے راضی ہو جائے۔ بھی شامل ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی آزمائش کا بیان:

یزید بن ہبیرہ اموی عراق کا والی تھا۔ اس نے امام صاحب کو کوفہ کا قاضی بننے کو کہا تو آپ نے انکار کر دیا۔ اس نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو سو کوڑے مروائے، ہر روز ان کو دس کوڑے مارے جاتے تھے لیکن وہ قاضی نہ بننے پر مصر رہے، جب اس نے یہ معاملہ دیکھا تو ان کا راستہ چھوڑ دیا۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ جب ان کے قاضی نہ بننے پر کوڑے مارے جانے کا ذکر کرتے تو رو پڑتے اور ان پر ترس آ جاتا۔ میں کہتا ہوں گویا انہوں نے خلق قرآن کے مسئلہ میں کوڑے برداشت کرنے میں ان کی اقتداء کی۔

امیر المومنین منصور ابوجعفر نے آپ کو کوفہ سے بغداد بلایا تاکہ آپ کو عہدۂ قضاء پر فائز کرے تو آپ نے انکار کر دیا۔ اس پر منصور نے قسم کھالی کہ وہ ایسا ضرور کرے گا، پس امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی قسم کھالی کہ وہ ایسا نہ کریں گے، دونوں نے یہ بات بارہا کہی، منصور کے حاجب ربیع نے کہا: آپ دیکھ نہیں رہے کہ امیر المومنین نے قسم کھالی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: امیر المومنین اپنی قسم کے کفارہ میں میری قسم کے کفارے سے زیادہ قادر ہیں، چنانچہ اسی وقت اس نے آپ کو جیل میں ڈالنے کا حکم دے دیا۔

ایک روایت کے مطابق ابوجعفر نے آپ کو قضاء کی دعوت دی تو آپ نے انکار کر دیا، اس نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو قید کر دیا پھر دوبارہ بلایا اور کہا تم ہمارے معاملے سے اعراض کر رہے ہو؟ آپ نے فرمایا: اللہ امیر المومنین کا بھلا کرے، مجھ میں قضاء کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس نے کہا: آپ کذب بیانی کر رہے ہیں، پھر اس نے دوبارہ منصب قضاء کی پیشکش کی تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"امیر المومنین مجھ پر حکم لگا چکے ہیں کہ میں قضاء کے لائق نہیں ہوں، اس لئے کہ انہوں نے میری نسبت جھوٹ کی طرف کی ہے لہٰذا اگر میں جھوٹا ہوں تو میں (اس کے) قابل نہیں ہوں اور اگر میں سچا ہوں تو میں بتا چکا ہوں کہ مجھ میں اس کی صلاحیت نہیں۔"

پس اس نے ان کو دوبارہ جیل میں ڈلوا دیا۔ ربیع بن یونس کا بیان ہے کہ میں نے منصور کو دیکھا وہ قضاء کے معاملہ میں ان سے بات چیت کر رہا تھا اور امام صاحب فرماتے تھے:

"اللہ سے ڈر، اپنی امانت میں صرف اسی کو شریک کر جو اللہ کا خوف رکھتا ہو، اللہ کی قسم میں رضا سے مامون نہیں ہوں تو

غضب سے کیسے مامون ہوں گا، لہٰذا میں اس کی صلاحیت نہیں رکھتا۔"

اس نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا: آپ جھوٹ بولتے ہیں آپ اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"آپ نے خود ہی مجھ پر حکم لگایا ہے، لہٰذا آپ کے لئے کیسے جائز ہوگا کہ اپنی امانت پر ایسے آدمی کو قاضی بنائیں جو جھوٹا ہو۔"

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مقام:

ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ہوا تو انہوں نے فرمایا:

کیا تم ایسے آدمی کا تذکرہ کرتے ہوں جس پر ہر جانب سے دنیا پیش کی گئی تو اس نے اس سے راہ فرار اختیار کی۔ آپ خوب رُو تھے عمدہ لباس اور بہترین خوشبو والے تھے، جب آپ تشریف لاتے تو اپنی عمدہ خوشبو سے پہچانے جاتے تھے۔ بہت زیادہ سخی تھے، اپنے بھائیوں سے غم خواری کرنے والے تھے، میانہ قد تھے، لوگوں میں سب سے بہترین اور شیریں طرز گفتگو کرنے والے تھے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے خواب میں دیکھا گویا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کھود رہے ہیں تو انہوں نے کسی کو محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے (اس کی تعبیر) پوچھنے کیلئے بھیجا تو انہوں نے کہا: یہ خواب کس کا ہے؟ اور اس خواب کے بارے میں جواب نہیں دیا، پھر سائل نے دوسری مرتبہ پوچھا تو انہوں نے پہلے والی بات کہی۔ پھر سائل نے تیسری مرتبہ پوچھا تو آپ نے فرمایا: یہ خواب دیکھنے والا شخص علم میں اس قدر فوقیت حاصل کرے گا کہ اس سے پہلے کسی کو حاصل نہ ہوئی ہوگی۔

ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نشانی تھے۔ ان سے کہا گیا: خیر کی نشانی تھے یا شر کی؟ تو آپ نے فرمایا: اے فلانے خاموش ہو جا، کیونکہ (ان کے بارے میں) کہا جاتا ہے کہ وہ خیر کی نشانی اور شر کی غایت تھے۔ پھر یہ آیت تلاوت کی:

﴿وجعلنا ابن مريم وامه آية﴾

(ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں) ایک دن وہ جامع مسجد میں تھے کہ ان کی گود میں ایک سانپ گرا، لوگ بھاگ کھڑے ہوئے، مگر آپ نے فقط اتنا کیا کہ اپنی گود جھاڑ دی اور اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی وفات پا گئے تو لوگ ان کے پاس تعزیت کیلئے جمع ہوئے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تو سفیان ثوری کھڑے ہو گئے، انکا اکرام کیا، ان کو اپنی جگہ پر بٹھایا اور خود ان کے سامنے بیٹھ گئے۔ جب لوگ چلے گئے تو اصحابِ سفیان نے کہا ہم نے آپ کو عجیب حرکت کرتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے فرمایا:

"اِس آدمی کا علم میں ایک مرتبہ ہے، اگر میں اس کے علم کی وجہ سے نہ اٹھتا تو اس کی عمر کی وجہ سے اٹھتا، اگر میں اس کی عمر کی وجہ سے نہ اٹھتا تو اس کی فقاہت کی وجہ سے اٹھتا اور اگر اس کی وجہ سے نہ اٹھتا تو اس کی پرہیز گاری کی وجہ سے اُٹھتا۔"

نضر بن شمیل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

"لوگ فقہ کو بھول کر سوئے ہوئے تھے، یہاں تک کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو بیان کر کے لوگوں کو بیدار کیا۔"

جعفر بن ربیع نے کہا: میں ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پانچ سال تک ٹھہرا رہا میں نے ان سے زیادہ لمبی خاموشی والا کوئی نہیں

دیکھا اور جب ان سے فقہ کے بارے میں کوئی بات پوچھی جاتی تو وہ وادی کی طرح بہہ پڑتے تھے۔

ابن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ ہمارے وقت میں ان سے زیادہ نماز پڑھنے والا مکہ میں کوئی نہیں آیا تھا۔

یحییٰ بن ایوب زاھد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ رات کو سوتے نہیں تھے۔

ابوعاصم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ آپ کی کثرت نماز کی وجہ سے آپ کو کھونٹا کہا جاتا تھا۔

امام زفر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ قرآن پڑھتے پڑھتے پوری رات ایک رکعت میں گذار دیتے تھے۔

اسد بن عمرو رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ چالیس سال امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے عشاء کے وضوء سے فجر کی نماز پڑھی، رات کا اکثر حصہ یوں گزرتا تھا کہ ایک رکعت میں پورا قرآن پڑھ لیتے تھے۔ آپ کی آہ و بکا س صاف سنائی دیتی تھی، حتی کہ ان پر پڑوسیوں کو ترس آجاتا۔

آپ کے بارے میں یہ بات بھی محفوظ ہے کہ جس جگہ آپ کی وفات ہوئی وہاں آپ نے سات ہزار قرآن مجید ختم کیے تھے۔

حسین بن عمارہ رحمۃ اللہ علیہ نے جب آپ کو غسل دیا تو فرمایا: اللہ آپ کی مغفرت فرمائے کہ تیس سال سے آپ نے کبھی روزہ نہیں چھوڑا، چالیس سال تک رات کو دائیں بازو کو تکیہ نہیں بنایا، اللہ کی قسم آپ نے بعد والوں کو مشقت میں ڈال دیا۔

ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں: آپ رحمۃ اللہ علیہ نے پینتالیس سال تک ایک وضوء سے پانچوں نمازیں پڑھیں اور دو رکعتوں میں پورا قرآن پڑھ لیتے تھے۔

زائدہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے عشاء کی نماز ان کے ساتھ ان کی مسجد میں پڑھی، لوگ چلے گئے، آپ کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ میں مسجد میں ہوں، میں نے ان سے ایک مسئلہ دریافت کرنے کا ارادہ کیا، وہ کھڑے ہوئے اور نماز پڑھنا شروع کر دی اور قرأت کرتے رہے یہاں تک کہ اس آیت پر پہنچے: ﴿فمن الله علينا و وقانا عذاب السموم﴾ اور اس کو بار بار پڑھتے رہے یہاں تک کہ مؤذن نے صبح کی اذان دے دی اور میں ان کا انتظار کرتا رہا۔

قاسم بن معن رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے: امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایک رات کھڑے ہوئے اور یہ آیت: ﴿بل الساعة موعدهم و الساعة ادهى و امر﴾ بار بار پڑھتے رہے، روتے رہے اور آہ وزاری کرتے رہے۔

وکیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اوپر یہ لازم کیا تھا کہ وہ اپنے کلام میں اللہ کی قسم نہیں کھائیں گے، وگرنہ ایک درھم صدقہ کریں گے۔ چنانچہ آپ نے (کسی بات پر) قسم اٹھائی تو ایک درھم صدقہ کیا پھر اپنے اوپر لازم کیا کہ اگر قسم کھائی تو ایک دینار صدقہ کریں گے، پس آپ اپنے کلام میں سچی قسم کھانے پر ایک دینار صدقہ کیا کرتے تھے۔

ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے کہا: امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ غیبت سے کس قدر دور ہیں! میں نے ان سے کبھی ان کے دشمن کی غیبت نہیں سنی۔ فرمایا: اللہ کی قسم! وہ بہت ہی عقل مند تھے کہ اپنی نیکیوں پر ایسی چیز کو مسلط نہیں ہونے دیا جو ان کی نیکیوں کو ختم کر دے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ائمہ ثلاثہ کی نظر میں:

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے عیال ہیں۔

اور ایک روایت میں ہے کہ جو فقہ میں تبحر ہونا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب کو لازم پکڑے۔

مروی ہے کہ امام شافعیؒ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک آدمی ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو بُرا کہتے ہوئے سنا تو اسے بلا کر کہا: ارے! تم ایسے آدمی کو بُرا بھلا کہہ رہے ہو کہ جس کے سپرد تمام لوگوں نے تین چوتھائی فقہ کر دی اور وہ ان سب کے سپرد چوتھائی نہیں کرتا۔ اس نے کہا: یہ کیسے؟ آپ نے جواب دیا: فقہ سوال و جواب ہے۔ انہوں نے سوالات وضع کیے تو نصف علم ان کے سپرد ہو گیا، پھر انہوں نے سب کا جواب دیا اور ان کے مخالفین کہتے ہیں کہ انہوں نے سب میں غلطی کی ہے، تو جب ان جوابات کہ جس میں لوگوں نے ان کی موافقت کی ہے کا تقابل ان جوابات سے کیا گیا جن میں لوگوں نے ان کی مخالفت کی ہے تو ان کو تین چوتھائی علم سونپ دیا گیا اور باقی ایک چوتھائی علم لوگوں میں مشترک ہے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''الخیرات الحسان'' نامی کتاب میں آپ کے جو مناقب بیان کئے ہیں ان میں سے ایک منقبت یہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: ابوحنیفہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا: ''میں ان کو ایسا آدمی سمجھتا ہوں کہ اگر وہ آپ سے ستون کے بارے میں بات کریں کہ وہ اس کو سونے کا بنا دیں گے تو دلیل ضرور دیں گے۔''

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جب بغداد تشریف لائے تو امام صاحب کی قبر کی زیارت فرمائی اور اس کے پاس دو رکعت نماز پڑھی اور تکبیر کے وقت رفع یدین نہیں کیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ دو رکعتیں صبح کی تھیں، آپ نے قنوت نہیں پڑھی۔ ان سے اس بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: ہمارا اس امام کے ساتھ ادب کا معاملہ کرنا، ان کی موجودگی میں ان کے خلاف اظہار کرنے سے زیادہ بڑا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سخاوت:

جب آپ اپنے عیال پر کوئی خرچہ کرتے تو اتنا ہی صدقہ بھی کرتے تھے، جب نیا کپڑا پہنتے تھے تو اسی قیمت کا کپڑا علماء مشائخ کو بھی پہناتے تھے، جب آپ کے سامنے کھانا رکھا جاتا تو جتنا خود کھاتے تھے اس سے دوگنا روٹی پر رکھ کر کسی فقیر کو دے دیتے تھے۔ آپ کے بیٹے حماد نے جب ختم کیا تو آپ نے حماد کے معلم کو پانچ سو درھم ھبہ کیے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ذہانت:

آپ کے پوتے اسماعیل کا بیان ہے کہ ہمارے ہاں ایک رافضی تھا اس کے دو خچر تھے ایک کا نام اس نے ابوبکر اور دوسرے کا نام عمر رکھا۔ ان دونوں میں سے کسی ایک نے اس رافضی کو دولتیاں مار مار کر قتل کر دیا، میرے دادا کو بتایا گیا تو انہوں نے فرمایا: اس کو عمر نامی خچر نے ہی مارا ہوگا، اور ایسا ہی تھا۔ میں کہتا ہوں چونکہ عمر مظہر جلال ہیں اور ابوبکر مظہر جمال ہیں۔

منصور کی ایک جماعت آپ رحمۃ اللہ علیہ بغض رکھتی تھی، جب اس جماعت کے کسی فرد نے آپ کو منصور کے پاس دیکھا تو کہا: آج میں اس کو قتل کر دوں گا۔ پھر آپ سے کہا: امیر المؤمنین ہمیں ایسے آدمی کی گردن مارنے کا حکم دے رہے ہیں جسے ہم جانتے نہیں کہ وہ کیسا ہے تو کیا ہمارے لئے اس کو قتل کرنا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا: امیر حق کا حکم دیتا ہے یا باطل کا؟ اس نے کہا: حق کا،

تو آپ نے فرمایا:

''حق کو لازم پکڑو خواہ حق بات کہنے والا کوئی بھی شخص ہو اور اس کے بارے میں تم سے سوال نہ کیا جاوے گا۔'' پھر آپ نے اپنے قریبی شخص سے فرمایا: اس نے مجھے ہلاکت میں ڈالنے کا ارادہ کیا تھا پس میں نے اسی کو باندھ دیا۔

امام صاحب کا تقویٰ:

آپ ریشم کی تجارت کیا کرتے تھے۔ دار عمرو بن حریث میں آپ کی دُکان مشہور تھی۔ ایک عورت ان کے پاس ریشمی کپڑا خریدنے آئی۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے لئے کپڑا نکالا تو وہ بولی: وہ ضعیفہ ہے اور یہ (رقم) امانت ہے، لہٰذا اتنے میں بیچ دیں جتنے میں آپکو پڑا ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: تم اس کو چار درھم میں لے لو۔ عورت نے کہا: آپ مجھ بڑھیا سے مذاق نہ کریں۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں نے دو کپڑے خریدے تھے، ان میں سے ایک کو کل رأس المال سے چار درھم کم میں فروخت کیا تھا اور باقی چار درھم میں یہ رہ گیا۔

☆ آپ کی پرہیزگاری کی ایک بات یہ ہے کہ آپ نے شب باشی کیلئے ایک باندی خریدنے کا ارادہ کیا تو بیس سال تک قید ی عورتوں کی تفتیش کرتے رہے اور ان کے بارے میں پوچھتے رہے، حتیٰ کہ جب آپ کو اطمینان ہوا تو تب آپ نے ایک باندی خریدی۔

☆ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے کسی مقروض کے پاس قرض کے تقاضے کیلئے جاتے تو اس کی دیوار کا سایہ نہیں حاصل کرتے تھے۔

☆ ایک بار آپ کے وکیل نے عیب دار کپڑا چپکے سے فروخت کردیا، اس کپڑے کی قیمت وکیل دوسرے مال میں ملا کر آپ کے پاس لایا تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے وہ سارا مال صدقہ کردیا۔ ایک قول کے مطابق وہ مال تیس ہزار تھا۔

☆ کوفہ میں ایک بکری گم ہوگئی تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے سات سال تک بکری کا گوشت چھوڑے رکھا کیونکہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کو بتایا گیا تھا کہ بکری اس سے زیادہ زندہ نہیں رہتی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کرامت:

آپ رحمۃ اللہ علیہ کی کرامات میں سے ایک کرامت یہ ہے کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اپنے یتیم وفقیر ہونے کا باعث صغر سنی میں اپنی والدہ سے بھاگ کر آپ کے پاس آگئے، ان کی والدہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئیں اور ان سے کہا آپ ہی ہیں جنہوں نے میرے بیٹے کو بگاڑا ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ماں کے حوالے کردیا لیکن وہ پھر بھاگ کر آگئے، اور انہوں نے ایسا کئی بار کیا۔

ان کی تنگدستی چل ہی رہی تھی کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے فرمایا: اس وقت تمہاری کیا شان ہوگی جب تم فیروزہ کے پیالہ میں فالودہ کھاؤ گے۔ جب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوگیا تو ہارون الرشید نے ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو بلایا اور ان کو اسی طرح فالودہ پیش کیا تو ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ہنس پڑے، رشید کو اس پر تعجب ہوا تو ان سے پوچھا، آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر رحم فرمائے اور ان کو سارا قصّہ آخر تک سُنا دیا۔

شیخ ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ کلام ملخص ہے، ہم نے ان کے کلام پر اکتفاء کیا، چونکہ یہ مخالفین پر حجت ہیں، اور جو کچھ نقل کیا ہے اس میں موافقین کیلئے کفایت ہے۔ آپ کی تعریف ومناقب میں کوئی کتنا ہی مبالغہ کرے کم ہے۔

ولادت ووفات:

آپ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور بغداد میں فوت ہوئے۔ ایک قول کے مطابق جیل خانہ میں فوت ہوئے جس وقت آپ کو منصب قضاء قبول کرنے کیلئے کہا گیا تھا۔ مشہور قول کے مطابق آپ کی وفات رجب ۱۵۰ھ میں یا ۱۵۱ھ یا ۱۵۳ھ کو بغداد میں ہوئی۔

آپ کی قبر کی زیارت کی جاتی ہے اور اس سے برکت حاصل کی جاتی ہے۔

وَاِنِّیْ اِذَا نَسَبْتُ الْحَدِیْثَ اِلَیْهِمْ كَاَنِّیْ اَسْنَدْتُ اِلَى النَّبِیِّ ﷺ لِاَنَّهُمْ قَدْ فَرَغُوْا مِنْهُ وَاَغْنَوْنَا عَنْهُ۔

''اور حقیقت یہ ہے کہ جب میں نے ان احادیث کی نسبت (ذکرِ رجال سمیت) ان (ائمہ ومحدثین) کی طرف کردی تو گویا میں نے (حدیث کی) سند نبی کریم ﷺ تک پہنچادی' کیونکہ ان ائمہ نے (اپنی کتابوں میں کامل) سند ذکر کرکے ہم کو اس (تحقیق اسناد) سے مستغنی کردیا ہے''۔

واضح رہے کہ مصنف نے ماقبل میں'' فاعلمت ما اغفله ''فرمایا تھا، جس سے ایک اعتراض اٹھتا ہے کہ اعلام حقیقی تو اسناد بالکلیہ لانے سے ہوگا، تاکہ اس پر وہ معرفت رجال مترتب ہوسکے جس پر حدیث کا حکم صحیح، حسن اور ضعف ہونا اور دیگر احوال موقوف ہوتے ہیں۔ تو اس اعتراض سے عذر خواہی کرتے ہوئے فرمایا: ''اور حقیقت یہ ہے کہ جب میں نے ان احادیث کی نسبت۔۔''

عبارت بالا میں ائمہ سے مراد وہ محدثین ہیں جن کی کتب ان کی اسانید سمیت مشہور علماء میں معروف ہیں۔

كان اسندت الى النبیؐ: یعنی اگر حدیث مرفوع تھی تو گویا میں نے اس کی سند نبی کریم ﷺ تک پہنچادی۔ جیسا کہ اکثر احادیث مرفوع ہیں۔ اور اگر حدیث موقوف تھی تو گویا میں نے اس کی سند صحابہ کرام تک پہنچادی۔ موقوف حدیث حکماً مرفوع ہے۔

قد فرغوا منه: یعنی ائمہ ومحدثین ان احادیث کی کامل سند ذکر کرکے فارغ ہوچکے ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (ضمیر کے مرجع کی وضاحت کرتے ہوئے) فرماتے ہیں: یعنی اس اسناد سے فارغ ہوچکے ہیں جو'' اسندت ''سے مفہوم ہورہی ہے۔ جیسے یہ آیت ہے: ﴿وان تعفوا اقرب للتقوى﴾ اھ۔

اور یہ بات مخفی نہیں کہ ''وان تعفوا'' بتاویل مصدر مبتدا ہے اور ''اقرب للتقوی'' اس کی خبر ہے۔ تقدیری عبارت یہ ہے: وعفوكم اقرب للتقوى۔ جیسے: ﴿وان تصوموا خير لكم﴾

پس درست یہ ہے کہ یہ ''اعدلوا اقرب للتقوى'' کی مانند ہے۔ مزید یہ کہ ''وان تعفوا هوا اقرب'' کی مانند قرار دینا یا تو کتاب کا سہو ہے یا صاحب کتاب کا وہم ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

''اغنونا عنه'': ہمزہ قطعی کے ساتھ، یعنی اسناد کی تحقیق سے ہمیں مستغنی کر دیا اور ہماری کفایت کر دی۔ تحقیق اسناد سے مراد یہ معلوم کرنا ہے کہ سند میں وصل ہے یا قطع، یہ موقوف ہے یا مرفوع، سندی اعتبار سے ضعیف ہے، حسن ہے یا موضوع ہے۔ اسی وجہ سے ضروری ہے کہ سند یا حدیث کی صحت، حسن، ضعف یا وضع کے سلسلہ میں محدثین میں سے کسی ایک کی تصریح کو لازم پکڑے۔

لہٰذا مصنف کے کلام سے معلوم ہوا کہ ان کتب مؤلفہ معتمدہ سے حدیث نقل کرنا جائز ہے جو کتب مشہور ہوں یا جن کتب کی نسبت ان کے مؤلفین کی طرف کرنا صحیح ہو جیسا کہ کتب ستہ وغیرہ۔

اور اس کے جوازِ نقل میں یہ بات برابر ہے کہ جو کچھ ذکر کیا گیا آیا اسکا نقل کرنا اسکے مضمون پر عمل کرنے کیلئے ہے اگر چہ وہ احکام کے بارے میں ہو یا استدلال کیلئے ہو اور اس سے منقول اصل کا متعدد ہونا شرط نہیں۔ اور ابن صلاح رحمۃ اللہ علیہ کا کلام اس کے شرط ہونے کا تقاضا کرتا ہے، اہل علم نے اس (اشتراط) کو استحباب واستظہار پر محمول کیا ہے۔ لیکن اس اصل میں یہ شرط ہوگی کہ اس کا کسی معتمد اصل کے ساتھ صحیح تقابل کیا گیا ہو۔ اس لئے کہ اس وقت اس کی وجہ سے وہ ثقہ حاصل ہوگا جس پر صحت واحتجاج کے اعتبار سے اعتماد کا مدار ہے۔ ہاں ترمذی کے نسخے حدیث پر حکم کے سلسلہ میں بہت مختلف ہیں بلکہ سنن ابی داؤد بھی ایسی ہی ہے، لہٰذا ان دونوں کا اصول معتمدہ سے تقابل ضروری ہے۔

مصنف کے کلام سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عمل اور استدلال کیلئے کتب معتمدہ سے نقل میں یہ شرط نہیں ہے کہ اس (عمل کرنے والے اور استدلال کرنے والے شخص) کی ان کتب کے مؤلفین سے روایت ہو۔ اسی وجہ سے ابن برھان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: سارے فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ عمل بالحدیث اس (شخص) کے سماع پر موقوف نہیں، بلکہ اگر اس کے نزدیک سنن کا نسخہ صحیح ہو تو اس کیلئے اس پر عمل کرنا جائز ہوگا اگر چہ اسکا سماع نہ کیا ہو۔ اور بعض مالکیہ نے شذوذ اختیار کرتے ہوئے کہا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی مسلمان کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا'' جب تک کہ اس کے نزدیک یہ قول مروی نہ ہو، اگر چہ روایات کی کسی اقل ترین صورت پر مروی ہو۔ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: **''من كذب علي متعمدا فليتبوا مقعده من النار''**

''جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں تیار رکھے۔''

اور ایک روایت (لفظ) ''متعمدا'' کے حذف کے ساتھ ہے، حافظ زین عراقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی اتباع کی ہے۔ چونکہ اس بات کے ثابت ہونے کے بعد کہ طالب علم کیلئے یہ بات قبیح ہے کہ وہ اپنی اسناد کے ساتھ متعدد احادیث یاد نہ کرے، اس کے ذریعہ سے ''عن کذا وعن کذا'' سے نجات پانے کیلئے۔ فرمایا: اور وہ جرح سے نجات پالے گا اس کے ذریعہ سے اس چیز کو نقل کر کے جو اس کی روایت ہی نہیں ہے، اس لئے کہ باجماعِ اہلِ درایت یہ ناجائز ہے۔ ایک جماعت نے پہلے (قول یا مذہب) کی تائید کی ہے۔ ان دو متعارض اجماعوں کو یوں جمع کیا جاتا ہے کہ اوّل (اجماع) کو اس پر محمول کیا ہے جب اس نے اصل معتمد پر نظر کر لی ہو، اور اس سے حدیث عمل یا احتجاج کیلئے اخذ کی ہو۔ اور ثانی (اجماع) کو اس صورت پر محمول کیا ہے جب ان کی احادیث قراءۃً اور اسناداً اپنی طرف نسبت کا وہم پیدا کرتے ہوئے بیان کرے، تو یہ جائز نہیں کیونکہ اس میں مزید دھوکہ دہی ہے

۔ثانی پر ہونے والا اعتراض اس سے ختم ہو گیا کہ اس سے ان پر لازم آتا ہے صحیحین یا ان دونوں میں سے کسی ایک میں کسی ایسے راوی کی احادیث لانا جس کی اس میں کوئی روایت نہیں اور ایسے راوی کی روایت کے نقل کا جواز معلوم ہوتا جس کی اس میں کوئی روایت ہے اگرچہ وہ ضعیف ہی ہو۔

وَسَرَدْتُ الْكُتُبَ وَالْاَبْوَابَ كَمَا سَرَدَهَا وَاقْتَفَيْتُ اَثَرَهٗ فِيهَا

''اور میں نے اس میں کتب اور ابواب کی ترتیب وہی رکھی جو صاحب مصابیح (یعنی امام بغوی رحمہ اللہ) نے (مصابیح میں) رکھی تھی اور اس سلسلہ میں ان ہی کے نقش قدم کی پیروی کی ہے''۔

اثرہ: دو فتحوں کے ساتھ ہے۔کہا گیا ہے کہ یہ ہمزہ کے کسرہ اور ثائے مثلثہ کے سکون کے ساتھ ہے۔

یعنی کتب و ابواب کے سلسلہ میں ان ہی کے نقش قدم کی پیروی کی ہے، کہ اس میں کوئی تقدیم و تاخیر، عنوان کا اضافہ اور تغیر نہیں کی۔اس لئے کہ اس کی ترتیب کمال درجہ کی ہے اور اس کی ابواب بندی حسن و جمال کی انتہاء کو پہنچی ہوئی ہے۔

اس بات کا بھی احتمال ہے کہ یہ کمال متابعت کی تاکید ہو، اور بعض کتب و ابواب کی وجہ مناسبت پر پیدا ہونے والے اعتراض سے اظہار براءت ہو۔

وَقَسَمْتُ كُلَّ بَابٍ غَالِبًا عَلٰى فُصُوْلٍ ثَلَاثَةٍ اَوَّلُهَا مَا اَخْرَجَهُ الشَّيْخَانِ اَوْ اَحَدُهُمَا وَاكْتَفَيْتُ بِهِمَا وَاِنِ اشْتَرَكَ فِيْهِ الْغَيْرُ لِعُلُوِّ دَرَجَتِهِمَا فِي الرِّوَايَةِ

''اور میں نے ہر باب کو تین فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔(اس کتاب کی) پہلی فصل میں ان حدیثوں کو جمع کیا ہے، جن کو شیخین (یعنی بخاریؒ اور مسلمؒ) نے روایت کیا ہے یا ان دونوں میں سے کسی ایک نے روایت کیا ہے اگرچہ ان حدیثوں میں بعض ایسی بھی ہیں جن کی تخریج دوسرے محدثین نے بھی کی ہے لیکن اس فصل میں میں نے صرف شیخین (کی تخریج) کے ذکر پر اکتفاء کیا ہے کیونکہ روایت میں شیخین کا درجہ بلند ہے''۔

قسمت: تخفیف کے ساتھ ہے۔

کل باب: یعنی میں نے ہر باب اور ہر کتاب کو تین فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔

غالبا: غالب بمعنی ''اکثر'' ہے، اس لئے کہ کتاب کے بعض ابواب میں فصل ثانی یا فصل ثالث یا دونوں ہی نہیں ہیں۔

اولھا: ضمیر ''فصول'' کی طرف راجع ہے۔اس سے مراد وہی ہے جس کیلئے مصابیح میں امام بغوی نے ''من الصحاح'' کی تعبیر اختیار کی ہے۔

ما اخرجه الشیخان او احدهما: (اس جملہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:)

(الف) یعنی فصل اول میں وہ روایات ذکر کی ہیں جن کے بارے میں صاحب مصابیح کا زعم ہے کہ ان کو شیخین نے یا شیخین میں سے کسی ایک نے روایت کیا ہے۔چونکہ آگے خود فرما رہے ہیں: وان عثرت علی اختلاف

(ب) اکثر مراد ہے اور نادر معدوم کی طرح ہے۔(یعنی فصل اول میں اکثر روایات وہ ذکر کی ہیں جن کو شیخین نے یا شیخین میں سے کسی ایک نے روایت کیا ہے۔)

محدثین کی اصطلاح میں ''شیخین'' سے مراد امام بخاری اور امام مسلم ہوتے ہیں، فقہاء حنفیہ کے نزدیک امام ابو یوسف اور امام محمد مراد ہوتے ہیں اور شافعیہ کے نزدیک رافعی اور امام نووی مراد ہوتے ہیں۔

واکتفیت: ایک نسخہ میں'' واکتفی '' ہے، ممکن ہے کہ اس میں ''التفات'' ہو، اس اعتبار سے یہ معلوم کا صیغہ ہوگا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ماضی مجہول کا یا مضارع متکلم معروف کا صیغہ ہو۔ یہی احتمال زیادہ ظاہر ہے۔

وان اشترك فیه: ''ان'' وصلیہ ہے، یہ نہ جزاء کا مطالبہ کرتا ہے اور نہ جواب کا مطالبہ کرتا ہے۔

الغیر: غیر سے مراد شیخین کے علاوہ محدثین ومخرجین ہیں جیسے سنن اربعہ اور کتب حدیث کے مؤلفین ومصنفین۔

لعلم درجتهما فی الروایة: '' فی الروایة ''علو کے متعلق ہے۔

روایت میں شیخین کا درجہ تمام محدثین سے بلند ہے اگرچہ شیخین کے رتبہ میں باہم فرق ہے۔ شیخین نے اسناد کی شرائط اور ان کی صحت کا جس قدر التزام کیا ہے اتنا التزام ان دونوں کے علاوہ دیگر محدثین نے نہیں کیا اگرچہ کئی محدثین علو اسناد میں ان دونوں سے اعلیٰ مرتبہ پر ہیں، چونکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے (حدیث) امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے اخذ کی، انہوں نے امام شافعی رحمہ اللہ سے اخذ کی اور انہوں نے امام مالک رحمہ اللہ سے اخذ کی ہے۔ اس وجہ سے بشر الحافی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دنیا کہ زینت میں سے ایک بات یہ ہے کہ آدمی یہ کہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے ہمیں یوں حدیث بیان کی۔

اس (مقولہ) میں احتمال ہے کہ علم ظاہر کے مقتضی کے مطابق یہ اسناد کی مدح ہو، اور احتمال اس بات کا بھی ہے کہ یہ تصوف کی بناء پر کہ جس کی بنیاد علم باطن پر ہے، اسناد کی مذمت ہو۔ جیسا کہ بعض نے کہا ہے کہ ''حدثنا'' دنیا کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ لیکن یہ اس صورت پر محمول ہے جب کہ اس کا ارادہ وغرض سمعہ اور ریاء ہو۔

شیخین کی شرائط کا بیان:

پھر جاننا چاہیئے کہ شیخین نے جن شرطوں کا التزام کیا ہے ان میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی اپنی شرط کی تصریح اپنی کتاب میں نہیں کی۔ اس سلسلہ میں زیادہ واضح بات وہی ہے جو ابو عبداللہ حاکم اور ان کے شاگرد امام بیہقی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے:

> ''ان دونوں نے شرط لگائی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے والے مشہور صحابی کے دو یا اس سے زیادہ راوی ہوں، پھر مشہور تابعی کے دو ثقہ راوی ہوں، پھر تبع تابعین میں سے کوئی حافظ، متقن اور مشہور تبع تابعی روایت کرے۔ پھر چوتھے طبقہ میں اس (تبع تابعی) کے ثقہ راوی ہوں پھر بخاری یا مسلم کے ایسے شیخ ہوں جو حافظ ومتقن ہوں، ان سے روایت میں ان کی عدالت مشہور ہو اور ان کے کئی راوی ہوں، پھر محدثین میں اس کی قبولیت ہمارے وقت تک ایسے متداول ہو، جیسے گواہی پر گواہی ہوتی ہے۔''

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ (شرط) اگر ان بعض صحابہ کے سلسلہ میں ٹوٹ جاتی ہے جن سے شیخین نے حدیث لی ہے تو وہ ان کے بعد والوں میں معتبر ہے۔ اسی لئے ان دونوں کی کتابوں میں کوئی بھی حدیث ایسی نہیں جس کا روایت کرنے والا صرف ایک راوی ہو۔ اھ۔

اور کہا گیا ہے امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی صحابہ کے استثناء میں موافقت کی ہے تو گویا کہ انہوں نے پہلے (قول) سے رجوع کر لیا۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب مستدرک میں جو "دونوں کی شرط پر" یا "دونوں میں سے ایک کی شرط پر" کی تعبیر اختیار کی ہے، اس کے بارے میں امام نووی، ابن دقیق العید اور امام ذہبی کی وہی رائے ہے جو رائے ابن صلاح رحمۃ اللہ علیہ کی ہے کہ اس سند کے رجال بعینہ وہی ہوں جو ان دونوں کی کتاب یا ان دونوں میں سے ایک کی کتاب کے ہیں ورنہ وہ صرف صحیح ہے اور بعض جگہ انہوں نے اپنی اس شرط کی مخالفت کی ہے سو اس کو ذھول پر محمول کیا جائے گا۔

سید جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر مصنف دو فصلوں پر اکتفانہ کرتے اور ان دونوں کے علاوہ سے مروی ہر حدیث کی تخریج کرنے والے (تمام حضرات) کا نام ذکر کر دیتے تو یہ بہترین اور بہت ہی مناسب و درست ہوتا، چونکہ حدیث اگرچہ اصل صحت میں ان دونوں کے علاوہ کی محتاج نہیں لیکن ترجیح میں ان دونوں کے علاوہ کے ذکر سے استغناء نہیں برتا جا سکتا۔ اس لئے کہ وہ حدیث جس کو مثلاً اصحاب صحاح ستہ نے روایت کیا ہے بلاشبہ اس حدیث پر راجح ہوگی جس کو شیخین یا دونوں میں سے کسی ایک نے روایت کیا ہو اور ان دونوں کے علاوہ نے روایت نہ کیا ہو۔

وَثَانِيْهَا مَا اَوْرَدَهُ غَيْرُهُمَا مِنَ الْاَئِمَّةِ الْمَذْكُوْرِيْنَ وَثَالِثُهُمَا مَا اشْتَمَلَ عَلَى مَعْنَى الْبَابِ مِنْ مُلْحَقَاتٍ مُنَاسِبَةٍ مَعَ مُحَافَظَةٍ عَلَى الشَّرِيْطَةِ وَاِنْ كَانَ مَاثُوْرًا عَنِ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ

"اور دوسری فصل میں وہ احادیث نقل کی گئی ہیں جن کو شیخین (یعنی بخاری و مسلمؒ) کے علاوہ دوسرے مذکورہ ائمہ میں سے کسی اور نے روایت کیا ہے اور تیسری فصل میں احادیث کے علاوہ صحابہ و تابعین کے منقول ان اقوال و آثار کو بھی جمع کیا گیا ہے جو باب کے مناسب اور لائق تھے لیکن آثار و اخبار کو شامل کرتے وقت شرائط حدیث کو مدنظر رکھا گیا ہے"۔

قوله: وثانيها: ما اوروه غيرهما من الائمة المذكورين:

ثانیھا: ضمیر "فصول" کی طرف راجع ہے۔ یعنی دوسری فصل سے مراد وہ ہے جس کو صاحب مصابیح نے "من الحسان" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ اور "ائمہ مذکورین" سے مراد امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی، دارمی اور ابن ماجہ ہیں، چونکہ مصابیح کی احادیث ائمہ سبعہ کی کتب سے متجاوز نہیں اور ان میں سے اکثر صحاح ہیں۔

ثالثهاما اشتمل على معنى الباب:

"ثالثھا": اس سے مراد فصل ثالث ہے جس کو امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب میں ذکر نہیں کیا۔

من ملحقات: حاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ "من" بیانیہ ہے "ما اشتمل" کا بیان ہے۔

مناسبة: سین کے کسرہ کے ساتھ، بمعنی مشاکلت ہے۔ یہ "ملحقات" کی صفت ہے، اس سے مراد وہ زوائد ہیں جن کو صاحب مشکاۃ نے ہر کتاب اور باب کی مناسبت سے غالباً زیادت فائدہ کی غرض سے لاحق کیا ہے۔

مع محافظة على الشريطة: یہاں شرط سے مراد یہ ہے کہ حدیث کی نسبت صحابہ و تابعین اور اس کی تخریج کرنے والے ائمہ مذکورہ کی طرف کی ہے۔ صاحب مصابیح نے اپنی کتاب کی دو فصلوں میں احادیث مرفوعہ لانے کا التزام کیا ہے مگر مصنف نے اس کا التزام نہیں کیا چنانچہ اپنے اگلے کلام (**وان كان ماثوراً عن سلف والخلف**) میں اس پر تنبیہ کی ہے۔

وإن كان مأثورًا عن سلف والخلف: ''کان'' کی ضمیر مرفوع شیء مشتمل کی طرف راجع ہے۔

جاننا چاہیئے کہ تمام تصحیح شدہ نسخوں میں لفظ ''سلف'' خلف پر مقدم ہے۔گویا کہ حافظ ابن احجر رحمۃ اللہ علیہ کے اصل نسخہ میں سہو ہے کہ وہاں ''خلف'' سلف پر مقدم ہے جس پر انہوں نے اعتماد کیا ہے۔اس توجیہ میں تکلف ہے۔

''سلف'' سے مراد متقدمین یعنی صحابہ ہیں اور ''خلف'' سے مراد متاخرین یعنی تابعین ہیں۔

(حافظ ابن احجر رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: خلف وہ ہیں جو قرون ثلاثہ کے بعد ہیں، پہلا قرن وہ ہے جس کی طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد گرامی میں اشارہ کیا ہے: **خير القرون قرني ثم الذين يلونهم ،ثم الذين يلونهم ،**

''سب سے بہترین لوگ میرے زمانہ کے ہیں، پھر سب سے بہترین وہ لوگ ہیں جو ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں پھر سب سے بہترین وہ لوگ ہیں جو ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔''

ان کو مقدم کیا ہے حالانکہ ان کا رتبہ مؤخر ہے جیسا کہ یہ حدیث اس کی تصریح کر رہی ہے۔کیونکہ انکی تقدیم ،غایت مذکورہ کے زیادہ مناسب ہے۔اس لئے کہ جب ان سے منقول چیز ذکر کریں گے تو جو سلف سے منقول ہوگی وہ اولی ہوگی۔اھ۔

یہ بات مخفی نہیں کہ مذکورہ بالا توجیہ خلف کو سلف پر مقدم کرنے کا سبب بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ہاں اگر صرف خلف کے ذکر پر ہی اکتفاء کرتے اور اپنی کتاب میں سلف سے نقل کرتے تو پھر یہ توجیہ ہو سکتی تھی۔

پھر آگے فرماتے ہیں: سلف وہ اہل قرون ثلاثہ ہیں جن کے ''خیر اُمة'' ہونے کی شہادت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ زعم کہ ''خلف میں سے کوئی صحابہ سے افضل ہو سکتا ہے'' یہ ان کا تفرد ہے، اور جن احادیث سے انہوں نے (اس مسئلہ میں) استدلال کیا ہے وہ ضعیف ہیں یہ اس بات پر محمول ہیں کہ ان کو فضیلت حاصل ہے بایں طور کہ ان کا ایمان بالغیب قوی ہے، اور ظلم کے زمانہ میں حق کی کڑواہٹ پر صبر کرنے کے اعتبار سے برتری حاصل ہے۔

اور یہ ممکن ہے کہ کبھی مفضول میں ایسی کوئی ایک یا کئی فضیلتیں پائی جائیں جو فاضل میں نہ پائی جائیں۔اسی وجہ سے ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے کہا گیا: کون افضل ہے حضرت معاویہ یا عمر بن عبدالعزیز؟ تو آپ نے فرمایا: وہ غبار جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں حضرت معاویہ کے گھوڑے کے نتھنوں میں داخل ہوا، عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جیسوں سے اتنی اتنی مرتبہ بہتر ہے۔اھ۔

اور یہ مخفی نہیں کہ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے یہی معنی بعینہ اسی حیثیت سے مراد لیا ہے، کہ خلف میں کبھی ایسے علمی کمالات، علمی مجاہدات، حقائق انسیہ، دقائق قدسیہ، احوالِ کرامات اور خوارق عادت پائے جاتے ہیں کہ وہ ایسے بعض سلف سے افضل ہوتے ہیں جن میں یہ (اوصاف) نہیں پائے جاتے۔جیسا کہ کسی اعرابی نے بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو اس کے حق میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تمام وجوہ سے تمام خلف یعنی ائمہ مجتہدین اور معتبر مشائخ سے افضل ہے۔جہاں تک تعلق ہے نسبتِ صحبت کی فضیلت کا تو کوئی بھی مومن اس کے شرف کا انکار نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ عظمت تاثیر میں بمنزلہ اکسیر کے ہے۔

سلف اور خلف کی تفسیر جو انہوں (یعنی ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ) نے بیان کی ہے اگرچہ نفس الامر میں صحیح ہے لیکن مصنف کے کلام سے مناسبت نہیں رکھتی، اس لئے کہ وہ اپنی کتاب میں صرف صحابہ اور تابعین ہی سے روایت کرتے ہیں، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ان کے اسماء الرجال صرف صحابہ و تابعین میں محصور ہیں۔پھر جب مصنف نے ان کی تفسیر سلف سے کر دی کی تو خلف کے

ذکر کا کوئی معنی باقی نہیں رہتا اور یہ خلف ہے۔

ثُمَّ اِنَّكَ اِنْ فَقَدْتَّ حَدِيْثًا فِيْ بَابٍ فَذٰلِكَ عَنْ تَكْرِيْرٍ اُسْقِطُهٗ

''پھر اگر کسی باب میں کوئی حدیث نہ پائے تو یہ نہ پانا کسی تکرار کی وجہ سے ہے میں نے اس کو ساقط کر دیا ہے''۔

یعنی میری اس کتاب کو دیکھنے والے اے شخص میں نے تم سے ذکر کیا تھا کہ میں نے ہر باب میں صاحب مصابیح کی متابعت کا التزام کیا ہے۔ تو اب واضح رہے کہ مصابیح میں مذکور حدیث، تو اگر مشکوۃ کے کسی باب میں بالکلیہ نہ پائے یا کتاب میں بھی نہ پائے تو اس حدیث کا مفقود ہونا یا تیرا اس حدیث کو نہ پانا کسی طعن یا سہو کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ مصابیح میں واقع تکرار کی وجہ سے میں نے اس کو ساقط کر دیا ہے۔ میں نے اس کو دوسری جگہ بغیر کسی تبدیلی کے بعینہٖ ذکر کر دیا ہے اس لئے کہ اس کے ظہور و بیان کے بعد اس کو لانے کا کوئی داعیہ نہیں۔ ''بالکلیہ'' کی قید سے یہ اعتراض ختم ہو جاتا ہے کہ ایک باب کی حدیث دوسرے باب میں نقل کر دیتے ہیں جیسا کہ انہوں نے کتاب میں بہت سے جگہوں میں کیا ہے۔

وَاِنْ وَجَدْتَّ اٰخَرَ بَعْضَهٗ مَتْرُوْكًا عَلٰى اخْتِصَارِهٖ اَوْ مَضْمُوْمًا اِلَيْهِ تَمَامُهٗ فَعَنْ دَاعِيْ اِهْتِمَامٍ اَتْرُكُهٗ وَاُلْحِقُهٗ

''اور اگر تم پاؤ ایک حدیث کہ اس کا بعض حصہ اختصار کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے (یعنی جس کو امام بغوی نے ساقط کر دیا ہے یا اس کو دوسری جگہ ذکر کیا ہے) یا اس میں بقیہ حصہ اس حدیث کا ملا دیا گیا ہے تو (یہ حذف کرنا اور ملانا اتفاقاً نہیں ہوا بلکہ) خاص مقصد کے تحت ہے''۔

آخر: یہ موصوف محذوف کی صفت ہے۔ ای حدیثا آخر

بعضہ: نصب کے ساتھ ہے، کل سے بدل البعض ہے۔ اور ''متروکا'' یہ حال ہے۔ ای بعضه حال کونه متروکا۔

علی اختصارہ: ضمیر مجرور کا مرجع ''محی السنہ'' ہیں، اس کی تائید اگلے الفاظ'' اتر که و الحقه'' سے ہو رہی ہے۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر ''حدیث'' کی طرف لوٹ رہی ہو، اس کی تا اگلے الفاظ'' أو مضموما اليه تمامه'' سے ہو رہی ہے۔ ہمارے شیخ المشائخ میرک شاہ رحمہ اللہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ امام طیبی رحمہ اللہ نے پہلے (احتمال) پر اکتفاء کیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان کی اتباع کی ہے۔ اور زیادہ ظاہر دوسرا (احتمال) ہے جیسا کہ سید جمال الدین رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ اس صورت میں کلام ایک ہی طرز پر ہو جائے گا، پہلے احتمال کی صورت میں تفکیک ضمیر لازم آئے گی جو نامناسب ہے۔

فعن داعی اهتمام: فاء جزائیہ ہے۔ ای ذلك الترك و الضم۔ کہا گیا ہے کہ ''عَن'' بمعنی لام ہے۔ ای فهو لاجل باعث اهتما م اقتضى انى اتر كه

اتر که و الحقه: واؤ بمعنی ''اَوْ'' ہے جیسا کہ ایک نسخے میں ہے۔ یعنی فوت دواعی اور اس کے سبب اختصار کی وجہ سے میں نے اسے دوسری جگہ ذکر کر دیا ہے۔ اس صورت میں یہ نشر مرتب ہے۔

فاضل طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ اس وجہ سے کہ بعض مرتبہ روایت کسی طویل حدیث کا اختصار ہوتی ہے، تو میں اس کو اختصاراً چھوڑ دیتا ہوں، یا وہ حدیث کئی معانی پر مشتمل ہوتی ہے، ہر باب اس حدیث کے معانی میں سے کسی معنی کا تقاضا کرتا ہے تو شیخ اسے ہر باب میں لے آئے، پس ہم نے نقل میں ان کی پیروی کی (ہم بھی اسے ہر باب میں لے آئے) اور جو حدیث ان

دونوں صورتوں سے ہٹ کر تھی ہم نے اکثر جگہوں پر اس کو پورا کر دیا ہے۔اھ۔

سید جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: شارح نے تقریر وتحریر اسی طرح بیان فرمائی ہے، اور''اختصار'' اور''اتمام'' کی اسناد صیغہ متکلم مع الغیر کے ساتھ کی ہے اور اس کلام کو مؤلف کی نسبت سے نقل نہیں کیا۔ شارح کا یہ امر اس بات کا احتمال رکھتا ہے کہ اس کو ان کے مصنف سے سماع پر محمول کیا جائے اور اس کا بھی احتمال ہے کہ شارح کی مراد یہ ہو کہ یہ ماتن کا مقصود ہے، واللہ اعلم۔

وَاِنْ عَثَرْتَ عَلٰى اخْتِلَافٍ فِي الْفَصْلَيْنِ مِنْ ذِكْرِ غَيْرِ الشَّيْخَيْنِ فِي الْاَوَّلِ وَذِكْرِهِمَا فِي الثَّانِيْ فَاعْلَمْ اَنِّيْ بَعْدَ تَتَبُّعِيْ كِتَابَيِ الْجَمْعِ بَيْنَ الصَّحِيْحَيْنِ لِلْحُمَيْدِيِّ وَجَامِعِ الْاُصُوْلِ اعْتَمَدْتُّ عَلٰى صَحِيْحَيِ الشَّيْخَيْنِ وَمَتْنَيْهِمَا۔

''اور اگر تمہیں دونوں فصلوں میں اختلاف نظر آئے کہ غیر شیخین کی احادیث فصل اوّل میں ذکر کی گئی ہوں اور شیخین کی ان احادیث کو فصل ثانی میں نقل کیا گیا ہو تو سمجھنا چاہئے کہ میں نے یہ حمیدی کی کتاب جمع بین الصحیحین اور کتاب جامع الاصول میں بسیار تلاش وتحقیق اور تتبع کے بعد کیا ہے اور اس سلسلہ میں میں نے بخاری ومسلم کے اصل نسخوں اور ان کے متن پر اعتماد کیا ہے۔

''عثرت'': ثاء پر تینوں حرکات درست ہیں اور فتحہ زیادہ بہتر ہے۔

یعنی اے اس کتاب کے قاری اگر تمہیں فصل اول اور فصل ثانی میں میرے اور صاحب مصابیح کے درمیان اختلاف نظر آئے کہ غیر شیخین کی احادیث فصل اوّل میں ذکر کی گئی ہوں اور شیخین کی یا شیخین میں سے کسی ایک کی احادیث کو فصل ثانی میں نقل کیا گیا ہو تو سمجھنا چاہئے کہ یہ اختلاف غلطی یا غفلت کی وجہ سے نہیں ہوا ہے الخ

فاعلم: شرط کی جزاء ہے۔ ای ان اطلعت علی ماذکر فاعلم انه ماصدر عنی بسهو اوغفلة فلاتظن هذا واعلم

كتابي الجمع: لفظ کتاب بصیغہ تثنیہ مضاف ہے۔''الجمع'' خبر ہے''احدهما'' مبتدا محذوف کی۔

الصحيحين: مراد بخاری شریف اور مسلم شریف ہیں جن کو''صحیحین'' کہا جاتا ہے۔

للحميدی: یہ (جار مجرور)''الجمع'' کے متعلق ہے، یہ تصغیر کا صیغہ ہے۔

یہ ان کے جد اعلیٰ حمید حافظ ابی عبداللہ محمد بن ابی نصر اندلسی قرطبی کی طرف نسبت ہے۔ وہ امامت کا درجہ رکھتے تھے، آپ کو اللہ جل شانہ نے بہت شہرت سے نوازا تھا، آپ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے۔ بغداد تشریف لائے، امام دارقطنی کے اصحاب اور دیگر حضرات سے سماع کیا۔ آپ نے ۴۸۰ھ میں اسی جگہ انتقال فرمایا۔

وجامع الاصول: مجرور ہے، اس کا عطف''الجمع'' پر ہے ای والآخر جامع الاصول۔ یہ کتاب صحاح ستہ کی احادیث پر مشتمل ہے۔ یہ امام مجد الدین ابی السعادات المبارک بن محمد الجزری رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے جو ابن اثیر کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے بہت سے مناقب ہیں۔'' النهاية فی حديث الغريب '' آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ آپ بہت بڑے عالم، محدث اور لغوی تھے۔ جزیرہ میں فروکش تھے، پھر وہاں سے موصل منتقل ہو گئے۔ ۶۰۶ھ میں یہیں وفات پائی۔

قوله:اعتمدت على صحيحى الشيخين ومتنيها :

ومتنيها: عطف بیان ہے۔

مصنف نے ان دو کتابوں پر اکتفاء نہیں کیا، چونکہ وہم ہوسکتا ہے کہ انکی تتبع اور کوشش غیر تام ہے۔ جب حمیدی اور صاحب جامع الاصول کی موافقت ہو جاتی ہے تو اس موافقت کی وجہ سے ان کے استقراء کی صحت کا ظن قوی ہو جاتا ہے، اور اگر وہ صرف ''الجمع بين الصحيحين'' اور ''جامع الاصول'' کے تتبع پر اکتفاء کرتے تو ان دونوں کے استقراء میں کوتاہی کا احتمال ہوتا، چنانچہ سنن اربعہ کے اتفاق کے بعد امام بغوی رحمہ اللہ کے سہو پر یقین کے ساتھ حکم لگانا ممکن ہو جائے گا۔

وَاِنْ رَاَيْتَ اِخْتِلَافًا فِيْ نَفْسِ الْحَدِيْثِ فَذٰلِكَ مِنْ تَشَعُّبِ طُرُقِ الْاَحَادِيْثِ۔

''اور اگر اختلاف اصل حدیث میں نظر آئے تو یہ (اختلاف) احادیث کے طرق میں اختلاف کی وجہ سے ہوگا''۔

رایت: یہ بمعنی بصارت بھی ہوسکتا ہے اور بمعنی معرفت بھی۔

اختلافا فى نفسى الحديث: ''نفس حدیث'' کی قید کے ذریعہ ''اسناد'' سے احتراز ہے۔

فذلك من تشعب طرق الاحاديث: جار مجرور ''ناشی'' محذوف کے متعلق ہے۔

یعنی اگر اختلاف اصل حدیث میں نظر آئے بایں طور کہ مشکاۃ میں الفاظ حدیث مصابیح کے الفاظ سے مختلف ہوں تو یہ اختلاف اسانید اور راویوں کے اختلاف کی وجہ سے ہوگا۔ حتی کہ یہ اختلاف تو ایک مؤلف کے ہاں بھی پایا جاتا ہے، چونکہ بسا اوقات شیخین یا ان میں سے کسی ایک یا ان کے علاوہ کوئی محدث ایک ہی حدیث کو متعدد طرق، متباین الفاظ اور یکساں یا مختلف معانی کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔

وَلَعَلِّيْ مَا اطَّلَعْتُ عَلٰى تِلْكَ الرِّوَايَةِ الَّتِيْ سلكها الشَّيْخُ رضى الله عَنْهُ وَقَلِيْلاً مَا تَجِدُ اَقُوْلُ مَا وَجَدْتُّ هذه الرواية فِيْ كُتُبِ الْاُصُوْلِ اَوْ وَجَدْتُّ خِلَافَهَا فَاِذَا وقفت عَلَيْهِ فَانْسِب الْقُصُوْرَ اِلَيَّ لِقِلَّةِ الدِّرَايَةِ لَا اِلٰى جناب الشَّيْخ رفع الله قدره فى الدَّارَيْنَ حاشَا لِلّٰهِ مِنْ ذٰلِك۔

''اور ہوسکتا ہے کہ مجھے وہ روایت نہ ملی ہو جس روایت کو شیخ (اپنی مصابیح میں) نے نقل کیا ہے، اور کہیں تم مجھے یہ کہتا ہوا پاؤ گے مجھے یہ روایت (مثلاً) مجھے یہ روایت کتب اصول میں نہیں ملی یا کتب اصول میں روایت (شیخ کی نقل کردہ روایت) کے خلاف ملی ہے۔ پس (اس کے باوجود) اگر تو (میری) اس (بات) پر مطلع ہو تو (تحقیق اور تتبع کے) خطا وقصور کی نسبت، میرے کوتاہ ہونے کی بناء پر، میری طرف کی جائے، (خطا وقصور کی نسبت) شیخ کی طرف نہ کی جائے، اللہ تعالیٰ ان کی قدر ومنزلت دونوں جہانوں میں بلند کرے، اس سے خدا تعالیٰ کے لئے پاکی ہے''۔

ولعلى: ''اشفاق'' کیلئے ہے۔ (یہاں کچھ عبارت مقدر ہے) اى اذا وجدتنى آثرت لفظ حديث على الذى رواه البغوى فى المصابيح لعلى۔۔۔ (یعنی جب تو مجھے پائے کہ میں نے کسی حدیث کے الفاظ کو بغوی کی روایت پر ترجیح دی ہے تو ممکن ہے کہ میں واقف نہ ہوا ہوں۔) اس لئے کہ وہ بہت بڑے امام ہیں، ان کا علم ومطالعہ بہت زیادہ ہے، چنانچہ میں نے وہ روایت حذف کر دی اور ان الفاظ کے ساتھ حدیث ذکر کی ہے جو الفاظ مجھے ملے ہیں۔

وقليلا ما تجد: ''ما'' کی زیادتی قلت کی تاکید کیلئے ہے اور''قلیلاً'' کا نصب''اقول'' کا مصدر ہونے کی وجہ سے ہے۔ای وتجدني اقول قولا قليلا یعنی تو مجھے بہت کم ایسا کہتے ہوئے پائے گا،اور کوئی بعید نہیں کہ''قلیلاً'' ظرفیت کی بناء پر منصوب ہو۔

في كتب الاصول: مراد حدیث کی وہ کُتب مبسوطہ ہیں جو کہ شیخ کے نزدیک اصول السبعہ ہیں،یا مراد مطلق اصول ہیں۔

أو وجدت: مقولہ کا حصہ ہے،اور''أوْ'' تنویع کیلئے ہے۔

فاذا وقفت عليه: ضمیر مجرور''اقول'' سے مفہوم مصدر کی طرف راجع ہے جو بمعنی''مقول'' ہے۔

فانسب: سین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

قوله: لا الى جناب الشيخ رفع الله قدره في الدارين:

خطا وقصور کی نسبت شیخ کی طرف نہ کی جائے،اس لئے کہ وہ ائمہ،حفاظ،متقنین،علماء کاملین راسخین میں سے تھے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:''**فاذا وقفت عليه**'' کا مطلب یہ ہے کہ جب میں نے کسی لفظ کو حذف کیا تو اپنی تتبع کے نتیجہ میں اس کی جگہ کوئی اور لفظ لایا،پس اگر تو اصول میں اس لفظ پر مطلع ہو جائے تو تو قصور کوالخ۔اور میں بھی یہی کہتا ہوں کہ قصور کو میری طرف منسوب کرنہ کہ شیخ کی طرف۔

رفع الله قدره في الدارين: جملہ دعائیہ ہے۔دنیا میں ان کی قدر و منزلت بایں طور بلند ہو کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو الہام فرمائے کہ میرے اس بندہ کے حق میں دعا گو ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو جا اور ان پر رحم فرما،اور آخرت میں بایں طور کہ ان کو اپنے خصوصی قرب سے نوازے۔

قوله بحاشا لله من ذلك: ''حاشا'' اثباتِ الف کے ساتھ ہے،بمعنی''تنزیہ'' ہے۔یہ مؤلف کی طرف سے ان کے ساتھ انتہائی تعظیم و تکریم اور ادب کا معاملہ ہے،وہ اس کے بلکہ اس سے زیادہ کے لائق ہیں چونکہ ان کو حق افادہ اور نسبتِ سیادت حاصل ہے۔

<u>لفظ''حاشا'' کی تحقیق:</u>

(حاش اسم،فعل،حرف میں سے کیا ہے؟اس بابت اہل علم کا اختلاف ہے،آراء حسب ذیل ہیں:)

(۱) حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ''حاشا'' حرف جر ہے۔اس کو مقام تنزیہ و براءت میں ذکر کیا گیا ہے۔

(۲) ''مغنی اللبیب'' میں ہے:صحیح یہ ہے کہ''حاشا'' اسم ہے جو تنزیہ کے مرادف ہے۔

(۳) بعضوں کا گمان یہ ہے کہ یہ اسم فعل ہے اور اس کا معنی ہے''براءت چاہنا''۔شیخ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ یہی تنزیہ واستثناء ہے۔ایک قول کے مطابق اس کا معنی''معاذ اللہ'' ہے۔

(۴) بعضوں نے کہا ہے کہ یہ فعل ہے۔

(۵) سید جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:بعض نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ اسم ہے تنزیہ کے مرادف ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ سورہ یوسف میں ﴿حاش لله﴾ تنوین کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور تنوین فعل اور حرف پر داخل نہیں ہوتی۔اور''حاش اللہ''

اضافت کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور یہ (اضافت) علامات اسم میں سے ہے، اس صورت میں "لله" منزہ و مبرأ کا بیان ہے گویا کہ انہوں نے یوں کہا: براۃ و وتنزیہ۔ اور پھر کہا: "للہ"، یہ مبرأ اور منزہ کا بیان ہے، پس اس کا لام "سقیا لك" کے لام کی طرح ہے۔ چنانچہ اس بناء پر کہا جائے گا کہ مشکاۃ کی عبارت کا معنی یہ ہے کہ شیخ قلتِ درایت سے مبرأ اور منزہ ہیں پھر منزہ اور مبرأ کو "للہ" کے الفاظ سے بیان فرمایا۔ ظاہر یہ تھا کہ وہ بغیر لام کے "حاش الله" کہتے اور گویا کہ یہ معنی اختصاص کا فائدہ دینے کیلئے ہے۔ تو گویا وہ یوں کہہ رہے ہیں: "تنزیهه لله" کہ ان کی تنزیہ اللہ تعالیٰ کے لئے مختص ہے اور اس کا یہ حق ہے کہ اس کی تنزیہ بیان کی جائے اس کے علاوہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ اور اس میں انتہاء درجہ کی تعظیم ہے۔

احتمال اس کا بھی ہے کہ تقدیری عبارت یوں ہو: "واقول فی حقه التنزیه لله لا لامر آخر" کہ میں ان کے حق میں تنزیہ اللہ کیلئے بیان کر رہا ہوں نہ کہ کسی اور وجہ سے۔

(۶) بعض نے کہا ہے کہ "حاشا" فعل ہے اور آیت میں اس کی تفسیر یوں بیان کی ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت یوسف نے برائی سے کنارہ کشی اللہ کیلئے اختیار کی۔ اس بناء پر مشکاۃ کی عبارت کا مطلب یہ ہوگا کہ شیخ کی جانب قصور کی نسبت سے پہلو تہی اللہ کیلئے اختیار کی ہے، نہ کہ کسی اور غرض سے، یا یہ کہ ہمارا ان کے حق میں "حاشاللہ" کہنا صرف اللہ کیلئے ہے نہ کہ کسی دوسری وجہ سے۔

(۷) بعض نے کہا کہ یہ اسم فعل ہے بمعنی "أنزه" یا "تبرأت" اور لام علت (کیلئے) ہے۔

(۸) ایک قول اس کے حرف ہونے کا ہے، لیکن یہ احتمال اس جگہ ضعیف ہے، اس لئے کہ اس کا حرف ہونا بمعنی استثناء یہاں درست نہیں اور "للہ" کا لام بھی "حاشا" کے حرف ہونے سے مانع ہے۔ اس لئے کہ حرف، حرف پر داخل نہیں ہوتا، واللہ اعلم۔

رَحِمَ اللّٰهُ مَنْ اِذَا وَقَفَ عَلٰى ذٰلِكَ نَبَّهَنَا عَلَيْهِ وَاَرْشَدَنَا طَرِيْقَ الصَّوَابِ۔ وَلَمْ اٰلُ جُهْدًا فِي التَّنْقِيْرِ وَالتَّفْتِيْشِ بِقَدْرِ الْوُسْعِ وَالطَّاقَةِ وَنَقَلْتُ ذٰلِكَ الْاِخْتِلَافَ كَمَا وَجَدْتُ۔

"خدا کی رحمت ہو اس شخص پر جس کو وہ روایت معلوم ہو وہ ہمیں اس پر مطلع کرے اور درست راستہ کی طرف ہماری راہنمائی کرے۔ میں نے (طرق احادیث اور اختلاف الفاظ کی بابت) اپنی تحقیق و تدقیق اور تلاش و جستجو میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور اپنی وسعت و طاقت کے مطابق پوری چھان بین کی اور یہ اختلاف میں نے جیسا پایا ویسا ہی نقل کر دیا"۔

رحم الله: جملہ دعائیہ ہے، بمعنی "ارحم اللہ" جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد گرامی ہے:

"رحم الله امرأ اهدى الى بعيوب نفسي"

"اللہ اس آدمی پر رحم کرے جس نے میرے نفس کے عیوب کی طرف میری رہنمائی کی۔"

تشریح ☆ یعنی اگر کسی شخص کو وہ روایت معلوم ہو جو صاحب مصابیح نے بیان کی ہے اور مجھے وہ اصول میں نہیں ملی تو اس کو چاہئے کہ وہ ہمیں آگاہ کر دے، اور روایت کی نسبت، باب و کتاب کی تصحیح کے سلسلہ میں راہنمائی کرے۔ یہ یا تو حقیقت پر محمول

ہے کہ اگر ہماری زندگی میں اسے معلوم ہو تو وہ ہمیں بالمشافہ بتادے۔یا مجازی معنی پر محمول ہے کہ اگر ہمارے مرنے کے بعد اسے معلوم ہو تو وہ ہماری کتاب کے حاشیہ یا شرح میں اس کا اضافہ کردے۔اس لئے کہ تصنیف بدلی نہیں جاسکتی وگرنہ کوئی معتبر کتاب نہیں ملے گی۔

وارشدنا: اس میں تجرید ہے۔اور یہ "ہدایت" کے معنی میں ہے۔ای وھدانا

ولم آل: ہمزہ کے مدہ اور لام کے ضمہ کے ساتھ، یہ "الا فی الامر" بمعنی "قصر" (کوتاہی کرنا) سے ماخوذ ہے۔

جهدًا: جیم کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ بمعنی "مشقت وطاقت" بعض کا کہنا ہے کہ ضمہ کے ساتھ ہو تو بمعنی "طاقت" اور فتحہ کے ساتھ ہو تو بمعنی "مشقت" ہے۔

بعض شراح نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے: "لم امنعك جهدا" (میں تمہیں کوشش سے نہیں منع کرتا) گویا کہ ان شراح نے س کو کلام عرب کے اس جملہ پر محمول کیا ہے: "لا ألوك نصحا"۔اور عبارت کی ترکیب کو حذف مفعول اوّل پر مبنی قرار دیا ہے اور "آلو" کو بمعنی "أمنع" استعمال کیا ہے تجوّزًا یا تضمیناً۔اس سے تقصیر لازم آتی ہے۔صورت حال یہ ہے کہ اس کو فعل لازمی مانیں تو معنی صحیح بنتا ہے اس طور پر کہ "جهدًا" تمیز ہو، یا بمعنی "مجتهدًا" حال ہو یا (بتاویل) "فی الاجتهاد" منصوب بنزع الخافض ہو۔

اور اگر یہ متعدی ہو، تو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہونے کی صورت میں ممکن ہے کہ "ترک" کو متضمن ہو اور ایک مفعول کی طرف متعدی ہو۔یہ سید جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا حاصل ہے۔

بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی: ﴿لا یالونکم خبالا﴾ کے بارے میں کہا ہے:

اس کا معنی ہے: "لا یقصرون لکم فی الفساد" (وہ تمہارے لئے فساد میں کوتاہی نہیں کرتے) "الالو" کا معنی "تقصیر" ہے۔اصل یہ ہے کہ یہ بواسطہ حرف متعدی ہو۔پھر اسے دو مفعولوں کی طرف متعدی کیا جانے لگا۔جیسے عربوں کا قول ہے: "لا آلوك نصحًا" کہ یہاں یہ "ترک ونقص" کے معنی کو متضمن ہے۔

ابو البقاء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ "یالو" ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے اور "خبالاً" تمیز ہے یا منصوب بنزع الخافض ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ مصدر موضع حال میں ہو۔

قاضی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق زیادہ واضح ہے: یہ اصل میں لازم ہے۔پس مشکاۃ کی عبارت میں یہ "ترک" کے معنی کو متضمن ہوگا چنانچہ "جهدًا" مفعول بہ ہوگا۔یا یہ (یالو) اپنے معنی اصل میں باقی ہوگا اور "جهدا" تین احتمالات میں سے ایک کی بناء پر منصوب ہوگا۔اور معنی یہ ہوگا کہ میں نے تمہارے لئے یا اللہ تعالیٰ کیلئے تقصیر نہیں کی۔

والتفتیش: ماقبل کا عطف بیان ہے۔

بقدر الوسع والطاقة: "الطاقة" عطف بیان ہے۔دیباچوں اور خطبوں میں مترادف الفاظ کا لانا فصحاء کے نزدیک متعارف ہے اور بلغاء کے نزدیک معیوب نہیں۔

قوله: ونقلت ذلك الاختلاف کما وجدت فی الاصول:

تشریح ☆ یہاں اختلاف سے مراد "مختلف فیہ" ہے یعنی جس میں اختلاف ہو۔یعنی میں نے اصول کی کتابوں میں جیسا پایا اور جس طرح نقل دیکھا ویسا ہی یہاں ذکر کر دیا شیخ کی تقلید محض سے ہٹ کر، اگرچہ شیخ جلیل القدر ارباب نقول میں سے ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (اس عبارت کا مطلب یہ بیان) فرماتے ہیں:

یعنی اس وجہ سے میں نے اس اختلاف کو ویسے ہی نقل کر دیا جیسے میں نے اصول میں پایا، میں نے اس میں کوئی تصرف نہیں کیا، نہ اس میں کوئی تغیر کیا نہ کچھ تبدیلی کی، یہاں تک کہ میں نے ہر ایک (حدیث) کے الفاظ اور معنی کو اس کے تخریج کرنے والے کی طرف منسوب کیا ہے، صرف معنی کا لحاظ کرتے ہوئے کسی صاحب تخریج کی طرف نسبت نہیں کی ہے، چونکہ حدیث کی بابت روایت بالمعنی کے جواز میں مشہور اختلاف ہے، اگرچہ اصح یہ ہے کہ مدلولاتِ الفاظ اور ان کے معانی کی معرفت رکھنے والے کیلئے روایت بالمعنی جائز ہے، لیکن اختلاف سے نکلنے کیلئے اس سے بچنا زیادہ بہتر ہے۔انتہی۔

تدبر فرمایئے۔اگرچہ ان کے اصل کلام میں ہمارا ان سے کوئی مناقشہ نہیں ہے، مزید یہ کہ تجویز مذکور (یعنی روایت بالمعنی کو جائز قرار دینا) اور اختلاف مسطور (یعنی روایت بالمعنی کے جواز کا اختلاف) صرف راوی کے اپنے شیخ سے حدیث نقل کرنے میں ہے، یہ یا تو مطلقاً ہے یا نسیان کی صورت میں ہے، معتمد یہی ہے۔جہاں تک بات ہے کسی کتاب مثلاً بخاری شریف وغیرہ سے حدیث نقل کرنے کی، اور اس کی اسناد ان کی طرف کرنے کی یہ بیان کئے بغیر کہ یہ نقل بالمعنی ہے تو یہ بالاجماع جائز نہیں۔ واللہ اعلم۔

وَمَا اَشَارَ اِلَيْهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ مَنْ غَرِيْبٍ اَوْ ضَعِيْفٍ اَوْ غَيْرِهِمَا بَيَّنْتُ وَجْهَهٗ غَالِبًا وَمَا لَمْ يُشِرْ اِلَيْهِ مِمَّا فِي الْاُصُوْلِ فَقَدْ قَفَيْتُهٗ فِيْ تَرْكِهٖ اِلَّا فِيْ مَوَاضِعَ لِغَرْضٍ۔

"اور جن احادیث پر شیخ (محی السنہ) نے ضعیف یا غریب یا ان دونوں کے علاوہ (صراحۃ یا کنایۃ) کوئی حکم لگایا ہے میں نے ان کا سبب بیان کر دیا ہے اور جن احادیث واصولی امور کی جانب شیخ نے کوئی اشارہ نہیں کیا تو میں نے بھی شیخ کی پیروی کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا ہے مگر بعض مقامات پر مجبوری کی بنا پر میں نے توضیح کر دی ہے"۔

قوله: وما اشار اليه رضى الله عنه من غريب او ضعيف او غيرهما، بينت وجهه غالبا:

رضى الله عنه: جملہ دعائیہ معترضہ ہے مبیّن اور بیان کے درمیان واقع ہوا ہے، بیان "من غریب۔۔" ہے۔

"غریب": (موصوف محذوف کی صفت ہے۔) ای حدیث غریب۔غریب وہ حدیث ہے جس میں راوی باقی تمام راویوں سے الگ ہو اور راوی سے اس کے روایت کرنے میں کوئی بھی اس کے ساتھ شریک نہ ہو۔

"ضعیف": ضعیف حدیث وہ ہے جس میں صحیح اور حسن کی صفات جمع نہ ہوں اس طور پر کہ اس کے کسی ایک راوی میں قدح یا تہمت ہو۔

او غیرھما: یہ فرمانا اعتباری طور پر ہے نہ کہ حقیقی طور پر، اس لئے کہ صحیح اور حسن کے علاوہ (احادیث) ضعیف کی انواع کے تحت داخل ہیں اور ان دونوں کے علاوہ سے مراد منکر وشاذ ہیں۔

منکر وہ حدیث ہے جس کو کسی قطعی (حدیث) نے رد کر دیا ہو یا جس کو ضعیف نے ثقہ کے مخالف روایت کیا ہو۔

شاذ وہ حدیث ہے جس میں ثقہ اپنے سے زیادہ ثقہ راوی کی مخالفت کرے۔
معلل وہ حدیث ہے جس میں کوئی ایسی خفیہ، غامضہ، قادحہ علت ہو جس تک بہت ماہر ہی پہنچ سکتا ہو۔
جاننا چاہیئے حدیث کی انواع کی معرفت، ان کی حدود کا بیان اور اس سے متعلقہ قیود میں بہت لمبے کلام کی ضرورت ہے یہ ان سب کو بیان کرنے کی جگہ نہیں ہے میں نے اسکو شرح نخبہ میں بیان کیا ہے جس کے ذکر سے مبتدی مستفید ہوتا ہے اور منتہی اس کے تذکرہ سے مستغنی نہیں۔

عرض مرتب: اس سلسلہ کا بقدر کفایت کلام ماقبل میں ''مصطلحات حدیث'' کے تحت گذر چکا ہے۔ اھ۔

بنیت وجهه غالبا: یعنی میں نے اس کے غریب ہونے یا ضعیف ہونے یا منکر ہونے کی وجہ اکثر جگہ بیان کر دی ہے۔ اور ممکن ہے کہ بعض جگہوں میں اس کی وضاحت علم نہ ہونے، یا اس میں اختلاف ہونے، یا اس کے علاوہ کسی وجہ سے چھوٹ گئی ہو۔

سید جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: اس عبارت سے فوری طور پر جو چیز سمجھ آتی ہے وہ یہ ہے کہ مصابیح کی احادیث حسان جس کو مشکاۃ میں فصل ثانی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہر وہ حدیث ہے جس کے بارے میں شیخ نے ذکر کیا ہے کہ یہ غریب ہے یا ضعیف ہے یا منکر ہے، مصنف نے اس کی وجہ بیان کی ہے، کہ یہ راوی اس میں متفرد ہے یا غیر ثقہ ہے، یا اپنے سے زیادہ ثقہ کے مخالف ہے۔

حالانکہ انہوں نے یہ نہیں کہا بلکہ ہر وہ حدیث جس کے بارے میں محیی السنہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ (حدیث) ضعیف ہے یا غریب ہے مصنف نے اس کے قائل کا ذکر کیا ہے اور اس کو متعین کیا ہے، اور ارباب اصول میں سے وہ (قائل) اکثر امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ ہوتے ہیں۔ اس بابت زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کبھی حدیث کی وجہ غرابت اور بیان ضعف کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔ اور مصنف کا یہ طرز اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انہوں نے محیی السنہ کو اس بات کا اہل نہیں قرار دیا کہ وہ حدیث پر ضعف اور صحت کا حکم لگائیں تو یقیناً اس کی نسبت اس کی طرف ہوگی جس میں اس کی اہلیت ہے۔ انتہی۔

پس اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے اس کی وجہ بیان کی ہے، اس پر لگنے والے حکم کی نسبت اس کے ان اہل افراد کی طرف کی ہے جن سے اس بارے میں رجوع کیا جاتا ہے۔ اس میں احتمال ہے کہ یہ شیخ کی تقویت کیلئے ہو نہ کہ ان سے سلب اہلیت کے لئے، پس دو علم، ایک علم سے بہتر ہیں۔ بلکہ اس میں مصنف کی کسر نفسی ہے کہ ان میں اس کی اہلیت ہے۔

قوله: وما لم يشر اليه مما في الأصول، فقد قفيته في تركه، الا في مواضع لغرض:

یعنی مصابیح کی کئی ایسی احادیث جو کتب اصول جامع ترمذی میں اور سنن ابی داؤد اور بیہقی سے لی گئی ہیں اور وہ منقطع، موقوف اور مرسل ہیں ان (کی اسنادی حیثیت) کے بارے میں صاحب مصابیح نے کوئی اشارہ نہیں کیا تو ان کی اتباع کرتے ہوئے میں نے بھی (ایسی روایات کے بارے میں) کوئی اشارہ نہیں کیا۔

فقد قفيته: تشدید کے ساتھ یعنی اس کی پیروی کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا۔ (كذا قاله الطيبي وتبعه ابن حجر)

میرک شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب کے حاشیہ میں لکھا ہے: قفوته ''واؤ'' کے ساتھ ہے۔اوراس پر''ظ'' لکھا ہے۔اس کی طرف اشارہ کرنے کیلئے کہ یہ ظاہر ہے۔ ان کے چچا سید جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ نے مشکاۃ کی شرح کے شروع میں لکھا ہے کہ ہمارے اصل سماع، اورموجودہ تمام معتمد نسخوں میں اس کو ھاء کی تشدید کے ساتھ صحیح لکھا ہے۔یہ'' التقفية'' سے مشتق ہے۔کلام عرب میں یہ ''علیٰ'' اور''باء'' کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے:﴿ وقفينا على آثارهم بعيسى بن مريم﴾

علاوہ ازیں ''من'' اور''باء'' کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وقفينا من بعده بالرسل﴾ اور یہاں اس کا معنیٰ ''علی تتبع'' ہے،لہذا مناسب ہے کہ فاء کی تخفیف اورواؤ کے ساتھ'' القفو '' سے ہو۔اھ۔

مناقشہ کا حاصل یہ ہے کہ تشدید کے ساتھ دومفعولوں کی طرف متعدی ہے۔یہ اس کے مذکورہ دو استعمالات میں سے ایک استعمال ہے۔تخفیف اور باء کے ساتھ (کلام عرب میں)وارد نہیں ہوا ہے۔ان دونوں کا جواب دیا گیا ہے۔

چنانچہ'' مختصر النهاية ''میں مذکور ہے: ''قفيته و اقفيته'' اى تبعته۔یعنی میں نے اس کی پیروی واقتداء کی۔

قاموس میں ہے: قفوته اى تبعته(میں نے اس کی پیروی کی) جیسے: تقفيته و اقتفيته و قفيته زيدًا أى أتبعته اياه الخ

آیاتِ قرآنیہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ''قفى''تشدید کے ساتھ بذاتِ خود ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے اور باء کے ساتھ دو کی طرف متعدی ہوتا ہے۔اسی وجہ سے قاضی بیضاوی نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وقفينا من بعده بالرسل﴾ (ہم نے انکے پیچھے رسولوں کو بھیجا) کے بارے میں کہا ہے: يعنى ارسلنا على اثره الرسل جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ثم ارسلنا رسلنا تترى﴾۔ کہا جاتا ہے: قفاه اذا اتبعه ،اور قفاه به اذا اتبعه من القفا جیسے ذنبه من الذنب ۔اھ۔

اس بات کو تسلیم کرنے کی صورت میں معاملہ آسان ہے کہ وہ بذات خود دومفعولوں کی طرف متعدی ہے۔اس صورت میں معنی یہ ہوگا: أتبعت نفسى اياه (میں نے خود اسکی پیروی کی)۔

في تركه:اس اضافت میں دواحتمال ہیں:

الف)مصدر کی اضافت اس کے فاعل کی طرف ہو۔اى فى ترك الشيخ الحكم على الحديث بشيء ۔(یعنی میں نے بھی شیخ کی پیروی کی ،کہ شیخ نے حدیث پر کوئی حکم نہیں لگایا تو میں نے بھی ایسا ہی کیا کہ حدیث پر میں نے بھی کوئی حکم نہیں لگایا۔)

ب)مصدر کی اضافت اپنے مفعول کی طرف ہو۔اى فى ترك المشار اليه بالموافقة معه فى السكوت عليه۔ (یعنی شیخ کی موافقت کرتے ہوئے میں نے بھی سکوت اختیار کیا۔)

الا فى مواضع لغرض :یعنی چند جگہ کسی خاص غرض کی وجہ سے میں نے ان کو بیان کیا ہے۔

فاضل طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وہ غرض یہ ہے کہ بعض طعن کرنے والوں نے احادیث کو مصابیح سے جدا لکھا اوراس کو موضوع قرار دے دیا، حالانکہ میں نے دیکھا کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو صحیح کہا ہے یا حسن کہا ہے اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے

علاوہ نے بھی اس کو اسی طرح (صحیح یا حسن) قرار دیا ہے۔ چنانچہ میں نے دفع تہمت کے لئے اس کو بیان کیا۔ جیسے حضرت ابو ہریرہ کی یہ حدیث ہے:

"المرء علی دین خلیله" (بعض) محدثین نے اسکے موضوع ہونے کی صراحت کی ہے، جب کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جامع میں کہا کہ یہ حسن ہے اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے "الریاض" میں کہا کہ یہ صحیح الاسناد ہے۔

ایک غرض یہ بھی ہے کہ شیخ نے خطبہ میں شرط لگائی ہے کہ میں منکر (حدیث) کے ذکر کرنے سے اعراض کروں گا، حالانکہ وہ اپنی کتاب میں بہت سی (منکر حدیث) لائے ہیں۔ ان میں سے بعض کا منکر ہونا بیان کیا اور بعض کا منکر ہونا بیان نہیں کیا۔ پس میں نے (ایسی احادیث کے بارے میں) بیان کر دیا کہ یہ (حدیث) منکر ہے۔

سید جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: صاحب مصابیح کی طرف سے جواب یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ یہاں "منکر احادیث" سے ان کی مراد وہ احادیث ہیں جن کا منکر ہونا مجمع علیہ ہے اور جو منکر احادیث وہ (اپنی کتاب میں) لائے ہیں وہ مختلف فیہ کی قسم سے ہیں اور بعض کے منکر ہونے پر خود تصریح فرما دی تا کہ ان کے ذہول پر حمل نہ کیا جائے اور بعض کے بیان سے اعراض کیا ہے اس لئے کہ اسکے منکر ہونے کا حکم انکے نزدیک معتبر نہیں تھا۔

وَرُبَمَا تَجِدُ مَوَاضِعَ مُهْمَلَةً وَ ذٰلِكَ حَيْثُ لَمْ اَطَّلِعْ عَلٰى رَاوِيْهِ فَتَرَكْتُ الْبَيَاضَ فَاِنْ عَثَرْتَ عَلَيْهِ فَاَلْحِقْهُ بِهٖ اَحْسَنَ اللّٰهُ جَزَآءَكَ۔

"اور (اے مشکوٰۃ دیکھنے والے تجھے) کچھ ایسے مقام بھی ملیں گے کہ وہاں حدیث کے بعد میں نے کتاب کا حوالہ نہیں دیا) اور یہ (اہمال وعدم بیان) اس وجہ سے ہوا ہے کہ میں اس (حدیث) کے راوی (یعنی صاحب تخریج) کے نام سے واقف نہیں ہو سکا چنانچہ میں نے (اس کی نشاندہی کیلئے حدیث کے بعد) خالی جگہ چھوڑ دی ہے، پس (اے مشکوٰۃ دیکھنے والے) اگر تمہیں (اس حدیث کے) راوی (یعنی صاحب تخریج) کے نام کا علم ہو تو اس جگہ اس (صاحب تخریج) کا حوالہ دے دینا اللہ تعالیٰ تمہیں (اس عمل پر) جزائے خیر عطا فرمائے۔"

قوله: وربما تجد مواضع مهملة......فالحقه به:

"ربما": تشدید کے ساتھ زیادہ مشہور ہے۔ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ تقلیل کے لئے ہے اور "ما" کافہ ہے۔

فالحقه به: حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "اس کو بیاض میں لکھ دیں۔" اس تعبیر میں مسامحت مخفی نہیں ہے۔ بعض علماء نے مواضع مہملہ کو کتاب کے حاشیہ میں بیان کیا ہے اور مصنف کی اصل میں بیاض کو برقرار رکھا ہے تا کہ اس بات پر دلالت رہے کہ یہ وضاحت مؤلف کے علاوہ کسی فرد نے کی ہے۔

قوله: احسن الله جزاء ك: "جزاء" الف ممدودہ کے ساتھ، بمعنی "ثواب" ہے۔

اس جملہ میں اشارہ ہے اس حدیث کی طرف جو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً منقول ہے:

"من صنع اليه معروف فقال لفاعله: جزاك الله خيرا فقد ابلغ في الثناء۔"

"جس کے ساتھ بھلائی کی گئی، اس نے بھلائی کرنے والے سے کہے جزاک اللہ خیرا (اللہ تجھے بہتر بدلہ دے) تو تحقیق

اس نے بھرپور تعریف کردی۔"

اس حدیث کو امام ترمذی، امام نسائی اور امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہم نے روایت کیا ہے۔

وَسَمَّيْتُ الْكِتٰبَ بِمِشْكٰوةِ الْمَصَابِيْحِ

"اور اس کتاب کا نام میں نے مشکوٰۃ المصابیح رکھا ہے"۔

☆**تشریح**: مصابیح "مصباح" کی جمع ہے جس کے معنی "چراغ" کے ہیں اور مشکوٰۃ کا معنی "طاقچہ" ہے۔ جس طرح طاقچہ میں چراغ رکھا جاتا ہے اسی طرح کتاب مصابیح 'مشکوٰۃ میں رکھی ہوئی ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اسم اور معنی کے درمیان مناسبت کی رعایت کی گئی ہے اس لئے کہ مشکاۃ (طاق) میں روشنی جمع ہوتی ہے چنانچہ طاق میں روشنی زیادہ قوی ہوتی ہے بخلاف کھلی جگہ کے، احادیث راویوں کی سمت سے غفلت میں تھیں تو وہ منتشر تھیں اور جب ان کو راوی کے ساتھ مقید کردیا تو وہ منضبط ہوگئیں اور اپنی جگہ میں قرار پکڑ لیا۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی اتباع کی ہے۔

میرک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مطابقت کی زیادہ واضح صورت یہ ہے کہ انکی کتاب مشکوٰۃ، "مصابیح" کی احادیث پر محیط و مشتمل ہے جس طرح کہ مشکاۃ مصباح پر محیط و مشتمل ہے۔ الخ۔

اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ مصابیح سے ان کی مراد وہ احادیث ہوں جو ان کی کتاب میں مصابیح اور دیگر کتب سے آئی ہیں، کہ ان کو مصباح کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ ان کے ساتھ تشبیہ اس لئے دی گئی ہے کہ یہ نورانی آیات اور برہانی دلالتیں ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک کے طاق سے صادر ہوئی ہیں، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے علماء اور اولیاء، گمراہی کے میدان اور جہالت کے صحراء میں ان (آیات ودلالات) کی اقتداء کریں اور اس معنی میں یہ (حدیث) آئی ہے: **"اصحابی کالنجوم بایهم اقتدیتم اهتدیتم"**

"میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کی بھی اقتداء کروگے راہ یاب ہو جاؤ گے۔"

ان کی کتاب کو اس لئے تشبیہ دی کہ یہ ان (احادیث) کو جامع ہے اور ان کے مشکاۃ میں متفرق ہونے سے مانع ہے، یہ بغیر کھڑکی کا طاق ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس میں توریہ کے معنی ہوں۔ توریہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا کلمہ لایا جائے جس کے دو معنی ہوں، ان میں سے ایک معنی قریب اور دوسرا معنی بعید ہو، اور مراد معنی بعید ہو۔

وَاَسْاَلُ اللّٰهَ التَّوْفِيْقَ وَالْاِعَانَةَ وَالْهِدَايَةَ وَالصِّيَانَةَ وَتَيْسِيْرَ مَا اَقْصِدُهٗ

"میں اللہ تعالیٰ سے توفیق، مدد، ہدایت، حفاظت اور اپنے مقصود کی آسانی کے لئے دعا کرتا ہوں"۔

قوله: واسال الله التوفيق والاعانة ...... ونعم الوكيل:

"التوفیق": اس کا مطلب ہے امور مرید کو مراد کے موافق بنانا۔

علماء کے عرف میں اس کا مطلب ہے طاعت اور عبادت میں بندہ کیلئے قدرت پیدا کرنا۔

والاعانة دین، دنیا اور آخرت کے امور اور اپنے مقصود میں اس کی مدد کا طالب ہوں۔

والهداية: یعنی میں نے جس کام کا ارادہ کیا ہے تو اس کی بابت میری راہنمائی فرما، دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ہدایت پر ثابت قدمی عطا فرما۔ ''من البدايه الى الهداية'' والا مفہوم مراد ہے۔

اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے خطا وقصور سے حفاظت اور مشکلات کی آسانیوں کے لئے دعا کرتا ہوں''۔

والصيانة: یعنی عقائد دنیہ اور احوال ردیہ سے میری حفاظت فرما، یا مراد یہ ہے کہ بیہودہ گفتگو اور لغزش سے مجھے محفوظ فرما۔ اور تیسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اے اللہ ان موانع اور علل سے مجھے بچا جو کتاب کو پورا کرنے سے روکتے ہیں۔

''اقصده'': صاد کے کسرہ کے ساتھ، یعنی میں اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہوں کہ میں نے جس تحریر، تفتیش اور تنقیر کا ارادہ کیا ہے وہ اس کو آسان فرمادے۔

وَاَنْ يَّنْفَعَنِيْ فِي الْحَيٰوةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ وَجَمِيْعِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ وَلَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ۔

''اور دعا کرتا ہوں کہ (اللہ تعالیٰ اس کتاب اور دیگر کتب سے) اس زندگی میں اور مرنے کے بعد مجھے بھی اور ہر مسلمان مرد عورت کو نفع پہنچائے اور وہی میرے لئے کافی اور بہتر کارساز ہے اور (اللہ کی معصیت سے بچنے کی) طاقت اور (اس کی طاعت کی) قوت اللہ ہی کی مدد ومعونت سے ہے جو تمام امور پر غالب اور حکمت والا ہے۔

وأن ينفعني: ایک نسخہ میں ''بہ'' کا اضافہ ہے۔ زندگی میں نفع تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب سے علمی، عملی اور تعلیمی اعتبار سے نفع پہنچائے۔

اور یہ بھی درست ہے کہ ''ینفع'' کی ضمیر مجازی طور پر ''کتاب'' کی طرف راجع ہو۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ کتاب دنیا میں مجھے براہ راست نفع پہنچائے اور میرے مرنے کے بعد مجھے بطور سبب کے نفع پہنچائے۔

اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے زندگی میں اس کتاب سے طور پر نفع دے کہ اس کو میرے اعمال میں زیادت کا اور بلند احوال کی طرف ترقی کا باعث بنادے، اور میری موت کے بعد اعلیٰ درجات تک وصول اور اعلیٰ مقامات کے حصول کا ذریعہ بنادے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ اس کتاب کی برکت سے مغفرت وبخشش اور جنت کی نعمتوں سے نوازے اور اپنی بے پایاں رحمت کے دروازے کھول دے۔)

''جميع المسلمين والمسلمات'': اس کا عطف ''ینفعنی'' کی ضمیر منصوب ہے۔

اس پورے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی قرأت سے، اس کی کتابت سے، اس کے واقف سے، شہروں کی طرف منتقل ہونے سے اور اس جیسے دیگر امور کے ذریعہ نفع دے۔

''حسبي الله'': ایک نسخہ میں واؤ عطف کے ساتھ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے میرے تمام امور میں کافی ہے۔

''ونعم الوكيل'': (یہاں فعیل بمعنیٰ مفعول ہے) اى الموكول اليه۔

''وکیل'' کا معنی ہے وہ ذات کہ (معاملہ) جس کے سپرد کیا جاتا ہو اور اس پر اعتماد کیا جاتا ہو۔

یہاں مخصوص بالمدح محذوف ہے اور وہ ''ھو'' ہے۔

''**العزیز**'': اپنے ارادے پر غالب ذات یا وہ بدیع (ذات) جس کا کوئی مثل نہیں۔

''**الحكیم**'': وہ صاحب حکم وحکمت جس کا ہر کام اتقان واحکام کے ساتھ متصف ہو۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا: ان دونوں اسموں (العزیز ، الحکیم) کو ذکر کیا اس لئے کہ (حدیث میں) اس کلمہ کے اختتام پر یہی یہ دو اسماء آئے ہیں نہ کہ ''**العلی الغظیم**'' جیسا کہ مشہور ہے اس پر بناء کرتے ہوئے کہ حافظ جزری رحمہ اللہ کی حصن حصین کے بعض نسخوں کی روایت میں آخر میں ''العلی العظیم'' کے الفاظ آئے ہیں، ممکن ہے کہ وہ کوئی اور روایت ہو......

جاننا چاہیئے کہ صحیح روایت میں ''العزیز الحکیم'' ہے بمطابق اس روایت کے جو مسلم میں ہے جیسا کہ صاحب مصابیح رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے اور صاحب مشکاۃ رحمہ اللہ نے ان کی اتباع کی ہے اور اسی طرح حصن حصین کے اصل (نسخ) میں ہے، اور اس کے حاشیہ میں ''العلی العظیم'' لکھا ہوا ہے اور اس کی نسبت بزار کی طرف کی ہے، واللہ اعلم۔

ائمہ کی ایک جماعت کی تصریح کے بموجب ہر مصنف کو چاہیئے کہ وہ اپنی کتاب کا آغاز اس حدیث سے کرے جو آگے آرہی ہے جس کو ''**طلیعة کتب الحدیث**'' کہا جاتا ہے، یہ حدیث ہر عالم ومتعلم کو تصحیح نیت واخلاص پر متنبہ کرتی ہے۔ اور یہ وہ اساس ہے جس پر عقائد واعمال کے جمیع احوال کی بناء ہے۔ واجبات میں سے سب سے پہلا واجب مقصد کا قصد ہے جو اللہ جل شانہ کی ذات تک پہنچانے والا ہے، پس قصد سابق ہے اور اور باقی امور لاحق ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب حدیث، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کرنے والے شخص کی مانند ہے، پس اس کو چاہیئے کہ وہ اخلاص کی رعایت رکھے، تاکہ مقام اختصاص تک پہنچ سکے۔ مصنف رحمہ اللہ کا بسم اللہ سے آغاز فرمانا امام بخاری رحمہ اللہ کی اتباع میں نہیں بلکہ امام بغوی رحمہ اللہ کی اتباع میں ہے، جیسا کہ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے۔

تمام کاموں کا دارومدار نیتوں پر ہے

۱: عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِامْرِءٍ مَا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوِ امْرَاَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری ۱/۱۳۵حدیث من غیر لفظ انما ۔ ومسلم فی صحیحه ۳/۱۵۱۵حدیث ۱۹۰۷وابوداود فی سننه ۲/۶۵۱ رقم ۲۲۰۱۔ والنسائی فی سننه ۱/۸۵حدیث ۷۵ بالافراد والترمذی ۴/۱۵۴حدیث ۱۶۴۷ وابن ماجة ۲/۱۴۱۳ حدیث ۴۲۲۷۔واحمد فی مسنده ۔ ۱/۲۵

ترجمه: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمام کاموں کا دارومدار نیتوں پر ہے۔لہٰذا جس شخص نے خالص اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہجرت کی۔تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ہی کے لئے ہوگی۔اور جس شخص نے دنیا حاصل کرنے کے لئے یا کسی خاتون سے شادی کرنے کے لئے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لئے ہوگی۔جس کا ارادہ کر کے اس نے ہجرت کی ہے۔(متفق علیہ)

راویٔ حدیث:

عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔یہ امیر المؤمنین عمر بن الخطاب فاروق ہیں۔ان کی کنیت ''ابو حفص'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز کردہ ہے۔حفص کے لغوی معنی ''شیر'' ہیں۔عدوی قریشی ہیں۔کعب بن لوی میں پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سلسلہ نسب ایک ہو جاتا ہے۔نبوت کے چھٹے سال میں اسلام لائے اور بعض نے کہا کہ پانچویں میں اس سے پہلے چالیس مرد اور گیارہ

عورتیں اسلام لا چکی تھیں اور کہا جاتا ہے کہ چالیسویں مرد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی تھے ان کے اسلام قبول کرنے کے دن سے ہی اسلام نمایاں ہونا شروع ہوا۔ اسی وجہ سے ان کا لقب فاروق ہو گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ تمہارا لقب فاروق کیوں رکھا گیا۔ فرمایا کہ حضرت حمزہ میرے اسلام سے تین دن قبل اسلام لا چکے تھے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے میرے سینہ کو اسلام کے لیے کھول دیا تو میں نے کہا: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى [طٰهٰ: ۸] (اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اسی کے لیے سب اچھے نام ہیں) اس کے بعد کوئی جان مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان سے پیاری نہ تھی۔ اس کے بعد میں نے دریافت کیا کہ رسول اللہ کہاں تشریف فرما ہیں تو میری ہمشیرہ نے مجھ کو بتلایا کہ وہ دار ارقم بن ابی ارقم میں جو کوہ صفا کے پاس ہے تشریف رکھتے ہیں۔ ارقم کے مکان پر حاضر ہوا جب کہ حضرت حمزہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے ساتھ مکان میں موجود تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی گھر میں تشریف فرما تھے میں نے دروازہ کو پیٹا تو لوگوں نے نکلنا چاہا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم کو کیا ہو گیا؟ سب نے کہا کہ عمر بن الخطاب ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور مجھے کپڑوں سے پکڑ لیا پھر خوب زور سے مجھ کو اپنی طرف کھینچا کہ میں رک نہ سکا اور گھٹنے کے بل گر گیا اس کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عمر رضی اللہ عنہ اس کفر سے کب تک باز نہیں آؤ گے تو بے ساختہ میری زبان سے نکلا: **اشهد ان لا اله الله وحده لا شرك له واشهد ان محمدا عبده ورسوله**۔ اس پر تمام دار ارقم کے لوگوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ جس کی آواز مسجد والوں نے بھی سنی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں اس کے بعد میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم اپنی موت وحیات میں دین حق پر نہیں ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیوں نہیں اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم سب حق پر ہو اپنی موت میں بھی اور حیات میں بھی۔ اس پر میں نے عرض کیا تو پھر اس حق کو چھپانے کا کیا مطلب قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے ہم ضرور حق کو لے کر نکلیں گے۔ چنانچہ ہم نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دو صفوں کے درمیان میں نکالا ایک صف میں حضرت حمزہ تھے اور دوسری صف میں میں (یعنی حضرت عمر) اور میرے اندر جوش کی وجہ سے چکی کی سی گھڑ گھڑاہٹ تھی۔ یہاں تک کہ ہم مسجد حرام میں پہنچ گئے تو مجھ کو اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قریش نے دیکھا یہ دیکھ کر ان کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ ایسا صدمہ انہیں اس سے پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔ اس دن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام فاروق رکھا کہ اللہ نے میری وجہ سے حق اور باطل میں فرق کر دیا۔

داؤد بن حصین اور زہری نے روایت کیا کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لے آئے تو حضرت جبرئیل امین تشریف لائے اور فرمایا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! تمام آسمان والے عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام سے بہت خوش ہوئے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قسم خدا کی میں یقین رکھتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا علم والا پلہ جھک جائے گا اور فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دس میں سے نو حصے علم کے اپنے ساتھ لے گئے' اور ایک حصہ باقی رہ گیا۔ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام غزوات میں شریک ہوئے اور یہ پہلے خلیفہ ہیں جو امیر المؤمنین کے لقب کے ساتھ پکارے گئے۔

حلیہ مبارک:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ گورے رنگ کے تھے۔ جس میں سرخی غالب تھی اور بعض نے گندم گوں کہا ہے۔ لانبے قد کے تھے۔ سر

کے بال اکثر گر گئے تھے۔آنکھیں نہایت سرخ رہتی تھیں۔

وفات:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد تمام امور انتظامیہ کو (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وصیت اور ان کے متعین فرمانے کی وجہ سے) کامل طور سے انجام دیا۔اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ کے غلام ابولوءلوء نے مدینہ میں بدھ کے دن ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ میں آپ کو خنجر سے زخمی کیا۔اور پہلی تاریخ محرم الحرام کو اتوار کے دن ۲۴ھ میں (تین دن بیمار رہ کر) دفن کئے گئے۔ان کی عمر تریسٹھ سال کی ہوئی اور یہ ان کی عمر کے بارے میں سب سے زیادہ صحیح قول ہے۔ان کی مدت خلافت دس سال چھ ماہ ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نماز حضرت صہیب رضی اللہ عنہ رومی نے پڑھائی۔ان سے حضرت ابوبکر اور باقی عشرۂ مبشرہ رضی اللہ عنہم اور ایک بڑی جماعت صحابہ اور تابعین کی روایت کرتی ہے۔

الحمد للّٰہ' نحمده و نستعینه و نستغفره ونعوذ باللّٰه من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یهده اللّٰه فلا مضل له ومن یضلله فلا هادی له واشهد ان لا اله الا اللّٰه شهادة تکون للنجاة وسیلة ولرفع الدرجات کفیلة واشهد ان محمدا عبده و رسوله الذی بعثه وطرق حال الایمان قد عفت آثارها و خبت انوارها ووهنت ارکانها وجهل مکانها فشید صلوات اللّٰه و سلامه علیه من معالمها ما عفی وشفی من العلیل فی تائید کلمة التوحید من کان علی شفا و اوضح سبیل الهدایة لمن اراد ان یسلکها واظهر کنوز السعادة لمن قصد ان یملکها اما بعد فان التمسك بهدیه لا یستتب الا بالاقتضاء لما صدر من مشکاته والاعتصام بحبل اللّٰه لا یتم الا ببیان کشفه وکان "کتاب المصابیح" الذی صنفه الامام محی السنة' قامع البدعة' ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی' رفع اللّٰه درجته اجمع کتاب صنفه فی باب واضبط لشوارد الاحادیث و اوابدها ولما سلك رضی اللّٰه بطریق اختصار وحذف الاسانید تکلم فیه بعض النقاد وان کان نقله وانه من الثقات۔ کالاسناد لکن لیس ما فیه اعلام کالاغفال فاستخرت اللّٰه تعالٰی واستوفقت منه فاوردت کل حدیث منه فی مقرمنه فاعلمت ما اغفله کما رواه الائمة المتقنون و الثقات الراسخون مثل ابی عبداللّٰه محمد بن اسماعیل البخاری۔وابی الحسین مسلم بن الحجاج القشیری وابی عبداللّٰه مالك بن انس الاصبحی وابی عبداللّٰه محمد بن ادریس الشافعی وابی عبداللّٰه احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی۔

"سب تعریف اللہ کے لئے ہم اس کی تعریف کرتے ہیں اور اس سے مدد چاہتے ہیں اور اس سے بخشش چاہتے ہیں ہم پناہ مانگتے ہیں اس سے اپنے نفس کی شرارتوں سے اور اپنے برے اعمال سے جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت کرے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جس کو وہ گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں

ایسی گواہی جو نجات کا وسیلہ اور بلندیٔ درجات کی ضامن ہو اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں ایسے رسول کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسے وقت میں بھیجا کہ ایمان کے راستوں کے آثار مٹ گئے تھے ان کی روشنی بجھ گئی تھی اور اس کے رکن کمزور اور سست ہو گئے تھے۔ اور ان کا مکان نا معلوم ہو چکا تھا۔ نبی ﷺ نے جو نشان مٹ گئے تھے ان کو مضبوط کیا اور کلمہ توحید کی تائید میں ایسے بیمار کو شفا بخشی جو ہلاکت کے کنارے پر تھا اور راہِ ہدایت واضح کی اس شخص کے لئے جو اس پر چلنا چاہتا ہے اور نیک بختی کے خزانے ظاہر کر دیئے اس کے لئے جو ان کا مالک بننا چاہتا ہے حمد وصلوٰۃ کے بعد تحقیق پیغمبر خدا کے طریق کو اختیار کرنا درست نہیں ہوتا ہے مگر اس چیز کی پیروی کرنے سے جو سینہ مبارک حضرت محمد ﷺ سے ظاہر ہوئی ہے۔ اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا پورا نہیں ہوتا مگر آپ کے خوب کھول کر بیان کر دینے سے اور کتاب مصابیح جسے امام (نے تصنیف کیا ہے) محی السنۃ (سنت کے زندہ کرنے والے) قامع البدعہ (بدعت کو ختم کرنے والے) ابو محمد حسین بن مسعود فراء بغوی نے تصنیف کیا (اللہ ان کے درجات بلند فرمائے) جامع ترین کتاب تھی جو اپنے باب میں تصنیف کی گئی اور متفرق اور منتشر احادیث کو خوب قریب کرنے والی تھی اور جب وہ چلے (اللہ ان سے راضی ہوں) اختصار کے طریقے پر اور اسانید حذف کر دیں تو بعض ناقدین نے اس میں کلام کیا اگرچہ ان کا نقل کر دینا ہی (اور بے شک وہ ثقات میں سے ہے) سند کی طرح ہے لیکن نشان والی معلوم چیز بے نشان مجہول کی طرح نہیں ہو سکتی۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا اور اس سے توفیق طلب کی اور ہر حدیث کو اس کے ٹھکانے پر رکھ دیا اور ہر بے نشان پر نشان لگا دیا جیسا کہ اس کو روایت کیا ائمہ ہدیٰ اور ثقہ و محکم محدثین نے جیسا ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری اور ابو الحسین مسلم بن حجاج قشیری اور ابو عبداللہ مالک بن انس اصبحی اور ابو عبداللہ محمد بن ادریس شافعی اور ابو عبداللہ بن محمد بن حنبل شیبانی"۔

اکثر محدثین کا یہ قاعدہ رہا ہے کہ وہ اپنی کتاب کی گزشتہ حدیث سے ابتداء کرتے ہیں جس کا نام "طلیعہ کتب الحدیث" رکھا گیا ہے تاکہ ہر ایک عالم اور متعلّم کو نیت اور اخلاص کے درست کرنے پر تنبیہ ہو جائے اور یہ وہ اساس ہے کہ جس پر عقائد اور اعمال کے تمام احوال کی بنیاد ہے اور اس بات پر تنبیہ ہو جائے کہ پہلا واجب وہ اس نظر کا قصد کرنا ہے جو (اللہ) صمد کی معرفت تک پہنچا دے لہٰذا قصد پہلے ہے اور بقیہ سب کچھ لاحق (بعد میں) ہے اور اگر حدیث نبی ﷺ کی طرف ہجرت کرنے کے حکم کا مطالبہ کرے تو اس پر لازم ہے کہ اخلاص کو مدِ نظر رکھے تاکہ مقام اختصاص (خاص ہونا) تک پہنچ جائے۔ مصنف نے اس کی ابتداء بغوی کی اقتداء میں کی نہ کہ بخاری کی اتباع میں جیسا کہ ابن حجرؒ نے یہی کہا۔

تشریح: قولہ: انما الاعمال بالنیات:

بعض نے کہا ہے کہ کلمہ "انما" بسیطہ ہے، اور بعض نے کہا کہ مرکبہ ہے۔ "ان" اور ما کافہ سے یا زائدہ ہے تاکید کے لیے ہے۔ اور بعض نے کہا کہ "اَن" اور "ما" نافیہ سے مرکب ہے، پس یہ اپنے دونوں رکنوں ایجاب اور نفی کے ساتھ حاصل ہے۔ حرف تحقیق سے چیز ثابت ہوتی ہے اور حرف نفی سے ماعدا کی نفی ہوتی ہے۔ اور اس پر جو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس سے ایک ہی چیز پر اجتماع ضدین لازم آتا ہے، اور یہ کہ "اَن" اور "ما" دونوں صدارت کلام کا تقاضا کرتے ہیں ان کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ سب کچھ تو ترکیب سے پہلے ہے اور بہرحال ترکیب کے بعد تو وہ مفرد علم بن گیا جو حصر کا فائدہ دیتا ہے اور اس کی تضاعیف

قصر کا فائدہ دیتی ہے اس لئے کہ یہ تو صرف حکم کی تاکید پر تاکید کے لیے ہی ہے۔ عربیت اور اصول والے اس بات پر متفق ہیں کہ یہ (انما) حصر کے لیے وضع کیا گیا ہے بخلاف اس کے جو اکثر نحویوں سے منقول ہے کیونکہ ھل قام عمرو؟ کے جواب میں انما قام زید کہنا درست، جس طرح کہ ما قام الا زید جواب دینا درست ہے۔ اور کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قول میں آیا ہے: ﴿أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾ [المائدۃ: ۹۲] ''یہ جان رکھو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صاف صاف پہنچا دینا ہے'' **وما علی الرسول الا البلاغ** اور جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ حصر کے لیے ہے تو مذکور ثابت ہو جائے گا اور غیر سے حکم کی نفی ہو جائیگی جیسے **انما قام زید ای لا عمرو** (بیشک صرف زید کھڑا ہے یعنی عمرو نہیں) یا حکم کے غیر کی مذکور سے (نفی ہو جائیگی) جیسے **انما زید قائم ای لا قاعد** (جز ایں نسیت کہ زید کھڑا ہے یعنی بیٹھا نہیں) اور جیسے حدیث (**انما الماء من الماء**، غسل منی سے ہے) اس پر دلالت کرتی ہے، پس وہ صحابہ جو اس قضیہ کو لینے والے ہیں تو جمہور ان سے معارضہ اس لیے نہیں کرتے کہ **انما** اس کا فائدہ نہیں دیتا وہ تو ان سے دوسرے دلائل کی وجہ سے معارضہ کرتے ہیں۔ جیسے حدیث: (**اذا التقی الختانان وجب الغسل**) (جب دو شرمگاہیں ملتی ہیں تو غسل واجب ہو جاتا ہے)۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس سے استدلال کیا ہے جس میں وہ اکیلے ہیں اور بعض نے کہا کہ جب حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے ان پر ''**انما الربا فی النسیئۃ**'' والی حدیث سے سخت انکار کیا تو انہوں نے رجوع کر لیا۔ اور صحابہ نے اس میں ان سے جھگڑا نہیں کیا بلکہ انہوں نے دوسرے دلائل کے ذریعے حکم میں ان سے معارضہ کیا تو یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ **انما** حصر کے لیے ہے لہٰذا التقدیری عبارت یہ ہوگی: **ان الاعمال تعتبر اذا کانت بنیۃ ولا تعتبر اذا کانت بلا نیۃ** (بے شک اعمال تب معتبر ہونگے جب نیت کے ساتھ ہو اور معتبر نہیں ہونگے جب بغیر نیت کے ہوں)۔ لہٰذا **انما** بمعنی ''ما'' اور ''الا'' ہوگا۔ اور بعض نے کہا حصر اس جمع سے حاصل ہوتا ہے، جس پر لام داخل ہے (یعنی الاعمال) یہ استغراق کا فائدہ دیتا ہے اور وہ حصر کو مستلزم ہے تو معنی یہ ہوگا: **لیست الاعمال حاصلۃ الا بالنیۃ** اور نفس اعمال کی یہاں نفی ممکن نہیں کیونکہ وہ حساً اور صورۃً ثابت ہیں بغیر نیت کو ان کے ساتھ ملائے ہوئے لہٰذا ایسی چیز کو مضمر ماننا ضروری ہے کہ جس کی طرف نفی متوجہ ہو اور جار اس کے متعلق ہو۔ بعض نے کہا وہ مقدر صحیحۃ یا تصح ہے جیسا کہ یہ امام شافعیؒ اور ان کے متبعین کی رائے ہے اور بعض نے کہا کہ کاملۃ یا تکمل ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کی رائے کے مطابق اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ مقدر معتبرۃ یا تعتبر ہوتا کہ سارے اعمال کو شامل ہو جائے چاہے وہ مستقل عبادات ہوں جیسے نماز اور زکوٰۃ کیونکہ ان کے صحیح ہونے کے لیے بالاجماع نیت معتبر ہے یا طاعات میں شرط ہو جیسے طہارت اور ستر کو ڈھانپنا کیونکہ بالاتفاق ثواب کے حصول کے لیے ان میں نیت معتبر ہوگی اس لئے کہ شروط صحیح ہونے میں نیت پر موقوف نہیں ہوتیں۔ امام شافعیؒ کا طہارت میں اختلاف ہے پس فرق کا بیان کرنا ان کے ذمہ ہے یا امور مباحہ ہوں تو یہ کبھی نیتوں کے ذریعے حسنات میں بدل جاتے ہیں جیسا کہ یہ بلا اختلاف سیئات میں بدل جاتے ہیں جو کچھ باب میں ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ صحت اور کمال کا متعلق خارج سے معلوم ہوتا ہے اور اس میں کچھ ممنوع نہیں اور جو ہم نے کہا اس پر دلالت کرتا ہے کہ الاعمال جمع ہے جس پر لام داخل ہے اس لئے یہ لفظ ہر ایک عمل کو شامل ہے چاہے وہ عبادات میں سے ہو یا ان کے علاوہ اور متروکات کو بھی شامل ہے۔ پس زنا اور غصب اور اس جیسی چیزوں کے چھوڑنے

میں کوئی ثواب نہیں مگر نیت کے ساتھ اگر چہ اس کے بغیر سب صحیح ہیں اور یہ اس کا مؤقف ہے جس نے کہا کہ مراد مکلفین کے اعمال ہیں اور ابن دقیق العید کا قول اس کی تائید کرتا ہے اور میرے نزدیک اس میں کوئی تردد نہیں کہ حدیث اقوال کو شامل ہے اور باء استعانت کے لیے ہے اور بعضوں نے کہا مصاحبت کے لیے ہے تا کہ اس سے مقارنت کا وجوب معلوم ہو لیکن یہ اپنے استصحاب کے وجوب کے ذریعے سے عمل کے آخر تک کی خبر دیتا ہے اس لئے کہ یہ معیت سے ظاہر ہے اور اس کا کوئی قائل نہیں۔ نیت عمل کے ساتھ ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ عمل سے قبل نیت درست نہ ہو اور یہ ضابطہ زکاۃ کی نیت سے ٹوٹ جائے گا اس لئے کہ زکاۃ کے مال کو الگ کرنے کے وقت نیت کرنا جائز ہے اور رات کو روزے کی نیت سے بھی یہ ضابطہ متاثر ہو گا اس لئے کہ یہ بلا اختلاف افضل ہے اور عبادات میں نیت کے اوقات مختلف ہیں اور اس کی تفصیل کا محل فقہی کتب ہیں۔ النیته یاء کی تشدید کے ساتھ اور کبھی تخفیف کے ساتھ لغت میں قصد ہے اور شریعت میں دل کا فعل کی طرف متوجہ کرنا ہے اللہ کی رضا کے چاہنے کے لیے اور اس کا قصد عبادت کو عادت سے جدا کرنے کے لیے ہے۔ بعض نے کہا کہ نیت دِل کے اعمال میں سے ایک عمل ہے تو وہ بھی نیت کا محتاج ہے تو اس سے تسلسل لازم آئے گا۔ اس کا جواب دیا گیا اس طور پر کہ اعمال سے مراد اعضاء کے اعمال ہیں عقلی دلیل اور صحیح حدیث کی دلیل سے کہ :"نية المومن خير من عمله" (مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے) اور اس دلیل سے کہ عرف میں نیت کرنے والے کے فعل پر عمل کا اطلاق نہیں ہوتا......

اور اس میں یہ بھی ہے کہ دِل کے تمام اعمال شرعاً نیت سے ہی معتبر ہوتے ہیں اور حدیث کا معنی یہ ہے کہ نیت کا عمل عضو کے عمل سے بہتر ہے کئی وجوہ سے ان کو حجۃ الاسلام (امام غزالیؒ) نے احیاء میں ذکر کیا ہے اور عرف کا کوئی اعتبار نہیں اس وجہ سے کہ یہ بدلتا رہتا ہے۔ جواب میں زیادہ ظاہر یہ ہے کہ نیت کا استثناء ہے اور اسی طرح دلالت عقلیہ کی وجہ سے اعتقادی امور۔ پھر یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ زبان کے ذریعے نیت دِل کی غفلت کے ساتھ معتبر نہیں اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا اور نہ تمہارے مالوں کو، لیکن وہ تمہارے دِلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے اور ایک روایت میں ہے' لیکن وہ تمہارے دِلوں اور تمہاری نیتوں کو دیکھتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی ظہر کے وقت میں دِل سے ظہر کی نیت کرتا ہے اور (منہ سے) عصر کی نیت کو بولتا ہے تو اس کا کوئی نقصان نہیں بخلاف اس کے برعکس۔ اور یہ ان کے قول کا معنی ہے کہ نیت زبان سے معتبر نہیں۔ انہوں نے نیت پر دلالت کرنے والے تلفظ میں اختلاف کیا ہے جبکہ اس پر ان سب کا اتفاق ہے کہ نیت میں جہر غیر مشروع ہے چاہے وہ امام ہو یا مقتدی ہو یا منفرد ہو اور اکثر اسی طرف گئے ہیں کہ ان دونوں کو جمع کرنا مستحب ہے تا کہ نیت کا معنی سمجھنا اور اس کا استحضار آسان ہو جائے۔ صاحب ہدایہ کے خیال میں دِل اور زبان دونوں سے نیت جمع کرنا بہتر ہے۔ جبکہ محقق امام ابن ہمام کے بقول بعض حفاظ نے کہا کہ حضور ﷺ سے نہ تو طریق صحیح ثابت ہے اور نہ بطریق ضعیف کہ آپ ﷺ نماز شروع کرتے وقت کہتے ہوں کہ میں اس طرح نماز پڑھتا ہوں اور نہ ہی صحابہ اور تابعین میں سے کسی سے ثابت ہے بلکہ یہ منقول ہے کہ آپ ﷺ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو تکبیر کہتے اور یہ بدعت ہے...... میں کہتا ہوں اصل نیت تو دل کی ہے تاہم دل میں اذکار و خیالات کا ہجوم ہوتا ہے ان کو مجتمع کرنے کے لئے اگر زبان سے بھی کہہ دیا تو مضائقہ نہیں پھر میں نے اس کو تجنیس میں دیکھا ہے' فرماتے ہیں اور نیت دِل کے ساتھ ہے اس لئے کہ دل کا عمل ہے اور تکلم اس میں معتبر نہیں اور جس نے اس کو اختیار کیا اس لئے

اختیار کیا ہے تاکہ اس کی عزیمت مجتمع ہو، الخ۔

اور بعض نے کہا کہ نیت کا تلفظ جائز نہیں یہ بدعت ہے اور متابعت جس طرح فعل میں ہوتی ہے اسی طرح ترک میں بھی ہوتی ہے اور جس نے ایسے فعل پر ہمیشگی کی جس کو شارع نے نہیں کیا تو وہ بدعتی ہے اور کبھی کہا جاتا ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ بدعت ہے لیکن بدعت حسنہ ہے اور مشائخ نے اس آدمی کے لیے کہ جس کو اس کی احتیاج ہو نیت کے متحضر کرنے پر استعانت کے لیے اسے مستحب قرار دیا ہے اور حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ دِلجمعی اور استحضار کے اس مقام پر تھے کہ وہ استحضار مذکور کے محتاج نہ تھے اور بعض نے کہا کہ تلفظ نماز کے صحیح ہونے کی شرط ہے لیکن علماء نے اس کو غلط اور خطاء اور اجماع کی مخالفت کی طرف منسوب کیا ہے۔ لیکن اس کا ہمارے نزدیک محمل ہے کہ یہ اس آدمی کے ساتھ مختص ہے جو وسوسے میں مبتلا ہو نیت کی تحصیل میں اور اس کو ادا کرنے سے عاجز ہو تو اس کے حق میں کہا گیا ہے کہ جب اس نے نیت کا تلفظ کیا تو شرط اس سے حرج کے دفع کرنے کے لیے ساقط ہو جائیگی۔ اور ابن حجر نے اسے عجیب خیال کیا ہے اور کہا کہ حضور ﷺ نے حج میں نیت کا تکلم کیا ہے اور ہم نے ساری عبادات کو اس پر قیاس کیا اور تمام وارد ہونے والی احادیث سے کچھ نہیں ملا اور یہ بھی وارد نہیں ہوا (کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہو) میں نے حج کی نیت کی اور حدیث میں صرف یہ آیا ہے، اے اللہ میں حج کا ارادہ کرتا ہوں، الخ۔ اور یہ دُعا اور خبر دینا ہے اور یہ نیت کے قائم مقام نہیں مگر انشاء بنانے کے ساتھ اور یہ موقوف ہے عقد پر اور انشاء کا قصد معلوم نہیں لہٰذا احتمال کے ساتھ استدلال صحیح نہیں اور صحت نہ ہونے کے ساتھ اس کو مقیس بنانا محال ہے پھر کہا کہ اس کا عدم ورود (نقل نہ کیا جانا) اس کے عدم وقوع پر دلالت نہیں کرتا، ہم نے کہا یہ مردود ہے اس طور پر کہ اصل عدم وقوع ہے یہاں تک کہ اس کے ورود کی دلیل نہ پائی جائے اور یہ بات ثابت ہے کہ حضور ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوئے پھر تکبیر کہی اگر وہ کچھ اور بولتے تو وہ (محدثین) اس کو نقل کرتے۔ اور نماز کو بگاڑنے والے کی حدیث میں وارد ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے اسے فرمایا **"اذا قمت الی الصلاۃ فکبر"** (جب تو نماز کے لئے کھڑے ہو تو تکبیر کہہ) تو یہ تلفظ کے نہ پائے جانے پر دلالت کرتی ہے۔ ابوداؤد نے ذکر کیا انہوں نے کہا میں نے بخاری سے کہا کیا آپ تکبیر سے پہلے کچھ کہتے ہیں انہوں نے کہا نہیں اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا اس کے قول سے ابن حجر کے بقیہ کلام کا فساد ظاہر ہو گیا اور یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ زیادہ کامل کو ہی کرتے تھے اور یہ بالاجماع اس کے ترک سے افضل ہے اور نقل ضروری حاصل ہے اس طور پر کہ آپ ﷺ نے پوری عمر افضل کے ترک پر ہمیشگی نہیں فرمائی۔ تو ثابت ہو گیا کہ آپ ﷺ وضوء اور نماز جیسی چیزوں میں نیت کو نطق کے ساتھ لاتے تھے اور یہ ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نے اس کو ترک کیا ہو اور شک یقین کے معارض نہیں ہوتا، الخ۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ افضل اور مکمل نیت کا تکلم نہ کرنا ہے باوجودیکہ اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں۔

مالکیہ نے کہا یہ مکروہ ہے اور حنبلیہ نے اس بات پر تصریح کی ہے کہ یہ بدعت غیر مستحب ہے اور اگر اس سے شافعیہ اور حنفیہ کے درمیان اتفاق کا ارادہ ہو تو یہ علی الاطلاق نہیں بلکہ اس کا محل ہے کہ اس پر استعانت (مدد طلب کرنے) کی ضرورت ہو اور حفاظ محدثین کے نزدیک بغیر کسی شک کے اس کا ترک ثابت ہے اور ان کا قول کہ شک یقین کے معارض نہیں ہوتا بہت بڑا اٹکل اور اعجب العجائب میں سے ہے کہ جس میں عقل والے حیران ہو جاتے ہی اس طور پر کہ اس نے وہم کو یقین بنایا ہے اور حفاظ کے ثبوت کو شک بنایا ہے۔ یہ نہ کہا جائے کہ مثبت نافی پر مقدم ہے اس لئے کہ ہم کہتے ہیں اس کا محل ہے کہ جب دو دلیلیں متعارض ہو

جائیں ان میں سے ایک نفی پر ہو اور دوسری اثبات پر ہو اور خصم وہاں برابر ہو۔ اور ہماری دلیل یہ ہے کہ جب محدثین نے آپ ﷺ کی نماز کی اتنی باریک تفیدات ذکر کرنے کے باوجود نیت کا تلفظ ذکر نہیں کیا تو یہ عدم بھی اثبات جیسا ہے۔ لہٰذا تو غور کر یہ لغزش کی جگہ اور غلطی کا محل ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ ابن قیم نے ''زاد المعاد فی هدی خیر العباد'' میں ذکر کیا ہے اور یہ حضور ﷺ کا لفظ ہے ''اذا قام الی الصلاة قال ''الله اکبر ''(جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو فرماتے اللہ اکبر) اس سے پہلے کچھ نہ کہتے اور نہ نیت کا تلفظ کرتے اور نہ یہ کہے کہ میں اللہ کے لیے نماز پڑھتا ہوں اور اسی طرح قبلہ کی طرف منہ کر کے چار رکعات امام ہونے کی حالت میں یا مقتدی ہونے کی حالت میں اور نہ یہ کہے کہ اداء ہے قضا نہیں ہے اور نہ وقت کا فرض اور یہ دس بدعتیں ہیں جن میں سے ایک بھی آپ ﷺ سے کبھی بھی نقل نہیں کی گئی نہ اسناد صحیح کے ساتھ نہ ضعیف اور نہ مسند اور نہ مرسل ان میں سے کبھی بھی ایک لفظ تک بلکہ نہ صحابہ میں سے بھی کسی سے اور نہ ہی کسی ایک تابعی نے اسے مستحب قرار دیا ہے اور نہ ہی ائمہ اربعہ میں سے کسی نے۔

بعض متاخرین کو امام شافعیؒ کے قول سے دھوکہ لگا ہے جو انہوں نے نماز کے بارے میں کہا کہ یہ روزوں کی طرح نہیں اس میں کوئی داخل نہیں ہوگا مگر ذکر کے ساتھ ہی، تو اس کو گمان ہوا کہ ذکر وہ نمازی کا نیت کا تلفظ کرنا ہے اور امام شافعیؒ کی ذکر سے مراد تکبیر تحریمہ ہے اس کے سوا نہیں اور امام شافعیؒ ایسے امر کو کیسے مستحب قرار دے سکتے ہیں جس کو رسول اللہ ﷺ نے ایک نماز میں بھی نہیں کیا اور نہ ہی آپ کے خلفاء اور صحابہ میں سے کسی نے کیا اور یہ ان کا طریقہ اور سیرت ہے۔ پس اگر کوئی اس بارے میں ایک حرف بھی ان سے پاتا تو ہم اسے قبول کرتے اور قبول اور تسلیم کے بالمقابل رکھتے اور کوئی طریقہ ان کے طریقے سے زیادہ کامل نہیں اور نہ سنت مگر جس کو انہوں نے صاحبِ شریعت سے حاصل کیا......

اور سید جمال الدین محدث نے محدثین سے نیت کے تلفظ کی روایت کی نفی کی صراحت کی ہے۔ اور اسی طرح فیروز آبادی صاحبِ القاموس نے اپنی کتاب جس کا نام الصراط المستقیم ہے میں ذکر کیا ہے، اور قسطلانی نے مواہب میں کہا۔ خلاصہ کلام کسی نے بھی آنحضرت ﷺ سے نیت کا تلفظ کرنا نقل نہیں کیا اور نہ صحابہ میں سے کسی کو اس کا تلفظ بتایا اور نہ اس کو اس پر باقی رکھا۔ بلکہ سنن میں آپ ﷺ سے منقول ہے آپ ﷺ نے فرمایا **مفتاح الصلاة الطهور، وتحريمها التكبير وتحليلها التسليم**'' (نماز کی کنجی وضوء ہے اور اس کو حرام کرنے والی تکبیر ہے اور اس کو حلال کرنے والا سلام ہے)۔ البتہ نیت کے تلفظ میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعضوں نے کہا یہ بدعت ہے اس لئے کہ اس کا کرنا منقول نہیں اور دوسرے بعض نے کہا یہ مستحب ہے کیونکہ نیتِ قلبی کے استحضار پر مددگار ہے اور زبان کی عبادت ہے جیسا کہ نیت دِل کی عبودیت ہے اور افعال منویہ (جن کی نیت کی جائے) اعضاء کی عبادت ہے ارراس جیسا جواب دیا شیخ تقی الدین سبکی نے اور حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اور ابن قیم نے ''الہدیٰ'' میں استحباب کے رد پر لمبا کلام کیا ہے اور بہت زیادہ دلائل بیان کیے ہیں جن کا ذکر طول نفس مانگتا ہے جو ہمیں مقصود سے نکال دے گا۔

اور ہمارے اصحاب کا جو مؤقف ہے وہ نیت کے تکلم کا مستحب ہونا ہے اور بعضوں نے اس کو حضرت انسؓ کی اس حدیث پر قیاس کیا ہے جو صحیحین میں ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے سُنا وہ حج اور عمرہ کا اکٹھا تلبیہ کہہ رہے تھے فرما رہے تھے: ''لبیك

عمرة وحجة" اور یہ لفظ کی تصریح ہے اور حکم جیسے نص سے ثابت ہوتا ہے ویسے ہی قیاس سے ثابت ہوتا ہے لیکن انہوں نے اس پر گرفت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ تعلیم صحابہ کے لیے احرام کے شروع میں کہا جس کو وہ اونچی آواز سے کہتے ہیں اور ان کے دل میں بیت اللہ کا قصد یا قربانی کا ارادہ تھا اور حضور ﷺ نے تیس ہزار نمازیں پڑھیں لیکن ان سے نقل نہیں کیا گیا کہ آپ ﷺ نے کہا میں فلاں فلاں نماز پڑھنے کی نیت کرتا ہوں اور اس کا ترک کرنا سنت ہے جیسا کہ اس کا کرنا سنت ہے۔ پس ہمارے لئے مناسب نہیں کہ جو انہوں نے کیا اور چھوڑا ان کے درمیان برابری کریں پھر جس جگہ انہوں نے چھوڑا اپنے اس کی نظیر اسی جگہ سے بیان کریں جس جگہ انہوں نے کیا ہے اور حج اور نماز میں فرق زیادہ ظاہر ہے جس میں سے ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ پھر النیات میں (الف) لام مضاف الیہ کے عوض میں ہے یعنی "انما الاعمال بنیاتها" (اعمال کا دارو مدار ان کی نیتوں پر ہے)۔ یا حدیث جمع کے مقابلہ جمع کے باب سے ہے: ورکب القوم دوابهم (لوگ اپنی سواریوں پر سوار ہوئے)۔ ابن ہمام نے کہا یہ حدیث مشہور ہے اور اس کی صحت پر اتفاق ہے۔ بہر حال اس کے الفاظ تو انما الاعمال بالنیات اور بالنیۃ اور الاعمال بالنیۃ اور العمل بالنیۃ سب صحیح میں ہیں اور بہر حال الاعمال بالنیات جیسا کہ کتاب ہدایہ میں ہے۔ تو نووی نے اپنی کتاب ''بستان العارفین'' میں کہا یہ حافظ ابو موسیٰ اصفہانی سے نقل کے اعتبار سے کامل نہیں، اس کی اسناد صحیح نہیں اور اس کو ثابت کیا ہے اور بعضوں نے اس میں نظر کی ہے اس لئے کہ ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے اپنی اربعین میں اسی طرح روایت کیا ہے اور اس کے صحیح ہونے کا حکم لگایا ہے۔ میں نے کہا اور یہی روایت مسند ابی حنیفہ رحمہ اللہ میں امام مذہب سے ہے انہوں نے اس کو عن یحییٰ بن سعید عن محمد بن ابراھیم التیمی عن علقمۃ عن ابی وقاص اللیثی عن عمر بن الخطاب سے روایت کیا ہے۔ عمرؓ بن الخطاب نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ان الاعمال بالنيات" (الحدیث)۔

اور ابن الجارود نے اس کو المنتقی میں روایت کیا ہے "ان الاعمال بالنيات وان لكل امرى مانوى"۔ اور امام شافعی سے اس حدیث کی یہ فضیلت مروی ہے کہ اس میں آدھا علم داخل ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نیت قلب کی عبودیت ہے اور عمل قلب کی عبودیت ہے یا یہ کہ دین یا ظاہر ہے اور وہ علم ہے یا باطن ہے اور وہ نیت ہے جیسے حضور ﷺ کا قول ہے کہ "علم میراث سیکھو کیونکہ یہ آدھا علم ہے"۔ کیونکہ یہ اس موت کے متعلق ہے جو حیات کے بالمقابل ہے اور ان سے وہ بھی روایت ہے جو اس کے ربع (چوتھائی) علم پر دلالت کرتی ہے۔ جیسا کہ کہا:

① عمدة الخير عندنا كلمات اربع قالهن خيرا لبرية

ہمارے نزدیک سب سے عمدہ اور خیر چار کلمات ہیں جن کو مخلوقات میں سے سب سے بہتر نے کہا۔

② اتق السيئات وازهد ودع ماليس يعنيك واعمل بنية)

گناہوں سے بچ اور پرہیز گاری اختیار کر اور لایعنی چھوڑ دے اور عمل نیت سے کر۔

یہ چار احادیث کی طرف اشارہ ہے۔ گویا کہ انہوں نے گناہوں سے بچنے اور مباح چیزوں سے پرہیز اور فضول چیزوں کے ترک اور نیتوں سے عمل کرنے کو تمام حالت میں معتبر سمجھا ہے۔

اور ان (شافعی) سے اور احمد سے مروی ہے کہ یہ تہائی اسلام یا تہائی علم ہے اور بیہقی نے اس کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ آدمی کا

کسب یا اس کے دل سے ہوتا ہے جیسے نیت یا اس کی زبان سے یا بقیہ اعضاء سے اور پہلا تین میں سے ایک ہے بلکہ ان میں سے زیادہ راجح ہے اس لئے کہ یہ الگ عبادت ہے اور یہی وجہ ہے حدیث (**نیة المؤمن خیر من عمله**) کی اور ایک روایت میں "ابلغ" ہے اور دوسری میں زیادتی ہے : "**ان اللّٰه عزوجل لیعطی العبد علی نیته مالا یعطیه علی عمله**" (اللہ عزوجل بندے کو اس کی نیت پر وہ کچھ دیتا ہے جو اس کے عمل پر اس کو نہیں دیتا)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیت میں ریاء نہیں ہوتی اور عمل میں ریاء مل جاتی ہے اور اس کے طرق ضعیف ہیں البتہ سب کے مجموعے سے قوی ہو جاتی ہے اور یہ حدیث اس کے معارض نہیں "**من هم بحسنة فلم یعملها کتبت له واحدا ومن عملها کتبت له عشرة**" (جو نیکی کا ارادہ کرتا ہے اور عمل نہیں کرتا اس کے لئے ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور جو اس پر عمل کرتا ہے اس کے لئے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں) اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ عمل اس سے بہتر ہے۔ کیونکہ دس نیکیوں کا لکھا جانا وہ صرف عمل پر نہیں بلکہ نیت کے ساتھ ہے اس لئے کہ نیت کے ساتھ ہے اس لئے کہ نیت عمل کی صحت کی شرط ہے اور عمل نیت کے صحیح ہونے کی شرط نہیں اس وجہ سے صرف نیت پر بھی ثواب ملتا ہے لہٰذا یہ حدیث بدل گئی اور نیت کے بہتر ہونے پر دلیل بن گئی اور اس کہنے والے کا قول کا فساد بھی ظاہر ہو گیا جس نے کہا نیت کے عمل سے بہتر ہونے سے مراد (عمل) بلانیت ہے نہ کہ اس کے ساتھ تا کہ یہ لازم نہ آئے کہ کوئی چیز اپنے غیر کے ساتھ اپنی ذات سے بہتر ہے۔ تعجب ابن حجر پر ہے کہ انہوں نے اس کمزور قول کو ذکر کیا ہے پھر علت سے ثابت بھی کیا ہے اور بہر حال ان کا قول کہ اس کا عمل سے بہتر ہونا جنت یا دوزخ میں ہیشگی کا تقاضا کرتا ہے اس لئے کہ مؤمن ہمیشہ ایمان کی نیت کرنے والا ہے اور کافر ہمیشہ کفر کی نیت کرنے والا ہے تو تابید (ہیشگی) تابید کے مقابل ہوگئی اور اگر عمل کو دیکھا جائے تو ثواب اور عذاب اس کی مدّت کے بقدر ہوگا۔ پس وہ مدخول ہے اور معلول ہے لہٰذا نہیں کہا جائے گا کہ کافر کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے، بلکہ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ کافر کا عمل اس کی نیت سے بہتر ہے۔ البتہ علماء نے ذکر کیا ہے کہ جنت کی جانب میں (لکھا) ہے کہ اس کا دخول ایمان کی وجہ سے ہے اور اس کے درجات اعمال کی وجہ سے ہیں اور اس کا خلود نیت سے ہے یا یہ باب افعال سے ہے لہٰذا کوئی اشکال نہیں، بہر حال کفار کا آگ میں داخلہ وہ ان کے کفر کی وجہ سے ہے اور ان کے درکات (تنزل کے درجات) ان کے اعمال سیئہ کے بقدر ہیں۔ ظاہری عدل میں عقل اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ کافر جو دنیا میں مثلاً سو سال زندہ رہا تو اس کو اس کے بقدر عذاب دیا جائے تو انہوں نے کہا کہ دوزخ میں ہمیشہ رہنا وہ ان کی ہیشگی کی نیت کے مقابلے میں ہے۔ اس لئے کہ اگر فرض کیا جائے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہتا تو وہ اپنی عادت کے مطابق ہمیشہ کفر پر رہتا۔ پھر کہا گیا کہ **عمله** کی ضمیر کفر معہود کی طرف راجع ہے اور وہ پہلے گزر گیا جیسے پُل کا بنانا کہ مسلمان نے اسے بنانے کا عزم کیا اور یہ قول کہ "خیر" افعل التفضیل کے معنی میں نہیں ہے اور اسکا یہ معنی کہ نیت تمام خیرات سے بہتر ہے تمام جہات کے اعتبار سے ساقط ہے۔ ابن حجر نے کہا ہے کہ علماء کا بری نیت میں اختلاف ہے اور حق یہ ہے کہ اس پر کوئی عذاب نہیں مگر جب اس کے ساتھ عزم اور تصمیم مل جائے یعنی فعل کی وجہ سے فعل پر عزم یا اس بات کا پکا ارادہ کہ وہ یہ عنقریب کرے گا اور اس میں یہ بھی ہے کہ نیت عزیمت کے ساتھ ہوتی ہے ورنہ تردّد کے ساتھ اسے خطرہ (دل میں کھٹکنے والا خیال) کہتے ہیں اور یہ بالا جماع مرفوع (اٹھا لیا گیا، معاف) ہے۔ مدارک میں اللہ تعالیٰ کے قول ﴿**وان تخفوا مافی انفسکم**﴾ میں کہا کہ وساوس داخل نہیں ہیں اور اپنے آپ سے باتیں کرنا ان چیزوں میں داخل ہے جن کو آدمی مخفی رکھتا

ہے۔ کیونکہ یہ ان چیزوں میں سے ہے کہ جن سے بچنا اس کے بس میں نہیں اور اللہ تعالیٰ بندے کو اتنا ہی مکلف بناتے ہیں جتنی ان کی وسعت ہے۔ لیکن وہ چیز داخل ہے جس کا وہ اعتقاد رکھے اور اس کا عزم کرے اور حاصل کلام یہ ہے کہ کفر کا عزم کفر ہے اور بغیر عزم کے گناہوں کے خیالات معاف ہیں۔

قوله: وانما لامرئ مانوی:

اور گناہ کا عزم کیا پھر اس پر نادم ہوا اور اس سے رجوع کر لیا تو وہ معاف ہے بلکہ اسے ثواب دیا جائے گا۔ پھر جب اس نے کسی برائی کا ارادہ کیا اور وہ اس پر ثابت ہے مگر کسی مانع کی وجہ سے نہ کہ اپنے اختیار سے اس سے رُک گیا تو اس کو اس پر اس فعل کا عذاب نہیں دیا جائے گا یعنی زنا کے عزم سے زنا کی سزا نہیں دی جائے گی اور کیا زنا کے عزم کی سزا دی جائے گی کہا گیا نہیں۔ حضور ﷺ کے اس قول کی وجہ سے ''کہ اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کو وہ معاف کر دیا جو ان کے دِلوں میں پیدا ہو جب تک کہ عمل نہ کرے یا اس کا تلم نہ کرے''۔ اور جمہور کا یہ مذہب ہے کہ یہ حدیث خطرہ (خیال) کے بارے میں ہے نہ کی عزم کے بارے میں اور اس کو شیخ ابو منصور اور شمس الائمہ حلوانی نے اختیار کیا ہے اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ﴾ [النور: ۱۹] ''جو لوگ مسلمانوں میں بے حیائی پھیلانے کے آرزومند رہتے ہیں''۔

ابن حجرؒ نے کہا کہ: اگر تو کہے کہ نیکی کی نیت بھی اسی طرح ہے میں کہوں گا اس میں فرق ہے اس طور پر کہ نیکی کی نیت کرنے والے کو اس پر ثواب دیا جائے گا اور اس کی نیت پر بھی اور برائی کی نیت کرنے والے کا صرف اس کی نیت پر مواخذہ کیا جائے گا، میں نے کہا: فرق کی کوئی حاجت نہیں اس لئے کہ ہر آدمی کو وہی ملے گا جو اس نے نیت کی، پھر جو فرق انہوں نے ذکر کیا ہے وہ صحیح نہیں اس لئے کہ اگر اس کی مراد تعدد (کثرت) حقیقی ہے تو وہ ثابت نہیں اور اگر اس کی مراد تعدد حکمی ہے تو وہ کیفیت میں زیادتی ہے نہ کہ کمیت میں جیسا کہ اپنے قول سے اس طرف اشارہ کیا تو اوّل قول پر اس کے ثواب کا معنی یہ ہے کہ اس کے لئے بہت بڑی نیکی لکھی جائے گی اور اس حدیث کے متعلقہ من جملہ فروع میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس کی زبان جاری ہوئی دونوں ہاتھوں کو لوہے میں جکڑے ہوئے بعض مالکیہ کے خلاف اس لئے کہ اسکی نیت نہیں ہے اور مسلم کی حدیث اس آدمی کے بارے میں ہماری تائید کرتی ہے کہ جس کی سواری (اونٹ) گم ہوگئی پھر اس نے اس کو پا لیا اور بہت خوشی کی حالت میں کہا اے اللہ تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ خوشی کی شدت سے اس نے خطاء کی۔ ابن حجرؒ نے کہا: اگر تو یہ کہے کہ ان میں سے بعض کے کلام کا ظاہر یہ ہے کہ اس کے دعویٰ کو قبول کیا جائے کہ یہاں سبقت لسانی ہوگئی اگرچہ بغیر قرینہ ہے تو جو کچھ طلاق میں گزرا وہ اس کے منافی ہوگا کہ قرینہ ضروری ہے، تو فرق کیا ہوا' تو میں کہوں گا بہر حال باطن کی طرف نسبت کرنے میں تو وہ دونوں برابر حد پر ہیں لہٰذا ان دونوں میں اس پر باطن کے اعتبار سے کچھ نہیں کیونکہ اس سے سبقت لسانی ہوئی اور بہر حال ظاہر کے اعتبار سے تو طلاق میں اور اسی طرح کفر میں قرینہ ضروری ہے جیسا کہ ظاہر ہے اور اس میں ظاہر کے اعتبار سے مطلقاً قبول کا بھی احتمال ہے اور اس میں فرق کیا جائے گا اس طور پر کہ اللہ کے حق ہی ان چیزوں کی بھی مغفرت کر دی جاتی ہے جو اس کے غیر کے حق میں نہیں کی جاتی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا حق مسامحت پر مبنی ہوتا ہے اور آدمی کا حق مشاحت (اختلاف) پر مبنی ہوتا ہے۔ اور ان فروع میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس نے وطی کی بیوی سمجھ کر یا پیا پانی سمجھ کر یا قتل کیا غیر معصوم سمجھ کر پھر ظاہر ہوا کہ وہ حرام ہے

تو اس کو گناہ نہیں ہوگا اور اس کے برعکس وہ گناہگار ہوگا اس میں نیت کے اعتبار سے۔ اور بعض علماء نے کہا اس عموم سے بعض اعمال کا استثناء ہے جیسے صریح طلاق اور عتاق اس لئے کہ شارع کا ان معانی کے لیے ان الفاظ کا متعین کرنا بمنزلہ نیت کے ہے اور اس میں کوئی خفا نہیں کہ یہ صرف صحت اور جواز کی طرف نسبت کرنے میں ہے اور بہرحال ثواب کی طرف نسبت کرنے میں تصحیح نیت ضروری ہے، واللہ اعلم۔

ایک روایت میں ہے: **وانما لکل امری مانوی** ۔ یعنی خیر اور شر میں سے جس کی اس نے نیت کی یا اس عمل کی جزا جس کی اس نے نیت کی نہ وہ کہ جس کی اس نے نیت نہیں کی یا اس کے غیر نے اس کے لئے اس کی نیت کی۔ اس میں اس چیز کا بیان ہے جو نیت کا ثمرہ ہے یعنی قبول اور ردّ و ثواب اور عقاب وغیرہ۔

قولہ: فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ:

جیسے اسقاط قضاء (قضاء کا ساقط کرنا) اور عدم اسقاط قضاء اس لئے کہ عمل کی صحت سے اس کی قبولیت اور ثواب کا وجود لازم نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ کے قول کی وجہ سے: ﴿اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (المائدۃ: ۲۷) ''اللہ تعالیٰ تقویٰ والوں کا ہی عمل قبول کرتا ہے'' پہلے جملے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اعمال نیت ہی سے شمار کیے جاتے ہیں اور اس سے اخلاص کے ذریعے سے مقبول ہوتے ہیں اور حاصل فرق یہ ہے کہ نیت پہلے نفس عمل کے متعلق ہوتی ہے اور دوسری دفعہ اس اُمید کی طرف متوجہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے عمل ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ پہلی کو مؤکد کرتی ہے اخلاص کے راز پر تنبیہ کرنے کے لیے۔ اور مناقشہ کیا گیا ہے اس طور پر کہ اس پر اس کی تنبیہ اس کے مؤکد کے اطلاق کو منع کرتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اعمال سے مراد عبادات ہیں اور ثانی سے مراد مباح امور ہیں۔ پس یہ منوبات (جس کو نائب بنایا گیا ہو) کا فائدہ نہیں دیتے مگر جب ان کے ذریعہ سے ان کا کرنے والا قربت کی نیت کرے جیسے خوراک اور پانی اور عورتیں اور تمام لذات جب کوئی ان چیزوں کے ذریعے شہوات کو پورا کر کے طاعات پر قوت کی نیت کرے اور جیسے خوشبو لگانا جبکہ سُنت کو قائم کرنے کا اور اللہ تعالیٰ کے بندوں سے اذیت دینے والی بُو کو دور کرنے کا ارادہ کرے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر وہ عمل جو اس سے حق کے داعی کی وجہ سے صادر ہوا پس وہ حق کی طرح ہے اور اسی طرح متروکات، کہ ان پر منوبات صرف نیتوں سے ہی مترتب ہوتے ہیں۔

روایت کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی بھوک کی حالت میں ریت کے ایک ٹیلے پر سے گزرا، تو اس نے اپنے جی میں کہا اگر یہ ریت کھانا ہوتا تو میں اسے لوگوں میں تقسیم کر دیتا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو وحی کی کہ اللہ تعالیٰ نے تیری تصدیق کی اور تیرے اچھے طرز کو پسند کیا اور تجھے اتنا ثواب عطا کیا کہ جتنا اگر یہ کھانا ہوتا اور تو اسے صدقہ کر دیتا۔ اور خطابی نے اعلام الحدیث میں کہا ہے اور نووی نے اس کو اختیار کیا کہ یہ منوی (جس کی نیت کی گئی ہو) کی تعیین کو واجب کرنے کی طرف اشارہ ہے لہٰذا فائتہ (فوت شدہ نماز) میں نیت ضروری ہے اس کے ظہر یا عصر ہونے کی اور اگر ایسا نہ ہوتا تو دلالت کرتا کہ اعمال صحت پر بغیر تعیین کے ہیں یا یہ وہم میں ڈال دیتا، الخ۔ اور اسی طرح اگر کسی نے دو وجہوں یا کئی وجوہ والا عمل کیا قربات میں سے جیسے اس کا قریبی پر صدقہ کرنا جو اس کا پڑوسی اور فقیر ہے یا اس کے علاوہ وہ اوصاف کہ جن سے آدمی احسان کا مستحق ہوتا ہے اور اس نے

صرف ایک وجہ کی نیت کی تو اس کو یہ حاصل نہیں ہوگا، بخلاف اس کے کہ اس نے تمام جہات کی نیت کی۔ پس اس جملہ کی تاخیر کا راز معلوم ہو گیا اور یہ دونوں آپس میں متغایر ہیں۔ بعض نے کہا کہ اس سے یہ سمجھ آتا ہے کہ خاص کی نیت عام کی نیت کے ضمن میں غیر معتبر ہے جیسا کہ بعض اس کے قائل ہیں اور بعضوں نے کہا یہ معتبر ہے اور اس پر حدیث (**الخیل لثلاثة**) (گھوڑے تین کے لیے ہیں) الخ، دلالت کرتی ہے، واللہ اعلم۔ اور بعضوں نے کہا کہ حدیث میں نیت اس کے معنی لغوی پر محمول ہے تا کہ اس کی تطبیق اور تقسیم اس کے مابعد پر اچھی ہو جائے۔

"**فمن کانت هجرته الی الله**" یہ اس کے اجمال کی تفصیل ہے اور اس کی اصل سے مقصود استنباط ہے اور اس کی تحریر یہ ہے کہ ان کا قول: **انما لامری مانوی** اس پر دلالت کرتا ہے۔ کہ جیسی نیت ہوگی ویسے اعمال ہونگے۔ اگر وہ خالص اللہ کے لیے ہے تو یہ اعمال اللہ کے لیے ہیں اور اگر نیت دنیا کے لیے ہے تو یہ اعمال دنیا کے لیے ہیں اور اگر یہ مخلوق کو دکھانے کے لئے ہے تو یہ ان اعمال کے لئے ہے۔ لہٰذا تقدیر یہی ہے کہ جب ہر انسان کے لیے وہی ہے جو اس کی نیت میں ہے بعض طاعت یا مباح یا ان دونوں کے علاوہ۔ لہٰذا جس کی ہجرت، ہجر سے ہے اور وہ ترک ہے جو وصل کی ضد ہے اور یہاں مراد ترک وطن ہے جو دار کفر میں ہے۔ دار اسلام کی طرف جیسے صحابہ کی ہجرت جب ان پر مکہ والوں کی اذیتیں بہت بڑھ گئیں تو انہوں نے مکہ سے حبشہ اور مدینہ کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے اور اس کے بعد ہجرت کی، اور جب علوم کے سیکھنے کی ضرورت پڑی تو اپنے وطنوں سے مدینہ کی ہجرت کی اور کبھی اس کا اطلاق اس ہجرت پر ہوتا ہے جس سے اللہ نے روکا ہے جیسا کہ احادیث میں ہے اور اس کے معنی میں "**هجر المسلم اخاه**" (مسلمان کا اپنے بھائی کو چھوڑنا) اور "**هجر المرأة مضجع زوجها**" (عورت کا اپنے خاوند کے بستر کو چھوڑنا) اور اس میں سے دیارِ بدعت سے بلادِ سنت کی طرف ہجرت کرنا ہے اور علم کو طلب کرنے کے لیے ہجرت اور تحصیل حج کے لیے ترکِ وطن اور اس کے معنی میں ہے لوگوں سے جدا رہنا۔ اور بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول "**لا هجرة بعد الفتح**" (فتح کے بعد کوئی ہجرت نہیں) تو یہ مکہ سے مدینہ کی طرف خصوصی ہجرت پر محمول ہے اس لئے کہ دار الکفر سے دار الایمان کی طرف عمومی انتقال اپنے حال پر باقی ہے اور اس طرح معاصی سے ہجرت ثابت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی وجہ سے "**المهاجر من هجر ما نهى الله عنه**" (مہاجر وہ ہے جس نے اس چیز کو چھوڑا جس سے اللہ نے روکا ہو) اور مراد مہاجر کامل ہے اور یہی حدیث کا معنی ہے "**لا تنقطع الهجرة حتى تنقطع التوبة**" (ہجرت منقطع نہیں ہوگی یہاں تک کہ توبہ منقطع ہو جائے)۔

اور بعضوں نے کہا کہ ہجرت سے مراد یہاں مدینہ کی طرف ہجرت ہے۔ عورت کے ذکر اور امّ قیس کی حکایت کی وجہ سے، لیکن اعتبار عموم لفظ کا ہے نہ کہ خصوص سبب کا اور معنی یہ ہے کہ جس نے اللہ کے لیے اور اس کی رضا کی طرف قرب کے لیے ہجرت کا ارادہ کیا اور اس میں دنیاوی اغراض میں سے کچھ خلط نہ کرے اور یہ نیت کو خالص کرنے سے کنایہ ہے یا اللہ کے ذکر کی رسول کے ذکر سے موافقت کے لیے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ تعالیٰ سے تخصیص کے لیے اور ان کی طرف ہجرت کی تعظیم کے لیے یا ذکر اللہ تزیین کے لیے ہے یا اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی ہجرت کرنا اللہ تعالیٰ کے اس قول کی وجہ سے ﴿**ومن يطع الرسول فقد اطاع الله**﴾ (یعنی جس نے رسول کی اطاعت

کی تحقیق اس نے اللہ کی اطاعت کی)

تصحیح شدہ نسخوں میں شرط اور جزا میں جار کا اعادہ ثابت ہے اور یہ حکم میں استقلال کا فائدہ دیتا ہے۔ اس معنی کو کہ دونوں ہجرتیں قبولیت کے مرتبہ میں ایک دوسرے کے قائم مقام ہیں۔

قولہ: فهجرته الى الله و الى رسوله:

ان دونوں کے ناموں کے تکرار سے لذت حاصل کرنے کی وجہ سے الیھما نہیں کہا۔

الى هجرته کے متعلق ہوگا اگر کانت تامہ مقدر مانیں اور محذوف کے متعلق ہوگا اور وہ اس کی خبر ہے اگر ''کانت'' ناقصہ ہو یعنی منتبۃ الیہما۔ اور مراد کون کی اصل ہے نہ کہ مخصوص زمانہ کی طرف دیکھنا یا اس کی وضع اصل ماضی کے لیے ہے یا یہاں استقبال کے لیے ہے کیونکہ یہ لفظاً یا معنیً شرط کی چیز میں واقع ہے اور کیونکہ اس بات پر اجماع ہے کہ احکام شرعیہ میں تمام زمانے برابر ہیں مگر کسی مانع کی وجہ سے پھر ثابت شدہ قواعد میں سے ہے کہ شرط اور جزا میں مغایرت ضروری ہے تاکہ فائدہ کا حصول ہو۔

بعضوں نے کہا' اس کی تقدیری عبارت: **فمن كانت هجرته الى الله ورسوله قصدًا دنيةً فهجرته الى الله ورسوله ثمرةً ومنفعةً**۔ پس وہ نسبت کی تمییز ہے اور قرینہ کی وجہ سے اس کا حذف کرنا جائز ہے۔ اور بعضوں نے کہا: **فمن كانت هجرته الى الله ورسوله فى الدنيا فهجرته الى الله ورسوله فى العقبى**۔ اور بعضوں نے کہا جملہ جزائیہ کنایہ ہے ان کے قول **"فهجرته مقبولة او صحيحة"** (پس اس کی ہجرت مقبول ہے یا صحیح ہے) سے پھر سبب کو مسبّب کے قائم مقام بنا دیا۔

اور بعضوں نے کہا اس کی خبر جزا کی طرف مقدر ہے یعنی: **فهجرته الى الله ورسوله مقبولة** یعنی یہ ایسے ہے جیسے اس نے اس کی نیت کی اور اس کا اجر اللہ پر واقع ہے چاہے وہ راستے میں مرجائے یا فریق تک پہنچ جائے۔

قولہ: ومن كانت هجرته الى دنيا يصيبها او امراة يتزوجها:

جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

﴿وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ......﴾

[النساء: ۱۰۰]

''اور جو کوئی اپنے گھر سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف نکل کھڑا ہوا' پھر اسے موت نے آ پکڑا تو یقیناً اس کا اَجر اللہ کے ذمہ لازم ہوگیا......''

اور بعضوں نے کہا کہ شرط اور جزاء کا اتحاد تعظیم کے قصد کے لیے ہے اور تحقیر کے ارادے کے لیے ہے اس چیز میں جو عنقریب آئے گی، لہٰذا سیاق کے قرائن کی دلیل سے معنیً تغایر ہوگا اس طور پر کہ اوّل سے مراد جو خارج میں پائی جائے اور ثانی سے مراد عہد ذھنی ہے اس حد پر اُنت اُنت یعنی خالص دوست وھم ھم یعنی جو (لوگ) ان کی قدر نہیں پہچانتے اور اس میں سے ہے **انا ابو النجم وشعرى شعرى** (میں ابوالنجم ہوں اور میرا شعر میرا شعر ہے) یعنی ابھی بھی میرا شعر وہی ہے جو میرا شعر پہلے تھا اور کبر وہ ہے جو زبان کو بدل دے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اس کی ہجرت عظیمہ ہے اور اس کا نتیجہ جسیمہ (بہت بڑا) ہے۔

دنیا: دال کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ اور وہ فعلی کے وزن پر ہے الدنو سے، اور وہ قرب کے معنی میں ہے اس کے زوال سے قریب ہونے کی وجہ سے یا اس کے ہمیں آخرت سے قریب کرنے کی وجہ سے اور اس کو تنوین نہیں دی جاتی اس لئے کہ اس کا الف مقصورہ ہے تانیث کے لیے یا یہ ادنی کی تانیث ہے اور یہ غیر منصرف ہونے میں کافی ہے اور اس کی تنوین لغت میں شاذ ہے اور اس کے اسماء کے قائم مقام ہونے کی وجہ سے اور اس کے وصفیت سے الگ ہونے کی وجہ سے نکرہ ہے جیسے رجعی اور اگر یہ وصفیت پر باقی ہوتی تو معرفہ ہوتی جیسے الحسنی۔

علماء نے اس کی حقیقت میں اختلاف کیا ہے باوجودیکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ بعض نے کہا یہ اس عالم متناہی کے مجموعے کا نام ہے۔ پس قاموس میں دنیا آخرت کی نقیض ہے اور اگر وہ اس کی ضد کہتے تو زیادہ بہتر ہوتا، اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ دونوں مجتمع نہیں ہوتیں البتہ ان دونوں کا مرتفع ہونا جائز ہے۔

بعض نے کہا یہ (دنیا) نام ہے اس چیز کا جو کچھ زمین پر ہے فضا اور ہوا یا یہ آخرت سے پہلے جو مخلوقات ہے یعنی جواہر اور اعراض موجودہ اس کا کل ہے۔ نووی نے کہا' یہی زیادہ ظاہر ہے اور اس کا اطلاق مجازاً اس کے ہر جزو پر ہوتا ہے، اور یہاں اس سے مراد کچھ خطوط نفسانیہ ہیں جیسے مال اور جاہ اور کبھی اشارہ ہوتا ہے عاجل (جلد آنے والا) کی طرف اور عورت اشارہ ہے آجل (دیر سے آنے والا) کی طرف اور وہ آخرت ہے۔ ان دونوں میں سے ہر ایک میں روحانیت کے جسمانیت کی طرف ملنے کی وجہ سے۔ پس اس وقت یہ فائدہ دے گا کہ اللہ تعالیٰ کے ماسویٰ کے قصد میں انحطاط تام ہے اس آدمی سے جس نے اللہ تعالیٰ کے غیر کا ارادہ نہیں کیا اور وہ بہت تھوڑے ہیں اور قوم کے محققین کے نزدیک جس کا ادراک حس سے ہو وہ دنیا ہے اور جس کا درک عقل سے ہو وہ آخرت ہے اور ایک روایت میں ہے **ومن کانت ھجرتہ لدنیا** یعنی اس کی عرض اور غرض کی وجہ سے۔ پس لام تعلیل کے لیے ہے یا ''الی'' کے معنی میں تاکہ مقابل کا تقابل ہو جائے۔

''**یصیبھا**'': یعنی اس کو حاصل کرے۔ لیکن جبلت اصلیہ میں نفس کا اس کی طرف جلدی سے سبقت کرنے کی وجہ سے اس کے حصول کو تیر کے نشانہ پر لگنے سے تشبیہ دی۔ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ حال مقدرہ ہے یعنی **یقصد اصابتھا**

اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ اس نے اگر دنیا طلب کی تاکہ اس کے ذریعے سے آخرت پر مدد حاصل کرے تو یہ مذموم نہ ہوگا باوجودیکہ اس کا چھوڑنا زیادہ بہتر ہے، عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول کی وجہ سے:

''اے دنیا کے طالب اپنے ربّ کی اطاعت کر تیرا دنیا چھوڑنا زیادہ بڑی نیکی ہے۔''

''**امرأۃ یتزوجھا**'' ''عورت کو'' ذکر میں خاص کیا حدیث کے سبب پر تنبیہ کرنے کے لیے اگرچہ اعتبار عموم لفظ کا ہے جیسا کہ طبرانی نے اسے اپنے ثقہ رجال کی سند سے ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ ہمارے درمیان ایک آدمی ایک عورت کا منگیتر تھا اس عورت کو اُم قیس کہا جاتا تھا تو اس نے اس آدمی سے نکاح کرنے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ وہ ہجرت کرے تو اس آدمی نے ہجرت کی اور اسی عورت سے نکاح کیا۔ فرمایا ہم اسے مہاجر اُم قیس کے نام سے پکارتے تھے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہجرت جو سنت عظیمہ ہے اس کے ضمن میں اس کے ارادے نے اس کی ہجرت کے ثواب کو باطل کر دیا تو اس کا غیر کیسا ہوگا۔ یا دنیا کے سب سے بڑے فتنے پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ

النِّسَآءِ......﴾(آلِ عمران:١٤) ''مرغوب چیزوں کی محبت لوگوں کے لئے مزین کردی گئی ہے'' کی وجہ سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی وجہ سے ''میں نے اپنے بعد ایسا فتنہ نہیں چھوڑا جو مردوں کو زیادہ نقصان دینے والا ہو عورتوں سے بڑھ کر۔

قولہ: ''فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ''

لیکن عورت جب صالحہ ہو تو وہ دنیا کا سب سے بہترین متاع ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی وجہ سے ''دنیا ساری کی ساری متاع ہے اور اس کا سب سے بہترین متاع صالحہ عورت ہے''۔

اس غرض کی طرف پھیرا جائیگی کہ جس کی طرف اس نے ہجرت کی تو اس کے لئے کوئی ثواب نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ کے اس قول کی وجہ سے: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۙ وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ﴾ (الشوریٰ: ٢٠) ''جس کا ارادہ آخرت کی کھیتی کا ہو ہم اُسے اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کی طلب رکھتا ہو ہم اسے اس میں سے ہی کچھ دے دیں گے ایسے شخص کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں ہے۔'' یا معنی یہ ہے کہ اس کی ہجرت مردود ہے یا قبیح ہے۔

بعضوں نے کہا یہ مذموم ہے اس لئے کہ اس نے ہجرت کی صورت میں دنیا طلب کی، پس اس نے عبادت آخرت کے لیے ظاہر کی اور اس کا مقصود حقیقی صرف دنیا ہی ہے اسی لئے نفاق والوں سے مشابہت کی وجہ سے ذم کا مستحق ہوا۔ اسی وجہ سے حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے جب مداری کو دیکھا تو کہا یہ ہمارے ساتھیوں سے اچھا ہے کیونکہ یہ (مداری) دنیا کو دنیا کے ذریعے سے کھاتا ہے۔ اور ہمارے اصحاب دنیا کو دین کے ذریعے سے کھاتے ہیں۔ ابن عبد السلام نے کہا' جب دنیا اور آخرت کا سبب اکٹھا ہو جائے تو مطلق خیر کا ثواب نہیں ہوگا۔

اور صحیح میں ہے ''میں شرکاء میں سے سب سے زیادہ شرک سے بے نیاز ہوں۔ جس نے ایسا عمل کیا جس میں میرے غیر کو شریک کیا تو میں اس سے بری ہوں اور وہ عمل اس شریک کے لیے ہے''۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا' باعث (سبب) کا اعتبار ہوگا اگر آخرت کا باعث غالب ہوا تو اسے ثواب دیا جائے گا اور اگر دنیا کا باعث غالب ہوا یا دونوں برابر ہوئے تو ثواب نہیں دیا جائے گا۔ ابن حجرؒ نے کہا: امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب کے قول سے ماخوذ ہے کہ جس نے تجارت کی نیت سے حج کیا تو اس کا ثواب صرف حج کی نیت کرنے والے کے ثواب سے کم ہوگا۔ اگر عبادت کے ساتھ حرام چیز کا ارادہ کیا جیسے ریا تو یہ ثواب اس کو مطلقاً ساقط کر دے گا۔ اور یہی حدیث مذکور کا محمل ہے۔ جیسا کہ اس کا لفظ اس کی تصریح کر رہا ہے یا غیر حرام کا ارادہ ہو تو جتنا اس کا آخرت کا ارادہ ہوگا اتنا ثواب دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے قول کے عموم سے اخذ کرتے ہوئے: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ [الزلزال: ٧] ''پس جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اُسے دیکھ لے گا۔''

یہ اچھی تفصیل اور مستحسن تعلیل ہے یہ جو بیان کیا گیا عبارت والے علماء کی زبان سے تھا۔ اور بہر حال عرفاء اور اصحاب اشارہ کی زبان میں اس کا معنی اجمالی طور پر یہ ہے کہ ظاہری قلب کے اعمال قلوب میں واقع ہونے والے غیب کے انوار کے متعلق ہیں۔ اور نیت یہ ہے کہ' جس کے لئے عمل کیا گیا ہے اس کے لئے عمل کو نافذ کرنے کے لیے ارادہ کو جمع کرنا ہے۔ اور

خلوت میں اس کے غیر کے ذکر کی طمع نہ کرے، اور لوگوں کے محبت وعشق میں اپنے اپنے طریقے اور انداز ہیں۔ پھر عوام کی نیت اغراض کی طلب میں فضل اور عوض کے بھولنے کے ساتھ ہے اور جاہل کی نیت بری قضا (تقدیر) اور مصیبت کے نازل ہونے سے محفوظ کرنا ہے اور نفاق والوں کی نیت لوگوں کے نزدیک مزّین (آراستہ) کرنا ہے مخالفت کو چھپانے کے ساتھ۔ اور علماء کی نیت طاعات کو قائم کرنا ہے اور اہل تصوّف کی نیت وہ عبادات جو ان سے ظاہر ہوتی ہیں اعتماد نہ کرنا ہے اور اہل حقیقت کی نیت وہ ربوبیت ہے جو عبودیت کی متولی ہے اور انما لکل امری مانوی نیک بختوں کے مطالب میں سے ہے اور وہ درکات سفلی (نیچے کے درجات) سے چھٹکارا پانا ہے۔ جیسے کُفر اور شرک اور جہالت اور معاص اور شہرت اور ریاء اور اخلاق ذمیمہ اور اوصاف کا روکنا ہے۔ اور بلند درجات کی کامیابی حاصل کرنا ہے۔

اور وہ معرفت اور توحید اور علم اور طاعات اور اخلاق محمودہ اور حق کے جذبات اور اس کی انابت سے فناء اور اس کی گہرائی میں بقاء ہے یا اشقیاء (بدبختیوں) کے مقاصد میں سے ہے۔ اور وہ اجمالاً وہ چیز ہے جو حق سے دور کر دے۔ فمن کانت هجرته یعنی جس مقام میں وہ ہے اس سے نکلنا چاہے اس کی وہ استعداد ہو جس پر وہ پیدا ہوا ہے یا نفس کی منازل میں سے کوئی منزل ہو یا اللہ کی طرف قلب کے مقامات میں سے کوئی مقام ہوتا کہ اس کی مرضیات اور اخلاق کی تحسین (اچھا بنانا) اور توحید ذات اور اس کے رسول کی طرف توجہ ان کے اعمال کی اتباع اور ان کے اخلاق کی پیروی کے ذریعے اور صفات کی توحید میں استقامت کی طلب کی طرف توجہ حاصل ہو جائے۔ فهجرته الی الله ورسوله تو عنایت الٰہیہ اسے حدوث وفناء کی ظلمتوں سے شہود وبقاء کے انوار کی طرف نکال دے گی اور اس کو عبودیت کی پستی سے عندیت کی بلندی کی طرف کھینچ لے گی اور عالم لاہوت (آخرت) میں فنا ہو جائے گا اور اللہ ہی ہے جسے کبھی موت نہیں آئے گی ہمیشہ باقی رہے گا، اور انسیت اس کی طرف لوٹی اور وہ ملک غفار کے پڑوس میں قرار کے گھر جنت میں اُترا اور انوارِ الٰہی اس پر روشن ہوئے اور کامل اضافی روح اس کے دِل میں اُتری اور اس میں روح محمدی اور احباب کو پایا۔ اور جانا کہ اس کے لئے ٹھکانہ ہے۔ ومن کانت هجرته لدنیا یعنی مال اور جاہ پر حرص کی شہوت کو حاصل کرنے کے لیے یا شرمگاہ کی شہوت کی لذت حاصل کرنے کے لیے۔ پھر اجنبی وطنوں اور ظلمت کے علاقوں میں حق سے قطع تعلق رہے گا اور اس کے لئے فرقت اور جدائی کی آگ ہوگی۔ اللہ کی جلائی ہوئی آگ جو دلوں کو جھانکتی ہے۔ بعض مخلصین نے کوتاہی کرنے والوں کے لیے یہ اشعار کہے:

یا غافل القلب عن ذکر المنیات	عما قلیل ستثوی بین اموات
اے موت کے ذکر سے غافل دل والے	تھوڑی دیر بعد عنقریب تو مردوں میں ٹھہرے گا
ان الحمام له وقت الی أجل	فاذکر مصائب ایام وساعات
بے شک موت کا مقررہ مدت تک وقت ہے	پس تو دنوں اور گھڑیوں کے مصائب کو یاد کر
لا تطمئن الی الدنیا وزینتها	قد حان للموت باذا اللب ان یأتی
تو دنیا اور اس کی زینت سے مطمئن نہ ہو	اے عقلمند موت کے آنے کا وقت قریب ہے
وکن حریصا علی الاخلاص فی عمل	فانما العمل الزاکی بنیات

چونکہ اچھی نشوونما والا عمل نیتوں سے ہی ہوتا ہے اور عمل کے اندر اخلاص پر تو حریص ہو
اور مسند ابی یعلی موصلی میں یہ حدیث مرفوعاً آئی ہے ''اللہ قیامت کے دِن اعمال لکھنے والے فرشتوں سے کہیں گے میرے اس بندے کے لیے اتنا اتنا اُجر لکھ لو۔ وہ کہیں گے اے ہمارے ربّ ہم نے تو اس سے یہ محفوظ نہیں کیا اور نہ یہ ہمارے دفتروں میں ہے تو اللہ تعالیٰ کہیں گے اس نے اس کی نیت کی تھی''۔
استاد ابو القاسم قشیری قدس اللہ سرہ العلی نے نقل کیا ہے' کسی نے زبیدہ کو خواب میں دیکھا، اس سے کہا اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ اس نے کہا اللہ نے مجھے بخش دیا۔ اس سے پوچھا گیا کیا تمہارے مکہ کے راستے میں کنویں اور حوض اور قلعے تعمیر کرنے اور اس میں خرچ کرنے کی وجہ سے تو اس نے کہا' دور ہو گیا اور یہ سارا کچھ ان کے مالکوں کے پاس چلا گیا۔ ہمیں تو اس سے صرف نیتوں نے نفع دیا اور اس کی وجہ سے میری مغفرت کر دی۔ اے اللہ تو ہماری نیتوں کو اچھا کر اور ہماری دنیا کی وجہ سے ہمارا مواخذہ نہ کرنا اور ہمارا خاتمہ خیر پر فرمانا۔

متفق علیہ کا مطلب:

یعنی جس پر شیخین متفق ہوں نہ کہ جس پر اُمت متفق ہو۔ لیکن اُمت کا اتفاق اس پر اس کو لازم ہے کیونکہ اُمت کا اس حدیث کو قبول کرنے پر اتفاق ہے، جس پر یہ دونوں متفق ہوں اور اسی طرح صحاح ستہ میں سے باقی چار نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ کوئی بھی کُتب معتمدہ والا نہیں ہے جس نے اس کو بیان نہ کیا ہو سوائے امام مالک کے۔
جاننا چاہیئے کہ محدثین وغیرہ کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ صحیحین یا ان میں سے کسی ایک میں جو احادیث مسند واقع ہوئی ہیں اس کی صحت یقینی اور قطعی ہے کیونکہ صحت کے اعتبار سے اُمت نے اسے قبولیت سے نوازا ہے اور اس طرح عمل بھی جب تک کوئی مانع نہ ہو جیسے نسخ اور تخصیص اور اس اُمت کا اجماع جو خطاء سے معصوم ہے جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: پس اس کا خبر غیر متواتر کو قبول کرنا علم نظری کو واجب کرتا ہے۔
استاد ابو اسحاق اسفرائینی کی عبارت ہے کہ اہلِ فن کا اس پر اجماع ہے کہ وہ اخبار کہ جن پر صحیحین مشتمل ہیں انکے اصول ومتون کی صحت قطعی ہے اور کسی حال میں بھی اس میں اختلاف حاصل نہیں ہوگا، اور اگر اس میں اختلاف ہوا بھی تو طرق اور رواۃ میں ہوگا۔ اور جس نے اس کے حکم کی ان دونوں سے خبر کے اعتبار سے مخالفت کی اور اس کے پاس کوئی جائز تاویل بھی نہ ہوئی تو ہم اس کے حکم کو توڑ دیں گے۔ امام الحرمین نے کہا علماء مسلمین کا ان دونوں کی صحت پر اجماع ہے اور عطاء نے کہا ہے' اجماع اسناد سے زیادہ قوی ہے تب تو انہوں نے علم کا فائدہ دیا۔ اکثر اور محقق علماء نے کہا' ان دونوں کی صحت ظنی ہے اس لئے کہ ان دونوں کی اخبار آحاد ہیں اور یہ ظن کا ہی فائدہ دیتی ہیں اگرچہ ائمہ نے ان کو قبولیت سے نوازا ہے اس لئے کہ انہوں نے ان دونوں کے علاوہ کو بھی جن کی صحت ظنی ہو قبولیت سے نوازا ہے اور اس لئے کہ ائمہ کا ایسی خبر کو صحیح قرار دینا جو صحت کی شرائط کو جمع کیے ہوئے ہو صرف ظاہر کے اعتبار سے ہے اور اس لئے کہ اس میں تقریباً دو سو مسند احادیث ہیں جن کی صحت میں طعن کیا گیا ہے لہٰذا اُمت نے جو کچھ ان دونوں میں ہے سب کو تلقی بالقبول عطا نہیں کی۔ لیکن اوّل کے قائلین نے ان کا استثناء کیا ہے۔

شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانی نے کہا: تحقیق یہ ہے کہ اختلاف لفظی ہے اس لئے کہ جس نے ان دونوں پر صحت کے علم کا اطلاق کیا ہے اس نے اس کو نظری بنایا ہے اور جس نے اس اطلاق کا انکار کیا ہے تو اس نے لفظ علم کو متواتر کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اور اس کے علاوہ ان کے نزدیک ظنی ہے اور اس میں بھی علماء نے اختلاف کیا ہے کہ کیا بعد کے زمانوں میں حدیث کو صحیح قرار دینا اور حسن قرار دینا اور ضعیف قرار دینا جائز ہے۔ ابن صلاح نے اس کو پسند کیا ہے کہ یہ ممکن نہیں۔ بلکہ اس پر اکتفاء کیا جائے گا۔ جس پر ائمہ نے اپنی معتمد تصانیف میں تصریح کی ہے۔ نوویؒ نے اس کی تردید کی ہے اور اس کا پیچھا کیا ہے اور اس کے ردّ کے بیان میں لمبا کلام کیا ہے۔ اس وجہ سے ان کے معاصرین کی ایک جماعت نے ان کی تصحیح کی ہے جیسے قطان اور ضیا مقدسی پھر منذری اور دمیاطی طبقے کے بعد طبقے نے۔ اور شاید انہوں نے اس کو مادہ سے روکنے کے لیے اختیار کیا ہوتا کہ بعض جاہل اس پر بچوں جیسی عادت اختیار نہ کریں اور اسی قسم کا ان کا اختلاف ہے کہ آیا کسی کے لیے اجتہاد مطلق بعد کے زمانوں میں بھی ممکن ہے تو کہا گیا ممکن ہے اور بعضوں نے کہا نہیں۔ اختلاف لفظی ہے اسلئے کہ امکان امر عقلی ہے اور ممکنہ ہونا امر عادی ہے، واللہ اعلم۔

اسنادی حیثیت:

یہ حدیث مشہور ہے۔ اس کی صحت پر اجماع ہے۔ اور ابن ماکولا وغیرہ نے جو اس میں کلام کیا ہے اس کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ متواتر ہے۔ اس لئے کہ اس کو نبی اکرم ﷺ سے صحیح طریق سے صرف عمرؓ نے روایت کیا ہے۔ اور عمرؓ سے صرف علقمہ نے روایت کیا ہے اور علقمہ سے اس کو صرف محمد بن ابراہیم التیمی نے روایت کیا ہے۔ اور ان سے صرف یحییٰ بن سعید انصاری نے روایت کیا ہے۔ پھر ان سے تواتر ہے، اس طور پر کہ ان سے سو سے زیادہ انسانوں نے روایت کیا ہے جن میں سے اکثر ائمہ ہیں۔

حفاظ کی ایک جماعت نے کہا کہ ان سے سات سو انسانوں نے اس کو روایت کیا ہے ان میں سے بڑے بڑے مالک اور ثوری اور اوزاعی اور ابن مبارک اور لیث بن سعد اور حماد بن زید اور سعید اور ابن عیینہ ہیں۔ اور اس حدث کو عمرؓ سے علقمہ کے علاوہ نو (۹) نے روایت کیا، اور علقمہ سے التیمی کے علاوہ دو نے اور التیمی سے یحییٰ کے علاوہ پانچ نے روایت کیا ہے۔ پس حدیث اس کے آخر کی طرف نسبت کی وجہ سے مشہور ہے اور اس کے اوّل کی طرف نسبت کرتے ہوئے غریب ہے۔

کِتَابُ الْاِیْمَانِ

کتاب "الکُتب" سے ماخوذ ہے، بمعنی "جمع" یا الکتابۃ سے ماخوذ ہے۔ ترجمۃ الباب کی تقدیری عبارت یوں ہوگی:

هذا مجموع أو مكتوب۔

اس کا عنوان "کتاب الایمان" قائم کیا حالانکہ اس میں اسلام کا بھی تذکرہ ہے اس لئے کہ یہ دونوں شریعت میں ہم معنی ہیں اور معنی لغوی کے اعتبار سے فرق ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے یہی اصل ہے اور اسی پر فصل کا مدار ہے اور اس کی فضیلت کے شرف کے زیادہ ہونے کی وجہ سے مقدم کیا اور اس وجہ سے بھی کہ یہ عبادات صحیح ہونے کی شرط ہے اور عبادات معاملات پر مقدم ہیں۔

لغت کے اعتبار سے "ایمان" کا معنی ایسی "تصدیق" ہے۔ جس کے ساتھ امن طمانیت ہو۔ اور اصطلاح شریعت میں جو کچھ ربّ کے پاس سے آیا ہے، دِل کا اس کی تصدیق کرنا۔ تو گویا کہ مؤمن ایمان کی وجہ سے اپنے آپ کو دارین میں عذاب سے یا تکذیب اور مخالفت سے محفوظ بنالیتا ہے۔

الایمان الامن سے باب افعال کا مصدر ہے۔ کہا جاتا ہے: **امنت و آمنت غیری** اور **آمنه** اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کی تصدیق کرلے۔ بعض نے کہا ہے کہ **امنت** کا معنی ہے **صرت ذا أمن** (میں امن والا ہوگیا) پھر تصدیق کے معنی کی طرف نقل کردیا گیا یہ لام کے ذریعے متعدی ہوتا ہے جیسے: ﴿وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا﴾ (یوسف۔۱۷) "آپ تو ہماری بات نہ مانیں گے"۔ **وقال فرعون** ﴿اٰمَنْتُمْ بِهٖ﴾ (الاعراف: ۱۲۳) "تم ایمان لائے ہو" اور کبھی اعتراف کے معنی کو متضمن ہوتا ہے اس وقت باء کے ذریعے متعدی ہوتا ہے جیسے: ﴿یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ (البقرہ:۳)۔ "غیب پر ایمان لاتے ہیں"۔

علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ کئی اقوال ہیں۔ ان میں سے پہلا قول جو اکثر علماء اشعری اور محققین کا ہے کہ "ایمان" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف تصدیق ہے ان امور میں کہ جن کا لانا ان سے واضح طور پر معلوم ہو، امور تفصیلیہ میں تفصیلی طور پر اور امور اجمالیہ میں اجمالی طور پر اس حال میں کہ یہ تصدیق جازم ہو اگرچہ بغیر دلیل کے ہو، یہاں تک کہ مقلّد کا ایمان بھی داخل ہو جائے گا قول اصح کے مطابق صحیح ہے اور اشعری سے جو اس کی عدم صحت منقول ہے اس کی تردید کی گئی ہے کہ یہ ان پر جھوٹ ہے۔

حاصل یہ کہ جس نے دین کے ارکان یعنی توحید نبوت اور نماز جیسے امور پر اعتقاد پس اگر اس نے شبہ کو جائز قرار دیا تو اس کا اعتقاد فاسد ہو جائے گا اور وہ کافر ہو گا اور اگر اس نے شبہ کو جائز قرار نہیں دیا تو وہ مؤمن ہے، لیکن نظر کے ترک کی وجہ سے فاسق ہو گا اور یہی ائمہ اربعہ اور اکثر علماء کا مذہب ہے۔ اس لئے کہ حضور ﷺ نے ایمان کو بغیر دلائل عقلیہ کے کھود کرید کے قبول فرمایا :كذا ذكره ابن حجرؒ)۔ لیکن ترک نظر سے اس کے فاسق ہونے میں ظاہری نظریہ، پس تو غور کر۔ پھر مجرد تصدیق کی قید سے یہ بات سمجھ آئی کہ اس کے ساتھ اعضاء کے اعمال معتبر نہیں اور یہ بات بھی ضروری ہے کہ جو امر اس طرح کا نہ ہو جیسے اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات کا عالم ہونا یا اس علم کا جو ذات پر صفت زائدہ ہے یا اللہ تعالیٰ کا مرئی (دکھائی دینے والا) ہونا تو بالا جماع اس کے منکر کو کافر قرار نہیں دیا جائے گا اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ تصدیق ظنی ایمان کے معنی کو حاصل کرنے میں کافی نہیں اور معنی یہ کہ ایمان دِل اور زبان کا اکٹھا عمل ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اقرار احکام کے اجراء کی شرط ہے نہ کہ فيما بينه وبين الله ایمان کی صحت شرط ہے۔ حافظ الدین نسفی فرماتے ہیں' یہی امام ابوحنیفہ سے مروی ہے اور اسی کو ابو منصور ماتریدی اور اشعری نے اختیار کیا ہے۔ اشعری کی دو روایتوں میں سے زیادہ صحیح روایت یہی ہے۔

بعض نے کہا: وہ رکن ہے لیکن اصلی نہیں بلکہ زائد ہے اس وجہ سے اکراہ اور عجز کے وقت ساقط ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جس نے تصدیق کی اور اچانک فوری طور پر مر گیا تو وہ بالا جماع مؤمن ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ پہلا مذہب متکلمین کا مذہب ہے اور دوسرا مذہب فقہاء کا ہے اور حق یہ ہے کہ اس کے مطالبہ کے وقت یہ رُکن ہے اور عدم مطالبہ کے وقت احکام کے اجراء کی شرط ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: ﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ﴾ [القصص:٥٦] ''آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے'' اس طور پر کہ مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت ابو طالب کے بارے میں نازل ہوئی اور اللہ مطالب کو زیادہ جاننے والا ہے۔ اس سے دونوں قول ثابت ہو جاتے ہیں، اور دونوں اختلاف لفظی ہیں۔

امام غزالیؒ سے یہ کلام منقول ہے کہ نطق سے امتناع ان معاصی کی طرح ہے جو ایمان کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں بظاہر اجماع کے خلاف ہے، لہٰذا اس کو عدم مطالبہ کے وقت امتناع پر محمول کیا جائے گا۔

باب کا خلاصہ یہ ہے کہ اقرار کو واجبات میں سے بنایا جائے نہ کہ شرط اور شطر۔

اور قول ثالث یہ کہ ایمان دِل اور زبان کا فعل ہے تمام ارکان کے ساتھ۔ یہ قول محدثین' مالک' شافعی' احمد' اوزاعی اور معتزلہ اور خوارج سے منقول ہے۔ لیکن معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کرنے والا ایمان اور کفر کے درمیان ہے بایں معنی کہ اس کو نہ مؤمن کہا جائے گا اور نہ کافر بلکہ اسے فاسق کہا جائے گا، ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔

خوارج کا مذہب یہ ہے کہ وہ کافر ہے اور اہلِ سنت کا مذہب یہ ہے کہ وہ مؤمن فاسق ہے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت داخل ہے، دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [النساء:٤٨] ''یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ شریک کئے جانے کو نہیں بخشتا اور اس کے سوا جسے چاہے بخش دیتے ہیں۔''

علماء نے کہا ہے کہ اصحاب حدیث اور تمام اہل سنت کے قول کے درمیان مغایرت ظاہر نہیں ہوگی، اس لئے کہ اوامر کی بجا آوری اور زواجر سے اجتناب بالاتفاق کمال ایمان میں سے ہے نہ کہ اس کی ماہیت میں سے۔ پس نزاع لفظی ہے نہ کہ حقیقی اور

اس طرح مندرجہ ذیل اختلافات بھی لفظی ہیں۔ نہ کہ حقیقی اور اسی طرح اختلاف ہے ایمان میں کمی اور زیادتی میں اور اسی طرح ایمان کا مشیت کے ساتھ متصل ہونے میں اور اسی طرح اختلاف ہے کہ ایمان مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ اور اسی طرح ملک اور بشر کے درمیان تفضیل اور اس بحث کا محل علم کلام کی کتب ہیں۔

الفصل الاول:

حدیث جبرئیل علیہ السلام

۲: عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ اِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيْدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ شَدِيْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ لَا يُرٰى عَلَيْهِ اَثَرُ السَّفَرِ وَلَا يَعْرِفُهٗ مِنَّا اَحَدٌ حَتّٰى جَلَسَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ اِلٰى رُكْبَتَيْهِ وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلٰى فَخِذَيْهِ وَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِسْلَامِ قَالَ الْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِيْمَ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكٰوةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا قَالَ صَدَقْتَ فَعَجِبْنَا لَهٗ يَسْاَلُهٗ وَ يُصَدِّقُهٗ قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِيْمَانِ قَالَ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ قَالَ صَدَقْتَ قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِحْسَانِ قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ السَّاعَةِ قَالَ مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنْ اَمَارَتِهَا قَالَ اَنْ تَلِدَ الْاَمَةُ رَبَّتَهَا وَاَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ قَالَ ثُمَّ انْطَلَقَ فَلَبِثْتُ مَلِيًّا ثُمَّ قَالَ لِيْ يَا عُمَرُ اَتَدْرِيْ مَنِ السَّائِلُ قُلْتُ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّهٗ جِبْرِيْلُ اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔

أخرجه مسلم ١/ ٣٦ حديث: ١، وابو داوٗد في السنن ٥/ ٦٩ حديث: ٤٦٩٥، وابن ماجه ١/ ٢٤ حديث: ٦٣، وأحمد في مسنده ١/ ٥١۔

ترجمہ: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک آدمی آیا جس کا لباس انتہائی سفید اور بال نہایت ہی سیاہ تھے چمکدار تھے۔ اس پر نہ تو سفر کی کوئی علامت تھی اور نہ ہی ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا تھا۔ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور رعایت ادب کی وجہ سے اپنے گھٹنے آپ کے گھٹنوں سے ملالئے اور اپنے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھ لئے۔ پھر اس نے سوال کیا۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے کہ اسلام کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ تعالیٰ کے

سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر پابندی سے نماز پڑھا کرو، زکوۃ ادا کیا کرو، رمضان المبارک کے روزے رکھا کرو، اگر بیت اللہ تک پہنچنے کی استطاعت ہو اور آنے جانے کا خرچہ موجود ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔ اس شخص نے عرض کیا آپ نے صحیح اور سچ فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں تعجب ہوا کہ یہ آدمی سوال بھی کر رہا ہے اور پھر جواب کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ پھر اس شخص نے سوال کیا۔ اے محمد ﷺ ایمان کیا چیز ہے آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کو اور اس کے فرشتوں کو۔ اس کی کتابوں کو، اس کے رسولوں کو اور قیامت کے دن کو دل سے تسلیم کرلو اور اس کی بھی تصدیق کرو کہ ہر اچھی اور بری تقدیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اس نے عرض کیا کہ آپ نے صحیح اور درست جواب دیا۔ پھر اس شخص نے سوال کیا کہ اے محمد ﷺ احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر اس کیفیت کا استحضار ممکن نہ ہو تو پھر یہ خیال کرلو کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ پھر اس شخص نے سوال کیا کہ قیامت کے بارے میں مجھے بتائیے کہ قیامت کب آئیگی۔ اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس کے متعلق سوال کرنے والے اور جواب دینے والے دونوں کا علم برابر ہے۔ پھر اس شخص نے سوال کیا کہ قیامت کی نشانیاں بتا دیجئے آپ نے فرمایا لونڈی اپنے مالک کو جنم دے گی اور پاؤں سے ننگے، جسم سے ننگے، فقیر اور بکریاں چرانے والوں کو عالیشان محلات میں غرور و تکبر کی زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھو گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ پھر وہ آدمی چلا گیا اور میں نے اس کے بارے میں فوراً آپ ﷺ سے کچھ نہ دریافت کیا کچھ دیر توقف کیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے خود ہی مجھ سے پوچھا۔ کہ عمر جانتے ہو وہ سوالات کرنے والا شخص کون تھا؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں کہ وہ کون تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ حضرت جبرائیل علیہ السلام تھے جو اس طریقہ سے تم لوگوں کو تمہارے دین کی تعلیم دینے کے لئے آئے تھے۔ (مسلم)

تشریح: قوله: قال بينما نحن عند رسول الله ﷺ ذات يوم اذ طلع علينا رجل :

"**بينما**": اس کی اصل بین ہے پھر فتحہ اشباع کیا گیا اور کہا گیا "بَینا"۔ پھر "ما" زیادہ کر دیا گیا بینما ہو گیا۔ یہ دونوں ظرف زمان ہیں۔ "**مفاجاة**" کے معنی میں ہیں۔ یہ دونوں کبھی جملہ اسمیہ کی طرف مضاف ہوتے ہیں اور کبھی جملہ فعلیہ کی طرف اور اذا میں عامل **مفاجاة** کا معنی ہے۔ پس حدیث کا معنی یہ ہوا: **وقت حضورنا في مجلس رسول الله ﷺ فاجأنا وقت طلوع ذلك الرجل**۔ **بينا** اس مقدر کا ظرف ہے اور "اذا" مفعول بہ ہے وقت کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ صاحب کشاف نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں کہا ہے: ﴿وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ﴾ (الزمر : ٤٥) "اور جب اس کے سوا (اوروں کا ذکر) کیا جائے تو ان کے دل کھل کر خوش ہو جاتے ہیں"۔ ای **وقت ذكر الذى من دونه ما جاء وا وقت الاستبشار**۔ پس "نحن" مبتداء ہے۔ "عند" ظرف مکان ہے **ذات يوم** "عند" کا ظرف ہے اس اعتبار سے کہ اس میں استقرار کا معنی ہے **أى بين أوقات نحن حاضرون عنده** یعنی ان اوقات میں جن میں ہم ان کے (حضور ﷺ کے) پاس حاضر ہوتے تھے۔ "نحن" کی خبر جملہ ظرفیہ ہے اور مجموعہ مضاف الیہ محذوف کی صفت ہے۔

"ذات" کی زیادتی مجاز کے وہم کو دور کرنے کے لیے ہے اس طور پر کہ **اليوم** سے مراد مطلق زمانہ ہے نہ کہ نہار (دن)

جیسا کہ تمہارے قول "رأيت ذات زيد" میں۔ بعض نے کہا ہے کہ ''ذات'' مقحم ہے اور بعض نے کہا بمعنی ساعت ہے۔
بعض نے کہا کہ "بین" لفظاً متعدد کی طرف مضاف ہوتا ہے جیسے آپ کا قول "جلست بين القوم" یا معناً جیسے آپ کا قول "جئت بين العشائين" اور جب اس کی اضافت جملہ کی طرف مقصود ہو تو ''الف'' یا ''ما'' ان اوقات کے عوض میں زیادہ کیا جاتا ہے جن کا تقاضا ''بین'' کرتا ہے اور بعض نے کہا مزید تین کا فائدہ صرف یہ ہے کہ دو جملوں پر دخول درست ہو سکے اور اس کے جواب میں ''اذ'' کا داخل کرنا جائز ہے جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے اور اس کا ترک بھی جائز ہے۔ جیسا کہ فصیح شعر میں ہے:

ع وبينا نحن نرقبه اتانا

اور ایک طریق میں آیا ہے: **بينما نحن عند رسول الله صلى الله عليه وسلم في آخر عمره** ۔ اور ان (یعنی حضرت جبرائیل) کے آنے میں تمام احکام کے نازل ہونے کے بعد تک تاخیر میں حکمت یہ ہے کہ دین کے وہ امور جو متفرق طور پر پہنچے، ہیں ایک ہی مجلس میں منضبط ہو جائیں۔ اور ایک قول کے مطابق وہ ۱۰ھ حجۃ الوداع سے کچھ پہلے آئے۔
مسلم شریف میں اس حدیث کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا "سلونی" (مجھ سے پوچھو) تو صحابہ سوال کرنے سے خوفزدہ ہو گئے چنانچہ حضرت جبرئیل آئے اور ابن منذہ کی روایت میں یوں ہے: ''**بينا رسول الله صلى الله عليه وسلم يخطب اى يعظ اذ جاء رجل**'' اور بخاری کی روایت میں ہے: **كان عليه الصلوٰة والسلام يوماً بارزًا للناس**''۔

ابوداؤد کی ایک دوسری روایت میں ہے:
''حضور ﷺ اپنے صحابہ کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک اجنبی آیا' کوئی بھی اسے نہیں جانتا تھا یہاں تک کہ اس نے سوال کیا، پس ہم نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ ہمارے لیے کوئی بیٹھنے کی جگہ بتا دیں تا کہ جب کوئی اجنبی آپ کے پاس آئے تو آپ کو پہچان لے فرمایا: ہم نے آپ ﷺ کے لیے گارے کا ایک چبوترہ بنایا۔ حضور ﷺ اس پر بیٹھتے تھے اور ہم آپ کے پہلو میں بیٹھتے تھے۔''
قرطبی رحمہ اللہ نے اس سے استنباط کیا ہے کہ، عالم کے لیے ایسی اونچی جگہ پر بیٹھنا سنت ہے جو اس کے لیے مختص ہو جبکہ اس کی ضرورت ہو اور یہ تعظیم وغیرہ کے لیے ہو۔
''طلع'': طلوع بمعنی ظہور ہے کمال نور سے اور یہ مستعار لیا گیا ہے **طلعت الشمس** سے اور اس میں ان کی کمال عظمت اور علو مرتبت کی طرف اشارہ ہے۔
'' رجل ''، رجل میں تنوین تعظیم کے لیے ہے اور تنکیر کا بھی احتمال ہے اگر چہ راوی روایت کے وقت جانتا تھا کہ وہ جبرئیل تھے لیکن انہوں نے ماضی کی حالت کی حکایت کی جیسا کہ ان کے قول "**لا يعرفه منا احد**" سے معلوم ہوتا ہے۔
یہ دلیل ہے کہ فرشتہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قدرت سے جو چاہے شکل اختیار کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
﴿فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا﴾ [مریم: ۱۷] ''پس وہ اس کے سامنے پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا''۔
بشر کی شکل اختیار کرنے میں حکمت یہ ہے کہ انسیت پیدا ہو۔ اس لئے کہ جنسیت ضم کی علت ہے۔ تو معنی یہ ہوا اذ

ہو جبریل۔ جیسا کہ ایک روایت میں یہی ہے اور نسائی کی روایت میں ہے کہ جبریل علیہ السلام دحیہ کلبی کی صورت میں نازل ہوئے یہ معلول ہے روایت کا وہم ہے جیسا کہ اس روایت میں عمر رضی اللہ عنہ (جن کا ذکر آگے آرہا ہے) کے قول کہ: **ولا یعرفه منا احد** سے معلوم ہوتا ہے ہاں وہ اکثر دحیہ کے کامل جمال کی وجہ سے ان کی صورت اختیار کرتے تھے۔

قوله: شدید بیاض الثیابه، شدید سواد الشعر، لا یری علیه اثر السفر:

"**شدید** "شدید کی اپنے مابعد کی طرف اضافت' اضافت لفظیہ ہے جو کہ صرف تخفیف کا فائدہ دیتی ہے۔ رجل کی صفت ہے۔

"**الثیاب**"، اور "**الشعر**" میں لام مضاف الیہ کے عوض میں ہے جو راجع ہے الرجل کی طرف یعنی **شدید بیاض ثیابه، شدید سواد شعره** اور ایک نسخہ میں صفت مشبہ کے دونوں صیغوں یعنی شدید میں تنوین ہے اور ان دونوں کا مابعد فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔

اس حدیث سے بیاض (سفیدی) کا اور کپڑوں میں صفائی کا استحباب معلوم ہوتا ہے اور یہ کہ طلب علم کا زمانہ شباب کا ہے' اس لیے کہ اس عمر میں مشقت کو برداشت کرنے کی طاقت ہوتی ہے اور ادائیگی کی قدرت ہوتی ہے۔

بیاض (سفیدی) کو، سواد (سیاہی) پر مقدم کیا اس لئے کہ یہ رنگوں میں سب سے بہتر اور جسموں کو محیط ہے اور اس لیے بھی تاکہ اچانک وحشت والے رنگ کے ساتھ سامنا نہ ہو۔

اور "ثیاب" صیغہ جمع لائے نہ کہ ثوب' یہ بتانے کے لیے کہ یہ سب اسی طرح ہیں یعنی کپڑے مکمل سفید تھے اور ابن حبان کی روایت میں ہے: **شدید سواد اللحیة** (بہت زیادہ کالی داڑھی تھی)۔ اس کے ذریعے سے "**شعر** "مذکور کا محمل حدیث مشہور میں واضح ہو گیا۔ "**الشعر** "دو فتحوں کے ساتھ زیادہ فصیح ہے دوسرے کے سکون سے اور (لفظ سفر کے) سجع کی رعایت کے پیش نظر بھی۔

"**لا یری علیه اثر السفر**":

مجہول غائب کے صیغے کے ساتھ اور "اثر" رفع کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔ یہی روایت اکثر اور اشہر ہے۔ علاوہ ازیں بصیغہ متکلم معروف اور "اَثر" کے نصب کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے۔ جملہ "رجل" سے حال ہے یا اس کی صفت ہے اور اثر سے مراد تھکاوٹ' تغیر اور غبار کا ظہور ہے۔

"سفر" ماخوذ ہے "السفر" سے، جس کے معنی ہیں الکشف "کھلنا"۔ اس لئے کہ اعمال کے وقت آدمیوں کے احوال کو کھولتا ہے۔

قوله: ولا یعرفه منا احد:

"**ولا یعرفه**" ماقبل پر عطف ہے۔ "**منا**" کی "**احد**" پر تقدیم اہتمام کے لیے ہے۔

ابوالفضائل علی بن عبداللہ بن احمد مصری جو زین العرب سے مشہور ہیں اپنی مصابیح کی شرح میں فرماتے ہیں: یعنی ہم صحابہ میں سے کوئی نہیں پہچانتا تھا ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ان کو پہچان لیا تھا۔ سید جمال الدین نے فرمایا کہ بعض روایات میں صراحۃ

آیا ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو نہیں پہچانا یہاں تک کہ جبرئیل علیہ السلام غائب ہو گئے۔ جیسا کہ شیخ ابن حجر عسقلانی نے اپنی بخاری کی شرح میں یہ فائدہ بیان کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ہم اس کے آنے کی کیفیت سے تعجب میں پڑ گئے اور ہمیں تردد ہوا کہ آیا یہ فرشتہ ہے یا جن ہے اس لئے کہ اگر وہ مدینہ کے لوگوں میں سے ہوتا تو ہم اس کو پہچانتے یا اگر اجنبی ہے تو اس پر سفر کے آثار ہوتے۔

اگر یہ کہا جائے کہ عمر رضی اللہ عنہ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ ان میں سے کوئی بھی اسے نہیں پہچانتا تھا؟

اس کے دو جواب دیئے گئے ہیں:

پہلا جواب ممکن ہے کہ یہ بات انہوں نے اپنے گمان کے مطابق کہی ہو۔

دوسرا جواب یہ بھی ممکن ہے کہ حاضرین کے صریح قول کی طرف نسبت کرتے ہوئے کہی ہو۔

دوسرا جواب زیادہ بہتر ہے۔ اس لئے کہ عثمان بن غیاث کی روایت میں ہے **فنظر القوم بعضهم الى بعض فقالوا: مانعرف هذا۔** کہ لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا ہم اسے نہیں پہچانتے: **كذا قاله الشيخ ابن حجر العسقلاني۔**

قوله: حتى جلس الى النبي ﷺ:

"حتی": محذوف کی غایت ہے جس پر "طلع" دلالت کر رہا ہے اس لیے کہ وہ بمعنی "اتی" ہے یعنی متوجہ ہوا اور اجازت مانگی۔

مسند امام اعظم میں حماد عن علقمہ عن ابن مسعود سے مروی ہے، فرمایا: جبرئیل علیہ السلام نبی ﷺ کے پاس ایک نوجوان کی صورت میں آئے انہوں نے سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے اور کہا: السلام علیکم یا رسول اللہ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وعلیک السلام"۔ پھر جبرائیل علیہ السلام نے کہا: اے اللہ کے رسول میں قریب ہو جاؤں آپ ﷺ نے فرمایا "قریب ہو جاؤ"۔ لہٰذا تقدیری عبارت یوں ہے: **دنا حتى جلس متوجها أي مائلا۔** یعنی وہ قریب ہوئے، یہاں تک کہ نبی ﷺ کی طرف متوجہ اور مائل ہو کر بیٹھ گئے۔

جلوس اور قعود دونوں مترادف لفظ ہیں۔ تورپشتی وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ قعود کا استعمال قیام کے ساتھ ہے اور جلوس کا استعمال لیٹنے کے ساتھ ہے کہ اس بات پر محمول ہے کہ یہ تحقیق اصل اور غالب و اکثر معنی کے اعتبار سے ہے اور ایک روایت میں ہے **حتى برك بين يدى النبى ﷺ كما يجلس أحدنا للصلوٰة** یہاں تک وہ نبی ﷺ کے سامنے بیٹھ گئے جس طرح ہم میں سے کوئی نماز میں بیٹھتا ہے۔ زین العرب کا یہ کہنا کہ وہ ان کے پہلو کی طرف یا ان کے ساتھ بیٹھ گئے یہ اگلے کلام **فأسند ركبتيه الى كبتيه** سے مناسبت نہیں رکھتا۔

قوله: فأسند ركبتيه الى ركبتيه و وضع كفيه على فخذيه:

اس نووارد نے اپنے گھٹنے رسول اللہ ﷺ کے گھٹنوں کے ساتھ ملا دیئے۔ اس لئے کہ گھٹنوں کے بل بیٹھنا تواضع اور آداب کے زیادہ قریب ہے اور گھٹنے کو گھٹنے سے ملانا کان لگانے میں زیادہ بلیغ ہے اور حضور قلبی کے حصول میں زیادہ تام ہے انسیت میں اکمل ہے، جلدی جواب دینے کو زیادہ لازم ہے اور اس وجہ سے بھی کہ اس ہیئت پر بیٹھنا سائل کی حاجت کی شدت پر دلالت کرتا

ہے اور جب مسئول اس کی حاجت جانے گا تو اس کی طرف جلد توجہ کرے گا۔

" **فخذيه**": فاء کے فتحہ کسرہ کے ساتھ۔ قاموس میں ہے **فخذ** جیسے کِتف پنڈلی اور سرین کے درمیان کا حصہ **فخذ** کی طرح مؤنث ہے اور کسرہ بھی دیا جاتا ہے أی **فخذی الرجل**۔

معلم کے سامنے متعلم کی یہی ہیئت مناسب ہے۔

حضور ﷺ کی رانوں پر ہاتھ رکھے تھے جیسا کہ نسائی وغیرہ کی روایت میں ہے: **ثم وضع يديه على ركبتي النبي ﷺ** پھر اپنے ہاتھوں کو نبی ﷺ کے گھٹنوں پر رکھا جیسا کہ شیخ ابن حجر عسقلانی نے بیان کیا ہے۔ تقرب' کان لگا کر بات سننے اور حضور ﷺ کے رخ زیبا تک نظر کو محدود رکھنے کے مقصد کے پیش نظر یہی حالت زیادہ مناسب تھی۔

قوله: وقال: يا محمد:

ایک قول کے مطابق انہوں نے ان کے نام سے پکارا اس لئے کہ حرمت تو اُمت کے ساتھ اسی زمانہ کے ساتھ مخصوص تھی یا مطلقاً تھی وہ فرشتہ معلم تھا (اس لیے اس کے لیے نام سے پکارنا جائز تھے) اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی اس کی تائید کرتا ہے: ﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾ (النور: ٦٣) "تم اللہ تعالیٰ کے نبی (ﷺ) کے بلانے کو ایسا بلاوا نہ کرلو جیسا کہ آپس میں ایک دوسرے سے ہوتا ہے"۔ اس لئے کہ خطاب آدمیوں کو ہے لہٰذا فرشتے کسی دلیل کی بنیاد پر ہی شامل ہونگے' یا اس سے معنی وضعی مراد ہوں نہ کہ معنی علمی میں نے نہیں دیکھا کہ کسی نے اس کو ذکر کیا ہو۔ صحاح میں ہے کہ بعض صحابہ کا حضور ﷺ کو نام سے پکارنا یہ تحریم سے پہلے تھا اور بعض نے نام سے پکارنے کو ترجیح دی، پوشیدگی میں زیادتی کے لیے۔ اس لیے کہ صحابہ کا اعتقاد تھا کہ آپ ﷺ کو صرف اجڈ عربی ہی نام لے کر پکارتے ہیں اور اس کا بھی احتمال ہے کہ یہ واقعہ تحریم سے قبل کا ہے۔

اور بعض نے یہ کہا کہ انہوں نے پوشدگی میں مبالغہ کے لیے سلام نہیں کیا یا یہ بیان کرنے کے لیے کہ وہ واجب نہیں یا سلام تو کیا لیکن راوی نے نقل نہیں کیا اور یہی صحیح ہے جیسا کہ امام صاحب کی روایت میں گذر چکا ہے اور جس نے اس کو یاد رکھا وہ اس پر حجت ہے جس نے محفوظ نہیں کیا' اور اس کو ذکر کرنے والا خاموش رہنے والے سے مقدم ہے اس لئے کہ اس میں علم کی زیادتی ہے۔ ہاں ایک روایت میں اس نے کہا: "السلام علیکم یا محمد"۔ دونوں طرح کی روایات میں جمع کی صورت یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ انہوں نے دونوں لفظوں کو جمع کیا اور کہا السلام علیکم یا محمد السلام علیک یا رسول اللہ اور قرطبی کے نزدیک یہ ہے کہ اس نے کہا :السلام علیکم یا محمد اور اس سے انہوں نے یہ اخذ کیا کہ داخل ہونے والے کے لیے سنت یہ ہے کہ عمومی سلام کرے پھر جس کے ساتھ خاص طور پر بات کرنا چاہے بات کرے۔ شیخ الاسلام فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ روایت میں جس چیز سے میں واقف ہوا ہوں، وہ یہ کہ اس میں بصیغۂ افراد السلام علیکم یا محمد ہے۔

میں کہتا ہوں اس کے ثابت ہونے کی صورت میں جمع کو لانے سے ظاہر تعظیم کا ارادہ ہے نہ کہ تعمیم کا۔ گویا کہ قرطبی نے اسے اللہ تعالیٰ کے قول : ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ [الطلاق: ١] "اے نبی (اپنی امت سے کہو کے) جب تم اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہو" کی نظیر بنایا ہے خطاب کے خاص اور حکم کے عام ہونے میں۔

قوله: اخبرني عن الاسلام:

ای أعلمنی عن الاسلام۔

"أخبرنی": یہاں امر کا صیغہ استدعاء کے لیے ہے جیسا کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ رسول ملائکہ سے افضل ہے۔

"اسلام": لغت میں اسلام کے معنی مطلقاً تابعداری ہے شرعاً وہ ظاہری تابعداری جو باطن کی تابعداری کی شرط کے ساتھ ہو جس کو ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ [الحجرات: ۱٤] "دیہاتی لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ آپ کہہ دیجئے کہ درحقیقت تم ایمان نہیں لائے لیکن تم یوں کہو کہ ہم اسلام لائے حالانکہ ابھی تک تمہارے دلوں میں ایمان داخل ہی نہیں ہوا" اور لام اس میں حقیقتِ شرعیہ کے لیے ہے۔ اس وجہ سے اس کا جواب ارکان خمسہ اسلامیہ سے دیا۔

پھر جاننا چاہیے کہ سوال اسلام کے بارے میں ہے اور اس کا جواب ایمان پر مقدم ہے۔

صحیح مسلم، کتاب الحمیدی، جامع الاصول، ریاض الصالحین اور شرح السنہ میں اس کا جواب مصابیح کے خلاف ہے۔ کہ اس میں ایمان اور تصدیق کو مقدم کیا ہے اگرچہ اسلام کی اساس ہونے کہ وجہ سے بھی مقدم ہے۔ لیکن مقام اسلام کی تقدیم کا تقاضا کرتا ہے اس لئے کہ وہ تصدیق پر دلیل ہے اور جبرئیل علیہ السلام آئے ہی شریعت کی تعلیم کے لیے تھے اور آپ ﷺ حکمتوں کے تدریجی مقتضی کے مطابق ظاہری حکم لگاتے تھے۔ پس ابتداء اس سے فرماتے جو زیادہ اہم ہوتا ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی فرماتے۔ لہٰذا اسلام ایمان پر مقدم ہوگا اور ایمان اخلاص پر جس کو احسان سے تعبیر کیا ہے۔

بخاری کی روایت میں اسلام ایمان سے مؤخر ہے لیکن یہ روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نہ کہ عمر رضی اللہ عنہ سے، پس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ لانے میں صاحب مشکوۃ کی طرف سے صاحب مصابیح بغوی پر اعتراض فعلی ہے۔

ایک روایت میں "احسان" دونوں کے درمیان میں ہے۔ کہا گیا کہ یہ اشارہ ہے اس طرف کہ ایمان کا محل قلب ہے اس لیے اس کو قلب میں ذکر کیا گیا اور توسط کی زیادہ ظاہر وجہ یہ ہے کہ اس کا طرفین میں سے ہر ایک کے ساتھ تعلق ہے۔

محققین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ: یہ تقدیم وتاخیر راویوں کی طرف سے ہے کیونکہ قضیہ ایک ہی ہے لہٰذا امر واقع ایک ہے جس کو راویوں نے مختلف اسالیب سے تعبیر کیا ہے۔

قولہ: قال: الاسلام ان تشهد ان لا اله الا الله:

"الاسلام": اس کا اعادہ کیا اور اس کو ضمیر کی جگہ رکھا تاکہ خوب وضاحت ہو جائے۔

"ان تشهد": یعنی اے مخاطب! خطاب عام ہے تعلم نہیں کہا اس لئے کہ شہادت انکشاف میں مطلق علم سے زیادہ بلیغ ہے۔ اس وجہ سے شہادت کی ادائیگی میں اشھد کی بجائے اعلم کہنا کافی نہیں۔ "ان" مصدریہ ہے۔ تقدیری عبارت یہ ہے: "الاسلام شهادة"۔

"ان" اور یہ مخففہ من المثقلہ ہے۔ ای انه اور ضمیر شان ہے۔

"لا اله": "لا" یہ نفی جنس کا ہے۔ اس کے افراد میں سے ہر ہر فرد کی تنصیصاً نفی کے لیے ہے۔

"الا الله" بعض نے کہا ہے "لا" کی خبر ہے اور حق یہ ہے کہ وہ محذوف ہے۔ اس میں زیادہ اچھی عبارت یہ ہے "لا اله

معبود بالحق فی الوجود الا الله" اور اس وجہ سے بھی کہ لفظ جلالہ نام ہے اس ذات کا جو صفات کے کمال کو مستجمع (تکمیل پانے والا) ہے اور معبود بالحق کا علم ہے۔ بعض نے کہا کہ اگر اس کو الرحمٰن کے ساتھ بدل دیا تو اس سے توحید مطلق صحیح نہ ہوگی۔

پھر کہا گیا ہے کہ توحید وہ کسی چیز کی وحدانیت کا حکم لگانا ہے، اور اس کا علم ہونا ہے اور اصلاح میں اللہ کی ذات کی وحدانیت کو ثابت کرنا ہے اس حال میں وہ اپنے مشابہ سے پاک ہونے کے ساتھ موصوف ہو اعتقاد پھر قولاً اور عملاً اور یقین وعرفان کے اعتبار سے اور مشاہدہ وعیان کے اعتبار سے اور ثبوت ودوام کے اعتبار سے۔

امام غزالی نے فرمایا: توحید کے دو مغز ہیں اور دو چھلکے ہیں بادام کی طرح۔ اوپر والا چھلکا وہ صرف زبان کا قول ہے اور دوسرا دِل کا پکا اعتقاد ہے اور اس کی گری یہ ہے کہ اللہ کے نور سے توحید منکشف ہو جائے اس طور پر کہ وہ دیکھے کہ بہت سی اشیاء ایک ہی فاعل سے صادر ہو رہی ہیں اور یہ پہچان لے کہ اسباب کا سلسلہ ان کے مسبّبات سے مربوط ہے اور مغز کا مغز یہ ہے کہ وجود میں ایک ہی کو دیکھے اور حق واحد ہی میں اس طور پر مستغرق ہو جائے کہ اس کے غیر کی طرف التفات نہ کرے۔

قوله: وأن محمدا رسول الله:

اس میں اشارہ ہے نبوت کی طرف۔ یہ وہ دو اصل ہیں جو ایک دوسرے کو ضرورتاً لازم ہیں اقامت دین میں؛ جس طرح کہ اسلام شہادتین پر موقوف ہے۔ حدیث کا ظاہر اس قائل کی تائید کر رہا ہے جس نے کہا کہ اقرار احکام کے اجراء کی شرط ہے اور بخاری کی روایت میں ہے أن تعبدالله و لاشرك به شيئا کہ تو اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔

محققین نے کہا کہ مجرد توحید یہ ہے جمع کو تفصیل سے چھپانا اور یہ محض جبر ہے جو اباحت تک پہنچاتا ہے اور قول وفعل کی رسول اللہ ﷺ اور تمام مخلوق کی طرف خالی اسناد تفصیل کو جمع سے چھپاتی ہے اور وہ صرف قدرۃ ہے جو تعطیل ثبوت تک پہنچاتی ہے اور ان دونوں کو اکٹھا کرنا حق محض ہے۔ عوارف میں انہوں نے کہا ہے جمع وہ اتصال ہے اور اتصال والا حق ہی کا مشاہدہ کرتا ہے، پس وہ اگر اس کے غیر کا مشاہدہ کرے تو وہاں جمع نہیں ہے۔ لہٰذا ﴿آمنا بالله﴾ جمع ہے اور ﴿وما انزل الینا﴾ [البقرة : ۱۳۶] تفرقہ ہے، اور اسی طرح ﴿ایاك نعبد﴾ تفرقہ ہے اور ﴿ایاك نستعین﴾ جمع ہے۔ اوّل جبریہ پر رد ہے اور ثانی قدریہ پر رد ہے۔

جنید فرماتے ہیں: وجد کے ساتھ قرب جمع ہے اور بشریت میں غیبت تفرقہ ہے اور ہر جمع بغیر تفرقہ کے زندقہ ہے اور ہر تفرقہ بغیر جمع کے تعطیل ہے۔ ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ "اور اللہ ہمیں کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے"۔

قوله: وتقیم الصلوٰة:

"تقیم" سے پہلے "أن" مقدر ہے اور "الصلوٰة" "ال" عہد کا ہے' نماز شرعی مراد ہے۔ مسلم کی روایت میں ہے "المکتوبة" اس پر متنبہ کرنے کے لیے کہ نفل نماز اگرچہ اسلام میں ہے لیکن اسلام کے ارکان میں سے نہیں، یعنی یہ کہ تو نماز ادا کر اور اس کی شرائط کی حفاظت کر اور اس کے ارکان میں تعدیل رکھ اور اس پر مداومت (ہمیشگی) کر۔ اسی وجہ سے وتصلی نہیں کہا۔

قوله: وتوتی الزکاة:

یہاں بھی "أن" مقدر ہے وان تعطیها اور اس میں اشارہ ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک ضروری ہے۔ یہ زکی بمعنی طھر ونما سے ماخوذ ہے۔ زکوٰۃ نام ہے اس مقدار کا جو نصاب میں سے نکالی جائے۔ وجہ تسمیہ یہ ہے یہ نکالنے والے یا جس (مال) سے نکالی جائے اسے پاک کرتی ہے اور برکت بڑھاتی ہے۔

قوله: وتصوم رمضان:

"تصوم" نصب کے ساتھ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ لفظ شہر کے بغیر صرف "رمضان" کہنا بلا کراہت جائز ہے یہی لفظ معتمد ہے۔ یہ رمض سے ماخوذ ہے۔ دھوپ کی تیزی سے اسی وجہ سے مہینے کو اسی کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ بھوک کی گرمی سے جل جانے کی وجہ سے اس کا نام رمضان رکھا چونکہ جس زمانے میں یہ واقع ہوا تھا وہ حرارت کا تھا یا اس وجہ سے کہ یہ گناہوں کو جلا دیتا ہے اور عیوب کو مٹا دیتا ہے یا اس وجہ سے کہ اس کے ساتھ شہوات کی حرارت زائل ہو جاتی ہے۔

"صوم" لغت میں روکنے کو کہتے ہیں اور شریعت میں اس کے معنی امساک (روکنا) مخصوص ہے وصف مخصوص کے ساتھ۔

قوله: وحج البيت ان استطعت اليه سبيلا :

"البيت" الف لام اس میں عہد کے لیے ہے ای البيت الحرام یا البیت اسم جنس ہے جو علم کے اعتبار سے کعبۃ اللہ پر غالب آ گیا اور لام اس میں جزء ہے جیسا کہ النجم ہے۔

"حج" لغت میں اس کے معنی ہیں قصد کرنا، یا مطلق تکرار شئی یا معظم کا ارادہ کرنا۔

شریعت میں وقت معین میں شرائط مخصوصہ کے ساتھ بیت اللہ کا قصد کرنے کا نام "حج" ہے۔

"اليه" کی ضمیر بیت کی طرف یا حج کی طرف راجح ہے یعنی اگر اس تک پہنچنا تیرے لئے ممکن ہو۔ اس طور پر کہ تو زادِ راہ اور سواری پالے جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے جس کی بہت سوں نے تصحیح کی ہے۔

"سبيلا": استطاعة کی نسبت سے تمیز ہے۔ جار سے اس کو مؤخر کیا تا کہ اوقع فی النفس ہو۔ "سبیل" وہ راستہ ہے جس میں سہولت ہو اور ہر اس راستے کو سبیل کہتے ہیں جس کے ذریعے کسی چیز تک پہنچا جائے اور اس کی تنکیر عموم کے لیے ہے۔ اس لئے کہ نکرہ اثبات میں عموم کا فائدہ دیتا ہے جیسا کہ زمخشری نے اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿علمت نفس﴾ [الانفطار: ۵] میں ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ مجاز ہے۔

"اليه" کو "سبيلا" پر مقدم کرنا اختصاص کے لیے ہے۔ یعنی کوئی بھی راستہ کسی بھی صورت میں ہو، قریب ہو یا بعید ہو یا ان دونوں جیسا جو اس تک، نہ کہ اس کے غیر تک اختصاص کی شرط کے ساتھ۔ بعض نے کہا کہ سبیلاً مفعول ہے بمعنی موصل اور مبلغ۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں (حج کا وجوب) مال کی وجہ سے ہے اور انہوں نے اپاہج غنی کے لیے نائب مقرر کرنے کو واجب قرار دیا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بدن کی وجہ سے ہے لہٰذا اس آدمی پر واجب ہے جو چلنے اور راستے میں کمانے پر قادر ہو اور امام ابوحنیفہؒ نے کہا کہ یہ دونوں باتوں کے مجموعہ کی وجہ سے ہے۔

استطاعت سے مراد قدرت ہے۔ "طاع لك" بمعنی سهل سے ماخوذ ہے۔ اس کا اطلاق اسباب کی سلامتی اور آلات

کی صحت پر ہوتا ہے۔ یہ کبھی فعل پر مقدم ہوتی ہے۔اور حیوان اس غرض پر ہوتا ہے جس کے ذریعے سے اختیاری افعال کیے جاتے ہیں مگر یہ فعل کے ساتھ ہی ہوتی ہے اور یہ استطاعت خاصہ ہے جیسا کہ معنی اوّل میں اس کی تفسیر بیان کی گئی۔ لہٰذا یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ وہ استطاعت کہ جس کی وجہ سے مکلّف عبادت کے فعل پر قادر ہوتا ہے یہ تو سب میں مشروط ہے' حج کو اس کے ساتھ کیسے خاص کر دیا گیا۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر تو یہ کہے کہ ارکان اسلامیہ میں سے صرف حج کو استطاعت کے ساتھ کیسے خاص کر دیا باوجود یکہ وہ استطاعت کہ جس کی وجہ سے مکلفین طاعت کے فعل پر قادر ہوتے ہیں یہ تو سب میں مشروط ہے۔اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس استطاعت کا معنی زادِراہ اور سواری ہے۔ایک گروہ اس زادِ اور راحلہ کو اس استطاعت میں شمار نہیں کرتا تھا اور وہ حاجیوں پر بوجھ بنتے تھے پس ان سے روک دیا گیا، یا اللہ کو معلوم تھا کہ آخری زمانے میں لوگ اس کو کریں گے تو بندوں پر آسانی کرنے کے لیے اس کی تصریح کر دی، اس کے باوجود آپ بہت سے لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ اس نص جلی کے لیے سر کو نہیں اٹھاتے اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں۔اور شاید کہ اس میں یہ حکمت ہو کہ ان اغنیاء پر حجت ہو جو حج کو بالکل چھوڑ دیتے ہیں باوجود یکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مال اور اثاثہ عطا کیا ہے۔

سارے فعل مضارع لائے گئے ہیں تا کہ ارکان اسلامی میں سے ہر ایک کے لیے استمرار تجددی کا فائدہ دیں۔ لہٰذا توحید میں استمرار دائم پوری زندگی کے لیے مطلوب ہے' نماز میں اس سے کم، پھر روزہ اور زکوٰۃ میں اس سے کم اور روزہ کو اس لئے مقدم کیا کہ اس کا تعلق تمام مکلفین سے ہے اور مؤخر اسے کیا جو عمر میں ایک دفعہ واجب ہے۔

فتح الباری میں لکھتے ہیں اگر کہا جائے کہ سوال تو عام ہے کیونکہ ماہیت اسلام کے بارے میں سوال کیا گیا ہے، اور جواب ان کے قول "ان تعبد وتشهد" کے ساتھ خاص ہے اور اس طرح ایمان کے بارے میں کہا کہ "ان تومن" اور احسان کے بارے میں کہا کہ "ان تعبد"۔ تو جواب یہ ہے کہ یہ ایک نکتہ کی وجہ سے ہے کہ مصدر "أن" اور فعل میں فرق ہے۔ اس لئے کہ "أن" اور فعل استقبال پر دلالت کرتا ہے اور مصدر زمانہ پر دلالت نہیں کرتا۔ اور ایک روایت میں یوں ہے: شهادة ان لا اله الا الله۔ بعض نے کہا: زیادہ بہتر ہے کہ جواب میں یوں کہا جائے کہ مقصد تعلیم ہے اور وہ مستقبل کے امور سے متعلق ہے اسی وجہ سے مصدر سے عدول کیا جو کہ سوال کے مناسب ہے، اور عدول کیا گیا اس چیز کی طرف جو استقبال پر دلالت کرے۔ دِل میں یہ بات آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی حقیقتِ حال کو زیادہ جانتا ہے کہ مصدر علم کے لیے مفید ہے اور مضارع عمل کا تقاضا کرتا ہے مصدر سے مضارع کی طرف عدول کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ "قوت" سے "فعل" کی طرف نکلے بغیر صرف معرفت ہی کافی نہیں اور اس عدول سے معلوم ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بلاغت کے انتہائی بلند درجوں پر پہنچے ہوئے تھے۔

ایک روایت میں حج کا ذکر نہیں ہے' دوسری روایت میں صوم کا ذکر نہیں ہے اور ایک روایت میں صرف شہادتین پر اکتفاء ہے اور دوسری میں صلوٰۃ اور زکوٰۃ پر اکتفاء کیا ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ بعض راویوں نے اس چیز کو ضبط کیا ہے جسے دوسرے ذہول اور نسیان کی وجہ سے ضبط نہیں کر پائے۔ یا کہا جائے گا کہ ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ توجیہ ہے۔ حج کو اس لئے حذف کیا گیا کیونکہ اس کا وجوب نادر ہے' عمر میں ایک مرتبہ ہے۔ روزے کو نماز کے ذکر پر اکتفاء کرتے ہوئے حذف کر دیا۔ اس لئے

کہ ان دونوں میں سے ہر ایک بدنی عبادت ہے۔ شہادتین پر اس وجہ سے اقتصار کیا کیونکہ وہ دونوں اسلام کی اساس ہیں۔ نماز اور زکوٰۃ پر اکتفاء اس وجہ سے کیا کیونکہ وہ دونوں بدنی اور مالی عبادت میں سے سب سے عمدہ ہیں اور مقصود ظاہری طاعت اور فرمانبرداری ہے' عبادت کے افراد کا احاطہ مقصود نہیں ہے۔ اگرچہ اس کے بڑے ارکان پانچ ہیں۔ لہٰذا بعض کے ذکر سے مراد بقیہ پر تنبیہ ہے۔ اس وجہ سے ایک روایت میں وارد ہے **وتعتمر وتغتسل من الجنابة وتتم الوضوء** (اور عمرہ کرنا اور جنابت سے غسل کرنا اور پورا وضو کرنا)۔ لہٰذا اختلاف لفظی کو تحدیث معنوی پر حمل کیا جائے گا۔

جاننا چاہیے کہ ان ارکان میں سے ہر ایک کا ظاہر ہے اس کے احکامِ فقہ کی کتابوں میں بیان کئے جائیں گے اور ہر ایک کا باطن ہے یعنی حقائق واسرار ہیں جن کو ان ارباب قلوب نے ذکر کیا ہے جو غیب کے رازوں کے امین ہیں۔ پس ہم اس میں سے کچھ کو ذکر کریں گے۔ توحید: وہ نام ہے انوار حق کی بقاء سے ظہور فناء خلق کا۔ اس کے کئی مراتب ہیں جن کو مناقب والوں نے ذکر کیا ہے۔

پہلا مرتبہ توحید نظری ہے اگر استدلال کے ذریعے سے معلوم ہو۔ یا توحید تقلیدی ہے اگر مخبر (خبر دینے والا) صادق کی صرف تصدیق پر پختہ یقین رکھے اور دِل کو شک وشبہ اور حیرت سے بچائے۔ وہ اس بات کا اعتقاد ہے کہ اللہ وصف الوہیت میں متفرد ہے اور بندگی کا اکیلا مستحق ہے۔ اموال اور خون کو اسی ذریعہ سے بچائے اور تمام احوال میں شرک جلی سے جدا ہو۔

دوسرا مرتبہ توحید علمی بندے کا اپنی صفات کے پردے سے نکل کر اور اپنی ذات کی ظلمتوں کی جیل سے نجات پا کر اور اختیار کے لباس سے ننگا ہو کر جبار کی عظمت کے انوار میں حیران ہونے اور انوار کے جلال کے تحت متحیر ہونے کا نام ہے۔ پس وہ جان لے کہ موجد محقق اور مؤثر مطلق وہ اللہ ہے' ہر ذات اس کی ذات کے نور کی فرع ہے۔ علم' قدرت' ارادہ' کان اور آنکھ کی ہر صفت اس کی صفات کے انوار کا عکس ہے اور اس کے افعال کے آثار کا اثر ہے اور اس کی منشا مراقبہ کا نور ہے۔

توحید کی اس قسم کا رتبہ مرتبہ حالیہ سے کم ہے۔ لیکن اس کی ملاوٹ تسنیم سے ہے یہ وہ چشمہ ہے جس سے مقربین پیتے ہیں۔ اس وقت وہ ظلمت وجودیہ سے دور ہو جائے گا اور کچھ شرک خفی مرتفع ہو جائے گا۔

تیسرا مرتبہ توحید حالی: وہ یہ ہے کہ توحید موحد کی ذات کا وصف لازم بن جائے بایں طور کہ غیر کے وجود کے نشانات کی ظلمتیں نیست ہو جائیں مگر تھوڑا سا توحید کے انوار کی روشنی میں ستاروں کا نور چھپ جاتا ہے۔ پس جب صبح روشن ہوتی ہے تو ستاروں کے نور کی روشنی لپیٹ دی جاتی ہے اور واحد کے وجود کے جمال کے مشاہدہ میں اس طور پر مستغرق ہوتا کہ اس کے شہود (حاضر ہونا) کے وقت واحد کی ذات ہی ظاہر ہو اور یہ دیکھے کہ توحید واحد کی صفت ہے نہ کہ اپنی صفت بلکہ اس کو نہ دیکھے۔ جنیدؒ فرماتے ہیں: توحید وہ معنی ہے جس میں رسوم (نشانات) مضمحل ہو جاتے ہیں اور اس میں علوم مندرج ہو جاتے ہیں اور اللہ ایسا ہو جائے جیسا کہ ہمیشہ سے ہے۔

چوتھا۔ اس کے حال کا نور علم توحید کے نور میں اس طرح چھپ جائے جس طرح سورج کا نور توحید الٰہی میں' وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ذات میں وحدانیت کے ساتھ اور صفات میں احدیت کے ساتھ ازل سے موصوف ہے۔ وہ تھا اور اس کے ساتھ کوئی چیز نہیں تھی اور وہ ابھی بھی جیسا تھا ویسا ہے: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ [القصص:۸۸] ''اس کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہو جانے

والی ہے'' اور یھلك نہیں کہا اس لئے کہ اس کی وحدانیت کی عزت کسی کے لئے وجود نہیں چھوڑے گا۔ اس معنی میں عارف انصاری نے اپنے لئے شعر کہا:

ما وحد الواحد من واحد اذ کل من وحده جاحد
واحد کی توحید کسی سے بیان نہیں کی گئی چونکہ جو اسکی توحید کرے گا وہ انکار کرنے والا ہے
توحید من ینطق عن نعته عاربة ابطلها الواحد
توحید اسکی ہے جو خالی ہو کر اسکی تعریف بیان کرے جس کو واحد باطل کر دے
توحیده ایاه توحیده ونعت من ینعته لاحد
اس کی توحید صرف اسی کی ہی توحید ہے اور تعریف اس کی ہے جو کسی کی تعریف کرے

نماز کے بارے میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے دو معراجیں تھیں۔ عالم حس میں معراج مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف پھر عالم ملکوت اور ملا اعلیٰ کے مقام کی طرف اور دوسری عالم ارواح میں تھی شہادت سے غیب کی طرف اور غیب سے غیب الغیب کی طرف جب آپ ﷺ نے واپسی کا ارادہ فرمایا تو ربّ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: مسافر جب اپنے وطن کی طرف لوٹتا ہے تو اپنے ساتھیوں کو تحائف پیش کرتا ہے اور بے شک آپ کی اُمت کا تحفہ نماز ہے جو دو معراجوں کو جامع ہے، معراج جسمانی آداب وافعال کے ساتھ اور روحانی کو اذکار واجمال کے ساتھ ہے۔ اس لئے وارد ہوا ہے: **الصلوٰۃ معراج المؤمن** کہ ''نماز مؤمن کی معراج ہے''۔

روزہ: صوم شریعت کے منافع شمار سے باہر ہیں اور اگر کوئی اور فضیلت نہ بھی ہوتی تو صرف ملا اعلیٰ کے ساتھ مشابہت کی فضیلت ہی کافی تھی اور صوم طریقت یہ ہے کہ رحمٰن کے مشاہدہ کی وجہ سے اکوان (کائنات، عام وجود) سے اور افطار رک جانا۔

صمت عن غیره فلما تجلی ☆ کان لی شاغل عن الافطار

''میں نے اس کے غیر سے روزہ رکھا پھر جب وہ ظاہر ہوا تو وہ مجھے افطار سے غافل کرنے والا تھا''

زکوٰۃ: یہ اشارہ ہے ظاہر وباطن کے احوال کے تزکیہ کی طرف' اموال کے ترک کے ذریعے اور ایسے اسباب پر خرچ کرنے کے ذریعے جو احوال اغیار سے دِل کے تخلیہ اور انوار کی تجلیات کے ظہور کے لیے روح کے تخلیہ کے ذریعہ۔

حج: وہ خلیل پر جلیل کے گھر کی زیارت کو واجب کرنے کی طرف اشارہ ہے اگر اس تک جانے کی استطاعت رکھتا ہو۔ اس طور پر کہ سلوک کی شرائط اس کا امکان' سفر کے آداب اور اس کے ارکان پائے۔ وہ رسوم اور عادات سے نکلنے کا احرام ہے' محبوب چیزوں سے فارغ ہونا ہے نیتوں کی صفائی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہے' معرفت کے عرفات کا وقوف کرنا ہے' جبل رحمت کی چوکھٹ سے چمٹا رہنا ہے' درندگی کے طور طریقوں سے چوکیداروں کے ذریعے نکل کر ربوبیت کے کعبہ کے گرد طواف کرنا ہے۔ صفات کے صفا اور مروات کے مروہ کے درمیان سعی کرنا ہے۔ انوار الٰہیہ کے استرے سے بندگی کے نشانات کے مٹنے کا حلق کرنا ہے اور اس پر سارے مناسک کو قیاس کرو۔

یا من الی وجهه حجی ومعتمری ان حج قوم الی ترب واحجار

اے وہ ذات کہ جسکی طرف میرا حج اور میرا عمرہ ہے	لوگوں کا حج مٹی اور پتھروں کی طرف ہے
لبیك لبیك من قرب ومن بعد	سرا بسر واضمارا باضمار
میں قریب سے حاضر ہوں اور دور سے حاضر ہوں	حالت سر میں سرا اور حالت خفا میں خفا

قولہ: قال: صدقت فعجبنا له یساله ویصدقه:

سائل نے جواب میں صدقت کہا' اس وہم کو دور کرنے کے لیے کہ اس نے اسے درست شمار نہیں کیا اور سامعین کو جواب یاد کرنے پر ابھارنے کے لیے۔

فعجبنا له: تعجب دِل کی حالت ہے جو کسی چیز کے سبب سے جہالت پر پیش آتی ہے۔

تعجب کی وجہ یہ تھی کہ اکثر سوال پوچھے جانے کے وقت جہالت کا تقاضا کرتا ہے اور تصدیق اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ سائل کو اس کا علم ہے۔ اسی وجہ سے "صدقت" اس وقت کہا جاتا ہے جب سائل کو پتہ چل جائے کہ مسئول (جس سے سوال کیا گیا) نے اس مجموعے اور تفصیل کی مطابقت کی ہے جو اس (مسئول) کے پاس ہے اور یہ سائل کی عادت کے خلاف تھا اور مزید تعجب اس پر ہوا کہ یہ جواب انہیں حضور ﷺ سے معلوم ہوا حالانکہ یہ آدمی ان لوگوں میں سے بھی نہیں تھا جس کی ملاقات حضور ﷺ سے معروف ہو چہ جائیکہ اس کا حضور ﷺ سے سماع ہو۔

ایک روایت میں ہے جب ہم نے اس آدمی کا قول 'صدقت" سنا تو ہم نے اس کا انکار کیا اور ایک دوسری روایت میں ہے' اس کو دیکھو آپ ﷺ سے سوال کرتا ہے اور ان کی تصدیق کرتا ہے گویا کہ ان سے زیادہ جاننے والا ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے ہم نے اس جیسا آدمی نہیں دیکھا گویا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو جانتا تھا جو اُن سے کہتا تھا" **صدقت صدقت** "(آپ نے سچ فرمایا)۔

بعض کا کہنا ہے کہ یہ شیخ کا طریقہ ہے جب طلبہ کی موجودگی میں کسی ماہر تجربہ کار کا امتحان لیتا ہے، تاکہ ان کی طمانیت اور اعتماد بڑھ جائے کہ اس نے سبق دہرایا ہوا ہے اور شیخ سے مسئلہ بے کم وکاست پہنچا رہا ہے اور اس میں ایک نسخہ اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى﴾ [النجم۔۳ تا۵] "اور نہ وہ اپنی خواہش سے کوئی بات کہتے ہیں۔ وہ تو صرف وحی ہے جو اتاری جاتی ہے۔ اسے پوری طاقت والے فرشتے نے سکھایا۔" کے ساتھ ہے۔

قولہ: قال فاخبرنی عن الایمان:

ایک روایت میں ہے "**ما الایمان**" اس سے شبہ پیدا ہوتا ہے کیونکہ "ما" سے ماہیت کے بارے سوال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جواب اسکے مطابق نہیں۔ یہ عدم مطابقت کی بات مردود ہے۔ اس لیے حدیث میں آیا ہے کہ حضور ﷺ کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس نے ایمان کے متعلقات کے بارے میں سوال کیا اس لئے کہ ان متعلقات کی تعلیم کا زیادہ حق ہے اور اس لئے بھی کہ تصدیق ان کے ضمن میں ہے۔ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ دونوں روایتوں میں کوئی فرق نہیں اور مطابقت دونوں جہت سے حاصل ہے اس لئے کہ ایمان۔

قولہ: قال: ان تؤمن باللہ وملائكته وكتبه ورسله واليوم الآخر:

"ان تؤمن" سے معنی لغوی مراد ہے اور بعضوں نے کہا معنی شرعی مراد ہے تا کہ " تفسیر الشئی بنفسه" لازم نہ آئے اور تعریف میں دور لازم نہ آئے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں تؤمن' تعترف کے معنی میں ہے۔ اس لئے "باء" کے ذریعے متعدی ہے یہ محل نظر ہے چونکہ "اعتراف "اسلام کے اجزاء میں سے ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ ایمان یہاں تصدیق کے معنی میں ہے اور وہ باء کے ذریعے متعدی ہوتا ہے۔ چنانچہ قاموس میں ہے آمن به ایماناً ای صدقه۔ ہاں اگر اعتراف کے معنی کو متضمن ہو تو اچھا ہے اور تقدیری عبارت یہ ہوگی: ان تصدق معترفا یا ان تعترف مصدقا۔ اور اقرار کے شطر ہونے یا شرط ہونے کا فائدہ دے گا۔ بعض نے کہا ہے کہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عمل ایمان کے مغایر ہے۔ اس لئے کہ اسلام کے بارے میں جواب دیا پھر ایمان کے بارے میں جواب دیا اور اس کو تصدیق قرار دیا۔

اللہ پر ایمان:

یعنی اس کی ذات کی توحید پر' اس کی صفات کی تفرید پر' اس کے وجود کے وجوب پر' اس کے جود و کرم کے ثبوت پر' اس کی تمام صفات کمال پر جو اس کے جلال و جمال کا تقاضا کرتی ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ صفت یا حقیقی ہے کہ اس کا تصور کسی چیز پر موقوف نہ ہو جیسے حیات، یا صفت اضافی ہے کہ اس پر موقوف ہو جیسے وجوب اور قدیم ہونا یا صفت وجودی ہے جیسا کہ یہ اکرام کی صفات ہیں یا صفت سلبی ہے جیسے جلال کی صفات ہیں اور صفت وجودی آٹھ چیزوں میں ہے جسے شاعر نے نظم میں کہا:

حیاة وعلم قدرة و ارادة ☆ کلام وابصار وسمع مع البقا

حیات' علم' قدرت اور ارادہ ۔ کلام اور دیکھنا اور سُننا ہے بقا کے ساتھ

ابن صلاح فرماتے ہیں یہ حدیث ایمان کی اصل کا بیان ہے اور وہ اصل تصدیق ہے اور اسلام فرمانبرداری کا نام ہے۔ اسلام کا حکم شہادتین سے ثابت ہوتا ہے اور ان دونوں کی طرف اعمال مذکورہ کی نسبت کی ہے اس لئے کہ اس کے شعائر میں سے سب سے ظاہر ہے۔

کہا گیا ہے کہ ایمان کا اطلاق کبھی اسلام پر کیا جاتا ہے جیسا کہ حدیث عبدقیس میں ہے اور یہ اسلام اصل ایمان کو شامل ہے اور اصل ایمان تصدیق اور طاعات ہیں۔ لہٰذا یہ سب کچھ تابعداری ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ دونوں اکٹھے ہوتے ہیں اور جدا بھی ہوتے ہیں۔ ہر مؤمن مسلم ہے بخلاف اس کے برعکس کے اور یہ تحقیق جمہور علماء کے مذہب کے موافق ہے اھ اور مشہور یہ ہے کہ یہ دونوں شریعت میں مترادف ہیں۔ ابن عبدالبر نے اس کو اکثر سے نقل کیا ہے۔ اس لئے کہ ظاہری تابعداری بغیر باطنی تابعداری کے نفع نہیں دیتی اسی طرح اس کے برعکس۔ حق یہ ہے کہ یہ اختلاف لفظی ہے اس لئے کہ پہلے کا مبنی دنیاوی حکم پر ہے اور دوسرے کا مدار اخروی امر پر ہے۔ یا پہلے کی بناء لغت پر ہے اور دوسرے کا مدار شریعت پر ہے۔ اس مسئلے میں دو بڑے اماموں نے فن تصنیف میں قدم رکھا ہے اور ان کے متغایر یا مترادف ہونے پر بہت زیادہ دلائل دیے ہیں، اس میں دونوں برابر ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ دونوں مفہوم کے اعتبار سے مختلف ہیں اور مصداق کے اعتبار سے متحد ہیں، واللہ اعلم۔

تصدیق نفس کا اقرار کرنا ہے اور اس کا اس چیز کو قبول کرنا ہے کہ جس کو قبول کرنا واجب ہے، تصدیق کی دو قسمیں ہیں ① تقلیدی ② تحقیقی اور تحقیقی یا استدلالی ہے یا ذوقی اور ذوقی یا کشفی ہے جو علم کی حد پر موقوف ہے یا غیبی ہے جو اس پر موقوف نہ ہو اور غیبی یا مشاہدہ ہے یا شہود اور اوّل وہ اعتقاد ہے جو جازم ہو مطابق ہو اور اس کا زوال ممتنع ہو ثانی وہ اعتقاد جازم ہے جو برہان سے ثابت ہو اور ثالث وہ ہے جس کا زوال ممتنع ہو اور ثابت ہو وجدان سے تین ایمان بالغیب کے مراتب ہیں اور اُخری دو "علم الیقین" ہے۔

رابع وہ مشاہدہ روحانیہ ہے جو اثنینیت (دو ہونا) کی بقا کے ساتھ ہو۔ اس کا نام "عین الیقین" ہے۔

خامس: وہ شہود حقانی ہے، وحدتِ ذاتیہ کی تجلی اور زوال اثنینیت کے وقت۔ اس کا نام حق الیقین ہے۔ ایمان کا وجود غیبی ہے اور ایک وجود ذہنی ہے اور وجود لفظی ہے۔ پہلے کی طرف شیخ کبیر ابوعبداللہ شیرازی نے اپنے معتقد میں اشارہ کیا ہے، کہ یہ نور ہے جو ذات کے نور سے دِل میں ڈالا جاتا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی اصل نور ہے جس کو حق تعالیٰ اپنے ملکوت سے اپنے بندوں کے دِلوں کی طرف پھینکتے ہیں، پس وہ ان کے اسرار کے متصل ہو جاتا ہے اور وہ اس حضرۃ (حضوری) سے متصل ہو جاتا ہے جو ان کے قلوب میں ثابت ہے۔ لہٰذا جب اس کے لئے حق کا جمال منکشف ہوتا ہے تو یہ نور بڑھ جاتا ہے پھر تقویت پکڑتا رہتا ہے یہاں تک کہ صدر میں انشراح اور انبساط ہو جاتا ہے اور بندہ اشیاء کے حقائق پر مطلع ہوتا ہے اور اس کے لیے غیب اور غیب الغیب اچھی طرح ظاہر ہو جاتا ہے اور اس کے لئے انبیاء کا صدق ظاہر ہوتا ہے اور اس کے دِل میں اتباع کا داعیہ اٹھتا ہے اور اعمال واخلاق کے انوار اس کی معرفت کے نور کی طرف ملتے ہیں۔ ﴿نور علی نور یهدی الله لنوره من یشاء﴾ اور یہ قذف اور کشف صفات کی بادِ نسیم کے اوقات میں اللہ کی مراد کے متعلق ہوتا ہے۔ کسی کو اس کے کسب پر قدرت نہیں۔ ہاں اس کی شرائط کسبی ہیں اور بہر حال وجود ذہنی تو اس نور کا ملاحظہ اور مطالعہ تصدیق سے ہے اور وجود لفظی، پس وہ شہادتین ہیں۔ جیسا کہ عوام کا ایمان وہ تصدیق بالجنان اقرار باللسان اور عمل بالارکان ہے، اور خواص کا ایمان وہ نفس کا دنیا سے جدا ہونا ہے اور اس کا سلوک آخرت کا راستہ ہے اور مولیٰ کے ساتھ دِل کا حاضر ہونا ہے اور خواص الخواص کا ایمان وہ اللہ کی طاعت میں ظاہر اور باطن کی ملازمت ہے (ایک دوسرے کا لازم ہونا) اور مخلوق کی فنا فی اللہ کی طرف انابت ہے اور سر کو بقاء باللہ کے لیے خالص کرنا ہے۔ اللہ ہمیں اس کا ذائقہ چکھائے۔

فرشتوں پر ایمان:

"ملائکة": ملاك کی جمع ہے۔ اس کی اصل مألك، ہمزہ کی تقدیم کے ساتھ "الألوكة" سے ہے۔ جس کے معنی ہیں رسالت (پیغام پہنچانا) ہے۔ ہمزہ پر لام کو مقدم کیا گیا اور ہمزہ کی حرکت ما قبل کو نقل کر کے اسے حذف کر دیا گیا۔ "ملک" ہو گیا۔ جب اس کی جمع لائی جاتی ہے تو ہمزہ لوٹ آتا ہے۔ بعض نے کہا الف سے بدل دیا اور لام کو مقدم کیا۔ اس کی جمع فعائل کے وزن پر آتی ہے جیسے "شمال" اور "شمائل"۔ مفرد کے ہمزہ کو کثرت استعمال کی وجہ سے ترک کر دیا گیا اور اس کی حرکت

لام کو دے دی گئی۔ تاءِ جمع کی تانیث کے لیے ہے یا اس کے معنیٰ کی مزید تاکید کے لیے ہے۔

اس کا اطلاق غلبہ کی وجہ سے جواہر علویہ نورانیہ پر کیا گیا جو جسمانی کدورتوں سے پاک ہیں۔ یہ اللہ اور اس کے انبیاء کے درمیان واسطے ہیں اور اس کے مخلص دوستوں کے خواص ہیں۔ بعضوں نے کہا: وہ اجسام لطیفہ نورانیہ ہیں جو مختلف شکلوں کے بدلنے پر قادر ہیں اور ان کے لئے چڑھنا اور اُترنا جائز ہے۔ ان کی تسبیح ہمارے سانس لینے کی طرح ہے۔ تکلیف کی مشقت ان سے ہٹائی ہوئی ہے۔ معنی یہ ہے کہ ان میں سے جن کے نام یقینی معلوم ہیں جیسے جبرئیل علیہ السلام، میکائیل علیہ السلام، اسرافیل علیہ السلام، عزرائیل علیہ السلام، ان کے وجود کا ہم تفصیلاً اعتقاد رکھتے ہیں اور ان کے علاوہ پر اجمالاً۔ وہ اللہ کے مکرّم بندے ہیں جو دِن رات اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں اور کوتاہی نہیں کرتے اور اللہ جو ان کو حکم دے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے۔ ان میں سے کراماً کاتبین ہیں اور عرش کو اٹھانے والے مقربین ہیں اور ان کے دو دو، تین تین، چار چار، پَر ہیں اور وہ مؤنث ہونے اور مذکر ہونے کے وصف سے پاک ہیں۔ بہر حال پیغمبروں کا ان سے افضل ہونا یا اس کے برعکس اس میں سے کسی ایک کا اعتقاد واجب نہیں اس لئے کہ مسئلہ ظنی ہے۔

اگر تو کہے ایمان صحیح کے مفہوم میں ان پر ایمان کے دخول کا کیا سبب ہے، حالانکہ مقصود بالذات مبدأ اور معاد کی معرفت ہے۔ جواب یہ ہے کہ فطین لوگوں کی کئی قسمیں ہیں۔ بعض وہ ہیں جو معقول کو محسوس کی طرح دیکھتے ہیں اور مشاہد کی طرح غائب کا ادراک کرتے ہیں یہ فطین شخصیات انبیاء ہیں۔ دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر صرف حس اور وہم کی متابعت غالب ہے۔ مخلوق کے اکثر لوگ ایسے ہی ہیں۔ ان کے لئے ایک معلم ضروری ہے جو ان کو حق کی طرف بلائے اور ان کو زیغ (ٹیڑھا پن، شک) مطلق سے محفوظ رکھے اور ان کے لئے مغیبات کو ظاہر کرے اور ان کی عقلوں سے شبہات کو کھولے۔ اس کام کے لیے مبعوث نبی ہی ہو سکتا ہے اور وہ اگرچہ انسانی طبیعت کو مشتعل کرنے والا ہے: ﴿يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ﴾[النور: ۳۵] "قریب ہے کہ اس کا تیل روشن کر دے اگرچہ اسے آگ نہ چھوئے"۔ ایسے نور کا محتاج ہے جو اس کے لئے غائب کو ظاہر کر دے اور وہ وحی اور کتاب ہے۔ اسی لئے قرآن کا نام "نور" رکھا اور اس کے لئے اٹھانے والا اور پہنچانے والا ضروری ہے اور وہ فرشتہ متوسطہ ہے۔ اسی طرف اپنے اس قول میں اشارہ کیا: ﴿إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا﴾[الجن: ۲۷] مراد یہ ہے کہ "وہ مؤمن تب ہی ہو سکتا ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ سیکھ لے جس کی تحقیق اس کتاب کے ارشاد سے ہوئی ہے جو اس تک فرشتے کے توسط سے پہنچی ہے" کہ اس کا ایک الٰہ ہے جو واجب الوجود ہے سخاوت کو جاری کرنے والا ہے جو شریعت سے ثابت ہے۔

کتابوں پر ایمان:

کتابیں اس کے رسولوں پر نازل کی گئی ہیں اس کا تفصیلی طور پر اعتقاد رکھتے ہیں ان کتابوں میں جو یقینی طور پر معلوم ہیں جیسے قرآن اور تورات اور زبور اور انجیل اور اس کے علاوہ میں اجمالی طور پر اور یہ قرآن کی وجہ سے منسوخ ہو چکی ہیں اور قیامت کے قائم ہونے تک اس میں نسخ اور تحریف ممکن نہیں، اور دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ

لَحٰفِظُوْنَ﴾۔ [الحجر: ۹] ''ہم نے ہی اس قرآن کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں''۔

قرآن کے غیر مخلوق ہونے میں معتزلہ اور اہلِ سنت کا اختلاف ہے۔ ایک قول کے مطابق نازل ہونے والی کتب ایک سو چار ہیں۔ ان میں سے پچاس صحیفے شیث علیہ السلام پر، تیس صحیفے ادریس علیہ السلام پر، دس صحیفے حضرت آدم علیہ السلام پر، دس صحیفے ابراہیم علیہ السلام پر اور چار سابقہ ہیں۔ ان میں سب سے افضل قرآن ہے۔

رسولوں پر ایمان:

انہوں نے ان احکام کی تبلیغ کی جو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف نازل کئے وہ معصوم ہیں اور ایمان لانا ان کے وجود پر تفصیلی طور پر جو نص اور تواتر سے معلوم ہیں اور ان کے علاوہ پر اجمالی طور پر۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ رسول اور نبی مترادف ہیں۔ اس لئے کہ جیسے رسولوں پر ایمان لانا واجب ہے اسی طرح انبیاء پر بھی ایمان لانا واجب ہے۔ امام احمد نے ابوامامہ سے حدیث نقل کی ہے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! انبیاء کی تعداد کتنی ہے؟ انہوں نے فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار ان میں سے رسول تین سو پندرہ ہیں۔ اھ

یہ روایت تغایر میں ظاہر ہے اور یہی جمہور کا مذہب ہے کہ ان دونوں میں فرق ہے۔ بایں طور کہ نبی وہ انسان ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے اگرچہ اسے تبلیغ کا حکم نہیں کیا گیا اور رسول وہ ہے جسے اس کا حکم کیا گیا۔ لہٰذا ہر رسول نبی ہے نہ کہ اس کے برعکس۔ شاید تخصیص کی وجہ یہ ہو کہ رسول ایمان میں مقصود بالذات ہیں اس اعتبار سے کہ وہ مبلغ ہیں اور انبیاء پر ایمان وہ رسولوں کی تبلیغ کی جہت سے معلوم ہوا ہے۔ اس لئے کہ انبیاء کے لیے تبلیغ نہیں، واللہ اعلم اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے منافی نہیں ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ﴾ [غافر: ۷۸] ''یقیناً ہم آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیج چکے ہیں جن میں سے بعض کے (واقعات) ہم آپ کو بیان کر چکے ہیں اور ان میں سے بعض کے (قصے) تو ہم نے آپ کو بیان ہی نہیں کئے'' اس لئے کہ نفی تفصیل کی ہے اور ثابت اجمال ہے، یا نفی وحی جلی کے ساتھ مقید ہے، اور ثبوت وحی خفی کے ساتھ متحقق ہے۔

اگر تو یہ کہے کہ رسل کے مابعد اور ان کے ماقبل کا ذکر کا کیا فائدہ باوجودیکہ ان پر ایمان لانا مستلزم ہے ان تمام احکام پر ایمان لانے کو جو وہ لائے وہ ان سب پر ایمان لانے کو مستلزم ہے۔ میں کہتا ہوں یہ تنبیہ ہے ترتیب پر۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتے کو کتاب دیکر رسول کے پاس بھیجا تا کہ مبدا اور معاد کی معرفت حاصل ہو اور خیر و شر بندوں پر اس کی تقدیر اور قضاء اور ارادہ کے مقتضی کے مطابق جاری ہوتے ہیں اس وجہ سے ملائکہ کو مقدم کیا نہ اس وجہ سے کہ وہ رسولوں سے افضل ہیں۔ اس لئے کہ وہ مختلف ہیں اور نہ کتابوں سے اس لئے کہ کوئی بھی ان کا قائل نہیں اور یہ ترتیب ان چیزوں میں سے ہے جن کا تقاضا عالم تکلیف و وسائط کی حکمت کرتی ہے ہمارے نبی کا مقام تو معروف ہے کہ اللہ کے ساتھ جس میں مجھے مقرب فرشتے کی اور نہ ہی نبی مرسل کو قدرت ہوتی ہے اس لئے کہ اس میں مشاہدہ کے کشوف (ظہور) کے وقت میں اس کے قدرت دینے اور وحدت کے سمندر میں اس کے مستغرق ہونے کی طرف اشارہ ہے اس وقت میں بشریت اور کونین (دونوں جہان) کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا' اور یہ ان

کی استقامت کا وہ محل ہے کہ جس کے بارے میں اللہ نے اپنے اس فرمان میں خبر دی ہے: ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ﴾ ''پس وہ دو کمانوں کے بقدر فاصلہ پر رہ گیا بلکہ اس سے بھی کم''۔ [النجم:۹] وہاں نہ جبرئیل علیہ السلام کا مقام ہے اور نہ مقرب فرشتوں کا اور نہ (آدم علیہ السلام) صفی کا مقام اور نہ (ابراہیم علیہ السلام) خلیل کا اور نہ ان کے علاوہ اور انبیاء علیہم السلام کا۔ ان کے اکثر اوقات ایسے ہی ہوتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض اوقات اُمت کو آداب سکھانے کے لیے لوٹا دیتے تھے تا کہ طرح طرح کے احکام ان پر جاری کریں اور کبریاءِ ازل کے انوار میں گھلتے نہ رہیں۔

قیامت کے دن پر ایمان:

یوم آخرت سے مراد قیامت کا دِن ہے۔ قیامت کے دن کو یوم آخرت، اس لئے کہتے ہیں کہ وہ دنیا کے ایام کا آخر ہے اور یہ زیادہ اچھا ہے تا کہ احوال برزخ کو بھی شامل ہو جائے اس لئے کہ وہ دنیا کے ایام میں سے آخری دن ہے اور آخرت کے ایام میں سے پہلا دن ہے اور اس لئے بھی کہ وہ اس کا مقدمہ ہے یا اس وجہ سے کہ اس کے آخر میں حساب و جزا ہے۔ بعض نے کہا وہ ایسی ابد دائم ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگی اس لئے کہ وہ اوقات محدودہ سے مؤخر ہے۔ روز قیامت پر ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے وجود پر ایمان' بعث جسمانی' حساب' جنت اور دوزخ وغیرہ پر ایمان لائے کہ جن کے بارے میں نصوص آئی ہیں۔ بخاری کی روایت میں ہے: **والبعث الآخر** یہ تاکید ہے جیسے: **امس الذاهب** (جانے والا گذشتہ کل) میں ہے یا اس کے تعدد کا فائدہ دینے کے لیے۔ اس لئے کہ اوّل عدم سے وجود کی طرف اخراج ہے یا ماؤں کے پیٹ سے دنیا کی طرف اور اخراج ثانی قبروں کے پیٹ سے محل حشر ونشور کی طرف اٹھایا جانا ہے اور بخاری کی دوسری روایت میں ہے: **وبلقائه وتؤمن بالبعث**۔ پس ''لقاء'' وہ دارِ جزاء کی طرف انتقال ہے اور ''بعث'' وہ مردوں کا اپنی قبروں سے اٹھایا جانا اور اس کا مابعد ہے یعنی حساب' میزان' جنت اور دوزخ اور ایک روایت میں ان چاروں کی تصریح ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ لقاء سے مراد حساب ہے اور بعض نے کہا اللہ تعالیٰ کی رؤیت (دیکھنا) ہے اور بعض نے کہا بعث سے مراد انبیاء کی بعثت ہے۔

قوله: وتؤمن بالقدر خيره وشره :

''تؤمن'' سے پہلے ''أن'' مقدر ہے ''القدر'' دال کے فتحہ اور سکون کے ساتھ۔ جو اللہ نے مقدر کیا اور اس کا فیصلہ کیا۔ عامل کا اعادہ تو عہد کے بعد کی وجہ سے ہے جیسے شاعر کا قول:

لقد علم الحيي اليماني أنني ☆ اذا قلت اما بعد انى خطيبها

حیی یمانی کو معلوم ہے کہ جب میں نے کہا اما بعد تو میں اس کا خطیب ہوں

یا اس کی قدر کے شرف اور اس کے امر کے بڑا ہونے کی وجہ سے ہے کہ اس میں اہتمام واقع ہوا ہے۔ اس لئے کہ یہ عقلوں کے حیران ہونے کی جگہ اور قدموں کے پھسل جانے کی جگہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ اُمت اس میں غور وخوض کرے گی اور بعض اس سے بچیں گے۔ پس اس کو مہتم بالشان بنایا پھر اس کو مزید پختہ کیا' اس کا ''بدل'' لا کر ''خيره وشره'' یعنی اس کا نفع اور نقصان۔ ایک روایت میں ''وحلوه ومره'' (اس کا میٹھا اور کڑوا) کی زیادتی ہے۔ بدل توضیح ہے تاکید کے ساتھ جو کہ عامل

کے مکرر ہونے کی وجہ سے تعمیم کا فائدہ دیتی ہے۔ میرے نزدیک عامل کے اعادہ نے یہاں یہ فائدہ دیا کہ اس پر ایمان لانے والا وہ سابقہ سے کم ہے۔ اس لئے کہ جس نے گذشتہ اشیاء میں سے کسی کا انکار کیا وہ کافر ہو جائے گا اس کے برخلاف جس نے اس کا انکار کیا وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوگا لہٰذا یہ بمنزلہ تذلیل وتطویل کے لیے ہے۔

ابن ملک کا قول کہ ''خیرہ و شرہ بدل بعض ہے'' یہ ظاہر نہیں الا یہ کہ یوں کہا جائے کہ معطوف اور معطوف علیہ میں سے ہر ایک کے اعتبار سے زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ بدل الکل ہے اور رابطہ عطف کے بعد ہے۔ تقدیر پر ایمان کا معنی یہ ہے کہ تو یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے خیر اور شر کو مقدر کیا اور تمام کائنات اس کی قضاء وقدر سے متعلق ومرتبط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِندِ اللَّهِ﴾ [النساء:۷۸] "اس نے ان کا ارادہ کیا'' وہ ان کا مرید (چاہنے والا) ہے۔ دلیل یہ ارشاد باری ہے: ﴿فَمَن يُرِدِ اللَّهُ أَن يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ﴾ [الانعام:۱۲۵] "وہ طاعات کو پسند کرتا ہے اور ان سے راضی ہوتا ہے بخلاف کفر اور معاصی کے''۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾ [الزمر:۷] ''اور وہ اپنے بندوں کی ناشکری سے خوش نہیں ہے'' اور ارادہ رضا کو مستلزم نہیں۔

قضاء وہ حکم ہے جو پہلے اُم کتاب میں تھا پھر لوح محفوظ میں علی سبیل الاجمال خاص ترتیب پر تمام موجودات کا نظام ہے۔ قدر اشیاء کا اپنے اوقات میں ارادہ سے متعلق ہونا ہے اور وہ اس کے قضاء سابق کی تفصیل ہے موادِ جزئیہ میں اس کو موجود کر کے جس (موادِ جزئیہ) کا نام لوح المحو والاثبات ہے، جس طرح الکتاب کا نام '' لوح القضاء ''اور ''اللوح المحفوظ '' کا نام لوح القدر رکھا گیا ہے۔ یہ قاضی کے کلام کی تحقیق ہے۔

جب ایمان بالقدر مستلزم ہے ایمان بالقضاء کو تو اس کے درپے نہیں ہوئے۔ راغب نے ذکر کیا ہے کہ قدر تقدیر ہے اور قضاء تفصیل ہے پس وہ اخص ہے اور اس کی مثال یہ ہے کہ ''قدر'' لباس پہننے کی تیاری کرنا ہے اور قضاء بمنزلہ لباس پہننے کے ہے۔ جو کچھ حکیم ترمذی نے ذکر کیا ہے وہ اس کی تائید کرتا ہے کہ ابتداء میں علم تھا پھر ذکر پھر مشیت پھر تدبیر پھر مقادیر پھر لوح میں اثبات پھر ارادہ پھر قضا۔ لہٰذا جب وہ کہتا ہے کُن (ہو جا) تو وہ ایسی ہیئت پر ہو جاتا ہے جس کا علم تھا اور ذکر کیا پھر چاہا اور تدبیر کی گئی پھر مقدر کیا پھر اثبات کیا پھر قضاء (حکم) کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز بھی علم ازل میں مستقیم ہوئی یہاں تک کہ لوح میں مستقیم ہو گئی پھر واضح ہوئی تو ضرور اس سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے امور متعلق ہوتے ہیں۔

بعض عارفین نے کہا: قدر کی مثال نقاش کا اپنے ذہن میں صورت بنانا ہے اور قضاء کی مثال اس کا شاگردوں کے لیے ''اسرب'' سے خط کھینچنا ہے اور شاگرد کا استاد کے خط کے پیچھے اس پر انگلی رکھنا ہے۔ وہ کسب واختیار ہے۔ اس کے اختیار میں ہے کہ استاد کے خط سے نہ نکلے اس طرح بندے کا اختیار ہے کہ اس کا قضا سے نکلنا ممکن نہیں ہوتا، لیکن وہ ان دونوں کے درمیان تردد میں ہوتا ہے۔

اور قدریہ نے قضاء کی تفسیر یہ کی ہے کہ قدر اس کا موجودات کے نظام کو جاننا ہے۔ انہوں نے مخلوقات کے افعال میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی تاثیر کا انکار کیا ہے۔ اہلِ سنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ بندوں کے خیر وشر کے افعال اللہ تعالیٰ کے پیدا

کردہ اور چاہے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود وہ بندوں کے لیے کسبی ہیں۔ اس لئے کہ ان کو ان کے کسب میں ایک قسم کا اختیار ہے۔ اگر چہ حقیقت میں وہ اس کے ارادے اور خلق کی طرف راجع ہوتے ہیں۔ اور اللہ جو کچھ کرتا ہے اس سے نہیں پوچھا جائے گا اور بندوں سے پوچھا جائے گا۔ یہ مذہب اوسط واعدل اور نصوص کے زیادہ موافق ہے۔ یہی حق اور درست ہے۔ بخلاف جبریہ کے جو اس کے قائل ہیں کہ بندے اپنے افعال پر مجبور ہیں۔ اس سے لازم آئے گا کہ تکلیف نہ ہو اور ان میں سے جس نے اس لازم کا اعتراف کیا وہ کافر ہے۔ بخلاف اس کے جس نے خیال کیا کہ بندے کی قدرت کا اس کی اصل سے سلب ہے وہ تو صرف اللہ کی قدرت کی تعظیم ہے اس سے کہ اس قدرت میں کسی طور پر کسی کو اس کے ساتھ شریک کرے۔ پس وہ بدعتی ہے اور قدر کی نفی کرنے والے قدریہ کے برخلاف اور وہ معتزلہ ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ بندہ اپنے افعال کو خود پیدا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کی اس میں کوئی تاثیر نہیں اور اس کا ارادہ اس کے متعلق نہیں کیونکہ اپنے افعال میں تاثیر اور وجود میں لانے کی وجہ سے بندے کی قدرت مستقل ہے۔ کیونکہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کے اس کی ملک میں شرکاء ہیں۔ اللہ اس سے پاک ہے اور جس نے قصداً حقیقت شرکت کا اعتقاد رکھا تحقیق اس نے کفر کیا یا قبیح فعل سے اللہ تعالیٰ کے پاک ہونے کا اعتقاد رکھا تو وہ بدعتی ہے۔

روایت کیا گیا ہے کہ حسن بصری رحمہ اللہ نے حسن بن علی رضی اللہ عنہ کو خط لکھا جس میں وہ ان سے قضاء وقدر کے بارے میں پوچھ رہے تھے، حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے ان کو جواب میں لکھا۔

''جو آدمی اللہ تعالیٰ کی قضاء اور اس کی اچھی بری تقدیر پر ایمان نہیں لایا اس نے کفر کیا اور جس نے اپنے گناہ کو اپنے ربّ پر ڈالا تو وہ فاجر ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت بُرا سمجھتے ہوئے نہیں کی جاتی اور غلبے کی وجہ سے اس کی معصیت نہیں کی جاتی اس لئے کہ جو کچھ ان لوگوں کی ملکیت میں ہے اللہ تعالیٰ اس کا مالک ہے اور جو ان کو قدرت دی اس پر قادر ہے۔ پھر اگر انہوں نے طاعت کا عمل کیا تو وہ ان لوگوں کے درمیان اور ان کے عمل کے درمیان حائل نہیں ہوا اور اگر انہوں نے معصیت کا عمل کیا تو اگر اللہ چاہتا تو ان کے اور ان کے عمل کے درمیان حائل ہو جاتا۔ پھر اگر اس نے عمل نہیں کیا تو وہ ایسا نہیں کہ اس پر ان کو مجبور کرے اور اگر اللہ مخلوق کو طاعت پر مجبور کرے تو ان سے ثواب کو ساقط کر دے اور اگر معصیت پر ان کو مجبور کرے تو ان سے عذاب کو ساقط کر دے اور اگر ان کو چھوڑ دے تو یہ قدرت میں عجز ہوگا۔ لیکن اس کی ان میں مشیت ہے جو ان سے غائب ہے۔ اگر انہوں نے طاعت کا عمل کیا تو اس کا ان پر یہ احسان ہے اور اگر ان لوگوں نے معصیت کا عمل کیا تو اس کی ان سب پر حجت ہے''۔ والسلام۔

اس خط پر مشکوٰۃِ نبوت ورسالت کے انوار کا ظہور ہو رہا ہے۔

ایمان بالقدر ذات حق کی توحید کے علم کو مستلزم ہے۔ اس لئے کہ مقدورات اور ان کے احکام کا مخصوص جگہوں اور زمانوں میں ان کے حق کے مطابق لانا ان کی تقدیر کے حکم کے اکیلے ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ جو مقدر کے اکیلے ہونے کا مقتضی ہے اور ایمان باللہ، مستلزم ہے اس کی صفات کے علم کو جیسے اس کے علم کی وسعت، تمام جہانوں پر اس کی رحمت، اس کی قدرت کے آثار، مخلوقات کے لیے اس کی حکمت اور ان میں اس کی قضاء کے نفوذ اور ایمان بالقدر مستلزم ہے اس کے افعال اور اس کی کاریگری کے علم کو اور حوادث اسباب الٰہیہ کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بچنا قدر کو نہیں کاٹتا اور لذات میں سے کسی چیز

کی طلب میں کسی سے نہیں جھگڑتا اور جب اسے پالیتا ہے تو اس سے مانوس نہیں ہوتا اور مطالب میں سے کسی چیز کے فوت ہو جانے کی وجہ سے غصے نہیں ہوتا اور نہ مہارب (مطالب کی ضد) میں سے کسی چیز کے واقع ہونے کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ﴾ [الحدید:۲۳] ''تا کہ تم اپنے فوت شدہ کسی چیز پر رنجیدہ نہ ہو جایا کرو اور نہ عطا کردہ چیز پر گھمنڈ میں آ جاؤ''۔

حدیث میں آیا ہے: ''ما اصابك لم يكن ليخطئك وما اخطاك لم يكن ليصيبك'' لہٰذا جن چیزوں میں قضاء مطلق اور ساری مخلوق کے ساتھ حسن خلق کا ارادہ کیا ان میں حق کا تابعدار ہوگا۔

بعض عارفین نے کہا: اللہ تعالیٰ کی تجلی کے مظاہر کے اپنی مخلوقات کے وجود کے بقدر اسما اور صفات ہیں ان میں سے ہر ایک کے لیے مظاہر تجلی کی مقرر مقدار ہے جس کو اللہ جانتے ہیں۔ اس کی شایان شان اس کے اسماء اور صفات ہیں جو وہاں کے لیے تیار ہوئے ہیں اور ان ہی سے ان کی پاکی بیان کی جاتی ہے۔ جیسا کہ اس نے کہا ہے: ﴿وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ﴾ [الاسراء:٤٤] ''اور (مخلوقات میں سے) کوئی چیز نہیں مگر اسکی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے''۔ اور ہر ذرے کے لیے ملکوتی زبان ہے جو اپنے صانع کی پاکی بیان کرنے کے لیے ہے۔ اس کی تسبیح وتحمید کرنے والی ہے اور صفاتِ جمالیہ اور جلالیہ کی مظہریت کا جو احسان کیا اس پر اس کی تعریف کے لیے۔ لہٰذا تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کی مقادیر ہیں نہ کہ اس کی ذات کی اور اس کی وسعت مؤمن کا دِل ہی رکھتا ہے۔ ''میری زمین میری وسعت نہیں رکھتی اور نہ میرا آسمان لیکن میرے مؤمن بندے کا دِل میری وسعت رکھتا ہے''۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ مؤمن کا دِل اللہ کا عرش ہے۔

ابو یزید قدس سرہ فرماتے ہیں: اگر ہزار ہا بار عالم عارف کے دِل کے گوشوں میں سے کسی گوشے میں واقع ہو تو وہ اس کو محسوس نہیں کرے گا۔

قوله: قال: صدقت۔ قال: فأخبرني عن الاحسان:

بعض نے کہا معہود ذہنی یہ آیاتِ قرآنیہ میں تھیں: ① ﴿لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَى وَزِيَادَةٌ﴾ [یونس:٢٦] اور ② ﴿هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ﴾ [الرحمن:٦٠] ③ ﴿وَأَحْسِنُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ [المائدہ:٩٣] اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ آیات میں اس سے مراد وہ امور ہیں جو ایمان، اسلام اور ان کے علاوہ اعمال، اخلاق، احوال پر مشتمل ہوں اور حدیث میں اس سے مراد زیادہ خاص معنی ہے کہا گیا اس سے مراد اخلاص ہے۔ اس لئے کہ یہ ایمان اور اسلام دونوں کے معاً صحیح ہونے کی شرط ہے۔ اس لئے کہ جس نے کلمہ کا تکلم کیا اور اخلاص کی نیت کے بغیر عمل کیا تو اس کا ایمان صحیح نہیں۔ ان کا یہ قول نہایہ میں ہے۔ طاعت میں مخلص فعل حسن کو اس کی ذات تک پہنچاتا ہے اور مرائی (ریاء والا) اس عمل کی ذات کو باطل کر دیتا ہے اور اخلاص عمل کو عوض کے طلب کرنے سے اور عزت کی غرض سے اور ریاء کے دکھلاوے سے صاف کرتا ہے اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد عمل کا احسان ہے وہ اس کو محکم ومضبوط کرتا ہے وہ اخلاص اور اس سے اوپر اللہ کے ساتھ حضوری کے مرتبہ کو شامل ہے اور اس کے ماسویٰ سے شعور کی نفی اور اس پر جواب دلالت کر رہا ہے۔

قوله: قال: ان تعبد الله كانك تراه:

''کانک تراہ'': مفعول مطلق ہے۔

یعنی اس کو ایک مانے اور اوامر ونواہی میں اس کی اطاعت کرے۔ ایک روایت میں عبادت نام ہے: ''ان تخشی اللہ''۔ ان دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہے اس لئے کہ عبادت خشیت کا اثر ہے اور یہ عبادت کا نتیجہ دیتی ہے خضوع اور تواضع کے ساتھ طاعت کا۔ امام راغب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عبادت فعل اختیاری ہے جو شہوات بدنیہ کے منافی ہے اور اس نیت سے صادر ہوتی ہے جس سے مراد تقرب الی اللہ ہو شریعت کی فرمانبرداری کرتے ہوئے۔

بعض محققین نے کہا ہے کہ مخلوق کو بنانے اور رسولوں کو بھیجنے کا یہ مقصود انتہائی ہے اور جوں جوں بندے کی معرفت بڑھے گی توں توں اس کی عبودیت (بندگی) بڑھے گی۔ اس وجہ سے انبیاء اور اولوالعزم کو عبادت میں خصوصیات کی وجہ سے خاص کیا گیا اور جب تک بندہ زندہ ہو عبودیت سے جدا نہیں ہوتا۔ بلکہ برزخ میں اس پر دوسری بندگی ہوگی جب اس سے دو فرشتے اس کے ربّ اس کے دین اور اس کے نبی کے بارے میں سوال کریں گے اور قیامت میں جس دِن پنڈلی کھولی جائے گی اور وہ بلائے جائیں گے سجدہ کرنے کو اور جب جنت میں داخل ہوگا تو اس کی عبودیت سبحانك اللهم کے سانسوں کے ساتھ ملی ہوئی ہوگی۔

صوفیہ کے کلام میں ہے کہ عبادت نام ہے حدود کی حفاظت کا' عہدوں کو پورا کرنے کا' تعلقات اور شرکاء کو شرک سے قطع کرنے کا تیرے مشاہدہ سے حق کے مشاہدہ میں فناء ہونے کا۔ اس کے تین درجے ہیں' اس لئے کہ یا تو عذاب کے خوف اور ثواب کی اُمید سے اس کی بندگی کرے گا اس کا نام عبادت رکھا گیا ہے۔ یہ اس کے لئے ہے جسے علم الیقین ہو۔ یا اس کی عبادت کے شوق اور اس کی تکالیف کو قبول کرتے ہوئے اس کی بندگی کرے گا۔ اس کا نام عبودیت ہے۔ یہ اس کے لئے ہے جسے عین الیقین حاصل ہو۔ یا اس کے الٰہ ہونے اور اِس کا بندہ ہونے کی وجہ سے بندگی کرے گا اور الہیت عبودیت کو واجب کرتی ہے۔ اس کا نام عبودۃ ہے، یہ اس کے لئے ہے جسے حق الیقین حاصل ہو اور شرک یہ ہے کہ نقصان یا نفع کا گمان اس کے سوی سے کرے' اور اللہ کے غیر کا وجود ثابت کرے ذات یا صفت یا فعل کے اعتبار سے۔

أي عبارة شبهة بعيادتك حين تراه۔

یعنی عبادت جو مشابہ ہو تیرے اس کو دیکھنے کی حالت کی عبادت کے یا فاعل سے حال ہے: أي حال كونك مشبها بمن ينظر الى الله...... یعنی اس حال میں کہ تو مشابہ ہو اس آدمی کے جو اللہ کی طرف دیکھ رہا ہو اس سے خوف کرتا ہو' حیاء کرتا ہوا' خشوع وخضوع اور ادب کرتا ہوا اور وفاء کرتا ہوا۔

یہ جوامع الکلم میں سے ہے۔ جب بندہ اپنے آقا کے سامنے کھڑا ہو تو حتی الوسع عمل کے احسان میں سے کوئی کسر نہ چھوڑے اور اس کے ماسوی کی طرف التفات نہ کرے اور اس کو نہ دیکھنے کے باوجود یہ معنی بندے کی عبادت میں موجود ہے تو اسے چاہیئے کہ اس کے مقتضی کے مطابق عمل کرے اس لئے کہ اس میں کوئی خفا نہیں کہ جو آدمی اس کو دیکھ رہا ہو کہ جس کے لئے عمل کر رہا ہے تو جتنا اس سے ممکن ہو سکے اس سے بھی اچھا عمل کرے گا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تحسین عامل کے معمول لہ کو دیکھنے کی وجہ سے ہے۔ یہاں تک کہ اگر عامل کو معلوم ہو کہ معمول لہ اس کو اس طور پر دیکھ رہا ہے کہ وہ اس کو نظر نہیں آ رہا تو تب بھی وہ عمل کے احسان (اچھا کرنے) میں کوشش کرے گا۔ اسی وجہ سے کہا:

قوله: فان لم تكن تراه فانه يراك:

یعنی اگر تو اس سے معاملہ نہیں کرتا اس ذات سا جس کو تو دیکھ رہا ہو۔ تو اس ذات جیسا معاملہ کر جو تجھے دیکھ رہی ہے یا تو اپنے عمل کو اچھا کر اس لئے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ ایک روایت میں: "فانه لم تره" یعنی اگر تو اس مشاہدے سے غافل ہے جو غایت کمال کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے تو اس سے غافل نہ ہو جو تیرے لئے اصل کمال بنایا گیا ہے۔ اس لئے کہ جس چیز کے کل کو نہ پایا جا سکے اس کے بڑے حصے کو نہیں چھوڑا جاتا بلکہ جتنا ممکن ہو سکے عبادت کے احسان پر مستمر رہو اس لئے کہ وہ تمہیں ہمیشہ دیکھ رہا ہے۔ اس لیے تُو اس کا استحضار رکھ تا کہ تو اس سے حیاء کرے یہاں تک کہ اس کے ڈر سے تو غافل نہ رہے اس لئے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

فاء جواب کی دلیل اور جزاء کی علت ہے چونکہ اس کا مابعد جواب نہیں بن سکتا اس لئے کہ اللہ کی رؤیت بندے کو حاصل ہے چاہے بندہ اس کو دیکھے یا نہ دیکھے۔ بلکہ جواب محذوف ہے اور اس کے لازم ہونے کی وجہ سے بھی اس کو ذکر کرنے کی چنداں حاجت نہیں۔ بعض نے کہا اس کی تقدیری عبارت: "فكن بحيث انه يراك" ہے، یہ تقدیری عبارت وہم پیدا کرتی ہے۔ سید جمال الدین فرماتے ہیں: اس کا یہ معنیٰ نہیں جیسا کہ بعض نے گمان کیا "ان لم تكن تعبد الله كانك تراه فاعبده كانه يراك" (اگر تو اللہ کی عبادت نہیں کرتا گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے تو اس کی عبادت کر گویا کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے) اس لئے کہ یہ واضح خطاء ہے، اھ۔

اس سے طیبی رحمۃ اللہ علیہ پر رد مقصود ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت ہمارے لئے ہمیشہ ثابت ہے عبادت کی حالت ہو یا غیر عبادت کی۔ لہٰذا "كانه يراك" سے تعبیر کرنا غلطی ہے اور درست تعبیر "فانه يراك" ہے اور بعضوں کو یہ بھی وہم ہوا اور انہوں نے كانك تراه کے بعد یوں کہا ای كانك تراه ويراك دوسرے کو حذف کر دیا پہلے کے اس پر دلالت کرنے کی وجہ سے اور یہ جیسا کہ پہلے گزرا قبیح غلطی ہے۔

لہٰذا درست یہ ہے کہ "وهو يراك" کہے۔ حاصل کلام تمام اقوال کا یہ ہے کہ اعمال میں اخلاص پر ابھارا گیا ہے اور یہ کہ تمام احوال میں بندے کو اپنے ربّ سے ڈرنا چاہیے۔ بعض عارفین نے کہا ہے کہ: اوّل اشارہ ہے مقام مکاشفہ کی طرف۔ اس کا معنیٰ ہے عبودیت کا اخلاص اور غیر کو اس صفت سے دیکھنا کہ دِل ذاتِ حق کے عین جلال کا ادراک کرنے والا ہو اور اس کا رسوم سے ہٹ کر اس میں فناء ہونا ہے اور ثانی اشارہ ہے تعظیم میں مقام مراقبہ کی طرف اور خدائے ذوالجلال کی اطلاع کی وجہ سے علم سے حیا کے حصول کی طرف۔ بعض نے کہا معنیٰ یہ ہے فان لم تكن بأن تكون فانيا تراه باقيا فانه يراك في كل حال من غير نقصان و زوال۔ کہ اگر تو فنا ہونے کی وجہ سے باقی نہیں دیکھتا۔ وہ تمہیں ہر حال میں بغیر نقصان اور زوال کے دیکھے گا۔

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ الف کے ساتھ کتابت اس کی تائید نہیں کرتا تو اس کا جواب دیا گیا کہ یہ لغت پر محمول ہے۔ یا حرکت کے اشباع پر یا مبتدا محذوف ہے اور اس جملہ اسمیہ سے "فا" کا حذف کرنا جائز ہے جو جزاء کی جگہ واقع ہو اور معنیٰ یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت کرے اس حال میں کہ تجھے اپنے وجود کا شعور ہو۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی وجہ سے: ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ [الحجر: ۹۹] "اور اپنے پروردگار کی عبادت کئے جاؤ یہاں تک کہ تمہاری موت (کا وقت) آ جائے۔" یعنی موت یا

جماع مفسرین۔ پس جب تو فنا ہو جائے اور حقیقی موت مرجائے تو تُو اس کی حقیقی رؤیت دیکھے گا اور عبادات تکلیفیہ اور تکفیہ مرتفع ہو جائیں گی (اٹھ جائیں گی) اور جب تو مجازی موت مرے اور فناء کے حال میں داخل ہو اور بقاء کے مقام پر باقی رہے تو تُو اس کو مشاہدہ غیبیہ کی اذیت میں دیکھے گا تو تجھ سے عباداتِ بدنیہ یا نفس اعمال ظاہری کا بوجھ ساقط ہو جائے گا جس وقت کہ باطن جذبات کا غلبہ ہو اور ان کا قول "فانه يراك" کلام سابق کے متعلق ہے۔ اگرچہ بعد والے کلام سے بھی اس کا کچھ نہ کچھ تعلق ہے۔ اس مقام پر کلام کو اس لئے لمبا کیا کیونکہ بعض شراح نے اس کلام میں غلطی کی ہے اور یہ اس کے منافی نہیں جو بعض روایات میں آیا ہے "فانك ان لا تراه فانه يراك" اور بعض میں ہے "فان لم تره فانه يراك"۔ قائل نے پہلے جو گزرا اس سے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ حدیث جو عبارت ادا کر رہی ہے اس سے یہ مراد ہے۔ بلکہ وہ معنی ذکر کیا جو بطریق اشارہ مضمون کلام سے اخذ کیا گیا۔ بعض نے کہا: ان کے قول كانك تراه میں اس کی دلیل ہے جو حق ہے کہ دنیا میں اللہ کی رؤیت واقع نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ مسلم کی حدیث میں ہے: واعلموا انكم لن تروا ربكم حتى تموتوا "تم جان لو کہ تم اپنے ربّ کو ہرگز نہیں دیکھ پاؤ گے یہاں تک کہ مرجاؤ"۔ امام مالک نے کہا: اس لئے دنیا میں آنکھ فناء کے لیے پیدا کی گئی لہٰذا وہ باقی رہنے والے کی رؤیت پر قادر نہیں۔ بخلاف اس کے آخرت میں۔ کیونکہ جب وہ بقاء ابدی کے لیے پیدا کی جائے گی تو قوی ہو جائے گی اور اللہ سبحانہ باقی رہنے والے کو دیکھنے پر قادر ہو جائے گی اور ایک قول کے مطابق لیلۃ الاسراء میں حضور ﷺ کا اپنے سر کی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو دیکھنا۔ یا تو حضورؐ کے اس سے مستثنیٰ ہونے کی بناء پر ہے یا ان کے ملکوت اعلیٰ میں ہونے کی وجہ ہے کہ اس پر حال دنیا صادق نہیں آسکتا اور اس مسئلہ میں معتزلہ کا نزاع مشہور ہے۔ بہت سی روایات میں آیا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے یہاں بھی "صدقت" کہا اور شاید بعض راویوں نے نسیان یا اعتماد یا مذکور پر اعتماد کرنے کی وجہ سے اس کو ذکر نہیں کیا۔ صحیح مسلم اور شرح السنہ کی بعض روایات میں لکھا ہوا ہے۔ بعض نے کہا: یہاں پر صدقت اس لئے نہیں کہا کیونکہ احسان وہ اخلاص ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے اسرار میں سے ایک سر ہے جس پر کوئی مقرب فرشتہ اور نبی مرسل واقف نہیں۔ جس طرح حدیث مسلسل ربانی میں آیا ہے کہ اخلاص میرے رازوں میں سے ایک راز ہے جس کو میں اپنے بندوں میں سے جس کو پسند کرتا ہوں اسکے دِل میں امانت رکھتا ہوں۔ جو پہلے ذکر کیا گیا وہ زیادہ بہتر ہے۔

قوله: قال: فأخبرني عن الساعة۔ قال ما المسؤول عنها باعلم من السائل:

یعنی اس کے قائم ہونے کے وقت کے بارے میں کیونکہ ایک روایت میں ہے "متى الساعة لا وجودها" اس لئے کہ وہ امیدوار ہے۔ بعض نے کہا: اس لئے کہ ان کے قول سابق واليوم الاخر سے معلوم ہو گیا اور یہ زمانہ کے اجزاء میں سے ایک جزء ہے جسے اس سے تعبیر کیا گیا اگرچہ اس کے پہلے زمانے کے اعتبار سے اس کا زمانہ لمبا ہو۔ پس یہ اچانک واقع ہو گی یا اس کے حساب کے جلدی سے ہونے کی وجہ سے یا اس کے برعکس اس کے لما ہونے کی وجہ سے یا اچھی فال (نیک شگون) لیتے ہوئے جیسا کہ ہلاکت کی جگہ کے لیے بیابان یا اس لئے کہ وہ اللہ کے نزدیک پیدائش کے وقت کی ساعت کی طرح ہے۔ اس طرح کشاف میں ہے اور لغت کے اعتبار سے ساعت زمانے کی غیر معین مقدار ہے اور عرف کے اعتبار سے دِن اور رات کے اوقات کے چوبیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔ بعض نے کہا: ساعۃ کا اطلاق جس طرح قیامت پر ہوتا ہے اور وہ ساعۃ کبریٰ

ہے اسی طرح ایک صدی والوں کے موت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ ساعۃ وسطیٰ ہے جیسا کہ حضور ﷺ کے قول میں ہے جب لوگوں نے ان سے ساعۃ کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے ان میں سے سب سے چھوٹے کی طرف اشارہ فرمایا "اگر یہ زندہ رہا تو اس کو بڑھاپا نہیں آئے گا۔ یہاں تک تم پر تمہاری ساعۃ (قیامت) قائم ہو جائیگی" اس لئے کہ مراد ان کے زمانے کا پورا ہونا ہے، اس وجہ سے ان کی طرف نسبت کی اور اس کا اطلاق مدت پر بھی ہوتا ہے اور یہ ساعۃ صغریٰ ہے۔ حدیث میں آیا ہے : "من مات فقد قامت قیامته"۔ تحقیق بعض نے کہا ظاہر حق یہ تھا کہ کہتے :ما المسئول عنه تا کہ ضمیر لام کی طرف لوٹتی۔ اس کا جواب دیا گیا کہ جس طرح کہا جاتا ہے سألت عن زید المسالة یہ بھی کہا جاتا ہے سألته عنها اور یہ زیادہ مستعمل ہے۔ لہٰذا ضمیر مرفوع لام کی طرف راجع ہے اور مجرور ساعۃ کی طرف راجع ہے اور "ما" نافیہ ہے یعنی "لیس الذی سئل عنها" (جس سے اس کے بارے میں پوچھا گیا وہ نہیں ہے)۔

قیامت کے بارے میں ان سے سوال کیے جانے کی صلاحیت ہونے کی نفی کی، اس لئے کہ قیامت غیب کی کنجیوں میں سے ایک کنجی ہے جس کو صرف وہی جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اکاد اخفیها﴾ [طٰہٰ: ۱۵] بعض نے کہا: یعنی اپنے ذات سے کنایہ کے طور پر مبالغہ کے لیے تا کہ معلوم ہو جائے کہ مسئول عنہ ضروری ہے کہ تمام چیزوں میں سائل سے زیادہ جاننے والا ہو۔ لہٰذا نہیں کہا جائے گا کہ علمیت (زیادہ جاننے) کی نفی سے اس کے بارے میں اصل علم کی نفی لازم نہیں آئے گی باوجود یکہ وہ دونوں اس کے بارے میں علم نہ ہونے میں مساوی ہیں اور سیاق کلام اس کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ کہتے کہ قیامت کے علم کے بارے میں مَیں تم سے زیادہ نہیں جانتا۔ لیکن اس سے عدول کیا تا کہ عموم کا فائدہ دے اس لئے کہ معنی یہ ہے کہ ہر سائل اور مسئول اس میں ایک جیسا ہے۔ ایک روایت میں ہے آپ ﷺ نے سر جھکایا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر اس نے دہرایا آپ ﷺ نے پھر کوئی جواب نہ دیا پھر آپ ﷺ نے سر اٹھایا اور کہا "ما المسئول عنها با علم من السائل"۔ اور "باء" نفی کی مزید تاکید کے لیے ہے۔ بعض نے کہا: جو انہوں نے سمجھا یا کہ :انهما مستویان فی العلم به وہ دونوں اس کے بارے میں علم ہونے میں مساوی ہیں۔ وہ مراد نہیں اس لئے کہ وہ دونوں اس کے بارے میں علم نہ ہونے میں برابر ہیں یا علم میں اس طور پر کہ اللہ نے خود کو ترجیح دی ہے۔ لہٰذا متعین ہو گیا کہ مراد ان دونوں کا قدر میں برابر ہونا ہے جو ان دونوں نے اس سے سیکھی اور وہ اس کا نفس وجود ہے۔ یہ واقعہ عیسیٰ اور جبرئیل علیہما السلام کے درمیان بھی ہوا ہے مگر عیسیٰ علیہ السلام سائل تھے اور جبرئیل علیہ السلام مسئول تھے۔ انہوں نے اپنے پروں کو ہلایا اور جواب دیا: "ما المسئول عنها با علم من السائل"۔ حمیدی نے اس حدیث کو عن سفیان مالک بن مغول عن اسمٰعیل بن رجاء عن الشعبی کی سند سے روایت کیا ہے۔

اگر تو یہ کہے' جب جبرئیل علیہ السلام کو اس کا علم تھا کہ' کہ قیامت کا علم صرف اللہ کو ہے تو قیامت کے بارے میں سوال کیوں کیا اور آیت اور جو غیبی خبریں عارف لوگوں کے بارے میں مشہور ہیں کیا کے درمیان کیا توفیق ہوگی۔ جیسا کہ شیخ الکبیر ابو عبداللہ نے اپنے معتقد میں کہا ہے، ہم اعتقاد رکھتے ہیں کہ بندہ کئی احوال میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ روحانی صفت کی طرف چلا جاتا ہے پھر غیب جانتا ہے، اور زمین اس کے لئے لپیٹ دی جاتی ہے اور پانی پر چلتا ہے اور آنکھوں سے غائب ہو جاتا ہے۔ اس کا جواب پہلے کے بارے یہ ہے، اس کے ذریعے ان کو ہر بات پر متنبہ کیا ہے کہ جس چیز کا ان کو علم نہیں اس کے بارے میں ان کا

کوئی جواب نہیں اور اس "لا ادری" (میں نہیں جانتا) کہنے میں کوئی عار نہیں جو نصف علم ہے جیسا کہ انہوں نے اپنے اس جواب سے ان کو تنبیہ کی جو حسن سوال کے ساتھ گزرا ہے جو کہ نصف علم ہے تو اس کی وجہ سے علم پورا ہو گیا۔ بہر حال دوسرے کے بارے جواب یہ ہے کہ غیب کے مبادی اور لواحق ہیں۔ تو اس کے مبادی پر نہ کوئی مقرب فرشتہ مطلع ہوتا ہے اور نہ ہی نبی مرسل اور بہر حال لواحق وہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں میں سے جس پر اپنے علم کی کوئی مخفی ظاہر کی ہو اور یہ غیب مطلق سے نکل گیا اور غیب اضافی ہو گیا۔ یہ تب ہوتا ہے جبکہ روح قدسیہ منور ہو جائے اور عالم حس کی ظلمت سے اعراض کرنے کی وجہ سے اس کی نورِیت اور چمک زیادہ ہو جائے اور دِل کا آئینہ طبیعت کا زنگ اتر کر مزّین ہو جائے اور علم و عمل پر ہمیشگی ہو اور انوارِ الٰہیہ کا فیضان ہو یہاں تک کہ نور قوی ہو جائے اور اس کے دِل کی فضاء میں پھیل جائے پھر لوح محفوظ میں لکھے ہوئے نقوش اس میں منعکس ہو جائیں اور مغیبات پر مطلع ہو جائے اور عالم سفلی کے اجسام میں تصرف کرے۔ بلکہ اس وقت اس کی اس معرفت سے فیاضِ اقدس خوب ظاہر ہو جائیں گے جو عطایا میں سب سے زیادہ شرف والی ہے اور اس کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے۔

قولہ: قال: فاخبرنی عن أماراتها:

"أمارات" ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ أمارة کی جمع ہے بمعنی علامت۔ ایک روایت میں ہے" **عن اشراطها** "اور "**اشراط**" شرط کی جمع ہے فتحہ کے ساتھ بمعنی علامت۔ مراد وہ چند علامات جو اس کے قرب پر دلالت کریں۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے یعنی اس کے مقدمات اور بعض نے کہا اس کے چھوٹے امور۔ ایک روایت میں ہے "**ساخبرك**" (میں عنقریب تمہیں بتاؤں گا) اور دوسری میں ہے: "**ساحدثك عن اشراطها**" (میں عنقریب تمہیں اس کی علامات بیان کروں گا) جمع اس لئے لائی گئی کیونکہ انہوں نے اس کی ابتداء اپنے قول "**ساخبرك**" سے کی۔ تو سائل نے کہا پھر آپ مجھے بتائیں۔ ایک روایت کا مضمون بھی اس پر دلالت کرتا ہے: "**ولکن ان شئت نبائتك عن اشراطها**" (لیکن اگر تم چاہو تو میں تمہیں اس کی علامات بتاؤں گا) اس نے کہا: جی ہاں۔ ایک روایت میں ہے "**فحدثني**"۔

قولہ: قال: أن تلد الامة ربتها:

"**ان تلدا لامة ربتها**" ترکیبی اعتبار سے یہاں کچھ عبارت مقدر ہے۔ **أی من جملة علاماتها ولادة الامة مالکها او مولاها**۔ یعنی اس کی منجملہ علامات میں سے ہے۔ یا اس کی علامات میں سے ایک علامت لونڈی کا اپنے مالک یا مولیٰ کو جننا ہے۔ بعض نے کہا' اس کی تقدیری عبارت یوں ہے۔ **علاماتها ولادة الامة ورؤية الجفاة** یہاں یہ کہنا پڑے گا جمع کے بارے میں دو سے خبر دی اس لئے کہ یہ جمع کے سب سے کم افراد ہیں جیسا کہ اس پر جمع کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس کی تانیث اس روایت میں ہے اگر چہ دوسری روایات میں تسمیہ کے اعتبار سے ہے تا کہ مذکر اور مؤنث دونوں کو شامل ہو جائے یا لفظ 'رب العباد' میں شرکت سے بھاگتے ہوئے اگر چہ اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے غیر پر اضافت کے ساتھ جائز قرار دیا گیا ہے' نہ کہ معرفہ اس لئے کہ یہ جاہلیت کے الفاظ میں سے ہے۔ یا لڑکی مراد لی ہے۔ اس صورت میں ابن کا بطریق اولیٰ معلوم ہو جائے۔

ابن اور اضافت یا تو اس وجہ کی ہے کہ وہ اس کی آزادی کا سبب ہے اور وہ اس کے رب کا بیٹا ہے باپ کے بعد اس کے

مولیٰ کا لڑکا ہے۔

اس قول کی تفسیر بہت سے لوگوں نے یہ کی ہے کہ حقیقی اسلام پھیلنے کے بعد قیدی بہت زیادہ ہو جائیں گے پھر لوگ اپنی باندیوں سے اولاد حاصل کریں گے چنانچہ وہ اولاد اپنی ماں کے آقا کی طرح ہوگی اس لئے کہ اس کی ملک ہے۔ تقدیری طور پر اسی کی طرف راجع ہے۔

یہ اشارہ ہے کہ دین کو قوت حاصل ہوگی اور مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوگا۔

اور یہ علامات قیامت میں سے ہے اس لئے کہ انتہاء تک پہنچنا لوٹنے اور انحطاط سے ہے۔ قیامت کے قائم ہونے کا اعلان کرنے والا ہے۔ یا اس طرف اشارہ ہے کہ عزت والے ذلیل بن جائیں گے اس لئے کہ ماں بچے کی مربیہ اور اس کے امور کی مدبرہ ہوتی ہے تو جب بچہ اس کا ''رب'' بن جائیگا خاص طور پر جبکہ لڑکی ہو تو معاملہ الٹ ہو جائیگا۔ جیسا کہ قرینہ ثانیہ اس کے برعکس ہے وہ یہ کہ ذلیل لوگ زمین کے باعزت بادشاہ بن جائیں گے چنانچہ معطوفین درست ہو جائیں گے۔ یہ حدیث زمانے کے تغیر اور لوگوں کے احوال کے بدل جانے کی پیشن گوئی ہے جس کا لوگوں نے پہلے مشاہدہ نہ کیا ہوگا اور ایک حدیث کا مضمون بھی اس کی تائید کرتا ہے: **اذا ضیعت الأمانة ووسد الامر الی غیر أهله فانتظر الساعة**۔ جب امانت ضائع ہونے لگے اور معاملہ نااہلوں کے حوالے کیا جانے لگے تو تم قیامت کا انتظار کرو'۔

بعض نے کہا: اس کے بچے کو اس کا آقا اس لئے کہا کہ باندی کی ولاء ہوگی اس کے باپ کے مرنے پر بطور میراث کے۔ یا وہ بچہ ماں کے آقا کی طرح ہو جائے گا کیونکہ بچے کے باپ کا مال اکثر بچہ کی طرف چلا جاتا ہے تو اس کی ماں گویا کہ اس کی باندی بن جائے گی۔

بعض نے کہا اس کا معنیٰ یہ ہے کہ لونڈیاں بادشاہوں کو جنیں گی تو اس بادشاہ کی ماں بھی منجملہ اس کی رعیت میں سے ہوگی۔ اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ صدر اوّل میں رئیس لوگ باندیوں سے وطی کرنا عام طور پر عار سمجھتے تھے اور آزاد عورتوں میں رغبت رکھتے تھے۔ پھر معاملہ الٹ ہو گیا خاص طور پر بنی عباس کے زمانے میں۔ اس کے قریب قیدی جب زیادہ ہو جاتے ہیں تو کبھی چھوٹا بچہ بھی قید ہو جاتا ہو پھر آزاد کر دیا جاتا اور رئیس بلکہ بادشاہ بن جاتا ہے پھر وہ اپنی ماں کو قید کر لیتا ہے اور پھر جان بوجھ کر یا جہالت سے خریدا جاتا پھر وہ اس کو خادمہ بناتا اور کبھی اس سے وطی کر لیتا ہے یا آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیتا۔

بعض نے کہا اس کا معنیٰ یہ ہے کہ امہات اولاد (اُم ولد کی جمع) کی فروخت کی کثرت سے احوال کا فساد ہے۔ وہ مشتریوں کے ہاتھوں میں بکتی رہتی ہے یہاں تک کہ اس اُم ولد کا بیٹا لاعلمی میں اپنی ماں کو خرید لیتا ہے اس سے وطی کر لیتا۔ **"بعلها"** والی روایت اس کی تائید کرتی ہے اگرچہ اس کی تفسیر **"سیدها"** کی گئی ہے۔

بعض نے کہا اس میں اشارہ ہے حقوق والدین کی کثرت کی طرف کہ بچہ خدمت وغیرہ میں اپنی ماں سے ایسا معاملہ کرے گا جیسے آقا اپنی باندی سے کرتا ہے۔

بچے کو باندی کے ساتھ خاص کیا گیا کیونکہ عام طور پر اس میں نافرمانی ہوتی ہے۔ بخاری کی روایت میں ''اَن'' مفتوحہ کی بجائے اِذا ہے۔ یہ درحقیقت تحقق وقوع کی طرف اشارہ ہے۔ اس وجہ سے علماء نے کہا کہ **"اذا قامت القيامة"** کہا جائے

''أن'' کسرہ کے ساتھ ان قامت القیامۃ نہ کہا جائے۔ اس لئے کہ یہ کفر ہے چونکہ اس کی خبر شک پر مبنی ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان کا یہ جزم بالکفر محل نظر ہے۔ اس کفر کو اس آدمی پر حمل کرنا متعین ہے جو اس کا معنی جانتا ہو اور اس کا اعتقاد رکھتا ہو ورنہ بہت سی جگہوں میں أن اذا کی جگہ استعمال ہوتا ہے اور اس کے برعکس بھی ہوتا ہے بہت سی اغراض کی وجہ سے جو علم معانی میں بیان کی گئی ہیں۔

قولہ: وان تری الحفاۃ العراۃ العالۃ رعاء الشاء:

''وأن تری'': خطاب عام ہے۔

''الحفاۃ'' حاء کے ضمہ کے ساتھ الحافی کی جمع ہے۔ جس کے پاؤں میں جوتا نہ ہو۔

''العراۃ'' العارۃ کی جمع ہے یہ اس آدمی پر صادق آتا ہے جس کے بدن کا وہ حصہ برہنہ ہو جس حصہ کا ملبوس ہونا مستحسن و ضروری ہو۔

''العالۃ'': عائل کی جمع ہے بمعنی فقیر۔ عال یعیل سے ماخوذ ہے محتاج ہونا یا عال یعول سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں تنگ درست ہونا اور زیادہ وہ عیال والا ہونا۔

''رعاء الشاء'' براء کے کسرہ اور مد کے ساتھ۔ راع کی جمع ہے جیسے تاجر اور تجار اور الشاء شاۃ کی جمع ہے اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اسم جنس ہے اور ایک روایت میں ہے: ''الابل البھم'' باء کے ضمہ کے ساتھ بمعنی سیاہ اور وہ میم کے جر اور رفع کے ساتھ رعاۃ کی صفت ہے۔ بھیم کی جمع ہے۔ یہ کنایہ ہے ان کی جہالت سے اور ان کی اصل غیر معروف ہونے سے۔ ''ابھم الامر'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں حقیقت کا پتہ نہ ہونا۔

قرطبی فرماتے ہیں: اس کو سیاہ رنگ پر حمل کرنا زیادہ بہتر ہے۔ اس لئے کہ گندمی رنگ عرب کے رنگوں میں غالب ہے یا اونٹوں میں غالب ہے۔ بھماء کی جمع ہے اس لئے کہ ان کے نزدیک اونٹوں میں سب سے برا سیاہ ہے اور سب سے بہترین سرخ ہے۔ اس وجہ سے حدیث میں آیا ہے ''خیر من حمر النعم'' (سرخ اونٹوں سے بہتر ہے)۔

اور ایک روایت میں: البھم باء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اس کی کوئی وجہ نہیں باوجودیکہ ابل کا ذکر موجود ہے بلکہ اس کے حذف کے ساتھ ہے مسلم کی روایت ہے۔ کیونکہ وہ بھمۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں چھوٹی بھیڑ' بکریاں۔ اور اس کو اُس پر ترجیح دی گئی اس لئے کہ بکریوں کے چرواہے صحراء والوں میں سب سے زیادہ کمزور لوگ ہوتے ہیں بخلاف اونٹوں کے چرواہوں کے کہ وہ صاحب فخر و غرور ہوتے ہیں۔

قولہ: یتطاولون فی البنیان:

یعنی عمارت کی بلندی اور کثرت میں باہم فضل کا دعویٰ کریں گے اور اس کی حسن و زینت میں تفاخر کریں گے۔ اگر رؤیت بمعنی بصیرت ہو تو یہ مفعول ثانی ہوگا اور اگر بمعنی بصارت ہو تو حال ہوگا۔

اس کا معنی یہ ہے کہ صحرا یا جنگل والے یا ان جیسے فاقہ مست لوگوں کے لیے دنیا ملک اور مُلک کے اعتبار سے پھیلا دی جائے گی وہ شہروں کو وطن بنائیں گے بڑے بڑے محلات تعمیر کریں گے اور اس پر باہم فخر کریں گے۔ اس میں اس بات کی طرف

اشارہ ہے کہ رذیل لوگ غالب آ جائیں گے اور شریف لوگ عاجز وفروتن ہو جائیں گے۔ غیر مستحق لوگ رئیس بن جائیں گے اور سیاست نکموں کے ہاتھ آ جائے گی جیسا کہ "ان تلد الأمة" ربتها سے اس کے عکس کی طرف اشارہ ہے۔

بعض نے کہا کہ دونوں علامات میں دین اسلام کے پھیلنے کی طرف اشارہ ہے لہٰذا معطوفین کی باہم مناسبت بالکل واضح ہے۔

شاید ان دونوں کی تخصیص ان کی حالت کی عظمت اور ان کی شرافت شان (مشہوری) یا ان دونوں کے وقوع کے قرب کی وجہ سے ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ پہلے سے ظلم، فسق، جہل کی کثرت زور اس کی انتہا تک پہنچنے کی طرف اشارہ ہو اور دوسرے سے دنیا کی محبت کے غلبہ اور آخرت کی منازل کو بھول جانے کی طرف اشارہ ہو۔

کہتے ہیں: تطاول الرجل "اس نے تکبر کیا۔ لہٰذا ابن حجر رحمہ اللہ نے جو اعتراض کیا ہے وہ وارد نہیں ہوگا کہ اس میں تفاعل مذکورہ صفات والے عراۃ (ننگوں) کے افراد کے درمیان ہے نہ کہ ان عراۃ اور ان کے غیر کے درمیان یعنی جو کہ باعزت تھے اور پھر ذلیل ہو گئے، بخلاف اسکے جس کو اس میں وہم ہوا ہے اور کہا معنی یہ ہے کہ دیانت سے عاری اہل بادیہ شہروں میں سکونت اختیار کریں گے اور بلند و بالا محلات بنائیں گے اور عبادت گزاروں اور پرہیزگاروں پر تکبر کریں گے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ دنیا کے نظام کا انقلاب بتا رہا ہے کہ اس دنیا میں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ لہٰذا عقلاء کرام کے نزدیک زندگی صرف آخرت کی زندگی ہے، جیسا کہ ملکہ حرقہ بنت نعمان جب قید ہوئی اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئی تو اس نے یہ اشعار کہے:

فبينا نسوس الناس والامر أمرنا ☆ اذا نحن فيهم سوقة نتنصف

جس دوران ہم لوگوں کے امور کی تدبیر کرتے تھے اور ہمارا حکم چلتا تھا اس وقت ہم لوگوں میں عوام کی بھلائی طلب کرتے تھے

فاف لدنيا لا يدوم نعيمها ☆ تقلب تارات بناوتصرّف

پس میں اس دنیا کو پسند نہیں کرتی کہ جس کی نعمتیں دائمی نہیں، کبھی ہمارے پاس لوٹتی ہیں اور پھیر دی جاتی ہیں

پس مبارکباد ہے اس شخص کو کہ جس نے دنیا کو ساعت کی طرح بنایا اور اس میں حبیب کے حکم کے قیام کے لیے طاعت میں مشغول رہا۔ اس لئے ہر آنے والی چیز قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ﴾ [الانبياء: ٢،١] "لوگوں کا حساب (اعمال کا وقت) نزدیک آ پہنچا ہے اور وہ غفلت میں (پڑے اس سے) منہ پھیر رہے ہیں۔ ان کے پاس کوئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے نہیں آتی مگر وہ اسے کھیلتے ہوئے سنتے ہیں۔"

قوله: قال ثم انطلق فلبثت مليا ......فانه جبريل:

ایک روایت میں فلبث ہے۔

"ملیا": میم کے فتحہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ الملاوۃ سے ماخوذ ہے مہموز بمعنی غنی آتا ہے اس زمانہ کو ابوداؤد، نسائی اور ترمذی نے بیان کیا ہے عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: فلبثت ثلاثا میں تین دن ٹھہرا رہا۔ ترمذی کی ایک روایت میں ہے: فلقيني

النبی ﷺ بعد ثلاث مجھے نبی اکرم ﷺ تین دن کے بعد ملے۔ ایک دوسری روایت میں ہے: فلبثت لیالی فلقینی النبی ﷺ بعد ثلاث میں بہت سی راتیں ٹھہرا رہا پھر نبی ﷺ مجھے تین دن بعد ملے۔ ابن حبان کی ایک روایت میں ہے: بعد ثلاثة تیسری رات کے بعد۔ ابن مندہ کی ایک دوسری روایت میں ہے: بعد ثلاثة ایام تین دِن کے بعد۔ ان روایات میں ان کا رد ہے جنھوں نے وہم کیا کہ "ثلاثا" والی روایت "ملیا" والی روایت سے تصحیف شدہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میں نے خوف کے مارے حضور ﷺ سے دریافت نہیں کیا۔ شرح مسلم میں ہے کہ یہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مخالف ہے کہ حضور ﷺ نے اس کا ذکر اسی مجلس میں کیا۔ پس زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت عمر رضی اللہ عنہ حاضر نہیں تھے آپ ﷺ نے صحابہ کو خبر دی پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تین دن بعد خبر دی۔

ثم قال لی: یا عمر! اتدری: عدول میں ایسا نکتہ ہے جو مخفی نہیں۔ "قلت: اللہ و رسولہ اعلم" اس لئے کہ سابقہ علامات اور تعجب نے ان کو تردد میں ڈال دیا تھا کہ آیا بشر تھا یا فرشتہ اور اس قدر شرکت بھی کافی ہے باوجود یکہ جا رہا ہے اسم تفضیل سے بغیر شرکت کے صرف اصل فعل ہی مراد ہوتا ہے۔

" فانه جبریل ": یہاں کچھ کلام مقدر ہے جس پر فاء کا ترتب ہو رہا ہے۔ ای اذا فوضتم العلم الی اللہ و رسولہ فان جبریل یعنی جب تم نے علم کو اللہ اور اس کے رسول کے سپرد کر دیا تو وہ جبرئیل علیہ السلام ہے یعنی تمہارا یہ سپرد کرنا اس خبر دینے کا سبب ہے اور محذوف کا قرینہ ان کا قول اللہ و رسولہ اعلم ہے تو فاء فصیحہ ہے اس لئے کہ شرط محذوف کو ظاہر کر رہا ہے۔

کلام کو مؤکد کیا کیونکہ سائل طالب متردد ہے اور ایک روایت میں ہے: ردوه فأخذوا ليردوه فما رأوا شيئا۔ اس کو لوٹاؤ وہ لوٹانے کے لیے گئے تو انہوں نے کچھ نہیں دیکھا۔ قاضی فرماتے ہیں: جبریل، اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان توسط والا فرشتے ہے اور فرشتے کے خواص میں سے ہے کہ وہ بشر کی صورت اختیار کر لے اور اس کو جسماً دیکھا جا سکے، اھ۔

بعض نے کہا: توسط میں راز یہ ہے کہ دو مخاطبوں کے درمیان بات چیت مناسبت کو چاہتی ہے پس حکمت جبریل کے توسط کا تقاضا کرتی ہے تاکہ وحی کو اسی روحانی طریقے سے لیں جو کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے عالم قدرت میں تھا۔ یا وحی کو لوح سے لیں۔ اور اسی صورت میں نبی ﷺ تک پہنچا دیں جیسی کہ عالم حکمت میں ہے۔

فرشتہ کبھی بشر کی صورت میں نازل ہوتا تھا، اور کبھی نبی ﷺ ارتقاء فرماتے ہوئے ملکیت کے مرتبہ تک پہنچ جاتے ہیں اور بشریت کا لبادہ اُتار دیتے ہیں پھر وحی ان کے قلب پر وحی جلال کے لبادہ اور کبریا و کمال کی بڑائی میں وارد ہوتی ہے اور اس کے ریشے ریشے میں پیوست ہو جاتی۔ پھر جب یہ زائل ہو جاتی ہے تو اس وحی منزل کو 'روح'' میں موجود پاتے' جیسا کہ کلام مسموع میں ہوتا ہے۔ اس حدیث کا بھی یہی مطلب ہے: أحيانا يأتيني مثل صلصلة الجرس وهو اشده علي۔ میرے پاس گھنٹیوں کی آواز کی طرح آتی اور یہ مجھ پر سب سے سخت ہوتی تھی مجھ سے جدا ہوتی اس حال میں کہ جو کچھ انہوں نے کہا میں اس کو محفوظ کر چکا ہوتا اور کبھی کبھی فرشتہ میرے پاس آدمی کی صورت میں آتا پھر جو کچھ وہ کہتا میں محفوظ کر لیتا''۔

لفظ جبریل کا ضبط:

جبریل جیم کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ اور راء کے کسرہ کے ساتھ اس کے بعد یاء اور اس کے فتحہ کے ساتھ اور ہمزہ مکسورہ اور اس کے ترک کے ساتھ۔ متواتر چار لغات ہیں۔ پہلی لغت اکثر واشہر ہے۔

قوله: اتاكم يعلمكم دينكم:

"اتاکم" جملہ مستانفہ بینہ ہے۔ یا" جبریل" کی خبر ہے اس صورت میں انہ میں ضمیر شان ہوگی۔ "یعلمکم دینکن" یہ جملہ اتاکم کی ضمیر مرفوع سے حالیہ ہے ای "عازماً تعلیمکم" پس یہ حال مقدرہ ہے اس لئے بوقت آوردہ کہ معلم نہیں تھے۔ یا لام کو مقدر مان کر مفعول لہ بنالیں جیسا کہ ایک روایت میں ہے اور مراد صحابہ کے علم کی تثبیت تھی سوال و جواب کے طریقے سے ان کی تقریر مقصود تھی تا کہ صحابہ کے نفوس میں یہ تعلیمات اچھی طرح جم جائیں اس لئے کہ طلب کے بعد حاصل ہونے والی چیز بغیر مشقت مل جانے والی سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔

ان کی طرف تعلیم کی نسبت مجازی ہے اس لئے کہ وہ سبب تھے اور دین کی نسبت ان کی طرف تھی، اس لئے کہ وہ سارے لوگوں میں سے دین قیم کے ساتھ مختص تھے۔ یا خطاب خاص طور پر صحابہ کے ساتھ مخصوص ہے یا عام طور پر اس لئے کہ سارے لوگ صحابہ رضی اللہ عنہم سے دین لیتے ہیں اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایمان، اسلام اور احسان کا نام "دین" رکھا گیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ [آل عمران:۱۹] "دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے" اس سے مراد کامل ہے اور اسی طرح اللہ عزوجل کا قول: ﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ﴾ [آل عمران:۸۵] "اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائیگا۔" ایک روایت میں ہے: اس نے چاہا کہ تم کو سکھائے جب تم نے سوال نہ کیا اور ایک دوسری روایت میں ہے: قسم ہے اس ذات کی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا میں اس کو نہیں جانتا تھا کہ وہ تم میں سے کونسا آدمی ہے، بلاشبہ وہ جبریل تھے۔ ایک اور روایت میں ہے: پھر پیٹھ پھیر کر چلا گیا۔ اس کا راستہ دکھائی نہ دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سبحان اللہ! یہ جبریل تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔ تم اس سے علم لو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے جب سے وہ میرے پاس آئے ہیں مجھے اس بار کے علاوہ کبھی اشتباہ نہیں ہوا اور میں نے انہیں نہیں پہچانا حتیٰ کہ وہ پیٹھ پھیر کر چلے بھی گئے۔

قوله: رواه مسلم:

بخاری نے کتاب الزکوۃ میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اس کو روایت کیا ہے۔ (كذا قاله بعض شراح الاربعين) ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بخاری نے عمر رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت نہیں کی کیونکہ اس کے بعض راوی مختلف فیہ ہیں۔ سید جمال الدین کہتے ہیں: بزار نے اس حدیث کو اپنی مسند میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے طریق سے روایت کیا ہے اور ابوعوانہ اسفرائینی نے اپنی صحیح میں جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کے طریق سے نسائی نے اپنی سنن میں ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے طریق سے اور احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے طریق سے روایت کیا ہے اور ان طرق میں سے ہر ایک طریق ایسے بہت سے فوائد وفرائد پر

مشتمل ہے جو عمر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کے طریق میں نہیں پائے جاتے۔ یہ بہت جلیل القدر حدیث ہے جس کو حدیث جبریل اور ''اُم الاحادیث'' اور اُم الجوامع کا نام دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ علی وجہ الاتم اجمالی طور پر شریعت' طریقت اور حقیقت کو متضمن ہے جس کی تفاصیل سنن نبویہ اور شرائع مصطفویہ علی صاحبہا الوف التحیۃ سے معلوم ہوتی ہیں۔ جس طرح کہ سورہ فاتحہ کا نام ''اُم القرآن'' اور اُم الکتاب رکھا گیا ہے کیونکہ یہ اجمالی دلالتوں کے ذریعے معانی قرآنیہ اور حکم فرقانیہ پر مشتمل ہے۔ پس: انما الاعمال بالنیات والی حدیث بمنزلہ بسم اللہ کے ہے اور یہ حدیث بمنزلہ سورہ فاتحہ کے ہے جو الحمد للہ سے شروع ہوتی ہے۔ ان دونوں (حدیثوں) کو صدر کتاب اور ابواب کی ابتدا میں لانے کی یہ توجیہ مشہور و معروف ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کو میرے پاس لاؤ۔ پس جب وہ انہیں لے گئے تو انہوں نے کچھ بھی نہ دیکھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتایا وہ جبریل تھے۔ نووی رحمہ اللہ کے حوالہ سے ان روایت میں جمع کی صورت تحلیل ہے' علاوہ ازیں یہ خبر دینا مجلس میں صریح نہیں، لہٰذا عمر رضی اللہ عنہ کے تین دن بعد اطلاع دینے والی صحیح روایت کے منافی نہیں۔

۳: وَرَوَاهُ اَبُوْ هُرَيْرَةَ مَعَ اخْتِلَافٍ وَفِيْهِ وَاِذَا رَاَيْتَ الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الصُّمَّ الْبُكْمَ مُلُوْكَ الْاَرْضِ فِيْ خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ قَرَأَ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ اَلْاٰيَة۔ (متفق علیه)

أخرجه مسلم ۱/۳٦ حدیث: ۱' وابوداوٗد فی السنن ٥/٦۹ حدیث: ٤٦۹٥' وابن ماجه ۱/۲٤ حدیث: ٦۳' وأحمد فی مسنده ۱/٥۱۔

ترجمہ: اس روایت کو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی چند الفاظ کے اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے اور ان کی روایت کے آخری الفاظ اس طرح ہیں کہ ''جب تم برہنہ پا اور برہنہ جسم اور بہرے گونگے (سنی اَن سنی کر دینے والے اور حق کہنے سے باز رہنے والے) لوگوں کو زمین پر حکمرانی کرتے دیکھو نیز فرمایا کہ قیامت تو ان پانچ چیزوں میں سے ایک ہے جن کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی نہیں رکھتا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ﴾ ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم کہ وہ کب واقع ہوگی اور وہی جانتا ہے کہ بارش کب ہوگی۔ آخر آیت تک''۔ (متفق علیہ)

راویٔ حدیث:

ابو ہریرہ۔ یہ ابو ہریرہ ہیں۔ ان کے نام اور نسب میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔ زیادہ مشہور یہ ہے کہ قبل از اسلام ان کا نام ''عبد شمس'' یا ''عبد عمرو'' تھا اور اسلام لانے کے بعد ''عبد اللہ'' یا ''عبد الرحمٰن'' نام رکھا گیا۔ یہ قبیلہ ''دوس'' کے فرد ہیں۔ حاکم ابو احمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک ابو ہرہ رضی اللہ عنہ کے نام کے بارے میں سب سے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان کا نام عبد الرحمٰن صخر ہے۔ ان کی کنیت ان کے نام پر اس طرح غالب آ گئی گویا ان کا نام ہی نہیں رکھا گیا۔ غزہ خیبر کے سال اسلام لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ شریک ہوئے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگ گئے اور علم کے شوق میں پابندی کے ساتھ حاضر رہنے لگے۔ صرف پیٹ بھر کھانے پر اکتفاء کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں تشریف لے جاتے یہ بھی ساتھ رہتے۔ صحابہ

رضی اللہ عنہم میں سب سے زیادہ قوی الحفظ تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگے رہنے کی برکت سے ان کو وہ چیزیں مستحضر رہتی تھیں جو دوسروں کو یاد نہ ہوتیں' خود ان کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی باتیں سنتا ہوں وہ مجھے یاد نہیں رہتیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنی چادر بچھاؤ۔ میں نے چادر بچھا دی۔امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان کی روایات کثرت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وہ آٹھ سو سے زیادہ آدمیوں سے روایت نقل کرتے ہیں۔ان میں صحابہ جیسے ابن عمر' ابن عباس' جابر اور انس رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ سب شامل ہیں۔مدینہ میں ۵۷ھ یا ۵۸ھ یا ۵۹ھ میں اٹھتر سال کی عمر میں وفات پائی۔

نام کی وجہ تسمیہ:

ان کے پاس ہر وقت چھوٹی سی بلی رہتی تھی۔ یہ اس کو اٹھائے رکھتے تھے اس لئے ان کا نام "ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہو" گیا۔

تشریح: قوله:وفيه:واذا رأيت الحفاة العراة الصم البكم:

وہ اپنی کند ذہنی اور حماقت اور تمیز نہ ہونے کی وجہ سے ایسے بنائے گئے گویا کہ ان کے حواس صحیح سلامت ہونے کے باوجود مصیبت زدہ ہیں صرف اس کا ادراک کرتے ہیں جس میں ان کا نفع ہو۔

قوله:ملوك الارض في خمس:

"ملوك" : رأیت کا مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔اور ان سے مراد صحراء والے ہیں جیسا کہ روایت میں ہے: قال ما الحفاة العراة قال۔ العریب۔ العرب کی تصغیر ہے۔

"في خمس" یہ حال ہونے کی بناء پر موضع نصب میں ہے۔ای "ترهم ملوك الارض متفكرين في خمس كلمات۔ تو ان کو دیکھے گا کہ وہ زمین کے بادشاہ ہیں اور پانچ کلمات میں فکر کرتے ہیں اس لئے کہ جاہل بادشاہوں کی شان ہے کہ وہ ایسی چیزوں میں فکر کرتے ہیں جو ان کے لئے کچھ مفید نہیں اور ان کے کام نہیں آئیں گی۔یا اَعلم کے متعلق ہے،ای "ما المسئول عنها باعلم من السائل في علم خمس" اس لئے کہ ان کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے اور اس میں کہانت اور علم نجوم کے بطلان کی طرف واضح اشارہ ہے اور ان جیسی ہر وہ چیز جس میں ان پانچ میں سے کسی چیز کے کلی یا جزئی علم کو پھاندنا لازم ہو اور امت کو نصیحت ہے اور ان کو علم غیب کا دعویٰ کرنے سے ڈرایا گیا ہے۔اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [النمل:٦٥] "کہہ دو کہ جو لوگ آسمانوں اور زمین میں ہیں خدا کے سوا غیب کی باتیں نہیں جانتے۔"

اگر تو کہے کہ انبیاء اور اولیاء نے ان میں سے بہت سی چیزوں کے بارے میں خبر دی ہے تو حصر کیسے رہا؟۔جواب: حصر کلیات کے اعتبار سے ہے نہ کہ جزئیات کے اعتبار سے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ مستثنیٰ متصل ہونے کی بناء پر جو کہ اصل ہے۔احمد نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے۔آپ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پانچ کے علاوہ ہر چیز کا علم دیا گیا۔انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اس جیسی حدیث مرفوع نقل کی ہے۔قرطبی فرماتے ہیں: جس نے ان میں سے کسی چیز کے علم کا دعویٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کی طرف نسبت کرکے کیا تو وہ اپنے دعویٰ میں کاذب ہوگا اور

فرمایا: غیب کا ظن تو کبھی کسی نجومی وغیرہ کو حاصل جاتا جب کہ کسی عادی چیز کے بارے میں ہو۔ یہ علم کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ ابن عبد البر نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ اس میں اجرت لینا اور دینا حرام ہے، اھ۔

اس کی تائید اس سے ہوتی ہے جو حمید بن زنجویہ نے نقل کیا ہے کہ بعض صحابہ نے سورج گرہن کے ظاہر ہونے سے پہلے اسکے وقت کے جاننے کا ذکر کیا۔ تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا اور کہا کہ غیب صرف پانچ چیزیں ہیں اور یہ آیت تلاوت فرمائی اور اس کے علاوہ غیب کو بعض لوگ جانتے ہیں اور بعض اس سے جاہل ہیں، اھ۔ بعض اولیاء نے آیت کے کلیات کے مضمون سے بعض جزئیات کی جو خبریں بطور کرامت ذکر کی ہیں وہ شاید مکاشفہ یا الہام یا خواب کی قبیل سے ہیں۔ جو ظنیات ہیں ان کو علوم یقینیات نہیں کہا جا سکتا۔

بعض نے کہا: جار مقدر کے متعلق ہے ای **ذکر اللہ ذلک فی خمس یاتجد علم ذلک فی خمس**"

بعض نے کہا "فی" بمعنی "مع" ہے اور بعض نے کہا ہے کہ "**فی**" بمعنی "**من** ہے۔ ای "**من جملة خمس**" ہے۔ بعض نے کہا خبر ہونے کی وجہ سے محل میں ہے ای "**الساعة ثابتة**" یا "**معدودة فی خمس**" اس کی تائید یہ روایت کرتی ہے: "**هی فی خمس من الغیب**" (یہ غیب کی پانچ چیزوں میں ہے) ای **علم وقت الساعة مندرج فی جملة خمس کلمات** یعنی قیامت کے وقت کا علم کل پانچ کلمات میں مندرج ہے۔

قوله: لا یعلمهن الا الله:

جیسا کہ آنے والی آیت تقدیم سے مستفاد ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ ظرف خبر مقدم ہے جو حصر کا فائدہ دیتی ہے۔ اس لئے کہ جس کا حق بعد میں آنے کا ہو اس کو مقدم کرنا حصر کا فائدہ دیتا ہے۔ "**ینزل**" اور اس کے مابعد کا عطف ان مصدر یہ کے ساتھ "**الساعة**" پر ہے اور جملہ **وما تدری** سے مقصود غیر اللہ سے اس نفی کا اثبات کرتے ہوئے اللہ کے لیے ثابت کرنا ہے۔ یہ سب تفصیل اس صورت میں ہے اگر اللہ تعالیٰ کے قول میں خمس کی تفسیر مفاتیح الغیب سے نہ کی جاتی اس فرمان: ﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ﴾ [الانعام: ۵۹] اور اگر یہی تفسیر کی جائے تو پھر حصر جلی ہے اس پر استدلال کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

اور جاننا چاہیے کہ جواب میں سوال پر اضافہ ہے ایک تو اس کے اہتمام کی وجہ سے اور دوسرا ارشاد اُمت کے لیے اس مصلحت میں بہت زیادہ اور بڑے بڑے فوائد ہیں۔

قوله: ثم قرأ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ ۚ﴾۔

یعنی یہ خمس والی کامل آیت پڑھی جیسا کہ سیاق اس پر اس کا بیان دلالت کر رہا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ قرأ کا فاعل ابا ہریرہ کا ہو۔ لہٰذا آیت حدیث کا استشہاد اور مصداق ہوگی۔ "**وینزل الغیث**" تشدید اور تخفیف کے ساتھ ہے (یہ جملہ **هو** مبتدا محذوف کی خبر ہے) ای **هو ینزل المطر الذی یغیث الناس** یعنی وہ لوگوں پر مختلف جگہوں اور مختلف زمانوں میں بارش برساتا ہے جس کو صرف وہی جانتا ہے۔

"**الآیة**": کسی راوی کا قول منصوب ہے اور اس کا تعلق کلام مقدر سے ہے جس میں کئی احتمال ہیں۔ اعنی 'یعنی یا اقرأ

یا قرأ کو یا ماقبل سے بدل ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔اور رفع کے ساتھ ہو تو عبارت یوں ہوگی: الآیة معلومة مشهودة اِذا قرأها۔بعض نے کہا جر کے ساتھ ہے اور تقدیر عبارت یہ ہے: قرا او اقرأ الی الآیة ای آخرها۔ یعنی اس کے آخر تک۔

اور مسلم کی روایت میں ﴿خبیر﴾ تک ہے اور بخاری کی دوسری روایت میں (الارحام) تک ہے اور پہلی اولی ہے کیونکہ اس میں زیادہ ثقہ اور افادہ ہے۔

اور دونوں روایتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ لفظ "الآیة" مصنف کا قول نہیں جیسا کہ بعض نے گمان کیا اور پوری آیت یوں ہے ﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ﴾ [لقمٰن : ٣٤] یعنی مادہ کے رحموں میں کیا ہے، وہ اس کی تفصیل جانتا ہے کہ وہ نر ہے یا مادہ' ایک ہے یا زیادہ کامل ہے یا ناقص' مؤمن ہے یا کافر' لمبا ہے یا چھوٹا وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنثَىٰ وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ﴾ [الرعد : ٨] "خدا ہی اس بچے سے واقف ہے جو عورت کے پیٹ میں ہوتا ہے' یعنی کمی ہے یا زیادتی ہے یعنی مدت حمل اور جثہ اور تعداد میں (و کل شیء عنده بمقدار) یعنی قدر اور حد سے متجاوز نہیں ہوتی۔

اور اس آیت میں علم سے عدول کیا گیا ہے: ﴿وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ﴾ [لقمٰن : ٣٤] "اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کو کیا کام کرے گا اور کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کس سرزمین میں اسے موت آئے گی' اس لئے کہ درایت کہتے ہیں کسی چیز کا حیلے سے علم حاصل کرنا' پس جب وہ ہر نفس سے منفی ہو گیا باوجود یکہ وہ اس کے ساتھ مختص ہے اور اسے اس کا علم نہیں ہوا تو اس کے علاوہ پر وہ بدرجہ اولی مطلع نہیں ہوگا۔

نفس سے مراد ذات نفس ہے یا ذات روح۔ ان دونوں معنوں میں نفس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر جائز نہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہاں مشاکلت ہے: ﴿تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ﴾ [المائدة : ١١٦] "مجھے کب شایاں تھا کہ میں ایسی بات کہتا جس کا مجھے کچھ حق نہیں' جب نفس سے مراد مطلق ذات ہو تو اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر صحیح ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: "سبحانك لا احصی ثناء علیك انت كما اثنیت علی نفسك" (اے اللہ تو پاک ہے اور میں آپ کی ثناء کا شمار نہیں کر سکتا جیسا کہ آپ نے اپنی ذات کی ثناء بیان کی ہے)۔

(ان الله علیم) یعنی اللہ تعالیٰ ان اشیاء کی جزئیات اور کلیات کو خصوصی طور پر اور دوسری اشیاء کو عمومی طور پر۔ "خبیر" یعنی ان کے باطن کی خبر رکھتا ہے جیسا کہ وہ ان کے ظاہر کو جاننے والا ہے

یا اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے بعض مخصوص بندوں کو بعض جزئیات کی خبر دیتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کئی جگہوں پر خبر دی ہے کہ قیامت کا علم ان چیزوں میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ایک روایت میں ہے "ثم ادبر فقال ردوه فلم یروا اشیئا"۔

قوله: متفق علیه:

یعنی شیخین ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت جس میں اضافہ ہے پر متفق ہیں۔ لیکن میرک رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر استدراک کیا ہے اور کہا ہے کہ مگر بخاری کی روایت میں "الصم والبکم ملوك الارض" کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ کتاب الایمان میں "واذا تطاول

رعاۃ الابل البھم فی البنیان" کے الفاظ ہیں اور کتاب التفسیر میں ہے: "اذا کان الحفاۃ العراۃ رؤوس الناس فذلك من اشراطھا"۔ ابوداؤد اور نسائی نے اس کے معنی کی نقل کی ہے۔

اسلام کے پانچ بنیادی اُمور

۴: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَھَادَۃِ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَ اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری ۱/۴۹حدیث رقم ۸۔ومسلم فی صحیحه ۱/۴۵حدیث (۲۱۔۱۶)والنسائی فی سننه ۸/۱۰۷حدیث رقم ۵۰۰۱۔ والترمذی فی الجامع الصحیح ۵/۸حدیث رقم ۲۶۰۹وأحمد فی المسند ۲/۲۶۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد اور اساس پانچ چیزوں پر ہے ایک اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں' دوم پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنا۔ سوم زکوٰۃ ادا کرنا۔ چہارم بیت اللہ کا حج ادا کرنا۔ پنجم رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔ (بخاری و مسلم)

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما۔ یہ عبداللہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں ''قرشی وعدوی'' ہیں۔ اپنے والد صاحب کے ساتھ مکہ میں بچپن میں ہی ایمان لے آئے تھے۔ یہ غزوہ بدر میں شریک نہیں ہوئے غزوہ اُحد میں ان کی شرکت مختلف فیہ ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ سب سے پہلا غزوہ جس میں یہ شریک ہوئے ہیں خندق ہے۔ بعض نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ بدر کے دن بچہ ہونے کی وجہ سے بھرتی نہیں کئے گئے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اُحد کے دن شریک ہونے کی اجازت دے دی تھی اور ایک روایت یہ ہے کہ یوم احد میں آپ کو واپس کر دیا۔ اس لیے کہ اس وقت ان کی عمر چودہ (۱۴) سال کی تھی۔ اس کے بعد غزوۂ خندق میں اور دوسرے غزوات میں شریک ہوئے ہیں۔

یہ بڑے علم' زہد' تقویٰ' پرہیز گاری والے تھے معاملات میں بڑی دیکھ بھال اور احتیاط کرتے تھے۔ جابر بن عبداللہ نے فرمایا کہ ہم میں کوئی نہیں بچا کہ دنیا اس پر مائل ہوگئی اور وہ دنیا کی طرف جھک گیا' سوائے حضرت عمر اور ان کے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کے۔ حضرت میمون رضی اللہ عنہ بن مہران کا قول ہے میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے زیادہ محتاط اور پرہیز گار کسی کو نہیں دیکھا اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے زیادہ کسی کو عالم نہیں پایا۔

حضرت نافع رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی حیات میں ایک ہزار بلکہ اس سے زیادہ انسانوں کو غلامی

کی قید سے آزاد کیا تھا۔

نزولِ وحی سے ایک سال قبل ان کی ولادت ہوئی اور ۷۳ھ میں ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے قتل کے تین ماہ بعد اور بقول بعض چھ ماہ بعد وفات پائی۔ انہوں نے وصیت کی تھی کہ مجھ کو حل میں دفن کیا جائے لیکن حجاج کی وجہ سے یہ وصیت پوری نہ ہوسکی اور مقام ذی طوی میں مقبرہ مہاجرین کے اندر دفن کئے گئے۔ حجاج نے ایک شخص کو حکم دیا تھا جس کے مطابق اس نے اپنے نیزے کے نیچے کی بوری کو زہر میں بجھالیا اور راستہ میں اس نے آپ سے مزاحمت کی اور اپنے نیزہ کی بوری کو آپ رضی اللہ عنہ کے قدم کی پشت میں چبھو دیا۔

حجاج کی دشمنی کا سبب:

وجہ اس کی یہ ہوئی کہ حجاج نے ایک دن خطبہ دیا اور نماز میں بہت تاخیر کر دی اس پر حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورج تمہارے لئے ٹھہرا نہیں رہیگا۔ اس پر حجاج نے کہا کہ میں نے ٹھان لیا کہ میں تمہاری بینائی کو نقصان پہنچاؤں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا اگر تو ایسا کریگا تو تعجب کیا ہے کیونکہ تو بڑا بیوقوف ہے اور ہم پر زبردستی کا حاکم ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی اس بات کو آہستہ کہا اور حجاج کو نہیں سنایا اور آپ رضی اللہ عنہ تمام مواقف اور مقامات میں جہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہرے یا اُترے تھے حجاج بن یوسف سے پیش پیش رہتے تھے۔ یہ بات حجاج کو بڑی ناگوار تھی۔ حجاج کو ڈر تھا کہ یہ کہیں خلافت کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں۔ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی عمر چوراسی (۸۴) سال کی ہوئی اور بعض نے کہا ہے کہ ۸۶ سال کی۔ ان سے بہت سے لوگ روایت کرتے ہیں۔

قوله: بنی الاسلام علی خمس:

"الاسلام" یہ شریعت کا نام ہے نہ کہ ایمان کا۔ کبھی اس کا اطلاق دل کے یقین اور تمام اعضاء وجوارح کے ساتھ تابعدار ہونے پر ہوتا ہے۔ یہ وہی ہے جس کا حکم ابراہیم علیہ السلام کو دیا گیا کہ ان سے کہا گیا: "اسلم" یہ پہلے سے اخص ہے اور اس سے مراد کامل اسلام ہے۔ اس لئے کہ اس کی حقیقت صرف شہادتین پر مبنی ہے۔

ایمان کے بقیہ شعبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صرف اس کے ارکان کے بیان پر اکتفاء کیا ہے لہٰذا بعض کا یہ قول قابل توجہ نہیں کہ یہ حدیث صرف مذہب شافعی رحمہ اللہ کے مطابق صحیح ہے جو کہتے ہیں کہ اسلام تین کے مجموعے سے عبارت ہے۔

"خمس": اس کی تمیز محذوف ہے اور تمیز محذوف کے بارے میں کئی احتمال: ① ای خمسة دعائم ② جیسا کہ روایت میں ہے أی خمسة خصال۔ ③ أی خمسة قواعد اور مسلم کی روایت میں تاء کے ساتھ ہے ای "خمسة اشیاء او ارکان او اصول"۔ معدود کے محذوف ہونے کی وجہ سے یہاں جائز ہے۔

اسلام کی اس کے پانچ ارکان کے ساتھ دوامی حالت کو اس خیمے کی حالت کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو پانچ ستونوں پر کھڑا ہو اور اس کی وہ میخ جس پر ارکان کا دارومدار ہے وہ شہادت ہے جو صمیم قلب سے پیدا ہوتی ہے اور اس پر شاہد وہ شہادت کا لفظ ہے جو کہ خیمے کے وسطی ستون کے مشابہ ہے اور ایمان کے باقی شعبے خیمے کے لئے کیلوں کی طرح ہیں۔

حسن رضی اللہ عنہ نے ایک جنازے پر موجود مجمع میں فرزدق سے کہا: اس جگہ کے لیے تم نے کیا تیار کیا؟ اس نے کہا اتنے اتنے سال سے لا الٰہ اِلا اللہ کی گواہی، تو حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ تو ستون ہے اس کی رسیاں کہاں ہیں؟ یہ تمثیل ہے، اسلام کو خیمہ سے تشبیہ دی گئی۔ اس کا ستون کلمۂ توحید ہے اور رسیاں اعمال صالحہ ہیں۔

قوله: شهادة ان لا اله الا الله:

"شهادة" جَر کے ساتھ زیادہ مشہور ہے وجۂ جر میں کئی احتمالات ہیں: ① عطف بیان ہے۔ ② خمس سے بدل کل ہے۔ مجرورات کا مجموعہ ہے جس کا عطف کل سے ڈالا گیا ہے۔ ③ رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے عطف سے پہلے ربط کو دیکھتے ہوئے یہ بھی صحیح ہے کہ بدل بعض ہو۔

"شهادة" نصب کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں اعنی مقدر ہوگا۔ مرفوع پڑھنے کی صورت میں دو احتمال ہیں: ① مبتدا محذوف کی خبر ہو اور وہ "هی" یا "احداها" ہے۔ ② یہ مبتداء ہے اور خبر محذوف ہے یعنی "منها شهادة ان لا اله الا الله"۔

"اَن" مخففہ ہے "لا" نفی جنس کا ہے اور "الٰہ" اس کا اسم ہے اور اس کے ساتھ اس کی ترکیب خمسۃ عشر والی ہے لہٰذا اس کا فتحہ بنی کا ہے نہ کہ معرب کا بخلاف زجاج کے اس لئے کہ انہوں نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ فتحہ لفظی کے ساتھ ہے اور اس کی خبر بالاتفاق محذوف ہے۔ جو "موجودٌ" ہے اگر الٰہ سے مرد معبود بحق ہو ورنہ اس کی تقدیر عبارت معبود بحق ہوگی اور الا حرف استثناء ہے۔ بعض نے کہا غیر کے معنی میں ہے اور یہ مابعد کے ساتھ الہ کی صفت ہوگی اور اس کی خبر محذوف ہوگی اور الا بمعنی غیر ہونے کی صورت میں لفظ جلالہ کو الہ کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب قرار دینا جائز ہے اور بعض نے کہا استثناء کی صورت میں اور لفظ اللہ خبر کی ضمیر مستتر سے بدل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور بعض نے کہا کہ لا کے اسم سے بدل ہے قبل اسکے محل کے اعتبار سے اس سے پہلے۔ بعض نے کہا لا کی خبر ہونے کی وجہ سے۔

قوله: وان محمدًا عبده ورسوله:

یعنی محمد ﷺ کامل بندے اور تکفیل کرنے والے رسول ہیں اور شرعی طور پر شہادتین کے تلازم کی وجہ سے دونوں کو ایک خصلت قرار دیا گیا۔ ایک روایت میں شہادتین میں سے ایک پر اقتصار کیا ہے، اکتفاء کی وجہ سے یا بھولنے کی وجہ سے۔

اکثر روایات میں دونوں کے ایک ساتھ مذکور ہونے سے یہ اخذ کیا گیا ہے کہ اسلام کی صحت میں ضروری ہے کہ ان دونوں یعنی عبدہ ورسولہ کو پے در پے اور ترتیب سے لایا جائے۔

قوله: واقام الصلوٰة:

"الصلوٰة" (یہاں فرض نماز ہے" اقامة " کی تاءِ فعل کے محذوف عین کلمہ کے عوض میں ہے۔ اضافت کے وقت عبارت کے لمبا ہونے کی وجہ سے حذف کر دی گئی۔ یہ تحقیق زجاج کے قول کے مطابق ہے۔ بعض نے کہا ہے یہ دونوں یعنی اقام اقامۃ مصدر ہیں۔

قوله: وایتاء الزکاة:

ایتاء سے مراد عطاء زکوٰۃ اور مصارف کو اس کا مالک بنانا اور یہاں زکوٰۃ سے مراد صدقہ مفروضہ ہے۔

قوله: والحج:

"**الحج**" حاء کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ دونوں مصدر ہیں۔ ایک روایت میں "**حج البيت**" ہے یعنی **اى قصده و أداء النسك** مناسک کو ادا کرنے کیلئے اس کا قصد کرنا پس لام مضاف الیہ کے عوض میں ہے۔ بعض نے کہا لام عہد ذھنی کا ہے اور واؤ مطلق جمع کے لیے ہے۔ لہٰذا یہ اعتراض نہ کیا جائے روزہ زکوٰۃ سے پہلے فرض ہوا ہے اور زکوٰۃ حج سے پہلے۔

اور شاید مذکورہ تقدیم میں یہ نکتہ ہو کہ عبادت صرف بدنی ہے یا صرف مالی ہے یا دونوں سے مرکب ہے یا اس طرف اشارہ ہو کہ طاعت تین طرح کی ہے یومیہ ہے یا سالانہ یا عمریہ ہیں۔

اور استطاعت کو اس کی شہرت کی وجہ سے ذکر نہیں کیا یا اس وجہ سے کہ استطاعت کا اعتبار ہر طاعت میں ہوتا ہے۔

قوله: وصوم رمضان:

یعنی رمضان کے ایام معروفہ میں ارکان و شرائط کے ساتھ روزہ رکھنا۔ بعض نے کہا یہاں **شهر** محذوف ہے۔ کہا گیا کہ رمضان مہینے کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿**شهر رمضان**﴾ میں اضافت بیانیہ ہے۔

بعض روایات میں صوم رمضان کا ذکر حج سے پہلے وارد ہوا ہے اور دونوں صحیح ہیں جیسا کہ پہلے گزرا۔ اس وجہ سے بخاری نے "کتاب الحج" کو کتاب الصوم پر مقدم کیا ہے اور جمہور نے اس کو تمام عبادات سے مؤخر کیا ہے کیونکہ اس کا وجوب عمر کے آخر تک معلق رہتا ہے۔ نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بخاری نے یہ حدیث کتاب الایمان کے ابتداء میں ذکر کی ہے تا کہ واضح ہو جائے کہ اسلام کا اطلاق افعال پر ہوتا ہے اور اسلام اور ایمان دونوں کبھی ایک معنی میں ہوتے ہیں۔

ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شہادتین کے ساتھ آخری چار (عبادات) کا ذکر کرنا صرف ان کی عظمت شان پر تنبیہ کرنے کے لیے ہے اگر چہ اسلام میں دخول صرف شہادتین پر ہی موقوف ہے اور یہی (چار عبادات) اسلام کے شعائر میں سب سے زیادہ ظاہر ہیں اس لئے کہ ان کی وجہ سے تابعداری پوری ہو جاتی ہے اور ان میں سے بعض کے ترک سے اطاعت کی قید ختم ہو جاتی ہے۔ اگر چہ یہ کفر تک نہیں پہنچا تا کیونکہ یہ بالا جماع انکار نہیں البتہ احمد وغیرہ سے ترک صلاۃ کے بارے میں منقول ہے تو وہ دلیل خاص ہے حضور ﷺ کا فرمان ہے: **من ترك الصلوٰة متعمدا فقد كفر۔** "جس نے عمداً نماز چھوڑی تحقیق اس نے کفر کیا"۔

اور جہاد کا ذکر نہیں کیا اس لئے کہ جہاد بعض احوال کے علاوہ فرض کفایہ ہے اور کلام ان فروض عین کے بارے میں ہے یہ جو اسلام کے شعائر اعظم ہیں۔ اسی وجہ سے ایک روایت میں اس کے آخر میں اس کو بھی زیادہ کیا ہے: "**وان الجهاد فى العمل الحسن**"۔

بعض نے کہا ان پانچ میں حصر کی وجہ یہ ہے کہ عبادت نام ہے فعل (کرنا) کا یا ترک (چھوڑنا) کا۔ روزہ عبادت کی قسم ثانی ہے اور عبادت کی پہلی قسم یا لسانی ہے وہ شہادتین ہیں یا بدنی ہے وہ نماز ہے یا مالی ہے وہ زکوٰۃ ہے یا مالی اور بدنی ہے تو وہ حج ہے۔

شہادتین کو مقدم کیا اس لئے کہ وہ دونوں اصل ہیں، پھر نماز کو (دیگر عبادات پر مقدم کیا) اس لئے کہ نماز سب سے عظیم

ستون ہے۔اس وجہ سے حدیث میں آیا ہے: "وعمودها الصلوٰة" (اور اس کا ستون نماز ہے) اور ایک حدیث میں ہے: "الصلوٰة عماد الدين" اور اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ [العنکبوت :٤٥] جامع ہے اس وجہ سے نماز کا نام "اُم العبادات" رکھا گیا ہے جیسے کہ شراب کا نام "اُم الخبائث" رکھا گیا ہے۔ پھر (نماز کے بعد متصل) زکوٰۃ کو اس لئے ذکر کیا کہ قرآن میں بہت سی جگہوں میں دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہے اور اس لئے بھی کہ بدنیہ اور مالیہ میں مناسبت ہے۔

پھر حج ذکر کیا' اس لئے کہ یہ دو عبادتوں کو جامع ہے والا اور دو مشقتوں کا محل ہے اور اس وجہ سے کہ بغیر عذر کے اس کو چھوڑنے والا بُرے خاتمہ کے راستے پر ہے۔جس طرح کہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے جس حدیث کی صحت اور ضعف میں اختلاف ہے۔:من استطاع الحج فلم يحج فليمت ان شاء يهوديا وان شاء نصرانيا۔"جو حج کی استطاعت رکھتا ہو اور اس نے حج نہ کیا تو چاہے وہ یہودی ہو کر مرے اور چاہے نصرانی ہو کر مرے" اور حدیث کی اصالت پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے :﴿وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [آل عمران: ٩٧] اس طور پر کہ من كفر کو من لم يحج کی جگہ پر رکھا ہے' میں مبالغہ آمیز تہدید کے لیے' اس طور پر کہ "عنہ" سے عدول کیا اور عن العالمین ذکر کیا۔

اس کو روزے سے مؤخر کرنا جیسا کہ صحیح روایت میں ہے تو وہ ترتیب کی رعایت کی وجہ سے ہے۔اس لئے کہ روزہ دوسرے سال میں فرض ہوا اور حج پانچویں یا چھٹے یا آٹھویں یا نویں سال میں فرض ہوا۔

تخریج: اس حدیث کو احمد' ابوداؤد' ترمذی اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے' اور پہلی تین احادیث "الاربعينية النووية" کے مجموعہ میں سے ہیں۔

ایمان کی ستّر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں

٥:وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاِيْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً فَاَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ.(متفق عليه)

أخرجه مسلم فى صحيحه ١/٦٣رقم ٥٨وزاد بضع وستون"وروى البخارى فى صحيحه ١/٥١حديث رقم ٩"الايمان بضع وستون شعبة ـوالحياء شعبة من الايمان "وأبو داوٗد ٥/٥٥حديث رقم ٤٦٧٦ـوالنسائى ٨/١١٠حديث رقم ٥٠٠٥والترمذى بنحوه ٥/١٢حديث ٢٦١٤وابن ماجة كذلك ١/٢٢حديث رقم ٥٧وأحمد فى مسنده ٢/٣٧٩ـ

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایمان کے ستر سے زائد شعبے اور شاخیں ہیں۔ان میں سے سب سے افضل شعبہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار ہے اور سب سے ادنیٰ شعبہ راستہ سے تکلیف دینے والی چیز کو دور کر دینا ہے اور حیاء ایمان کا ایک خاص درجہ اور شاخ ہے۔(متفق علیہ)

تشریح: قوله:قال رسول الله ﷺ الايمان بضع وسبعون شعبة :

"الایمان": یعنی اس کے ثمرات اوراس کی فروع ایمان (اور وہ تصدیق اور اقرار ہے) کا ان پر اطلاق مجازی ہے۔اس لئے کہ یہ ایمان کے حقوق اور لوازم میں سے ہے۔

ایک روایت بضعة کی ہے۔باء دونوں میں مکسور ہے اور کبھی فتحہ دیا جاتا ہے بمعنی قطعہ (ٹکڑا) ہے۔پھر یہ دونوں تین اور دس کے درمیان عدد میں استعمال ہونے لگے اور قاموس میں ہے کہ تین سے لیکر نو کے درمیان یا پانچ تک یا ایک سے چار تک کے درمیان یا چارسے نو تک یا سات ہے،اھ۔

اور بعض روایات میں سبع وسبعون آیا ہے یہ اس کی تائید کرتا ہے اور اصل میں مسلم کی روایت ہے اس پر ابوداوٗد ترمذی اور نسائی رحمہ اللہ چلے ہیں (متابعت کی ہے) اور بخاری کی روایت میں "بضع وستون" ہے اور وہ اس کے یقینی ہونے کو راجح قرار دیتی ہے۔قاضی عیاض نے پہلی کو درست قرار دیا ہے اس لئے کہ تمام احادیث میں وہی ہوتا ہے اور اس کو ایک جماعت نے جن میں نووی رحمہ اللہ بھی ہیں راجح قرار دیا ہے اس لئے کہ اس میں زیادہ ثقہ راوی ہیں اور کرمانی رحمہ اللہ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ ثقہ کی زیادتی یہ ہے کہ روایت میں لفظ زیادہ کیا جائے اور یہ تو دو روایتوں کا اختلاف ہے حالانکہ ان دونوں کے درمیان معنی میں کوئی منافات نہیں اس لئے کہ اقل کا ذکر کرنا اکثر کی نفی نہیں کرتا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ساٹھ کے بارے میں خبر دی پھر ان کو زیادہ کا علم ہوا تو اس کی خبر دے دی اور یہ بھی جواب دیا گیا ہے کہ یہ زیادتی کو متضمن ہے جیسا کہ کرمانی رحمہ اللہ نے اس کا اعتراف کیا ہے لہٰذا صحیح وہی ہے جو نووی رحمہ اللہ نے کہا۔اور زیادہ ظاہر یہ ہے واللہ اعلم۔کہ اس سے مراد تکثیر ہے نہ کہ تحدید اور اختلاف کو قضیہ کے تعدد پر محمول کیا جائے اگر چہ ایک ہی راوی کی طرف سے ہو۔"شعبة" اصل میں درخت کی ٹہنی کو کہتے ہیں۔اور ہر اصل کی فرع کو کہتے ہیں اور یہاں اس سے مراد عمدہ خصلت ہے یعنی ایمان متعدد خصلتوں والا ہے اور ایک صحیح روایت میں ہے: "بضع وسبعون بابا" اور ایک روایت میں ہے: "اربع وستون بابا" ای نوعا من الخصال الکمال۔

اور ایک دوسری روایت میں ہے:"ثلاثة وثلاثون شریعة من وافی الله بشریعة منها دخل الجنة" تینتیس شریعتیں ہیں۔جس نے ان میں سے ایک شریعت اللہ کو پوری کی وہ جنت میں داخل ہوگا۔ابن شاہین نے روایت کیا ہے:ان لله تعالٰی مائة خلق من اتی بخلق منها دخل الجنة کہ اللہ تعالیٰ کے سو اخلاق ہیں جو ان میں سے ایک خلق بھی بجالایا جنت میں داخل ہو جائے گا اور اس کی تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد حیاء، رحمت، سخاوت اور تسامح (چشم پوشی/درگذر کرنا) وغیرہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفات علیا میں مذکور ہیں۔

قوله: فافضلها قول لا اله الا الله:

"فأفضلها" فاء تفصیلیہ ہے یا تفریعیہ ہے بعض نے کہا یہ جزائیہ ہے جسے فصیحہ کہا جاتا ہے ای اذا کان الایمان ذا شعب فأفضلها......

"قول لا اله الا الله" یعنی یہ ذکر قول کو "هذا الذکر" کی جگہ رکھا گیا۔اس کی تائید ایک اور روایت سے ہوتی ہے افضل الذکر لا اله الا الله ہے نہ کہ شہادت کی جگہ۔اس لئے کہ یہ اس کی اصل میں سے ہے نہ کہ فرع میں سے اور تصدیق قلبی اس سے خارج ہے بالاجماع جس طرح کہ کہا گیا اور یہ اقرار کو ایمان کا حصہ بنانے پر مبنی ہے۔

اور بہر حال اس قول پر کہ وہ شرط ہے تو اس میں کوئی مانع نہیں کہ " قول " سے مراد شهادة ہو کیونکہ یہ اس توحید سے منع کرتی ہے جو اس مکلّف پر متعین ہے کہ اس کا غیر اس کی صحت کے بعد ہی صحیح ہوتا ہے اور یہ وہی اصل ہے جس پر سارے شعبوں کی بنیاد ہے۔ یا اس لئے کہ وہ شرعاً توحید کے معنی یعنی تصدیق کو متضمن ہے۔

اور یہ بھی جائز ہے کہ مراد یہ ہو کہ وہ من وجہ ان سے افضل ہے اور وہ یہ کہ وہ خون اور مال کی عصمت کو واجب کرتی ہے نہ کہ وہ من کل وجوہ افضل ہے ورنہ لازم آئے گا کہ وہ روزہ اور نماز سے بھی افضل ہے حالانکہ اس طرح نہیں ہے۔

اور یہ بھی جائز ہے کہ مقصود مطلق زیادتی ہو یعنی تمام ادیان میں فضل کے اعتبار سے لا الٰہ الا اللہ کا قول مشہور ہے۔

قولہ: وادناها اماطة الاذی عن الطريق:

"ادناها" أی أقربهامنزلة وأدونها مقداراً۔ "دنو "بمعنی "قرب " سے ہے پس یہ "فلان بعيد المنزلة" کی ضد ہے أی رفيها۔ اس وجہ سے ابن ماجہ نے "افضلها" کی جگہ لفظ "فارفعها " روایت کیا ہے اور ایک روایت میں فأقصاها ہے' یا دناء ة سے ماخوذ ہے، ای أدناها فائدة یعنی فائدہ کے اعتبار سے سب سے کم' اس لئے کہ یہ ادنی ضرر کو دفع کرنا ہے۔

"اماطة" ازالہ یہ مصدر ہے بمعنی مؤذی (اذیت دینے والی چیز) یا مبالغہ ہے یا اس چیز کا نام ہے جس کے ذریعے تکلیف دی جائے جیسے کانٹا یا پتھر یا گندگی۔ حسن بصری نے الابرار کی تفسیر میں کہا ہے کہ" ابرار وہ ہیں جو چھوٹی چیونٹیوں کو بھی اذیت نہیں دیتے اور ضرر پر راضی نہیں ہوتے"۔ ایک روایت میں اماطة العظم (ہڈی کا دور کرنا) ہے۔ ہڈی کا ذکر بطور مثال کے ہے۔

اور اہل تحقیق کے طریق میں اذی سے مراد نفس ہے' جو صاحب اذیت اور دوسروں کے لیے منبع اذی تکلیف کا سرچشمہ ہے۔ پس پہلا شعبہ عبادات قولیہ کا ہے اور دوسرا طاعاتِ فعلیہ کا ہے' یا پہلا شعبہ فعلیہ کا ہے اور دوسرا عبادات ترکیہ کا ہے یا پہلا شعبہ حق تعالیٰ کے ساتھ معاملہ کرنے کا ہے اور دوسرا شعبہ مخلوق کے ساتھ خوش معاملگی سے پیش آنے کا ہے یا پہلا شعبہ اللہ تعالیٰ کے امر کی تعظیم کا ہے اور دوسرا شعبہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت کرنے کا ہے یا پہلا حقوق اللہ کے قیام کا ہے اور دوسرا حقوق العباد کے قیام کا ہے۔ لہٰذا جس نے ان دونوں کو صدق کے ساتھ قائم کیا وہ صالحین میں سے ہے۔

قولہ: الحياء شعبة من الايمان:

"الحياء": "مد" کے ساتھ۔ " شعبة"۔ کی تنوین تعظیم کے لیے ہے۔ أی عظيمة۔

"من الايمان": (یہاں مضاف محذوف ہے) أی من شعب الايمان یعنی اس کے شعبوں میں سے ہے۔ یہاں "حیاء" سے مراد حیاء ایمانی ہے اور حیاء ایمانی وہ اخلاق ہیں جو کسی شخص کو ایمان کی وجہ سے فعل قبیح سے روکتے ہیں جیسے ستر کھولنے سے اور لوگوں کے سامنے جماع کرنے سے "حیاء" نفسانی مراد نہیں ہے۔ حیاء نفسانی وہ حیاء ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نفوس میں پیدا کیا ہے یہ نام ہے اس تغیر اور انکساری کا جو آدمی کو ملامت اور عیب کے خوف سے لاحق ہوتی ہے۔

حیاء کی وجہ تخصیص:

تمام شعبوں میں سے صرف حیاء کو ذکر کیا اس لئے کہ یہ تمام شعبوں کی طرف داعی ہے، چونکہ زندہ شخص دنیا کی فضیحت اور آخرت کی قباحت سے ڈرتا ہے اس لئے وہ منہیات سے رُک جاتا ہے اور ملاھی (کھیل کود/ گانے کے آلات) سے باز رہتا ہے۔اس وجہ سے کہا گیا ہے: **الحیاء ان مولاك لایراك حیث یراك۔** حقیقی حیاء یہ ہے کہ تیرا مولا تجھے اس جگہ نہ دیکھے جس سے تجھ کو روکا ہے اور یہ مقام احسان ہے جس کا نام مشاہدہ رکھا گیا ہے جو محاسبہ اور مراقبہ کے حال سے پیدا ہوتا ہے۔پس یہ حدیث جلیل' حدیث جبرائیل کا اجمال ہے۔لہٰذا ان شعبوں میں سب سے افضل: **استحیوا من الله حق الحیاء۔ ...... فمن یعمل ذلك فقد استحی من الله حق الحیاء۔** ایمان کی طرف مشیر ہے اور سب سے کم تر اسلام سے آگاہ کرنے والا ہے اور حیاء احسان تک پہنچانے والی ہے۔اس وجہ سے حضور ﷺ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ سے حیا کرو جیسا کہ حیاء کرنے کا حق ہے''۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ہم اللہ سے حیا کرتے ہیں جیسا کہ حیاء کا حق ہے والحمدللہ۔حضور ﷺ نے فرمایا: ''یہ حیا نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ سے حیا کرنا جیسا کہ حیاء کا حق ہے وہ یہ ہے کہ سر اور اس کے متعلقات کی حفاظت کی جائے اور پیٹ اور جس پر وہ حاوی ہے اس کی حفاظت کی جائے اور موت اور مصیبت کو یاد کیا جائے اور جو آخرت کا ارادہ کرتا ہے وہ دنیا کی زینت کو چھوڑ دیتا ہے اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتا ہے۔پس جو یہ کرے گا تو اس نے اللہ سے حیاء کی جیسا کہ حیاء کا حق ہے''۔اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ایک اور حدیث صحیح میں آتا ہے: **الحیاء خیر کلہ** حیاء ساری کی ساری خیر ہے۔

ابن حبان فرماتے ہیں: میں اس حدیث کے معنی میں ایک مدت تتبع کرتا رہا اور طاعات کو شمار کیا تو وہ کچھ اوپر ستر ہو گئیں۔پھر میں نے سنت کی طرف رجوع کیا اور ہر اس طاعت کو شمار کیا جس کو رسول اللہ ﷺ نے ایمان میں سے شمار کیا تو وہ کم ہو گئیں۔پھر جو کچھ کتاب وسنت میں تھا اس سب کو ملایا تو وہ ستتر (۷۷) ہو گئیں پس معلوم ہوا کہ یہی مراد ہے۔

امام سیوطی فرماتے ہیں: ایک جماعت نے جس میں بیضاوی اور کرمانی وغیرہ شامل ہیں نے تکلف کیا' ان کو شمار کیا اور ان میں شمار کے اعتبار سے سب سے قریب ابن حبان ہیں کیونکہ انہوں نے ہر وہ خصلت ذکر کی ہے جس کا نام کتاب وسنت میں ایمان رکھا گیا ہے۔شیخ الاسلام ابوالفضل ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی شرح میں ان کی اتباع کی ہے اور ہم نے ان دونوں کی اتباع کی ہے وہ شعبے یہ ہیں: اللہ پر ایمان لانا ہے' اس کی صفات پر' اس کے علاوہ ہر چیز کے حادث ہونے پر' اس کے ملائکہ پر' اس کی کتابوں پر' اس کے رسولوں پر' تقدیر پر' آخرت کے دِن پر' اللہ کی محبت' اللہ کے لیے محبت' اسی کے لیے بغض' نبی کی محبت اور ان کی تعظیم کا اعتقاد اور اس حکم میں ان پر درود بھیجنا اور ان کی سنت کا اتباع بھی شامل ہے' اخلاص' ریاء اور نفاق کا چھوڑنا بھی اخلاص میں داخل ہے' توبہ' خوف' رجاء' شکر' وعدہ پورا کرنا' صبر' رضا بالقضا' حیاء' توکل' رحمت' تواضع' بڑوں کی عزت کرنا' چھوٹوں پر رحم کرنا بھی تواضع میں شامل ہے' کبر اور عجب کا چھوڑنا اور حسد' کینے کا چھوڑنا ہے' غصہ کو ترک کرنا' توحید کی گفتگو' قرآن کی تلاوت' علم کا سیکھنا اور اس کا سکھانا' دُعا' ذکر' استغفار اور لغو سے اجتناب یہ بھی ذکر میں شامل ہے' حساً اور حکماً پاک ہونا اور نجاستوں سے اجتناب بھی اس میں شامل ہے اور ستر کا ڈھانپنا' فرض اور نفل نماز' زکوٰۃ' غلام آزاد کرنا' سخاوت' کھانا کھلانا اور ضیافت بھی اس

میں شامل ہے' فرض اور نفل روزہ رکھنا' اعتکاف' لیلۃ القدر کو تلاش کرنا' حج' عمرہ' طواف' دین کی خاطر فرار اور اس حکم میں ہجرت ہے' نذروں کو پورا کرنا' ایمان کو طلب کرنا' کفاروں کا اداء کرنا' نکاح کے ذریعے پاکدامنی حاصل کرنا' عیال کے حقوق کا قیام والدین کے ساتھ بھلائی کرنا' اولاد کی تربیت کرنا' صلہ رحمی کرنا' آقا کی تابعداری کرنا' غلاموں سے نرمی کرنا' عدل کے ساتھ حکومت کو قائم کرنا' جماعت کی اتباع کرنا' اولی الامر کی طاعت کرنا' اصلاح بین الناس۔ خوارج اور باغیوں سے قتال بھی اسی حکم میں شامل ہے' نیکی پر تعاون کرنا' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی اسی حکم میں شامل ہے' حدود و جہاد کو قائم کرنا' سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے' امانت کا ادا کرنا۔ خمس اور قرض کو پورا ادا کرنا بھی اس میں شامل ہے۔ پڑوسی کا اکرام کرنا' حسن معاملہ' مال کو جائز طریقے سے جمع کرنا بھی اسی میں شامل ہے اور مال کا اس کے حق میں خرچ کرنا' ترک تبذیر و اسراف بھی اس میں شامل ہے ۔سلام کا جواب دینا' چھینکنے والے کو جواب دینا' لوگوں سے ضرر کو ہٹانا' لہو سے اجتناب کرنا اور راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے، اھ۔

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب نقایہ میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس کے دلائل اس کی شرح ''اِتمام الدرایہ'' میں مذکور ہیں اور اس کتاب میں متفرق طور پر آئیں گے لیکن میں نے آپ کے لئے مجمل طور پر ذکر کر دیئے ہیں تاکہ آپ اس میں تفصیل کے ساتھ غور کریں۔ لہٰذا جن صفات کے ساتھ آپ کا نفس متصف ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر اداء کریں اور جس کو آپ اس کے خلاف دیکھیں تو اس کی توفیق اللہ سے مانگیں کہ وہ آپ کو حاصل ہو جائیں۔ اس لیے کہ جس میں یہ شعبے پائے جائیں گے وہ کامل مؤمن ہے اور جس میں ان میں سے بعض کم ہوئے تو وہ ناقص مؤمن ہوگا۔ نووی نے ایک عجیب بات کہی ہے کہ ایمان شرعی کے اعمال پر اطلاق کیے جانے میں یہ حدیث نص ہے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا تعاقب کیا اور کہا ہے کہ: بعض قائلین نے اس (حدیث) سے اس پر استدلال کیا کہ ایمان نام ہے تمام طاعات کے بجالانے کا اور بعض نے کہا کہ وہ اقرار اور تصدیق اور عمل سے مرکب ہے' حالانکہ ایسا نہیں جیسا کہ انہوں نے گمان کیا۔ اس لئے کہ کلام ایمان کے شعبوں میں ہے نہ کہ اس کی ذات میں اس لئے کہ تقدیری عبارت ''شعب الایمان'' ہے۔ تاکہ اس کے بارے میں سبعون شعبۃ کے الفاظ سے خبر دینا صحیح ہو سکے اس لئے کہ اس کا حاصل یہ ہے کہ ایمان کے شعبے یہ یہ ہیں اور کسی چیز کے شعبے اس کا غیر ہیں، اھ۔

حدیث میں ایمان کو ٹہنیوں اور شاخوں والے درخت سے تشبیہ دی ہے۔ جس طرح قرآن میں حقیقت ایمان پر دلالت کرنے والے کلمہ کو ایسے ''شجرہ طیبہ'' سے تشبیہ دی ہے جس کی جڑ ثابت ہو اور شاخیں آسمان میں ہوں۔ یعنی اس کی جڑ دِل میں ثابت ہے اور اس کی شاخیں آسمان میں بلند ہیں۔

قوله: متفق عليه:

میرک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس حدیث کو متفق علیہ کہنا محل نظر ہے۔ اس لئے کہ ''بضع وسبعون شعبة'' صرف مسلم کے الفاظ ہیں اور بخاری میں ''بضع وستون شعبة'' ہے اور اس طرح ''فأفضلها الطريق'' یہ مسلم کی روایت ہے۔ لہٰذا یہ متفق علیہ نہیں ہے اور اصحاب اربعہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے مگر ترمذی نے انکے قول ''الحياء شعبه من الايمان'' کو ساقط کر دیا ہے اھ۔ عینی نے ذکر کیا ہے کہ ''بضع وسبعون'' ابوذر ہروی کے طریق میں مروی ہے اور سیوطی نے کہا ہے کہ ''بضع

وستون او بضع وسبعون شعبة"۔ بخاری نے اسی طرح شک کے ساتھ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اصحاب سنن ثلاثہ نے اس کو "بضع وسبعون" کے الفاظ کے ساتھ بغیر شک کے روایت کیا ہے اور ابوعوانہ نے اپنی صحیح میں "ست وسبعون او سبع سبعون" کے لفظ سے نقل کیا ہے اور ترمذی نے "اربع وستون" کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ پس مصنف کے کلام کی یہ تاویل کی جائے گی کہ ان دونوں کی روایت میں بغیر زیادتی کے اس کی اصل فافضلھا ہے...... متفق علیہ۔

حقیقی مسلم وحقیقی مہاجر

۶ : وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَانَهَى اللّٰهُ عَنْهُ هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ وَلِمُسْلِمٍ قَالَ اِنَّ رَجُلاً سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ اَيُّ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرٌ؟ قَالَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ۔

أخرجه البخاري ۱/۵۳حديث رقم ۱۰۔ ومسلم ۱/۶۵حديث (۶۵۔۴۱)۔وأبو داؤد في سنة ۳/۹حديث رقم ۲۴۸۱۔ والنسائي في سننه ۸/۱۰۵حديث رقم ۴۹۹۶وأحمد ۲/۱۸۷۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کامل درجے کا مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان کے شر سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور کامل مہاجر وہ ہے کہ جس نے ان تمام اشیاء کو ترک کر دیا جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے۔ یہ الفاظ صحیح بخاری کے ہیں اور مسلم شریف میں یہ الفاظ بھی نقل کئے گئے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ سب سے بہترین مسلمان کون ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جس کے ہاتھ اور زبان کے شر سے مسلمان سلامتی میں رہیں

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن عمرو بن العاص۔ یہ عبداللہ ابن عمرو بن العاص "سہمی قریشی" ہیں۔ لفظ "عمر" تمیز سے کرنے کی خاطر "عمروؔ" کو واؤ کے ساتھ لکھا جاتا ہے چنانچہ حالت قصبی میں مغیر واؤ کے لکھا جاتا ہے چونکہ اس صورت میں تمیز کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے والد سے پہلے اسلام لے آئے ان کے والد تیرہ (۱۳) سال بڑے تھے۔ بعض نے بارہ سال کہا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ گیارہ (۱۱) سال بڑے تھے۔ بڑے عابد، عالم، حافظ، کتابوں کے پڑھنے والے تھے۔ آنحضور ﷺ سے آپ کی احادیث کے بارے میں لکھنے کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے ان کو اجازت دے دی۔ ان کی وفات کے بارے میں اختلاف ہوا ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ واقعہ حرہ کی راتوں میں ذی الحجہ ۶۳ھ میں وفات ہوئی۔ بعض نے سن وفات ۷۳ھ کہا ہے اور بعض نے ۶۵ھ میں وفات بتلائی ہے۔ بعض نے طائف میں ۵۵ھ میں ان کی وفات کا ذکر کیا ہے کچھ لوگ مصر میں ۶۵ھ میں ان کی موت بتلاتے ہیں۔ مقام وفات میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض نے مکہ، بعض نے طائف اور بعض نے مصر بتائی ہے۔ ان سے بہت سے لوگ روایت کرتے ہیں یعلی بن عطاء اپنی والدہ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ عبداللہ بن عمرو بن العاص کے لئے سرمہ بنایا کرتی تھیں

کیونکہ یہ رات بھر عبادت کیا کرتے تھے۔ چراغ بجھا کر بہت رویا کرتے تھے۔حتی کہ ان کی آنکھوں کی پلکیں گر گئی تھیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ روایت کرتے تھے' لیکن ان کی روایات کی تعداد سات سو (۷۰۰) ہے' جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایات سے کم ہے۔

تشریح: قوله:قال رسول الله ﷺ:المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده:

"**المسلم**": یہاں مسلمان مراد نہیں ہے' بلکہ کامل مسلمان مراد ہے جیسا کہ اسلام کا معنی پیچھے بیان ہوا۔یا حقیقی مسلمان مراد ہے جو اسلام سے معنی لغوی کے متصف ہو۔

المسلمون: اس حکم میں مسلمات شامل بھی ہیں اور مسلمین کا ذکر تغلیباً ہے یا تبعاً ہے اور اہل ذمہ (ذمی) بھی حکماً انہی کے ساتھ لاحق ہیں۔ابن حبان کی روایت میں ہے "من سلم الناس"۔

من لسانه: گالی گلوچ 'لعنت بھیجنے سے' غیبت سے' بہتان سے' چغلی سے اور سلطان کی طرف کوشش کرنے سے وغیرہ وغیرہ۔یہاں تک کہ کہا گیا کہ سب سے پہلی بدعت جو ظاہر ہوئی وہ لوگوں کا یہ کہنا تھا، راستہ (دو) راستہ (دو)۔

"**ويده**" مارنے سے' قتل سے' عمارت ڈھانے سے' دھکا دینے سے اور باطل لکھنے سے وغیرہ۔

ان دونوں کو خاص کیا گیا کیونکہ تکلیف اکثر ان دونوں سے دی جاتی ہے یا ان دونوں سے ارادہ کیا جاتا ہے'۔

اور زبان کو مقدم کیا، اس لئے کہ اس کے ذریعے ایذاء زیادہ اور آسان ہوتی ہے اور اس لئے بھی کہ یہ زخمی کرنے میں زیادہ سخت ہوتی ہے۔جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

جراحات السنان لها التئام ☆ ولا يلتام ما جرح اللسان

تلوار کے زخم بھر جاتے ہیں ☆ اور زبان کے زخم مندمل نہیں ہوتے

اور اس وجہ سے بھی کہ یہ زندوں اور مردوں کو عام ہے اور اس میں خاص و عام مبتلا ہے خصوصاً ان دنوں۔

اور قول کے بجائے "لسان" سے تعبیر کیا' کہ کسی سے استہزاء کے لیے زبان نکالنے کو بھی شامل ہو جائے۔

بعض نے کہا: ہاتھ کنایہ ہے تمام اعضاء سے اس لئے کہ افعال کی سلطنت اسی سے ظاہر ہوتی ہے، پکڑنا' کاٹنا' ملانا اور روکنا' لینا اس سے ہوتا ہے۔چنانچہ ہر عمل میں کہا گیا ہے: یہ ان اعمال میں سے ہے جو اس کے ہاتھوں نے کیا' اگر چہ اس کا وقوع اس سے نہ ہوا ہو۔ "ایدی" اور "یدان" کو نفس یا نفس کی جگہ رکھا جاتا ہے۔اس لئے کہ اکثر افعال ان دونوں سے ہوتے ہیں اور مفرد "ید" کا استعمال اس معنیٰ میں معروف نہیں۔

حد' تعزیز' بچوں کی تادیب اور حملہ کرنے سے روکنا وغیرہ۔تو یہ درستی چاہنا اور سلامتی کو طلب کرنا ہے یا شرعاً مستثنیٰ ہے' یا عرف میں اس پر اذیت کا اطلاق نہیں ہوتا۔

قوله:والمهاجر من هجر ما نهى الله عنه هذا لفظ البخاري:

"**المهاجر**": یعنی کامل یا حقیقتاً تا کہ ہجرت کی تمام انواع کو شامل ہو جائے اس لئے کہ اس کا فضل دائمی ہے۔

"**هجر**" یعنی ترک (چھوڑنا)۔"**ما نهى الله عنه**" یعنی کتاب وسنت میں اللہ نے جن چیزوں سے منع فرمایا ہے اور

ایک روایت میں ہے: "ما حرم الله عليه" (جسے اللہ نے حرام قرار دیا) اور (باب) مفاعلہ سے مراد مبالغہ ہے، جہاں مبالغہ صحیح نہ ہو۔

تخریج: ابوداؤد اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔

قوله: ولمسلم "قال: ان رجلا سأل النبي ﷺ ...... :

یعنی ان کی صحیح میں اس کا بعض حصہ۔ انہوں نے اس کا پہلا حصہ لفظاً جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع نقل کیا ہے اور عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے بالمعنیٰ نقل کیا ہے۔

"**ان رجلا سأل النبي**" اور ایک نسخہ میں **رسول الله صلى الله عليه وسلم** کے الفاظ ہیں۔

اى المسلمين اى اى افراد هذا الجنس أواى قسمي هذا النوع یعنی اس جنس کے کونسے افراد یا اس نوع کی کونسی قسم۔ "**خير**" بمعنی افضل اور اکمل ہے۔

بخاری نے "**اى الاسلام أفضل قال: من سلم......**" کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ "**اى اسلام من سلم**"۔ بعض نے کہا: چونکہ "ای" متعدد پر ہی داخل ہوتا ہے اس لئے یہاں (عبارت) محذوف ہے اور اس کی تقدیر "**اى اصحاب الاسلام**" ہے۔ بعض نے تقدیری عبارت یوں بیان کی ہے: "**اى خصال الاسلام**" (اسلام کی کونسی خصلتیں)۔ بعض نے کہا: اسلام بمعنی مسلم ہے مبالغہ مراد ہے۔ جیسا کہ عدل بمعنی عادل آتا ہے۔

خیر اور افضل کے درمیان فرق:

خیر اور افضل کے درمیان فرق ہے حالانکہ دونوں اسم تفضیل کے صیغے ہیں۔ پہلے کا تعلق کیفیت سے ہے اس لئے کہ وہ شر اور مضرت کے مقابلے میں نفع ہے اور دوسرے کا تعلق کمیت سے ہے اس لئے کہ وہ قلت کے مقابلے میں ثواب کی کثرت ہے۔

اور دونوں روایتوں میں اس بات پر دلالت ہے کہ روایت سابقہ میں مسلم سے مراد کامل (مسلم) ہے۔ اس وجہ سے خطابی نے کہا: **الناس العرب** کے قبیل سے ہے۔ **اى هم أفضل الناس** یعنی وہ لوگوں میں سب سے افضل ہیں۔ یہاں مراد یہ ہے کہ مسلمانوں میں سب سے افضل ہے وہ آدمی ہے جس نے اللہ کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی کو جمع کیا۔

اور دوسرے وہ آدمی جو حقوق العباد پر ہی اکتفاء کریں، اس وجہ سے کیا کہ پہلا بطریق اولیٰ سمجھا جاتا ہے۔

یا اس وجہ سے کہ اس کا ترک عفو کے زیادہ قریب ہے۔

یا اس وجہ سے کہ دوسرے سے دو حق متعلق ہیں لہٰذا اس کو اہتمام اور توجہ کی وجہ سے خاص کیا گیا اور اس وجہ سے کہ اسکے موجود ہونے سے دنیاوی اور اخروی سلامتی حاصل ہوتی ہے۔

یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اسلام کی علامت مخلوق کی ایذاء پہنچانے سے بچنا ہے جیسے کہ جھوٹ، خیانت اور وعدہ خلافی منافق کی علامت ہے۔

تکمیل ایمان کا مدار حب رسول پر ہے

۷ :وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ . (متفق علیه)

أخرجه البخاری ۵۸/۱حدیث رقم ۱٤ و مسلم فی صحیحه ۶۷/۱حدیث (۶۹ ـ ٤٤)والنسائی فی سننه ۱۱٤/۸حدیث رقم ۵۰۱۳ـ وابن ماجة فی سننه ۲۶/۱ حدیث رقم ۶۷ـ وأحمد فی مسنده۲۰۷/۳ـ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اس کی محبت میرے ساتھ اپنے والد، اولاد اور سب لوگوں سے بڑھ کر نہ ہو۔ (بخاری ومسلم)

راویٔ حدیث:

انس بن مالک۔ یہ انس بن مالک بن النضر ہیں۔ ان کی کنیت ''ابوحمزہ'' ہے حمزہ ایک سبزی کا نام ہے جو پت جھڑ کے موسم میں ہی اگتی ہے۔ یہ سبزی زبان کو کاٹتی ہے اسی مناسبت سے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میری کنیت ابو حمزہ ایک بھاجی پر رکھی تھی جس کو میں چنا کرتا تھا۔ قبیلہ خزرج میں سے ہیں۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص ہیں۔ ان کی والدہ کا نام ام سلیم بنت ملحان ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو ان کی عمر دس سال تھی۔ ان کی والدہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چھوٹا سا خادم ہے اس کے لیے دعا فرمائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ دعا دی' اے اللہ ان کے مال واولاد میں برکت عطا فرما' ان کی عمر دراز فرما' اور گناہوں کو معاف فرما' حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں اپنی صلبی اولاد میں سے ۹۸ جو اپنے ہاتھوں سے دفن کر چکا ہوں' میرا باغ سال میں دو بار پھول دیتا ہے' میری اتنی عمر ہو چکی ہے کہ زندگی سے دل اچاٹ ہے اور چوتھی دعا یعنی مغفرت کا امیدوار ہوں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں بصرہ میں قیام کیا تاکہ وہاں لوگوں کو دین سکھائیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بصرہ میں سب سے آخر میں ان کا انتقال ہوا' ان کی عمر ایک سو تین سال ہوئی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ننانوے سال ہوئی۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ یہ قول زیادہ صحیح ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی اولاد کی شمار ایک سو ہے اور ایک قول کے مطابق اسّی۔ جن میں اٹھتر مرد اور دو عورتیں ہیں۔ ان سے بہت لوگوں نے روایت کی۔

تشریح: قوله قال رسول الله ﷺ :لا یؤمن احدکم حتی أکون:

''لا یؤمن أحدکم'': اور ایک روایت میں ''الرجل'' ہے۔ ایک دوسری روایت میں ''أحد'' ہے اور یہ دونوں کو شامل ہے اور پہلی اخص ہے۔ ''حتی أکون'' حتی جارہ ہے اور أن مضمر ہونے کی وجہ سے ''یکون'' نصب کے ساتھ ہے۔

قوله: احب الیه من والده و ولده والناس اجمعین:

'' احب'' اسم تفضیل بمعنی مفعول ہے۔ ظرف میں وسعت ہونے کی وجہ سے افعل کے معمول (من والده) پر جار کو مقدم کیا۔ ''من والده'' باپ کا ذکر ہے' نہ کہ ماں کا' اس لئے کہ وہ زیادہ شرافت والا ہے لہٰذا اس کی محبت زیادہ بڑھ کر ہے۔ یا

''والد'' سے مراد ''ذو ولد'' ہے جو دونوں کو شامل ہے۔

'' ولد'': مذکر اور مؤنث دونوں کو شامل ہے۔

باپ کو مقدم کیا کیونکہ اس کی شرافت زیادہ ہے اور وہ وجود میں بھی مقدم ہے۔

نسائی کی روایت میں ''ولد ''کو مقدم کیا گیا ہے اس لئے کہ اس کی محبت زیادہ ہوتی ہے۔

اور دونوں کو خاص کیا گیا اس لئے کہ یہ دونوں اوروں سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔

اور ایک روایت میں ان دونوں کو مالی اور اہل سے تبدیل کیا گیا ہے' تا کہ نفس کی ہر محبوب چیز کو عام ہو جائے اور ان دونوں کا ذکر تمثیل کے طور پر ہے۔ گویا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''یہاں تک کہ میں اس کے نزدیک تمام عزیزوں سے زیادہ محبوب ہو جاؤں'' پھر اس کو اپنے قول ''الناس اجمعین'' سے مؤکد کیا تاکید اور اسعراق کے اعتبار سے ''والناس اجمعین'' کے الفاظ کے ذریعے عام کا خاص پر عطف ہے۔ لغت کے اعتبار سے اس عموم میں نفس بھی داخل ہے اگر چہ عرف کے اعتبار سے خارج ہے۔ جیسا کہ اگلی حدیث میں آ رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس قول کے موافق ہے: ﴿اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ [الاحزاب: ٦] ''نبی سے لگاؤ ہے ایمان والوں کو زیادہ اپنی جان سے'' اور اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بھی موافق ہے: ﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ﴾ [التوبة: ٢٣] (تو کہہ دے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور برادری اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور حویلیاں جن کو پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور لڑنے سے اس کی راہ میں تو انتظار کرو یہاں تک کہ بھیجے اللہ اپنا حکم اور اللہ راستہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو''۔

اور مراد طبعی محبت نہیں اس لئے کہ وہ اختیار میں داخل نہیں اور ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة: ٢٨٦] ''اللہ تعالیٰ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے'' بلکہ مراد عقلی محبت ہے جس اس چیز کے ترجیح دینے کو واجب کرتی ہے جس کے راجح ہونے کا عقل تقاضا کرے اور اس کو اختیار کرنے کی استدعا کرے اگر چہ وہ خواہش کے خلاف ہو۔ جیسے مریض کا دوائی کو محبوب رکھنا' وہ اپنے اختیار سے اس کی طرف مائل ہوتا ہے اور عقل کے مقتضیٰ کے مطابق اسے لیتا ہے۔ کیونکہ اسے معلوم ہے اور اس کا گمان غالب ہے کہ اس کی درستگی اسی میں ہے اگر چہ اس کی طبیعت اس کو ناپسند کرے مثلاً اگر کسی کو حضور ﷺ حکم دیں کہ وہ اپنے کافر ماں باپ یا اولاد کو قتل کرے یا یہ حکم دیں کہ وہ کفار سے قتال کرتا کرتا شہید ہو جائے۔ تو وہ اس کو اختیار کرنے کو پسند کرے گا کیونکہ جوہ جانتا ہے کہ سلامتی آپ ﷺ کے حکم کو پورا کرنے میں ہی ہے۔

یا مراد وہ حب ایمانی ہے جو اجلال' توقیر' احسان اور رحمت سے پیدا ہوتی ہے۔ جب ایمانی یہ ہے کہ محبوب کی تمام اغراض کو اس کے غیر کی تمام اغراض پر ترجیح دینا یہاں تک کہ ہر قریب ترین شخص اور نفس (پر) اور جب حضور ﷺ موجبات محبت یعنی حسن صورت' سیرت' کمال فضل اور احسان کا جامع ہیں' جن تک ان کا غیر نہیں پہنچ سکتا تو وہ اس کے مستحق ہیں کہ وہ مؤمن کو اس کے نفس سے بھی محبوب ہوں چہ جائیکہ ان کا غیر اور وہ محبوب حقیقی کے رسول ہیں اور اس کی طرف رہنمائی کرنے والے ہیں' اس پر دلالت کرنے والے اور ان کے نزدیک مکرم ہیں۔ قاضی فرماتے ہیں: ان کی سنت کی نصرت کرنا' ان کی شریعت کا دفاع کرنا' اپنی زندگی میں ان کو پانے کی تمنا کرنا تا کہ اپنے نفس و مال وغیرہ کو ان کی خاطر خرچ کرے یہ ان کی محبت میں داخل ہے۔

اور جو اس مرتبہ و کمال کی بلندی پر پہنچے ان میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ انہوں نے جب یہ حدیث سُنی تو سچ سچ بتلا دیا یہاں تک کہ اس سچ کی برکت سے اس کے کمال تک پہنچے۔ انہوں نے امر طبعی کے مقتضٰی کے مطابق کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اپنی جان کے علاوہ ہر چیز سے محبوب ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس وقت تک نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے جب تک کہ میں تم کو تمہاری جان سے بھی زیادہ محبوب ہو جاؤں''۔ عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کی قسم اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمر! تمہارا ایمان اب پورا ہوا ہے۔ اس کو بخاری نے روایت کیا ہے اور اس میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ وہ پہلے سمجھے کہ اس سے مراد طبعی محبت ہے پھر ان کو معلوم ہوا کہ مراد ایمانی اور عقلی محبت ہے تو انہوں نے جو مافی الضمیر کا اظہار کر دیا اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ کی برکت سے مقام اتم تک پہنچا دیا اور ان کے دِل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت یوں گھر کر گئی گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی زندگی ہیں۔

اسی لئے کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و بزرگی کا اعتقاد نہیں اس لئے کہ وہ تو اس سے پہلے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یقیناً حاصل تھی۔ بلکہ یہ ایسا وصف ہے کہ جو شخص اس سے متصف ہوتا ہے وہ اپنے نفس سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے اور اس کا دِل محبوب کے علاوہ ہر ایک کی محبت سے خالی ہو جاتا ہے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''جس کسی کا بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر صحیح ایمان ہوگا وہ اس محبت راجحہ کے کسی نہ کسی حصے کے پائے انے سے خالی نہ ہوگا اگرچہ وہ اکثر اوقات خواہشات اور غفلتوں میں ڈوبا رہتا ہو۔ ہم یہ بات اس دلیل کی بناء پر کہتے ہیں کہ ہم ان میں سے اکثر لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ جب بھی ان کے سامنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو اپنے اہل وعیال، مال و دولت اور اپنے والدین پر ترجیح دیتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنی جان کو خطرات اور ہلاکتوں میں ڈالنے کے باوجود وہ اپنے دِل میں ایسا سکون واطمینان پاتے ہیں کہ جس میں ذرا بھی تردد نہیں ہوتا ان تمام مذکورہ چیزوں پر اور خارج میں اس بات پر گواہی ان لوگوں کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کی زیارت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ مقامات دیکھنے کو ترجیح دیتے ہیں چونکہ ان کے دلوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے قلوب مسلسل غفلتوں اور خواہشات میں پڑے رہنے کی وجہ سے اکثر اوقات ایسی لہو ولعب میں مشغول رہتے ہیں، جو ان کو نفع پہنچنے سے دور رکھتی ہے۔ اس کے باوجود یہ لوگ ان شاء اللہ تعالیٰ محبت کی اس نوع کی برکت سے بہرہ ور ہوں گے۔ ان کے لیے ہر خیر کی امید کی جاتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے کامل حصہ ملا تھا اس لئے کہ (کسی سے محبت) اس کی معرفت کا ثمرہ ہوتا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت کا سب سے زیادہ علم تھا''۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس حدیث شریف میں نفسِ مطمئنہ اور نفس امارہ کی صفت کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ جس شخص میں نفس مطمئنہ کی جانب کو ترجیح ہوگی اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت راجح ہوگی اور جس میں نفس امارہ کی جانب غالب ہوگی اس میں اس کا عکس ہوگا اھ۔ اور نفس لوامہ ان دونوں کے درمیان کی حالت ہوتی ہے جو ان دونوں پر مرتب ہوتی ہے اس لئے اس کو ان دونوں کے ساتھ ذکر نہیں کیا۔

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "سلف وخلف" اہلِ حق کا مذہب ہے کہ جو شخص بھی توحید کے اقرار پر مرا وہ ہر حال میں یقینی طور پر جنت میں داخل ہوگا۔ جو شخص معاصی کے ارتکاب سے بچا رہا، مثلاً صغیر، اور وہ مجنون کہ جس پر حالت بلوغ کے ساتھ ہی جنون طاری ہوگیا، وہ تائب کہ جس نے بہت اچھے طریقہ سے توبہ کی ہو، حتی کہ اس توبہ کے بعد اس سے کوئی بھی گناہ سرزد نہیں ہوا، نیز وہ شخص کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اور وہ گناہوں سے بالکل صحیح سالم رہا، محفوظ رہا۔ تو اس وصف کے تمام لوگ جنت میں جائیں گے۔ جہنم میں بالکل نہیں جائیں گے۔ لیکن پلِ صراط پر سے گزرنا ہوگا۔ اگرچہ اس مرور میں اختلاف ہے، واضح بات یہ ہے کہ اس سے مراد "مرور الطراط" یہ اصل میں ایک پل ہوگا جو جہنم پر نصب کیا جائے گا۔ نعوذ باللہ منہا۔

جو شخص کبائر کا مرتکب رہا پھر بغیر توبہ کئے دنیا سے چل بسا، سو اس کا معاملہ اللہ کی مشیت کے سپرد ہے، وہ اگر چاہے تو عفو ودرگزر کا معاملہ فرمائے اور جنت میں داخل کردے، اور اگر چاہے تو معاف نہ کرے بلکہ جس قدر چاہے عذاب دے اور پھر جنت میں داخل فرمادے۔ لہٰذا "توحید" کے ساتھ مرنے والا کوئی بھی شخص اگرچہ اس نے معاصی کا ارتکاب کیا ہو وہ مخلد فی النار نہیں ہو گا۔ اسی طرح وہ شخص بھی جنت میں نہیں جائے گا کہ جس کا خاتمہ کفر پر ہوا ہو، اگرچہ اس نے کیسے ہی نیک اعمال کیے ہوں۔ کتاب وسنت اور اجماع سے اسی مذہب کی تائید ہوتی ہے اور علمی قطعی کے درجہ میں ہے۔ اگر کسی حدیث کا ظاہر اس کے خلاف ہو تو اُس حدیث میں تاویل واجب ہے تاکہ اُدلہ کے درمیان تطبیق رہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد، نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی روایت کیا۔

حلاوتِ ایمان سے سرشار ہونے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت

۸: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَبِهِنَّ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ مَنْ كَانَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَمَنْ اَحَبَّ عَبْدًا لَّا يُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ وَمَنْ يَّكْرَهُ اَنْ يَّعُوْدَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَاَنْ اَنْقَذَهُ اللّٰهُ مِنْهُ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ. (متفق علیه)

أخرجه البخاری ۱/ ۶۰حدیث رقم۱۶۔ ومسلم فی صحیحه ۱/ ۶۶حدیث (۶۷۔۴۳)۔ والنسائی ۸/ ۹۶حدیث رقم ۴۹۸۸والترمذی ۵/ ۱۶حدیث رقم ۲۶۴۴۔ وابن ماجة ۲/ ۱۳۳۸حدیث رقم ۴۰۳۳ وأحمد فی مسنده ۳/ ۱۷۲۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس آدمی میں تین چیزیں موجود ہیں۔ ان کی وجہ سے اس نے ایمان کی لذت کو حاصل کرلیا۔ ایک یہ کہ اس کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت تمام چیزوں کی محبت سے بڑھ کر ہو۔ دوم یہ کہ کسی شخص سے اس کی محبت صرف اور صرف اللہ کی رضا کے لئے ہو۔ سوم یہ کہ جب اللہ تعالیٰ اس کو کفر کے اندھیرے سے نکال کر ایمان کی روشنی کی طرف لے آیا تو اب وہ اسلام سے پھرنے کو اس طرح ناپسند جانے جس طرح آگ میں ڈالے جانے کو برا جانتا ہے۔ (متفق علیہ)

تشریح: قولہ: ثلاث من کن فیه وجب بهن حلاوة الایمان:

"ثلاث" مبتداء ہے اور جملہ شرطیہ اس کی خبر ہے۔ "ثلاث" نکرہ کا مبتداء واقع ہونا اس بناء پر درست ہے کہ تقدیری عبارت یوں ہے "خصال ثلاث"۔ ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نکرہ کے مبتداء ہونے کی مثال عرب کا یہ قول ہے: ضعیف عاذ بحرملة یعنی انسان ضعیف عاذ الی حرملة ایک کمزور آدمی نے ایک کمزور سے پناہ طلب کی۔ حرملة: ایک کمزور درخت۔

یا مبتدا واقع ہونا اس لئے درست ہے کہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ تقدیری عبارت "ثلاث خصال" ہے۔ مضاف الیہ کے عوض مضاف پر تنوین لے آئے ہیں۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے اس لئے کہ یہ توجیہ کلٌ اور بعضٌ کے علاوہ میں معروف نہیں یا ثلاثٌ کی تنوین تعظیم کی ہے اس لئے اس کا مبتداء بننا جائز ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ جملہ شرطیہ ثلاث کی صفت واقع ہو اور "من کل کان" اس کی خبر ہو۔

حدیث کا مطلب یہ ہے، جس شخص میں تین باتیں بیک وقت پائی جائیں گی وہ ان کے سبب اپنے دل میں ایمان کی حلاوت ولذت اور رغبت پائے گا۔ نسائی کی روایت میں "طعمه" کا اضافہ ہے۔

حلاوت کو دیگر ذائقوں کی بنسبت اس لیے ذکر کیا یہ لذاتِ محسوسہ میں بالکل نمایاں لذت ہے۔

بعض روایات میں وارد ہوا ہے بان حلاوة الایمان اذا دخلت قلبا لاتخرج منه أبداً کہ "ایمان کی حلاوت ومٹھاس جب کسی دل میں داخل ہو جاتی ہے تو پھر اس سے کبھی بھی نہیں نکلتی"۔ پس اس میں ایسے شخص کے لئے حسن خاتمہ کی بشارت ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ حلاوت ایمان کا معنی یہ ہے کہ طاعات میں لذت محسوس ہو تمام نفسانی خواہشات ورغوبات کی بنسبت طاعات کو ترجیح دے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی کیلئے مشقتوں کو گوارہ کرتا ہو، تکلیفوں کے کڑوے گھونٹ پی جاتا ہو اور تمام حالات میں تقدیر پر راضی ہو۔

اس میں اس تندرست آدمی کی طرف اشارہ ہے جو (اشیاء) کے ذائقوں کا حقیقی طور پر ادراک کر لیتا ہے اور اس کے برخلاف صفراء میں مبتلا شخص جو شہد کے ذائقے کو بھی اپنی صحت کی کمزوری کی بقدر اس کے اصل ذائقے سے کم محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ (اسی طرح) ایسا دل جو غفلت اور خواہشات کے امراض سے صحیح سالم ہو وہ ایمان کا ذائقہ چکھتا ہے، اور اس سے لذت حاصل کرتا ہے اور اس کی وجہ سے تنعم حاصل کرتا ہے، جیسا کہ وہ منہ میں شہد اور دیگر لذیذ کھانوں کی لذت پاتا ہے اور ان کے ذریعے تنعم حاصل کرتا ہے۔ بلکہ وہ ایمانی لذت اس سے بھی اعلیٰ درجہ کی ہے اس لئے اس کے حصول کی خاطر مؤمن دنیا کی لذتوں، بلکہ دوسری ساری نعمتوں کو چھوڑ دیتا ہے۔

قوله: من کان الله ورسوله احب الیه مماسواهما:

اس سے قبل مضاف ماننا ضروری ہے پہلی صورت (جبکہ ثلاثٌ مبتداء ہو اور جملہ شرطیہ ثلاث ہو) کی تقدیر پر یہ بدل، عطف بیان یا مبتدا محذوف جو "هی" یا "هن" یا اِحداها ہے کی خبر ہے اور دوسری صورت (جس میں جملہ شرطیہ ثلاث کی صفت ہو) میں یہ خبر ہے ای محبة من کان یعنی محبت "احبّ" یہ کان کی خبر ہونے کی بناء پر منصوب ہے، اور مفرد اس

لئے ہے کہ مَن کا صلہ ہے اور اس سے مراد ذکر کردہ محبت اختیاری ہے۔

"مما سواھما": یہ ذوی العقول و غیر ذوی العقول مال، وجاہت اور تمام خواہشات و مرادوں کو عام ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ اور اپنے آپ کو ضمیر ما سواھما میں جمع فرمادیا، حالانکہ آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ اس لئے کہ بسا اوقات آپ ﷺ کے لئے وہ چیز جائز ہوتی ہے جو دوسروں کے لئے جائز نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے نکاح کے خطبہ میں فرمایا: من یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصھما فلا یضر الانفسہ "جس نے اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کی تو وہ یقیناً ہدایت یافتہ ہے ورجس نے ان کی فرمانی کی اس نے اپنی ہی نقصان کیا"

حضور ﷺ کی خصوصیت کی وجہ یہ ہے کہ ان کی طرف سے برابری کا وہم نہیں ہوتا جب کہ ان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص حضور ﷺ اور اللہ تعالیٰ کو ایک ہی ضمیر میں جمع کرے گا تو اس میں دونوں کے برابر سمجھے جانے کا وہم ہوتا ہے ابن عبد السلام کا رجحان بھی اسی طرف ہے اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ منع کی حدیث پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ دوسری حدیث میں خصوصیت کا احتمال موجود ہے اور نیز نہی سے متعلق حدیث قولی ہے اور دوسری فعلی ہے (قول کو فعل پر ترجیح ہوتی ہے)۔

کہا گیا ہے کہ تثنیہ کی ضمیر یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے لائی گئی ہے کہ وہی محبت معتبر ہے جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ دونوں سے ہو' تنہا کسی ایک کی محبت معتبر نہیں' کیونکہ وہ بے کار اور لغو ہے اسی بات کی طرف اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اشارہ موجود ہے: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ [آل عمران:۳۱] (آپ فرمادیجئے کہ اگر تمہیں اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائیں گے)۔

یہاں انفرادی طور پر حکم اس بات کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے کہ دونوں کی نافرمانیوں میں سے ہر ایک کی نافرمانی مستقل طور پر گمراہی کو مستلزم ہے کیونکہ عطف عامل کے تکرار کا فائدہ دیتا ہے' اس کا مستقل بالحکم ہونا بھی تکرار کی قوت رکھتا ہے، پس گویا یوں فرمایا: من عصی اللہ فقد غوی' ومن عصی رسولہ فقد غوی جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو وہ یقیناً گمراہ ہوا اور جس نے اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی وہ یقیناً گمراہ ہوا۔

یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کی نافرمانی دوسرے کی نافرمانی ہے لہٰذا کیلئے کسی کی نافرمانی کا تصور نہیں ہوسکتا اس لئے کہ بات تو اسی طرح ہے البتہ مقصود معصیت کی شناعت کو بتانا ہے، کہ اگر معصیت کا پایا جانا صرف رسول اللہ ﷺ کی نسبت سے ہوتو بھی وہ انسان کے بہکاوے کا مستقل باعث ہے تو جب ہر دو کی نافرمانی ہوگی تو وہ کسی قدر زیادہ گمراہی کا باعث ہوگئی اور یہ تحقیق کے اعتبار سے انتہائی باریک بات ہے اور اس میں لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ اللہ جل جلالہ اور رسول اللہ ﷺ کی محبت کمال درجے میں حاصل ہونی چاہیے، بایں طور پر کہ دونوں کی محبت مغایرت کا احتمال نہیں رکھتی چنانچہ مقولہ ہے۔

"أنا من اھوی ومن اھوی انا میں ہوں جو محبت کرتا ہوں، اور جو محبت کرتا ہے میں ہوں۔

اور مخالفت افتراق کا باعث ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: ﴿هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ﴾ [الکھف:

[۷۸] ترجمہ: ''اب میرے اور تیرے درمیان جدائی کا وقت ہے'' اور اس محبت کی چند علامات ہیں جن میں سے بہت واضح علامت وہ ہے جس کی طرف یحییٰ بن معاذ رازی نے اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا کہ ''محبت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ عطاء کی وجہ سے زیادہ نہ ہو اور جفا کی وجہ سے کم نہ ہو اور یہ صرف اسی دوست کے حق میں ہو سکتی ہے جسے عنایت کی لگام نے ولایت کی چوکھٹ پر لا کھڑا کیا اور اسے شہود مطلق کے باغ میں اتارا پھر اسے صرف یہی دکھائی دیتا ہے کہ اس کا محبوب وہی حق و سچ ہے اور اسکے علاوہ ہر چیز بالکل باطل ہے''۔

قولہ: ومن احب عبدا لا یحبه الا لله:

''من'': مبتدا محذوف ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے: **ثانیتهما محبة من أحب**......۔

''عبدا'' یعنی محبت ایسے بندہ سے ہو جو عبودیت کے ساتھ موسوم ہو، خواہ وہ آزاد ہو، خواہ غلام ہو۔

الا الله:

یہ استثناء مفرغ ہے مطلب یہ ہے کہ اس سے محبت کسی غرض سے نہ ہو وہ نہ کسی چیز یا کسی کے عوض میں ہو اور اس سے محبت میں کوئی دنیوی مفاد یا انسانی غرض کا شائبہ تک نہ ہو۔ بلکہ اس سے محبت خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہو وہ **حب فی الله** کے ساتھ متصف ہو سکے اور ان لوگوں میں داخل ہو سکے جو اللہ کی خاطر باہم محبت رکھنے والے ہیں۔

جملہ فاعل یا مفعول یا دونوں سے حال واقع ہو رہا ہے۔

قولہ: ومن کرہ ان یعود فی الکفر......:

''من یکرہ'': یہاں عبرت مقدر ہے: **أی وثالثتهما کراهة من یکرہ**۔

''ان یعود'': عود بمعنی ''رجوع'' یا بمعنی ''تحول'' ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ بمعنی ''میرورۃ'' ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ ''عود'' کو ''فی'' کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے۔ جس طرح ﴿أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا﴾ [الاعراف: ۸۸] میں عود متعدی ہے فی کے ذریعہ۔ ترجمہ: یہاں تک کہ تم ہمارے دین میں واپس آجاؤ''۔ اس طرح یہ ارشاد اس شخص کو بھی شامل ہوگا جس سے پہلے کفر کا ارتکاب نہیں ہوا اور آپ ﷺ کا ارشاد: ''**بعد أن انقذہ الله منه**'' اس کے منافی نہیں ہے اس لئے کہ **أنقذ** کے معنی ہیں اللہ نے بچا لیا اسے ابتداء ہی سے کفر سے اس کی حفاظت فرمائی کہ وہ دین اسلام پر ہی پیدا ہوا اور ہمیشہ کے لیے اس وصف پر برقرار رہا۔ یا کفر سے حفاظت بایں طور پر کہ اسے کفر کی تاریکی سے ایمان کے نور کی طرف نکالا۔ یا معنی کو یہ الفاظ شامل نہیں ہے لیکن وہ معنی مفہوم سے برابری کے طور پر سمجھ میں آتا ہے یا بطریق اولیٰ سمجھا جا رہا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ ہے: ﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ [البقرہ: ۲۵۷] ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا دوست ہے جو انہیں تاریکیوں سے نور کی طرف نکالتا ہے'' یعنی اپنی ہدایت و توفیق سے۔ پس یہ ارشاد گرامی بھی ابتداء سے کفر سے بچانے یا بعد میں کفر سے نجات دینے پر دونوں صورتوں کو شامل ہے۔

بخاری کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: **حتی ان یقذف فی النار أحب الیه من أن یرجع فی الکفر بعد أن انقذہ الله منه**۔ ''یہاں تک کہ اسے آگ میں پھینکا جائے یہ اسے اس بات سے زیادہ پسندیدہ کہ وہ کفر میں لوٹ جائے بعد اس

کے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس سے نجات عطا فرمادی ہے۔ایک دوسری روایت جو بخاری ومسلم کی ہے میں وارد ہوا کہ "من کان یکرہ أن یلقی فی النار أحب الیه من أن یرجع الیه یھودیا اونصرانیا" نسائی کی روایت میں ہے: "وان توقد نارعظمة فیقع فیھا أحب الیه من أن یشرك باللہ شیئا" بہت بڑی آگ جلا کر اس میں اسے ڈالا جائے تو اس آگ میں کود جانا اسے اس بات سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائے۔یعنی دنیا کی آگ میں گر پڑنے کو زیادہ ترجیح دیتا ہے اس بات سے کہ کفر میں واپس چلا جائے اور اس میں صوفیاء کے اس قول کی طرف اشارہ ہے: "الحجاب اشد العذاب" سب سے سخت ترین عذاب باری تعالیٰ کی ذات سے حجاب کا ہے۔

پھر یہ جاننا چاہیے کہ ان تین چیزوں میں سے پہلی دو باتوں کا تعلق تجلی بالفضائل سے ہے۔اور آخری بات کا تعلق تخلی من الرذائل انواع سے ہے۔چنانچہ ان چیزوں میں اس انسان کو دیگر عمدہ خصائل وعادات کے اختیار کرنے پر ابھارنا، ترغیب دینا وبرانگیختہ کرنا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مذکورہ تین چیزوں ان عمدہ صفات کے لئے جو تحریر میں نہیں لائی گئیں بنیاد اور اصل ہیں۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ نے اسے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا: **ثلاث من کن فیه وجد حلاوۃ الایمان ' ان یکون اللہ ورسوله أحب الیه بماسواھما' وأن یحب المرء لایحبه الاللہ' وأن یکرہ أن یعود فی الکفربعد اذأنقذہ منه کما یکرہ أن یلقی فی النار** ۔(کذا فی الجامع الصغیر للیوطی)

۹ :وَعَنِ الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاقَ طَعْمَ الْإِيْمَانِ مَنْ رَّضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا . (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۶۲/۱ حدیث رقم(۳۴۰۵۶)۔والترمذی ۱۶/۵ حدیث ۲۶۲۳ وأحمدفی مسندہ ۲۰۸/۱۔

ترجمہ: حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے اللہ کو خوشی سے اپنا رب مان لیا اور محمد ﷺ کو خوشی سے اپنا رسول مان لیا اور اسلام کو خوشی سے اپنا دین مان لیا اس نے ایمان کی حلاوت اور لذت کو چکھ لیا۔(مسلم)

تشریح: قوله:قال رسول اللہ ﷺ ذاق طعم الایمان:

"ذاق": ایمان کا ذائقہ اس نے چکھا یعنی ایمان کی حلاوت ولذت کو پالیا۔چکھنا اصل میں تو منہ میں تھوڑا سا ذائقہ پائے جانے کو کہتے ہیں یہاں اس سے مراد معنوی چکھنا ہے۔علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے عجیب بات فرمائی کہ حسی اعتبار سے یا معنوی اعتبار سے چکھے۔

راویٔ حدیث:

عباس بن عبدالمطلب ۔یہ عباس بن عبدالمطلب حضور ﷺ کے محترم چچا ہیں۔آپ رسول اللہ ﷺ سے صرف دو (۲) سال

بڑے تھے ان کی ماں ''نمر بن قاسط'' کی ایک عورت ہیں۔ یہ پہلی عربی عورت ہیں جنہوں نے خانہ کعبہ کو ریشم اور دیباج اور طرح طرح کا غلاف پہنایا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بچپن میں گم ہو گئے تھے۔ انہوں نے نذر مانی تھی کہ اگر وہ مجھے مل گئے تو میں بیت اللہ پر غلاف چڑھاؤں گی۔ جب ان کی ماں نے ان کو پالیا تو ایسا کیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ دورِ جاہلیت میں بڑے سردار تھے مسجد حرام کی عمارت یعنی آبادی واحترام اور سقایہ کے یہی ذمہ دار تھے سقایہ (جس کا مطلب آبِ زمزم پلانے کی خدمت ہے) تو ایک مشہور بات ہے۔ رہا احترام پس اس کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ قریش کو اس بات پر آمادہ کیا کرتے تھے کہ وہ خانہ کعبہ میں گالی گلوچ اور گناہوں کو چھوڑ کر بھلائی اور نیکی کے ساتھ اس کو آباد کریں۔

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنی موت کے وقت ستر غلام آزاد کیے تھے یہ واقعہ فیل سے قبل پیدا ہوئے اور جمعہ کے دن ۱۲ رجب کو ۳۲ھ میں جب کہ ان کی عمر اٹھاسی سال کی تھی وفات پائی۔ جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ ابتدا ہی میں اسلام لے آئے تھے مگر اپنے اسلام کو چھپائے رہے۔ چنانچہ بدر کے معرکہ میں مشرکین کے مجبور کرنے سے نکلے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عباس رضی اللہ عنہ سے ملے تو ان کو قتل نہ کرے کیونکہ وہ زبردستی جنگ میں شریک کیے گئے ہیں۔ پس ان کو ''ابوالیسر'' کعب بن عمرو نے قید کر لیا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے نفس کا فدیہ دیا اور مکہ واپس ہو گئے۔ پھر اس کے بعد مدینہ ہجرت کر کے تشریف لائے ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔ ان کی الطافت فہمی اور متانت علمی کا یہ قصہ مشہور ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ آپ بڑے ہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ہیں؟ **هو اكبر و أنا أسن** کہ بڑے وہ ہیں اور عمر میں بڑا میں ہوں۔

مرتب عرض کرتا ہے: ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی بات دل کو لگتی ہے۔ اس کی تائید بزرگوں کے بعض واقعات سے بھی ہوتی ہے کہ مثلاً بعض بزرگ ذکر اللہ کی حلاوت یوں محسوس فرماتے تھے جیسے واقعی ان کے منہ میں شیرنی ہے۔

قوله: من رضى بالله ربًّا وبالاسلام دينا وبمحمد رسولا:

یعنی اس کا نفس قانع ہوا اور اس کا دِل خوش ہوا اور اسے انشراح صدر حاصل ہوا اور اس نے اکتفاء کیا

''**بالله ربًّا**'': اللہ سے از روئے ربّ راضی ہونے پر یعنی مالک وآقا و متصرف ہونے کے اعتبار سے اور لفظ ربًّا، دِینًا اور رسولا تمییز ہونے کی بناء پر منصوب ہیں۔ ''**بالاِسلام**'': اسلام کے ساتھ یہ ایمان کو بھی شامل ہے۔ ''**دینا**'': یہ عام کا عطف خاص پر ہے ''**رسولًا**'': خاص کا عطف عام پر ہے۔ اللہ تعالیٰ سے راضی ہونے سے مقصود ظاہری و باطنی اعتبار سے اس کے تابع فرمان ہونا ہے اور اس کا کمال درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی تکلیف آئے تو اس پر صبر کرے اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرے، اس کی تقدیر، فیصلے پر امساک وعطاء کرنے پر راضی رہے اور اوامر کی بجا آوری اور گناہوں سے بچنے کے ذریعے تمام احکام اسلام پر عمل کرے اور محبوبِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک طریقوں، آداب، اخلاق، معاشرت، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی طرف مکمل توجہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اتباع کرے۔

تخریج: مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ نے اور امام احمدؒ اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ مسند فردوسی میں دیلمی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً یہ حدیث نقل کی ''**ألظوا ألسنتكم قول لا اله الا الله محمد رسول الله، وأن الله بنا وبالاسلام ديننا و محمد ابنينا فانكم سئلون عنها فى قبوركم**'' ترجمہ: تم اپنی زبانوں پر لا الہ الا اللہ

محمد رسول اللہ کا کلمہ پابندی سے جاری رکھو اور یہ کہ اللہ ہمارا رب ہے اسلام ہمارا دین ہے، محمد ﷺ ہمارے نبی ہیں چنانچہ تم سے قبروں میں ان امور کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں عثمان بن مطر راوی ہے۔

مدارِ نجات

۱۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَا يَسْمَعُ بِیْ اَحَدٌ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ يَهُوْدِیٌّ وَلَا نَصْرَانِیٌّ ثُمَّ يَمُوْتُ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِهٖ اِلَّا كَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ۔

(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم ١/ ١٣٤ حديث رقم (٢٤٠-١٥٣)۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ قسم ہے اس ذات کی کہ جس کے قبضۂ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے۔ اس امت میں جو شخص ہو چاہے یہودی ہو یا نصرانی اس کو میری نبوت کی اطلاع ہو جائے پھر وہ میری لائی شریعت اور اسلام پر ایمان لائے بغیر مر جائے تو وہ جہنمی ہے۔ (مسلم)

تشریح: قوله: والذی نفس محمد بیده:

یعنی آپ ﷺ کی روح' آپ ﷺ کی ذات وصفات، حالات' آپ ﷺ کا ارادہ حرکات وسکنات جس اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے یعنی یہ تمام چیزیں اللہ کی نعمت وقدرت سے ہیں اور اسی کی چاہت سے باقی ہیں۔

قدرت کے لئے ہاتھ کو استعارہ لینے کی وجہ یہ ہے کہ قدرت کا غلبہ واثر عام طور پر ہمارے ہاتھوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اللہ کا ہاتھ متشابہات میں سے ہے، متشابہات کے سلسلے میں علماء وسلف کا مذہب یہ ہے کہ ان کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اور ان کے ظاہری معنی سے اللہ پاک ہے اور یہ مذہب زیادہ سلامتی کا باعث ہے کہ اس میں متشابہات کے کوئی ایسے معنی متعین نہیں کیے جاتے جو اللہ تعالیٰ نے مراد نہیں لیے اور جمہور علماء کا اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [آل عمران :۷] ''میں اسم جلالہ پر وقف کرنا اس مذہب کی تائید کرتا ہے اور انہوں نے اسے لازمی وقف قرار دیا، جس کے وصل (ملانے) کی صورت میں فاسد معنی کا وہم ہوتا ہے۔ اسی لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یَد کے معنی ''قدرت'' سے بیان کرنے میں اللہ تعالیٰ نے جو یَد کو اپنی ذات عالیہ کے لئے ثابت کیا اس معنی کا معطل کرنا لازم آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ید وغیرہ جن چیزوں کو ذکر فرمایا اور ان سے جو معنی مراد لیے ہیں صرف ان پر ایمان لانا چاہیے اور ان الفاظ کے معنی ومفہوم کے بیان میں نہ پڑا جائے۔ چنانچہ ہم یوں کہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے اس معنی میں جو اس نے خود مراد لیا، مخلوق کے ہاتھ جیسا نہیں۔ علماء رحمہم اللہ خلف کا مذہب یہ ہے کہ ان متشابہات کے ایسے معنی بیان کیے جائیں جو اللہ جل جلالہ کی ذاتِ عالیہ کے مناسب ہوں اور اسے جسم، جہت اور اس کے لوازمات سے پاک سمجھا جا۔ یہ تاویل ''الراسخون فی العلم'' پر وقف کی صورت میں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے ''میں متشابہات کا معنی ومفہوم جانتا ہوں اور میں راسخ علم رکھنے والوں میں سے ہوں''۔ کہا گیا ہے کہ یہ بہت علم وآگہی پر مشتمل ہے یعنی اس میں مزید علم وحکمت کی ضرورت ہے تا کہ ذکر کردہ تاویل اس نص کے

سیاق کے مطابق ہو جائے أنا علم تأویله' وأنا من الراسخین۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ علماء خلف کا مذہب (علماء سلف کے مقابلے میں) زیادہ علمی ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات کو جسم وجہت سے پاک قرار دیئے جانے میں دونوں مذاہب متفق ہیں اختلاف تو اس بات میں ہے کہ بہتر کیا ہے؟ تفویض یا تاویل' اور امکان اس بات کا بھی ہے کہ علماء کے اختلاف کو اختلاف زمان پر محمول کیا جائے کہ تفویض علماء سلف کے دور میں زیادہ بہتر تھی کیونکہ وہ سلیم الفطرت تھے اور ان کے زمانے میں بدعات کا ظہور نہیں ہوا تھا۔ خلف کے زمانہ میں تاویل بہتر تھی کہ اکثر لوگ (اپنی سوجھ بوجھ سے) وہی معنی مراد لینے لگتے جو انہیں جلد سمجھ میں آتے اور مبتدعہ غلو بھی کرنے لگے۔(واللہ اعلم بالمرام)

قوله :لا یسمع بی احد من هذه الامة یهودیّ ولا نصرانیّ:

اصل کلام یوں ہونا چاہیے تھا: "والذی نفسی" اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے' لیکن آپ ﷺ نے نفسی کی بجائے اپنے اسم گرامی کو ذکر فرمایا تا کہ کلام میں مزید بلاغت پیدا ہو جائے اور بات سننے والے کے دِل میں اُتر جائے۔

آپ ﷺ نے صیغہ غائب سے متکلم کی طرف التفات مقام جمع سے " تفرقه" اور حق تعالیٰ کے ساتھ خاص مقام قرب سے مخلوق خدا کے لئے دعوۃ میں مشغولیت اور اوجِ کمال سے منصۂ تکمیل کی طرف انتقال' تنزیل کے طور پر فرمایا۔

عارف سہروردی فرماتے ہیں کہ "جمع" وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشغولی کا مقام بلند ہے جہاں صاحب جمع حق ہی کا مشاہدہ کرتا ہے اور جہاں غیر بھی مشاہدہ میں آئے وہ مقام جمع نہیں۔اس لحاظ سے امنا باللّٰہ یہ مقام جمع (حضوری) کا آئینہ دار ہے جبکہ وما انزل الینا (اس میں اپنی ذات پر بھی نظر گئی) مقام "تفرقہ" ہے۔

جنید بغدادی جنہیں اولیاء اللہ میں سید الطائفہ کے نام سے اس لئے موسوم کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جو کتاب وسنت کے مطابق نہ ہو۔فرماتے ہیں: "بالقرب الوجد جمع وغیبته فی البشریة تفرقة و کل جمع بلا تفرقة زندقة' کل تفرقة بلاجمع تعطیل۔"

بعض حضرات نے کہا کہ "بی" میں "با" زائدہ ہے، یا مِنْ کے معنی میں ہے۔زیادہ واضح یہی ہے، کہ باء تعدیه کی تاکید کے لیے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ گرامی میں ہے ﴿مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا﴾ [المومنون :٢٤] یا معنی اخبار کو متضمن ہے مایسمع مخبرا ببعثی "أحدٌ": کوئی شخص جو فی الحال موجود ہے یا آئندہ موجود ہوگا۔(من هذه الأمة) یعنی اُمت دعوت میں سے۔مِنْ تبعیضیه ہے۔بعض کا کہنا ہے کہ یہ معنی بیانیہ ہے۔**قوله :یهودیّ ولا نصرانیّ** یہ دونوں الفاظ أحدٌ کی صفت واقع ہوا ہے۔

جن لوگوں کا عقیدہ باری تعالیٰ کے بارے میں تعطیل کا ہے یا بتوں کے پجاری ہیں ان کا حکم بطریق اولیٰ معلوم ہو گیا۔

یا یہ دونوں أحد سے بدل بعض کے ہیں۔

یہودی ونصرٰی کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کا کفر دوسرے لوگوں کی بنسبت زیادہ قبیح ہے۔"لا" صورت زائدہ ہے، تاکید حکم کے لیے ہے۔

قوله: ثم يموت ولم يؤمن بالذى اُرسلت به...... الخ:

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر چہ کسی شخص کا ایمان لانا تاخیر سے ہی کیوں نہ ہو البتہ غرغرہ سے پہلے ہو، تو وہ اس کے لئے نافع ہوگا۔ "ولم يؤمن بالذى اُرسلت به" جملہ حال واقع ہو رہا ہے، یا عطف ہو رہا ہے۔ "الا كان" یعنی وہ اللہ کے علم میں تھا۔ یا "کان" بمعنی یکون ہوگا۔ اس صورت میں اسے ماضی سے اس لئے تعبیر کیا گیا تا کہ اس کے وقوع کا محقق ویقینی ہونا معلوم ہو۔ یہ استثناء مفرغ ہے عام احوال سے۔

"من اصحاب النار" ان لوگوں میں سے ہوگا جنہیں اس جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہوگا اور جس نے آپ کی نبوت ورسالت کے بارے میں سُنا پھر آپ ﷺ پر ایمان لے آیا تو اس کا حکم اس کے برعکس ہوگا (ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت میں جائے گا) اور جس نے آپ ﷺ کے بارے میں نہ سنا اور نہ وہ ایمان لایا تو وہ اس وعید سے خارج ہے۔ "لا يسمع" میں "لا" بمعنی لَيْسَ ہے اور ثم يموت کا عطف يسمع، مثبت پر ہے اور لم يؤمن کا عطف يموت پر ہے یا اس کے فاعل سے حال ہے اور ليس اس مجموعہ کی نفی کے لئے ہے اس کی تقدیری عبارت یوں ہے ليس احد يسمع بى ثم يموت ولم يومن او غير مؤمن كائنا من اصحاب شئى الا من اصحاب النار (یعنی کوئی بھی شخص ایسا نہیں کہ اس نے میرے بارے میں سن رکھا ہو پھر وہ مرجائے اور ایمان نہ لایا یا اس حال میں کہ وہ ایمان نہ لایا جس مذہب والا بھی ہو مگر وہ جہنم والوں میں سے ہوگا)۔

تین اشخاص کے لیے دوگنے اجر کی بشارت

۱۱ : وَعَنْ اَبِىْ مُوْسَى الْاَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ لَهُمْ اَجْرَانِ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمَنَ بِنَبِيِّهٖ وَاٰمَنَ بِمُحَمَّدٍ وَالْعَبْدُ الْمَمْلُوْكُ اِذَا اَدّٰى حَقَّ اللّٰهِ وَحَقَّ مَوَالِيْهِ وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهٗ اَمَةٌ يَطَاُهَا فَاَدَّبَهَا فَاَحْسَنَ تَاْدِيْبَهَا وَعَلَّمَهَا فَاَحْسَنَ تَعْلِيْمَهَا ثُمَّ اَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا فَلَهٗ اَجْرَانِ. (متفق عليه)

أخرجه البخارى فى صحيحه ١/ ١٩٠ حديث ٩٧۔ وأخرجه مسلم فى صحيحه ١/ ١٣٤ حديث (٢٤١۔١٥٤) والترمذى ٣/ ٤٢٤ حديث رقم ١١١٦۔ والدارمى فى سننه ٢/ ٢٠٦ حديث رقم ٢٢٤٤۔وأحمد فى المسند ٤/ ٤٠٢۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تین آدمی ایسے ہیں جن کو دوہرا اجر ملے گا: ① اہل کتاب (یہود، نصاریٰ) کے اس آدمی کو جو پہلے اپنے نبی پر ایمان لایا پھر محمد ﷺ پر ایمان لایا۔ ② وہ غلام جس نے اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی پورے ادا کئے اور اپنے مالکوں کے حقوق بھی پورے ادا کئے۔ ③ وہ آدمی جس کی باندی تھی اور وہ اس سے وطی کرتا تھا پھر اس کو اچھا ہنرمند بنایا۔ پھر اس کو اچھی تعلیم سے آراستہ کیا پھر اس کو آزاد کر کے اس سے شادی کرلی تو یہ بھی دوگنے اجر کا مستحق ہوگا۔ (متفق علیہ)

راویٔ حدیث:

ابو موسیٰ۔ ابو موسیٰ کا نام عبداللہ ہے۔ قیس کے بیٹے اور ''اشعری'' ہیں۔ مکہ میں مسلمان ہوئے اور سرزمین حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ پھر اہل سفینہ کے ساتھ آئے اس وقت آنحضرت ﷺ خیبر میں تھے۔ ۲۰ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابن الخطاب نے ان کو بصرہ کا حاکم مقرر فرمایا۔ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے ''ہواز'' کو فتح کیا۔ ابتدائے خلافت عثمان تک بصرہ ہی کے حاکم رہے۔ پھر وہاں سے معزول ہو گئے اور کوفہ کی طرف منتقل ہو گئے اور وہاں قیام پذیر ہو گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک کوفہ کے والی رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف طے کرنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے حکم بنائے گئے۔ اس کے بعد اپنے سال وفات ۵۲ھ تک مکہ ہی میں رہے۔

تشریح: ثلاثه مبتداء ہے اور (لهم اجران) اس کی خبر ہے۔ یعنی ان (تین میں سے) ہر ایک کے لیے دو عظیم اجر ہیں۔ جو صرف اسی کے لیے مخصوص ہیں اور ان دو اجروں میں اس کے علاوہ کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں۔

قوله: ثلاثة لهم اجران ثلاثة مبتدا ہے لهم اجران خبر ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے: ثلاثة اشخاص لكل واحد اجران۔

قوله: رجلٌ من اهل الكتب اٰمن بنبيه و آمن بمحمد:

''رجل'' یہ مبتدا سے بدل بعض ہے اس صورت میں عطف ربط کے بعد ہے۔ یا بدل کل ہے اور ربط عطف کے بعد ہے۔ یا یہ مبتداء محذوف ''احدهم'' کی خبر ہے، یا یہ مبتداء موصوف ہے جس کی خبر منهم محذوف ہے۔ یا وہ مبتدأ کی خبر ہے ''ولهم اجران'' اس کی صفت ہے۔

(یہاں عورت کا ذکر نہیں اس لئے کہ) عورت بھی مرد کے حکم میں داخل ہے۔ (یعنی اس کے لیے بھی یہ دو اجر ہیں)۔

''اٰمن بنبيه'': یہ جملہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے۔

شراح کا اس بات میں اختلاف ہوا ہے کہ اس سے مراد صرف نصرانی ہی ہیں یا یہودی بھی ہیں۔ پہلے قول کی طرف صاحب الازھار کا میلان ہے۔ اس قول کو انہوں نے دلائل عقلیہ و نقلیہ سے مؤید کیا ہے۔ جبکہ ان کے علاوہ دیگر علماء دوسرے قول کی طرف مائل ہیں اور ان حضرات نے اس کی تائید دلائل نقلیہ سے پیش کی ہے۔ اس اختلاف کی بنیاد اس بات پر ہے کہ کیا نصرانیت، یہودیت کے لیے ناسخ ہے یا نہیں۔ ہر دو صورت میں (یعنی خواہ نصرانیت یہودیت کے لیے ناسخ ہو یا نہ ہو) یہودیوں میں سے جس شخص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی اور یہودیت پر برقرار رہا وہ اپنے نبی پر ایمان نہ لایا۔ آپ اگر کہیں کہ الکتب سے صرف انجیل مراد اس کی تائید بخاری کی روایت فاذا آمن بعيسى ثم آمن بي فله اجران سے ہوتی ہے۔ تو اس کے جواب میں میں کہوں گا کہ بخاری کی یہ روایت اس کی مؤید نہیں چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام کی تصریح ایک خاص حکمت کی وجہ سے ہے اور وہ یہ ہے کہ جو شخص موسیٰ علیہ السلام پر تو ایمان لایا لیکن حضرت عیسیٰؑ پر ایمان نہیں لا سکا اس بنیاد پر کہ اس کو عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ السلام کی دعوت نہیں پہنچی، یہاں تک کہ ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ السلام کی بعثت ہوئی تو وہ آپ ﷺ پر بھی

ایمان لے آیا۔ اگر چہ اس کا وجود مستبعد ہے، لیکن "اهل الكتاب "کو ایسے معنی پر حمل کرنے میں جو یہود کو بھی شامل ہوں ایک فائدہ ہے اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل کے یہودی اور اسرائیل کے علاوہ دیگر قوموں کے جو لوگ یہودیت میں داخل ہوئے ان تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت نہ پہنچی ہو تو ان پر بھی یہ بات صادق آتی ہے کہ وہ یہودی ہیں اور وہ اپنے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کسی دوسرے نبی کی تکذیب نہیں کی۔ پس ایسے کسی شخص نے جب ہمارے نبی ﷺ کی بعثت کو بھی پایا ہو اور ان پر ایمان لے آیا ہو اس کو بھی مذکورہ خبر شامل ہوگی اور اسے یہ اجر ملے گا۔ ان لوگوں میں یمن کی طرف کے عرب بھی شامل ہیں جنہوں نے یہودیت اختیار کر لی تھی لیکن بالاتفاق طور پر بنی اسرائیل کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کے خاص ہونے کی وجہ سے آپ کی دعوت ان تک نہ پہنچی تھی۔ اس (تفصیل سے) سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس سے مراد تورات اور انجیل دونوں ہیں جیسا کہ کتاب وسنت کی نصوص میں (اهلِ الكتب ہی) معہود فی الذھن ہوتا ہے۔

ان نصوص میں سے جو اس کے عموم پر دلالت کرتی ہیں وہ آیت بھی ہے جو حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کی طرح کے دیگر لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے: ﴿الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ﴾ [القصص:٥٢] ترجمہ: "یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے اس سے پہلے کتاب عطا فرمائی اور وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں ﴿اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ ......﴾ [القصص:٥٤] "یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کا اجر دو مرتبہ دیا جائے گا"۔

طبرانی رحمہ اللہ نے رفاعہ القرظی رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں نزلت هذه الآية في وفين آمن بي ... کہ یہ آیت میرے بارے میں اور ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو میرے ساتھ ایمان لائے اور طبرانی رحمہ اللہ ہی نے روایت کیا ہے کہ یہ آیت حضرت سلمان فارسی اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور اس میں کوئی منافات نہیں۔ اس لئے کہ ان میں سے پہلے صاحب (یعنی حضرت سلمان) نصرانی تھے اور دوسرے (صاحب یعنی عبداللہ بن سلام) یہودی تھے۔

اگر آپ یہ کہیں کہ مدینہ منورہ کے یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لائے پھر وہ دو اجر کے مستحق کیسے ہوگئے؟ تو میں کہوں گا کہ ہمیں ان کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر عدم ایمان کا دعویٰ تسلیم نہیں جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان جیسے دیگر حضرات اپنے علم کی وسعت اور کمال عقل کے ہوتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کریں، ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔

"من امن بنبيه سے مراد ایسا ایمان صحیح ہے کہ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتا ہو ان کی شریعت کے انجیل کی وجہ سے منسوخ ہونے کے علم سے پہلے اس بناء پر کہ وہ ناسخ ہے ورنہ ہماری شریعت کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے منسوخ ہونے سے پہلے اور (من امن بنبيه سے مراد ایسا ایمان صحیح ہے)۔ یہودی اور نصرانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہماری شریعت کے ذریعے ان (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی شریعت کے منسوخ ہونے سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور علماء نے (امن بنبيه کو) ماقبل النسخ کے ساتھ مقید کیا ہے اس لئے کہ کسی بھی نبی پر ایمان رکھنے والے کو جبکہ اس کو اس نبی کے علاوہ دوسرے نبی

کی دعوت جو کہ پہلے نبی کی شریعت کے لیے ناسخ ہو، پہنچ چکی ہو تو اس پہلے نبی پر ایمان رکھنے کی وجہ سے اجر نہیں ملے گا۔ اس لئے کہ اب اس پر یہ بات صادق نہیں آتی کہ وہ اپنے نبی پر ایمان رکھنے والا ہے۔

کہا گیا ہے کہ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس قید لگانے کی احتیاج ہی نہ ہو اس لئے کہ یہ بات بھی بعید نہیں کہ ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانا، سابق ایمان کے ثواب کے لیے سبب ہو۔ جیسا کہ جب کوئی کافر اسلام قبول کرتا ہے تو اس کی سابقہ نیکیوں پر جو کہ اس نے حالتِ کفر میں کی تھیں، ثواب عطا کیا جاتا ہے۔

اور اس قول (یعنی اھل کتاب سے مراد یہود و نصاریٰ دونوں ہیں) کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ﴾ [الحدید: ۲۸] کا عموم کرتا ہے اور اسی طرح نبی اکرم ﷺ کا ہرقل کے نام خط جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اسلم یوتك اللہ أجرك مرتین اسلام لے آ ؤ اللہ تمھیں اجر دو مرتبہ دے گا۔ (اس قول کی تائید کرتا ہے) حالانکہ اس کی قوم کے لوگ بنی اسرائیل میں سے نہ تھے بلکہ وہ اپنے سابقہ دین کو تبدیل کرنے کے بعد نصرانیت میں داخل ہوئے تھے۔ جیسا کہ اس بات کی تصریح شیخ الاسلام بلقینی رحمہ اللہ وغیرہ نے کی ہے اور یہی مطلب زیادہ ظاہر ہے اور پھر بھی کہا گیا ہے کہ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس کے اجر کا دوگنا ہونا اس کے اپنے اسلام کی جہت سے ہو اور دوسرا اس جہت سے ہے کہ وہ سبب بنا اپنے اتباع کے ایمان قبول کرنے کا۔

(وامن بمحمد) اس سے بھی مراد ایمان صحیح ہے۔ یہاں پر وبمحمد نہیں کہا باوجودیکہ اس میں اختصار زیادہ ہے یہ بتلانے کے لیے کہ ہر نبی پر مستقل طور پر ایمان لانا ضروری ہے نہ کہ بالتبع۔ نبی اکرم ﷺ پر ایمان تمام انبیاء پر ایمان لانے کو متضمن ہوتا ہے۔ چنانچہ مقصود یہ ہے کہ اس شخص کے سابق ایمان پر بھی اس کو ثواب عطا کیا جائے گا اس لئے وہ ایمان بھی حق تھا۔

قولہ: والعبد المملوك اذا اذی حق اللہ وحق موالیہ:

"العبد المملوك" "العبد" کو "المملوك" کے ساتھ اس لئے مقید کیا کہ یہاں پر وہی بندہ مراد ہے جو غلام بھی ہو مطلق "عبد" مراد نہیں ہے اس لئے کہ تمام لوگ "عباد اللہ" (اللہ کے بندے) ہیں۔ "حق اللہ" ی سے مراد نماز، روزہ اور ان جیسے دوسرے حقوق اللہ مراد ہیں "وحق موالیہ: یعنی اپنے سرداروں، مالکوں اور اپنے معاملات کے ذمہ داروں کی اپنی طاقت اور خوت کی بقدر جائز خدمت کرے۔

اور "الموالی" جمع لانے کی وجہ یہ ہے کہ "العبد" میں (ال) جنس کے لیے ہے چونکہ ہر عبد کے لیے ایک مولیٰ یا اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے (المولی کو جمع لائے ہیں) کہ اگر وہ غلام آقاؤں کی ایک جماعت میں مشترک ہوتا تو لازماً وہ ان سب کے حقوق ادا کرتا۔ چنانچہ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جو غلام منفرد ہو (یعنی ایک ہی مالک کا غلام ہو) وہ بدرجہ اولیٰ اپنے مالک کی خدمت کرے گا۔ یا اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے کہ جب کسی غلام کے کئی موالی ہوں تو رائج دستور کے مطابق باری باری ان میں سے ہر ایک مولیٰ کے حقوق ادا کرنے کا اہتمام کرے گا۔

قولہ: ورجل كانت عنده امة يطاها.....فله اجران :

"یطأھا": وطی سے مراد مجامعت ہے' یہ قید لگانے کا فائدہ یہ ہے اس باندی سے جماع کے باوجود اس کو اس کی تربیت کا ثواب ملے گا۔ کہا گیا ہے کہ یطأھا سے وطی کا بالفعل وقوع مراد نہیں بلکہ اس سے مراد وطی بالقوۃ ہے۔ بخاری کی روایت میں اس لفظ کا ساقط ہونا اس قول کی تائید کرتا ہے اور وہ روایت یہ ہے: اذا ادب الرجل امته فأحسن تأديبهاثم أعتقها فتزوجها كان له أجران۔ ترجمہ: "جب آدمی اپنی باندی کو ادب سکھائے اور اس کی تادیب عمدہ طریقے سے کرے پھر اس کو آزاد کر کے اس کے ساتھ شادی کرے تو اس کے لیے دو اجر ہونگے"۔

" فأدبها": یعنی اس کو قابلِ تعریف عادتیں جو آداب خدمت سے متعلق ہوں، سکھائے اس لئے کہ ادب نام ہے انسان کے مختلف احوال، اٹھنے بیٹھنے کے اچھے انداز اور حسن اخلاق کو۔

"فأحسن تاديبها": یعنی اس کی تادیب وتربیت نرمی کے ساتھ ہو، غصہ اور سختی کے ساتھ نہ ہو۔ اس کو شریعت کے ضروری احکامات سکھائے اور سکھانے میں اچھا طریقہ اختیار کرے۔ زیادہ ضروری کو کم ضروری پر مقدم کرے۔ پھر اس کو آزاد کردے، یعنی یہ تمام کام کرنے کے بعد اللہ کی رضاء کو طلب کرنے کے لیے۔ اور پھر اس سے شادی کرلے، یعنی اس کی عفت کی حفاظت کے لیے اور اس پر ترس کھاتے ہوئے۔

آدمی کے لیے۔ دو اجر ہیں۔ ایک اُجر اس کو آزاد کرنے پر اور ایک اُجر اس سے شادی کرنے پر۔ علماء نے یہی فرمایا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس کو ایک اجر اس کو ادب سکھانے پر اور اس کے بعد کے معاملے پر اور ایک اس کو آزاد کرنے اور اس کے بعد کے معاملے پر ملے گا۔ "ثم" کے ساتھ عطف کا یہاں یہ فائدہ ہے کہ وہ دونوں مرتبوں کے درمیان بُعد کی طرف اشارہ کررہا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ حکم (فله اجران) کو مکرر لانا باندی اور اس سے شادی کرنے کے معاملے کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے ہے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ ممکن ہے کہ فله کی ضمیر تینوں میں سے ہر ایک کی طرف لوٹ رہی ہو، اس صورت میں تکرار' تاکید کے لیے ہوگی۔ یا طولِ کلام کے لیے ہوگی، چنانچہ یہ خلاصے کی طرح ہوگی۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ لا......﴾ [البقرة:٨٩]

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ راوی کے اختصار یا اس کے نسیان کے باعث ہو۔

اور ایک قول یہ ہے کہ صرف باندی کے ساتھ فله اجران کو اس کے حال کی تاکید کے لیے ذکر فرمایا ہے۔ اس لئے کہ یہاں پر جو چیز دو اجر کو ثابت کررہی ہے وہ امر مستحب ہے جس کا چھوڑنا جائز ہے اور وہ ہے اعتاق اور تزوج ہے۔ اس وجہ سے تاکید لانے کی احتیاج ہوئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کو چھوڑ دیا جائے، بخلاف ماقبل امور کے کہ وہ واجب ہیں' ان کا ترک کرنا جائز ہی نہیں۔

یا یہ تکرار اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے لایا گیا کہ باندی کے ساتھ مختص مذکورہ چار امور میں سے جو چیزیں دو گنے اُجر کی مُوجب ہیں وہ اعتاق اور تزوج ہی ہیں۔ چنانچہ ان دونوں کے ذکر کے بعد "فله اجران" ذکر کیا۔ بخلاف تادیب اور

تعلیم کے کہ وہ دونوں تو اجنبی، اولاد اور تمام لوگوں کے بارے میں موجب اجر ہیں، صرف باندیوں کے ساتھ خاص نہیں اور اسی سے امام شعبیؒ کے اس حدیث کو اس شخص کے ردّ کے لیے لانے کی توجیہ ہو جاتی ہے جو کہتا ہے کہ اپنی آزاد کردہ باندی سے شادی کرنے والا اپنی اونٹنی پر سوار ہونے والے کی مانند ہے۔ یعنی اس کے لئے اجر نہیں اور یہی بات علماء کو ابھارتی ہے کہ وہ اجران کی تفسیر کریں جیسا کہ گزر چکا ہے کہ ایک اجر عتق پر اور دوسرا اجر تزوّج پر ہے۔ اس لئے کہ وہ شخص اس پر عتق جیسا احسان اعظم کرنے کے بعد ایک اور احسانِ عظیم کر کے اس کا محسن بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ پہلے میں اس کے لیے غلامی کے غلبے سے خلاصی ہے اور دوسرے میں ایک مغلوب کو اٹھا کر غالب کے ساتھ ملانا ہے۔ بیویوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشادِ پاک ہے:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ [البقرۃ: ۲۲۸] ”اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے“۔

علامہ کرمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”اگر آپ کہیں کہ ان تین اشخاص کی تخصیص کی کیا وجہ ہے، حالانکہ ان کے علاوہ لوگوں کا معاملہ بھی یہی ہے۔ جیسے کوئی شخص نماز بھی پڑھے اور روزہ بھی رکھے تو ایک اجر نماز کی وجہ سے ہوگا اور ایک روزے کی وجہ سے اور اسی طرح اس بیٹے کی مثال ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کرے اور اپنے والد کا حق بھی“۔

تو میں کہوں گا کہ ان تینوں اور ان کے علاوہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ ان میں ہر ایک فاعل دو ایسے امور کو جمع کرتا ہے جن کے درمیان مخالفت عظیمہ ہے۔ گویا کہ ان دونوں کاموں کا سرانجام دینے والا دو متضاد کام کرنے والا ہے“۔ اھ

یہ محل نظر ہے اس لیے کہ یہ ضدیت بعینہٖ اللہ تعالیٰ کے حق کی ادائیگی اور والد کے حق کی ادائیگی میں بھی موجود ہے۔ لہٰذا زیادہ بہتر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ ”اس سے مراد مذکورہ چیزیں اور ان کی مثل دوسری چیزیں ہیں اور ان مذکورہ چیزوں کو ذکر کرنے سے ان کے علاوہ باقی چیزوں کی نفی مقصود نہیں“۔ جمہور علماء کرام کا مذہب اسی قول کے مطابق ہے۔

اسی لئے مہلب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث شریف میں اس بات کی دلیل ہے جو شخص بھی نیکی کے کاموں میں کسی کام میں دو افعال انجام دیتا ہے۔ اس کے لیے دوگنا اجر ہوگا۔ سید جمال الدینؒ فرماتے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ یوں کہا جائے کہ ان تینوں گروہوں میں ہر ایک کے لیے دوہرا اجر ایک عمل کے سبب ہے شرطیکہ وہ ایک عمل دوسرے عمل سے ملا ہوا ہو۔ چنانچہ اھلِ کتاب میں سے وہ شخص جو اپنے نبی پر بھی ایمان لایا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لایا اس لیے دو اجر ہیں' ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی وجہ سے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ السلام پر بھی ایمان لایا ہو اور عبد مملوک کے لیے دو اجر اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنے کی وجہ سے ہیں۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنے مولیٰ کا حق ادا کرتا ہو۔ یہ بات قابلِ غور ہے۔ اھ۔

آپ جب غور کریں گے تو آپ پر یہ بات آشکارا ہو جائے گی کہ مقارنہ بالکل شرط نہیں ہے اور دو اجر دو ایمانوں کے، اور دو قسم کے حق کی ادائیگی کے مقابلے میں ہیں۔ اصل وجہ وہی ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ سابقہ ادیان کے منسوخ ہونے کی وجہ سے یہ وہم ہو سکتا تھا کہ ان ادیان کے پیروکاروں کے لیے مطلقاً کوئی ثواب نہیں، اس حدیث کے ذریعے اس کا دفیعہ فرمایا، اور اسی طرح عوام میں یہ بات مشہور ہے کہ مملوک کی عبادت کا ثواب مالک کو ملتا ہے، اس لئے اس کا ذکر خاص طور پر آیا۔ بعض اوقات یوں بھی کہا جاتا تھا کہ ”باندی کو آزاد کرنا اور پھر اس سے شادی کرنا تو اپنے نفس کی غرض سے ہے اور وہ اس کی طبیعت ہے۔ لہٰذا ان دونوں میں کوئی اجر نہیں“۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس

(غلط بات) کو دور فرمایا اور اس میں مبالغہ فرماتے ہوئے فرمایا "له اجران" کہ ایسے شخص کے لیے دو اجر ہیں۔
یا یوں کہا جائے کہ مذکورہ تینوں اشخاص میں سے ہر ایک جاہلیت کے زمانے میں دوسرے عمل سے رُکا رہتا تھا۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ نے ان تینوں کو خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا اور اپنے اس قول لهم اجران کے ذریعے ان کو عمل پر ابھارا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور کہا گیا ہے کہ ان تین کے ساتھ اُمہات المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنھن کو نہیں ملایا باوجودیکہ اس کے کہ ان کے لیے بھی دوہرا اجر ہے اس لئے کہ یہ انہیں کے ساتھ خاص ہے اور جو یہاں ذکر ہوا ہے وہ عام ہے۔

تخریج: علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ جامع صغیر میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو حضرات شیخین، امام احمد، ترمذی اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔ ابن ماجہ نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

ثلاثة يؤتون اجرهم مرتين: رجل من اهل الكتاب آمن بنبيه وادرك النبى ﷺ فآمن به واتبعه وصدقه فله اجران، وعبد مملوك ادى حق الله و حق سيده فله اجران، ورجل كان له امة فغذاها فاحسن غذاء ها ثم ادبها فاحسن تاديبها وعلمها فاحسن تعليمها ثم اعتقها وتزوجها فله اجران

کفار سے قتال کا حکم

۱۲: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْٓا اَنْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَآءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ (متفق عليه) اِلَّا اَنَّ مُسْلِمًا لَمْ يَذْكُرْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ۔

أخرجه البخارى فى صحيحه ۱/۷۵حديث ۲۵۔ومسلم۱/۵۳حديث(۳۶۔۲۲)وأبوداوٗد فى سننه ۳/۱۰۱ حديث ۲۶۴۱والترمذى حديث رقم۲۶۴۱والنسائى ۷/۷۸حديث ۳۹۷۳وابن ماجة حديث رقم (۷۱) والدارمى ۲/۲۸۷حديث۲۴۴۶وأحمد ۲/۳۴۵الا أن الأربعة لم يرووه عن ابن عمربل عن أبى هريرة وأنس۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں کفار سے اور مشرکین سے اس وقت تک قتال کروں جب تک کہ وہ اس بات کی شہادت نہ دیدیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور یہ کہ لوگ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور جب وہ ایسا کرنے لگیں تو انہوں نے اپنی جان اور مال کو مجھ سے محفوظ کر لیا ہاں جو پوچھ گچھ اسلامی قانون کے تحت ہوگی۔ وہ اب بھی باقی ہے اس کے بعد ان کے باطن کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے اور مسلم شریف کے روایت میں الا بحق الاسلام کے الفاظ نہیں ہیں۔
(متفق علیہ)

تشریح: قوله: امرت ان اقاتل الناس حتى......رسول الله:

دی گئی جو خود ابتداء کریں۔ پھر حرم اور اشہر حرام کے علاوہ خود ابتداء کی بھی اجازت دے دی گئی۔ پھر یہ حکم بھی منسوخ ہو گیا اور حرم اور اشہر حرام میں بھی ابتدائے جہاد کرنے کو مباح کر دیا گیا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "حتی" امرت یا اقاتل کے لیے غایت ہے اور یہی زیادہ بہتر ہے یعنی یہاں تک کہ وہ چار میں سے کوئی ایک کام نہ کریں جب تک وہ جزیہ کے اہل ہوتے ہوئے جزیہ ادا نہ کریں، یا ان کے لیے امان کا معاہدہ نہ ہو یا ان سے مصالحت نہ ہوئی ہو، اگر وہ اس کے اہل نہ ہوں، تو مجھے جیسا کہ یہی بات دوسرے دلائل سے مستفاد ہوتی ہے"۔ اھ۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا اس کو "اولی" کہنا خلاف اولیٰ ہے۔ اس لئے کہ غایت اس مقاتلہ کی تعیین کے لیے ہے جو استمرار کو قبول کر سکتا ہے۔ جبکہ امر کے لیے غایت کا ہونا صحیح نہیں چونکہ اس میں عدم استقرار ہے۔

قولہ: ویقیموا الصوٰۃ :

یعنی فرض نمازوں کو لوگ ان کی متفق علیہ شرائط ارکان کی رعایت کے ساتھ ادا کریں۔ ایک قول یہ ہے کہ "اس میں امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب کی دلیل ہے کہ "تارکِ صلاۃ کو فقہ میں طے کردہ شرط کے ساتھ قتل کیا جائے"۔ لیکن یہ بات بھی (محلِ نظر) ہے اس لیے کہ کلام مقاتلہ کے بارے میں ہے قتل کے بارے میں نہیں۔ جبکہ تارکین صلوٰۃ سے مقاتلہ جب تک کہ وہ نماز کی ادائیگی کی طرف نہ لوٹیں، ایک متفق علیہ امر ہے باوجودیکہ یہ استدلال ترک زکوٰۃ سے ٹوٹ جاتا ہے، اس لیے کہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔ ویؤ الزکاۃ: اور زکوٰۃ تو ہوتی ہی فرض ہے، یہ دلیل ہے کہ مانعین زکوٰۃ سے قتال کیا جائے گا، اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اسی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف قتال کیا، اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اس پر اجماع ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جب تک کہ لوگ نماز و زکوٰۃ کی فرضیت کو قبول کریں۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ شارح علیہ السلام کی اس سے مراد وہ پانچ ارکان ہیں، جن پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی۔

اور ان دو کو یا تو اس لئے خاص طور پر ذکر کیا کہ یہ دونوں عبادات بدنیہ اور مالیہ کی جڑ اور بنیاد ہیں اور ان کے علاوہ دوسری عبادات کے لیے عنوان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی لئے نماز کا نام "عماد الدین" (دین کا ستون) اور زکوٰۃ کا نام "قنطرۃ الاسلام" (اسلام کا پل) رکھا گیا۔ اور قرآن میں جا بجا ان دونوں کو ملا کر ذکر کیا گیا۔

یا اس لئے کہ یہ دونوں بار بار آتی ہیں جس کی وجہ سے یہ ان لوگوں پر شاق گزرتی ہیں۔

یا اس لئے کہ اس وقت تک حج اور روزہ فرض ہی نہ تھے اور نے یہ ہے کہ جب تک لوگ اسلام نہ لے آئیں اور اسی معنی پر بخاری کی یہ روایت بھی دلالت کرتی ہے: حتی یشھدوا ان لا الہ الا اللہ ویؤمنوا بی وبما جئت بہ ی "یہاں تک کہ لوگ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور مجھ پر اور جو کچھ میں لایا ہوں اس پر ایمان لائیں" اور اسی لئے ایک روایت میں شھادتین کے ذکر سے مستغنیٰ ہونے کی وجہ سے ان کو حذف کر دیا گیا۔ اس لئے کہ یہ دونوں (اسلام کی) بنیاد ہیں۔

تحقیقی بات یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ شھادۃ سے اشارہ ہے دِل کی تختی کو شرک جلی، خفی اور باقی تمام فاسد اور بے کار نقشوں

سے خالی کرے اور پھر اس کو معارف یقینیہ' الٰہی حکمتوں' عتقادات حقہ، آخرت کے احوال اور امورِ غیبیہ اور اخروی احوال سے آراستہ کرنے کی طرف ہے کہ جس شخص نے بھی اللہ تعالیٰ کو ان تمام اسماء وصفات کے ساتھ کہ جن پر اللہ تعالیٰ کا اسم دلالت کرتا ہے۔ موجود مانا اور اس کے غیر کی نفی کی اور نبی اکرم ﷺ کی رسالت کی صدق وامانت کے ساتھ تصدیق کی تحقیق اس نے اپنے عہد کی ذمہ داری کو نبھایا اور اس نے اپنی جدو جہد کی ابتداء میں ہی اپنی انتہائی کوشش کو صرف کر ڈالا اور کتابوں، رسولوں اور آخرت پر میں سے جتنے امور ثابت تھے، سب پر ایمان لایا۔ اسی لئے نبی اکرم ﷺ ان تمام چیزوں کو شمار کرنے کے درپے نہیں ہوئے۔ قامتِ صلوٰۃ بدنی راحتوں کو چھوڑنے اور جسمانی اعضاء کو (طاعتِ باری تعالیٰ میں) تھکانے کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ یہ وہ ام العبارات ہے جب یہ پائی جاتی ہے تو انسان باقی عبادتوں سے پیچھے نہیں رہتا۔ اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے باقی عبادتوں کو شمار کرنے اور ترک سیئات سے استغناء برتا اس لئے کہ نماز تمام بُرائی کے کاموں اور گناہوں سے روکتی ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی اپنے زائد از ضرورت مال سے اعراض کرنا ہے، بلکہ موجود حقیقی کے ذریعے موجود وہمی سے اعراض کرنا ہے اور مال جو کہ روح ہے اس کا خرچ کرنا کشادگی کے دروازے کھلوانے کے لیے ہے۔ ان دونوں کلموں میں لاَم یا تو عہد کا ہے یا جنس کا۔ چنانچہ (ان میں سے ہر ایک کا) فرد کامل والا معنی مراد ہے۔ جیسے لوگوں کا قول ہے: "ھو الرجل" (یعنی گویا کامل مرد تو وہی ہے) گویا کہ مسلمانوں میں نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ کوئی کامل نماز اور زکوٰۃ ہے ہی نہیں۔

قولہ: اذا فعلوا ذلک عصموا منی دمائھم ...... علی اللہ:

"**ذلک**": شھادتین، نماز اور زکوٰۃ کی طرف ہے۔ قول کو فعل کا نام دیا اس لئے کہ قول زبان کا عمل ہے' یا تغلیباً ایسا کیا۔

"**عصموا**": صاد کے فتح کے ساتھ حفاظت اور پناہ میں آنا "**منی**": یعنی میری اتباع سے یا میری طرف سے اور میرے دین کی رو سے۔

"**دماء ھم و امو الھم**": یعنی ان کی خونریزی مباح قرار دیئے جانے سے اور اموال کے لوٹ لیے جانے سے جو کہ لفظ مقاتلہ سے سمجھ میں آرہا ہے۔ "**بحق الاسلام**": یعنی اپنے دین کے حق کی وجہ سے بحق الاسلام میں اضافت لامیہ ہے۔ اور جار ومجرور کے عام میں اعم سے استثناء مفرغ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ یہ کام کرلیں گے تو کسی بھی وجہ سے ان کا خون بہانا اور ان کے اموال کو مباح سمجھنا کسی بھی سبب سے سوائے اسلام کے حق کے کسی نفس کا یا کسی کے عضو کا قصاص' جبکہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا کسی کا کوئی عضو کاٹا ہو، ہوسکتا ہے۔ حقِ اسلام یہ ہے کہ کسی سے مال لیا جائے جبکہ اس نے کسی کا مال غصب کیا ہو اور اسی طرح دوسرے اسلامی حقوق مثلاً زانی محصن کو قتل کرنا، چوری کی وجہ سے ہاتھ کاٹنا' یا کسی کا مال محترم ضائع کرنے کی وجہ سے اس سے مالی تاوان لینا وغیرہ۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں استثناء "**الدماء**" اور "**الاموال**" سے ہے اور موصوف محذوف ہے "**ای الا دماء او اموالا ملتبسۃ بحق**"

"**وحسابھم**" اور ان کا مواخذہ کفر اور گناہوں میں سے جو چیزیں وہ اسلام کے اظہار کے اور چھپاتے ہیں۔ اللہ کے حوالے ہے۔

یہ جملہ مستانفہ ہے یا شرط کی جزاء پر معطوف ہے اور معنی یہ ہے کہ ہم تو ظاہر حال اور قولی ایمان پر حکم لگائیں گے اور ان پر سے وہ احکام جو کفار پر لاگو ہوتے ہیں ہٹالیں گے، اس لئے نہیں کہ وہ مخلص ہیں۔ ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے سپرد ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ مخلص کو اجر عطا فرمائیں گے اور منافق کو سزا دیں گے اور گناہوں پر ڈٹے رہنے والوں کو اس کا بدلہ دیں گے یا ان کو معاف فرما دیں گے۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ جس نے اسلام کو ظاہر کیا اور دل میں کفر کو چھپائے ظاہر میں اس کا اسلام قبول کیا جائے گا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ زندیق کی توبہ قبل نہیں کی جائیگی اور زندیق وہ ہے جو ظاہراً تو مسلمان ہو لیکن کفر کو چھپا رکھے اور یہ بات (کہ اس نے دل میں کفر چھپایا ہوا تھا) اس طرح معلوم ہوگی کہ وہ خود اقرار کر لے یا کسی کو اس کے مخفی کفر کی اطلاع ہو جائے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور اس کا قتل ضروری ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنی توبہ میں سچا ہوا تو آخرت میں وہ توبہ اس کو فائدہ دے گی اور ایک قول یہ ہے کہ صرف ایک مرتبہ اس کی توبہ قبول کی جائے گی۔ ایک قول یہ ہے کہ جب تک وہ تلوار کے نیچے نہ آئے اس کی توبہ قبول کر لی جائیگی۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کی توبہ اس وقت قبول کی جائے گی جب تک کہ وہ گمراہی کی طرف دعوت دینے والا نہ ہو۔

ایک قول یہ ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قتال اور عصمت ان دونوں کا تعلق دنیوی امور سے ہے جبکہ اُخروی امور جیسے ثواب وعقاب اور ان کی کمیت وکیفیت اللہ تعالیٰ کے سپرد ہیں ان میں ہمارے لئے دخل کی گنجائش نہیں۔ اھ

ایک قول یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقوع کے تحقق میں حساب واجب کی طرح ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ حساب اللہ تعالیٰ کے وعدے کی بناء پر ازروئے شریعت واجب ہے۔ چنانچہ حساب کا وقوع ضروری ہے نہ یہ کہ اللہ سبحانہ اللہ تعالیٰ پر کوئی شی واجب ہے۔ لہٰذا اس میں معتزلہ کے لیے ان کے اس باطل گمان کی' کہ حساب کتاب اللہ تعالیٰ پر واجب ہے، کوئی دلیل نہیں ہے۔

الحساب مصدر ہے جیسا کہ محاسبة بمعنی شمار کرنا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ حسابهم على الله الخ کا معنی یہ ہے کہ لوگ یہ جان لیں گے کہ ان کے حق میں کیا فیصلہ ہوا ہے اور ان کے خلاف کیا فیصلہ ہوا ہے۔ وہ اس طرح کہ ان کے اعمال کی مقداروں اور ان کی جزاوسزا کا یقینی علم اللہ تعالیٰ ان کے دِلوں میں فرما دیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ مخلوق کا باقاعدہ حساب کتاب نہیں ہوگا بلکہ لوگ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوں گے اور ان کے اعمال نامے ان کے دائیں ہاتھ میں دے دیئے جائیں گے اور کہا جائے گا، ''تمہارے اعمال کے بارے میں ہم نے درگزر کا معاملہ کیا''۔ پھر انہیں ان کی نیکیاں دی جائیں گی' اور کہا جائے گا: ''اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارے لیے دوگنا کر دیا''۔

چنانچہ یہ مجاز ہے سبب بول کر مسبّب مراد لینے کی قبیل سے ہوگا۔ اس لئے کہ حساب انسان کے اپنے نفع ونقصان کے علم کے حصول کا سبب ہوتا ہے۔ یا اللہ تعالیٰ ان کو جزا دے گا۔ اس لئے کہ حساب پکڑ یا عطاء کا سبب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ﴾ [النور: ۳۹] : ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ بہت جلدی حساب کرنے والا ہے'' اور اللہ تعالیٰ کی سرعت کا

معنی یہ ہے کہ کسی بھی چیز کی تخلیق میں کسی بھی قسم کی فکر کرنے یاد یکھنے یا مدت یا زمانے کی طرف احتیاج کے بغیر اللہ کی قدرت تمام ممکنات کے ساتھ متعلق ہے اور اسی لئے ارشاد وارد ہوا ہے: **کاسب الخلق فی مقادر حلبة شاة' أوفی لمحة** کہ مخلوق کا حساب کتاب ایک بکری کے دوہنے کی بقدر وقت یا ایک لمحے میں ہوگا۔

تخریج: امام نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس روایت کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اور یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿فَإِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ﴾ [التوبہ: ۵] ترجمہ: ''اگر انہوں نے توبہ کی''۔اقرار کے ساتھ کفر سے توبہ کی' نماز قائم رکھیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں تو تم ان کا راستہ چھوڑ دو''۔الجامع الصغیر میں ہے کہ اس حدیث کو محدثین کی ایک جماعت نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا اور یہ حدیث ان کے الفاظ کے ساتھ متواتر معنوی ہے۔**امرت ان اقاتل الناس حتی یشهدوا ان لا اله الا الله' وانی رسول الله فاذا قالوا هاعصموا منی دمائهم وأموالهم الابحقها' بحسابهم علی الله۔**

جامع کبیر میں ہے کہ اس حدیث کو امام ابن جریر نے اور طبرانی رحمہم اللہ تعالیٰ نے الاوسط میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا اور ان الفاظ کے ساتھ اس کو حسن قرار دیا ہے: **امرت ان اقاتل الناس حتی یشهدوا أن لا اله الا الله 'فاذا قالوا قالوها عصموا منی دمائهم وأموالهم الا بحقها قیل وماحقها قا: زنا بعد احصان أو کفر بعد اسلام' أوقتل نفس فیقتل لبها۔اه**

اس حدیث شریف کی اس بات پر ظاہراً دلالت ہے کہ اقرار' اسلام کی صفت اور احکام کے ترتب کے لیے شرط ہے اور اس میں مرجئہ کے اس قول ''**ان الایمان غیر منتقر الی الأعمال**'' ''ایمان اعمال کا محتاج نہیں ہوتا'' پر ردِ بلیغ ہے اور اس حدیث شریف میں اہلِ بدعت جو کہ اہلِ قبلہ کا اقرار کرنے والے اور شریعت کے احکام کا التزام کرنے والے ہوں، کی عدم تکفیر کی بھی دلیل موجود ہے۔

مسلمانوں کی تین علامتیں

۱۳: وَ عَنْ اَنَسٍ اَنَّهٗ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ صَلّٰی صَلٰوتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَاَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِيْ لَهٗ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ فَلَا تُخْفِرُوا اللّٰهَ فِيْ ذِمَّتِهٖ. (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۴۹۶/۱ حدیث رقم ۳۹۱۔ورواه النسائی ۱۰۵/۸ حدیث ۴۹۹۷ لقوله فذلکم المسلم۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو انسان ہماری نماز کی طرح نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کی جانب رخ کرے اور ہمارے ذبیحہ کو کھائے۔ وہ انسان مسلمان ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اس کو امن حاصل ہے۔ لہٰذا جو شخص اللہ اور رسول ﷺ کی ذمہ داری میں ہے تم اس کے ساتھ عہد شکنی کر کے اللہ کی ذمہ داری کو نہ توڑو۔ (بخاری)

تشریح: قوله: انه قال: قال رسول الله ﷺ من صلی صلاتنا:

یہ لفظ تصحیح شدہ نسخوں میں ثابت ہے۔ یعنی "من صلی صلاتنا": جس طرح ہم نماز پڑھتے ہیں اس طرح پڑھے اور ایسی نماز صرف اسی شخص سے پائی جائے گی جو موحد ہو اور آپ ﷺ کی نبوت کا اعتراف کرنے والا ہو، اور جو شخص بھی آپ ﷺ کی نبوت کا اعتراف کرتا ہے تحقیقی بات ہے کہ اس نے ان تمام امور کا اعتراف کرلیا، جو آپ ﷺ لے کر آئے ہیں۔ چنانچہ اسی لئے نماز کو اس شخص کے اسلام کے لیے علامت ٹھہرایا اور شہادتین کے نماز حقیقۃً یا حکماً داخل ہونے کی وجہ سے ان کا ذکر نہیں فرمایا۔

قوله: واستقبل قبلتنا:

باوجودیکہ قبلہ نماز میں داخل ہے' اس کا ذکر اس لئے فرمایا کہ قبلہ زیادہ معروف ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہر شخص اپنا قبلہ پہچانتا ہے، اگرچہ اس کو نماز کو نہ آتی ہو، اور اس لئے بھی کہ ہماری نماز میں وہ اعمال بھی پائے جاتے ہیں، جو ہمارے علاوہ دوسروں کی نماز میں پائے جاتے ہیں۔ جبکہ استقبالِ قبلہ صرف ہمارے نماز کے ساتھ مخصوص ہے۔

(اس حدیث میں) نبی اکرم ﷺ نے نماز جو کہ دین کا ستون ہے کے ذکر پر اکتفاء کرتے ہوئے زکوٰۃ اور اس کے علاوہ ارکانِ اسلام کا ذکر نہیں فرمایا۔ یا اس لئے کہ ان فرائض کا وجوب اس حدیث کے زمانے کے بعد ہوا۔

پھر جب مسلمان کو غیر مسلموں سے عبادت کے اعتبار سے ممتاز فرما چکے تو ان امور کو بیان فرما رہے ہیں۔

قوله: واکل ذبیحتنا:

جو اسے عبادت اور عادت کے اعتبار سے مسلم کو غیر مسلم ممتاز کردیں۔ ذبائح کے کھانے سے رکنا جس طرح عبادات میں سے ہے اسی طرح وہ سابقہ ملتوں کی ثابت شدہ عادتوں میں سے بھی ہے۔ "الذبیحة" فعیلة کے وزن پر "مفعولة" کے معنی میں ہے اور اس میں الشاۃ کی طرح تاء جنس کی ہے۔

قوله: فذٰلك المسلم الذی له ذمة الله و ذمة......:

"فذلك" سے اشارہ اس شخص کی طرف ہے جو ان تین اوصاف کو جمع کرے، یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر "المسلم" ہے۔ یا یہ ذٰلك کی صفت ہے اور اس کی خبر الذی ہے۔ یعنی وہ کفار کے وبال سے اللہ اور اس کے رسول کی امان اور ذمہ داری میں آجاتا ہے۔ لفظ ذمة کو اس لئے مکرر لائے تاکہ اس بات کی طرف راہنمائی ہو کہ ان دونوں میں سے ہر ایک ذمہ مقصود ہے۔ البتہ اصل پہلا ہے۔ یہ دونوں آپس میں لازم وملزوم ہیں اسی وجہ سے آپ ﷺ نے اپنے ارشاد فلاتخفروا الله ذمته میں صرف پہلے پر اقتصار کیا۔ "فلا یخفروا" "اخفار" سے ہے۔

مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے عہد کے معاملے میں خیانت نہ کرو اور اس کے حق یعنی اس کے مال، جان اور عزت سے تعرض نہ کرو۔ یا ضمیر مسلم کی طرف راجع ہوگی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے عہد کو نہ توڑو۔ مضاف کو حذف کرکے اس کی جگہ مضاف الیہ کو ذکر کردیا ہے۔ ای فلا تنقفوا عهد الله مادام هو فی ذمته یعنی جب تک وہ اپنے ذمہ پر برقرار رہے۔

تخریج: امام ابوداوٗد، ترمذی اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس حدیث کے ہم معنی روایت نقل کی ہے۔

جنت میں لے جانے والے اعمال

۱۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ اَتٰی اَعْرَابِیٌّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ دُلَّنِیْ عَلٰی عَمَلٍ اِذَا عَمِلْتُهٗ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ فَقَالَ تَعْبُدُ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكْ بِهٖ شَیْئًا وَتُقِیْمُ الصَّلٰوةَ الْمَكْتُوْبَةَ وَتُؤَدِّی الزَّكٰوةَ الْمَفْرُوْضَةَ وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ قَالَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَا اَزِیْدُ عَلٰی هٰذَا شَیْئًا وَلَا اَنْقُصُ مِنْهُ فَلَمَّا وَلّٰی قَالَ النَّبِیُّ ﷺ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی رَجُلٍ مِّنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی هٰذَا. [متفق علیه]

البخاری فی صحیحه ۳/۲٦۱ حدیث رقم۱۳۹۷ و مسلم فی صحیحه ۱/٤٤ حدیث(۱۵۔۱٤)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے کہ جس کے کرنے سے میں جنت میں داخل ہو جاؤں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پانچ کام کر۔ ① عبادت ایک اللہ کی کر۔ ② اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر۔ ③ فرض نماز پابندی سے ادا کر۔ ④ فرض زکوٰۃ ادا کر۔ ⑤ رمضان المبارک کے روزے رکھ۔ یہ سن کر اعرابی نے کہا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ نہ میں اس میں کچھ زیادتی کروں گا اور نہ اس سے کچھ کم کروں گا۔ جب وہ اعرابی واپس چلا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس آدمی کی چاہت ہو کہ میں کسی جنتی انسان کو دیکھوں تو وہ اس آدمی کو دیکھ لے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **قوله: قال: اتی اعرابی النبی ﷺ فقال: دلنی...... الجنة:**

"**أعرابی**": **اعرابی** أعراب کی طرف منسوب ہے۔ أعرابی وہ لوگ ہوتے ہیں جو دیہات و جنگلات میں رہتے ہیں۔ جیسے کہ عرب شہروں کے باسی ہوتے ہیں۔

"**النبی**": ایک نسخہ میں **الی النبی** ﷺ کے الفاظ ہیں۔ "**دُلنی**" دال کے ضمہ کے لام مشددہ کے فتح کے ساتھ۔ یعنی دلالت کے ذریعے میری راہنمائی کیجئے۔ ایک ایسے عمل پر جس کی صفت یہ ہے کہ جب میں وہ عمل کرلوں تو جنت میں داخل ہو جاؤں، یعنی کسی قسم کے عذاب سے دوچار ہونے سے پہلے دخول اولیٰ کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤں۔

قوله: قال. یعبد الله ولا تشرك به شیئا:

"**تعبد الله**": یہ خبر بمعنی امر ہے۔ یا یہ ان کی تقدیر کے ساتھ بتاویل مصدر کے ہے۔ جب "ان" کو حذف کر دیا گیا تو فعل مرفوع ہو گیا اور ایک قول کے مطابق یہ نصب کے اثر کے باقی رہنے کے ساتھ (پڑھا جائے گا)۔ یا یہ فعل کو بمنزلہ مصدر کے اتارا گیا ہے۔ (اس طرح کہ) فعل کو ذکر کیا گیا اور اس سے اس کا حدوث مراد ہے۔ جیسا کہ "**تسمع بالمعیدی خیر من ان تراہ**" میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ﴿وَمِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ﴾ [الروم: ٢٤] کی طرح ہے۔ حدیث شریف میں مبتدا محذوف کی خبر ہونے کے باعث محلاً مرفوع ہے۔ أی **هدلنی علی العمل الذی اذا عملته دخلت الجنة هو عبادة الله** (ایسا عمل بتایئے کہ جب میں اس کو کروں تو جنت میں داخل ہو جاؤں، وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے)۔

ایک قول یہ ہے کہ عبادت سے مراد عطف کی وجہ سے توحید ہے۔ (عطف میں) اصل تو مغایرت ہے اور توحید نبوت کو

شامل ہوتی ہے اس لئے کہ نبوت کے بغیر توحید کا اعتبار ہی نہیں۔ لہٰذا توحید کے تذکرہ نے نبوت کے ذکر کرنے سے مستغنی کر دیا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ سائل مؤمن تھا لیکن اس کے باوجود توحید کا ذکر اس کے شرف کی وجہ سے اور اس پہ اصل کیا اور ایک قول یہ ہے کہ یہ عطف الخاص علی العام کے قبیل سے ہے۔

''ولا تشرك به شيئاً'': یعنی چیزوں میں کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ کرنا۔ یا شرک جلی یا شرک خفی میں سے کوئی بھی شرک نہ کرنا، یہ جملہ حالیہ ہے۔ یعنی اس حال میں کہ تم مشرک نہ ہو اور (جملہ حالیہ ہونا) یہ اس بات کی تائید کرتا ہے کہ عبادت سے مراد توحید ہے۔ یہ جملہ تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ اس جملے کو دو (وجہ سے ارشاد فرمایا اول) کفار پر کرنے کے لیے ذکر فرمایا، اس لئے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ: ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ [الزمر:۳] ترجمہ: ''ہم ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ درجہ کے اعتبار سے ہمیں اللہ کے قریب کرتے ہیں''۔ (دوم) ذکر کیا کہ عبادت اس وقت تک کامل نہیں ہوتی جب تک دکھاوے کے تمام طریقوں سے سلامت نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾ [الکھف: ۱۱۰] اہلِ معرفت فرماتے ہیں: عبادت گزاری ثواب کے لیے ہوتی ہے یا پکڑ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے، اور یہ سب سے نچلا درجہ ہے۔ عبادت کو عبادت اس لئے کہا جاتا ہے کہ بندے کا معبود ہی حقیقت میں مطلوب ہوتا ہے۔ بلکہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی عبادت کی عدم صحت پر متکلمین کا اجماع نقل کیا ہے، یا باری تعالیٰ کی خدمت کے شرف کے لیے اس کی طرف انتساب کے لیے ہوتی ہے۔ اسی عبادت کو عبودیہ کا نام دیا جاتا یہ پہلی سے ارفع ہے۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے لیے خالص نہیں ہے یا کسی اور کی طرف نظر کیے بغیر صرف اکیلے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہوتی ہے۔ اس کو عبودۃ کا نام دیا جاتا ہے، اور یہ مکافات میں سب سے اعلیٰ اور حالات میں سب سے ارفع ہوتی ہے۔

قوله: وتقيم الصلوٰة المكتوبة......وتصوم رمضان:

شرائط وارکان معلومہ کے ساتھ لوگوں پر فرض کی گئی۔ ''يؤدى بز كوٰة المفروضة'': صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے درمیان (مکتوبہ اور مفروضہ کے تغایر) تفنن کے لیے ہے اور یہاں پر یہ قید (المفروضۃ) تاکید کے لیے ہے تاکہ معنی لغوی کا وہم نہ ہو، برخلاف پہلی قید (المکتوبہ) کے کہ وہ احترازی ہے۔ زکوٰۃ کے لغوی معنی مطلق صدقہ ہیں۔ ادائیگی زکوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی معین مقدار مقرر کردہ مصارف میں دی جائے اور تو رمضان کے روزے رکھے، اور رمضان کے روزے تو فرض ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو کسی قید کے ساتھ مقید نہیں کیا۔ اسی وجہ سے رمضان کا روزہ مطلق نیت سے بھی درست ہو جاتا ہے۔

قوله: والذى نفسى بيده......ولا انقص منه:

''والذی'': اس جملہ سے بغیر ضرورت کے قسم کھانے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ ''لا ازيد على هذا'': یعنی مذکورہ چیزوں میں کسی چیز کی زیادتی نہ کروں گا اور نہ اس سے کمی کروں گا۔

ایک قول یہ ہے کہ سوال پر زیادتی نہ کروں گا اور جو کچھ آپ ﷺ سے سنا اس پر عمل کرنے میں کمی نہ کروں گا۔

یا یہ کہ وہ شخص قاصد بن کر آیا تھا۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ میں دوسروں تک پہنچانے میں جو کچھ میں نے سنا اس میں نہ تو زیادتی کروں گا نہ کمی۔

عبادت جبکہ تمام افعال واجبہ کی انجام دہی اور منکرات کے چھوڑنے کو شامل ہے یا یہ کہ نماز تمام گناہوں اور بُرائی کے کاموں سے روکتی ہے تو اس شخص کے لیے ان چیزوں کی بدولت نجات کا اثبات درست ہوا۔ اس بات کی تائید بخاری کی روایت **فاخبره رسول الله صلى الله عليه وسلم بشرائع الاسلام والله لا أزيد ولا انقص......** سے بھی ہوتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس قول کا مقصود تصدیق وقبول میں مبالغہ ہے۔ یعنی میں نے جو باتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھی ہیں ان کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو اس انداز سے قبول کروں گا کہ سوال کی جہت سے اس میں مزید کی گنجائش نہیں اور قبول کی جہت میں اس میں کمی کی گنجائش نہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ یہ بات نوافل کی مشروعیت سے پہلے کی ہے۔ لیکن اس طرح کہنے کی کوئی ضرورت نہیں، اس لئے کہ نوافل فرائض کے لیے متمم اور مکمل ہوتے ہیں، نہ کہ ان پر زیادتی' علاوہ ازیں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اجناسِ مذکورہ پر زیادتی نہ کروں گا، یہاں حج کا ذکر نہیں کیا۔ ایک روایت میں روزے کا ذکر نہیں جبکہ ایک اور روایت میں زکوٰۃ کا ذکر نہیں اور ایک روایت میں ایمان کا بھی ذکر نہیں۔ جبکہ بعض روایات میں صلہ رحمی کا اور بعض میں خمس کا بھی ذکر ہے۔ اس کا جواب علامہ ابن الصلاح اور قاضی عیاض رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ اس کا سبب حفظ واتقان کے اعتبار سے راویوں کا تفاوت ہے۔

قوله: من سره ان ينظر الى رجل من اهل الجنة فلينظر الى هذا:

"**فلينظر**": جواب شرط ہے، یا خبر ہے جو جواب کو متضمن ہے۔

اس شخص کی طرف دیکھے' کہ اس نے مأمورات پر عمل اور محظورات (جس سے روکا گیا) کو چھوڑنے کا عزم کیا ہے۔ لہٰذا جو شخص اس معاملے میں اس کے ساتھ لاحق ہونے کا ارادہ رکھتا ہو اس پر لازم ہے جن چیزوں کے بارے میں اس نے مصمم ارادہ کیا ہے، یہ بھی عزمِ مصمم کرے اور نجات پانے والوں میں اس کا شمار ہو اور سابقین کے ساتھ اس کا حشر ہو۔

یہ بھی احتمال ہے کہ اشارہ فردِ جنسی کی طرف ہو، اور یہ ظاہر ہے۔ یا فردِ شخصی کی طرف ہو یہ زیادہ ظاہر ہے اور (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے جنتی ہونے کا) علم یا تو وحی کے ذریعے ہوا ہوگا۔ یا غلبہ ظن کے ذریعے۔

سفیان ثقفی رضی اللہ عنہ کا سوال اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب

۱۵: وَعَنْ سُفْيَانَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الثَّقَفِيْ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قُلْ لِيْ فِي الْإِسْلَامِ قَوْلًا لَا اَسْئَالُ عَنْهُ اَحَدًا بَعْدَكَ وَفِيْ رِوَايَةٍ غَيْرَكَ قَالَ قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ. (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٦٥ حديث (٦٢-٣٨)۔ والترمذي بلفظ وآخر ٤/٥٢٤ حديث ٢٤١٠۔ وابن ماجة ٢/١٣١٤ حديث ٣٩٧٢ وأحمد في المسند ٣/٤١٣۔

ترجمہ: سفیان بن عبداللہ ثقفی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ اے اللہ کے رسول۔ مجھے

اسلام کی کوئی ایسی خصلت اور کام بتا دیجئے کہ آپؐ کے بعد مجھے کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت نہ ہو۔ایک دوسری حدیث میں الفاظ اس طرح ہیں کہ آپ کے علاوہ کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔آپ نے فرمایا زبان اور دل سے سچائی کے ساتھ اس بات کا اقرار کرو کہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا اور پھر اس اقرار پر استقامت اختیار کرو۔
(صحیح مسلم)

راویٔ حدیث:

سفیان بن عبداللہ۔ یہ سفیان بن عبداللہ بن ربیعہ ہیں۔سفیان کے سین پر تینوں حرکتیں پڑھنا درست ہیں۔ضمہ زیادہ مشہور ہے۔ان کی کنیت ابوعمرو ہے۔ان کا تعلق قبیلہ ''ثقیف'' سے ہے۔الثقفی ہے۔اہل طائف میں ان کا شمار ہوتا ہے۔صحابی تھے۔طائف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے حاکم تھے۔

تشریح: **قوله:قل لي في الاسلام......غيرك:**

یعنی ایسی بات جس سے اسلام میں کمال حاصل ہو،اور اس کا اہتمام اسلام کے حقوق کی نگہداشت کا سبب اور اس سے اسلام کے توابع پر استدلال کیا جا سکتا ہو۔بعض حضرات نے فرمایا: تقدیری عبارت **في مبادي الاسلام وغاياته** ہے یعنی اسلام کی بنیادی اور انتہائی باتیں بتا دیجئے۔ایسی جامع بات بتا دیجئے،کہ اس کے بارے میں آپ سے سوال کے بعد کسی اور سے دریافت کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿وَمَا يُمْسِكْ لا فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ م بَعْدِهٖ﴾ [فاطر:۲]
اي من بعد امساكه۔

ایک روایت میں **بعدك** کی بجائے **غيرك** کے الفاظ وارد ہوئے ہیں تقدیری عبارت یوں ہوں گی: **لا أسأل عنه أحدا غيرك** یعنی آپ کے علاوہ کسی اور سے اس کے بارے میں نہ پوچھوں اور پہلی روایت اس معنیٰ کو بھی مستلزم ہے اس لئے کہ جب آپ ﷺ سے سوال کے بعد کسی سے دریافت نہ کرے گا تو اس نے آپ ﷺ کے علاوہ کسی اور سے نہ پوچھا۔اس سے پہلی روایت کی وجہ ترجیح بھی ظاہر ہے اس لئے اسے اصل قرار دیا جائے اور دوسری کو ایک روایت کہا جائے جبکہ امام نووی نے اپنی اربعین میں اس کے برعکس کہا۔

قوله:قال:قل أمنت بالله ثم استقم :یعنی میں ان تمام چیزوں پر ایمان لایا جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔
یہ جملہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد:﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ [الاحقاف:۱۳] سے مقتبس ہے اور دوسری آیت میں یوں ہے:﴿تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ......﴾ [فصلت:۳۰]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں،میں نے عرض کیا:اے اللہ کے رسول!مجھے وصیت فرما دیجئے۔آپ ﷺ نے فرمایا:تم کہو اللہ میرا ربّ ہے،پھر اس پر استقامت اختیار کرو۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:میں عرض کیا:اللہ میرا پروردگار ہے اللہ تعالیٰ ہی مجھے توفیق مرحمت فرمائیں گے۔اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔تو آپ ﷺ نے

فرمایا: اے ابوالحسن! تمہیں علم مبارک ہو۔

یہ حدیث جوامع کلم میں سے ہے جو اسلام کے اصولوں پر مشتمل ہے توحید وطاعت پر۔ توحید کا مفہوم آپ ﷺ کے فرمان امنت باللہ سے حاصل ہوتا ہے اور ہر قسم کی طاعت "ثم استقم" کے ذیل میں پائی جارہی ہے۔ اس لئے کہ استقامت تمام مامورات کی بجا آوری اور تمام ممنوعات سے اجتناب کو کہتے ہیں چنانچہ اس میں دلوں اور جسموں سے متعلق اعمال یعنی ایمان واسلام اور احسان سب داخل ہیں کیونکہ کجروی کے ساتھ استقامت حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس لئے صوفیاء کرام فرماتے ہیں "استقامت ہزار کرامتوں سے بہتر ہے"۔ یا ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ "امنت باللہ" ہر قسم کی طاعات کی تعمیل اور تمام منع کردہ باتوں سے بچنے کو شامل ہے اور آپ ﷺ کا ارشاد "ثم استقم" ان دونوں پر جمے رہنے پر محمول ہے۔ استقامت کی اہمیت کا اندازہ آپ ﷺ کے اس مبارک ارشاد سے بھی ہوتا ہے "شیبتنی سورة هود" مجھے سورہ ہود نے بوڑھا کردیا، اس لئے کہ اس میں یہ حکم نازل ہوا ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ﴾ [هود: ۱۱۲] "آپ استقامت اختیار کیجئے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا"۔ استقامت تمام قسم کے احکامات کو جامع ہے۔

صوفیاء کرام فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت لوگوں کو دینا جو پہلے سے صراطِ مستقیم پر ہوں مشکل کام ہے جو صرف اس طور پر ممکن ہے کہ دعوت دینے والا بصیرت رکھتا ہو اور سمجھتا ہو کہ وہ ایک حکم سے دوسرے حکم کی طرف بلارہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ﴾ [هود: ۱۱۲] کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "رسول اللہ ﷺ پر پورے قرآن مجید میں اس سے زیادہ شدید وسخت آیت نازل نہیں ہوئی"۔ اسی لئے جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا: آپ ﷺ جلدی بوڑھے ہوگئے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "مجھے سورہ ہود اور اسی جیسی دیگر سورتوں نے بوڑھا کردیا"۔ امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: استقامت ایک بڑا مشکل اور سخت امر ہے اس لئے کہ وہ عقائد کو بھی شامل ہے بایں طور کہ انسان تشبیہ وتعطیل سے پرہیز کرے اور اعمال کو بھی شامل ہے کہ وہ تغییر تبدیلی سے بچا رہے اور اخلاق کو بھی شامل ہے کہ افراط وتفریط ہر دو سے دور رہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ نے فرمایا: دنیا میں صراطِ مستقیم پر استقامت اس طرح دشوار ہے جیسے جہنم کے اوپر کے راستہ سے گزرنا مشکل ہے اور ان میں سے ہر ایک بال سے باریک اور تلوار سے تیز تر ہے اھ۔ استقامت کے بلند درجہ کے دشوار ہونے کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں ارشاد ہے: استقيموا ولن تحصوا: "استقامت اختیار کرو اور تم استقامت کا حق ادا کرسکو اس کی طاقت نہیں رکھتے ہو"۔ لیکن تم مکمل تابعداری اختیار کرنے کے لیے پوری محنت وکوشش کرو کہ جو مکمل طور پر حاصل نہ ہوسکے اسے پورے طور پر چھوڑ بھی نہ دیا جائے۔ اس میں تنبیہ ہے اس بات پر کہ کوئی اپنے بارے میں یہ نہ سمجھے کہ وہ استقامت کو اختیار کیے ہوئے ہے اور نہ اسے یہ وہم ہو کہ نفس لوامہ کی صفت وحالت سے پورے طور پر نکل چکا ہے کہ وہ عجب وغرور میں پڑ جائے جو ہر قابلِ ملامت سے زیادہ قبیح ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سلامت رکھے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ استقامت میں "سین" "طلب ماخذ کے لیے ہے" یعنی موت تک تمام اوقات میں ہر قسم کے حالات اور ہر مقام پر ڈٹ جانے اور جم جانے کی طلب کیلئے آیا ہے۔

پھر بعض حضرات نے کہا ہے کہ انسان جو اطاعت پر دوام کی طاقت وقوت نہیں رکھتا اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی مٹی کو نسیان (بھول) کے پانی سے گوندھا گیا جس سے نافرمانی کا صدور ہوتا ہے۔ اس لئے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **کلکم خطائون و خیر الخطائین التوابون۔** "تم میں سے ہر ایک خطا کار ہے اور بہترین خطاء کار خوب توبہ کرنے والے ہیں"۔ پس جنس انسان عورتوں کی قسم کی مانند ہے جو ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔ لہٰذا ان سے صفت استقامت پر ہمیشگی مقصود نہیں ہو سکتی۔ **نکل میسر لما خلق له** "اور ہر ایک کے لیے وہ امر آسان ہے جس کے لئے اس کی تخلیق عمل میں آئی" اور ہر طبیعت اس شرست سے الگ نہیں ہو سکتی جس پر وہ پیدا کی گئی ہے، جیسا کہ اس حدیث میں اشارہ موجود ہے۔

حدیث باب میں "**ثم**" کا لفظ رتبہ و درجہ کی تراخی کے لیے مستعار ہے۔ اس لئے کہ استقامت "**امنت بالله**" سے افضل ہے کیونکہ استقامت عقائد و اعمال اور اخلاق کو شامل ہے: (**ذکرہ المخشری**)

"**استقامه**" لغت میں **اعوجاج** (ٹیڑھے پن) کی ضد ہے۔ درست سمت قائم رکھنا استقامت کی دو قسمیں ہیں۔

① : استقامت عمل: عمل میں میانہ روی اختیار کرنا کہ سنت طریقہ سے آگے نہ بڑھے اور اخلاص سے ریا کاری، دکھاوے عوض کی امید اور مفاد طلبی کی طرف متجاوز نہ ہو۔

② : استقامت قلب: درست وصحیح بات پر جم جانا۔ محققین کے نزدیک **سیر الی الله** (اللہ کی رضا جوئی کے حصول) میں قصد وارادہ کا درست رہنا اور اعضاء و جوارح کا حدودِ شریعت پر کاربند رہنا کہ امر و نہی کی پابندی کریں، اور یہ درجہ **سیر فی الله** سے کم درجہ ہے۔ اس لئے کہ یہ صرف ایک صراطِ مستقیم (سیدھا راستہ) کے ذریعہ اللہ تعالیٰ تک جاتا ہے۔ جہاں تک سیر فی اللہ کا تعلق ہے وہ اس کی صفات سے متصف ہونے کا نام ہے اور ارشادِ باری: ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ﴾ [هود: ۱۱۲] میں ہمارے نبی ﷺ کو استقامت فی اللہ ہی کا حکم دیا گیا نہ کہ استقامت فی السیر فی اللہ۔

علامہ قشیری فرماتے ہیں: استقامت ایسے درجہ کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے کاموں میں کمال وتمامیت حاصل ہوتی ہے اور اس کے پائے جانے سے نیکیوں کا حصول اور ان پر پابندی کی توفیق ملتی ہے۔ جسے استقامت حاصل نہ ہو اس کی محنت ضائع ہو گئی اور کوشش رائیگاں چلی گئی اور یہ اشعار پڑھے:

جب تو اپنے دل کی تنگی کے راز کو فاش کریگا	اذا أفشيت سرك ضيق صدر
تو تجھے ملامت وندامت کا سامنا کرنا پڑیگا	أصابتك الملامة والنه امة
اور اگر تو ہر روز مسلسل کام میں لگا رہ	وان أخلت يوما فى فعال
تو تجھے استقامت کی صورت میں اس کا بدلہ ملے گا	تنال جزاءہ بالاستقامة

بعض عارفین نے فرمایا: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب تجھے توحید کے اختیار اور اس کی جلالتِ شان کو پیشِ نظر رکھنے کی توفیق مل جائے تو حق سبحانہ وتعالیٰ کی معیت میں وہیں رہ جہاں وہ رہے یا خواہ قضاءٔ رہ خواہ رضاءٔ رہ اور رضاء الٰہی کے مقام رفیع سے نفس وخواہش کی آرزوؤں کی پستیوں میں نہ اُتر۔

امام غزالی رحمہ اللہ نے فرمایا: استقامت کی بلند شان ہر حال میں اس کی حاجت وضرورت کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے اپنے

بندوں کو پنجگانہ نمازوں میں سورہ فاتحہ کا وجوبی حکم فرمایا جو استقامت کی دُعا کو متضمن ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے حسن خاتمہ پر مشتمل استقامت کا سوال کرتے ہیں۔

تخریج: نسائی، ابن ماجہ اور ترمذی نے بھی اسے روایت کیا۔ ترمذی کی روایت میں اتنا اضافہ بھی ہے: میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ کونسی چیز ہے جس کے بارے میں مجھے سب سے زیادہ ڈرتے رہنا چاہیے؟ تو آپ ﷺ نے اپنی زبان کو پکڑ کر فرمایا: ''یہ ہے''۔ امام ترمذی نے اس روایت کو حسن صحیح قرار دیا۔ احیاء میں یہ اضافہ ہے: میں نے عرض کیا: کس چیز سے میں زیادہ ڈروں؟ تو آپ ﷺ نے اپنے دستِ اقدس سے اپنی زبان کی طرف اشارہ فرمایا۔

نجات کا ذریعہ...... چند اعمال

۱۶: وَعَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَهْلِ نَجْدٍ ثَائِرَ الرَّأْسِ نَسْمَعُ دَوِيَّ صَوْتِهٖ وَلَا نَفْقَهُ مَا يَقُوْلُ حَتّٰى دَنَامِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِذَا هُوَ يَسْأَلُ عَنِ الْاِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُنَّ فَقَالَ لَا اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصِيَامُ شَهْرِ رَمَضَانَ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهٗ قَالَ لَا اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ قَالَ وَذَكَرَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الزَّكٰوةَ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا فَقَالَ لَا اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ قَالَ فَاَدْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُوْلُ وَاللّٰهِ لَااَزِيْدُ عَلٰى هٰذَا وَلَا اَنْقُصُ مِنْهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْلَحَ الرَّجُلُ اِنْ صَدَقَ. (متفق عليه)

أخرجه البخاري ١/١٠٦ حديث رقم ٤٦۔ ومسلم في صحيحه ١/٤٠ حديث (١١٠٨)۔ ورواه أبو داوٗد ١/٣٧٢ حديث رقم ٣٩١ والنسائي في سننه ١/٢٢٦ حديث ٤٥٨۔ ومالك في الموطا ١/١٧٥ حديث رقم ٩٤ ورواه الدرامي ١/٤٤٧ حديث ١٥٧٨ وأحمد في مسنده ١/١٦٢۔

ترجمہ: حضرت طلحہ بن عبیداللہ ؓ سے روایت ہے کہ نجد کا رہنے والا ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے خدمت عالیہ میں حاضر ہوا جس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ہم لوگ اس کی آواز کی گنگناہٹ تو سن رہے تھے لیکن فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے کیا کہہ رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ آتے آتے آپ ﷺ کے بالکل قریب آ گیا۔ تو اچانک ہم نے سنا تو وہ اسلام کے احکام کے بارے میں سوال کر رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ رات دن میں پانچ نمازیں فرض ہیں یہ سن کر اس شخص نے سوال کیا، کیا ان نمازوں کے علاوہ مجھ پر کوئی اور نماز بھی فرض ہے نبی علیہ السلام نے جواب دیا نہیں مگر نفل نماز پڑھنے کا تجھے اختیار ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا رمضان المبارک کے روزے تجھ پر فرض ہیں۔ اس شخص نے سوال کیا، کیا رمضان کے روزوں کے علاوہ مجھ پر کوئی اور روزہ

فرض ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں مگر نفل روزہ رکھنے کا تجھے اختیار ہے۔ حضرت طلحہؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ کا ذکر فرمایا۔ اس شخص نے سوال کیا، کیا اس کے علاوہ بھی مجھ پر کوئی صدقہ فرض ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ مگر نفلی صدقہ دینے کا تجھے اختیار ہے۔ اس کے بعد وہ شخص یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ اللہ کی قسم میں اس پر نہ زیادتی کرونگا اور نہ ہی اس میں کچھ کمی کروں گا۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اگر اس شخص نے سچ کہا ہے تو یہ یقیناً نجات پا گیا اور کامیاب ہو گیا۔ (بخاری و مسلم)

راویٔ حدیث:

طلحہ بن عبید اللہ۔ یہ طلحہ بن عبید اللہ ہیں جن کی کنیت ''ابو محمد'' ہے ''قریشی'' ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان کا نام ''طلحۃ الخیر'' اور ''طلحۃ الجود'' رکھا تھا۔ یہ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں شروع میں ہی اسلام لے آئے تھے۔ تمام غزوات میں سوائے بدر کے شریک رہے۔ عدم شرکت کی وجہ یہ تھی کہ آنحضور ﷺ نے ان کو سعید بن زید کے ہمراہ قریش کے اس غلہ کے قافلہ کا پتہ چلانے کے لئے روانہ کیا تھا جو ابوسفیان بن حرب کے ساتھ آ رہا۔ بس یہ دونوں ''بدر'' کی مڈبھیڑ کے دن واپس ہوئے۔ انہوں نے آنحضور ﷺ کی حفاظت احد کے دن اپنے ہاتھ سے کی۔ حملہ کی کثرت سے ان کے ہاتھ کی انگلیاں سن ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اس دن چوبیس (۲۴) زخم کھائے اور بعض نے کہا ہے کہ ان کے ۷۵ زخم لگے۔ کچھ نیزے کے' کچھ تلوار کے' کچھ تیر کے۔

حلیہ مبارک:

یہ طلحہ گندم گوں بہت بال والے تھے۔ بال ان کے نہ بالکل گھنگر والے تھے اور نہ بالکل سیدھے ہی تھے۔ حسین چہرے والے تھے۔

وفات:

جنگ جمل میں شہادت پائی۔ جمعرات کے دن ۲۰ جمادی الاخرہ ۳۶ھ بصرہ میں دفن کئے گئے۔ ان کی چونسٹھ سال کی عمر ہوئی۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔

تشریح: قوله: جاء رجل الى رسول الله ﷺ...... حتى دنا من رسول الله ﷺ:

''الى رسول الله'' جار، مجرور کا تعلق ''جاء'' سے ہے۔ ''من أهل نجد'': یہ رجل کی صفت واقع ہو رہا ہے۔ ''نجد'' لغت میں بلند زمین کو کہتے ہیں۔ یہ نجد ''تہامہ'' کی ضد ہے، تہامہ پست جگہ کو کہتے ہیں۔ مکہ اور عراق کے درمیانی علاقہ کو نجد کہتے ہیں۔

''ثائر الرأس'': تین نقطے والی ''ثا'' کے ساتھ۔ ثار البغبار سے مشتق ہے' جس کے معنی ہیں غبار اڑنا۔

یعنی سر کے بال بکھرے ہوئے تھے ان میں کنگھی نہیں کی ہوئی تھی۔ ثائر الرأس مضاف کے حذف کے ساتھ ہے۔ ثائر شعر الرأس، یا بالوں کو مجاز أرأس (سر) کہہ دیا، محل بول کر حال مراد لیا' یا مبالغۃً بالوں کو سر سے تعبیر کیا گویا وہ سر ہی منتشر و بکھرا ہوا تھا۔ اکثر حضرات کے نزدیک ثائرُ الرأس' مرفوع ہے صفت واقع ہونے کی بناء پر، بعض حضرات نے فرمایا: کہ یہ رجلٌ سے

حال واقع ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اس کا وصف اور بعض حضرات نے فرمایا: روایت میں ایسے ہی ہے۔

"دوِیّ صوته": جیسے شہد اور عام مکھیوں کی بھنبھناہٹ۔ دوی دال کے فتحہ کے ساتھ ہے اور دال کے ضمہ کے ساتھ روایت ضعیفہ ہے۔ واؤ کے کسرہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔ یہ بناء پر مفعولیت منصوب ہے۔ "نسمع" صحیح قول کی رُو سے صیغہ متکلم معروف ہے، بعض نسخوں میں یاء کے ساتھ مجہول بھی ہے یعنی "یسمع" اس صورت میں دویّ نائب فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہوگا۔

قوله: فاذاهو يسئال عن الاِسلام:

یعنی اس نے اسلام کے ان فرائض سے متعلق دریافت کیا جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے رسول ﷺ کی تصدیق کرنے والے پر لازم ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی حقیقت و ماہیت سے متعلق اس نے سوال نہیں کیا۔ اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے جواب میں شہادتین (اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدًا عبده رسوله) کا تذکرہ نہیں فرمایا اور اس بناء پر آپ ﷺ نے شہادتین کا ذکر نہیں فرمایا کہ سائل پہلے سے مسلمان تھا، اسلئے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی اور بخاری کی روایت سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ اس نے کہا "ماذا فرض الله علي"۔ "مجھے بتایئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کن امور کو فرض فرمایا"۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے اسلام کی ماہیت سے متعلق سوال کیا ہو اور آپ ﷺ نے جواب میں شہادتین (توحید و سالت کی گواہی دینے) کو ذکر فرمایا ہو اور راوی نے اسے نہ سنا ہو، یا وہ اسے بھول گیا ہو یا اس نے روایت کو اختصار سے نقل کیا ہو کیونکہ توحید و رسالت کی شہادت تو ہر ایک جانتا ہی ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ آپ ﷺ نے حج کا ذکر اس لئے نہیں فرمایا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ایک خاص شخص کی حالت کے اعتبار سے تھا کیونکہ اس نے سوال میں یہی کہا تھا کہ میرے ذمہ کیا فرائض ہیں؟ تو آپ ﷺ نے اس کے حالات کو جانتے ہوئے جواب ارشاد فرمایا اور اس پر حج فرض نہ تھا۔ یا ہو سکتا ہے اس وقت تک حج فرض ہی نہ ہوا ہو۔ یا بعض راویوں نے حج کا ذکر نہیں کیا۔ بخاری کی روایت اس کے حال کی تائید کرتی ہے کہ آپ ﷺ نے اسے اسلام کے احکام و شرائع بتائے۔

قوله: خمسُ صلوٰت في اليوم والليلة:

"خمس" صحیح قول کے مطابق خمس مرفوع ہے۔ مبتداء محذوف اسلام کی خبر ہے، اعشرضه اقامة خمس صلوات۔ یا یہ مبتداء ہے جس کی خبر محذوف ہے یعنی اى من شرائعه أداء خمس صلوات اسلام کے احکام میں سے پانچ نمازوں کی ادائیگی ہے اور خمس کا منصوب ہونا بھی درست ہے اس صورت میں تقدیری عبارت خذ (لے لو) یا اعمل (عمل کرو) یا صلّ (نماز پڑھ) ہے اور یہ زیادہ بہتر ہے۔ اھ

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے انوکھی بات ذکر فرمائی کہ "خمس" اسلام سے بدل ہے۔ یا مرفوع ہے هو مبتداء مقدر کی خبر ہونے کی بناء پر یا منصوب ہے خُذ مقدر کا مفعول ہونے بہ کی وجہ سے، اھ اور جر کو اختیار کرنا عقل و نقل دونوں لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔ نقل کے اعتبار سے صحیح نہ ہونا تو تصحیح شدہ نسخوں کی چھان بین سے معلوم ہوتا ہے اور عقل و قیاس کے اعتبار سے اس لئے صحیح نہیں ہے کہ بدل اور مبدل منہ ایک ہی شخص کے کلام میں ہوتے ہیں اور مقولہ جملہ ہی ہوتا ہے۔ جزء موجود ہے اس کا مرفوع ہونا

متعین ہے اور جب اس کو بدل بنا دیا تو یہ سائل کے سوال کا جواب باقی نہیں رہے گا اور سائل کا اگلہ کلام اس پر متفرع نہیں ہو سکے گا۔

قوله: فقال: هل على غيرهن؟ فقال: لا الا أن تطّوّع:

"**هل على غيرهن**" جار مجرور کا متعلق محذوف ہے۔ **اى يجب من الصلوٰة على غير هن** ۔ دوسرا احتمال یہ ہے جار مجرور کو خبر مقدم اور **غير هنّ** کو مبتداء مؤخر بنالیں۔

"**فقال لا**": **اى لاشئى عليك غيرها**۔ یہ فرمان وتر کے وجوب سے پہلے کا ہے یا پھر وتر عشاء کی نماز کے تابع ہو گئے اور عید کی نماز روزانہ کے فرائض میں شامل نہیں ہے بلکہ سالانہ واجبات میں سے ہے۔

"**الا أن**": میں ہمزہ پر فتحہ ہے۔ "**تطّوّع**": واؤ اور طاء پر شد ہے۔ **تطّوّع** اصل میں **تتطوع** دو تاء کے ساتھ تھا۔ دوسری تاء کو طاء میں تبدیل کر کے "طاء" کا "طاء" میں ادغام کر دیا گیا اور بعض روایات میں ایک "تاء" کو گرا کر "طاء" کو تشدید کے بغیر ذکر کیا گیا ہے۔

اور اس (فرمان) کا معنی یہ ہے کہ الا یہ کہ تم نفل شروع کر دو شروع کرنے کے بعد ان کا مکمل کرنا تجھ پر واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿**ولا تبطلوا اعمالكم**﴾ [محمد: ۳۳] "اور تم اپنے اعمال کو باطل نہ کرو" اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجماع کی وجہ سے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا کہ یہ "دعویٰ بلا دلیل ہے" قابلِ قبول نہیں اس لئے کہ اجماع کے صحیح ہونے کے لئے دلیل کا تذکرہ کرنا شرط نہیں۔ جب کہ ذکر کردہ اجماع کے لئے مذکورہ آیت معتبر دلیل موجود ہے اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا کہ "اس میں نہی تنزیہی ہے" جمہور کے اصول وقوانین کے خلاف ہے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا قابلِ قبول نہیں کہ "حنفیہ پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ اس کے ذریعہ اتمام نفل کی فرضیت پر استدلال کریں، حالانکہ وہ اتمام کو واجب کہتے ہیں"۔

اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول کہ "واجب کا فرض سے استثناء منقطع ہے" ہم تسلیم نہیں کرتے کیونکہ واجب ہمارے نزدیک عملی طور پر فرض ہی ہے اعتقادی طور پر نہیں۔ اسی اعتبار سے اس پر فرض کا اطلاق کیا جاتا ہے چنانچہ حدیث مذکور میں فرض سے عام معنیٰ مراد ہے (جو فرض وواجب دونوں کو شامل ہے) واللہ اعلم۔ علاوہ ازیں کلام کے صحیح ہونے کے لئے مستثنیٰ منقطع قرار دینا بھی کوئی ممانعت نہیں جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس جگہ پر اسی کو اختیار کیا۔

اور علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا کہ "نفی سے استثناء (جیسا کہ **لا، انْ تتطوع** میں ہے) اثباتِ حکم کا فائدہ نہیں دیتا بلکہ حنفیہ کے ہاں حکم مسکوت عنہ ہے"۔ قابلِ اعتراض ہے اسلئے کہ یہ اشکال حنفیہ پر تب لازم آتا اگر وہ صرف اسی حدیث سے استدلال کرتے حالانکہ پہلے یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ حنفیہ کی اس سلسلہ میں دلیل آیتِ کریمہ اور اجماع ہے اور انہوں نے حدیث کے لفظ کو اسی معنیٰ پر محمول کیا جو ان دونوں (آیت واجماع) سے مستفاد ہو رہا ہے۔

پھر یہ بات کہ نفل شروع کرنے کے بعد اتمام کا ضروری ہونا ہمارے نزدیک تمام عبادات میں چلتی ہے، اور امام

شافعی رحمۃ اللہ علیہ حج وعمرہ کے متعلق اس مسئلہ میں ہمارے ساتھ متفق ہیں انہیں فرق بیان کرنا چاہیے ورنہ ہمارے لئے تو حج وعمرہ پر تمام عبادات کو بھی قیاس کرنا کافی ہے، یا استثناء کو متصل قرار دیکر (الا ان تتطوع) کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں ''الاّ ان توجب علی نفسك بالنذر'' یعنی اور کچھ واجب نہیں سوائے اس عبادت کے جو نذر مان کر تم اپنے اوپر لازم کرلو اور استثناء میں اصل یہ ہے کہ متصل ہو اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے استثناء متصل سے عدول کرتے ہوئے فرمایا: ''لیکن تطوع (نفل) مستحب ہیں۔ چنانچہ استثناء متصل ہے نہ کہ منقطع۔ اس صورت میں نفل کو شروع کرنے کے بعد اتمام لازم نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ استثناء منقطع ہو اس کا بھی احتمال ہے اور معنی یہ ہوگا لکن التطوع باختیارك ابتداء أی کما هو مذهبنا او انتهاء ایضًا کما هو مذهب الشافعی لیکن نفل نماز پڑھنا ابتداءً آپ کے اختیار ومرضی پر ہے جیسا کہ ہمارا مذہب ہے یا انتہاءً بھی تمہارے اختیار پر ہے جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی میں نیکیوں پر ابھارنا اور صرف واجبات پر عمل پیرا ہونے کے ترک کی ترغیب ہے۔ یعنی واجبات کے ساتھ ساتھ نوافل کا بھی اہتمام کرنا چاہیے صرف فرائض وواجبات پر اکتفاء نہیں کرنا چاہیے۔

قوله: قال: رسول اللهﷺ: وصیام شهر رمضان...... لا الا أن تطّوع:

''وصیام شهر رمضان'': اس کا عطف ''خمس صلوات'' پر ہے اور درمیان میں سوال وجواب جملہ معترضہ کے طور پر ہیں۔ ''هل علی غیره'' اصل عبرت یوں ہے: هل علی صوم فرض سوی صوم رمضان قال: الا ان تطوع: تمام نسخ اصول ''فا'' حذف ہے۔ (یہ دلیل ہے کہ) عاشوراء کا روزہ فرض نہیں خواہ رمضان سے پہلے یہ فرض رہا ہو یا نہ رہا ہو۔

''وذکر له رسول الله صلی الله علیه وسلم، الزکاة'': یہ کلام راوی کا ہے۔ راوی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہو بہو الفاظ بھول گئے یا ان میں اشتباہ ہو گیا اس لیے یہ تعبیر اختیار فرمائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روایت میں الفاظ کی کتنی رعایت رکھی جاتی ہے۔ جب راوی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض الفاظ میں اشتباہ پڑ جائے تو وہ اپنے الفاظ میں اس معنی کو بیان کرتا ہے جیسا کہ اس حدیث کے راوی حضرت طلحہ نے کیا۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ اس فرمان سے معلوم ہوا کہ مال میں سوائے زکوٰۃ کے جس کے وجوب کے لئے خاص شرائط نہیں کوئی دیگر حق نہیں ہے، اور یہ مفہوم بالکل واضح ہے بشرطیکہ مالی حق سے وہ بنیادی حقوق مراد لئے جائیں جو اسباب کے تکرار سے متکرر ہوتے ہیں ورنہ مال سے متعلق حقوق تو بہت سے ہیں جیسے صدقہ فطر، ذوی الارحام کا نان نفقہ اور قربانی وغیرہ۔

قوله: فادبر الرجل وهو یقول: والله لا ازید علی هذا ولا انقص منه:

''وهو یقول'' یہ جملہ حالیہ ہے۔ ''والله لا ازید الخ'' اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ① دوسروں تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان پہنچانے میں اس پر کوئی اضافہ نہ کروں گا۔ ② یا جن چیزوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض قرار دیا ان میں کوئی اضافہ نہ کروں گا۔ یعنی کچھ بھی کمی نہ کروں گا۔ بخاری کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: لا اتطوع شیئا' ولا انقص مما فرض الله علی شیئا'' میں کسی چیز کو خود نفلی قرار نہ دوں گا اور اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں مجھ پر فرض فرمائی ہیں اُن میں کچھ کمی نہ کروں گا۔

قوله:فقال رسول الله ﷺ:افلح الرجل ان صدق :

یعنی فلاح وکامیابی میں داخل ہوگیا۔کامیاب وکامران ہوگیا اوراسے اپنا مطلوب حاصل ہوگیا۔

مطلوب کی قسمیں: مطلوب کی دو قسمیں ہیں۔

①: دنیوی: ان اشیاء واسباب کا حاصل ہوجانا جن کے ذریعہ دنیوی زندگی عمدہ انداز سے بسر ہوتی ہے۔

②: اُخروی: آخرت میں عذاب سے نجات حاصل ہوجانا اوراجر وثواب کامل جانا ہے۔

حضرات علماء فرماتے ہیں کہ تمام بھلائیوں کے لئے ''فلاح'' سے جامع کوئی لفظ نہیں۔اس لئے اس کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ فلاح ایسی بقاء کو کہتے ہیں جسے فنا نہیں،ایسی مالداری کو کہتے ہیں جس میں فقر نہیں،ایسی عزت کو کہتے ہیں جس میں ذلت کا شائبہ نہیں اور ایسے علم کو کہتے ہیں جس میں جہالت کا امکان نہیں۔

ایک روایت میں ہے:''افلح و الله'' اللہ کی قسم وہ کامیاب ہوگیا۔ایک دوسری صحیح روایت میں ہے:''بلا شک'' یقیناً وہ کامیاب ہوگیا۔ایک روایت میں ہے:''افلح و أبيه'' اس کے باپ کی قسم وہ کامیاب ہوگیا۔اس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ حدیث میں آیا ہے:من حلف بغير الله فقد اشرك۔جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔بعض حضرات نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ قسم نہی سے پہلے کھائی گئی ہے۔بعض حضرات نے کہا کہ و أبيه میں مضاف محذوف ہے تقدیر عبارت یوں ہے ''ورب أبيه'' اس کے باپ کے ربّ کی قسم۔بعض حضرات نے کہا کہ اصل یوں ہے ''انه و الله'' کاتب نے دونوں لاموں میں قصر کیا۔بعض حضرات نے یہ جواب دیا کہ شارع کے علاوہ دوسروں کے لیے غیر اللہ کی قسم کھانا مکروہ ہے' جیسا کہ امام بیہقی نے اپنے مشائخ سے اسے نقل فرمایا ہے۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے عجیب بات کہی کہ ''مذکورہ تمام اقوال ضعیف ہیں اور انہوں نے اس قسم کو اس پر محمول کیا کہ بلا قصد وارادہ یہ قسم آپ ﷺ نے کھالی۔حالانکہ ان کا یہ قول بہت بعید از امکان ہے۔

''ان صدق'': صحیح قول کے مطابق ہمزہ پر کسرہ ہے۔ایک نسخہ میں ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ''أن'' ہے۔اى لصدقه۔اس پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔

تعارض:

پہلے قول ''اِن'' کی صورت میں بعض حضرات نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں انہیں مطلقاً اہلِ جنت میں سے قرار دیا اور یہاں پر فلاح کو ان کی سچائی پر معلق فرمایا،حالانکہ مروی ہے کہ دونوں حدیثیں ایک ہی ہیں۔

دفع تعارض:

پہلا جواب: آپ ﷺ نے اعرابی کی موجودگی میں اس کی فلاح کو اس کی سچائی پر معلق فرمایا تاکہ وہ دھوکہ میں نہ پڑ جائے جو اس کے لئے مشکل ہوجائے۔پھر جب وہ چلا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: من سرّه الخ۔دوسرا جواب: بعض حضرات نے فرمایا کہ ممکن ہے آپ ﷺ نے تعلیقاً اس وقت فرمایا جب آپ کو اللہ تعالیٰ نے ان کی جنتی ہونا بتایا نہ تھا۔پھر جب آپ ﷺ کو مطلع کردیا تو آپ ﷺ نے بغیر تعلیق کے ان کے جنتی ہونے کی بشارت دی ہے۔

تیسرا جواب: یہ بھی ممکن ہے کہ یوں کہا جائے کہ آدمی کے جنتی ہونے سے اس کا مفلح ہونا لازم نہیں آتا اس لئے کہ مفلح وہ

ہے جو غضب و عذاب سے نجات پانے والا ہو۔ لہٰذا ہر مؤمن اہلِ جنت میں سے تو ہے لیکن ہر ایک فلاح پانے والا نہیں ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ﴾ [المومنون: ۱،۲] ''تحقیق وہ ایمان والے کامیاب ہوگئے جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں'' (الآیات) اور ارشاد فرمایا: (قرآن) متقین کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہے تیسری جگہ فرمایا: ﴿وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [البقرة: ۵] اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

تخریج: ابوداؤد و نسائی نے بھی اسے روایت کیا ہے۔

حدیثِ عبد القیس

۱۷: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ إِنَّ وَفْدَ عَبْدِالْقَيْسِ لَمَّا أَتَوُا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنِ الْقَوْمُ أَوْمَنِ الْوَفْدُ قَالُوْا رَبِيْعَةُ قَالَ مَرْحَبًا بِالْقَوْمِ أَوْ بِالْوَفْدِ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا نَدَامٰى قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّا لَا نَسْتَطِيْعُ أَنْ نَأْتِيَكَ إِلَّا فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ وَبَيْنَنَا وَبَيْنَكَ هٰذَا الْحَيُّ مِنْ كُفَّارِ مُضَرَ فَمُرْنَا بِأَمْرٍ فَصْلٍ نُخْبِرْ بِهِ مَنْ وَّرَآءَ نَا وَنَدْخُلْ بِهِ الْجَنَّةَ وَسَأَلُوْهُ عَنِ الْأَشْرِبَةِ فَأَمَرَهُمْ بِأَرْبَعٍ وَنَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ أَمَرَهُمْ بِالْإِيْمَانِ بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ قَالَ أَتَدْرُوْنَ مَا الْإِيْمَانُ بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ قَالُوْا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَعْلَمُ قَالَ شَهَادَةُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَإِقَامُ الصَّلٰوةِ وَإِيْتَاءُ الزَّكٰوةِ وَصِيَامُ رَمَضَانَ وَأَنْ تُعْطُوْا مِنَ الْمَغْنَمِ الْخُمُسَ وَنَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ عَنِ الْحَنْتَمِ وَالدُّبَّاءِ وَالنَّقِيْرِ وَالْمُزَفَّتِ وَقَالَ احْفَظُوْهُنَّ وَأَخْبِرُوْا بِهِنَّ مَنْ وَّرَاءَكُمْ. (متفق عليه للفظه للبخاری)

أخرجه البخاری ۱/۱۲۹ حديث ۵۳ ومسلم في صحيحه ۱/۴۷ حديث رقم (۲۴-۱۷)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب وفد عبدالقیس رسول اللہ ﷺ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوا۔ تو آپ ﷺ نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں یا یوں فرمایا کہ کس قبیلہ کے نمائندے ہیں۔ (گویا راوی کو تردد ہو گیا کہ آپ ﷺ نے یہاں قوم کا لفظ فرمایا یا وفد کا لفظ) ان لوگوں نے جواب دیا کہ ہم قبیلہ ربیعہ کے لوگ ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا خوش آمدید ہو اس قوم یا فرمایا اس وفد کو نہ دنیا میں تمہارے لئے رسوائی ہے اور نہ آخرت میں تمہارے لئے ندامت ہے۔ وفد والوں نے عرض کیا یا رسول اللہ۔ ہمارے اور آپ کے درمیان کفار مضر کا ایک جنگ جو قبیلہ ہے۔ اس لئے ہم آپ کی خدمت عالیہ میں جلدی جلدی حاضر نہیں ہو سکتے۔ صرف حرمت والے مہینوں میں آ سکتے ہیں۔ لہٰذا آپ ہمیں واضح اور فیصلہ کن احکام کی تعلیم دیدیں۔ جن پر ہم خود بھی عمل کریں اور واپس جا کر اپنی قوم کو بھی بتائیں اور ان پر عمل کر کے ہم جنت میں داخل ہو جائیں پھر ان لوگوں نے نبیذ والے برتنوں کے بارے میں دریافت کیا کہ کون سے برتن قابل استعمال ہیں اور کونسے برتن قابل استعمال نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو چار باتوں کا حکم دیا اور چار چیزوں سے منع کیا۔ ایک تو انہیں اللہ

کی وحدانیت پر ایمان لانے کا حکم دیا اس سے مراد یہ ہے کہ اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود۔ حاجت روا اور کارساز نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ دوم نماز پابندی سے ادا کرنا۔ سوم زکوۃ دینا۔ چہارم رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔ ان چار باتوں کے علاوہ آپ ﷺ نے ان لوگوں کو مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ ادا کرنے کا حکم دیا اور چار برتنوں کو استعمال کرنے سے منع کیا۔ ایک سبز مرتبان سے دوم کدو کے برتن سے سوم لکڑی کے برتن سے چہارم تارکول لگائے ہوئے گھڑے سے اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ان باتوں کو اچھی طرح یاد کرلو اور جن لوگوں کو اپنے پیچھے چھوڑ کر آئے ہو ان کو جا کر بتاؤ۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم کی ہے اور الفاظ بخاری کے ہیں۔

تشریح: قوله: ان وفد عبد القيس لما...... قالوا ربيعة:

عبد قیس ایک بڑے قبیلے کے سردار ہیں جو قبیلہ ربیعہ بن نزار بن معد بن عدنان پر منتہی ہوتا ہے اور ربیعہ مضر کے مقابلے میں بڑا قبیلہ ہے۔ عبد القیس کے قبیلے والے بحرین قطیف کے ارد گرد اور حجر سے قبیلہ مضر کے علاقوں تک پڑاؤ ڈالتے تھے اور ان کا وفد ۸ھ میں آیا۔ اس کا سبب یہ بنا کہ مضران کا ایک شخص منقذ ابن حبان مدینہ منورہ میں تجارت کے لیے آتا تھا ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کھڑے ہو گئے پھر آپ ﷺ نے اس کی قوم کے سرداروں کے نام لے کر ان کے بارے میں پوچھا تو منقذ بن حبان مسلمان ہو گئے اور انہوں نے سورہ فاتحہ اور اقراء باسم ربک سیکھی، پھر وہ حجر چلے گئے اور ان کے پاس نبی کریم ﷺ کا خط بھی تھا جسے انہوں نے کچھ دن چھپا کے رکھا ان کی بیوی نے نماز اور اس کے مقدمات (وضوء وغیرہ) کو اچنبھا جانا اور اس بات کا تذکرہ اپنے والد قبیلہ کے سردار منذر سے کیا پھر دونوں کی ملاقات ہوئی، تو منذر کے دِل میں بھی اسلام گھر کر گیا۔ پھر وہ خط لے کر اپنی قوم کے پاس گئے اور انہیں خط سنایا تو وہ بھی سب مسلمان ہو گئے اور سب نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضری کا عزم کیا، پھر ان میں سے چودہ حضرات آپ ﷺ کی طرف روانہ ہوئے جب وہ مدینہ منورہ کے قریب پہنچے تو نبی کریم ﷺ نے اپنی مجلس سے موجود حضرات سے فرمایا: تمہارے پاس عبد القیس کا وفد آ رہا ہے جو اہل مشرق میں سب سے بہتر ہے اور ان میں چہرے پر زخم کے نشان والا یعنی منذر بھی ہے آپ ﷺ نے اُسے اس نام سے اس لئے پکارا کہ اس کے چہرے میں زخم کا نشان تھا۔

ایک روایت یہ ہے کہ وہ چالیس افراد تھے دونوں روایتوں کو یوں جمع کر سکتے ہیں کہ وہ دو مرتبہ وفد کی صورت میں آپ ﷺ کے پاس آئے یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے چودہ سردار تھے۔

"قالوا: ربيعة": یہاں کچھ عبارت مقدر ہے۔ ایک نے کہا: ہم ربیعہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں یا قال بعض الصحابة: هم ربيعة ہم ربیعہ کا وفد ہیں۔ یا بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا: وہ ربیعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا وفد ربيعة۔ ربیعہ کا وفد ہے حذف مضاف کی تقدیر پر۔ ایک نسخہ میں ربیعہ نصب کے ساتھ ہے ای تسمى ربيعة یعنی اس قبیلہ کا نام ربیعہ رکھا گیا ہے۔ یسمون ربيعة لوگ انہیں ربیعہ کہتے ہیں۔

قوله: قال: مرحبا بالقوم، أو: بالوفد...... ولا ندامى:

مرحبا بالقوم: یہاں تقدیری عبارت میں کئی احتمال ہیں: ① اصاب الوفد حبا وسعة۔ ② اتى القوم موضعا

وسعا یعنی وفد کو کشادگی وفراخی حاصل ہو، یا قوم وسیع جگہ تشریف لائی۔ ''با'' فاعل میں زائدہ ہے اور ''مرحبا'' فعل مقدر کا مفعول بہ ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قوم کو وسیع جگہ لائے۔ اس صورت میں ''با'' تعدیہ کے لیے ہوگی اور مرحباً مفعول مطلق ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ مرحباً ان مفاعیل میں سے ہے جن کا عامل وجوباً مضمر ہونے کی بناء پر ان کو نصب دیتا ہے۔ اضمار عامل اس لئے ہوتا ہے کہ یہ لفظ بکثرت زبانوں پر جاری رہتا ہے۔

یوں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ (موحباً) ہر آنے والے خواہ وہ پیغام لے کر آیا ہو یا خیر کا طلبگار ہو یا ضرورت مند ہو کو مانوس کرنے اور اس کے غم وحیا کو زائل کرنے کے لئے آتا ہے۔ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے **صادفتم یا أصبتم** مقدر مانا ہے یہ تقدیر جو قوم کی موجودگی میں غیر ظاہر ہے۔

''**غیر خزایا**'': خاء کے فتحہ کے ساتھ **خزیان** کی جمع ہے، جو **خزی** سے مشتق ہے اور اس کا معنی ہے ذلت اور اہانت۔ یہ وفد سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور اس میں عامل وہ فعل ہے جو مرحباً میں مقدر ہے۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے ''**با لوفد الذین جاء وا غیر خزایا**'' اس وفد کو مرحبا جو اس حال میں آئے کہ وہ ذلیل وخوار نہیں ہے اور اس کو مجرور اس بناء پر پڑھنا کہ قوم سے بدل ہے درست ہے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں بھی عجیب بات کہی کہ ''ایک روایت میں یہ مکسور ہے صفت ہونے کی بناء پر'' اور یہ بات اس بناء پر عجیب وغریب ہے کہ محققین کے نزدیک غیر میں اتنی نکارت ہے کہ باوجود اضافت کے اگرچہ معرفہ کی طرف ہو وہ معرفہ نہیں بنتا۔

''**ولا ندامی**'': ندمان کی جمع ہے بمعنی **نادم** یا **نادم** کی خلاف قیاس جمع ہے کیونکہ قیاس کے مطابق نادمین آنی چاہیے۔ **خزایا** کے ساتھ جوڑ ملاتے ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ہمارے پاس آنے کی وجہ سے نقصان اٹھانے والے اور نامراد نہیں ہوئے اس لئے کہ انہوں نے اسلام قبول کرنے میں نہ تو تاخیر کی اور نہ انہیں قتال اور گرفتاری کا سامنا کرنا پڑا جو کہ شرمندگی یا رسوائی یا ذلت یا ندامت کا باعث ہے۔

قوله: قالوا یا رسول الله:.....من کفار مضر:

''**الحرام**'': اس سے مراد جنس ہے۔ اس لئے کہ اشہر حرم چار ہیں: ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم، یہ پے در پے ہیں اور رجب اکیلا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ﴾ [التوبة: ٣٦] ''یقیناً شمار مہینوں کا (جو کہ) کتاب الٰہی میں اللہ کے نزدیک (معتبر ہیں) بارہ مہینے (قمری) ہیں جس روز اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین پیدا کیے تھے (اسی روز سے اور) ان میں سے چار خاص مہینے ادب کے ہیں''۔

(ترجمہ از بیان القرآن مؤلفہ حکیم الامت)

اور یہ بات انہوں نے بطورِ عذر کے کہی کہ ہم اس وقت کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہیں آسکتے۔ کیونکہ اہلِ جاہلیت ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے البتہ اشہر حرم کی تعظیم کی وجہ سے اور بیت اللہ کے زائرین کی سہولت کے لئے ان مہینوں میں ان جنگوں اور قتل وغارت گری سے باز رہتے جو ان کے علاوہ دیگر مہینوں میں جاری رہتیں جن کی بناء پر سوائے اشہر حرم کے دیگر مہینوں میں راستے اور پڑاؤ کی جگہوں میں وہ ایک دوسرے سے محفوظ و مامون نہیں رہتے تھے۔ اسی لئے ان حضرات کے لئے

آپ ﷺ کی خدمت میں دیگر مہینوں کی بنسبت ان محترم مہینوں میں آنا ممکن ہوا کیونکہ ان کے اور مدینہ منورہ کے درمیان کفار مضر رہتے تھے جو ان کے لئے آنے میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ پھر اشہر حرم کی تعظیم ابتدائے اسلام میں تھی، بعد میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے منسوخ ہوگئی: ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ﴾ [التوبة : ٥] ''تو (اس وقت) ان مشرکوں کو جہاں چاہو مارو''۔

''وبيننا وبينك هذا الحي'': یہ جملہ نأتيك کی ضمیر فاعل سے حال ہے یا نہ آسکنے کی وجہ کا بیان ہے۔ ''الحی'' اصل میں قبیلہ کی منزل (رہائش گاہ) کو مجازاً کہتے ہیں اس لئے کہ ہر ایک دوسرے کی زندگی کا باعث وسبب بنتا ہے۔ یا بعض دوسرے افراد کو حیات بخشتے ہیں۔

''من كفار مضر'': مِن تبعیضیہ یا بیانیہ ہے اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ ''مضر'' اصح قول کے مطابق غیر منصرف ہے۔ مضر وہ ابن نزار بن معد بن عدنان ہے جو ابوعبدالقیس، ربیعہ کا بھائی ہے۔

قوله: فمرنا بامر فصل ...... وندخل به الجنة :

زیادہ ظاہر یہ ہے کہ امر کے معنی ایک کام کے ہیں اس کی جمع امور ہے باء صلہ کی ہے اور تنکیر تعظیم کے لیے ہے۔ اس سے مراد لفظ کے معنی اور اس کا مصداق ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ امر یہ أو امر کا واحد ہے۔ **اى لقول الطالب للفعل** یعنی ایسی بات جو فعل کا مطالبہ کرے اور تنکیر تقلیل کے لیے ہے اور ''با'' استعانت کے لیے ہے اور اس سے مراد لفظ ہے اور مامور بہ محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ہمیں حکم فرمائیں ہم آپ کے ارشاد ''أمنوا'' ایمان لاؤ تم یا ''قولوا امنّا'' (ہم ایمان لائے) کہو پر عمل پیرا ہوں گے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب بات کہی ہے کہ اسی بناء پر راوی نے فرمایا: ''امرهم بالايمان'' آپ ﷺ نے انہیں ایمان کا حکم فرمایا۔ اھ۔ اس لئے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُمر بمعنی شاْن (معاملہ وحالت) کے ہے۔ اگر ایسی ہی بات ہوتی جیسا کہ ابن حجرؒ نے فرمایا تو راوی یوں کہتے کہ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: آمنوا أو قولوا آمنا۔ ایمان لاؤ تم یا یوں فرماتے: تم یوں کہو کہ ہم ایمان لائے۔

''فصل'': بمعنی فاصل حق و باطل میں امتیاز کرنے والا یہ أمر کی صفت ہے یعنی امر قاطع (جدا کرنے والی بات) یا بمعنی مفصل ہے کہ تفصیل شدہ بات اس لئے آپ ﷺ نے ایمان کی تفصیل اس کے پانچوں ارکان کے ساتھ بیان فرمائی۔ یا بمعنی مفصول واضح بیان کردہ کہ اس کے ذریعہ مقصود غیر سے بالکل واضح ہو جائے۔ بعض حضرات نے بأمرِ فصل کو اضافت کے ساتھ (بأمرِ فصل) بھی نقل کیا ہے۔

''نخبر'': رفع کے ساتھ ہے یہ امر کی دوسری صفت ہے۔ یا یہ جملہ مستأنفہ ہے اور جزم کے ساتھ (نُخْبِرْ) جواب امر کے طور پر ہے۔ ''به'': بعض حضرات نے اس باء کو سببیہ فرمایا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ''ب'' تعدیہ کے لیے ہے۔

''من وراء نا'': میم اور ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ **اى من خلفنا من قومنا أو من بعدنا ممن يدركنا**۔ یعنی جو افراد ہماری قوم کے پیچھے رہ گئے ہیں۔ یا جو لوگ ہمارے بعد آئیں گے اور ہم سے ملیں گے۔

ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا: ایک دوسری روایت میں میم وہمزہ ہر دو مکسور ہیں۔ اھ۔ حالانکہ تصحیح شدہ نسخوں میں اس طرح موجود نہیں اور اس صورت میں مفعول مقدر ماننے کی ضرورت پڑے گی۔

"وندخل": اس کا عطف نخبر پر ہے جو کہ صیغہ معلوم ہے اور ضمیر فاعل ہے اور ایک نسخہ میں صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ **به أي بسبب قبول أمرك والعمل به أو الاخبار به المفهوم من نخبر**: آپ کے امر کو قبول کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے سبب یا اس خبر دینے کی وجہ سے جو نخبر سے سمجھ میں آتے ہیں۔ "**الجنة**": یعنی کامیاب ہونے والوں کے ساتھ۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نجات پانے والوں کے ساتھ۔ اھ۔ اس قول میں بہت بحث ہو سکتی ہے جو مخفی نہیں۔ یوں تو جنت میں داخلہ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہوگا البتہ نیک عمل اس کا سبب ہے جیسا کہ کھانا شکم سیری کا سبب ہے اور حقیقت میں شکم سیر کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے جو اپنے فضل وکرم سے سیر فرماتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ پر یہ لازم نہیں ہے۔ یا مضاف مقدر ہے یعنی درجاتِ جنت، اس لئے کہ درجات جنت وہ بمقابلہ اعمال ہیں اور جنت میں داخل ہونا محض فضل الٰہی سے ہوگا۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں جو فرمایا کہ اس عمل کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے یہ ایسا ہی ہے جیسا یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ [الزخرف:۷۲]

اور یہ اس حدیث کے منافی نہیں ہے: **لن يدخل الجنة احد منكم بعمله** "تم میں سے کوئی جنت میں اپنے عمل کی وجہ سے ہرگز داخل نہ ہوگا"۔ اس لئے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عمل دخولِ جنت کا سبب مستقل نہیں ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت فرمایا: یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے عمل سے جنت میں داخل نہ ہونگے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں بھی اپنے عمل سے جنت میں داخل نہ ہونگا، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت مجھے اپنی آغوش میں لے لے۔

ذکر کردہ توجیہہ بہتر ہے اس جواب سے کہ اس آیتِ کریمہ میں "باء" ملابست کے لئے ہے ای **أو رثتموها ملابسة لأعمالكم أي لثوابها** یعنی تم اپنے اعمال یعنی ان کے ثواب کی بناء پر جنت میں داخل ہوگے۔ یا مقابلہ کے لئے ہے جیسے اس مثال میں ہے **بعته بدرهم**۔ یا یہ کہ جنت سے اعلیٰ درجہ کی جنت مراد ہے یا یوں کہنا کہ دخولِ جنت تو فضلِ باری سے ہوگا اور درجات کی بلندی اعمال کی بناء پر ہوگی۔

علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا: دخولِ جنت عمل کی باعث ہوگا اور عمل کے توفیق کا مل جانا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہے تو مطلب یہی ہوا کہ دخولِ جنت صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت کے صدقہ میں ہوگا۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ پہلی بات یعنی دخولِ جنت عمل کے سبب ہوگا' صریح حدیث کے خلاف ہے۔ جس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عمل کو دخولِ جنت کا سبب مستقل سمجھنا قطع نظر اس بات کہ یہ عمل اللہ کی رحمت ہے۔ کیونکہ اس حدیث سے مقصود اس شخص کے نظریہ کی تردید ہے جو اپنے عمل کو دخولِ جنت کا کفیل سمجھتا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نتیجہ نہیں جانتا۔ اھ۔

محقق بات یہ ہے کہ اس حدیث سے مقصود یہ بتانا ہے کہ عدل کی رُو سے اعمال دخولِ جنت کا سبب نہیں ہیں، اور فضل باری شاملِ حال ہو تو پھر وہ جنت میں داخلہ کا باعث ہیں اور جو ان دونوں باتوں میں بظاہر منافات ہے وہ اس فصل قبول کرتا ہے)۔

قوله: وسالوه عن الأشربة:

"شراب" کی جمع ہے ہر وہ چیز جو پی جا سکتی ہو اسے شراب کہتے ہیں۔ یعنی انہوں نے شراب کے برتنوں کا حکم پوچھا' اس صورت میں مضاف محذوف ماننا پڑے گا۔ ای عن حکم ظروف الأشربة۔ یا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ان شرابوں کی بابت سوال کیا جو مختلف قسم کے برتنوں میں تھیں' اس صورت میں صفت محذوف ہوگا۔ ای عن الاشربة لتی تکون فی الدوانی المختلفة' یعنی انہوں نے ان کا حکم پوچھا۔

قوله: فأمرهم بأربع، ونهاهم باربع:

آپ ﷺ نے انہیں چار باتوں کا حکم اس وجہ سے دیا کہ یہ باتیں زیادہ لائق دریافت اور تحصیل کمال کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ **قوله: أمرهم بالايمان بالله وحده ......وان محمدا رسول الله:**

"وحدہٗ": بمعنی 'واحد' حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی وہ ذات میں اکیلا ہے، صفات میں یکتا ہے افعال میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ یہ ایمان کا حکم بطور تمہید کے ہے اس لئے کہ امر و نہی یہ احکامات کی فروع میں سے ہیں جو کہ ایمان پر موقوف ہیں' اس لئے کہ ایمان احکام کی صحت کے لیے شرط اور ان کے ثبوت کا مبدا ہے۔

آپ ﷺ نے ان سے یہ بات اس لئے دریافت فرمائی تا کہ وہ اپنے اذہان کو مکمل فارغ کر خوب اہتمام سے بات سنیں تا کہ وہ ان کے دلوں میں راسخ ہو جائے۔

"قالوا: الله ورسوله أعلم" انہوں نے آدب کے طور پر اور آپ ﷺ کی زبانِ اطہر سے سننے کے شوق میں یہ جواب دیا اس لئے کہ وہ پہلے سے ایمان لا چکے تھے۔ لہٰذا ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ کہنا کوئی مطلب نہیں رکھتا کہ 'اللہ ورسولہ اعلم اسی معنی میں ہے جو: ﴿اللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسٰلَتَهٗ﴾ [الانعام: ۱۲۴] میں ہے"۔ آگے چل کر ابن حجر رحمہ اللہ نے اور عجیب بات کہی کہ 'اس حدیث سے ان لوگوں کی تردید بھی اخذ کر سکتے ہیں جو فقہاء کرام کے فتاوی و علمی ابحاث کے ذکر کے بعد 'والله اعلم" کہنے پر اعتراض کرتے ہیں' نیز ان کی بھی تردید ہوتی ہے جو تفصیل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جواب دینے والے کو عقائد سے متعلق جواب دینے کے 'بعد وبالله التوفيق" اور فروعی احکام کے بعد "والله اعلم" کہنا چاہیے۔ اھ۔ کیونکہ اسکا جو معنی بیان کیا اور جو اس کی وجہ سے اعتراض کیا دونوں میں تناقض ہے۔

بعض حضرات نے کہا کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ پر کونسا ایمان ہے جو اسلام کے معنی میں ہے؟ اس لئے کہ ایمان واسلام کا اطلاق ایک دوسرے پر ہوتا رہتا ہے۔ اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے بعض احادیث میں اسلام کی وہ تشریح فرمائی جو اس حدیث میں آپ نے ایمان کی فرمائی۔ یہ ابن حجر رحمہ اللہ کا قول ہے اور یہ اچھی تاویل ہوتی اگر اس حدیث میں ایمان کے ساتھ باللہ وحدہٗ کی قید نہ ہوتی۔

"شهادة ان لا الٰه الا الله وأن محمدًا رسول الله": یہاں شهادة پر رفع متعین ہے دیگر کوئی احتمال نہیں اس بناء کہ شہادۃ مبتداء محذوف "هو" کی خبر ہے۔

قوله: واقام الصلٰوة وايتاء الزكوٰة وصيام رمضان۔

تینوں کو مجرور پڑھا جائیگا اور یہی زیادہ ظاہر بات ہے یا تینوں کو مرفوع پڑھا جائے جیسا کہ اس کا بیان آئے گا۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ ﷺ نے حج کا تذکرہ اس لئے نہیں فرمایا کہ وفد عبدالقیس عام الفتح میں آیا جبکہ حج کی فرضیت اس سے چند ماہ بعد ۹ھ میں نازل ہوئی۔

قولہ: وان تعطوا من لمغنم الخمس : "للغنم": میم اور نون مفتوح ہیں بمعنی غنیمت۔

"**الخمس**": میم پر ضمہ بھی درست ہے اور اسے ساکن پڑھنا بھی صحیح ہے۔

ابن صلاح فرماتے ہیں "**وان تعطوا**" کا عطف **بأربع** پر ہے۔ اس صورت میں خمس کی ادائیگی مذکورہ چار امور میں سے ایک نہ ہوگی اگرچہ مطلق ایمان کے شعبوں میں سے یہ بھی ایک ہے۔ اھ۔ اس صورت میں یہ زائد افادہ کی قبیل سے ہوگا۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث پر دو اشکال وارد ہوتے ہیں: ایک یہ کہ مامور بہ ایک ہی ہے (ایمان) اور دیگر ارکان اسی ایمان کی تفسیر ہیں جیسا کہ آپ ﷺ کے ارشاد "**أتدرون ما الایمان**" کیا تم جانتے ہو کہ ایمان کیا ہے؟ سے معلوم ہوتا ہے (حالانکہ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں چار چیزوں کا حکم فرمایا)۔

دوسرا اشکال یہ ہوتا ہے ارکان مذکورہ پانچ ہیں حالانکہ راوی نے شروع حدیث میں چار ارشاد فرمائے۔

پہلے اشکال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ راوی نے اس کے اجزاء مفصلہ کو دیکھتے ہوئے ایمان کو چار قرار دیا۔

اور دوسرے کا جواب یہ دیا گیا کہ بلیغ لوگوں کی عادت ہے کہ جب کلام ایک خاص مقصد کے لیے کہا جائے تو اس سے وہی غرض مقصود ہوتی ہے اور اس کے علاوہ مقصود نہیں ہوتا تو یہاں پر بھی شہادتین کا ذکر مقصود نہیں ہے کیونکہ وہ حضرات پہلے ہی سے شہادتین کا اقرار کر کے ایمان لا چکے تھے، جس کی دلیل ان کا یہ قول ہے: **اللہ ورسولہ اعلم**۔ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ اھ۔

اور اس پر بخاری کی یہ روایت دلالت کرتی ہے **أمرھم بأربع، ونھاھم عن أربع، أقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وصوموا رمضان** ...... آپ ﷺ نے انہیں چار باتوں کا حکم دیا اور چار سے روکا ہے: "تم نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، رمضان کے روزے رکھو، اور جو تمہیں مال غنیمت ملے اس میں سے خمس اداء کرو اور کدو، سبز رنگ کے مٹکے، کریدی ہوئی لکڑی اور تارکول ملے برتن میں مت پیو"۔ اھ

اس روایت کی رو سے تمام اشکالات ختم ہو جاتے ہیں اور یہی روایت تاویلات کا مرجع بھی بنتی ہے لیکن میں وہ بات نہیں کہتا جو علامہ طیبیؒ نے کہی ہے کہ شہادتین کا ذکر مقصود نہیں ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ وہی بالذات مقصود ہے اور ذکر کردہ امور اسی (ایمان) کے بڑے بڑے شعبے اور عظیم الشان ارکان ہیں اور طیبی رحمہ اللہ کے کلام کا محمل یہ ہے کہ وہ چار باتوں میں مقصود نہیں بلکہ ایمان کا تذکرہ چار اور اس کے ذیل میں ذکر کردہ چیزوں کے درمیان جملہ معترضہ کے طور پر ہے۔

سید جمال الدینؒ نے فرمایا کہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ حدیث اشکال سے خالی نہیں اس لئے کہ اگر **اقام الصلوٰۃ** کا **شہادۃ** پر عطف کر کے مرفوع پڑھا جائے تا کہ ان دونوں کا مجموعہ ایمان قرار پائے تو باقی تین چیزیں (زکوٰۃ کی ادائیگی الخ) کیا ہونگیں؟ اور اگر انہیں **اقام الصلوٰۃ** کو بالایمان پر عطف کر کے مجرور پڑھا جائے تو مذکورہ باتیں پانچ ہو جائیں گی نہ کہ چار۔ پہلی صورت کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ باقی تین باتوں کو راوی نے اختصار کے طور پر یا بھول کر حذف کر دیا ہے اور دوسری صورت کی

وجہ سے یہ جواب دیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے انہیں چار باتوں کو شمار فرمایا جن کا ان سے وعدہ فرمایا تھا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پانچویں بات اداءِ خمس کا حکم اس لئے فرمایا کہ وہ کفار مضر کے پاس رہتے تھے اور وہ اہلِ جہاد وغنائم میں سے تھے۔ اھ۔

زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ جَر کو اختیار کیا جائے اور عطف کی بناء پر چاروں مجرورات وہی مامورات ہیں اور ایمان کا ذکر اس کی شرافت وفضیلت اور اس کے اساس وبنیاد ہونے کی وجہ سے ہوا خواہ وہ حضرات ایمان دار تھے یا مرتدین اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد: **امرهم بالايمان** سے شہادتین کے آخر تک جملہ معترضہ کی مانند ہے اور تقدیر عبارت یوں ہوگی **امرهم بالايمان أيضاً** انہیں ایمان کا بھی حکم فرمایا اس وجہ سے کہ اہلِ سنت کا اتفاق ہے کہ اُرکان (نماز وغیرہ) ایمان کے اجزاء نہیں اور بخاری کی سابقہ روایت کی بناء پر بھی یہی مطلب ہے۔

قوله: ونهاهم عن أربع عن الحنتم......:

چار باتوں سے انہیں روکا یعنی چار برتنوں میں نبیذ بنانے اور ان سے لیکر پینے سے منع فرمایا۔

"**عن الحنتم**": جار کے اعادہ کے ساتھ بدل ہے۔ "حنتم" حاء مفتوح کے ساتھ مطلقاً گھڑے کو کہتے ہیں یا سبز سُرخ رنگ کے گھڑے جن گردنیں ان کی اطراف میں ہوتی تھیں، اور مضر سے ان میں شراب لایا جاتا تھا، یا ان کے منہ ان کے پہلوؤں میں ہوتے تھے ان میں طائف سے شراب لایا جاتا تھا۔ یا ایسے مٹکے جو مٹی، چمڑے اور بالوں سے بنائے جاتے تھے۔ یہ سب صحابہ کرام اور دیگر حضرات کے اقوال ہیں اور ممکن ہے وہ لوگ ان تمام قسم کے گڑھوں میں نبیذ بنایا کرتے ہوں۔

"**والدبّاء**": دال کے ضمہ اور "باء" کی تشدید کے ساتھ، "مد" بھی کی جاتی ہے اور بغیر مد کے قصر بھی کر سکتے ہیں۔ خشک کدو سے بنایا ہوا برتن۔

"**النقير**": نون کے فتحہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ ایسی جڑ کو کہتے ہیں جسے درمیان سے کرید کر اس میں نبیذ بنایا جاتا ہو۔

"**المزفّت**": "فا" مفتوحہ پر تشدید کے ساتھ۔ ایسا برتن جسے تارکول ملا گیا ہو۔ اسے قلر اور قیر بھی کہتے ہیں۔

کبھی ابن عباس رضی اللہ عنہ مزفت کی بجائے قیر فرماتے ہیں، اور نہی سے مطلقاً ان کا استعمال مراد نہیں بلکہ ان برتنوں میں نبیذ بنا کر اس میں سے حد سکر تک پینا ممنوع ہے' اور خصوصیت کے ساتھ جو حکم ان برتنوں کے بارے میں دیا گیا اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ وہ لوگ ان کو نشہ آور شرابوں ہی میں استعمال کے عادی تھے یا یہ ایسے برتن تھے جن میں بنایا جانے والا نبیذ جلدی گاڑھا ہو جاتا کیونکہ یہ برتن موٹے ہوتے ہیں نہ تو ان سے پانی ٹپکتا نہ ہی ان میں ہوا داخل ہو سکتی تھی۔ تو امکان تھا کہ ان میں تھوڑے سے وقت میں نبیذ شراب میں بدل جائیگا پھر اس کا مالک غفلت سے اسے پی لے گا بخلاف دیگر برتنوں کے کہ ان میں بہت مدت بعد نبیذ میں تغیر واقع ہوتا ہے اور اس کی دلیل وہ روایت ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "**نهيتكم عن النبيذ الا في اسقاء فاشربوا في الأسقية كلها ولاتشربوا مسكرا** میں نے تمہیں عام برتنوں کے علاوہ میں نبیذ بنانے سے منع کر دیا ہے لہٰذا عام سب برتنوں میں نبیذ بنا کر پی سکتے ہو البتہ نشہ آور نبیذ مت پیو۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ برتن صرف شراب کے لیے استعمال ہوتے تھے چنانچہ جب شراب کو حرام قرار دیا گیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان برتنوں کے استعمال کو بھی اس لئے حرام قرار دیدیا کہ ان کے استعمال میں شراب پینے سے مشابہت ہوتی تھی یا

اس بناء پر کہ ان برتنوں میں ابھی شراب کے اثرات باقی تھے، پھر جب کچھ مدت گزر جانے پر شراب کے اثرات زائل ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے استعمال کو جائز قرار دیا۔ نیز یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب کوئی چیز حرام قرار دی جاتی ہے تو شروع شروع میں اس میں خوب مبالغہ وسختی کی جاتی ہے تاکہ لوگ اسے بالکل چھوڑ دیں پھر جب لوگ اس کو چھوڑ دیں اور یہ بات راسخ ہو جائے تو سختی ختم ہو جاتی ہے چونکہ مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ اسے اچھی طرح اپنے ذہن نشین کر لیجئے۔

امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ اس بات کے قائل ہیں کہ ان برتنوں میں نبیذ بنانے کی حرمت اب بھی باقی ہے منسوخ نہیں ہوئی، اس لئے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ان میں نبیذ بنانے سے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب میں اسی حدیث کو ذکر فرمایا۔ اگر یہ حکم منسوخ ہو چکا ہوتا تو آپ اس حدیث کو پیش نہ فرماتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو شاید نسخ کا علم نہیں ہوا لہذا ان کا اس روایت کو جواب میں پیش کرنا ان حضرات کے خلاف حجت نہیں بن سکتا جنہیں اس کے نسخ کا علم ہو گیا تھا۔

احفظ وهن وأخرو بهن من ورائكم: قوم کے ان لوگوں کو جو پیچھے رہ گئے ہیں تاکہ تم خود سیکھنے والے اور دوسروں کو سکھانے والے کامل اور مکمل بن جاؤ۔ بعض نسخوں میں **من وراء کم** میم کے کسرہ اور مابعد کے جر کے ساتھ یہ روایت آتی ہے۔ لیکن یہ غیر ظاہر ہے کیونکہ اس صورت میں مفعول مقدر ماننا پڑتا ہے۔

تخریج: ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے کی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ حدیث کے یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔ مسلم کی حدیث اس کے ہم معنی ہے اس طرح یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

بیعتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

۱۸ : وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَحَوْلَهٗ عِصَابَةٌ مِّنْ اَصْحَابِهٖ بَايِعُوْنِيْ عَلٰى اَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا وَلَا تَسْرِقُوْا وَلَا تَزْنُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ وَلَا تَاْتُوْا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْصُوْا فِيْ مَعْرُوْفٍ فَمَنْ وَفٰى مِنْكُمْ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوْقِبَ بِهٖ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ فَهُوَ اِلَى اللّٰهِ اِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَاِنْ شَاءَ عَاقَبَهٗ فَبَايَعْنَاهُ عَلٰى ذٰلِكَ. (متفق علیہ)

أخرجه البخاري ٦٤/١ حديث رقم ١٨۔ ومسلم ١٣٣٣/٣ حديث (٤١) والترمذي ٣٦/٤ حديث ١٤٣٩ والنسائي ١٦٠/٧ حديث ٤٢٠٥۔ وأحمد في المسند ٣١٤/٥۔

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین مجلس صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے ارشاد فرمایا۔ کہ مجھ سے ان باتوں پر بیعت یعنی مضبوط وعدہ اور اقرار کر لو۔ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرو گے۔ چوری نہیں کرو گے۔ زنا نہیں کرو گے۔ فقر اور غربت کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گے۔ جان بوجھ کر کسی پر الزام تراشی اور بہتان نہیں لگاؤ گے اور مذہب اسلام کے مطابق میں تمہیں جو حکم دوں گا اس کی

نافرمانی نہیں کرو گے۔ لہٰذا تم میں سے جو شخص اس عہد واقرار کو پورا کرے گا۔ اس کا ثواب اور اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اور جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہو جائے اور پھر دنیا میں اس کو اس گناہ کی سزا مل جائے۔ تو یہ سزا اس کے لئے کفارہ ہو جائے گی اور اگر اللہ تعالیٰ کسی گناہ کرنیوالے کی پردہ پوشی کر دے۔ اس ستر پوشی کی وجہ سے دنیا میں اس کو سزا نہ ملی۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ چاہے تو اپنے فضل وکرم سے آخرت میں بھی مغفرت کر دے اور اگر چاہے تو عذاب دے۔ پس ہم نے ان سب امور پر آپ سے بیعت کر لی۔ (متفق علیہ)

راوی حدیث:

عبادۃ بن الصامت۔ یہ عبادہ بن الصامت ہیں۔ ''عبادہ'' عین کے پیش اور باء غیر مشدد کے ساتھ ہے۔ ان کی کنیت ''ابو الولید'' ہے۔ انصاری سالمی ہیں۔ یہ نقیبوں میں سے تھے۔ عقبہ اولیٰ عقبہ ثانیہ ثالثہ میں شریک ہوئے۔ بدر اور تمام غزوات میں بھی شریک رہے ہیں۔ ان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام میں قاضی اور معلم بنا کر بھیج دیا اور ان کا مستقر ''حمص'' کو بنایا تھا۔ اس کے بعد یہ ''فلسطین'' تشریف لے گئے اور وہیں مقام رملہ اور بقول بعض بیت المقدس میں ۳۴ھ میں جب کہ ان کی عمر بہتر (۷۲) سال کی تھی وفات پائی ان سے صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

تشریح: **قولہ: قال: قال رسول اللہ ﷺ وحولہ عصابۃ من اصحابہ:**

''عصابہ'': عین کے کسرہ کے ساتھ اسم جمع ہے ''عصبہ'' کی مانند۔ دس سے چالیس کے درمیان افراد کو کہتے ہیں۔ عصب سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں مضبوط کرنا۔ گویا ان میں سے بعض افراد دوسرے بعض کو مضبوط کرتے ہیں یا یہ عصب (بمعنی پٹی) سے ماخوذ ہے اس لئے کہ وہ اعضاء کو مضبوط کرتی ہے۔

''حول'': ظرف ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور عصابۃ کی خبر ہے۔ ''وحولہ عصابۃ من اصحابہ''۔ ''من أصحابہ'': عصابۃ کی صفت ہے۔

قولہ: بایعونی علی ان لا تشرکوا باللہ شیئاً:

یعنی مجھ سے عقد ومعاہدہ کرلو۔

طاعت کے مقابلہ جو ثواب ملتا ہے اسے اس بیع کے عقد سے تشبیہ دی جس میں مال کے مقابلہ میں مال ہوتا ہے۔

باب مفاعلہ (جس کی خاصیت جانبین سے اشتراک ہے) کے استعمال کی وجہ یہ ہے کہ بیعت کرنے اور بیعت لینے والوں میں سے ہر ایک گویا جو کچھ اس کے پاس ہے وہ دوسرے کو بیچ دیتا ہے اور اسے خالصتاً اپنی تابعداری کا یقین دلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ ......﴾ [التوبۃ: ۱۱۱]

''شیئاً'': مفعول بہ یا مفعول مطلق ہے۔ بعض کہ بالکل شرک نہ کرنے سے مراد ریاء کاری سے بچنا ہے۔

قولہ: ولا تسرقوا...... ولا تعصوا فی معروف:

سرقہ کہتے ہیں دوسرے کے محفوظ مال کو چھپا کر لے لینا۔

''ولا تقتلوا أولادکم'': انہیں زندہ دفن کرنے کے ذریعے۔ لڑکوں کو تو بھوک واحتیاج کے ڈر سے اور لڑکیوں کو عار

وعیب لاحق ہونے کے ڈر سے۔

ولا تأتوا ببهتان تفترونه بين ايدكم وارجلكم:

"بھتان": باء تعدیہ کے لیے ہے اور بہتان ایسے جھوٹ کو کہتے ہیں جو سننے والے کو حیرت زدہ کردے۔ مراد الزام تراشی ہے۔

تفترونه: بہتان کی صفت ہے۔

"بين ايدكم وارجلكم"

① اس سے مراد ذات ہے۔ ذات کو ہاتھ پاؤں سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ بڑے بڑے افعال ہاتھ پاؤں سے ہی انجام دیے جاتے ہیں۔

② بعض حضرات نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے آمنے سامنے روبرو ہو کر ان پر بہتان نہ باندھو تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ایک دوسرے سے جھگڑنے نہ لگو جیسے یوں کہا جائے **فعلت هذا بين يديك** میں نے آپ کے سامنے ایسا کیا' یہ بہتان کی سخت ترین صورت ہوتی ہے۔

③ یا یہ مطلب ہے کہ تم بدگمانی اور باطنی کھوٹی۔ جو تمہارے سینوں اور دلوں میں ہے جو تمہارے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان ہیں کی بناء پر کسی کی طرف غلط منسوب نہ کرو۔

④ یا مطلب یہ ہے کہ تم اس اولاد کو جو ان لوگوں کی صلب سے نہ ہو ان کی طرف منسوب نہ کرو۔ چنانچہ دورِ جاہلیت میں کوئی عورت کسی گرے پڑے لڑکے کو اٹھا کر اپنے خاوند سے کہتی کہ یہ میرا بیٹا تجھ سے ہے۔ اس فعل کو بہتان تراشنے سے تعبیر کیا جسے وہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے سامنے گھڑ لیتی اس لڑکے سے متعلق جسے وہ جھوٹ کے طور پر اپنے خاوند سے منسوب کرتی' اس لئے کہ اس عورت کا پیٹ جسے وہ اس کا حمل قرار دیتی ہے اس کے سامنے ہے اور جس فرج سے وہ اسے جنتی اس کی ٹانگوں کے درمیان ہے۔

"**ولا تعصوا**": یہ صاد کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ تعمیم بعد از تخصیص ہے۔

"**معروف**": وہ ہے جس کا حسن و قبح شریعت میں معروف ہو۔

قوله: فمن وفى منكم فأجره على الله:

"**وفى**" تخفیف و تشدید ہر دو کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لفظ "وفی" اس بات پر دلالت کرتا ہے اجر احکام کی مکمل طور پر بجا آوری سے حاصل ہوگا' اس لئے کہ وفا کہتے ہیں تمام عہدوں اور حقوق کی بجا آوری کرنا اور سزا کسی ایک کو بھی چھوڑنے سے ہو سکتی ہے۔ اھ۔

اس پر یہ اشکال ہوتا ہے اگر اجر سے مراد اجر کامل ہے تو پھر ذکر کردہ بات صحیح ہے' اور اگر اجر کامل مراد نہیں تو پھر کسی طاعت کی بجا آوری اور کسی معصیت سے اجتناب کا اجر و ثواب دوسرے عمل پر موقوف نہیں اور اس پر مذہب صحیح دلالت کرتا ہے کہ بعض گناہوں سے توبہ درست ہے۔ خوارج کا اس میں اختلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ توبہ کے لئے تمام گناہوں سے بچنا لازم ہے۔

قوله:ومن أصاب من ذٰلك شيئاً فعوقب في الدنيا فهو كفارة له:
یعنی مذکورہ امور میں سے کسی کا مرتکب ہوا۔اور پھر اس کی وجہ سے ایک نسخہ صحیح میں بہ کا لفظ بھی ہے)اس پر حد جاری ہوئی۔
"هو" کا مرجع حد وعقاب ہے۔

كفارة له: ایک نسخہ میں اس کے بعد و طھور کا اضافہ بھی ہے طاء کے فتحہ کے ساتھ۔

"فعوقب في الدنيا": یعنی اس کے گناہ کے لئے کفارہ بن جائے گا اور آخرت میں اسے سزا نہ ملے گی اور یہ بات شرک کے علاوہ گناہوں کے ساتھ خاص ہے۔

اس حدیث سے علماء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ حدود کفارات ہے۔

اور حدیث **"لا ادری الحدود کفارات ام لا"** مجھے معلوم نہیں کہ حدود کفارات ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب محدثین علماء کرام نے یہ دیا کہ وہ حدیث اس حدیث سے پہلے کی ہے اس بناء پر کہ اس میں علم کی نفی ہے اور اس میں اثباتِ علم ہے، مطلب یہ ہے کہ آخرت میں اسے اس گناہ پر سزا نہ دی جائیگی' بلکہ اگر توبہ نہ کی اور توبہ کرنے سے پہلے ہی مر گیا تو اس سے توبہ نہ کرنے پر سزا ہوگی' کیونکہ توبہ نہ کرنا ایک علیحدہ گناہ ہے' اور جس گناہ کے پر عتاب ہو چکا وہ علیحدہ ہے بوجہ ارشادِ باری تعالیٰ کے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ [الحجرات:۱۱] ممکن ہے اس اختلاف کو لفظی قرار دیا جائے۔واللہ اعلم

قوله:ومن اصاب من ذلك شيئاً ثم ستره الله عليه ......وان شاء عاقبه:
"من ذلك""ثم استره الله عليه": ملاعلی قاری کے نسخہ میں لفظ **"عليه"** موجود نہیں ہے۔چنانچہ وہ فرماتے ہیں ایک نسخہ میں **"عليه"** بھی ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس گناہ کے مرتکب کی پردہ پوشی فرمائے کہ بایں طور کہ اس پر حد جاری نہ ہو۔

"فهو الى الله": هو ضمیر کا مرجع گناہ مستور ہے۔(حاء مجرور کا تعلق محذوف ہے)**اى فامر المستدروحكمه من العفووالعقاب مفرض اليه** جس کے گناہ پر پردہ ڈالا گیا ہے اس کی معافی وسزا کا معاملہ وحکم اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔چنانچہ صحیح مذہب کی رُو سے اللہ تعالیٰ پر گناہگار کو سزا دینا لازم نہیں جیسا کہ اس پر فرمانبردار کو بہتر بدلہ دینا واجب نہیں۔

"ان شاء عفا عنه الخ" اللہ تعالیٰ کی سبقت رحمت کی بناء پر آپ ﷺ نے اس کی معافی کو پہلے ذکر فرمایا۔

"وان شاء عاقبه": اس میں معتزلہ پر ردّ ہے۔

"فبايعناه على ذلك": فائدہ: اسے بیعت نساء کہتے ہیں جیسا کہ سورہ ممتحنہ میں ہے۔اس لئے کہا گیا ہے **عليكم بدين العجائز** کہ تم پر بوڑھی عورتوں کا دین لازم ہے۔

حضور ﷺ کی خواتین کو نصائح

۱۹:وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِیْ اَضْحٰى اَوْ فِطْرٍ اِلَى الْمُصَلّٰى فَمَرَّ عَلَى النِّسَاءِ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ فَاِنِّیْ اُرِيْتُكُنَّ اَكْثَرَ اَهْلِ النَّارِ فَقُلْنَ وَبِمَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ مَا رَاَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِيْنٍ اَذْهَبَ لِلُبِّ

الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ اِحْدَا كُنَّ قُلْنَ وَمَا نُقْصَانُ دِيْنِنَا وَعَقْلِنَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَلَيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ مِثْلَ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ قُلْنَ بَلٰى قَالَ فَذٰلِكَ مِنْ نُقْصَانِ عَقْلِهَا قَالَ اَلَيْسَ اِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ قُلْنَ بَلٰى قَالَ فَذٰلِكَ مِنْ نُقْصَانِ دِيْنِهَا. (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۴۰۵/۱ حديث رقم ۳۰۴ ومسلم ۸۶/۱ حديث (۷۹.۱۳۲) والترمذي عن أبي هريرة ۱۱/۵ حديث رقم ۲۶۱۳ وابن ماجة عن ابن عمر ۱۳۲۶/۲ حديث ۴۰۰۳

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ عید الاضحیٰ یا عید الفطر کی نماز کیلئے عید گاہ کی طرف تشریف لائے۔ تو آپ ﷺ عورتوں کی ایک جماعت کے پاس گئے جو کہ نماز کے لئے الگ ایک کونہ میں جمع تھیں۔ ان عورتوں کو خطاب کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ کہ اے خواتین کی جماعت تم صدقہ اور خیرات کرو کیونکہ میں نے تم میں سے اکثر کو جہنم میں دیکھا ہے۔ یہ بات سن کر عورتوں نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول اس کا سبب کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم لعن وطعن بہت کرتی ہو اور اپنے خاوندوں کی نافرمانی اور ناشکری کرتی رہتی ہو اور میں نے باوجود عقل اور دین کی کمزوری کے محتاط اور ہوشیار آدمی کو بیوقوف بنانے میں تم سے بڑھ کر اور کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ بات سن کر ان عورتوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ہماری عقل اور دین میں کیا نقصان ہے؟۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا ایک خاتون کی شہادت مرد کی نصف گواہی کے برابر نہیں؟ انہوں نے عرض کیا جی ہاں ایسا ہی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اس کی عقل کی کمزوری ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا ایسا نہیں ہے کہ جس وقت عورت حیض کی حالت میں ہوتی ہے۔ تو اس دوران نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ ہی روزہ رکھتی ہے۔ انہوں نے عرض کیا جی ہاں ایسا ہی ہے آپ ﷺ نے فرمایا یہ اس کے دین کی کمی اور کمزوری ہے (متفق علیہ)

راویٔ حدیث:

ابوسعید خدری۔ ان کا اسم گرامی سعید سعد بن مالک تھا۔ انصاری وخدری ہیں اپنی کنیت ہی کے ساتھ مشہور ہیں۔ حافظ حدیث اور صاحب فضل وعقل علماء میں سے تھے۔ احادیث بہت زیادہ روایت کرتے ہیں' صحابہ ﷡ اور تابعین ﷫ کی ایک بڑی جماعت ان سے روایت کرتی ہیں ۶۴ھ میں انتقال کیا اور جنت البقیع میں سپرد خاک کیے گئے ۸۴ برس کی عمر پائی۔ خدر ''خاء'' معجمہ اور ''دال'' مہملہ کے سکون کے ساتھ ہے۔ انصار کے ایک قبیلہ کا نام ہے۔

تشریح: قوله: قال: خرج رسول الله ﷺ في أضحى

''في أضحى'': یہاں مضاف محذوف ہے۔ ای فی عید اضحی۔ ہمزہ کے فتحہ اور تنوین کے ساتھ ہے۔ أو فطر الی المصلی: اس کا واحد اضحیۃ ہے' اس میں ایک لغت اضحاۃ بھی ہے بلکہ قربانی کی عید (عید النحر) کو عام طور پر اَضحیٰ کہا جاتا ہے اس صورت میں مضاف کو مقدر ماننے کی ضرورت ہی نہیں۔ جیسے فطر کا اطلاق غالباً عید الفطر پر ہوتا ہے۔ بعض نسخوں میں اَضحیٰ پر تنوین کو ترک کیا گیا ہے۔

عید قربانی کو "أضحی" کا نام اس لئے دیا گیا کہ عموماً قربانی ضحیٰ (چاشت) کے وقت جب سورج صبح بلند ہو جاتا ہے، کی جاتی ہے۔

قوله: فمرّ علی النساء فقال: یا معشر النساء......اکثر اهل النار:

"فر علی النساء" "مرّ" علیٰ کے ذریعہ اسی طرح متعدی ہوتا ہے جیسے باء کے ذریعہ ہوتا ہے۔

"یامعسر النساء": خطاب تمام عورتوں کے لیے عام ہے اور موجودات کو غائبات پر غالب قرار دیتے ہوئے انہیں خطاب فرمایا۔

فانی اریتکن اکثر اهل النار": أری سے صیغہ مجہول، بمعنی أعلم (بتایا گیا) کی رُو سے اس کے تین مفاعیل ہیں: ایک مفعول تاء ہے جو قائم مقام فاعل ہے، دوسرا مفعول "کُنّ" ہے اور تیسرا "أکثر" ہے۔

اس وعظ میں احتمال ہے کہ آپ ﷺ عورتوں (کو وعظ فرمانے کے لیے مقصودی طور پر ان) کے پاس تشریف لے گئے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے (کہ اتفاقاً) آپ ﷺ کا گزر ان کے پاس سے ہوا تو آپ ﷺ نے انہیں وعظ فرمایا ہو۔

اس بات کا علم آپ ﷺ کو کشف یا وحی کے ذریعہ ہوا کہ عورتیں مردوں کی بنسبت زیادہ تعداد میں جہنم میں جائیں گی اور صدقہ اس سے بچاتا ہے، ہر شخص اس وقت تک اپنے صدقہ کے سائے میں رہے گا جب تک لوگوں کے درمیان فیصلہ نہ ہو جائے۔ جہنم سے بچو اگر چہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ سے ہو۔

اہل جہنم میں عورتوں کے زیادہ ہونے کی وجہ ان کی دنیا سے محبت ہے اور صدقہ کرنے سے دنیا کی محبت ختم ہو جاتی ہے یا جو دنیا کی محبت مذمومہ، بخل جیسی گندی خصلت کے جنم کا باعث بنتی ہے، کم ہو جاتی ہے اسی نکتہ کی وجہ سے حدیث میں آیا ہے "الید العلیا خیرٌ من الید السفلیٰ" اوپر والا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے۔

قوله: فقلن وبم یا رسول الله؟:

"بم": اصل میں "بما تها" ما استفہامیہ کے الف کو حرف جر کے داخل ہونے کی وجہ سے تخفیفاً حذف کر دیا۔ باء سببیہ ہے جو اس کے مابعد مقدر کے متعلق ہے۔

اس واؤ کے بارے میں دو احتمال ہیں: ① واؤ ماقبل مقدر پر عطف کے لئے ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے فقلن کیف یکون ذلك؟ وبأی شیء نکن أکثر اهل النار۔ اہلِ جہنم میں سے زیادہ تعداد میں ہونگیں؟

② واؤ زائدہ ہے اس بات پر دلالت کے لیے ہے کہ اس سوال کا تعلق ماقبل سے ہے، یہ کوئی ایسا مستقل سوال نہیں جس کا ماقبل سے تعلق نہ ہو۔

قوله: قال: تکثون اللعن وتکفرن العشیر:

"اللعن": اصل لعنت کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کا کسی بندہ کو اپنی ناراضگی وغصہ کی وجہ سے اپنی رحمت سے دور کر دینا ہے۔ لعنت بندہ کی طرف سے ہو تو اس کا معنی بندہ کا اپنے آپ یا کسی دوسرے کے لیے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی و رحمت سے دوری کی بددعا کرنا ہے۔

لعنت کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ سے جو اس کے غضب پر سبقت لے جاتی ہے سے اعراض ہے۔اسی لئے علماء کا اتفاق ہے کہ کسی معین شخص پر اگر چہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو' کو لعنت کرنا حرام ہے جب تک یقینی طور پر معلوم نہ ہو جائے کہ اس کی موت کفر پر ہی ہوئی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وہ شخص کیونکر کسی کو دور کر سکتا ہے جس کو اس کے انجامِ کار کی خبر نہیں خواہ موجودہ صورتحال میں وہ کافر ہی کیوں نہ ہو اس لئے کہ احتمال ہے کہ وہ مسلمان ہو کر مر جائے۔

وہ شخص جس کے متعلق شارع کی جانب سے معلوم ہو جائے کہ اس کی موت کفر کی حالت پر ہوئی ہے جیسا کہ ابوجہل ہے یا یہ کہ اس کی موت کفر پر ہوگی جیسا کہ ابلیس ہے کہ اسے لعنت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

اسی طرح جب کسی معین شخص کو لعنت نہ کی جائے بلکہ خاص صفت کے ساتھ متصف کر دیا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں جیسے: لعن اللہ الو اصلہ۔ اللہ تعالیٰ ایسی عورت پر لعنت فرمائے اور سود خور اور جھوٹے پر لعنت فرمائے۔اس صورت میں لعنت جنس کی طرف پھر جاتی ہے نہ کہ کسی خاص فرد کی طرف۔

اور شاید آپ ﷺ نے "تکثرن اللعن" کی قید اس بناء پر لگائی کہ عورتوں کی زبانوں پر لعنت کے الفاظ بغیر اس کے معنی سابق کے مقصود ہونے کے جاری رہنا ان کی عادت سی ہے۔(یعنی لعنت ملامت کرنا عورتوں کا تکیہ کلام ہوتا ہے) اس لئے آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں ان پر تخفیف فرمائی اور انہیں یہ وعید "اکثانو" کے ساتھ مقید فرما کر سنائی۔

اور اس کی نظیر بعض ائمہ کا یہ قول ہے کہ غیبت صغیرہ گناہ ہے اور اس کی وجہ انہوں نے یہ ذکر فرمائی کہ لوگ اس میں مبتلا رہے ہیں۔پس اگر غیبت کو کبیرہ گناہ قرار دیا جائے جیسا کہ اکثر حضرات یہی فرماتے ہیں' بلکہ اس پر اجماع بھی نقل کیا جاتا ہے تو اس سے تمام لوگوں یا ان کی اکثریت کا فاسق ہونا لازم آتا ہے، اور اس میں بہت بڑا حرج لازم آتا ہے۔کبھی لعنت کا استعمال گالی گلوچ اور بُرے کلام کے طور پر بھی ہوتا ہے، یعنی تمہاری عادت زیادہ لعن طعن، گالی گلوچ اور زبان سے ایذاء پہنچانے کی ہے۔

"وتکون العشیر" عشیر سے مراد وہ شخص ہے جو ہر وقت ساتھ رہتا ہے اور یہاں اس سے مراد خاوند ہے۔شوہر کی ناشکری یہ ہے کہ اس کے احسان و مہربانی کا انکار کیا جائے یا اس کا شکریہ ادا نہ کرے اس پر پردہ ڈال دیا جائے، حالانکہ حدیث میں ہے:ومن لم یشکر الناس لم یشکر اللہ۔ جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر گزار نہیں ہو سکتا۔یعنی اللہ کا کامل شکر گزار نہیں ہو سکتا۔اس لئے کہ اس نے مسبّب (اسباب فراہم کرنے والے) کا تو شکریہ ادا کیا اور سبب کا شکریہ ادا نہیں کیا۔

عام طور پر نعمتوں کی ناشکری کے لیے "کفران" دین کے انکار کے لیے "کفر" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

قولہ:ما رأیت من ناقصات عقل ودین ......من احداکن:

"مِنْ" زائدہ استغراق کے لیے ہے مفعول محذوف کی صفت ہے' یعنی ما رأیت أحدًا من ناقصات۔اور بعض اس بات کا احتمال ہے کہ مبالغہ کے طور پر یہ احداکن کا بیان ہو یا اس کے برعکس ہو۔

"أذھب":احدًا محذوف کی صفت ہے۔اگر رأیتُ بمعنی أبصرت ہو تو پہلے احتمال (کہ من ناقصات پہلی صفت ہو احدًا کی) رُو سے "اذھب" اس کی دوسری صفت ہوگی اور اگر علمت بمعنی ہو تو س کا مفعول ثانی ہوگا۔

مفضل علیہ (جس پر فضیلت دی گئی ہے) مفروض مقدر ہے۔"أذھب" اذھاب سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے کیونکہ

آپ ﷺ کے ارشاد "للب الرجل" میں لام آیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل کو زیادہ اڑا لے جانے والا۔سیبویہ کی رائے کی رو سے یہ درست ہے۔جیسے **هو اعطاهم الدراهم** (وہ ان میں سے دراھم زیادہ دینے والا ہے) کہنا ہے۔

"عقل": اس طبیعت کو کہتے ہیں جو معانی کا ادراک کرتی ہے اور قبیح امور سے باز رکھتی ہے۔عقل اللہ تعالیٰ کا (عطا کردہ) نور ہے جو ایمان والے کے دل میں راسخ ہوتا ہے "اللب" اس عقل کو کہتے ہیں جو خواہش کے شائبہ سے پاک صاف ہو۔

"**الحازم**": "**الرجل**" کی صفت ہے "**حازم**" کا مطلب ہے اپنے معاملہ میں خوب احتیاط سے کام لینے والا۔

"لب" (عقل) کے ساتھ "**الحازم**" کا تذکرہ اس بات کو بتاتا ہے کہ عورتوں کا فتنہ کس قدر عظیم ہوتا ہے کہ محتاط عقلمند افراد کی عقلوں کو اڑا لے جاتا ہے تو سوچیں دوسروں کا کیا حال ہوگا۔

"**من احداكن**" : **أذهب** کے متعلق ہے۔

آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے "**منكن**" ارشاد نہیں فرمایا بلکہ "**احداكن**" فرمایا اس لئے کہ جب ایک عورت اتنی مذموم صفت پر ہے تو سب عورتوں کا اس صفت پر ہونا بطریق اولیٰ ہے جبکہ اس کا عکس نہیں (سب مل کر کسی کی عقل اُڑا دیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک بھی ایسا کر سکے)۔جریر نے عورتوں کے عیب کا تذکرہ کس حسین انداز میں فرمایا: **يصرعن ذااللب حتى لاحراك به وهن أضعف خلق الله اركانا**۔

عورتیں عقل مند شخص کو یوں پچھاڑ کر رکھ دیتی ہیں کہ وہ حرکت بھی نہیں کر سکتا۔

حالانکہ وہ اعضاء کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی کمزور ترمخلوق ہے۔

قوله: قلن: وما نقصان ديننا وعقلنا يا رسول الله؟:

حالانکہ ہمارا اور مردوں کا دین ایک ہی ہے اور ہم سب کا شمار اہلِ عقول میں سے ہوتا ہے۔

ممکن ہے انہوں نے ترتیب سابق جس کے مطابق آنے والا جواب بھی ہے کے برخلاف اس لئے کہا کہ ان کا سوال اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ انہیں دین کے معاملے کا بہت اہتمام تھا کہ اگر اس (دینی کوتاہی) کی تلافی ہو سکے تو وہ تلافی کریں۔

یا اس میں بھی ان کی عقل کی کمی کا اشارہ ہے کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے کلام کی رعایت نہیں رکھی اور وہ آپ ﷺ کے ارشاد کی ترتیب بھی سمجھ نہ پائیں کہ عقل کی کمی یہ فطری امر ہے جو وجود میں مقدم ہے اور دینی نقصان ایک اُمر حادث ہے، یا عام طور پر دینی نقصان کا منشا بھی عقل کی کمی ہوتا ہے۔

اس وقت موجود عورتوں کا یہ سوال کرنا ان کی سمجھداری کا ثبوت ہے اسی بناء پر نبی اکرم ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں ان کی تعریف فرمائی: **فعم النساء نساء الانصار لم يمنعهن الحياء أن يتفقهن فى الدين** "بہترین عورتیں، انصار کی عورتیں ہیں کہ انہیں دین میں تفقہ حاصل کرنے سے حیاء مانع نہ ہوئی"۔اس حدیث اور اس سے ماقبل حدیث میں علم سیکھنے والے کے لیے اس بات کی ترغیب موجود ہے کہ جس بات کا مطلب وہ نہ سمجھ سکے (جاننے والے سے مراجعت کر کے پوچھ لے۔

قوله: قال: اليس شهادة المرأة ......فذلك من نقصان عقلها:

"الیس شهادة... الرجل": اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ﴾ (البقرة:۲۸۲)

" فذلك": میں حکم سابق کی طرف اشارہ ہے اور "ك" عام خطاب کے لئے ہے (مخاطب خاص نہیں ہے)۔ کاف پر کسرہ کا بھی احتمال ہے اسی بناء پر آپ ﷺ نے ذلکن نہیں فرمایا' حالانکہ آپ ﷺ کا خطاب عورتوں سے تھا۔

علامہ عسقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کاف کے کسرہ کے ساتھ (ذلك) اس عورت سے خطاب ہے جو دیگر عورتوں کیطرف سے بات چیت کررہی تھی، اور کاف پر فتحہ بھی درست ہے اس صورت میں خطاب عام ہوگا۔

عورتوں کی عقل کے ناقص ہونے کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے رشاد فرمایا: ﴿اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى﴾

[البقرة:۲۸۲]

قوله: قال: أليس اذا حاضت لم تصل ولم تصم؟ قلن بلى قال: فذلك من نقصان دينها:

"لیس": اس کا اسم ضمیر شان ہے اور اس کی خبر "اذا حاضت لم تصل ولم تصم؟" ہے۔

"قال": شاید "قال" کا اعادہ اس بناء پر کیا تا کہ پتہ چلے کہ یہ مستقل قول ہے' جو اس کی نظیر سابق کی طرف لوٹ رہا ہے اور یہ بات قریبی قول کا تتمہ نہیں ہے۔ یہ قال اکثر نسخوں میں موجود ہے البتہ سید جمال الدین کی اصل (کتاب) اور صحیح بخاری کے متن میں موجود نہیں۔ واللہ اعلم۔

"فذلك من نقصان دينهاء" یعنی فی الجملہ یہ اس کے دین کا نقصان ہے اسلئے کہ وہ نماز کے ثواب سے محروم رہتی ہے کیونکہ اس کی قضاء نہیں کرتی اور روزے کے کامل ثواب سے بھی محروم رہتی ہے کیونکہ وہ فضیلت والے وقت (رمضان) میں واقع نہ ہوا باوجود یکہ وہ طاعت کی ادائیگی میں ایمان والوں کے ساتھ شریک ہے اور شاید اسی وجہ سے اس حدیث کو اس باب میں لایا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تخریج: نسائی اور ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

انسان اللہ کو کیسے جھٹلاتا ہے؟

۲۰ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى كَذَّبَنِى ابْنُ اٰدَمَ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ ذٰلِكَ وَشَتَمَنِیْ وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ ذٰلِكَ فَاَمَّا تَكْذِيْبُهٗ اِيَّایَ فَقَوْلُهٗ لَنْ يُّعِيْدَنِی كَمَا بَدَاَنِیْ وَلَيْسَ اَوَّلُ الْخَلْقِ بِاَهْوَنَ عَلَیَّ مِنْ اِعَادَتِهٖ وَاَمَّا شَتْمُهٗ اِيَّایَ فَقَوْلُهٗ اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا...... وَاَنَا الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ اَلِدْ وَلَمْ اُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لِّیْ كُفُوًا اَحَدٌ

أخرجه البخاري في صحيحه ٧٣٩/٨ حديث رقم ٤٩٧٤' والنسائي في سننه ١٢/٤ حديث رقم ٢٠٧٨ وأحمد في مسنده۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آدم کا بیٹا مجھے جھٹلاتا ہے۔ حالانکہ یہ اس کے لیے مناسب نہیں اور میرے بارے میں فحش گوئی کرتا اور گالی دیتا ہے حالانکہ یہ اس کے لئے مناسب نہیں اس کا مجھ کو جھٹلانا تو یہ ہے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھے اس دنیا میں پہلی بار پیدا کیا ہے اس طرح آخرت میں مجھے دوبارہ ہرگز پیدا نہیں کرسکتا۔ حالانکہ دوبارہ پیدا کرنا پہلی مرتبہ پیدا کرنے کے مقابلے میں مشکل نہیں ہے (بلکہ تقاضا عقل کے مطابق آسان ہے) اور اس کا میرے بارے میں فحش گوئی کرنے اور گالی دینے سے مراد یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب اولاد ہے حالانکہ میں اکیلا ہوں اور بے نیاز ہوں نہ میں نے کسی کو جنا ہے اور نہ مجھ کو کسی نے جنا ہے اور نہ ہی میرا کوئی ہمسر ہے۔

تشریح: **قوله: قال الله تعالى: كذبني ابن آدم ولم يكن له ذلك:**

"قال الله تعالى": اگلا کلام حدیث قدسی ہے۔ حدیث قدسی اور قرآن میں فرق کے اور قرآن کے مابین پہلا فرق یہ ہے کہ حدیث قدسی الہام، خواب یا فرشتے کے واسطہ معنیٰ کا نزول ہوتا ہے پھر اس معنیٰ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے الفاظ سے تعبیر فرما کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب فرماتے ہیں اور قرآن مجید صرف وہ ہے جو جبرئیل امین کو معین الفاظ دے کر بھیجا گیا۔ دوسرا فرق نیز قرآن مجید متواتر ہے جبکہ حدیثِ قدسی ایسی نہیں لہٰذا اس کا حکم فروعات میں قرآن والا حکم نہیں۔

"كذّبني": یاء کے سکون کے ساتھ ہے اور اس پر فتحہ پڑھنا بھی درست ہے۔ "ابن ادم": یعنی جنس ادم مراد ہے۔

"تکذیب" کہتے ہیں یہ بتانا کہ متکلم نے واقع کے مطابق خبر نہیں دی۔

قوله: وشتمني ولم يكن له ذلك:

"شتمني": شتم کہتے ہیں کسی چیز کو کمی اور نقص کے ساتھ متصف کرنا۔ اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد ثابت کرنا بھی اسی طرح (باعث عیب) ہے اس لئے کہ اس "ذلك" کا مشارالیہ "شتم" ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بیٹا باپ کی حقیقت کے بالکل مماثل ہے، اور وہ مستلزم ہے اس امکان کو جو حدوث کا متداعی ہے۔

قوله: فا ما تكذيبه اياى فقوله لن يعيد...... من اعادته:

"فا ما تكذيبه اياى": مجمل کی تفصیل ہے۔

"لن يعيدنى": اعادہ کہتے ہیں پہلے جو موجود ہو اس کے معدوم ہونے کے بعد اسے دوبارہ بنانا' پیدا کرتا۔ مطلب اس بات کا یہ ہے کہ مجھے عدم سے وجود عطا فرمایا اور ابتداءً پیدا کیا۔ میرے مرنے کے بعد مجھے ہرگز کوئی زندہ نہیں کرسکے گا۔ مطلب یہ ہے وہ مجھے ہرگز نہیں لوٹائے گا۔ اس حالت کی مانند جس پر میں اس وقت تھا جب مجھے پیدا کیا گیا تھا۔ یا جیسے اس نے مجھے ابتدا میں بنایا تھا اسی طرح نہیں لوٹائے گا۔ یا مجھے بالکل اسی طرح لوٹا نہیں سکتا جس حالت پر مجھے پیدا کیا، یا مٹی سے پیدا کرنے پر قادر نہیں یا وہ اصل پر اعادہ کا ارادہ ہی نہ کرے گا یا اجسام کو دوبارہ پیدا ہی نہ کرے گا۔ یہ تمام باتیں کفریہ ہیں۔ ان آیاتِ قرآنیہ کو جھٹلانے والی ہیں جو اعادہ جسمانیہ پر دلالت کرتی ہیں' برخلاف اس کے جسے ان بیوقوف لوگوں نے اختیار کیا جو اس آیت کا مصداق ہیں: ﴿أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾ [الاعراف : ۱۷۹] اور اسی بناء پر اگلے جملہ (ليس اول

الخلق) میں ان کی تردید فرمائی۔

"لیس اول الخلق": اس میں کئی ترکیبی احتمال ہیں۔اس کو صفت کی موصوف کے طرف اضافت کی قبیل سے قرار دینا بھی درست ہے۔ای لیس اول خلق الخلق۔اور خلق بھی مخلوق ہے۔یعنی مخلوقات کی پہلی تخلیق یا یہ مضاف کو حذف کر کے مضافِ الیہ کو اس کے قائم مقام رکھنے کی قبیل سے ہے یعنی مخلوق کی پہلی پیدائش نہیں ہے یا لام مضاف الیہ کے عوض ہے ای أول خلق الشیئ۔یعنی اشیاء کی پہلی پیدائش۔

"بأھون": باءزائدہ تاکید کے لیے ہے۔ ھان الأمر یھون کہتے ہیں جب کام آسان ہو جائے۔
مطلب یہ ہے کہ زیادہ آسان نہیں۔

"علی من اعادته": ضمیر کا مرجع مخلوق یا شئی ہے۔

بلکہ دونوں (پیدائش اور اعادہ) میری قدرت میں برابر ہیں بلکہ عادتاً دوبارہ پیدا کرنا آسان تر ہے کہ اصل بنیاد اور اس کے اثرات موجود ہیں۔یا تمہارے خیال میں اور تمہارے نزدیک بھی آسان تر ہے یا مخلوق پر آسان تر ہے اس لئے واپسی فوراً ہو جاتی ہے بخلاف ایجاد کے وہ تدریجاً ہوتی ہے۔

یہ حدیث اس آیت کا اقتباس ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ﴾ [الروم: ۲۷]

بعض حضرات نے فرمایا کہ اس میں ایسی مثال پر تنبیہ ہے جو ہوشیار آدمی کو فہم حق کی راہنمائی کرتی ہے اور اسے اس کے نزدیک مزید پختہ کر دیتی ہے، اور وہ اس طرح کہ وہ دیکھتا ہے کہ کوئی شخص صنعت کو ایجاد کرنا چاہے جس کی مثل نہ تو اس نے ایسی دیکھی ہے نہ کہیں اس کی اصل یا مدد پائی جاتی ہے تو وہ اس کے لئے بہت مشکل ہوتی ہے اور اس میں وہ بہت تھک ہار جاتا ہے اور ایسے پر مشقت اعمال اور مددگاروں کی معاونت اور بہت زمانہ چاہیے ہوتا ہے اس کے باوجود بہت دفعہ اس کا مقصود پورا نہیں ہوتا اور باوجود کوشش کے اُس کی مراد حاصل نہیں ہوتی۔اور اس کا مشاہدہ کیمیاء کی صنعت کے طلبگاروں میں عموماً ہو سکتا ہے کہ ان میں ایک شخص اپنی ساری زندگی اور جمع پونجی اس کی معرفت میں گنوا کر سمجھتا ہے وہ بالکل صحیح اس کو جان گیا تو اسکے ساتھ ہی اس کی خوشی کرکری ہو جاتی ہے اور وہ بلندی سے نیچے گر جاتا جس سے اس کی گردن ٹوٹ جاتی ہے اور جو شخص کسی ٹوٹی ہوئی چیز کی اصلاح کرنا چاہے یا منہدم عمارت کو دوبارہ بنانا چاہے اور اس کے پاس اس کا سامان اور بنیادیں موجود ہوں تو یہ اس پر آسان ہوگا اور جلد ہی اس کا مقصود پورا ہو جائے گا۔پس جو کوئی اس میں غور فکر کرے وہ جان لے گا کہ ہماری نسبت سے کسی چیز کو ابتداءً بنانے سے اس کا اعادہ آسان تر ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ انہوں نے جب ابتدائی تخلیق کا اقرار کر لیا پھر ان کا اعادہ سے انکار یہ ان کی جانب سے باری تعالیٰ کی تکذیب ہے۔یہ جملہ حالیہ ہے اور اس کا عامل "فقوله" ہے۔اور ذوالحال مضاف الیہ کی ضمیر ہے۔

"وء ما شتمه ایای فقوله: اتخذ الله ولداً": یعنی اللہ سبحانہ اسے اپنے لئے چن لیا۔یہود نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے' نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے' عرب کہنے لگے: "فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں"۔

قوله: وانا ألاحد الصمد ... کفوا احد:

"کفوا" کان کی خبر ہے اور "أحد" اس کا اسم ہے۔

وانا الأحد الصمد: یہ جملہ حالیہ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا۔

بیٹا بنانا عیب سے یہ دو محال باتوں کو مستلزم ہے۔ایک محال ان میں سے اللہ تعالیٰ کا بیٹے کے مماثل و مانند ہونا ہے اور اس کی حقیقت کا نام ہونا ہے جس سے اس کا ممکن وحادث ہونا لازم آتا ہے اور ان میں سے دوسرا محال دوسری بات اللہ تعالیٰ کے بعد اس کا خلیفہ ہونا ہے جو اس کا کام سنبھال لے،اس لئے کہ توالد (اولاد ہونے) سے مقصود بقاء نوع ہے جو باری تعالیٰ سبحانہ کے زوال وفناء کو مستلزم ہے۔اسی لئے اللہ تعالیٰ کا رشاد ہے: ﴿تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ......﴾ [مریم: ۹۰]

"**الأحد**" وہ ہے جو ذات وصفات کے اعتبار سے اکیلا مطلق ہو۔

واحد اور اُحد میں فرق

یہ ہے کہ واحد ابتدائی عدد کی نفی کے لیے آتا ہے اور اُحد ہر عدد کی نفی کے لیے ہے۔پس واحد سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ذات مثل ونظیر سے جدا ہے اور اُحد بتاتا ہے کہ اس کی ذات ہر عیب کمزوری سے الگ تھلگ اور ہر کمال کے ساتھ متصف ہے تو اس کے باوجود وہ پہلے کا کیونکر محتاج ہوگا؟۔

"**الصمد**" اس ذات کو کہتے ہیں جس کا ہر کوئی محتاج ہو اور وہ سب سے بے نیاز ہو۔چنانچہ اللہ تعالی وہ ذات ہے جو کسی کا محتاج نہیں۔نہ وہ والد کا محتاج ہے اور نہ ولد کا محتاج ہے۔

"**الذی لم ألد**": یہ **أنا الذی سمتنی أمی حیدرہ**" کے قبیل سے ہے۔

یعنی میں کسی کا باپ نہیں ہوں کیونکہ جو قدیم ہوتا ہے حادث کا محل نہیں بن سکتا اور میں کسی کا بیٹا بھی نہیں کیونکہ میں بغیر ابتداء کے اول قدیم ہوں جیسا کہ میں بغیر انتہاء کے آخر ہوں۔

"**کفو**": ① کاف اور فاء دونوں پر ضمہ ہے۔② فاء کو ساکن بھی پڑھ سکتے ہیں ہمزہ کے ساتھ۔③ اور اسے آخر میں واؤ کے ساتھ مضموم بھی پڑھ سکتے ہیں' تینوں متواتر لغات ہیں۔

"**کفو**" کا معنیٰ "برابر" ہے اور برابری کی نفی والا ہونا باپ ہونا بیٹا ہونا خاوند بیوی ہونا ہونا وغیرہ سب کو شامل ہے۔

۲۱: وَفِيْ رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَاَمَّا شَتْمُهٗ اِيَّايَ فَقَوْلُهٗ لِيْ وَلَدٌ وَسُبْحَانِيْ اَنْ اَتَّخِذَ صَاحِبَةً اَوْ وَلَدًا۔ (رواہ البخاری)

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں اس طرح ہے اور انسان کا مجھ کو گالی دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب اولاد ہے۔حالانکہ میں اس سے پاک ہوں کہ کسی کو اپنا بیٹا یا بیوی بناؤں۔(بخاری)

تشریح: قولہ: وفی روایة عن ابن عباس...... صاحبة او ولدا:

"**ولد**": اسم جنس ہے، جو مذکر ومؤنث کو شامل ہے۔ "**وسبحانی**": ایک نسخہ صحیحہ میں سبحانی فاء کے ساتھ ہے یعنی "**فسبحانی**" ہے۔

میری ذات پاک ہے۔ کہ کسی کو بیوی یا بیٹا بناؤں کیونکہ اس کی احتیاج نہیں اور اس لئے بھی کہ جنس ایک نہیں۔

"أو ولدًا": ابن ملک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ راوی کو شک ہے کہ آپ نے صاحبت فرمایا' یا ولداً اور ظاہر یہ ہے کہ أو نوع کے لیے ہے اور اس پر جامع حمیدی کی روایت دلالت کرتی ہے "ولا ولداً"۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ لا کا اضافہ ولداً کے ساتھ اس بناء پر کیا گیا کہ "سبحانی" میں تنزیہہ کے معنی ہیں' جو اس کے مترادف شتمنی جز عنی میں پایا جاتا ہے جو اس کی خبر میں لا کے ساتھ عطف کا متقاضی ہے۔

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کے وسیع حلم کا بیان ہے جو عقل کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ اگر ایسی بات اس کی کسی اُدنی مخلوق جو عاجز وضعیف ہے کے ساتھ ہوتی تو اس کا غیظ وغضب اسے اس کے بارے میں ایسی بات کہنے والے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے پر ابھارتا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی گستاخانہ بات کہنے والے کی کوئی گرفت نہیں فرمائی بلکہ اسے حق کی طرف راہنمائی بہت بلیغ و واضح دلیل سے فرمائی۔

تخریج: بخاری کی روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ ہے:

"قال الله تعالٰی: شتمنی ابن ادم وما ینبغی لهٗ ان یشتمنی، وکذبنی وما ینبغی له أن یکذبنی، أماشتمهٗ ایای فقوله: ان لی ولدا و انا الله الأحد الصمد الذی لم ألد ولم أولد ولم یکن لی کفواً أحد، وأما تکذیبه ایای فقولهٗ: لیس یعیدنی کما بدأنی، ولیس أول الخلق بأهون علی من اعادته"۔

امام احمد ونسائی نے بھی اس روایت کو اسی طرح نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی بخاری کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"قال اللّٰه تعالٰی: کذبنی ابن ادم ولم یکن له ذلك، وشتمنی ولم یکن له وذلك فأما تکذیبه ایای فزعم انی لا أقدر ان اعیده کما کان واماشتمه ایای فقول: لی ولد وسبحانی ان اتخذ صاحبة او ولداً"۔

جامع صغیر میں اسی طرح مروی ہے غور کریں گے تو دونوں روایتوں کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

زمانے کو برا بھلا کہنا جائز نہیں

۲۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ یُؤْذِیْنِیْ اِبْنُ اٰدَمَ یَسُبُّ الدَّهْرَ وَاَنَا الدَّهْرُ بِیَدَیَّ الْاَمْرُ اُقَلِّبُ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ. (متفق علیه)

أخرجه البخاری ۸/۵۷۴ حدیث رقم ۴۸۲٦ ومسلم ۴/۱۷٦۲ حدیث (۲۲۴٦-۲) وأبو داؤد ۵/۴۲۳ حدیث رقم ۵۲۷۴ وأحمد فی المسند ۲/۲۷۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ مجھے اولاد آدم یعنی انسان تکلیف دیتا ہے وہ اس طرح کہ وہ زمانے کو برا کہتا ہے۔ حالانکہ زمانہ تو کچھ نہیں وہ تو میں ہی ہوں کیونکہ سب تصرفات میرے قبضہ قدرت میں ہیں۔ رات اور دن کی گردش بھی میرے ہی حکم سے ہوتی ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قولہ: وعن أبی هریرۃ: صاحب مشکوۃ نے "عنہ" نہیں فرمایا تا کہ کسی کو وہم نہ ہو کہ اس کا مرجع ابن عباس ؓ ہیں اس لئے قریب میں انہیں کا ذکر ہے اگر چہ عنوان حدیث میں حضرت ابو ہریرہ ؓ ہی کا تذکرہ ہے۔

قولہ: یؤذینی ابن ادم یسب الدّھر:

"یؤذینی": ہمزہ کے ساتھ اور ابدال کے ساتھ۔

ابن آدم عیب جوئی کے ذریعہ مجھے تکلیف دیتا ہے۔ وہ میرے بارے میں ایسی بات کہتا ہے جسے میں ناپسند کرتا ہوں اور میری طرف ایسی چیز کی نسبت کرتا ہے جو میری شان کے لائق نہیں۔

یا ایسی بات کہتا ہے جس سے وہ شخص جس کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ اسے تکلیف پہنچتی ہے کے لیے تکلیف دہ ہے۔

قیل کہ یہ حدیث متشابہات میں سے ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا تکلیف محسوس کرنا محال ہے لہٰذا یا اس کی حقیقی مراد کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیا جائے (کہ وہی اس کی حقیقی مراد جانتا ہے) یا اس کی تاویل کی جائے جیسا کہ متشابہات سے متعلق کلام گزر چکا ہے اور کبھی ایذاء کا اطلاق دوسرے کو قول یا فعل سے ناگواری پہنچانے پر ہوتا ہے اگر وہ اس سے متاثر نہ ہو پس اللہ تعالیٰ کو ایذاء پہنچانا ایسے فعل کے ارتکاب کو کہتے ہیں جسے وہ ناپسند کرتا ہے اور ایذاء رسول اللہ ﷺ کا بھی یہی معنی ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان اسی قبیل سے ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا﴾ [الاحزاب ۵۷:]

"یسب الدّھر": صیغہ مضارع کے ساتھ جملہ مستانفہ بیانیہ ہے۔ بعض حضرات نے حرف جر اور سین کے فتحہ اور دھر کے کسرہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ای بسَبّ الدھر: زمانہ کو برا بھلا کہنے کا مطلب یہ ہے یعنی وہ سمجھتا ہے کہ زمانہ ہی دیتا ہے اور منع کرتا ہے۔ نقصان پہنچاتا اور نفع دیتا ہے۔

قولہ: وأنا الدّھر:

"الدھر": راء کے رفعہ کے ساتھ مروی ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ صحیح یہی ہے یہ اصل میں مضاف الیہ ہے جو مضاف کے قائم مقام ہے۔ ای أنا خالق الدھر (میں زمانہ کا خالق ہوں)۔ أو مصرف الدھر۔ یا زمانہ کو پھیرنے اور منقلب کرنے والا ہوں أو مدبر الامر یا ان امور کی تدبیر کرنے والا ہوں جنہیں وہ زمانہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

پس جو زمانہ کو ان کا فاعل سمجھ کہ گالی دیتا ہے اس کی گالی میری طرف لوٹ کر آتی ہے اس لئے کہ میں ہی ان امور کا خالق ہوں، زمانہ تو صرف ان امور کے وقوع پذیر ہونے ہونے کے لیے ظرف بنتا ہے۔

دھر کے لفظ کو ان لوگوں پر رد میں مبالغہ کرتے ہوئے دوبارہ ذکر کیا۔

دھریئے دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک دھر یہ جو زمانہ کا کسی کو خالق نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ "ما یھلکھنا الاّ الدھر" ہمیں تو صرف زمانہ نے ہلاک کیا یا وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے وجود کو مانتے ہیں لیکن امور مکررہ کی نسبت اس کی طرف کرنے سے تنزیہہ کا عقیدہ نہیں رکھتے چنانچہ یوں کہتے ہیں: وہ تباہ و برباد اور نامراد ہو وغیرہ۔ کبھی جہالت اور غفلت سے عام مسلمانوں سے بھی اس کا صدور ہو جاتا ہے۔

"دھر" نصب (فتحہ) کے ساتھ ظرف ہونے کی بناء پر مروی ہے ای انا الفاعل أو المتصرف فی الدھر یعنی میں ہی زمانہ میں فاعل یا متصرف ہوں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ دوسرا دھر پہلے سے مختلف ہے اس لئے کہ اس کے معنی عالم کی ابتداء کے زمانہ سے اس کے ختم ہونے تک کی مدت ہ۔ یا وہ طویل زمانہ جو دنوں اور راتوں کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے پر مشتمل ہے۔

بلکہ دھر مصدر بمعنی فاعل داھر کے ہے۔ اور اس کا مطلب ہے میں ہی زمانہ لانے والا ہوں متصرف و مدبر اور ہر حادث کو وجود بخشنے والا ہوں۔

امام راغب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس کا معنی ہے زمانہ کی جانب جو خیر و شر اور اچھائی و برائی منسوب ہے میں ہی اس کا فاعل ہوں۔ تو جب تم اپنے اعتقاد کے مطابق اس کو گالی دیتے ہوئے جسے تم ان چیزوں کا فاعل سمجھتے ہو تو یقیناً تم مجھے برا بھلا کہتے ہو۔

قولہ: بیدی الامر اقلب اللیل والنھار:

"ید" کے مفرد ہونے کی صورت میں یاء کے فتحہ اور سکون کے ساتھ ہے اور بصیغۂ تثنیہ بھی جائز ہے۔ تاکید و مبالغہ کے لیے یائے مشددہ کے فتحہ کے ساتھ درست ہے۔ یعنی تمام امور اچھے برے، مزیدار، اور بدمزہ کڑوے سب میری قدر و تصرف کے تحت ہیں۔ جیسے میں چاہوں گا ان دونوں میں کمی کر کے یا بڑھا کر اور ان بسنے والوں کے دلوں کو پلٹ کر جیسے میں چاہتا ہوں۔

تخریج: اسے احمد اور ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے۔ امام مسلم نے بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی روایت کو ان الفاظ میں روایت فرمایا ہے: **قال اللہ تعالیٰ: یؤذینی ابن ادم یقول: یا خیبۃ الدھر، فلا یقولن أحدکم یاخیبۃ الدھر فانی أنا الدھر، اقلب لیلہ ونھارہ فاذا شئت قبضتھما"**

صبرِ خداوندی

۲۳: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَحَدٌ اَصْبَرَ عَلٰی اَذًی یَسْمَعُہٗ مِنَ اللّٰہِ یَدْعُوْنَ لَہُ الْوَلَدَ ثُمَّ یُعَافِیْھِمْ وَیَرْزُقُھُمْ. (متفق علیہ)

أخرجہ البخاری ۱/۵۱۱ حدیث ۶۰۹۹۔ ومسلم فی صحیحہ ۴/۲۱۶۰ حدیث (۲۸۰۴۰۴۹) وأحمد فی المسند ۴/۴۰۱۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تکلیف دینے والے کلمات سن کر اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی زیادہ صبر اور بردباری والا نہیں۔ لوگ اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد کا دعویٰ کرتے ہیں اور وہ اس پر بھی ان کو عافیت سے نوازتا ہے اور انہیں رزق دیتا ہے۔ (بخاری۔ مسلم)

تشریح: ما: ماصابر بلیس ہے

قولہ: ما أحد أصبر علی أذی:

"اصبر": أی أستد صبرا۔ نفس کو اس کی پسندیدہ چیزوں سے روکنے یا اس کی ناپسندیدہ اشیاء کے گوارہ کرنے کو صبر کہتے ہیں اور باری تعالیٰ کی صفت میں صبر کا اطلاق ان کے عذاب کو مستحقین سے مؤخر کر دینے پر ہوتا ہے۔

"أذی": بعض "أذی" یہ اذٰی' یؤذی سے اسم مصدر بمعنی موذی ہے۔ کلام محذوف کی صفت ہے۔ ای کلام مؤذ یعنی ایسا موذی' برا کلام جو کافروں سے صادر ہوتا ہے۔

قولہ: یسمعه من الله تعالی یدعون له الولدثم یعافیهم ویرزقهم:

"یسمعه": یہ أذی کی صفت ہے۔ بطور تتمیم کے ہے۔ "من الله": اس کا تعلق أصبر سے ہے نہ کہ یسمع سے ہے۔

"یدعون": دال سکون کے ساتھ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس کی تشدید کے ساتھ ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔

ایذاء کے بیان کا آغاز ہے کہ تکلیف دہ بات جب تکلیف دئے جانے والے کو سنائی دے تو اس کی تکلیف بہت سخت ہوتی ہے۔ یہ ہماری نسبت سے ہے ورنہ مسموع اور سنائی نہ دی جانے والی بات اللہ تعالیٰ کو معلوم اور اس کے نزدیک برابر ہے۔ اس کے باوجود وہ ان کو معاف کرتا ہے، ان سے تکلیف دور کرتا ہے، اور روزی پہنچاتا ہے انہیں نفع پہنچاتا ہے۔

آپ غور فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور انعام ان لوگوں پر جو اسے ایذاء پہنچانے والے پر کتنا ہے تو اس شخص سے متعلق آپ کا کیا گمان ہے اپنے اس کے نافرمانوں کی جانب سے تکلیفیں سہنا ہے، اس کے احکامات کی بجا آوری اور منع کردہ چیزوں سے رکتا ہے اس حدیث میں ہمیں بھی تکالیف کے سہنے' بدلہ نہ لینے اور اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے متصف ہونے کا درس ہے۔

تخریج: نسائی نے بھی اسے روایت کیا ہے۔

بندوں پر اللہ تعالیٰ کا حق

۲۴: وَعَنْ مُعَاذٍ قَالَ کُنْتُ رِدْفَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلٰی حِمَارٍ لَیْسَ بَیْنِیْ وَبَیْنَهٗ اِلَّا مُؤْخِرَةُ الرَّحْلِ فَقَالَ یَا مُعَاذُ هَلْ تَدْرِیْ مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلٰی عِبَادِهٖ وَمَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَی اللّٰهِ قُلْتُ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّ حَقَّ اللّٰهِ عَلَی الْعِبَادِ اَنْ یَعْبُدُوْهُ وَلَایُشْرِکُوْابِهٖ شَیْئًا وَّحَقُّ الْعِبَادِ عَلَی اللّٰهِ اَنْ لَّا یُعَذِّبَ مَنْ لَّایُشْرِكُ بِهٖ شَیْئًا فَقُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا اُبَشِّرُبِهِ النَّاسَ قَالَ لَا تُبَشِّرْهُمْ فَیَتَّکِلُوْا۔

(متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ٥٨/٦حدیث ٢٨٥٦ومسلم فی صحیحه ٥٨/١حدیث (٤٨۔٣٠)والترمذی ٢٦/٥ حدیث رقم٢٦٤٣۔ وابن ماجة فی سننه ١٤٣٥/٢حدیث٤٢٩٦۔

ترجمه: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ ایک سفر کے دوران سواری کے گدھے پر میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا میرے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان کجاوے کی پچھلی لکڑی حائل تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے پوچھا۔ اے معاذ جانتے ہو کہ بندوں پر اللہ کا حق کیا ہے؟ میں نے جواب میں عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ

ﷺ نے ارشاد فرمایا بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کریں اور اللہ تعالیٰ پر بندوں کا حق یہ ہے کہ جس نے کسی کو اللہ کے ساتھ شریک نہ کیا ہو اس کو عذاب نہ دے۔ آپ ﷺ کا ارشاد سن کر میں نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول کیا یہ بشارت لوگوں کو سنا دوں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کو یہ بشارت نہ سناؤ۔ کیونکہ لوگ اسی پر اعتماد کر کے بیٹھ جائیں گے اور عمل کرنا چھوڑ دینگے۔ (بخاری، مسلم)

راویٔ حدیث:

معاذ بن جبل۔ یہ "معاذ" ہیں۔ "جبل" کے بیٹے ہیں، ابو عبدالرحمٰن کنیت ہے۔ انصاری خزرجی ہیں۔ یہ انصار کے ان ستر (۷۰) اشخاص میں سے ہیں جو بیعت عقبہ ثانیہ میں حاضر ہوئے تھے۔ بدر اور دوسرے غزوات میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو بحیثیت قاضی و معلم یمن روانہ فرمایا تھا۔ ان سے عمر ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم اور بہت سے لوگوں نے روایت کی۔ اٹھارہ (۱۸) سال کی عمر میں مسلمان ہوئے۔ یہ بعض کا قول ہے۔ ان کو حضرت عمر نے ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے بعد شام کا حاکم مقرر فرمایا۔ اسی سال ۱۸ھ میں بعمر ۳۸ سال طاعون عمواس میں ان کی وفات ہوئی اور بھی کچھ اقوال اس بارے میں نقل کیے گئے ہیں۔ "معاذ" میم کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: **قوله: قال كنت ردف النبی ﷺ على حمار ليس بينی وبينه الا مؤخرة الرحل:**

"ردف": راء کے کسرہ اور دال کے سکون کے ساتھ۔ "ردف" جو شخص سوار کے پیچھے سوار ہو۔ ردف بمعنی الخمز (پیٹھ) سے ماخوذ ہے۔

"مؤخرة": میم کے ضمہ اور ہمزہ کے سکون کے ساتھ ہے۔ کبھی ابدال بھی ہوتا ہے۔ اور پھر خاء مکسورہ ہے۔ یہی صحیح ہے۔ اس میں ایک اور لغت ہمزہ کے فتحہ اور خاء مشددہ مکسورہ کی بھی ہے اور کبھی مفتوح بھی ہوتی ہے۔ "مؤخرة" وہ لکڑی جو سوار کے پیچھے ہوتی ہے۔

الا مؤخرة: استثناء مفرغ ہے۔

یعنی میں آپ ﷺ کا ردیف تھا۔ سواری کا ذکر قصہ کے خوب یاد ہونے اور آپ ﷺ کی تواضع کی طرف اشارہ ہے۔

یہ کہنا کہ "میرے اور آپ ﷺ کے درمیان سواری کے کجاوے کا پچھلا حصہ حائل تھا" شدتِ قرب کو بتا رہا ہے کہ بات پورے طور پر ضبط ہے۔

قوله: فقال يامعاذ هل تدری ما حق الله عباده؟

درایت و معرفت میں فرق:

علامہ زمخشری فرماتے ہیں: درایت چالاکی سے کسی چیز کے جاننے کو کہتے ہیں۔ اسی لئے باری تعالیٰ کو اس کے ساتھ متصف نہیں کیا جا سکتا ہے، اسی طرح معرفت بھی اللہ تعالیٰ کی صفت نہیں بن سکتی کہ وہ جہالت سابقہ کو مستلزم ہے بخلاف علم کے۔ یا معرفت کا تعلق جزئیات کے جاننے سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کلیات و جزئیات کو جانتا ہے۔

قوله: وما حق العباد على الله؟:

"حق اللہ" کا معنی اس کے واجب ولازم ہونے کے ہیں جبکہ "حق العباد" کا معنی لائق ومناسب کے ہیں، کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا کسی ربّ نہ بنائے حکمت کی رو سے احسان مناسب ہے اور اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز لازم نہیں برخلاف معتزلہ کے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ بندوں کا حق وہ ہے جس کا ان سے وعدہ فرمایا ہے اور جس کا وعدہ باری تعالیٰ خود فرمائیں اس کی بجا آوری واجب ہے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کے سچے وعدہ کی بناء پر حق ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "بندوں کا اللہ پر حق مشاکلت ومقابلہ کے طور پر ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کلام اس قبیل سے ہو کہ ایک آدمی دوسرے سے کہے: **حقك واجب علي** کہ آپ کا حق مجھ پر لازم ہے یعنی میں تاکیدی طور پر اس کی بجا آوری کروں گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اسی قبیل سے ہے: **حق على كل مسلم ان يغتسل فى كل سبعة ايام** (ہر مسلمان پر ہفتہ میں ایک بار غسل کرنا لازم)۔

قوله: فان حق الله على العباد ان يعبدوه ولا يشركوا أحدا:

فان: فاء کا ترتب کلام محذوف پر ہے: **اذا فضقت فاعلم ان**۔

"**ولا يشركوا أحدا**": واؤ مطلق جمع کے لیے ہے اور یہ جملہ تاکید یا تخصیص ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس کی توحید کا اقرار کریں یا اس کو معبود ورب قرار دینے کے مقتضی کے مطابق اس کی عبادت وبندگی بجا لائیں۔

قوله: وحق العباد على الله ان لا يعذب من لا يشرك به شيئا:

"حق": منصوب ہے اور اس کا مرفوع پڑھنا بھی جائز ہے۔

"شیئاً": (یا مفعول بہ ہے) أی **شيئا من الاستياء** اشیاء میں کسی چیز کو شریک نہ بنائے، یا (مفعول مطلق ہے) أی **شيئا من الاشراك** شرک میں ذرا بھی شرک نہ کرے۔ **لا لعذب من الخ** یعنی اسے ہمیشگی کا عذاب نہ دے۔ لہٰذا اس اُمت کے گناہگار افراد کی بڑی تعداد کا جہنم میں داخل ہونا اسکے منافی نہیں جیسا کہ احادیث صحیحہ بلکہ متواترہ سے یہ بات ثابت ہے اسی وجہ سے علماء نے اس پر ایمان کو ضروری قرار دیا ہے۔

اگر آپ اعتراض کریں آپ کا یہ دعویٰ کیونکر صحیح ہے جبکہ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ہمارے نزدیک یہ بات لازمی نہیں ہے کہ اُمت کا کوئی فرد ضرور جہنم میں داخل ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ ﴿وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [النساء: ٤٨]

اور ارشاد: ﴿يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا﴾ [الزمر: ٥٣] کا مقتضی یہ ہے کہ پوری اُمت کی معافی کی امید رکھی جائے"۔

میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بالکل دخول جہنم کی نفی نہیں کی بلکہ اس کے لازمی وحتمی ہونے کی نفی فرمائی ہے اور عموم وعدہ کی بناء پر سب کی معافی کے امکان کا ذکر کیا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے گناہگاروں کے بارے میں دوزخ میں داخل ہونے کی خبر

دی ہے اس سے علامہ بیضاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تعرض نہیں کیا' وہ فرماتے ہیں: مذکورہ وعدہ کی رو سے عام معافی لازم آتی ہے''۔اور وہ دوزخ میں داخل نہ ہونے کو مستلزم نہیں' اس لئے کہ ممکن ہے بعض گناہگاروں کو جہنم میں داخلہ کے بعد پورا پورا عذاب دینے سے پہلے معافی ہو جائے۔اھ۔

اس توجیہہ کے باوجود علامہ بیضاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی مذکورہ بات محلِ نظر ہے اس لئے کہ نصوص دلالت کرتی ہیں کہ بہت سے لوگ جہنم میں داخل کیے جائیں اور انہیں اس قدر عذاب ہوگا کہ ان کے بدن جل کر کوئلہ ہو جائیں گے لہٰذا اس بات پر ایمان لانا ضروری ہے۔

قوله: فقلت: يا رسول الله! أفلا ابشر به الناس؟:

بشارت کسی کو ایسی خبر دینے کا نام ہے جس سے اس کے چہرہ پر خوشی کے اثرات ظاہر ہوں۔ جہاں تک باری تعالیٰ کے اس ارشاد کا تعلق ہے: ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ [آل عمران:٢١] بطور تہکم کے ہے یا اس سے صرف خبر پہنچانے کے معنی مراد ہیں بشارت کے معنی کی تجرید کر لی گئی۔

یعنی عام لوگوں کو بھی خوشخبری سنا دوں۔''فا'' شرط مقدر کے جواب میں ہے، **اى اذا كان كذلك أفلا أبشرهم بماذكرت من حق العباد** مطلب یہ ہے کہ جب ایسا ہے تو بندوں کا جو حق ذکر فرمایا' کیا میں انہیں اس کی بشارت نہ دے دوں؟

قوله: قال: لا تبشرهم فيتكلوا:

''**فيتكلوا**'': نہی کے جواب میں ''فاء'' کے بعد أن مقدر ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

بعض نہی کچھ لوگوں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی حدیث سے امام بخاریؒ نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ عالم کے لیے جائز ہے کہ بعض لوگوں کو ایک بات بتائے اور دوسرے لوگوں کو نہ بتائے کہ وہ سمجھ نہ پائیں گے۔

کبھی اس جیسی احادیث کو اہلِ اباحت کے قائلین احکام چھوڑنے بلکہ ان کے رفع کا ذریعہ بنا لیتے ہیں جو عقبی کی بربادی کے ساتھ ساتھ دنیا کی تباہی کا بھی باعث بنتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ اعتماد کر کے بیٹھ جائیں گے اور اللہ کے حق کی ادائیگی میں کوشش چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ نہی ایک ساتھ سبب اور مسبب پر واقع ہے **اى لا يكن منك تبشير فاتكال منهم**۔یعنی تمہاری طرف سے خوشخبری نہ ہو کہ ان کی طرف سے اسی پر بھروسہ ہو جائے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو اس کے روایت کرنے سے روکا تھا اس کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ نے اسے اس لئے روایت فرمایا کہ آپ رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ زمانے وحالات کے تبدیل ہونے سے یہ خبر دینا متغیر ہو جائے گا۔ اس وقت لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے احکام کی بجا آوری کے عادی نہ تھے (اس لئے انہیں اطلاع نہ دی) پھر جب وہ اسلام پر پکے ہو گئے اور استقامت اختیار کر لی تو آپ رضی اللہ عنہ نے انہیں یہ حدیث بتا دی۔

یا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے علم کی تبلیغ کا حکم اور اسے چھپانے پر وعید وارد ہوئی تو آپ رضی اللہ عنہ نے اسے روایت فرمایا

کیونکہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اپنی جلالتِ شان کی وجہ سے اس بات سے ناآشنا تھے کہ علم پھیلانے کا ثواب اور اسے چھپانے کا وبال کس قدر ہے۔ لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے فی الجملہ اسے روایت کرنا واجب سمجھا۔ اس بات کی تائید اس کے بعد والی حدیث سے ہوتی ہے کہ آپ نے اپنی وفات کے وقت گناہ سے بچنے کے لیے اسے روایت فرمایا۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دینے سے منع فرمایا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اہلِ ایمان کو خود یہ بشارت دیدی تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے بتانے سے منھی عنہ کا ارتکاب لازم نہیں آیا اس لئے کہ نہی تبشیر سے تھی نہ کہ خبر دینے سے۔

تخریج: ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے بھی اسے روایت کیا ہے۔

جہنم سے بچاؤ کا آسان راستہ

۲۵: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمُعَاذٌ رَدِیْفُہٗ عَلَی الرَّحْلِ قَالَ یَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَ سَعْدَیْکَ قَالَ یَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَسَعْدَیْکَ قَالَ یَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَسَعْدَیْکَ ثَلَاثًا قَالَ مَامِنْ اَحَدٍ یَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ صِدْقًا مِنْ قَلْبِہٖ اِلَّا حَرَّمَہُ اللّٰہُ عَلَی النَّارِ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَفَلَا اُخْبِرُ بِہِ النَّاسَ فَیَسْتَبْشِرُوْا قَالَ اِذًا یَتَّکِلُوْا فَاَخْبَرَ بِھَا مُعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِہٖ تَاَثُّمًا. (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ١/٢٢٦ حديث ١٢٨ ومسلم ١/٦١ حديث (٥٣-٣٢)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سواری پر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ اے معاذ۔ انہوں نے جواباً عرض کیا اے اللہ کے رسول میں حاضر ہوں اور اطاعت کے لئے تیار ہوں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے معاذ۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول میں حاضر ہوں اور اطاعت کے لئے تیار ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا۔ اے معاذ۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول میں حاضر ہوں اور اطاعت کے لئے تیار ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ اسطرح خطاب کرنے کے بعد حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ اللہ کا جو بندہ صدق دل سے اس بات کی شہادت دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود مشکل کشا اور حاجت روا نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں تو اس پر اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ کو حرام کر دیتا ہے۔ یہ بات سن کر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول کیا میں یہ بشارت لوگوں کو سنا دوں۔ تاکہ لوگ اس بشارت کو سن کر خوش ہو جائیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں لوگ اسی پر اعتماد کر لیں گے اور اعمال چھوڑ دیں گے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بالآخر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اس ڈر سے کہ حدیث کو مخفی رکھنے کا گناہ نہ ہو اپنی وفات کے وقت اس حدیث کو بیان کر دیا تھا۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: ان النبی ﷺ ومعاذ ردیفه علی الرحل......وسعدیك ثلاثا :

"معاذ لا دیفه": انّ کے اسم اور اس کی خبر کے درمیان واقع یہ جملہ حالیہ ہے۔

"لبیك": تثنیہ، مضاف ہے۔ غیر محصور طور پر تکرار کے لئے آتا ہے۔ لب بمعنی اجاب سے ماخوذ ہے۔ یعنی میں یکے بعد دیگرے آپ کی پکار کا جواب دیتا ہوں، یا لب بمعنی اقام سے ماخوذ ہے۔ أو أقمت علی طاعتك اقامة بعد اقامة میں بار بار آپ کی طاعت کی بجا آوری کروں گا۔

"یا رسول الله": ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کے نسخہ میں حرف ندا' موجود نہیں ہے' چنانچہ وہ لکھتے ہیں کمال قرب کی وجہ سے حرف نداء کو حذف کر دیا گیا۔

"وسعدیك": لبیک پر عطف ہے۔ أی ساعت طاعتك مساعدة بعد مساعدة یعنی میں بار بار آپ کی فرمانبرداری (کے لیے تیار ہوں) کہ اپنے لئے سعادت سمجھتا ہوں۔

"قال: یا معاذ! قال: لبیك رسول الله وسعدیك": آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ اس لئے نداء دی تا کہ جو بات انہیں بتائی جا رہی ہے اس کا خوب اہتمام کریں اور پورے چوکنے ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سنیں تا کہ بات ان کے دل میں راسخ ہو جائے اچھی طرح اسے یاد کر کے محفوظ کر لیں۔

"قال: یا معاذ! قال: لبیك رسول الله وسعدیك- ثلاثا": أی وقع هذا النداء والجواب ثلاث مرات یعنی یہ نداء اور جواب تین مرتبہ ہوا۔ تمام صحیح نسخوں میں رسول اللہ سے پہلے حرف نداء محذوف ہے اور علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے نسخہ میں تیسری بار حرف نداء موجود ہے جس کی توجیہہ میں علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے بہت اطناب سے کام لیا۔

قوله: قال : ما من احد......حرمه علی النار:

ایک نسخہ میں قال مکرر مذکور ہے یعنی "قال: قال مامن احد الخ"

"ما من احد": مِنْ زائدہ ہے نفی استغراق کے لیے ہے اور أحد مبتدا ہے اور اس کی صفت "یشهد أن لا اله الا الله وأن محمدًا رسول الله صدقا": فعل محذوف کا مصدر ہے أی یصدق صدقًا من قلبه صدقًا کی صفت ہے۔ اس لئے کہ صدق کبھی دلی اعتقاد سے نہیں ہوتا جیسے منافق کا کہنا: "انك لرسول الله" یا صدقًا۔ بمعنی صادقا حال واقع ہو رہا ہے یشهد کے فاعل سے۔

"الا حرّمه الله علی النار": مبتداء کی خبر یہ استثناء مفرغ ہے۔ أی ما من أحد یشهد محرم علی شیئ الامحرمًا علی النار۔

مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص بھی جو شہادت کا اقرار کرتا ہو اس پر کوئی خبر ممنوع نہیں سوائے اس کے کہ وہ آگ پر حرام ہے۔ اور تحریم بمعنی منع ہے۔ سلف کی ایک جماعت جن میں ابن المسیب بھی ہیں' سے منقول ہے کہ یہ فرائض اور اوامر و نواھی کے نزول سے پہلے کا ارشاد ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جس نے کلمہ پڑھا اور اس کے حق اور فریضہ کو اداء کیا پس اوامر کی بجا آوری اور نواھی سے اجتناب شہادتین کے تحت آ گیا۔ یہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

بعض حضرات نے کہا کہ یہ بات اس آدمی کے بارے میں ہے جو نادم ہو کر توبہ کرتے ہوئے کلمہ پڑھ لے پھر اسی حالت پر اس کی وفات ہو جائے اور اسے کسی اور فرض کی بجا آوری کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہ امام بخاری کا قول ہے۔ سب سے قریب تربات

یہ ہے کہ جہنم میں ہمیشہ رہنے کی حرمت مراد لی جائے۔

قولہ:قال:یا رسول اللہ افلا أخبر بہ الناس فیتبشروا؟:

أبشر کی جگہ أخبر کا استعمال تجرید کے طور پر ہے یا اصل لغت کی طرف رجوع کرتے ہوئے اس کو استعمال فرمایا یا آپ ﷺ کے ارشاد "فیستبشروا" پر اکتفاء کرتے فرمایا۔

یعنی وہ خوش ہو جائیں گے بایں طور کہ خوشی کے آثار ان کے چہرے پر ظاہر ہونگے کیونکہ اس میں ان کے بڑی معافی کا اعلان ہے چونکہ یہ بات انہوں نے اس سے قبل نہ سنی ہوگی۔

قولہ:قال اذا یتکلوا:

"اذن": حرف جواب اور جزاء ہے اور کبھی محض جواب کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ یہاں ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ انہیں اس کی خبر نہ دیں اس لئے کہ اگر آپ نے انہیں یہ بتا دیا اور یہ خوشخبری انہیں سنا دی تو وہ پروردگار کے الطاف وانعامات پر بھروسہ کر کے اس کی عبودیت کا حق چھوڑ دیں گے جس سے ان کے درجات میں کمی اور ان کے حالات ابتر ہو جائیں گے اور یہ عوام کی اکثریت کا حکم ہے ورنہ خواص کا علم تو یہ ہوتا ہے کہ جب بھی انہیں خوشخبری سنائی جاتی ہے تو وہ عبادت میں اور اضافہ کر دیتے ہیں جیسا کہ عشرہ مبشرہ اور دیگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا طرز عمل رہا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے جب دریافت کرنے والے نے پوچھا کہ آپ رات کو اتنا طویل قیام کیوں فرماتے ہیں کہ آپ کے قدم مبارک پر ورم آ جاتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے سب لغزشوں کو معاف فرما دیا ہے تو آپ ﷺ نے جواب ارشاد فرمایا: **افلا أکون عبدا شکورا** کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

قولہ:فاخبر بھامعاذ عند موتہ تأثما:

"عنہ موتہ": ظاہر یہ ہے کہ **موتہ** کی ضمیر کا مرجع معاذ ہیں۔ علامہ کرمانی فرماتے ہیں یہ بھی احتمال ہے کہ ضمیر نبی اکرم ﷺ کی طرف راجع ہو۔

"تأثما": مفعول لہ ہے۔ یعنی علم چھپانے کے گناہ سے اجتناب واحتراز کرتے ہوئے۔ چونکہ حدیث میں آتا ہے: **"من کتم علما الجم بلجام من نار"** جو کوئی علم کو چھپائے اسے آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔

نجات کا آسان راستہ

۲۶ :وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَعَلَیْہِ ثَوْبٌ اَبْیَضُ وَھُوَ نَائِمٌ ثُمَّ اَتَیْتُہٗ وَقَدِ اسْتَیْقَظَ فَقَالَ مَامِنْ عَبْدٍ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰی ذٰلِکَ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّۃَ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قَالَ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قَالَ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قَالَ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ عَلٰی رَغْمِ اَنْفِ اَبِیْ ذَرٍّ وَکَانَ اَبُوْ ذَرٍّ اِذَا حَدَّثَ بِھٰذَا قَالَ وَاِنْ رَغِمَ اَنْفُ اَبِیْ ذَرٍّ. (متفق علیہ)

البخاری فی صحیحہ ۱۰/۲۸۳ حدیث رقم ۵۸۲۷۔مسلم فی صحیحہ ۱/۹۵ حدیث رقم(۱۵۴۔۹۴)وأحمد فی المسند ۵/۱۶۶۔

ترجمہ: حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔اس وقت آپ ﷺ ایک سفید رنگ کا کپڑا اوڑھے سو رہے تھے۔(میں واپس لوٹ آیا)۔کچھ دیر کے بعد دوبارہ آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اس وقت بیدار ہو چکے تھے۔آپ ﷺ نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ جس آدمی نے سچے دل سے لا الہ الا اللہ پڑھا۔یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کی صدق دل سے تصدیق کی اور اسی عقیدہ پر اس کی وفات ہوئی تو وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا۔اگرچہ اس آدمی نے چوری اور زنا کا ارتکاب کیا ہو۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں۔اگرچہ اس نے چوری اور زنا کے جرم کا ارتکاب کیا ہو۔میں نے پھر تعجب سے دوبارہ سوال کیا۔اگرچہ اس نے چوری اور بدکاری جیسے بڑے گناہوں کا ارتکاب کیا ہو۔آپ ﷺ نے فرمایا ہاں اگرچہ اس نے چوری اور زنا کا ارتکاب کیا ہو۔میں نے پھر تیسری مرتبہ حیرت سے عرض کیا۔اگرچہ اس نے چوری اور زنا کا ارتکاب کیا ہو۔آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔اگرچہ اس نے چوری اور زنا کا ارتکاب کیوں نہ کیا ہو۔(بات یہی ہے) اگرچہ ابوذرؓ کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔راوی کہتے ہیں جب بھی حضرت ابوذرؓ اس حدیث کو بیان کرتے تھے۔تو فخر کے طور پر یہ آخری فقرہ (وَإِنْ رَغِمَ أَنْفُ أَبِي ذَرٍّ) ''اگرچہ ابوذر (رضی اللہ عنہ) کو کتنا ہی ناگوار گزرے'' ضرور نقل کرتے تھے۔(بخاری۔مسلم)

راویٔ حدیث:

ابوذر الغفاری۔ ابوذر کا نام جندب ہے۔ان کے والد ''جنادہ'' ہیں۔یہ بلند مرتبہ مشہور تارک الدنیا اور مہاجرین صحابہ میں سے ہیں۔مکہ میں شروع میں اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ یہ ایمان لانے والوں میں سے پانچویں صحابی ہیں۔پھر یہ اپنی قوم میں لوٹ گئے تھے۔اور مدت تک ان کے پاس رہے۔یہاں تک کہ غزوۂ خندق کے بعد آنحضور ﷺ کے پاس مدینہ طیبہ میں حاضر ہوئے پھر مقام ''بذہ'' میں قیام کیا اور ''بذہ'' میں ہی ۳۲ھ خلافت عثمان کے زمانہ میں وفات ہوئی۔آنحضور ﷺ کی بعثت سے قبل ہی عبادت کیا کرتے تھے ان سے بہت سے صحابہ اور تابعین نے روایت کی ہیں۔

تشریح: ''وعلیه ثوبٌ أبیض وهونائم'':''وعلیه ثوب ابیض'': یہ جملہ النبی ﷺ سے حال ہے۔شراح فرماتے ہیں کہ یہ اضافہ وعلیه ثوب ابیض ایسی کوئی زائد بات نہیں جس کا کوئی فائدہ نہ ہو بلکہ راوی کا مقصود اس کے ذکر سے یہ بتانا ہے کہ اس نے اس روایت میں نہایت اہتمام واحتیاط سے کام لیا تاکہ سامعین کے دلوں میں راسخ ہو جائے۔میں کہتا ہوں یا راوی کا مقصود نبی اکرم ﷺ کی ذات انور اور آپ ﷺ کی عمدہ پوشاک کے ذکر سے یہ بتانا ہے کہ گویا وہ آپ کی خدمت اقدس میں حاضر اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے کھڑا ہے۔

''وهو نائم'': اس کا عطف حال پر ہے۔**قوله:** تم أتیته وقد استیقظ: ضمیر منصوب سے حال ہے مطلب یہ ہے کہ جب میں دوبارہ آیا تو میں نے آپ ﷺ کو نیند سے بیدار پایا۔**قوله:** ما من عبد قال لا اله الا الله: آپ نے کلمہ طیبہ میں محمد رسول اللہ کا تذکرہ اس لئے نہیں فرمایا کہ یہ سب کو معلوم ہے کہ اس کے بغیر کلمہ نفع بخش نہیں ہے۔

"ثم مات علی ذلك": "ثم" رتبہ کی تراخی کے لیے ہے اور اسم اشارہ کا مشارالیہ "الاعتقاد" محذوف ہے۔ کلمہ طیبہ کے اقرار کو اس قید کے ساتھ مقید فرمانا اس حقیقت کے پیش نظر ہے کہ اعتبار خاتمہ کا ہے۔ "الا دخل الجنة": استثناء مفرغ ہے۔ أي لایکون له حال من الأحوال الاحال الاستحقاق دخول الجنة مطلب یہ ہے اس کا سب احوال میں سے کوئی حال نہیں سوائے اس کے کہ وہ اس حال میں ہے کہ جنت کا مستحق ہے۔ اس جملہ میں اس کے انجام کار دخولِ جنت کی بشارت ہے اگرچہ اس نے بڑے بڑے گناہ کئے نہ ہوں لیکن اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اگر وہ چاہے تو اسے معاف کر کے جنت میں داخل فرمادے اور اگر وہ چاہے تو اس کے گناہ کے بقدر اس کو عذاب دیکر پھر جنت میں داخل فرمائے۔

"قلت: وان زنٰی؟ وان سرق": ابن مالک کہتے ہیں کہ "وان زنی؟" میں حرف استفہام مقدر ہے اور اس کو مقدر ماننا ضروری ہے أي ایدخل الجنة وان زنی آیا وہ باوجود زناکاری کے جنت میں داخل ہو جائے گا؟

"وان سرق؟": یا تقدیری عبارت یوں ہے: وان زنی وان سرق دخل الجنة۔ اس واؤ کو واؤ مبالغہ کہتے ہیں اور اس کے بعد والے "اِن" کو وصلیہ کہا جاتا ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے جس پر اس کا ماقبل دلالت کرتا ہے۔

ان دو گناہوں کو خصوصیت سے اس لئے ذکر فرمایا کہ گناہ کا تعلق حقوق اللہ سے ہو گا تو وہ زنا ہے اور اگر بندوں کے حقوق سے ہوگا اور تو ان کا ناحق مال لینا ہے اور ان دونوں کو ذکر کر کے تمام گناہوں کا استیعاب مقصود ہے جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا﴾ [مریم: ٦٢] میں بھی استیعاب مراد ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا بار بار پوچھنا اس بناء پر تھا کہ وہ کبیرہ گناہوں کے ارتکاب کے باوجود جنت میں داخلہ کو بہت بڑی چیز سمجھتے تھے اور بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اس لئے پوچھا تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی دوسرا جواب دیدیں جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی دوسرا فائدہ حاصل ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بار بار ارشاد فرمانا ان کے بڑے سمجھنے کا انکار تھا، یعنی تم اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حق میں بخل سے کیوں کام لیتے ہو؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت باوجود تیری ناگواری کے اپنی مخلوق پر بہت وسیع ہے۔

اس بات کی دلیل موجود ہے کہ کبائر کا ارتکاب کرنے والوں سے اسم ایمان سلب نہیں ہوتا۔ اسلئے کہ جو مؤمن نہیں وہ بالاتفاق جنت میں داخل نہ ہوگا۔ نیز وہ (یعنی ارتکاب کبائر) نیک اعمال کو ضائع نہیں کرتا اسلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمومی حکم فرمایا اور اس میں کوئی تفصیل نہیں فرمائی۔

علی رغم انف ابی ذر": "رغم" میں فتحہ بنسبت ضمہ زیادہ مشہور ہے اور کسرہ بھی حکایت کیا گیا ہے اس کے معنی ہیں "الکرہ" اس بات سے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے۔

"وکان ابو ذر اذا احدّث": نسخہ صحیحہ میں اسی طرح ہے۔ قال: بطورِ تفاخر کے ارشاد فرماتے۔ وان رغم: غین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ بعض حضرات نے ضمہ اور فتحہ کا قول بھی کہا ہے۔ انف ابی ذر رغام فتحہ کے ساتھ مٹی مجازاً ناگواری محسوس کرنا یا ذلیل ہونا کے معنی مراد ہیں۔ اس میں سبب کا اطلاق مسبب پر ہوگا۔

نجات کے بنیادی اصول

۲۷ :وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاَنَّ عِيْسٰى عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ وَابْنُ اَمَتِهٖ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ عَلٰى مَا كَانَ مِنَ الْعَمَلِ. (متفق عليه)

أخرجه البخاری ٦/٤٧٤حديث رقم ٣٤٣٥ـومسلم ١/٥٧حديث (٤٦ـ٢٨)وأخرجه أحمد فی المسند٥/٣١٤ـ وأخرجه النسائی "فی اليوم والليلة ص ٦٠٣حديث ١١٣٠ـ

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو انسان (تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان کے ساتھ) اس بات کی شہادت دے کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور اس بات کی بھی شہادت دے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں اور اللہ کی بندی حضرت مریم صدیقہ کے بیٹے اور اس کا کلمہ ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کی طرف ڈالا تھا اور اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی روح ہیں اور اس بات کی بھی شہادت دے کہ جنت اور جہنم دونوں برحق ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کو جنت میں ضرور داخل کریگا چاہے اس کے اعمال کیسے ہی ہوں۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: من شهد ان لا اله الا الله ......وابن امته:

"وأن عيسٰى عبد الله": عبدہ ضمیر کی بجائے اسم جلالہ کا لفظ اس لئے ذکر فرمایا تاکہ مقصود بالکل کھل کر واضح ہو جائے اور نصاریٰ پر تعریض بھی ہے (جو آپ کو ابن اللہ کہتے ہیں) اور آپ بندہ ہونے کی تقریر ہے اور عیسائیوں کے اس عقیدہ کا ابطال بھی بتانا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ آپ کی والدہ کو اللہ تعالیٰ نے (نعوذ باللہ) بیوی بنایا۔

"ورسوله": کے الفاظ میں یہود کے لیے تعریض ہے (جو حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ السلام کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کرتے ہیں)۔ وابن أمته: نسخہ صحیحہ میں اسی طرح ہے۔ أمة (بندگی) کی نسبت واضافت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی شرافت کے اظہار اور یہ کلام یہود جو ان پر تہمت لگاتے تھے اس کی تردید کے لیے فرمائی۔

قوله :وكلمته القاه الى مريم وروح منه:

① حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ السلام کو کلمۃ اللہ اس لیئے کہا جاتا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی حجت ودلیل ہیں انہیں اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے پیدا فرمایا اور اس وقت میں انہیں قوتِ گویائی عطا فرمائی جس وقت عام طور پر بچہ بات چیت نہیں کرسکتا لہٰذا اضافت شرافت کے اظہار کے لئے ہے۔ ② بعض حضرات نے فرمایا کہ آپ ﷺ کو کلمہ اس لئے کہا گیا کہ آپ کو کلمہ "کن" سے وجود میں لایا گیا۔ ③ بعض حضرات نے کہا کہ آپ کے کلام سے لوگوں کو فائدہ پہنچا اس لئے آپ کو یہ نام دیا گیا جیسے کہا جاتا ہے فلاں سیف اللہ (اللہ کی تلوار) اور اسد اللہ ہے۔ ④ بعض حضرات نے فرمایا: آپ کو خصوصیت کے ساتھ بچپن میں جب

کلام کی صلاحیت عطا فرمائی اسلیئے بایں طور کہ آپ نے فرمایا: انی عبد الله اس لئے آپ کو کلمۃ اللہ کہا جاتا ہے۔

"القاها الى مريم": جملہ مستانفہ مبینہ ہے۔اس جملہ کا مطلب ہے أو صلها الله تعالٰى اليها وحصلها فيها۔یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی والدہ تک پہنچایا اوران میں آپ کو بھیجا۔"ولا وح منه: محض اللہ کے ارادہ سے آپ کی تخلیق کی ابتداء ہوئی، کیونکہ تمام ارواح انسانیہ گویا کہ وہ اپنے آباء کی ارواح سے جنم لیتی ہیں خصوصاً ان حضرات کے مذہب کی رو سے جو سمجھتے ہیں کہ ارواح بدن میں سرایت کرنے والے اجسام ہیں جو گلاب کے پانی کی طرح سرایت کرتے ہیں۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ آپ ﷺ کو روح اس لئے کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے تھے تو آپ ﷺ روح کی مانند ہوئے۔

یا اس لئے کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ جسم وروح والے ہیں لیکن کسی ذی روح کا جزو نہیں ہیں جیسے وہ نطفہ ہوتا ہے جو زندہ سے الگ ہوتا ہے۔آپ محض اللہ تعالیٰ کے اختراع سے وجود میں آئے۔

یا اس لئے کہ آپ روح الآمین کی پھونک سے معرضِ وجود میں آئے کہ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو آپ ﷺ کی والدہ کے پاس بھیجا انہوں نے ان کی قمیص جو آگے سے پھٹی ہوئی تھی اس میں پھونک ماری جو ان تک پہنچی جس سے وہ حاملہ ہوئیں اس حالت میں کہ وہ نطفہ کی تابیث اور پیدائش کے مختلف اطوار مثلاً خون کا جمنا پھر لوتھڑا بننا سے پاک رہیں۔

اور روح کی نسبت جو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمائی اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے مقرب اور اس کے حبیب ہیں یہود پر تعریض ہے۔

روایت میں آتا ہے کہ ایک بڑے عیسائی نے کسی کو تلاوت کرتے ہوئے یہ پڑھتے سنا: وروح منه۔ تو اس نے کہا: کیا نصارٰی کا دین اس سے مختلف ہے؟ یعنی یہ تو بعینہٖ نصارٰی کا دین ہے۔مطلب یہ کہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ عیسٰی علیہ السلام اللہ کا بعض ہیں۔تو علی بن حسین بن واقد نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ﴾ [الجاثية : ١٣]

پس اگر اس کے ارشاد "روح منه" سے مراد اس کا بعض یا اس کا جزء ہے تو پھر سب کچھ اس کا بعض یا اس کا جزء ہے۔اس سے نصرانی مسلمان ہو گیا اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمام اشیاء کی تسخیر اسی کی طرف سے ہے اور سب کا بنانے اور پیدا کرنے والا ہی ہے۔

قوله: والجنة والنار حق:

منصوب اور مرفوع پڑھ سکتے ہیں۔

یہ مبالغہ کے طور پر فرمایا جیسا کہ زید عدل یا حق صفت مشبہ ہے، أى ثابت اور اسے مفرد اس لئے ذکر کیا کہ وہ مصدر ہے یا جنت اور جہنم میں سے ہر ایک مراد ہے۔

اور اہلِ تحقیق کے کلام میں ہے کہ جنت وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے افعال اور ملائکہ مقربین وروحانیہ طبقات اُرواح اور عالم سماوات کی معرفت کا حصول جنت ہے بایں طور کہ سالک کی روح اس آئینہ کی مانند ہو جائے جو عالم قدس کے

برابر ہو۔ اس کے درخت اچھے ملکات اور سعادت بخش اخلاق اور ایسے دوسرے اچھے اعمال ہیں اور اس کے ثمرات مکاشفات ومشاہدات اور اشارات اور دیگر مواہب ہیں۔ جو فقط جنت حسیہ پر راضی ہو گیا وہ بے وقوف ہے اور جو حق سے مُنہ موڑے اور محبت وقرب کی روح سے قہر وبُعد کی سیاست کی طرف منتقل ہو اور علوی جہت سے عالم دوزخ کی طرف پستی میں چلا جائے تو اسے ایسی روحانی آگ کے ذریعہ سزا ملے گی جو قہر الٰہی کی صفت کے غلبہ سے پیدا ہو گی چنانچہ وہ جسمانی آگ کی بنسبت زیادہ سخت اور دیر پا عذاب کا باعث ہو گی، اس لئے کہ اس کی حرارت اس روحانی ملکوتی آگ جو اللہ کے غضب کی آگ کے شعلہ کے کئی درجہ نزول کے بعد ہوتی ہے' کے تابع ہے۔ جیسا کہ وہ نفس کے مرتبہ میں بصورت غضب نزول کرتی ہے اور وہ غیر متناہی ہے۔ یہی مطلب ہے اس بات کا جو کہی جاتی ہے کہ جہنم کی آگ کو ستر مرتبہ پانی سے دھویا گیا ہے۔ پھر دنیا میں اتاری گئی تا کہ اس سے نفع حاصل کیا جا سکے۔

قوله: أدخله الله الجنة على ما كان من العمل

جملہ جواب شرط یا مبتداء کی خبر ہے۔ **على ما كان: أدخله الله** کی ضمیر مفعول سے حال ہے۔ **أي كائنا على ما كان عليه موصوبه من العمل۔**

ابتداء انتہاء، اچھا ہو یا بُرا، تھوڑا ہو یا زیادہ، چھوٹا ہو یا بڑا، اس میں معتزلہ وخوارج پر رد ہے۔

تخریج: نسائی نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

اسلام تمام گناہ مٹا ڈالتا ہے

۲۸ : وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ اُبْسُطْ يَمِيْنَكَ فَلْاُبَايِعَكَ فَبَسَطَ يَمِيْنَهٗ فَقَبَضْتُ يَدِيْ فَقَالَ مَالَكَ يَاعَمْرُو قُلْتُ اَرَدْتُّ اَنْ اَشْتَرِطَ قَالَ تَشْتَرِطُ مَاذَا؟ قُلْتُ اَنْ يُّغْفَرَلِيْ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ يَا عَمْرُو اَنَّ الْاِسْلَامَ يَهْدِمُ مَاكَانَ قَبْلَهٗ وَاَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَاكَانَ قَبْلَهَا وَاَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَاكَانَ قَبْلَهٗ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالْحَدِيْثَانِ الْمَرْوِيَّانِ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَنَا اَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ وَالْاٰخَرُ الْكِبْرِيَاءُ رِدَاءِ یْ سَنَذْكُرُهُمَا فِيْ بَابِ الرِّيَاءِ وَالْكِبْرِاِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى. (رواه مسلم)

أخرجه مسلم ۱/ ۱۱۲ حديث رقم(۱۹۲ ـ ۱۲۱)وأخرجه أحمد في المسند ٤/ ٢٠٥ ـ

ترجمہ: حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ میں مسلمان ہونے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول اپنا ہاتھ بڑھایئے میں آپ ﷺ سے بیعت اسلام کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ مبارک آگے بڑھا دیا تو میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ آپ ﷺ نے تعجب سے فرمایا عمرو یہ کیا؟ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! میں ایک شرط لگانا چاہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا شرط ہے؟ میں نے عرض کیا کہ

میرے اس سے پہلے والے تمام گناہ معاف کردیئے جائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے عمرو کیا تم نہیں جانتے کہ اسلام ان تمام گناہوں کو ختم کردیتا ہے جو اسلام سے پہلے کئے تھے۔ (اسلام لانے سے حق اللہ اور حق العبد دونوں معاف ہو جاتے ہیں۔ ہاں البتہ حق العبد کا مطالبہ باقی رہتا ہے) اور ہجرت ان تمام گناہوں کو ختم کردیتی ہے جو ہجرت سے پہلے کئے اور حج ان تمام گناہوں کو ختم کردیتا ہے جو حج سے پہلے کیئے (ہجرت اور حج سے حق اللہ معاف ہوتا ہے نہ کہ حق العبد)۔ (مسلم)

راویٔ حدیث:

عمرو بن العاص۔ یہ عمرو بن العاص سہمی قریشی ہیں۔ ۵ھ میں اسلام لائے اور بعض نے کہا ہے ۸ھ میں۔ اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ حضرت خالد بن الولید اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہم کے ہمراہ آنحضور ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور یہ سب ساتھ اسلام لائے ہیں۔ ان کو آنحضور ﷺ نے ''عمان'' کا حاکم بنایا تھا یہ برابر وہاں حاکم رہے۔ یہاں تک آنحضرت ﷺ کی وفات ہوگئی۔ انہوں نے حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے بھی بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ انہیں کے ہاتھ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مصر فتح ہوا اور برابر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یہ مصر کے حاکم رہے ہیں۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی ان کو وہاں کا حاکم تقریباً چار سال تک برقرار رکھا اس کے بعد معزول فرمایا۔ پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب وہ امیر ہوگئے تو ان کو پھر مقرر کیا۔ مصر میں ہی ۴۳ھ میں جب کہ ان کی عمر نوے (۹۰) سال تھی وفات پائی اور ان کے بعد ان کے بیٹے ''عبداللہ'' کو مصر کا حاکم بنا دیا۔ پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو معزول کر دیا ان سے ان کے بیٹے عبداللہ اور عبداللہ ابن عمر اور قیس بن ابی حازم روایت کرتے ہیں۔

لفظ ''عاص'' کی تحقیق:

عاص' اجوف ہے۔ اس کی جمع ''أعیاص'' آتی ہے امیر بن عبد شمس اکبر کی اولاد میں سے ہیں۔ جن کو عاص' ابوالعاص' عیص اور ابوالعص کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کلمہ کو یاء کے ساتھ لکھنا پڑھنا' نہ وصل میں نہ فصل میں درست ہے۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ عصی سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ ہاں اگر اس کو ناقص مان لیا جائے تو یاء کو لکھنا درست ہے۔

تشریح: **قوله: اتيت النبي ﷺ فقلت: ابسط يمينك فلا بايعك:**

یعنی اسے کھولئے اور پھیلائے تا کہ میں اپنا ہاتھ اس پر رکھوں جیسا کہ ایک نسخہ میں ہے۔

''فلا بايعك'': صحیح قول کے مطابق لام کے کسرہ اور عین کے فتحہ کے ساتھ ہے امر کی تعلیل کے لیے ہے اور فاء مقحمہ ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ عین کے ضمہ کے ساتھ ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے: **فأنا أبايعك** اور لام زائد کو تاکید کے لیے لائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ لام امر کا ہو پھر فعل مجزوم ہوگا اور یہ بھی احتمال ہے کہ لام مفتوحہ اور عین مضمومہ ہو اور تقدیری عبارت ہو: **فانی لأ بايعك** اور فاء جزاء کے لئے ہے۔ جیسے: **اتني فاني اكرمك** (آپ میرے پاس آئیں میں آپ کا اکرام کروں گا)۔ یا لام قسم کا ہے اور بعض حضرات نے فرمایا: کہ تقدیر عبارت یوں ہے: **فلاجل ان أبايعك طلبت بسط يمينك** (میں نے آپ سے ہاتھ پھیلانے کی درخواست اس لئے کہ تا کہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرسکوں)۔

قولہ:فبسط یمینہ فقبضت یدی......قال تشترط ماذا؟

"یدی": یاء کے سکون کے ساتھ ہے اور فتحہ بھی پڑھ سکتے ہیں۔یعنی میں نے اپنا ہاتھ اپنی طرف کھینچ لیا۔ابن ملک نے فرمایا کہ ("یدی" سے مراد "نفسی" ہے)أی قبضت نفسی (میں نے اپنے آپ کو روک لیا)۔یہ معنی ظاہر نہیں ہے۔

یعنی کونسی بات آپ کے دل میں کھٹکی کہ آپ بیعت سے رُک گئے۔قلت: أردت ان اشترط: اس کا مفعول محذوف ہے جو شرطا یا شیئاً ہے اور مطلب یہ ہے کہ میرا بیعت سے رُکنے سے مقصود یہ ہے کہ میں اپنے لئے ایسی شرط لگاؤں جس کا مجھے فائدہ ہو۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ "ماذا" کا حق تشترط پر مقدم ہوتا ہے اس لئے کہ وہ معنی استفہام کو متضمن ہے جو صدارتِ کلام کا متقاضی ہے پس ماذا کو حذف کر کے تشترط کے بعد محذوف کی تفسیر کے لیے لایا گیا۔

اور بعض حضرات نے کہا کہ رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا ان کی طرف سے ایمان کے بارے میں شرط لگانے کو اچھا نہ سمجھتے ہوئے بطورِ انکار فرمایا: "اتشترط؟ پھر ہمزہ کو حذف کر کے کلام کی ابتداء فرمائی تو پوچھا: ماذا؟ وہ کیا ہے؟ یعنی آپ کیا شرط لگاتے ہیں؟ یا کونسی چیز کی شرط لگا رہے ہو؟

مالکی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول "اقول ماذا" سے متعلق فرمایا: کہ ماذا اس اس بات پر شاہد ہے کہ "ما" استفہامیہ جب ذا کے ساتھ مرکب ہوتا ہے تو صدارت کلام کے وجوب سے الگ ہو جاتا ہے۔پس اس ماقبل اس میں رفع اور نصب کے اعتبار سے عمل کرتا ہے۔چنانچہ رفع کی مثال آپ کا قول ہے: "کان ماذا؟" اور منصوب کی مثال جیسا کہ حدیث مذکور میں واقع ہے اور اس کی تائید بعض علماء کے اس قول سے ہوتی ہے کہ ماذا کا تمیز واقع ہونا درست ہے جیسے کوئی کہے عندی عشرون تو آپ کہیں عشرون ماذا؟

قولہ:قلت:ان یغفر لی .....یھدم ما کان قبلہ؟:

"ان یغفر": بنی للمفعول ہے۔کہ یغفر مبنی للفاعل ہے أی یغفر اللہ جیسا کہ ایک نسخہ میں اسی طرح ہے۔(أی یغفرلی کا فعل محذوف ہے۔)أی اشترط غفران ذنوبی ان اسلمت۔

یعنی اگر میں اسلام لے آؤں تو اپنے گناہوں کی مغفرت کی شرط لگاتا ہوں۔قال: أما علمت یا عمرو: یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت عقلمند ہونے' عمدہ رائے والے ہونے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال ہوشیاری جن اوصاف میں عرب کا کوئی باشندہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا نہیں کا حق یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے یہ مخفی نہ رہے۔

"ان الاسلام": یعنی حربی کا اسلام اس لئے کہ ذمی کا اسلام حقوق العباد میں سے کسی حق کو ساقط نہیں ہوتا۔یھدم: دال کے کسرہ کے ساتھ،۔ما کان قبلہ: اس سے پہلے کی سیأت کو۔

"وأن الھجرۃ": یعنی میری زندگی میں میری طرف ہجرت اور میری وفات کے بعد دار الحرب (کافر ملک) سے دار الاسلام (اسلامی ملک) کی طرف ہجرت۔

اور جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے: لا ھجرۃ بعد الفتح اس کا مطلب ہے مکہ سے ہجرت نہیں ہے کیونکہ اس کے

رہنے والے مسلمان ہو گئے۔

"تهدم ما كان قبلها": اس سے پہلے گناہ سرزد ہو گئے اور اسلام کے بعد ہجرت سے مظالم یعنی خطبات کے علاوہ تمام گناہ۔

"وأن الحج يهدم ما كان قبله": جو تغیرات وکوتاہیاں ہو جائیں۔

ابن حجر رحمہ اللہ کی اصل سے کان کا لفظ رہ گیا جس کی وجہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے تکلف سے کام لیا' حالانکہ تمام موجودہ صحیح نسخے جو مشائخ کے سامنے پڑھے جاتے ہیں' میں موجود ہے۔

ہمارے ائمہ میں سے شیخ تورپشتی رحمہ اللہ نے فرمایا: اسلام پہلے کے تمام گناہوں کو خواہ حق العبد میں کوتاہی ہو یا اس کے علاوہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ کو مٹا دیتا ہے۔ البتہ ہجرت اور حج یہ دونوں نہ تو حقوق العباد کا کفارہ بنتے ہیں نہ ان سے ان کبائر کی مغفرت ہوتی ہے جو بندہ اور اس کے مولیٰ کے درمیان ہوں لہٰذا حدیث کو ان صغیرہ گناہوں کے ختم ہونے پر محمول کریں گے جو اس سے پہلے سرزد ہوئے ہوں اور یہ بھی احتمال ہے کہ ان سے وہ کبیرہ گناہ بھی ختم ہو جائیں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہو بشرطیکہ توبہ کرے۔ یہ بات ہمیں اصولِ دین سے معلوم ہوئی، لہٰذا ہم نے مجمل کو مفصل پر محمول کر دیا اور اس پر شارحین کا اتفاق ہے۔

ہمارے بعض علماء نے فرمایا کہ اسلام پہلے کے کفر، نافرمانی اور ان پر مرتب ہونے والی وہ سزائیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے حقوق سے ہو مٹا دیتا ہے۔ حقوق العباد حج اور ہجرت سے تو اجماعاً ساقط نہیں ہوتے اور اگر مسلمان ہونے والا شخص پہلے ذمی تھا تو اسلام سے بھی حقوق العباد ساقط نہیں ہوتے خواہ وہ مالی حق ہو یا غیر مالی جیسے قصاص یا مسلمان پہلے حربی تھا اور قرض لینے یا کوئی چیز خریدنے کی وجہ سے اس پر قرض لازم ہوا اور مال بھی شراب نہ ہو۔

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں حج ان گناہوں کو جو اس سے پہلے ہوئے ہیں ختم کر دیتا ہے اور اسلام لانے کے بعد جو ہوئے ان کو بھی ختم کر دیتا ہے سوائے مظالم (حقوق العباد) کے لیکن اس شرط کے ساتھ جو حدیث میں مذکور ہے: **من حجّ فلم يرفث ولم يفسق خرج من ذنوبه كيوم ولدته أمه** "جس نے حج کیا پھر نہ تو اس نے کوئی بے حیائی کا کام کیا نہ نافرمانی کی تو وہ اپنے گناہوں سے اس دن کے مانند نکل جائے گا جس دن اس کی ماں نے اسے جنم دیا تھا"۔ اس کے باوجود اہلِ سنت کا عقیدہ یہ ہے جیسے بہت سے ائمہ مثل امام نووی اور قاضی عیاض رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے کہ اس کا محل تبعات (تاوان) کے علاوہ گناہ ہیں بلکہ کبائر ہیں کیونکہ وہ بھی بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے اور بعض شارحین کی عبارت یوں ہے: حقوق مالیہ ہجرت وحج سے ختم ہو جاتے ہیں اور اسلام کے بارے میں اختلاف ہے جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے تو وہ بالا جماع ہجرت اور حج سے ساقط نہیں ہوتے اھ۔ ہاں ممکن ہے بلکہ یہ واقع ہے کہ جس پر بعض احادیث دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب کسی گناہ گار کی معافی کا ارادہ کرتے ہیں اور اس پر تاوان ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس تاوان والے کو بڑا ثواب عطا فرماتے ہیں جو اس کے معاف کرنے اور راضی ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔ جہاں تک شافعیہ کی ایک جماعت اور دیگر حضرات کے اس قول کا تعلق ہے کہ حج تاوان کا بھی کفارہ بنتا ہے اور انہوں نے ابن ماجہ کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے: کہ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کی شام اپنی اُمت کی مغفرت کی دعا فرمائی تو مظالم کے علاوہ سے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول کی گئی ان کی مغفرت کے متعلق قبول نہ ہوئی۔

پھر آپ ﷺ نے مزدلفہ کی صبح یہی دعا فرمائی تو آپ ﷺ یہ دیکھ کر ہنس پڑے کہ ابلیس نے جب آپ ﷺ کی اُمت کی عمومی مغفرت کا مشاہدہ کیا تو وہ جزع فزع کر رہا تھا۔ جو اس قول کو یوں ردّ کیا ہے کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔اھ۔
اس حدیث کو صحیح تسلیم کرنے کی صورت میں ''مظالم'' کو محمول کیا جائے ان مظالم پر جن کا تدارک ممکن نہ ہو یا توبہ کے ساتھ مقید ہے، یا آپ ﷺ کی اُمت کے ان لوگوں کے ساتھ خاص ہے جو آپ ﷺ کے ساتھ حج میں شریک تھے۔اس لئے کہ ان میں سے کسی کا بھی گناہ پر مصر رہنا ثابت نہیں ہے۔ اسی لئے جمہور فرماتے ہیں: ان الصحابة كلهم عدول کہ تمام صحابہ عدول ہیں۔واللہ تعالیٰ اعلم

اس کو مصابیح میں حسان (احادیث حسان) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

الفصل الثانی:

جنت میں لے جانے والے اعمال

۲۹: عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَخْبِرْنِیْ بِعَمَلٍ يُّدْخِلُنِیَ الْجَنَّةَ وَيُبَاعِدُنِیْ مِنَ النَّارِ قَالَ لَقَدْ سَاَلْتَ عَنْ اَمْرٍ عَظِيْمٍ وَاِنَّهٗ لَيَسِيْرٌ عَلٰى مَنْ يَسَّرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ تَعْبُدُ اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا وَتُقِيْمُ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِی الزَّكٰوةَ وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ وَتَحُجُّ الْبَيْتَ ثُمَّ قَالَ اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰى اَبْوَابِ الْخَيْرِ الصَّوْمُ جُنَّةٌ وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَآءُ النَّارَ وَصَلٰوةُ الرَّجُلِ فِیْ جَوْفِ اللَّيْلِ ثُمَّ تَلَا (تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ)حَتّٰى بَلَغَ يَعْمَلُوْنَ ثُمَّ قَالَ اَلَا اَدُلُّكَ بِرَأْسِ الْاَمْرِ وَعُمُوْدِهٖ وَذِرْوَةِ سَنَامِهٖ قُلْتُ بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ رَاْسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ وَعُمُوْدُهُ الصَّلَاةُ وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ ثُمَّ قَالَ اَلَا اُخْبِرُكَ بِمِلَاكِ ذٰلِكَ كُلِّهٖ قُلْتُ بَلٰى يَانَبِیَّ اللّٰهِ فَاَخَذَ بِلِسَانِهٖ وَقَالَ كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا فَقُلْتُ يَا نَبِیَّ اللّٰهِ وَاِنَّا لَمُؤَاخَذُوْنَ بِمَا نَتَكَلَّمُ بِهٖ قَالَ ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ يَا مُعَاذُ وَهَلْ يُكَبُّ النَّاسُ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اَوْعَلٰى مَنَاخِرِهِمْ اِلَّاحَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ.

(رواہ احمد و الترمذی و ابن ماجۃ)

أخرجه الترمذي ٥/١٣ حديث رقم ٢٦١٦۔ وابن ماجة في سننه ٢/١٣١٤ حديث رقم ٣٩٧٣ وأحمد في مسنده ٥/٢٣١۔

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیں۔ کہ جو مجھے جنت میں داخل کر دے اور جہنم سے دور کر دے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا حقیقت تو یہ ہے کہ آپ نے ایک عظیم الشان چیز کے متعلق سوال کیا۔ لیکن جس پر اللہ تعالیٰ آسان کر دے اس کے لئے بہت آسان ہے

۔پھر آپ ﷺ نے چند امور بتائے ① اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو ② اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو ③ نماز پابندی سے ادا کرو ④ زکوٰۃ ادا کرو ⑤ رمضان المبارک کے روزے رکھو ⑥ بیت اللہ کا حج کرو۔ پھر اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے معاذ کیا تمہاری خیر و بھلائی کے دروازوں تک راہنمائی نہ کروں۔ تو سنو روزہ ایک ایسی ڈھال ہے جو گناہوں اور جہنم کی آگ سے بچاتی ہے اور اللہ کے راستہ میں صدقہ کرنا اور مال خرچ کرنا گناہوں کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے اور اسی طرح مؤمن جب وسط رات میں تہجد کی نماز پڑھتا ہے تو گناہ ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے سورۂ سجدہ کی پوری آیت تلاوت کی جس میں تہجد کی نماز پڑھنے والوں اور رات میں اللہ کی عبادت کرنے والوں کی فضلیت بیان کی گئی ہے اور آیت کا ترجمہ اس طرح ہے اور مؤمنین صالحین کے پہلو بوقت رات بستروں سے الگ رہتے ہیں اور وہ اپنے رب کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں اور ہم نے جو مال دیا ہے اس میں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں کوئی نفس نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے کیسے کیسے آنکھوں کی ٹھنڈک کے اسباب چھپا رکھے ہیں یہ ان کے اعمال صالحہ کا بدلہ اور صلہ ہے جو وہ کرتے تھے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تمہیں دین کا سر اور ستون اور اس کے کوہان کی بلندی نہ بتادوں۔ میں نے عرض کیا ہاں اے اللہ کے رسول ﷺ ضرور بتایئے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا دین کا سر اسلام ہے۔ اس کا ستون نماز ہے اور اس کے کوہان کی بلندی جہاد ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کیا تمہیں ان تمام امور کی اصل اور جڑ نہ بتادوں؟ میں نے کہا ہاں۔ اے اللہ کے نبی ضرور بتا دیجئے۔ آپ ﷺ نے اپنی زبان مبارک پکڑی اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کو بند رکھو۔ میں نے عرض کیا اے اللہ کے نبی کیا ہم اپنی زبان سے جو بھی لفظ نکالتے ہیں اس پر ہماری گرفت اور پکڑ ہوگی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے معاذ تمہاری ماں تمہیں گم کر دے اچھی طرح جان لو کہ لوگوں کو ان کے منہ کے بل یا پیشانی کے بل جہنم میں گرانے والی اسی زبان کی بری باتیں ہوں گی۔ (اس کو روایت کیا ہے احمد ترمذی اور ابن ماجہ نے)۔

تشریح: قوله: قال: قلت یارسول الله اخبرنی بعمل یدخلنی الجنة و یباعدنی من النار:

ایک روایت میں یوں ہے: قال: بینما نحن نخرج مع رسول الله صلی الله علیه وسلم فی غزوة تبوك وقد اصابنا الحر فتفرق القوم، فاذا رسول الله صلی الله علیه وسلم اقربهم منی فدنوت منه وقلت"

(ہم غزوہ تبوک میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے ہمیں گرمی لگ رہی تھی اس لئے لوگ ادھر اُدھر ہو گئے تو اچانک رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ میرے قریب تھے تو میں اور آپ کے نزدیک ہو گیا اور میں نے عرض کیا الخ)

''عمل'': کی تنوین تعظیم کے لیے ہے یا نوع کے لیے ہے۔ یعنی عمل عظیم (بڑا عمل) یا ایسا عمل جو شریعت میں معتبر ہو۔

''یدخلنی'': رفع کے ساتھ ہو تو عمل کی صفت مخصصہ یا مادحہ یا کاشفہ ہے۔ اس لئے کہ عمل جب ایسا نہ ہو تو گویا وہ عمل ہی نہیں اور ''یدخلنی'' جزوم پڑھنے کی صورت میں یہ شرط محذوف کی جزا ہے جو عمل کی صفت ہے۔ أی أخبرنی بعمل ان أعمله یدخلنی الجنة (مجھے ایسا عمل بتایئے کہ اگر میں وہ عمل انجام دوں تو وہ مجھے جنت میں داخل کرے)۔ یعنی خبر عمل کا

ذریعہ ہے اور عمل ادخال جنت کا باعث ہے۔

ادخال کی اسناد "عمل" کی طرف یہ اسناد الی السبب ہے یا عمل کو فاعل حقیقی سے اس لئے تشبیہ دی کہ وہ مطلوب کا سبب ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ وہ عمل اپنی ذات کے لحاظ سے داخل نہ کرائے گا بلکہ اللہ کے فضل سے وہ ادخال کا باعث ہوگا کہ اللہ نے اسے دخول کا سبب بنایا۔

کہا گیا ہے کہ جزم روایت و درایت کسی بھی اعتبار سے درست نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ گویا اس کے درایت و عقل کے لحاظ سے صحیح نہ ہونے میں اشکال ہے کہ اخبار دخول جنت کا سبب نہیں بلکہ عمل ہے۔ اس میں اشکال ہے اس لئے کہ آپ ﷺ کا خبر دینا اس عمل کی انجام دہی کا ذریعہ ہے جو دخول جنت کا باعث ہے۔ تو آپ ﷺ کا خبر دینا ایک درجہ میں جنت میں داخل کرانے کا سبب ہے۔ اسی لئے علامہ ابن حاجب رحمہ اللہ تعالیٰ نے: ﴿قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ [ابراهيم: ٣١] میں ﴿يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ کو اور اس کے علاوہ ﴿هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ﴾ [الصف: ١٠] میں "يغفرلكم" یہ جزاء ہے اس کو جزاء قرار دیا ہے۔ کامل مؤمن کے بارے میں جب حکم کی بجا آوری کا گمان ہے تو اسے ایسے قرار دیا گویا کہ وہ عمل بجالایا ہے۔

"و يباقولي عدني": کا "يدخلني" پر ہر دو اعراب کے ساتھ عطف ہے اور ابن ملک کا یہ کہنا "اس میں صرف رفع اور يدخلني میں دونوں اعراب درست ہیں۔" بہت کمزور بات ہے۔

پھر عطف کا فائدہ یہ ہے کہ جنت میں داخلہ بغیر عذاب سابق کے ہوگا اور اس کی تائید اگلے جملہ کے اسلوب سے ہو رہی ہے۔

قوله: قال: لقد سألت عن عظيم:

یعنی تم نے مجھ سے بڑی چیز کی بابت پوچھی ہے یا بڑا سوال کیا ہے جس کا جواب مشکل ہے اس لئے کہ دخول جنت اور جہنم سے دوری، بہت بڑا معاملہ ہے تو اس کا سبب جو ہے وہ گناہ سے اجتناب اور ہر مامور کی بجا آوری وہ ہے بھی اسی طرح ہے۔

یا اس لئے کہ اس عمل کی معرفت جو جنت میں داخل کرنے کا سبب ہو علم غیب میں سے ہے اور بہتر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ ایسے عمل کے بارے میں جس کی ادائیگی نفوس پر بہت عظیم (گراں) ہے تا کہ سابق اور لاحق میں مطابقت ہو جائے۔ اصل میں تقدیری عبارت یوں ہے: **أي لقد سألته عن عمل عظيم فعله على النفوس۔**

"عظيم" عظیم حقیر کی ضد ہے جیسے کبیر "صغیر" کی نقیض ہے اور جیسے حقیر صغیر سے بھی کم درجہ کا ہے اسی طرح عظیم کبیر سے بالاتر ہے۔ یہ دونوں الفاظ صور و معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔ آپ کہیں گے: **رجل عظيم و كبير اى جثته او قدره۔**

قوله: وانّه ليسير على من يسره الله عليه......وتحج البيت:

ایک نسخہ میں "يسره الله" کے بعد "تعالیٰ" کا اضافہ بھی ہے۔

"تعبد الله": (۱) امر کے معنی میں ہے، اور اسی طرح اس کا مابعد کلام ہے۔ (۲) دونوں دلیلوں میں سے قوی تر پر اعتماد کرتے ہوئے مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اى هو أن تعبد ہے۔ معنوی اعتبار سے تقدیری عبارت یوں ہے: **العمل الذى**

یدخلك الجنة عبادتك الله۔ یعنی وہ عمل جو مجھے تیری جنت میں داخل کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے ان کے حذف کے ساتھ ہے۔ یا فعل بمنزلہ مصدر ہے۔

صیغہ اُمر سے عدول اس بات پر تنبیہ کے لئے کیا گویا مامور بہت جلدی حکم کی بجا آوری کر رہا ہے اور آپ اس کی خبر دے رہے ہیں تا کہ ماموربہ کے وقوع میں اس کی رغبت کا اظہار ہو جائے۔

آپ ﷺ نے اس کو پہلے جملہ سے اس لئے الگ فرمایا کہ یہ پہلے کا بیان ہے یا جملہ مستانفہ ہے، اور اس میں براعت استہلال ہے بایں طور کہ یہ اجمالی طور پر آنے والے کلام کے مضمون پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ کوئی یوں کہے: کف علیك یہ حسنِ قطع پر دلالت کرتا ہے۔ عبادت انتہائی خضوع کو کہتے ہیں اور یہاں اس سے مراد توحید ہے جس کی دلیل اگلا جملہ (ولا تشرك به سیئا) ہے۔ یا عبادت سے مراد اس سے عام معنی ہے تا کہ ہر مامور کی بجا آوری اور ہر گناہ سے اجتناب اس میں داخل ہو جائے اور "بہ" کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے یا عبادت کی طرف، اور دوسرا احتمال ہی بہتر ہے اس لئے کہ جب وہ عبادت میں شریک قرار نہ دے گا تو اللہ تعالیٰ کی ذات میں بطریق اولیٰ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے گا، اور شیئاً میں تنوین افرادِ شخصی کے لیۓ جیسا کہ آپ کے ارشاد عظیم میں تنوین تعظیم کی اور یسیرٌ میں تقلیل کی ہے۔

"وتقیم الصلوٰۃ": یہ عطف خاص علی العام کے قبیل سے ہے۔ مراد اس سے فرض نماز ہے۔

اور یہ حکم حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ہر مؤمن کے لیے عام ہے اس لئے کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ سبب کی خصوصیت کا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جنت میں داخل ہونا اعمال پر موقوف ہے تو وہ صرف دخول اُولیٰ کے طور پر ہے جیسا کہ پہلے اس کی طرف اشارہ گزر چکا ہے لہٰذا یہ حدیث معتزلہ وخوارج کی دلیل نہیں بن سکتی۔ یعنی اس کا جواب یا اس کا فعل، آسان وسہل ہے۔ "وتحج البیت": افعال معلومہ کے ساتھ استطاعت پائے جانے کی شرط پر زندگی میں ایک بار حج کرنا۔

قولہ: ثم قال: الا ادلك علی أبواب الخیر:

"الا ادلك": ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے اور لا نفی مابعد کی تحقیق کے لیے ہے۔

اور ممکن ہے کہ راوی کا قول: "قلت: بلٰی یہاں بھی موجود ہو جیسا کہ اس کے بعد دو جگہوں میں موجود ہے لیکن راوی بھول گیا' (کذا قیل)

کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے: ینبغی لی ان لا أدلك مع انی المرشد الکامل کہ میرے لیے مناسب نہیں کہ میں تمہاری راہنمائی نہ کروں جبکہ میں تمہارا مرشد کامل ہوں۔

زیادہ ظاہر یہ ہے کہ الا تنبیہ کے لیے ہے تا کہ راوۃ کی طرف نسیان کی نسبت نہ کرنا پڑے۔ نیز اس کا جواب ضروری نہیں تھا اس لئے کہ یہ ایسا امر ہے جو بالکل ظاہر ہے اور اس کے مطلوب ہونے پر اس کی دلالت معلوم ہے۔

یا یوں کہا جائے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے "الا أدلك" کے بعد اتنا توقف بھی نہیں فرمایا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ "بلٰی" کہہ دیتے اس بات پر تنبیہ فرمانے کے لیے کہ آئندہ بیان کیا جانے والا مضمون اتنا اہم ہے کہ اس کی تصدیق کا انتظار بھی نہیں کرنا

چاہیے۔

پھر آپ علیہ الصلوٰۃ السلام نے مزید افادہ کے لیے نوافل پر ابھارنے کے لیے تاکہ اعلیٰ درجات کی حاصل کیے جاسکیں اور عبادات بدنیہ و مالیہ کی تکمیل ہو سکتے ارشاد فرمایا:

''علی ابواب الخیر'': عبارت کا مقتضی ہے کہ کچھ کلام مقدر مانا جائے۔ای الطرق الموصلة به وہ طریقے جو اس خیر تک پہنچانے والے ہیں۔آپ علیہ الصلوٰۃ السلام نے بھلائی کو ایسے گھر سے تشبیہ دی جس میں نفس کی ہر مرغوب چیز موجود ہو۔ ''الخیر'' میں ال جنس کا ہے۔آپ ﷺ نے آنے والے امور کو خیر کے ابواب (دروازے) اس لئے قرار دیا کہ روزہ نفس پر بڑا بھاری ہوتا ہے، اسی طرح صدقہ میں مال کا خرچ کرنا خصوصاً زکوٰۃ سے زیادہ خرچ کرنا، اور ایسے ہی رات کے آخری پہر جو نفس کے آرام کا وقت ہے اور اس میں ریاء کاری کا بھی دور دور اندیشہ نہیں میں نماز پڑھنا نفس پر بہت شاق ہے تو جو شخص ان امور کا عادی ہو جائے گا اس کے لیے ہر بھلائی آسان ہو جائے گی کیونکہ گھر میں داخل ہونے کے لیے دروازہ کھولنے کی مشقت ہی اٹھانی پڑتی ہے۔

قوله: الصوم جنة:

نبی اکرم ﷺ نے روزہ کو جہنم یا شیطان سے ڈھال قرار دیا اس لئے کہ بھوک سے شیطان کے جاری ہونے کی جگہیں بند ہو جاتی ہیں، جب اس کے جاری و سرایت کرنے کی جگہیں بند ہو جائیں گی تو وہ جسم میں داخل نہ ہو سکے گا، پس وہ اس نافرمانی کا باعث نہ بنے گا جو جہنم میں داخلے کا سبب ہے۔

بعض کہ تقدیری عبارت ''صوم النفل'' ہے، ''الصوم'' کا ''ال'' مضاف الیہ پر دلالت کر رہا ہے۔اربعین کے شراح میں سے ایک محقق فرماتے ہیں کہ شاید قول مذکور کا قائل کوئی کوفی ہے۔تفسیر کشاف میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ﴾ [النازعات: ۳۹] (سو جہنم ٹھکانہ ہے) کے ذیل میں فرمایا: أی مأواہ اس لیے کہ لام مضاف الیہ پر دلالت نہیں کرتا بلکہ لام تعریف عہد کا ہے اس لئے کہ جب معلوم ہو گیا کہ سرکشی اختیار کرنے والا وہی ٹھکانہ والا ہے تو اضافت ترک کر دی گئی۔ اسی طرح یہاں پر بھی ہے کہ جب فرائض کا تذکرہ پہلے ہو چکا تو معلوم ہوا کہ اس کے بعد نوافل مذکور ہیں پس لام عہد خارجی کا ہے اور معہود کا پہلے ذکر ضروری نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، بلکہ کبھی معہود کی تقدیم کی ضرورت اس بناء پر نہیں ہوتی کہ مخاطب کو قرائن کی بنا پر علم ہوتا ہے، جیسے آپ گھر میں داخل ہونے والے شخص سے کہیں: اغلق الباب'' دروازہ بند کر دو اور اس جیسی بہت سی مثالیں ہیں۔

آپ ﷺ کے ارشاد: ''الجُنة'' کا مطلب ہے کہ دنیا میں شہوت کی تیزی سے بچاؤ کا ذریعہ ہے اور آخرت میں دوزخ سے بچاؤ کا ذریعہ ہے، اس میں متکلمین کے نزدیک محسوس سے تشبیہ ہے، بعض افاضل نے اس بات کو اختیار فرمایا ہے کہ اس جیسی مثال استعارہ ہے، چنانچہ حس کے لیے ڈھال ہوگا، شیاطین اس کے دل تک راستے نہ بنا سکیں گے پس شیاطین کی ظلمت چھٹ جانے کے بعد وہ دل نور غیب کے ذریعے صفات کی حکمتوں کے لطائف کے خزانہ کا مشاہدہ کرے گا پھر ان کے انوارات کے ذریعہ ہر قسم کی مخالفتوں اور آفات سے محفوظ رہے گا۔

قوله: والصدقة تطفیء الخطیئة کما یطفئ الماء النار:

یعنی جو گناہ آگ میں لے جانے کا ذریعہ ہے صدقہ اسے ختم کر دیتا ہے اور اس کے اثرات مٹا دیتا ہے، بشرطیکہ اس گناہ کا تعلق حق اللہ سے ہو اور اگر اس کا تعلق بندہ کے حق سے ہو تو وہ نیکی اس مظلوم کو دے دی جائے گی اس کے مخالف شخص کو اس گناہ وزیادتی کے عوض مل جائے گی جو اس کی گئی۔

کیونکہ دونوں کے آثار میں اللہ تعالیٰ سبحانہ کے پیدا کرنے سے منافات ہے اسلئے کہ اشیاء اپنی ذات کے اعتبار سے مؤثر نہیں چنانچہ پانی پیاس نہیں بجھاتا، روٹی شکم سیر نہیں کرتی، اور آگ جلاتی نہیں۔

قوله: وصلاة الرجل فی جوف اللیل : خبر محذوف مبتداء ہے۔ **ای وصلاة الرجل فی جوف اللیل کذلك۔ ای تطفئ الخطیئة أوهی من البواب الخیر۔**

رات کے آخری پہر میں گناہ کو ختم کرنا ہے یا وہ بھی ابواب خیر میں سے ہے اور پہلا احتمال زیادہ ظاہر ہے۔ قاضی فرماتے ہیں: بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ خبر مقدر ماننا زیادہ ظاہر ہے اور وہ "**شعار الصالحین**" ہے، جامع الاصول میں اسی طرح ہے۔

قوله: ثم تلا: ﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۫ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [السجدہ: ۱۶، ۱۷] بچھونے، سونے کی جگہیں، جمہور کے نزدیک سے نماز مراد ہے، بعض حضرات نے فرمایا: مغرب اور عشاء کے درمیان عبادت میں وقت گزارنا ہے۔ "**یدعون ربهم**": نماز، ذکر، تلاوت، اور دعا کے ذریعہ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں۔ (**خوفا**): اس کی ناراضگی کے ڈر سے طمع میں۔ (**وطعما**): اور اس کی رحمت۔ (**ومما رزقنٰهم**): ہمارے دیے ہوئے میں سے بعض مال بھلائی کے کاموں میں خرچ کرتے ہیں۔ یعنی وہ مالی و بدنی عبادتوں کو جمع کرنے والے، عبادت گزار اور دنیا سے بے رغبتی اختیار کرنے والے ہیں۔

(**فلا تعلم نفس**): یعنی نہ کوئی فرشتہ اور نہ کوئی نبی۔ (**ما اخفی لهم**): جمہور قراء اسے بصیغۂ ماضی مجہول پڑھتے ہیں اور ایک قراءت میں ہمزہ کے ساتھ واحد متکلم معلوم کا صیغہ ہے۔ "**من قرة اعین**": ایسی لذات جو ان کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرے اور ان کے دلوں کو لبھائے۔ حدیث قدسی میں وارد ہوا ہے:

اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا أذن سمعت ولا خطر علی قلب لبشر۔

''میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جن کو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں، کسی کان نے سنی نہیں اور نہ کسی کے دل میں ان کا خیال تک گزرا''۔

قوله: ثم قال الادلك برأس الامر......وذروة سنامه الجهاد :

"**عمود**": اول کے فتحہ کے ساتھ یعنی جس کے ساتھ رجز کا قیام ہو اور اس پر مدار ہو۔

''**ذروة**'': ذال کے کسرہ کے ساتھ اور وہ مشہور تر ہے، اور اس کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے اور بعض حضرات سے اس کا فتحہ بھی منقول ہے۔ کسی چیز کے اعلیٰ و بلند تر حصہ کو کہتے ہیں۔

"سنام": سین کے فتحہ کے ساتھ اونٹ کی (کوہان) کو کہتے ہیں۔

"رأس الأمر الاسلام":

اسلام سے مراد شہادتین ہیں۔ یہ تشبیہ مقلوب کے قبیل سے ہے، چونکہ مقصود اسلام کو راس الامر سے تشبیہ دینا ہے تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کی نسبت تمام اعمال سے ایسی ہے جیسے جسم میں سر ہوتا ہے کہ سارا جسم اس کا محتاج ہوتا ہے اور اس کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا۔

"عموده الصلوٰة": یعنی اصل دین وہ اسلام ہے البتہ بغیر نماز کے اس میں قوت وکمال حاصل نہیں ہوسکتا جیسا کہ وہ گھر جس میں ستون نہ ہو (اس میں قوت وپختگی نہیں ہوتی)۔ لہٰذا جب وہ نماز پڑھے گا اور اس پر مداومت وپابندی کرے گا اس کا دین مضبوط وپختہ ہوگا البتہ اس میں بلندی ورفعت نہ آئے گی پھر جب وہ جہاد بھی کرے گا تو اس کے دین کو رفعت ملے گی۔

"وذروة سنامه الجهاد": اس میں 'جہاد' کی صعوبت اس کی علوشان اور تمام اعمال سے برتر ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ جہاد یہ جهد جیم کے فتحہ کے ساتھ بمعنی مشقت سے ماخوذ ہے یا جُہد جیم کے ضمہ کے ساتھ بمعنی طاقت سے مشتق ہے اس لئے کہ مجاہد دشمن سے لڑائی کے وقت اپنی قوت وطاقت کو استعمال کرتا ہے جیسا کہ دشمن اپنی بھرپور طاقت صرف کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد کے لیے اپنی کوشش ومحنت کو اپنے بھائی کی جدوجہد سے ملاتا ہے جیسا کہ ایک شخص اپنا دست وبازو اپنے بھائی کے دست وبازو سے ملاتا ہے تاکہ قوت وطاقت حاصل ہو۔

جہاد کی اقسام:

اللہ کے دین کے دشمنوں سے جہاد ہے تاکہ سارے کا سارا دین اللہ کا ہو جائے۔

دوسری قسم اپنے نفس کے خلاف جہاد ہے کہ اسے احکام کی پیروی کرنے، نفسانی خواہشات کو چھوڑنے اور نفس کے تقاضے کے برخلاف کرتے ہوئے مذموم اور حدود سے متجاوز کرنے والی خصلتوں کے ترک کا خوگر بنانے اور نفسانی خواہشات کے مقتضی کی ضد پر جائے تاکہ قوت علم وغضب، اور شہوت وعدل میں اعتدال اور توازن پیدا ہو۔

اور یہ قسم پہلی قسم سے بھی اشد (مشکل تر) ہے، اسی لئے وارد ہوا ہے "رجعنا من الجهاد الاصغر الى الاكبر" (ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ رہے ہیں)۔ کیونکہ انسان کے اندر نفس ایک بادشاہ کی طرح ہے اور اس کی فوج روح حیوانی وطبعی اور خواہش وشہوت ہے جو اپنی ذات میں اندھی ہیں کہ ہلاکت کی جگہوں کو دیکھ نہیں سکتی اور خیر کو برائی سے ممتاز نہیں کر سکتی جب تک اللہ تعالیٰ اپنی لطیف حکمت سے اس کی بصیرت کو منور نہ فرمائے کہ پھر وہ دشمنوں اور دوستوں کو دیکھ سکتی ہے، اور عمارت انسانی کو حرص کے خنزیروں، کتوں کی دشمنیوں، غصے کے چیتوں، گدھے کی شہوت اور شیطان کے ساتھیوں سے پُر پاتی ہے پھر اسے رذائل سے پاک اور فضائل سے آراستہ کر دیتی ہے۔

تیسری قسم جہاد قلب (دل کا جہاد) وہ دل کو پاک صاف کرنے اور اغیار سے اس کے تعلق کو منقطع کرنے کا نام ہے۔

چوتھی قسم جہاد روح اپنے وجود کو واحد قہار کے وجود میں فناء کر دینے کا نام ہے۔

قولہ: ثم قال الا اخبرك ملاك ذلك كله:

"ملاك" کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو مستحکم اور پختہ کیا جائے، یہ ملك العجين سے ماخوذ ہے جب کوئی خوب اچھی طرح آٹا گوندھے اور اس میں مبالغہ کرے۔ اہلِ لغت میم کو کسرہ دیتے ہیں اور فتحہ بھی دیتے ہیں اور روایتِ حدیث میں کسرہ کے ساتھ ہے۔ "ذلك" سے شروع حدیث سے یہاں تک جتنی عبادات ذکر کی ہیں ان کی طرف اشارہ ہے۔

"كله": اور آپ ﷺ نے اپنے ارشاد "كله" سے تمام عبادات کو مؤکد کر دیا تا کہ خلاف شمول کا گمان نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ان تمام عبادات کا قیام استحکام کس چیز کے ساتھ ہے؟

"يانبي الله": نبی اللہ کی مناسبت اُخبار سے بالکل اسی طرح واضح ہے جیسا کہ رسالت کی مناسبت دلالت سے واضح ہے۔

قولہ: فاخذ بلسانه وقال: كف عليك هذا:

"بلسانه": باء زائدہ ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ باء معنیٔ تعلق کی تضمین کے لیے ہے۔ "كف": فاء مشددہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

"هذا": کا اشارہ زبان کی طرف ہے۔ منصوب پر مجرور کی تقدیم اسکے اہتمام کی بناء پر ہے اور "علیٰ" کے ساتھ كفّ کو متعدی کرنا تضمین کے لیے ہے یا بمعنی مِنْ ہے، اور اس کے بعد اسم اشارہ کو مزید تعیین یا تحقیر کیلئے لائے ہیں جو كفّ کا مفعول بہ ہے۔

آپ ﷺ نے اپنی زبان مبارک کو پکڑ کر اس کی طرف اشارہ بھی فرمایا صرف اپنے ارشاد پر اکتفاء اسلئے نہیں فرمایا تا کہ اس بات پر تنبیہ ہو جائے کہ زبان کا معاملہ بڑا مشکل ہے۔

اور آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تم لایعنی بات مت کرو، اس لئے کہ جو زیادہ بولتا ہے اس کی زیادہ غلطیاں ہوتی ہیں، اور جس کی زیادہ غلطیاں ہوں اس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں، اور زیادہ گفتگو کے اتنے نقصانات ہیں جو شمار نہیں کیے جا سکتے، اور جو کوئی ان سب کو جاننا چاہے وہ "احیاء العلوم" کو اہتمام سے پڑھ لے اور اسی وجہ سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لتنی كنت أخرس الاعن ذكر الله کاش میں ذکر اللہ کے سوا ہر بات سے گونگا ہو جاتا۔

قولہ: فقلت يا نبي الله وانا لمؤاخذون بما نتكلم به؟

"مؤاخذون": ہمزہ کے ساتھ ہے اور ابدال کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ یعنی کیا ہمارا مؤاخذہ فرمائے گا اور ہمیں سزا دے گا یا ہمارا حساب لے گا ہمارا پروردگار۔ تمام باتوں کا، اس لئے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ پر یہ بات مخفی نہیں تھی کہ بعض باتوں پر تو مؤاخذہ ہوگا۔

قولہ: قال ثكلتك أمك يا معاذ:

"ثكلتك" عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ بمعنی گم کرنا۔

ظاہر ہے آپ ﷺ کے خلاف موت کی بددعا ہے اس کا وقوع مراد نہیں ہے بلکہ اس میں تادیب ہے، غفلت پر تنبیہ ہے اور

معاملہ کے تعجب انگیز اور بڑا ہونا کو بتاتا ہے۔

قوله: وهل يكب الناس في النار على وجوههم او على مناخرهم الا حصائد السنتهم:

"وهل": استفہام نفی کے لیے ہے۔ "یکب": یاء کے فتحہ اور کاف کے ضمہ کے ساتھ ہے کَبّہ سے ماخوذ ہے منہ کے بل پچھاڑنا بخلاف أکبّ کے اس کا معنی "منہ کے بل گرنا" ہیں۔ یہ نوادر میں سے ہے۔

اس کا عطف مقدر پر ہے ای هل تظن غير مقلت عقل يكب الناس الخ یعنی آپ کا گمان ایسا نہیں ہے جو بات میں نے کہی ہے اور کیا لوگوں کو ڈالے گی اور انہیں گرائے گی اور انہیں پچھاڑے گی۔

"او على مناخرهم": راوی کو شک ہے۔

"منخر": میم کے فتحہ اور خاء کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ۔ ناک کے نتھنے کو کہتے ہیں، اور یہاں پر مراد "ناک" ہی ہے۔

ان دونوں کو "گرنے" میں خصوصیت سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اعضاء میں سب سے پہلے ہی دو اعضاء (چہرہ یا ناک) گرتے ہیں۔

"الا حصائد السنتهم": آپ ﷺ نے انسان کے کلام کو درانتی سے کاٹی گئی کھیتی سے تشبیہ دی، اور یہ کلام نبوت کی بلاغت میں سے ہے۔

تو جس طرح درانتی کاٹتی ہے اور تر و خشک، اور اچھے برے میں تمیز نہیں کرتی اسی طرح بعض لوگوں کی زبان سے ہر قسم کا کلام اچھا برا صادر ہوتا ہے۔

مطلب حدیث کا یہ ہے کہ لوگوں کو جہنم میں صرف ان کی زبان کی کھیتیاں کفر، الزام تراشی، گالی گلوچ، غیبت، چغلی اور بہتان وغیرہ ڈالیں گی، اور استثناء مفرغ ہے۔ یہ حکم اکثر لوگوں پر عائد ہوتا ہے کیونکہ جب آپ تجربہ کریں گے تو آپ کو کوئی ایک آدمی ایسا نہیں ملے گا جس نے اپنی زبان کو برائی سے محفوظ رکھا ہو، اور اس سے کوئی بری بات صادر نہ ہوئی ہو جو جہنم میں داخلہ کا سبب ہے، مگر بہت نادر۔

اسی لئے کہ جب وہ شریعت کی طرف دیکھے گا تو زبان کو روکے رکھے گا جو شریعت کی محافظت پر بہترین مددگار ہے، اور جب وہ طریقت کی طرف نظر کرے گا تو وہی اس کا رُکن ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہی قطب ہے جس پر مدار ہے کیونکہ جب زبان ساکت ہوگی تو دل (گویا) ناطق ہوگا اور اسے پروردگار کے ساتھ سرگوشی نصیب ہوگی اور اس پر رحمت کے بادل نور کے قطرات برساتے ہیں............

اسی لئے وارد ہوا ہے: "من عرف الله كل لسانه" جس نے اللہ کو پہچانا اس نے اپنی زبان کو روک لیا، یعنی غیر اللہ کے تذکرہ سے باز رہا ایسا شخص مقام مراقبہ میں ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

احفظ لسانك ايها الانسان لا يلدغنك انه ثعبان

كم في المقابر من قتيل لسانه كانت تهاب لقائه الشجعان

تخریج: اس حدیث کو امام نسائیؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو "حسن صحیح" قرار دیا ہے۔

تکمیلِ ایمان

۳۰: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰی لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِیْمَانَ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ

أخرجه أبوداوٗد في سننه ٥/ ٦٠ حديث رقم ٤٦٨١۔

ترجمہ: حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے محبت کرے اور اللہ ہی کے لئے دشمنی رکھے اور اللہ ہی کے لیے خرچ کرے اور اللہ ہی کے لئے خرچ نہ کرے اپنے مال کو روک لے۔ یقیناً اس نے اپنے ایمان کو مکمل کرلیا۔ اس کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

ابوامامۃ الباہلی۔ یہ ابوامامہ ہیں۔ جن کا نام صُدی ہے۔ عجلان باہلی کے بیٹے ہیں مصر میں رہتے تھے۔ پھر "حمص" منتقل ہوگئے تھے اور وہیں انتقال کیا۔ یہ ان اصحاب میں سے ہیں جن سے بکثرت روایات نقل کی جاتی ہیں۔ اہل شام کے یہاں ان کی مرویات زیادہ ہیں۔ ان سے بہت لوگوں نے روایات کی ہیں۔ ۸۶ھ میں انتقال ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر اکہتر (۷۱) سال کی تھی یہ سب سے آخری صحابیؓ تھے جن کا شام میں انتقال ہوا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ شام میں سب سے بعد میں عبداللہ بن بشر رضی اللہ عنہ فوت ہوئے۔ "صدی" میں صاد پر ضمہ دال مہملہ مفتوح اور یاء مشدد ہے۔ جنگ بدر، احد اور دیگر جنگوں میں شریک ہوئے جنگ احد کے دن حضور ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رہے۔

تشریح: قوله: قال رسول الله ﷺ من أحب لله وابغض لله وأعطى لله ومنع لله:

"من أحب الله" : کسی چیز یا شخص کو۔ مفعول کو اس لئے حذف کیا گیا تا کہ مکمل طور پر وہم ختم ہوجائے۔ اللہ ہی کے لیے کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ ہی کے لئے محبت کرے اور اللہ ہی کے لئے بغض رکھے اور اللہ ہی کے لئے خرچ کرے اور اللہ ہی کے لئے خرچ کرنے سے باز رہے، اس کے سوا کوئی اور غرض اس کی نہ ہو، نہ اس کی طبیعت کی شہوت وخواہش شامل ہو۔ اسی طرح کوئی غرض وشہوت سے نہ ہو۔ اور اسی طرح تمام اعمال انجام دے، پس وہ بولے تو اللہ تعالیٰ ہی کے لیے، اور خاموش ہو تو اللہ ہی کے لیے ہو، لوگوں سے ملے تو اللہ ہی کے لیے، اور مخلوق سے الگ تو اللہ ہی کے لیے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [الانعام: ۱۶۲]

اللہ تعالیٰ نے چار افعال کو اس لئے خاص طور پر ذکر فرمایا کہ ان میں حظوظ نفسانی شامل ہوتے ہیں کیونکہ بہت کم انسان انہیں محض اللہ کے لئے انجام دیتا ہے، تو جب ان کو محض اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لیے کرے حالانکہ ان کو خالص کرنا مشکل ہے تو دیگر افعال کو بطریق اُولیٰ محض اس کی رضاء کے لیے انجام دے گا۔ اسی بناء پر ان کے محض رضاءِ الٰہی کے لیے انجام دینے پر آپ علیہ

الصلوٰۃ والسلام نے اپنے ارشاد(فقد اسکمل الایمان)میں دین کے کمال کا اشارہ فرمایا۔

قولہ:فقد استکمل الایمان:

''الایمان'':نصب کے ساتھ ہے۔

اس کی طرف متعدی کرنا برائے مبالغہ ہے اس کی نظیر:﴿وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾

[البقرۃ: ۸۹] یعنی اپنی ذات سے ان کے خلاف فتح کو طلب کرتے تھے۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ''ایمان''مرفوع ہے یعنی اس کا ایمان کامل ہو جائے گا۔

تخریج: ابوداؤد نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

۳۱ :وَرَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ عَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسٍ مَعَ تَقْدِيْمٍ وَتَاْخِيْرٍ وَفِيْهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ اِيْمَانَهُ. (ترمذی)

ترجمہ: اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے الفاظ کی تقدیم وتاخیر کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس میں فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ کے بجائے فَقَدِ اسْتَكْمَلَ اِيْمَانَهُ کے الفاظ ہیں کہ اس نے اپنے ایمان کو مکمل کرلیا۔

راویٔ حدیث:

معاذ بن انس۔یہ معاذ ہیں۔انس کے بیٹے ہیں۔بنو جہینہ سے تعلق رکھتے ہیں۔اہل مصر میں شمار ہوتے ہیں۔وہاں ہی ان کی حدیثیں پائی جاتی ہیں۔ان کے بیٹے''سہل''ان سے روایت کرتے ہیں۔''معاذ''میم کے ضمہ کے ساتھ ہے''جہینہ''صیغۂ تصغیر کے ساتھ ہے۔

تشریح: قولہ: ورواہ الترمذی : آپ نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت نہیں کی بلکہ حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے تقدیم وتاخیر کے ساتھ نقل کی اور حدیث ترمذی یا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت میں (فقد استکمل ایمانہ) اضافت کے ساتھ ہے اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن قرار دیا۔

محض اللہ عزوجل ہی کی خوشنودی کی خاطر محبت ونفرت رکھنا

۳۲ :وَعَنْ اَبِيْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ اَلْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ .

(رواہ ابوداؤد)

أخرجه أبو داؤد فی سننه ۶/۵ حدیث رقم ۴۵۹۹۔

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اعمال باطنیہ میں سے سب سے بہتر اور افضل عمل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کیلئے کسی سے محبت کی جائے اور اللہ ہی کیلئے کسی سے بغض اور دشمنی رکھی جائے۔

تشریح: قولہ:قال رسول اللہ ﷺ أفضل الاعمال...... :

"افضل الأعمال": یعنی وہ باطنی اعمال جن کے ذریعہ معرفت وشہود کے حقائق تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے، پس "الأعمال" میں الف لام عہد ذہنی کا ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا: تقدیری عبارت من افضل الاعمال ہے۔ (افضل اعمال میں سے)۔ اس لئے کہ شہادتین کی ادائیگی کے بعد مطلقاً سب اعمال سے افضل نماز ہے۔

"الحب فی الله": یعنی اس کی ذات کے لیے اور اس کی راہ میں یعنی اس کے لیے اور اس کے حق میں کسی کو کچھ دینا اور منع کرنا محبت وبغض پر متفرع ہیں۔ اس لئے اس حدیث میں انہیں دو اصل امور پر اکتفاء کیا ہے۔

تخریج: ابوداؤد نے مجاہد عن رجل عن أبی ذر کے طریق سے روایت کیا ہے، اور یہ مجہول شخص واللہ اعلم وہ عبداللہ بن عباس ہیں جیسا کہ طبرانی نے اسنادِ جید کے ساتھ عکرمہ عن ابن عباس روایت نقل کی ہے:

قال: قال رسول الله ﷺ لأبی ذر: ای عرا الایمان اشرف بل اوثق ،قال: الله ورسوله أعلم، قال: الموالاۃ فی الله والمعاداۃ فی الله والحب فی الله والبغض فی الله۔اھ۔

موالاۃ اور حب میں فرق یہ ہے کہ موالاۃ دو آدمیوں کے درمیان ہوتی ہے جبکہ حبّ اس سے عام ہے۔

مسلمان کون؟

۴۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ وَالْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰی دِمَآئِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ۔

الترمذی فی الجامع الصحیح ۱۸/۵ حدیث ۲۶۲۷۔والنسائی ۱۰۵/۸ حدیث رقم ۴۹۹۶ عن ابن عمر۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کامل اور پختہ مسلمان وہ ہے کہ جس کے ہاتھ اور زبان کی تکلیف سے مسلمان محفوظ ومامون رہیں اور کامل مؤمن وہ ہے کہ جس سے لوگ اپنی جانوں اور اموال کو محفوظ سمجھیں۔ اس حدیث کو روایت کیا ہے امام ترمذی اور امام نسائی نے۔

تشریح: قولہ: المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده: اس پر تفصیلی کلام ماقبل میں حدیث: کے تحت گذر چکا ہے۔

قولہ: والمؤمن من امنه الناس علی دمائهم وأموالهم:

"امنه": علمه کی طرح ہے۔

یعنی کامل مؤمن وہ ہے جس کی کمال امانت ودیانت اور عدم خیانت کی وجہ سے لوگ اپنی جان اور مال کو مامون ومحفوظ سمجھیں، دونوں جملوں کا حاصل اس بات پر تنبیہ کرنا ہے کہ دونوں اسموں (مسلم ومؤمن) کا اشتقاق درست ہو، چنانچہ جو یہ سمجھتا ہو کہ وہ اس کے ساتھ متصف ہے (مسلم ومؤمن ہے) تو اسے چاہیئے کہ وہ اپنی ذات سے اس کے مشتق منہ (اسلام وایمان) کا مطالبہ کرے اگر وہ اس میں نہ پایا جاتا ہو تو وہ ایسا ہے جیسے کوئی آدمی اپنے آپ کو کریم سمجھ رہا ہو حالانکہ اس میں صفت کرم موجود نہیں۔

تنبیہ: ''التصحیح'' میں لکھا ہے کہ یہ حدیث اس سیاق کے ساتھ کتب ستہ (صحاح ستہ) میں سے کسی میں موجود نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک حصہ ان میں ہے چنانچہ صحیحین میں اس حدیث کا ایک حصہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده والمهاجر من هجر ما نهی الله عنه'' اور اس کا بقیہ حصہ مقطع کی صورت میں سنن میں حضرت فضالہ، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم کی حدیث میں موجود ہے۔ البتہ اس پوری حدیث کو حاکم نے اپنی مستدرک میں اپنی سند جو علیٰ شرط مسلم ہے، حضرت فضالہ بن عبید سے انہیں الفاظ میں نقل کی ہے البتہ انہوں نے اپنی روایت میں مؤمن کو مسلم پر مقدم فرمایا۔ یہ عظیم الشان حدیث ہے جو دین کے بہت سے اصولوں پر مشتمل ہے جن کا تذکرہ طول کا باعث ہے۔

۳۴: وَزَادَ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْإِيْمَانِ بِرِوَايَةِ فُضَالَةَ وَالْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ الْخَطَايَا وَالذُّنُوْبَ۔

ترجمہ: اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت فضالہ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ زیادہ ہیں اور کامل مجاہد وہ ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی میں اپنے نفس سے جہاد کیا اور کامل مہاجر وہ ہے کہ جس نے تمام چھوٹے اور بڑے گناہوں کو چھوڑ دیا۔

تشریح: قوله: المجاهد من جاهد نفسه فی طاعة الله:

یعنی مجاہد حقیقی وہ ہے جس نے اللہ کی اطاعت وعبادت میں اپنے نفس سے جہاد کیا۔ اسلئے کہ یہی جہادِ اکبر ہے، اور اسی سے جہادِ اصغر وجود میں آتا ہے۔

قوله: والمهاجر من هجر الخطايا والذنوب:

اور مہاجر کامل وہ جو یعنی چھوٹے بڑے گناہوں کو چھوڑ دے۔

بعض حضرات نے فرمایا: ذنب' خطیئه سے عام ہے اسلئے کہ ذنب (گناہ) کبھی جان بوجھ کر بھی ہوتا ہے بخلاف خطیئه کے وہ عمداً نہیں ہوتی۔

یہ حقیقی مہاجر اسلئے ہے کہ ہجرت کی حکمت یہ ہے کہ بغیر کسی رکاوٹ کے طاعت کی بجا آوری اور اس پر قدرت حاصل ہو جائے اور اشرار کی صحبت جو خطایا کے ارتکاب میں مؤثر ہو سکتی ہے سے برأت کا اظہار ہے پس ہجرت صحبت سے بچنے کو کہتے ہیں چنانچہ حقیقی مہاجر وہ ہے جو اس سے پرہیز کرنے والا ہو۔

امانت اور وعدہ کی اہمیت

۳۵: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَّا قَالَ لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْإِيْمَانِ.

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٤/٧٨ حديث ٤٣٥٤۔ وأحمد في المسند ٣/١٥٤۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے شاذ و نادر ہی کوئی خطبہ دیا ہوگا جس میں یوں نہ فرمایا ہو کہ جس آدمی میں امانت نہیں اس کا ایمان بھی نہیں اور جس میں وعدے کو پورا کرنا نہیں اس کا دین بھی نہیں۔ اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں بیان کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

فضالہ بن عبید۔ ''فضالہ'' نام ہے۔ ''عبید'' کے بیٹے ہیں۔ قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے ہیں اور انصاری ہیں۔ غزوات میں پہلے پہل یہ ''غزوہ احد'' میں شریک ہوئے اس کے بعد دوسرے غزوات میں شرکت کی۔ بیعت تحت الشجرہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پھر جہاد سے شام کی طرف روانہ ہو گئے اور ''دمشق'' میں قیام پذیر ہو گئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے دمشق میں فصل خصومات کا کام کرتے رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جنگ صفین کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہی وفات پائی۔ کہا گیا ہے کہ ۵۳ھ میں انتقال ہوا۔ ان سے ان کے آزاد کردہ ''میسرہ'' اور دوسرے لوگ روایت کرتے ہیں۔ ''فضالہ'' میں فاء اور ضاد معجمہ دونوں پر زبر ہے اور ''عبید'' میں عین مہملہ پر ضمہ ہے۔

تشریح: **قوله: لا ایمان لمن لا أمانة له:**

جس شخص میں امانت نہیں اس میں کامل ایمان نہیں، نفس، اہل اور مال میں۔ بعض حضرات نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اور بندوں کے وہ حقوق جن کا اسے مکلف بنایا گیا ان پر اس سے امانت داری کا مطالبہ کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ﴾ [الاحزاب: ۷۲]

اس آیت کریمہ میں انسان سے مراد حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں، اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہے، اس کے ظلوم ہونے کے باوجود یعنی اس نے اس کا التزام کر کے اپنے اوپر ظلم کیا کہ اس بارِ گراں کو اٹھایا جس میں اس پر بڑی مشقت ہے۔ جو اس کی عدم بجا آوری کا باعث خصوصاً اکمل طور پر ادائیگی نہ ہو سکنے کا سبب ہے۔

اور ''جھول'' ہے اس وجہ سے کہ اس امانت کے خطرہ اور اس بارِ گراں کا اٹھاتے ہوئے اس کی رعایت رکھنے میں مشقت سے بے خبر ہے۔

دوسروں کی امانت داری نہ ہونے پر کمال دین کی نفی اس بناء پر فرمائی کہ کبھی امانت کا نہ ہونا اموال، عزتوں، شرمگاہوں اور جانوں کے ساتھ مباح معاملہ کرنے کا باعث بن جاتا ہے اور یہ بے حیائی کے کام ایمان کو ناقص کر دیتے ہیں اور اسے اتنا پیچھے لوٹا دیتے ہیں کہ بہت تھوڑا سا ایمان باقی رہ جاتا ہے بلکہ کبھی وہ کفر کا باعث بن جاتے ہیں اسی لئے کہا جاتا ہے: **المعاصی برید الکفر** گناہ کفر کے ڈاکیے ہیں۔

قوله: ولا دین لمن لا عهد له:

اس میں ایمان نہیں جس شخص میں ایفائے عہد نہیں، یعنی جو عہد اور قسم کو توڑ دے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اور اس جیسی دیگر ارشادات وعیدیں ہیں ان سے دین و ایمان کا ختم ہو جانا مراد نہیں ہوتا بلکہ زجر ہوتا ہے اور فضیلت کی نفی مقصود ہوتی ہے حقیقت مراد نہیں ہوتی۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ان سے حقیقت مراد لینے کا بھی احتمال ہے کہ جو شخص ان امور کا عادی ہو جائے تو آخر کار وہ کفر میں جا پڑے گا جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

"من يرتع حول الحمٰى يوشك ان يقع فيه"

جو کوئی جانور چراگاہ کے قریب چرے گا تو ممکن ہے وہ چراگاہ میں چلا جائے۔

روایات باب: اسی طرح اس حدیث کو صاحب مصابیح نے اپنی سند کے ساتھ شرح السنۃ میں روایت کیا ہے۔ امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی معجم کبیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کچھ اضافوں کے ساتھ روایت کیا ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:

"قال: قال رسول الله ﷺ: لا ايمان لمن لا امانة له، ولا دين لمن لا عهد له، والذى نفس محمد بيده لا يستقيم دين عبد حتى يستقيم لسانه، ولا يستقيم لسانه له حتى يستقيم قلبه، ولا يدخل الجنة من لا يامن جاره بوائقه۔ فقيل: ما البوائق يارسول الله؟ قال: غشمه وظلمه، وأيما رجل اصاب مالاً من حرام وأفق منه لم يبارك له فيه وان تصدق منه لم يقبل منه، وما بقى فزادهٗ الى النار، الا ان الخبيث لا يكفر الخبيث ولكن الطيب يكفر"۔

الفصل الثالث:

تیسری فصل اس سے مراد وہ احادیث ہیں جو اس باب کے ساتھ ملحق ہیں۔ انہیں صاحب کتاب نے لاحق کیا ہے اور ان میں یہ قید ملحوظ نہیں کہ بخاری و مسلم یا ان دونوں کے علاوہ اصحابِ سنن نے ان کی تخریج کی ہو اور نہ یہ قید ہے کہ کسی صحابی یا کسی تابعی سے منقول ہوں۔

جہنم کی آگ کس پر حرام ہے؟

۳۶: عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ شَهِدَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ النَّارَ. (رَوَاهُ مُسْلِمُ)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۵۷ حديث (۴۷۔۲۹)۔ والترمذی ۵/۲۳ حديث ۲۶۳۸۔

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص نے صدق دل سے اس بات کی شہادت دی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کی آگ کو حرام کر دے گا۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول ...... ان محمدا رسول الله:

"يقول": یہ جملہ کثرت سے بار بار آتا ہے اور سمعت کے بعد منصوبین کے بارے میں اختلاف ہے، جمہور کے

نزدیک پہلا منصوب (یعنی رسول اللہ) مفعول بہ ہے اور یہ جملہ (یقول) حال ہے، ای سمعت کلامه میں نے آپ کا کلام سُنا، اس لئے کہ شنوائی ذوات پر واقع نہیں ہوتی۔ یہ حال مبینہ ہے اس کا حذف درست نہیں۔

علامہ فارسی کا مختار قول یہ ہے کہ سمعتُ کا مابعد اگر ان چیزوں میں سے جو سنی جاسکتی ہوں جیسے سمعتُ القرآن تو یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہوگا ورنہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوگا جیسا کہ یہاں پر ہے۔ تو اس قول کی رو سے یقول والا جملہ مفعول ثانی ہے۔

"من شهد": جو شخص (دل سے) اس بات کی گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہوئے تمام احکامات کا التزام کریا اور جو باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں انہیں قبول کرے۔ تو اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ حرام کردے گا۔

قوله: حرم الله عليه النار:

یعنی کافروں کی طرح ہمیشہ جہنم میں رہنا حرام قرار دے دیا ہے، بلکہ مآل کار وہ نیکوکار لوگوں کے ساتھ جنت میں جائے گا اگر اس نے بدکاروں کے سے اعمال کا ارتکاب کیا۔ اگر اس کی موت اطاعت وفرمانبرداری کی حالت میں واقع ہوئی تو اس کا جہنم میں داخلہ حرام فرمادیں گے اور فاسق ہونے کی حالت میں اس کی موت آئی تو وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت ہوگا۔

فائدہ: حدیث مذکور میں اس بات پر بھی دلالت موجود ہے کہ جو شخص شہادتین کے تلفظ پر قادر تھا اس کے باوجود اس نے ان کا تلفظ نہ کیا تو وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا' تاہم اس میں اختلاف ہے جو مذاہب اربعہ کے متاخرین کی جماعت سے منقول ہے گویا کہ انہوں نے پہلی بات پر منعقد اجماع نووی کی حکایت کو نہیں دیکھا پہلی بات (کہ ایسا شخص ہمیشہ جہنم میں رہے گا) پر امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو اجماع نقل کیا ہے وہ درست نہیں ہے۔ اس کو ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے اس میں اشکال ہے جو باب کے شروع میں گزر چکا ہے۔

۳۷: وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ مَّاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ. (رواه مسلم)

أخرجه مسلم ۱/ ۵۵ حديث (۴۳-۲۶) وأحمد في مسنده ۱/ ۶۹۔

ترجمہ: حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے اس عقیدہ اور یقین پر وفات پائی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں تو وہ شخص جنت میں داخل ہوگا۔ اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

عثمان بن عفان۔ یہ امیر المؤمنین عثمان بن عفان ہیں۔ ان کی کنیت "ابوعبداللہ" ہے۔ الاموی قریشی ہیں۔ ان کا اسلام لانا اوّل دور اسلام میں حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دار ارقم میں تشریف لے جانے سے پہلے ہی ہوا۔

انہوں نے حبشہ کی طرف دو مرتبہ ہجرت فرمائی اور غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے کیونکہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی اُن دنوں بیمار تھیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معذوری کی بناء پر ان کا حصہ مال غنیمت میں مقرر فرمایا تھا اور مقام حدیبیہ میں جو تحت الشجرۃ بیعت رضوان واقع ہوئی اس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شرکت نہ فرما سکے کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صلح کے معاملات طے کرنے کے لئے مکہ بھیج دیا تھا۔ جب بیعت رضوان واقع ہوئی تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک کو دوسرے دست مبارک پر مار کر فرمایا کہ یہ بیعت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے ہے۔ ان کو ذوالنورین بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے عقد میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دونور نظر یعنی دو صاحبزادیاں رقیہ اور ام کلثوم رضی اللہ عنہما یکے بعد دیگرے آئی تھیں۔ یہ گورے رنگ کے تھے' میانہ قد تھے۔ بعض نے کہا کہ گندم گوں تھے۔ پتلی اور خوبصورت چہرے والے۔ آپ کا سینہ چوڑا تھا۔ سر پر بال بہت زیادہ تھے۔ بڑی داڑھی والے تھے داڑھی کو زرد رنگا کرتے تھے۔ ۲۴ھ میں محرم الحرام کی پہلی تاریخ کو ان کو خلیفہ بنایا گیا تھا۔ اسود تجیبی نے جو مصر کا رہنے والا تھا ان کو قتل کیا تھا اور بعض نے کسی اور کو بتایا ہے۔ شنبہ کے روز جنت البقیع میں دفن کئے گئے۔ اس دن ان کی عمر شریف بیاسی (۸۲) سال تھی اور بعض نے کہا کہ ۸۸ سال کی تھی۔ ان کا دورِ خلافت بارہ سال سے کچھ دن کم تک رہا۔ ان سے بہت لوگوں نے روایت کی ہے۔

تشریح: **قوله: قال رسول الله ﷺ من مات وهو يعلم انه لا اله الا الله:**

یعنی یقینی علم اسے حاصل ہو خواہ زبانی اقرار پر اسے قدرت حاصل ہوئی پھر اس نے اقرار کیا' یا اسے اس پر قدرحاصل نہ ہوئی اور اس نے دل سے جاننے پر اکتفاء کیا' یا اسے اقرار کے وجوب کا علم ہی نہ تھا، یا اس سے اس کا مطالبہ نہیں کیا گیا، یا اس نے اقرار کیا۔ اسلئے کہ حدیث میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو اس کے تلفظ کی نفی کر رہا ہو۔

لا اله الا الله پر اکتفاء کرنے کی وجہ:

یہ کلمہ شہادتین کے دونوں کلمات کے لیے علم ہے اسی لئے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس پر اکتفاء فرمایا۔

قوله: دخل الجنة:

① دخول اُولی کے طور پر اگر ایمان کے بعد اس سے گناہوں کا صدور نہ ہوا ہو۔
② اس سے گناہ کا ارتکاب ہوا اور اس نے توبہ کر لی
③ اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرما دیا۔
④ آخر کار جنت میں داخل ہو گا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کسی اچھے عمل کرنے والے کے بدلہ کو ضائع نہیں فرماتے۔
⑤ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دخول جنت کا حقدار ہو گیا۔

شیخ ابوحامد رحمہ اللہ تعالیٰ ''احیاء علوم الدین'' میں فرماتے ہیں:

جس آدمی نے دل سے تو تصدیق کی' البتہ زبان سے اس کا تلفظ کرنے یا کسی عبادت کی ادائیگی سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا تو کیا وہ بينه وبين الله مؤمن ہے؟ تو اس میں اختلاف ہے۔ چنانچہ جن حضرات نے ایمان کے تمام ہونے کے لیے زبان سے اقرار کو شرط قرار دیا وہ کہتے ہیں کہ یہ ایمان سے پہلے فوت ہو گیا یہ قول فاسد ہے اسلئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يخرج من النار من كان في قلبه مثقال ذرة من الايمان ''جس کے دِل میں رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہوگا وہ جہنم سے نکلے گا'' اوراس شخص کا دِل ایمان سے لبریز ہے۔

جس نے دِل سے تصدیق کی اوراس کے پاس کلمہ شہادتین کے اقرار کا وقت بھی میسر آیا اوران کے اقرار کے وجوب کا بھی اسے علم تھا لیکن اس نے ان کلمات کا اقرار نہیں کیا تو اس کے اقرار سے رُکنے کو نماز سے امتناع (باز رہنے) کے مترادف قرار دینے کا احتمال ہے، اور یوں کہہ سکتے ہیں: وہ ایسا مؤمن ہے جو ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا۔ اھ۔

اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ یہ قیاس مع الفارق ہے۔ اسلئے کہ اقرار ایمان کے لیے یا شرط ہے یا اس کا جزو ہے اور نماز ایمان کے اس درجہ میں نہیں ہے، واللہ اعلم۔ گویا کہ امام کے پاس اقرار اسلام کے واجبات میں سے ہے، اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ اگر یہی بات ہوتی تو ابو طالب کو کافر نہ کہا جاتا لہٰذا اگر امتناع کی بجائے ''ترک'' کی تعبیر کی جاتی تو پھر اس کی معتبر وجہ ہو سکتی تھی۔

دو موجبات

۳۸: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثِنْتَانِ مُوْجِبَتَانِ قَالَ رَجُلٌ يَّا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْمُوْجِبَتَانِ قَالَ مَنْ مَّاتَ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ وَمَنْ مَّاتَ لَايُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٩٤ حديث رقم (١٥١-٩٣) وأحمد في المسند ٣/٣٩١۔

ترجمه: حضرت جابرؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دو خصلتیں جنت اور جہنم کو واجب کرنے والی ہیں ایک آدمی نے سوال کیا اے اللہ کے رسول جنت اور جہنم کو واجب کرنے والی وہ دو خصلتیں کونسی ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ پہلی خصلت تو یہ کہ جو شخص اس حال میں فوت ہوا کہ اس نے کسی کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرا رکھا تھا تو وہ جہنم میں ڈالا جائے گا اور دوسری خصلت یہ ہے کہ جس کی موت اس حال میں ہوئی کہ اس نے کسی کو اللہ کے ساتھ شریک نہیں کیا تھا تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ۔ ان کی کنیت ''ابوعبداللہ'' ہے۔ یہ انصار میں قبیلہ ''سلم'' سے تعلق رکھتے ہیں مشہور صحابہ میں سے ہیں۔ ان کا شمار ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے جنہوں نے حدیث کی روایت کثرت سے کی ہے۔ غزوۂ بدر اور اس کے بعد پیش آنے والے تمام غزوات میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ حاضر ہوئے۔ ایسے تمام غزوات کی تعداد اٹھارہ (۱۸) ہیں۔ وہ شام اور مصر میں تشریف لائے۔ آخر عمر میں ان کی بینائی جاتی رہی۔ ان سے بڑی جماعت نے حدیث کو نقل کیا ہے۔ سہ۷۴ھ میں مدینہ منورہ میں انہوں نے وفات پائی۔ ان کی عمر ۹۴ سال بتلائی جاتی ہے۔ ایک قول کے اعتبار سے مدینہ میں وفات پانے والے سب سے آخری صحابی ہیں۔ ان کی وفات عبدالملک بن مروان کی خلافت میں ہوئی۔

تشریح: قوله: ثنتان موجبتان:

"ثنتان" مبتدا محذوف "خصلتان" کی صفت ہے۔" موجبتان": کہا جاتا ہے: أوجب الرجل جب آدمی ایسا عمل کرے جس کی وجہ سے جنت یا جہنم واجب ہوجائے۔ نیکی اور بدی کو موجبة کہتے ہیں۔

اہلِ سنت کے نزدیک "وجوب" وعدہ اور وعید سے متعلق ہے جبکہ معتزلہ کے نزدیک "وجوب" کا تعلق عمل سے ہے۔

قوله: ما الموجبتان؟: موجبتان سے مراد دو سبب ہیں۔ اس لئے کہ حقیقی واجب کرنے والا تو وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

قوله: من مات یشرك بالله شیئا دخل النار:

جو شخص اس حال میں مرا کہ اس نے کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرا رکھا تھا تو وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ اس لئے کہ شرک اکبر پر موت آ جانا دخول دوزخ اور اس میں ہمیشہ رہنے کا سبب ہے۔

قوله: ومن مات لا یشرك بالله شیئا دخل الجنة:

یعنی جو شخص اس حال میں مرا کہ اس نے اللہ کے ساتھ شریک نہیں ٹھہرایا تو وہ جنت میں داخل ہوگا، چونکہ توحید پر موت دخولِ جنت کا باعث ہے۔

لا الٰہ الا اللہ...... دخولِ جنت کا ٹکٹ

۳۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ كُنَّا قُعُوْدًا حَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَنَا اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ فِیْ نَفَرٍ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنْ بَیْنِ اَظْهُرِنَا فَاَبْطَاَ عَلَیْنَا وَخَشِیْنَا اَنْ یُّقْتَطَعَ دُوْنَنَا وَفَزِعْنَا فَقُمْنَا فَكُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَزِعَ فَخَرَجْتُ اَبْتَغِیْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰی اَتَیْتُ حَائِطًا لِّلْاَنْصَارِ لِبَنِی النَّجَّارِ فَدُرْتُ بِهٖ هَلْ اَجِدُلَهٗ بَابًا فَلَمْ اَجِدْ فَاِذَا رَبِیْعٌ یَدْخُلُ فِیْ جَوْفِ حَائِطٍ مِنْ بِئْرٍ خَارِجَةٍ وَالرَّبِیْعُ اَلْجَدْوَلُ قَالَ فَاحْتَفَزْتُ فَدَخَلْتُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَبُوْ هُرَیْرَةَ ؟ فَقُلْتُ نَعَمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ مَاشَانُكَ قُلْتُ كُنْتَ بَیْنَ اَظْهُرِنَا فَقُمْتَ فَاَبْطَاْتَ عَلَیْنَا فَخَشِیْنَا اَنْ تُقْتَطَعَ دُوْنَنَا فَفَزِعْنَا فَكُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَزِعَ فَاَتَیْتُ هٰذَا الْحَائِطَ فَاحْتَفَزْتُ كَمَا یَحْتَفِزُ الثَّعْلَبُ وَهٰؤُلَاءِ النَّاسُ وَرَآئِیْ فَقَالَ یَا اَبَاهُرَیْرَةَ وَاَعْطَانِیْ نَعْلَیْهِ فَقَالَ اِذْهَبْ بِنَعْلَیَّ هَاتَیْنِ فَمَنْ لَقِیَكَ مِنْ وَرَآءِ هٰذَا الْحَائِطِ یَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَیْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ فَكَانَ اَوَّلَ مَنْ لَقِیْتُ عُمَرَ فَقَالَ مَا هَاتَانِ النَّعْلَانِ یَااَبَا هُرَیْرَةَ فَقُلْتُ هَاتَانِ نَعْلَا رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَنِیْ بِهِمَا مَنْ لَقِیْتُ یَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَیْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ بَشَّرْتُهٗ بِالْجَنَّةِ فَضَرَبَ عُمَرُ بَیْنَ ثَدْیَیَّ فَخَرَرْتُ لِاِسْتِیْ فَقَالَ ارْجِعْ یَا اَبَا هُرَیْرَةَ فَرَجَعْتُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَجْهَشْتُ بِالْبُكَاءِ وَرَكِبَنِیْ عُمَرُ وَاِذَا هُوَعَلٰی اَثَرِیْ فَقَالَ

رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَالَكَ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ قُلْتُ لَقِيْتُ عُمَرَ فَاَخْبَرْتُهُ بِالَّذِىْ بَعَثْتَنِىْ بِهٖ فَضَرَبَ بَيْنَ ثَدْيَىَّ ضَرْبَةً خَرَرْتُ لِاِسْتِىْ فَقَالَ ارْجِعْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عُمَرُ مَا حَمَلَكَ عَلٰى مَا فَعَلْتَ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ بِاَبِىْ اَنْتَ وَاُمِّىْ اَ بَعَثْتَ اَبَا هُرَيْرَةَ بِنَعْلَيْكَ مَنْ لَقِىَ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ بَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَلَا تَفْعَلْ فَاِنِّىْ اَخْشٰى اَنْ يَّتَّكِلَ النَّاسُ عَلَيْهَا فَخَلِّهِمْ يَعْمَلُوْنَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَلِّهِمْ. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

أخرجه مسلم فى صحيحه ١/٥٩ حديث رقم (٥٢ ـ ٣١)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ہم ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد بیٹھے تھے اور ہمارے ساتھ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اچانک ہمارے درمیان سے اٹھ کر کہیں باہر تشریف لے گئے ۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گئے ہوئے کافی دیر ہوگئی تو ہمیں بہت فکرمندی ہوئی کہ کہیں ہماری عدم موجودگی میں کسی دشمن کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے ۔ ہم یکا یک گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے، گھبرا جانے والا سب سے پہلا شخص میں تھا۔ اس لئے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طلب اور تلاش میں باہر نکلا اور تلاش کرتے ہوئے قبیلہ بنو نجار کے ایک انصاری کے باغ کے قریب پہنچ گیا کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس باغ کے اندر ہوں ۔ میں نے باغ کے اندر جانے کے لئے چاروں اطراف میں دروازہ تلاش کیا مگر دروازہ کہیں نظر نہ آیا۔ اچانک ایک نالی نظر آ گئی جو باہر کے کنوئیں سے باغ کے اندر جارہی تھی ۔ لہٰذا میں سمٹ کر اس نالی میں داخل ہوا۔ بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالیہ میں پہنچ گیا۔ آپ نے مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیرت سے فرمایا ابو ہریرہ تم ہو؟ حیرت یہ تھی کہ دروازہ بند ہونے کے باوجود کیسے آ گئے میں نے عرض کیا جی ہاں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ابو ہریرہ ہوں ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا ہے اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے ۔ پھر آپ اچانک اٹھے اور چلے گئے جب بہت دیر ہوگئی آپ واپس تشریف نہ لائے تو ہم گھبرا اٹھے کہ کہیں ہماری عدم موجودگی میں آپ کو کوئی اذیت اور تکلیف نہ پہنچا دی جائے اور سب سے پہلے گھبراہٹ کا شکار ہونے والا میں تھا۔ چنانچہ آپ کو تلاش کرتا ہوا آخر کار اس باغ تک پہنچ آیا۔ باغ کے اندر آنے کے لئے تلاش بسیار کے باوجود دروازہ نظر نہ آیا۔ تو لومڑی کی طرح سکڑ اور سمٹ کر نالی سے اندر گھس آیا۔ باقی لوگ بھی میرے پیچھے آ رہے ہیں یہ بات سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں جوتے اتار کر مجھے دیدیئے اور فرمایا اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جاؤ اور ان جوتوں کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ تاکہ لوگ اس بات کو باور کرلیں کہ تم مجھے مل کر واپس آئے ہو اور اس باغ سے باہر جو آدمی بھی صدق دل اور اعتقاد جازم کے ساتھ یہ شہادت دیتا ہوا تمہیں مل جائے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں، تو اس کو جنت کی خوش خبری دیدو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پیغام اور فرمان کو لے کر واپس آیا۔ تو سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے میری ملاقات ہوئی ۔ انہوں نے فرمایا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یہ جوتے کیسے ہیں؟ میں نے عرض کیا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ جوتے علامت اور دلیل کے طور پر دیکر بھیجا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ جو آدمی صدق دل اور اعتقاد جازم کے ساتھ یہ شہادت دیتا ہوا ملے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی

معبود حقیقی نہیں تو اس کو جنت کی خوشخبری دیدو۔ یہ سنتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے میرے سینے پر اتنے زور سے مکا مارا کہ میں سرین اور ایڑی کے بل پیچھے کی جانب نیچے گر پڑا۔ پھر انہوں نے فرمایا۔ ابو ہریرہ واپس چلے جاؤ۔ چنانچہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں واپس آ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ڈر بھی مجھ پر سوار تھا۔ اب کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے پہنچ آئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حالت اور کیفیت دیکھ کر پوچھا ابو ہریرہ کیا ہو؟ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول میں آپ کا پیغام لے کر واپس لوٹا تو سب سے پہلے میری ملاقات حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوئی ۔میں نے آپ کا پیغام ان کو سنایا۔ انہوں نے اس کو سنتے ہی میرے سینے پر انتہائی زور سے مکا مارا کہ میں سرین اور ایڑیوں کے بل زمین پر گر پڑا اور کہا کہ واپس چلے جاؤ۔ تو میں واپس آ گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا عمر تم نے ایسا کیوں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں کیا واقعی ابو ہریرہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دلیل اور علامت کے طور اپنے جوتے دیکر اس لئے بھیجا تھا کہ جو شخص صدق دل اور اعتقاد جازم کے ساتھ ۔توحید کی تصدیق کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہتے ہوئے ملے اس کو جنت کی خوش خبری سنا دو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول ایسا نہ کیجئے مجھے خوف ہے کہ لوگ کہیں اسی خوش خبری پر اعتماد کر بیٹھیں گے اور عمل کرنا چھوڑ دینگے ۔اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو زیادہ سے زیادہ عمل میں مصروف رہنے دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر آپ کا یہی مشورہ ہے تو ٹھیک ہے لوگوں کو عمل میں مصروف رہنے دیں۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: كنا قعودا حول ......ان يقتطع من دوننا:

"بين اظهرنا": أظهر زائدہ ہے تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔" ان يقتطع": ای من بيننا يقتطع میں ضمیر مستتر سے حال ہے۔

"دوننا": کشاف میں ہے کہ دون کا معنی ہے "ادنى مكان الشيء" (کسی چیز کی قریبی جگہ)، اور اسی سے الشيء الدون (کمتر چیز) ماخوذ ہے افعال ومراتب میں تفاوت کے لیے بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ محاورہ ہے: زيد دون عمرو في الشرف والعلم "زید شرف وعلم میں عمرو سے کم ہے"۔ پھر اس میں وسعت سے کام لیا گیا اور ہر اس جگہ استعمال کیا جانے لگا جہاں ایک حد سے کسی دوسری حد تک تجاوز پایا جائے۔

مطلب یہ ہے کہ ہیں خطرہ ہوا کہ کہیں ہم سے دور الگ دشمن یا کسی اور کی طرف سے آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے۔

قوله: ففزعنا وقمنا ،......فاحتفزت:

"فزعنا" یہ زاء کے کسرہ کے ساتھ ہے، ایک نسخہ میں ففزعنا ہے فاء کے ساتھ عطف کی وجہ یہ ہے دوسرا پہلے پر مترتب ہوتا ہے تو پہلا دوسرے کا سبب بنا۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ایک مترادف کا عطف دوسرے پر استمرار کے ارادہ سے کیا گیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: ﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا﴾ [القمر:۹] ای كذبوه تكذيبا غب تكذيب یعنی انہوں

نے بار بار جھٹلایا۔اھ۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ان دونوں میں یوں تغایر ہو کہ خشیت کو باطنی خوف اور فزع کو ظاہری اضطراب پر محمول کیا جائے اور یہی ظاہر ہے، اسلئے تأسیس یا نسبت تاکید بہتر ہے خصوصاً جب دونوں لفظوں میں تغایر بھی ہے۔

"للانصار لبنی النجار": انصار کے بعد "بنی النجار" کا ذکر تخصیص بعد از تعمیم ای فاجأعدم و جودی للباب رؤیۃ کے قبیل سے ہے۔یا بنی النجار انصار سے بدل بعض ہے۔

"فاذا": اذا مفاجات کے لیے ہے۔

"بئر خارجۃ": ہم نے بئر اور خارجہ تنوین کے ساتھ ضبط کیا ہے اس بناء پر کہ "خارجۃ" یہ بئر کی صفت ہے، شیخ ابوعمرو بن صلاح نے اسے اسی طرح روایت کیا ہے۔حافظ ابوموسیٰ اصفہانی اور دیگر حضرات نے فرمایا کہ یہ تین طریقوں پر مروی ہے۔پہلا طریقہ: جو ہم نے ذکر کردیا ہے۔دوسرا طریقہ: بئر تنوین کے ساتھ اور خارجۃ کے آخر میں ھاء مضمومہ یہ ضمیر حائط کی طرف لوٹ رہی ہے، البئر فی موضع خارج عن الحائط یعنی ایسا کنواں جو اس جگہ میں واقع ہے جو دیوار سے باہر ہے۔

تیسرا طریقہ: بئر کی اضافت خارجۃ کی طرف ہے خارجۃ کے آخر میں تاء تانیث کی ہے اور یہ ایک شخص کا نام ہے۔

پہلا طریقہ ہی مشہور ظاہر ہے شیخ محی الدین النووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی طرح ذکر فرمایا ہے۔

بئر اِس جگہ باغ کے معنی میں ہے اور باغ کو بئر اس بناء پر کہا کہ اس میں بہت سے کنویں تھے۔لوگ بئر بضاعۃ اور بئر بضاعۃ کہتے ہیں حالانکہ یہ دونوں باغ ہیں بئر اور حائط سے یہاں مراد ہے کھجور کا باغ جس کے گرد دیوار ہو۔" بئر" ہمزہ کے ساتھ یا ابدال کے ساتھ۔

یعنی میں نے سمجھا کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام اس باغ میں ہیں۔اس دیوار کی جانب دوسرا باغ یا اس باغ کی دیواروں میں سے ایک دیوار کا سوراخ شروع ہورہا ہے یا اس نہر تک جارہا ہے۔

" والربیع: الجدول": یہ جملہ بطور تفسیر کسی راوی نے بیان کیا ہے۔

"فاحتفزت": علامہ نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ زاء معجمہ اور راء مہملہ کے ساتھ مروی ہے اور درست روایت پہلی ہے اور اس کا معنی ہے میں سکڑ گیا تاکہ اندر جانے والی جگہ سے گزر سکوں۔

قولہ: فقال: ابو ہریرۃ؟ فقلت نعم یارسول اللہ:

اصل عبارت یوں ہے: فقال النبی ﷺ أ انت ابو ھریرہ؟ یعنی نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا: آیا آپ ابو ہریرہ ہو؟

اس استفہام کے بارے میں تین احتمال ہیں:

① استفہام یا تو اپنی حقیقت پر ہی ہے اس لئے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام اس بشارت کے وحی کئے جانے کی وجہ سے اپنی بشریت سے غائب تھے (آپ کا تعلق اس عالم سے نہ تھا) لہٰذا آپ کو پتہ نہ چلا کہ یہ ابو ہریرہ ہیں؟

② اور یا استفہام تقدیر وثبوت کے لیے تھا، اور یہی ظاہر ہے۔

③ یا تعجب کے لیے تھا، کہ آپ ﷺ حیران ہوئے کہ سب راستے بند ہیں تو یہ آپ ﷺ کی خدمت میں کیونکر پہنچ گئے؟

قوله: قال: ماشأنك؟......الناس ورائی: ہمزہ کے ساتھ ہے اور ابدال کے ساتھ بھی درست ہے۔
ہمیں پہلے آپ کے بارے میں پھر اپنے متعلق اندیشہ لاحق ہوا۔ کہ کہیں آپ کو آپ کے دشمنوں نے الگ کر کے ہلاک نہ کر دیا۔ اور ہمیں اطلاع بھی نہ ہو، یا ہم آپ کو نہ پا کر آپ کے لیے جان دیدیں۔ اسی وجہ سے ہم گھبرا گئے، اور ہم نے آپ سے متعلق خبر معلوم کرنے میں جلدی کی۔ آپ مشتاقین میں نے، اور میں تمام اندیشہ کرنے والوں میں سب سے پہلے اٹھ کھڑا ہوا ہوں۔ اور یہاں آیا اس بناء پر کہ میرا خیال تھا کہ آپ اس باغ میں ہوں گے۔ میں سکڑ گیا اس لئے کہ مجھے اس کا کوئی دروازہ نہیں ملا۔ مطلوب کی تحصیل میں۔
اور لوگ میرے پیچھے آپ سے متعلق معلومات کے منتظر ہیں کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا،
"**هو لاء الناس ولائی**": یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا اقتباس ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی حکایت ہے: ﴿قَالَ هُمْ أُولَاءِ عَلَىٰ أَثَرِي وَعَجِلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَىٰ﴾ [طٰہ: ۸۴]

قوله: واعطانی نعليه......فبشره بالجنة:
"**واعطانی نعليه**": یہ جملہ حال ہے۔
"**فقال**": پہلے فقال کے لیے تاکید ہے۔" **اذهب بنعلي**": یہ باء تعدیہ کے لیے ہے۔
"**هاتين**": تنبیہ کے واسطے تاکید ہے۔
ممکن ہے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اس مقام نوری میں کوہ طور والی تجلی ہوئی ہو، لہٰذا آپ ﷺ نے نعلین مبارکین اتار دئے ہوں اور اپنے دونوں جہانوں کے اصحاب کو دیے ہوں یا انہیں ان کے دین پر ثابت قدم رہنے اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف اپنے قدموں سے چل کر بھرپور جدوجہد صرف کرنے کا اشارہ ہو۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ممکن ہے آپ ﷺ کے نعلین بھیجنے کا فائدہ ان کی سچائی پر دلالت ہو اگرچہ ان کی خبر اس کے بغیر بھی مقبول تھی۔
آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نعلین کو بھیجنے کے لیے کیوں مختص فرمایا چونکہ اس میں کئی احتمال ہیں: آپ ﷺ کے پاس نعلین کے علاوہ کچھ نہ تھا۔
اور یا اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ آپ کی بعثت اور تشریف آوری کا مقصد اُمت کو خوشخبری سنانا' ان کے لیے آسانی پیدا کرنا' اور ان بوجھوں (مشکل احکام) کو ختم کرنا تھا جو سابقہ اُمتوں کو دیے گئے اور یا ثابت قدمی اور اقرار ایمان کے بعد استقامت اختیار کرنے کا اشارہ تھا جیسا کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: "**قل امنت بالله ثم استقم**" تم کہہ دو! میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا ہوں پھر تم استقامت اختیار کرو۔ واللہ اعلم باسرارہ واسرار اُبرارہ۔
"**من رواء هذا الحائط**": یہ قید واقعی ہے یا مراد غیبی ایمان ہے جس کے ذریعہ مخلص مؤمن، منافق سے ممتاز ہو جاتا ہے۔
"**يشهد**": یعنی وہ انجام یہ کہ وہ "**لا اله الا الله**" کی ہو اور اس سے محمد رسول اللہ کی گواہی بھی لازم آتی ہے۔
"**مستقينا بها**": یعنی اس کلمہ کے مضمون کا۔ "**قلبه**": یعنی اسے اس کلمہ پر انشراح صدر حاصل ہو، توحید و نبوت جو دونوں

اجمالی ایمان ہیں ان میں کوئی شک وشبہ نہ ہو۔تو اس کو بشارت دیں کہ جو اس صفت کے ساتھ متصف ہو گا وہ اہلِ جنت میں سے ہے ورنہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ان کے یقین کا علم نہیں تھا۔

توحید اور اس کا اقرار:

اس حدیث میں اہلِ حق کے مذہب واضح دلیل موجود ہے کہ توحید کا عقیدہ بغیر اقرار کے جب کہ اقرار پر قدرت حاصل ہو یا اس کا مطالبہ نفع بخش نہیں جیسا کہ صرف شہادتین کا اقرار بغیر دل سے اعتقاد کے بالا جماع فائدہ نہیں، بلکہ دونوں ضروری ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقرار باللسان کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ ایمان کے لیے شرط ہے یا جزوِ ایمان ہے اور کبھی عذر کی بناء پر ساقط بھی ہو جاتا ہے۔

یہاں قلب کا ذکر تاکید اور توہم مجاز کی نفی کے لیے ہے ورنہ یقین تو دل ہی سے ہوتا ہے، اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی کہے: رایت بعینی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

قولہ: فکان اول من لقیت عمر ......فخررت لاستی :

''عمر'': کان کی خبر ہونیکی بناء منصوب پر ہے اور بعض حضرات نے فرمایا' اسم ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، اور اول کے برعکس (خبر مقدم) ہے۔بعض: یہی زیادہ بہتر ہے اسلئے اول من لقیت یہ وصف ہے اور وہ خبر بننے کے زیادہ لائق ہے۔

یہ بات بہت بعید ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو ہریرہ کو بغیر کسی باعث کے مارا ہو۔اس لئے '' **فضرب عمر** '' سے پہلے عبارت کا مقدر ماننا ضروری ہے جو سیاق وسباق اور مابعد پر دلالت کرے۔وہ عبارت یوں ہے: **فقال عمر: ارجع ،فابیت وامتنعت عن حکمہ فضرب عمر بین ثدییہ**

(یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہو گا کہ آپ دوبارہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا کر پھر پوچھ لیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات اس بناء پر فرمائی کہ آپ رضی اللہ عنہ کی رائے کتاب اللہ کے موافق، اور آپ کا فرمان صواب تھا۔لیکن ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے انکار کیا' ان کے حکم کی بجا آوری نہیں کی کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ظاہری حکم ہر حکم کرنے والے کے حکم سے مقدم ہے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ سے ان کے سینے پر ضرب لگائی۔)

''ثدی'': بصیغۂ تثنیہ ہے۔''خررت'': راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔''است'': کا ہمزہ وصلی ہے۔

قولہ: فقال: ارجع یا ابا ھریرہ : بطور تاکید کے فرمایا۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فعل اور ان کا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مراجعت کا حکم آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اعتراض یا آپ کے حکم کو رد کرنے کے لیے نہیں تھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو صرف اُمت کے دلوں کو خوش کرنے اور انہیں بشارت سنانے کے لیے بھیجا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے چھپانے کو زیادہ مناسب خیال فرمایا تا کہ لوگ اسی بشارت کا سہارا ہی نہ لے لیں۔اھ

حاصل یہ ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام چونکہ رحمۃ العالمین، اہلِ ایمان پر رحیم، علیٰ وجہ الکمال مظہر جمال اور ہر حال میں

اُمت کے طبیب تھے جب آپ ﷺ کو ان کے خوف وڈر اور اضطراب کا پتہ چلا تو آپ ﷺ نے ڈر اور خوف کو زائل فرمانے کیلئے بشارت دیکر ان کا علاج فرمانا چاہا اسلئے کہ علاج معالجہ اضداد کے ذریعہ ہوتا ہے، جبکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلال کا مظہر تھے اور آپ ﷺ جانتے تھے کہ لوگوں میں سستی اور اسی پر بھروسہ کر کے بیٹھ جانا ہے تو آپ ﷺ نے اکثر لوگوں کے لیے معجون مرکب کو زیادہ باعث مصلحت سمجھا بلکہ ان کی بنسبت غلبہ خوف کو زیادہ مناسب جانا' پھر آپ ﷺ نے بھی ان کی موافقت فرمائی، اور یہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بہت بڑا مرتبہ اور جلیل القدر شان ہے۔

جہاں تک حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی اس بات کا تعلق ہے کہ "حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے مارنے کو اسلئے مباح سمجھا کہ وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے لئے بمنزلہ شیخ اور معلّم کے تھے، اور شیخ اور معلّم کے لیے اس جیسے مواقع میں متعلّم کی تادیب جائز ہے جبکہ وہ اسے خلاف آدب سمجھ رہا ہو اور یہاں یہ صورت تھی کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد کی مراد سمجھنے سے پہلے فوری طور پر اس حدیث کی اشاعت شروع کر دی حالانکہ اس پر اشکال اور اس پر لوگوں کا بھروسہ کر کے بیٹھ جانا اور اعمال سے روگردانی اختیار کرنا مرتب ہو رہا تھا، اور آپ رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری تھی کہ جب اس حدیث کی تبلیغ پر آپ کو مامور کیا گیا تھا تو اس کی مراد کو سمجھتے' تاکہ اسے موقع محل پر بیان فرماتے' ہر جگہ بیان نہ کرتے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد اس بات کا مقتضی ہوا کہ اس کمزوری پر آپ ﷺ کی تادیب کی جائے اس لئے انہوں نے اس مار سے ان کی تادیب فرمائی"۔ یہ بے فائدہ بات کو طول دینا ہے۔ اس لئے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کی ذکر کردہ ساری بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی اس پر حقیقی شیخ کی جانب سے فوری طور پر مارنا عقل میں نہیں آتا چہ جائیکہ کوئی اور مارے۔

پھر حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تعالیٰ کا یہ بھی فرمانا کہ "یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے اس عموم کے صدور کو مستبعد سمجھا ہو جس کی دلیل آگے آنے والا یہ ارشاد ہے: کیا آپ ﷺ نے انہیں بھیجا؟ الخ اور آپ ﷺ نے اس تصرف (عموم خبر) کی نسبت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف فرما کر اس پر انہیں تادیب فرمائی"۔ یہ بھی بہت دور کا احتمال ہے' جو سوءِ ظن اور دینی امور میں خبر واحد قبول نہ ہونے کا باعث بن سکتا ہے۔ اس سب کے باوجود اس پر مار کا کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے، مزید برآں تعجب کی بات یہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اس بات کو بھی متفرع فرمایا کہ بڑے اصحاب فضیلت اپنے چھوٹوں کو جو ان کے شاگردوں کے درجہ میں ہوں کی تادیب کر سکتے ہیں، اور شیخ اپنے شاگرد کو مار کر بھی تادیب سکھا سکتا ہے، اور انہوں نے اپنے بعض ائمہ سے اس کا جواز بھی نقل فرمایا۔ اھ۔ حالانکہ یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ بات کی مراد نہ سمجھنے پر مارنا یا بدگمانی پر اسے بیان کئے بغیر سزا دینا اجماع کے خلاف ہے۔ واللہ اعلم۔

قوله: فاجهشت بالبكاء:

"فاجهشمت" جهشت ھاء کے کسرہ اور بغیر ہمزہ کے مروی ہے، دونوں صحیح ہیں اور معروف کے صیغے ہیں، جھش اجہاش کی طرح ہے کہ ایک شخص دوسرے انسان سے جزع فزع کرے' اس کے پاس پناہ حاصل کرے اور اس کے ساتھ ساتھ رو بھی رہا ہو جیسے بچہ اپنی ماں کے پاس روتے ہوئے آتا ہے۔ "بالبكاء": باء مصاحبت کی ہے اور رونا یا تو شدت تکلیف کے باعث تھا یا قلتِ احترام کی بناء پر تھا۔

قوله: ورکبنی عمر واذا هو علی اثری:

میرے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دوڑتے چلے آنے نے مجھے خوف کی بناء پر بوجھل کر دیا جیسے کہا جاتا ہے: رکبته الدیون اس پر قرضے سوار ہو گئے یعنی انہوں نے اسے بوجھل کر دیا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی میرے پیچھے چلے آئے۔

"واذاھو": اذا مفاجات کے لیے ہے۔ اور ایک نسخہ میں فاء کے ساتھ ہے۔

"اثری": اس میں دو فصیح لغات ہیں: ا۔ دونوں پر فتحہ پڑھنا۔ یہ زیادہ صحیح ہے۔ ۲۔ ہمزہ کے کسرہ اور ثاء کے سکون کے ساتھ

قوله فقال رسول الله ﷺ مالك ......ماحملك علی ما فعلت ؟ :

ایک نسخہ میں "قلت" کے بجائے "فقلت" ہے۔ ایک نسخہ میں "قال" کے بجائے "فقال" ہے۔

قوله: قال: یا رسول الله یابی انت وامی ......بشره بالجنة:

ایک نسخہ میں "قال" کے بجائے "فقال" ہے۔ "باء" محذوف سے متعلق ہے۔ اس مقدر کو تخفیف کے طور پر حذف کر دیا گیا کثرت استعمال اور مخاطب کے اسے جانے کی بناء پر۔ بعض حضرات نے کہا وہ محذوف اسم ہے، تقدیر عبارت ہے: انت مدی بابی بعض نے کہا کہ وہ فعل ہے؛ ای فدیتك بابی وامی۔

"ابعثت": میں استفہام تقریر و تحقیق کے لیے ہے۔ "بشر": ماضی کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

قوله: فلا تفعل فانی اخشی ان یتکل الناس علیها فخلهم یعملون :

"یعملون": حال ہے۔

یعنی اس اجمالی بشارت پر، اور عام لوگ اس خوبصورت رحمت پر بھروسہ کر کے بندگی کی ان ذمہ داریوں کو جن کی صفات ربوبیت متقاضی ہیں چھوڑ بیٹھیں گے۔ اور اس وقت دنیا و آخرت کا نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا بایں طور کہ اکثر لوگ ملت اباحیت میں جا گریں گے، جیسا کہ بعض جاہل صوفیوں کا مذہب ہے۔ اس لئے کہ عوام کو جب بشارت دی جاتی ہے تو وہ عمل چھوڑ دیتے ہیں۔ بخلاف خواص کے انہیں جب خوشخبری دی جاتی ہے تو وہ عمل کو بڑھا دیتے ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

<u>فوائد</u>: علامہ نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حدیث مذکور سے معلوم ہوا: ① اتباع (چھوٹوں) کو اپنے متبوعین کے حال کا کس قدر اہتمام ہونا چاہیے اور ان کے مصالح کی تحصیل اور مفاسد کے دور کرنے پر کتنی توجہ دینی چاہیے۔ ② آدمی دوسرے کی مملوکہ زمین میں اس کی اجازت کے بغیر جا سکتا ہے جب کہ باہمی محبت وغیرہ کی وجہ سے معلوم ہو کہ مالک اس پر راضی ہے اسلئے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ باغ میں داخل ہوئے اور نبی کریم ﷺ نے اس پر تقریر فرمائی اور آپ سے اس بارے میں ان پر کوئی نکیر منقول نہیں ہے اور یہ صرف کسی کی زمین پر داخل ہونے کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ اس کی اشیاء سے انتفاع حاصل کرنا اس کے غلہ کا کھانا' اسے اپنے گھر لے جانا اور اس کی سواری پر بیٹھنا' اور اس کے علاوہ ہر ایسا تصرف جس کے بارے میں معلوم ہو کہ یہ اس کے مالک پر گراں نہیں گزرے گا جائز ہے۔ اس پر خلف و سلف کا اتفاق ہے۔ علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ یہ تصرف کھانے وغیرہ سے دراھیم و دنانیر وغیرہ کی طرف متجاوز نہ ہوگا، اور شاید یہ ان کثیر دراھم سے متعلق بات ہو

جن سے متعلق مالک کی رضامندی کا شک ہو۔

اور اس حدیث سے ایک آدمی کا دوسرے کو أبی أنت و امی (میرے ماں باپ آپ پر قربان) کہنے کا جواز بھی معلوم ہوتا ہے چاہے مفدی به (جاں نثار) مسلمان ہو یا کافر ہو زندہ ہو یا مردہ۔

قوله: رواه مسلم: مناسب یہ تھا کہ صاحب کتاب اپنی عادت کے موافق یوں فرماتے:

"روی الاحادیث الاربعة مسلم"۔ کہ چاروں احادیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

۴۰: وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَفَاتِیْحُ الْجَنَّةِ شَهَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ. (رواه احمد)

أخرجه أحمد في المسند ٥/٢٤٢۔

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ صدق دل سے اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں یہ جنت کی چابیاں ہیں اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: قال لی رسول الله ﷺ:

اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس وہ اکیلے تھے' یا یہ کہ خطاب میں ہی مقصود تھے۔

قوله: مفاتیح الجنة شهادة ان لا اله الا الله:

علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "مفاتیح" مبتدا اور "شهادة" اس کی خبر ہے، اور ان دونوں کے درمیان جمع اور مفرد ہونے کے اعتبار سے مطابقت نہیں ہے۔ اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں: ① یہ شاعر کے اس قول کی قبیل سے ہے:

معی جیاعًا ومعی جیاعًا

بھوک سے لاغر اونٹنی کی آنتوں کے ہر جز کو شدت بھوک کی بناء پر گویا ایک آنت قرار دیا۔ اسی طرح ایسی شہادت جس کے بعد ان اعمال صالحہ کی انجام دہی ہو جو کنگھی کے دندانوں کی طرح ہیں کہ ان کا ہر جز و بمنزلہ ایک چابی کے ہے۔ اھ

② زیادہ ظاہر یہ ہے کہ شہادت سے مراد جنس ہے، چنانچہ ہر ایک کی شہادت اسکے ابتدائی طور پر یا آخر کار جنت میں داخلہ کا باعث ہے اور اعمال صرف درجات کی بلندی اور وصال کی لذتوں کے مراتب میں رفعت کا سبب ہیں۔ ③ اس وجہ سے کہ شہادت جب جنت کے دروازوں کی کنجی ہے، تو گویا وہ کئی چابیاں ہیں (کہ دروازے بہت ہیں)۔ ④ اس بناء پر کہ شہادت مصدر ہے۔ قلیل و کثیر کو شامل ہونے کی وجہ سے جمع وغیرہ کی خبر دیتا ہے۔

وجہ تشبیہ کا بیان: آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شہادت کو چابیوں سے تشبیہ دی ہے چونکہ ان میں سے ہر ایک دخولِ جنت کا سبب ہے، پھر حروف تشبہ کو حذف کر دیا اور مشبہ کے معنی کی زیادتی اور اس میں مبالغہ کے تحقق کے لیے اسے منقلب کر دیا اور ایک بات یہ بھی ہے کہ متلازمین (دو چیزیں جو باہم ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہوں) میں سے ایک کو ذکر کرنا دوسرے سے مستغنی کر دیتا ہے اسلئے کہ شہادتین میں سے ایک شہادت دوسری کے بغیر قابلِ اعتداد نہیں۔

۴۱: وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ اِنَّ رِجَالًا مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حِیْنَ

تُوُفِّيَ حَزِنُوْا عَلَيْهِ حَتّٰى كَادَ بَعْضُهُمْ يُوَسْوِسُ قَالَ عُثْمَانُ وَكُنْتُ بَعْضَهُمْ فَبَيْنَا اَنَا جَالِسٌ مَرَّ عَلَيَّ عُمَرُ وَسَلَّمَ فَلَمْ اَشْعُرْ بِهٖ فَاشْتَكٰى عُمَرُ اِلٰى اَبِيْ بَكْرٍ ثُمَّ اَقْبَلَا حَتّٰى سَلَّمَا عَلَيَّ جَمِيْعًا فَقَالَ اَبُوْ بَكْرٍ مَا حَمَلَكَ عَلٰى اَنْ لَا تَرُدَّ عَلٰى اَخِيْكَ عُمَرَ سَلَامَهٗ قُلْتُ مَا فَعَلْتُ فَقَالَ عُمَرُ بَلٰى وَاللّٰهِ لَقَدْ فَعَلْتَ قَالَ قُلْتُ وَاللّٰهِ مَا شَعَرْتُ اَنَّكَ مَرَرْتَ وَلَا سَلَّمْتَ قَالَ اَبُوْ بَكْرٍ صَدَقَ عُثْمَانُ قَدْ شَغَلَكَ عَنْ ذٰلِكَ اَمْرٌ فَقُلْتُ اَجَلْ قَالَ مَاهُوَ قُلْتُ تَوَفَّى اللّٰهُ تَعَالٰى نَبِيَّهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ اَنْ نَّسْاَلَهٗ عَنْ نَّجَاةِ هٰذَا الْاَمْرِ قَالَ اَبُوْ بَكْرٍ قَدْ سَاَلْتُهٗ عَنْ ذٰلِكَ فَقُمْتُ اِلَيْهِ وَقُلْتُ لَهٗ بِاَبِيْ اَنْتَ وَاُمِّيْ اَنْتَ اَحَقُّ بِهَا قَالَ اَبُوْ بَكْرٍ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا نَجَاةُ هٰذَا الْاَمْرِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَبِلَ مِنِّي الْكَلِمَةَ الَّتِيْ عَرَضْتُ عَلٰى عَمِّيْ فَرَدَّهَا فَهِيَ لَهٗ نَجَاةٌ . (رَوَاهُ اَحْمَدُ)

أخرجه أحمد في مسنده ١٠/٦ـ

ترجمہ: حضرت عثمان غنیؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات کا سانحہ ہوا تو آپ ﷺ کے بعض اصحاب پر غم اور رنج کا اس قدر غلبہ ہوا کہ ان میں سے بعض لوگوں کے بارے میں یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں شک وشبہ اور وسوسہ کا شکار نہ ہو جائیں۔ حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں میں سے ایک میں بھی تھا چنانچہ میں ایک مرتبہ اسی کرب و اضطراب کی حالت اور کیفیت میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ میرے پاس سے گزرے اور مجھے سلام کیا اور مجھے اس رنج وحزن کی وجہ سے بالکل پتہ نہیں چلا کہ آپ کب میرے پاس سے گزرے ہیں اور کس وقت مجھے سلام کیا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے میری عدم توجہ اور سلام کا جواب نہ دینے کو بہت شدت سے محسوس کیا اور اس کی شکایت حضرت ابوبکرؓ سے کی کہ عثمانؓ نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا۔ پھر دونوں حضرات میرے پاس تشریف لائے اور دونوں نے مجھے سلام کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ آپ نے اپنے بھائی عمر رضی اللہ عنہ کے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا؟ میں نے کہا نہیں۔ ایسا تو ہرگز نہیں ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ میرے پاس آئے ہوں اور مجھے سلام کیا ہو اور میں نے ان کے سلام کا جواب نہ دیا ہو۔ میرے علم میں یہ بات نہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں اللہ کی قسم ایسا ہی ہوا ہے کہ میں نے سلام کیا ہے اور آپ نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا۔ حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں اللہ کی قسم مجھے قطعاً اس کا علم نہیں کہ آپ میرے پاس آئے تھے اور آپ نے مجھے سلام کیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا عثمان سچ کہتے ہیں ان کو آپ کے گزرنے اور سلام کرنے کا احساس نہیں ہوا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص وجہ اور معاملے نے تمہیں اس سے بے خبر کر دیا اور توجہ نہ ہوئی کہ نہ تو عمر رضی اللہ عنہ کے آنے کا علم ہوا اور نہ آپ ان کے سلام کا جواب دے سکے۔ میں نے کہا ہاں بالکل ایسی ہی بات ہے۔ انہوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ میں نے کہا پہلے تو رسول اللہ ﷺ کی وفات ہی ہمارے لئے اندوہناک اور صبر آزما تھی اور اب یہ کرب واضطراب لاحق ہوا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس دار فانی سے تشریف لے گئے۔ لیکن ہم لوگ آپ ﷺ سے یہ نہ پوچھ سکے کہ اس معاملہ میں یعنی عبادات میں وساوس کا پیدا ہونا۔ شیطان کے ازلال اور جہنم کی آگ سے نجات اور بچاؤ کیسے ہوگا؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا

آپ غم نہ کریں۔ میں نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے دریافت کر لیا ہے۔ حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ میں بے اختیار فوراً کھڑا ہو گیا اور میں نے کہا۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں فی الواقع آپ ہی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کمال قرب کا خصوصی تعلق رکھنے اور علم حاصل کرنے کے غلبہ شوق کی وجہ سے اس کے متعلق سوال کرنے کے لائق اور مناسب تھے پھر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا میں نے عرض کیا تھا۔ اے اللہ کے رسول ﷺ اس معاملے میں نجات اور کامیابی کی کیا صورت ہوگی۔ تو اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ جس آدمی نے صدق دل اور اخلاص کے ساتھ مجھ سے کلمہ توحید کو قبول کر لیا۔ جس کو میں نے اپنے چچا ابوطالب کے سامنے پیش کیا تھا اور اس نے اس کو قبول نہیں کیا تھا بلکہ رد کر دیا تھا۔ وہ کلمہ اس آدمی کی نجات اور فلاح کا ضامن ہوگا۔ اس حدیث کو احمد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قولہ: ان رجال من اصحاب النبی ﷺ ...... بعضھم یوسوس:

''ان'': ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ ''توفی'': تاء اور واؤ کے ضمہ کے ساتھ ماضی مجہول ہے۔ ''حزنوا'': زاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وسوسہ حدیث نفس کو کہتے ہیں، اور وہ لازم ہے۔ علامہ جوہری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کچھ لوگ **یوسوس کسرہ** (پہلے واؤ کے کسرہ اور دوسرے کے فتحہ سے) اور فتحہ کے ساتھ پڑھتے ہیں جو کہ غلطی ہے۔ وسوسہ میں پڑ جائیں اور عقل چلی جائے۔

یعنی ان کی موت پر اور ان کی شخصیت کے دنیا سے پردہ پوشی پر اور ان کے وجود کو نہ پا کر اور ان کے علمی افادہ اور معارف باطنیہ کے افاضہ کو نہ پا کر وسوسے میں پڑ گئے۔ بایں طور کہ دل میں یہ بات آگئی کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی موت کے باعث یہ دین ختم ہو گیا اور شریعت منورہ کا نور بجھ گیا، اور نفوس کاملہ میں اس خیال کا کھٹکا ان کے لیے باعثِ ہلاکت بن گیا یہاں تک کہ ان کا حال بدل گیا اور کلام میں اختلاط واقع ہو گیا۔ مدہوش ہو کر رہ گئے کچھ حضرات کے حالات کتاب کے آخر میں آئیں گے کہ بعض حضرات کو اس حادثہ نے ان بٹھا دیا اور خاموش کر دیا، اور ان میں سے بعض نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی موت کا انکار کر دیا، اللہ تعالیٰ نے صدیق اکبر ؓ کو استقامت عطا فرما کر ان کی فضیلت سب پر ظاہر فرما دی۔

قولہ: قال عثمان کنت منھم ...... فقلت: اجل:

''قال'': ''قلت واللہ ماشعرت'' کی ضمیر حضرت عثمان ؓ کی طرف راجع ہے۔ بعض نسخوں میں ''قال'' متروک ہے۔

ایک نسخہ میں ''أنك مررت'' کے بعد ''بی'' کا اضافہ بھی ہے۔

یعنی سلام کا جواب نہ دینے کا فعل مجھ سے سرزد نہیں ہوا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں حضرت عمر کے سلام کا پتہ ہی نہیں چلا۔ انہوں نے عدم شعور کا جو عذر بیان فرمایا اس میں وہ سچے ہیں۔

جواب میں اتنا فرما دینا بھی کافی تھا کہ ''ما شعرت انك مررت'' اس پر ''ولا سلمت'' کا اضافہ تاکید کے لیے ہے۔ یعنی نہ میں نے آپ کو دیکھا نہ ہی آپ کا کلام سنا۔ (طیبی)

قولہ: توفی اللہ نبیہ ﷺ قبل ان نسالہ عن نجاۃ ھذا الامر:

جس کے ذریعہ ہم دوزخ سے نجات حاصل کر سکتے ہیں وہ اس دین کے ساتھ خاص ہے، اور یہ بھی مراد لے سکتے ہیں کہ جس راستہ پر عام لوگ چلتے ہیں کہ شیطانی دھوکہ، دنیا کی محبت اور اس میں فناء ہو جانا، اس کی شہوتوں کی جانب میلان، گناہوں اور معصیتوں کا ارتکاب میں مبتلا ہوتے ہیں یعنی ہم اس بڑے معاملہ سے نجات کا طریقہ آپ ﷺ سے پوچھتے، اور بقسم تقویٰ کی بات بیدار نفس میں ہی مؤثر ہوتی ہے، اور اس بات کو صرف وہی سمجھ پاتے ہیں جو سیر الی اللہ کرنے والے، اور اس کی معرفت رکھنے والے ہیں اور اسی وجہ سے ان حضرات نے اس بات کو لازم پکڑ لیا تھا اور وہی اس کے زیادہ حقدار اور اسکے اہل تھے۔

قوله:وقلت له:بأبي أنت وأمي أنت أحق بها:

یعنی پوچھنے، اس کی طرف سبقت کرنے اور اس سے بحث کرنے میں اسلئے کہ آپ پر خیر کی جانب سب سے آگے بڑھنے والے ہیں۔

قوله:فقال:من قبل مني الكلمة التي عرضت......الخ:

"**فقال**" کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہے جیسا کہ ایک نسخہ میں ایسا ہی ہے۔ "**الكمة التي عرضت على عمي فردها**": ایک نسخہ میں " **عرضت**" کے بجائے " **عرضتها**" ہے۔

اسی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ﴾ [القصص : ٥٦]

اسلئے کہ کلمہ ایسی ہدایت ہے جو ابتداءً یا انتہاءً عنایت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی خصوصاً جب کہ وہ حسن رعایت کے ساتھ مقرون بھی ہو، تو گویا آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں: نجات اس کلمہ میں ہے جو میں نے ابو طالب جیسے شخص پر پیش کیا جو ستر سال سے زیادہ عرصہ حالت کفر میں رہا کہ اگر وہ ایک بار اسے کہہ لیتا تو وہ اس کی رہائی وخلاصی کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں حجت بن جاتا، اس کے عذاب سے نجات کا ذریعہ بنے گا۔ تو اس مؤمن ومسلمان کا کیا کہنا جس کے گوشت پوست اور خون میں وہ کلمہ شامل ہے؟ لہٰذا اگر آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے ارشاد میں صراحتاً اس کلمہ کو ذکر فرما دیتے تو وہ عظمت جو اس انداز سے ظاہر ہو رہی ہے وہ مفہوم نہ ہوتی۔

۴۲ :وَعَنِ الْمِقْدَادِ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَبْقٰى عَلٰى ظَهْرِ الْأَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْإِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيْزٍ وَذُلِّ ذَلِيْلٍ إِمَّا يُعِزُّهُمُ اللّٰهُ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ أَهْلِهَا أَوْ يُذِلُّهُمْ فَيَدِيْنُوْنَ لَهَا قُلْتُ فَيَكُوْنُ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ. (رواه احمد)

أخرجه أحمد في مسنده ٦/٤۔

ترجمہ: حضرت مقداد بن اسودؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ زمین پر کوئی گھر۔ چاہے مٹی کا ہو یا خیمہ ہو باقی نہیں رہے گا کہ جس میں اللہ تعالیٰ کلمہ اسلام کو عزت والے کی عزت کے ساتھ اور ذلت والے کی ذلت کے ساتھ داخل نہ کرے۔ پس جو لوگ اپنی رضاء ورغبت سے بخوشی اسلام کو قبول کر لیں گے۔ ان کو اللہ تعالیٰ معزز ومحترم بنا کر کلمہ اسلام کا مستحق قرار دے گا اور جو لوگ اپنی رضاء ورغبت اور خوشی سے اس کلمہ کو قبول نہ کریں ان کو اللہ تعالیٰ ذلیل وخوار کر کے چھوڑ دے گا۔ تو پھر وہ لوگ کلمہ اسلام کی اطاعت اور تسلیم پر مجبور ہوں گے وہ اس طرح کہ وہ

جزیہ ادا کر کے رہ سکیں گے۔ اس کے علاوہ کوئی صورت نہ ہوگی۔ میں نے یہ سن کر کہا پھر تو ہر طرف اللہ ہی کا دین ہوگا۔ اس حدیث کو احمد نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

المقداد بن الاسود۔ یہ ''مقداد'' ہیں۔ اسود کے بیٹے اور ''کندی'' ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کے والد نے ''بنو کندہ'' سے عہد و پیمان کر لیا تھا۔ اسی لیے ''کندہ'' کی طرف منسوب ہوئے۔ ''ابن الاسود'' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ''اسود'' کے حلیف یا ان کے پروردہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بات نہ تھی بلکہ یہ ''اسود'' کے غلام تھے انہوں نے ان کو متبنّٰی بنا لیا تھا۔ یہ اسلام لانے والوں میں چھٹے آدمی ہیں۔ ان سے علی رضی اللہ عنہ اور طارق بن شہاب وغیرہ نے روایت کی۔ ''جرف'' میں وفات پائی۔ لوگ ان کو وہاں سے اپنے کندھوں پر اٹھا کر لائے اور بقیع میں ۳۳ھ میں دفن کیا۔ اس وقت ان کی عمر ستر (۷۰) سال تھی۔ جرف مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک مقام ہے۔

تشریح: **قوله:يقول :لا يبقى على ظهر الارض بيت مدر ولا وبر......وذل ذليل:**

''**يقول** '' یہ حال واقع ہو رہا ہے، مفعول ثانی ہے۔''**ظهر الارض**'': سے مراد جزیرہ عرب اور اس کے قریب کی سطح زمین ہے۔ لہٰذا یہ بات اس کے منافی نہیں ہے جو بعض حضرات کہتے ہیں کہ چین کے پیچھے ایک ایسی قوم آباد ہے جنہیں ابھی تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر نہیں پہنچی۔

''**وبر**'': وبر الابل سے ماخوذ ہے انٹوں کے بال' اسلئے کہ لوگ اونٹوں کے بالوں سے اور ان جیسے دوسرے بالوں سے اپنے خیمے بناتے تھے۔ ''**المدر**'': مدرۃ کی جمع ہے پکی اینٹ کو کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اسلام ہر شہر، ہر بستی، ہر دیہات کے ہر گھر میں داخل ہو کر رہے گا۔

''**ادخل**'' کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے اگرچہ ذکر پہلے نہیں ہوا جس کی دلیل آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اگلا ارشاد ہے: ''**اما يعزهم الله**'' اور بعض نسخوں میں ''**ادخله الله**'' کے الفاظ ہیں۔''**كلمة الاسلام**'': اس کا مفعول ہے، ضمیر منصوب ظرف ہے اور آپ علیہ السلام کا ارشاد ''**بعز عزيز**'' حال ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کلمہ اسلام کو ہر گھر میں اس حال میں داخل فرمائیں گے کہ عزت والے شخص کو عزت ملے گی یعنی اللہ تعالیٰ اس کو اس کلمہ کی بدولت عزت عطا فرمائیں گے بایں طور کہ وہ اسے بغیر گرفتار ہوئے اور لڑائی کے قبول کر لے گا اور ذلیل کو اس کلمے کے انکار کی وجہ سے اسے ذلیل کریں گے لفظ ''ذلیل'' یہاں حربی اور ذمی دونوں کو شامل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اس کلمہ کے انکار کی وجہ سے گرفتاری یا لڑائی کی ذلت سے دوچار فرمائیں گے یہاں تک کہ وہ اس کلمہ کی تابعداری اختیار کرے گا ناخوش ہو کر یا خوشی سے یا جزیہ دے کر اور یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ماخوذ ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ [التوبة : ٣٣]

قوله:: ''اما يعز هم الله......فيدينون له:

اس ارشاد میں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عزت وذلت کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔

کہ ایک ایسی قوم ہے جسے اللہ نے کلمہ کی قبولیت کی وجہ سے عزت بخشی۔ اور ایک دوسری قوم جس نے کلمہ کی طرف التفات کیا اور نہ ہی اسے قبول کیا تو گویا انہوں نے کلمہ کو ذلیل کیا پس انہیں ذلیل کر کے اس کا پورا پورا بدلہ دیا گیا اور یہ بات معلوم ہے کہ حربی کا تلوار کے ڈر سے زبردستی اسلام درست ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ ہے: ﴿حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ﴾ [التوبة: ۲۹]

قوله: قلت: فيكون الدين كله لله:

قائل حضرات مقداد ہیں اور ظاہر یہ ہے کہ آپ نے یہ ارشاد حضور ﷺ کی عدم موجودگی میں، بلکہ روایت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اسی لئے آپ ﷺ نے اس کا جواب ذکر نہیں فرمایا۔ یعنی جب معاملہ اس طرح ہے تو غلبہ طوعا وکرھا اللہ تعالیٰ کے دین کو ہوگا اور یہ کہ آخری زمانہ میں سطح زمین پر کفر کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا بلکہ تمام لوگ مسلمان ہو جائیں گے، ظاہراً و باطناً خوشی ورغبت سے یا جبر واکراہ سے اور جب ایسا ہوگا تو سارے کا سارا دین اللہ تعالیٰ کا ہوگا۔

قوله: رواه احمد:

فائدہ: ظاہر یہ تھا کہ مصنف یوں فرماتے **روى الاحاديث الثلاثة احمد** کہ تینوں حدیثوں کو امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے۔

جنت کی چابی

۴۳: وَعَنْ وَهْبِ بْنِ مُنَبِّهٍ قِيْلَ لَهُ أَلَيْسَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لَيْسَ مِفْتَاحٌ إِلَّا وَلَهُ أَسْنَانٌ فَإِنْ جِئْتَ بِمِفْتَاحٍ لَهُ أَسْنَانٌ فُتِحَ لَكَ وَإِلَّا لَمْ يُفْتَحْ لَكَ. (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)

أخرجه البخاري ۳/۱۰۹۔

ترجمہ: حضرت وہب بن منبہؒ سے روایت ہے کہ کسی آدمی نے ان سے پوچھا۔ کیا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ جنت کی چابی نہیں ہے؟ حضرت وہبؒ نے فرمایا کیوں نہیں۔ یہ جنت کی چابی ہے لیکن کوئی چابی ایسی نہیں ہوتی کہ جس کے دندانے نہ ہوں۔ اگر آپ ایسی چابی لے کر آئے کہ جس کے دندانے موجود ہوں۔ تو یقیناً تمہارے لیے جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ اگر اس میں دندانے نہ ہوئے تو پھر ہرگز جنت کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اس کو امام بخاری نے ترجمۃ الباب میں ذکر کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

وہب بن منبہ۔ یہ وہب ہیں۔ "منبہ" کے بیٹے ہیں۔ کنیت "ابوعبداللہ" ہے۔ صنعاء کے رہنے والے ہیں، ایرانی النسل ہیں۔ جابر بن عبداللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے حدیث کی سماعت کی۔ ۱۱۴ھ میں انتقال فرمایا۔

''منبہ'' میں میم پر پیش'نون پر زبر'باء (ایک نقطہ والی) کے نیچے زیر اور اس پر تشدید ہے۔

تشریح: قولہ: الیس لا الہ الا اللہ مفتاح الجنۃ:

" لا الہ الا اللہ " محل رفع میں ہے اس بناء پر کہ یہ لیس کا اسم ہے اور اس کی خبر'' مفتاح الجنۃ" ہے۔ بعض حضرات نے اس کے برعکس کہا ہے اور خبر کی تقدیم اس کے شرف کی بناء پر ہے۔

قولہ: قال: بلٰی ولکن لیس مفتاح الا ولہ أسنان:

یعنی میں اسکے مقتضی کے مطابق کہتا ہوں کہ بلاشبہ وہ جنت کی چابی ہے (جسا کہ پہلی حدیث میں گزر چکا ہے) لیکن کوئی دھوکہ میں نہ آئے اور یہ نہ سمجھے کہ اس کلمہ کا جو جنت کی چابی ہے جس سے جنت کا دروازہ کھلے گا صرف زبانی پڑھ لینے سے ہی کامیاب لوگوں کے ساتھ جنت میں داخل ہو جائے گا اگر چہ ان جیسے اعمال نہ بھی کرے اس لئے کہ وہ اگر چابی تو لے کر آیا لیکن اس کیلئے نفع مند نہیں، اس لئے کہ ہر کنجی کے دندانے ہوتے ہیں۔

یعنی لکڑی یا لوہے کی عام طور پر، یا عادت کے لحاظ سے وہی حقیقت میں کھولنے والی ہے۔

قولہ: فان جئت بمفتاح لہ أسنان......الخ:

علامہ طیبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ دندانوں سے مراد ارکانِ اربع یعنی نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ مطلق اعمالِ صالحہ جو بُرے اعمال کے ترک کو متضمن ہیں وہ مراد ہیں۔

اگر تم ایسی چابی نہ لے کر آئے جس کے دندانے ہوں جس کا ذکر ہو چکا اگر چہ اک دندانہ بھی کم ہو۔ ابتدائی طور پر اور اہلِ سنت والجماعت کے مذہب کی روح حدیث کے معنی صحیح ہونے کے لیے یہ تاویل ضروری ہے۔

یہ بات آپ سے مخفی نہیں ہونی چاہیے کہ حدیث کا ظاہر پہلی قید کا انکار کرتا ہے بہتر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ دندانوں سے مراد ایسی تصدیق قلبی ہے جس کے نفس الامر کے موافق ہونے میں کوئی شک وشبہ نہ ہو اور ایسا زبانی اقرار جو نفاق سے خالی ہو اور اسلام کے احکام کی ایسی تابعداری جس میں ناگواری اور مخالفت نہ ہو، چنانچہ کلمہ ان اوصاف کے ساتھ جنہیں ''اسنان'' سے تشبیہ دی گئی ابتدائی طور پر یا آخر کار جنت کی کنجی ہوگا جسے بھی فتاح وعلیم کی اجازت ہوگی۔

قولہ: رواہ البخاری فی ترجمۃ الباب:

ترجمہ جیم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ باب کے بعد حدیث معلق ذکر کرتے ہیں جس میں وہ مضمون بیان ہوتا ہے جن پر احادیث باب مشتمل ہوتی ہیں اور اس کی طرف باب کی اضافت کرتے ہیں۔ حضرات علماء کرام کا امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی ذکر کردہ تعلیقات کی صحت میں اختلاف ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ حدیث معلق جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ صیغہ تمریض مثلاً ''رُوِیَ" ذکر اور قیل سے ذکر کرتے ہیں وہ ضعیف ہے اور جسے صیغہ تمریض سے ذکر نہیں کرتے وہ ضعیف نہیں ہے۔

ایک نیکی کا ثواب سات سو گنا

۴۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَحْسَنَ اَحَدُكُمْ اِسْلَامَهٗ فَكُلُّ حَسَنَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهٗ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ وَكُلُّ سَيِّئَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ بِمِثْلِهَا حَتّٰى لَقِيَ اللّٰهَ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

أخرجه البخاري ۱/ ۱۰۰ حديث رقم ۴۲ ـ ومسلم ۱/ ۱۱۷ حديث (۲۰۵ ـ ۱۲۹)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی انسان صدقِ دل، اخلاص اور للّٰہیت کے ساتھ اپنا ایمان اچھی کیفیت والا بنالیتا ہے۔ اس کے بعد وہ عمل صالح کرتا ہے تو اس کے لیے اس کے صحیفہ میں دس سے لے کر سات سو تک زائد نیکیوں کا ثواب لکھا جاتا ہے اور جو گناہ وہ کرتا ہے وہ اس کے مثل اور برابر لکھا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: اذا احسن احدکم اسلامه...... الی سبعمائة ضعف:

"اذا أحسن احدکم اسلامه":

"تکتب بعشر" ایک نسخہ میں تکتب کے بعد "له" کا اضافی بھی ہے۔ اور "الی" انتہاء غایت کے لیے ہے۔

یعنی عمدہ اور خالص کرے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ [البقرة: ۱۱۲]

لہٰذا دس سے سات سو درجات تک اعمال، اشخاص اور حالات کے اعتبار سے ہے یا محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہے اور اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے مزید بڑھا دیتا ہے۔ علامہ ماوردی رحمۃ اللہ سے منقول ہے کہ دگنا ثواب سات سو گنا سے زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔

علامہ نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ غلط ہے اسلئے کہ مسلم شریف کی روایت میں ہے: **الی سبعمائة ضعف الی اضعاف کثیرة**۔ اھ۔ سات سو گنا سے بہت زیادہ کئی گنا بڑھا کردے گا اھ۔ اسلئے سات سو سے مراد کثرت ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾ [البقرة: ۲۶۱] یہاں **ضعف** سے مراد مثل ہے، خصوصاً حرم کی نیکی کا ثواب ایک لاکھ نیکیوں کے برابر ہوتا ہے۔

علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا: صحیح روایت میں ہے: **صلاة واحد فی المسجد الحرام تعدل مائة الف صلاة فی مسجد رسول الله** ﷺ کہ مسجد حرام میں پڑھی جانے والی ایک نماز مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے، اور اس جیسی دوسری احادیث سے میں نے یہ اُخذ کیا ہے کہ مکہ مکرمہ میں ایک نماز کا ثواب (**مائة الف الف صلاة**) ایک کھرب نمازوں کے برابر ہوتا ہے، جیسا کہ آگے آئے گا، پس دس نیکیوں سے کم ثواب نہیں ملتا' اور زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں اور دس سے سات سو گنا ثواب عام طور پر کمالِ اعمال اور ان کے ساتھ جو اخلاص وغیرہ شامل ہوتا ہے اس کی بناء پر ہوتا

ہے۔اھ۔ یہ بات بھی مخفی نہیں کہ حسنات کی کیفیات بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔

قوله: وكل سيئة يعملها تكتب بمثلها حتى لقى الله:

یعنی اللہ کے فضل واحسان اور رحمت کے صدقہ میں کمیت کے اعتبار سے۔اگرچہ سیئات زمانہ، مکان، نافرمانی کے مراتب کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے ملے گا پھر وہ اسے سزا دے گا یا معاف فرمادے گا۔ ماضی کی طرف عدول تحقق وقوع کے لیے ہیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَتَىٰ أَمْرُ اللَّهِ......﴾ [المومن : ۷۸] ''اللہ کا امر آ چکا''۔ حتی کا تعلق دونوں جملوں سے ہونا کوئی بعید نہیں ہے اور لقاء سے مراد موت کے ہیں۔

ایمان کی تعریف

۴۵: وَ عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا الْاِيْمَانُ قَالَ اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَائَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ قَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَمَا الْاِثْمُ قَالَ اِذَا حَاكَ فِيْ نَفْسِكَ شَيْءٌ فَدَعْهُ۔ (رَوَاهُ اَحْمَدُ)

أخرجه أحمد في مسنده ۵/ ۲۵۱ وفيه تقديم وتاخير۔

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا۔ اے اللہ کے رسول ﷺ ایمان کی علامت اور نشانی کیا ہے۔ آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جب تمہاری نیکی تمہیں خوش کردے اور تمہاری برائی تمہیں غمزدہ کردے تو سمجھ لو کہ تم سچے مؤمن ہو۔ پھر اس آدمی نے سوال کیا۔ اے اللہ کے رسول گناہ کی علامت کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جب کوئی بات تمہارے دل میں شک اور تردد پیدا کردے تو جان لو کہ وہ گناہ کی بات ہے اس کو ترک کردو۔ اس حدیث کو احمد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: ما الايمان؟ قال: اذا سرتك ...... فانت مؤمن:

یعنی جب تم کوئی نیکی کرو تو توفیق طاعت پر تمہیں فرحت ومسرت حاصل ہو، اور جب تم کسی برائی کا ارتکاب کرو تو عقوبت کے ڈر سے تمہارے دل میں غم و پریشانی لاحق ہو تو تم سمجھ لو کہ تم مؤمن ہو۔ اس لئے کہ مؤمن کامل نیکی و بدی کے درمیان فرق کرتا ہے اور اعتقاد رکھتا ہے کہ قیامت کے دن اس کا بدلہ ملنا ہے بخلاف کافر کے وہ نہ تو دونوں میں فرق کرتا ہے اور نہ ہی اسے دونوں (یعنی نیکی و بدی) کے کرلینے کی کوئی پرواہ ہوتی ہے۔

قوله: فما الاثم؟ قال اذا حاك في نفسك شيء:

یعنی گناہ کے بارے میں کوئی نص صریح، یا نقل صحیح نہ ہو اور اس کا معاملہ مشتبہ ہو جائے اور اس کے حکم میں التباس ہو جائے۔ اور اس پر تمہارا دل مطمئن نہ ہو اور اس پر اس طرح اثر انداز ہو کہ اس کی نفرت تا دیر رہے۔ جیسے نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: دع ما يريبك الى ما لا يريبك

''جو چیز تیرے دل میں کھٹکے اسے چھوڑ دو اور اس پر عمل پیرا ہو جس میں کوئی تردد (شک و شبہ) نہ ہو۔''

یہ معنی ان حضرات کے اعتبار سے ہے جن کے باطن صاف اور دل پاک ہیں۔
یا مطلب یہ ہے کہ جب اسے چھوڑ دینے میں احتیاط ہو تو اسے احتیاطاً چھوڑ دیں اور جب اس کا انجام دینا بہتر ہو تو اس کی ضد کو چھوڑ دو تا کہ تم گناہ میں نہ پڑو۔ بعض حضرات نے فرمایا: دونوں جواب من قبیل اسلوب الحکیم ہیں۔
تنبیہ: سید سے حاك کے کلمہ میں تغیر واقع ہوا ہے اس لیے انہوں نے حاك کی بجائے "جاء ك" مجئی سے ماضی کا صیغہ پڑھ دیا۔

دین کی بنیادی تعلیمات

۴۶: وَعَنْ عَمْرِوبْنِ عَبَسَةَ قَالَ اَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ مَّعَكَ عَلٰى هٰذَا الْاَمْرِ قَالَ حُرٌّ وَعَبْدٌ قُلْتُ مَا الْاِسْلَامُ قَالَ طِيْبُ الْكَلَامِ وَاِطْعَامُ الطَّعَامِ قُلْتُ مَا الْاِيْمَانُ قَالَ الصَّبْرُ وَالسَّمَاحَةُ قَالَ قُلْتُ اَيُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ قَالَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ قَالَ قُلْتُ اَيُّ الْاِيْمَانِ اَفْضَلُ قَالَ خُلُقٌ حَسَنٌ قَالَ قُلْتُ اَيُّ الصَّلَاةِ اَفْضَلُ قَالَ طُوْلُ الْقُنُوْتِ قَالَ قُلْتُ اَيُّ الْهِجْرَةِ اَفْضَلُ قَالَ اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ قَالَ قُلْتُ فَاَيُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ قَالَ مَنْ عُقِرَ جَوَادُهٗ وَاُهْرِيْقَ دَمُهٗ قَالَ قُلْتُ اَيُّ السَّاعَاتِ اَفْضَلُ قَالَ جَوْفُ اللَّيْلِ الْاٰخِرُ. (رواه احمد)

أخرجه أحمد في مسنده۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن عبسہ ؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول۔ جب آپ ﷺ نے شروع میں دعوت وتبلیغ کا کام شروع کیا تو آپ ﷺ کے ساتھ کون تھا۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے ساتھ ایک آزاد یعنی ابوبکر صدیق ؓ اور ایک غلام یعنی بلال ؓ تھے پھر میں نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ اسلام کی علامت کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا عمدہ کلام اور فقیروں کو کھانا کھلانا۔ پھر میں نے سوال کیا کہ ایمان کی علامت کیا ہے؟ آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ صبر اور سخاوت اختیار کرنا یعنی سیئات سے باز رہنا اور اطاعت وفرمانبرداری کے کاموں پر ہمہ وقت مستعد رہنا۔ پھر میں نے پوچھا کہ کونسا مسلمان بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ وہ مسلمان بہتر ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی تکلیف سے دوسرے مسلمان سلامتی اور حفاظت میں رہیں پھر میں نے پوچھا کہ ایمان کا کونسا کام افضل ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایمان کا افضل کام اچھے اخلاق ہیں۔ پھر میں نے سوال کیا نماز میں کونسی چیز افضل ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا طویل قیام کرنا۔ پھر میں نے سوال کیا کہ کونسی ہجرت افضل ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا افضل ہجرت یہ ہے کہ جن امور کو اللہ پسند نہیں کرتا ان کو چھوڑ دو۔ پھر میں نے سوال کیا کہ کونسا جہاد افضل ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ جہاد افضل ہے کہ جس میں آدمی کا گھوڑا بھی مارا جائے اور خود شہید ہو جائے۔ پھر میں نے دریافت کیا کہ سب سے افضل وقت کونسا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا نصف لیل کا آخری حصہ (اس حدیث کو احمد نے روایت کیا ہے)۔

راویٔ حدیث:

عمرو بن عبسۃ ۔''عمرو بن عبسہ''صحابی رسول ہیں'ان کی کنیت ابونجیح ہے'سلمی ہیں'ابتداء میں ہی اسلام لے آئے تھے۔کہا جاتا ہے کہ اسلام لانے والوں میں یہ چوتھے شخص ہیں'پھر یہ اپنی قوم''بنی سلیم'' کی طرف واپس ہو گئے تھے'آنحضور ﷺ نے ان سے فرمایا تھا کہ جب تم میرے متعلق یہ سنو کہ میں (ہجرت کے لیے) نکلا ہوں تو میری اتباع کرنا۔چنانچہ یہ برابر اپنی قوم میں مقیم رہے اور اپنے ایمان لانے کو اپنی قوم سے چھپائے رکھا'یہاں تک کہ غزوۂ خیبر ختم ہوا'اس کے بعد یہ آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مدینہ طیبہ میں قیام اختیار فرمایا'ان کا شمار شامیوں میں ہوتا ہے'ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

''عبسہ''عین مہملہ اور بائے موحدہ اور سین مہملہ تینوں کے زبر کے ساتھ ہے۔''نجیح''نون کے زبر'جیم کے زیر اور حائے مہملہ کے ساتھ ہے۔عرض مرتب:امام مغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یقین کے ساتھ کہا کہ یہ''سلمی''نہیں ہیں۔ملاحظہ فرمایئے:الاصابۃ'ج:ع'۱۹۶/۱۱۵۱۔

تشریح:قولہ:قال:حر وعبد:

یعنی ہر آزاد وغلام کو موافقت کا حکم ہے'بعض حضرات نے فرمایا:حضرت ابوبکر وزید'یا حضرت ابوبکر وبلال رضی اللہ عنہم مراد ہیں اور اس کی تائید مسلم شریف کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے:ومعه يومئذ أبوبكر وبلال کہ''اس دن آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر اور حضرت بلال رضی اللہ عنہما تھے''ممکن ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تذکرہ ان کے بچہ ہونے کی بناء پر اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا ذکر ان کے مستور وعدم ظہور کی وجہ سے نہ کیا ہو۔

قوله:قلت :ما الاسلام؟قال:طيب الكلام واطعام الطعام:

''ما الاسلام'':

''طيب الكلام و اطعام الطعام'':ان دونوں میں اعلیٰ اخلاق اور انسانی افراد کے ساتھ احسان کا مظاہرہ کرنے کی طرف اشارہ ہے اگرچہ زبان کی حلاوت کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔

قوله:قلت :ما الايمان؟قال:الصبر والسماحة:

یعنی اطاعت پر استقامت اور مصیبت میں نافرمانی سے بچنا'دنیا سے بے رغبتی'فقیروں کے ساتھ کرم واحسان،اور بعض حضرات نے کہا کہ غیر موجود چیز پر صبر کرنا اور موجود چیز میں سخاوت کرنا۔

قوله:اى الاسلام افضل؟ قال:''من سلم المسلمون من لسانه ويده:

''اى الاسلام'':یعنی اسلامی اطوار اور اسلام والے اور یہی (مراد) زیادہ بہتر ہے (یہاں مضاف محذوف ہے) **اى خصال الاسلام او أهل الاسلام اى اى اخلاق الايمان أو خصال الايمان۔**

قوله:قلت:اى الايمان أفضل؟قال:خلق حسن:

''اى الايمان'':

"خلق" لام کے ضمہ کے ساتھ ہے اور اس کو ساکن بھی کر دیا جاتا ہے۔

یعنی اس کے کون سے اخلاق یا اطوار افضل ہیں؟ واضح رہے کہ حسن خلق یہ عمدہ خصلتوں اور بہترین عادات کے لئے ایک جامع صفت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ [القلم: ٤]

اسی لئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا فرمان ہے کہ **كان خلقه القرآن**، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان امور کی بجا آوری کرتے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا اور ان کاموں سے باز آتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا۔

ہمارے شیخ المشائخ خاتمۃ المحدثین وآخر المجتہدین جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے ایک حدیث حسن ذکر فرمائی ہے، جسے حسن نے حسن سے انہوں نے حسن کے والد سے انہوں نے حسن کے دادا سے یہ روایت نقل کی ہے:

"**أن احسن الحسن الخلق الحسن**" "سب سے بہترین نیکی خلق حسن ہے۔

بعض محققین نے فرمایا: **حسن خلق** کشادہ روئی، سخاوت کرنے، بخشش کرنے، ایذاء رسانی سے بچنے اور اللہ تعالیٰ کی خوب معرفت کی بناء پر کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی لئے محاورہ ہے: **الصوفی لا یخاصم ولایخاصم** صوفی نہ تو کسی سے لڑتا ہے اور نہ اس سے کوئی جھگڑتا ہے یا خوشی وتنگی میں مخلوق کو راضی کرنے کا نام حسن خلق ہے۔

حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حسن خلق کا ادنیٰ درجہ برداشت کرنا اور بدلہ نہ لینا، ظالم سے نرمی سے پیش آنا اور اس کیلئے استغفار کرنا اور اس پر شفقت کرنا ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ ارباب عرفان کے نزدیک وحی کی ابتدائی تعلیمات (طوالع) اور وجدان کے ظاہری امور سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ انسانِ عالم بڑا نورانی جوہر لطیف ہے جو جواہر قدسیہ ملکوتیہ کے مشابہ ہے اور وہ دو قوتوں کا مالک ہے ان کے کمال درجہ کا حصول خوش نصیبی کی علامت ہے اور ان دونوں میں کمزوری انسان کی بدبختی کا باعث ہے: ① ایک قوتِ عاقلہ ہے جو موجودات کی اجناس وانواع کی حقیقتوں کا ادراک کرتی ہے اور ان سے ان کے موجد کی معرفت کی جانب منتقل ہو جاتی ہے۔ ② دوسری قوتِ عاملہ ہے جو نفع مند چیز کے نفع کا ادراک کر کے اس کی طرف مائل ہوتی ہے اور نقصان دہ چیز کے نقصان سے آگاہی حاصل کر کے اس سے متنفر ہو جاتی ہے اور یہ معاشی امور ہیں جن کا تعلق نوع انسانی کی حفاظت اور کمال بدن سے ہے۔ اسی لئے حدیث میں وارد ہوا ہے: "**خالق الناس بخلق حسن**" "لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ۔

یا حسن خلق، ملکات فاضلہ (اوصاف حمیدہ) اور باطنی احوال ہیں اور وہ حسن خلق یا تو نفس کا رذائل سے پاک وصاف ہونا ہے اور اس کے دس اصول (بنیادی چیزیں) ہیں: ① کھانے۔ ② گفتگو۔ ③ غصہ۔ ④ حسد۔ ⑤ بخل۔ ⑥ حب مال۔ ⑦ حب جاہ ⑧ تکبر۔ ⑨ عجب اور ⑩ ریاء کاری۔

یا فضائل سے آراستہ ہونا ہے اور ان کی بنیادی قسمیں (اشیاء) بھی دس ہیں: توبہ، خوف، زہد، صبر، شکر، اخلاص، توکل، محبت، تقدیر پر راضی رہنا اور موت کو یاد کرنا۔

خُلُق ایسے ملکہ واستعداد کو کہتے ہیں جس کی بناء پر نفس سے بغیر کسی سابق غور وفکر کے افعال آسانی وسہولت سے صادر ہوتے ہیں۔ ملکہ کی دو قسمیں ہیں: **خلق فضیلہ** (اچھا عمدہ ملکہ) اور **خلق رذیلہ** (برا ملکہ گندے اوصاف)۔ اسی لئے ارشادِ باری

تعالیٰ ہے: ﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾ [القلم:٤]

قوله:قال:قلت:ای الصلوٰۃ أفضل؟

"أی الصلوٰۃ":أی أی ارکانها و کیفیاتها۔

یعنی اس کے ارکان یا اس کی کیفیات ثواب اور فضیلت کی رو سے زیادہ ثواب کا باعث ہے؟

قال:طول القنوت أفضل:

"القنوت":یعنی:① قیام۔② قراءت۔③ خشوع۔

قوله:قال:قلت:ای الهجرۃ أفضل؟

اُس لئے کہ ہجرت کی کئی قسمیں ہیں:صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کفار کی ایذاء رسانی کی بناء پر حبشہ کی طرف ہجرت کرنا، مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی جانب ہجرت، کافروں کے ملک سے اسلامی ملک کی طرف ہجرت بھی اسی حکم میں ہے، قبائل کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دینی مسائل سیکھنے کے لیے ہجرت کرنا اور اللہ کے منع کردہ امور سے ہجرت۔

قوله:قال:ان تهجر ما کره ربك:

مکروہ تحریمی یا تنزیہی ہے اور ہجرت کی یہ قسم سب سے افضل ہے اسلئے کہ یہ اعم ہے دوسری تمام قسموں کو شامل ہے۔

قوله:قال:فقلتُ ای الجهاد افضل؟ :

ایک نسخے میں قلتُ (بغیر فاء کے) ہے۔ای فائی انواعه او أهله یعنی اجہاد کی اقسام یا جہاد کرنے والے۔

قوله:قال:من عقر جواده و اهریق دمه :

"عقر": فعل مجہول ہے۔"اهریق": ہمزہ کے ضمہ اور ھاء کے سکون کے ساتھ ہے۔بعض حضرات نے کہا کہ ھاء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور یہ وہم ہے اس کا معنی ہے بہانا' کہا جاتا ہے: اراق یریق اور هراق یهریق ہمزہ کو ھاء سے بدل کر اور اهراق یهریق ہمزہ کی زیادتی کے ساتھ' جیسے کہ استطاع میں سین زائد ہے' پہلے کے مضارع میں "ھاء" متحرک ہے اور دوسرے کے مضارع میں ساکن ہے (کذا قاله صاحبِ الفائق)، حاشیۂ شفاء میں علامہ حجازی فرماتے ہیں: ہمزہ کے ساتھ ھاء کو فتحہ نہیں دیا جاتا۔

یعنی اس کا گھوڑا قتل کر دیا جائے۔

یہ جہاد اس وجہ سے افضل ہے کہ یہ دو جہادوں پر مشتمل ہے ایک شہسوار کا جہاد اور دوسرا پیادہ کا جہاد یا اس جہاد میں انفاق فی سبیل اللہ اور اپنے مولیٰ کی رضاء میں شہادت دونوں جمع ہیں۔

قوله:قال:قلت:ای الساعات افضل؟ قال:جوف اللیل الاخر:

"الآخر" جوف کی صفت ہے (رات کا آخری نصف حصہ)۔

یعنی میں نے عرض کیا کہ طاعات کے حصول کے لیے سب سے افضل کون سا وقت ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا درمیانی رات کا آخری نصف حصہ۔

رات کے اس حصہ کی یہ خصوصیت اس لئے ہے کہ وہ اخلاص کے زیادہ قریب ہے اور ریاء کاری سے بعید تر ہے کیونکہ وہ وقت نفس پر بہت بھاری ہوتا ہے اور مخلوق سے بہت زیادہ خلوت وتنہائی کا ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کی رحمت اترنے کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

نجات کے بنیادی اصول

۴۷: وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ لَقِيَ اللّٰهَ لَايُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا وَيُصَلِّي الْخَمْسَ وَيَصُوْمُ رَمَضَانَ غُفِرَلَهٗ قُلْتُ اَفَلَا اُبَشِّرُهُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ دَعْهُمْ يَعْمَلُوْا. (رواه اَحْمَدُ)

اخرجه احمد فی المسند ۵/۲۳۲ ۴۷

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جو آدمی دنیا سے رحلت کر کے اللہ کے پاس اس حال میں چلا گیا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا اور پانچوں وقت کی نماز پابندی سے پڑھتا رہا اور رمضان المبارک کے روزے رکھتا رہا تو اس کی مغفرت اور بخشش کر دی جائے گی۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ کیا میں لوگوں کو یہ بشارت سنا دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا لوگوں کو یہ خوش خبری نہ سناؤ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو تا کہ وہ عمل کرتے رہیں۔ اس حدیث کو احمد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: من لقی الله لا یشرك به شیئاً...... غفر له:

"لایشرك به شیئا": یعنی چھوٹا بڑا کسی طرح کا شرک نہیں کرتا یہ جملہ حال ہے یعنی اس حال میں کہ وہ مشرک نہیں یعنی وہ مؤمن مؤحد ہو۔ ہر روز پانچوں اوقات میں نمازیں متعین رکعتوں کے ساتھ معلوم ارکان وشرائط کے ساتھ اداء کرتا ہے۔

"ویصوم رمضان": یعنی پورے سال میں رمضان المبارک کے گنے چنے ایام میں روزے رکھتا ہے۔ "غفر له": اللہ تعالیٰ اس کے ان صغیرہ گناہوں کو جو اس سے ایک نماز سے دوسری اور ایک روزہ سے دوسرے روزہ کے درمیان صادر ہوئے معاف فرما دے گا یا اگر وہ اللہ چاہے تو اس کے ان کبیرہ گناہوں کو جنہیں اس کے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا درگزر فرما دے، اور جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے تو ممکن ہے اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں راضی فرمائیں۔

زکوۃ وحج کو شاید اسلئے چھوڑ دیا کہ وہ مالداروں کے ساتھ خاص ہیں۔ یا یہ حدیث شریف زکوۃ وحج کی فرضیت سے پہلے کی ہے۔

خوشخبری نہ سنانے کی حکمت:

قوله: قال: دعهم یعملوا:

"یعملوا": جواب اَمر ہونے کی بناء پر مجزوم ہے۔

یعنی انہیں خوشخبری سنائے بغیر رہنے دیجئے تاکہ وہ زیادہ عبادت کرنے میں خوب محنت وکوشش کریں۔ اس اجمالی بشارت پر بھروسہ کرکے بیٹھ نہ جائیں، اور بُرے افعال کے مرتکب نہ ہو جائیں، اسلئے کہ عام طور پر عوام کا یہی طریقہ ہے بخلاف خواص اور اصحاب اختصاص، کیونکہ اگر فرض کریں کہ جنت وجہنم نہ بھی ہوتی تو یہ حضرات دن اور رات کی کسی ایک گھڑی میں بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرتے۔ حدیث شریف میں آیا ہے: "رحم الله صهيباً لولم يخف الله لم يعصه" اللہ تعالیٰ صہیب پر رحم فرمائے بالفرض اگر وہ اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرتے تو بھی اس (اللہ تعالیٰ) کی نافرمانی نہ کرتے۔

بلکہ خواص بشارت کے بعد اس اشارہ کے باعث شکر بجالاتے ہوئے عبادت میں اور اضافہ کردیتے ہیں، اور ڈرتے رہتے ہیں کہ بشارت اس قید کے ساتھ مقید ہے جو عبارت کے ذیل میں ربّ العالمین کی طرف سے امتحان کے طور پر موجود ہے، اور اللہ تعالیٰ بندوں کے ساتھ بڑی شفقت کا معاملہ کرنے والے ہیں۔

ایمان کے افضل امور

۴۸: وَعَنْهُ اَنَّهُ سَاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَفْضَلِ الْاِيْمَانِ قَالَ اَنْ تُحِبَّ لِلّٰهِ وَتُبْغِضَ لِلّٰهِ وَتُعْمِلَ لِسَانَكَ فِيْ ذِكْرِ اللّٰهِ قَالَ وَمَاذَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَاَنْ تُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ وَتَكْرَهُ لَهُمْ مَاتَكْرَهُ لِنَفْسِكَ. (رَوَاهُ اَحْمَدُ)

أخرجه أحمد في المسند ٥/٢٤٧ وزاد "أن تقول خيراً أو تصمت"۔

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ایمان کے اعلیٰ اور افضل امور کونسے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تمہاری محبت بھی کسی سے صرف اللہ کے لئے ہو بغض اور دشمنی بھی اللہ ہی کے لئے ہو اور تم اپنی زبان کو اخلاص اور للّٰہیت کے ساتھ اللہ کے ذکر میں مشغول رکھو۔ پھر حضرت معاذؓ نے سوال کیا اے اللہ کے رسول اس کے علاوہ اور ایمان کے افضل امور کون سے ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو اپنے لئے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لئے پسند کرو اور جس چیز کو اپنے لئے پسند نہیں کرتے وہ دوسروں کے لئے بھی پسند نہ کرو۔ اس حدیث کو احمد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: انه سأل النبي ﷺ عن أفضل الايمان: "أفضل الايمان": اى عن شعبه ومراتبه واحواله أو خصال أهله۔

یعنی اس ایمان کے شعبوں، مراتب اور احوال یا اہلِ ایمان کی عادات کے بارے میں پوچھا۔

قوله: قال ان تحب لله وتبغض لله وتعمل لسانك في ذكر الله:

"ان تحب لله وتبغض لله":

یہ "اعمال" بمعنی استعمال واشغال استعمال کرنا اور مشغول رکھنا سے ماخوذ ہے۔

یعنی تم اپنی زبان کو اللہ کے ذکر میں مشغول رکھو تاکہ اس کی برکت تمہارے دل تک پہنچ جائے اس طور پر مشغول ہو کہ زبان

اس ذکر سے تر وتازہ رہے اس شرط کے ساتھ کہ پوری توجہ ہو، تو وہ ذکر نورٌ علی نور ہوگا' ورنہ کسی عضو کا عبادت میں مشغول رہنا بھی اللہ تعالیٰ کی عنایت کی ایک قسم ہے، اور جو اس نعمت کا شکر یہ اداء کرے گا اسے مزید توجہ حاصل ہوگی۔

قوله: قال: و ماذا يا رسول الله ؟......:

" ماذا ":" أصنع" محذوف کی وجہ سے منصوب ہے۔ای وما ذا أصنع بعد ذلك؟ یعنی اس کے بعد میں کیا کروں؟، اس صورت میں یہ مقولہ ہے۔

یا مرفوع ہے ای ای شيء أصنعه یعنی کونسی چیز ہے جسے میں کروں۔

"ان تحب": یہ منصوب ہے اور دوسری صورت کی رو سے مرفوع ہے' واؤ عاطفہ ہے' اور عطف کلام مقدر پر ہے۔

تقدیری عبارت یوں ہے: ان تستقيم على ما قلناو ان تحب للناس ۔

"الناس" میں تعمیم کا احتمال بھی ہے تخصیص کا احتمال بھی ہے کہ اس سے خاص ایمان والے مراد ہوں۔

بَابُ الْکَبَائِرِ وَ عَلَامَاتِ النِّفَاقِ

''کبائر'' کبیرہ کی جمع ہے''وعلامات النفاق'': یہ تخصیص بعد از تعمیم کے قبیل سے ہے۔ یا دونوں میں عموم وخصوص من وجہ کی نسبت ہے۔

''کبیرہ'' وہ ایسی بڑی غلطی جو اپنی ذات میں بہت بڑی ہو، اس کے مرتکب کی سزا بھی اس معصیت ونافرمانی کی بہ نسبت جو کبیرہ نہ ہو بڑی ہو۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ بڑا گناہ وہ ہوتا ہے جس پر خصوصیت سے شارع نے وعید سنائی ہو۔

اور بعض نے کہا کہ جس پر حد متعین کی ہو۔

بعض دوسرے حضرات نے فرمایا کہ یہ نسبت (کبیرہ وصغیرہ) اضافی ہے کبھی ایک گناہ ان گناہوں کی بہ نسبت جو اس سے کم تر ہیں کبیرہ ہوتا ہے اور ان گناہوں کی نسبت سے جو اس سے بھی بڑے ہیں صغیرہ ہوتا ہے۔

اور کبھی افراد اور حالات کے اعتبار سے گناہ متفاوت ہو جاتے ہیں جیسا کہ محاورہ ہے: ''حسنات الابرار سئیات المقربین'' نیکوکار لوگوں کی حسنات ونیکیاں مقربین کے اعتبار سے سیات ہیں۔

کبھی ان میں تفاوت مفعول کے اعتبار سے بھی ہو جاتا ہے چنانچہ سادات اور علماء کی اہانت، بازاری اور جاہل لوگوں کی اہانت کی مانند نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس سلسلہ میں ایک بڑی عمدہ کتاب بنام ''الزواجر عن الکبائر'' ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر معصیت اللہ تعالیٰ کی عظمت وبڑائی کے پیش نظر کبیرہ ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا: اصرار (مسلسل ارتکاب) کے ساتھ کوئی گناہ صغیرہ نہیں اور استغفار کے اہتمام کے ساتھ کوئی گناہ کبیرہ نہیں۔

کبائر وصغائر کی عدم تعیین میں حکمت:

بعض حضرات نے فرمایا کہ گناہوں میں کبیرہ گناہ متعین اور واضح نہیں تاکہ لوگوں کے دلوں سے خوف ختم نہ ہو جائے۔

الفصل الاول:

سب سے بڑا گناہ

۴۹ :عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَىُّ الذَّنْبِ اَكْبَرُ عِنْدَاللّٰهِ قَالَ اَنْ تَدْعُوَ لِلّٰهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ قَالَ ثُمَّ اَىٌّ قَالَ اَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ خَشْيَةَ اَنْ يَطْعَمَ مَعَكَ قَالَ ثُمَّ اَىٌّ قَالَ اَنْ تُزَانِىَ حَلِيْلَةَ جَارِكَ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَصْدِيْقَهَا (وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ الْاٰية) [الفرقان ٦٨] .(متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٢/١٨٧حديث رقم ٦٨٦١ومسلم في صحيحه ١/٩١حديث رقم (١٤٢ـ٨٦) والترمذي في السنن ٥/٣١٤حديث ٣١٨٢ـ والنسائي ٧/٩٠حديث رقم ٤٠١٣ـوأبوداوٗد في سننه ٢/٧٣٢ حديث رقم ٢٣١٠ـ وأحمد في المسند ١/٣٨٠ـ

ترجمہ:حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ۔اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟رسول اللہ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ جس ذات نے تمہیں پیدا کیا ہے تم کسی اور کو اس کا شریک بناؤ۔ پھر اس آدمی نے سوال کیا اس کے بعد کبیرہ گناہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنی اولاد کو اس خیال سے قتل کر ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائیگی پھر اس آدمی نے سوال کیا کہ اس کے بعد کبیرہ گناہ کیا ہے؟رسول اللہ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اس کے بعد کبیرہ یہ ہے کہ تم پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرو۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی تصدیق میں یہ آیت نازل ہوئی کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے ہیں جو اللہ کے سوا کسی اور کو معبود نہیں بناتے اور جس جان کو قتل کرنا اللہ نے حرام کیا ہے اسے ناحق قتل نہیں کرتے اور نہ ہی زنا کرتے ہیں۔

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن مسعود۔یہ عبداللہ بن مسعود ہیں' ان کی کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے''ہزلی''ہیں۔صحابی کے طبقہ میں جب لفظ ''عبداللہ'' بولا جائے تو اس سے مراد ''عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہوتے ہیں' آنحضور ﷺ کے ''دارارقم''میں داخل ہونے سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے کچھ زمانہ قبل شروع میں اسلام لے آئے تھے کہا گیا ہے کہ اسلام لانے والوں میں یہ چھٹے شخص ہیں' آنحضور ﷺ نے ان کو اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا' یہ آپ ﷺ کے خاص خدام میں تھے اور آنحضور ﷺ کے گھر کے راز دان تھے' آپ ﷺ کی مسواک' نعلین مبارک اور وضو کا پانی سفر میں لئے رکھتے تھے۔حبشہ کی طرف ہجرت کی' غزوۂ بدر اور اس کے بعد تمام غزوات میں شریک تھے۔آنحضور ﷺ نے ان کے لئے جنت کی بشارت دی اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''ام عبد کا بیٹا'' جو میری امت کے لئے پسند کرے میں بھی اسی کو پسند کرتا ہوں اور جس چیز کو میری امت کے لئے وہ ناپسند جانے اس کو میں

بھی برا سمجھتا ہوں۔ آنحضور ﷺ کی مراد ''ابن ام عبد'' سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ آنحضور ﷺ کے ساتھ آپ رضی اللہ عنہ کی ظاہری صورت، حلم و وقار اور سیرت میں بھی مشابہ تھے۔

حلیہ مبارک:

یہ ہلکے بدن والے، چھوٹے قد والے، گہرے گندمی رنگ والے تھے، نحیف الجثہ تھے، لمبے قد کے لوگ بیٹھنے کی حالت میں ان کے پورے قد کے برابر معلوم ہوتے تھے کوفہ میں مسند قضاء کے مالک بنائے گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں اور ابتدائی دور خلافت عثمان میں وہاں کے بیت المال کی ذمہ داری بھی ان کے سپرد کی گئی پھر یہ مدینہ لوٹ گئے اور وہاں پر ۳۲ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن کیے گئے، ان کی عمر ساٹھ (۶۰) سال کچھ اوپر ہوئی ان سے حضرت ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم اور ان کے علاوہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ روایت کرتے ہیں۔ حنفیہ کے نزدیک خلفائے راشدین کے بعد یہ ''افقہ الصحابہ'' ہیں۔

تشریح: قولہ: ای ذنب اکبر عند اللہ؟:

'' ذنب'' (گناہ) کہتے ہیں جس کا مرتکب شرع کی رُو سے مذمت کے قابل ہو، پھر گناہ کی چار قسمیں ہیں: ① ایک قسم کا گناہ وہ ہے جس کے مرتکب کی بغیر توبہ کے مغفرت نہ ہوگی جیسے کفر۔ ② دوسری قسم وہ ہے جو استغفار اور تمام حسنات کے ذریعہ معاف ہو جاتے ہیں وہ صغیرہ گناہ ہیں، اور تیسری قسم کے وہ گناہ ہیں جو توبہ سے اور بغیر توبہ کے اللہ تعالیٰ کے مشیت کے تحت معاف ہو سکتے ہیں او یہ وہ کبیرہ گناہ ہیں جن کا تعلق حق اللہ سے ہی، اور چوتھی قسم کے وہ گناہ ہیں جن میں صاحبِ حقوق کو حق کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے اور وہ گناہ بندوں کے حقوق سے متعلق ہیں۔ حق کی واپسی کی تین صورتیں ہیں، یا تو صاحبِ حق اس کے لیے اس چیز کو حلال قرار دیدے، یا عین حق واپس کر دے یا اس کا بدلہ دیدے اور آخرت میں بدلہ دینے کی ایک صورت یہ ہے کہ ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دی جائیں گی، یا مظلوم کے گناہ ظالم پر ڈالے جائیں گے یا اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مظلوم کو راضی فرما دیں گے۔

قولہ: ان تدعو للہ ندا وھو خلقک: '' ند'' نون کے کسرہ کے ساتھ یعنی اپنی دعا اور عبادت میں اس کی مثال، نظیر قرار دے۔ بعض حضرات نے فرمایا: ند ایسے ہمسر کو کہتے ہیں جو امور میں اس کے برخلاف ہو، ندّ بمعنی نفر سے ماخوذ ہے۔ ضد دو متقابلین میں سے ایک ایسے متقابل کو کہتے ہیں جن دونوں کا اجتماع ممکن نہیں ہے۔

''وھو خلقک'': یہ جملہ لفظ اللہ سے حال ہے یا تدعو کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔

اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ اس لائق ہے کہ آپ اسے ربّ بنائیں اور اسی کی عبادت کریں اسلئے کہ وہ آپ کا خالق ہے یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ معبود ہونے میں دوسروں سے ممتاز کیونکر ہے۔ یا شریک کے ضعف کی طرف اشارہ ہے مطلب یہ ہے کہ تو اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتا ہے حالانکہ تیرا خالق وہ شریک نہیں بلکہ وہ تو کسی چیز کے پیدا کرنے پر قادر بھی نہیں۔ حاصل یہ ہے کہ سب سے بڑا گناہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا ہے بلکہ مطلقاً کفر سب سے بڑا گناہ ہے اور خصوصیت سے شرک کو اسلئے ذکر کیا کہ شرک ظلم عظیم ہے۔

قوله: قال: ثم ای؟:

ایٌّ کی تنوین کے ساتھ استفہام مضاف الیہ کا بدل ہے البتہ حالت وقف میں تنوین کو ایک خاص مقصد کے لیے حذف کر دیا جاتا ہے، تقدیر عبارت یوں ہے: **ای شیء من الذنوب اکبر بعد الکفر**، یعنی کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ کونسا ہے۔

اس حدیث شریف میں **ثم** تراخی زبان کے لیے نہیں ہے اور نہ ہی تراخی رتبہ کے لیے ہے اس لئے کہ اس صورت میں معطوف کا رتبہ معطوف علیہ سے برتر ہونا ضروری ہے حالانکہ یہاں اس کے برعکس ہے بلکہ وہ تراخی فی الاخبار کے لیے ہے گویا کہ یوں کہا: **اخبرنی عن اوجب ما یهمنی السوال عنه من الذنوب ثم الأوجب فالأوجب**، آپ مجھے گناہوں سے متعلق وہ اہم سوال بتائیں جو سب سے زیادہ ضروری ہے پھر اس کے بعد ضروری پھر اس کے بعد لازمی سوال ہے، یہ بات علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے۔

زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ یہاں **ثمّ** تراخی رتبہ کے لیے ہے اور کبھی معطوف ادنی مرتبہ بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: "**اشد الناس بلاءً الأنبیاء ثم الأولیاء ثم الأمثل فالأمثل**" لوگوں میں سب سے زیادہ آزمائش کا سامنا انبیاء علیہم السلام کو کرنا پڑا پھر اولیاء کرام کو پھر جو ان کے بعد جو دوسروں سے بہتر تر تھے پھر جو بہترین لوگ تھے۔

قوله: قال: ان تقتل ولدك خشية ان يطعم معك

"**خشية**": مفعول له ہونے کی بناء پر منصوب ہے (**ان يطعم**): اس کے شروع میں فتحہ ہے۔

اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ مسلمان کو ناحق قتل کرنا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ اولاد کا قتل سب سے بڑا گناہ ہے اور اس خوف سے اسے قتل کرنا کہ وہ بھی میرے ساتھ کھائے گا بہت بڑا گناہ ہے اسلئے کہ اس کا یہ یقین نہیں کہ رازق اللہ تعالیٰ ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مسلمان جان کا ناحق قتل کبیرہ گناہ ہے اور قریبی مسلمان کا قتل بدترین قسم کا قتل ہے اسلئے کہ اس میں قتل کے گناہ کے ساتھ ساتھ قطع رحمی کا گناہ بھی ہے اور قریبی رشتہ دار کے قتل کی بدترین قسم والد کا قتل ہے پھر بیٹے کا قتل ہے، پس اولاد کا قتل کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ اس علت مذکورہ کی بناء پر ہے، نیز اس میں بہت سارے گناہ شامل ہو جاتے ہیں کہ قاتل اللہ تعالیٰ کو رزاق نہیں سمجھتا اور اولاد کے معاملے میں اللہ تعالیٰ پر توکل اور اعتماد نہیں رکھتا اس کے ساتھ ساتھ ایک ننھی معصوم جان کا قتل اور وہ بھی بدترین انداز سے کہ اسے زندہ دفن کردے اس کی کمال قساوتِ قلبی پر دلالت کرتا ہے۔

قوله: قال ثم ای ؟ قال: ان تزانی حلیلة جارك:

حلّ، یحل عین کے کسرہ کے ساتھ سے ماخوذ ہے کیونکہ میاں بیوی میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے حلال ہوتا ہے یا پھر حلّ یحلّ (حاء کے ضمہ کے ساتھ) سے ماخوذ ہے کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے پاس آتا ہے۔

زنا تو مطلقاً گناہ کبیرہ ہے اور خاص کر اس کے ساتھ جو پڑوس میں رہائش پذیر ہو اور تمہاری امانت داری کا خواستگار ہو تو وہ زنا پڑوس کا حق مارنا اور اس کے ساتھ خیانت ہے جو سب سے زیادہ برائی ہے۔

باری تعالیٰ کا شریک قرار دینا، قتل میں اولاد اور بدکاری میں پڑوسی کی قیود کا حاصل اس قسم کے گناہوں میں مذکورہ گناہوں

کی کمال شناعت وقباحت کا بیان ہے نہ یہ کہ مذکورہ قیود احتراز یہ ہیں ورنہ زنا کی بدترین قسم تو محارم کے ساتھ زنا ہے۔ پھر "ان تزنی" مقاعلہ کے صیغہ لانے میں مبالغہ ہے جو کسی پر مخفی نہیں پھر حدیث مذکور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مانند ہے: ﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ﴾ [الاسراء: ۳۱] "اور تم اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل مت کرو"۔

یا سائل کی حالت کی رعایت ملحوظ ہے، اسی لئے بعض احادیث میں کبائر کو سات گناہوں کے ساتھ مقید فرمایا، اور بعض میں ان میں سے تین پر اکتفاء کا جیسا کہ اس حدیث میں ہے، یا چار میں منحصر کیا جیسا کہ آگے آئے گا اس بناء پر کہ حدیث بیان کرتے وقت انہیں کے ذکر کی ضرورت محسوس کی گئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا فرمان ہے کہ کبائر ستر کے قریب گناہ ہیں۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کبائر کی تعداد سات سو کے قریب ہے۔ جس پر بعض حضرات نے فرمایا کہ انہوں نے گناہوں کی انواع واقسام کے اعتبار سے یوں فرمایا ہے جبکہ دوسرے بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ تعداد بالکل حقیقی ہے، واللہ اعلم۔

قولہ: فأنزل اللہ تصدیقھا: ایک نسخہ میں "عز وجلّ" کے الفاظ بھی ہیں۔

(تصدیقھا): یعنی اس مسئلہ کی تصدیق یا احکام مذکورہ کی تصدیق، یا واقعہ کی تصدیق کے لیے ہے، تصدیق مفعول لہٗ ہونے کی بناء پر منصوب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ کی تصدیق کے لیے، اس آیت مبارکہ کو نازل فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ سنت کی تقریر و پختگی اور اس کی تصدیق کتاب اللہ سے ہوسکتی ہے، یہ بات علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمائی اور ان کی اس بات سے کوئی مخالفت کرنے والا میرے علم میں نہیں کہ دلائل پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی اور تصدیق سے مطابقت وموافقت بھی مراد لی جاسکتی ہے، اور حدیث مذکور اس آیت سے مقتبس ہوگی نیز اس میں مذکورہ گناہوں کے قبیح ترین افراد پر مزید تنبیہ بھی ہے۔

قولہ: ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا﴾ [الفرقان: ۶۸] "اور وہ جو خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس جاندار کو مار ڈالنا خدا نے حرام کیا ہے اس کو قتل نہیں کرتے مگر جائز طریق (یعنی حکم شریعت کے مطابق) اور بدکاری نہیں کرتے اور جو یہ کام کرے گا سخت گناہ میں مبتلا ہوگا"۔

اس سے پہلے عباد الرحمٰن (رحمٰن کے بندوں) سے متعلق جن باتوں واوصاف کی خبر دی گئی ہے ان میں سے ایک وصف ان کا یہ بھی ہے۔ "ولا یقتلون النفس" یعنی مسلمان، ذمی اور معاہد (جن کفار سے صلح کا معاہدہ ہوگیا ہو) "التی حرم اللہ" یعنی جن کے قتل کو حرام فرمایا، مطلب یہ ہے کہ حربی کے علاوہ کسی صورت میں کسی شخص کو قتل نہیں کرتے "الا بالحق" یہ استثناء مفرّغ ہے یا قتل مقدر سے متعلق ہے اور بعض حضرات نے فرمایا: وہ قتل نہیں کرتے سوائے ان تین باتوں ارتداد محصن کا زنا کرنا اور قصاص میں سے کسی ایک کے پائے جانے کی صورت میں۔ "ولا یزنون" پوری آیت سورہ فرقان میں ہے، اس آیت کا حدیث کی تصدیق کنندہ ہونے میں اس بات پر واضح دلیل موجود ہے جو پہلے مذکور ہوئی کہ اولاد کا قتل انفاق کے ڈر سے اور پڑوسی کی بیوی کا تذکرہ محض ان گناہوں کی شناعت کے بیان کے لیے ہے تقید کے لیے نہیں ہے، ورنہ آیت جو قتل وزنا کے بڑے

گناہ ہونے پر دلالت کرتی ہے بغیر کسی قید کے حدیث سے مطابقت نہیں رکھتی کہ اس کی تصدیق کرے بلکہ حدیث مذکور اس آیت کے لیے مقید بنے گی۔

کبیرہ گناہ

۵۰: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْكَبَائِرُ الْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَالْيَمِيْنُ الْغَمُوْسُ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَفِيْ رِوَايَةِ اَنَسٍ وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ بَدَلَ الْيَمِيْنِ الْغَمُوْسِ۔

(متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۱/۵۵۵ حديث رقم ٦٦٧٥۔ وأورده الترمذي بلفظ قريب مع نقص "قتل النفس" وأخرجه النسائي في سننه ۸۹/۷ حديث رقم ٤٠١١۔ والدرامي ۲۵۱/۲ حديث رقم ۲۳٦۰ وأحمد في المسند ۲۰۱/۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک قرار دینا، والدین کی نافرمانی کرنا، ناحق کسی کو قتل کرنا اور جھوٹی قسم کھانا کبیرہ گناہ ہیں اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں جھوٹی قسم کھانے کے بجائے جھوٹی شہادت کے الفاظ ہیں۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **قوله: الكبائر الاشراك بالله** : کا معنی ایک کا دوسرے کے لیے شریک قرار دینا یہاں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معبود بنا لینا ہے اور اس سے مراد کفر ہے' اور اشراک کے لفظ کو اسلئے اختیار فرمایا کہ عرب میں عام طور پر شرک رائج تھا۔

قوله: وعقوق الوالدين: یعنی ان دونوں سے صلہ رحمی و حسن سلوک کو ختم کر دینا۔ عق سے ماخوذ ہے جس کے معنی پھاڑنا اور قطع کرنا ہے اور اس سے مراد دونوں میں سے کسی ایک کی نافرمانی کرنا ہے' بعض حضرات نے کہا کہ عق ایسی ایذاء کو کہتے ہیں جس کا عادتاً بیٹے کی جانب سے تحمل نہیں کیا جاتا اور بعض حضرات نے کہا کہ والدین کے ایسے حکم میں مخالفت جس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی نہ ہو عقوق والدین کہلاتی ہے اور دادے' دادیاں بھی والدین کے حکم میں ہیں۔ اسے اشراک باللہ کے ساتھ ملا کر ذکر کرنا اس مناسبت کی بناء پر ہے کہ ہر ایک میں اس کے حق کی نفی پائی جاتی ہے جو وجود میں آنے اور مدد کرنے کا سبب ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ کے حق میں حقیقتاً ہے اور والدین کے حق میں صورتاً ہے۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ [النساء : ٣٦] اور خدا ہی کی عبادت کرو اور اسکے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو' اور اللہ تعالیٰ عزوجل کا ارشاد ہے: ﴿اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ﴾ [لقمٰن : ١٤]

قوله: وقتل النفس : یعنی ناحق کسی کو قتل کرنا۔

قوله: واليمين الغموس: جو قسم کھانے والے کو گناہ میں غوطہ زن کر دیتی ہے پھر جہنم میں اسے غوطہ زن کرے گی اور بعض

حضرات نے کہا ہے کہ امام شافعیؒ کے مذہب پر اسے کفارہ میں غوطہ زن کر دیتی ہے۔ یمین غموس کا مطلب ہے کہ ماضی میں کسی بات سے متعلق یہ جانتے ہوئے قسم کھانا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ کسی کا مال اڑانے کے لیے جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھانے کو کہتے ہیں۔

بہتر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ کبیرہ گناہ کسی خاص عدد میں منحصر نہیں ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خاص تعداد بیان فرمائی وہ یا تو وحی کے ذریعہ یا مقام کے مقتضیٰ کے مطابق ذکر فرمائی۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ انہیں منضبط کر لیا جائے، اور گناہ میں منصوص علیہ مفسدہ پر قیاس کیا جائے، اگر کسی گناہ میں اَقل مفاسد سے بھی کم مفسدہ ہے تو وہ صغیرہ گناہ ہوگا ورنہ کبائر سے شمار ہوگا۔ یہ امام عز الدین بن عبد السلام کے قول کا خلاصہ ہے۔

۵۱: وَفِیْ رِوَایَۃِ اَنَسٍ وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ بَدَلَ الْيَمِيْنِ الْغَمُوْسُ .

ترجمہ: اور سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں جھوٹی قسم کھانے کی بجائے ''جھوٹی گواہی دینے'' کے الفاظ ذکر کئے گئے ہیں۔ (بخاری و مسلم)

قوله: وفي رواية أنس وشهادة الزور بدل: اليمين الغموس:

جار مجرور خبر مقدم ''وشهادة الزور'' مبتداء ہے ''بدل'' ظرف ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور اس کا عامل فعل کا معنی ہے جھوٹ کو ''زور'' کو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ جہت حق سے پھرا ہوتا ہے۔

سات مہلکات

۵۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِجْتَنِبُوْا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَاهُنَّ قَالَ اَلشِّرْكُ بِاللّٰهِ وَالسِّحْرُ وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَكْلُ الرِّبَا وَاَكْلُ مَالِ الْيَتِيْمِ وَالتَّوَلِّیْ يَوْمَ الزَّحْفِ وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٥/٣٩٣ حديث رقم ٢٧٦٦ و مسلم في صحيحه ١/٩٢ حديث رقم (١٤٥-٨٩)۔ وأبوداؤد في سننه ٣/٢٩٤۔ والنسائي في سننه ٦/٢٥٧ حديث رقم ٣٦٧١۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے لوگو! ہلاک کرنے والی سات چیزوں سے بچو سوال کیا گیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہلاک کرنے والی سات چیزیں کون سی ہیں؟ فرمایا کسی کو اللہ کے ساتھ شریک کرنا، جادو کرنا، کسی جان کو ناحق اور ظلم سے قتل کرنا، یتیم کا مال کھانا، میدان جہاد سے پیٹھ پھیر کر بھاگ جانا، ایمان والی پاک دامن اور غافل عورتوں پر زنا کا الزام لگانا۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: اجتنبوا السبع الموبقات:

پہلے انہیں اجمالاً ذکر کیا پھر ان کی تفصیل بیان فرمائی تاکہ اَوقع فی النفس ہو جائے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کبائر سات گناہ ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ ستر کے قریب ہیں۔ شیخ ابو

طالب مکی صاحبِ ''قوت القلوب'' جو امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ کی احیاء العلوم کی اصل ہے نے فرمایا: میں نے ان تمام احادیث کو جو اس باب (کبائر) سے متعلق وارد ہوئی ہیں جمع کیا ہے تو مجھے سترہ کبیرہ گناہ ملے ہیں:

چار گناہوں کا تعلق دِل سے ہے: ① شرک۔ ② گناہ پر اصرار کی نیت۔ ③ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی۔ ④ اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے نڈر ہو جانا۔

چار زبان سے متعلق ہیں: ① جھوٹی گواہی۔ ② پاکدامن پر الزام تراشی۔ ③ جھوٹی قسم۔ ④ جادو۔

تین گناہوں کا تعلق پیٹ سے ہے: ① شراب نوشی۔ ② یتیم کا مال کھانا۔ ③ سود خوری۔

دو کا تعلق شرمگاہ سے ہے: ① زنا۔ ② لواطت۔

دو کا تعلق ہاتھوں سے ہے: ① ناحق قتل۔ ② چوری۔

ایک کا تعلق پاؤں سے ہے: کفار سے مڈبھیڑ کے دن لڑائی سے فرار۔

ایک کا تعلق پورے جسم سے ہے اور وہ ہے والدین کی نافرمانی۔

قوله: قالوا: و ما هن ؟ قال: الشرك بالله: ایک نسخہ میں ''قال'' ہے۔

قوله: والسحر: تفسیر مدارک میں فرمایا: اگر جادوگر کے قول یا اس کے فعل میں ایسی بات ہو جو اس شرط کی تردید پر مشتمل ہو جو ایمان کے لئے لازم ہے تو کفر ہے ورنہ نہیں۔

جان تو کہ عام علماء کرام کے نزدیک معتزلہ اور ابوجعفر استر بادی کے برخلاف جادو کی ایک حقیقت ہے اور سحر کا شرک پر عطف ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جادو کفر نہیں ہے اس مسئلہ میں علماء کے مابین بڑا اختلاف ہوا ہے، ہمارے مذہب کا حاصل یہ ہے کہ جادو کرنا فسق ہے، اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ: **ليس منا من سحر او سحر له** ''جس نے جادو کیا یا جس کے حق میں جادو کیا گیا اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں'' اس کا سیکھنا فتنہ میں پڑنے اور دوسروں کو تکلیف پہنچانے کے خوف کی بناء پر حرام ہے البتہ امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا اس میں اختلاف ہے اور جادو کرنا' اسے سیکھنا یا سکھانا کفر نہیں ہے، البتہ اگر جادو کسی مخلوق کی عبادت پر مشتمل ہو یا اس کی ایسی تعظیم پر مشتمل ہو جیسی اللہ تعالیٰ کی تعظیم کی جاتی، یا اس کے بارے میں یہ اعتقاد ہو کہ جادو مؤثر بالذات ہے، یا یہ تمام انواع کے ساتھ مباح ہے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

امام مالک اور ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ جادوگر مطلقاً کافر ہے، جادو کا سیکھنا سکھانا کفر ہے اور جادوگر کو قتل کیا جائے اس کی توبہ قبول نہ کی جائے گی اس نے خواہ کسی مسلمان پر یا ذمی پر جادو کیا ہو۔

حنیفہ کا کہنا ہے کہ اگر جادوگر کا یہ عقیدہ و نظریہ ہو کہ شیطان اس کے لئے جو چاہتا ہے کرتا ہے تو وہ کافر ہے اور اگر اس کا اعتقاد یہ ہو کہ جادو محض تخیل و تمویہ ہے تو وہ کافر نہیں ہے۔

حنابلہ کا جادوگر کے کفر میں اختلاف ہے، ان کی ایک کتاب ''التنقیح'' میں ہے: جادوگر کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، اسے جادو کی وجہ سے کافر قرار دیا جائے گا، اور مسلمان پر جادو کرنے والے کو قتل کر دیا جائے گا اور جادوگر اور اس جادو کو حلال سمجھنے والے کی تکفیر کی جائے گا اور ان کے فروعی مسائل میں یہ بھی ہے کہ جو شخص اپنے طریقہ و طرز سے کسی قوم کو یہ باور کرائے کہ وہ غیب

جانتا ہے تو امام کو چاہیئے کہ اسے قتل کر دے کیونکہ وہ زمین میں فساد مچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس بحث سے متعلقہ بقیہ تفصیلات نیز معجزہ اور جادو میں فرق کی وجوہ کو میں نے اپنی کتاب ''الاعلام بقواطع الاسلام'' میں وضاحت کے ساتھ لکھ دیا ہے۔

قوله: وقتل النفس التی حرم الله الا بالحق: کسی بھی طور پر اس کی صورت یہ ہے کہ شرعاً اس کا قتل قصاص وغیرہ کی بناء پر جائز ہو گیا ہو۔

قوله: أكل الربا واكل مال اليتيم: سود کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے۔ یتیم اس چھوٹے لڑکے کو کہتے ہیں جس کا باپ نہ ہو۔ البتہ یتیم کا مال کھانا شریعت کے قاعدہ کے موافق ہو تو گنجائش ہے۔

سود اور یتیم کے مال ہر دو میں أکل (کھانے) کی تعبیر اختیار کی گئی حالانکہ اس سے مراد استعمال کی تمام صورتیں ہیں کیونکہ اکثر استعمال کی یہی صورت ہوتی ہے جو ان میں مقصود ہے۔

قوله: والتولی یوم الزحف: زحف ایسی جماعت کو کہتے ہیں جو دشمن کی طرف بڑی مشقت سے چل کر جاتی ہے یہ زحف الصبی سے ماخوذ ہے جس کا معنی ''بچہ چوتڑ کے بل آہستہ آہستہ چلا''

بعض حضرات نے کہا ہے کہ اسے زحف اسلئے کہا گیا کہ اس کی کثرت اور ثقل حرکت کی بناء پر گویا کہ وہ گھسٹ کے چلتے ہیں اور مبالغہ کے طور پر انہیں مصدر سے موسوم کیا گیا اور جب ہر مسلمان کے مقابلے میں دو کافروں سے زیادہ ہوں تو میدان جہاد سے پیٹھ پھیرنا جائز ہے۔

قوله: قذف المحصنات المؤمنات الغافلات:

''المحصنات'' صاد کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بچایا اور اس کی حفاظت کی یا ایسی عورت جس نے زنا سے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی۔

''المؤمنات'': کافر عورتوں پر تہمت زنا سے احتراز ہے اس لئے کہ ان پر تہمت لگانا کبیرہ گناہ نہیں ہے اور اگر کافر عورت ذمیہ ہو تو اس پر تہمت لگانا صغیرہ گناہ ہے اور یہ موجب حد نہیں ہے اور مسلمان باندی پر تہمت لگانے میں تعزیر ہے حد نہیں ہے جس کا تعلق امام کے اجتہاد سے ہے (یعنی جو وہ مناسب سمجھے سزا دے) مرد پر تہمت لگانا بھی کبیرہ گناہ ہے اور اس میں بھی حد واجب ہو جاتی ہے اور حدیث میں تہمت لگانے کو عورتوں کے ساتھ خاص کرنا آیتِ قرآنیہ اور عموم کی بناء پر ہے۔

(الغافلات): فحش باتوں کے ارتکاب سے، یہ کنایہ ہے پاکدامن عورتوں سے اس لئے کہ جو زنا سے مبرا و پاکدامن ہو گی وہ یہاں سے جو اس پر لگایا گیا ہے غافل ہو گی۔ اس حدیث میں صحیح نسخوں کی رُو سے الغافلات یہ المؤمنات سے آیتِ قرآنیہ کے برعکس مؤخر ہے، اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نسخہ میں اسکے برعکس آیت کے مطابق ہے۔

بدترین کبیرہ گناہ

۵۳: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايَزْنِی الزَّانِی حِيْنَ يَزْنِی وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَنْتَهِبُ

نُهْبَةً يَرْفَعُ النَّاسُ اِلَيْهِ فِيْهَا اَبْصَارَهُمْ حِيْنَ يَنْتَهِبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَغُلُّ اَحَدُكُمْ حِيْنَ يَغُلُّ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاِيَّاكُمْ اِيَّاكُمْ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ ۔ (هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِ)

أخرجه البخاري في صحيحه ١١٩٥حديث رقم ٢٤٧٥۔ومسلم في صحيحه ١/٧٦حديث (١٠٠۔٥٧)وأخرج أبو داوٗد بعضه ٥/٦٤حديث٤٦٨٩والترمذي ٥/١٦حديث رقم ٢٦٢٥۔وابن ماجة في سننه ٢/١٢٩٨حديث رقم ٣٩٣٦والنسائي في السنن ٨/٦٤حديث رقم٤٨٧٠۔

ترجمه: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ زانی جب زنا کرتا ہے تو اس وقت اس کے اندر ایمان باقی نہیں رہتا اور چوری کرنے والا جب چوری کرتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا اور شرابی جب شراب پیتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا اور ڈاکہ ڈالنے والا جب ڈاکہ ڈالتا ہے اور لوگ اس کو کھلم کھلا راہ زنی کرتے ہوئے دیکھتے ہوں لیکن ڈر اور دہشت کی وجہ سے عاجز ہوں۔(چیخ و پکار اور شور وغل کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے) تو اس وقت اس کے اندر ایمان باقی نہیں رہتا اور خیانت والا جب خیانت کرتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا۔ان گناہوں سے بچو۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قال:قال رسو ل الله ﷺ : لا يزني الزاني حين يزني وهو مؤمن:

"لا يزني" خط کی رو سے یاکے اثبات کے ساتھ ہے۔"وهو مؤمن": واؤ حال کے لیے ہے۔

حدیث کے ظاہری معنی سے معلوم ہوتا ہے کہ کبیرہ گناہ کرنے والا مؤمن نہیں ہے، اور ہمارے حضرات نے اس کی یہ تاویل فرمائی ہے کہ اس سے مراد ایسا مؤمن ہے جس کا ایمان کامل ہو یا اللہ تعالیٰ کے عذاب سے مامون ہونے والا، یا اس سے مراد ایسا ایمان والا ہے جو اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہے، کہا جاتا ہے: امن له جب وہ تابعداری واطاعت اختیار کرے۔

یا اس حدیث سے مقصود زجر وعید ہے یا اِن کبائر کے مرتکب افراد کو بُرے انجام سے ڈرانا ہے، اسلئے کہ ان کے ارتکاب کرنے والے کے بارے میں خطرہ ہے کہ وہ اس کفر میں نہ جا پڑے جو ایمان کی ضد ہے۔

یا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص بدکاری کرتا ہے تو اس وقت ایمان اس سے نکل کر اس کے سر کے اوپر سائبان کی طرح ہو جاتا ہے، پھر جب وہ اس گناہ سے بالکل الگ ہو جاتا ہے تو ایمان اس میں واپس آ جاتا ہے، اور عنقریب اس کی وضاحت آئے گی۔بعض حضرات نے کہا ہے کہ مؤمن کا معنی اللہ تعالیٰ سے حیاء کرنے والا ہے اسلئے کہ حیاء ایمان کا شعبہ ہے چنانچہ اگر یہ شخص اللہ تعالیٰ سے حیاء کرتا اور اعتقاد رکھتا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے تو اس فعلِ بد کا مرتکب نہ ہوتا۔

اور یہ محل اشکال ہے کیونکہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا گیا کہ عارف (اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے والا) بدکاری کر سکتا ہے؟ تو انہوں نے جواب میں فرمایا: اللہ تعالیٰ کا طے شدہ معاملہ ہو کر رہتا ہے نیز اس جواب کا مطلب بھی قول اول ہی کی طرح ہے اسلئے کہ جب شعبہ حیاء منتفی ہوگا تو کمال ایمان کی نفی ہوگی اسلئے کہ جزء کے انتفاء سے کل منتفی ہو جاتا ہے، اور اس کی نظیر: "لا ايمان لمن لا امانة له، ولا دين لمن لا عهد له۔یعنی اس کا ایمان نہیں جو امانتدار نہیں اور اس کا دین کامل نہیں جو عہد پورا نہ کرے"۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ افعال کے صیغے اگرچہ بطور اخبار وارد ہوئے ہیں تاہم ان سے مراد نہی ہے اور اس مطلب کا شاہد اس حدیث کا لا یزن حذف یاء کے ساتھ یا ولا یشرب باء کے کسرہ کے ساتھ روایت ہونا بھی ہے۔ اس طرح اس حدیث اور سابقہ بیان کردہ دلائل کہ ایمان صرف دل کی تصدیق کا نام ہے اور اعمال اس سے خارج ہیں میں مطابقت ہو جاتی ہے، نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ”وان طائفتان من المؤمنين اقتتلوا“ اگر مؤمنین کے دو گروہ باہم لڑ پڑیں اور اس جیسی دوسری نظائر اسی کے موافق ہیں۔ لیکن اس کو نہی پر محمول کرنے میں اشکال ہے کیونکہ اس سے منھی عنہ کا جواز معلوم ہوتا ہے اس حال میں کہ وہ مؤمن نہ ہو، جیسے طبیب کہتا ہے: لا تشرب اللبن وأنت محموم تم بخار کی حالت میں دودھ مت پیو۔

اور یاء کا حذف اگر درست ہو تو یہ اس اسلوب کے موافق ہے لا تكذب وأنت عالم یعنی تیرا عالم ہونے کے باوجود جھوٹ بولنا اس سے زیادہ سخت جرم ہے کہ تو غیر عالم ہونے کی حالت میں جھوٹ بولتا۔

قوله: ولا يشرب الخمر حين يشربها وهو مؤمن:

یہاں الشارب فاعل محذوف ہے اسی طرح دوسری جگہ میں بھی ہے اور فاعل کا حذف جو کہ کلام میں عمدہ ہوتا ہے مقام کی دلالت کی بناء پر ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہر دو میں فاعل ضمیر مستتر ہو جو مؤمن کی طرف لوٹ رہی ہو۔ علامہ مالکی فرماتے ہیں کہ فاعل کے حذف کی قبیل سے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ حدیث بھی ہے: ”ولا یشرب ولا ینتھب ولا یغل ولا یقتل“ یعنی شارب، ناھب، غال اور قاتل فاعل محذوف ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا﴾ [آل عمران: ١٦٩] ”اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے“ ہشام کی قراءت میں فاعل حاسب محذوف ہے، یہ بات علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے۔ اسی طرح غال کی تقدیر سہو کے طور پر ہوگئی اسلئے کہ اس کا فاعل حدیث میں احدکم موجود ہے۔

قوله: ولا ينتهب نهبة...... حين ينتهبها وهو مؤمن:

انتھب اور نھب اس وقت کہا جاتا ہے جب ایک شخص کسی پر غارت گری کرے اور اسکے مال کو زبردستی چھین لے۔ (نھبة): ضمہ کے ساتھ وہ مال جو لوٹا گیا۔ یہ مفعول بہ ہے اور نھبة نون کے فتحہ کے ساتھ مصدر ہے۔ (یرفع الناس): نھبہ کی صفت ہے۔ (فیھا): اس کے لوٹ مار کے سبب اور اس کی وجہ سے یا لوٹنے کی حالت میں، یا مال چھیننے میں۔ (ابصارھم): اس کی بے باکی پر تعجب کرتے ہوئے یا اس کی قوت کے خوف سے۔ ابصارھم یہ یرفع کا مفعول ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص جو کسی قوم کے مال کو زبردستی چھینتا ہے اس حال میں کہ وہ اسے دیکھ رہے ہوں اور اپنے تضرع و عاجزی کا اظہار کر رہے ہوں اور رو رہے ہوں اور اس سے بچنے پر قادر نہ ہوں حالانکہ وہ مؤمن ہو، تو یہ ایسا ظلم عظیم ہے جو کسی مؤمن کے لائق شان نہیں ہے۔

قوله: ولا يغل احدكم حين يغل وهو مؤمن:

”غلول“ مال غنیمت میں جنابت یا خیانت کو کہتے ہیں۔ غنیمت سے کوئی چیز چوری کرے یا امانت میں خیانت کرے اور غل کے معنی کینہ ہیں۔ پہلے کا مضارع ضمہ کے ساتھ یغُلّ ہے اور یہاں یہی مراد ہے، دوسرے کا مضارع عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

قولہ: فایاکم ایاکم: اس کا نصب تحذیر کے طور پر اور تکرار تاکید ومبالغہ کے طور پر ہے۔

تنبیہ: "ولا یغل" یہ الفاظ صرف مسلم شریف کے ہیں، یہ بات میرکؒ نے فرمائی۔

۵۴ : وَفِیْ رِوَایَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَلَا یَقْتُلُ حِیْنَ یَقْتُلُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ قَالَ عِكْرِمَةُ قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ كَیْفَ یُنْزَعُ الْاِیْمَانُ مِنْهُ قَالَ هٰكَذَا وَشَبَّكَ بَیْنَ اَصَابِعِهٖ ثُمَّ اَخْرَجَهَا فَاِنْ تَابَ عَادَ اِلَیْهِ هٰكَذَا وَشَبَّكَ بَیْنَ اَصَابِعِهٖ وَقَالَ اَبُوْ عَبْدِاللّٰهِ لَایَكُوْنُ هٰذَا مُؤْمِنًا تَامًّا وَلَا یَكُوْنُ لَهٗ نُوْرُ الْاِیْمَانِ .

ترجمہ: اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ قاتل جب ناحق قتل کرتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا۔ حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث سن کر حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پوچھا کہ ایمان کس طرح الگ کرلیا جاتا ہے؟ تو ابن عباسؓ نے فرمایا اس طرح (یہ کہہ کر) انہوں نے اپنی انگلیوں میں تشبیک کی یعنی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسری میں داخل کیا اور پھر انگلیوں کو ایک دوسری سے الگ کرلیا اس کے بعد انہوں نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ توبہ کرلیتا ہے تو پھر ایمان اس طرح واپس آجاتا ہے اور یہ فرما کر انہوں نے پھر اپنی انگلیوں میں تشبیک کی یعنی اپنی انگلیوں کو ایک دوسری میں داخل کیا اور ابوعبداللہ یعنی امام بخاریؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس حدیث کا معنی اور مطلب یہ ہے کہ وہ آدمی گناہ اور معصیت کے ارتکاب کے وقت کامل اور اعلیٰ درجہ کا مؤمن نہیں رہتا اور اس کے اندر سے ایمان کا نور ختم ہوجاتا ہے (بخاری)

تشریح: قولہ: قال ھکذا، وشبك بین اصابعه ثم أخرجها :

آپ ﷺ نے امر معنوی کو سمجھانے کے لیے ایسی چیز سے تعبیر فرمایا جس کا ادراک حواس سے ہوتا ہے۔

قولہ: قال: فان تاب عاد الیه ھکذا وشبك بین اصابعه: نسخہ صحیحہ میں ایسے ہی ہے (یعنی 'قال'' کے ساتھ ہے۔)

آپؐ کے کلام سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ ان افعال کے مرتکب شخص کا ایمان ان کے ارتکاب کے وقت نکل جاتا ہے اور بغیر توبہ اس کی طرف واپس نہیں آتا، حالانکہ اہلِ سنت کے قواعد کی رُو سے یہ درست نہیں ہے لہٰذا اس کی تاویل یہ ہے کہ ایمان کا کمال اس کا نور، ثمرہ اور اس کا نتیجہ جو حیاء وخوف، ورحمت وشفقت اور دیانتداری سے حاصل ہوتا ہے اس حالت میں انسان سے الگ ہوجاتا ہے اور توبہ کرنے والا ایسا ہوتا ہے کہ گویا اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں، اس کی تائید حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ان گناہوں میں کسی گناہ کے مرتکب شخص سے مدح وتعریف کے القاب چھن جاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اولیاءِ مؤمن بندوں کو ملتے ہیں اور برے القاب چور، زانی اور فاسق جیسے القاب کا وہ مستحق ٹھہرتا ہے۔

قولہ: ھذا لفظ البخاری: مصنف علیہ الرحمۃ کے قول کی رُو سے۔ علامہ میرکؒ نے فرمایا کہ حدیث کے بارے میں یہ کہنا: فی روایۃ اور 'قولہ' اور 'قال' کذا فی قولہ، ھذا لفظ البخاری یہ ناپسندیدہ طریقہ ہے جیسا کہ بالکل ظاہر ہے۔

منافق کی تین نشانیاں

۵۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اٰیَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ زَادَ مُسْلِمٌ وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰی وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ ثُمَّ اتَّفَقَا اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اُؤْتُمِنَ خَانَ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۸۹/۱حدیث رقم۳۳۔وأخرجه مسلم فی صحیحه ۷۸/۱حدیث رقم(۱۰۷۔۵۹)۔ وأخرجه الترمذی ۲۰/۵حدیث رقم۲۶۳۱۔والنسائی فی سننه ۱۱۶/۸حدیث رقم ۵۰۲۱وأحمد فی المسند ۳۵۷/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ منافق کی تین علامات ہیں۔اسکے بعد امام مسلمؒ نے اپنی ذکر کردہ روایت میں اتنا اضافہ کیا ہے۔اگر چہ وہ نماز کی پابندی کرے۔روزے رکھے اور مسلمان ہونے کا دعوی کرے' اسکے بعد امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں متفق ہیں' وہ تین علامات یہ ہیں: ① جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔② جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے۔③ جب اسکے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

تشریح: **قوله: وعن ابی هریرة** : صاحب مشکوٰۃ نے "عنه" نہیں فرمایا، تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ ضمیر کا مرجع حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ہیں یا بخاری ہے۔

قوله: قال: قال رسول الله ﷺ اية المنافق ثلاث:
یعنی اس کے منافق ہونے کی علامت جو اس کی بُری نیت اور فساد فطرت پر دلالت کرتی ہے، اصل منافقت یہ ہے کہ آدمی کے دل میں جو بات پوشیدہ ہو اس کے برخلاف کا اظہار کرے پھر اس لفظ کا غالب استعمال اس پر ہونے لگا کہ کوئی زبان سے اسلام کا اظہار کرے اور دل میں کفر چھپائے۔

اٰیة کے معنی علامت ہے' اس کو مفرد اس لئے لائے کہ جنس مراد ہے یعنی ان میں سے ہر ایک نفاق کی علامت ہے یا علامتِ نفاق تینوں خصلتوں کے اجتماع سے حاصل ہوتی ہے۔پہلے احتمال کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو صحیح ابن عوانہ میں ان الفاظ کے ساتھ درج ہے: **علامات المنافق ثلاث**: منافق کی تین علامتیں ہیں۔

اگر یہ اشکال کیا جائے کہ اس حدیث میں ظاہری طور پر تین علامتوں میں حصر ہے تو پھر ایک دوسری حدیث میں یوں وارد ہے: **أربع من کن فیه......** چار باتیں جس میں پائی جائیں وہ منافق ہے۔امام قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ممکن ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ان کی تمام عادات کا علم نہ ہوا ہو بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کی عادات سے متعلق مزید علم عطا فرمایا۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں ہے اسلئے کہ نفاق کی خصلت کے شمار

سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ علامتِ نفاق بھی ہو، نیز مسلم شریف کی روایت جو علاء بن عبدالرحمٰن عن ابیہ عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کے طریق سے منقول ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان علامات کا حصر مقصود نہیں ہے اسلئے کہ اس کے الفاظ یہ ہیں: "من علامة النفاق ثلاث" چنانچہ ایک وقت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ علامتیں بیان فرمادیں اور کچھ علامات دوسرے وقت میں ذکر فرمادی ہیں۔

قوله: زاد مسلم: وان صام وصلى وزعم انه مسلم:

دو چیزوں کو تاکید واستیعاب کی غرض سے ذکر فرمایا یعنی اگرچہ وہ مسلمانوں والے اعمال نماز، روزہ اور دیگر عبادات انجام دے اور ایک روایت میں یوں منقول ہے: **وان صام وصلى وحج واعتمر، وقال: انى مسلمٌ** "اگرچہ وہ روزہ رکھے، نماز پڑھے، حج اور عمرہ کرے اور کہے کہ میں مسلمان ہوں" اور یہ شرط جملہ معترضہ کے طور پر مبالغہ کیلئے ذکر کی گئی ہے اسلئے جواب شرط کی متقاضی نہیں۔

قوله: اذا احدث كذب: یہ خصلت تینوں خصلتوں میں سے سب سے زیادہ قبیح ہے اور جملہ خبر کے بعد خبر ہے۔

قوله: واذا وعد أخلف: یعنی مستقبل میں کسی بات کی خبر دے۔ "وعد" عام طور پر خیر کے امور میں استعمال ہوتا ہے اور اُوعد شر میں استعمال ہوتا ہے۔ نیز وعید میں تخلّف بہترین اخلاق کی علامت ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

وإني إذا أوعدته أو وعدته ☆ لمخلف إيعادي ومتجز موعدي

"میں جب اسے دھمکی دیتا ہوں یا اس سے وعدہ کرتا ہوں تو اپنی دھمکی میں تخلف کر لیتا ہوں اور اپنا وعدہ پورا کر لیتا ہوں"۔

اس میں اور پہلی نشانی میں باہم فرق یہ ہے کہ وعدہ خلافی کبھی عمل سے ہوتی ہے اور اسے وہ جھوٹ قرار نہیں دے سکتے جو بات چیت کے لیے لازم ہے اور اس میں عہد پورا کرنے کا وجوب پر کوئی دلالت نہیں ہے اسلئے کہ وعدہ خلافی کرنا صرف اس بناء پر مذموم ہے کہ وہ جھوٹ کو جو قابلِ مذمت ہے متضمن ہے، بشرطیکہ وعدہ کرتے ہوئے آدمی وعدہ خلافی کا پکا عزم کرلے اور اگر بعد میں کسی عارض کی وجہ سے وعدہ نہ نبھا سکے تو وہ قابلِ مذمت نہیں جیسا کہ یہ بات بالکل واضح ہے علاوہ ازیں علامتِ نفاق سے اس کا حرام ہونا لازم نہیں آتا اسلئے کہ مکروہ اس بناء پر کہ وہ حرام تک لے جانے کا سبب بنتا ہے حرام کی علامت ہو سکتا ہے، اور اس کی نظیر قیامت کی نشانیاں بھی ہیں کہ ان میں سے بعض علامات حرام نہیں ہوتیں۔

قوله: واذا اؤتمن خان: صیغہ مجہول ہے علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ایک روایت میں "اتمن" تاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔

ممکن ہے یہ اعلال "اذا" کے اس پر داخلہ سے پہلے کا ہو، اس کے باوجود قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ﴾ [البقرة: ۲۸۳] کے بارے میں فرمایا: ورش اور سوسی نے اسے **الذی یتمن** ہمزہ کو یاء سے بدل کر پڑھا ہے اور الذی تمن ادغام کے ساتھ بھی پڑھا گیا جو کہ غلطی ہے اسلئے کہ ہمزہ سے جو بدل کر آئے وہ اسی ہمزہ کے حکم میں ہوتی ہے لہٰذا وہ مدغم نہیں ہوتی۔ اھ۔

اسی لئے محققین قراء نے فرمایا: اسے تشدید سے پڑھنا عقل ونقل کے برخلاف ہے، لہٰذا روایت کی رُو سے اس میں صحیح یا

ہمزہ ساکنہ ہے یا اسے الف سے بدلنا ہے۔

تخریج: اسے ابن ماجہ اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔

ان تین خصلتوں کو خصوصی طور پر اس لئے ذکر فرمایا کہ یہ تینوں اس مخالفت پر مشتمل ہیں جس پر منافقت کی بنیاد ہے کہ ظاہر کا باطن کے برخلاف ہو، پس جھوٹ خلاف واقعہ خبر دینے کو کہتے ہیں اور امانت کا حق یہ ہے کہ اسے صاحب امانت کے حوالہ کیا جائے تو خیانت اس کے برخلاف ہے اور وعدہ کی خلاف ورزی کا برخلاف ہونا بالکل واضح ہے اسلئے اسے صریح طور پر ''اخلف'' سے تعبیر فرمایا۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ حدیث اس اعتبار سے مشکل ہے کہ یہ عادات بسا اوقات ایسے مسلمان میں بھی پائی جاتی ہیں جسے بالاتفاق کافر قرار نہیں دیا جا سکتا؟ تو ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ منافق میں الف لام یا تو جنس کا ہے پھر عملی نفاق جو کہ اسلام کے منافی نہیں ہے اسے اس اعتقادی نفاق سے تشبیہ دی ہے جو اسلام کے منافی ہے اور دونوں میں قدر مشترک ایسی چیز کا اظہار ہے جو باطن کے برخلاف ہے یا اس سے مراد ان چیزوں کا عادی ہونا ہے اسی لئے ان خصلتوں کو ''اذا'' کے ساتھ مقید فرمایا جو مقتضی تکرار ہے مطلب یہ ہے کہ عملی نفاق جب اتنا زیادہ ہو جائے کہ وہ عادت میں بدل جائے تو کبھی وہ نفاق حقیقی تک پہنچا دیتا ہے، بخلاف اس شخص کے جس میں یہ تمام عادات یا ان میں سے بعض کبھی کبھار پائی جائیں، لہٰذا اس حدیث کا مصداق وہ شخص ہے جس میں بکثرت یہ عاداتِ بد پائی جائیں۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ بھی احتمال ہے کہ یہ حدیث عام ہو کہ تمام لوگوں کو ان خصلتوں سے پوری تاکید سے روکا جائے یہ بتاتے ہوئے کہ یہ عادات اس نفاق کی علامات ہیں جو قبیح ترین بُرائی ہے اسلئے کہ یہ ایسا کفر ہے جسمیں ربّ الارباب (سب کا پروردگار) اور مسبب الاسباب کا استہزاء اور اس سے دھوکہ ہے تو معلوم ہوا کہ یہ خصال مسلمانوں کی حالت کے منافی ہیں اسلئے مسلمان کو چاہیئے کہ ان کے قریب بھی نہ پھٹکے کیونکہ جو چراہ گاہ کے گرد چرتا ہے اسکے بارے میں امکان ہے کہ وہ اس چراہ گاہ میں بھی چلا جائیگا اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس منافق سے منافق عرفی مراد ہے اور وہ ایسا شخص ہوتا ہے جس کا ظاہر اس کے باطن کے بالکل خلاف ہے، اور اس کا شاہد آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: **من کانت فیه خصلة** نیز آپ ﷺ کا ارشاد خالصاً ہے اسلئے کہ وہ خصلتیں جن کی بناء پر ظاہر و باطن میں مخالفت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے ان سے زائد نہیں ہیں۔

امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: دونوں حدیثوں سے منافق کی پانچ خصلتیں معلوم ہوتی ہیں، اور شرح مسلم میں آپؒ نے فرمایا: **اذا عاهد غدر** یہ **اذا ائتمن خان** کے تحت داخل ہے، اور اس اعتبار سے انجام کار تین بلکہ ایک ہی خصلت بنتی ہے جو ان میں سب بدترین ہے اور وہ جھوٹ ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے صحیح یہی ہے کہ ان خصلتوں میں عرف کے اعتبار سے تغایر، یا ان کے اوصاف اور لوازم کے مختلف ہونے کی بناء پر یہ پانچ ہیں اور دوسری حدیث میں آپ کے ارشاد ثلاث (تین) اور یہاں اَربع (چار) میں کوئی منافات نہیں ہے۔ کیونکہ مفہوم عدد اکثر حضرات کے نزدیک حجت نہیں، نیز ثلاث کے مقابل کو بہت سے حضرات نے صحیح قرار دیا چنانچہ احتمال ہے کہ پہلے نبی کریم ﷺ کو وحی کے ذریعہ تین علامات بتائی گئیں، پھر چار یا اس حدیث سے مقصود ڈرانا اور دھمکانا ہے ان خصلتوں کی عادت ڈالنے سے کہ جو خالص نفاق کی طرف مفضی ہیں۔ یا منافق میں الف لام

عہد خاجی کا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے منافق مراد ہیں یا کوئی خاص منافق شخص مراد ہے، یا نفاق سے مراد نفاق عملی ہے نفاقِ ایمانی مراد نہیں یا نفاق سے نفاق عرفی مراد ہے کہ جس کا باطن اس کے ظاہر کے خلاف ہو اور یہی احتمال مستحسن ہے کیونکہ نفاق شرعی وہ اعتقادی نفاق ہے جو باطن میں کفر چھپانا اور اسلام کا اظہار کرنا ہے اور عرفی نفاق وہ عملی نفاق ہے جس میں معصیت کو باطن میں چھپا کر طاعت کا اظہار کیا جاتا ہے اور یہاں یہی مراد لینا اولی ہے اور نفاق عملی پر کفر کا اطلاق ایسے ہی ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے بعض کبیرہ گناہوں پر کفر کا اطلاق فرمایا ہے جیسے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: **سباب المسلم فسوق و قتاله كفر** (مسلمان کو گالی دینا گناہ ہے اور اس سے قتال کفر ہے)۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بعض مقامات پر مسلمان پر کفر کے اطلاق کا انکار فرمایا اور بعض جگہوں میں کفر کا اطلاق کیا ہے، چنانچہ انہوں نے کبیرہ گناہ کے مرتکب کو منافق قرار دیا، اور ان سے اس پہلے قول (منافق قرار دینے) سے رجوع بھی منقول ہے جس کی وجہ یہ ہوئی کہ حضرت عطاء رحمہ اللہ تعالیٰ کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ صاحب کبیرہ کو منافق قرار دیتے ہیں تو انہوں نے حضرت حسنؒ کے پاس یہ سوال بھیجا کہ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بھائیوں میں یہ تینوں باتیں پائی گئیں آیا آپ انہیں بھی منافقین سمجھیں گے؟ حضرت عطاء رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس تنبیہ پر آپؒ بہت خوش ہوئے۔

حضرت مقاتل رحمہ اللہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے حضرت ابن جبیر رحمہ اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اس حدیث کی وجہ سے میری زندگی برباد ہوگئی کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ان تین باتوں یا ان میں سے بعض سے میں محفوظ نہیں ہوں تو وہ ہنس پڑے اور فرمایا: مجھے اپنے بارے میں بھی اس حدیث کی بناء پر پریشانی لاحق ہوئی تو میں نے اس سلسلہ میں ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا تو وہ دونوں ہنس پڑے اور انہوں نے فرمایا کہ ہمیں بھی اس کے بارے میں فکر لاحق ہوئی تو ہم نے بھی رسول اللہ ﷺ سے اس کی بابت دریافت کیا تو آپ ﷺ ہنس پڑے اور ارشاد فرمایا: تمہارا ان باتوں سے کیا تعلق؟ سنو میرا ارشاد: "**اذا حدث كذب**" یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد جو مجھ پر نازل فرمایا کے بارے میں ہے: ﴿وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ﴾ [المنافقون: ۱] ''لیکن خدا ظاہر کئے دیتا ہے کہ منافق (دِل سے اعتقاد نہ رکھنے کے لحاظ سے) جھوٹے ہیں''۔

اور **اذا وعد أخلف** اس ارشادِ باری کے متعلق ہے (گویا اس کی تشریح ہے) ﴿فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ﴾ [التوبة: ۷۷] ''تو خدا نے اس کا انجام یہ کیا کہ اس روز تک کے لئے جس میں وہ خدا کے روبرو حاضر ہوں گے ان کے دلوں میں نفاق ڈال دیا اس لئے کہ انہوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا اور اس لئے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔'' اور جہاں تک "**اذا ائتمن خان**" کا تعلق ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ اس ارشاد کے بارے میں ہے: ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ......﴾ [الاحزاب: ۷۲] ''اور ہم نے (بار) امانت کو آسمانوں اور زمینوں پر پیش کیا......'' اور تم لوگ ان باتوں سے بری ہو۔

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد سے متعلق مذکورہ باتیں اس قول کی رُو سے ہیں کہ وہ انبیاء نہیں تھے، اور ان کے انبیاء ہونے کے قول کی رُو سے ان سے صادر ہونے والے امور سے متعلق تاویل کرنا

متعین ہے کہ انہیں مجازی معانی اوران کنایات پر محمول کیا جائے جو اس بات کے متقاضی ہوں کہ حقیقی طور پر یہ امور ان سے صادر نہیں ہوئے تھے، اسلئے کہ انبیاء نبوت سے پہلے اور اس کے بعد کبائر وصغائر کے ارتکاب سے خواہ وہ سہواً ہوں محققین کے قول حق کی رُو سے معصوم ہوتے ہیں، اگر چہ اکثر حضرات کے رائے اس کے برخلاف ہے، اور ان کے نبی ہونے کے قول کی تائید بلکہ اس کی تصریح اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے: ﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ﴾ [البقرة : ١٣٦] ''(مسلمانو!) کہو کہ ہم خدا پر ایمان لائے اور جو (کتاب) ہم پر اتری اس پر اور جو (صحیفے) ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے''۔ اسباط سے مراد اولادِ یعقوب ہے، تو آیت میں تصریح ہے کہ ان نازل ہونے والی وحی پر ایمان لانا واجب ہے اور ان پر وحی کے نازل کرنے سے ان سب کی نبوت لازم آتی ہے۔

اس میں اشکال ہے اسلئے کہ سبط عرف ولغت میں ولد الولد (پوتے) کے بارے میں معروف ہے۔قاموس میں ہے: السبط کسرہ کے ساتھ پوتے اور یہود کے ایک قبیلہ کو کہتے ہیں، جس کی جمع اسباط آتی ہے، نہایہ میں ہے: الأسباط اسحاق بن ابرہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد ہے جس طرح اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد کے قبیلے ہیں اس کی واحد سبط آتی ہے جو ایک جماعت پر بولا جاتا ہے۔

ان کی جانب وحی نازل کرنے سے ان سب کا نبی ہونا لازم نہیں آتا اسلئے کہ ممکن ہے کہ ان میں سے ایک نبی ہو اور باقی حضرات کو اس کی اتباع کا حکم دیا گیا ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: وما انزل الینا۔ پھر تمام حضرات کی نبوت کے ثبوت اور نبی سے صغیرہ گناہ کے سہواً بھی صادر نہ ہو سکنے کو درست قرار دیتے ہوئے ان کی طرف سے والدین کی نافرمانی، صلہ رحمی کو توڑنے اور آزاد شخص کو فروخت جیسے افعال کے صدور کی کوئی تاویل نہیں ہوسکتی، نیز ان کے قول: ﴿أكله الذئب﴾ [یوسف : ١٧] اور ان کی جانب سے ان الفاظ سے حفاظت کا وعدہ : وانا له لحافظون اور رات کو اظہارِ غم کے لئے ان کا روتے ہوئے آنا اور ان کا یہ کہنا: مالك لاتأ منا علي يوسف وانا له لناصحون۔ ان کے قول: "اقتلوا یوسف" اور انہیں کنویں میں پھینکنے کی کوئی تاویل نہیں ہوسکتی۔ علاوہ ازیں ان امور کی تاویل سلف صالحین کے اقوال کے برخلاف بھی ہے جو حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ کے الزام اور حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ کے التزام سے پیدا ہوئی ہے۔

لہٰذا صحیح قول جمہور کا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے وحی کے بعد سہواً کبیرہ گناہوں اور عمداً صغیرہ گناہوں کا صدور ممکن ہے اور وحی کے نزول سے پہلے گناہوں کے صادر نہ ہوسکنے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ کبیرہ گناہوں کا صدور ان سے ناممکن ہے جبکہ شیعہ کا مذہب یہ ہے کہ وحی کے نزول سے پہلے اور بعد صغیرہ وکبیرہ ہر دو قسم کے گناہوں کا صدور نہیں ہو سکتا۔

منافق کی چار نشانیاں

٥٦: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ

مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

أخرجه البخاري في صحيحه ۸۹/۱حديث رقم۳۴۔ و مسلم في صحيحه ۷۸/۱حديث (۱۰۷۔۵۹۰) وابو داوٗد والترمذي ۶۴/۵حديث رقم ۴۶۸۸۔والنسائي في سننه۱۱۶/۸حديث رقم ۵۰۲۰والترمذي ۲۱/۵حديث رقم ۲۶۳۲ وأحمد في المسند ۱۸۹/۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی میں چار چیزیں ہوں گی وہ خالص اور پکا منافق ہے اور جس کے اندر ان میں سے کوئی ایک چیز پائی جائے گی تو جان لو کہ اس میں نفاق کی ایک خصلت پیدا ہوگئی ہے' جب تک کہ اس کو ترک نہ کردے اور وہ چار چیزیں یہ ہیں نمبرا جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے نمبر۲ جب کوئی بات کرے تو اس میں جھوٹ بولے نمبر۳ اور جب کوئی وعدہ کرے تو اس میں جھوٹ بولے نمبر۴ جب کسی سے جھگڑے اور لڑائی کرے تو گالیاں نکالے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله:عن عبد الله بن عمرو:واؤ کے ساتھ (رضی اللہ عنہما)۔

قوله:قال رسول الله ﷺ أربع من كن فيه كان منافقا خالصا: لہٰذا اسے مبتداء قرار دینا درست ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا انہیں حلال اعتقاد کرتے ہوئے یہ کام کرے اس تاویل کی صورت میں ممکن ہے کہ کسی مؤمن میں یہ چاروں باتیں جمع نہ ہوں خصوصاً عادت کے طور پر، اور اس کی تائید آپ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے:ومن كانت فيه خصلة.....حتى يدعها۔

اذا ائتمن خان:فعل مجہول ہے (خان):یعنی غیر شرعی تصرف کرکے۔

قوله:واذا حدث كذب:جان بوجھ کر بغیر عذر کے۔

قوله: واذا عاهد غدر:یعنی شروع سے وعدہ توڑ ڈالے۔علامہ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ حلف اٹھاتا ہے تو اسے پورا نہیں کرتا۔

قوله: واذا خاصم فجر:یعنی گالی دے اور بری اشیاء کی طرف منسوب کرے۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:جس آدمی میں یہ عادات جمع ہوں اور اس میں برابر رہیں تو وہ منافق ہونے کے لائق ہے، اور جو مؤمن ان خصال کا شکار ہو جائے تو ایک بات یہ ہے کہ وہ مسلسل ان باتوں کا مرتکب نہ ہوگا دوسری بات یہ ہے کہ اس میں ان میں سے کوئی ایک عادت پائی بھی جائے تو دوسری عادت نہیں پائی جائے گی۔

بعض حضرات نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ منافق کی طرح ہوگا حرف تشبیہ کو حذف کردیا گیا ہے زیدٌ اسد میں تشبیہ محذوف ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ بات آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ والوں کے ساتھ خاص ہو اس طرح کہ آپ ﷺ کو وحی کے نور سے ان کے باطنی احوال کا پتہ چل گیا ہو اور آپ نے ان میں سے صدقِ دل سے ایمان لانے والوں اور پکے منافقین میں امتیاز فرما کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کے بارے میں مطلع فرمانا چاہا تا کہ وہ ان منافقین سے بچ سکیں، نیز اس وجہ

سے کہ تصریح کو ترک کرنا اوقع فی النصیحة ہوتا ہے اور جلد دل پر اثر کرنے والی نصیحت اور زیادہ شفقت پر دال اور ایمان کی دعوت کے لیے زیادہ پرکشش اور نفرت، لڑائی جھگڑے اور مخالفین سے ملانے سے اَبعد ہے۔

تخریج: یہ الفاظ حدیث بخاری کے ہیں۔ اسے امام احمد امام ابوداؤد، ترمذی، اور نسائی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی روایت کیا، اور ان کے الفاظ یہ ہیں: اذا احدث کذب، واذا وعد أخلف، واذا عاهد غدر، واذا خاصم فجر۔

منافق کی مثال

۵۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْمُنَافِقِ كَالشَّاةِ الْعَائِرَةِ بَيْنَ الْغَنَمَيْنِ تَعِيْرُ اِلٰى هٰذِهٖ مَرَّةً وَاِلٰى هٰذِهٖ مَرَّةً۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

أخرجه مسلم فی صحيحه ٤/٢١٤٦ حديث (١٧)۔ والنسائی فی سننه ٨/١٢٤ حديث رقم ٥٠٣٧۔ وأحمد فی المسند ٢/٤٧۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ منافق کی مثال اس بکری کی طرح ہے جو دو ریوڑوں کے درمیان گھومتی پھرتی ہے اپنے مرکز کی تلاش میں کبھی اس ریوڑ کے طرف مائل ہو جاتی ہے اور کبھی دوسرے ریوڑ کی طرف مائل ہو جاتی ہے اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: مثل المنافق كالشاة العائرة بين الغنمين:

یعنی جو نر کی تلاش کے لیے بھاگ رہی ہو، عار بمعنی ذهب اور بُعد سے مشتق ہے یعنی دو ریوڑوں کے درمیان۔ اسلئے کہ غنم اسم جنس ہے جو ایک اور زیادہ پر بولی جاتی ہے۔ یعنی اسے پتہ نہیں چلتا کہ دونوں میں سے کس کے پیچھے چلے۔

قوله: تعير الى هذه مرة والى هذه مرة:

دوسری بار تا کہ نر اس سے جفتی کر لے، اسے ایک حالت پر قرار حاصل نہیں ہوتا، وہ اپنی شہوت کی قیدی ہوتی ہے۔ یہ تشبیہ مرکب محسوس کی معقول کے ساتھ ہے جو مخاطب کے فہم کے قریب کرنے کے لیے لائی گئی ہے، چنانچہ منافق کے دو جماعتوں مسلمانوں اور کافروں کے درمیان اپنی خواہش و چاہتوں کی پیروی اور شہوتوں کے مقصود ہونے کو اس بکری کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو ادھر اُدھر بھاگتی پھر رہی ہو ایک حالت پر برقرار نہ رہتی ہو، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی اس حالت کو اپنے ارشاد میں یوں بیان فرمایا: ﴿هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ﴾ [النساء:١٤٣] ''اور نہ ان کی طرف اور جس کو خدا بھٹکائے''۔

تخریج: اسی طرح احمد و نسائی نے بھی اسے روایت کیا اور یہ اضافہ بھی کیا: لا تدری أيهما تتبع۔

الفصل الثانی:

دین کے نو بنیادی احکام

۵۸:عَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ قَالَ یَهُودِیٌّ لِصَاحِبِهٖ اِذْهَبْ بِنَا اِلٰی هٰذَا النَّبِیِّ فَقَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ لَا تَقُلْ نَبِیٌّ اِنَّهٗ لَوْسَمِعَكَ لَكَانَ لَهٗ اَرْبَعُ اَعْیُنٍ فَاَ تَیَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَسَاَ لَاهُ عَنْ تِسْعِ اٰیَاتٍ بَیِّنَاتٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَیْئًا وَلَا تَسْرِقُوْا وَلَاتَزْنُوْا وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا تَمْشُوْا اِلٰی ذِیْ سُلْطَانٍ لِیَقْتُلَهٗ وَلَاتَسْحَرُوْا وَلَا تَاْكُلُوا الرِّبَا وَلَا تَقْذِفُوْا مُحْصِنَةً وَلَا تُوَلُّوْا لِلْفِرَا رِیَوْمَ الزَّحْفِ وَعَلَیْكُمْ خَاصَّةً الْیَهُوْدَ اَنْ لَّا تَعْتَدُوْا فِی السَّبْتِ قَالَ فَقَبَّلَا یَدَیْهِ وَرِجْلَیْهِ وَقَالَا نَشْهَدُ اَنَّكَ نَبِیٌّ قَالَ فَمَا یَمْنَعُكُمْ اَنْ تَتَّبِعُوْنِیْ؟ قَالَ اِنَّ دَاوٗدَ عَلَیْهِ السَّلَامُ دَعَا رَبَّهٗ اَنْ لَّا یَزَالَ مِنْ ذُرِّیَّتِهٖ نَبِیٌّ وَاِنَّا نَخَافُ اِنْ تَبِعْنَاكَ اَنْ یَّقْتُلَنَا الْیَهُوْدُ ۔ (رواہ الترمذی و ابوداود والنسائی)

أخرجه الترمذی ۷۲/۵حدیث رقم۲۷۳۳وقال حسن صحیح ـ والنسائی فی سننه ۱۱۱/۷حدیث رقم ۴۰۷۸ـ وأحمد فی مسنده ۲۳۹/۴ـ

ترجمہ:حضرت صفوان بن عسال سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ایک دن ایک یہودی نے اپنے دوسرے یہودی ساتھی سے کہا کہ آؤ اس نبی (ﷺ) کے پاس چلتے ہیں اس کے ساتھی نے کہا اس شخص کو نبی نہ کہو کیونکہ اگر اس نے سن لیا کہ یہود بھی مجھے نبی کہتے ہیں تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی یعنی اس کی خوشی کی کوئی انتہاء نہ رہے گی الغرض وہ دونوں یہودی رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں آئے اور آپ سے نو واضح احکام کے بارے میں سوال کیا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا① کسی کو اللہ کے ساتھ شریک نہ کرو② چوری نہ کرو③ بدکاری نہ کرو④ جس جان کو قتل کرنا اللہ نے حرام کر دیا ہے اس کو ناحق اور ظلم سے قتل نہ کرو⑤ کسی بے گناہ پر الزام لگا کر قتل کرانے کے لئے حاکم وقت کے پاس نہ لے جاؤ ⑥ جادو نہ کرو⑦ سود نہ کھاؤ⑧ پاکدامن عورت پر زنا کا الزام نہ لگاؤ⑨ میدان جنگ میں دشمن کو پیٹھ نہ دکھاؤ اور یہ بھی فرمایا کہ اے یہودیو! تمہارے لئے خاص طور پر ضروری ہے کہ ہفتہ کے دن کے بارے میں اللہ کے حکم سے تجاوز نہ کرو راوی کہتے ہیں کہ یہ سن کر دونوں یہودیوں نے آپ ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں چوم لیئے اور کہا ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ سچے نبی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمہیں میری رسالت پر یقین ہے تو پھر تم میری اتباع کیوں نہیں کرتے میری اتباع سے تمہارے لئے کونسا امر مانع ہے انہوں نے کہا اصل بات یہ ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اپنے رب سے دعاء کی تھی کہ ان کی اولاد میں ہمیشہ نبی رہے لہٰذا ہمیں اس بات کا خوف ہے کہ اگر ہم آپ کی پیروی کریں تو یہودی لوگ ہمیں قتل کر ڈالیں گے اس حدیث کو امام ترمذی اور امام ابوداؤد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

صفوان بن عسال۔ یہ صفوان بن عسال مرادی ہیں' مشہور و معروف صحابی ہیں' کوفہ کے رہنے والے تھے' ان کی حدیث اہل کوفہ میں شائع تھی' ''صفوان'' بروزن سلمان ہے' عسال میں عین مہملہ پر زبر اور سین مہملہ پر تشدید ہے اور آخر میں لام ہے۔

تشریح: قوله: اذهب بنا الى هذا النبى ﷺ: ''با'' مصاحبت کی ہے یا تعدیہ کے لئے ہے۔

قوله: لاتقل نبى، انه لو سمعك لكان له اربع عين:

انه: ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ استیناف (نئی بات کا آغاز) معنی میں تعلیل کے لیے۔

'' لكان له أربع أعين'': مطلب یہ ہے کہ تیری بات سے یہ نبی اتنے زیادہ خوش ہونگے کہ اس سے ان کی آنکھیں پھیل جائیں گیں جس سے ان کی نگاہوں کی روشنی میں اتنا اضافہ ہوگا جیسے دو آنکھوں سے دیکھنے والا چار آنکھوں سے دیکھنے لگے، سو خوشی سے آنکھیں یوں ہی پھٹی کی پھٹی رہ جاتیں ہیں جیسا کہ غم و پریشانی سے آنکھوں میں خلل واقع ہوتا ہے' اسی لئے جس آدمی پر غم چھا جائیں اسکے بارے میں کہا جاتا ہے: اس پر دنیا تاریک ہوگئی۔

قوله: فسألاه عن تسع آيات بينات:

آیت کسے کہتے ہیں؟ آیت کھلی علامت کو کہتے ہیں، محسوسات میں استعمال ہوتی ہے جیسے راستہ کی علامت اور معقولات میں بھی استعمال ہوتی ہے جیسے واضح حکم، واضح مسئلہ۔ چنانچہ ہر ایسی چیز جس میں غور فکر اور لوگوں کے علم کے مراتب کے اعتبار سے معرفت مختلف ہوتی ہے اسے آیت (نشانی) کہتے ہیں، اور معجزہ کو بھی آیت کہتے ہیں، اور ہر جملہ جو اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے کسی حکم پر دلالت کرتا ہے اسے آیت کہتے ہیں، ہر ایسا کلام جو لفظی اعتبار سے دوسرے سے جدا ہو اسے آیت کہتے ہیں۔

یہاں آیات سے مراد یا تو معجزات ہیں اور وہ موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کا عصا، ید بیضا (روشن ہاتھ)، طوفان کا عذاب، ٹڈی، جوؤں، مینڈکوں، خون، قحط سالی، اور پھلوں میں کمی کا عذاب۔ اس لحاظ سے آپ کا ارشاد ''لا تشر كوا'' جواب کے بعد کلام مستانف ہے، اور راوی نے ان کے سوال کا جواب اسلئے نہیں دیا کہ قرآن مجید وغیرہ میں اس سوال کا جواب مذکور ہے اسلئے جس کی تائید ترمذی کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ ان دونوں نے آپ ﷺ سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ [البقرة: ۸۷] ''اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت کی اور ان کے پیچھے یکے بعد دیگرے بھیجتے رہے اور عیسیٰ بن مریم کو کھلے نشانات بخشے اور روح القدس (یعنی جبرئیل) سے ان کو مدد دی، تو جب کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسی باتیں لے کر آئے جن کو تمہارا جی نہیں چاہتا تھا تو تم سرکش ہو جاتے رہے اور ایک گروہ (انبیاء) کو تو جھٹلاتے رہے اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے'' وہ احکام جو عام ہوں اور تمام شریعتوں میں سب مذاہب والوں کیلئے ثابت ہوں جن کا بیان مابعد میں آرہا ہے۔ ان کا نام ''آیات'' اسلئے قرار دیا گیا کہ وہ اس شخص کی آخرت میں سعادت یا شقاوت پر دلالت کرتی ہیں جو ان کے متعلق عمل پیرا ہوگا۔

قوله: لا تشركوا بالله...... : یعنی اس کی ذات وصفات وعبادت میں کسی کو بھی اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ۔

"**ولا تمشوا ببرئ الى ذى سلطان ليقتله**": "**برئ**" ہمزہ اور ادغام کے ساتھ۔
یعنی جو گناہ سے بری ہو، یا متعدی بنانے کے لیے ہے یعنی مت کوشش کرو اور مت بری بات کرو اس کے بارے میں جس نے گناہ نہیں کیا' یعنی ایسے آدمی کے پاس جسے قوت وقدرت اور غلبہ وشوکت حاصل ہو تو وہ اسے قتل نہ کردے۔

"**ولا تسحروا**": حاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اس لئے کہ سحر کی بعض اقسام کفر ہیں اور بعض فسق ہیں۔

"**ولا تاكلوا الربو**": اور سود نہ کھاؤ کیونکہ یہ ہلاکت اور تباہی ہے۔

"**ولا تقذفوا محصنة**": ذال کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ "**محصنة**": صاد کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ ہے۔

"**ولا تولّوا للفرار**": **تولّوا**' **تولى** سے ماخوذ ہے جس کے معنی اعراض اور پیٹھ پھیرنے کے ہیں اصل میں **تتولوا** تھا ایک تاء کو حذف کر دیا بعض حضرات نے کہا: تاء اور لام کے ضمہ کے ساتھ **ولى توليه** سے ماخوذ ہے جب وہ پیٹھ پھیر لے یعنی اپنی پیٹھیں مت پھیرو، بعض نسخوں میں **الفرار** بغیر لام علت کے ہے جو مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

قوله: وعليكم خاصة اليهود ان لا تعتدوا فى السبت:

"**وعليكم خاصة**" نیا حکم ہے جو جواب سے زائد ہے' اسی لئے آپ ﷺ نے اس کا سیاق بدل دیا۔
"**عليكم**" ظرف خبر مقدم واقع ہے۔ "**خاصة**": تنوین کے ساتھ حال ہے ظرف میں مستتر ضمیر مبتداء کی طرف لوٹ رہی ہے۔

یعنی اس دسویں بات میں وہ (یہود) مخصوص ہیں یا ہفتہ کے دِن تجاوز نہ کرنے کی حالت تمہارے ساتھ خاص ہے دیگر ملتوں کے ساتھ نہیں یا یہ تمیز ہے۔ "**خاصة**" عاملہ کی ضد ہے۔
"**اليهود**": تخصیص اور تفسیر کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی میری مراد یہود ہیں۔ ممکن ہے کہ "**خاصة**"، خصوصاً کے معنی میں ہو اور یہود فعل محذوف کا مفعول ہو یعنی **اخص اليهود خصوصاً**۔ اس حدیث کے بعض طرق میں یہود بغیر الف لام کے منادی ہونے کی بناء پر مضموم ہے۔

"**ان لا تعتدوا**": بتاویل مصدر مبتداء ہونے کی بناء پر محلاً مرفوع ہے۔ ایک صحیح نسخہ کے مطابق "**ان لا تعدوا**"، عین کے سکون اور دال کی تخفیف کے ساتھ اور ایک نسخے میں عین کے فتحہ اور دال کی تشدید کے ساتھ ہے۔ یعنی ہفتہ کی تعظیم کے متعلق اللہ کے امر سے متجاوز نہ ہو کہ اس دن مچھلی کا شکار نہ کرو۔
بعض حضرات نے کہا "**عليكم**" اسم فعل بمعنی خذوا ہے اور "**ان لا تعتدوا**" اسکا مفعول ہے۔
مطلب یہ ہے کہ ترک اعتداء کو لازم پکڑو اور یہ بھی ممکن ہے کہ سوال نو واضح احکامات اور عام احکامات پر دو سے متعلق ہو، انہوں نے ایک کے متعلق بتایا ہو اور دوسرے کے متعلق توریۃً چھپایا ہو تو آپ ﷺ نے دونوں امور سے متعلق جواب دیا اور راوی نے پہلے کو حذف کر دیا' یا آپ ﷺ نے مشکل کا جواب دیا ہو' یا آپ ﷺ نے مضمر کا جواب دیا ہو اور مشہور کو اس کے ظاہر ہونے کی بناء پر یا علی اسلوب الحکیم چھوڑ دیا ہو، اسی وجہ سے بظاہر وہ دونوں آپ ﷺ کے مطیع ہو گئے۔

قوله: وقالا: نشهد أنك بني:
اس لئے کہ یہ علم امی کی طرف سے ایک معجزہ ہے لیکن ہم یہ گواہی دیتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) عرب کی طرف نبی ہیں۔
قوله: قال: فما يمنعكم ان تتبعوني :اس سے پتہ چلا کہ اقل جمع دو ہے یا مطلب یہ ہے کہ تم دونوں اور تمہاری قوم۔
"تتبعونی": تاء کی تشدید کے ساتھ ہے، بعض حضرات نے کہا: تاء کی تشدید کے بغیر ہے یعنی میری نبوت کو تم خود سے تسلیم کرو اور وہ احکام شرعیہ جو تم پر واجب ہیں ان میں میری اتباع کرو۔

قوله: قالا: ان داود ......الخ
یعنی قیامت تک اور وہ مستجاب الدعوات تھے، لہٰذا ان کی اولاد میں نبی ہوگا اور یہود اسی کے پیروکار ہوں گے اور ممکن ہے کہ انہیں کبھی غلبہ اور شوکت بھی نصیب ہو۔ اور اگر ہم اپنے دین کو چھوڑ کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کریں تو ہمیں یہود اس وقت قتل کر دیں گے جب ان کا نبی ظاہر ہوگا اور انہیں قوت حاصل ہوگی۔
یہ داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام پر محض بہتان ہے اس لئے کہ انہوں نے توریت وزبور میں سے پڑھا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین بنا کر مبعوث ہو جائیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام ادیان کو منسوخ کر دیں گے تو وہ اس کے برخلاف کیسے دعا کر سکتے تھے جو اللہ نے انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بتادی تھی، اور اگر اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو عیسیٰ علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور قیامت تک نبی باقی ہیں۔
تخریج اور اسنادی حیثیت: اور فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اسی طرح حاکم نے فرمایا کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس میں ضعف کی وجہ کوئی نہیں پائی جاتی حالانکہ شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی۔

ایمان کی تین جڑیں

۵۹: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَلَاثٌ مِنْ اَصْلِ الْاِيْمَانِ اَلْكَفُّ عَمَّنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لَا تُكَفِّرْهُ بِذَنْبٍ وَلَا تُخْرِجْهُ مِنَ الْاِسْلَامِ بِعَمَلٍ وَالْجِهَادُ مَاضٍ مُذْ بَعَثَنِيَ اللّٰهُ اِلٰى اَنْ يُقَاتِلَ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الدَّجَّالَ لَا يُبْطِلُهُ جَوْرُ جَائِرٍ وَلَا عَدْلُ عَادِلٍ وَالْاِيْمَانُ بِالْاَقْدَارِ . (رواہ ابوداود)

أخرجه أبو داؤد في السنن ۳/ ۴۰ حديث رقم ۲۵۳۲۔اخرجه ابو داؤد في السنن ۳/ ۴۰ حديث رقم ۲۵۳۳۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین باتیں ایمان کی جڑ اور بنیاد ہیں: ① جو آدمی صدق دل سے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر لے اس کے ساتھ جنگ اور جھگڑا ختم کر دینا اب کسی گناہ کی وجہ سے اس کو ہرگز کافر نہ کہو اور نہ کسی عمل کی وجہ سے اس پر کافر ہونے کا فتویٰ لگاؤ۔ ② جس وقت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بنا کر بھیجا ہے اس وقت سے جہاد ہمیشہ کے لئے جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ اس امت کا آخر دجال سے قتال کریگا کسی عادل بادشاہ کا عدل اور کسی ظالم بادشاہ کا ظلم جہاد فی سبیل اللہ کو ختم نہیں کر سکے گا۔ ③ اچھی اور بری تمام تقدیروں پر ایمان لانا۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قولہ:ثلاث من اصل الایمان......من الاسلام بعمل :

"**لا تکفرہ**": تاء کے ساتھ اور نون کے ساتھ نفی ہے اور دونوں طریقوں سے مروی ہے۔ اکفار اور تکفیر کسی کو کفر کی طرف منسوب کرنے کو کہتے ہیں۔

یعنی ایمان کی اساس اور بنیاد ہیں ان میں سے ایک یا بعض ان میں سے۔

یہ اہلِ اسلام سے تعارض نہ کرنے کا بیان ہے اسی لئے اس کو الگ ذکر کیا۔

وہ شخص جو لا الہ الا اللہ کا اقرار کرے اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے سے باز رہنا۔ اُس سے جنگ ومخاصمت ختم کرو اور کسی بھی گناہ کے باعث، یعنی کفر کے علاوہ اگر چہ وہ کبیرہ گناہ ہو بخلاف خوارج کے (کہ وہ مرتکب کبیرہ کو کافر قرار دیتے ہیں) اور بخلاف معتزلہ کے (کہ وہ مرتکب کبیرہ کو ایمان سے خارج قرار دے کر کفر وایمان کے درمیان درجہ میں قرار دیتے ہیں۔)

اس کو کافر مت کہو اور نہ عملی کوتاہی کے باعث اس پر اسلام سے خارج ہونے کا فتویٰ صادر کرو۔ یعنی دوسری عادت جہاد کے برقرار رہنے کا عقیدہ رکھنا ہے یا دوسری خصلت جہاد ہے یا جہاد ایمان کی اصل ہے۔

(**ولا تخرجه**): مجرد اور مزید دونوں طریقوں سے پڑھ سکتے ہیں۔

قولہ: والجهاد ماض......ولا عدل عادل :

"**ماض**" مبتداء محذوف کی خبر ہے یعنی **هو ماض**

"**مذ**": ایک نسخے میں نون کے ساتھ "**منذ**" ہے۔ (**لا يبطله**): باب افعال سے ہے، یہ جملہ ماض کی صفت یا خبر کے بعد دوسری خبر ہے۔

یعنی ابتدائے زمانے سے مدینہ منورہ کی طرف بھیجا یا جہاد دے کر مبعوث فرمایا پس "**مذ**" حرف جر ہے۔

یا مطلب یہ ہے کہ جہاد کے جاری ہونے کی ابتدائی مدت وہ زمانہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث کیا اس صورت میں "**مذ**" مبتداء ہے اور زمان مقدر خبر ہے اور جملہ "ماض" کے مبتداء کی دوسری خبر ہے۔

یعنی اُمت اجابت یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا مہدی علیہ السلام کے ساتھ۔

یعنی جب سے اللہ نے مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے اور جہاد فرض قرار دیا ہے اس وقت سے تا قیامت جہاد جاری رہے گا' اُس وقت تک کسی عادل کے عدل یا کسی ظالم کے ظلم کا بہانہ بنا کر جہاد ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تک اس امت کے آخر پر ایک شخص آ کر دجال سے جنگ کرے گا، دجال کے قتل کے بعد جہاد باقی نہیں رہے گا جہاں تک یاجوج ماجوج کا تعلق ہے تو ان کے خلاف تو اس لئے جہاد نہیں ہوگا کہ قدرت وطاقت نہیں ہوگی تو اس وقت آیت انفال کی بناء پر جہاد اس دور کے لوگوں پر واجب نہ ہوگا اور ان کی ہلاکت کے بعد سطح زمین پر کوئی کافر باقی نہیں رہے گا جب تک عیسیٰ علیہ السلام زمین پر زندہ رہیں گے اور عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جو مسلمان کافر ہو جائیں گے ان کے خلاف اس بنا پر جہاد نہیں ہوگا کہ اس کے تھوڑے عرصے بعد تمام مسلمان ایک پاکیزہ ہوا کی وجہ سے مرجائیں گے اور قیامت کے برپا ہونے تک کافر باقی رہیں گے دجال کے ذکر میں یہ حکایت آئے گی۔

ایک حدیث میں وارد ہوا ہے: "**الجهاد واجب عليكم مع كل امير برّا كان او فاجرا**" (جہاد تم پر ہر امیر کے

ساتھ خواہ وہ نیک ہو یا فاجر واجب ہے)۔

اس حدیث میں منافقین اور بعض ان کفار پر رد ہے جن کا یہ گمان تھا کہ تھوڑے دنوں بعد مملکت اسلام سکڑ جائے گی گویا کہ یوں کہا گیا ہے کہ جہاد برقرار رہے گا مطلب یہ ہے کہ مملکت اسلام کے پھریرے لہراتے رہیں گے اور اس کی اُمت کے اولیاء کی مدد ہوگی اور ملتِ اسلام کے دشمن قیامت تک مغلوب ہوں گے اور ممکن ہے کہ علامہ محی السنۃ نے اسی بناء پر اس حدیث کو بابِ علامات النفاق میں ذکر کیا ہے نیز حدیث سابق کو بھی اس باب میں ذکر کیا اس لئے کہ وہ دونوں یہودیوں نے منافقت کے طور پر کہا کہ "نشهد انك نبی" پھر ان کا یہ کہنا کہ داؤد علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے دعا کی بھی منافقت کے طور پر تھا اسلئے کہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے یہ بات دلی اعتقاد سے نہیں کہی یہ مطلب علامہ طیبی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس میں تکلف وتعسف ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ باب علامات نفاق اور کبائر دو چیزوں کے لیے وضع کیا گیا ہے، پس اس حدیث کی مناسبت کبائر سے بالکل واضح ہے جیسا کہ خوارج ومعتزلہ کی مخالفت سے ظاہر ہے اسی طرح جہاد فرضِ کفایہ ہے اور کبھی فرض عین بھی ہو جاتا ہے اور اس کا چھوڑنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔

حدیث سابق میں نو احکامات سارے کے سارے کبیرہ گناہ ہیں اور دونوں یہودیوں نے اپنے کفر پر برقرار رہنے کی صراحت کی لہٰذا وہ منافق نہیں ہوگے اور حضرت داؤد علیہ السلام کی دعا میں اس بات پر کوئی دلالت موجود نہیں کہ انہوں نے یہ بات دلی اعتقاد سے نہیں کہی۔ واللہ اعلم

بعض حضرات نے فرمایا: **لا يبطل......** کا مطلب یہ ہے کہ امام کے ظالم ہونے کی بناء پر ترکِ جہاد جائز نہیں بلکہ جہاد کے سلسلے میں امام کی موافقت لوگوں پر ضروری ہے اسی طرح امام کے عادل ہونے سے ترکِ جہاد جائز نہیں کہ مسلمانوں کو کفار کا ڈر باقی نہ رہے اور نہ انہیں غنیمتوں کی ضرورت ہو اس لئے کہ جہاد سے مقصود اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔ لہٰذا اس توہم کی نفی کی ضرورت پیش آئی اگرچہ عادل کے عدل کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے بارے میں جہاد کے ابطال کا وہم نہ ہو بلکہ جہاد کی تقویت کا باعث ہو۔ بعض حضرات نے کہا: اس بنا پر نفی کے معنی میں ہے۔

قولہ: والایمان بالاقدار: یعنی تیسری خصلت تقدیروں پر ایمان وہ بھی ایمان کی بنیادوں میں سے ہے۔

مطلب یہ ہے کہ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے وہ سب اللہ کی قضاء وقدر سے ہوتا ہے اور اس حدیث میں معتزلہ پر رد ہے جو بندوں کے لیے معصیت کے ارتکاب میں قدرتِ مستقلہ کو ثابت کرتے ہیں۔

دورانِ گناہ ایمان معلق رہتا ہے

۶۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا زَنَى الْعَبْدُ خَرَجَ مِنْهُ الْاِيْمَانُ فَكَانَ فَوْقَ رَأْسِهٖ كَالظُّلَّةِ فَاِذَا خَرَجَ مِنْ ذٰلِكَ الْعَمَلِ رَجَعَ اِلَيْهِ الْاِيْمَانُ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِىُّ وَاَبُوْدَاوُدَ)

أخرجه أبو داوٗد في سننه ٥/٦٦ حديث ٤٦٩٠ ـ والترمذي تعليقاه ١٧/٥ ضمن حديث رقم ٢٦٢٥ ـ

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی آدمی زنا

کا ارتکاب کرتا ہے تو ایمان اس کے اندر سے نکل جاتا ہے اور سائبان کی طرح اس کے سر پر لٹک جاتا ہے جب وہ اس گناہ سے فارغ ہو جاتا ہے تو ایمان دوبارہ اس کی طرف لوٹ کر واپس آ جاتا ہے اس حدیث کو ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اذا زنی العبد خرج منہ الایمان:

یعنی ایمان کا نور وکمال میں ایمان کا سب سے بڑا شعبہ جو اللہ سے حیاء ہے۔

یا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے ہو جاتا ہے جیسے وہ ایمان سے خارج ہو گیا اسلئے کہ اس کا ایمان اسے زنا سے نہیں روکتا جیسے اس آدمی کو نہیں روکتا جس آدمی سے ایمان نکل چکا ہو۔

یا یہ بات وعید میں شدت کی قبیل سے ہے۔

علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں: یہ بات زجر وتوبیخ کے باب سے ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی آدمی اس شخص سے جس کی مردانگی اور مروت مشہور ہو پھر وہ ایسے کام کا ارتکاب کردے جو اس کی عادت وخصلت کے منافی ہو عار دلانے کے لیے اور تمیز کے طور پر کہے اس شخص سے مردانگی ومروت ختم ہو چکی ہے، تاکہ آئیندہ وہ ایسی بات کا ارتکاب نہ کرے اور سامعین کو عبرت دلانے اور روکنے کے لیے اور ان پر شفقت اور تنبیہ کرتے ہوئے کہ زنا کافروں کی عادات اور ان کے اعمال میں سے ہے لہٰذا ایمان اور زنا کا جمع ہونا ایسے ہے جیسے دو متنافی چیزوں کا جمع ہونا ہے۔

قولہ: فکان فوق راسہ کالظلۃ: ظلہ اس ابتدائی بادل کو کہتے ہیں جو سایہ فگن ہو۔

آپ ﷺ کے اس ارشاد میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ زنا اگرچہ ایمان کے حکم کے برخلاف ہے تاہم یہ شخص ایمان کے زیر سایہ ہے حکم ایمان اس سے زائل نہیں ہوا' اور نہ اسم ایمان اس سے ختم ہوا۔

قولہ: فاذا خرج من ذالک العمل رجع الیہ الایمان:

بعض حضرات نے کہا: یعنی توبہ کے ذریعے اور بعض حضرات نے فرمایا: اس حدیث میں ایک معنوی مناسبت جو کہ اعلیٰ شرف الزوال ہونا ہے کی بناء پر معنی کو محسوس چیز کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مؤمن معصیت کی حالت میں اس شخص کی مانند ہو جاتا ہے جو ایمان کھو چکا ہو لیکن ایمان کا حکم اور اس کا نام اس سے زائل نہیں ہوگا بلکہ اس کے بعد بھی وہ ایمانی جھنڈا جو اس کے اوپر گاڑا ہوا ہو کے زیرِ سایہ اور اس کی برکت کے گوشہ (کنارہ) میں سے گویا بادل اس پر سایہ فگن ہے، پھر جب وہ اپنی معصیت سے فارغ ہوا تو ایمان پھر اس کی طرف لوٹ آیا۔

اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اس کے بارے میں نعوذ باللہ کفر کا اندیشہ تھا اسلئے کہ اس سے وہ گناہ صادر ہوا جو کبھی اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ ایمان اس کی طرف لوٹ کر نہ آئے۔ اسی لئے حضرات علماء نے فرمایا کہ: معاصی کفر کی ڈاک ہیں۔

اسنادی حیثیت: امام ابوداؤدؒ اور منذریؒ نے اس پر سکوت اختیار فرمایا۔ امام حاکم اسے روایت کر کے فرماتے ہیں: یہ حدیث شیخین کی شرط پر صحیح ہے اور علامہ ذہبی نے ان کی موافقت فرمائی ہے۔

الفصل الثالث:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دس نشانیاں

۶۱ :عَنْ مُعَاذٍ قَالَ اَوْصَانِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعَشْرِ كَلِمَاتٍ قَالَ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَاِنْ قُتِلْتَ وَحُرِّقْتَ وَلَا تَعُقَّنَّ وَالِدَيْكَ وَاِنْ اَمَرَاكَ اَنْ تَخْرُجَ مِنْ اَهْلِكَ وَمَالِكَ وَلَا تَتْرُكَنَّ صَلَاةً مَكْتُوْبَةً مُتَعَمِّدًا فَاِنَّ مَنْ تَرَكَ صَلَاةً مَكْتُوْبَةً مُتَعَمِّدًا فَقَدْ بَرِاَتْ مِنْهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَلَاتَشْرَبَنَّ خَمْرًا فَاِنَّهٗ رَأْسُ كُلِّ فَاحِشَةٍ وَاِيَّاكَ وَالْمَعْصِيَةَ فَاِنَّ بِالْمَعْصِيَةِ حَلَّ سَخَطُ اللّٰهِ وَاِيَّاكَ وَالْفِرَارَ مِنَ الزَّحْفِ وَاِنْ هَلَكَ النَّاسُ وَاِذَا اَصَابَ النَّاسَ مَوْتٌ وَاَنْتَ فِيْهِمْ فَاثْبُتْ وَاَنْفِقْ عَلٰى عِيَالِكَ مِنْ طَوْلِكَ وَلَا تَرْفَعْ عَنْهُمْ عَصَاكَ اَدَبًا وَاَخِفْهُمْ فِی اللّٰهِ . (رواه احمد)

أخرجه أحمد في المسند ۵/۲۳۸۔

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دس چیزوں کی وصیت فرمائی: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اگرچہ تمہیں قتل کر دیا جائے اور آگ میں جلا دیا جائے۔ اپنے ماں باپ کی نافرمانی نہ کرنا اگرچہ وہ تمہیں اپنے اہل وعیال اور مال کو چھوڑنے کا حکم دے دیں۔ جان بوجھ کر فرض نماز کو نہ چھوڑنا کیونکہ جو آدمی جان بوجھ کر نماز کو چھوڑ دیتا ہے اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری اس سے ختم ہو جاتی ہے۔ شراب مت پیو اس لیے کہ شراب تمام برائیوں اور بے حیائیوں کی جڑ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ سے بچو کیونکہ نافرمانی کرنے سے اللہ تعالیٰ کا غصہ اور ناراضگی اتر آتی ہے۔ میدان جہاد میں دشمنوں کے مقابلہ سے پیٹھ نہ پھیرو اگرچہ تمہارے ساتھ والے تمام لوگ ہلاک ہو جائیں۔ جب لوگوں میں کوئی وباء پھیل جانے سے موت عام ہو جائے اور تم ان میں موجود ہو تو اسی جگہ میں ثابت قدم رہو۔ اپنے اہل وعیال پر اپنی وسعت اور طاقت کے مطابق خرچ کرتے رہو۔ اپنے اہل وعیال کو ادب سکھانے کے لئے اپنا لاٹھی ان سے نہ ہٹاؤ۔ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں اپنے اہل وعیال کو ڈراتے رہو یعنی اگر اہل وعیال میں سے کسی کو توبیخ ضروری ہو تو اس سے اعراض نہ کرو اور ان کو اچھی باتوں کی نصیحت اور تلقین کرتے رہو اور منکرات سے بچنے کی تاکید بھی کرتے رہو۔

تشریح: قوله: اوصانی رسول الله ﷺ بعشر کلمات:

یعنی اوامر ونواہی میں سے دس احکام کا تاکہ میں ان پر خود بھی عمل کروں اور دوسروں کو بھی بتاؤں۔

قوله: قال: لا تشرك بالله شيئا وان قتلت وحرقت:

یعنی اپنے دل اور زبان سے بھی چنانچہ اکراہ کے وقت افضل یہی ہے کہ زبان سے بھی شرک نہ کرے۔ یعنی اگرچہ تجھے قتل اور جلائے جانے کا سامنا کرنا پڑے، مبالغے کے لیے شرط کو ذکر کیا لہٰذا یہ جواب کو نہیں چاہتی۔

علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا: یہ شرط مبالغہ کے لیے ہے بایں طور کہ کامل ترین درجہ اس شخص کے لیے جسے کفر پر

مجبور کیا گیا دھمکی کو گوارا کر کے کفر سے باز رہنا ہے اور یہ اس شخص کے بارے میں ہے جس کی موت سے اسلام کمزور نہ ہوتا ہو ورنہ وہ عالم اور بہادر جس کی موت سے اسلام کمزور ہوتا ہو اس کیلئے افضل یہ ہے کہ وہ اس بات کا ارتکاب کر لے جس پر اسے مجبور کیا گیا اور دو خرابیوں میں سے اخف خرابی کو گوارا کرتے ہوئے دھمکی پر صبر نہ کرے جہاں تک اصل جواز کا تعلق ہے تو اس کے لیے کلمہ کفر کا تلفظ اور ایسے فعل کا ارتکاب جائز ہے جو موجب کفر ہو جیسے اسلام کو گالی دینا یا بتوں کو سجدہ کرنا جب اسے اس سلسلہ میں سخت مار یا مال چھیننے کی دھمکی دی گئی جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے: ﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ إِيْمَانِهٖٓ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيْمَانِ﴾ [النحل: ۱۰۶] ''جو شخص ایمان لانے کے بعد خدا کے ساتھ کفر کرے وہ نہیں جو (کفر پر زبردستی) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔''

قوله: لا تعقن والديك وان امراك ان تخرج من اهلك ومالك:

یعنی ان دونوں یا کسی ایک کے ایسے حکم کی خلاف ورزی مت کر جو گناہ نہ ہو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔ **وان امرادا وان امراك**: یعنی اپنی بیوی یا باندی یا غلام کو طلاق یا بیع یا عتق وغیرہ کے ذریعے چھوڑنے کا حکم دیں۔ کہ اسے ان دونوں کی رضا جوئی میں صرف کردے۔

علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: یہ شرط بھی کامل ترین درجے کے اعتبار سے مبالغے پر مبنی ہے یعنی ان میں سے کسی ایک کے حکم کی خلاف ورزی مت کرو خواہ وہ حکم جو وہ تجھے دیں اس میں غلو سے کام لیں خواہ بیوی کی جدائی کا حکم ہو یا مال کے ہبہ کا، جہاں تک اصل جواز کا اعتبار ہے تو اس پر بیوی کے چھوڑنے سے متعلق حکم کی بجا آوری لازم نہیں اگرچہ بیوی کو باقی رکھنے میں انہیں سخت تکلیف ہو اسلئے کہ بیوی کو چھوڑنے کی صورت میں اسے بھی تکلیف کا سامنا ہوگا لہٰذا ان کی وجہ سے اسے ضرر کا مکلّف نہیں کیا جائے گا اسلئے کہ ان دونوں کی شفقت کا تقاضہ یہ ہے کہ اگرچہ انہیں اس سے تکلیف بھی ہو تو وہ اسے اس بات کا حکم نہ کریں اس کے باوجود ان کا اس کے لیے یہ بات لازم کرنا باعث حماقت ہے جس کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی اور یہی حکم اس کے مال ھبہ کرنے سے متعلق بھی ہے۔

قوله: ولا تتركن صلاة مكتوبة متعمدا...... ذمة الله: سہو ونسیان اور ضرورت سے احتراز ہے۔

یعنی وہ فرض نماز ہو اگرچہ نذر ماننے کی بناء پر لازم ہوئی ہو اس نماز کو وقت مقرر پر ادا نہ کرے' تو اس کے لئے مذکورہ وعید ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس سے بری الذمہ ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے امن میں باقی نہیں ہے گا' کہ دنیا میں تعزیر وملامت کا مستحق ہوگا اور آخرت میں عذاب کا حقدار۔

علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: یہ اس کے احتراز کے سقوط سے کنایہ ہے کیونکہ اس نے نماز چھوڑ کر اپنے آپ کو گرفتاری کی سزا کے لیے علماء کی ایک جماعت کے نزدیک پیش کر دیا اور ہمارے ائمہ کے نزدیک اس نے اپنے آپ کو حد کے طور پر قتل کے لیے پیش کر دیا نہ کہ کفر کے طور پر بشرطیکہ اس نے نماز کو اس کے وقت ضروری سے جس میں اسے ادائیگی کا حکم تھا' ٹال دیا اور امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور دیگر ائمہ کے نزدیک اس نے اپنے آپ کو کفر کا ارتکاب کرتے ہوئے قتل کے لیے پیش کیا لہٰذا نہ تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور نہ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔

قوله: ولا تشربن خمرا فانه رأس كل فاحشة :

" فانه " کی ضمیر کا مرجع "شرب خمر" ہے۔ فاحشه : یعنی برائی، اسلئے کہ برائیوں سے مانع چیز عقل ہوتی ہے اسی بناء پر اسے عقل کہتے ہیں کہ وہ صاحبِ عقل کو ہر قبیح سے روکتی ہے اور جب انسان سے عقل زائل ہو جائے تو جو برائی اس کے سامنے آئے گی اس کا مرتکب ہو جائے گا۔ اسی لئے شراب کو ام الخبائث کہتے ہیں جیسا کہ نماز کو اُم العبادات کہتے ہیں اسلئے کہ وہ بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔

قوله: واياك والمعصية ، فان بالمعصية حل سخط الله:

تخصیص کے بعد تحذیر وتعمیم ہے اور اس بات کا بتلانا ہے کہ سابقہ معاصی بہت بڑے ضرر کا باعث ہیں۔ حل : یعنی وہ عذاب اترتا ہے اور معصیت کے مرتکب پر واقع ہوتا ہے

ضمیر شان کا حذف:

انَّ کا اسم ضمیر شان محذوف ہے یعنی "فانه بعض حضرات نے کہا: ضمیر شان محذوف نہیں ہوا کرتی اس لئے کہ مقصود اس سے کلام کی تعظیم کا اظہار ہوتا ہے جو کہ اختصار کے منافی ہے اور اس بات کو یوں رد کیا گیا ہے کہ ضمیر شان اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ......﴾ [التوبة : ١١٧] میں بھی محذوف ہے۔

علامہ ابن حاجب کا یہ کہنا کہ ضمیر شان منصوب کا حذف ہونا ضعیف ہے علماء نحاۃ نے اس قول کو بھی ضعیف قرار دیا وہ یہ بات کیسے کہہ سکتے ہیں حالانکہ حضور ﷺ کے اس ارشاد میں جو مکروہ اوقات میں نماز کی ممانعت سے متعلق ہے مسلم کی حدیث میں آیا ہے: "اقصر عن الصلوٰة فان حينئذ تسجر جهنم اى فان الامر والشان" نماز مختصر کرو! اسلئے کہ اس وقت جہنم کی آگ دھکائی جاتی ہے یعنی بے شک معاملہ اور شان یہ ہے کہ......۔

علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: ابن حاجب کی اس بات کا یہ بھی جواب دے سکتے ہیں کہ یہ (ضمیر شان منصوب کا حذف) قیاساً ضعیف ہے استعمالاً ضعیف نہیں ہے اور قرآن مجید میں اس کی مثال : ﴿قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ﴾ [الأنعام : ١٣٧] میں اولاد کے نصب کے ساتھ جو مضاف مضاف الیہ کے درمیان فاصل ہے موجود ہے۔ انتھی اس سے مراد ابن عامر کی قراءت ہے اور اس سے بھی ظاہر مثال ابی یابی کا قرآن مجید میں موجود ہونا ہے جس کے قیاس کی رو سے شاذ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔

قوله: واياك والفرار من الزحف......وانت فيهم فاثبت :

" واياك والفرار " یہ کلام تعمیم کے بعد تخصیص ہے اور "ان" وصلیہ ہے "وانت فيهم": جملہ حالیہ ہے۔

علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: یہ شرط بھی باعتبار کامل ترین ہونے کے مبالغے پر محمول ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ﴾ [الأنفال : ٦٦] سے معلوم ہو گیا تھا کہ کفار جب مسلمانوں سے دُوگنا ہوں تو پیٹھ پھیرنا جائز ہے۔

فاثبت : کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: اذا وقع الطاعون ببلد وانتم فیه فلا تخرجوا منه واذا وقع ببلد ولستم فیه فلا تدخلوا الیه" (جب کسی شہر میں طاعون پھیل جائے اور تم اسی میں ہو تو اس سے نہ نکلو اور جب کسی شہر میں طاعون پڑے اور تم اس میں نہ ہو تو اس میں داخل نہ ہو)۔

پہلے کی حکمت یہ ہے کہ اگر اہلِ شہر کو جانے کی اجازت دی جائے تو وہ بیماروں کو چھوڑ کر چلے جائیں گے اور اس طرح بیمار ہلاکت کا شکار ہو جائیں گے اور دوسرے کی حکمت یہ ہے کہ جو آدمی کسی شہر میں آئے تو اسے اگر بیماری لگ جائے تو وہ اس کو اپنے آنے کی طرف منسوب کرے گا تو وہ بھٹک جائے گا اور دونوں باتوں کا موقع محل وہ ہے کہ جہاں آنے جانے کی ضرورت نہ ہو ورنہ آنے جانے میں کوئی گناہ نہیں جیسا کہ یہ ظاہر ہے۔

قوله: وانفق علی عیالك من طولك:

"عیال" عین کے کسرہ کے ساتھ ہے یعنی جن کا نفقہ شرعاً تم پر لازم ہے اور اس کی تفصیل کا موقع کتب فقہ ہیں۔

" طول" طاء کے فتحہ کے ساتھ ہے یعنی اپنے زائد مال سے بقدر وسعت وطاقت۔

قوله: لا ترفع عنهم عصاك ادبا واخفهم فی الله: " ادبا "مفعول لۂ ہے۔

یعنی ادب سکھانے نہ کہ سزا دینے کے لیے مطلب یہ ہے کہ جب آدب سکھانے کے لیے مار کی ضرورت ہو تو اس سے درگزر نہ کیا جائے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ﴾ [النساء : ٣٤] "اور جن عوتوں کی نسبت تمہیں معلوم ہو کہ سرکشی اور (بدخوئی) کرنے لگی ہیں تو (پہلے) ان کو (زبانی) سمجھاؤ (اگر نہ سمجھیں تو) پھر ان کے ساتھ سونا ترک کر دو۔"

اسی ترتیب سے جو مذکور ہے۔ نیز تعلیم اور نصیحت سے اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواھی کی مخالفت سے انہیں ڈرائیں اور مکارم اخلاق پر محمول کرتے ہوئے فقیر کو کھانا کھلانا' یتیم کے ساتھ احسان کرنا اور پڑسیوں کے ساتھ نیکی کرنا وغیرہ ہیں۔

تخریج: اسی طرح طبرانی نے الکبیر میں نقل کیا ہے اور احمد کی سند ہے اگر انقطاع سے سالم ہو تو درست ہے کیونکہ عبدالرحمٰن بن جبیر ابن نفیر نے معاذ سے سماعت نہیں کی۔

نفاق اب نہیں رہا......

٦٢: وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ اِنَّمَا النِّفَاقُ كَانَ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَمَّا الْيَوْمَ فَاِنَّمَا هُوَ الْكُفْرُ وَالْاِيْمَانُ. (رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ)

أخرجه البخاری فی صحیحه ٦٩/١٣ حدیث ٧١١٤۔

ترجمہ: حضرت حذیفہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ منافقت کا حکم رسول کریم ﷺ کے دور میں ختم ہو گیا ہے لہٰذا اب دو ہی صورتیں ہیں کفر یا ایمان۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: قال: انما النفاق کان علی عهد رسول الله ﷺ:

یعنی منافقین کا حکم کہ انہیں زندہ چھوڑتے ہوئے ان پر مسلمانوں کے احکام جاری کرنا صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں چند مصالح کی بناء پر تھا ایک مصلحت یہ تھی کہ مسلمان جب منافقین کے حالات پر پردہ ڈالتے تو مخالفین پر ان کی حالت مخفی رہتی اور وہ انہیں مسلمانوں ہی میں سے سمجھتے تو وہ مسلمانوں کی کثرت کی وجہ سے ان سے چھیڑ چھاڑ نہ کرتے بلکہ خود ان سے ڈرتے رہتے اور ان کی شوکت کم پڑ جاتی۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "ان الله ليؤيد هذا الدين باقوام لا خلاف لهم"۔

"بیشک اللہ تعالیٰ اس دین کو ایسی اقوام کے ذریعے مضبوط کرے گا جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔"

اور ایک مصلحت یہ تھی کہ کفار جب مسلمانوں کی طرف سے ان لوگوں پر سخت برتاؤ کے متعلق سنتے جو ان کے ساتھ تھے تو یہ بات ان کفار کیلئے اسلام سے نفرت کا باعث ہوتی۔

ایک مصلحت یہ تھی کہ جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن اخلاق کا قریب سے مشاہدہ کر لیتا تو باجود آپ کے مخالف ہونے کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے کو پسند کرتا اور ظاہری باطنی اعتبار سے آپ کا موافق بن جاتا اور اللہ کے دین میں پورے شوق وذوق سے داخل ہو جاتا۔

قوله: واما اليوم فانما هو الكفر او الايمان:

"**الكفر او الايمان**": "ھو" ضمیر "ہم" کی تفسیر ہے۔ اور "اَوْ" نوع بیان کرنے کے لیے ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: ﴿تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ﴾ "تم ان سے قتال کرو یا وہ تابع فرمان ہو جائیں"۔

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد۔ **فانما هو**: یعنی معاملہ اور حکم جس پر سیاقِ کلام دلالت کرتا ہے یعنی وہ حالت جس پر شریعت کا حکم برقرار ہے۔ یعنی آج یا تو صرف کفر ہے یا ایمان تیسری چیز نہیں ان دو کے علاوہ، یعنی صریح کفر اور قتل یا علانیہ وخفیہ ایمان کے علاوہ خیالات اگر گناہوں کے ہوں تو وسوسہ ہیں اور اچھائیوں کے ہوں تو الہام ہیں اور اصح یہ ہے کہ غیر معصوم کا الہام حجت نہیں کیونکہ اس کے خیالات معتبر نہیں ہیں۔

الفصل الاول:

وسوسہ کب تک معاف ہے؟

۶۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِیْ مَا وَسْوَسَتْ بِهٖ صُدُوْرُهَا مَالَمْ تَعْمَلْ بِهٖ اَوْتَتَكَلَّمْ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۶۰/۵حدیث رقم ۲۵۲۸۔وأخرجه مسلم ۱۱۶/۱حدیث (۲۰۲۔۱۲۷) وأخرجه أبو داوٗد فی السنن ۶۵۷/۲حدیث رقم ۲۲۰۹۔وأخرجه النسائی فی سننه ۱۵۶/۶ حدیث رقم ۳۴۳۴۔وأخرجه الترمذی فی السنن ۴۸۹/۳حدیث رقم ۱۱۸۳۔وابن ماجة فی السنن ۶۵۸/۱ حدیث رقم ۲۰۴۰وأحمد فی مسنده ۳۹۳/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا یقیناً اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لوگوں کے ان وسوسوں اور خیالات کو معاف کر دیا ہے جو ان کے دلوں میں پیدا ہوں جب تک کہ وہ لوگ ان وسوسوں پر عمل نہ کرلیں اور اپنی زبان پر لا کر ان کے ساتھ کلام نہ کرلیں (بخاری ومسلم)

تشریح: (عن أمتی): یعنی اُمت اجابت سے اور ایک روایت میں ہے : تجاوز لی عن امتی یعنی میری وجہ سے اس بات پر اللہ ان کا مواخذہ نہیں فرمائیں گے' یہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر اتنا بڑا احسان ہے جس کی کوئی انتہاء نہیں۔

قولہ: ان اللّٰه تجاوز عن امتی ماوسوست به صدورها:

''صدور'': فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے۔ ای ما خطر فی قلوبهم من الخواطر الردیئة ۔ ور مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب بھی ہوسکتا ہے۔ بعض حضرات نے کہا: اس میں اشکال ہے کیونکہ وسوسہ لازم ہے ہاں نصب کی وجہ ظرفیت ہے اگر روایت اس کی موافقت کرے ایک روایت میں ''ما حدثت به انفسها'' رفع کے ساتھ ہے والنصب بدلہ۔

یعنی جو برے خیالات ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ (سینہ) چونکہ دِل کے قریب ہے اسلئے مجاز صدور سے قلوب مرادلیا

قولہ: مالم تعمل به او تتکلم: "تتکلم" کا صلہ "بہ" مقدر ہے۔

یعنی اگر وہ وسوسہ فعلی ہو تو جب تک عمل اس سے متعلق نہ ہو اور اگر قولی ہو تو جب تک اس کی بات نہ کرے ازھار میں اسی طرح ہے، صاحب روضہ نے صحیح بخاری کی شرح میں کہا ہے: مذہب صحیح مختار جس پر جمہور ہیں یہ ہے کہ دل کے افعال جب پختہ ہو جائیں تو ان پر مواخذہ ہوگا حضور ﷺ کا یہ فرمان: "ان الله تجاوز عن امتی ما وسوست صدورها" اس پر محمول ہے کہ جب وہ دل کے افعال پختہ نہ ہوئے ہوں اور یہ بغیر کسی شک کے معاف ہیں کیونکہ ان سے بچنا ممکن نہیں بخلاف استقرار کے۔

خیال کے درجات:

صاحب ازھار نے "احیاء العلوم" سے نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے: اعمالِ قلب کے چار مرتبے ہیں۔

پہلا مرتبہ: خاطر یعنی خیال ہے جیسا کہ کسی آدمی کے دل میں عورت کی صورت آئی مثلاً راستے میں اس کے پیچھے اس طرح ہے کہ اگر اس کی طرف متوجہ ہو تو دیکھ سکتا ہے۔

دوسرا مرتبہ: ہیجان رغبت: اس کی طرف توجہ کرنے کے لئے بہت زیادہ رغبت کا ہو جانا جسے ہم طبیعت کا میلان کہتے ہیں پہلی قسم "حدیث النفس" ہے۔

تیسرا مرتبہ: دِل میں یہ بات طے کر لی کہ یہ ایسا کرنا ہے یعنی اس عورت کو دیکھنا ہے چنانچہ جب طبیعت مائل ہوتی ہے تو ہمت اور ارادہ پیدا ہوتا ہے جب تک اس سے موانع باز نہ رکھیں اور وہ موانع یہ ہیں: حیاء، اللہ تعالیٰ، یا اس کے بندوں کا ڈر اس کو ہم اعتقاد کہتے ہیں۔

چوتھا مرتبہ: متوجہ ہونے کا پختہ عزم کر لینا اور اس کی پکی نیت کر لینا اسے ہم دِلی عزم کہتے ہیں، خیال پر مواخذہ نہیں اسی طرح نفس کے میلان اور رغبت پیدا ہونے پر بھی مواخذہ نہیں کہ یہ دونوں بندے کے اختیار میں نہیں اور یہی دونوں مرتبے حضور ﷺ کے اس ارشاد: **ان الله تجاوز عن امتی......** میں ہیں۔

تیسرا درجہ جو اعتقاد ہے یہ اختیاری اور اضطراری ہونے کے درمیان دائر ہے اختیاری ہونا یہ ہے کہ اسے ناپسند نہ کر اور اضطراری یہ ہے کہ اسے دل سے ناپسند کرے اختیاری پر مواخذہ ہوگا اور اضطراری پر نہیں۔

چوتھا درجہ جو کسی کام کا عزم اور پختہ ارادہ ہے اس پر مواخذہ ہوگا اور وہ تمام آیات جو دل کے اعمال کے مواخذے پر دلالت کرتی ہیں اسی مرتبے پر محمول ہیں البتہ اگر اس گناہ کو اللہ کے ڈر سے چھوڑ دے تو اس کیلئے ایک نیکی لکھی جائے گی اس لئے کہ اس کا عزم گناہ ہے اور نفس کے مجاہدہ کے ساتھ اس سے باز رہنا گناہ سے بڑھ کر نیکی ہوگا اور اگر اس کا چھوڑنا کسی کی وجہ سے ہوا یا اس گناہ تک رسائی حاصل نہ کر پایا تو اس کے عزم و پختہ ارادہ کی وجہ سے گناہ لکھا جائے گا اس سلسلہ میں پکی دلیل حضور ﷺ کا

ارشاد ہے جو ایسی حدیث صحیح میں منقول ہے جس کی صحت پر اتفاق ہے "**اذا التقی المسلمان بسفیهما فالقاتل والمقتول فی النار قیل: یا رسول الله فما بال المقتول، قال: انه کان حریصا علی قتل صاحبه**" (جب دو مسلمان ایک دوسرے کے خلاف اپنی تلواریں سونت لیں تو قاتل ومقتول دونوں جہنمی ہیں عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول مقتول کا کیا قصور ہے؟ آپ (ﷺ) نے فرمایا: وہ اپنے ساتھی کے قتل پر حریص تھا)، یہ حدیث اس سلسلہ میں صریح ہے کہ اس کا جہنم میں جانا محض عزم اور نیت کی بناء پر تھا اگر چہ وہ مر گیا اور اس پر عمل نہ کر سکا اور ظلماً قتل ہوا دل کے یقینی اعمال پر کیونکر مواخذہ نہ ہوگا حالانکہ تکبر، عجب، نفاق، حسد اور دیگر اوصاف! ذمیمہ پر مواخذہ ہوگا (اور یہ سب افعال قلوب ہیں)۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "**الاثم ماحاك فی الصدر**" گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور آپ ﷺ نے فرمایا: (**البر ما اطمئن الیه القلب واطمانت الیه النفس والا ثم ماحاك فی نفسك وتردد فی صدرك وان أفتاك الناس**" اھ۔ (نیکی وہ ہے جس پر دل مطمئن ہو اور نفس کو اطمینان حاصل ہو، گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور جس کے بارے میں تیرے سینے میں تردد ہو اگر چہ لوگ تجھے اس کے بارے میں فتویٰ دے دیں) اھ۔

میں (ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کہتا ہوں: آخری حدیث سے استدلال قابلِ اشکال ہے اسلئے کہ اس حدیث میں بعینہٖ اس چیز کو جس کے بارے میں دِل میں تردد ہو گناہ قرار دیا ہے حالانکہ پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ جو بات دل میں مستقر نہ ہو گناہ نہیں ہوتی پس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کے بارے میں تردد ہو دل میں کہ یہ گناہ ہے کہ نہیں اس کا ارتکاب احتیاطاً گناہ ہے جیسا کہ کسی چیز کے متعلق دلیل محرم اور محلل میں تعارض ہو تو اسے حرام قرار دیا جاتا ہے بعض حضرات نے کہا: حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مذکورہ معافی اس اُمت کے خاص ہے اور جو توجیہہ صاحب الازھار نے الروضہ اور احیاء العلوم سے نقل کی ہے اس سے یہ لازم آتا ہے کہ یہ معافی تمام اُمتوں کے لئے عام ہے اسلئے کہ جو چیز اختیار میں داخل نہ ہو اس پر کسی آدمی کا مواخذہ نہیں ہوتا جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة: ٢٨٦] "اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں بناتے" چنانچہ صحیح بات علامہ طیبیؒ کی ہے کہ وسوسہ ایک اضطراری ہوتا ہے اور ایک اختیاری۔ اضطراری وہ ہے جو ابتدائی طور پر دل میں خیال آجائے اور انسان اس کو ہٹانے پر قادر نہ ہو یہ تمام اُمتوں سے معاف ہے۔

وسوسہ اختیاری وہ ہے جو دل میں آئے اور برقرار رہے اور اس کی بجا آوری کا مکمل ارادہ ہو اور اس سے لذات حاصل کرے جیسے کسی آدمی کے دل میں کسی عورت کی محبت گھر کر جائے اور وہ اس تک رسائی کا ارادہ کرلے اس قسم کے گناہ خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کی اُمت کی تعظیم وتکریم کے لیے معاف فرمائے ہیں اور یہی بات اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں بھی پیش نظر ہے: ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ [البقرة: ٢٨٦] "اے پروردگار! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیو جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا" جہاں تک عقائد فاسدہ برے اخلاق اور ان سے ملتے جلتے افعالِ بد کا تعلق ہے تو وہ دلوں میں پیدا ہونے والے وساوس میں داخل نہیں ہیں۔ اھ

یہ عمدہ کلام ہے اسی لئے نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشاد میں یہ قید لگائی: **ما لم تعمل او تتکلم**۔ جس میں اس بات کی

طرف اشارہ ہے کہ اعمال واقوال کے ارتکاب سے قبل وسوسہ معاف ہے وہ وسوسہ جس کا تعلق عمل اور کلام سے نہ ہو جیسے اخلاق اور عقائد، وہ دل میں جم جائیں تو گناہ ہیں۔ امام نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے قاضی ابوبکر بن طیب کا یہ مذہب ذکر فرمایا: جو آدمی معصیت کا عزم کرلے اور نفس کو اس پر تیار کرلے تو وہ اپنے اعتقاد وعزم میں گناہ گار ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس جیسے ارشاد: "اذا هم عبدی بسيئة فلا تكتبوا عليه فان عملها فاكتبوها سيئة" (حدیث قدسی ہے جس میرا بندہ کسی گناہ کا ارادہ کرے تو اسے اس کے خلاف نہ لکھو اور اگر عمل کرلے تو اس کا گناہ لکھ دو) اس شخص کے متعلق ہے جس نے اپنے نفس کو گناہ کے ارتکاب پر مکمل آمادہ نہیں کیا اور اس گناہ کا گزر اس کے دل میں بغیر استقرار کے ہوا اسے "هم" کا کہتے ہیں اور هم اور عزم میں فرق کیا جاتا ہے یہ قاضی ابوبکر کا مذہب ہے اور بہت سے فقہاء ومحدثین نے اس کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے ظاہر حدیث پر عمل کیا ہے۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں: عام سلف اور اہلِ علم فقہاء محدثین نے قاضی ابوبکر کے مذہب کو اختیار کیا ہے' ان احادیث کی بناء پر جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دلوں کے اعمال پر مواخذہ ہوگا البتہ وہ یہ کہتے ہیں کہ عزم گناہ لکھا جاتا ہے اور جس گناہ کا اس نے صرف ارادہ کیا وہ گناہ نہیں ہوتا کیونکہ اس پر اس کا عمل نہیں ہوا اور اللہ تعالیٰ کے خوف اور انابت کے علاوہ کوئی اور رکاوٹ اس کے آگے آگئی لیکن گناہ پر اصرار' عزم معصیت ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کے خوف اور اپنے نفس امارہ کے ساتھ مجاہدہ کرکے اسے چھوڑ دینا نیکی ہوگی۔

وہ "هم" جو گناہ نہیں لکھا جاتا وہ ایسے خیالات ہیں' جن پر نفس پورے طور پر تیار نہیں ہوتا اور نہ ان کے ساتھ کوئی عقد اور نہ نیت اور نہ ہی عزم ہوتا ہے، بعض متکلمین نے اس صورت میں اختلاف ذکر فرمایا ہے کہ جب گناہ کو اللہ تعالیٰ کے خوف سے نہیں بلکہ لوگوں کے خوف سے چھوڑا گیا ہو تو کیا وہ نیکی لکھا جاتا ہے؟ فرمایا: نہیں، اسلئے کہ اسے اس گناہ کے ترک پر لوگوں سے حیاء نے ابھارا ہے اور یہ اختلاف ضعیف ہے اس کی کوئی وجہ نہیں' یہ قاضی کی آخری بات ہے اور یہ بالکل واضح عمدہ بات ہے' جس پر اضافہ نہیں ہوسکتا اور نصوص شرع اس دلی عزم پر مواخذے کے بارے میں بالکل واضح ہیں جو دل میں پختہ ہو، اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾ [النور: ۱۹] "اور جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں بے حیائی (یعنی تہمت بدکاری کی خبر) پھیلے ان کو دنیا اور آخرت میں دکھ دینے والا عذاب ہوگا" اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ [الحجرات: ۱۲] بہت گمان کرنے سے احتراز کرو کہ بعض گمان گناہ ہیں۔"

اور اس سلسلے میں بہت سی آیات ہیں اور نصوص شرع اور اجماع علماء حسد رکھنے اور مسلمانوں کو حقیر جاننے اور ان کے بارے میں بُرائی چاہنے اور دیگر اس جیسے دلوں کے اعمال اور ان کے عزم کا حرام ہونا واضح ہے اور تحقیق جس ارادے کا عمل سے تعلق ہے اور جس کا نہیں ہے ان کے درمیان فرق پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم

بعض حضرات فرماتے ہیں: حرم مکہ میں گناہ کے ارادہ پر پکڑ ہوگی اور اس کے علاوہ میں نہیں ہوگی اور یہ روایت امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿وَمَنْ یُّرِدْ فِیْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ﴾

[الحج: ۲۵] ''اور جو اس میں شرارت سے کجروی (وکفر) کرنا چاہے'' کی بناء پر اسی کے قائل ہیں لیکن اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ ارادہ قصد کو کہتے ہیں اور قصد وہ عزم ہے جو ''ھم'' سے اخص ہے۔

تخریج: جامع صغیر میں ہے: اسے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک جماعت نے ان الفاظ سے روایت کیا: ''ان اللہ تجاوز لأمتی عما حدثت به انفسها مالم تتکلم او تعمل به''۔

صریح ایمان کی علامت

۶۴: وَعَنْهُ قَالَ جَاءَ نَاسٌ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلُوْهُ اِنَّا نَجِدُ فِيْ اَنْفُسِنَا مَا يَتَعَاظَمُ اَحَدُنَا اَنْ يَّتَكَلَّمَ بِهٖ قَالَ اَوَقَدْ وَجَدْ تُمُوْهُ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ ذَاكَ صَرِيْحُ الْاِيْمَانِ ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۱۱۹ حديث رقم (۲۰۹-۱۳۲)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ کے چند صحابہ کرام آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے اور پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ہم اپنے دلوں میں کچھ ایسے وسوسے اور خیالات پاتے ہیں جن کا زبانوں پر لانا بھی ہمارے لئے انتہائی برا ہے رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ فی الواقع تم ایسی کیفیت پاتے ہو؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ہم ایسی کیفیت ضرور پاتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ تو واضح وصریح ایمان کی علامت ہے۔

تشریح: قوله: انا نجد فی انفسنا ما یتعاظم احدنا ان یتکلم به:

''انا نجد:'' یہ جملہ موضع حال کے موقع پر واقع ہے یعنی درانحالیکہ وہ کہنے والے تھے، ہمزہ کے فتحہ اور کسرہ کے احتمال پر بعض حضرات کہتے ہیں: فتحہ کی صورت میں فسالوہ کا مفعول ثانی ہے کسرہ کا احتمال زیادہ راجح ہے تاکہ مسئول عنہ کا بیان واضح ہو سکے اور وہ مجمل ہے اس کی تفسیر آنے والی دو حدیثوں میں آئے گی۔

یعنی ہمیں اپنے دلوں میں بُرے بُرے خیالات محسوس ہوتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا؟ وہ کس حالت میں ہے؟ وہ کس چیز سے بنا؟ اور اس جیسے خیالات جن کا زبان پر لانا ہم بہت بڑا سمجھتے ہیں اسلئے کہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ سب بُری باتیں ہیں جن میں سے کوئی بات بھی قابلِ اعتقاد نہیں ہے ہمیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ قدیم ہیں ساری چیزوں کے خالق ہیں مخلوق نہیں پس ان خیالات کا ہمارے دلوں میں آنے کا کیا حکم ہے؟ ''تعاظم'' باب تفاعل سے مبالغے کے معنی میں ہے اسلئے کہ حروف کی زیادتی معنی کی زیادتی کے لیے آتی ہے اسلئے کہ ایک ہی فعل جب دو کے درمیان مشترک ہو تو اس کا استعمال اس فعل کی بنسبت جو ایک ہی کے لیے استعمال ہو زیادہ دشوار ہوتا ہے اسی وجہ سے بعض حضرات نے کہا: مفاعلہ جب مبالغہ کے لیے نہ ہو تو بھی وہ مبالغہ کے لیے ہے (تو مطلب ما یتعاظم احدنا کا یہ ہے) ہم اسے بہت بڑا سمجھتے ہیں۔ ''احدنا'' دال کے رفع کے ساتھ مروی ہے اور مطلب اس کا یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک اس چیز کے تکلم کو اس کے قبیح ہونے کی وجہ سے بہت بڑا سمجھتا ہے

اور نصب بوجہ نزع خافض کے بھی درست ہے یعنی ہم میں سے ایک پر اس کا تکلم بڑا دشوار ہوتا ہے۔

قولہ: قال: او قد وجدتموہ:

"أو" ہمزہ استفہام تقریری کے لیے ہے اور اس کے ساتھ واؤ جو ملا ہوا ہے وہ تقدیری عبارت پر عطف کے لیے ہے مطلب یہ ہے: "أحصل ذلك وقد وجدتموه" اور ضمیر ما يتعاظم کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی وہ خیال تمہارے دلوں میں پختہ و مضبوط ہے لہٰذا وجدان بمعنی مصادفہ کے ہے یا مطلب یہ ہے أحصل ذلك الخاطر القبيح و علمتم أن ذلك مذموم غير مرضي کہ کیا یہ برا خیال تمہیں آتا ہے حالانکہ تم جانتے ہو کہ یہ مذموم و ناپسندیدہ ہے تو وجدان بمعنی علم کے ہے۔

قولہ: قال: ذلك صريح الايمان:

وجد مصدر کی طرف اشارہ ہے یعنی اس خیال کو تمہارا قبیح سمجھنا یا يتعاظم کے مصدر کی طرف اشارہ ہے یعنی ان وساوس کے فاسد ہونے کا تمہیں علم ہونا اور اپنے آپ کو بچانا اور اس کو زبان پر نہ لانا۔

یعنی خالص ایمان، مطلب یہ ہے کہ یہ ایسی علامت ہے جو صراحتاً اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ایمان تمہارے دلوں میں راسخ ہو چکا ہے اور وہ تشبیہ و تعلیل سے بالکل خالص ہے اسلئے کہ کافر اس بات پر مصر ہوتا جو اس کے دِل میں ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات کے مشابہ ہے اور اسے وہ اچھا سمجھتا ہے اور جو شخص اس کو قبیح سمجھتا ہے اور اسے قبیح جاننے کی بناء پر ناگوار جانتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں سمجھتا تو وہ پکا سچا مؤمن ہے اسے کوئی شبہہ متزلزل نہیں کرتا اگر چہ وہ قوی ہو اور اس کے دل کی گہرائی میں کوئی شک نہیں گزرتا اگر چہ وہ مزین ہو کر آئے حالانکہ جس کے ایمان میں آمیزش ہو وہ وسوسہ کو قبول کرتا ہے اور اسے ردّ نہیں کرتا۔ بعض حضرات نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ وسوسہ ایمان کی نشانی ہے کیونکہ چور خالی گھر میں داخل نہیں ہوتا اسی لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ نماز جس میں وسوسہ نہ ہو وہ یہود و نصاریٰ کی نماز ہے۔

ایک شیطانی وسوسہ

۶۵: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْتِي الشَّيْطَانُ اَحَدَكُمْ فَيَقُوْلُ مَنْ خَلَقَ كَذَا؟ مَنْ خَلَقَ كَذَا؟ حَتّٰى يَقُوْلَ مَنْ خَلَقَ رَبَّكَ؟ فَإِذَا بَلَغَهُ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ وَلْيَنْتَهِ۔ (متفق علیه)

البخاري في صحيحه ٦/٣٣٦ حديث رقم ٣٢٧٦۔ ومسلم في صحيحه ١/١٢٠ حديث (٢١٤۔١٣٤)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے بعض انسانوں کے پاس شیطان آتا ہے اور آ کر یہ کہتا ہے کہ فلاں اور فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اور اس چیز کو کس نے پیدا کیا؟ یہاں تک کہ پھر وہ یہ کہتا ہے کہ تیرے پروردگار کو کس نے پیدا کیا؟ جب وساوس کا سلسلہ یہاں تک پہنچ جائے تو اس آدمی کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگے اور وسوسہ کے سلسلہ کو ختم کر دے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قولہ: يأتي الشيطان...... من خلق ربك؟:

یعنی زمین وغیرہ کو اور اس کا مقصد اسے دھوکے اور کفر میں مبتلا ہوتا ہے، اور اس جیسے سوالات بکثرت کرتا ہے حتیٰ کہ وہ کہتا

ہے کہ تیرے پروردگار کو کس نے پیدا کیا؟ حالانکہ کہ وہ قدیم' ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے۔

قولہ: فاذا بلغہ فلیستعذ باللہ ولینتہ:

"**بلغہ**" ضمیر فاعل کے مرجع میں دو احتمال ہیں: فاعل کی ضمیر "**احدکم**" اور مفعول کی ضمیر یقول کے مصدر کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی **او ذا بلغ احدکم ھذا القول** یعنی **من خلق ربك** یا تقدیر عبارت یہ ہے: **بلغ الشیطان ھذا القول**)۔

جب بات اس جگہ پہنچ جائے تو اس کو چاہئے کہ شیطان کو بھگانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرے اور اس سلسلہ کو ذہن و دماغ سے جھٹک دے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ﴾ [الحجر: ٤٠] "ہاں ان میں جو تیرے مخلص بندے ہیں (ان پر قابو چلنا مشکل ہے)" کی طرف اشارہ ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرمان: "**لا حول ولا قوۃ الا باللہ**" کی اشارہ ہے کیونکہ بندہ اپنی قوت وطاقت سے شیطان کے ساتھ جھگڑنے اور غلبہ حاصل کرنے کی قوت نہیں رکھتا، پس اپنے مولیٰ سے التجا کرے اور اللہ تعالیٰ کی اس شیطان کے مقابلے میں مدد مانگے جس نے یہ خیال اس کے دل میں ڈالا جس سے بدتر کوئی خیال نہیں ہوسکتا، پس اپنی زبان سے وہ کہتا ہے: **اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم** شیطان کے شر اور مکر کے دور کرنے کے لیے اپنے دل سے آنجناب کی پناہ مانگتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کرم کے ساتھ وہ اس (شیطان) سے زیادہ ضعیف ہے نہ ذلیل کیونکہ وہ دروازے پر کھڑے کُتے کے مثل ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا﴾ [النساء: ٧٦] "کیونکہ شیطان کا داؤ بود ہوتا ہے" یعنی اللہ تعالیٰ کی قوت کی طرف نسبت کرتے ہوئے، پس یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کے فرمان جو بطور حکایت ذکر فرمایا ﴿اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ﴾ [یوسف: ٢٨] "اور کچھ شک نہیں کہ تم عورتوں کے فریب بڑے بھاری ہوتے ہیں" کے منافی نہیں ہے۔

"**ولینتہ**": لام ساکن ہے اور مکسورہ بھی ہوتا ہے یعنی اس خیال میں غور وفکر کرنا چھوڑ کر کسی دوسرے کام میں وہ مشغول ہو جائے تاکہ شیطان اس پر غالب نہ آئے' کیونکہ اس نے یہ خیال اس کے دل میں پختہ ہونے اور ٹھہر جانے کی امید سے ڈالا ہے تو اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے حادث ہونے سے پاکی میں شک وشبہ آ جائے گا اگرچہ وہ کتنا دقیق اور مخفی کیوں نہ ہو پس جو آدمی ہوشیار ہو جائے اور اس خیال کو بے لگام ہونے سے روک دے اور اپنے آپ کو کسی دوسرے کام میں مصروف کر دے یہاں تک کہ اس سے توجہ ہٹ جائے تو وہ نجات پا جائے گا اور جو ایسا نہیں کرے گا وہ شک میں مبتلا ہو جائے گا پھر اس کے بارے میں اندیشہ ہ کہ راہِ راست سے بھٹک کر جہنم کے گڑھے میں گر جائے گا اور اسے ان دو باتوں (استعاذہ اور رُک جانا) کا حکم دیا گیا اسے اس کے خلاف دلیل پکڑ لے اور غور وفکر کرنے کا حکم دو وجہوں سے نہیں دیا: ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں مؤثر اور موجد سے مستغنی ہونے کا علم بدیہی ہے جو دلیل کو قبول نہیں کرتا یہ چیز محض شیطان دل میں ڈالتا ہے تاکہ اس سے اگر آپ مجادلہ کریں تو وہ آپ پر غالب آ جائے اس لیے کہ دِلوں میں وساوس ڈالنے کے لحاظ سے وہ غالب ہے تاکہ دِلوں کے ایمان کو جانچا جائے اور اس کے وساوس لامتناہی ہیں چنانچہ جب آپ ایک طریقے سے اس کی دلیل کو توڑیں گے تو وہ دوسرے راستے سے

مغالطہ اور شک ڈال دے گا یا آپ کا وقت ضائع کر لے اور اگر آپ اسے چھوڑ دیں تو وہ آپ کی زندگی بدمزہ کر دے گا' اگر آپ اس پر دلیل میں غالب آجائیں تو بھی آپ کے لیے اس کے علاوہ کوئی راہِ نجات نہیں کہ آپ اس سے مکمل طور پر اعراض کریں اور اس سے پناہ مانگتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آجائیں جیسا کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ [الاعراف: ۲۰۰] ''اور اگر شیطان کی طرف سے تمہارے دل میں کسی طرح کا وسوسہ پیدا ہو تو خدا سے پناہ مانگو بیشک وہ سننے والا (اور) سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عام طور پر یہ خیالات نفس کی سستی اور اس کے مطلوبہ اہم امور میں مشغول ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں تو ان میں غور وفکر اسے سوائے حق سے دور کرنے کے کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا چنانچہ اس کا علاج اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قوت وطاقت سے پناہ حاصل کی جائے اور کتاب اللہ وسنتِ رسول اللہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو مضبوطی سے تھاما جائے۔

علامہ خطابی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر رسول اللہ ﷺ شیطان کے خلاف دلائل قائم کرنے کی اجازت مرحمت فرماتے تو ہر موحد کے لیے جواب آسان ہوتا اس طرح کہ وہ قطعی دلائل ابطال تسلسل دمیرہ کے ذریعہ سے ثابت کر لیتا کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی خالق نہیں جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ تمام مخلوقات اسم خلق کے تحت داخل ہیں تو اگر یہ کہنا درست ہوتا کہ خالق کا پیدا کرنے والا کون ہے تو یہ سلسلہ لامتناہی ہو جاتا، اور یہ قطعاً باطل ہے (اور جو مستلزم باطل ہو وہ خود باطل ہے)۔

فوائد حدیث: اس حدیث مبارک سے علم کلام کی مذمت اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے متعلق نامناسب بحث مباحثہ اور جھگڑنے کی حرمت کا پتہ بھی چلتا ہے، اور اس مقلد کا ایمان صحیح ہونے کی جانب اشارہ بھی ہے۔

تصورات کی حدود

۶۶: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايَزَالُ النَّاسُ يَتَسَآءَلُوْنَ حَتّٰى يُقَالَ هٰذَا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ فَمَنْ وَجَدَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَلْيَقُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ . (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

الحديث ليس موجود في صحيح البخاري إنما الموجود رواية أنس لن يبرح الناس يتساء لون حتى يقولوا' هذا الله خالق كل شئ فمن خلق الله حديث رقم ۷۲۹۶۔ وأخرجه مسلم في صحيحه ۱۱۹/۱ حديث رقم (۲۱۲۔ ۱۳٤)۔ وأبو داوٗد في سننه ۹۱/۵ حديث رقم ٤۷۲۱ وأحمد في المسند ۲۸۲/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے یہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگ ہمیشہ اپنے دل میں مخلوق وغیرہ کے متعلق خیالات اور تصورات کرتے رہیں گے یہاں تک کہ کہا جائے گا یعنی دل ودماغ میں یہ خیال آئے گا کہ اس تمام مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ پس جس انسان کے دل ودماغ میں یہ وسوسہ پیدا ہو تو وہ فوراً یہ کہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لایا۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: لا يزال الناس يتساء لون:

یعنی ایک دوسرے سے علوم وموجودات کے بارے میں دریافت کریں گے، تساء ل دو یا زیادہ کے درمیان سوال جواب

ہونے کو کہتے ہیں، ممکن ہے یہ پوچھ گچھ بندے اور شیطان یا نفس یا کسی دوسرے انسان کے درمیان ہو، یعنی دونوں میں سے ہر ایک نوع کا سوال چل سکتا ہے۔

قوله: يقال: هذا خلق الله الخلق، فمن خلق الله؟: بعض حضرات نے فرمایا کہ **هذا** کا لفظ اپنے محذوف عطف بیان جو کہ مقولہ ہے **يقال** کا مفعول قائم مقام فاعل ہے اور **خلق الله هذا** کی تفسیر، بیان یا بدل ہے۔

بعض حضرات نے کہا: **هذا** مبتداء ہے اور اس کی خبر محذوف ہے یعنی **هذا القول** یا **قولك هذا خلق الله الخلق معلوم مشهور فمن خلق الله؟** اور جملہ **يقال** کا قائم مقام فاعل ہے۔

قوله: فمن وجد من ذلك شيئا فليقل: أمنت بالله ورسله:

''**ذلك**'' میں قولِ مذکور کی طرف اشارہ ہے **من ذلك شيئاً** سے حال ہے۔

یعنی جو اپنے دل میں اس جیسی بات محسوس کرے۔ **امنت**: یعنی میں اس بات پر ایمان لایا ہوں جو اللہ اور اس کے رسولوں نے اس کی صفات توحید اور قدیم ہونا بیان فرمایا ہے' اللہ کا ارشاد اور اس کے پیغمبروں کا اجماع وہی سچ اور حق ہے، پس حق کے بعد سوائے گمراہی کے کیا ہوتا ہے؟ پھر یہ قول ممکن ہے کہ علم و تحقیق کی بناء پر ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ تقلید کے طور پر ہو۔ اس مقام پر مجھے واضح طور پر یہی سمجھ میں آیا۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کی پیروی میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ کہنا کہ ''**من خلق الله؟** یہ کفریہ بات ہے جو یہ کہہ دے تو اس کا تدارک کا ایمان (**امنت بالله ورسله**) سے کر لے اس کے مراد ہونے میں صریح اشکال ہے' اسلئے کہ یہ بات ایسے سائل کی طرف سے جس کا تعلق شیاطین انس یا تغلیباً شیاطین الجن سے نہیں ہو سکتی' جیسا کہ حدیث سابق اس کی مؤید ہے اور مسئول بھی یہ نہیں کہہ سکتا کیونکہ وہ صریح مؤمن ہے، نیز اس حدیث میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد ''**فليقل**'' مسئول کی نسبت سے ایسا ہی ہے جیسا آپ ﷺ کا ارشاد ''**فليستعذ**'' حدیث سابق میں ہے واللہ اعلم۔ اسی لئے بعض حضرات نے فرمایا کہ مسنون اس کے لیے پہلے استعاذہ پھر یہ کہنا ہے، **أمنت الله ورسله**۔

تخریج: ابن ابی الدنیا نے اس حدیث کو حضرت عبداللہ عمر رضی اللہ عنہ سے نقل فرمایا اور اس کے آخر میں یہ اضافہ بھی فرمایا: **فان ذلك يذهب عنه**۔

اور مسلم نے اس حدیث کو اسی سیاق میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی روایت فرمایا، اور ان کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''**حتى يقال: هذا الله خلق الخلق**''۔

اسی طرح امام بخاری نے بھی اپنی کتاب میں اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل فرمایا ہے۔

اس سیاق وسباق کی رُو سے حدیث کی ذکر کردہ توجیہات کے علاوہ دیگر کا بھی احتمال ہے کہ **هذا الله** مبتدا اور خبر ہو یا ہذا مبتدا اللہ عطف بیان اور خلق الخلق مبتدا کی خبر اکثر رواۃِ حدیث نے اس حدیث کو اسی سیاق سے روایت کیا ہے اس لحاظ سے مصابیح میں ذکر کردہ روایت کی بنسبت یہ روایت راجح ہے اور ہر دو طریقِ روایت صحاح میں سے ہیں۔

ہر انسان کے ساتھ ایک جن اور ایک فرشتہ

۶۷ :وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ وُكِّلَ بِهٖ قَرِيْنُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَقَرِيْنُهٗ مِنَ الْمَلٰئِكَةِ قَالُوْا وَاِيَّاكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَاِيَّايَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَعَانَنِيْ عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ فَلَا يَاْمُرُنِيْ اِلَّا بِخَيْرٍ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/٢١٦٧ حديث ٦٩۔ والدارمي في سننه ٢/٣٩٦ حديث رقم ٢٧٣٤ وأحمد في المسند ١/٣٨٥۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی آدمی ایسا نہیں ہے کہ جس کا ایک ساتھی جنوں میں سے اور ایک ساتھی فرشتوں میں سے مقرر نہ کیا گیا ہو صحابہ کرام نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ! کیا آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہاں میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس جن سے مقابلہ کرنے کی مدد دے رکھی ہے اس لئے میں اس کے مکر و فریب اور ضلالت سے سلامتی میں رہتا ہوں بلکہ یہاں تک کہ وہ بھی مجھے نیکی کا مشورہ دیتا ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله : قال :قال رسول الله ﷺ :ما منكم من أحد:

ہر انسان کے ساتھ دو ساتھی ہوتے ہیں ایک جنات یعنی شیطانوں میں سے اور دوسرا ملائکہ میں سے۔ فرشتہ نیکی بھلائی خیر اور اعمال صالحہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور انسان کے دل و دماغ میں اچھے اچھے خیالات ڈالتا ہے اور اس کا نام ملہم ہے اور شیطان انسان کو اعمال سیئہ پر لگا دیتا ہے اور انسان کے دل و دماغ میں فاسد خیالات، برے تصورات اور وساوس ڈالتا ہے معصیت اور نافرمانی کا جذبہ پیدا کرتا ہے اس کا نام وسواس ہے۔

شیطان انسانی رگوں میں

۶۸ :وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ . (متفق عليه)

البخاري أخرجه عن صفية بنت حيي زوجة الرسول ٦/٣٣٦ حديث ٣٢٨١ وهي الرواية التي اتفق عليها الشيخان ۔ورواية أنس أخرجه مسلم ٤/١٧١٢ حديث رقم ٢٣۔ وأخرجه أبوداوٗد في سننه ٢/٨٣٤ حديث ٢٤٧٠ ۔وأخرجه ابن ماجة في سننه ١/٥٦٦ حديث رقم ١٧٧٩ وأحمد في مسنده ٣/١٥٦۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی کے اندر شیطان اس طرح گردش کرتا ہے۔ جس طرح رگوں میں خون گردش کرتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان کی رگوں میں شیطان گردش کرتا رہتا ہے مراد اس سے یہ ہے کہ

شیطان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو قوت عطا کی گئی ہے اس کی وجہ سے اس کو انسان کے گمراہ کرنے پر مکمل قدرت حاصل ہے اور اس قدرت کا انحصار صرف ظاہری قدرت اور تصرف پر نہیں کہ ابلیس انسان کو اعمال صالحہ اور خیر کے امور سے ظاہری طور پر رکاوٹیں ڈال سکتا ہے کہ نیک لوگوں کو صراط مستقیم سے دور کر دیتا ہے۔ بلکہ شیطان کو من جانب اللہ ایسی قدرت اور استطاعت بھی میسر ہے کہ وہ داخلی اور باطنی طور پر انسان کے اندر گھس کر دل و دماغ کو وساوس اور خیالات فاسدہ سے خراب کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے اور اس اثر کو مجری الدم کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ بعض علماء کے نزدیک یہ تشبیہ ہے اور مجاز پر محمول ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ شیطان وہاں تک وساوس ڈالتا ہے جہاں تک خون انسان کے جسم میں سرایت کرتا ہے اور بعض علماء کے نزدیک یہ معنی حقیقی پر محمول ہے معنی یہ ہوگا کہ شیطان انسان کے اندر گھس کر دوڑتا ہے جہاں تک خون چلتا ہے۔

بوقتِ پیدائش شیطانی حملہ

۶۹ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ بَنِيْ آدَمَ مَوْلُوْدٌ اِلَّا يَمَسُّهُ الشَّيْطَانُ حِيْنَ يُوْلَدُ فَيَسْتَهِلُّ صَارِخًا مِنْ مَسِّ الشَّيْطَانِ غَيْرَ مَرْيَمَ وَابْنِهَا ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٤٦٩/٦ حديث رقم ٣٤٣١ ۔ ومسلم في صحيحه ١٨٣٨/٤ حديث رقم ١٣٦ ۔ وأحمد في المسند ٢٣٣/٢ ۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بنی آدم کے ہاں جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تو شیطان اس کو مس کرتا ہے یعنی چھوتا ہے جس کی وجہ سے بچہ چیخ مارتا ہے لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت مریم کو شیطان نے نہیں چھوا۔ (بخاری و مسلم)

شیطان کی ٹھونگ سے بچے کی چیخ وپکار

۷۰ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صِيَاحُ الْمَوْلُوْدِ حِيْنَ يَقَعُ نَزْغَةٌ مِنَ الشَّيْطَانِ . (متفق علیه)

أخرجه مسلم في صحيحه ١٨٣٨/٤ حديث ١٤٨ ۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ولادت کے وقت بچہ اس لئے چیخ مارتا ہے کہ شیطان اس کو ٹھونگ مارتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

ابلیس کا تخت

۷۱ : وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اِبْلِيْسَ يَضَعُ عَرْشَهُ عَلَى الْمَآءِ ثُمَّ يَبْعَثُ سَرَايَاهُ يَفْتِنُوْنَ النَّاسَ فَاَدْنَاهُمْ مِنْهُ مَنْزِلَةً اَعْظَمُهُمْ فِتْنَةً يَجِيْءُ اَحَدُهُمْ فَيَقُوْلُ فَعَلْتُ كَذَا وَكَذَا فَيَقُوْلُ مَا صَنَعْتَ شَيْئًا قَالَ ثُمَّ يَجِيْءُ اَحَدُهُمْ فَيَقُوْلُ مَا تَرَكْتُهُ حَتّٰى فَرَّقْتُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ اِمْرَاَتِهٖ

قَالَ فَيُدْنِيهِ مِنْهُ وَيَقُولُ نِعْمَ أَنْتَ قَالَ الْأَعْمَشُ أُرَاهُ قَالَ فَيَلْتَزِمُهُ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/٢١٦٧ حديث ٦٧ وأحمد في مسنده ٣/٣١٤۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان اپنی حکمرانی کا تخت سمندر پر رکھتا ہے پھر وہاں سے اپنے لشکروں اور جماعتوں کو روانہ کرتا ہے تاکہ لوگوں کو فتنہ فساد اور ضلالت میں ڈال دیں' اس کے لشکروں میں شیطان کا سب سے زیادہ مقرب وہ ہے جو مخلوق میں سب سے بڑا فتنہ اور فساد ڈالے ان میں سے ایک واپس آ کر اپنی کارگزاری سناتے ہوئے کہتا ہے کہ میں نے فلاں اور فلاں فتنے پیدا کیے' شیطان اس کے جواب میں کہتا ہے تو نے کچھ نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ پھر ان میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے ایک آدمی کو گمراہ کرنا شروع کیا اور اس کے تعاقب میں رہا یہاں تک کہ اسکے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈلوادی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان یہ کارگذاری سن کر اس کو اپنے قریب بٹھالیتا ہے اور شاباش دیتے ہوئے کہتا ہے کہ تو نے بہت اچھا کام کیا۔ حدیث کے راوی حضرت اعمشؒ فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے حضرت جابرؓ نے فيدنيه کے بجائے فيلتزمه فرمایا کہ شیطان یہ سن کر اس کو اپنے گلے سے لگالیتا ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: شیطان کا محبوب اور پسندیدہ کام خاوند اور بیوی کے درمیان جدائی ڈالنا ہے اس حدیث میں يَضَعُ عَرْشَهُ عَلَى الْمَاءِ کہ شیطان اپنی حکومت کا تخت سمندر پر رکھتا ہے بعض علماء نے اس کو مجاز پر محمول کیا ہے کہ اس سے مراد شیطان کا تسلط اور غلبہ ہے اور بعض دیگر علماء کے نزدیک اپنے ظاہر اور حقیقت پر محمول ہے کہ شیطان فی الواقع اپنا تخت سلطانی سمندر پر رکھتا ہے اور پھر اپنی ذریت اور کارندوں کو فتنہ اور فساد کی کارروائیوں کے لئے روانہ کرتا ہے اور جب اس کی اولاد اور کارندے واپس آ کر اپنی اپنی کارگذاریاں سناتے ہیں تو سب سے زیادہ اس کی کارگذاری پر خوش ہوتا ہے کہ جو خاوند اور بیوی کے درمیان فتنہ، فساد، لڑائی اور جدائی ڈال دے کیونکہ میاں اور بیوی کے باہم تنازع سے غیظ و غضب اور غفلت میں ایسے جملے صادر ہو جاتے ہیں کہ بیوی کے لئے طلاق بائن کو مستلزم ہوں اور طلاق بائن کی صورت میں بیوی اپنے خاوند پر حرام ہو جاتی ہے اور اس سے شیطان کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ خاوند اپنی حماقت اور جہالت کی وجہ سے عورت کو اپنی منکوحہ اور بیوی سمجھتا ہے اور وظیفہ زوجیت اس سے بدستور جاری وساری رکھتا ہے۔ جب کہ حقیقت میں یہ فعل حرام ہوتا ہے اور اس فعل حرام کے نتیجہ میں ناجائز اور حرام کی اولاد پیدا ہوتی ہے جس سے روز بروز حرام زادوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ایسے لوگ پھر دنیا میں فسق و فجور، گناہ، معصیت، فتنہ، فساد اور شر انگیزی کا کارنامہ سرانجام دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں روئے زمین پر فساد اور فتنہ عام ہو جاتا ہے امن اور سکون ختم ہو جاتا ہے۔

شیطان کی اُمید اور نا اُمیدی

۷۲: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ أَيِسَ مِنْ أَنْ يَعْبُدَهُ الْمُصَلُّونَ فِي جَزِيرَةِ الْعَرَبِ وَلٰكِنْ فِي التَّحْرِيشِ بَيْنَهُمْ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/٢١٦٦ حديث ٦٥۔ والترمذي ٤/٢٩١ حديث رقم ١٩٣٧ وأحمد في المسند ٣/٣١٣۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے یہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابلیس اس بات سے تو ناامید ہو گیا کہ جزیرہ عرب میں نماز پڑھنے والے اس کی عبادت کریں لیکن ان کے درمیان فتنہ فساد اور لڑائی جھگڑا ڈالنے سے ناامید نہیں ہوا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

الفصل الثانی:

شیطانی وسوسے سے حفاظت پر شکر خداوندی

۷۳: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَآءَہٗ رَجُلٌ فَقَالَ اِنِّیْ اُحَدِّثُ نَفْسِیْ بِالشَّیْءِ لَاَنْ اَکُوْنَ حُمَمَۃً اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اَتَکَلَّمَ بِہٖ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ رَدَّ اَمْرَہٗ اِلَی الْوَسْوَسَۃِ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد في سننه ۵/۳۳۶حديث رقم ۵۱۱۲وفيه زيادة ثلاث تكبيرات قبل "الحمد لله" وأحمد في المسند ۱/۳۴۰۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک آدمی حاضر ہوا اور عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ! میں اپنے اندر ایک ایسا برا خیال اور وسوسہ پاتا ہوں کہ زبان سے اس کا اظہار کرنے کے بجائے جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے زیادہ محبوب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ جس نے اس برے خیال کو وسوسہ کی حد تک رکھا۔ اس حدیث میں کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

شیطانی وسوسے اور فرشتے کی ترغیب میں فرق

۷۴: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلشَّیْطَانِ لَمَّۃً بِابْنِ اٰدَمَ وَلِلْمَلَکِ لَمَّۃً فَاَمَّا لَمَّۃُ الشَّیْطَانِ فَاِیْعَادٌ بِالشَّرِّ وَتَکْذِیْبٌ بِالْحَقِّ وَاَمَّا لَمَّۃُ الْمَلَکِ فَاِیْعَادٌ بِالْخَیْرِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْحَقِّ فَمَنْ وَجَدَ ذٰلِکَ فَلْیَعْلَمْ اَنَّہٗ مِنَ اللّٰہِ فَلْیَحْمَدِ اللّٰہَ وَمَنْ وَجَدَ الْاُخْرٰی فَلْیَتَعَوَّذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ثُمَّ قَرَاَ اَلشَّیْطَانُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ۔ (البقرہ ۲۶۸) (رواہ الترمذی وقال هذا حدیث غریب)

أخرجه الترمذي ۵/۲۰۴حديث رقم ۲۹۸۸۔

ترجمہ: "اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ حقیقت ہے کہ ہر انسان پر ایک تصرف شیطان کا اور ایک تصرف فرشتہ کا ہوا کرتا ہے شیطانی تصرف یہ ہے کہ وہ برائی پر ابھارتا ہے اور حق کو جھٹلاتا ہے اور فرشتہ کا تصرف یہ ہے کہ وہ نیکی پر ابھارتا ہے اور حق کی تصدیق کرتا ہے لہٰذا جو شخص اپنے اندر یہ کیفیت محسوس کرے تو اس کو سمجھنا چاہئے کہ یہ منجانب اللہ ہے اس پر اس کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے اور جو شخص دوسری کیفیت (شیطانی وسوسہ اندازی)

اپنے اندر محسوس کرے تو اس کو چاہئے کہ شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگے پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اور گناہ کے لئے اکساتا ہے۔" (اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا اور کہا کہ یہ حدیث غریب ہے)۔

تشریح: فرشتہ کے ابھارنے کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ نیکی کی قدر و قیمت اور اس پر ملنے والے اجر و انعام کی کشش آشکارا کرتا ہے اور انسان کے لاشعور میں یہ بات ڈال دیتا ہے کہ اللہ کا سچا دین ہی انسانیت کی بقاو ترقی کا ضامن ہے اللہ کے رسول ﷺ جو شریعت لے کر مبعوث ہوئے اسی میں بنی آدم کی دونوں جہان کی نجات پوشیدہ ہے۔ اگر اپنی فلاح و نجات چاہتے ہو تو برائی کے راستہ سے بچو اور نیکی کے راستہ کو مضبوطی سے تھام لو۔

وسوسے کا علاج

۷۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَزَالُ النَّاسُ یَتَسَآءَ لُوْنَ حَتّٰی یُقَالَ هٰذَا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ فَاِذَا قَالُوْا ذٰلِكَ فَقُوْلُوْا اللّٰهُ اَحَدٌ اللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ثُمَّ لِیَتْفُلْ عَنْ یَّسَارِهٖ ثَلَاثًا وَّلْیَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَسَنَذْكُرُ حَدِیْثَ عَمْرِو بْنِ الْاَحْوَصِ فِیْ بَابِ خُطْبَةِ یَوْمِ النَّحْرِ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی۔

أخرجه أبو داوٗدفی سننه ۵/۹۲ حدیث رقم ۴۷۲۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگ پہلے مخلوق کے متعلق پوچھ گچھ کرینگے اور پھر آخر میں یہ تصور خیال اور سوال پیدا ہوگا کہ تمام مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو خود اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ جب یہ سوال کیا جائے تو تم کہو اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس سے کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے اور اس کا کوئی ہمسر اور مثل نہیں اور پھر اپنی بائیں طرف تین بار تھوک دو اور شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگو۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ عمرو ابن احوص کی حدیث کو ہم خطبہ یوم النحر کے باب میں نقل کرینگے ان شاء اللہ تعالیٰ کیونکہ وہ روایت اسی باب کے مضمون اور موضوع سے متعلق ہے۔

تشریح: تکرار سے بچنے کی خاطر خطبہ یوم النحر میں شرح بیان کر دی گئی ہے، مرتب۔

شیطانی وساوس کی حد

۷۶: عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَنْ یَّبْرَحَ النَّاسُ یَتَسَآءَ لُوْنَ حَتّٰی یَقُوْلُوْا هٰذَا اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ وَلِمُسْلِمٍ قَالَ قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِنَّ اُمَّتَكَ لَا یَزَالُوْنَ یَقُوْلُوْنَ مَا كَذَا مَا كَذَا حَتّٰی یَقُوْلُوْا هٰذَا اللّٰهُ خَلَقَ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ ۔

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۳/۲۶۵ حدیث رقم ۷۲۹۶۔ ومسلم ۱/۱۲۱ حدیث (۲۱۷۔۱۳۶)۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگ ہمیشہ آپس میں پوچھ گچھ یعنی

سوال کرتے رہیں گے یعنی شیطانی وساوس کی شکل میں ان کے اندر اس طرح کے فاسد خیالات پیدا ہوتے رہیں گے کہ جب ہر چیز کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے۔ بخاری کی روایت اسی طرح ہے اور مسلم شریف میں اس طرح ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آپ کی امت کے لوگ اگر شیطان کے وساوس سے ہوشیار نہ رہے تو پہلے یوں کہیں گے یہ کیا ہے؟ اور یہ کیسے ہوا؟ یعنی مخلوقات کے متعلق آپس میں گفتگو اور تفتیش کرینگے اور پھر آخر میں یوں کہیں گے کہ سب اشیاء کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو اللہ عزوجل کو کس نے پیدا کیا ہے؟

خنزب شیطان سے نجات کی صورت

۷۷ : وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ اَبِی الْعَاصِ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ الشَّیْطَانَ قَدْ حَالَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ صَلَاتِیْ وَبَیْنَ قِرَآءَ تِیْ یُلَبِّسُھَا عَلَیَّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاكَ شَیْطَانٌ یُقَالُ لَہٗ خِنْزِبٌ فَاِذَا اَحْسَسْتَہٗ فَتَعَوَّذْ بِاللّٰہِ مِنْہُ وَاتْفُلْ عَلٰی یَسَارِكَ ثَلَاثًا فَفَعَلْتُ ذٰلِكَ فَاَذْھَبَہُ اللّٰہُ عَنِّیْ۔

(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ٤/١٧٢٨ حدیث ٦٨۔ وأحمد فی المسند ٤/٢١٦۔

ترجمہ: حضرت عثمان بن ابو العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اے اللہ کے رسول میرے اور میری نماز میری قراءت کے درمیان شیطان دخیل ہو جاتا ہے اور ان چیزوں سے متعلق التباس ڈالتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا یہ وہ شیطان ہے جس کو خنزب کہا جاتا ہے۔ پس جب تمہیں اس کا احساس ہو کہ اب شیطان وساوس اور شبہات میں ڈالے گا تو تم اس شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرو اور بائیں طرف رخ کر کے تین مرتبہ تھوک دو۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق میں نے اسی طرح عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے وساوس سے حفاظت اور سلامتی میں رکھا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

عثمان بن ابی العاص۔ یہ عثمان بن ابی العاص ''بنو ثقیف'' میں سے ہیں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو طائف کا حاکم بنایا تھا۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھر اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے اول دو سال میں طائف کے ہی حاکم رہے، اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو طائف سے ہٹا کر ''عمان'' اور ''بحرین'' کا عامل بنا دیا۔ یہ عثمان بن ابی العاص وفد ثقیف میں شامل ہو کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تھے، یہ جماعت وفد میں سب سے زیادہ کمسن تھے۔ اس وقت ان کی عمر انتیس (۲۹) سال کی تھی اور یہ وفد ۱۰ھ میں آیا تھا، یہ بصرہ میں قیام پذیر رہے اور ۵۱ھ میں یہیں وفات پائی۔ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قبیلہ ثقیف نے مرتد ہونے کا ارادہ کیا تو عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے ان

سے فرمایا اے ثقیف والو! تم لوگوں میں اسلام لانے کے اعتبار سے سب سے آخر تھے تو مرتد ہونے کے اعتبار سے سب سے پہلے مت بنو چنانچہ بنو ثقیف مرتد ہونے سے رک گئے' ان سے ایک گروہ تابعین کا روایت کرتا ہے۔

نماز کے وہم کا علاج

۷۸ :وَعَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ اَنَّ رَجُلاً سَاَلَهٗ فَقَالَ اِنِّیْ اَهِمُ فِیْ صَلَاتِیْ فَیَكْبُرُ ذٰلِكَ عَلَیَّ فَقَالَ لَهٗ اِمْضِ فِیْ صَلَاتِكَ فَاِنَّهٗ لَنْ یَذْهَبَ ذٰلِكَ عَنْكَ حَتّٰی تَنْصَرِفَ وَاَنْتَ تَقُوْلُ مَا اَتْمَمْتُ صَلَاتِیْ۔

(رواہ مالك)

أخرجه مالك فی الموطا ۱/ ۱۰۰ حدیث رقم ۳ من کتاب السهو۔

ترجمہ: حضرت قاسم بن محمد سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں ایک آدمی نے مجھ سے سوال کیا کہ مجھے اپنی نماز میں وہم ہو جاتا ہے یعنی کبھی تو یہ شک پڑ جاتا ہے کہ میری نماز صحیح ادا نہیں ہوئی اور کبھی یہ وہم ہو جاتا ہے کہ ایک رکعت پڑھنے سے رہ گئی ہے مجھے اس تردد کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے حضرت قاسم نے فرمایا کہ تم اس طرح کے وسوسہ پر توجہ نہ دیا کرو اور اپنی نماز پوری کرو اس لئے کہ وہ شیطان تم سے تب ہی دور ہوگا کہ جب تم اپنی نماز پوری کر لو اور یہ کہہ دو کہ میں نے اپنی نماز پوری نہیں کی اس حدیث کو مالک نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ان دونوں حدیثوں کا حاصل یہ ہے کہ نماز کے اندر وہم اور وسوسہ کو نظر انداز کر کے اپنی نماز کو جاری رکھنے کی کوشش کی جائے نماز چونکہ تمام عبادات میں سے ایک اہم اور جلالت شان والی عبادت ہے اس لئے شیطان اخلاص کے ساتھ نماز پڑھنے والوں کو اپنی پوری کوشش اور محنت کے ساتھ شک اور تردد میں ڈال کر نماز کو خراب کرنے کی کوشش کرتا ہے اور شیطان کی طرف سے یہ تخریبی کارروائی عام لوگوں کو توجہ اور یکسوئی سے محروم کر دیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو باتیں نماز کے علاوہ یاد نہیں رہتیں نماز میں وہ باتیں بھی یاد آ جاتی ہیں اور دل و دماغ میں گردش کرنے لگتی ہیں جب شیطان کے بہکانے اور ورغلانے سے انسان نماز کے اندر توجہ اور دھیان سے غافل ہو جاتا ہے تو اب اس سے ترقی کر کے شیطان کبھی تو یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ تیری نماز مکمل نہیں ہوئی یعنی ایک یا دو رکعت چھوٹ گئیں ہیں اور کبھی یہ تردد ڈال دیتا ہے کہ تیری نماز صحیح نہیں ہوئی کسی فرض اور رکن چھوٹ جانے کا شک ڈال دیتا ہے اور کبھی یہ خیال ڈال دیتا ہے کہ قراءۃ کے دوران آیت چھوٹ گئی ہے اس سب کوشش سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے والے کا سلسلہ ختم ہو جائے چنانچہ یہی شکایت سائل نے حضرت قاسم بن محمد سے کی تو انہوں نے بطور علاج کے شیطان کی اس تخریبی کارروائی سے حفاظت اور سلامتی میں رہنے کا طریقہ بتایا کہ جب شیطان اس طرح کے شکوک وشبہات پیدا کرے تو اپنی نماز کو ختم نہ کرو بلکہ جاری رکھو نماز مکمل کرنے کے بعد شیطان سے کہہ دو کہ ٹھیک ہے میں غلطی کر رہا ہوں میری نماز صحیح نہیں ہو رہی مگر اس کے باوجود نماز پڑھوں گا اور تیری کوشش پر ہرگز عمل نہیں کروں گا یہ علاج شیطانی اثرات سے حفاظت کے لئے بہترین نسخہ ہے کیونکہ اس سے شیطان نماز پڑھنے والے سے مایوس ہو جاتا ہے جب وہ جان لیتا ہے کہ اس پر

میری محنت اثر نہیں کرتی تو وہ انسان سے دور ہو جاتا ہے اور یہ حکم اس وقت ہے جب کہ نماز پڑھنے والے کو پورا یقین ہو کہ میں نماز صحیح پڑھ رہا ہوں نماز کے ارکان اور قراءۃ میں کوئی کمی یا غلطی نہیں ہو رہی اس سے معلوم ہوا کہ اگر فی الواقع نماز میں کوئی کمی اور کوتاہی ہو رہی ہو اور ارکان کی ادائیگی صحیح نہ ہو پھر اس غلطی اور کوتاہی کو ختم کر کے نماز کو صحیح ادا کرنا ضروری ہے حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ مسلمان اور یہودی کی نماز میں یہ فرق ہے کہ ان کی نماز میں وسوسے پیدا نہیں ہوتے اور ہماری نماز میں وسوسہ پیدا ہو سکتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ مسلمان کے عمل کی قدر ہے اس لئے شیطان اس کو ناکارہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہودی کا عمل بیکار ہے وہ پہلے سے خراب ہے شیطان کو خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔

بَابُ الْاِیْمَانِ بِالْقَدْرِ

اس باب میں تقدیر پر ایمان لانے کا بیان ہے تقدیر اللہ تعالیٰ کے رازوں میں سے ایک راز ہے جو اللہ نے کسی کو نہیں بتایا نہ کسی مقرب فرشتہ کو اور نہ کسی مقرب رسول کو اور تقدیر کو عقل کے معیار پر پرکھنا جائز نہیں بلکہ یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کر کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ایک جماعت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جنت میں جائے گی اور دوسری جماعت اللہ تعالیٰ کے عدل سے جہنم میں جائے گی اور اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو خیر اور شر کے کام پر مجبور نہیں کیا بلکہ ہر انسان کو خیر اور شر کے کام کرنے کا اختیار ہے حضرت علیؓ سے کسی آدمی نے تقدیر کے متعلق سوال کیا کہ تقدیر کیا چیز ہے؟ حضرت علیؓ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تقدیر ایک تاریک راستہ ہے اس پر نہ چلو اس آدمی نے پھر سوال کیا حضرت علیؓ نے جواب میں فرمایا تقدیر ایک گہرا سمندر ہے اس میں نہ اترو اس آدمی نے پھر سوال کیا آخر میں حضرت علیؓ نے فرمایا کہ تقدیر اللہ تعالیٰ کا پوشیدہ راز ہے اس راز کو فاش کرنے کی کوشش نہ کرو۔

معنی تقدیر: تقدیر کا لغوی معنی ہے کسی چیز کا اندازہ کرنا جیسے اللہ تعالیٰ کا قول انا کل شئ خلقناہ بقدر کہ بیشک ہم نے ہر چیز کو اندازہ کے ساتھ پیدا کیا ہے اور دوسرا معنی ہے تنگی میں ڈالنا جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: فظن ان لن نقدر علیہ کہ حضرت یونس علیہ السلام نے خیال کیا کہ ہم اس پر تنگی نہیں کریں گے اور اصطلاح میں تقدیر کی تعریف تین طرح سے کی گئی ہے۔

① تقدیر ہر مخلوق کی حیثیت اور صفت کے تعین کا نام ہے چاہے وہ صفت نفع یا نقصان کی ہو چاہے حسن اور قباحت کی ہو۔
② تقدیر سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جہان کی تخلیق سے پہلے چیزوں کا اندازہ مقرر کر دیا ہے اور لوح محفوظ میں انکو لکھ دیا ہے۔
③ تقدیر سے مراد یہ ہے کہ تمام فیصلے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیئے ہیں۔ تقدیر پر ایمان لانا فرض ہے وہ اس طرح کہ انسان یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام افعال کا خالق ہے چاہے وہ عمل خیر کا ہو یا شر کا اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی تخلیق سے پہلے لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے اب جو کچھ اس جہان میں ہو رہا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور ارادہ کے مطابق ہے اور اللہ تعالیٰ اطاعت اور خیر کے کاموں سے خوش ہوتا ہے اور کفر سے ناراض ہوتا ہے اس لئے نافرمانی پر سزا کی دھمکی ہے اور اطاعت پر ثواب کا وعدہ ہے۔

تقدیر کی قسمیں: تقدیر کی دو قسمیں ہیں ایک تقدیر معلق ہے اور دوسری تقدیر مبرم ہے۔ ان میں سے تقدیر معلق میں تغیر اور

تبدیلی واقع ہوسکتی ہے اور تقدیر مبرم میں تغیر اور تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ تقدیر معلق کا مطلب یہ ہے کہ تقدیر میں ایک فیصلہ کردیا گیا ہو مگر اس کو کچھ شرائط کے ساتھ مشروط کردیا گیا ہو۔ جیسے فلاں آدمی کی عمر ستر سال ہوگی اور اگر اس نے والدین کی اطاعت کی۔ یا زہد اور تقویٰ اختیار کیا تو پھر اس کی عمر اسی سال ہوجائے گی اور تقدیر مبرم اٹل فیصلہ کو کہتے ہیں۔ اس میں جو کچھ مقرر اور معین کردیا گیا ہے اس میں ذرہ برابر تغیر اور تبدل ممکن نہیں۔

الفصل الاول:

مخلوقات کی تقدیر کب لکھی گئی؟

۷۹ :عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَتَبَ اللّٰهُ مَقَادِيْرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ اَنْ يَّخْلُقَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ بِخَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ قَالَ وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاءِ ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/٢٠٤٤ حديث ١٦ ۔ من غير "كان"۔

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے مخلوقات کی تقدیروں کو لکھ دیا تھا اور فرمایا اس وقت اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: كتب الله مقادير الخلائق......الف سنة۔

مقادیر: جمع ہے مقدار کی اور مقدار وہ چیز ہے جس سے کسی چیز کی قدر اور کمیت معلوم ہوتی ہے جیسے پیمانہ (ناپنے کا برتن) اور ترازو اور کبھی مقدار خود قدر کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے اور وہ (قدر) کمیت و کیفیت ہے۔

كتب الله: اور اللہ کے لکھنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے لوح و قلم کے درمیان تعلق پیدا کرکے قلم کو لوح محفوظ پر چلا دیا اس میں مخلوق کی تقدیر کو ثبت کر (لکھ) دیا جو کچھ ہوچکا اور جو ابد تک ہونے والا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے امر اور ارادے میں ازل سے طے ہوچکا تھا' جیسا کہ کاتب اپنے ذہن میں پائی جانے والی بات کو تختی (یا کاغذ) پر لکھتا ہے' بعض نے کہا ہے کہ اللہ نے قلم کو حکم دیا کہ مخلوقات میں سے جس چیز کو بھی وجود ملنے والا ہے' اللہ کے ارادے کے مطابق اس کی ذات' صفت' کام' اچھائی اور برائی کے اعتبار سے اس کو لکھ دے۔

لوحِ محفوظ پر لکھنے کی حکمت:

اس کی حکمت یہ ہے کہ جو کچھ بھی وقوع پذیر ہونے ہوالا ہے فرشتوں کو اس کی اطلاع ہوجائے تاکہ اس کے وقوع کے ساتھ ان کا ایمان اور تصدیق بڑھ جائے اور اس لیے بھی کہ وہ جان لیں کہ تعریف کا مستحق کون ہے اور مذمت کا مستحق کون اور تاکہ وہ اس کے ہر مرتبہ کو پہچان لیں۔

او قدر وعين مقادير هم: ایسی قطعی اور یقینی تعیین کہ اس کے خلاف نہیں ہوسکتا اللہ تعالیٰ کے اس علم قدیم کے مطابق

جس کو ام الکتاب سے تعبیر کیا جاتا ہے یا تقدیر معلق ہوگی جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے کہ فلاں آدمی نے اگر حج کیا تو اس کی عمر بیس سال ہوگی اور اگر حج نہ کیا تو اس کی عمر ۱۵ سال ہوگی اور یہ وہ تقدیر ہے جو محو و اثبات (لکھنا اور مٹانا) کو قبول کرتی ہے' جس کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے: ﴿يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ أُمُّ الْكِتٰبِ﴾ [الرعد: ۳۹] یعنی وہ جس میں کوئی محو و اثبات نہیں ہے۔ پس محو و اثبات میں سے جو بھی واقع ہوتا ہے وہ اس اٹل فیصلے کے مطابق ہوتا ہے جو ام الکتاب میں ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسی طرح ذکر کیا اور ابن حجر کے کلام میں کچھ ابہام ہے' اس لیے کہ تقدیر مبرم اور تقدیر معلق دونوں لوح محفوظ میں اس طرح لکھی ہوئی ہیں کہ ان کو مٹایا نہیں جا سکتا ہاں اتنی بات ہے کہ حقیقت میں معلق بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم کے اعتبار سے مبرم کے تحقق کی طرف لوٹتا ہے جو ام الکتاب میں موجود ہے یا دو شقوں میں سے اس ایک شق کو مٹاتا ہے جو اللہ کے علم میں نہیں ہے' پس یہ مقام غور و فکر کا ہے کیونکہ ایک باریک معاملہ ہے اور اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی تحقیق کی جائے۔

بخمسين الف سنة: اس سے مراد تقدیر اور مخلوق کے پیدا کرنے کے درمیان کی لمبی مدت ہے یا اس کا اندازہ اس زمانے کے ایک حصے کے ساتھ ہے جس زمانے کا ایک دن انسانوں کے شمار کردہ دنوں کے اعتبار سے ایک ہزار سال کا ہے یا خود زمانے سے۔

اشکال: اگر کوئی کہے کہ اس کو زمانے پر کیسے محمول کیا جا سکتا ہے؟ حالانکہ زمانہ پیدا ہی نہیں ہوا تھا اور نہ ہی دن' مہینے اور سال جن سے زمانے کو شمار کیا جاتا ہے۔

جواب: (صاحب مرقاۃ کہتے ہیں کہ) میں کہوں گا کہ اس وقت زمانہ کو اس بڑے آسمان کی حرکت کے اندازے پر محمول کیا جائے گا جو (بڑا آسمان) عرش ہے اور عرش اس وقت موجود تھا اور اس کی دلیل حدیث شریف کا اگلا جملہ **و کان عرشه علی الماء** ہے۔

قوله: وعرشه على الماء وفي المصابيح......على الماء:

یعنی آسمان اور زمینوں کے پیدا کیے جانے سے پہلے اللہ کا عرش پانی پر تھا اور پانی ہوا کی پشت پر اور ہوا اللہ کی قدرت پر تھی اور یہ بات اس پر دلالت کرتی ہے کہ عرش اور پانی آسمان و زمین کی تخلیق سے پہلے پیدا ہو چکے تھے اور بعض نے اسی پانی کو قلم قرار دیا ہے اور بعض نے کہا کہ اس میں ان لوگوں کے لیے دلیل ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ نے مخلوقات میں سے سب سے پہلے پانی کو پیدا فرمایا پھر سارے اجسام کو اسی سے وجود بخشا کبھی پانی کو لطیف (باریک) کر کے اور کبھی کثیف (گاڑھا و موٹا) کر کے۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرمایا کہ اول مخلوق کے بارے میں روایت کا اختلاف ہے خلاصہ اس کا یہ ہے کہ (صاحب مرقاۃ فرماتے ہیں کہ اس کی وضاحت میں نے شمائل ترمذی کی شرح میں بھی کی ہے) مخلوقات میں سب سے پہلے وہ نور ہے جس سے نبی کریم ﷺ کو پیدا کیا گیا پھر پانی اور اس کے بعد عرش ہے۔

ہر چیز تقدیر کے تابع ہے

۸۰: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كُلُّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ حَتَّى الْعِجْزِ وَالْكَيْسِ۔

(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/٢٠٤٥ حديث ١٨۔ وأخرجه الامام مالك في الموطا ٢/٨٩٩ كتاب القدر حديث رقم ٤۔ وأحمد في مسنده ٢/١١٠۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر چیز تقدیر سے ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ دانائی اور نادانی بھی تقدیر کے تحت ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: كل شيئى ......والكيس۔

قدر: دال کے فتحہ کے ساتھ ہے یعنی اس مقدار مرتب کے ساتھ جو لوح میں حکمت کے تقاضے کے مطابق لکھی ہوئی ہے خارج میں اس کے پائے جانے سے پہلے۔

العجز والكيس: الكيس کاف کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

ان دونوں کو مرفوع بھی روایت کیا گیا ہے اس صورت میں ان دونوں کا عطف "کل" پر ہوگا یا یہ مبتدا ہوگا اور اس کی خبر محذوف ہوگی یعنی حتی العجز و الكيس كذالك۔

مطلب یہ ہے یہ دونوں (عجز و کیس) بھی اللہ کی قدرت کے ساتھ ہوتے ہیں اور ان دونوں کو مجرور بھی روایت کیا گیا ہے اس صورت میں ان کا عطف "شيئى" پر ہوگا۔

بعض نے کہا کہ بہتر یہ ہے کہ یہاں پر حتی الی کے معنی میں جارہ ہو اس لیے کہ حدیث کا معنی عنایت کا تقاضا کرتا ہے اس لیے آپ علیہ السلام نے اس سے ارادہ یہ کیا کہ بندوں کا کسب اور ان کے افعال سارے کے سارے ان کے خالق کی تقدیر سے ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ دانائی جس کو آدمی اپنا مقصد حاصل کرنے کا ذریعہ بناتا ہے اور وہ عجز جس کی وجہ سے آدمی اپنے مقصد کے پیچھے رہ جاتا ہے اور بعض نے کہا کہ یہاں عجز سے مراد عدم قدرت ہے یا جو کام کرنا ضروری ہے اس کو چھوڑ دینا عجز ہے یا طاعت و فرمانبرداری سے عاجز ہو جانا ہے اور "کیس" ضد ہے "عجز" کی اور وہ معاملات میں چستی اور مہارت ہے اور حدیث کا معنی یہ ہے کہ عاجز آدمی کا عجز بھی تقدیر میں لکھا ہوا ہے اور عقلمند کی عقلمندی بھی تقدیر میں لکھی ہوئی ہے۔

اور بعض نے کہا کہ "کیس" عقل کا کامل ہونا' معاملات کی بہتر پہچان اور فائدہ مند اور نقصان دہ چیزوں کے درمیان فرق کرنے کا نام ہے اور "عجز" اس کا مقابل ہے۔

"کیس" کے مقابلے میں عجز کو ذکر کیا ہے علی المعنی اس لیے کہ "کیس" کا حقیقی مقابل "بلادۃ" ہے اور عجز کا حقیقی مقابل "قوۃ" ہے اور اس اسلوب کا فائدہ یہ ہے کہ دونوں لفظوں کو دوسرے کے مقابل (متضاد) کے ساتھ مقید کیا ہے گویا کہ کہا گیا ہے: حتى الكيس والقوة و العجز والبلادة من قدر الله یہاں تک کہ دانائی اور قوت اور عاجزی و بیوقوفی بھی اللہ کی تقدیر سے ہے۔

فرقۂ باطلہ پر رد:

یہ حدیث رد ہے ان لوگوں پر جو بندوں کے لیے اختیار اور قدرت کو ثابت کرتے ہیں اس لیے کہ فعل داعیہ (وہ فعل جو سبب بنتا ہے) کا مصدر و منشاء (پیدا ہونے کی جگہ) وہ دل ہے جو دانائی و بیوقوفی کے ساتھ موصوف ہے' پھر قوت اور ضعف کی جگہ اعضاء

اور جوارح ہیں اور جب ہر ایک (وہ فعل جس کا منشاء دل ہے یا وہ فعل جا کا منشاء اعضاء و جوارح ہیں) اللہ کی قضاء وقدر سے ہے تو کون سی چیز قضاء وقدر سے خارج ہوگی۔

عجز وکیس کی وضاحت از تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ:

تورپشتی نے کہا کہ "کیس" طبیعت کی عمدگی کا نام ہے اور (حدیث میں) اس کا مقابل "عجز" لایا اس لیے کہ یہی (کیس) وہ خصلت ہے جو اپنے ساتھی (وہ آدمی جو اس صفت سے متصف ہو) کو صبر واستقلال اور کاموں کو معروف طریقے سے کرنے کی طرف لے جاتی ہے اور یہ "عجز" کی نقیض ہے اور یہاں "عجز" سے مراد عدم قدرت ہے۔

عجز وکیس کی وضاحت از مظہر:

مظہر نے کہا کہ مطلب یہ ہے کہ جو آدمی عاجز ہو اور جسامت' رائے یا تمیز کرنے میں کمزور ہو یا ناقص الخلقت ہو تو اس کو عار نہ دلاؤ اس لیے کہ وہ اللہ کی تقدیر سے ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہی اس کو اس صفت پر پیدا فرمایا ہے اسی طرح جو آدمی کامل عقل والا' معاملات پر نظر رکھنے والا اور پوری جسامت والا ہو تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے اور اپنی قوت وقدرت سے اس طرح نہیں ہوا پس نیکی کرنے کی توفیق اور برائی سے بچنے کی طاقت اللہ ہی کی طرف سے

بعض نے کہا کہ تورپشتی کی بیان کردہ بات بہتر ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مناظرہ

۸۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهُ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِحْتَجَّ اٰدَمُ وَمُوْسٰی عِنْدَ رَبِّهِمَا فَحَجَّ اٰدَمُ مُوْسٰی قَالَ مُوْسٰی اَنْتَ اٰدَمُ الَّذِیْ خَلَقَكَ اللّٰهُ بِیَدِهٖ وَنَفَخَ فِیْكَ مِنْ رُّوْحِهٖ وَاَسْجَدَلَكَ مَلَآئِكَتَهٗ وَاَسْكَنَكَ فِیْ جَنَّتِهٖ ثُمَّ اَهْبَطْتَ النَّاسَ بِخَطِیْئَتِكَ اِلَی الْاَرْضِ قَالَ اٰدَمُ اَنْتَ مُوْسَی الَّذِیْ اَصْطَفَاكَ اللّٰهُ بِرِسَالَاتِهٖ وَبِكَلَامِهٖ وَاَعْطَاكَ الْاَلْوَاحَ فِیْهَا تِبْیَانُ كُلِّ شَیْءٍ وَقَرَّبَكَ نَجِیًّافَبِكَمْ وَجَدْتَّ اللّٰهَ كَتَبَ التَّوْرَاةَ قَبْلَ اَنْ اُخْلَقَ قَالَ مُوْسٰی بِاَرْبَعِیْنَ عَامًا قَالَ اٰدَمُ فَهَلْ وَجَدْتَّ فِیْهَا وَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی قَالَ نَعَمْ قَالَ اَفَتَلُوْمُنِیْ عَلٰی اَنْ عَمِلْتُ عَمَلًا كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَیَّ اَنْ اَعْمَلَهٗ قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَنِیْ بِاَرْبَعِیْنَ سَنَةً قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَحَجَّ اٰدَمُ مُوْسٰی. (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

أخرجه البخاري في صحيحه بشئي من الاختصار ۵۰۵/۱۱ حديث رقم ۶۶۱۴۔وأخرجه مسلم في صحيحه ۲۰۴۳/۴ حديث ۱۵۔وأخرجه أبوداؤد مختصراً ۷۶/۵ حديث ۴۷۰۱۔والترمذي ۳۸۶/۴ حديث رقم ۲۱۳۴۔ وابن ماجة في مقدمته ۳۱/۱ حديث رقم ۸۰۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عالم ارواح میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان اپنے پروردگار کے سامنے مناظرہ ہوا اور حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا آپ وہی آدم ہیں کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے بنایا تھا اور پھر آپ کے اندر اپنی روح پھونکی تھی اور ملائکہ سے آپ کے سامنے سجدہ کرایا تھا اور اپنی جنت میں آپ کو ٹھکانہ دیا تھا اور پھر آپ نے اپنی خطاء اور غلطی سے لوگوں کو جنت سے نیچے اتروا دیا تھا۔ یعنی اگر آپ غلطی نہ کرتے تو لوگ یہاں زمین پر نہ اتارے جاتے اور آپ کی اولاد اس زمین پر نہ پھیلتی بلکہ جنت میں رہتی۔ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ تم وہی موسیٰ ہو۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے منصب رسالت سے نوازا اور برگزیدہ کیا اور ہم کلامی کے شرف سے نوازا اور آپ کو تورات کی تختیاں عطا کیں۔ جن میں ہر چیز کا واضح بیان تھا اور پھر آپ کو سرگوشی کے لئے قریب کرنے کی عزت اور شان بخشی پس کیا آپ کو یہ بات معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری پیدائش سے کتنا عرصہ پہلے توراۃ کو لکھ دیا تھا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا چالیس سال پہلے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا کیا آپ نے توراۃ میں یہ الفاظ لکھے ہوئے نہیں پائے۔ **وعصی آدم ربہ فغوی۔** کہ آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور بھٹک گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ ہاں یہ تو لکھا ہوا ہے۔ آدم علیہ السلام نے فرمایا پھر آپ مجھے میرے اس عمل پر کیوں ملامت کرتے ہو۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے میری پیدائش سے چالیس سال پہلے میرے لئے لکھ دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس دلیل کی وجہ سے آدم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **قولہ: احتج ادم وموسی عندربھما، فحج آدم موسی۔**

حج: (افتعال بمعنی تفاعل ہے) یعنی ایک دوسرے سے بحث (مناظرہ) کیا یعنی ہر ایک نے دوسرے سے اس کے قول پر دلیل مانگی۔

بعض نے کہا کہ یہ مناظرہ روحانی تھا عالم غیب میں اور اس بات کی تائید اگلے جملے سے ہو رہی ہے اور یہ بھی درست ہے کہ یہ مناظرہ جسمانی ہو اس طور پر کہ اللہ نے ان دونوں کو زندہ کیا ہو یا حضرت آدم علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں زندہ کیا ہو اور وہ بیت المقدس کے آس پاس جمع ہوئے جیسا کہ حدیث اسراء سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء کے ساتھ جمع ہوئے یا اس لیے کہ **الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون** (انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں نماز پڑھتے ہیں)۔

عندربھما یعنی جب ان کی گفتگو کے دوران اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی تجلی کی۔

فحج ادم موسیٰ: یعنی حضرت آدم علیہ السلام مناظرے میں موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے، اس طور پر کہ ان پر یہ بات ثابت کر دی کہ جو کچھ مجھ سے صادر ہوا میں اس میں مستقل بالذات نہیں تھا اور اس کے ترک کرنے پر قادر بھی نہ تھا بلکہ یہ ایک طے شدہ معاملہ تھا۔ پس زوال تکلیف اور توبہ اور معاف کر دیے جانے کے بعد اس پر ملامت کرنا عقلاً مستحسن نہیں ہے خاص طور پر اس آدمی کی طرف سے جس نے اللہ کے راز کا مشاہدہ کیا ہو پردوں کے پیچھے سے مہر لگی ہوئی تقدیر میں اور شرعاً گناہ پر جو حدود یا تعزیر مرتب ہوتی ہے تو اس کی خوبی شارع کی طرف سے ہے اور کسی غرض پر موقوف نہیں ہے، اگرچہ اس میں کوئی فائدہ بھی ہو۔

قولہ: موسیٰ: انت ادم الذی ...... قبل ان یخلقنی باربعین سنة قال موسیٰ ......:

یہ ماقبل کے معنی کو بیان کرنے والا جملہ ہے۔

انت اٰدم الذی خلقك الله بیدہٖ:

اپنے ہاتھ کے ساتھ یعنی اپنی قدرت کے ساتھ۔ حضرت آدم کو خاص طور پر ذکر کیا (حالانکہ سارے انسانوں کو اللہ نے اپنی قدرت سے پیدا فرمایا) ان کے عزت اور شرف کی وجہ سے اور اس لیے کہ حضرت آدم کو بغیر نمونے کے اور ماں باپ کے واسطے کے بغیر پیدا فرمایا۔

ادبی نکتہ: قیاس کے تقاضا یہ تھا کہ خلقک کی جگہ خلقہ ہوتا ہے تا کہ ضمیر اس موصول کی طرف لوٹے اور جملہ کا صلہ بننا درست ہو جائے۔ لیکن التفات کیا (غائب سے مخاطب کی طرف) تا کہ اس والد کو مخاطب کرنے سے لذت حاصل کریں جو اس بڑے شرف کو جمع کرنے والا ہے۔ اسی طرح کہا گیا ہے اور زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ بھی ایک لغت ہے جیسا کہ حضرت علی کا یہ قول ہے: **انا الذی سمتنی امی حیدرۃ** ''میں وہ شخص ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے'' (اس قول میں بھی جملے کی ضمیر اسم موصول کی طرف راجع نہیں ہے بلکہ متکلم کی ضمیر استعمال کی ہے) مترجم

ونفخ فیك من روحہٖ: ''روح کی'' اللہ کی طرف اضافت تشریف وتخصیص کے لیے ہے یعنی وہ روح جس کو اللہ نے پیدا کیا اور کسی اور کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

و اسجدلك ملآئکتہ:

اس بات میں کوئی پوشیدگی نہیں ہے کہ حدیث کے ان الفاظ سے قرآن کے الفاظ کی طرف اشارہ ہے۔

اسجد: یعنی فرشتوں کو حکم دیا کہ آپ کو سجدہ کریں۔

اس سجدہ کی حقیقت کیا تھی؟

یہ سجدہ آپ کی طرف رخ کر کے (اللہ کے لیے) کیا گیا آپ کی تعظیم کی وجہ سے (جیسا کہ کعبہ کی طرف سجدہ کیا جاتا ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ان کا سجدہ دوسرے کے لیے جھکنا تھا۔ **لا خروراً علی الذقن** اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی اقتداء کریں پس آدم علیہ السلام نے سجدہ کیا اور انہوں نے بھی سجدہ کیا اللہ کے لیے۔

پس تقدیری عبارت یوں ہوگی: **امرھم بان یسجد واللہ لا جل سجودك ایاہ** ۔ (اللہ نے ان کو حکم دیا کہ اللہ کو سجدہ کریں آپ کے اللہ کو سجدہ کرنے کی وجہ سے یا لام توقیت کے لیے ہوگا (یعنی اس وقت سجدہ کریں جب آدم سجدہ کریں) اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا قول یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم کے سامنے عاجزی کا اظہار کریں اور ان کی فضیلت کا اقرار کریں پس سجدہ لغوی ہے جو تابعداری کے معنی میں ہے۔

واسکنك: یعنی آپ کو ٹھہرایا آپ کو رہائش دی۔

فی جنتہٖ: یعنی ایسی جنت جو خاص اللہ تعالیٰ کی ہے۔

معتزلہ پر رَد:

اس میں لفظاً اور معنًی معتزلہ پر رد ہے اور اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ جنت سے دنیا کے باغوں میں سے کوئی باغ مراد ہے۔

ثم اهبطت الناس بخطيئتك الى الارض: آپ کی غلطی سے یعنی وہ غلطی جو آپ سے صادر ہوئی جو کہ آپ کی بلند شان کے لائق نہ تھی اور وہ آپ کا درخت میں سے کھانا ہے اگر چہ وہ بھول سے ہوئی یا خطاء اجتہادی تھی۔ اس لیے کہ کامل لوگوں پر عتاب ہوتا ہے اور ان کا مؤاخذہ ہوتا ہے ان باتوں سے بھی جن سے دوسروں کا مؤاخذہ نہیں ہوتا پس بے شک ابرار کی نیکیاں مقربین کے گناہ شمار ہوتے ہیں یعنی آپ ان لوگوں کے زمین پر اترنے اور جنت سے نکلنے کا سبب بنے ہیں۔ پس اگر چہ وہ موجود نہیں تھے لیکن موجود ہونے والے تھے تو گویا کہ آدم علیہ السلام نے ان کو مہبطین (جنت سے نکالے ہوئے) بنا دیا۔

یعنی اللہ نے آپ پر یہ عظیم الشان نعمتیں کی تھیں اور آپ نے درخت میں سے کھا کر اللہ کی نافرمانی کی یہاں تک کہ اس کے سبب سے آپ کو جنت سے نکال دیا گیا اور آپ کی اولاد مشقت، مصیبت اور فقر، مرض اور اس طرح کی دوسری چیزوں کی آزمائش کی جگہ میں باقی رہ گئی اور اگر وہ ہمیشہ جنت میں رہتے تو ان کو ان میں سے کوئی چیز حاصل نہ ہوتی بلکہ وہ انتہائی درجے کی نعمت میں ہوتے ہیں ایسی نعمت کہ اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے۔

(اور یہاں پر سوءِ ادب کا شبہ نہ کیا جائے کیونکہ) اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو والد کے ادب میں مخل ہو اس لیے کہ مقام احتجاج (مناظرہ اور دلیل دینے کا مقام) میں اس جیسی باتوں سے تسامح کیا جاتا ہے۔

ترکیبی حالت:

الى الارض: یہ **اهبطت** کے ساتھ متعلق ہے۔

قال ادم انت موسىٰ الذى اصطفاك الله برسالاته: **اصطفاك** کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے آپ کو چنا ہے۔ **برسالاته** جمع ہے انواع کی طرف اشارہ کرنے کے لیے یا مفرد ہے جنس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں دونوں طرح پڑھا گیا ہے: ﴿يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ﴾ [عراف: ١٤٤]

"(خدا نے) فرمایا: موسیٰ! میں نے تم کو اپنے پیغام اور اپنے کلام سے لوگوں سے ممتاز کیا ہے۔"

اور جمہور علماء کے نزدیک یہ جمع ہی ہے۔

اشکال مقدر کا جواب: اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کی رسالت کی نفی کرے اس لیے کہ ہر ایک نے دوسرے کی سب سے اعلیٰ صفت کو بیان کیا ہے اور کسی چیز کا خصوصیت سے ذکر کرنا اس کے علاوہ کی نفی نہیں کرتا اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو چنا رسالت اور تکلیم کو جمع کرنے ساتھ اور موسیٰ علیہ السلام کو اس کے ساتھ خاص کیا۔ اس لیے کہ زمین میں ان کے علاوہ کسی نے اللہ کا کلام قدیم نہیں سنا اور اس میں اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف اشارہ ہے: ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ [النساء: ١٦٤]

وبكلامه: یعنی آپ سے گفتگو کرنے ساتھ (آپ کو چنا)۔

و اعطاك الالواح: اور وہ تورات کی تختیاں ہیں۔

فیھاتبیان کل شئی: تبیان یعنی مبالغے کے ساتھ بیان کرنا' اس لیے کہ حروف کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے اور یہ جملہ استثناء فیہ مبینہ ہے یا صفت ہے یعنی وہ تختیاں جس میں غیب کی خبروں' قصص' مواعظ' عقائد' حلال وحرام' حدود' احکام اور دوسری چیزوں میں سے ہر اس چیز کا اظہار ہے' دین کے معاملے میں جس کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے مستفاد ہے: ﴿وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ......﴾ [الاعراف: ١٤٥]

و قربك نجيا: نجیا فاعل یا مفعول سے حال واقع ہو رہا ہے نجی سے مراد سرگوشی کرنے والا ہے اور اس میں واحد اور جمع برابر ہے اور یہ وہ شخص ہے جس کے اور آپ کے درمیان رازدارانہ گفتگو ہو۔ تو مراد یہ ہوئی کہ اللہ نے کسی فرشتے کے واسطے کے بغیر آپ سے کلام فرمایا یا معنی یہ ہے کہ آپ کو سرگوشی کے لیے خاص کیا جیسے اللہ کا فرمان ہے: ﴿وَنَادَيْنَاهُ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ وَقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا﴾ [مریم: ٥٢]

فبكم: اس کی تمیز محذوف ہے یعنی **فبكم زمانا يافباى زمان** ۔

وجدت الله: یعنی آپ نے اس کو جانا یا اس کے حکم کو پایا۔

كتب التوراة: یعنی الواح میں توراۃ کے لکھنے کا حکم فرمایا جیسا کہ گذر گیا ہے کہ جو کچھ لوح محفوظ میں ہے اس کو اس سے پچاس ہزار سال پہلے لکھا۔

قبل ان اخلق: اخلق مجہول کا صیغہ ہے۔

قال موسیٰ' اربعين عاما: اس سے مراد تحدید بھی ہو سکتی ہے اور تکثیر (یعنی زیادتی) بھی۔

فهل وجدت فيها: یعنی تورات میں' اور آپ نے اس کو پڑھا اور آپ نے اللہ کے اس قول کے مضمون کو جان لیا۔

وعصى ادم ربه: نافرمانی کی یعنی اسکے حکم کی مخالفت کی۔

فغوى: یعنی اس نافرمانی کے ساتھ وہ اپنے فعل میں ہدایت یافتہ ہونے سے خارج ہو گئے اور یہ مراد نہیں ہے کہ ان کے الفاظ اس ترکیب سے تھے بلکہ اس کا مطلب عبرانی زبان میں تھا۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ حضرت آدم کی اللہ کے سامنے انتہائی انکساری تھی اور اس بات کا یقین تھا جو اللہ کی طرف سے آئی اور اللہ کو حق حاصل ہے کہ اپنے غلاموں کو خطاب کرے اور جیسے چاہے ان کو متصف کرے' اس لیے کہ معصیت اور گمراہی کا اطلاق مطلق مخالفت پر ہوتا ہے اگرچہ بھول کر ہو جیسا کہ یہاں ہوا کہ آدم علیہ السلام نے ممنوعہ درخت سے جان بوجھ کر نہیں کھایا بلکہ تاویل کی یا بھول گئے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ﴾ [طہٰ: ١١٥] ''اور ہم نے پہلے آدم سے عہد لیا تھا۔''

اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کے رب نے ان کے بارے میں بیان فرمایا کہ اس نے ''نافرمانی کی اور گمراہ ہوا'' اس پر ناموس ربوبیت کو قائم کرنے کے لیے' نہ اس لیے کہ لوگ ان کو اس صفت سے متصف کرنے میں اس بات کی پیروی کریں اس لیے کہ انبیاء نبوت سے پہلے اور بعد صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔ پس قرآن کے علاوہ ان کو اس صفت سے

متصف نہیں کیا گیا اس لیے کہ یہ بات عام لوگوں کو وہم میں ڈالتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے معصیت کا صدور ہوا ہے۔

قال: یعنی آدم علیہ السلام نے فرمایا۔

افتلومنی: یعنی کیا آپ تورات میں یہ پاتے ہیں اور مجھے ملامت کرتے ہیں؟

علی ان عملت عملا کتبه الله علی: یعنی لکھا تھا لوح میں۔

ان اعمله: یہ کتبه کی ضمیر منصوب سے بدل ہے۔

قبل ان یخلقنی باربعین سنه: تورپشتی نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام کے قول کتبه الله علی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ نے مجھ پر لازم وواجب کیا اور درخت میں سے کھانے میں میرا کوئی کسب واختیار نہیں تھا۔ بلکہ مطلب یہ تھا کہ اللہ نے اس بات کو میرے پیدا ہونے سے پہلے ام الکتاب میں لکھ دیا تھا اور اس پر یہ حکم لگایا تھا کہ یہ بات ہر صورت میں ہوگی تو کیا یہ ممکن تھا کہ مجھ سے اللہ کے علم کے خلاف کام صادر ہوتا؟ تو آپ کیسے پہلے پائے جانے والے علم سے غفلت برتتے ہیں اور اس کسب کو یاد کرتے ہیں جو کہ سبب ہے اور آپ بھول رہے ہیں اصل کو جو کہ تقدیر ہے۔ باوجود اس کے کہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو اللہ نے چنا' اور ان چنے ہوئے لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اللہ کے راز کا مشاہدہ کیا ہے پردوں کے پیچھے سے۔

ضروری وضاحت:

جان لو کہ یہ قصہ کچھ ایسے معانی پر مشتمل ہے جو کہ آدم علیہ السلام کے دعویٰ کو درست کرنے والے اور ان کی دلیل کو پکا کرنے والے ہیں۔

① ان معانی میں سے پہلا یہ ہے کہ یہ مناظرہ عالم اسباب میں نہیں ہوا کہ جس میں وسائط اور اکتساب سے قطع نظر کرنا جائز نہیں ہوتا بلکہ یہ تو عالم علوی میں روحوں کی ملاقات کے وقت ہوا۔

② ان معانی میں سے دوسرا یہ ہے کہ آدم علیہ السلام نے خود سے مواجب کسب کے دور ہونے اور احکام تکلیف کے خود سے اٹھ جانے کے بعد اس کو دلیل کے طور پر پیش فرمایا ہے۔

③ ان معانی میں سے تیسرا یہ ہے کہ ملامت گناہ کے ساقط ہونے اور مغفرت کے ثابت ہونے کے بعد تھی۔

تقدیر کے بارے میں مذاہب:

کہا گیا ہے کہ جبریہ کا مذہب اللہ کی تقدیر کو ثابت کرنا اور بندے سے بالکل قدرت کی نفی کرنا ہے اور معتزلہ کا مذہب اس کے برعکس ہے اور صحیح راستہ دونوں کے مذہبوں کے درمیان کا ہے جیسا کہ اہل سنت کا مذہب ہے۔ اس لیے کہ اصل جو کہ تقدیر ہے اس کو ساقط کرنا جائز نہیں اور نہ ہی اس کسب کو باطل کرنا صحیح ہے جو کہ سبب ہے۔

قوله: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : فحج آدم موسی۔ (آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے) ان کے حق میں اللہ کے علم کو رد نہ کر سکنے کی وجہ سے۔ اس لیے کہ ان کو اس کی خبر دی گئی تھی کہ اللہ نے ان کو زمین کے لیے پیدا کیا تھا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں نہیں رکھے گا بلکہ اس سے زمین کی طرف منتقل کر دے گا۔ تاکہ وہ زمین میں اللہ کے خلیفہ بن

جائیں۔

اس جملے کو دوبارہ ذکر کرنے کی وجہ:

طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس جملے کا اعادہ تفصیل کا خلاصہ ہے کہ نفسوں کو اس اعتقاد پر پکا کرنے کے لیے ہے اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ آپ علیہ السلام کا قول "فحج" پہلی مرتبہ تحریر دعویٰ کے لیے ہو اور دوسری مرتبہ اثبات دعویٰ کے لیے۔ پس پہلے میں فاء عطف کے لیے اور دوسرے میں نتیجے کے لیے ہو اور دونوں معنی میں مختلف ہیں۔

انسانی تخلیق کے مراحل

۸۲: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ اِنَّ خَلْقَ اَحَدِکُمْ یُجْمَعُ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا نُطْفَۃً ثُمَّ یَکُوْنُ عَلَقَۃً مِثْلَ ذٰلِکَ ثُمَّ یَکُوْنُ مُضْغَۃً مِثْلَ ذٰلِکَ ثُمَّ یَبْعَثُ اللّٰہُ اِلَیْہِ مَلَکًا بِاَرْبَعِ کَلِمَاتٍ فَیَکْتُبُ عَمَلَہٗ وَاَجَلَہٗ وَرِزْقَہٗ وَشَقِیٌّ اَوْسَعِیْدٌ ثُمَّ یُنْفَخُ فِیْہِ الرُّوْحُ فَوَالَّذِیْ لَآ اِلٰہَ غَیْرُہٗ اِنَّ اَحَدَکُمْ لَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ حَتّٰی مَایَکُوْنُ بَیْنَہٗ وَبَیْنَھَا اِلَّا ذِرَاعٌ فَیَسْبِقُ عَلَیْہِ الْکِتَابُ فَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَھْلِ النَّارِ فَیَدْخُلُھَا وَاِنَّ اَحَدَکُمْ لَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَھْلِ النَّارِ حَتّٰی مَایَکُوْنُ بَیْنَہٗ وَبَیْنَھَا اِلَّا ذِرَاعٌ فَیَسْبِقُ عَلَیْہِ الْکِتَابُ فَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَھْلِ ا لْجَنَّۃِ فَیَدْخُلُھَا۔

(متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ٦/٣٠٣حدیث رقم ٣٢٠٨۔ومسلم فی صحیحه ٤/٢٠٣٦حدیث ١وأخرجه أبو داوٗد فی سننه ٥/٨٢حدیث رقم٤٧٠٨۔وأخرجه الترمذی ٤/٣٨٨حدیث رقم٢١٣٧وابن ماجة فی مقدمة سننه ١/٢٩ حدیث رقم ٧٦۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کہ صادق اور مصدوق ہیں ہمارے سامنے بیان کیا کہ تم میں سے ہر انسان کی پیدائش اس طرح ہوتی ہے کہ پہلے اس کا نطفہ ماں کے رحم میں چالیس دن جمع رہتا ہے پھر اتنے ہی دنوں میں یعنی چالیس دن کے بعد وہ جما ہوا خون بنتا ہے پھر اتنے ہی دنوں کے بعد گوشت کا لوتھڑا بن جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اس کے پاس ایک فرشتہ کو چار چیزوں کے لکھنے کے لئے بھیجتا ہے چنانچہ وہ فرشتہ اس کا عمل اس کی موت کا وقت اس کے رزق کی مقدار اور اس کا بد بخت اور نیک بخت ہونا اللہ کے حکم سے اس کی تقدیر میں لکھ دیتا ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں تم میں سے ایک آدمی جنتیوں والا عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا ہوا غالب آ جاتا ہے اور وہ دوزخیوں کے اعمال کرنے لگتا ہے اور دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے اور تم میں سے ایک آدمی دوزخیوں کے اعمال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا ہوا غالب آ جاتا ہے اور وہ اہل جنت کے کام کرنے لگتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: هو الصادق المصدوق: بہتر یہ ہے کہ اس جملے کو جملہ معترضہ بنایا جائے نہ کے حالیہ تا کہ یہ تمام احوال کو عام ہو جائے اور حضور ﷺ کی عادت مبارکہ تھی پس یہاں اس کے ذکر کرنے کی کیا ہی اچھی جگہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے تمام کاموں میں سچے تھے یہاں تک کہ نبوت سے پہلے بھی اس لیے کہ آپ لوگوں کے درمیان امین اور صادق مشہور تھے۔

تصدیق کیے ہوئے تھے اس ساری وحی میں جو آپ ﷺ کی طرف آئی۔ صدقہ زیدٌ راست گفت باوزید۔ حضور ﷺ نے ابو العاص بن الربیع کے بارے میں فرمایا **(فصد قنی)** اس نے میری تصدیق کی اور حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ میں فرمایا **(صدقك وهو كذب)** اس نے آپ کی تصدیق کی حالانکہ وہ جھوٹا ہے' اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حدیث **افك** میں نبی ﷺ سے عرض کیا **"سل الجارية تصدقك"** (باندی سے پوچھیں وہ آپ کی تصدیق کرے گی) اور س کی نظیریں بہت ہیں اسی طرح سید جمال الدین نے کہا ہے اور اس میں رد ہے اس پر جو کہا گیا ہے کہ ان دونوں (صادق اور مصدوق) کو جمع کرنا تاکید ہے اس لیے کہ ایک سے دوسرا لازم آتا ہے۔ ہاں یہ بات ہے کہ یہ نبی کریم علیہ السلام کے ساتھ خاص ہے

قوله: ان خلق احدكم...... ثم يكون مضغة مثل ذلك: ان میں ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے پس یہ حدیث جملہ سے ہے اور اس کو فتحہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے یعنی تمہاری تخلیق کا مادہ یا وہ چیز جس سے تم میں سے کسی کو پیدا کیا جاتا ہے۔

يجمع في بطن امه: جمع کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کے رحم میں ٹھہرایا جاتا ہے اور محفوظ کیا جاتا ہے اور نہایہ میں ہے کہ یہ بھی درست ہے کہ جمع کرنے سے مراد رحم میں نطفہ کا ٹھہرنا ہو۔

اربعين يوماً: یعنی چالیس دن تک ان کا خمیر تیار کیا جاتا ہے یہاں تک کہ پیدائش کے لیے تیار ہو جائے۔ طیبی نے کہا کہ اس حدیث کی تفسیر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ نطفہ جب رحم میں جاتا ہے اور اللہ یہ ارادہ فرمالیتا ہے کہ اس سے آدمی پیدا کرے گا تو یہ نطفہ عورت کی جلد میں ہر ناخن اور ہر بال کے نیچے تک پھیل جاتا ہے اور اس حالت پر چالیس دن رہتا ہے پھر خون بن کر رحم میں اترتا ہے پس یہی اس کا جمع ہونا ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبی کریم ﷺ سے جو کچھ سنا اس کی تفسیر لوگوں میں سب سے زیادہ جاننے والے ہیں اور اس کی تاویل کے سب سے زیادہ حقدار ہیں اور لوگوں میں سب سے زیادہ احتیاط کرنے والے بھی ہیں تو بعد کے لوگوں کے لیے درست نہیں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم پر رد کریں۔

اور ابن حجر نے فرمایا کہ اس حدیث کو ابن ابی حاتم اور دوسرے لوگوں نے روایت کیا ہے اور جمع کی تفسیر ایک اور طرح سے کرنا بھی درست ہے اور وہ تفسیر یہ ہے جس کو نبی ﷺ کی یہ حدیث شامل ہے: **(ان الله تعالى اذا اراد خلق عبد فجامع الرجل المرأة طار ماء ه في كل عرق و عضو منها' فاذا كان يوم السابع جمعه الله ثم احضره كل عرق له دون ادم في اى صورة ماشاء ركبك)** اور اس معنی کی شاہد ایک دوسری حدیث سے ملتی ہے جس میں نبی ﷺ نے اس آدمی سے فرمایا جس نے کہا تھا کہ میری بیوی نے کالا بچہ جنا ہے۔ تو آپ نے فرمایا: **(لعله نزعه عرق)** شاید کہ اس کو کسی رگ نے کھینچا ہو اور نطفہ کی اصل تھوڑا پانی ہے اس کو اس کی قلت کی وجہ سے منی کہا گیا ہے اور بعض نے کہا کہ یہ **"نطافة"** سے ہے یعنی بہنا اور یہ بھی بہتا ہے اس لیے اس کو نطفہ کہتے ہیں۔

صوفیاء نے فرمایا ہے کہ چالیس دن کی خصوصیت اس کے آدم علیہ السلام کی مٹی کا خمیرہ تیار کرنے اور موسیٰ علیہ السلام کے میقات کے ساتھ موافقت کی وجہ سے ہے۔ پھر نطفہ کو اس آدمی کی قبر کی مٹی کے ساتھ گوندھا جاتا ہے جیسا کہ اس قول کی تفسیر میں وارد ہوا ہے: ﴿ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ ﴾ [طٰہٰ: ۵۵] اور وہ یہ ہے کہ فرشتہ اس کی قبر کی مٹی لیتا ہے اور اس کو نطفے پر بکھیر دیتا ہے اور اس کے مٹی کا خلاصہ ہونے کی وجہ سے آدمی مختلف رنگوں اور اخلاق کا پیدا ہوتا ہے جیسا کہ مٹی کے اجزاء میں اختلاف ہوتا ہے بلکہ مٹی کے مرکبات کے اختلاف کے اعتبار سے اس میں چیونٹی اور چوہے کی حرص، چڑیا کی شہوت، تیندوے کا غصہ، چیتے کا تکبر، کتے کا بخل، خنزیر کی برائی، سانپ کا کینہ اور دوسری صفات مذمومہ ہوتی ہیں اور اس میں شیر کی بہادری، مرغ کی سخاوت الو کی قناعت، اونٹ کی بردباری، بلی کی تواضع، کتے کی وفاداری، کوے کی طبیعت، باز کی ہمت اور اس طرح کے اچھے اخلاق ہوتے ہیں۔

نطفة : یہ **یجمع** کے فاعل سے حال ہے۔

ثم یکون : پھر تم میں سے کسی کی تخلیق ہوتی ہے۔

علقة : یعنی گاڑھا اور جامد خون۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یعنی ان چالیس دن کے بعد اس محل میں جس میں نطفہ جمع ہوا تھا خون کا لوتھڑا بن جاتا ہے اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ "یکون" بمعنی "یصیر" ہے اور ضمیر لوٹ رہی ہے اس کی طرف جو ماں کے پیٹ میں بحالت نطفہ جمع کیا گیا۔

اور کہا گیا ہے کہ اس کی خلقت لوتھڑا بن جاتی ہے اس لیے کہ اس کا تعلق رحم سے ہو جاتا ہے اور اس میں ایک بات یہ لازم آتی ہے کہ صیرورت (یعنی اس کا بننا) چالیس دن میں ہوتی ہے حالانکہ ایسی بات نہیں ہے اور ظاہر یہ ہے کہ اس کا اندازہ مقررہ کیا جاتا ہے یا باقی رہتا ہے یا ٹھہرتا ہے (چالیس دن)۔

مثل ذلك: اس میں محذوف کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اس زمانے کی طرح یعنی چالس دن کی طرح۔

ثم یکون مضغة: یعنی گوشت کے اس ٹکڑے کی مقدار جس کو چبایا جاسکتا ہو۔

مثل ذلك: اسی زمانے کی طرح اور ان چالیس دنوں میں اس کی تصویر ظاہر ہو جاتی ہے۔

بتدریج پیدائش کی حکمت:

مظہر نے کہا کہ ایک ہی لحہ میں پیدا کر دینے کی قدرت کے باوجود اس تحویل (تبدیلی کرنے) میں فوائد اور عبرتیں ہیں۔

① ان میں سے (ایک حکمت) یہ ہے کہ اگر اللہ انسان کو فوراً بنا لیتا تو عادت نہ ہونے کی وجہ سے ماں مشقت میں پڑ جاتی اور کبھی ان کو بیماری لاحق ہو جاتی۔ لہٰذا اس کو پہلے نطفہ بنا دیا تاکہ کچھ عرصہ اس کو عادت ہو جائے اسی طرح ولادت تک (بتدریج اس کو بنایا)۔

② ان میں سے (دوسری حکمت) اللہ کی قدرت اور اسکی نعمت کا اظہار ہے تاکہ لوگ اس کی عبادت کریں اور اسکا شکر ادا کریں اس لیے کہ اللہ نے ان کو ان حالتوں سے تبدیل کر کے ایسا خوبصورت انسان بنایا جو کہ عقل اور ذہانت سے مزین ہے۔

③ ان میں سے (تیسری حکمت) لوگوں کو حشر پر اللہ کی کمال قدرت کی طرف ہدایت اور تنبیہ ہے۔ اس لیے کہ وہ ذات جو

گندے پانی سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر گوشت کے اس ٹکڑے سے جو کہ روح پھونکے جانے کے لیے تیار ہوا انسان کو پیدا کرنے پر قادر ہے وہ اس کے حشر اور اس میں روح پھونکنے پر بھی قادر ہے۔

④ صاحب مرقاۃ کہتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ ان میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ بلکہ اس میں سب سے ظاہر یہ ہے کہ لوگوں کو کاموں میں تدریج' اور ان میں جلدی نہ کرنے کی تعلیم ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے فوراً پیدا کرنے کی قدرت اور قوت کے باوجود انسان کو بتدریج پیدا فرمایا گو کہ انسان کو اپنے کام میں زیادہ غور و فکر (بردباری) کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ مفسرین نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر میں اسی طرح کی بات فرمائی ہے: ﴿ إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ﴾ [الاعراف: ٥٤] ''کچھ شک نہیں کہ تمہارا پروردگار خدا ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا'' پس آیات آفاقیہ اور دلالات انفسیہ میں مطابقت اور مناسبت حاصل ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ﴾ [فصلت: ٥٣] ''ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ (قرآن) حق ہے۔''

⑤ ان حکمتوں میں سے (پانچویں حکمت) انسانوں کو تنبیہ کرنا اور ان کو ان کی اصل اور فرع کے بارے میں سمجھانا ہے۔ پس انسان اپنے اجسام' اعضاء اور خواص کی قوت سے دھوکے میں نہ پڑیں' اور جان لیں کہ یہ ساری چیزیں عطائے خداوندی ہیں بلکہ بطور عاریت ان کے پاس موجود ہیں تاکہ وہ اپنے مبتداء کو دیکھیں جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ﴾ [الطارق: ٥] اور حدیث شریف میں آتا ہے:۔ **من عرف نفسه فقد عرف ربه** ''جس نے اپنی ذات کو پہچان لیا تو تحقیق اس نے اپنے رب کو پہچان لیا''۔

قوله: ثم يبعث الله اليه ملكا...... ثم ينفخ فيه الروح'

ثم يبعث الله اليه ملكا: یعنی تم میں سے کسی کی تخلیق کی طرف یا تم میں سے کسی کی طرف' یعنی اس حال میں جب اس کی بناوٹ کامل ہوتی ہے اور اس کے اعضاء کی شکل بنتی ہے۔

اور اربعین میں **ثم يرسل اليه الملك** کے الفاظ ہیں اور بھیجنے سے مراد اس کو اس کا حکم کرنا اور اس میں تصرف کرنا ہے اس لیے کہ صحیحین سے ثابت ہے کہ وہ فرشتہ رحم کا محافظ ہوتا ہے جب وہ نطفہ ہوتا ہے یا وہ اور فرشتہ ہے جو کہ محافظ فرشتے کے علاوہ ہے۔

اشکال: اگر تو کہے کہ صحیح مسلم میں حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہ کی روایت حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے خلاف وارد ہوئی ہے جیسا کہ مشارق میں ہے کہ جب نطفے پر بیالیس راتیں گذر جاتی ہیں تو اللہ ایک فرشتے کو بھیجتا ہے جو اس کی شکل و صورت بناتا ہے اور اس کے کان' آنکھیں' جلد اور ہڈیاں بناتا ہے پھر کہتا ہے اے رب! یہ مذکر ہو گا یا مؤنث؟ تو آپ کا رب جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے پھر اس کی عمر رزق لکھتا ہے پس اس (روایت) سے معلوم ہوا کہ شکل و صورت بنانے کا کام پہلے چالیس دنوں کے بعد ہوتا ہے اور یہ بات اس روایات کے خلاف ہے۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ فرشتے کے تصرف کے مختلف اوقات ہیں' ان میں سے پہلا وقت وہ ہے جب وہ نطفہ ہوتا ہے پھر خون کا لوتھڑا بنتا ہے اور وہ فرشتے کا پہلا علم ہے اس بارے میں کہ وہ پیدا ہوگا اور وہ پہلے چالیس دن کے بعد ہوتا ہے اور اس وقت اللہ فرشتے کو اس کی طرف بھیجتا ہے تو وہ اس کا رزق' عمر' عمل' اور شکل وصورت کے بارے میں لکھتا ہے پھر اس میں شکل وصورت بنانے اور اعضاء کے پیدا کرنے کے ساتھ تصرف کرتا ہے اور یہ تیسرے چالیس دن میں ہوتا ہے پھر اس میں روح پھونکتا ہے پس اس کے بعد اس کی شکل وصورت بنانے سے مراد یہ ہے کہ اس کو لکھ دیتا ہے پھر دوسرے وقت میں شکل وصورت بناتا ہے۔ اس لیے کہ تصویر اول عادتاً پہلے چالیس دن کے بعد موجود نہیں ہوتی اسی طرح مسلم کی شرح میں ہے۔ **ولا یخفی مافیه** (اور اس میں جو بات ہے وہ پوشیدہ نہیں ہے)۔

اور عورتوں میں یہ مشہور ہے کہ نطفہ جب مذکر بنایا جاتا ہے تو اس کی شکل وصورت پہلے چالیس دنوں کے بعد بنائی جاتی ہے اس طور پر کہ اس کی ہر چیز نظر آتی ہے یہاں تک کہ شرمگاہ بھی' پس ابن مسعودؓ کی روایت لڑکیوں پر محمول کی جائے گی یا اکثر پر (کہ اکثر اوقات اسی طرح ہوتا ہے)۔

باربع کلمات:

یعنی ان (کلمات) کے لکھنے کے ساتھ' اور ہر قضیے کو کلمہ کہا جاتا ہے چاہے وہ قول ہو یا فعل ہو۔

فیکتب عمله: خیر اور شر میں سے (اس کا عمل لکھا جاتا ہے)

واجله: اس کی زندگی کی مدت یا اس کی عمر کی انتہاء۔

ورزقهٗ: یعنی اس کا رزق تھوڑا ہوگا یا زیادہ یا اس کے علاوہ کہ جس چیز سے وہ نفع اٹھائے گا وہ حلال ہوگی یا حرام۔ چاہے وہ کھانے کی چیز ہو یا نہ ہو پس وہ اس کے لیے متعین کر دیتا ہے اور اس میں نقش کر دیتا ہے۔ اس کے بعد کے اعمال' عمر اور رزق میں سے اس کے لائق جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے جیسا کہ اس کی حکمت نے تقاضا کیا اور اس کے کلمہ نے سبقت کی۔ پس جس کو اللہ نے قبول حق اور اتباع حق کے لیے مستعد پایا اور اس کو بھلائی کا دیکھا اور نیکی کے اسباب اس کی طرف متوجہ تھے تو اس کو نیک لوگوں کی تختیوں میں شمار کیا اور جس کو خیر سے دور' سخت دل اور حق سے باز رہنے والا پایا اس کو شقی لوگوں کے رجسٹر میں لکھ دیا اور اس سے جو گناہ اور برائیاں متوقع تھیں وہ بھی لکھ دیں۔ یہ اس وقت ہے جب اس کا حال معلوم نہ ہو جو اس کی تبدیلی کا تقاضا کرتا ہے اور اگر اس میں سے کوئی چیز معلوم ہو تو اس کے معاملہ کی ابتداء اور انتہاء لکھ دی اور اس پر اس کے عمل کے خاتمے کے اعتبار سے حکم لگا دیا۔ پس بے شک عمل کا سہارا اس کا خاتمہ ہے اور یہی وہ ہے جس کی طرف کتاب سبقت کرتی ہے اور وہ اہل جنت یا اہل جہنم والا عمل کرتا ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ فرشتے کے ان چیزوں کے لکھنے سے مراد فرشتے کے لیے اس کا اظہار ہے۔ ورنہ اس کا فیصلہ تو اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ مجاہد نے کہا کہ: یہ کلمات ایک کاغذ پر لکھے جاتے ہیں اور اس ورق کو اس کی گردن میں اس طرح لٹکا دیا جاتا ہے کہ اس کو انسان نہیں دیکھتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ﴾ [الأسراء: ١٣] ”اور ہم نے ہر

انسان کے اعمال کو (بصورتِ کتاب) اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے' اہل معانی نے فرمایا ہے کہ پرندے سے مراد وہ ہے جس کا اس کے بارے میں فیصلہ کیا ہے کہ وہ اس کو کرنے والا ہو گا اور وہ نیک بختی یا بدبختی میں سے جس کی طرف ہو گا اور گردن کو خاص فرمایا اس لیے کہ یہ ہار اور طوقوں کی جگہ ہے۔ میں (صاحب مرقاۃ) نے کہا کہ وہ کنایہ ہے ذمہ سے۔ تو گویا یہ چیزیں اس کے ذمے میں ہیں کہ وہ ان کو کرے گا اور وہ اس پر قادر نہیں کہ ان چیزوں سے جدا ہو جائے اور کہا گیا ہے (بعض نے کہا) کہ تقدیر میں اس کے لیے طے شدہ اور احکام کو اس کی پیشانی یا ہتھیلی پر لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

جان لو کہ ام الکتاب کی تحریر ہر چیز کو عام ہے اور یہ وہ ہے جس کے ساتھ ہر انسان خاص ہے اس لیے کہ ہر تحریر کے لیے سابق ہے اور یہ وہ ہے جو لوح محفوظ میں ہے اور لاحق ہے جو لیلۃ القدر کو لکھا جاتا ہے اور درمیانی ہے جس کی طرف حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے اور اصل الاربعین میں ہے (يكتب رزقه واجله وعمله وشقي أو سعيد) اور وہ آپ ﷺ کے قول "اربع" سے بدل الکل ہے اس لیے کہ اس میں مضاف مقدر ہے اور یکتب بھی روایت کیا گیا ہے۔

استیناف کے طور پر:

وشقي: یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے یعنی يكتب هو شقي۔

أو سعيد: کہا گیا ہے کہ ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ: "ويكتب سعادته و شقاوته" کہا جاتا ہے پس ظاہر سے انحراف کیا یا تو اس صورت سے جس کو حکایت کرتے ہوئے فرشتہ لکھتا ہے۔ اس لیے کہ وہ لکھتا ہے: "أشقي أو سعيد؟"

یا تقدیر یہ ہے کہ: "انه شقي أو سعيد" اور اس سے انحراف کیا اس لیے کہ کلام ان دونوں کے لیے چلایا گیا ہے اور اس کی تفصیل جو آپ ﷺ کا قول "فو الذی الخ" ہے ان دو پر وارد ہے۔

سعادت اور شقاوت کیا ہے؟

اور سعادت انسان کے لیے بھلائی کے حصول پر اللہ کے معاملات کا مددگار رہنا ہے اور شقاوت اس کے برعکس ہے۔

اور سعادت قلبی ہو گی یا بدنی ہو گی اور یا بدن کے اردگرد ہو گی۔ پس سعادت قلبی معارف' حکمتیں' کمالاتِ علمیہ اور قلبی اعمال کا کمال ہے اور سعادت بدنی (یا جسمانی) صحت' قوت اور جسمانی لذات ہیں اور بدن کے اردگرد کی سعادت مال و اسباب ہے اور نبی کریم ﷺ نے شقاوت (بدبختی) کو اپنے کلام میں سعادت (نیک بختی) پر مقدم کیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ شر بھی خیر کی طرح اللہ کی طرف سے ہی ہے۔

اور یہ رد ہے ثنویہ پر جو کہ اللہ کے لیے ایسا شریک ثابت کرتے ہیں جو شر کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس لیے کہ وہ اللہ کے کاموں میں حکمت طلب کرتے ہیں پس کہتے ہیں کہ مدبر عالم اگر اکیلا ہوتا ہے تو یہ خاص نہ ہوتا نیکی کی قسموں' صحت اور مالداری کے ساتھ اور وہ شر کی قسموں کے ساتھ پس رب تعالیٰ نے ان پر اپنے اس قول سے رد کیا: " لا يسئل عما يفعل"۔

اور شاعر کا قول کیا خوب ہے:

کم من ادیب فهم قلبه مستکمل العقل مقل عدیم

وکم جهول مكثر ماله ذلك تقدير العزيز العليم

اوراس مقام کی تحقیق یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ اللہ کی دو صفتیں ہیں لطف اور قہر اور حکمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ بادشاہ خاص طور پر ملک الملوک ایسا ہی ہو۔اس لیے کہ یہ دونوں اوصاف کمال میں سے ہیں اور ان میں سے ایک دوسری کے قائم مقام نہیں ہوسکتی اور ایک کا تحقق دوسری کے بغیر نہیں ہوسکتا۔جیسا کہ لذت واضح نہیں ہوتی درد کے بغیر اور اشیاء اپنی ضد کے ساتھ پہچانی جاتی ہیں۔تو ضروری ہے کہ ان میں سے ہر ایک (لطف وقہر) کے لیے ظاہر ہونے کی جگہ ہو۔پس نیک بخت لوگ اور ان کے اعمال صفت لطف کے مظاہر ہیں اور انبیاء اور کتابوں کے بھیجے جانے کے فائدہ ان کی طرف لوٹتا ہے:﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا﴾ [النازعات: ٤٥] جیسا کہ سورج کی روشنی کا فائدہ آنکھوں والوں کے لیے ہے اور بد بخت لوگ اور ان کے اعمال صفت قہر کے مظاہر ہیں اور بعثت (انبیاء وکتب) کا فائدہ ان پر حجت کو لازم کرتا ہے (لئلايكون للناس على الله حجة بعدا لرسل) تا کہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی حجت نہ ہو اور حقیقت میں یہ بات ان کی شقاوت کے عیب کو ظاہر کرنے والی ہے۔

ثم ينفخ:ینفخ مجہول کا صیغہ ہے اور بعض نے کہا کہ یہ معلوم کا صیغہ ہے۔

فيه الروح:روح منصوب بھی ہوسکتا ہے اور مرفوع بھی (ینفخ کے اعتبار سے)یعنی ثم' ینفخ فيه الروح سے معلوم ہوا کہ) اس فرشتے کو بھیجے جانے کے بعد۔نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد جیسا کہ بیہقی کی روایت میں ہے کہ اس سے مراد صرف خبر کی ترتیب ہے اس لیے کہ شیخین کی روایت دوسری روایات پر مقدم ہوتی ہے اسی طرح ابن حجر نے ذکر کیا ہے۔لیکن اربعین نووی میں ان الفاظ کے ساتھ ہے۔(فينفخ فيه الروح ومر......) اور اس کی نسبت شیخین کی طرف کی گئی ہے کہ پس غور کرو شاید وہ دو الگ روایتیں ہوں واللہ اعلم۔

قوله:فو الذى لا اله غيره......فيعمل بعمل اهل الجنه فيدخلها:قسم تحقیق کا فائدہ دینے کے لیے اور تصدیق کی تاکید کے لیے ہے اور تا کہ قضا کے معاملے میں یہ معلوم ہو جائے کہ حقیقت میں کسب کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔یعنی جب سعادت وشقاوت لکھی ہوئی ہیں۔

ان احدكم: اور مصابیح کے الفاظ "فان الرجل "یعنی شخص۔

ليعمل بعمل اهل الجنة حتى مايكون:یکون دونوں جگہوں پر رفع کے ساتھ ہے اس لیے نہیں کہ ما نافيه كافه عن العمل ہے بلکہ اس لیے کہ مراد آدمی کے حال کی حکایت ہے نہ کہ مستقبل کی خبر دینا اسی طرح سید جمال الدین نے فرمایا' اور مظہر نے فرمایا کہ حتّٰی ناصبہ ہے اور ما نافیہ ہے اور لفظ يكون حتى کی وجہ سے منصوب ہے اور ما اس (حتى) کو عمل سے روکنے والا نہیں ہے اور ابن مالک نے فرمایا کہ بہتر یہ ہے کہ حتى عاطفہ ہو اور يكون رفع کے ساتھ ہو اور اس کا عطف ماقبل پر ہو۔

بينه و بينها:یعنی آدمی اور جنت کے درمیان۔

الاذراع:یہ انتہائی قرب کی تمثیل ہے۔

فیسبق علیه الکتاب: "یسبق" متضمن ہے "یغلب" کے معنی کو۔ اسی وجہ سے "علی" کے ساتھ متعدی ہوا ہے ورنہ یہ متعدی بنفسہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس پر بدبختی کی کتاب غالب آ جاتی ہے اور الکتاب کا الف لام عہدی ہے اور کتاب بمعنی مکتوب ہے یعنی مقدر اور تقدیر یعنی تقدیر والی اور "فاء" تعقیب کے لیے ہے جو "حصول سبق بغیر مہلت" پر دلالت کر رہی ہے

فیعمل بعمل اهل النار فیدخلها: اس میں اشارہ ہے کہ "دخول جہنم" صرف علم الٰہی کے تعلق سے نہیں ہے بلکہ مخلوق کے عمل کا ظاہر ہونا ضروری ہے پس یہ جبر محض بھی نہیں ہوگا ورقدر خاص بھی نہیں ہوگا۔ (صاحب مرقاۃ کہتے ہیں) یہ وہ تحقیق ہے جو مجھ پر ظاہر ہوئی اور کہا گیا ہے اس لیے کہ نیک بختی اور بدبختی کا بیج انسانی اطوار میں پوشیدہ ہوتا ہے یہ ظاہر نہیں ہوتا مگر یہ کہ جب وہ غایت ایمانیہ یا غایت طغیانیہ کے انتہا کو پہنچ جائے۔ واللہ اعلم۔

وان احدکم: یعنی تم میں سے دوسرا شخص۔

لیعمل بعمل اهل النار: یعنی کفر یا معاصی کا ارتکاب کرتا ہے۔

حتی مایکون: "یکون" دونوں اعرابوں کے ساتھ ہوسکتا ہے (یعنی مرفوع بھی اور منصوب بھی جیسا کہ پہلا یکون تھا) **بینه و بینها الا ذراع فیسبق علیه الکتاب** کہا گیا ہے کہ اس میں ظاہری دلالت ہے اس بات پر کہ اعمال علامات ہیں نہ کہ موجبات اور بے شک ان کا چلنا اس طرف ہے جس طرف ابتداء میں تقدیر چل گئی۔

فیعمل بعمل اهل الجنة: اس طور پر کہ وہ توبہ استغفار کر لیتا ہے۔

فیدخلها: (صاحب مرقاۃ کہتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ اس حدیث میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ سالک کو اپنے اچھے اعمال سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے اور اس کو عیب، تکبر اور برے اخلاق سے اجتناب کرنا چاہیے اور امید اور خوف کے درمیان ہونا چاہیے اور قضا پر راضی رہنا چاہیے اور اسی طرح اگر اس سے کوئی برے اعمال صادر ہو جائیں تو اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ پس بے شک جب توجہ کی نظر پڑتی ہے تو بعد والی حالت بھی پہلی حالت کے ساتھ ملا دی جاتی ہے اس طرح اعمال کا حال غیر کی طرف نسبت کرتے ہوئے پس کسی کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ جنت اور مرتبوں والا ہے اگرچہ وہ سارے اعمال طاعات والے کرے اور اگرچہ اس سے خرق عادت کاموں کا صدور ہو اور کسی کے بارے میں یہ یقین بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ جہنمی ہے اور سزا کا مستحق ہے اگرچہ اس سے تمام برائیوں، مظالم اور ہلاک کرنے والے کاموں کا صدور ہو۔ پس بے شک حالات کے اختتام کا اعتبار کیا جائے گا اور خاتمے کا علم اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں ہے۔

پھر جان لو کہ دنیا میں ایمان و کفر، نیک بختی و بدبختی اور کلیات و جزئیات میں سے جو کچھ بھی جاری ہے وہ اللہ کی تقدیر اور ایجاد کے ساتھ ہے۔ اس لیے کہ وجود دینے میں وہ اللہ ہی مؤثر ہے جو ذات، صفات اور افعال کے اعتبار سے شرک سے بلند ہے ۔اللہ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے اس کے کام کی کوئی علت نہیں اور "لا معقب لحکمه" وہ جو کرتا ہے اس کے بارے میں اس سے سوال نہیں کیا جائے گا اور اعمال کے حسن وقبح میں عقل کا مجال نہیں ہے بلکہ اللہ سے جو کام بھی صادر ہو وہ حسن ہی ہے اور بندے کے لیے افعال اور مدح وذم میں استقلال محل کے اعتبار سے ہے نہ کہ فاعل کے اعتبار سے۔ جیسا کہ کسی چیز کی تعریف اس کی خوبی کی وجہ سے کی جاتی ہے اور ثواب وعقاب تمام امور عادیہ کی طرح ہیں۔ پس بے شک اللہ کی یہ عادت جاری ہوئی ہے کہ وہ

پہلے اسباب کو پیدا فرماتا ہے پھر ان کے بعد مسببات کو پیدا فرماتا ہے اور ان (اسباب ومسببات) میں سے ہر ایک ابتداءً اللہ ہی سے صادر ہوئے ہیں اور بہر حال نبیوں کو بھیجنا اور انسانوں کو مکلف بنانا یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امر' نہی اور وعدے اور وعید کے ساتھ متصف ہونا ثابت ہے' تو اس کے لیے ظاہر ہونے کی جگہ ضروری تھے جیسا کہ اللہ کی تمام صفات کا یہ معاملہ ہے تو اللہ نے بندوں کو ان دونوں (صفات) کا مکلف بنا دیا اور اس پر وعدہ اور وعید کو مرتب کر دیا اپنی سلطنت کے مقتضٰی کے ظہور کے لیے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے (حدیث قدسی) فرمایا: کنت کنزاً مخفیا فاردت ان اعرف فخلقت الخلق لأن اعرف۔

اعمال کا دارومدار خاتمے پر ہے

۸۳: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ عَمَلَ اَهْلِ النَّارِ وَاِنَّهٗ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَيَعْمَلُ عَمَلَ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاِنَّهٗ مِنْ اَهْلِ النَّارِ وَاِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری من حديث طويل ۴۹۹/۱۱ حديث ۶۶۰۷ ورواه مسلم من غير "انما الأعمال بخواتيمها" ۱۰۶/۱ حديث (۱۷۹-۱۱۲)۔

ترجمہ: حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انسان اہل جہنم کے کام کرتا رہتا ہے۔ حالانکہ وہ جنتی ہوتا ہے اور یہ کہ وہ اہل جنت والا کام کرتا رہتا ہے لیکن وہ جہنمی ہوتا ہے اور بے شک نجات اور عذاب کا دارومدار خاتمہ کے عمل پر ہے۔ (بخاری ومسلم)

راویٔ حدیث:

سہل بن سعد۔ یہ سہل بن سعد بن مالک ساعدی انصاری ہیں اور ''ابو عباس'' ان کی کنیت ہے ان کا نام ''حزن'' تھا رسول اللہ ﷺ نے ''سہل'' رکھ دیا۔ قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے ہیں۔ بنو ساعدہ میں سے تھے۔ باپ بیٹا دونوں صحابی ہیں۔ جب حضور ﷺ نے وفات پائی تو ان کی عمر پندرہ (۱۵) سال تھی۔ ''سہل'' نے مدینہ میں ۹۱ھ میں انتقال فرمایا اور بعضوں نے ۸۸ھ بیان کیا ہے۔ یہ سب سے آخری صحابی ہیں جن کا انتقال مدینہ میں ہوا۔ ان سے ان کے بیٹے عباس اور زہری اور راو ابو حازم روایت کرتے ہیں۔

تشریح: قوله: وعن سهل بن سعد ؓ: سہل بن سعد یعنی ساعدی' انصاری ان کی کنیت ابو العباس ہے۔ ان کا نام حزن تھا تو نبی کریم ﷺ نے ان کا نام سہل رکھ دیا۔ جب نبی ﷺ کا وصال ہوا تو حضرت سعد کی عمر ۱۵ سال تھی اور ان کی وفات ۹۱ھ کو مدینہ میں ہوئی اور وہ آخری صحابی ہیں جن کا مدینے میں انتقال ہوا اور ان سے ان کا بیٹا عباس' زہری اور ابو حازم نے روایت کی ہے۔

قوله: ان العبد ليعمل......وانما الاعمال بالخواتيم۔

ان العبد: یعنی اللہ کے غلاموں (بندوں) میں سے ایک غلام (بندہ)۔

ليعمل عمل اهل النار: یعنی ظاہراً وصورتاً یا شروع میں یا مخلوق کی نظر میں۔

وانہ من اهل الجنة: یعنی باطنی اور معنوی اعتبار سے یا آخر میں یا اللہ تعالیٰ کے علم میں واو حالیہ ہے اور اس کے بعد ان مکسور الہمزہ ہوتا ہے۔

ویعمل عمل اهل الجنة وانہ من اهل النار: یعنی دوسرا بندہ (عمل کرتا ہے)۔

وانما الاعمال: یعنی اعمال کا دارومدار۔

بالخواتیم: یعنی اس حالت پر جس پر اس کے عمل کا خاتمہ ہوتا ہے اور یہ (یعنی **انما الاعمال بالخواتیم**) ماقبل کی تذییل ہے اور اسکے حاصل پر مشتمل ہے۔ پس بعض ہٹ دھرم کافر آخر میں ایمان لے آتے ہیں اور بعض عبادت گذار مسلمان آخر میں کافر ہو جاتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ اس حدیث میں طاعات پر دوام اور اوقات کو گناہوں سے اور برائیوں سے بچانے کی ترغیب ہے۔ اس خوف سے کہ یہی اس کا آخری عمل ہو اور اس میں عجب (خود پسندی) سے زجر ہے اس لیے کہ بندے کو معلوم نہیں کہ اس کا انجام کیا ہوگا اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی آدمی کے لیے جنت یا جہنم کی گواہی دینا درست نہیں ہے اور کہا گیا ہے کہ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ملک میں جیسے چاہے تصرف کرتا ہے اور یہ سب عدل وصواب ہے اور کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ اللہ کی قضا وقدر کو تسلیم کیے بغیر نجات نہیں ہے۔

جنت اور جہنم میں داخلے کا مدار تقدیر پر ہے

۸۴ : وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ دُعِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى جَنَازَةِ صَبِيٍّ مِّنَ الْاَنْصَارِ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ طُوْبٰى لِهٰذَا عُصْفُوْرٌ مِّنْ عَصَافِيْرِ الْجَنَّةِ لَمْ يَعْمَلِ السُّوْءَ وَلَمْ يُدْرِكْهُ فَقَالَ اَوَغَيْرَ ذٰلِكِ يَا عَائِشَةُ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ لِلْجَنَّةِ اَهْلًا خَلَقَهُمْ لَهَا وَهُمْ فِيْ اَصْلَابِ اٰبَآئِهِمْ وَخَلَقَ لِلنَّارِ اَهْلًا خَلَقَهُمْ لَهَا وَهُمْ فِيْ اَصْلَابِ اٰبَآئِهِمْ.

أخرجه مسلم في الصحيح ٤/ ٢٠٥٠ حديث وأخرجه النسائي في سننه ٤/ ٥٧ حديث رقم ١٩٤٧ وابن ماجة ١/ ٣٢ حديث رقم ٨٢۔ وأحمد في المسند ٦/ ٢٠٨۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ ایک انصاری بچہ فوت ہو گیا اس کے جنازہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا گیا۔ میں نے کہا اے اللہ کے رسول! اس بچہ کو خوشخبری ہو۔ یہ بچہ تو جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے۔ جس نے کوئی برا عمل نہیں کیا اور نہ ہی برائی کی حد تک پہنچا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے عائشہ! بات اس کے علاوہ کچھ اور ہو سکتی ہے یعنی اس کے جنتی ہونے کا جزم اور یقین نہ کرو۔ کیونکہ اللہ نے جنت کے لئے مستحق لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ جب کہ وہ اپنے باپوں کی پشت میں تھے اور جہنم کے لئے بھی مستحق لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ جب کہ وہ اپنے باپوں کی پشت میں تھے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا۔ ''عائشہ'' ہمزہ کے ساتھ ہے' اس کو یاء کے ساتھ پڑھنا غلط ہے' جیسا کہ عوام پڑھتے ہیں۔ یہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ ہیں۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہیں۔ ان کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی ''ام رومان بنت عامر بن عویمر'' ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اپنا پیام نکاح دیا اور ہجرت سے پہلے شوال ۱۰ نبوی میں بمقام مکہ ان سے عقد کیا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نکاح ہجرت سے تین سال پہلے ہوا اور بھی کچھ اقوال نقل کیے گئے ہیں۔ شوال ۲ھ میں ہجرت سے اٹھارہ (۱۸) ماہ بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی عمل میں آئی۔ اس وقت ان کی عمر نو (۹) سال تھی۔ کہا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں آمد کے سات (۷) ماہ بعد مدینہ میں یہ رخصتی عمل میں آئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نو (۹) سال رہیں۔ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر اٹھارہ (۱۸) سال تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ کسی اور کنواری سے شادی نہیں کی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، فقیہ، عالمہ، فصیحہ، فاضلہ تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بکثرت روایات کی ناقل ہیں۔ وقائع عرب ومحاربات اور اشعار کی زبردست ماہر وواقف تھیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم کے ایک بڑے طبقہ نے ان سے روایات نقل کیں۔ مدینہ طیبہ میں ۵۷ھ یا ۵۸ھ میں ۱۷ رمضان شب سہ شنبہ میں وفات پائی۔ آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ شب میں آپ کو دفن کیا جائے' بقیع میں مدفون ہوئیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اس وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور حکومت میں مدینہ میں مروان کے نائب تھے۔ ان کی مرویات کی تعداد ایک ہزار دو سو دس (۱۲۱۰) ہے۔

تشریح: قوله: قالت: دعي رسول الله ﷺ ...... ولم يد ركه دعي رسول الله ﷺ: الى جنازة صبي من الانصار:

جنازہ جیم کے فتحہ کے ساتھ ہے اور کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔

فقلت! يا رسول الله طوبى لهذا:

طوبی ''فعلی'' کا وزن ہے۔ طاب یطیب سے' یاء کو واؤ سے بدل دیا گیا اور باء کو فتحہ دے دیا گیا جیسا کہ ''بیض'' میں ہے جو جمع ہے ابیض کی اصل کو باقی رکھنے کے لیے اور اس کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اللہ کے قول ﴿طوبىٰ لهم﴾ [الرعد: ۲۹] کے بارے میں فرمایا کہ ان کے لیے خوشی اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگی اور کہا گیا ہے کہ ان کے لیے خوبی ہوگی' اور بعض نے کہا خیر اور کرامت ہوگی اور بعض نے کہا کہ طوبی حبشی زبان میں جنت کا نام ہے بعض نے کہا کہ جنت کا نام ہے ہندی زبان میں بعض نے کہا کہ جنت کے ایک درخت کا نام ہے اور بعض نے کہا کہ اس کا معنی کنایۃً یہ ہے کہ ان کو خیر پہنچے گی۔ اس لیے کہ خیر کا پہنچنا اچھی زندگی کے لیے لازم ہے اور اس لیے کہ جس کو خیر پہنچے اس کو طوبی لك کہا جاتا ہے پس لازم کا اطلاق ملزوم پر کر دیا گیا اور بعض نے کہا کہ طوبی اطیب کی تانیث ہے یعنی راحت اور عمدہ زندگی اس بچے کو حاصل ہوگی۔

هو عصفور من عصافير الجنة:

یعنی چھوٹا پرندہ۔ یعنی وہ بچہ اس چھوٹے پرندے کی طرح ہے جس پر کوئی گناہ نہیں ہے اور جنت میں جہاں چاہے پھر لے۔ ابن ملک نے کہا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس بچے کو چڑیا سے تشبیہ دی اس لیے کہ وہ چھوٹا ہے یا تو اس نسبت سے کہ چڑیا دوسرے پرندوں سے چھوٹی ہوتی ہے یا اس لیے کہ وہ گناہوں سے پاک ہے مکلف نہ ہونے کی وجہ سے اور زیادہ ظاہر دوسری بات ہے اور یہ تشبیہ بلیغ ہے اور جو یہ کہا گیا ہے کہ یہ تشبیہ کے باب میں سے نہیں ہے اس لیے کہ جنت میں پرندے نہیں ہوں گے تو یہ بات درست نہیں ہے۔ لئے کہ حدیث میں آیا ہے: **ان في الجنة طيرا كامثال البخت تاتي الرجل فيصيب منها لم تذهب كأن لم ينقص منها شيئ** اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ﴾[الواقعة: ۲۱] ''اور پرندوں کا گوشت جس قسم کا ان کا جی چاہے'' اور یہ حدیث کہ: **نسمة المؤمن اى روحه طائر تعلق في شجر الجنة** یہ سند کے اعتبار سے مانع ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی جیسا کہ واضح ہے۔

لم يعمل السوء:

السوء سین کے ضمہ کے ساتھ ہے اور فتحہ کے ساتھ پڑھنا بھی درست ہے۔ مراد گناہ ہے۔ مظہر نے کہا کہ یعنی ایسا گناہ نہیں کیا جو حقوق اللہ سے متعلق ہو۔ باقی رہے حقوق العباد جیسے مسلمان کا مال تلف کرنا اور کسی کو قتل کرنا' تو اس سے اس کا تاوان اور دیت لی جائے گی اور جب چوری کرے تو اس سے مال لیا جائے گا اور اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا اس لیے کہ یہ حقوق اللہ میں سے ہے۔

(صاحب مرقاۃ کہتے ہیں کہ) میں کہتا ہوں کہ اس کے یہ افعال گناہ شمار نہیں کیے جائیں گے پس غور و فکر کر۔

ولم يدركه:

یعنی اس کو برائی لاحق نہیں ہوئی پس یہ تاکید ہو جائے گی یا اس کو برائی کا ادراک نہیں ہوا یعنی برائی کا وقت اس کی موت کے لیے اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد تکلیف ہے چہ جائیکہ اس کا عمل اور تاسیس بہتر ہے اور مبالغہ کے فائدہ دینے کے ساتھ زیادہ مستحق ہے۔

قوله: فقال: او غير ذلك يا عائشه......وهم في اصلاب آبائهم۔

فقال او غير ذالك يا عائشه:

واؤ کے فتحہ اور راء کے ضمہ کے ساتھ اور کاف کے کسرہ کے ساتھ ہے یہی صحیح اور مشہور روایت ہے اور تقدیری عبارت یوں ہوگی:

اتعتقدين ما قلت؟ والحق غير ذٰلك:

(کہ جو تو کہتی ہے کیا اس کا اعتقاد رکھتی ہے حالانکہ حق اس کے علاوہ ہے) اور وہ اس بات پر یقین کا نہ ہونا ہے کہ وہ اہل جنت میں سے ہے۔ پس واؤ حالیہ ہے۔ **في الفائق**: فائق میں ہے کہ ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے اور واؤ کے ذریعے

محذوف عبارت پر عطف کیا گیا ہے اور "غیر" مرفوع ہے ضمیر کے ساتھ۔ تقدیری عبارت ہے: او وقع هذا ويحتمل غير ذلك' اور بعض نے کہا کہ "او' کو واؤ کے سکون کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے یعنی وہ "او" جو احدالامرین کے لیے آتا ہے یعنی یہ واقع ہوا ہے یا اس کے علاوہ اور بعض نے فرمایا کہ تقدیری عبارت یہ ہے: أو هو غير ذلك۔ اور "غیر" کے نصب کے ساتھ بھی روایت کی گئی ہے یعنی اویکون غیر ذالك؟ (یعنی یکون کی خبر ہوگا) یا تقدیری عبارت ہے أو غير ما قلت؟ اور بعض نے کہا کہ یہ بھی درست ہے کہ "او" "بل" کے معنی میں ہو جیسا کہ اللہ کا قول ہے: ﴿مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيدُونَ﴾ [الصافات: ۱٤۷] یعنی بل غير ذلك محتمل (بلکہ اس کے غیر کا احتمال بھی ہے) یا يحتمل غير ذالك اور گویا کہ نبی کریم ﷺ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ بات اچھی نہ لگی۔ اس لیے کہ آپؐ کے اس قول میں بچے کے والدین یا ان میں سے ایک کے ایمان کی تعیین کا یقین تھا اس لیے کہ بچہ والدین کا تابع ہوتا ہے اور استفہام کا معنی بیان پر یقین کے انکار اور عدم تعیین کو پکا کرنے کی طرف لوٹتا ہے۔

میں (صاحب مرقاۃ) کہتا ہوں کہ اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ کفار کی اولاد اہل جنت میں سے نہیں ہے بلکہ وہ اہل جہنم میں سے ہیں جیسا کہ آگے جملہ اس پر دلالت کرتا ہے۔

ان الله خلق للجنة اهله:

یعنی جو اس میں داخل ہوں گے اور اس کی نعمتیں حاصل کریں گے۔

خلقهم لها وهم فی اصلاب ابائهم:

اس کو مکرر لایا اس کے ساتھ ایک امر زائد کو معلق کرنے کے لیے اور وہ (امر زائد) آپ ﷺ کا قول وهم فی اصلاب آبائهم ہے اور جملہ حال ہے اہتمام کے لیے ہے اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ نسل کو آدم علیہ السلام کی پشت میں پیدا فرمایا اور اس اولاد کو ہر ایک کی پشت سے دنیا کے ختم ہونے تک نکالے گا اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد ازل میں یہ متعین کرنا ہے کہ یہ آدمی اہل جنت میں سے ہوگا اور یہ اہل جہنم میں سے۔ پس لوگوں کو سمجھانے کے لیے ازل کو اصلاب الآ باء سے تعبیر کر لیا۔

وخلق للنار اهلاً:

اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اس پر کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے اس لیے کہ وہ اسی جہنم کے مستحق ہیں یہ ایسا استحقاق ہے کہ اس کو خالق ہی جانتا ہے۔

خلقهم لها وهم فی اصلاب ابائهم:

ان سے وہی اعمال ظاہر ہوتے ہیں جو ازل میں ان کے لیے مقدر کر دیے گئے۔ قاضی نے کہا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ثواب اور عقاب اعمال کی وجہ سے ہوتا ہے ورنہ مسلمانوں اور کافروں کے بچے نہ جنت کے اہل ہوتے نہ جہنم کے بلکہ موجب اللہ کا لطف اور خذران الٰہی ہے جو کہ ان کے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا جبکہ وہ اپنے والدین کی پشت میں تھے۔ پس توقف کرنا اور یقین نہ کرنا واجب ہے کافروں اور مسلمانوں کے بچوں کا ٹھکانہ کیا ہوگا؟

امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ علماء کی ایک معتد جماعت کا اس بات پر اجماع ہے کہ مسلمانوں کے جو بچے فوت ہو جاتے ہیں وہ جنت میں جائیں گے۔ لیکن بعض علماء نے اس حدیث کی وجہ سے توقف کیا ہے۔ لیکن دوسرے علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بغیر دلیل قطعی کے یقینی بات میں جلدی کرنے سے منع فرمایا ہو اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے بچوں کے جنتی ہونے کا علم ہونے سے پہلے یہ فرمایا ہو۔ (ملا علی قاری فرماتے ہیں) زیادہ صحیح بات وہ ہے جو پہلے گذری ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول کو پسند نہیں فرمایا اس لیے کہ اس میں غیب پر حکم لگانا اور اس بچے کے ایمان کا یقینی ہونا تھا اس لیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک معین بچے کی طرف اشارہ کیا تھا اور کسی معین شخص پر یہ حکم لگانا کہ وہ اہل جنت میں سے ہے بغیر نص کے وارد ہونے کے درست نہیں ہے اس لیے کہ یہ علم غیب میں سے ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ ایمان و کفر کے اعتبار سے بچوں کا والدین کا تابع ہونا دنیا میں ہے اور اس کا حکم لگانا اُمورِ آخرت میں سے ہے۔

پس اس میں امت کو امور مبہمہ کے بارے میں توقف کرنے کی تعلیم ہے اور یہ کہ جس چیز کے بارے میں اس کو علم نہ ہو اس کے بارے میں خاموش رہے اور علام الغیوب کے سامنے حسن ادب کی ترغیب ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ شاید یہ اس سے پہلے کا قول ہے جب مشرکین و مومنین کے بچوں کا جنتی ہونا نازل ہوا اس لیے کہ مسلمانوں کے بچوں کے جنتی ہونے پر اجماع ہے اور کافروں کے بچوں کے بارے میں بھی زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ وہ جنتی ہیں۔

تقدیر پر ایمان کے ساتھ ساتھ عمل ضروری ہے

۸۵ :وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ كُتِبَ مَقْعَدُهٗ مِنَ النَّارِ وَمَقْعَدُهٗ مِنَ الْجَنَّةِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا نَتَّكِلُ عَلٰى كِتَابِنَا وَنَدَعُ الْعَمَلَ قَالَ اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُّيَسَّرٌ لِمَاخُلِقَ لَهٗ اَمَّامَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ السَّعَادَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ السَّعَادَةِ وَاَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الشَّقَاوَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ الشَّقَاوَةِ ثُمَّ قَرَاَ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى الْاٰيَةَ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

أخرجه البخاري في الصحيح ٣/٢٢٥ حديث ١٣٦٢ ومسلم ٤/٢٠٣٩ حديث ٦ والترمذي بعضه ٤/٣٨٧ حديث ٢١٣٥ وكذلك ابن ماجة ١/٣١ حديث رقم ٣١۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے ہر آدمی کا مقام اور ٹھکانہ جنت اور جہنم میں لکھ دیا گیا ہے۔ (یعنی یہ مقرر کر دیا گیا ہے کہ کون لوگ جنتی اور کون لوگ جہنمی ہیں) یہ سن کر صحابہ کرام نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول ! کیا ہم لکھی ہوئی تقدیر پر توکل اور اعتماد کر کے بیٹھ جائیں اور عمل کرنا چھوڑ دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ عمل کرو اس لئے کہ جو آدمی جس چیز کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس پر اس کو آسانی اور توفیق دی جاتی ہے لہٰذا جو آدمی نیک بختی کا اہل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو نیک بختی کے اعمال کی توفیق دے دیتا ہے اور جو آدمی بدبختی

کا اہل ہوتا ہے۔اس کو بدبختی کے اعمال کا موقع دیا جاتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی (جس کا ترجمہ ہے) جس نے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں مال دیا۔تقویٰ اختیار کیا اور اچھی بات یعنی کلمہ توحید کی تصدیق کی۔اس کے لئے ہم آسانی کی جگہ یعنی جنت آسان کر دینگے۔لیکن جس نے بخل کیا اور نفسانی خواہشات اور دنیا کی چمک دمک میں پھنس کر آخرت کی نعمتوں سے بے پرواہی اختیار کی اور عمدہ بات یعنی کلمہ توحید کی تکذیب کی تو اس کے لئے مشکل جگہ یعنی جہنم کی راہ آسان کر دینگے۔(بخاری ومسلم)

راویٔ حدیث:

علی بن ابی طالب ۔ یہ امیر المؤمنین علی ابن طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔ان کی کنیت ''ابوالحسن'' اور ''ابوتراب'' ہے قریشی ہیں۔اکثر اقوال کے اعتبار سے مردوں میں سب سے پہلے اسلام لانے والے ہیں اور بچوں میں سب سے پہلے اسلام لانے والے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر کے بارے میں اختلاف ہوا ہے کہا جاتا ہے کہ ان کی عمر ۱۵ سال تھی۔بعض نے کہا سولہ سال اور بعض نے آٹھ سال اور بعض نے دس سال بیان کی ہے۔آنحضور ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک ہوئے ہیں سوائے غزوۂ تبوک کے کہ وہ اپنے گھر والوں میں ضرورتاً چھوڑے گئے تھے۔اسی واقعہ کے سلسلہ میں آنحضور ﷺ نے ان سے فرمایا تھا کہ کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ تمہیں میری جانب سے وہ حیثیت حاصل ہو جو حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ السلام کی طرف سے تھی۔

حلیہ مبارک:

یہ گندم گوں تھے اور گیہواں رنگ کھلا ہوا تھا۔بڑی بڑی آنکھوں والے تھے لمبائی کے اعتبار سے کوتاہ قامتی کی طرف زیادہ مائل تھے (یعنی زیادہ طویل القامت نہ تھے) پیٹ بڑا تھا زیادہ بال والے چوڑی داڑھی والے تھے سر کے بال وسط میں سے اُڑے ہوئے تھے سر اور داڑھی دونوں سفید تھے۔

خلافت وشہادت:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے دن جو جمعہ کا روز تھا ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو خلیفہ بنائے گئے تھے اور عبدالرحمٰن بن ملجم مرادی نے کوفہ میں ۱۷ رمضان المبارک ۴۰ھ کو جمعہ کے دن صبح کے وقت آپ پر تلوار سے حملہ کیا تھا۔زخمی ہونے کے تین روز بعد انتقال فرمایا۔آپ کے دونوں صاحبزادوں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما اور عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے آپ کو غسل دیا۔نمازِ جنازہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔صبح کے وقت آپ کو دفن کیا گیا۔

تشریح: قولہ: مامنکم من احد......افلانتکل علی کتابنا وندع العمل؟

مامنکم من احد:

من استغراق نفی کو زیادہ کرنے والا ہے۔

الا وقد کتب مقعدہ من النار:

واؤ حالیہ ہے اور مستثنیٰ مفرغ ہے یعنی تم میں سے کوئی کسی حال میں نہیں ہو سکتا مگر اس حال میں یعنی اس کا ٹھکانہ مقدر ہوتا ہے جہنم میں سے (یا جنت میں سے)۔

ومقعده:

واؤ بمعنی "او" ہے اور بعض روایات میں لفظ أو بھی وارد ہوا ہے جیسا کہ سید جمال الدین نے تحریر کیا ہے اور مقعد کا معنی ہے موضع قعود یعنی بیٹھنے کی جگہ۔

من الجنة:

طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اہل جنت یا اہل جہنم میں سے ہونے کو اس میں استقرار سے کنایہ کیا ہے اور ظاہر کلام تقاضا کرتا ہے کہ ہر ایک کے لیے جنت میں بھی ٹھکانہ ہو اور جہنم میں بھی اور یہ اگر چہ عذاب قبر میں وارد ہونے والی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث میں ہے لیکن اس حدیث میں آگے آنے والی تفصیل اس معنی پر حدیث کو محمول کرنے سے روکتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ یہ کہا جائے کہ واؤ بمعنی اُو ہے۔

مظہر کا کہنا ہے کہ بعض روایات میں یہ حدیث لفظ واؤ کے ساتھ وارد ہوئی ہے لیکن شرح السنۃ میں یہ لفظ اُو کے ساتھ ہی ہے۔

قالو: یا رسول الله افلا نتكل على كتابنا:

یعنی اس کتاب پر جو ازل میں ہمارے لیے مقدر ہو چکی بعض نے کہا کہ فاء جواب شرط میں ہے یعنی یا رسول اللہ! جب معاملہ ایسے ہے جیسے آپ نے ذکر فرمایا تو کیا ہم اس پر اعتماد نہ کریں جو ازل میں ہمارے لیے لکھ دیا گیا ہے۔

وندع العمل:

یعنی ہم اعمال کو چھوڑ دیں۔ اس لیے کہ اپنی جانوں کو اعمال سے تھکانے کا کوئی فائدہ نہیں اس لیے کہ اللہ کے فیصلے تبدیل نہیں ہوتے۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں توکل کرنے اور اعمال ترک کرنے کی رخصت نہیں دی۔ (اور آگے والی بات ارشاد فرمائی)۔

قوله: قال: اعملوا فكل ميسر......وصدق بالحسنى

بلکہ عبودیت میں سے مولیٰ کے امتثال حکم دنیا کے اعتبار سے اور آخرت کے اعتبار سے حکم ربوبیت میں سے معاملے کو اللہ کے حوالے کرنے میں بندے پر جو واجب ہے اس کے التزام کا حکم فرمایا اور ان کو یہ بتایا کہ یہاں دو امر ہیں ان میں سے ایک دوسرے کو باطل نہیں کرتا' ایک باطن ہے جو کہ ربوبیت کا حکم اور دوسرا ظاہر ہے جو بندگی کی علامت ہے۔ پس دونوں کا حکم دیا تا کہ باطن سے خوف متعلق ہو جائے اور ظاہر سے امید وابستہ ہو جائے تا کہ بندہ اس کے ذریعے ایمانی صفات' یقین کی خوبیوں اور احسان کے مراتب کی تکمیل کرے۔ یعنی مقتضائے عبودیت کے مطابق تکالیف شرعیہ میں سے اوامر کا التزام اور نواہی سے اجتناب تمہارے اوپر لازم ہے اور امر ربوبیت میں تصرف کرنے سے خود کو بچاؤ اور اعمال کو نیک بختی اور بد بختی کے لیے اسباب

نہ بناؤ بلکہ یہ علامات اور نشانیاں ہیں پس ہر ایک کو اس کی توفیق ہوتی ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے یعنی خیر و شر میں سے جو کچھ اس کے مقدر میں ہے اس کے لیے۔ پس :فکل میں فاء سببیت کے لیے ہے اور تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ سے جس امر مبہم پر بیان وارد ہوا ہے وہ یہ ہے کہ بندوں کے حق میں تقدیرِ اللہ کی تدبیر کے مطابق واقع ہوتی ہے اور یہ ان کے اعمال کی تکلیف کو باطل نہیں کرتی۔ بندگی کے حق کے ساتھ۔ پس مخلوق میں سے ہر ایک کے لئے غیب میں جو تدبیر کی گئی ہے اس کے لئے وہی آسان ہوتا ہے۔ پس اس کا عمل اس کو چلاتا ہے اس سعادت اور شقاوت کی طرف جو ازل میں اس کے لئے لکھ دی گئی۔ پس عمل کا مطلب ثواب وعقاب کے لئے تعرض ہے اور اس کی نظیر تقسیم شدہ رزق ہے باوجود کمائی کے حکم کے۔ پھر آپ ﷺ نے اجمال کی تفصیل اپنے اس فرمان سے کی جو آگے آ رہا ہے:

اما من کان:

یعنی اللہ کے علم یا اللہ کی کتاب یا اس کے آخری معاملے یا عمل کے خاتمے کے اعتبار سے۔

من اھل السعادۃ:

یعنی دنیا میں ایمان اور آخرت میں دخولِ جنت۔

فسنییسّر لعمل السعادۃ:

یعنی اس کے لئے آسان کیا جاتا ہے اور اس کو توفیق ہوتی ہے' سعادت کے اعمال کی۔

واما من کان من اھل الشقاوۃ:

شقاوۃ (بدبختی) سعادۃ کی ضد ہے اور مصابیح میں "شقوۃ" کا لفظ ہے۔ شین کے کسرہ کے ساتھ اور "شقوۃ" مصدر ہے "شقاوۃ" کے معنی میں ہے۔

فسنییسر لعمل الشقاوۃ:

شقاوۃ کے عمل سے مراد اہل شقاوۃ یعنی کفار و فجار کا عمل ہے۔

ثم قرأ:

یعنی نبی کریم ﷺ نے بطور استشہاد کے اور اپنی بات کو پکا کرنے کے لئے اس آیت کی تلاوت فرمائی:

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی﴾ [اللیل: ٥'٦]

"یعنی جس نے اللہ کے حکم کو پورا کیا اور مال میں سے بھی اس کا حق ادا کیا" اور اللہ کی مخالفت اور سزا سے ڈرا اور اس کی نافرمانی سے اجتناب کیا اور لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کیا۔

اس کلمہ کا ذکر بعد میں کیا گیا ترقی میں الادنیٰ الی الاعلیٰ کی غرض سے اور حسن خاتمہ کی طرف اشارہ کرنے کے لئے۔ یہ بات واضح ہے کہ الحسنیٰ آیت کا آخری حرف ہے اور یہاں مراد مابعد کی آیات ہیں جو اس کے ساتھ متعلق ہیں اور اس مقام کے مناسب ہیں اور وہ یہ ہیں:

فسنیسرہ للیسر :بیضاوی نے فرمایا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہم اس کو ایسی عادت کی توفیق دیں گے جو ان کو آسانی اور راحت کی طرف لے جائے گی۔جیسا کہ جنت میں داخل ہونا۔

واما من بخل وستغنی و کذّب بالحسنی:

یعنی جس نے بخل کیا اس چیز سے جس کا اسے حکم دیا گیا تھا اور دنیا کی خواہشات میں پڑ کر آخرت کی نعمتوں سے لاپرواہی کی اور کلمہ توحید کو جھٹلایا۔

فسنیسرہ للعسری:

یعنی اس عادت کے ساتھ جو کہ تنگی اور شدت کی طرف لے جائے گی جیسا کہ جہنم میں داخل ہونا۔

اور ''کشاف'' میں خیر کے طریقے کو ''یُسر'' کا نام دیا ہے اس لئے کہ اس کا انجام یُسر (آسانی) ہے اور برائی کے طریقے کو ''عُسر'' کا نام دیا ہے۔اس لئے کہ اس کا انجام ''عسر'' ہے۔

اور معالم میں ہے کہ فسنیسرہ سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں ہم آسانی کے لئے اس کو تیار کریں گے۔آسان عادت کے ذریعے اور وہ عمل کرنا ہے اس بات پر جس سے اللہ راضی ہوتا ہے اور جس نے نیکی کے خرچ کرنے میں بخل کیا اور اللہ کے ثواب سے لاپرواہی کی اور اس کی طرف راغب نہ ہوا تو ہم اس کے لئے ''عُسر'' کو آسان کر دیں گے۔یعنی ہم اس کو ''عُسر'' کے لئے تیار کریں گے اس طور پر کہ اس کے ہاتھ پر برائی کو جاری کر دیں گے یہاں تک کہ وہ ایسے کام کرے گا جو اللہ کو ناپسند ہیں اور اس کے ذریعہ جہنم کا مستحق ہو جائے گا۔

مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خیر اور نیکی کا کام کرنا اس کے لئے مشکل کر دیا جائے گا۔

یہ بات واضح ہے کہ جو کچھ تفسیر بیضاوی میں ہے وہ حدیث کے موافق نہیں ہے۔اس لئے کہ یہ حدیث کے معنی مقصود کے برعکس ہے۔

پس مدار اس پر ہے جو کہ ''معالم'' اور ''کشاف'' میں ہے لیکن آیت کریمہ میں سین کو صرف تاکید پر محمول کیا جائے گا نہ کہ استقبال پر۔واللہ اعلم بالحال۔

تقدیر کے لکھے سے فرار ممکن نہیں

۸۶ :وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَى ابْنِ اٰدَمَ حَظَّهٗ مِنَ الزِّنَا اَدْرَكَ ذٰلِكَ لَا مَحَالَةَ فَزِنَا الْعَیْنِ النَّظْرُ وَزِنَا اللِّسَانِ الْمَنْطِقُ وَالنَّفْسُ تَمَنّٰی وَتَشْتَهِیْ وَالْفَرْجُ یُصَدِّقُ ذٰلِكَ وَیُكَذِّبُهٗ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ وَفِیْ رِوَایَةٍ لِّمُسْلِمٍ قَالَ كُتِبَ عَلَى ابْنِ اٰدَمَ نَصِیْبُهٗ مِنَ الزِّنَا مُدْرِكٌ ذٰلِكَ لَامَحَالَةَ اَلْعَیْنَانِ زِنَاهُمَا النَّظْرُ وَالْاُذُنَانِ زِنَاهُمَا الْاِسْتِمَاعُ وَاللِّسَانُ زِنَاهُ الْكَلَامُ وَالْیَدُ زِنَاهَا الْبَطْشُ وَالرِّجْلُ زِنَاهَا الْخُطَا وَالْقَلْبُ یَهْوٰی وَیَتَمَنّٰی وَیُصَدِّقُ ذٰلِكَ الْفَرْجُ وَیُكَذِّبُهٗ.

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱/ ۲٦ حدیث رقم ٦٣٤٣۔ومسلم فی صحیحه ٤/ ۲۰٤٦ حدیث ۲۰ والروایة الثانیة ٤/ ۲۰٤۷ وأخرجه أبوداؤد ۲/ ٦۱۱ حدیث ۲۱۵۲ وأحمدفی المسند ۲/ ۲۷٦۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جتنا حصہ انسان کی تقدیر میں زنا کا لکھدیا ہے۔ وہ ضرور اس سے سرزد ہوگا۔ آنکھوں کا زنا' غیر محرم کی طرف دیکھنا ہے اور زبان کا زنا غیر محرم عورتوں سے شہوت انگیز گفتگو کرنا ہے اور انسان کا نفس خواہش اور آرزو کرتا ہے اور شرم گاہ اس آرزو کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔ (بخاری ومسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ انسان کے نوشتہ تقدیر میں زنا کا جتنا حصہ لکھدیا گیا ہے۔ وہ اسے کر کے رہے گا۔ آنکھوں کا زنا غیر محرم عورت کی طرف دیکھنا ہے اور کانوں کا زنا غیر محرم عورت سے شہوت انگیز گفتگو سننا ہے اور زبان کا زنا غیر محرم عورت سے شہوت انگیز کلام اور گفتگو کرنا ہے اور ہاتھوں کا زنا غیر محرم عورت کو برے ارادہ سے پکڑنا ہے اور پاؤں کا زنا بدکاری کی طرف چل کر جانا ہے اور دل کا زنا خواہش اور آرزو کرنا ہے اور شرم گاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔

تشریح: قوله :ان الله كتب على ابن ادم حظه من الزنا......

ان الله كتب على ابن ادم:

یعنی اللہ نے لوحِ محفوظ میں لکھ دیا ہے۔

حظه: یعنی حصہ۔

من الزنا: لفظ زنا قصر کے ساتھ ہے فصیح زبان میں۔ من بیانیہ ہے اور جو اس کے ساتھ متصل ہے یہ "حظه" سے حال ہے۔

اور اس من کو تبعیضیہ بنانا جیسا کہ ابن حجر نے کہا ہے غیر ظاہر ہے اور حظ سے مراد مقدماتِ زنا' تمنا کرنا' چل کر جانا' اس کی وجہ سے گفتگو کرنا' دیکھنا' چھونا اور تنہائی اختیار کرنا وغیرہ ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ لوحِ محفوظ میں سبب زنا کو لکھ دیا ہے اور وہ (سبب زنا) شہوت' عورتوں کی طرف مائل ہونا اور اس میں آنکھوں' کانوں' دل اور شرمگاہ کو پیدا کرنا ہے اور وہ زنا کی لذت پاتے ہیں یا مراد ازل میں اس بات کا مقدر ہونا ہے کہ فی الجملہ اس سے زنا جاری ہوگا۔

ادرك ذلك:

یعنی ابن آدم کا حصہ' یا قدر وقضا جو اس کے لئے لکھا گیا ہے اس کو پہنچے گا۔

لا محالة:

میم کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے یعنی اس کے لئے ضروری ہے اور اس سے علیحدگی نہیں ہوسکتی اور اس سے کوئی حیلہ نہیں ہے اور یہ یقینی ہے۔

فزنا العين النظر:

''عین'' مفرد ہے مراد جنس ہے اور ایک نسخے میں تثنیہ بھی ہے۔ یعنی اس (آنکھ) کا حصہ کسی حرام چیز کو شہوت کی نگاہ سے دیکھنا ہے اور حدیث میں آیا ہے:

(النظر سهم مسموم من سهام ابليس)

اس لئے کہ کبھی نظر زنا کی طرف کھینچتی ہے۔ پس مبالغۃً مقدمہ زنا کو لفظ زنا سے تعبیر کر دیا یا مسبّب کا اطلاق سبب پر کر دیا۔

و زنا اللسان المنطق:

یعنی حرام طریقے پر گفتگو کرنا جیسے (بدکاری کا) وعدہ کرنا۔

والنفس تمنّی وتشتهی:

نفس سے مراد دِل ہے جیسا کہ آنے والی روایت میں ہے یا یہ کہ نفس جب طلب کرتا ہے تو دِل اس کی اتباع کرتا ہے اور تمنی اصل میں تتمنّی تھا ایک تا کو حذف کر دیا گیا ہے۔

اور یہاں سابقہ طریقے سے ہٹ کر الفاظ لائے تجدّد کے فائدے کے لئے یعنی نفس کا زنا حقیقی زنا میں واقع ہو جانے کی تمنا اور خواہش کرنا ہے اور تمنی اشتہاء سے عام ہے۔ اس لئے کہ تمنا زنا کے علاوہ ممتنعات میں بھی ہوتی ہے اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ زنا کی (یا کسی بھی گناہ کی) تمنا جب باطن میں ٹھہر جائے' آدمی اس پر اصرار کرے اور اس کو دور نہ کرے تو اس کو زنا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پس یہ معصیت بن جاتی ہے اور اس پر سزا مرتب ہوگی۔ اگرچہ اس پر عمل نہ کرے۔ (فتامل)

والفرج يصدق ذلك او يكذبه:

طیبی نے فرمایا کہ ان اشیاء کو لفظ زنا سے تعبیر کیا اس لئے کہ یہ زنا کے مقدمات اور اس کی طرف آگاہی کرنے والی ہیں اور تصدیق و تکذیب کی نسبت شرمگاہ کی طرف کی اس لئے کی کہ شرمگاہ زنا کا منشاء اور مکان ہے یعنی اس کی تصدیق کرتی ہے اس کی خواہش کے موافق کر کے اور اس سے رک کر اس کی تکذیب کرتی ہے اور بعض نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس نے شرمگاہ سے وہ کام کر لیا جو ان چیزوں کا مقصود ہے تو شرمگاہ ان اعضاء کی تصدیق کرنے والی ہوگئی اور اگر اس نے وہ کام چھوڑ دیا جو کہ ان کا مقصود ہے تو شرمگاہ ان اعضاء کی تکذیب کرنے والی ہوگئی۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر اس کا زنا متحقق ہو گیا تو وہ آدمی اس کبیرہ کا مرتکب ہو جائے گا اور اگر وہ اس کی تکذیب کرتا ہے اس طور پر کہ زنا نہ کرے تو ان اعضاء کا زنا بدستور صغیرہ گناہ رہے گا۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ کہا جائے کہ شرمگاہ کی تصدیق و تکذیب سے مراد شرمگاہ کے عمل کی تصدیق و تکذیب ہے۔ یہ لفظوں کے زیادہ قریب اور معنی کے زیادہ مناسب ہے۔

اور بعض نے کہا کہ ''کتب'' کا معنی یہ ہے کہ اس پر یہ ثبت کر دیا اس طور پر کہ اس کے حواس پیدا فرمائے جن کے ذریعے وہ اس چیز کی لذت پاتا ہے اور اس کو وہ قویٰ عطا کئے جن کے ذریعے وہ اس فعل پر قادر ہوتا ہے۔ پس آنکھوں اور ان میں رکھی گئی قوت باصرہ کے ذریعے وہ دیکھنے کی لذت پاتا ہے اسی طرح دوسرے اعضاء و حواس کا حال ہے۔ پس یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ

نے اس کو اس فعل پر مجبور کیا ہے بلکہ اللہ نے اس کی فطرت میں خواہشاتِ نفس کی محبت رکھ دی ہے۔ پھر اپنے فضل و رحمت سے اللہ جس کو چاہتے ہیں محفوظ رکھتے ہیں۔ اسی طرح بعض شراح نے بیان فرمایا ہے۔

بعض نے فرمایا کہ یہ اپنے عموم پر نہیں ہے۔ اس لئے کہ خواص زنا اور اس کے مقدمات سے معصوم ہوتے ہیں اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ یہ اپنے عموم پر باقی رہے اس طور پر کہ یہ کہا جائے کہ اللہ نے بنی آدم میں سے ہر ایک پر نفس زنا کا صدور لکھ دیا ہے۔ پس جس کو اللہ اپنے فضل سے محفوظ کرتے ہیں تو اس سے زنا کے مقدماتِ ظاہرہ صادر ہوتے ہیں اور جس کو اللہ اپنے مزید فضل و رحمت سے مقدمات کے صدور سے بھی بچا دیتے ہیں تو ان سے فطرت کے تقاضے کے مطابق مقدماتِ باطنہ یعنی نفس کی خواہش اور اشتہاء ضرور صادر ہوتے ہیں اور یہ لوگ اللہ کے خواص ہوتے ہیں (جن کو مقدماتِ ظاہرہ سے بھی بچایا جاتا ہے)۔

میں (ملا علی قاریؒ) کہتا ہوں کہ مقدماتِ باطنہ سے مراد برے خیالات ہیں جو کہ غیر اختیاری ہیں اور اس بات کی تائید اللہ کے اس قول سے ہوتی ہے:

﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا﴾ [یوسف : ۲۴]

تخریج: متفق علیہ ہے اور اس کو ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے۔

وفی روایة لمسلم:

یعنی ایک دوسری روایت جو کہ مسلم میں ہے اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

کتب علی ابن آدم نصیبه من الزنا:

"کتب" مجہول کا صیغہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ معروف ہے اور ابن آدم سے مراد ابن آدم کی جنس ہے یا اس کے افراد میں سے ہر فرد مراد ہے اس سے انبیاء مستثنیٰ ہوں گے۔ نصیب سے مراد حصہ یا وہ مقدار جو اس کے لئے مقدر ہے۔

مدرك ذلك: (شرح میں تو مدرک ہے ورنہ متن میں یدرکہ ہے فتامل)

لفظ مدرک تنوین کے ساتھ ہے اور اضافت بھی جائز ہے اور "ذلك" سے مراد "هو" ہے۔ یعنی اس ابن آدم کو اس کا حصہ اور نصیب پہنچنے والا ہے یا یہ کہ اس کا نصیب مقدر اس کو پائے گا اور اس کو پہنچے گا۔

لا محالة:

یعنی اس کے اور اس کے حصے کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور اس کے پاس اس حصے سے بچنے کا کوئی حیلہ نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے لئے اس سے کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ اس لئے کہ تقدیر سے بچا نہیں جا سکتا اور اللہ کے فیصلے کے خلاف کسی کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

العینان زناهما النظر:

اس لئے کہ دیکھنا ان کا حصہ اور ان کی لذت ہے۔

والاذنان زناهما الاستماع:

"الاذنان" ذال کے ضمہ کے ساتھ ہے اور ساکن بھی پڑھا جاتا ہے۔ یعنی کانوں کا زنا زانیہ کے واسطے (زانی اور زانیہ کے درمیان واسطے کا کام کرنے والا ہے) کی باتیں سننا ہے اور یہ کانوں کا حصہ اور ان کی لذت ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس سے مراد مطلقاً اجنبی عورت کی آواز سننا ہے۔ اس قول کی بنا پر کہ عورت کی آواز ستر ہے اور فتنہ کے خوف کی شرط کے ساتھ زیادہ صحیح قول کی بناء پر کہ عورت کی آواز ستر نہیں ہے۔

واللسان زناہ الکلام:

یعنی اجنبیہ کے ساتھ زنا کا وعدہ کرنا یا اس آدمی کے ساتھ جس کے ذریعے سے اس تک پہنچتا ہے حرام طریقے سے اور اسی میں اس کے بارے میں شعر بنانا اور شعر پڑھنا شامل ہے۔

والید زناھا البطش:

یعنی پکڑنا اور چھونا اور اسی میں اس کی طرف خط لکھنا' اس کی طرف کنکریاں پھینکنا اور اس طرح کے دوسرے افعال شامل ہیں۔

والرّجل زناھا الخطا:

"خطا" جمع ہے خطوۃ کی اور خطوۃ (چلنے کے دوران) قدموں کے درمیان کا فاصلہ ہے۔ یعنی پاؤں کا زنا قدموں کو منتقل کرنا یا سوار ہو کر زنا کے لئے جانا ہے۔

والقلب یھوی و یتمنی:

"یھوی" واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہے یعنی پسند کرتا ہے اور خواہش کرتا ہے۔

و یصدق ذلك الفرج:

یعنی شرمگاہ مقدمات زنا' تمنائے نفس اور حواسِ جنس کی طرف بلاتے ہیں' اس کی موافقت کرتی ہے اور فعل سے اس کی مطابقت کرتی ہے یعنی جماع کرتی ہے۔

ویکذبه:

یعنی زنا کو ترک کر کے اور اس سے رک کر تکذیب کرتی ہے۔ پس اگر اس نے اللہ کے خوف سے یہ کام چھوڑ دیا تو اس کو ثواب ملے گا اور اگر اضطراراً چھوڑ دیا تو صرف اس کو سزا نہیں ملے گی۔

ایک شبہے کا ازالہ

۸۷ : وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ الْحُصَيْنِ اَنَّ رَجُلَيْنِ مِنْ مُزَيْنَةَ قَالَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ مَا يَعْمَلُ النَّاسُ الْيَوْمَ وَيَكْدَحُوْنَ فِيْهِ اَشَيْءٌ قُضِيَ عَلَيْهِمْ وَمَضٰى فِيْهِمْ مِنْ قَدَرٍ سَبَقَ اَوْفِيْمَا يَسْتَقْبِلُوْنَ بِهٖ مِمَّا اَتَاهُمْ بِهٖ نَبِيُّهُمْ وَثَبَتَتِ الْحُجَّةُ عَلَيْهِمْ فَقَالَ لَابَلْ شَيْءٌ قُضِيَ عَلَيْهِمْ وَمَضٰى فِيْهِمْ وَتَصْدِيْقُ ذٰلِكَ

فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰھَا فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا۔ (الشمس ۷،۸) ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/٢٠٤١ حديث ١٠۔

ترجمہ: حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ قبیلہ مزینہ کے دو آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا اے اللہ کے رسول! ہمیں یہ بتائیں کہ آج دنیا میں لوگ جو عمل کرتے ہیں اور اعمال کی کوشش میں لگے رہتے ہیں کیا یہ وہی چیز ہے جس کا حکم اور فیصلہ ہو چکا ہے اور تقدیر میں لکھا جا چکا ہے یا یہ عمل ان احکامات کے موافق ہے جو آئندہ زمانہ میں ہونے والے ہیں جن کو ان کا نبی لایا ہے اور جن پر دلیل ثابت ہو چکی ہے رسول اللہ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا نہیں بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے اور تقدیر میں لکھا جا چکا ہے اور اس کی تصدیق کتاب اللہ کی اس آیت سے ہوتی ہے: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰھَا فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا ۔ قسم ہے انسان کی جان کی اور قسم ہے اس ذات کی جس نے اس کو ٹھیک بنایا پھر اس کو گناہ اور پرہیزگاری دونوں کا القاء کیا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

راوئ حدیث:

عمران بن حصین۔ عمران بن حصین کی کنیت "ابو نجید" ہے خزاعی و کعبی ہیں۔ خیبر کے سال اسلام لائے۔ بصرہ میں قیام فرمایا اور وہیں ان کی وفات ۵۲ھ میں ہوئی۔ بڑے فاضل اور فقیہ صحابہ میں سے تھے۔ یہ اور ان کے والد دونوں مشرف باسلام ہوئے۔ "مرقاۃ" میں یوں ہے کہ یہ اور ان کا بیٹا ایک ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئے اھ۔ ان سے ابو رجاء اور مطرف اور زرارہ بن ابی اوفیٰ روایت کرتے ہیں۔ نجید نون کے پیش جیم کے زبر یاء کے سکون اور دال مہملہ کے ساتھ ہے۔ "حصین" صیغۂ تصغیر کے ساتھ ہے۔

تشریح: قوله :ان رجلين من مذينة...... فالهمها فجورها و تقوٰها۔

ان رجلين من مزينة قالا:

"مزينة" تصغیر کے ساتھ ہے اور ایک قبیلہ کا نام ہے۔

يا رسول الله! ارأيت :

یعنی ہمیں خبر دیجئے۔ سبب کا اطلاق مسبب پر کرنے کی قبیل سے ہے۔ اس لئے کہ چیزوں کو دیکھنا ان کے بارے میں خبر دینے کا ایک طریقہ ہے اور اس میں ہمزہ تقریر کے لئے ہے۔ یعنی تحقیق آپ اس کو دیکھ چکے ہیں۔ پس ہمیں اس کی خبر دیجئے۔

ما يعمل الناس اليوم و يكدحون فيه:

یعنی خیر اور شر میں سے لوگ دنیا میں جو کچھ کرتے ہیں اور اس کے حاصل کرنے کے لئے محنت اور مشقت سے کوشش کرتے ہیں۔

أشئ :

یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی أهو شئ۔

قضى عليهم و مضى فيهم:

"قضی" مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ یعنی اس کا کرنا ان کے لئے مقدر ہے اور "مضی" معلوم کے صیغہ کے ساتھ ہے یعنی ان کے حق میں نافذ ہو گیا ہے۔

من قدر سبق:

یعنی ازل میں (ان کے لئے مقدر ہو چکا) اور من یا تو بیانیہ ہوگا "شیٔ" کے لئے اور قضا اور قدر ایک ہی چیز ہوگی۔ جیسا کہ بعض نے کہا ہے یا اطلاقِ لغوی کے اعتبار سے۔

اور یا (من) تعلیلیہ ہوگا اور "قضی" کے ساتھ متعلق ہوگا یعنی قضی علیهم لاجل قدر سبق۔

اور یا (من) ابتدائیہ ہوگا یعنی قضا خلق مقدر سے پیدا ہوئی اور شروع ہوئی۔ پس قدر مقدم ہوگی قضا پر۔

نہایہ میں فرمایا کہ قدر سے مراد تقدیر ہے اور قضاء سے مراد پیدا کرنا ہے۔

مقدر کا لکھا مٹ نہیں سکتا

۸۸ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ رَجُلٌ شَابٌّ وَّاَنَا اَخَافُ عَلٰی نَفْسِی الْعَنَتَ وَلَا اَجِدُ مَا اَتَزَوَّجُ بِهِ النِّسَاءَ کَاَنَّهٗ یَسْتَاْذِنُهٗ فِی الْاِخْتِصَاءِ قَالَ فَسَکَتَ عَنِّیْ ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَسَکَتَ عَنِّیْ ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَسَکَتَ عَنِّیْ ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا اَبَاهُرَیْرَةَ جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا اَنْتَ لَاقٍ فَاخْتَصِ عَلٰی ذٰلِكَ اَوْذَرْ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۹/۱۱۷ حدیث رقم ۵۰۷۶۔ والنسائی فی سننه ۶/۸۹ حدیث رقم ۳۲۱۵۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ! میں ایک جوان آدمی ہوں اور میں اپنے نفس کے بارے میں خوف زدہ رہتا ہوں کہ میرا نفس بدکاری کی طرف مائل نہ ہو جائے اور میرے اندر اتنی استطاعت نہیں ہے کہ میں کسی عورت سے نکاح کر لوں گویا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اپنے اندر سے مردانہ قوت کو ختم کر دینے کی اجازت مانگ رہے تھے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری یہ بات سن کر خاموشی اختیار کی میں نے دوبارہ یہی سوال کیا تو آپ پھر بھی خاموش رہے۔ میں نے پھر تیسری مرتبہ یہی عرض کیا پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے کچھ نہیں فرمایا میں نے پھر یہی عرض کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابو ہریرہ! جو کچھ ہونا ہے اس کو تمہارے مقدر میں لکھ دیا گیا اور قلم خشک ہو چکا ہے لہٰذا تمہیں اختیار ہے کہ مردانہ قوت کو ختم کر و یا نہ کرو۔

تشریح: قوله قلت ...... فاختص علی ذلك اوذر۔

انی رجل شاب: یعنی بہت شہوت والا آدمی ہوں۔

وانا اخاف علی نفسی العنت:

شیخ نے فرمایا کہ بخاری میں "انی اخاف" کے الفاظ ہیں۔

"نفسی" فاء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور اس کو ساکن بھی پڑھا جاتا ہے اور "العنت" دو فتحوں کے ساتھ ہے یعنی زنا

اس کے مقدمات اور اصل میں عنت مشقت کو کہتے ہیں اور زنا کا نام العنت رکھا گیا ہے اس لئے کہ زنا دنیا اور آخرت میں عذاب کا باعث ہے۔

ولا اجد ما اتزوج به النساء۔

"نساء" سے مراد جنس نساء ہے۔ یعنی میں اتنی مقدار میں مال نہیں پاتا کہ کسی عورت سے نکاح کروں اور اس پر خرچ کروں۔ پس جب وہ عورت سے نکاح کرنے سے عاجز ہو گئے تو باندی خریدنے سے بطریق اولیٰ عاجز ہوئے۔

کانہٗ یستاذنہ فی الاختصاء:

"اختصاء" مد کے ساتھ ہے یعنی خصیتین کا کاٹنا یا ان کو نکالنا اور عضو مخصوص کے کاٹنے کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ پس یہ تغلیباً اختصاء ہو گیا۔

یہ راوی کا کلام ہے' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور ابہری نے فرمایا کہ یہ الفاظ بخاری شریف میں موجود نہیں ہیں۔

قال :فسکت عنی:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے جواب سے خاموشی اختیار فرمائی۔

ثم قلت مثل ذلك فسکت عنی:

یعنی پھر میں نے وہی بات عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار فرمائی۔

ثم قلت ذالك فسکت عنی:

پھر وہی بات عرض کی کہ شاید مجھے جواب دے دیں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری بار بھی خاموشی اختیار فرمائی۔

ثم قلت مثل ذلك:

یعنی اصرار اور مبالغہ کے لئے وہی بات پھر کہی۔

فقال النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) :

ایک نسخہ میں "فقال رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم)" کے الفاظ ہیں۔

یا ابا هریرة! جف القلم بما انت لاق:

یعنی جو تو کرتا ہے یا جو بولتا ہے وہ تمہیں ملنے والا ہے اور تمہارے اوپر جاری ہونے والا ہے۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قلم کا خشک ہونا تقدیر کے لکھنے میں قلم کے جاری ہونے اور اس سے فارغ ہونے سے کنایہ ہے۔ اس لئے کہ شروع ہونے کے بعد فارغ ہونا قلم کے سیاہی سے خشک ہونے کو مستلزم ہے۔ پس لازم کا اطلاق ملزوم پر کر دیا گیا اور یہ عبارت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقتضائے فصاحت میں سے ہے۔

فاختص:

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ صحیح روایت صاد کی تخفیف کے ساتھ فاختص ہے۔ اختصاء مصدر سے ہے اور بعض نقل

کرنے والوں نے غلطی کی اور اس کو اس طرح روایت کیا ہے جیسے مصابیح میں ہے یعنی راء کی زیادتی کے ساتھ **فاختصر** روایت کیا ہے اور کہا (تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے) کہ یہ بات صرف عوام پر مشتبہ ہو سکتی ہے۔

اور طیبی کی شرح میں ہے کہ بخاری' کتاب الحمیدی' شرح السنۃ اور مصابیح کے بعض نسخوں میں حدیث اسی طرح ہے جیسے تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

علی ذٰلك:

یہ موضع حال میں واقع ہے یعنی جب تمہیں معلوم ہو گیا کہ ہر چیز تقدیر میں لکھی ہوئی ہے۔ اس حال میں کہ آپ کا فعل تم اختصاء کرو اور ترکِ فعل واقع ہوں گے' اس کے مطابق جس پر قلم خشک ہو چکا ہے

اَوْ ذر:

یعنی اختصاء کو ترک کر دے اور یقین رکھ اور قضاء کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے اور "اَوْ" یہاں تخییر کے لئے ہے۔

مظہر نے کہا کہ جو کچھ ہو چکا اور جو ہونے والا ہے سب ازل میں مقدر ہو چکا ہے۔ پس اختصاء میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ پس اگر تو چاہے تو اختصاء کر اور اگر چاہے تو ترک کر دے۔ یہ اختصاء کی اجازت نہیں ہے بلکہ بے فائدہ کسی عضو کے کاٹنے کی اجازت طلب کرنے پر توبیخ اور ملامت کے ہے۔

اور بعض نے کہا کہ "اَوْ" تسویہ کے لئے ہے۔ جیسا کہ مصابیح کے اکثر نسخوں میں "**فاختصر او ذر**" کے الفاظ آئے ہیں اور مراد یہ ہے کہ تقدیر پر اختصار کرنا اور اس کے لئے سرِ تسلیم خم کرنا اور اس کا ترک اور اس سے اعراض برابر ہے۔ پس جو خیر اور شر میں سے کچھ تیری تقدیر میں لکھا ہوا ہے وہ ضرور تمہیں ملے گا اور جو تقدیر میں نہیں لکھا ہوا وہ نہیں ملے گا۔

اور ذکر کیا گیا ہے کہ عبداللہ بن طاہر رحمۃ اللہ علیہ نے حسین بن الفضل کو بلایا اور کہا کہ مجھ پر اللہ کا قول: ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾ [الرحمٰن: ۲۹] اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول "**جف العلم بما انت لاق**" مشکل ہو گیا ہے۔ پس انہوں (حسین بن الفضل) نے جواب دیا کہ وہ ایسے امور ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے ذریعے ابتداء نہیں کرتے۔ پس عبداللہ (بن طاہر) کھڑے ہوئے اور ان کے سر کو چوم لیا۔

ساری انسانیت کے دِل اللہ عزوجل کی دو اُنگلیوں کے مابین ہیں

۸۹: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ قُلُوْبَ بَنِیْ اٰدَمَ كُلَّهَا بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ كَقَلْبٍ وَّاحِدٍ يُصَرِّفُهٗ كَيْفَ يَشَاءُ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰى طَاعَتِكَ. (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في الصحيح ٤/ ٢٠٤٥ حديث ١٧ وأحمد في المسند ٢/ ١٦٨۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمام انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں ایک انسان کے دل کی طرح اور وہ اپنی انگلیوں سے جس

طرح چاہتا ہے دلوں کو گردش میں لاتا ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے بطور دعا کے ارشاد فرمایا: اے اللہ! جو دلوں کو پھیرنے والا ہے ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله :ان قلوب بنی ادم کلها...... یصرفه کیف یشاء:

ان قلوب بنی ادم کلها:

یعنی اس جنس کے اور بنی آدم کو خاص اس لئے کیا کہ بنی آدم کے دِلوں میں تقلیب (بدل جانے) کی خصوصیت پائی جاتی ہے اور ''کلها'' سے اس کو مؤکد کیا تاکہ انبیاء اولیاء اور بدبختوں میں سے کافروں اور فاجروں سب کو شامل ہو جائے۔

تورپشتی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ حدیث ان احادیث میں سے نہیں ہے جن کی تاویل بیان کرنے سے علمائے سلف بچتے ہیں۔ جیسا کہ سمع، بصر، ید کی احادیث یا وہ احادیث جو صحت اور وضوح میں ان احادیث کے قریب ہیں۔ مذکورہ حدیث کو جنس کے افراد کے ساتھ تشبیہ دیئے بغیر اپنے ظاہر پر محمول کی جائے گی یا توسع اور مجاز کے معنی پر محمول کی جائے گی بلکہ یہ اعتقاد رکھا جائے گا کہ یہ اللہ کی ایسی صفات ہیں کہ ان کی کوئی کیفیت (معلوم) نہیں ہے اور وہ (علماء سلف) پہلی قسم کی احادیث کی تاویل سے بچتے تھے اس لئے کہ جس تاویل کے ساتھ بھی معنی درست ہوتا ہے اور اس کو ایسی چیز پر محمول کیا جاتا ہے جو عقل کے موافق ہوتی ہے تو کتاب وسنت کسی دوسرے اعتبار سے اس سے مانع ہوتی ہے بہرحال اس حدیث کی طرح کی احادیث اقسام صفات میں سے نہیں ہیں بلکہ یہ ایسے الفاظ ہیں جو اسم کی وضع میں صفات کے ساتھ مشابہ ہیں۔ پس ایسے طریقے سے اس کی کوئی تخریج کرنا ضروری ہے جو کہ نسق کلام (کلام کے سیاق وسباق) کے مناسب ہو۔

متشابہ کی اقسام:

کہا گیا ہے کہ متشابہ کی دو قسمیں ہیں۔ متشابہ کی پہلی قسم وہ ہے جو تاویل کو قبول نہیں کرتا اور اس کی تاویل اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ''نفس'' کا لفظ ہے۔ ﴿وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ﴾ [المائدۃ: ۱۱۶] اسی طرح اللہ کے اس قول میں ''مجیٔ'' (آنے) کا لفظ ہے۔ ﴿وَّجَآءَ رَبُّكَ﴾ [الفجر: ۲۲]

اسی طرح سورتوں کے شروع کے الفاظ یعنی حروف مقطعات ہیں اور متشابہ کی دوسری قسم وہ ہے جو تاویل کو قبول کرتا ہے۔ شیخ الشیوخ سہروردی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے استواء، نزول، ید، قدم، تعجب اور اس قبیل میں سے جس چیز کی بھی خبر دی ہے، وہ توحید کے دلائل ہیں پس اس میں تشبیہ اور تعلیل کے ساتھ تصرف نہیں کیا جائے گا۔ کہا گیا ہے کہ یہ مذہب معقول ہے اور سلف صالحین کا یہی مذہب تھا اور لوگ قولِ اوّل کے قائل ہیں، انہوں نے تاویل کی یہ شرط لگائی ہے کہ ہر وہ تاویل جو اللہ کی تعظیم کی طرف لے جائے وہ جائز ہے اور جو ایسی نہ ہو وہ جائز نہیں ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ چونکہ اکثر سلف کے زمانوں میں اہل بدعت کا ظہور نہیں ہوا تھا اس لئے وہ حضرات اس علم کو اللہ کی طرف تفویض کرتے تھے اور اس کے ساتھ اللہ کی تنزیہ بھی بیان کرتے تھے اس ظاہری معنی سے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے مناسب نہیں ہے اور اکثر خلق (علماء متاخرین) ان کی تاویل کرتے ہیں اور ان کو ایسی چیزوں پر حمل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے

جلالِ اقدس اور کمالِ انفس کے مناسب ہیں۔ اس لئے کہ اپنے زمانوں میں اہل بدعت وزیغ کی کثرت کیوجہ سے وہ اس بات پر مجبور تھے۔ اسی لئے امام الحرمین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر لوگ اپنی پہلی حالت پر باقی رہتے تو ہم علم کلام میں مشغول ہونے کا حکم نہ کرتے اور بہر حال اب بدعتیں کثیر ہوگئی ہیں۔ پس فتنے کے تلاطم خیز موجوں کو چھوڑ دینے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

اور اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے اس قول: ﴿......وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهُ إِلَّا اللّٰهُ وَالرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ ......﴾ [آل عمران: ۷]

"وہی اللہ تعالیٰ ہے جس نے تجھ پر کتاب اتاری جس میں واضح مضبوط آیتیں ہیں جو اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ آیتیں ہیں۔ پس جن کے دلوں میں کجی ہے وہ تو اس کی متشابہ آیتوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں، فتنے کی طلب اور ان کی مراد کی جستجو کے لئے، حالانکہ ان کی حقیقی مراد کو سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا اور پختہ اور مضبوط علم والے یہی کہتے ہیں کہ ہم تو ان پر ایمان لا چکے ہیں، یہ ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور نصیحت تو صرف عقلمند حاصل کرتے ہیں۔"

اصل اختلاف وقف کرنے میں ہے۔ پس اکثر علماء کے نزدیک وقف لفظ جلالہ پر ہے اور بعض علماء کے نزدیک وقف الراسخون فی العلم پر ہے۔ ان علماء میں سب سے بڑے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں۔ پس وہ العلم پر وقف کرتے تھے اور آپ رضی اللہ عنہ لوگوں کو سوال کرنے اور خود سے سیکھنے پر ابھارنے کے لیے فرمایا کرتے تھے کہ میں راسخین فی العلم میں سے ہوں۔ اس کے باوجود اختلاف کو رفع کرنا ممکن ہے اس طور پر کہ متشابہ کی دو قسمیں ہیں' پہلی قسم وہ ہے جو کسی قریبی تاویل کو قبول نہیں کرتی اور یہ پہلے وقف کا محمل ہے اور دوسری قسم وہ ہے جو تاویل کو قبول کرتی ہے اور یہ دوسرے وقف کا محمل ہے۔ اسی لئے بعض محققین نے اس بات کو اختیار کیا ہے کہ اگر تاویل لفظ کے قریب ہو اور وضع کے اعتبار سے اس کا احتمال ہو تو اس کو قبول کیا جائے گا اور اگر اس سے دور ہو تو اس کو رد کر دیا جائے گا اور حاصل یہ ہے کہ سلف اور خلف دونوں ہی تاویل کرنے والے ہیں لفظ کو اپنے ظاہر سے پھیرنے پر ان کے اجماع کی وجہ سے لیکن سلف کی تاویل اجمالی ہے اس لئے کہ وہ اس کو اللہ کی طرف تفویض کرتے ہیں اور خلف کی تاویل تفصیلی ہے کیوں کہ مبتدعین کی کثرت کی وجہ سے وہ ایسا کرنے پر مجبور تھے۔

بين اصبعين من اصابع الرحمٰن:

"اصبعين" ہمزہ کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور یہی مشہور ہے ورنہ اس میں نو لغات ہیں۔ صاحب قاموس نے قاموس میں کہا ہے کہ اصبع مثلث الہمزۃ والباء ہے (یعنی ہمزہ اور باء پر تینوں حرکتیں پڑھی جاسکتی ہیں۔

حدیث میں اصبع سے مراد:

اور "اصبع" کا اللہ کی ذات پر اطلاق کرنا مجاز ہے یعنی دلوں کو پلٹنا اللہ کے لئے آسان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے قلوب اور غیر قلوب میں جس طرح چاہتے ہیں تصرف فرماتے ہیں۔ اس سے کوئی چیز روکتی نہیں ہے اور جس کام کا وہ ارادہ کرتا ہے وہ کام اس سے رہ نہیں سکتا۔ جیسے کہا جاتا ہے: "فلان فی کفی" (فلاں میری مٹھی میں ہے) یعنی میرے قبضے میں ہے۔ اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ اس کی مٹھی میں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اس کی قدرت میں ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ: "فلان بین اصبعی اقلبه کیف شئتُ" (فلاں میری انگلیوں کے درمیان ہے میں جیسے چاہوں اس کو الٹ پلٹ

کرتا ہوں''، یعنی میرے لئے اس پر غلبہ پانا آسان ہے اور اسی طرح جس طرح چاہتا ہوں اس میں تصرف کرنا بھی میرے لئے آسان ہے۔

بعض نے کہا کہ دو انگلیوں سے مراد اللہ ربّ العزت کی دو صفتیں، صفت جلال اور صفت اکرام ہیں۔ پس اللہ اپنے صفت جلال سے قلوب کا فجور ان کو الہام کرتا ہے اور اپنی صفت اکرام سے ان کا تقویٰ ان کو الہام کرتا ہے۔ یعنی کبھی ان کو فجور سے تقویٰ کی طرف اور کبھی تقویٰ سے فجور کی طرف الٹ پلٹ کرتا (پھیرتا) ہے۔

بعض نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ (دل) اللہ کے آثار میں سے دو اثروں رحمت اور قہر کے درمیان ہیں یعنی وہ اس بات پر قادر ہے کہ دلوں کو ایک حال سے دوسرے حال (یعنی ایمان سے) کفر اور طاعت اور عصیان کی طرف پھیر دے۔

قاضی نے کہا کہ دلوں کے پھیرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا اس بات کا اشارہ ہے کہ دلوں کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذمہ داری میں رکھا ہے اور یہ معاملہ اپنے ملائکہ میں سے کسی کے حوالے نہیں کیا ہے اور یہاں صفت رحمٰن کا ذکر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ذمہ داری محض رحمت ہے تا کہ کوئی اور انسانوں کے رازوں پر مطلع نہ ہو اور ان کے خلاف وہ کچھ نہ لکھے جو ان کے دلوں میں ہے۔

کقلب واحد:

وصف کے ساتھ ہے یعنی جیسا کہ تم میں سے کوئی ایک چیز کی قدرت رکھتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ ایک ہی وقت میں تمام چیزوں پر قدرت رکھتا ہے، کوئی حالت اس کو کسی دوسری حالت سے مشغول نہیں کر سکتی اور اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

﴿مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ﴾ [لقمٰن : ۲۸]

''(خدا کو) تمہارا پیدا کرنا اور جلا اٹھانا ایک شخص (کے پیدا کرنے اور جلا اٹھانے) کی طرح ہے بیشک خدا سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

بعض نے کہا کہ یہ مراد نہیں ہے کہ ایک دِل میں تصرف کرنا زیادہ آسان ہے اللہ کے اعتبار سے اس لئے کہ اللہ کے اعتبار سے تو کوئی مشکل ہے ہی نہیں بلکہ یہ بندوں کے اعتبار سے ہے اور اس اعتبار سے جس کو بندے آپس میں جانتے ہیں۔

یصرفه:

تشدید کے ساتھ ہے (اور مذکر کی ضمیر اس لئے لائی کہ) یعنی ایک دل کو پھیرتا ہے یا جنس قلب کو پھیرتا ہے اور مصابیح کے بعض نسخوں میں ضمیر کی تانیث کے ساتھ ہے یعنی قلوب۔ اسی طرح عینی نے اس کو ذکر کیا ہے اور یہ وجہ تشبیہ کی تحقیق ہے۔

کیف یشاءُ:

یہ ''ھنیئا'' اور ''سھلاً'' کی تاویل میں ہو کر حال واقع ہو رہا ہے یعنی ایسا آسان ہے کہ کوئی روکنے والا اس کو روک نہیں سکتا یا مصدر ہے یعنی تقلیباً، سریعًا، سھلاً اور کتاب الحمیدی اور مسلم میں ''حیث یشاء'' کے الفاظ ہیں۔ یہ بات عینی نے کہی ہے۔

قوله :ثم قال رسول الله ﷺ ...... على طاعتك :

اللّٰھم :اس کی اصل ''یا اللہ'' ہے۔ پس حرف ندا کو حذف کر دیا گیا اور اس کے عوض میں میم کو لایا گیا اس لئے یہ دونوں جمع نہیں ہو سکتے اور بعض نے کہا کہ یہ اصل میں ''یا الله امنا بالخیر'' تھا۔ یعنی ہمارے لئے خیر کا ارادہ کر' پس جو حذف کیا گیا وہ اختصار کے لئے حذف کیا گیا ہے۔

مصرف القلوب:

اضافت کے ساتھ ہے اور مبرد اور اخفش کے نزدیک اللّٰھم کی صفت ہے اس لئے کہ ''یا'' وصف سے نہیں روکتی۔ اسی طرح اس کا بدل بھی وصف سے نہیں روکتا اور سیبویہ کے نزدیک یہ خود منادیٰ ہے اور اس سے حرف ندا کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ میم کے لفظ اللہ کے ساتھ لگنے نے اس کے وصف کو روک دیا ہے۔

صرف قلوبنا على طاعتك:

علٰی یہاں اِلٰی کے معنی میں ہے۔ یا صرف تثبیت کے معنی کو متضمن ہے اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے: **''اللهم يا مقلب القلوب ثبت قلبي على دينك''** بعض نے کہا کہ اس میں امت کے لئے ارشاد ہے اور ظاہر بات یہ ہے کہ بندوں میں سے ہر ایک جیسا کہ وہ اپنے پیدا ہونے میں اللہ کا محتاج ہے ایسے ہی وہ ایک گھڑی بھی اللہ کی امداد سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے

۹۰ :وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْ یُمَجِّسَانِهٖ كَمَا تُنْتَجُ الْبَهِیْمَةُ بَهِیْمَةً جَمْعَاءَ هَلْ تُحِسُّوْنَ فِیْهَا مِنْ جَدْعَاءَ ثُمَّ یَقُوْلُ فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ۔ (الروم :۳۰) ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه۳/۲۱۹حدیث رقم ۱۳۵۸وأخرجه مسلم فی الصحیح ۴/۲۰۴۷حدیث رقم ۲۲۔ وأحمد فی المسند۲/۳۵۱۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اس میں حق قبول کرنے کی صلاحیت اور استعداد موجود ہوتی ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ جیسے ایک جانور کامل الخلقت بچہ جنم دیتا ہے کیا تم اس میں کوئی کمی پاتے ہو۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی: ﴿فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ ......﴾ اللہ تعالیٰ کی فطرت کو لازم پکڑو جس فطرت پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی فطرت میں تغیر اور تبدل نہیں ہوتا یہ دین مضبوط ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح :قوله :ما من مولودٍ...... هل تحسون فيها من جدعاء؟ :

ما من مولودِ الاَّ یولد علی الفطرۃ:

کوئی بھی بچہ جن ہو یا انسان۔ بعض نے کہا کہ مولود مبتداء ہے اور اس کی خبر یولد ہے۔ یعنی کوئی بھی بچہ کسی حالت پر نہیں پایا جاتا مگر اس حالت پر اور فطرۃ دلالت کرتی ہے ابتداء واختراع کی ایک قسم پر جو کہ ایمان ہی کے معنی میں ہے:

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا......﴾ [الروم: ٣٠] ''اپنے اس سابقہ ایمان پر ثابت قدم رہو جو کہ عالم انوار میں تم سے واقع ہوا تھا''۔ ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ [الاعراف: ١٧٢] ''کے دن اور اس کی تائید ترمذی وغیرہ کی روایت سے ہوتی ہے جس میں ''فطرت'' کی جگہ ''ملت'' کا لفظ آیا ہے۔ اس لئے کہ یہ دونوں لفظ ایک ہی چیز پر صادق آتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا﴾ [الانعام: ١٦١]

''کہہ دو کہ میرے پروردگار نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے (یعنی) دین صحیح مذہب ابراہیم کا''۔

(صاحب مرقاۃ کہتے ہیں کہ) اور یہ بات ظاہر ہے کہ ملت دین سے خاص ہے' اسی لئے کہا گیا ہے کہ انبیاء ﷺ کا دین متحد ہے جو کہ اسلام اور توحید ہے اور یہ کہ انبیاء ﷺ کی ملتیں مختلف ہیں اس لئے کہ ان کی شریعتیں مختلف ہیں:

اور اس حدیث کے معنی میں یہ حدیث ہے:

''خلقت عبادی حنفاء کلھم وأنھم اتتھم الشیاطین فاضلتھم عن دینھم''۔

''میں نے اپنے سب بندوں کو دین حنیف پر پیدا کیا اور ان کے پاس شیاطین آتے ہیں جو ان کو ان کے دین سے گمراہ کر دیتے ہیں۔''

اور معنی یہ ہے کہ ہر ایک اسی حال پر پیدا کیا جاتا ہے جو لوگوں کو اصل فطرت میں ہدایت اور دین کو قبول کرنے کی صلاحیت پر قدرت دیتا ہے۔ پس اگر اس کو اسی مذکورہ صلاحیت اور قدرت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ ہمیشہ ہدایت اور دین پر رہے گا اور اس کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کی طرف نہیں جائے گا۔ اس لئے کہ اس کا حسن دلوں میں گاڑ دیا گیا ہے۔ پس آفت بشریہ یا کسی دوسرے کی تقلید کے بغیر اس سے عدول واقع نہیں ہوتا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ......﴾ [البقرة: ١٦]

''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی، نہ تو ان کی تجارت ہی نے کچھ نفع دیا اور نہ وہ ہدایت یاب ہی ہوئے۔''

پس اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کو رأس المال بنایا ہے جو کہ ان کے پاس موجود ہے پھر انہوں نے اس کو ضلالت بعیدہ کے حاصل کرنے میں خرچ کر کے زوال کے لئے پیش کیا۔

فابواہ یھودانہ أو ینصرانہ او یمجسانہ:

''یھودانہ'' واؤ کی شد کے ساتھ ہے۔ یعنی اس کو یہودیت سکھاتے ہیں اور اس کو یہودی بناتے ہیں (اسی طرح باقی دو

لفظ یعنی "ینصرانہ" اور "یمجسانہ" ہیں۔ از مرتب) اور "فابواہ" میں فاء یا تو تعقیب کے لئے ہے جو کہ ظاہر ہے یا سببیت کے لئے ہے یعنی جب معاملہ یہ ہے تو جو بدلتے ہیں وہ اکثر اپنے والدین کے سبب سے بدلتے ہیں۔

کما تنتج البھیمۃ:

یہ مصدر محذوف کی صفت ہے اور "ما" مصدریہ ہے۔ "ای یولد علی الفطرۃ ولادۃ مثل نتاج البھیمیۃ"۔ (یعنی وہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے ایسا پیدا ہونا جیسا کہ چوپایہ پیدا ہوتا ہے) یا "یغیر انہ تغیراً کتغییر البھیمۃ" (یعنی اس کو ایسے بدل ڈالتے ہیں جیسے چوپایہ کو بدلا جاتا ہے) اور بعض نے کہا کہ یہ حال ہے یعنی "مشبھًا" فطرت پر پیدائش کو سلامت چوپایہ کی پیدائش کے ساتھ تشبیہ دی لیکن سلامتی حسی بھی ہے اور معنوی بھی اور دونوں تقدیروں پر افعالِ ثلاثہ یعنی "یھودانہ" اور جن کا اس پر عطف کیا گیا ہے۔ "کما تنتج" میں تنازع کیا ہے۔ اس معقولی چیز کی اس محسوس معاین (نظر آنے والی) چیز کے ساتھ تشبیہ کا فائدہ یہ ہے اس سے یہ واضح ہو جائے کہ کشف و بیان میں اس کا ظہور اس محسوس و معاین و مشاہد چیز کی حد کو پہنچا ہوا ہے اور "تنتج" کو مبنی الفاعل بھی روایت کیا جاتا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے اور اس کے مجہول ہونے کی صورت میں کہا جاتا ہے کہ "نتج الناقۃ ینتجھا" جبکہ اس کے بچہ جننے کی نگرانی کرے۔ یہاں تک کہ وہ بچہ جن لے۔ پس وہ آدمی ناتج ہے وہ جانوروں کے لئے ایسا ہے جیسے عورتوں کے لئے دائی ہوتی ہے اور اس کی اصل "نتجھا اھلھا ولدًا" ہے اور اسی لئے یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اور جب یہ مبنی للمفعول الاوّل ہوگا (یعنی پہلا مفعول نائب فاعل بنے گا) تو جب وہ بچہ جن لے تو کہا جائے گا "نتجت ولدًا" اور اگر دوسرا مفعول نائب فاعل بنے تو جب وہ بچہ جن لے تو کہا جائے گا: "نتج الولد"۔

بھیمۃ:

بعض نے کہا کہ یہ مصغر "بُھَیْمَۃٌ" ہے اور یہ تنتج کا مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور پہلا مفعول اس کے فاعل کا قائم مقام ہوگیا (یعنی نائب فاعل بن گیا' از مرتب) اور بعض نے کہا کہ اس کا نصب حال ہونے کی وجہ سے ہے اس تقدیر پر کہ تنتج مجہول ہو۔ "ای ولدت فی حال کونھا بھیمۃ" (یعنی اس سے بچہ جنوالیا گیا اس حال میں کہ وہ چوپایہ تھا۔ یا اس کا نصب مفعول ہونے کی وجہ سے ہو جب یہ "وَلَدَ" کے معنی میں "نتجَ" معروف سے ہو۔

اور ابن حجر نے ایک عجیب بات کہی ہے کہ "کما تنتج" فعل مجہول ہی ہے فعل معروف نہیں ہو سکتا۔

جمعاء:

یعنی سلامت اور کامل اعضاء والا چوپایہ۔ اس کا نام جمعاء اس لئے رکھا گیا کہ اس میں اعضاء کی سلامتی مجتمع ہے' کان کٹنے اور داغ لگنے سے وہ سلامت ہے۔

ھل تحسون فیھا:

یعنی کیا تم اس سلامتی اعضاء والے چوپایہ میں محسوس کرتے ہو؟ اور مراد جنس ہے اور "تحسون" تاء کے ضمہ اور حاء کے

کسرہ کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا کہ تاء کے فتحہ اور حاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ یعنی کیا تم پاتے ہو اور جملہ حالیہ ہے یعنی ایسا سلامتی اعضاء والا چوپایہ جس کے بارے میں یہ بات کہی گئی ہو اور اس میں ایک قسم کی تاکید ہے یعنی جس نے بھی اس کی طرف نظر کی اس نے اس چوپایہ کے اعضاء کی سلامتی کے ظہور کی وجہ سے یہ بات کہی اور بعض نے کہا کہ یہ ایک اور صفت ہے "مقولاً فی حقها" کی تاویل میں کر کے۔

من جدعاء:

یہ جیم مہملہ کے ساتھ ہے یعنی وہ جانور جس کے کان کاٹ لئے گئے ہوں اور مصابیح کے نسخے کی عبارت یوں ہے: "حتی تکونوا انتم تجدعونها" بعض نے کہا کہ کان کٹے کی تخلیص سے اس طرف اشارہ ہے کہ کافروں کو کفر پر بہرہ کر دینا اس لئے ہے کہ وہ خود حق سننے سے بہرے ہو گئے۔

قوله :ثم یقول ...... ذٰلك الدین القیم:

ثم یقول:

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث مرفوع کا بقیہ حصہ ہے لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا کلام ہے جس کو انہوں نے حدیث میں درج کیا ہے۔ مسلم نے اس کو ترمذی کے طریق سے زہری سے بیان کیا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

ثُمَّ یَقُوْلُ اَبُوْهُرَیْرَةَ اقْرَؤُوْا اِنْ شِئْتُمْ وَاِنْ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ الْاٰیَةَ۔

(صحیح مسلم ج ۱ ح ۳۹۰)

"پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر تم چاہو تو پڑھو: وَاِنْ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ...... یعنی کوئی آدمی اہل کتاب میں سے نہیں رہتا مگر وہ اپنے مرنے سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق ضرور کرتا ہے۔

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ [الروم : ۳۰]

"تو تم ایک طرف کے ہو کر دین (خدا کے راستے) پر سیدھا منہ کئے چلے جاؤ (اور) خدا کی فطرت کو جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے (اختیار کئے رہو) خدا کی بنائی ہوئی (فطرت) میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

اسی طرح شیخ ابن حجر رحمہ اللہ نے صحیح بخاری کی شرح میں بیان فرمایا ہے (صاحب مرقاۃ نے فرمایا) میں کہتا ہوں کہ بخاری کی اس روایت میں اس کی تصریح بھی واقع ہوئی ہے جو یونس عن الزہری عن ابی سلمۃ الرازی عن ابی ھریرۃ (رضی اللہ عنہما) کے طریق سے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

ثم یقول ابو هریرة فطرة الله التی فطر الناس علیها:

یعنی جس پر ابتداءً ان کو پیدا کیا اور اس پر ان کی جبلت بنائی ہے۔

لا تبدیل لخلق اللہ:

یعنی تم میں قبولِ اسلام کی جو فطرت ہے وہ تبدیل نہیں ہوتی اور اس کی تاویل کی جائے گی کہ اس فطرت کی شان یہ ہے کہ وہ تبدیل نہیں ہوتی یا یہ کہ غالب یہ ہے کہ وہ تبدیل نہیں ہوتی یا یہ کہا جائے گا کہ یہاں جملہ خبریہ نہی کے معنی میں ہے اور یہ درست نہیں ہے کہ یہ اخبار محض ہو اس لئے کہ اس میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ حماد بن سلمۃ نے اس حدیث کے معنی کے بارے میں فرمایا کہ ہمارے نزدیک یہ اس وقت کے بارے میں ہے جب اللہ نے بندوں سے اصلابِ آباء میں عہد لیا تھا اور انہوں نے 'بلٰی'' کہا تھا۔

خطابی نے کہا کہ یہ عمدہ معنی ہے اور گویا کہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ احکامِ دنیوی میں ایمان فطری کا اعتبار نہیں ہے۔ وہی ایمان شرعی معتبر ہے جو مکتسب بالارادہ ہو کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ یہ دنیا کے حکم کے بارے میں فرمایا کہ اس کے والدین اس کو یہودی بناتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ ایمان فطری موجود ہے اس پر کافر والدین والا حکم لگایا گیا ہے اور حاصل اس کا یہ ہے کہ عالم یا تو عالم غیب ہے یا عالم شہادتٗ پس جب حدیث عالم غیب پر محمول ہوئی تو اس کا معنی مشکل ہو گیا اور جب اس عالم شہادت کی طرف پھیری گئی جس پر ظاہر شریعت کا مبنیٰ ہے تو اس کو لینا آسان ہو گیا اور اس کی تحریر یہ ہے کہ جب دیکھنے والا بچے کی ذات کو دیکھے گا اور عالم غیب کا اعتبار نہیں کرے گا اور شان یہ ہے کہ بچہ اس فطرت پر ہے جس پر اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے کہ اس میں معرفت کی استعداد' قبولِ حق اور انکارِ باطل اور غلطی و درستی کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت موجود ہے تو وہ (دیکھنے والا) یہ حکم لگائے گا کہ اگر اس بچے کو اسی حالت پر چھوڑ دیا جاتا جس پر وہ پہلے تھا اور اس پر نظرِ صحیح سے روکنے والی چیزیں تقلید' محسوسات سے مانوس ہونا اور نفسانی خواہشات میں انہماک باری باری نہ آتیں تو وہ ہمیشہ اس فطرتِ سلیمہ پر رہتا جس پر وہ تھا اور اس پر کسی چیز کو ترجیح نہ دیتا اور توحید' تصدیق رسول اور دوسرے عقائد پر جو دلائل قائم کئے گئے ہیں وہ شخص ان میں صحیح غور و فکر کرتا جو اس کو حق تک پہنچاتے اور ہدایت کی طرف اس کی راہنمائی کرتے اور وہ صحیح بات کو پہچانتا' حق کا اتباع کرتا اور ملت حنیفیہ میں داخل ہو جاتا اور اس کے علاوہ کسی چیز کی طرف توجہ نہ کرتا۔

لیکن اس (مولود) کو اس (قبولِ حق) سے اس طرح کے موانع روکتے ہیں اور اس کی نظیر وہ لڑکا ہے جس کو حضرت خُضر نے قتل کر دیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے عالم شہادت اور ظاہر شرع کو دیکھا تو اس پر نکیر فرمائی اور خضر نے عالم غیب کی طرف دیکھا اور یہ کہ وہ طبعًا کافر ہے تو اس کو قتل کر دیا اسی لئے جب خضر نے علم غیب کے ساتھ عذر پیش کیا تو موسیٰ علیہ السلام نے ان پر اعتراض نہیں کیا۔ اسی طرح علماء نے فرمایا ہے اور شاید کہ طبع کافرا کا معنی یہ ہو کہ اس کو پیدا کیا گیا اور اس کے بارے میں یہ مقدر کیا گیا کہ اگر وہ زندہ رہا تو کافر بن جائے گا تاکہ اس حدیث کے مخالف معنی نہ بنے۔

ذالك الدين القيم:

یعنی وہ توحید جو فطرت کا معنی ہے وہ دین قیم ہے یعنی ایسا درست دین جس میں کوئی کجی نہیں ہے اور تشبیہ و تعلیل اور قدر و جبر میں سے کسی کی طرف میلان نہیں ہے۔

تقدیر سے متعلق خطبہ نبوی ﷺ

۹۱ :وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَامَ فِیْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِخَمْسِ كَلِمَاتٍ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَنَامُ وَلَا یَنْبَغِیْ لَهٗ اَنْ یَّنَامَ یَخْفِضُ الْقِسْطَ وَیَرْفَعُهٗ یُرْفَعُ اِلَیْهِ عَمَلُ اللَّیْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ وَعَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّیْلِ حِجَابُهُ النُّوْرُ لَوْ كَشَفَهٗ لَاَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهٖ مَا انْتَهٰی اِلَیْهِ بَصَرُهٗ مِنْ خَلْقِهٖ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۱۶۱حدیث(۲۹۳-۱۷۹)-وابن ماجة ۱/۷۰حدیث رقم ۱۹۵واحمد فی المسند٤/٤٠٥-

ترجمه: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور اس خطبہ میں پانچ باتیں بیان فرمائیں۔ کہ بے شک اللہ تعالیٰ سوتا نہیں ہے اور سونا اس کی شان کے مناسب نہیں ہے اور وہ ترازو کو بلند و پست کرتا ہے اور دن کے عمل سے پہلے رات کے عمل اور رات کے عمل سے پہلے دن کے عمل اللہ کے پاس پہنچا دیئے جاتے ہیں اور اللہ کا حجاب نور ہے اگر وہ اس کو اٹھا دے تو اس کی ذات پاک کا نور مخلوق کی تاحد نگاہ تمام چیزوں کو جلا دے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله :وعن ابی موسٰی رضی الله عنه قال ...... انتهی البصرة من خلقه۔

عن ابی موسٰی:

یعنی ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جیسا کہ بعض نسخوں میں اشعری کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

قام فینا رسول الله ﷺ بخمس کلمات:

نبی کریم ﷺ جب وعظ فرماتے تو کھڑے ہو جاتے تھے اور کلمہ سے مراد یہاں جملہ مفیدہ ہے یعنی آپ ﷺ کھڑے ہوئے اس حال میں کہ آپ ﷺ نے پانچ فصلوں کے ساتھ گفتگو کی (یعنی پانچ کی طرح کی باتیں ارشاد فرمائیں' ازمرتب)

بعض حضرات نے کہا کہ: "قام فینا" تذکیر سے کنایہ ہے یعنی پانچ باتوں سے خطبہ دیا اور ہمیں نصیحت فرمائی۔

طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کا قول: "فینا" اور "بخمس" یا تو حال مترادف ہیں یا حال متداخل ہیں۔ یعنی آپ ﷺ کھڑے ہوئے اس حال میں کہ خطبہ دے رہے تھے اس حال میں کہ ہمیں نصیحت فرما رہے تھے یا "فینا" متعلق ہوگا "قام" کا' اس صورت میں "قام"، "خطب" کے معنی کو متضمن ہوگا اور "بخمس" حال واقع ہوگا اور "قام" دونوں صورتوں میں قیام کے معنی میں ہوگا اور یہاں ایک تیسری صورت بھی ہے وہ یہ کہ "بخمس"، "قام" کے ساتھ متعلق ہوا اور "فینا" بیان ہو۔ گویا کہ جب "قام بخمس" کہا گیا تو سوال کیا گیا کہ "فی حق من؟" تو جواب دیا گیا "فینا ای فی حقنا" اور اس تقدیر پر "قام" بمعنی "قام بالامر" ہوگا یعنی "تشمرله" کسی کام کے لئے آمادہ ہونا) یعنی وہ کلمات ہمیں یاد کرانے کے لئے کھڑے ہوئے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس حقیقت کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ: ((کان علیه الصلوٰة والسلام ینصرف الینا بعد العشاء فیحدثنا قائما علی رجلیه حتی یرواح بین قدمیه من طول القیام)) ''نبی علیہ السلام عشاء کے بعد ہماری طرف مڑتے اور کھڑے ہو کر ہمارے ساتھ گفتگو فرماتے یہاں تک کہ زیادہ دیر کھڑے رہنے کی وجہ سے بار باری دونوں ٹانگوں پر کھڑے ہوتے تھے اور اس میں یہ بات ہے کہ بعض مقامات میں قیام کا حقیقت ہونا اس کے استمرار کو لازم نہیں کرتا۔

فقال :ان الله لا ینام:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ [البقرة : ۲۵۵]

اور ''سنة'' اونگھ کو کہتے ہیں اور وہ ہلکی نیند ہے یا نیند کا مقدمہ ہے۔

ولا ینبغی له ان ینّام۔

یہ جملہ جواز کی نفی کے لئے ہے اس سے وقوع کی نفی کی تاکید ہو رہی ہے جو کہ تتمہ کے طور پر لائی ہے۔ یعنی نہ وہ سوتا ہے نہ نینداس کے لئے درست اور صحیح ہے اور نہ ہی ممکن ہے اس لئے کہ نیند موت کی بہن ہے اور یہ کہ نیند قوئی کے آرام کے لئے ہوتی اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے منزّہ ہے اور دوسرا جملہ ان پانچ باتوں میں سے ہے اور ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کو جملہ معترضہ قرار دے کر عجیب بات کہی ہے اور اگلا جملہ تیسری بات ہے۔

یخفض القسط و یرفعه:

تورپشتی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بعض نے ''قسط'' کی تفسیر ''رزق'' سے کی ہے یعنی اللہ اس (رزق) کو تنگ کرتا ہے اور اس میں وسعت عطا کرتا ہے اور اس کی تعبیر رزق سے کی اس لئے کہ وہ ہر مخلوق کی قِسْط یعنی حصہ ہے اور بعض نے اس کی تفسیر ''میزان'' سے کی ہے اور ''میزان'' کو ''قسط'' اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے برابری (اور انصاف) کیا جاتا ہے۔ یعنی تقسیم اور اس کے علاوہ چیزوں میں اور یہ معنی زیادہ مناسب ہے اس لئے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں: ''یرفع المیزان و یخفضه'' اور میزان سے مراد وہ میزان ہے جو اللہ کے پاس اس کے بندوں کے لئے نازل ہونے والے رزق کا وزن کرتی ہے اور بندوں کے ان اعمال کا وزن کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف جاتے ہیں۔ یعنی کبھی اس کو جھکاتا ہے رزق کی تنگی کے ساتھ اور اس کو معصیت کے لئے چھوٹ دینے کے ساتھ اور کبھی اس کو بلندی عطا کرتا ہے۔ رزق کی وسعت اور نیکی کی توفیق دے کر۔ یہاں پر ''خفض'' اور ''رفع'' میں اور اس کے بعد والے جملے میں تضاد بھی ہے اور مطابقت بھی ہے اور یہ اعیان کے لئے استعمال ہونے والے معانی کا استعارہ ہے اور اس بات کا احتمال بھی ہے کہ اشارہ اس بات کی طرف ہو جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے:

﴿كُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ﴾ [الرحمٰن: ۲۹]

اور پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے بارے میں میزانِ عدل سے فیصلہ فرمائے گا اور معنی کو اس مشاہد کی طرح بیان کیا جیسا کوئی آدمی ترازو سے وزن کرتا ہے تو اس کا ہاتھ ترازو کو جھکاتا اور اٹھاتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ تاویل نبی علیہ السلام کے فرمان: ((ولا ینبغی له ان ینام" سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے اس (نیند) کو ثابت کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے حالانکہ اللہ وہ ذات ہے جو ہمیشہ اپنی مُلک میں میزانِ عدل کے ساتھ تصرف کرتا ہے۔ اس کے بعد والا جملہ چوتھی بات ہے۔

یرفع الیه عمل اللیل قبل عمل النهار:

قاضی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ خزانوں کی طرف اٹھنا مراد ہے جیسے کہا جاتا ہے: "حمل المال الی الملك" اور عمل مصدر بمعنی اسم مفعول ہے یعنی "معمول فی اللیل" یعنی دن کے اعمال لائے جانے سے پہلے پس ان کو قیامت کے دن تک محفوظ کر لیا جاتا ہے یا اللہ کے اعمال کے بارے میں علم کے باوجود ان کو اللہ پر پیش کیا جاتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو اس بدلے کے دینے کا حکم کرے جس کا اللہ تعالیٰ نے اس فعل کے کرنے سے اس کے لئے فیصلہ کیا ہے اور بعض حضرات نے کہا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کے اعمال کو قبول کرتا ہے۔ پس یہ جلدی قبول کرنے سے عبارت ہوگا۔

وعمل النهار قبل عمل اللیل:

"عمل النهار" کا عطف "عمل اللیل" پر ہے' اس میں آسمانوں سے اوپر اٹھنے اور بلند ہونے کی طرف اشارہ ہے' اس اعتبار سے دن اور رات میں کوئی فرق نہیں۔ بعض نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ رات کے اعمال کے اٹھنے سے پہلے دن کے اعمال اٹھتے ہیں لیکن پہلا مطلب زیادہ بلیغ ہے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ یہ ان ملائکہ کی تیز رفتاری کا بیان ہے جو دن کے اعمال کو عصر کے بعد اور رات کے اعمال کو فجر کے بعد لے کر اوپر جاتے ہیں وہ (فرشتے) قلیل مدت میں اس لمبی مسافت کو طے کرتے ہیں جو کہ سات ہزار سال سے زیادہ کی مسافت ہے جیسا کہ روایت کی گئی ہے کہ آسمان و زمین کے درمیان کی مسافت پانچ سو سال ہے کہ اسی طرح ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور ہر آسمان کی بلندی بھی اسی طرح ہے اور پہلے (رات کے) اعمال کے اٹھانے اور دوسرے (دن کے) اعمال کے اٹھانے یا کرنے کی حقیقت وہ ہے جو دوسری حدیث میں آئی ہے کہ دن کے اعمال نمازِ عصر کے بعد اٹھائے جاتے ہیں اور رات کے اعمال نمازِ فجر کے بعد اٹھاتے جاتے ہیں۔ پس رات کے اعمال کو اٹھایا جانا دن کے کسی فعل کے کئے جانے کے بعد ہی ہوگا اور بہر حال دن کے اعمال کو اٹھایا جانا تو رات کے کسی عمل کے کرنے یا اٹھائے جانے سے پہلے ہے۔ اس لئے کہ اس کے اٹھائے جانے کی ابتداء اور رات کے عمل کے درمیان فاصلہ ہے جو کہ اس بات کی وسعت رکھتا ہے اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کی مناسب ہے۔ پس حاصل یہ ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: "قبل عمل النهار" میں رفع کی تقدیر متعین کی ہوگئی اور اس میں عمل کرنے کی تقدیر درست ہے اور آپ علیہ السلام کے اس فرمان: "قبل عمل اللیل" میں دونوں تقدیریں درست ہیں اور فعل (یعنی عمل کرنے) کی تقدیر زیادہ بلیغ ہے اس لئے کہ زمانہ کم ہے۔ پس اس میں غور و فکر کرو تاکہ اس بات کا فساد معلوم ہوجائے جو بعض شارحین نے ذکر کی ہے' اس کے بعد پانچویں بات ہے۔

حجابه النور لو کشفه لا حرقت سبحات وجهه۔

حجاب سے مراد معنوی حجاب ہے "و کشفه" سے نئی بات شروع ہے جو کہ اس آدمی کے سوال کا جواب ہے جو یہ کہے کہ:

"لم نشاهده" یعنی اگر حجاب کو ہٹا دے تو اس کا مشاہدہ کیوں نہیں ہوتا؟ "سبحات" میں اور باء کے ضمہ کے ساتھ ہے جو کہ سبحه کی جمع ہے اس سے مراد اس کے وجہ کے انوارات ہیں اور وجہ سے مراد ذات باری ہے اور بعض اہل تحقیق نے فرمایا کہ وہ ایسے انوارات ہیں کہ جب فرشتے اس کو دیکھتے ہیں تو تسبیح و تہلیل کرتے ہیں اس وجہ سے کہ وہ اللہ کی عظمت اور جلال سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں اس لئے کہ سبحان اللہ کلمہ تعجب و تعجیب ہے جیسے ابن اثیر نے ذکر کیا ہے اور کشاف نے کہا کہ اس میں تعجب ہے اور اس میں اصل یہ ہے کہ اللہ کی تسبیح کرے اللہ کی تخلیق کے عجائبات دیکھ کر پھر اس کا استعمال زیادہ ہو گیا تو ہر ایسی چیز میں استعمال ہونے لگا جس سے تعجب ہو۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ "حجابه النور" سے مراد یہ ہے کہ اللہ کا حجاب عام حجابوں کی طرح نہیں ہے۔ پس وہ اپنی مخلوق سے پوشیدہ ہے اپنی عزت اور جلال کے انوارات سے اور اگر وہ ان حجابات کو ہٹا دے اور پردے کے پیچھے کی اپنی حقیقی صفات اور اپنی ذات کی عظمت کو ظاہر کر دے تو ساری مخلوق جل جائے اور حجاب اصل میں ایسے پردے کو کہتے ہیں جو دیکھنے والے اور دیکھی جانے والی چیز کے درمیان حائل ہو اور وہ یہاں پر آنکھوں سے اللہ کے دیدار نہ کر سکنے کا مفہوم دیتا ہے۔ پس یہ دنیا میں اللہ کا دیدار نہ کر سکنے سے کنایہ ہے یا اس بات سے کنایہ ہے کہ دنیا یا آخرت میں اللہ کی ذات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔

اگلا جملہ "لو كشفه" جملہ استینافیہ ہے جو کہ کلام سابق پر مبنی ہے گویا کہ کہا گیا کہ اللہ نے خود کو حجاب کے ساتھ خاص کیوں فرمایا یا یہ کہ وہ حجاب ہٹایا کیوں نہیں جاتا؟ تو اس بات کے جواب میں فرمایا گیا کہ اگر وہ حجاب نور کا نہ ہو یا یہ کہ اگر اس حجاب کو ہٹا دیتا تو کائنات جل جاتی۔

نبی کریم ﷺ نے سابقہ جملے فعل مضارع کو ساتھ لائے تاکہ تجدد مع الاستمرار حاصل ہو۔ باقی رہا یہ جملہ اسمیہ تو یہ اس دنیا میں ثبوت اور دوام پر دلالت کرتا ہے۔ پس جنت میں جب مؤمنین کدوراتِ بشریہ سے پاک ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کو بغیر حجاب کے دیکھ لیں گے جیسا کہ نبی کریم علیہ السلام نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا ان کے نور میں تبدیل ہو جانے کی وجہ سے جیسا کہ آپ علیہ السلام نے خود ارشاد فرمایا:

((اللّٰهم اجعَل في قلبي نورًا وفي بصري نورًا وفي بشري نورًا اِلى قوله واجعلني نورا.))

ما انتهى اليه بصره۔

انتهى بمعنی وصل ہے اور الیہ کی ضمیر ما کی طرف راجع ہے اور بصرہ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ بصرہ کی ضمیر ما کی طرف راجع ہے جو کہ ما موصولہ ہے اور احرقت کا مفعول بہ ہے اور الیہ کی ضمیر وجهه کی طرف راجع ہے اور من خلقه ما کا بیان ہے یا احرقت کے ساتھ متعلق ہے اور من خلقه سے مراد تمام موجودات ہیں۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ اس حدیث کا معنی آیۃ الکرسی سے مسبوك (ڈھالا ہوا) ہے۔ پس یہ حدیث سیّد الاحادیث ہے جس طرح آیۃ الکرسی سیّدہ الآیات ہے۔

اللہ کا خزانہ ختم نہیں ہوتا

۹۲ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَدُاللّٰهِ مَلْاٰی لَا تَغِیْضُهَا نَفَقَةٌ سَحَّاءُ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ اَرَاَیْتُمْ مَآ اَنْفَقَ مُذْخَلَقَ السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ فَاِنَّهٗ لَمْ یَغِضْ مَافِیْ یَدِهٖ وَکَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ وَبِیَدِهِ الْمِیْزَانُ یَخْفِضُ وَیَرْفَعُ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ وَفِیْ رِوَایَةٍ لِمُسْلِمٍ یَمِیْنُ اللّٰهِ مَلْاٰی وَقَالَ ابْنُ نُمَیْرٍ مَلْآنُ سَحَّآءُ لَا یَغِیْضُهَا شَیْءٌ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ۔

أخرجه البخاری فی الصحیح ۳۵۲/۸ حدیث ٤٦٨٤۔ومسلم فی الصحیح ۶۹۱/۲حدیث ۳۷والترمذی ۲۳٤/٤ حدیث ۳۰٤٥وابن ماجة ۷۱/۱حدیث رقم۱۱۷وأحمد فی المسند۳۱۳/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ یعنی اس کا خزانہ بھرا ہوا ہے دن اور رات ہر وقت خرچ کرنا بھی اس میں کمی نہیں کرتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے ہو؟ کہ جب سے اس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے اور جس وقت اس کا عرش پانی پر تھا۔ کتنا خرچ کیا ہے؟ لیکن اتنا زیادہ خرچ کرنے کے باوجود جو کچھ اس کے ہاتھ میں ہے یعنی اس کے خزانے اس میں کمی نہیں ہوئی ہے اور اس کے ہاتھ میں ترازو ہے جس کو وہ بلند اور پست کرتا ہے۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا داھنا ہاتھ بھرا ہوا ہے اور ابن نمیر کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے اور ہمیشہ دینے والا ہے۔ رات اور دن میں خرچ کرنے کے باوجود اس میں کوئی چیز نقصان اور کمی نہیں کرتی۔

تشریح: قوله :ید الله ملأی ......ما فی یده۔

ید الله ملأی لا تغیضها نفقة::

یہ کنایہ ہے محل عطا سے۔ اللہ تعالیٰ کا خزانہ مراد ہے اور ملأی' فعلی کے وزن پر ہے اور ملان کی تانیث ہے اس نعمت کی کثرت اور عموم سے کنایہ ہے لا تغیضها تانیث کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا کہ یاء کے ساتھ ہے اور نفقة بمعنی انفاق ہے۔ یعنی خرچ کرنا اللہ کے خزانے کو کم نہیں کرتا۔

سحاء اللیل والنهار :

سحاء میں سین اور حاء مهملتین ہیں اور مدّ کے ساتھ ہے۔ سح الماء سے ہے سح الماء کہتے ہیں جب پانی اوپر سے نیچے کی طرف بہتا ہے اور سحت الماء سے ہے یعنی صببته یہ نفقۃکی صفت ہے یاید کی صفت ہے اور یہ زیادہ صحیح ہے اور نبی کریم علیہ السلام کا فرمانا: اللیل والنهار ظرفیت کی بنیاد پر منصوب ہے یعنی دن اور رات میں ہمیشہ بہانے والا ہے اور صحیح مسلم میں سحًا مصدر ثابت ہے اور مسلم کی روایت میں سح اللیل والنهار آیا ہے حاء کے فتحہ اور اضافت کے ساتھ۔ یہ بات ابہری نے فرمائی ہے اور اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جب پانی اوپر سے بہایا جاتا ہے تو آسانی سے بہایا جاتا ہے اور اس کے عطایا کی جزالت کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے کہ "سح" کا استعمال اس چیز میں ہوتا ہے جو زیادہ ہو اور قطروں سے

زیادہ ہو کر حد سیلان تک پہنچ جائے اور اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے عطاء کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ اس لئے کہ پانی جب بہنا شروع ہو جاتا ہے تو کوئی آدمی اس کو لوٹا نہیں سکتا۔

ارایتم ما انفق:

ارایتم کا معنی اخبرونی یعنی مجھے بتلاؤ اور بعض نے کہا کہ اس کا معنی ہے ابصرتم واعلمتم۔ یعنی تم اس بات کو جانتے ہو۔ ما انفق میں "ما" مصدریہ ہے اس طرح یہ "انفاق اللہ" کے معنی میں ہوگیا اور بعض نے فرمایا کہ "ما" موصولہ ہے شرط کے معنی کو متضمن ہے۔

مذ خلق السماء والارض؟

یعنی اس ابتدائی زمانے سے جب اللہ نے زمین و آسمان یا اس میں بسنے والی مخلوق کو پیدا فرمایا۔

فانہ لم یغض ما فی یدہ

انہ میں ضمیر راجع ہے انفاق کی طرف اور لم یغض یاء کے فتحہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ ہے اور یہ لم ینقص کے معنی میں ہے۔ ما فی یدہ میں ما موصولہ ہے اور مفعول لہ بن رہا ہے یعنی اللہ کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: ید اللہ ملأی سے مراد ہے نعمتہ غزیرۃ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ﴾ [المائدة : ٦٤]

پس بے شک بسط الید سخاوت سے مجاز ہے اور اس میں ید اور بسط کا ثبوت مقصود نہیں ہے' اسی طرح کشاف میں بیان ہوا ہے اور مظہر نے فرمایا کہ ید کا اطلاق خزائن پر اس لئے کیا کہ ید تصرف کرتا ہے خزائن میں۔ خزائن کا معنی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے معلوم ہوتا ہے:

﴿كُنْ فَيَكُونُ﴾ [الانعام : ٧٣]

اس لئے کہ اس کو معدوم کے ایجاد کرنے کی قدرت ہے اسی لئے یہ خزانے کبھی کم نہیں ہوتے اور نبی کریم علیہ السلام کا فرمان: (ملأی' ولاتغیضھا' حماء اور ارایتم) قول کی تاویل میں ہے یعنی ان کے بارے میں ایسی باتیں کہی گئی ہیں جو ید اللہ کے مناسب ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ آخری تین ملأی کا وصف ہوں اور یہ بھی کہ ارایتم جملہ مستانفہ ہو۔

قولہ: وکان عرشہ علی الماء...... و یرفع۔

و کان عرشہ علی الماء:

یہ جملہ خلق کی ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے' اسی طرح اگلا جملہ بھی خلق کی ضمیر سے حال ہے یا کان کی خبر سے حال ہے یا کان کے اسم سے حال ہے سیبویہ کی رائے کے مطابق' اور نبی علیہ السلام کے فرمان: (وکان عرشہ علی الماء) کی تحقیق عنقریب باب بدء الخلق میں آ رہی ہے۔

و بیدہ المیزان:

اعمال اور رزق کا میزان اللہ کی قدرت اور اس کے تصرف میں ہے۔

یخفض و یرفع:

یعنی حصے اور رزق کو اس اعتبار سے کم کرتا ہے کہ اس کو پہلے عطا کیا تھا یا پہلی صورت حال کو دیکھتے ہوئے زیادہ کرتا ہے۔ اپنے اس اندازے کے تقاضے کے مطابق جو اس کے پہلے کی تفصیل ہے یا بندوں کے وہ اعمال جو اس کی طرف اٹھتے ہیں ان کے میزان کو جھکاتا اور اٹھاتا ہے' جس کے لئے چاہتا ہے کم کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے زیادہ کر دیتا ہے۔ جیسا کہ وہ آدمی جس کے ہاتھ میں ترازو ہو وہ کبھی اس کو بلند کرتا ہے' کبھی جھکاتا ہے۔

بعض نے کہا کہ اس سے مراد عدل ہے یعنی کبھی تو اللہ تعالیٰ زمین میں عدل کو کم کرتا ہے' ظلم اور اہل ظلم کے غلبہ سے اور کبھی عدل کو زیادہ کرتا ہے عدل اور اہل عدل کو غلبہ دے کر۔

وفی روایۃ لمسلم :یمین اللہ ملأی:

بعض نے فرمایا کہ یمین کو خاص کیا اس لئے کہ غالباً دائیں ہاتھ ہی سے عطا کیا جاتا ہے یا اشارہ ہے عطاء کے یمن اور برکت کی طرف۔ پس اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے قبول اور رضا کے ساتھ آدمی کے قلیل میں بھی برکت ڈال دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس کثیر پر فائق ہو جاتا ہے جو ظاہری اعتبار سے اس طرح نہیں ہوتا۔

اور حدیث میں وارد ہوا ہے:

و کلتا یدیہ یمین۔

اس کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں یعنی مبارک' قوی اور قادر ہیں ایک کی دوسرے پر زیادتی نہیں (بلکہ دونوں اعتبار سے برابر ہیں' مرتب) اور شاہد کہ دو ہاتھوں سے مراد دو تصرف ہوں یعنی زیادہ یا کم عطا کرنا۔

ابن نمیر نے (نمیر تصغیر کے ساتھ ہے یعنی عبداللہ بن نمیر) اپنی روایت میں ملآن فرمایا ہے یعنی انہوں نے اس کو ملآن روایت کیا ہے۔ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شراح نے فرمایا کہ ابن نمیر کی غلطی ہے اور درست تانیث کے ساتھ ملأی ہے جیسا کہ سب روایات میں آتا ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر شراح نے اس نمیر پر روایت اور نقل کے اعتبار سے رد کیا ہو تو کوئی نزاع نہیں لیکن اگر انہوں نے عدم مطابقت کی وجہ سے رد کیا ہو تو بے شک ید مؤنث ہے۔ پس اس کا معاملہ آسان ہے اس لئے کہ ید اللہ سے مراد اللہ کا احسان اور فضل ہے (جو کہ مذکر ہے) میں کہتا ہوں کہ اس میں یہ بات ہے کہ یہ نبی علیہ السلام کے قول "سحاء" کے مناسب نہیں ہے۔

لا یغبضھا شی اللیل و النہار۔

۹۳ :وَعَنْهُ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذَرَارِی الْمُشْرِكِيْنَ قَالَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ ـ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ

أخرجه البخاری فی صحیحه ۳/۲٤٥حدیث رقم۱۳۸٤۔وأخرجه مسلم فی الصحیح ٤/۲۰٤۹حدیث

۲٦ وأخرجه أبو داوٗد ٥/ ٨٤ حديث رقم ٤٧١١ والنسائي ٤/ ٥٨ حديث رقم ١٩٥٠ وأحمد في المسند ٢/ ٣٩٣۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کی اولاد کے بارے میں سوال کیا گیا کہ مرنے کے بعد جنت میں جائیں گے یا جہنم میں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے تو کیا عمل کرتے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله :سئل رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ......بما كانوا عاملين۔

سئل رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم من ذراری المشركين۔

ذراری جمع ہے ذرية کی اور یہ انسانوں اور جنوں کی نسل کو کہتے ہیں اور اس کا اطلاق چھوٹے' بڑے سب پر ہوتا ہے۔ یا تو یہ "ذر" سے ہے جس کا معنی ہے تفریق۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو زمین میں پھیلایا ہے یا "الذرء" سے ہے جس کا معنی ہے مخلوق پس ہمزہ کو ترک کر دیا گیا یا اس کو بدل دیا گیا اور یہاں مراد ان کی اولاد کے حکم کے بارے میں سوال ہے کہ جب وہ بلوغ سے پہلے مر جائیں تو وہ اہل جنت میں سے ہوں گے یا اہل جہنم میں سے؟

اور جان لو کہ دنیوی امور میں بچہ دین کے اعتبار سے اشرف الابوین کا تابع ہوتا ہے (یعنی والدین میں سے جس کا دین اچھا ہوگا بچہ بھی اسی دین پر سمجھا جائے گا' مثلاً اگر والد مسلم اور والدہ کتابیہ ہے تو بچہ مسلم شمار ہوگا اور اگر والد کتابی اور والدہ مشرکہ ہے تو بچہ بھی کتابی سمجھا جائے گا۔ از مرتب)

یہی مطلب آپ علیہ السلام کے اس فرمان کا ہے جو بعض روایات میں آتا ہے۔

هم من ابائهم۔

بہرحال امورِ اُخروی جو کہ ثواب و عقاب ہیں وہ موقوف ہیں اور اللہ کے علم کے سپرد کئے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے نزدیک سعادت و شقاوت اعمال سے معلل نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے جس کو چاہا نیک بخت پیدا کیا اور جس کو چاہا بد بخت پیدا فرمایا اور اعمال کو نیک بختی اور بدبختی پر دلیل بنایا ہے۔

قال :الله اعلم بما كانوا عاملين۔

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ جانتا ہے کہ وہ جنت میں جانے والے ہوں گے یا جہنم میں یا ان کو دونوں کے درمیان چھوڑ دیا جائے گا اور اس میں علماء نے اختلاف کیا ہے پس بعض نے کہا کہ وہ اپنے والدین کے تابع ہونے کی وجہ سے اہل جہنم میں سے ہیں اور بعض نے کہا کہ اصل فطرت کا اعتبار کرتے ہوئے اہل جنت میں سے ہیں۔ بعض نے کہا کہ وہ اہل جنت کے خدام ہوں گے۔ بعض نے کہا کہ وہ جہنم اور جنت کے درمیان ہوں گے نہ ان کو نعمتوں سے سرفراز کیا جائے گا نہ ہی عذاب دیا جائے گا۔ بعض نے کہا کہ جن کے بارے میں اللہ جانتا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے تو وہ ایمان لاتے اور اس پر مرتے تو ان کو اللہ جنت میں داخل کرے گا اور جن کے بارے میں اللہ کے علم میں ہے کہ وہ کفر کرے گا تو اس کو جہنم میں داخل کر دے گا۔ بعض نے کہا کہ ان کے معاملے میں توقف کرنا چاہیے اور قطعی حکم نہیں اٹھانا چاہیے اور یہی اولیٰ ہے اس لئے کہ اس میں نبی علیہ السلام کی طرف سے توقیف ہے۔ پس نبی علیہ السلام نے ان کے اہل جنت یا اہل جہنم میں ہونے کا قطعی حکم نہیں لگایا بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس اعتقاد کا حکم دیا جو اکثر اہلسنّت

کا مذہب ہے کہ ان کے معاملے میں توقف کیا جائے۔ اسی طرح ابن الملک نے مصابیح کی شرح میں ذکر فرمایا ہے۔

اور اس میں یہ بات ہے کہ دونوں منزلوں (جنت اور جہنم) کے درمیان چھوڑ دینا کتاب وسنت سے ثابت نہیں ہے اور اہل اعراف کا آخری ٹھکانہ بھی جنت ہے۔ بعض نے کہا کہ ان کو جہنم میں داخل کر کے امتحان لیا جائے گا' واللہ اعلم۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کے بارے میں کچھ نازل نہیں ہوا تھا۔ پس یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ سب سے صحیح یہ ہے کہ وہ اہل جنت میں سے ہیں۔

الفصل الثانی:

سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا گیا

۹۴: عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ مَاخَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهٗ اُكْتُبْ قَالَ مَا اَكْتُبُ قَالَ اُكْتُبِ الْقَدَرَ فَكَتَبَ مَا كَانَ وَمَا هُوَ كَائِنٌ اِلَى الْاَبَدِ .

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ اِسْنَادًا)

أخرجه الترمذى فى السنن ٤/٣٩٨حديث رقم ٢١٥٥۔ وقال غريب من هذا الرجه۔وأخرجه أحمد فى المسند ٥/٣١٧۔

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا۔ پھر اس قلم کو لکھنے کا حکم دیا۔ قلم نے کہا اے اللہ میں کیا لکھوں؟ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے جواب ملا کہ تقدیر لکھو۔ لہٰذا اس قلم نے ان چیزوں کو لکھا جو اب تک ہو چکی ہیں اور ان چیزوں کو لکھا جو آئندہ ہونے والی ہیں۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور فرمایا کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے غریب ہے۔

تشریح: قولہ: ان اول ما خلق اللہ القلم ...... اکتب القدر

ان اول ما خلق اللہ' القلم:

القلم رفع کے ساتھ ہے اور نصب کے ساتھ بھی مروی ہے۔ بعض مغاربہ نے کہا کہ "القلم" کو مرفوع پڑھنے کی روایت ہی صحیح ہے اور اگر نصب درست ہو تو ان لوگوں کی لغت کے مطابق ہوگا جو ان کی خبر کو نصب دیتے ہیں۔ مالکی نے کہا کہ اس کو نصب دینا کان کو مقدر ماننے کے ساتھ درست ہے جیسا کہ کسائی کا مذہب ہے۔

کقولہ: ھالیت ایام الصبیار واجعا:

اور مغربی نے کہا کہ "القلم" کو "خلق" کا مفعول بنانا درست نہیں ہے' اس لئے کہ مراد یہ ہے کہ قلم اوّل مخلوق ہے اور جب اس کو خلق کا معمول بنایا جائے تو یہ بات لازم آئے گی کہ انّ کا اسم ضمیر شان ہے اور اول ظرف ہے۔ پس چاہیے کہ نبی علیہ السلام کے فرمان فقال سے فاء ساقط ہو جائے۔ اس لئے کہ معنی یہ بنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے اکتب کہا۔ جب اس کو پیدا

فرمایا۔ پس اس میں اس کے اول مخلوق ہونے کی خبر نہیں ہے اور مذکورہ بات اس لئے لازم آئی کہ اس کے بغیر اصل معنی فاسد ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ تقدیر یہ ہو جائے گی بے شک اللہ نے جس چیز کو پہلے پیدا کیا وہ قلم ہے اور یہ بات درست نہیں ہے۔

بعض نے کہا کہ اگر نصب والی روایت درست ہو تب بھی وہ "فاء" ممنوع نہیں ہے جب کہ فقال سے پہلے "امرہ" مقدر مانا جائے اور وہ ظرف میں عامل ہو یہ تحقیق طیبی کی ہے۔

اور اس میں یہ بات ہے کہ اس وقت تخلیق قلم کی اولیت پر تنصیص نہیں ہوگی جس پر صحیح مرفوع حدیث دلالت کرتی ہے۔

الازھار میں ہے کہ (اول ما خلق الله القلم) یعنی عرش، پانی اور ہوا کے بعد اس لئے کہ نبی علیہ السلام کا فرمان ہے:

کتب الله مقادیر الخلائق قبل ان یخلق السموات والارضین بخمسین الف سنة و عرشه علی الماء۔

(رواہ مسلم)

اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں سوال کیا گیا:

وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ ۔ [ھود:۷]

کہ پانی کس چیز پر تھا؟ تو انہوں نے فرمایا کہ ہوا کی پشت پر۔ اس کو بیہقی نے روایت کیا ہے اور ابہری نے ذکر کیا ہے۔ پس اولیت اضافی ہے اور اول حقیقی نور محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے جیسا کہ میں نے "المورد للمولد" میں بیان کیا ہے۔

فقال له :اکتب

قال کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور صحیح نسخے میں "فقال له" کے الفاظ ہیں۔ "اکتب" کتابة سے امر کا صیغہ ہے۔

قال :ما اکتب؟

ایک نسخہ میں فقال ہے "فاء" کے ساتھ۔ "ما اکتب" میں ما استفہامیہ ہے اور ترکیب کے اعتبار سے فعل کا مفعول مقدم ہے۔

قال :اکتب القدر:

یعنی وہ اندازہ جو طے شدہ ہے اور مصابیح میں ہے: قال :القدر ما کان ......۔ شراح نے فرمایا کہ: "ای اکتب القدر" پس اس کا نصب فعل مقدر کی وجہ سے ہے اور "وما کان" فعل مقدر سے بدل ہے یا اس کا عطف بیان ہے۔

قوله :فکتب ما کان...... إلی الابد۔

فکتب ما کان: ماضی نبی کریم علیہ السلام کی نسبت سے ہے۔ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ اس حکم کی حکایت نہیں ہے جو قلم کو کیا گیا تھا ورنہ یہ کہا جاتا کہ "فکتب ما یکون" (کہ جو کچھ ہونے والا تھا اس نے لکھ دیا) پس یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت کے اعتبار سے ہی خبر ہے۔ یعنی نبی کریم علیہ السلام کے یہ بتانے (اور یہ گفتگو کرنے) سے پہلے نہ کہ قلم سے پہلے اس لئے کہ غرض یہ ہے کہ قلم اول مخلوق ہے۔ ہاں! اگر اولیت اضافی ہو تو قلم سے پہلے کے امور کو مراد لینا درست ہوگا۔

وما ھو کائن الی الابد:

ما موصولہ ہے۔ ابہری نے فرمایا کہ "ما کان" سے مراد عرش' پانی' ہوا اور اللہ کی ذات وصفات ہیں۔

عالمِ ارواح میں انسانوں سے لیا گیا میثاق

۹۵ : عَنْ مُسْلِمِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ سُئِلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عَنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ الْاٰيَةَ قَالَ عُمَرُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسْئَلُ عَنْهَا فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلْجَنَّةِ وَبِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ يَعْمَلُوْنَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهٗ بِيَدِهٖ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلنَّارِ وَبِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ يَعْمَلُوْنَ فَقَالَ رَجُلٌ فَفِيْمَ الْعَمَلُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ اِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلْجَنَّةِ اِسْتَعْمَلَهٗ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَمُوْتَ عَلٰى عَمَلٍ مِنْ اَعْمَالِ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُدْخِلُهٗ بِهِ الْجَنَّةَ وَاِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلنَّارِ اِسْتَعْمَلَهٗ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ حَتّٰى يَمُوْتَ عَلٰى عَمَلٍ مِّنْ اَعْمَالِ اَهْلِ النَّارِ فَيُدْخِلُهٗ بِهِ النَّارَ۔ (رَوَاهُ مَالِكٌ وَالتِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ : الاعراف ۱۷۲)

أخرجه مالك فى الموطا ۸۹۸/۲ حديث رقم ۲ من كتاب القدر والترمذى ۲۴۸/۵ حديث رقم ۳۰۷۵ وقال حديث حسن وأبو فى السنن ۷۹/۵ حديث ۴۷۰۳ وأحمد فى المسند ۴۴/۱۔

ترجمہ: حضرت مسلم بن یسار رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ سے اس آیت کریمہ کے بارے میں پوچھا گیا: ﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ﴾ (اور جب تیرے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو عقل وشعور عطا کر کے ان سے انہیں کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کہ کیوں نہیں ہم سب اس کی شہادت دیتے ہیں۔ تاکہ قیامت کے دن نہ کہنے لگو کہ ہم تو اللہ کی اس توحید سے غافل تھے) تو حضرت عمرؓ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا۔ تو میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو پیدا کیا۔ پھر ان کی پشت پر داھنا ہاتھ پھیرا اور اس میں سے ان کی اولاد نکالی اور فرمایا کہ میں نے ان کو جنت کے لئے اور اہل جنت کے اعمال کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ پھر اپنا ہاتھ آدم کی پشت پر پھیرا اور اس میں سے ان کی اولاد نکالی اور فرمایا کہ میں نے ان کو جہنم کے لئے اور دوزخیوں کے اعمال کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ سن کر ایک آدمی نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ پھر عمل کی کیا ضرورت ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو جنت کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے اہل جنت کے اعمال کراتا ہے۔ یہاں تک کہ اس بندہ کی وفات اہل جنت کے اعمال پر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کو ان اعمال کی وجہ سے جنت میں داخل کر دیتا ہے اور جب کسی بندہ کو جہنم کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے اہل جہنم کے اعمال کراتا ہے یہاں

تک کہ وہ دوزخیوں کے اعمال پر مرجاتا ہے پھر اس کو ان اعمال کی وجہ سے جہنم میں داخل کر دیتا ہے۔

(مؤطا امام مالک' ترمذی' ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

مسلم بن یسار۔ یہ "مسلم" ہیں۔ "یسار" کے بیٹے ہیں اور جہنی ہیں۔ سورۂ اعراف کی تفسیر میں امام ترمذی رحمہ اللہ نے ان کی روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب سے نقل کی اور کہا کہ ان کی حدیث حسن ہے' لیکن انہوں نے عمر رضی اللہ عنہ سے نہیں سنا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مسلم بن یسار نے نعیم سے اور انہوں نے عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔

تقدیر کے متعلق دو کتابیں

۹۲ :وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِيْ يَدَيْهِ كِتَابَانِ فَقَالَ اَتَدْرُوْنَ مَاهٰذَانِ الْكِتَابَانِ قُلْنَا لَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِلَّا اَنْ تُخْبِرَنَا فَقَالَ لِلَّذِيْ فِيْ يَدِهِ الْيُمْنٰى هٰذَاكِتَابٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ فِيْهَا اَسْمَاءُ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاَسْمَاءُ اٰبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ ثُمَّ اُجْمِلَ عَلٰى اٰخِرِهِمْ فَلَا يُزَادُ فِيْهِمْ وَلَايُنْقَصُ مِنْهُمْ اَبَدًا ثُمَّ قَالَ لِلَّذِيْ فِيْ شِمَالِهٖ هٰذَا كِتَابٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ فِيْهِ اَسْمَاءُ اَهْلِ النَّارِ وَاَسْمَاءُ اٰبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ ثُمَّ اُجْمِلَ عَلٰى اٰخِرِهِمْ فَلَا يُزَادُ فِيْهِمْ وَلَا يُنْقَصُ مِنْهُمْ اَبَدًا فَقَالَ اَصْحَابُهٗ فَفِيْمَ الْعَمَلُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ كَانَ اَمْرٌقَدْ فُرِغَ مِنْهُ فَقَالَ سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا فَاِنَّ صَاحِبَ الْجَنَّةِ يُخْتَمُ لَهٗ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاِنْ عَمِلَ اَيَّ عَمَلٍ وَاِنَّ صَاحِبَ النَّارِ يُخْتَمُ لَهٗ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ وَاِنْ عَمِلَ اَيَّ عَمَلٍ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدَيْهِ فَنَبَذَهُمَا ثُمَّ قَالَ فَرَغَ رَبُّكُمْ مِنَ الْعِبَادِ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)

أخرجه الترمذي ٤/٣٩١حديث رقم ٢١٤١وقال هذا حديث حسن غريب صحيح وأخرجه أحمد في المسند ١٦٧/٢۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں اور صحابہ کرام کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ دو کتابیں کیسی ہیں۔ ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول۔ ہمیں کیا معلوم یہ دو کتابیں کیسی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہمیں بتا دیجئے کہ یہ دو کتابیں کیسی ہیں؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب کے بارے میں ارشاد فرمایا جو داہنے ہاتھ میں تھی کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے ہے۔ جس میں جنتیوں کے نام، ان کے آباء اور قبائل کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ پھر آخر میں ٹوٹل کر دیا گیا ہے اب اس میں کمی زیادتی کبھی نہیں ہو سکتی اس کے بعد آپؐ نے بائیں ہاتھ والی کتاب کے متعلق ارشاد فرمایا کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے ہے اس میں اہل جہنم اور ان کے آباء اور قبیلوں کے نام لکھے ہوئے ہیں پھر آخر میں ٹوٹل

کر دیا گیا ہے اب اس میں کمی زیادتی نہیں ہو سکتی۔ یہ سن کر صحابہ کرام نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! اگر یہ چیز پہلے سے مقرر اور ثابت ہو چکی ہے کہ جنت اور جہنم کا دارومدار نوشتہ تقدیر پر ہے۔ تو پھر عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا شریعت کے مطابق اپنے اعمال کو اچھی طرح مضبوط کرو اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرو۔ اس لئے کہ جنتی کا خاتمہ اہل جنت والے اعمال پر ہوتا ہے اگر چہ اس نے اپنی زندگی میں کیسے ہی اعمال کئے ہوں اور جہنمی کا خاتمہ اہل جہنم کے اعمال پر ہوتا ہے۔ اگر چہ اس نے اپنی زندگی میں کیسے ہی اعمال کئے ہوں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا اور ان دونوں کتابوں کو رکھ دیا اور ارشاد فرمایا کہ تمہارا رب اپنے بندوں کے بارے میں یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ ایک جماعت جنتی ہے اور ایک جماعت جہنمی ہے۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قولہ :خرج وفي يديه كتابان۔

بعض نسخوں میں یدہ ہے جیسا کہ مصابیح کے اکثر نسخوں میں ہے۔ پس اس سے مراد جنس ہے اور واؤ حال کے لئے ہے۔

قولہ :اتدرون ما هذان الكتابان :

تدرون بمعنی تعلمون ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ حسی ہے کیونکہ وہ دونوں حسی ہیں اور کہا گیا ہے کہ سامع کے مشاہدہ میں خفی باریک معنی کے لئے استحضار اور تمثیل ہے۔ یہاں تک کہ گویا وہ اس کی طرف آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ پس جب نبی اکرم ﷺ کو حقیقت امر منکشف ہوئی اور اسکی پوری اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ کے ساتھ کوئی خفاء نہ رہا تو آپ ﷺ نے جو چیز قلب میں حاصل ہوتی ہے اس کی تصویر کشی اس چیز کے ساتھ کی جو ہاتھ میں حاصل ہوئی ہے اور اس کی طرف اشارہ کیا محسوس کی طرف اشارہ کرنے کی طرح۔

قولہ :قلنا :لا يا رسول الله!الا ان تخبرنا۔

استثناء مفرغ ہے یعنی ہم نہیں جانتے اسباب میں سے کسی سبب کو مگر یہ کہ آپ ﷺ اس کی ہمیں خبر دیں اور کہا گیا ہے کہ استثناء منقطع ہے یعنی لیکن اگر آپ ہمیں خبر دیں تو ہم جان لیں گے گویا کہ اس استدراک سے انہوں نے آپ سے ان کی خبر طلب کی۔

قولہ :فقال الذی ...... هذا كتاب رب العلمين۔

یعنی اس کتاب کے لئے یا اس کی شان میں یا اس کے بارے میں اور کہا گیا ہے کہ "قال" بمعنی اشار ہے۔ پس لام الیٰ کے معنی میں ہے۔ ربّ العالمین کو ذکر کے ساتھ خاص فرمایا اس بات پر دلالت کرتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے مالک ہیں اور وہ اس کے مملوک ہیں۔ ان میں تصرف کرتے ہیں جیسے چاہتے ہیں جس کو چاہتے ہیں نیک بخت بناتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں بد بخت بناتے ہیں اور یہ سب عدل اور صحیح ہے کسی کے لئے اس پر اعتراض کا حق نہیں اور کہا گیا ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ یہ کلام تصویر کشی اور تمثیل کے طور پر صادر ہوا ہے اس کے مثل جو اللہ کے علم میں ثابت ہے یا جو لوحِ محفوظ میں ثابت ہے وہ اس کے مثل ہے جو ثابت ہے اس کتاب میں جو آپ کے ہاتھ میں بھی اور بعید نہیں ہے اس کو اپنی حقیقت پر جاری کرنا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں اور نبی اکرم ﷺ غائبی معانی کے ادراک اور ان صورتوں کے مشاہدہ کے لئے جو ان کے لئے بنائی گئی ہیں مستعد

ہیں۔

قوله :فیه اسمآء اهل الجنة' واسمآء ابائهم و قبائلهم:

ظاہر یہ ہے کہ اہل جنت اور اہل جہنم میں سے ہر ایک کا نام اور اس کے باپ کا نام اور اس کے قبیلہ کا نام لکھا جاتا ہے خواہ وہ اہل جنت میں سے ہوں یا اہل جہنم میں سے تمیز تا نام کے لئے جیسا کہ دستاویزات میں ہوتا ہے۔ اشرف کہتے ہیں اہل جنت کے نام ان کے آباء اور قبائل کے نام ان لوگوں کے لئے جو اہل جہنم میں سے ہے لکھے جاتے ہیں اس کتاب میں جو دائیں ہاتھ میں ہوتی ہے اور اس کے برعکس اہل جہنم کے لکھے جاتے ہیں۔ ورنہ اگر والدین اور بیٹے اگر اہل جنت کی جنس میں سے ہیں یا اہل جہنم میں سے ہیں تو ان کا الگ ذکر کرنے کی حاجت نہیں اس لئے کہ اس قول کے تحت داخل ہیں: **"فیه اسمآء اهل الجنة و فیه اسمآء اهل النار۔"**

قوله :ثم اجمل علی آخرهم۔

"اجمل الحساب" والے قول سے نکلا ہے اس وقت بولتے ہیں جب حساب تمام ہو جائے اور تفصیل کو اجمال کی طرف لوٹایا جائے اور ورق کے آخر میں پورے مجموع کو ثابت کیا اور جیسا کہ محاسبین کی عادت ہے کہ وہ اشیاء مفصلہ لکھتے ہیں پھر اس کے آخر میں لکھ دیتے ہیں کہ یہ تفصیل اجمال کی طرف لوٹتی ہے۔

اجمل اوقع کے معنی کو متضمن ہے پس اس کو علی کے ساتھ متعدی کیا یعنی اجمال کو واقع کیا اس پر جس پر تفصیل منتہی ہوتی ہے اور کہا گیا ہے کہ تفصیل کے آخر میں اجمال کو واقع کیا یعنی لکھا اور جائز ہے کہ یہ حال ہو یعنی مجمل کیا آخر تک تمثیل کی انتہاء کے حال میں ہیں۔ اس صورت میں "علی" بمعنی "الی" ہے۔

قوله :فلا یزاد فیهم ولا ینقص منهم ابدا:

یہ شرط کی جزاء ہے یعنی تفصیل و تعیین میں اور تفصیل کے بعد اجمال میں سے دستاویز میں تو اس پر نہ زیادتی کی جائے گی اور نہ کمی۔ "ینقص" مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ "ابدا" اس لئے کہا کہ اللہ کا حکم متغیر نہیں ہوتا۔ رہا اللہ کا یہ فرمان: ﴿يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ (الرعد: ۳۹) "ہر لکھا ہوا اللہ مٹاتا ہے جس کو چاہتا ہے اور باقی رکھتا (جس کو چاہتا ہے) اور اس کے پاس اصل کتاب ہے" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انتہاء کے لئے وقت مقررہ کی مدت ہے۔ پس جو اپنی اس مقررہ مدت کو پہنچتا ہے تو اللہ اس کو مٹا دیتا ہے اور جس کی مدت باقی ہوتی ہے تو اس کو باقی رکھتا ہے اس پر جو اس میں ثابت ہے اور یہ سب ثابت ہے اللہ کے ہاں اصل کتاب میں اور وہ تقدیر ہے جب کہ اس کو مٹانا اور باقی رکھنا قضاء ہو تو یہ بھی عین تقدیر ہے اور ازل سے جاری ہے۔ پس یہ تغیر نہیں ہے اور یا مراد احکام میں سے منسوخ کو مٹانا اور ناسخ کو باقی رکھنا ہے اور تائب سے برائیوں کو مٹانا حسنات کو اس کی جزاء وغیرہ کے لئے باقی رکھتا ہے اور ممکن ہے یہ کہا جائے کہ محو اور اثبات امور معلقہ سے متعلق ہیں نہ کہ محکم امور سے واللہ اعلم۔

جامع صغیر میں طبرانی کی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت ہے: **"ان الله تعالیٰ خلق لوحًا محفوظًا من درة بیضآء صفحاتها من یاقوته حمرآء قلمه نور و کتابه نور لله فی کل یوم ستون و ثلاثمائة لحظة یخلق و**

یرزق و یمیت و یحیی و یعز و یزل و یفعل ما یشاء" (جامع صغیر) ''اللہ تعالیٰ نے لوحِ محفوظ کو سفید موتی سے پیدا کیا جس کے سامنے کے حصے سرخ یاقوت کے ہیں' اس کا قلم نور ہے اور اس کی کتاب نور ہے' اللہ کے لئے ہر آن میں تین سو تریسٹھ لحات ہیں' پیدا کرتا ہے' رزق دیتا ہے' مارتا ہے اور زندہ کرتا ہے اور عزت دیتا ہے اور ذلیل کرتا ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے منافی نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا: ﴿يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ (الرعد: ۳۹) ''ہر لکھا ہوا اللہ مٹاتا ہے جس کو چاہتا ہے اور باقی رکھتا (جس کو چاہتا ہے) اور اس کے پاس اصل کتاب ہے'' جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔ محو اور اثبات اس نسبت سے ہے جو لوحِ محفوظ میں ہے اور ملائکہ کے علم کی نسبت سے ہے اس لئے کہ اشیاء بعض اوقات معلق ہوتی ہیں ایسے اسباب پر جن کے پائے جانے اور نہ جانے کی وجہ سے متغیر ہوتی ہیں نہ کہ اصل کتاب کی وجہ سے۔ جس سے مراد اللہ کا علم قدیم ہے اور یہ کسی کے لئے ممکن نہیں ہے کہ اس پر مطلع ہو سکے مگر جزئیات معینہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کو متعین طور پر بتلانا کہ وہ جنتی ہیں۔

قولہ :ثم قال للذی فی شمالہ...... اسمآء ابائھم و قبائلھم۔

اور فاسق کے بارے میں سکوت کیا گیا ہے جیسا کہ آیاتِ قرآنیہ اور احادیث مبارکہ کا طرز ہے' وعدوں اور وعیدوں کے جمع احکام ہیں تاکہ خوف و امید کے درمیان راضی رہے اس پر قضاء جاری ہو اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اہل جنت سے لکھا جائے گا اس لئے کہ بالآخر اس کا انجام یہی ہوگا اگرچہ وہ دوزخ میں داخل ہو اس لئے کہ مدار خاتمہ پر ہوتا ہے۔

قولہ :ثم اجمل علی آخرھم...... قد فرغ منہ۔

''فرغ'' مجہول کے صیغہ پر ہے یعنی اگر مدار ازلی کتابت پر ہے تو اکتسابِ عمل کا کیا فائدہ۔

قولہ :فقال :سددوا قاربوا:

یعنی اپنے اعمال کو طریق حق پر درست کرتے رہو اور اللہ کی اطاعت کے ساتھ اس کی قربت طلب کرتے رہو جتنی بھی تم طاقت رکھتے ہو۔ یہ جواب حکیم کے طرز پر ہے یعنی تمہیں کیا ہے' تقدیر کا معاملہ ذکر کرنے اور اس کے ذریعہ حجت پکڑنے سے بچو۔

بے شک تم تو عبادت کے لئے پیدا کئے گئے ہو' پس عمل کرو اور سیدھے رہو اور قریب رہو۔ علامہ طیبی نے یہی کہا ہے اور شیخ ابن حجر نے بخاری کی شرح میں فرمایا ہے: **''سددو :ای الزموا السداد...... تفریط''** یعنی **''سددوا''** کا مطلب ہے سداد کو لازم پکڑو اور یہ افراط و تفریط کے بغیر درست راستے کو کہتے ہیں: **''وقاربوا ای ان لم تستطیعوا الاخذ بالاکمل فاعملوا بما یقرب منہ''** اور **''قاربو''** کا مطلب ہے کہ اگر تم اکمل کو لینے کی طاقت نہیں رکھتے تو اس پر عمل کرو جو اس کے قریب ہے اور علامہ کرمانی فرماتے ہیں اور عبادت میں قریب رہو اور دور نہ ہو کیونکہ اگر تم اس میں دور ہو گئے تو اس تک نہیں پہنچ سکتے یا اس کا معنی ہے مدد کرو۔ کہا جاتا ہے: **''قاربت فلانا''** جب کوئی کسی کی مدد کرے یعنی تم میں سے بعض بعض کی مدد کریں امور میں اور جواب کا حاصل ''اللہ ہی بہتر جانتا ہے'' یہ ہے کہ جبریہ اور قدریہ کی نفی کرنا اور حکم کو ثابت کرنا ہے۔ دونوں امروں یعنی ازلی کتابت اور سرایت عمل کے اعتدال کے ساتھ اور یا یہ کہ اعمال نشانیاں اور علامات ہیں لہٰذا ان کا وجود ضروری ہے' اس لئے اللہ

تعالیٰ محض اپنے علم پر عمل نہیں کرے گا' واللہ اعلم اور اسی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قوله :فان صاحب الجنة يختم له...... وان عمل اى عمل۔

"**يختم له**" مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے اہل جنت کے عمل سے مراد یہ ہے کہ ایسا عمل ہے جو ایمان کو بتلانے والا وراس کے تعین کی طرف اشارہ کرنے والا ہے۔

قوله :ثم قال بيديه۔

"**قال**" سے یہاں مراد "**اشار**" ہے۔ عرب تمام افعال کو لفظ قول کے ساتھ تعبیر کر لیتے ہیں۔ پس اس کا اطلاق کلام اور زبان کے علاوہ پر بھی کرتے ہیں۔ پس کہتے ہیں: "**قال بيده اى اخذ**" اس نے اپنے ہاتھ سے کہا یعنی لیا اور "**قال برجله اى مشى**" اس نے پاؤں سے کہا یعنی چلا۔۔

وقالت له العينان : سمعًا وطاعة ☆ وحدرتا كالدر لما يشقب

"اس کو اس کی آنکھوں نے سمع اور طاعت کا اشارہ کیا ☆ اور خوبصورت ہوگئیں اس موتی کی طرح جس میں سوراخ نہیں کیا گیا"

یعنی **قالت** کا مطلب "**او مأت**" اشارہ کیا ہے اور "**قال بالماء على يده**" کا مطلب ہے الٹ پلٹ اور "**قال بثوبه**" کا مطلب ہے اس نے اٹھایا۔

قوله :فنبذهما ثم قال :فرغ ربكم من العباد:

یعنی جو کچھ ان دونوں کتابوں میں ہے پھینک دیا گیا ہے' اپنی پیٹھ پیچھے اور راز ہار میں ہے کہ "**نبذهما**" کی ضمیر "**يدين**" کی طرف لوٹتی ہے اس لئے کہ کتابوں کا پھینکنا آپ کی عادتِ مبارکہ سے بعید ہے۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ ان کا پھینکنا بطور اہانت نہیں ہے بلکہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ آپ نے ان کو عالم الغیب کی طرف پھینکا۔ پھر یہ سب اس وقت ہے جب وہاں کوئی حقیقی کتاب ہو اور رہی تمثیل تو اس وقت "**نبذهما**" سے مراد ہاتھوں کا ڈالنا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ آپ کا قول: "**قال بيديه فنبذهما**" یہ "**جف القلم بما انت لاق**" کے مرتبہ میں ہے یعنی قلم خشک ہو گیا' اس کے ساتھ جس کا تو مستحق ہے۔ یہ کنایہ ہے اس بات سے کہ اس امر سے فراغت ہو چکی ہے۔ پس یہ ایسے ہو گیا جیسے تو نے اس کو پیٹھ کے پیچھے ڈال دیا' پس آپ کا فرمانا: "**ثم قال :فرغ ربكم**" یہ اس عمل کی تفسیر ہوگی اور اس کلام کا نتیجہ ہوگا۔

اشرف کہتے ہیں کہ: "**من العباد**" کا مطلب ہے کہ بندوں کے امر سے اور امر سے مراد شان ہے۔ یعنی ان کی شان کو مقدر کر دیا۔ جب ان کو دو قسموں پر تقسیم کیا اور ہر قسم کے لئے متعین طور پر مقدر کر دیا کہ اہل جنت سے ہے یا اہل دوزخ سے اس طور پر کہ یہ تقسیم تفسیر کو قبول نہیں کرتی گویا ان کے معاملہ سے فارغ ہو گیا' ورنہ اللہ تعالیٰ پر فراغت جائز نہیں ہے۔

قوله :فريق فى الجنة و فريق فى السعيد:

ممکن ہے کہ یہ قرآنِ حکیم سے گواہی لینا اور فرقانِ حمید سے مضبوطی پکڑنا ہو اس طور پر کہ دونوں فریقوں کا معاملہ ہمارے

ہاں مبہم اور مجمل ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں معلوم اور مفصل ہے اور ممکن ہے یہ موافقت لفظیہ اور مطابقت معنویہ جو اللہ تعالیٰ کے کلمات سے حکیمانہ اقتباسات اور تضمنات کی ایک قسم ہے۔ واللہ اعلم۔

علاج اور حفاظت کے اسباب تقدیر کے تحت ہیں

٩٧ : وَعَنْ اَبِىْ خِزَامَةَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ رُقًى نَسْتَرْقِيْهَا وَدَوَآءً نَتَدَاوٰى بِهٖ وَتُقَاةً نَتَّقِيْهَا هَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ شَيْئًا قَالَ هِىَ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ۔ (رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِىُّ وَابْنُ مَاجَه)

أخرجه أحمد في المسند٣/٤٢١۔ والترمذی ٤/٣٤٩حدیث رقم ٢٠٦٥وقال حدیث حسن صحیح وابن ماجة في السنن ١١٣٧ حدیث رقم ٣٤٣٧۔

ترجمہ: حضرت ابوخزامہ اپنے والد محترم سے نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! وہ وظائف اور دم جن کو ہم شفاء حاصل کرنے کے لئے پڑھواتے ہیں اور وہ دوائیں جن کو ہم صحت حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور وہ چیزیں جن کو ہم حفاظت کے لئے استعمال کرتے ہیں جیسے ڈھال اور زرہ وغیرہ ان کے بارے میں مجھے بتائیے کیا یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں سے کسی چیز کو رد کرسکتی ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ چیزیں بھی تقدیر کے تحت ہیں اس حدیث کو روایت کیا ہے امام احمدؒ اور امام ترمذی اور ابن ماجہ نے۔

تشریح: قوله :قال قلت یا رسول الله ...... نتقیها:

رقی "رقیة" کی جمع ہے جیسے "ظلم" ظلمۃ کی جمع ہے اور یہ اس کو کہتے ہیں جو شفاء طلب کرنے کے لئے پڑھا جاتا ہے اور "استرقاء" رقیہ طلب کرنے کو کہتے ہیں اور "دوا" نصب کے ساتھ ہے۔ "نتداوی به" کا مطلب ہے "نستعمله" یعنی ہم اس کو استعمال کریں۔ "تقاہ" قاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ "نتقیها" یعنی ہم اس کے ذریعہ التجاء طلب کریں اور اس کے سبب سے بچیں اور "تقاہ" کا اصل "وقاۃ" ہے جو "وقی" سے ہے اور یہ نام ہے اس کا جس کے ذریعہ لوگ بچتے ہیں دشمن کے خوف سے جیسے ڈھال اور وہ ہے جس کو دشمن سے حفاظت کرتی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مصدر ہو بمعنی "اتقاء"۔ پس ضمیر "نتقیها" میں مصدر کی طرف لوٹے گی۔ کہا گیا ہے یہ منصوبات ہیں یعنی "وقی" اور جو اس پر معطوف ہیں موصوف ہیں ان افعال کے ساتھ جو اس کے بعد ہیں اور متعلق ہیں "ارایت" سے یعنی مجھے منتر کے بارے میں خبر دو جس کے ذریعہ ہم منتر کریں۔ پس اس کو نصب علیٰ نزع الخافض کے طور پر ہے (یعنی حرف جار کو ہٹا کر) اور جائز ہے یہ متعلق ہو لفظ "ارایت" کے ساتھ اور مفعول اوّل موصوف ہو صفت کے ساتھ اور ثانی استفہام ہو "مقو لافی حقها" کی تاویل کے ساتھ۔

قوله :هل ترد من قدر الله شیئا؟ قال :هی من قدر الله:

یعنی یہ اسباب جو اللہ کی تقدیر پر لوٹا سکتے ہیں آپ نے فرمایا یہ یعنی مذکور تین چیزیں بھی اللہ کی تقدیر سے ہیں یعنی جس طرح اللہ نے بیماری کو مقدر کیا ہے اسی طرح دواء کے ذریعہ اس کی شفاء کو بھی مقدر کیا ہے اور جو اس کو استعمال کرے اور نفع نہ ہو پس وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے مقدر میں نہیں لکھا۔ نہایہ میں کہا ہے کہ بعض احادیث میں آیا ہے کہ منتر جائز ہے جیسا کہ نبی

اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ((استرقو لها فان بها النظرة)) ''اس کے لئے منتر طلب کرو اس لئے کہ اس کو نظر ہے'' یعنی اس کو طلب کرو جو اس کا منتر کرے اور بعض روایات میں اس کی نہی آتی ہے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے توکل کے باب میں۔ ((الذین لا یسترقون ولا یکتوون)) ''یہ لوگ ہیں جو نہ منتر کرواتے ہیں اور نہ داغ لگاتے ہیں'' اور احادیث دونوں قسموں میں کثیر ہیں اور دونوں کے درمیان تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جو منتر اللہ تعالیٰ کے اسماء اس کی صفات اور اس کے کلام کے علاوہ ہے جو کتب منزلہ میں ہے یا عربی زبان کے علاوہ ہو اور جس کے بارے میں یہ اعتقاد ہو کہ یہ لامحالہ نفع دے گا۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنے اس فرمان سے ''ما توکل من استرقی'' یہی مراد لیا ہے اور جو اس کے برخلاف ہے۔ جیسے قرآن سے اور اللہ تعالیٰ کے ناموں سے تعوذ حاصل کرنا اور وہ منتر جو مروی ہے وہ منہی عنہ نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اس آدمی کے لئے فرمایا جس نے قرآن سے منتر کیا اور اس پر اجرت کی: ((من اخذ برقیة باطل فقد اخذت برقیة حق)) ''جس نے باطل منتر لیا پس وہ حق منتر لے'' اور رہا نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان: ((لا رقیة الا من عین او حمة)) ''منتر نہیں ہے مگر نظر سے یا زہر سے'' پس اس کا مطلب ہے کہ کوئی منتر ان دونوں پر اثر کرنے سے زیادہ بہتر اور نفع بخش نہیں ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں' عربی کے علاوہ الفاظ کے ساتھ منتر کرنے کی حرمت پر ائمہ اربعہ رحمہم اللہ نے صراحت کی ہے۔

تقدیر میں بحث اور جھگڑا نہ کرو

۹۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَتَنَازَعُ فِي الْقَدَرِ فَغَضِبَ حَتّٰى اِحْمَرَّ وَجْهُهٗ حَتّٰى كَاَنَّمَا فُقِئَ فِيْ وَجْنَتَيْهِ حَبُّ الرُّمَّانِ فَقَالَ اَبِهٰذَا اُمِرْتُمْ اَمْ بِهٰذَا اُرْسِلْتُ اِلَيْكُمْ اِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حِيْنَ تَنَازَعُوْا فِيْ هٰذَا الْاَمْرِ عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ اَنْ لَّا تَنَازَعُوْا فِيْهِ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذی ٤/٣٨٦ حدیث رقم ٢١٣٣۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ تقدیر کے مسئلہ میں بحث اور جھگڑا کر رہے تھے۔ کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور ہمیں اس مسئلہ میں جھگڑتے ہوئے دیکھ کر آپ کا چہرہ انور غصہ کی وجہ سے سرخ ہو گیا اور یوں معلوم ہوتا تھا گویا کہ انار کے دانے آپ ﷺ کے رخسار مبارک پر نچوڑ دیئے گئے ہوں اسی حالت میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ کیا تمہیں یہی حکم دیا گیا ہے؟ اور مجھے اسی لئے تمہارے پاس رسول بنا کر بھیجا گیا ہے؟ اور تم اس بات کو جان لو کہ تم سے پہلے لوگ اس وقت ہلاک کر دیئے گئے جب انہوں نے مسئلہ تقدیر میں بحث اور جھگڑا کیا۔ لہٰذا میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں اور پھر دوبارہ اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ تم اس مسئلہ تقدیر میں بحث نہ کیا کرو۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قولہ: قال: خرج علینا رسول اللہ ﷺ ونحن نتنازع فی القدر:

یعنی ہم اس حال میں تھے کہ تقدیر کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ پس بعض کہہ رہے تھے جب سب تقدیر کے ساتھ

ہے تو ثواب اور عقاب کیسا جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں اور دوسرا کہتا تھا بعض کو جنت اور بعض کو دوزخ میں ڈالنے میں کیا حکمت ہے؟ پس تیسرا کہتا تھا' اس لئے کہ اس میں ان کے لئے ایک طرح کا کسبی اختیار ہوتا ہے۔ پس چوتھا کہتا تھا پس کس نے اس اختیار اور کسب کو ایجاد کیا ہے اور ان کے اوپر مقدر کیا ہے اور اس طرح کی چیزیں۔

قوله :فغضب حتى احمر وجهه...... حب الرمان:

یعنی انتہائی سرخ ہوا۔ یہاں تک کہ شدتِ سرخی کی وجہ سے ایسا ہوگیا کہ آپ ﷺ کے رخسار پر انار نچوڑا گیا ہے۔ "وجنتيه" سے مراد رخسار ہیں۔ "حب الرمان" چہرہ کی مزید سرخی سے جو زیادہ غصہ کی خبر دینے والی ہے۔ آپ ﷺ اس لئے غضبناک ہوئے کیونکہ تقدیر اللہ تعالیٰ کے اسرار میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کے راز کو طلب کرنا منہی عنہ ہے اور اس لئے بھی کہ جو ان میں بحث کرتا ہے وہ اس سے مامون نہیں کہ وہ جبری بن جائے یا قدری (یہ دونوں گمراہ فرقے ہیں) اور بندے مامور ہیں اس چیز کو قبول کرنے کے جو شریعت ان کو حکم دے بغیر اس کے کہ وہ طلب کریں اس راز کو جس کو طلب کرنا جائز نہ ہو۔

قوله :فقال أبهذا امرتم...... عزمت عليكم ان لا تتنازعوا فيه:

یعنی کیا اس تنازع فی القدر کے بارے میں تمہیں حکم دیا گیا ہے؟ اور ہمزۂ استفہام انکار کے لئے ہے اور مجرور کی تقدیم مزید اہتمام کے لئے ہے۔ ام منقطع بمعنی بل ہے اور ہمزہ یہاں بھی انکار کے لئے ہے۔ اہون سے اشد کی طرف ترقی کے لئے ہے اور انکار سخت انکار کے لئے ہے۔ "من كان قبلكم" یعنی امم سابقہ میں سے۔ "انما هلك" سے جملہ مستانفہ ہے جواب ہے اس کا جو ان کی طرف سے متوجہ ہوسکتا ہے کہ وہ کہیں: آپ اتنا بلیغ انکار کیوں فرما رہے ہیں؟ "حين تنازعوا فی هذا الامر" کا جملہ دلالت کرتا ہے کہ اللہ کا غضب اور ان کو ہلاک کرنا بغیر مہلت دیئے تھا' پس اس میں زیادہ وعید ہے۔ "عزمت" "اقسمت" اور "وجبت" یعنی میں تم کو قسم دیتا ہوں اور تم پر واجب کرتا ہوں کہا گیا ہے: "عزمت عليكم" کا اصل یہ ہے: "عزمت بالقاء اليمين والزامها عليكم" یعنی میں قسم کو پھینکنے اور اس کو تمہارے اوپر لازم کرنے کا عزم کرتا ہوں۔ "تنازعوا" ایک تاء کے حذف کے ساتھ ہے اصل میں تتنازعواہ ہے اور نہ بحث کرو اس کے بعد تقدیر میں۔ ابن الملک کہتے ہیں: یہ "ان" ممتنع ہے کہ مصدریہ ہو یا زائدہ۔ اس لئے کہ جواب قسم نہیں ہوسکتا مگر جملہ ہی اور "ان" "لا" کے ساتھ زائد نہیں ہوسکتا۔ پس یہ اس وقت مفسرہ ہے جیسے: "اقسمت ان لا ضربت" ہے۔ یعنی "میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نہیں ماروں گا" اور تنازعوا مجزوم ہے۔ لائے نہی کے ساتھ اور جائز ہے کہ "ان" مخففہ ہو مثقلہ سے' اس لئے کہ یہ اپنے اسم اور خبر کے ساتھ ہے۔ یہ جملہ کے قائم مقام ہے۔ اس طرح زین العرب نے کہا ہے۔

۹۹ : وَرَوَى ابْنُ مَاجَةَ نَحْوَهُ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ۔

أخرجه الترمذي ٤/٣٨٦ حديث رقم ٢١٣٣۔

ترجمہ: اور ابن ماجہ نے اسی طرح کی روایت عمرو بن شعیب سے نقل کی ہے۔ جو انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے نقل کی ہے۔

راویٔ حدیث:

عمرو بن شعیب۔ یہ عمرو بن شعیب بن محمد بن عبداللہ ابن عمرو بن العاص کے بیٹے اور سہمی ہیں۔ اپنے والد اور ابن المسیب اور طاؤس سے حدیث سنی اور ان سے زہری' ابن جریج' عطاء اور بہت سے لوگوں نے روایت کی۔ شیخ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں :ترجمہ عمرو قویة علی المختار حیث لاتعارض۔ بخاری اور مسلم نے اپنی صحیحین میں ان کی کوئی حدیث نہیں لی۔ اس لیے کہ وہ اپنی روایات اس طرح نقل کرتے ہیں: عن ابیہ عن جدہ اور کبھی اس سند میں اختصار کرتے ہیں۔ اب اگر مقصود عن ابیہ عن جدہ سے خود اپنے باپ اور اپنے دادا ہیں تو معنی یہ ہوئے کہ اپنے باپ ''شعیب'' اور اپنے ''دادا محمد'' سے روایت کر رہے ہیں کہ ان کے ''دادا محمد'' سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا اس صورت میں روایت ''مرسل'' ہوگی۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے دادا سے سماع کیا ہے' لہٰذا اس طریق سے ان کی حدیث متصل ہے۔ لیکن احتمال ہوتا ہے کہ جدہ سے مراد محمد ہوں' عبداللہ مراد نہ ہوں اس لیے صحاح میں ان کی روایت کو اس اسناد سے نہیں لیا گیا (نووی)۔ کیونکہ محمد جو ان کے دادا ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات سے مشرف نہیں تھے نہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا اور اگر اس سند کا مطلب یہ ہے کہ ''عمرو'' اپنے باپ ''شعیب'' سے شعیب اپنے دادا ''عبداللہ'' سے روایت کرتے ہیں تو اس صورت میں سند متصل نہیں رہتی کیونکہ ''شعیب'' نے اپنے دادا ''عبداللہ'' کا زمانہ نہیں پایا۔ اسی عیب کی وجہ سے امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ان کی روایات کو نہیں لیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''شعیب'' نے اپنے دادا کو پایا تھا۔

امام احمد اور محدثین کی ایک جماعت نے ان سے روایات نقل کی ہیں۔ ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ ان کی کثرت روایت کی وجہ سے محدثین نے ان کی روایات کو لینے سے انکار کیا ہے۔ انہوں نے بسرہ کی احادیث سنی تھیں' ان کے پاس ایک صحیفہ تھا یہ اس سے نقل کیا کرتے تھے اور شعیب کو ہم نہیں جانتے اور نہ میں کسی ایسے شخص کو جانتا ہوں جس نے ان کی توثیق کی ہو۔ البتہ ابن حبان نے تاریخ الثقات میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ابن عدی فرماتے ہیں کہ عمرو بن شعیب ثقہ ہیں۔ البتہ جب یہ عن أبیہ عن جدہ عن النبی ﷺ روایت کرتے ہیں تو وہ مرسل ہے۔ فرماتے ہیں اس کا سماع عبداللہ سے ثابت ہے' یہ عبداللہ وہ صاحب ہیں جنہوں نے ان کی پرورش کی تھی حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ محمد اپنے والد عبداللہ کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ تو شعیب کی کفالت ان کے دادا عبداللہ نے کی ہے۔ (کذا فی المیزان للذھبی) بعض محققین کا کہنا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ جدہ کی ضمیر شعیب کی طرف راجع ہے۔ چنانچہ ابوداؤد اور نسائی کی بہت سی روایات میں تصریح ہے: عن عمرو بن شعیب عن أبیہ عن جدہ عبداللّٰہ بن عمرو بن العاص۔ اس اعتبار سے ان کے بارے میں کوئی طعن نہیں رہتا۔

تشریح: قولہ :نحوہ عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ:

نحوہ کا مطلب ہے روایت بالمعنی۔

عمرو بن شعیب بن محمد بن عبداللہ بن عمرو بن العاص ابو عبداللہ علی الصحیح۔

اپنے زمانے کے بڑے علماء میں سے ایک ہیں۔

اولادِ آدم کی پیدائش زمین کی کیفیات کے مطابق ہوئی

۱۰۰: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ مِنْ قَبْضَةٍ قَبَضَهَا مِنْ جَمِيْعِ الْاَرْضِ فَجَاءَ بَنُوْ اٰدَمَ عَلٰی قَدَرِ الْاَرْضِ مِنْهُمُ الْاَحْمَرُ وَالْاَبْيَضُ وَالْاَسْوَدُ وَبَيْنَ ذٰلِكَ وَالسَّهْلُ وَالْحَزْنُ وَالْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ ۔ (رواہ احمد والترمذی و ابوداود)

أخرجه أحمد في المسند ٤/ ٤٠٠ ـ وأخرجه أبو داؤد في سننه ٥/ ٦٧ حديث رقم ٤٦٩٣ ـ وأخرجه الترمذي ٥/ ١٨٧ حديث رقم ٢٩٥٥ ـ

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی پیدائش مٹی کی ایک مٹھی سے کی ہے جو ہر جگہ کی زمین سے لی گئی تھی اسی وجہ سے آدم کی اولاد زمین کے موافق پیدا ہوئی کہ بعض انسان سرخ بعض سفید بعض سیاہ اور بعض درمیانہ رنگ کے ہیں بعض نرم مزاج بعض سخت مزاج بعض پاک اور بعض ناپاک ہیں۔ اس حدیث کو امام احمد امام ترمذی اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: عن ابی موسی ...... من قبضة:

"قبضہ" ضمہ کے ساتھ بھی ہے اور فتحہ کے ساتھ بھی اور "من" ابتدائیہ متعلق ہے خلق کے ساتھ یا بیانیہ ہے' حال ہے آدم سے۔

قوله: قبضها:

یعنی فرشتے کو حکم دیا اس کو لینے کا اور "القبضه" ضمہ کے ساتھ ہے مٹھی بھرنے کو کہتے ہیں اور بسا اوقات قاف کے فتحہ کے ساتھ بھی آیا ہے' ایسے ہی صحاح میں ہے اور قاموس میں ہے۔ "القبضه و ضمه اکثر" جو کسی چیز میں سے لی جاتی ہے' قبضہ کی جاتی ہے اور نہایہ میں ہے: "القبض الاخذ بجميع الكف" قبض پوری ہتھیلی سے پکڑنے کو کہتے ہیں اور قبضہ ایک مرتبہ لینے کو اور ضمہ کے ساتھ سے اس سے اسم ہے۔

قوله: من جميع الارض:

یعنی اس کی سطح سے یعنی ان تمام جگہوں سے جہاں اللہ نے مقدر کیا ہے کہ اس زمین میں بنی آدم رہیں گے اور اس سے پوری زمین مراد نہیں ہے اس لئے کہ زمین میں سے بعض جگہیں وہ بھی ہیں جہاں بنی آدم کے قدم نہیں پہنچ سکتے اور پوری زمین سے مٹھی بھر کر لینے والے عزرائیل علیہ السلام ہیں۔ پس فعل کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا اس لئے کہ اسی کے حکم اور ارادہ سے انہوں نے لیا تھا۔ پس جب عزرائیل مٹی لینے کے متولی ہیں تو جسم سے ارواح لینے کو بھی ان کے سپرد کیا گیا تاکہ اللہ تعالیٰ کی ودیعت جس کو انہوں نے زمین سے لیا ہے اسی کی طرف لوٹا دیں' اسی طرح زین العرب نے کہا ہے اور اس میں اشارہ ہے اس آیت کی طرف:

﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰی﴾ (طٰہٰ: ۵۵)

''اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے اور اسی کی طرف لوٹائیں گے اور اسی سے دوسری مرتبہ نکالیں گے۔''

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے درمنثور میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے خطبہ سے ذکر کیا کہ وہ فرماتے ہیں: **"خلقت الكعبة قبل الارض بالفي سنة ......انام"** ''خانہ کعبہ زمین سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا گیا'' لوگوں نے کہا: اس کو پہلے کیسے پیدا کیا گیا حالانکہ یہ زمین میں سے ہے؟ تو آپ نے فرمایا: یہ یہ پانی پر ایک خشفہ کی طرح تھا۔ "خشفه" خاءُ شین اور فاء کے ساتھ ہے یعنی حجرہ یا ٹیلہ یا جزیرہ۔ اس پر دو فرشتے تھے جو رات دن اللہ کی تسبیح بیان کرتے تھے' دو ہزار سال تک پس جب اللہ نے ارادہ فرمایا کہ زمین کو پیدا کریں تو اس کو پھیلا دیا اس سے پس اس نے زمین کے درمیان کر دیا۔ پس جب اللہ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو حاملین عرش میں سے فرشتے کو بھیجا جو زمین کی مٹی لایا پس جب اس نے لینے کے لئے ہاتھ پھیلایا تو زمین نے کہا: میں اس ذات کا واسطہ دے کر تجھ سے سوال کرتی ہوں جس نے تجھے بھیجا ہے کہ آج مجھ سے کوئی چیز نہ لے جو کہ کل اس سے آگ کے لئے حصہ ہو۔ پس فرشتے نے اس کو چھوڑ دیا۔ پس جب وہ ربّ کی طرف لوٹا تو ربّ نے کہا: کس چیز نے تجھے روکا کہ تو وہ نہ لائے جس کا میں نے تجھے حکم دیا؟ اس نے کہا: اس نے تیرا واسطہ دے کر سوال کیا' میں نے اس کو برا جانا کہ اس کو لوں جس کا سوال تیرا واسطہ دے کر کیا گیا ہے۔ پس اللہ نے دوسرا فرشتہ بھیجا۔ پس اس نے بھی ایسے ہی کہا' یہاں تک کہ سب کو بھیجا پھر ملک الموت کو بھیجا۔ زمین نے اس سے بھی ایسا ہی کہا۔ اس نے کہا: بے شک وہ ذات جس نے مجھے بھیجا ہے تیری بنسبت اطاعت کی زیادہ حقدار ہے۔ پس اس نے تمام سطح زمین سے لیا اس کی پاکیزہ جگہ سے بھی اور خبیث جگہ سے بھی یہاں تک کہ کعبہ کی جگہ سے بھی ایک مٹھی لی۔ پس اس کو لے کر اپنے ربّ کے پاس آیا۔ پس اس پر جنت کا پانی ڈالا اور جب وہ سڑا ہوا گارا ہو گیا تو اس سے آدم کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا۔

قوله :فجآء بنو آدم ...... والطيب:

قدر الارض کا مطلب ہے زمین کی انتہا تک مختلف رنگوں اور طبائع میں سے (مٹیال) پس ان کی مٹی کے اعتبار سے (سرخ' سفید اور کالے انسان پیدا کئے) اور یہ تین رنگوں کی بنیاد ہیں اور ان کے علاوہ جو ہیں وہ انہی سے مرکب ہیں اور یہی مراد ہے اللہ کے اس قول سے ﴿**وبين ذلك**﴾ یعنی سرخ' سفید اور کالے کے درمیان زمین کے اجزاء کے اعتبار سے اور ان میں سے نرم ہیں اور غلیظ ہیں۔ حزن حاء کے فتحہ اور زاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ "خبيث" سے مراد خصلت کا خبیث ہے اور طیب' زمین کی طبیعت پر اور یہ سب اللہ کی تقدیر پر ہے۔ رنگ' طبیعت اور خلقت کے اعتبار سے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں: اور جب چار اوصاف انسان میں ظاہر ہیں اور زمین اپنی حقیقت پر چلتی ہے اور دوسری چار تبدیل ہو جاتے ہیں اس لئے کہ یہ اخلاقِ باطنہ میں سے ہیں پس سہل کے معنی نرم اور ملائم کے ہیں اور حزن کے معنی تند خو اور سنگدل کے ہیں اور طیب جس کا معنی میٹھی زمین سے کرتے ہیں اس سے مراد وہ مؤمن ہے جو سب کو نفع دیتا ہے اور خبیث سے مراد شور زمین لی جاتی ہے یہاں مراد وہ کافر ہیں جو سب کو نقصان پہنچائے اور جن امور کو حدیث نے چھوڑا ہے وہ امور باطنہ ہیں اس لئے کہ وہ قدر بالخیر والشر والی حدیث کے تحت داخل ہیں اور رہے امورِ ظاہرہ رنگوں میں سے اگر چہ یہ بھی مقدر ہیں مگر ان کا اس میں اعتبار نہیں کیا جاتا۔

اور ممکن ہے اس کا اعتبار ہوا اشارہ ہو اس طرف یہ اوصاف اور آثار ان رنگوں کے درجہ میں ہیں اس اعتبار سے کہ یہ تقدیروں

کے تحت داخل ہیں' زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ یہ اوصاف زیادت اور نقصان کے قابل ہیں' طاعت اور امکان کے مطابق انسان کے مجاہدہ کے لئے بخلاف رنگوں کے اور اگر تو حقیقت کی طرف دیکھے تو اللہ کی تخلیق کے لئے کوئی تبدیلی اور تغیر نہیں ہے اور یہی معنی ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا: جف القلم علی علم اللّٰہ۔

نورِ ہدایت اسلام میں ہے

۱۰۱ : وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ خَلْقَهٗ فِيْ ظُلْمَةٍ فَاَلْقٰى عَلَيْهِمْ مِنْ نُّوْرِهٖ فَمَنْ اَصَابَهٗ مِنْ ذٰلِكَ النُّوْرِ اِهْتَدٰى وَمَنْ اَخْطَاَهٗ ضَلَّ فَلِذٰلِكَ اَقُوْلُ جَفَّ الْقَلَمُ عَلٰى عِلْمِ اللّٰهِ . (رواہ احمد والترمذی)

أخرجه أحمد في المسند ۱۷۶/۲۔ والترمذي ۲٦/۵ حديث ۲٦٤۲ وقال حديث حسن۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق یعنی جنوں اور انسانوں کو اندھیرے میں پیدا کیا اور پھر ان پر اپنے نور کی جھلک ڈالی لہٰذا جس کو اس نور کی روشنی مل گئی اس نے ہدایت حاصل کر لی اور جو اس نور کی روشنی سے محروم رہا وہ گمراہ ہو گیا اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے علم یعنی تقدیر پر قلم خشک ہو چکا ہے یعنی اب تقدیر میں تبدیلی ممکن نہیں۔ اس حدیث کو امام احمد اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله :خلق خلقه في ظلمة :

خلق سے مراد یہاں ثقلین یعنی انسان اور جن ہیں نہ کہ فرشتے "ظلمة" کا مطلب ہے کہ نفس کی ظلمت میں ہیں جو ہر برائی کا عادی ہے گمراہ کن خواہشات اور محسوسات کی طرف جھکنے اور عالم الغیب سے غفلت کی طرف کھینچنے والا ہے۔

قوله :فالقى عليهم من نوره:

القی کے معنی ہیں چھینٹے مارے کسی چیز کے۔ من نورہ صفت ہے محذوف کی یعنی "شیئا من نورہ" اور من بیانیہ ہے یا تبعیضیہ ہے یا زائدہ ہے اور اس سے مراد نورِ ایمان' معرفت یقین' طاعت اور احسان کا نور ہے۔

قوله :فمن اصابه من ذالك النور:

یعنی اس کے معنوی نور سے جو اس کی طرف پہنچنے والا ہے اور نور مجرور ہے اور جائز ہے کہ یہ مرفوع ہو اس طور پر کہ اصاب کا فاعل ہو اور اسی وجہ سے یہ اس سے حال ہے اس کو عینیؒ نے ذکر کیا ہے۔

قوله :اهتدى:

یعنی جنت کے راستے کی طرف۔

قوله :ومن اخطأ ضلّ۔

اس نور سے خطاء کی یعنی اس سے تجاوز کر گیا اور اس تک نہ پہنچا۔ "ضل" کا مطلب ہے راہِ حق سے خارج ہوا اور کہا گیا

ہے کہ ان کی طرف ڈالے جانے والے نور سے مراد دلائل اور حجتوں کا قائم ہونا ہے اور جو ان کی طرف آیات اور ڈرانے والے مضامین نازل کئے گئے ہیں اس لئے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ جہالت کے میدان میں گمراہی کے اندھیرے میں باقی رہتے اور کہا گیا ہے ظلمت سے مراد حرص' حسد اور تکبر وغیرہ ہے' اخلاقِ ذمیمہ میں سے ہے اور نور سے مراد ان کو قلع قمع کرنے کی توفیق اور ہدایت ہے۔ پس جو اس ہدایت کے موافق ہوا اس نے ہدایت پائی اور جو اس کے موافق نہ ہوا' گمراہ ہوا اور بہکا اور کہا گیا ہے کہ ظلمت سے مراد جہالت اور نور سے مراد معرفت ہے یعنی اللہ پاک نے مخلوق کو پیدا کیا جو اس سے جاہل تھے اور اس کی صفات سے جاہل تھے۔ پس ان کو اپنی ذات اور اپنی صفات کی معرفت عطا فرمائی تا کہ اس کو پہچانیں اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے ان کی ارواح کو ظلمت اور حیرت میں پیدا فرمایا۔ پھر ان پر رحمت اور ہدایت کا نور ڈالا اور ایسا نہ ہوتا تو کوئی ہدایت نہ پاتا۔

لو لا الله ما اهتدينا ☆ ولا تصدقنا ولا صلينا

''اگر اللہ نہ ہوتا تو ہم ہدایت نہ پاتے ☆ اور نہ صدقہ کرتے اور نہ نماز پڑھتے''

اور کہا گیا ہے کہ ممکن ہے کہ حدیث کو محمول کیا جائے اس نسل کی پیدائش پر جو ازل میں آدم علیہ السلام کی صلب سے نکالی گئی۔ پس اس کو الطافِ الٰہیہ کے نور سے جو کہ ہدایت کی صبح کی پہلی جھلکیں اور عنایت کی بجلی کی ابتدائی چمک ہیں پھر اشارہ کیا اپنے قول ''اصاب واخطأ'' سے۔ اس غایت کے ظہور کی طرف ان چیزوں میں جو بعض کی ہدایت اور بعض کی گمراہی میں برابر رہتی ہیں۔

قوله :فلذلك اقول جف القلم على علم الله:

یعنی اس وجہ سے کہ ہدایت اور گمراہی جاری ہو چکی ہے۔

''جف القلم على علم الله'' یعنی جو اللہ کا علم ہے اور جس کا اس نے حکم دیا' ازل میں وہ متغیر اور تبدیل نہیں ہوتا اور قلم کا خشک ہو جانا اسی سے عبارت ہے اور کہا گیا ہے کہ اس کے عدم تغیر کی وجہ سے جو ازل میں جاری ہوئی ہے اس کی تقدیر ایمان' طاعت' کفر اور معصیت میں سے اور میں کہتا ہوں کہ ''جف القلم'' کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس معنی کے درمیان اور نبی علیہ السلام کے اس فرمان کے درمیان: ''مامن مولود يولد الا على فطرة الاسلام فابواه يهوادنه او يمجسانه او ينصرانه''۔ ''جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے وہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ پس اس کے والدین اس کو یہودی' مجوسی یا نصرانی بنا دیتے ہیں'' وجہ تطبیق یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ انسان مرکب ہے روحانیت سے جو عالم قدس کی طرف عروج کی مقتضی ہے اور یہ قبولِ حق کے لئے مستعد ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے نور کا فیضان ہوتا ہے اور کلمات کے ساتھ مزین ہوتا ہے اور انسان مرکب ہے اس نفسانیت سے جو مائل ہے شہوت اور گمراہی کے اندھیروں کی طرف۔ پس یہ حدیث تقدیر کے بارے میں لائی گئی ہے' اس دلیل کے ساتھ کہ قلم خشک ہو چکا ہے پس اس میں اس طرف متنبہ کیا گیا ہے کہ انسان ایسی حالت پر پیدا کیا گیا ہے کہ وہ ظلمت سے جدا نہ ہو مگر یہ کہ وہ جس کو وہ نور پہنچے جو ان کے اوپر ڈالا گیا ہے۔ پس اس حدیث میں قضاء کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ آپ کا فرمان: ''ما من مولود......'' ہے پس کلام چلایا گیا اس پر جس کا بیان پیچھے گزر چکا ہے۔

انسان ہر وقت خطرہ میں ہوتا ہے

۱۰۲: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُكْثِرُ اَنْ يَّقُوْلَ يَامُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ فَقُلْتُ يَانَبِيَّ اللّٰهِ اٰمَنَّابِكَ وَبِمَا جِئْتَ بِهٖ فَهَلْ تَخَافُ عَلَيْنَاقَالَ نَعَمْ اِنَّ الْقُلُوْبَ بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ اللّٰهِ يُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَآءُ ۔ (رواه الترمذي وابن ماجة)

أخرجه أحمد في المسند ۳/۱۱۲۔ وأخرجه الترمذي ٤/۳۹۰حديث رقم۲۱٤۰وقال حديث حسن وأخرجه ابن ماجة في السنن ۲/۱۲٦۰حديث رقم۳۸۳٤۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر دعا کرتے ہوئے یہ فرمایا کرتے تھے۔ اے دلوں کو پھیرنے والے۔ میرے دل کو اپنے دین پر قائم اور ثابت رکھ۔ میں نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول ہم آپ پر ایمان لائے اور آپ کے لائے ہوئے احکام اور شریعت پر بھی ایمان لائے کیا پھر بھی آپ ہمارے بارے میں ڈرتے ہیں کہ کہیں ہم گمراہ نہ ہو جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں بے شک تمام دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت، تصرف اور اختیار میں ہیں اور وہ جیسے چاہتا ہے ان کو پھیر دیتا ہے۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله :يكثر ان يقول :يا مقلب القلوب...... على دينك۔

"یکثر" اکثار سے ہے۔ "ان یقول" یعنی یہ قول "مقلب القلوب" یعنی اس کو پھیرنے والے کبھی اطاعت کی طرف اور کبھی معصیت کی طرف اور کبھی حضوری کی طرف اور کبھی غفلت کی طرف۔ "ثبت قلبی علی دینك" یعنی اس کو ثابت رکھ اپنے دین پر کہ مائل نہ ہو سیدھے دین سے اور سیدھے راستے سے اور خلق عظیم سے۔

قوله :فقلت يا نبي الله...... قال :نعم:

"امنا بك" یعنی آپ کی نبوت اور رسالت پر ایمان لائے اور جو آپ لائے یعنی کتاب وسنت تو کیا آپ پر ڈرتے ہیں یعنی آپ کا یہ قول آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس کے لئے نہیں ہے اس لئے کہ خطاء اور پھسلنے سے معصوم ہیں، خصوصی طور پر دین اور ملت سے دل کے پلٹنے سے بلکہ اس سے مراد امت کو تعلیم دینا ہے تو کیا آپ ہمارے اوپر ایمان کی نعمت کے زوال یا کمال سے نقصان کی طرف انتقال کا خوف رکھتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! میں آپ پر ڈرتا ہوں۔

قوله :ان القلوب بين اصبعين من اصابع الله:

اور مسلم کی حدیث میں: "من اصابع الرحمٰن" ہے اور فرق یہ ہے کہ وہاں سے ابتداء کی ہے پس رحمت غضب پر سابق ہے پس وہاں رحمٰن کا ذکر مناسب ہے اور یہاں ان کے اوپر خوف کی تاکید کے لئے واقع ہے پس یہ مقام ہیبت اور جلال کا ہے پس جلال اور الٰہیت کے مقام کا ذکر مناسب ہے جو اس کی مقتضی ہے۔ اس لئے کہ وہ خاص کرتا ہے جس کو چاہتا ہے جس کے ساتھ ہدایت یا ضلالت میں سے۔

قوله :يقلبها كيف يشآ:

یعنی ان قلوب کو "کیف یشاء" مفعول مطلق ہے یعنی ایسا پلٹنا جس کو وہ چاہتا ہے یا ضمیر منصوب سے حال ہے یعنی پلٹتا ہے جس صفت پر چاہتا ہے۔

دل پر کی طرح ہے

۱۰۳: وَعَنْ اَبِیْ مُوسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْقَلْبِ کَرِیْشَۃٍ بِاَرْضٍ فَلَاۃٍ یُقَلِّبُھَا الرِّیَاحُ ظَھْرًا لِبَطْنٍ . (رَوَاہُ اَحْمَدُ)

أخرجه أحمد فى المسند ٤/٤٠٨ـ وابن ماجة ١/٣٤ حديث رقم ٨٨ـ

ترجمه: حضرت ابی موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انسان کے دل کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی پر کسی میدان میں پڑا ہوا ہو اور ہوائیں اس کو پشت سے پیٹ اور پیٹ سے پشت کی طرف الٹ پلٹ کرتی رہیں۔ اس حدیث کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله :مثل القلب:

یعنی قلب کی عجیب شان کی صفت اور عالم غیب کی جانب سے جو اسباب اس پر وارد ہوتے ہیں اور ان کے سبب سے اس کا تیزی سے پلٹنا۔

قوله : كريشة:

یعنی پر کی صفت کی طرح ہے اور "ریشہ" ریش کی واحد ہے۔

قوله :بارض فلاة:

"ارض" تنوین کے ساتھ ہے اور کہا گیا ہے کہ اضافت کے ساتھ ہے۔ "فلاۃ" ارض کی صفت ہے یعنی بیابان نباتات سے خالی۔ کہا گیا ہے کہ "ارض" کا ذکر کمزور ہے اس لئے کہ لفظ "فلاۃ" اس پر دلالت کرتا ہے پس مقصود اس سے تاکید ہے۔ مجازی معنی کو دفع کرتے ہوئے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ "ابصرتها بعيني" میں نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور بیابان زمین کی تخصیص اس لئے ہے کہ اس میں الٹنا پلٹنا بنسبت آبادی کے زیادہ آسان ہے۔

قوله :يقلبها الرياح:

تذکیر کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ تانیث کے ساتھ ہے۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ "ریشه" کے لئے دوسری صفت ہے اور ریاح کو جمع لایا تاکہ الٹنے پلٹنے کے ظہور پر دلالت ہو سکے اس لئے کہ اگر ہوا ایک ہی جانب لگا تار ہو تو الٹ پلٹ ظاہر نہیں ہوتا۔

ظهرًا لابطن:

یعنی "وبطنا لظھر" مطلب یہ ہے کہ ظھرًا للبطن فرمایا کہ بیرونی حصہ اندر کی طرف لے جاتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اندرونی حصہ باہر لے آتی ہے یعنی ہر گھڑی اس کو ایک صفت پر پلٹتی ہے۔اسی طرح دل بھی ہے کبھی خیر سے شر کی طرف پلٹتا ہے اور کبھی اس کے برعکس اور لفظ "ظھرا" بدل بعض ہے یقلبھا کی ضمیر سے اور "لبطن" میں "لام" بمعنی "الی" ہے جیسا کہ اللہ عزوجل کا فرمان ہے:

﴿رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا﴾ [آل عمران: ۱۹۳]

"اے ہمارے ربّ ہم نے ایک منادی کو سنا جو ایمان کی طرف بلا رہا تھا کہ اپنے ربّ پر ایمان لاؤ' پس ہم ایمان لائے۔"

اس آیت میں يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ' الی الایمان کے معنی میں ہے۔

اور یہ بھی جائز ہے کہ "ظھرًا لبطن" مفعول مطلق ہو یعنی مختلف طرح سے پلٹنا اور یہ بھی جائز ہے کہ حال مقدر ہو یعنی اس کو پلٹتی ہے ہو امختلف انداز میں اور اسی اختلاف اور انقلاب کی وجہ سے دِل کو قلب کہتے ہیں۔

چار چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے

۱۰۴: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَايُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِاَرْبَعٍ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ بَعَثَنِيْ بِالْحَقِّ وَيُؤْمِنُ بِالْمَوْتِ وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَيُؤْمِنُ بِالْقَدْرِ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجه)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/٣٩٣ حديث رقم ٢١٤٥۔وابن ماجة ١/٣٢ حديث ٨١۔

ترجمہ:حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی آدمی اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ چار چیزوں پر ایمان نہ لائے۔اس بات کی شہادت دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں دین حق لے کر اس دنیا میں آیا ہوں موت اور مرنے کے بعد دوبارہ میدان محشر میں زندہ ہونے پر ایمان لائے اور تقدیر پر ایمان لائے۔اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قولہ :لا یومن:

یہ اصل ایمان کی نفی ہے یعنی معتبر نہیں ہے جو اس کے ہاں تصدیق قلبی ہے۔

قولہ :حتی یومن باربع:یشھد:

"یشھد" منصوب ہے "حتی یومن" کے قول سے بدل ہو کر اور کہا گیا ہے کہ مرفوع ہے ماقبل کی تفصیل کے طور پر یعنی عمل کرے اور یقین کرے۔

قول :ان لا الله الا الله وانی رسول الله:

یعنی ایمان لائے توحید اور رسالت پر اور لفظ شہادت کی طرف عدول کیا تا کہ التباس سے امن ہو جائے۔اس طور پر کہ وہ گواہی دے اور ایمان نہ لائے یا اس پر دلالت کرتے ہوئے کہ شہادتین کا تلفظ کرنا بھی من جملہ ارکان میں سے ہے پس گویا کہا

گیا ہے کہ دل سے تصدیق کے بعد زبان سے گواہی دے یا اشارہ ہے اس طرف کہ حکم ظاہر پر ہے اور دل کے بھیدوں کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

قوله :بعثنی بالحق:

یہ جملہ استنافیہ ہے گویا کہ کہا گیا ہے کہ کسی چیز کی گواہی دی۔ پس آپ نے فرمایا: ''اس بات کی کہ اللہ نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا' یعنی سارے انسانوں اور جنوں کی طرف اور جائز ہے کہ یہ حال مؤکدہ ہو یا خبر کے بعد خبر ہو تو اس صورت میں یہ شہادت میں داخل ہوگا اور نبی اکرم ﷺ نے دونوں قولوں پر گواہ کا کلام بالمعنی حکایت فرمایا ہے۔ اس لئے کہ اس کی عبارت ''ا ن محمدا'' اور ''بعثه'' ہے۔

قوله :ویومن بالموت والبعث بعد الموت:

''یومن بالموت'' دو وجہوں کے ساتھ ہے ''والبعث'' سے مراد ہے جی اٹھنے کے وقوع پر ایمان لانا ہے ''بعد الموت'' موت کا تکرار کیا گیا ہے اس کے مہتم بالشان ہونے کے اعلان کے لئے ابہریؒ نے کہا ہے: اگر کہا جائے کہ موت کی لفظ یومن کے ساتھ تاکید کیوں لائی گئی اور بعث کی کیوں نہ لائی گئی حالانکہ موت ظاہر ہے جس کا کوئی انکار نہیں کرتا اور بعث خفی ہے اس کا انکار کیا جاتا ہے؟ میں کہتا ہوں: یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بعث کے دلائل ظاہر ہیں اور یہ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ وہ موت کے ذکر سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

میں کہتا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ''کوئی یقین شک سے زیادہ مشابہ نہیں ہے بنسبت موت کے۔'' امام راغب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: 'موت نعمتوں کی طرف جانے والے اسباب میں سے ایک سبب ہے'' پس وہ ظاہر میں فناء ہے اور حقیقت میں دوسری ولادت ہے اور بقاء ہے اور یہ جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس (موت) کی تخلیق کے ساتھ اللہ نے انسان پر احسان جتلایا ہے اس طور پر کہ فرمایا:

﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ﴾ [الملك : ۲]

''جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تا کہ تمہارا امتحان لے'' موت کو مقدم کیا اس لئے کہ یہی حقیقی زندگی کی طرف لے جانے والی ہے۔ پس جو تغیرات اس کی وجہ سے واقع ہوتے ہیں وہ ایسے ہی ہے جیسے کھجور کی گٹھلی کہ وہ اس وقت تک کھجور کا درخت نہیں بن سکتی جب تک اس کا جسم خراب نہ ہو اور جیسا کہ گندم جبکہ ہم اسے کھانا چاہیں اور جیسا کہ بیج جب وہ بویا جائے تو کہا گیا ہے کہ یہ ظاہری فساد ہے اور باطنی طور پر حقیقی اصلاح ہے۔ پس نفس کا دنیا میں بقاء کے ساتھ راضی ہونا اس کی گندگی کے ساتھ راضی ہونا ہے اور گھٹیا اعراض کے ساتھ راضی ہونا ہے اور جیسے کیڑے کا ہمیشہ گندگی میں لت پت رہنے کے ساتھ راضی ہونا اور کہا گیا ہے کہ جب وہ مشک کو سونگھتا ہے تو اسی وقت مر جاتا ہے۔

قوله :یومن بالقدر

''یومن'' دو وجہوں کے ساتھ ہے۔ مظہر کہتے ہیں کہ اس حدیث سے مراد اصل ایمان کی نفی ہے نہ کہ کمال کی نفی۔ پس جو

شخص ان چار میں سے کسی ایک پر ایمان نہ رکھتا ہو وہ مؤمن نہیں ہو سکتا۔ پہلی: شہادتین کا اقرار ہے اور یہ کہ آپ ﷺ مبعوث ہیں تمام جنوں اور انسانوں کی طرف۔ دوسری وہ موت پر ایمان لائے دنیا کے فناء ہونے کا اعتقاد کرے اور یہ دہریوں کے مذہب سے احتراز ہے جو عالم کے قدیم ہونے کے قائل ہیں اور اس کے ہمیشہ رہنے کے قائل ہیں۔ میں کہتا ہوں اسی معنی میں تناسخی ہیں اور احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد یہ اعتقاد ہو کہ موت اللہ کے حکم سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ مزاج کے فساد سے جیسا کہ طبعی کہتے ہیں۔ تیسرا: یہ دوبارہ جی اٹھنے پر ایمان لائے۔ چوتھا: تقدیر پر ایمان لائے یعنی یہ جو کچھ عالم میں جاری ہوتا ہے وہ سب اللہ کی قضا اور قدر سے ہے۔

فرقہ مرجیہ اور قدریہ

۱۰۵: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صِنْفَانِ مِنْ اُمَّتِی لَیْسَ لَھُمَا فِی الْاِسْلَامِ نَصِیْبٌ اَلْمُرْجِئَۃُ وَالْقَدَرِیَّۃُ (رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ)

أخرجه الترمذي في السنن٤/٣٩٥حديث رقم ٢١٤٩وقال هذا حديث حسن صحيح ـ وأخرجه ابن ماجة ١/٢٤حديث رقم ٦٢ـ

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں دو فرقے ایسے ہیں جن کے لیے اسلام کا کچھ حصہ نہیں ہے اور وہ مرجئہ اور قدریہ ہیں۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قوله :صنفان من امتی ...... المرجئة و القدرية:

قوله :"صنفان" سے مراد نوعان ہے یعنی دو قسمیں۔ امت سے مراد امت اجابت ہے **"نصیب"** سے مراد کامل حصہ ہے یا یہ کہ ان کے لئے نہیں ہے' ان کے لئے حصہ مکمل بجا آوری میں اس کی جو قضاء اور قدر ہے بندوں پر اس میں سے جو اس نے ارادہ فرمایا یعنی مطلق حصہ نہیں ہے۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کبھی کبھی اس سے دلیل پکڑتا ہے وہ جو ان دونوں فریقوں کی تکفیر کرتا ہے اور صحیح یہ ہے کہ اہل بدعت کی طرف جلدی نہ کرنی چاہیے کیونکہ وہ یا تو جاہل ہیں یا مجتہد مخطئ منزلہ میں ہیں اور یہ امت کے محققین کا قول ہے احتیاط کرتے ہوئے۔ پس **"لیس لهما نصیب"** والے قول کو برے حصہ یا کم حصہ پر محمول کیا جائے گا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ بخیل کے لئے اس کے مال میں سے حصہ نہیں ہے اور رہا نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان: **((یکون فی امتی خسف و امثال و ذلک فی المکذبین بالقدر))** [مشكوة: ١٠٦] "میری امت میں خسف اور مسخ ہوگا اور یہ تقدیر کو جھٹلانے والوں میں ہوگا" اور یہ فرمانا: **"ستة لعنتهم و لعنهم الله وکل نبی یجاب :الزائد فی کتاب الله والمکذب بقدر الله والمتسلط بالجبروت لیعز من ازله الله و یذل من اعزه الله والمستحل لحرم الله والمستحل من عتری ما حرم الله والتارك لسنتی"** [مشكوة: ١٠٩] اور اس کی مثالیں ان کو محمول کیا جائے گا' تقدیر کی تکذیب کرنے والے پر جب اس کے

پاس ایسا بیان آ جائے جس سے عذر ختم ہو جاتا ہو' یا جس کو عصبیت اس چیز کی تکذیب کی طرف لے جائے جس میں نصوص وارد ہوتی ہیں اور اس کی تکفیر کی طرف جو اس کی مخالفت کرے اور ان احادیث کی امثال تغلیظ اور زجر و توبیخ کے طور پر وارد ہوئی ہیں۔ علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جو فریقین کی تکفیر کرتا ہے اس حدیث کے ظاہر کو پکڑتے ہوئے تو اس نے آرام پایا بلکہ صحیح' اکثر علمائے سلف وخلف کے ہاں یہ ہے کہ ہم اہل بدعت اور اہل ہواء کی تکفیر نہیں کرتے مگر یہ کہ صریح کفر والی چیز کو کریں' نہ کہ التزامی کو۔ اس لئے کہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ لازم مذہب لازم نہیں ہے' اسی وجہ سے علماء ان کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کرتے رہے ہیں ان سے نکاح کرنے اور نکاح کرانے میں اور ان کے مردوں کی نمازِ جنازہ پڑھنے اور ان کو اپنے قبرستانوں میں دفن کرنے میں اس لئے کہ اگرچہ یہ خطا کرنے والے ہیں معذور نہیں ہیں ان کے اوپر فسق اور ضلالت کا کلمہ صادق آتا ہے مگر یہ کہ انہوں نے جو کہا اس سے کفر کا قصد نہیں کیا ہے اور انہوں نے اپنی طاقت کو حق کے حاصل کرنے میں خرچ کیا ہے پس وہ ان کو حاصل نہیں ہوا لیکن اپنی عقلوں اور خواہشات کو حکم بنانے کی تقصیر کی وجہ سے اور صریح سنت اور آیات سے اعراض کی وجہ سے بغیر درست تاویل کے۔ اسی وجہ سے یہ فروعات کے مجتہدین سے جدا ہیں' اس لئے کہ ان کی خطاء عذر کی وجہ سے ہوئی جو ان کے پاس دوسری دلیل قائم ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے جو ان کے غیر کی دلیل کا مقابلہ کر رہی ہوتی ہے' اسی کی جنس میں سے پس انہوں نے تقصیر نہیں کی اس وجہ سے ان کو ان کے اجتہاد پر ثواب ملتا ہے۔

قوله :المرجئة:

یہ ہمزہ کے ساتھ ہے اور "ارجآ" سے مہموز اور معتل ہے اور یہ تاخیر کو کہتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں افعال سارے کے سارے اللہ کی تقدیر سے ہیں اور بندوں کو ان میں اختیار نہیں ہے اور یہ کہ ایمان کے ساتھ معصیت نقصان نہیں دیتی جیسا کہ کفر کے ساتھ اطاعت فائدہ نہیں دیتی اس طرح ابن الملک نے کہا ہے اور علامہ طیبی فرماتے ہیں: کہا گیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ایمان قول ہی ہے عمل کے بغیر پس وہ عمل کو قول سے مؤخر کرتے ہیں اور یہ غلط ہے بلکہ حق یہ ہے کہ مرجیہ وہی جبریہ ہیں جو کہنے والے ہیں کہ فعل کی اضافت بندے کی طرف ایسے ہی ہے جیسا کہ اس کی اضافت ہو جمادات کی طرف۔ ان کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ اللہ کے حکم اور نہی کو مؤخر کر دیتے ہیں ان کے ساتھ عمل کرنے سے اور کبائر کے مرتکب ہوتے ہیں۔ پس یہ افراط پر ہیں۔

قوله :والقدريه:

اور قدریہ تفریط پر ہیں اور حق دونوں کے درمیان ہے اور "قدریہ" دال کے فتحہ کے ساتھ ہے اور سکون کے ساتھ بھی ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو تقدیر کے منکر ہیں اور یہ کہنے والے ہیں کہ بندوں کے افعال ان کی اپنی قدرت اور اسباب سے پیدا شدہ ہیں نہ کہ اللہ کی قدرت وارادہ سے ہیں۔ اس گروہ کی نسبت تقدیر کی طرف اس لئے کی گئی ہے کہ یہ تقدیر میں بہت بحث کرتے ہیں۔

منکر تقدیر کے لیے سزا

۱۰۶ :وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ يَكُوْنُ فِىْ اُمَّتِىْ خَسْفٌ

وَمَسْخٌ وَذٰلِكَ فِي الْمُكَذِّبِيْنَ بِالْقَدَرِ۔ (رواہ ابوداود و روی الترمذی نحوہ)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/٣٩٧ حديث رقم ٢١٥٢ وقال حديث حسن صحيح غريب۔ وأخرج أبو داوٗد نحوه ٥/ ٢٠ حديث رقم ٤٦١٣ وأحمد فی المسند ٢/ ١٠٨۔

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میری امت میں زمین میں دھنس جانا اور شکلوں کا بگڑ جانا بھی ہوگا اور یہ عذاب ان لوگوں کے لئے ہوگا جو تقدیر کی تکذیب کریں اور انکار کریں۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔

تشریح: قوله : فی امتی ...... و ذلك

"امتی" سے مراد امت اجابت ہے۔ "خسف" کہا جاتا ہے "خسف الله به" یعنی اس کو زمین میں غائب کر دیا اور مسخ کہتے ہیں شکل وصورت میں تبدیلی' پہلے سے زیادہ قبیح ہے۔ **ذلك** سے مراد یہ ہے کہ جو خسف اور مسخ کو ذکر کیا گیا۔

قوله : فی المکذبین بالقدر:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قدریہ جن کی مذمت کی گئی ہے وہ ہیں جو تقدیر کا انکار کرتے ہیں نہ کہ اس پر ایمان لانے والے جیسا کہ معتزلہ کا گمان ہے اور انہوں نے اہلسنّت والجماعت کو قدریہ کی طرف منسوب کیا ہے کیونکہ وہ جبریہ کے مقابلہ میں ہیں اور اللہ پاک نے ان دونوں (قدریہ اور جبریہ) کو سزا دی ہے تکوینات کی اضافت غیر اللہ کی طرف رجوع کرنے سے۔ اللہ کی تخلیق کو مٹاتے ہیں' اور اس کی تخلیق کی صورتوں کو مسخ کرتے ہیں پس اللہ نے ان کو بدلہ دیا مٹانے اور مسخ کرنے سے۔ اشرف کہتے ہیں حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خسف اور مسخ مکذبین بالقدر میں ہوگا۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شاید انہوں نے اعتقاد کیا ہو کہ یہ امت مرحومہ ان دونوں سے مامون ہے۔ پس کلام کو شرط کی جگہ نکالا اور "ذلك" جو حدیث میں آیا ہے ما قابل کے استحقاق یعنی خسف اور مسخ پر دلالت کرتا ہے مابعد تکذیب کی وجہ سے اور تورپشتی کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ حدیث باب تغلیظ میں سے ہے لہٰذا شرط کی تقدیر کی حاجت نہیں اور ابوسلیمان خطابی اس امت میں خسف اور مسخ کے وقوع کی طرف گئے ہیں چنانچہ انہوں نے فرمایا ہے: یہ دونوں باتیں ہوں گی اس امت میں جیسا کہ تمام امتوں میں ہوئی ہیں' بخلاف اس آدمی کے قول کے جو کہتا ہے کہ یہ نہیں ہوگا بلکہ ان کے دل مسخ ہوں گے' اس کو اعلاء السنن میں ذکر کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ خسف سے مراد زمین میں لے جانا ہے جیسا کہ قارون اور اس کے مال کے ساتھ ہوا اور مسخ سے مراد بدنوں کا بندر اور خنزیر وغیرہ کی شکل میں تبدیل ہونا ہے جیسا کہ داؤد علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی قوموں کے ساتھ ہوا اور کہا گیا ہے کہ خسف سے مراد چہرے اور بدنوں کا سیاہ ہونا ہے' یہ ماخوذ ہے "خسوف القمر" (چاند گرہن) سے اور مسخ سے مراد دلوں کا سیاہ ہونا ہے اور ان کی معرفت کا چلا جانا ہے اور ان میں قساوت' جہالت اور تکبر کا آنا ہے۔ ایسا ہی ابہری نے ذکر فرمایا ہے اور بعید نہیں ہے کہ ان کا مسخ قیامت کے دن ان کے چہروں کے سیاہ ہونے کے ساتھ ہو جیسا کہ بعض مفسرین نے ذکر فرمایا ہے اللہ پاک کے اس فرمان میں: ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ﴾ (ال عمران : ١٠٦)

"اس دن بہت سے چہرے چمکدار سفید ہوں گے اور بہت سے سیاہ' سو جن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے کہا جائے گا

کیا تم کافر ہوئے ایمان لانے کے بعد۔ پس چکھو عذاب بوجہ اس کے جو تم کافر ہوئے'' سفید چہروں سے اہل سنت کے چہرے اور سیاہ چہروں سے اہل بدعت کے چہرے مراد ہیں اور ان کے خسف سے مراد ان کا راستہ سے ہٹ کر دوزخ میں جانا ہے یا ہلاکت کی گہرائی میں گرنا ہے۔ اللہ ہی اسرار کو جاننے والا ہے۔

اِس اُمت کے مجوسی

۱۰۷: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْقَدَرِيَّةُ مَجُوْسُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِنْ مَرِضُوْا فَلَا تَعُوْدُوْهُمْ وَاِنْ مَاتُوْا فَلَا تَشْهَدُوْهُمْ ۔ (رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوُدَ)

أخرجه أحمد في المسند ۸٦/۲۔ وأخرجه أبو داوٗد ٥/٦٦ حديث رقم ٤٦٩١۔ وأخرجه ابن ماجة بنحوه عن جابر ۳٥/۱ حديث رقم ۹۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قدریہ فرقہ اس امت کے مجوسی ہیں لہٰذا اگر وہ بیمار ہو جائیں تو ان کی عیادت کے لئے نہ جاؤ اور اگر وہ مر جائیں تو ان کے جنازہ میں نہ جاؤ اس حدیث کو امام احمد اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قولہ: القدریہ مجوس ھٰذہ الامۃ:

امت سے امت اجابت مراد ہے۔ اس لئے کہ ان کا قول ہے کہ بندوں کے افعال بندوں کی تخلیق ہیں یہ مجوسیوں کے قول کے مشابہ ہے جو کہتے ہیں کہ عالم کے لئے دو الٰہ ہیں ایک خیر کا خالق ہے اسے یزدان کہتے ہیں اور دوسرا شر کا خالق ہے اسے اہرمن کہتے ہیں یعنی شیطان اور کہا گیا ہے کہ مجوسی کہتے ہیں کہ خیر نور کا فعل ہے اور شر ظلمت کا فعل ہے اسی طرح قدریہ کہتے ہیں کہ خیر اللہ کی جانب سے ہے اور شر شیطان اور نفس کی جانب سے اور خطابی فرماتے ہیں: ان کے اسلام میں نیا مذہب ایجاد کرنے کی وجہ سے جو مجوسیوں کے مذہب کے مشابہ ہے من وجہ وہ یہ کہ وہ کائنات کی اضافت کرتے ہیں اعیان اور احداث کے اعتبار سے دو معبودوں کی طرف۔ ان میں سے ایک سے صرف خیر ہی صادر ہوتی ہے اور دوسرے سے صرف شر ہی صادر ہوتا ہے اور قدریہ کا قول اس کے مشابہ ہے لیکن احداث میں نہ کہ اعیان میں۔ اس لئے کہ وہ خیر کی اضافت اللہ کی طرف کرتے ہیں اور شر کی نفس کی طرف۔

شاید کہ یہ معتزلہ کے ایک فرقہ کا مذہب ہے' ورنہ مشہور وہ ہے جو علامہ زمخشری نے ان سے صراحت کی ہے اور وہ یہ کہ بھلائی جو سرسبزی و شادابی اور صحت ہے اور برائی جو کہ قحط اور مرض ہے یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور رہی طاعت تو یہ بندہ کی جانب سے ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ لطف و کرم کیا ہے' اس کی ادائیگی میں اور اس کو اس پر مقرر کیا ہے اور اسی طرح معصیت بھی اس کی جانب سے ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے بری ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان کا نام مجوسی رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اس قول سے بھی لازم آتا ہے اس کا متعدد ہونا' اس لئے کہ ان کے ہاں اطاعت پر اٹھانے والا معصیت پر اٹھانے والے کے علاوہ ہے جیسا کہ ثابت ہو چکا ہے۔

قولہ :ان مرضوا فلا تعودوھم وان ماتوا فلا تشھدوھم۔

نہی زجر وتوبیخ اور سختی پر محمول ہے اور ان کے اعتقاد کے قبیح ہونے پر اس شخص کے قول پر جو ان کی تکفیر کا حکم نہیں کرتا اور حقیقت پر محمول ہے اس شخص کے قول پر جو ان کے کفر کا حکم کرتا ہے اس لئے کہ فاسق کے جنازے پر حاضر ہونے میں کوئی ممانعت اور کراہت نہیں ہے بخلاف مریض کے۔ ان کے کفر کے علاوہ ان کی عیادت سے بھی روکا گیا ہے' ایسے ہی ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا اور یہ ہمارے مذہب کے مخالف ہے اس لئے کہ مسلمانوں میں مریض کی عیادت فرض کفایہ ہے جیسا کہ ان کے جنازے پر حاضر ہونا اور ان دو خصلتوں کو خاص کیا ہے اس لئے کہ یہ تمام حقوق سے زیادہ لازم واولیٰ ہیں۔ پس یہ دونوں مختلف حالتیں ہیں' ایک صحت کی دعا اور دوسری مغفرت کی دعا ہے۔ پس ان سے نہی' مقصود کے اندر زیادہ بلیغ ہے۔

اہلِ باطل سے تعلق نہ رکھو

۱۰۸ :وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تُجَالِسُوْا اَهْلَ الْقَدَرِ وَلَا تُفَاتِحُوْهُمْ۔ (رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ)

أخرجه أحمدفي المسند ۱/ ۳۰۔ وأخرجه أبو داؤده/ ۸۴حديث رقم ۴۷۱۰۔

ترجمہ: حضرت عمرؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قدریہ فرقہ کے ساتھ میل جول اختیار نہ کرو اور نہ ان کو اپنا قاضی بناؤ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح : قولہ :لا تجالسوا اھل القدر:

اول کے ضمہ کے ساتھ ہے یعنی نہ تو ان سے الفت رکھو اور نہ محبت' اس لئے کہ مجالست اور اسی طرح اکٹھا چلنا محبت اور مودت کی علامت ہے' پس معنی یہ ہوں گے کہ ان کے ساتھ نہ بیٹھو انس اور ان کی تعظیم کے لئے بیٹھنا' اس لئے کہ یا تو وہ تمہیں اپنی بدعت کی طرف بلائیں گے ان موہوم حجتوں اور گڑھے ہوئے دلائل کے ذریعہ جو شیطان نے ان کے لئے مزین کئے ہیں' جو کھینچ لیتے ہیں اس آدمی کو جس کے پاس علوم ومعارف نہ ہوں' اپنی طرف ظاہری رائے سے اور یا تمہارے اوپر ان کی کمزوری اور برا عمل لوٹ آئے گا جو تمہارے قلوب اور اعمال پر اثر کرے گا اس لئے کہ اغیار کی مجالست ہلاکت کی غایت اور خسارے کی انتہا کی طرف کھینچتی ہے' اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ [التوبة: ۱۱۹] ''اے ایمان والوں! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ'' اور حدیث کا اطلاق آیت قرآنیہ کے منافقین کے بارے میں مقید ہونے کے منافی نہیں ہے' اس طور پر کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖۤ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ﴾ [النساء: ۱۴۰] ''پس ان (منافقین) کے ساتھ نہ بیٹھو یہاں تک کہ وہ دوسری بات میں مشغول ہو جائیں ورنہ تم بھی ان کے مثل ہو جاؤ گے'' اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ﴾ [الانعام: ۶۸] ''اور جب تو دیکھے ان لوگوں کو جو ہماری آیات میں کھود کرید کرتے ہیں تو ان سے اعراض کر یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں'' پس ان کی مطلق مجالست سے منع نہیں فرمایا اس لئے کہ

محمول ہے اس آدمی پر جو اپنے نفس پر ان سے مامون نہ ہو۔ تو اس مطلق مجالست سے منع فرمایا اور آیت اس آدمی پر محمول ہے جو مامون ہو۔ پس اس پر کوئی حرج نہیں ہے ان کے ساتھ مجالست میں بغیر تانیس و تعظیم کے جب تک کفر اور بدعت میں نہ ہو اور اسی طرح جب کھوج لگائیں اور ان پر رد کا ارادہ کریں اور ان کے دلائل کی بیوقوفی ظاہر کریں اس کے باوجود ان سے دوری اولیٰ ہے اور ان سے مباحثہ سے بچنا بہتر ہے۔

قوله :ولا تفاتحوهم:

یہ فتاحہ سے ہے فاء کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ ہے یعنی حکومت اور اسی سے اللہ پاک کا فرمان ہے: ﴿رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ﴾ (الاعراف: ۸۹) ''اے ہمارے ربّ! ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے'' یعنی ان کی طرف محاکمہ نہ لے جاؤ اس لئے کہ وہ اہل عناد اور دشمنی میں سے ہیں اور کہا گیا ہے کہ ان کے ساتھ کلام اور سلام میں ابتداء نہ کرو اور مظہر کہتے ہیں: ان سے مناظرہ نہ کرو اس لئے وہ تم کو شک میں ڈال دیں گے اور تمہارے اوپر اپنے اعتقاد مشوش کریں گے یعنی اگر تم ان کے ساتھ مجالست نہ کرو گے پس یہ عطف مغایر ہے اور کہا گیا ہے کہ عطف خاص ہے اس لئے کہ مجالست شامل ہے اکٹھے کھانے' موانست اور بات چیت وغیرہ کو اور تقدیر کے بارے میں کلام کی ابتداء کرنا اس سے خاص ہے۔

چھ قسم کے لوگوں پر لعنت

۱۰۹ :وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِتَّةٌ لَعَنْتُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَكُلُّ نَبِيٍّ يُجَابُ الزَّائِدُ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ وَالْمُكَذِّبُ بِقَدَرِ اللّٰهِ وَالْمُتَسَلِّطُ بِالْجَبَرُوْتِ لِيُعِزَّ مَنْ اَذَلَّهُ اللّٰهُ وَيُذِلَّ مَنْ اَعَزَّهُ اللّٰهُ وَالْمُسْتَحِلُّ لِحُرُمِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَحِلُّ مِنْ عِتْرَتِيْ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَالتَّارِكُ لِسُنَّتِيْ۔

(رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي الْمَدْخَلِ وَرَزِيْنٌ فِيْ كِتَابِهٖ' بَيْهَقِي' رَزِيْن)

أخرجه الترمذي في السنن ٤/ ٣٩٧ حديث رقم ٢١٥٤۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: چھ آدمی ایسے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ لعنت بھیجتا ہے اور میں بھی ان پر لعنت بھیجتا ہوں اور ہر نبی کی دعاء قبول ہوتی ہے۔ اللہ کی کتاب میں زیادتی کرنے والا' اللہ کی تقدیر کی تکذیب کرنے والا اور وہ آدمی جو زبردستی غلبہ پالے پھر اس آدمی کو عزت والا بنادے جس کو اللہ نے ذلیل کیا ہے اور اس آدمی کو ذلیل کرے جس کو اللہ تعالیٰ نے عزت عطا کی ہے اور جو آدمی اللہ کی حدود سے تجاوز کر کے حرام کو حلال جانے اور وہ آدمی جو میری اولاد سے اس چیز کو حلال جانے جس کو اللہ نے حرام کیا ہے (قتل) اور وہ آدمی جو میری سنت کو چھوڑ دے اس حدیث کو امام بیہقی نے روایت کیا ہے مدخل میں اور رزین نے بیان کیا ہے اپنی کتاب میں۔

تشریح: **قوله :ستة لعنتهم:**

''ستة'' سے مراد چھ اشخاص یا اقوام ہیں۔ ''لعنتهم'' یعنی یہ اللہ کی رحمت سے دوری کی بددعا ہے۔

قوله :و لعنهم الله:

واؤ عاطفہ کے ساتھ ہے اور اس کے بغیر بھی ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے (یعنی واؤ کے بغیر) اور اس کو ماقبل جملہ پر معطوف نہیں کیا یا تو اس لئے کہ یہ دعا ہے اور ماقبل خبر ہے اور یا اس لئے کہ ماقبل کے معنی کی عبارت ہے' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت وہی اس کے رسول کی لعنت ہے اور اس کے برعکس اور یا اس لئے کہ یہ جملہ استینافیہ ہے۔ گویا کہ کہا گیا ہے اس کے بعد کیا ہے؟ پس جواب دیا گیا اللہ نے ان پر لعنت کی اور دوسرا جملہ پہلے کی خبر دے رہا ہے اور کہا گیا' کیوں؟ پس اس کے عکس کے ساتھ اور اسی پر یہ قول ہے (جو آگے آ رہا ہے)۔

قوله :و كل نبي يجاب:

یہ بیان اور مبین کے درمیان جملہ معترضہ ہے یعنی ہر نبی کی شان یہ ہے کہ وہ مستجاب الدعوات ہو اور کُلُّ نَبِیٍّ مبتداء ہے اور اس کی خبر یُجَاب ہے فعل مضارع سے مفعول کی بناء پر یعنی اس کی دعا قبول کی جاتی ہے اور یہی مشہور روایت ہے اور میم کے ساتھ بھی مروی ہے یعنی "مجاب الدعوة" اور جملہ دونوں روایتوں پر یا ابتدائیہ ہے اور یا "ستة لعنتهم" پر عطف ہے یا "لعنتهم" کے فاعل سے حال ہے اور جملہ "لعنهم الله" انشائیہ ہے حال اور ذوالحال کے درمیان معترضہ ہے اور تورپشتی نے کہا ہے کہ اعطف صحیح نہیں ہے بلکہ مجاب کا صفت ہونا صحیح ہے اور اشرفی نے اسے صحیح کہا ہے فاصل کے پائے جانے کی وجہ سے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں اس میں نظر ہے اس لئے کہ منع تو جملہ کا عطف مفرد پر ہے نہ کہ ضمیر مرفوع متصل پر عطف اور اس میں یہ بھی ہے کہ یہ قول کہ مجاب صفت ہے دلالت کرتا ہے کہ آپ نے جملہ کے عطف کا ارادہ نہیں کیا پھر علامہ طیبی نے کہا ہے اور جائز نہیں ہے کہ مجاب کو صفت بنایا جائے نہ کہ خبر اس لئے کہ اس سے لازم آتا ہے کہ بعض انبیاء علیہم السلام مستجاب الدعوات ہیں اور اس سے تورپشتی بھاگے ہیں اور مجاب میں جر کی روایت کو باطل کہا ہے۔

اور ممکن ہے کہ صفت کاشفہ بنایا جائے (آنے والے قول کو)

قوله :الزائد في كتاب الله:

کتاب سے مراد قرآن اور تمام کتب یعنی ان میں داخل کرے' وہ بات جو ان میں نہ ہو اور ان کی تاویل کرے ایسی تاویل جس کا لفظ انکار کرے اور حکم کی مخالفت کرے جیسا کہ یہود نے کہا اور کتاب اللہ میں زیادتی اس کے نظم اور حکم میں کفر ہے اور اس کی ایسی تاویل جو کتاب وسنت کے مخالف ہو بدعت ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں یعنی کتاب اللہ میں ایسے لفظ کا اضافہ کرنے والا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر نہ ہو اس کو قرآن گمان کرتے ہوئے اسلئے کہ قراءت شاذہ حرام ہے اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایت سے ثابت ہو اس لئے کہ اس وقت وہ خبر واحد کے حکم میں ہے نہ کہ قرآن ہے پس اس کو ذکر نہیں کیا جائے گا مگر تفسیر کے بیان کے لئے یا حکم کی زیادتی کے لئے۔ پس جو اس کو لایا اس طور پر کہ یہ قرآن ہے باوجود اس اعتراف کے کہ قرآن ثابت نہیں ہوتا مگر تواتر سے' جب کہ اس پر عام علماء ہیں تو اس پر یہ قول صادق آئے گا کہ اس نے کتاب اللہ میں زیادتی کی پس اس کو لعنت شامل ہوگی اس کے فسق کی وجہ سے بلکہ کفر کی وجہ سے جبکہ وہ قرآن میں مطلق زیادتی کو مباح سمجھے۔

قوله :والمكذب بقدر الله والمتسلط بالجبروت :

"مكذب بقدر الله" کا حکم پیچھے گزر چکا ہے "المتسلط بالجبروت" سے مراد وہ انسان ہے جو زبردستی والی بناء ہو' قوی ہو یا تکبر کے ساتھ حکومت کرنے والا اور عظمت ناشی ہے شان وشوکت' ولایت سے اور "جبروت"، "فعلوت" کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے "جبر" سے اور وہ قہر کو کہتے ہیں اور کہا گیا ہے کہ اس کا اطلاق انسان کی صفت میں اس پر ہوتا ہے جو اپنے مدمقابل پر جبر کرے بڑائی کے درجہ کا دعویٰ کرتے ہوئے اور وہ اس کا مستحق نہ ہو یا عہدہ کا متولی ایسے آدمی کو بنا کر جو اس کا استحقاق نہ رکھتا ہو اور روک کر اس آدمی کو جو استحقاق رکھتا ہو۔

قوله :ليعز من اذله الله و يذل من اعزه الله:

کہا گیا ہے کہ: "ليعز" میں لام عاقبت کے لئے ہے جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فرمان میں ہے:

فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ۭ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـــِٕيْنَ (القصص : ۸)

"پس آپ کو اٹھالیا آل فرعون نے تاکہ آپ ان کے لئے دشمنی اور غم کا باعث بن جائیں۔ بے شک فرعون' ہامان اور ان کا لشکر خطا کرنے والے تھے' اور جیسا کہ حدیث میں ہے: ((لدوا للموت وابنوا للخراب)) "موت کے لئے بچے جنو اور خراب ہونے کے لئے تعمیر کرو' نہ کہ لام تعلیل کے لئے ہے اس لئے کہ تسلط اس کے بغیر پایا جانا بھی جائز ہے ظاہرا۔ یعنی جس کو اللہ ذلیل کرے اس کے فسق اور کفر کی وجہ سے اس کا مرتبہ یہ (تسلط) مسلمانوں پر بلند کرے اور اس کو ان میں حاکم بنائے۔ جیسا کہ بہت سے ظالم حکمرانوں نے یہود ونصاریٰ کو بہت سے مسلمانوں پر بلند کرنے کے ساتھ کیا اور فساق کو بلند کرے واضح عادلوں پر اور ذلیل کرے اس کو جس کو اللہ نے عزت دی یعنی علماء وصلحاء وغیرہ کے مراتب کو کم کرے۔

قوله :والمستحل لحرم الله:

حاء اور راء کے فتحہ ہے اس سے حرم مکہ مراد ہے یعنی اس میں وہ کرے جو اس میں جائز نہیں ہے یعنی شکار' درختوں کا کاٹنا اور بغیر احرام کے داخل ہونا ایسے ہی علامہ طیبیؒ نے کہا ہے اور حاء کا ضمہ اس طور پر کہ یہ "حرمة" کی جمع غلطی ہے۔ ایسے ہی بعض شراح نے کہا ہے اور میرک شاہ نے تخریج سے نقل کیا ہے کہ یہ حاء کے ضمہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ دونو ں کے فتح کے ساتھ ہے اور جو ہم نے پیچھے ذکر کیا ہے وہ زیادہ عام ہے مگر یہ کہ روایت ایسے ہی ہو جیسا کہ کہا ہے اور یہ ثابت نہیں ہے۔

اور دونوں نسخے صحیح ہیں لیکن معنی کے اعتبار سے پہلے کی تائید ہوتی ہے۔

قوله :والمستحل من عترتي ما حرم الله:

یعنی ان کو ایذاء دے اور ان کی تعظیم نہ کرے اور عترت قریبی رشتہ داروں کو کہتے ہیں اور یہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد اور ان کی اولاد ہے اور حرم کے ذکر کی تخصیص اور عترت کی تخصیص حالانکہ ہر حرام کو حلال کرنے والا ملعون ہوتا ہے (یہ تخصیص) ان

کے شرف کی وجہ سے کی اور یہ کہ ان میں سے ایک کی نسبت اللہ کی طرف ہے اور دوسرے کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف۔ پس اس پر "من عترتی" میں من ابتدائیہ ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ بیانیہ ہو اس طور پر کہ رسول اللہ ﷺ کی عترت میں سے حلال کرنے والا ہی اس میں جرم کی تعظیم ہے جو ان سے صادر ہو۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں اور یہ حآء کے ضمہ کے ساتھ ہے اور یہ کافر ہے جب داخل ہوگا اس عموم میں کہ "جس نے اپنی چیز کو حلال جانا جو مال بالاجماع حرام ہونا معلوم ہو دین سے بالضرورۃ تو وہ شخص کافر ہو جائے گا" بلکہ بہت سے حضرات نے فرمایا ہے کہ اس کو معلوم بالضرورۃ ہونا بھی شرط نہیں ہے۔

قوله :والتارك لسنتي :

یعنی بالکلیہ اس سے اعراض کرنے والا ہو اور بعض سے اعراض کرنے والا گھٹیا سمجھتے ہوئے یا کم خیال کرتے ہوئے تو وہ کافر اور ملعون ہے اور سستی اور کاہلی سے۔ اس کو چھوڑنے والا نہ کہ ہلکا سمجھتے ہوئے گنہگار ہے اور اس پر لعنت باب تغلیظ میں ہے۔

ہر انسان کی موت کی جگہ مقرر ہے

۱۱۰ : وَعَنْ مَطَرِ بْنِ عُكَامِسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَضَى اللّٰهُ لِعَبْدٍ اَنْ يَّمُوْتَ بِاَرْضٍ جَعَلَ لَهٗ اِلَيْهَا حَاجَةً ۔ (رواہ احمد والترمذی)

أخرجه أحمد في المسند ٥/٢٢٧۔ والترمذي ٤/٣٩٤ حديث رقم ٢١٤٦۔ وقال حسن غريب۔

ترجمہ: حضرت مطر بن عکامس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی آدمی کی موت کو زمین کے کسی حصہ میں مقرر کر دیتا ہے تو پھر اس علاقہ کی طرف اس انسان کے لئے کوئی حاجت اور ضرورت پیدا کر دیتا ہے تاکہ اس حاجت کی وجہ سے وہاں جائے اور وہاں اس پر موت کا فیصلہ نافذ ہو جائے اس حدیث کو امام ترمذی اور امام احمد نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

مطر بن عکامس۔ یہ مطر ہیں، عکامس کے بیٹے ہیں اور خاندانی لحاظ سے سلمی ہیں، ان کا شمار اہل کوفہ میں ہے۔ ان سے صرف ایک روایت منقول ہے۔ ابو اسحاق سبیعی کے علاوہ اور کسی نے ان سے روایت نہیں کی۔ "عکامس" میں عین مہملہ پر پیش کاف غیر مشدد میم پر کسرہ اور آخر میں سین غیر منقوط ہے۔

تشریح :قوله :اذا قضى الله:

یعنی ارادے کرے یا مقدر کرے یا حکم لگائے۔

قوله :بعبد ان يموت بارض ......

"بارض" یعنی اور وہ بندہ اس زمین کے علاوہ زمین میں ہوتو اس کی طرف اللہ ظاہر کر لینے میں اس کے لئے کوئی حاجت نہیں پس وہ اس کی طرف آتا ہے اور اس میں کرتا ہے یہ اشارہ اللہ پاک کے اس فرمان کی طرف ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ (لقمٰن : ٣٤)

"بے شک اللہ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم اور وہ بارش برساتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہے' کوئی نفس نہیں جانتا کل کیا کمائے گا' کوئی نفس نہیں جانتا کس زمین پر مرے گا۔ بے شک اللہ پاک جاننے والے' خبر رکھنے والے ہیں۔"

مسلمان اور مشرک کی اولاد باپ کے تابع ہوگی

۱۱۱: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ذَرَارِى الْمُؤْمِنِيْنَ؟ قَالَ مِنْ اٰبَائِهِمْ فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ بِلَا عَمَلٍ قَالَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ قُلْتُ فَذَرَارِىُّ الْمُشْرِكِيْنَ؟ قَالَ مِنْ اٰبَائِهِمْ قُلْتُ بِلَا عَمَلٍ قَالَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ ۔ (رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ)

أخرجه أبوداؤد في السنن ٥/٨٥ حديث رقم ٤٧١٢۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جنت اور جہنم کے بارے میں مسلمانوں کے بچوں کا کیا حکم ہے؟ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا وہ اپنے باپوں کے تابع ہیں یعنی وہ اپنے باپوں کے ساتھ جنت میں جائیں گے پھر میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بغیر کسی عمل کرنے کے آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ وہ بچے جو کچھ کرنے والے تھے پھر میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول مشرکوں کی اولاد کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا وہ بھی اپنے باپوں کے تابع ہیں۔ میں نے عرض کیا بغیر کوئی عمل کرنے کے فرمایا اللہ ہی بہتر جانتا ہے وہ بچے جو کچھ کرنے والے تھے اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: ذراری المؤمنين:

یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے ان کی اولادوں کا کیا حکم ہے کیا وہ جنت میں ہوں گے یا دوزخ میں؟

قوله: قال: من آبائهم:

"من" اتصالیہ ہے جیسا کہ اللہ پاک کے اس فرمان میں ہے:

﴿الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ۖ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ۗ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (التوبة : ٦٧)

"منافق مرد اور منافق عورتیں بعض بعض میں سے ہیں' برائی کا حکم کرتے ہیں اور نیکی سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو بند کرتے ہیں' وہ اللہ کو بھول گئے' اللہ ان کو بھول گیا۔ تحقیق منافق وہی ہیں' نافرمان۔"

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان: ((ما انا من دد ولا الدد منی)) "نہ میں کھیل کود سے ہوں اور نہ کھیل کود مجھ سے ہے"

"دد" کے معنی لہو ولعب ہیں۔ پس معنی یہ ہوں گے کہ وہ اپنے آباء واجداد کے ساتھ متصل ہوں گے اور کہا گیا ہے کہ من تبعیضیہ ہے اور معنی یہ ہوں گے کہ وہ اپنے آباء واجداد کا بعض ہیں پس ان کے لئے ان کا حکم ہے یعنی ان کا حکم ان کے آباء و اجداد کے حکم سے معلوم ہوگا یعنی اگر ان کے آباء واجداد جنتی ہوں گے تو یہ بھی ایسے ہی ہوں گے۔ علامہ تورپشتی فرماتے ہیں یعنی ان میں سے گنے جائیں گے اس لئے کہ شریعت والدین میں سے کسی ایک کے اسلام کے ساتھ اولاد کے اسلام کا حکم لگاتی ہے اور ان کے اوپر نمازِ جنازہ کا حکم کرتی ہے اور مسلمانوں کے احکام کی مراعات کا حکم کرتی ہے' اسی طرح مشرکین کی اولاد پر حکم لگاتی ہے ان کے غلام بنانے کے ساتھ اور ان کے اندر ان کے احکام کی مراعات کا اس سے (اسلام سے) پہلے اور ان کے درمیان اور مسلمانوں کے درمیان میراث کے جاری ہونے سے روکتی ہے۔ پس وہ ظاہری امور میں اپنے آباء واجداد کے ساتھ ملحق ہوں گے۔

قولہ :فقلت یا رسول اللہ!بلا عمل:

یہ بطور تعجب کے وارد ہے اس لئے کہ ثواب اور عقاب کا کوئی موجب نہیں پایا گیا۔ پس معنی ہوں گے کیا وہ بغیر عمل کے جنت میں داخل ہوں گے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں: ﴿الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ [النحل : ٣٢]

قولہ :قال ﷺ :واللہ اعلم بما کانوا عاملین۔

یعنی اگر بالغ ہو جائے یہ ان کے تعجب کو رد کرنے کے لئے ہے اور تقدیر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے' فرمایا یہی وجہ ہے کہ حدیث کو تقدیر کے باب میں لائے۔

قولہ :قلت :وذرری المشرکین...... اللہ اعلم بما کانوا عاملین۔

یعنی مشرکین کی اولادوں کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ان کے آباء واجداد میں سے ہیں یعنی ان کا حکم ان کے آباء و اجداد کے حکم سے معلوم ہوگا یا معنی ہوگا کہ وہ اپنے آباء واجداد کے تابع ہیں۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یعنی یہ دنیا میں ان کے تابع ہیں اور رہی آخرت تو ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے علم کے سپرد ہے۔ قاضی فرماتے ہیں: ثواب اور عقاب اعمال کے ساتھ نہیں ہے ورنہ تو نہ مسلمانوں اور کفار کی اولاد اہل جنت اور اہل دوزخ میں سے نہ ہوتی بلکہ موجب تو لطف الٰہی ہے اور وہ رسوائی ہے جو ازال میں ان کے لئے مقدر ہے لہٰذا ان کے بارے میں توقف اور عدم جزم واجب ہے۔ پس ان کے اعمال اللہ کے علم کے سپرد ہیں' ان چیزوں میں جو آخرت کے معاملہ کی طرف لوٹتی ہیں اور اعمال نیک بختی اور بد بختی کے دلائل ہیں اور دلیل کے انتفاء سے مدلول کا انتفاء لازم نہیں آتا۔ علامہ نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں مشرکین کے بچوں کے بارے میں علماء کا اختلاف ہوا ہے۔ پس بعض کہتے ہیں کہ وہ اپنے آباء کے تابع دوزخ میں ہیں اور بعض نے توقف کیا ہے اور صحیح یہ ہے کہ وہ اہل جنت سے ہیں اور اس پر کئی چیزوں سے استدلال کیا ہے ان میں سے ایک ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی حدیث ہے کہ "جب ان کو نبی کریم ﷺ نے دیکھا اور ان کے اردگرد لوگ تھے' لوگوں کی اولاد تھی' لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا ان میں مشرکین کی اولاد بھی تھی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: مشرکین کی اولاد بھی تھی"۔ اس کو بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

اوران میں سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ (الاسراء: ۱۵)

''جو ہدایت پاتا ہے پس وہ اپنے نفس کے لئے ہدایت پاتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے وہ اسی پر گمراہ ہوتا ہے اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں یہاں تک کہ رسول بھیجیں۔''

اور بچے پر تکلیف نہیں ہے یہاں تک کہ حجت لازم ہو جائے اور یہ متفق علیہ ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حق توقف کا مذہب ہے جیسا کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں وارد ہوا ہے' جو عنقریب آئے گا اور حدیث: ((الوائدة والمؤودة في النار)) [مشکوۃ: ۱۱۲] زندہ درگور کرنے والی اور درگور ہونے والی دونوں دوزخی ہیں' مخالف ہے ابراہیم علیہ السلام والی حدیث کے۔ پس وجہ یہ ہے کہ کلام کی بنیاد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث پر رکھی جائے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ''عصفور من عصافير الجنة'' کہ یہ جنت کی چڑیوں میں ایک چڑیا ہے' مسلمانوں کی اولاد میں ایک بچے کی شان میں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نکیر اس لئے فرمائی کہ اس پر جزم اس بات پر جزم ہے کہ اس کے والدین یا ان میں سے ایک جنت میں ہے اور اسی پر مشرکین کی اولاد جو ابراہیم علیہ السلام کے پاس تھیں یہ وہ مشرکین تھے جو اس وقت ایمان نہیں لائے تھے پھر انجامِ کار ایمان لے آئے اور رہی خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اولاد اور زندہ درگور کی جانے والی...... پس یہ وہ ہیں جن کے آباء کفر پر مرے ہیں اور رہا اللہ پاک کا فرمان: ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ﴾ [الاسراء: ۱۵] تو اس میں احتمال ہے کہ عذاب سے مراد دنیا میں جڑ سے اکھیڑنے والا عذاب مراد ہو' اس لئے کہ ''حتی'' کا لفظ ظاہراً اس کا تقاضا کرتا ہے کہ عذاب دنیا میں ہو اور اس کی تائید کر رہا ہے اس کے بعد آنے والا اللہ کا یہ فرمان:

﴿وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا﴾ (الاسراء: ۱۶)

''اور جب ہم نے ارادہ کیا کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو اس کے آسودہ حال لوگوں کو حکم دیا پس انہوں نے اس میں نافرمانی کی' پس ان پر ہمارا قول ثابت ہو گیا' پس ہم نے ان کو اکھاڑ مارا اٹھا کر۔''

پس آیت سے استدلال مکمل نہیں ہے اور امام بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اور جیسا کہ بالغ لوگوں میں بد بخت اور نیک بخت ہوتے ہیں' اسی طرح بچوں میں سے بھی ہوتے ہیں جن پر تقدیر آ چکی ہوتی ہے کہ وہ نیک بخت اہل جنت میں سے ہوں گے۔ پس اگر وہ زندہ رہتے تو اہل جنت کا عمل کرتے اور ان میں بعض پر فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے کہ وہ جہنم والوں میں سے ہوں گے پس اگر وہ زندہ رہتے تو جہنم والوں کا سا عمل کرتے اور اس کی تائید کرتا ہے اس بچے کا قصہ جس کو حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا کہ اس کی طبیعت کافرانہ تھی۔ پس اللہ کے علم میں تھا کہ اگر یہ زندہ رہا اور بالغ ہوا تو شرک کرے گا اور بعض روایات میں آتا ہے کہ ان کا امتحان لیا جائے گا آخرت میں اپنے آپ کو دوزخ میں پھینکنے کے ذریعہ۔ پس جس نے اطاعت کی جنت میں داخل ہوگا اور جس نے انکار کیا دوزخ میں داخل ہوگا اور اسی طرح مجنون اور اہل فترت ہیں اور ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں اور حق ان کے بارے میں جو فترت کے زمانہ میں مرے ہیں یہی ہے کہ وہ دوزخ میں نہیں جائیں گے' اس آیت کی وجہ سے اور رہی وہ احادیث جو اس کے خلاف پر دلالت کرتی ہیں جیسا کہ مسلم کی حدیث: ((ابي وابوك في النار)) ان میں تاویل کی گئی ہے اور اکثر علماء

سے منقول ہے کہ وہ دوزخ میں جائیں گے اور میں نے اس میں ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا ہے۔

زندہ درگور کرنے والی اور جس کو کیا گیا ہے دونوں جہنمی ہیں

۱۱۲ : وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْوَائِدَةُ وَالْمَوْءُوْدَةُ فِي النَّارِ۔ (رواہ ابو داوٗد)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ٥/٨٩ حديث رقم ٤٧١٧۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ زندہ بچہ درگور کرنے والی عورت اور جس کو زندہ درگور کیا گیا ہے دونوں جہنمی ہیں۔ اس حدیث کو امام ابوداوٗد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله : الوائدة والموؤدة في النار :

"وأد و بنته يئدها وأدًا فهي موؤدة" اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کو قبر میں دفن کرے اس حال میں کہ وہ زندہ ہو اور عرب کی عادت تھی کہ زمانہ جاہلیت میں فقر سے خوف کھاتے ہوئے یا عار سے بھاگتے ہوئے اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے اور بعض ان کو چھوڑ دیتے تھے اور ان کی تربیت کرتے تھے ذلت کے طریقہ پر۔ اللہ پاک فرماتے ہیں:

﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ﴾ (النحل : ۵۸، ۵۹)

"اور جب ان میں سے کسی کو بچی کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سارا دن سیاہ رہتا ہے اور جی میں گھٹتا رہتا ہے، قوم سے چھپتا پھرتا ہے، مارے برائی اس خوشخبری کے جو اس نے سنی، کیا اس کو رہنے دے، ذلت قبول کرے یا اس کو مٹی میں دبا دے، سنتا ہے کیا برا فیصلہ وہ کرتے ہیں"

یعنی ان کا فیصلہ اللہ کے لئے بیٹیاں ثابت کرنے کے ساتھ برا ہے، اپنے اس قول کے ذریعہ: "فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں" اور حال یہ ہے کہ خود بیٹیوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ قاضی کہتے ہیں: عرب اپنے زمانہ جاہلیت میں بیٹیوں کو زندہ دفن کرتے تھے پس زندہ درگور کرنے والی آگ میں جائے گی اپنے کفر اور اپنے فعل کی وجہ سے اور زندہ درگور کی گئی اپنے کفر کی وجہ سے اور حدیث میں دلیل ہے مشرکین کے بچوں کو عذاب دینے پر اور کبھی کبھی "وائدة" کی تاویل دائی سے کی جاتی ہے اس کے ساتھ اس کی رضامندی کی وجہ سے اور "موء ۃ" کی تاویل "موؤدة لها" (یعنی جس کے لئے درگور کی گئی) سے کی جاتی ہے اور یہ بچے کی ماں ہے پس صلہ کو حذف کیا گیا۔ اس لئے کہ ان کے دین میں سے تھا کہ عورت کو جب دردِ زہ شروع ہوتا تھا تو اس کے لئے گہرا کنواں کھودا جاتا تھا۔ پس عورت اس پر بیٹھتی تھی اور دائی اس کے پیچھے بچے کا انتظار کرتی تھی اگر وہ بیٹا جنے تو اس کو لے لیتی تھی اور اگر بچی جنتی تو اس کو گڑھے میں گرا دیتی تھی اور اس کے اوپر مٹی ڈال دیتی تھی۔ سید جمال الدین کہتے ہیں مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا اس کو اس باب میں لانا اس تاویل سے انکار کرتا ہے پس تأمل کرو اور کہا گیا ہے کہ یہ حدیث اور وہ حدیث جو اس سے پہلے ہے ان دونوں کو اس باب میں لانا تقدیر کے ثابت کرنے اور کفار کے بچوں کو عذاب دینے پر استدلال کرتے ہوئے ہے اور جو اس کے علاوہ تاویل کریں تو ان پر واجب ہے کہ وہ ان کو اس باب سے نکالیں۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر اس حدیث سے مراد وہ

لیا جائے جو اہل فترت کو عام ہے تو یہ مبنی ہوگا اس پر جو اکثر سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ دوزخی ہوں گے یا وہ لیا جائے جو مختص ہے اہل اسلام کے ساتھ تو موؤودہ بالغہ پہ محمول ہوگی۔

اور یہ بہت بعید ہے اس لئے کہ عربوں سے یہ نہیں سنا گیا کہ وہ بچے کو بالغ ہونے کے بعد دفن کرتے تھے اور یہ قول کہ یہ حدیث ایک خاص واقعہ میں وارد ہے اور وہ یہ ہے کہ ملیکہ کے دونوں بیٹے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ پس انہوں نے اپنی ماں کے بارے میں سوال کیا جو زندہ درگور کی گئی تھی تو نبی اکرم ﷺ نے یہ حدیث بیان فرمائی۔ رہی زندہ درگور کرنے والی پس اس لئے کہ یہ کافرہ تھی اور زندہ درگور ہونے والی تو وہ اس لئے کہ وہ کافر کی بیٹی ہے اور احتمال ہے کہ وہ بالغہ تھی اور احتمال ہے کہ غیر بالغہ تھی لیکن نبی اکرم ﷺ کو معجزہ کے ذریعہ علم ہوا کہ وہ دوزخی ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ اس عورت کے حق میں وارد ہوئی ہے جس نے زنا سے بچہ ساقط کر دیا تھا اور دونوں مر گئے تھے۔ پس اس حدیث کے ذریعہ قطعی طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ مشرکین کے بچوں کو عذاب دیا جائے گا اس لئے کہ یہ خاص قضیے میں وارد ہوئی ہے لہٰذا احتمال کے ہوتے ہوئے اس کا حمل عموم پر کرنا جائز نہیں ہے پس اس کا جواب یہ ہے کہ اعتبار عموم لفظ کا ہے نہ کہ خصوص سبب کا ہاں دارمی نے جامع صحیح میں روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے کہا : اے اللہ کے رسول! ہم جاہلیت والے تھے اور بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ پس ہم اپنی اولاد کو قتل کرتے تھے اور میری ایک بیٹی تھی۔ پس جب وہ مانوس ہوئی اور میرے بلانے سے خوش ہونے لگی جب میں اس کو بلاتا۔ ایک دن میں نے اس کو بلایا پس وہ میرے پیچھے آئی۔ تو ہم ایک گھریلو کنوئیں پر آئے جو دور نہیں تھا۔ پس میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ پس اس کے ذریعہ اس کو کنوئیں میں پھینکا اور میرا آخری عہد جو اس کے ساتھ تھا کہ وہ یہ کہہ رہی تھی اے میرے ابو جی! اے میرے ابو جی! پس نبی اکرم ﷺ رو پڑے یہاں تک کہ آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ پس نبی اکرم ﷺ کے ہم نشینوں میں سے آدمی نے اس سے کہا تو نے نبی اکرم ﷺ کو غمگین کر دیا ہے۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: رک جا! یہ اُس چیز کے بارے میں سوال کر رہا ہے جس نے اس کو فکر مند کر دیا ہے۔ پھر اس سے فرمایا: دوبارہ بتاؤ۔ پس اس نے اعادہ کیا۔ پس آپ ﷺ روئے یہاں تک کہ آنسو آپ ﷺ کی ڈاڑھی مبارک پہ گرنے لگے پھر اس سے فرمایا: ''اللہ پاک نے جاہلیت کے اعمال کو مٹا دیا ہے پس نئے سرے سے اپنا عمل کر''۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں آپ کے فرمان ''ما عملوا'' ظاہر کرتا ہے کہ ان سے مراد اہل فترت ہیں۔ میں کہتا ہوں : ایسا نہیں ہے بلکہ معنی یہ ہے کہ اللہ نے مٹا دیا ہے ان سے جو انہوں نے اعمال کئے تھے' جب وہ اسلام لے آئے اسی وجہ سے آپ نے ان کی تسلی کے لئے فرمایا: پس اپنے عمل کو نئے سرے سے کر۔ یہ اس حدیث کی طرح ہے: **((الاسلام يهدم ما كان قبله))** ''اسلام مٹا دیتا ہے اس کو جو اس سے قبل ہو'' اور جیسا کہ اللہ پاک کا فرمان ہے:

﴿عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ﴾ [المائدۃ : ۹۵] ''اللہ نے معاف کر دیا جو گزر گیا۔''

الفصل الثالث:

پانچ چیزوں کا فیصلہ ہوگیا ہے

۱۱۳: عَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ فَرَغَ اِلٰی كُلِّ عَبْدٍ مِنْ خَلْقِهٖ مِنْ خَمْسٍ مِنْ اَجَلِهٖ وَعَمَلِهٖ وَمَضْجَعِهٖ وَاَثَرِهٖ وَرِزْقِهٖ۔ (رواه احمد)

أخرجه أحمد في المسند ٥/١٩٧۔

ترجمہ: حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر بندے کے بارے میں پانچ چیزوں کا فیصلہ تقدیر میں لکھ کر فارغ ہوگیا ہے: ① اس کی موت کب آئے گی۔ ② اس کے اچھے اور برے اعمال کے بارے میں۔ ③ اس کی رہائش کی جگہ کے بارے میں۔ ④ اس کی واپسی کی جگہ کے بارے میں۔ ⑤ اس کے رزق کے بارے میں۔ اس حدیث کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله :ان الله عزوجل فرغ الى كل عبد:

فرغ لام کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور اسی سے اللہ پاک کا یہ فرمان: ﴿سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ﴾ (الرحمٰن : ۳۱) ''ہم جلد فارغ ہونے والے ہیں تمہاری طرف اے بھاری قافلو'' اور یہاں اس کا الی کے ساتھ استعمال انتہا کے معنی کی تضمین کے لئے ہے۔ یہ یہاں ''منتهيا'' کی تقدیر کے ساتھ حال ہے اور معنی یہ ہے کہ اس کی تقدیر ازل میں ان پانچ امور کے بارے میں اس بندے کی تدبیر کی طرف ان کے ظاہر کے ساتھ منتہی ہوچکی ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے' اس قول میں ''شؤون يبديها لا يبتدى بها'' یعنی خصلتیں ہیں جن کو وہ ظاہر کرتا ہے نہ کہ ان کے ساتھ ابتداء کرتا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ الی لام کے معنی میں ہو۔ کہا جاتا ہے: ''هداه الى كذا ولكذا'' (اس کو راہ دکھلائی اس کی طرف)۔

قوله :من خلقه:

یہ ''فرغ'' کا صلہ ہے یعنی اس کی پیدائش سے اور جو پیدائش کے ساتھ مختص ہے اور جو اس کے لئے ضروری ہے' موت کا وقت اور عمل وغیرہ۔

قوله :من خمس:

یہ ''من خلقه'' پر عطف ہے اور ہوسکتا ہے کہ واؤ کاتب کی جانب سے ساقط ہوئی ہو اور ممکن ہے یہ کہا جائے کہ یہ اس سے بدل ہے صرف جر کے اعادہ کے ساتھ اور وجہ یہ ہے کہ خلق بمعنی مخلوق لیا جائے اور ''من'' اس میں بیانیہ ہے یا تبعیضیہ' در ''من خمس'' میں ''من'' متعلق ہے فرغ کے ساتھ یعنی فارغ ہوگیا ہے ہر بندے سے جو اس کی مخلوق میں سے ہے پانچ چیزوں سے۔

قوله :من اجله و عمله و مضجعه واثره ورزقه:

"اجل" ہمزہ اور جیم دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے اور من "خمس" کے لئے بیانیہ ہے اور بدل ہے حرف جر کے اعادہ کے ساتھ اور اجل سے مراد اس کی عمر کی مدت ہے اور عمل سے مراد خیر و شر کا عمل اور "مضجعه" جیم کے فتحہ کے ساتھ ہے یعنی اس کا سکون اور قرار "اثر" دو حرکتوں کے ساتھ ہے یعنی اس کی حرکت اور اضطرار "رزقه" کا مطلب ہے کہ اس کا رزق حلال ہوگا یا حرام یا قلیل یا کثیر اور کہا گیا ہے کہ "اثرہ" سے مراد اس کا زمین پر چلنا ہے۔ سید جمال الدین نے کہا ہے "مضجع" اور "اثرہ" کو جمع کیا اور اس سے مراد حرکت اور سکون لیا ہے تاکہ اس کے تمام احوال حرکات اور سکون کو شامل ہو جائے اور نجله السعید کہتے ہیں زیادہ ظاہر یہ ہے کہ "من مضجعه" سے مراد اس کی قبر کی جگہ ہے اور یہ کہ وہ کس زمین پر مرے گا اور "اثرہ" سے مراد جو اس کو ثواب اور عقاب حاصل ہوگا اور یہ کہ وہ اہل جنت میں سے ہے یا اہل دوزخ میں سے۔ واللہ اعلم۔

تقدیر کے اندر بحث کرنے والے سے قیامت کے دن پوچھا جائے گا

۱۱۴: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ تَكَلَّمَ فِيْ شَيْءٍ مِنَ الْقَدَرِ يُسْئَلُ عَنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ لَّمْ يَتَكَلَّمْ فِيْهِ لَمْ يُسْئَلْ عَنْهُ۔ (رَوَاهُ ابْنُ مَاجَه)

أخرجه ابن ماجة في السنن ۱/۳۲ حديث رقم ۸۴۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو آدمی مسئلہ تقدیر میں بحث مباحثہ کریگا۔ قیامت کے دن اس سے پوچھا جائے گا اور جو آدمی تقدیر پر ایمان لا کر خاموشی اختیار کریگا وہ قیامت کے دن گرفت سے بچ جائے گا۔ اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: من تكلم في شيء من القدر:

تقدیر میں سے کسی چیز کے بارے میں تکلم کیا یعنی اگرچہ تھوڑی سی ہو "من القدر" عام ہے نفی اثبات حق و باطل سب کو شامل ہے۔ علامہ طیبی کہتے ہیں: زیادہ بلیغ ہے اس سے کہ یوں کہا جائے: "في القدر" تقدیر اور اس سے نہی کے بارے میں مبالغہ کے افادہ کے لئے اور ظاہر یہ ہے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ مراد مسئلہ تقدیر سے متعلقہ عقلی دلائل کے ذریعہ تکلم کرنے سے نہی ہے اس کے اثبات پر ایمان کے بعد۔ اس لئے کہ ان کی انتہاء اہل علم اور اہل عمل کے ہاں اللہ کے اس فرمان پر ہے:

﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ (الانبیاء: ۲۳)

"اس سے نہ پوچھا جائے گا جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جائے گا۔"

قوله: سئل عنه يوم القيامة:

یعنی تمام اقوال اور افعال کی طرح اور بدلہ دیا جائے گا ہر ایک کو وہ جس کا وہ مستحق ہے اور شاید یہ اشارہ ہو اللہ پاک کے اس فرمان کی تخصیص کی طرف:

﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ (الانبیاء: ۲۳)

"اس سے نہ پوچھا جائے گا جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جائے گا۔"

قوله :ومن لم يتكلم فيه لم يسئل عنه:

اس لئے کہ مخلوق ایمان بالقدر کی مکلّف ہے ادلہ نقلیہ کی وجہ سے اور ادلہ عقلیہ کے موجب سے تحقیق پر مامور نہیں ہے۔ بس کوئی شخص جب تقدیر پر ایمان لاتا ہے اور اس سے بحث نہیں کرتا تو اس پر اعتراض کا سوال وارد نہیں ہوتا' کھوج نہ لگانے کی وجہ سے اس لئے کہ وہ اس کا مامور نہیں ہے اسی وجہ سے ماقبل میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی بطور انکار کے گزرا ہے کہ "بھذا امرتم" یعنی جھگڑے کے بارے میں تمہیں حکم دیا گیا ہے: یعنی "في البحث بالقدر" تقدیر کے بارے میں بحث کرنے میں اور نبی اکرم ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے: ((اذا ذكر القدر فامسكوا)) "اور جب تقدیر کا ذکر کیا جائے تو رک جا۔"

وہی ہوگا جو تقدیر میں لکھا گیا ہے

۱۱۵ : وَعَنِ ابْنِ الدَّيْلَمِيِّ قَالَ اَتَيْتُ اُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ فَقُلْتُ لَهُ قَدْ وَ قَعَ فِيْ نَفْسِيْ شَيْءٌ مِّنَ الْقَدَرِ فَحَدِّثْنِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يُّذْهِبَهُ مِنْ قَلْبِيْ فَقَالَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ عَذَّبَ اَهْلَ سَمٰوٰتِهٖ وَاَهْلَ اَرْضِهٖ عَذَّبَهُمْ وَهُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ لَّهُمْ وَلَوْ رَحِمَهُمْ كَانَتْ رَحْمَتُهٗ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْ اَعْمَالِهِمْ وَلَوْ اَنْفَقْتَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَاقَبِلَهُ اللّٰهُ مِنْكَ حَتّٰى تُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ وَتَعْلَمَ اَنَّ مَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ وَاَنَّ مَا أَخْطَاَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَكَ وَلَوْمُتَّ عَلٰى غَيْرِ هٰذَا لَدَخَلْتَ النَّارَ قَالَ ثُمَّ اَتَيْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ قَالَ ثُمَّ اَتَيْتُ حُذَيْفَةَ بْنَ الْيَمَانِ فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ اَتَيْتُ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ فَحَدَّثَنِيْ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلَ ذٰلِكَ۔ (رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ٧٥/٥ حديث ٤٦٩٩۔وأخرجه ابن ماجة ٢٩/١حديث رقم ٧٧۔أحمد في المسند ١٨٩/٥۔

ترجمہ: حضرت ابن دیلمیؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں صحابی رسول حضرت ابی بن کعبؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے دل میں تقدیر کے متعلق کچھ شکوک وشبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ کہ جب تمام چیزیں تقدیر کے مطابق ہیں تو پھر یہ ثواب اور عقاب کیوں ہے؟ اس لئے آپ میرے سامنے کوئی حدیث بیان کریں شاید اللہ تعالیٰ میرے دل کو ان شکوک وشبہات سے پاک کردے۔ یہ سن کر حضرت ابیؓ نے فرمایا اگر اللہ تعالیٰ تمام زمین وآسمان والوں کو عذاب میں مبتلا کرے۔ تو وہ ان پر کسی طرح سے بھی ظلم کرنے والا نہیں ہوگا۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ زمین وآسمان والوں کو کتنا ہی عذاب کیوں نہ دے وہ ظالم نہیں ہوگا اور اگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے نواز دے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے یقیناً بہتر ہوگی اور اگر تم اللہ تعالیٰ کے راستہ میں احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرو تو تمہارا یہ خیر کا عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس وقت تک قبول نہیں ہوگا جب تک کہ تم تقدیر پر کامل اعتقاد ویقین اور ایمان نہ رکھو اور اس بات کو اچھی طرح نہ جان لو کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوگیا ہے۔ وہ رکنے اور خطا کرنے والا نہ تھا اور جو چیز رک گئی ہے تمہیں نہیں پہنچی تو سمجھ لو کہ وہ تمہارے مقدر اور نصیب میں نہیں تھی اور اگر تم اس حالت میں فوت ہو جاؤ کہ تمہارا عقیدہ اس کے خلاف ہو یعنی تقدیر پر کامل ایمان نہ ہو تو پھر یقیناً

تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے۔ ابن دیلمیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابی بن کعبؓ کا یہ بیان سن کر میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اسی طرح بیان کیا۔ پھر میں حضرت حذیفہ بن یمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے بھی ایسا ہی فرمایا پھر میں حضرت زید بن ثابتؓ کی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے بھی بالکل اسی طرح کی حدیث رسول اللہ ﷺ سے روایت کی۔ اس حدیث کو امام احمدؒ امام ابوداؤدؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

ابن الدیلمی۔ ان کا نام ضحاک ہے یہ "فیروز" کے بیٹے ہیں' تابعی ہیں۔ ان کی حدیث مصریوں میں مروج ہے۔ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ دیلمی دال کے فتحہ کے ساتھ ہے "دیلم" پہاڑ کی طرف منسوب ہے "دیلم" کی جانب جو ایک پہاڑ ہے۔ لوگوں میں مشہور ہے "فیروز" فاء کے فتحہ اور یائے تحتانی دو نقطوں والی کے سکون اور راء کے پیش کے ساتھ ہے اور آخر میں زاء ہے۔

"ابن دیلمی" یہ ابوعبداللہ ہیں۔ کہا گیا ہے کہ ابوعبدالرحمٰن ہیں اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ ابوضحاک ہیں۔ فیروز دیلمی ہیں۔ ان کو حمیری بھی کہا جاتا ہے' کیونکہ یہ حمیر میں مقیم تھے اور ان ایرانی النسل لوگوں میں سے ہیں جنہیں کسریٰ نے یمن بھیجا تھا۔ محمد بن سعید فرماتے ہیں: بعض محدثین فرماتے ہیں کہ فیروز بن دیلمی اور فیروز دیلمی ایک ہی ہیں فیروز رسول ﷺ کی خدمت میں وفد کے ساتھ آئے تھے۔ مشہور کذاب اسود عنسی مدعیٔ نبوت کو انہوں نے ہی قتل کیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کا آخری زمانہ تھا آنحضرت ﷺ مرض الموت میں تھے کہ آپ کو اسود عنسی کے قتل کی خبر پہنچی آپ ﷺ نے فرمایا: اسود عنسی کو ایک مردِ صالح نے قتل کیا ہے' فیروز کامیاب ہوگیا' فیروز کامیاب ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ فیروز نجاشی کے بھانجے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں وفات پائی اور کہا گیا ہے کہ سن ۵۰ ہجری کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں وفات پائی۔ (کذا فی تہذیب الاسماء)۔

میرک شاہ فرماتے ہیں یہ نفس کلام درست ہے' البتہ یہاں اس مقام پر ابن دیلمی سے مراد فیروز دیلمی نہیں' بلکہ ابن ضحاک بن فیروز مراد ہیں یہ تابعی ہیں' مقبول ہیں' اوساط تابعین کے درجہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا والد کا شمار صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان سے کئی احادیث مروی ہیں یہ بھی احتمال ہے کہ عبداللہ بن فیروز مراد ہوں جو ضحاک کے بھائی ہیں وہ ثقہ ہیں' کبار تابعین میں سے ہیں۔ بعض اہل علم نے ان کو صحابہ میں شمار کیا ہے میرے نزدیک یہ احتمال زیادہ واضح ہے۔ اھ

فیروز الدیلمی۔ فروز دیلمی کو "حمیری" کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے قبیلہ "حمیر" میں قیام کر لیا تھا۔ اصل میں فارسی النسل ہیں اور صنعاء کے رہنے والے ہیں۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بصورت وفد حاضر ہوئے۔ "اسو دعنسی کذاب" (جس نے یمن میں نبوت کا دعویٰ کیا) کے قاتل یہی ہیں۔ آپ ﷺ کی زندگی کے آخری ایام میں اس نے دعویٰ کیا اور اس کی اطلاع آپ ﷺ کو مرض الوفات میں ملی تھی۔ فیروز کے دو بیٹے ضحاک اور عبداللہ وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں انتقال فرمایا۔ "عنسی" میں عین پر زبر' نون ساکن اور سین مہملہ ہے۔

اُبی بن کعب۔ یہ "ابی" کعب الاکبر انصاری خزرجی کے بیٹے ہیں۔ یہ حضور ﷺ کے کاتب وحی تھے اور ان چھ (۶) اصحاب میں

سے تھے جنہوں نے نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں پورا قرآن حفظ کر لیا تھا اور ان فقہاء میں سے ہیں جو حضور ﷺ کے زمانہ میں فتویٰ دیتے تھے اور صحابہ میں کتاب اللہ کے بڑے قاری تسلیم کئے جاتے تھے۔ ان کو حضور ﷺ نے ابوالمنذر کی کنیت سے اور حضرت عمرؓ نے ابوالطفیل سے خطاب فرمایا۔ حضور ﷺ نے آپ کو سید الانصار کا خطاب دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو سید المسلمین کا۔ آپ کی وفات مدینہ طیبہ میں ۱۹ھ میں ہوئی۔ آپ سے کثیر مخلوق نے روایات کی ہیں۔

تشریح: قوله :فقلت له:

یعنی اللہ پاک کے اس فرمان کے حکم کی وجہ سے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (الانبیاء:۷)

''پس اہل ذکر سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے۔''

قوله :قدوقع في نفسي شيء من القدر:

یعنی بے چینی اور عظیم اضطراب قضاء و قدر کے بارے میں عقل کے اعتبار سے نہ کہ نقل کے اعتبار سے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں یعنی بعض تقدیر کے مشابہ چیزیں جو بسا اوقات شک کی طرف لے جاتی ہیں جیسا کہ اس بات کا اعتقاد کہ انسان اپنے نفس کے فعل کا خالق ہے جیسا کہ معتزلہ نے کہا ہے یا وہ فعل پہ مجبور ہے جیسا کہ جبریہ نے کہا ہے۔ پس اسے کیسے عذاب دیا جائے گا اور میں اس سے خلاصی چاہتا ہوں یعنی اس بحث سے:

قوله :فحدثني لعل الله ان يذهبه من قلبي:

پس انہوں نے مجھ سے حدیث بیان کی اس امید پر کہ یہ خیال مجھ سے زائل ہو جائے اور راوی نے پہلے **في نفسي** کہا اور دوسری مرتبہ **''في قلبي''** کہا۔ اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے کہ یہ شک پختہ ہو گیا تھا اور اپنے مجموعہ کے ساتھ ذات اور قلب میں اس نے جگہ پکڑ لی ہے۔ ایسے ہی علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ بے چینی نفسانی خطرات سے پیدا ہوتی ہے اور ثبات اور اطمینان قلبی صفات ہیں پھر راوی کا قول: **''ان يذهبه''** یہ لعل کی خبر ہے اس کو عسیٰ کا حکم دیا ہے اس کی خبر میں ''ان'' کو داخل کرنے کے ساتھ۔

قوله :فقال :لو ان الله عذب اهل سماواته واهل ارضه عذبهم......:

یہ بیان شافی کی غایت اور ارشادِ وافی کی نہایت کو تلاش کرتے ہوئے فرمایا: ''لو'' بمعنی فرض ہے۔ **''اهل سماواته''** سے مراد مقرب فرشتے ہیں اور **''اهل ارضه''** میں انبیاء اور مرسلین علیہم السلام بھی ہیں **''عذبهم''** اس میں اشکال ہے اور اس کا دفعیہ یہ ہے کہ ان شرط لازم الوقوع نہیں ہے۔

قوله :وهو غير ظالم لهم:

واؤ حال کے لئے ہے اس لئے کہ وہ اپنی ملکیت اور بادشاہت میں تصرف کرنے والا ہے۔ پس اس کا عذاب عدل ہے اور اس کا ثواب فضل ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس میں عظیم راہنمائی ہے اور بیان شافی ہے اس شک کے ازالہ کے لئے جو طلب کیا گیا اس

لئے کہ انہوں نے عقلی حسن وقبح کے قاعدہ ہی کو منہدم کر دیا' اس لئے کہ وہ سب کا مالک ہے۔ پس اس لئے جائز ہے جیسے چاہے تصرف کرے اور کوئی ظلم نہیں اصلاً۔

قوله :ولو رحمهم كانت رحمة خيرًا لهم من اعمالهم:

یعنی نیک اعمال سے۔ یہ اشارہ ہے اس طرف کہ اس کی رحمت اعمال کے سبب سے نہیں ہے اور اس کو واقع کرنا بھی اعمال کے سبب سے نہیں ہے اس لئے کہ یہ اللہ پر واجب نہیں ہے کیسے واجب ہو' جبکہ وہ اعمال بھی اس کی منجملہ رحمت سے ہیں' پس اس کی ان پر رحمت محض اس کا فضل ہے پس اگر وہ اولین اور آخرین پر رحمت کرے تو اس کے لئے یہ حق ہے اور یہ اس کی غایت کی حکمت سے خارج نہیں ہے کہ اس نے اطاعت شعاروں کو ثواب کی خبر دی اور گنہگاروں کو عذاب کی جیسا کہ ام الکتاب میں ثابت ہے۔ پس مقدر شدہ معاملہ نہ متغیر ہوتا ہے نہ تبدیل ہوتا ہے اور یہی درست جواب ہے۔

قوله :ولو انفقت مثل احد ذهبا في سبيل الله ما قبله الله:

"اُحد" دوضموں کے ساتھ ہے' مدینہ منورہ کے قریب ایک عظیم پہاڑ ہے۔ "**ذهبا**" تمیز ہے "**في سبيل الله**" یعنی اس کی رضامندی میں اور نیکی کے راستوں میں "**ما قبله الله**" یعنی اس پہاڑ کے مثل خرچ کو۔

قوله :منك:

یہ تمثیل ہے بطور فرض کے نہ کہ تحدید ہے۔ اس لئے کہ اگر فرض کیا جائے آسمان اور زمین بھر کر خرچ کرنا تو ایسا ہی ہو۔

قوله :حتى تومن بالقدر:

یعنی کائنات کے تمام امور' ان کا خیر وشر' میٹھا وکڑوا' نفع ونقصان' قلیل وکثیر' بڑا اور چھوٹا اس کی قضا وقدر اور ارادے اور حکم سے ہے اور ان (بندوں) کے لئے نہیں ہے مگر صرف کسب اور کام کی مباشرت اور یہاں مراد کمالِ ایمان ہے اور اس کے نہ ہوتے ہوئے قبولیت کا سلب ہے جو اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ بدعتیوں کے اعمال قبول نہیں ہوتے یعنی ان کو ان پر ثواب نہیں دیا جائے گا جب تک وہ اپنی بدعت پر قائم ہیں اور اس کی تائید کر رہی ہے یہ حدیث: ((**انی اللّٰه ان يقبل عمل صاحب بدعة حتى يتوب من بدعته**)) ''اللہ پاک نے انکار کر دیا ہے کہ وہ صاحب بدعت کا عمل قبول کریں یہاں تک کہ وہ اپنی بدعت سے توبہ کرے'' اور اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اہل بدعت متقین میں سے نہیں ہیں' اس لئے کہ اللہ پاک کا فرمان ہے: ﴿قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (المائدۃ :۲۷) ''بے شک اللہ تعالیٰ متقین سے قبول کرتا ہے'' اور یہ کہ اللہ ان سے محبت نہیں رکھتا کیونکہ اللہ متقین سے محبت رکھتا ہے۔

قوله :و تعلم ان ما اصابك لم يكن ليخطئك:

یہ تعمیم کے بعد تخصیص ہے۔ جو تجھے نعمت' آزمائش' اطاعت اور مصیبت میں سے پہنچنے والا ہے' جس کو اللہ نے تیرے لئے یا تیرے خلاف مقدر کیا ہے وہ تجھ سے تجاوز نہیں کر سکتا۔

قوله :وان ما اخطاك لم يكن ليصيبك:

اور جو خیر وشر تجھ سے چھوٹ جائے تجھے مل نہیں سکتی اور محال کی جگہ رکھا گیا ہے' گویا کہ کہا جاتا ہے کہ محال ہے کہ وہ تجھ سے تجاوز کرے اور اس میں تین مبالغات ہیں ایک انّ کا دخول اور لام جو نفی کی تاکید کرتا ہے اس کا الحاق اور نفی کو تکوین پر مسلط کرنا اور اس کو خبر میں سرایت کرنا اور یہ اللہ پاک کے اس فرمان کا مضمون ہے:

﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَاۚ هُوَ مَوْلٰنَاۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ [التوبة: ٥١]

''کہہ دیجئے' ہمیں ہرگز نہیں پہنچتا مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ لیا ہے' وہ ہمارا آقا ہے اور اللہ ہی پر چاہیے کہ مؤمن توکل کریں۔''

اور اس میں توکل اور رضا پر ابھارنا ہے اور حول اور قوت کی نفی ہے اور قناعت اور مصیبت پر صبر کو لازم پکڑنا ہے۔

قوله :ولومت على غير هذا لدخلت النار:

''مت'' میم کے ضمہ کے ساتھ ہے ''مات'' یموت سے اور کسرہ کے ساتھ ہے۔ ''مات یمیت'' سے ''علی غیر هذا'' کا مطلب ہے کہ اس اعتقاد کے علاوہ جو تیرے لئے ذکر کیا گیا ہے ایمان بالقدر میں سے ''لدخلت النار'' میں احتمال ہے کہ وعید کے لئے ہو اور احتمال ہے کہ تہدید کے لئے ہو۔

قوله :فقال مثل ذلك :

یعنی اس کے مثل جو میرے والد نے میرے سوال کا جواب دیا تھا۔

قوله :فحدثني عن النبي ﷺ مثل ذلك:

پس حدیث اس طریق سے مرفوع ہوگئی۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایک کے بعد دوسرے سے سوال کرنے اور ان کے جواب میں بغیر کسی تغیر کے اتفاق سے پھر جواب کا حدیث نبوی ﷺ کی طرف پہنچنا اجماع پر دلیل ہے جو اجماع مستند ہو نص جلی پر۔ پس جو اس کی خلاف کرے گا وہ حق صریح کو توڑنے والا ہے۔

تقدیر کے منکر کے لئے خسف، مسخ اور پتھروں کی بارش ہوگی

١١٦ :وَعَنْ نَافِعٍ اَنَّ رَجُلًا اَتَى ابْنَ عُمَرَ فَقَالَ اِنَّ فُلَانًا يَقْرَأُ عَلَيْكَ السَّلَامَ فَقَالَ اِنَّهُ بَلَغَنِيْ اَنَّهُ قَدْ اَحْدَثَ فَاِنْ كَانَ قَدْ اَحْدَثَ فَلَا تُقْرِئْهُ مِنِّى السَّلَامَ فَاِنِّىْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ يَكُوْنُ فِىْ اُمَّتِىْ اَوْفِىْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ خَسْفٌ وَمَسْخٌ اَوْ قَذْفٌ فِىْ اَهْلِ الْقَدْرِ۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوٗدَوَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ)

أخرجه الترمذي في السنن ٣٩٧/٤ حديث رقم ١٢٥٢ وقال حديث حسن صحيح غريب۔ وأخرجه ابن ماجة في السنن ١٢٥٠/٢ حديث رقم ٤٠٦١۔ وأخرج أبوداوٗد ونحوه ٢٠/٥ حديث رقم ٤٦١٣۔ وأحمد في المسند ١٣٦/٢۔

ترجمہ: حضرت نافع رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ

فلاں آدمی نے آپ کو سلام کہا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ اس آدمی نے دین میں کوئی نئی بات نکالی ہے۔ اگر فی الواقع ایسا ہی ہے کہ اس نے دین میں کوئی بدعت ایجاد کی ہے تو میری طرف سے اس کو جواب میں سلام نہ کہنا۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت میں سے یا یہ فرمایا کہ اس امت میں سے اللہ تعالیٰ کے دردناک عذاب زمین میں دھنس جانا شکل کا تبدیل ہو جانا اور پتھروں کی بارش اہل قدر یعنی تقدیر کا انکار کرنے والوں پر ہوگا۔ اس حدیث کو امام ترمذی امام ابوداؤد امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

تشریح: **قوله :ان فلانا يقرأ عليك السلام:**

ایک نسخہ میں "یقرئ" ہے۔ قاموس میں ہے: "قرأ عليه السلام" کا مطلب ہے اس تک پہنچایا جیسے "اقرأ" ہے یا یہ کہ "اقرأ" نہیں کہا جاتا مگر اس وقت جب سلام لکھا ہوا ہو۔

قوله :فقال انه بلغني انه قدا حدث:

"انه" ضمیر شان ہے اور اس کی تفسیر خبر ہے اور وہ آپ کا قول "بلغني انه قد احدث" ہے یعنی دین میں ایسی چیز ایجاد کی جو اس میں سے نہیں ہے یعنی تقدیر کی تکذیب۔

قوله :فان كان قد احدث فلا تقرئه مني السلام:

اگر اس نے ایسی چیز نکالی ہے جو ذکر کی گئی ہے تو اس کو میری طرف سے سلام نہ دینا۔ یہ کنایہ ہے اس کے سلام کی عدم قبولیت سے۔ ایسا ہی علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ان کی مراد یہ ہے کہ اس کو میری طرف سے سلام یا اس کا جواب نہ پہنچاؤ' اس لئے کہ وہ اپنی بدعت کی وجہ سے سلام کے جواب کا مستحق نہیں رہا اگرچہ وہ اہل اسلام سے ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کو میری طرف سے سلام نہ دو' اس لئے کہ ہمیں اہل بدعت کو چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے اسی وجہ سے علماء نے کہا ہے کہ فاسق اور بدعتی کے سلام کا جواب واجب نہیں ہے بلکہ سنت بھی نہیں ہے ان کی زجر و توبیخ کے لئے اور اسی وجہ سے ان کو چھوڑنا جائز ہے۔

قوله :يكون في امتي او في هذه الامة:

امت دعوت اور امت اجابت دونوں کا احتمال ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے اور "او" شک کے لئے ہے۔

قوله :خسف و مسخ او قذف:

"خسف" یعنی زمین میں دھنسنا اور ایک نسخہ میں "مسخ" کی جگہ "او مسخ" ہے یعنی صورت کا تبدیل ہونا اور قذف کہتے ہیں پتھروں سے مارنے کو جیسا کہ قوم لوط پر مارے گئے۔ میرک شاہ کہتے ہیں ظاہر یہ ہے کہ راوی کو شک ہے اور علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ مختلف انواع کا احتمال بھی ہے۔

اور یہ صحیح ہے اگر مسخ کا عطف خسف پر واؤ کے ساتھ نہ ہو' پس تامل کرو۔

قوله :في اهل القدر:

یہ بدل بعض ہے "فی امتی" کے قول سے صرف جرّ کے اعادہ کے ساتھ۔

زمانہ جاہلیت میں مرنے والا بچہ جہنمی ہے

۱۱۷: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ سَأَلَتْ خَدِيْجَةُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ وَلَدَيْنِ مَاتَالَهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُمَا فِي النَّارِ قَالَ فَلَمَّا رَأَى الْكَرَاهَةَ فِيْ وَجْهِهَا قَالَ لَوْرَأَيْتِ مَكَانَهُمَا لَأَ بْغَضْتِهِمَا قَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَوَلَدِيْ مِنْكَ قَالَ فِي الْجَنَّةِ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَوْلَادَهُمْ فِي الْجَنَّةِ وَاِنَّ الْمُشْرِكِيْنَ وَاَوْلَادَهُمْ فِي النَّارِ ثُمَّ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ. (رَوَاهُ اَحْمَدُ)

أحمد فی المسند ۱/۱۳٤۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت خدیجہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ان دو بچوں کے متعلق سوال کیا جو اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت میں فوت ہو گئے تھے کہ وہ جنتی ہیں یا جہنمی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ دونوں بچے دوزخ میں ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتے دیکھا تو ارشاد فرمایا کہ اگر تم ان بچوں کا ٹھکانہ اور حال دیکھ لو کہ وہ کس طرح اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہیں تو تمہیں ان سے نفرت ہو جائے گی۔ پھر حضرت خدیجہؓ نے سوال کیا۔ اے اللہ کے رسول میری وہ اولاد جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیدا ہوئی ہے یعنی قاسم اور عبداللہ ان کا کیا ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ جنت میں ہیں۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمنین اور ان کی اولاد جنت میں ہوں گے۔ مشرکین اور ان کی اولاد جہنم میں ہوں گے اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق میں یہ آیت تلاوت کی: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ ...... کہ جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ان کی اطاعت کی تو ہم ان کی اولاد کو جنت میں ان کے ساتھ رکھیں گے اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قولہ: سالت خدیجة النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن ولدین ماتا فی الجاهلیة:

یعنی ان کی شان کے بارے میں اور یہ کہ وہ جنت میں ہیں یا دوزخ میں؟ اور مؤلف کہتے ہیں یہ امّ المؤمنین خدیجہ بنت خویلد بن اسد قرشی ہیں، بنی ھالہ بن زرارہ کے عقد میں تھیں پھر عتیق بن خویلد نے ان سے نکاح کیا پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کیا اور اس وقت ان کی عمر چالیس سال تھی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قبل کسی عورت سے شادی نہیں کی تھی اور ان پر بھی کوئی نکاح نہیں کیا یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا اور یہ تمام لوگوں مرد و زن میں سے سب سے پہلے ایمان لائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری اولاد سوائے ابراہیم رضی اللہ عنہ کے ان ہی سے ہیں اور ابراہیم رضی اللہ عنہ ماریہ سے ہیں اور یہ مکہ میں فوت ہوئیں ہجرت سے پانچ سال قبل اور کہا گیا ہے کہ چار سال قبل اور اس وقت ان کی عمر پینسٹھ سال تھی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی مدت پچیس سال تھی اور حجون میں دفن ہوئیں۔

قوله :قال :فلما رای الكراهة في وجهها قال :لا بغضتهما:

جب آپ ﷺ نے ان کے چہرے پر غم واندوہ کے آثار دیکھے تو ان کی تسلی کے لئے فرمایا اگر تو جہنم میں ان کی جگہ دیکھ لیتی تو ان دونوں کو ناپسند کرتی اور ایک نسخہ میں "لابغضتیھا" کسرہ کو یاء کر کے ہے یعنی اگر تو ان کے مقام کو حقارت اور اللہ تعالیٰ سے دوری میں دیکھ لے تو تو کراہت محسوس کرے اور ان کو ناپسند کرے یا اگر تو ان کے مقام کو جان لے اور ان کے ساتھ اللہ کے بغض کو بھی جان لے تو تو ان سے بغض رکھے اور ان سے برأت کا اظہار کرے جیسے ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے برأت ظاہر کی تھی جب واضح ہو گیا تھا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے۔

قوله :قالت :یا رسول الله! فولدی منك ؟ قال في الجنة:

اس سے مراد ان کی وہ اولاد ہے جو آپ علیہ السلام سے ہوئی یعنی قاسم اور عبداللہ اور کہا گیا ہے کہ طیب اور طاہر بھی ہیں اور کہا گیا ہے کہ یہ دونوں عبداللہ کے لقب ہیں اور اکثر کا یہی قول ہے واللہ اعلم۔

قوله :ان المؤمنين واولادهم في الجنة:

اس میں کوئی معتد بہ اختلاف نہیں ہے۔

قوله :وان المشركين...... ثم قرأ :"والذين امنوا واتبعتهم ذريتهم بايمان۔"

اور ایک صحیح نسخہ میں ذریاتھم ہے اور یہ دونوں متواتر قراء تیں ہیں۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اور حدیث میں ہے کہ اولاد آباء کے تابع ہے کہ ماؤں کے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ پاک کے اس فرمان سے استشہاد لیا (جو آگے آ رہا ہے)

قوله :الحقنا بهم ذريتهم:

رہا مشرکین کی اولاد کو ان کے آباء کے ساتھ ملحق کرنے کے لئے استشہاد کا طریق وہ اس طرح ہے کہ یوں کہا جائے: اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ الحاق ان کے آباء کے اکرام اور ان کی مزید خوشی اور غبطہ کے لے ہے جنت میں۔ ورنہ ان پر نعمت تلخ ہو جائے گی اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ "والذين امنوا" محل نصب میں ہے تقدیر عبارت یوں ہے: "واكرمنا الذين امنوا" مبتداء ہے "بايمان الحقنابهم ذريتهم" اس کی خبر ہے اور جو ان کے درمیان ہے وہ جملہ معترضہ ہے اور ایمان میں تنوین تنکیر تعظیم کے لئے ہے اور معنی یہ ہے کہ ایمان عظیم کے سبب سے محل کی بلندی ہے اور وہ آباء کا ایمان ہے۔ ہم ان کے درجات کے ساتھ ان کی اولاد کو ملا دیتے ہیں اگر چہ وہ اس کے اہل نہیں ہوتے۔ ان پر اور ان کے آباء پر فضل کرتے ہوئے تا کہ ان کی خوشی مکمل ہو جائے اور ان کی نعمت مکمل ہو جائے اور یہ معنی کفار میں مفقود ہیں۔

میں کہتا ہوں بلکہ ان کی اولاد کا ان کے ساتھ معذّب ہونا ان کے عذاب کی زیادتی اور عقاب کی شدت کا سبب ہے پھر جو شراح نے آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے وہ حدیث کے مدعٰی میں صریح نہیں ہے یا یہ کہ مؤمنین کی چھوٹی اولاد دخولِ جنت میں اپنے آباء کے تابع ہوتی ہے یا درجات کی بلندی میں اور بے شک یہ تفسیر بغوی سے مستفاد ہے اس طور پر کہ انہوں نے کہا آیت کی تفسیر میں اختلاف ہے پس ایک قوم نے کہا کہ اس کا معنی ہے "اور جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ ان کی اتباع کی"

یعنی ان کی چھوٹی اور بڑی اولاد نے۔ پس بڑی اولاد نے اپنے ایمانوں کے ساتھ اور چھوٹی اولاد نے آباء کے ایمان کے ساتھ۔ اس لئے کہ چھوٹے بچے پر اسلام کا حکم لگایا جاتا ہے والدین میں سے کسی ایک کے تابع بنا کر تو ہم ان کی مؤمن ذریت کو ان کے ساتھ ملا دیتے ہیں جنت میں ان کے درجات کے ساتھ۔ اگرچہ وہ اپنے اعمال کے ذریعہ اپنے آباء کے درجات تک نہ پہنچتے ہوں ان کے آباء کا اکرام کرتے ہوئے تاکہ اس سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور یہی روایت ہے سعید بن جبیر کی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور دوسروں نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے: ''جو ایمان لائے اور ان کی بالغ اولاد نے ان کی اتباع کی ایمان کے ساتھ ہم ان کے ساتھ ان کی اولاد کو ملا دیتے ہیں'' یعنی چھوٹی اولاد کو جو ایمان کو نہیں پہنچتے آباء کے ایمان کے سبب سے اور یہی ضحاک کا قول ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عوفی کی روایت ہے: **"اخبر اللّٰہ عزوجل انه یجمع لعبده المؤمن ذریته فی الجنة کما کا ن یحب فی الدنیا ان یجتمعوا الیه یدخلهم الجنة بفضله"**۔ ''اللہ عزوجل نے خبر دی ہے کہ وہ اپنے مؤمن بندے کے لئے اس کی اولاد کو جنت میں جمع کرے گا جیسا کہ وہ دنیا میں پسند کرتا تھا کہ وہ اس کے پاس جمع ہوں اور ان کو جنت میں اپنے فضل سے داخل کرے گا اور ان کو ان کے باپ کے درجہ کے ساتھ ملائیں گے بغیر اس کے کہ ان کے آباء کے عمل سے کوئی چیز کم کی جائے۔ اسی وجہ سے اللہ پاک کا فرمان ہے:

قوله :وما التناهم:

یعنی ہم کم نہیں کرتے ان کے آباء کے عمل سے کوئی چیز اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث میں ہے: **"ان اللّٰہ یرفع ذریة المؤمن فی درجته وان کانوا دونه فی العمل لتقربه عینه"**۔ ''بیشک اللہ پاک مؤمن کی ذریت کو بلند کرتے ہیں اگرچہ وہ عمل میں اس سے کم ہوتا کہ اس کے ذریعہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں'' پھر یہ آیت تلاوت کی:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِيءٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ﴾ (الطور : ۲۱)

اور آیت کا ظاہر یہ ہے کہ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ عام ہے آباء اور امہات دونوں کو شامل ہے اور شاید خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اولاد آگ میں اس لئے ہو کہ وہ ان کی موت کے وقت مؤمن نہیں تھیں۔ پس یہ منافی نہیں ہوگا علماء کے اس قول کے'' کہ چھوٹے بچے پر اسلام کا حکم لگایا جاتا ہے'' والدین میں سے کسی ایک کے تابع بنا کر۔ اس صورت میں علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام اپنی صداقت پر نہیں ہوگا۔ پس تدبر کرو۔

اولادِ آدم انکار اور خطا کرتی ہے

۱۱۸ :وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّاخَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ مَسَحَ ظَهْرَهٗ فَسَقَطَ مِنْ ظَهْرِهٖ كُلُّ نَسَمَةٍ هُوَخَالِقُهَا مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَجَعَلَ بَيْنَ عَيْنَيْ كُلِّ اِنْسَانٍ مِنْهُمْ وَبِيْصًا مِّنْ نُوْرٍ ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلٰى اٰدَمَ فَقَالَ اَيْ رَبِّ مَنْ هٰؤُلَاءِ فَقَالَ ذُرِّيَّتُكَ فَرَاٰى رَجُلًا

مِنْهُمْ فَاَعْجَبَهٗ وَبِيْصُ مَابَيْنَ عَيْنَيْهِ قَالَ اَىْ رَبِّ مَنْ هٰذَا قَالَ دَاوٗدُ فَقَالَ اَىْ رَبِّ كَمْ جَعَلْتَ عُمْرَهٗ قَالَ سِتِّيْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ زِدْهُ مِنْ عُمُرِىْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا انْقَضٰى عُمْرُ اٰدَمَ اِلَّا اَرْبَعِيْنَ جَاءَهٗ مَلَكُ الْمَوْتِ فَقَالَ اٰدَمُ اَوَلَمْ يَبْقَ مِنْ عُمُرِىْ اَرْبَعُوْنَ سَنَةً قَالَ اَوَلَمْ تُعْطِهَا ابْنَكَ دَاوٗدَ فَجَحَدَ اٰدَمُ فَجَحَدَتْ ذُرِّيَّتُهٗ وَنَسِىَ اٰدَمُ فَاَكَلَ مِنَ الشَّجَرَةِ فَنَسِيَتْ ذُرِّيَّتُهٗ وَخَطَاَ اٰدَمُ وَخَطَأَتْ ذُرِّيَّتُهٗ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِىُّ)

أخرجه الترمذی ١٤٩/٥ حدیث رقم ٣٠٧٦ وقال حسن صحیح۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرشتہ کو ہاتھ پھیرنے کا حکم دیا چنانچہ اس کے نتیجہ میں ان کی پشت سے تمام جانیں نکل پڑیں۔ جن کو اولاد آدم سے قیامت تک اللہ نے پیدا کرنا تھا اور ہر آدمی کی دونوں آنکھوں کے درمیان نور کی چمک رکھی پھر ان سب کو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے لا کر کھڑا کیا حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں دیکھ کر پوچھا اے میرے رب یہ کون لوگ ہیں؟ رب نے فرمایا یہ سب آپ کی اولاد ہے حضرت آدم علیہ السلام نے ان میں سے ایک شخص کو دیکھا جس کی آنکھوں کے درمیان غیر معمولی چمک تھی۔ اس سے آدم علیہ السلام کو بڑا تعجب اور حیرانگی ہوئی تو سوال کیا اے رب یہ کون ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ داؤد علیہ السلام ہیں۔ پھر آدم علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے رب تو نے اس کی کتنی زندگی مقرر کی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ساٹھ (۶۰) سال۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا اے میرے رب! اس کی زندگی میں میری عمر میں سے چالیس سال زیادہ کردے۔ راوی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب آدم علیہ السلام کی زندگی کے چالیس سال باقی رہ گئے تو ملک الموت ان کے پاس روح قبض کرنے کے لئے آیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اس فرشتہ سے کہا کیا ابھی میری زندگی کے چالیس سال باقی نہیں ہیں؟ موت کے فرشتہ نے کہا۔ کیا آپ نے اپنی زندگی میں سے چالیس سال اپنے بیٹے داؤد علیہ السلام کو نہیں دیئے تھے؟ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے انکار کر دیا۔ اب ان کی اولاد بھی انکار کرتی ہے اور حضرت آدم علیہ السلام اپنے وعدہ کو بھول گئے اور انہوں نے شجرہ ممنوعہ کا پھل کھا لیا اور اب آدم کی اولاد بھی بھولتی ہے اور حضرت آدم علیہ السلام نے خطا کی تھی اور اب آدم کی اولاد بھی خطا کرتی ہے۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله :مسح ظهره فسقط من ظهره كل نسمة:

آپ آگے ہوئے پس آپ کی پیٹھ سے نکلا اور ایک صحیح نسخہ میں: "من ظهره" کی جگہ "عن ظهره" ہے یعنی واسطہ کے ساتھ اور بغیر واسطہ کے "كل نسمة" یعنی ذی روح اور کہا گیا ہے ہر ذی نفس پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ ماخوذ ہے نسیم سے یہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور قاموس میں ہے کہ نسم محرک ہے نفس روح کا' جیسا کہ نسمہ محرک ہے اور نفس الریح جب ضعیف ہو بادِ نسیم کی طرح ہوتی ہے۔

قوله :هو خالقها من ذريته الى يوم القيامة:

"ھو خالقھا من ذریتہ" والا جملہ صفت ہے نسمۃ کی اس کو ذکر فرمایا تا کہ اس کے ساتھ متعلق ہو جائے "الی یوم القیامۃ" اور من بیانیہ ہے اور اس حدیث میں واضح دلیل ہے کہ ذریت کا اخراج حقیقی ہے۔

قولہ :وجعل بین عینی کل انسان:

یعنی ان میں سے ہر ایک۔ اور ایک نسخہ میں "منھم" ہے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ بین عینی' جعل کا دوسرا مفعول ہے اور جائز ہے کہ یہ بمعنی "خلق" ہو۔ پس اس کے لئے ظرف ہو۔

قولہ :وبیصا من نورہ:

"وبیصا" یعنی حسین اور چمکدار۔ "من نورہ" اور اس کے ذکر میں اشارہ ہے فطرتِ سلیمہ کی طرف اور آپ کے فرمان: "بین عینی کل انسان" میں اس بات کا بیان ہے کہ ذریت انسانی صورت میں چیونٹی کی مقدار پر تھی۔

قولہ :قال :ھو داؤد:

کہا گیا ہے کہ داؤد کی چمک سے تعجب کی تخصیص اس کی کرامت کے اظہار اور ان کی مدح کے لئے ہے۔ پس اس سے تمام انبیاء علیہم السلام پر ان کی فضیلت لازم نہیں آتی' اس لئے کہ کبھی مفضول میں کوئی مزید خوشی ہوتی ہے بلکہ کئی مزید خوبیاں ہوتی ہیں جو فاضل میں نہیں ہوتیں اور شاید دونوں کے درمیان مناسبت کی وجہ نسبت خلافت کا اشتراک ہو۔

قولہ :فقال :ربّ! کم جعلت عمرہ۔

ایک نسخہ میں ای ربّ ہے۔ "عمر" عین اور میم کے ضمہ کے ساتھ ہے اور کبھی کبھی میم ساکن بھی ہوتی ہے اور "کم" تا بعد کے لئے مفعول ہے اور مقدم اس لئے کیا کہ یہ صدر کلام کا تقاضا کرتا ہے یعنی ان کی عمر کتنے سال ہے۔

قولہ :رب زدہ من عمری:

یعنی منجملہ ہزار سال میں سے اور "من عمری" یہ اربعین کی صفت ہے' اس کو مقدم کیا گیا ہے' پس حال کے طور پر لوٹی ہے۔

قولہ :اربعین سنۃ:

یہ مفعول ثانی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا﴾ (طٰہٰ : ۱۱۴) "کہہ دیجئے اے ربّ! میرے علم میں اضافہ فرما" ابوالبقاء کہتے ہیں "زادَ" کا لفظ لازم استعمال ہوتا ہے جیسا کہ تیرا قول: "زاد الماء" پانی زیادہ ہوا اور متعدی استعمال ہوتا ہے دو مفعولوں کی طرف جیسے کہ کسی کا قول: "زدتہٗ درھما" میں نے اس کو ایک درہم زیادہ دیا۔ اسی پر اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ج وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ﴾ (البقرۃ : ۱۰)

"ان کے دِلوں میں مرض ہے۔ پس اللہ نے ان کے مرض کو بڑھا دیا ہے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے بوجہ اس کے جو وہ جھوٹ بولتے ہیں"

ایسے ہی علامہ طیبی نے ذکر فرمایا ہے۔علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اور کبھی کبھی ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسے "زاد المال درھما" (مال ایک درہم زیادہ ہوا) سید جمال الدین فرماتے ہیں اس میں یہ ہے کہ مثالیں دو مفعولوں کی طرف متعدی ہونے میں نص نہیں ہیں اس لئے کہ تمیز کا بھی احتمال ہے پس تامل کرو۔

قولہ :اولم یبق من عمری اربعون سنۃ

"یبق" باء اور قاف دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ہمزہ استفہام انکاری کے ساتھ ہے جو بقاء کی نفی پر نصب ہے پس اثبات کا فائدہ دیتا ہے اور واؤ پر مقدم کیا صدارت کلام کی وجہ سے اور واؤ استینافیہ ماقبل اور مابعد کے درمیان محض ربط کے لئے ہے۔

اگر تو کہے کہ "انقضی عمرہ الا اربعین" اور "بقی من عمر آدم اربعون" کے درمیان کیا فرق ہے؟ تو میں کہوں گا استثناء میں وہ تاکید ہے جو اس کے غیر میں نہیں ہے۔علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں میں کہتا ہوں کہ غیر استثناء میں اکثر کا احتمال ہے جبکہ یہ کُل چالیس کی بقاء میں نص ہے جیسا کہ اللہ پاک کا فرمان ہے:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ۭ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾

(العنکبوت: ١٤)

"تحقیق ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا۔پس وہ ان میں ایک ہزار سال ٹھہرے سوائے پچاس سال کے۔پس ان (قوم) کو طوفان نے پکڑا اس حال میں کہ وہ ظالم تھے۔"

آیت میں زائد افادہ کے ساتھ ضبط کی طرف زیادہ قریب کرنے اور کثرت میں عدد مشہور پر دلالت کرنے اور کسر کے باطل کرنے کے جواز پر اشارہ ہے جیسا کہ عامہ زبانوں پر جاری ہے۔

قولہ :اولم تعطھا ابنک داوٗد:

یعنی تو ایسا کہتا ہے اور تو نے چالیس سال نہیں دینے اپنے بیٹے داؤد کو "ابنك" مفعول ثانی ہے "داود" بدل ہے یا عطف بیان ہے۔

قولہ :فجحد آدم فجحدت ذریتہ!

یعنی آدم نے اس کا انکار کیا اس لئے کہ یہ اس وقت عالم ذر میں تھے۔پس ملک الموت کے آنے کے وقت ان کو وہ حال مستحضر نہیں ہوا۔ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا ہی فرمایا ہے۔پس ان کی اولاد بھی انکار کرے گی اس لئے کہ بیٹا باپ کا ہمراز ہوتا ہے۔

قولہ :و نسی آدم فاکل من الشجرۃ فنسیت ذریتہ:

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ انکار بھی نسیان کی وجہ سے تھا' اس لئے کہ ان کا انکار بطور عناد کے جائز نہیں۔ "فاکل من الشجرۃ" کہا گیا ہے کہ وہ بھول گئے کہ نہی جنس شجر سے ہے یا معین درخت سے ہے۔پس انہوں نے اس معین درخت کے علاوہ سے کھایا اور نہی جنس شجر سے تھی' واللہ اعلم۔یہی وجہ ہے کہ کہا جاتا ہے: "اول الناس اول الناسی" (پہلا آدمی پہلا

بھولنے والا ہے)۔

قوله :و خطأ و خطأت ذریته:

"خطأ" طاء کے فتحہ کے ساتھ ہے یعنی تعیین اور تخصیص کی جہت سے اجتہاد میں اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ خطا بمعنی عصی ہے۔ اللہ پاک کے اس فرمان کی وجہ سے: ﴿وَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی﴾ (طٰہٰ: ۱۲۱) "اور آدم نے اپنے رب کا حکم پورا نہ کیا پس وہ بہک گیا" اور نبی اکرم ﷺ کے فرمان کی وجہ سے ((و کلکم خطاؤون و خیر الخطائین التوابون)) "اور تم میں سے ہر ایک خطا کار ہے اور بہترین خطا کار توبہ کرنے والے ہیں" علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ حدیث میں اشارہ ہے اس طرف جو شیخین نے نقل کیا ہے: ((یھرم ابن اٰدم و یشب فیه اثنان الحرص علی المال والحرص علی العمر)) [بخاری] "ابن آدم بوڑھا ہوتا ہے اور اس میں دو چیزیں جوان ہوتی جاتی ہیں مال پر حرص اور عمر پر حرص اور ابن آدم بہانہ بنانے کے راستہ پر وارد ہے اور ابن آدم اپنی اصل خلقت کے اعتبار سے انکار، نسیان اور خطاء کی طرف کھینچا گیا ہے، سوائے اس کے جس کو اللہ بچائے۔

جنتی اور جہنمی ہونے کا فیصلہ ہو چکا ہے

۱۱۹: وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ حِیْنَ خَلَقَهٗ فَضَرَبَ کَتِفَهُ الْیُمْنٰی فَاَخْرَجَ ذُرِّیَّةً بَیْضَاءَ کَاَنَّهُمُ الذَّرُّ وَضَرَبَ کَتِفَهُ الْیُسْرٰی فَاَخْرَجَ ذُرِّیَّةً سَوْدَآءَ کَاَنَّهُمُ الْحُمَمُ فَقَالَ لِلَّذِیْ فِیْ یَمِیْنِهٖ اِلَی الْجَنَّةِ وَلَا اُبَالِیْ وَقَالَ لِلَّذِیْ فِیْ کَتِفِهِ الْیُسْرٰی اِلَی النَّارِ وَلَا اُبَالِیْ. (رَوَاهُ اَحْمَدُ)

أخرجه أحمد في المسند ٦/٤٤١۔

ترجمہ: حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کے دائیں کندھے پر ہاتھ مارا۔ یعنی دست قدرت یا ہاتھ مارنے کا حکم دیا اور اس سے سفید اولاد نکالی گویا کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں جتنے تھے اور پھر بائیں کندھے پر ہاتھ مارا اور اس سے سیاہ رنگ کی اولاد نکالی گویا کہ وہ کوئلہ تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے دائیں جانب والی اولاد کے بارے میں فرمایا کہ یہ جنتی ہیں اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں اور بائیں کندھے والی اولاد کے بارے میں فرمایا کہ یہ جہنمی ہیں اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں ہے۔ اس حدیث کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله :خلق اللّٰہ آدم حین خلقه فضرب:

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "حین خلقه" ظرف ہے۔ "فضرب" کے لئے اور فاء عمل سے مانع نہیں ہے اس لئے کہ یہ ظرف ہے، علاوہ ازیں کہ فاء سببیہ بھی مابعد کے ماقبل میں عمل سے مانع نہیں ہے، اس لئے کہ "لایلاف قریش" متعلق ہے اللہ پاک کے قول: ﴿فلیعبدو﴾ سے شرط کی تقدیر پر یعنی اگر کچھ اور نہیں کرتے تو اس کی عبادت کرو ایسے ہی کشاف میں ہے۔ عرب کہتے ہیں: "اما لا" یعنی اگر تو اور کچھ نہیں کرتا تو یہ کر۔ قاضی فرماتے ہیں یعنی اگر وہ اس کی ساری نعمتوں کے لئے

عبادت نہیں کرتے تو اس کی عبادت کریں۔ اللہ کی ان پر نعمتوں کی وجہ سے اور سید جمال الدین فرماتے ہیں اور احتمال ہے کہ یہ ظرف ہو: "خلق اللہ" کے قول سے اور مقصود ان کے زمانہ تخلیق کے عدم علم کی طرف اشارہ کرنا ہو پس تامل کرو۔

اور کہا گیا ہے کہ ظرف کی تقدیم تعقیب کے باوجود اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ اخراج اولادِ آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پیچھے نہیں ہے اور اس میں نظر ہے اس لئے کہ دلالت حاصل ہو جاتی ہے اگرچہ ظرف متاخر ہو اور "فضرب" کے بارے میں کہا گیا ہے اللہ نے ضرب کا حکم دیا' یعنی فرشتہ نے مارا۔

قولہ : کتفه الیمنی:

کاف کے فتحہ اور تاء کے کسرہ کے ساتھ ہے' اسی طرح صحیح نسخوں میں لکھا گیا ہے اور قاموس میں "کتف کفرح" کتف فرح کی طرح ہے "ومثل وجبل" اور مثل جبل کی طرح ہے۔

قولہ :فاخرج ذریة بیضآء کانهم الذر:

"بیضاء" سے مراد نورانی۔ "ذر" اکثر نسخوں میں ذال معجمہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ پس تشبیہ ہیئت میں ہے اور کہا گیا ہے اس سے مراد سفید ہے۔ مقابل دلیل کی وجہ سے جو آنے والی ہے اور بعض نسخوں میں دال مہملہ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ پس تشبیہ رنگ اور صفائی کے اعتبار سے ہے اور یہ اس کے منافی نہیں ہے جو پیچھے گزر چکا ہے کہ "ان میں سے ہر انسان کی دونوں آنکھوں کے سامنے چمک ہے" یہاں تک کہ محتاج ہو اس کی طرف کہ یہ احتمال ہے کہ اخراج کا تکرار ہو مختلف صفات پر جیسا کہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

قولہ :و ضرب کتفه الیسری فاخرج ذریة سودآء کانهم حمم:

"سوداء" یعنی تاریک "حمم" حاء کے ضمہ کے ساتھ حممۃ کی جمع ہے' کہا جاتا ہے "حممت الجمرة" میں نے پتھر کو گرم کیا یا کوئلہ بنایا۔ جیسے "فرحت" ہے اور "تحم" فتحہ کے ساتھ اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ کوئلہ بن جائے۔

قولہ :فقال للذی فی یمینه:

یعنی ان کے لئے جو دائیں کندھے سے نکلے اس دلیل کی وجہ سے کہ آگے کتفه الیسری آ رہا ہے۔ پس وہ ما کان کے اعتبار سے ہوگا۔

اور معنی یہ ہے کہ اللہ پاک نے آدم علیہ السلام سے فرمایا ان کی وجہ سے جو ان کے دائیں طرف ہیں اور ان کے بارے میں اور ان کے حق میں جیسا کہ اللہ پاک کا فرمان:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ۭ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ﴾

(الاحقاف : ۱۱)

"اور کہنے لگے منکر ایمان والوں کو کہ اگر یہ دین بہتر ہوتا تو یہ نہ دوڑتے اس پر ہم سے پہلے اور جب راہ پر نہیں آئے اس کے بتلانے سے تو یہ اب کہیں گے' یہ جھوٹ ہے بہت پرانا"۔

اور ''الذی'' صفت ہے فریق کی جیسا کہ اللہ پاک کا فرمان ہے:

﴿كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ (التوبة : ٦٩)

''پھر فائدہ اٹھا گئے اپنے حصے سے پھر فائدہ اٹھایا تم نے اپنے حصہ سے جیسے فائدہ اٹھا گئے تم سے اگلے اپنے حصہ سے اور تم بھی چلتے ہو انہی کی سی چال۔ وہ لوگ ایسے ہیں کہ مٹ گئے ان کے اعمال دنیا میں اور آخرت میں اور وہی لوگ پڑے ہیں نقصان میں۔''

قوله :الى الجنة:

مبتداء محذوف کی خبر ہے یعنی ان کو میں پہنچاؤں گا یا لے جاؤں گا جنت کی طرف اور ممکن ہے حکم بالمشافہ ہو اور تقدیر عبارت یہ ہو کہ تم کو میں جنت کی طرف پہنچاتا ہوں یا میں تم کو جنت کی طرف لے جاتا ہوں۔

قوله :ولا ابالی له:

یہ خبر میں ضمیر مستکن سے حال ہے یعنی حال ہے کہ میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا' کیسے کروں جبکہ میں کرنے والا ہوں جو ارادہ کرتا ہوں اور مخلوق ساری میری غلام ہے اور یہ اس قول کی طرح ہے: ''**وان رغم انف ابی ذر**''۔ ''اگرچہ ابوذر کا ناک رگڑا جائے'' بے شک اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ بعض بدعتی اس کے خلاف کہیں گے پس خود ان پر رَد کر دیا ان کی تحقیر اور ان کی عقلوں کی بیوقوفی میں مبالغہ کے طور پر اور یہ کہ وہ گرد کی طرح ہیں جس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا' اگرچہ کرے جو کرے۔

قوله :وقال للذی و کفه الیسری:

''**کفه**'' کاف کے فتحہ اور فاء کی تشدید کے ساتھ ہے ایسے ہی سید جمال الدین کی اصل میں ہے اور بعض نسخوں میں ''**ای فی یده**'' ہے اور یہ مناسب ہے ''**فی یمینه**'' کے قول کے مقابل معنی کے لئے اور اکثر نسخوں میں ''**کتفه الیسری**'' ہے اور ہو سکتا ہے یہ ما کان کے اعتبار سے ہو۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں اور یمین اور کف کو ذکر فرمایا عظمت کا تصور دلاتے ہوئے۔

اور ظاہر یہ ہے کہ ''**یمینه**'' اور ''**کفه**'' کی ضمیر آدم کی طرف راجع ہے اور مراد ان کی دونوں جہتیں ہیں اور ''**کتفه**'' کی روایت اس معنی میں صریح ہے اور ''**یسری**'' بھی' اسلئے کہ ان کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پر نہیں ہوتا۔ اسلئے کہ اس کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں جیسا کہ بعض احادیث میں وارد ہوا ہے۔

قوله :الى النار ولا ابالی:

اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے۔ اعمال تو علامات ہیں موجبات نہیں ہیں پس وہ اپنے تمام افعال میں محمود ہے ایک فریق کو جنت کے لئے پیدا کیا بطور فضل کے اور ایک فریق کو دوزخ کے لئے پیدا کیا عدل کے طریقہ پر۔ اس سے نہیں پوچھا جاتا جو وہ کرتا ہے اور وہ پوچھے جائیں گے۔

جنتی اور جہنمی ہونے کی فکر کرنی چاہیے

۱۲۰: وَعَنْ اَبِیْ نَضْرَۃَ اَنَّ رَجُلًا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُقَالُ لَہٗ اَبُوْعَبْدِاللّٰہِ دَخَلَ عَلَیْہِ اَصْحَابُہٗ یَعُوْدُوْنَہٗ وَھُوَ یَبْکِیْ فَقَالُوْا لَہٗ مَا یُبْکِیْکَ اَلَمْ یَقُلْ لَکَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خُذْ مِنْ شَارِبِکَ ثُمَّ اَقِرَّہٗ حَتّٰی تَلْقَانِیْ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ قَبَضَ بِیَمِیْنِہٖ قَبْضَۃً وَّاُخْرٰی بِالْیَدِ الْاُخْرٰی وَقَالَ ھٰذِہٖ لِھٰذِہٖ وَھٰذِہٖ لِھٰذِہٖ وَلَااُبَالِیْ وَلَآاَدْرِیْ فِیْ اَیِّ الْقَبْضَتَیْنِ اَنَا ۔ (رَوَاہُ اَحْمَدُ)

اخرجه احمد فی ٥/٦٨۔

ترجمہ: حضرت ابونضرہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام میں سے ایک آدمی جن کا نام ابوعبد اللہ تھا' بیمار ہوگئے اوران کے دوست واحباب ان کی تیمارداری کے لئے تشریف لے گئے۔ تو انہوں نے وہاں جا کر دیکھا کہ ابوعبداللہ رو رہے ہیں۔ ان لوگوں نے پوچھا کہ آپ کو کس چیز نے رونے پر مجبور کیا ہے؟ اور آپ کیوں رو رہے ہیں کیا رسول اللہ ﷺ نے آپ سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ تم اپنی مونچھوں کے بال کاٹ کر چھوٹے کرو اور اسی پر قائم رہو یہاں تک کہ تم مجھ سے جنت میں مل جاؤ۔ ابوعبداللہؓ نے فرمایا: ہاں! یہ تو فرمایا ہے لیکن میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ عزوجل نے اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں ایک جماعت کو پکڑا اور فرمایا کہ یہ جنت کے لئے ہیں اور اسی طرح دوسرے ہاتھ میں ایک جماعت کو پکڑا اور فرمایا یہ جماعت جہنم کے لئے ہے اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے یہ فرما کر ابوعبد اللہ نے کہا مجھے معلوم نہیں کہ میں کس مٹھی میں ہوں۔ یعنی جنت والی مٹھی میں ہوں یا جہنم والی مٹھی میں۔ اس حدیث کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

ابونضرۃ ابن المنذر۔ یہ ابونضرہ ہیں' ان کا نام منذر ہے۔ مالک کے بیٹے ہیں اور "عبدی" ہیں۔ ابن عمر ابوسعید اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے حدیث کی سماعت کی ہے۔ ان سے ابراہیم تیمی' قتادہ اور سعید بن یزید نے روایت کی ہے۔ ان کا شمار بصرہ کے تابعین میں کیا جاتا ہے۔ ان کا انتقال حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ پہلے ہوا۔

تشریح: قوله :ان رجلا ...... یقال له عبدالله:

صحابی کا مجہول ہونا نقصان نہیں دیتا اس لئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم سب کے سب عادل ہیں۔

قوله :دخل علیه اصحابه:

یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم یا تابعین رحمہم اللہ میں سے اور اول زیادہ ظاہر ہے جیسا کہ عنقریب آئے گا۔

قوله :یعودونه وهو یبکی:

"یودون" عبادت سے ہے جو عبادت سے افضل ہے لفظاً اور معنیٰ "وهو يبكي" جملہ حالیہ ہے۔

قوله :فقالوا له :ما يبكيك؟

یعنی کیا چیز تجھے رونے والا بنارہی ہے اور تیرے رونے کا کیا سبب اور باعث ہے؟

قوله :الم يقل لك حتى تلقاني:

"خذمن شاربك" یعنی بعض مونچھ یعنی اس کو کاٹ کر ہونٹ کے برابر مقدار پر کرے۔ "اقره" ہمزہ کے فتحہ' قاف کے کسرہ اور راء کی تشدید کے ساتھ ہے یعنی اس پر دوام کرے "حتى تلقاني" یعنی حوض پر یا غیر حوض پر اور حتی غایت اور علت دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمزہ انکار کے لئے ہے نفی پر داخل ہوا ہے پس اس نے تقدیر اور تعجب کا فائدہ دیا ہے یعنی تو کیسے روتا ہے اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ فرمایا ہے کہ تم لامحالہ ان سے ملو گے اور جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اس حال میں کہ وہ اس سے راضی ہوں تیرے مثل اس پر کوئی خوف نہیں ہے۔

قوله :قال :بلى ...... واخرى باليد الاخرى:

یعنی مجھے اس کی خبر دی ہے۔ "ان الله عزوجل قبض" یعنی بعض ذریت کو "قبضة" یعنی ایک مٹھی میں "واخرى" یعنی دوسری مٹھی بعض دوسری ذریت کے لئے۔

قوله :باليد الاخرى.

"يساره" نہیں کہا ادب کی وجہ سے اور اس وجہ سے دوسری حدیث میں آیا ہے "اس کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں" اور اس میں اللہ تعالیٰ کے جلال اور عظمت کے لئے تصویر ہے اس لئے کہ وہ جسم اور لوازم جسم سے منزہ ہے۔

قوله :وقال هذه لهذه:

یعنی وہ مٹھی جو دائیں ہاتھ میں پکڑی ہے وہ جنت کے لئے ہے۔

قوله :وهذه لهذه:

یعنی وہ مٹھی جس کو دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہے وہ آگ کے لئے ہے۔

قوله :ولا ابالي ولا ادري في:

یعنی دونوں حالتوں میں میں نہیں جانتا اور ایک نسخہ میں "في" کی جگہ "من" ہے۔

قوله :في اى القبضتين انا:

اور جواب کا حاصل یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے فرمان: "لا ابالي" کی وجہ سے عدم خیال اور لاپرواہی سے ڈرتا ہوں' ایسے ہی علامہ طیبی رحمہ اللہ نے کہا ہے یعنی میرے اوپر خوف غالب ہے اس کی عظمت اور جلال کی طرف نظر کرتے ہوئے اس طور پر کہ اس خوف نے مجھے اس کی رحمت اور جمال میں تامل کرنے سے روک دیا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور عدم مبالات کی وجہ سے اس کے لئے جائز ہے کہ وہ کرے جو چاہے اور اس پر کوئی چیز واجب نہیں ہے بندے کے لئے اور یہ بھی ہے کہ غلبہ خوف

کی وجہ سے کبھی کبھی انسان بشارت اور اس کی امید کو بھول جاتا ہے باوجودیکہ بشارت ثابت ہے شہادت اور دوام کے ساتھ۔ سنت کے راستہ پر اقامت اور استقامت کے ساتھ اور یہ ایک دقیق معاملہ ہے اور خوف کے لائق ہے' واللہ اعلم۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اور حدیث میں اشارہ ہے اس طرف کہ مونچھوں کو کاٹنا سنت مؤکدہ ہے اور اس پر مداومت سیّد المرسلین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پڑوس میں نعمتوں کے گھر کے قرب کی طرف پہنچانے والی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جس نے سنت کو ترک کیا کسی بھی سنت کو تو وہ بہت بڑی خیر سے محروم ہوا تو تمام سنتوں کے ترک پر مواظبت کیسے ہو سکتی ہے پس بے شک یہ کبھی زندیق بننے کی طرف لے جاتی ہے۔

اللہ نے عالم ارواح میں سب سے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ وعدہ لیا ہے

۱۲۱: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَخَذَ اللّٰهُ الْمِيْثَاقَ مِنْ ظَهْرِ اٰدَمَ بِنَعْمَانَ يَعْنِيْ عَرَفَةَ فَاَخْرَجَ مِنْ صُلْبِهٖ كُلَّ ذُرِّيَّةٍ ذَرَاَهَا فَنَثَرَهُمْ بَيْنَ يَدَيْهِ كَالذَّرِّ ثُمَّ كَلَّمَهُمْ قُبُلًا قَالَ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غَافِلِيْنَ اَوْ تَقُوْلُوْا اِنَّمَا اَشْرَكَ اٰبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۔ (رَوَاهُ اَحْمَدُ۔الاعراف ۱۷۲)

أخرجه أحمد فی المسند ۱/ ۲۷۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میدان عرفات کے قریب وادی نعمان میں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی تمام پیدا ہونے والی اولاد کو نکالا اور ان سب کو چیونٹیوں کی طرح حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے پھیلا دیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے آمنے سامنے گفتگو کی اور فرمایا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ حضرت آدم علیہ السلام کی تمام اولاد نے کہا بے شک آپ ہمارے رب ہیں پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ شہادت میں نے تم سے اس لئے لی ہے کہ کہیں تم قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگو کہ ہم اس سے بے خبر اور غافل تھے یا تم یہ کہہ دو کہ ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے شرک کیا تھا اور ہم ان کی اولاد تھے۔ چنانچہ ہم نے ان کی اطاعت کی تھی اے اللہ کیا تو ان باطل پرستوں کے اعمال کی وجہ سے ہمیں ہلاک کرتا ہے۔ اس حدیث کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قولہ :اخذ اللّٰہ المیثاق:

یعنی عہد لیا یعنی لینے کا ارادہ کیا اس قول کی دلیل کے ذریعہ "فاخرج"۔

قولہ :من ظهر آدم بنعمان:

یعنی آدم کی ذریت کو جوان کی پیٹھ سے ظاہر ہوئی۔ جوہری کہتے ہیں "نعمان' فتحہ کے ساتھ ایک وادی ہے۔ طائف کے راستہ میں جو عرفات کی طرف جاتا ہے اور قاموس میں ہے کہ عرفہ کے پیچھے ایک وادی ہے اور اسے "نعمان الاراك" کہتے ہیں اور نہایہ میں ہے کہ یہ ایک پہاڑ ہے عرفہ کے قریب اور اسے نعمان سحاب کہتے ہیں' اس لئے کہ اس کے اوپر نہیں چڑھا جاتا اس کی بلندی کی وجہ سے۔ پس اس کے عرفہ کے قریب ہونے کی وجہ سے راوی نے کہا (یعنی عرفہ)۔

قوله :فاخرج من صلبه:

"صلبه" اول یعنی صاد کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ پیٹھ کا بالوں سے خالی حصہ ہے۔

قوله :کل ذرية ذرأها فنثرهم بين يديه کالذر:

"ذرأها" ہمزہ کے ساتھ ہے یعنی اس کو پیدا کیا قیامت تک یہ "ذرأ الله الخلق" سے ہے ان کے اشخاص کو ایجاد کیا یعنی بعض کو واسطہ کے ساتھ اور بعض کو بغیر واسطہ کے۔ پس ان کو جدا جدا کیا اور پھیلایا' بکھیرا' آدم کے سامنے یا بعض کو دائیں طرف اور بعض کو بائیں طرف جو جسامت میں چیونٹی کے مشابہ تھے۔

قوله :ثم کلمهم قبلا:

یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان سے خطاب فرمایا: "قبلا" دونوں کے ضموں کے ساتھ ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ "عنب' صرد' قفل اور جبل" کی طرح ہے اور یہ حال ہے یعنی ان سے کلام کیا آمنے سامنے نہ کہ پردے کے پیچھے سے اور نہ اس طرح کہ کسی فرشتے کو حکم دیا ہو۔

قوله :قال الست بربکم ؟ قالوا بلی:

"قال" استنافیہ ہے بیان ہے اور ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ "کلمهم" سے بدل ہے یعنی ان سے کہا: "الست بربکم؟" تو انہوں نے کہا: "ہاں" آپ ہمارے ربّ ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اگر وہ بلی کی جگہ نعم کہہ دیتے تو کافر ہو جاتے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس لئے کہ یہ نفی کو مضبوط کرنا ہے اور "بلی" اس کو رد کرنا ہے اور نفی کی نفی اثبات ہوتا ہے' مغنی میں کہا ہے: یہی وجہ ہے کہ فقہاء کی ایک جماعت نے کہا ہے اگر کوئی کہے کہ کیا تیرے لئے تیرے اوپر ہزار نہیں ہے؟ تو وہ کہے "بلی" تو اسے لازم ہو جائے گا اور اگر وہ کہے "نعم" تو لازم نہیں ہوگا اور دوسروں نے کہا ہے دونوں صورتوں میں لازم ہوگا اور اس میں وہ عرف کے مقتضی پر چلے ہیں پھر کہا کہ کتب حدیث میں واقع ہوا ہے جو تقاضا کر رہا ہے کہ اس کے ذریعہ محض استفہام کا جواب دیا جاتا ہے۔ چنانچہ بخاری میں کتاب الایمان میں ہے: ((انه عليه السلام قال لاصحابه ارضون ان يکونوا ربع اهل الجنة؟ قالوا بلى)) (بخاری) "نبی علیہ السلام نے اپنے اصحاب سے فرمایا: کیا تم راضی ہو کہ تم اہل جنت کا چوتھائی ہو جاؤ؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں" اور صحیح مسلم میں کتاب الھبہ میں پوری حدیث اس طرح ہے: ((عن النعمان بن بشير قال :انطلق بی ابی يحملنی الی رسول الله صلی الله عليه وسلم فقال يا رسول الله! اشهد انی قد نحلت النعمان کذا و کذا من مالی فقال اکل بنيك قد نحلت مثل ما نحلت النعمان قال لا قال فاشهد علی هذا غيری ثم قال يسرك ان يکونوا اليك فی البر سوآء قال بلی قال فلا اذًا)) ۔ (مسلم کتاب الھبات)

"نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ میرے والد مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے اور کہا: اے اللہ کے رسول! میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے نعمان کو اپنے مال سے اتنا اتنا دیا ہے آپ نے فرمایا: کیا تو نے اپنے سارے بیٹوں کو اتنا دیا ہے جتنا نعمان کو دیا ہے؟ کہا: نہیں' تو آپ نے فرمایا: پس اس پر کسی اور کو گواہ بنالے پھر فرمایا: کیا تجھے یہ بات خوش کرتی ہے کہ وہ تیرے ساتھ

بھلائی کرنے میں برابر ہوں؟ کہا کیوں نہیں! تو آپ نے فرمایا پھر ایسا نہ کرو' اور اس میں یہ بھی ہے کہ کہا: کیا تو وہی ہے جو مجھ سے مکہ میں ملا تھا؟ تو جواب دینے والے نے کہا: کیوں نہیں۔ پھر کہا: لیکن یہ اس طرح آنا تھوڑا ہے اس پر تنزیل کا استخراج نہیں ہو سکتا۔

اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ یہ مثالیں متنازع فیہ کی قبیل سے نہیں ہیں۔ ازہار میں ہے اور درست یہ ہے کہ ان کے جواب بلی کے قول کے ساتھ نطق کے ساتھ تھا اور وہ زندہ تھے' عاقل تھے اور کہا گیا ہے زبانِ حال سے تھا پھر کفار پر ہیبت کی تجلی ڈالی تو انہوں نے "بلی" کہا ڈر کر۔ پس ان کو ان کے ایمان نے نفع نہیں دیا اور مؤمنین پر رحمت کی تجلی ڈالی تو انہوں نے بلی خوشی سے کہا پس ان کو ان کے ایمان نے نفع دیا۔

قولہ :شہدنا:

اس میں احتمال ہے کہ کہی ہوئی بات کا تتمہ ہو یعنی ہم گواہی دیتے ہیں اپنے نفسوں پر اس کی اور تیری وحدانیت کا اقرار کرتے ہیں اور یہ اس کی طرف محتاج ہیں باوجودیکہ "بلی" نے اس سے مستغنی کر دیا ہے اللہ پاک کے اس فرمان کی وجہ سے:

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ﴾ (الاعراف: ۱۷۲)

"تیرے ربّ نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر کیا میں نہیں ہوں تمہارا ربّ؟ بولے: ہاں ہے ہم اقرار کرتے ہیں (یہ اقرار اس لئے کیا کہ) کبھی کہنے لگیں قیامت کے دن ہم کو تو اس کی خبر نہ تھی"۔

اور احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی ابتداء ہو یعنی ہم تمہارے اقرار پر گواہ ہیں۔ علامہ طیبی کی تقدیر پہلے کی تائید کرتی ہے۔

قولہ :ان تقولوا:

یعنی احتجاجاً اور کہا گیا ہے: "لکئی تقولوا" تاکہ تم یہ نہ کہو اور جمہور خطاب کے ساتھ مانتے ہیں اور ابو عمرو غیبت کے ساتھ مانتے ہیں دونوں جگہوں پر التفات پر اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا: "گواہ رہو" انہوں نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں اور بعض نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں یعنی خود اللہ نے اور فرشتوں اور آسمانوں اور زمین نے۔ سہل بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ مجھے وہ میثاق یاد ہے۔

قولہ :یوم القیامۃ:

یہ ظرف ہے ان تقولوا کے لئے یعنی جب ان پر محاسبہ کیا جائے گا ان کے کفر پر اللہ کے ساتھ' اس کی کتابوں کے ساتھ' اس کے رسولوں کے ساتھ اور ان کا مقولہ:

قولہ :انا کنا من ھذا غافلین:

"ھذا" سے مراد یہ میثاق یا ربوبیت کا اقرار اور بندگی کا اعتراف ہے اور غافلین کا مطلب ہے یعنی جاہل تھے نہیں جانتے

تھے اس کو جس پر ہمیں متنبہ کیا گیا ہے۔

قوله :او تقولوا انما اشرك آباء نامن قبل:

بعض متاخرین کہتے ہیں کہ یہ دوسری حجت لینا ہے یعنی ہمارے ظہور اور وجود سے قبل یا ہمارے شرک کرنے سے قبل ہمارے آباء واجداد نے شرک کیا ہے۔

قوله :وكنا ذرية من بعدهم افتهلكنا بما فعل المبطلون :

پس ہم نے ان کی اقتداء کی للہذا ملامت ان پر ہے نہ کہ ہم پر "افتهلكنا" یعنی کیا تو یہ جانتا ہے۔ پس ہمیں عذاب دینا ہے کیا ہمارے آباء کی وجہ سے جنہوں نے شرک کی بنیاد ڈالی اور مطلب یہ ہے کہ ان کے لئے اس سے دلیل پکڑنا ممکن نہیں ہے' ان کے اپنے نفسوں پر توحید کے ساتھ گواہی دینے کے ساتھ اور صاحب معجزہ کی زبان سے اس کو یاد دلانا قائم مقام ہے' نفوس میں یاد آنے کے۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ حدیث ابوعبدالرحمٰن نسائی کی کتاب سے نکالی گئی ہے اور یہ اس تاویل کا احتمال نہیں رکھتی جس کا احتمال عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث رکھتی ہے اور میں نے معتزلہ کو نہیں دیکھا کہ اس دلیل کا مقابلہ کرتے ہوں مگر اپنے اس قول کے ذریعہ کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث آحاد میں سے ہے اس کے ذریعہ ہم کتاب اللہ کے ظاہر کو نہیں چھوڑ سکتے اور وہ بھاگے ہیں آیت کے معنی میں اس قول سے جس کا ظاہر حدیث تقاضا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ﴾ (الاعراف : ۱۷۲) "پس وہ کہتے ہیں اگر یہ اضطرار اُتھا اس طور پر کہ ان پر حقیقت امر ظاہر کی گئی اور انہوں نے یقین کی آنکھ سے مشاہدہ کیا تو ان کے لئے قیامت کے دن جائز ہے کہ وہ کہیں "ہم نے اس دن گواہی دی تھی" پس جب ہم سے یہ زائل ہوا تو ہم نے بدیہی علم کے طور پر جان لیا اور ہم کو اپنی آراء کے سپرد کیا۔ پس ہم میں سے بعض نے درست پایا اور بعض نے خطا کی اور اگر یہ استدلال سے ہو لیکن وہ اس کے ہاں خطاء سے معصوم ہوں تو ان کے لئے جائز ہے کہ وہ کہیں کہ ہم نے توفیق اور عصمت کے ساتھ یوم اقرار کی تائید کی اور بعد میں ہم دونوں اس سے محروم ہو گئے اور اگر ان دونوں کے ساتھ ہماری مدد کی جاتی تو ہماری شہادت بروقت یوم اول کی شہادت کی طرح ہوتی۔ پس ظاہر ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے میثاق کو عقلوں میں نہیں گاڑا اور ان کے پاس اور ان کے آباء کے پاس بصائر آئے ہیں اس لئے کہ وہ باقی رہنے والی حجت ہیں جو ان کو یہ کہنے سے مانع ہیں کہ وہ کہیں کہ ہم اس سے غافل تھے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اقرار کو ان کے خلاف حجت بنایا ہے' شرک کرنے میں۔ جیسا کہ رسولوں کی بعثت کو ان پر حجت بنایا ہے اس چیز پر ایمان لانے میں جو ان کو غیب کی خبریں دی گئی ہیں۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں' جو وہ کہتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس سے لازم آتا ہے کہ وہ قیامت کے دن اس سے دلیل پکڑنے والے ہوں گے کہ ہم سے علم ضرورت زائل ہو گیا تھا اور ہم کو اپنی آراء کے سپرد کیا گیا تھا۔ پس ان سے کہا جائے گا' تم جھوٹ بولتے ہو بلکہ ہم نے لگاتار رسول بھیجے جو تم کو غفلت کی نیند سے جگاتے رہے اور رہا ان کا یہ قول کہ ہم اس کے بعد توفیق اور عصمت سے محروم کر دیئے گئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ مشترک الزام ہے اس لئے کہ ان کے لئے جائز ہے کہ وہ یہ کہیں کہ ہمارے لئے عقول اور بصائر میں کوئی منفعت نہیں ہے' جب ہم توفیق اور عصمت سے محروم کر دیئے جائیں اور حق یہ ہے کہ

احادیث واردہ کو ظاہر پر محمول کیا جائے اور ان میں طعن پر اقدام نہ کیا جائے کہ یہ احاد ہیں کسی ایک کے اعتقاد کے مخالف ہونے کی وجہ سے اور جو اس پر اقدام کرے گا وہ خیر کثیر سے محروم ہوگا اور سلف صالحین کے طریقہ کی مخالفت کرے گا اس لئے کہ خبر کو ثابت مانتے ہیں جو ایک ایک کے ذریعہ نبی اکرم ﷺ کی روایت ہو اور اس کو سنت مانتے ہیں۔ اس کی تعریف کی جاتی ہے جو اس کی اتباع کرتا ہے اور عیب لگایا جاتا ہے اس پر جو اس کی مخالفت کرتا ہے۔

اور کشاف میں کہا ہے: ابن آدم کی قدرت نازل ہوتی ہے علم ربوبیت کے علم کے ساتھ دلائل نصب کرنے کے ذریعہ اور ان میں استعداد پیدا کرنے کے ساتھ اور ان کو اس کی معرفت کی قدرت دینے کے ساتھ اور اس کا اقرار گواہی لینے کے درجہ میں ہے اور اعتراف تمثیل اور تخیل کے منزلہ میں ہے وہاں نہ کوئی قول ہے نہ حقیقی گواہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جمع کرنے میں کوئی مانع نہیں ہے اور اس پر عقل اور سمع مل جاتے ہیں۔ مولی علامہ قطب الدین شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ عقولوں کی ابتداء میں یہ بات پختہ ہو چکی ہے کہ بنو آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے ہیں۔ پس جو بھی بنی آدم کی پشتوں سے نکالا جائے گا وہ برابر انہیں میں رہے گا جن کو اللہ تعالیٰ نے ازل میں آدم کی پشت سے نکالا تھا اور اس سے میثاقِ ازلی لیا تھا تا کہ وہ اس سے پہچان لے کہ یہ نسل جو نکلی ہے ان میں سے ہے جو بنی آدم کی پشتوں میں رہی ہے وہ چیونٹی ہے جو ازل میں آدم علیہ السلام کی پشت سے نکلی اور اس سے پہلا عہد لیا اور یہی مقالی ازلی ہے۔ جیسا کہ ان سے لیا ان میں جو تدریج کے ساتھ رہا جب ان کو نکالا گیا دوسرا میثاق اور یہ حالی ازلی ہے۔ پس اللہ کے لئے دو میثاق ہیں بنی آدم کے ساتھ۔ جس کی طرف عقلیں راہنمائی کرتی ہیں دلائل نصب کرنے میں سے جو اعتراف حالی پر ابھارتے ہیں اور دوسرا مقالی ہے جس کی طرف عقلیں راہ نہیں پاتی بلکہ موقوف ہے واقف کے بتلانے پر جو بندوں کے احوال کو ازل سے ابد تک جانتا ہو جیسے انبیاء علیہم السلام۔ پس نبی اکرم ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ امت جان لے کہ اس میثاق کے پیچھے جس کی طرف یہ راہ پکڑتے ہیں ایک دوسرا ازلی میثاق ہے۔ پس کہا جو کہا ازل میں آدم کی پیٹھ پر مسح کے بارے میں...... اور یہ تحقیق کی غایت اور باریکی کی انتہا ہے واللہ اعلم۔

آیت میثاق کی تفسیر

١٢٢: وَعَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ فِیْ قَوْلِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ قَالَ جَمَعَھُمْ فَجَعَلَھُمْ اَزْوَاجًا ثُمَّ صَوَّرَھُمْ فَاسْتَنْطَقَھُمْ فَتَکَلَّمُوْا ثُمَّ اَخَذَ عَلَیْھِمُ الْعَھْدَ وَالْمِیْثَاقَ وَاَشْھَدَھُمْ عَلٰی اَنْفُسِھِمْ (اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی) قَالَ فَاِنِّیْ اُشْھِدُ عَلَیْکُمُ السَّمٰوٰتِ السَّبْعَ وَالْاَرَضِیْنَ السَّبْعَ وَاُشْھِدُ عَلَیْکُمْ اَبَاکُمْ اٰدَمَ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ لَمْ نَعْلَمْ بِھٰذَا اِعْلَمُوْا اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ غَیْرِیْ وَلَارَبَّ غَیْرِیْ وَلَا تُشْرِکُوْا بِیْ شَیْئًا اِنِّیْ سَاُرْسِلُ اِلَیْکُمْ رُسُلِیْ یُذَکِّرُوْنَکُمْ عَھْدِیْ وَمِیْثَاقِیْ وَاُنْزِلُ عَلَیْکُمْ کُتُبِیْ قَالُوْا شَھِدْنَا بِاَنَّکَ رَبُّنَا وَاِلٰھُنَا لَارَبَّ لَنَا غَیْرُکَ وَلَآ اِلٰہَ لَنَا غَیْرُکَ فَاَقَرُّوْا بِذٰلِکَ وَرَفَعَ عَلَیْھِمْ اٰدَمَ یَنْظُرُ اِلَیْھِمْ فَرَاَی الْغَنِیَّ وَالْفَقِیْرَ وَحَسَنَ الصُّوْرَۃِ وَدُوْنَ ذٰلِکَ

فَقَالَ رَبِّ لَوْلَا سَوَّيْتَ بَيْنَ عِبَادِكَ قَالَ اِنِّي اَحْبَبْتُ اَنْ اُشْكَرَ وَرَاَى الْاَنْبِيَآءَ فِيْهِمْ مِّثْلَ السُّرُجِ عَلَيْهِمُ النُّوْرُ خُصُّوْا بِمِيْثَاقٍ اٰخَرَ فِي الرِّسَالَةِ وَالنُّبُوَّةِ وَهُوَ قَوْلُهٗ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ اِلٰى قَوْلِهٖ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ كَانَ فِيْ تِلْكَ الْاَرْوَاحِ فَاَرْسَلَهٗ اِلٰى مَرْيَمَ عَلَيْهَا السَّلَامُ فَحُدِّثَ عَنْ اُبَيٍّ اَنَّهٗ دَخَلَ مِنْ فِيْهَا۔ (رَوَاهُ اَحْمَدُ)

أخرجه أحمد في المسند ۵/۱۳۵۔

ترجمہ: حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ قرآن کی اس آیت: وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (کہ جب تمہارے رب نے آدم کی اولاد کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کو جمع کیا اور ان کو مختلف قسم کا بنا دیا۔ (یعنی کسی کو فقیر اور کسی کو مال دار بنا دیا باعتبار ارادہ کے)۔ پھر ان کو شکل وصورت عطا کی اور پھر بولنے کی طاقت عطا کی اور انہوں نے باتیں کیں پھر ان سے مضبوط وعدہ لیا اور پھر ان کو ان کی اپنی جانوں پر گواہ بنا کر پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ آدم کی اولاد نے کہا بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں ساتوں آسمانوں اور زمینوں کو تمہارے سامنے گواہ بناتا ہوں اور تمہارے باپ حضرت آدم کو بھی گواہ بناتا ہوں تاکہ قیامت کے دن تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہم اس سے غافل اور بے خبر تھے۔ اس وقت تم اچھی طرح جان لو کہ نہ تو میرے سوا کوئی معبود ہے اور نہ ہی میرے سوا کوئی رب ہے اور خبردار کسی کو میرے ساتھ شریک نہ کرنا۔ میں تمہارے پاس عنقریب اپنے رسول اور انبیاء بھیجوں گا جو تمہیں میرا یہ وعدہ یاد دلائیں گے اور تمہارے لئے اپنی کتابیں بھی بھیجوں گا۔ یہ سن کر آدم کی اولاد نے کہا کہ ہم اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ تو ہمارا رب ہے اور تو ہی ہمارا معبود ہے۔ تیرے سوا نہ تو ہمارا کوئی رب ہے اور نہ ہی تیرے سوا ہمارا کوئی معبود ہے۔ چنانچہ آدم کی تمام اولاد نے اس کا اقرار کر لیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو ان کے اوپر بلند کر دیا اور وہ اپنی نگاہ کو بلند کئے ہوئے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ جب آدم علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کی اولاد میں امیر بھی ہیں اور غریب بھی' خوبصورت بھی ہیں اور بدصورت بھی یہ منظر دیکھ کر آدم علیہ السلام نے عرض کیا۔ اے اللہ تو نے اپنے تمام بندوں کو برابر اور یکساں نہیں بنایا؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میرے بندے میرا شکر ادا کرتے رہیں۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام نے انبیاء کرام کو دیکھا جو چراغوں کے مثل روشن تھے اور نور ان کے اوپر جلوہ نما تھا۔ ان سے خصوصیت کے ساتھ نبوت ورسالت کے بارے میں وعدہ لیا گیا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ اِلٰى قَوْلِهٖ عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ اور جب ہم نے انبیاء کرام سے ان کا عہد لیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور نوح سے اور ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام سے بھی وعدہ لیا۔ ان روحوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تھے چنانچہ ان کی روح کو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے توسط سے حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بھیج دیا۔ حضرت ابی بن کعبؓ بیان کرتے ہیں کہ یہ روح حضرت مریم علیہا السلام کے جسم مبارک میں ان کے منہ سے داخل کی گئی۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله :واذ اخذ ...... ذريتهم:

ایک نسخہ صحیحہ میں "ذریاتھم" اور یہ دونوں قراءتیں متواتر ہیں۔

قوله :قال جمعهم فجعلهم ازواجا:
یہاں اللہ نے ان کو نکالنے کے بعد جمع کیا پس مذکر اور مؤنث بنایا یا کئی قسمیں بنائیں اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے یعنی ارادہ کیا کہ ان کو کئی اقسام بنائے اور اصناف کی تفسیر آنے والے قول سے کی پس مالدار اور فقیر کو دیکھا۔

قوله :ثم صورهم فاستنطقهم فتكلموا:
یعنی ان صورتوں پر جن پر بعد میں ہوں گے۔ "**فاستنطقهم**" یعنی ان میں عقل پیدا کی اور ان سے گویائی طلب کی۔ پس اس نے کلام کیا جو اللہ نے چاہا جو آگے آئے گا۔

قوله :ثم اخذ عليهم العهد والميثاق:
یعنی بنانے اور گویائی طلب کرنے کے بعد خلاق کی تقدیر کے حکم کے ساتھ ان سے توحید کا عہد لیا اور میثاق لیا۔ میثاق عہد کی تاکید ہے اقرار کے ساتھ یا اس عہد سے مراد یہ ہے کہ اگر ان کے پاس رسول آئے تو وہ ضرور ان پر ایمان لائیں گے اور میثاق سے مراد مؤکد قسمیں ہیں کہ وہ ضرور اس کو پورا کریں گے۔

قوله :واشهدهم على انفسهم:
یعنی اپنی ذاتوں پر یا بعض کو بعض پر یا ان سے فرمایا اپنے نفسوں پر گواہی دو اور ہر تقدیر پر اس آدمی کا قول جو "شهدنا" کہے ان کے قول کی تائید کرتا ہے۔

قوله :الست بربكم قالوا :بلى:
یہ یا تو جملہ استینافیہ بیان ہے اور یا تقدیر عبارت یہ ہے: "**اشهدهم يقوله الست بربكم**" ان کو گواہ بنایا اپنے فرمان "**الست بربكم**" کے ساتھ۔ یعنی اس پر ان سے گواہی طلب کی۔ انہوں نے کہا "**بلى**" اکثر صحیح نسخوں میں یہی ہے اور بعض نسخوں میں لفظاً متروک ہے اگرچہ معنی مقدر ہے اس لئے کہ معنی یہ ہے انہوں نے کہا: بلکہ کیوں نہیں ہم گواہی دیتے ہیں۔

قوله :قال: فانى اشهد عليكم السمٰوات السبع والارضين السبع:
یعنی ان کی ذات کو اس طور پر کہ ان میں عقلیں ڈالی گئی ہیں۔ وہ ازیں محققین اس طرف گئے ہیں کہ تمام موجودات کو اپنے اور اپنے اہل کے موجد کا علم ہے۔ "**ارضين**" راء کے فتحہ اور سکون کے ساتھ ہے۔ سات زمینوں کو اسی طرح یعنی تمہارے اپنے نفسوں پر شہادت پر زیادتی کرنے کے لئے اور کافی ہے اللہ بطور گواہ اور علامہ طیبی فرماتے ہیں اس میں دلیل ظاہر کے نصب کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ پس "**اشهدنا**" انصب کے معنی میں ہے اور اُبیّن کے معنی میں ہے اور پہلے کی تائید کرتا ہے آنے والے قول کا ظاہر۔

قوله :واشهد عليكم آباكم آدم ان تقولوا يوم القيامة لم نعلم:
علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کی بھی تاویل کی ہے۔ "**يذكرونكم**" کی طرف۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ نصوص ظاہرہ

جو وارد ہوئی ہیں' رسولوں کی طرف سے ہیں۔

قولہ :اعلموا انہ لا الہ غیری ولا رب غیری:

یعنی اس زمانہ کے آنے سے پہلے تحقیق کرلو اور معاملہ آنکھوں کے ساتھ ظاہر ہے کہ میرے علاوہ کوئی معبود نہیں اور میرے سوا کوئی ربّ موجود نہیں۔

قولہ :ولا تشرکوا بی شیئاً' انی سأرسل الیکم رسلی:

میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ' اس لئے کہ میں ہی مقصود ہوں "انی" اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ فتحہ کے ساتھ ہے ماقبل سے بدل اشتمال ہے اور کسرہ کے ساتھ استنافیہ ہے اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ یعنی میں اس بیان کے ساتھ زمانہ مستقبل میں تمہاری طرف رسول بھیجوں گا' دلیل کے ساتھ۔

قولہ :یذکرونکم عھدی و میثاقی وانزل علیکم کتبی:

"یذکرونکم" کاف کی تشدید کے ساتھ ہے۔ "انزل علیکم کتبی" یعنی رسولوں کے واسطہ کے ساتھ اور ان میں ہر چیز کا بیان ہے جو متعلق ہے میرے عہد کے اور میثاق کے ساتھ اسی وجہ سے اللہ پاک فرماتے ہیں:

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ﴾

(البقرۃ: ٤٠)

"اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تمہارے اوپر کی ہیں اور میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرو۔"

اور یہ تصریح کی طرح ہے اس کے لئے جو ہم نے پیچھے بیان کیا' میثاق مقالی' میثاق حالی' عہد حسی اور معنوی کے درمیان جمع کرنے کے بارے میں۔

قولہ :قالوا شھدنا بانک ربنا والٰھنا۔

یعنی ہم نے جان لیا اور اعتراف کرلیا کہ تو ہمارا ربّ ہے اور ہر چیز کا ربّ ہے۔ ہم تیری ربوبیت کے ساتھ راضی ہوئے اور تو ہمارا معبود ہے اور ہر چیز کا معبود ہے۔ پس ہم تیری الوہیت کے مقتضی پر تیری عبودیت کے حق کے ساتھ کھڑے ہیں۔

قولہ :لا رب غیرک ولا الہ لنا غیرک:

آپ کے سوا کوئی ربّ نہیں' اس لئے کہ آپ سارے جہانوں کے ربّ ہیں اور آپ کے سوا ہمارا کوئی معبود نہیں' اس لئے کہ آپ عابدین کے معبود ہیں۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں مقام ربوبیت کو مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حق کی تربیت کے گواہ' ایمان بالالوہیت پر اٹھانے والے ہیں لہٰذا یہاں وہ تقدیم کا زیادہ حقدار ہے اور اللہ پاک کے کلام میں اس کا عکس ہے اس لئے کہ وہ مقام الوہیت تقدیم کا زیادہ حقدار ہے کہ اس پر متنبہ کیا جائے اس لئے کہ وہی اصل ہے اور جو اس کے سوا ہیں وہ اس کے لئے وسیلہ ہیں جیسا کہ واضح ہو چکا ہے۔

قوله :فاقروا بذلك ورفع عليهم آدم عليه السلام ينظر اليهم:

یعنی اس سب کا اقرار کیا پھر آدم علیہ السلام کو اونچے مقام پر بلند کیا جہاں سے دیکھ رہے تھے۔ "ینظر الیھم" حال ہے یا مفعول ہے ان کی تقدیر کے ساتھ جیسا کہ کسی کے قول میں ہے: "احضر الوغی" (لڑائی میں حاضر ہوا)۔

قوله :فرأى الغنى والفقير و حسن الصورة و دون ذلك:

پس غنی کو دیکھا صورۃً اور معنیً روشن اور چمکدار آثار کے اعتبار سے اور فقیر کو جو ہاتھ کا فقیر ہو اور دل کا فقیر ہو اور ایک نسخہ میں فقیر کو مقدم کیا گیا ہے اور خوبصورت کو ظاہراً اور باطناً اور اس کے علاوہ کو یعنی خوبصورت کے علاوہ کو جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ کو۔

قوله :فقال رب لولا سويت بين عبادك:

"لولا" ھلا کے معنی میں ہے یعنی "لم ما سویت" (تو نے برابری کیوں نہ کی؟) اور مقصد اس سوال کا یہ ہے کہ اس کی حکمت بیان کی جائے۔

قوله :قال انى احببت ان اشكر:

مجہول ہے یعنی میں انعامات کے ساتھ پہچانا جاؤں اور لوگوں کی زبانوں پر ہمیشہ میرا شکر ادا کیا جاتا رہے اور یہ معنی اس کی تصحیح کرتا ہے جو حدیث نقل کی گئی ہے اور لفظاً درست نہیں ہے وہ یہ ہے:

"کنت کنزا مخفیًا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق لان اعرف"

"میں مخفی خزانہ تھا پس میں نے پسند کیا کہ میں پہچانا جاؤں، پس میں نے مخلوق کو پیدا کیا تا کہ میں پہچانا جاؤں۔"

اور یہی وجہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اللہ پاک کے اس فرمان:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (الذاريات: ٥٦)

"میں نے جنوں اور انسانوں کو محض اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے"

میں "لیعبدون" کا مطلب "لیعرفون" بیان فرمایا ہے تا کہ مجھے پہچانیں اور مطلب یہ ہے کہ مالدار فقیر کی طرف دیکھے گا تو شکر ادا کرے گا اور فقیر اپنے دین کی طرف دیکھے گا پس اپنی نعمت کو مالدار سے اوپر دیکھے گا، پس شکر ادا کرے گا اور بدصورت اپنی اچھی عادات کو دیکھے گا تو شکر ادا کرے گا ایسے ہی علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے اور اس سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ حسن صورت اور حسن سیرت جمع نہیں ہو سکتے اور یہ کہ مالداری اور دین ایک دوسرے کے منافی ہیں۔ لہٰذا زیادہ بہتر وہ مطلب ہے جو میرے شیخ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ مالدار نعمت غنیٰ، عظمت کو دیکھے گا اور فقیر دنیا کی گندگی، فکر، تعب سے بچنے کی نعمت عظمیٰ کو دیکھے گا، جس کا کوئی حاصل نہیں ہے۔ طولِ حساب، پے درپے آزمائشوں اور مسلسل عذاب کے علاوہ اور خوبصورت شخص دیکھے گا جو اللہ نے اس کو ظاہری جمال دیا ہے جو کہ جمال باطنی پر دلالت کرتا ہے غالباً اور اس کا غیر دیکھے گا کہ عدم جمال فتنہ کو زیادہ دفع کرنے والا ہے اور آزمائش سے زیادہ سالم محفوظ ہے۔ پس ان میں سے ہر ایک ان نعمتوں کی زیادتی کو دیکھے گا جو ان پر ہیں۔ پس سب ان پر شکر

ادا کریں گے اور اگر وہ سب ایک وصف میں برابر ہوتے تو اس کے لئے متنبہ نہ ہوتے۔

قوله :ورأى الانبياء فيهم مثل السرج عليهم النور۔

انبیاء رسل سے عام ہے۔ "فیھم" یعنی اس حال میں کہ وہ ان کے جملہ افراد میں مندرج تھے۔ "سرج" سراج کی جمع ہے یعنی چراغ "علیھم النور" یعنی غالب ہوگا گویا یہ بیان ہے ان کی چراغوں کے ساتھ تشبیہ کا۔ اس لئے کہ مخلوق تاریکی میں پیدا کی گئی ہے اور انبیاء علیہم السلام پر اللہ کے انوارات ہیں چمکتے ہوئے ان کے ذریعہ وہ اپنے ربّ کی طرف ہدایت پاتے ہیں' اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ انبیاء بھی اخلاقِ بشریہ کی ظلمت سے خالی نہیں ہیں لیکن ان پر عصمت الٰہیہ اور انوارِ ربانیہ غالب ہیں:

قوله :خصوا بميثاق آخر في الرسالة والنبوة:

یعنی عوام کے میثاق کے عموم میں داخل ہونے کے بعد ان کے مقصد کے اہتمام تام کے لئے ہے۔ پس لفظ "خصوا" استنافیہ ہے یا لفظ "الانبیاء" کے لئے صفت ہے "فی الرسالة والنبوة" یعنی ان کی شان میں اور انکے حق کے قائم کرنے میں اور دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ نبی وہ ہوتا ہے جو اللہ کی جانب سے خبر دے' برابر ہے کہ اسے حکم دیا جائے کہ وہ اللہ کی جانب سے خبر دے یا نہ اور رسول وہ ہے جس کو تبلیغ و رسالت کا حکم دیا گیا ہو۔

قوله :وهو قوله تبارك و تعالٰى واذا اخذنا من النبيين ميثاقهم الى قوله عيسٰى بن مريم:

اس سے قبل آیت اس طرح ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا﴾ (الاحزاب: ۷)

"اور جب لیا ہم نے نبیوں سے ان کا اقرار اور تجھ سے اور نوح سے اور ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور عیسیٰ بن مریم سے اور لیا ہم نے ان سے گاڑھا قرار۔"

اس میں تخصیص ہے تعمیم کے بعد' اس لئے کہ یہ پانچ اولوالعزم پیغمبر ہیں اصح قول کے مطابق اور نبی اکرم ﷺ کو ذکر میں مقدم کیا رتبہ میں مقدم ہونے کی وجہ سے یا وجود میں بھی مقدم ہونے کی وجہ سے۔ اس لئے کہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ((اول ما خلق الله روحی)) اور آپ ﷺ کا فرمان ہے: ((کنت نبیاً و آدم بین الروح والجسد))۔

پھر اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا﴾ (الاحزاب: ۷) یعنی عظیم مؤکد صادقین سے ان کے صدق کے بارے میں پوچھا جائے گا اور ظاہر یہ ہے کہ میثاق خاص صدق اور اخلاص کا عہد ہے اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا میثاق وہ بعض کا بعض پر ایمان' تصدیق' نصرت اور معاونت کا مظاہرہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا

﴿مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ (ال عمران : ٨١)

''اور جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے جو کچھ میں نے دیا تم کو کتاب اور علم پر آوے تمہارے پاس رسول تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ فرمایا کہ تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا۔ بولے ہم نے اقرار کیا' فرمایا تو اپنے گواہ رہو میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔''

اور یہ میثاق خاص ہے احتمال ہے کہ یہ عام کے بعد ہو اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس سے پہلے عالم ارواح میں ان کی تعظیم و تکریم کے لئے اور اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: ((**کنت نبیا و آدم بین الروح والجسد**'' اور اس پر یہ قول دلالت کرتا ہے۔

قولہ :کان فی تلك الارواح فارسله الی مریم علیهما السلام۔

یعنی عیسیٰ علیہ السلام عالم ارواح میں تھے' میں نے ان کی روح کو بھیجا' روح مذکر اور مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے یعنی جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ۔

قولہ :فحدث عن اُبّی انه دخل۔

''**حدث**'' مجہول کے صیغہ پر ہے یعنی روایت کیا گیا ''**دخل**'' یعنی روح ان کے جوف میں داخل ہوئی پھر ان کے رحم میں اور روح کی تاویل منفوخ (پھونکی گئی) یا عیسیٰ کے ساتھ ہے ذکر کی گئی ہے ایسے ہی علامہ طیبی رحمہ اللہ نے کہا ہے اور قاموس میں ہے روح ضمہ کے ساتھ وہ ہے جس کے ساتھ نفسوں کی زندگی ہو اور یہ مؤنث ہوتی ہے پس تذکیر کو اصل قرار دیا جیسا کہ لفظ میں اصل ہے۔

قولہ :من فیها:

یعنی ''**من فمها**'' اس کے منہ میں سے ایسے ہی ابہری نے کہا ہے اور یہ اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف: ﴿فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا﴾۔ **فیها** بمعنی **فمها** ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے **فیها** پڑھا ہے یعنی مریم میں اور احتمال ہے کہ اس سے مراد ''**فی فیها**'' ہے یا ''**فی جیب درعها**'' (اس کی قمیص کے گریبان میں) اور دونوں کے درمیان جمع کیا جا سکتا ہے اس طرح کہ اس نفخہ کا بعض ان کی جیب میں اور بعض ان کے سینہ میں داخل ہوا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کی تخصیص اپنے اس فرمان: ''**دخل من فیها**'' کے ساتھ نصاریٰ پر ان کی عقلوں کی خفت کی طرف اشارہ ہے کہ تم اللہ کے سوا کسی دوسرے کو کیسے معبود مانتے ہو جس کا یہ حال ہو۔ ایسے ہی علامہ طیبی نے فرمایا ہے اور اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ﴾ (المائدۃ: ٧٥)

کہا گیا ہے کہ یہ کنایہ ہے: ''**یبولان و یغوطان**'' سے یعنی پیشاب اور پاخانہ بھی کرتے ہیں۔

انسان کی عادت نہیں بدلتی

۱۲۳: وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ بَیْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَتَذَاكَرُ مَایَكُوْنُ اِذْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَكَانِهٖ فَصَدِّقُوْهُ وَاِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَیَّرَ عَنْ خُلُقِهٖ فَلَا تُصَدِّقُوْا بِهٖ فَاِنَّهٗ یَصِیْرُ اِلٰی مَاجُبِلَ عَلَیْهِ. (رَوَاهُ اَحْمَدُ)

أخرجه أحمد في المسند ٦/ ٤٤٣۔

ترجمہ: حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ ہم ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور مستقبل میں پیش آنیوالے حالات کے بارے میں باہم گفتگو کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری گفتگو کو سن کر ارشاد فرمایا کہ جب تم سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو اس کی تصدیق کر دو لیکن جب تم یہ سنو کہ کسی شخص کی فطرت اور عادت بدل گئی ہے تو اس کی تصدیق نہ کرو۔ اس لئے کہ ہر انسان اپنی فطرت اور پیدائش کی طرف جاتا ہے جس پر اس کو پیدا کیا گیا ہے۔

تشریح: **قولہ :نتذاکر:**

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یا ایک دوسرے کے ساتھ آپ کی موجودگی میں اور آپ سن رہے تھے۔

قولہ :ما یکون:

ما موصولہ ہے یعنی جو حوادث پیش آئیں گے کیا وہ ایسی چیز ہے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اس سے فراغت ہو چکی ہے پس یہ حوادث اس انداز میں آئیں گے یا یہ ایسی چیز ہے جو بعد میں بغیر کسی سابق قضاء کے پائی جائے گی۔

قولہ :اذ قال واذا سمعتم بجبل زال عن مکانه...... :

اس کے امکان کی وجہ سے بلکہ اس کے وقوع کی حکایت کی گئی ہے جیسا کہ کہا گیا ہے کہ مغرب کے بعض پہاڑ اپنے محل سے دور مسافت پہ چلے گئے تھے۔

قولہ :واذا سمعتم برجل تغیر عن خلقه فلا تصدقوه:

خلقه لام کے ضمہ اور سکون کے ساتھ ہے یعنی اپنی اصلی عادت سے بالکلیہ "فلا تصدقوا به" یعنی اس کی اس خبر کی اس لئے کہ یہ عادۃً غیر ممکن ہے اسی وجہ سے اللہ پاک نے فرمایا ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ (آل عمران: ۱۳۴)

"جو خرچ کرتے ہیں خوشی میں اور تکلیف میں اور دبا لیتے ہیں غصہ اور معاف کرتے ہیں لوگوں کو اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے نیکی کرنے والوں کو۔"

یہاں "والعادمین له" نہیں کہا۔

قوله :فانه يصير الى ماجبل عليه:

"فانه" کی ضمیر رجل کی طرف راجع ہے اور مراد اس سے جنس ہے۔ پس یہ اس چیز میں جس کا وہ ارادہ کرے کہ اس کو کرے ایسی عادت کی طرف پھر جائے گا جس پر اس کی خلقت ہوئی اور اس کو ڈھالا گیا ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے موافق جس پر قضاء وقدر سبقت کر چکی ہے جس کا تغیر وتبدل غیر ممکن ہے پس عقلمند بیوقوف نہیں ہوسکتا اور سخی بخیل نہیں ہوسکتا' دلیر بزدل نہیں ہوسکتا اور ان کا عکس اور یہ مثال تقریبی ہے اس اعتبار سے کہ عادۃً پہاڑ کا اپنی جگہ سے زائل ہونا ایسا مستبعد ہے کہ جس کے ساتھ محال عقلی لاحق ہے پس اس وقت اس میں نقصان نہیں دے گا' زوال جبل کا امکان اپنی جگہ سے نہ کہ خلق مقدر کا زوال جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے اور اگر آپ کہیں کہ صوفیہ کا مدار تبدیل اخلاق پر ہے تو یہ حدیث کیسے ہے؟ تو میں کہوں گا کہ ہر ایک پیدا کیا گیا ہے اور اس کی طبیعت میں سارے اخلاق ڈالے گئے ہیں اور وہ اپنے اصل کے اعتبار سے اس کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ وہ اچھے ہوں اور یہ کہ وہ مذموم ہوں اور ان کی تعریف کی جاتی ہے جب افراط وتفریط کے درمیان ہوں اور مذمومہ اس کی ضد ہے۔ مثلاً شجاعت کے بارے جو تہور اور بزدلی کے درمیان محمود ہے اور غالب لوگوں پر عدم اعتدال ہے عادۃ۔ پس صوفیاء مجاہدات اور ریاضتیں کرتے ہیں' اخلاق ذمیمہ میں تا کہ ان کو عادت کے مقتضی سے بدل دیں اور ان کو استقامت اور عبادت کے طریقوں پر اعتدال پر لے آئیں اور اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ارادہ' عادت ترک کرنے کا نام ہے اور ان میں سے ایک بغض ہے اور اس کی اعتدال والی محمود حالت ہے کہ وہ اپنے محل میں ہو جو اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے' اس محدود مقدار میں جو شریعت میں ہے اور اسی طرح اس کی ضد محبت ہے' یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((من احب الله وابغض لله فقد استكمل ايمانه)) اور رہا صفت بخل کا بالکلیہ ازالہ تو یہ ناممکن ہے مگر اللہ کی جانب سے جذب کے ساتھ۔ اسی لئے اللہ پاک فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّیْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا﴾

(الاسرا: ۱۰۰)

"کہہ دو کہ اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے تمہارے ہاتھ میں ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے خوف سے (ان کو) بند رکھتے اور انسان دل کا بہت تنگ ہے۔"

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لو كان لابن آدم واد بان من ذهب لا بتغى ثالثًا ولا يملأ جوف ابن آدم الا التراب......)) "اور اللہ پاک توبہ قبول کرتا ہے جو توبہ کرے بلکہ کہا گیا ہے کہ اگر انسان سے بری صفات بالکلیہ زائل ہو جائیں تو وہ ناقص ہو جائے۔ اس لئے کہ اس کا کمال یہ ہے کہ اس کی صفاتِ حمیدہ غالب ہوں اسی وجہ سے نوع انسانی کو نوع ملائکہ پر فضیلت دی گئی ہے' واللہ اعلم اور حاصل یہ ہے کہ اصلی ذاتی تبدیلی ناممکن ہے' جیسا کہ اس طرف حدیث نبوی نے اشارہ فرمایا ہے اور رہی وصفی تبدیلی تو وہ ممکن ہے بلکہ بندہ اس کا مامور ہے اور اس کو تہذیب نفس اور تحسین اخلاق کہتے ہیں' اللہ پاک کا فرمان ہے: ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا﴾ (الشمس : ۹) "تحقیق مراد کو پہنچا جس نے اس کو سنوار لیا۔" اور حدیث میں ہے: ((حسنوا اخلاقكم)) اور دعاء میں ہے: "اللّٰهم كما حسنت خلقي فحسن خلقي" اور "اللهم اهدني لصالح الاعمال والاخلاق لا يهدى لصالحها الا انت" اور جو استفادہ کرنا چاہے تو اس پر لازم ہے احیاء العلوم کا مطالعہ اور ممکن ہے کہ کہا

جائے کہ خلق مبرم تبدیل نہیں ہوتا اور خلق معلق تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ ہمارے نزدیک مبہم ہے اللہ کے ہاں معلوم ہے۔ پس ہمارے اوپر مجاہدہ ہے پس ہر ایک کے لئے آسان ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تو بہت سے ریاضت کرنے والوں کو دیکھے گا کہ ان کے اخلاق زمانہ طویل میں بھی اچھے نہیں ہوئے اور بعض کے اخلاق ذمیمہ مدت قلیلہ میں اخلاق حمیدیہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں یا نفی محمول ہے عادت پر اسباب عادیہ کے حصول کے بغیر اور خلاف عادت امور کے ظہور کے بغیر اور وہ کبھی جذب الٰہی کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی نفسانی ریاضتوں سے ہوتا ہے اور کبھی علوم اور معارف ربانیہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اور حدیث میں اشارہ ہے اس طرف کہ مخلوق سے ان افعال کے وقوع کے بعد مخلوق کے لئے نظر کرنے میں اس کا استحضار مناسب ہے، یہاں تک کہ ان کے بہت سے احوال میں ان کے غدر قائم ہو جائیں جن کے قائل کرنے پر کوئی مانع مرتب نہیں تھا پس ہر ایک اس تیار میں چلتا ہے جو اس کے لئے مقدر کیا گیا ہے اس سے ایک ذرہ برابر بھی اپنی حرکات و سکنات میں نکلتا نہیں۔

تقدیر آدم کی تخلیق سے پہلے ہی لکھ دی گئی

۱۲۴: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ لَا يَزَالُ يُصِيْبُكَ فِىْ كُلِّ عَامٍ وَجَعٌ مِنَ الشَّاةِ الْمَسْمُوْمَةِ الَّتِىْ اَكَلْتَ قَالَ مَآ اَصَابَنِىْ شَىْءٌ مِنْهَا اِلَّا وَهُوَ مَكْتُوْبٌ عَلَىَّ وَاٰدَمُ فِىْ طِيْنَتِهٖ۔ (رواه ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجة في السنن ۲/۱۱۷٤ حديث رقم ۳۵٤٦۔

ترجمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ نے جو زہر آلود بکری کھائی تھی ہر سال اس کی وجہ سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے آپ نے فرمایا جو تکلیف یا بیماری مجھ کو پہنچتی ہے وہ میرے لئے اس وقت لکھی گئی تھی جب کہ آدم علیہ السلام مٹی کے اندر تھے یعنی میری تقدیر میں اسی طرح لکھا تھا۔ اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

ام سلمہ۔ یہ ام سلمہ ام المومنین ہند بنت ابی امیہ ہیں۔ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ابو سلمہ کے نکاح میں تھیں جب ابو سلمہ ۴ھ یا ۳ھ میں انتقال کر گئے تو انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی سال جس میں ابو سلمہ کا انتقال ہوا تھا جب کہ ماہ شوال کی کچھ راتیں باقی رہ گئی تھیں نکاح کر لیا۔ ۵۹ھ میں ان کا انتقال ہوا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئیں۔ اس وقت ان کی عمر چوراسی برس کی تھی، ان سے ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور زینب ان کی بیٹی اور ان کے بیٹے عمر اور ابن المسیب اور صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین کی ایک بڑی جماعت روایت کرتی ہے۔

تشریح: قولہ: لا یزال یصیبک فی کل عام وجع:

"لا تزال" خطاب کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ غائب کے صیغہ کے ساتھ ہے "یصیبك" کا مطلب آپ کے لئے حاصل ہوتا ہے ہر سال "وجع" جیم کے فتحہ کے ساتھ ہے یعنی درد۔

قوله :من الشاة المسمومة:

یعنی بکر کے اثر کی وجہ سے "مسمومة" یعنی اس زہر سے جو یہودیہ نے آپ ﷺ کے لئے تیار ہونے والے کھانے میں ڈال دی تھی تاکہ اسی وقت اور اسی گھڑی قتل ہو جائیں۔ "التی اکلت" آپ نے جو کھائی تھی یعنی خیبر میں۔

قوله :ما اصابنی شی منها الا وهو مکتوب علی و آدم فی طینته:

یعنی اس بکری یا اس کھانے میں سے جو "الا وهو" یعنی درد میں سے وہ چیز میرے اوپر لکھی ہوئی تھی اس حال میں کہ آدم علیہ السلام اپنی مٹی میں تھے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تقدیر سابق کی مثال ہے اور تعیین ہے اس لئے کہ آدم علیہ السلام کا مٹی میں ہونا بھی پہلے مقدر تھا جیسا کہ کہا جاتا ہے: مالدح کوکب وما اقام ثبیر فی التابید وان لم یکن مؤبد۔ نہ ستارہ چمکا اور نہ ثبیر کھڑا ہوا۔ تابید میں اگر چہ وہ مؤبد نہ ہوا اور اس کی تائید کرتا ہے اللہ پاک کے اس ارشاد:

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ﴾

(الحدید : ۲۲)

"کوئی آفت نہیں پڑتی ملک میں اور نہ تمہاری جانوں میں جو لکھی نہ ہو ایک کتاب میں پہلے اس سے کہ پیدا کریں ہم اس کو دنیا میں بے شک یہ اللہ پر آسان ہے"

اور بکری کا قصہ معجزات کے باب میں ان شاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔

عذابِ قبر کے ثبوت کا بیان

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اہلسنّت کے نزدیک عذابِ قبر ثابت ہے اور اس بارے میں کتاب وسنت سے دلائل واضح ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وہ آگ پر پیش کئے جاتے ہیں‘ صبح وشام اور جس دن قیامت قائم ہوگی حکم ہوگا آلِ فرعون کو سخت عذاب میں داخل کرو اور رہی احادیث تو ان کی کثرت کا شمار نہیں ہے اور عقل میں کوئی مانع بھی نہیں ہے کہ اللہ پاک جسم کے کسی جزء یا پورے جسم میں حیات کو لوٹائیں‘ اصحاب کے درمیان اختلاف کے ساتھ یہ بات بہر طور طے ہے کہ حیات لوٹائی جاتی ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک جسم کے جزء میں اور بعض کے نزدیک کُل میں حیات کو لوٹایا جاتا ہے) پس اس کو ثواب دیں یا عذاب دیں اور اس سے میت کے اجزاء کا متفرق ہونا مانع نہیں ہے جیسا کہ عادۃً اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے یا یہ کہ درندے‘ پرندے اور دریا کی مچھلیاں اس کو کھا جائیں (یعنی یہ سب چیزیں مانع نہیں ہیں) اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کی قدرت ان سب کو شامل ہے پس اگر اعتراض کیا جائے کہ ہم میت کو اس کے حال پر دیکھتے ہیں پس اس سے کیسے سوال ہوتا ہے اور بٹھا دیا جاتا ہے اور مارا جاتا ہے اور اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا پس جواب یہ ہے کہ ایسا ممکن ہے اور مشاہدہ میں اس کی نظیر موجود ہے اور وہ سویا ہوا آدمی ہے پس وہ لذت اور درد پاتا ہے جس کو وہ محسوس کرتا ہے اور ہم محسوس نہیں کرتے اور اسی طرح بیدار لذت اور درد پاتا ہے جس کو وہ سنتا ہے اور غور وفکر کرتا ہے اور اس کے ساتھ بیٹھا ہوا اس کا مشاہدہ نہیں کرتا اور اسی طرح جبرئیل امین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے اور وہ قرآنِ مجید کی وحی لاتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ان کو نہیں دیکھتے تھے۔

الفصل الاول:

عذابِ قبر قرآن سے ثابت ہے

۱۲۵ : عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُسْلِمُ اِذَا سُئِلَ فِي الْقَبْرِ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ فَذٰلِكَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَفِيْ رِوَايَةٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ

اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ نَزَلَتْ فِیْ عَذَابِ الْقَبْرِ یُقَالُ لَهٗ مَنْ رَّبُّكَ فَیَقُوْلُ رَبِّیَ اللّٰهُ وَنَبِیِّیْ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۳/۲۳۱حدیث رقم ۱۳۶۹۔ومسلم فی الصحیح ٤/۲۲۰۱حدیث ۷۳۔ وأبوداوٗد بنحوه ٥/۱۱۲حدیث رقم ٤۷٥۰۔والنسائی ٤/۱۰۱حدیث رقم ۲۰٥۷۔والترمذی ٥/۲۷۶حدیث رقم ۳۱۲۰۔وابن ماجة ۲/۱٤۲۷حدیث رقم ٤۲۶۹۔

ترجمہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس وقت قبر میں مسلمان سے سوال کیا جاتا ہے۔تو وہ شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا: ﴿یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ......﴾ کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو قائم اور ثابت رکھتا ہے جو ایمان لاتے ہیں۔مضبوط طریقہ پر ثابت رکھنا دنیا کی زندگی اور آخرت میں اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ آیت: ﴿یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ......﴾ عذاب قبر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔جب قبر میں مردہ سے سوال کیا جاتا ہے کہ تیرا رب کون ہے؟ تو وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور میرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔(بخاری ومسلم)

راویٔ حدیث:

براء بن عازب۔ یہ براء بن عازب ابو عمارہ انصاری حارثی ہیں۔یہ اور ان کے والد دونوں صحابی ہیں کوفہ میں آئے اور ۲۴ھ میں "رے" فتح کیا اور جنگ جمل وصفین ونہرواں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے اور مصعب بن الزبیر کے زمانہ میں کوفہ میں انتقال کیا۔ان سے خلق کثیر نے روایت کی ہے۔عمارہ میں عین مہملہ مضموم ہے اور میم پر تشدید نہیں ہے۔

"عازب" میں عین مہملہ ہے' زاء پر کسرہ ہے' اور اس کے بعد بائے موحدہ ہے"براء" میں راء مخففہ ہے' الف ممدودہ ہے' اور کہا گیا ہے کہ قصر کے ساتھ ہے (کرمانی)۔

تشریح: قوله :المسلم اذا سئل فی القبر:

اور اسی (المسلم) کے معنی میں ہے مؤمن اور اس سے مراد جنس ہے۔پس یہ مذکر اور مؤنث دونوں کو شامل ہے یا مؤنث کا حکم بالتبع پہچانا جاتا ہے اور قبر کی تخصیص عادۃً ہے یا ہر وہ جگہ جہاں انسان کا ٹھکانہ ہوگا (یعنی مرنے کے بعد) وہ اس کی قبر ہے اور یہاں مسئول عنہ محذوف ہے یعنی سوال کیا جائے گا' اس کے ربّ کے بارے میں' اس کے دین کے بارے میں اور اس کے نبی کے بارے میں جیسا کہ دوسری احادیث سے ثابت ہے۔

قوله :فذلك قوله ...... بالقول الثابت:

یعنی اس حکم کا مصداق اور طیبی نے فرمایا ہے کہ یہ اشارہ ہے اس کے جواب کی سرعت کی طرف جو وہ دے گا۔ اذا کو "یشهد" کے لئے ظرف قرار دیا ہے اور فاء سببیت کے لئے ہے اور اس میں اشکال ہے اس لئے کہ ظاہر یہ ہے کہ آیت سبب ہے اس کے لئے جو حدیث میں ہے نہ کہ اس کا عکس۔پس بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جاتا ہے کہ فاء تفریعیہ ہے یا تفصیلیہ۔ "قوله" سے مراد

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جیسا کہ ایک نسخہ میں ہے (یعنی قولہ تعالیٰ ہے) اور وہ قول یہ ہے: ﴿یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ۚ وَیُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ ۙ وَیَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ﴾ (ابراھیم: ۲۷) ''اللہ پاک مضبوط رکھتا ہے ایمان والوں کو مضبوط بات کے ساتھ دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی'' ''بالقول الثابت'' سے مراد کلمہ شہادت ہے جو جواب کی توفیق کے ساتھ دل میں پیوست ہوگا۔ علامہ طیبی کہتے ہیں کہ یہاں اشارہ ہے کلمہ طیبہ کی طرف اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے لیا گیا ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ﴾ (ابراھیم: ۲٤) ''کیا آپ کو معلوم نہیں اللہ تعالیٰ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ کی (توحید وایمان کی) وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہے اور اس کی شاخیں آسمان کی طرف ہیں۔'' اور کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت ہے جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے پاک درخت کی طرح' جس کی جڑ گڑی ہوئی ہو اور اس کا تنا آسمان کی طرف ہو اور یہ کھجور کا درخت ہے جیسا کہ صحیح روایت میں ہے۔ کہا گیا ہے کہ باء سببت کے لئے ہے اور یہ متعلق ہے ''یثبت'' کے۔

قولہ: فی الحیٰوۃ الدنیا وفی الاٰخرۃ:

یعنی وہ اس سے ہٹیں گے نہیں جب آزمائے جائیں گے اور شبہات کے ذریعہ شک میں نہیں پڑیں گے اگرچہ وہ آگ میں ڈالے جائیں اور آخرت سے مراد برزخ وغیرہ میں اور بعض نے کہا کہ قبر میں سوال کے وقت اور یہی صحیح ہے جیسا کہ اس کی تصریح آئی ہے اور علامہ طیبی نے کہا ہے کہ حرف جار کا اعادہ فرمایا ہے تا کہ ثابت قدمی میں مؤمن کے استقلال پر دلالت کرے۔

قولہ: وفی روایۃ ...... نزلت فی عذاب القبر:

یہ مبتداء ہے یعنی یہ آیت ﴿یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ۚ وَیُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (ابراھیم: ۲۷) ''اللہ پاک مضبوط رکھتا ہے ایمان والوں کو مضبوط بات کے ساتھ دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی......'' (''نزلت فی عذاب القبر'' اس کی خبر ہے) ﴿وَیُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ ۙ وَیَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ﴾ (ابراھیم: ۲۷) ''اور اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے ظالموں کو اور اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے'' ظالموں سے مراد کافر ہیں' عذابِ قبر میں نازل ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کے اثبات میں نازل ہوئی اور اگر یہ کہا جائے کہ آیت میں مؤمن کے عذاب پر دلیل نہیں ہے تو پھر آپ کے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ یہ عذابِ قبر کے بارے میں نازل ہوئی۔ میں کہوں گا کہ شاید قبر میں بندہ کے احوال کو عذابِ قبر سے موسوم فرمایا یا کافر کے عذاب کو مؤمن کے عذاب پر غالب کرتے ہوئے ڈرانے کے طور پر اور اس لئے بھی کہ قبر گھبراہٹ اور وحشت کا مقام ہے اور یہ کہ فرشتوں کی ملاقات سے مؤمن بھی گھبرا جاتا ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ مراد عذابِ قبر کو مجملاً ثابت کرنا ہے۔ اس کی غایت یہ ہے کہ مؤمن فاسق کے عذاب سے سکوت اختیار کیا گیا ہے جیسا کہ قرآنِ حکیم کی عادت ہے کہ فریقین (یعنی کافر اور مسلمان) کے حکم پر اقتصار کرتا ہے جیسا کہ اعمالنامہ دائیں اور بائیں ہاتھ میں دینے کے حوالہ سے اور میزان کے بھاری اور ہلکا ہونے کے حوالہ سے اور ان جیسی مثالوں میں وارد ہوا ہے اور دلیل کی اتنی ہی مقدار مخالف پر حجت ہے اس لئے کہ فصل کا کوئی قائل نہیں۔

قوله :يقال له ...... نبي محمد:

یعنی صاحب قبر سے سوال کیا جائے گا تیرا رب کون ہے؟ پس اگر وہ مسلمان ہو تو اللہ تعالیٰ اس سے خوف زائل کر دے گا اور اس کی زبان فرشتوں کے جواب میں جاری کر دے گا۔ پس وہ کہے گا میرا رب اللہ ہے اور میرے نبی محمد ہیں۔ جواب کے اندر زیادتی بطور فخر کے کرے گا یا سوال میں "من نبيك" مقدر ہے اور یا اس لئے کہ توحید کے بارے میں سوال اس کو لازم ہے کیونکہ اس کے بغیر توحید کا اعتبار نہیں اور "مصابیح" میں یہ زیادتی ہے۔ "والاسلام ديني" اور اسلام میرا دین ہے۔ پس اس وقت اس کو قبر میں انعامات دیئے جائیں گے اور رہا کافر تو اس پر خوف' حیرت' دہشت اور وحشت غالب ہوگی اور وہ ان کے جواب پر قادر نہیں ہوگا۔ پس اس وقت اس کو اس پر عذاب دیا جائے گا۔ کہا گیا ہے کہ کافر کے حالات کا ذکر نہیں اس لئے کہ ضد اپنی ضد کے ذکر کے وقت دل میں زیادہ جلدی آنے والی ہوتی ہے۔ پس اس کے ذریعہ اس سے اکتفا کیا گیا۔

قبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سوال کیا جائے گا

۱۲۶ :وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَاوُضِعَ فِيْ قَبْرِهٖ وَتَوَلّٰى عَنْهُ اَصْحَابُهٗ وَاِنَّهٗ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ اَتَاهُ مَلَكَانِ فَيُقْعِدَ انِهٖ فَيَقُوْلَانِ مَاكُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ؟ لِمُحَمَّدٍ فَاَمَّا الْمُؤْمِنُ فَيَقُوْلُ اَشْهَدُ اَنَّهٗ عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ فَيُقَالُ لَهٗ اُنْظُرْاِلٰى مَقْعَدِكَ مِنَ النَّارِ قَدْ اَبْدَلَكَ اللّٰهُ بِهٖ مَقْعَدًا مِنَ الْجَنَّةِ فَيَرَاهُمَا جَمِيْعًا وَاَمَّا الْمُنَافِقُ وَالْكَافِرُ فَيُقَالُ لَهٗ مَاكُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ فَيَقُوْلُ لَآ اَدْرِيْ كُنْتُ اَقُوْلُ مَا يَقُوْلُ النَّاسُ فَيُقَالُ لَهٗ لَادَرَيْتَ وَلَا تَلَيْتَ وَيُضْرَبُ بِمَطَارِقَ مِنْ حَدِيْدٍ ضَرْبَةً فَيَصِيْحُ صَيْحَةً يَسْمَعُهَا مَنْ يَلِيْهِ غَيْرُالثَّقَلَيْنِ . (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ ولفظه للبخاری)

أخرجه البخاری فی الصحيحه۲۰۵/۳حديث رقم ۱۳۳۸۔ومسلم فی الصحيح ۲۲۰۱/۴حديث (۷۰۔۲۸۷۰) وأخرجه النسائی فی السنن ۹۷/۴حديث رقم ۲۰۵۱۔ وأخرجه أبو داؤدفی سننه ۱۱۴/۵ حديث رقم ۴۷۵۲۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب بندہ قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے رشتہ دار اور احباب واپس آ جاتے ہیں۔ تو مردہ ان کے جوتوں کی آواز کو سنتا ہے اس کے پاس قبر میں دو فرشتے آتے ہیں اور اس کو بٹھا کر پوچھتے ہیں کہ تم اس شخص یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا کہتے ہو۔ اس کے جواب میں مؤمن بندہ کہتا ہے کہ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں پھر اس آدمی سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنا ٹھکانہ جہنم میں دیکھو۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے بدل دیا ہے اور اس کے بدلہ میں تمہیں جنت میں جگہ دیدی ہے۔ چنانچہ وہ مردہ اپنے دونوں ٹھکانے جنت اور جہنم میں دیکھتا ہے اور جو مردہ منافق یا کافر ہو اس سے بھی یہی سوال کیا جاتا ہے کہ اس شخص یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تو کیا کہتا ہے؟ وہ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ جو کچھ لوگ کہتے تھے وہی کچھ میں کہتا تھا۔ پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ نہ تو نے عقل سے سمجھا اور نہ تو نے قرآن پڑھا۔

اس کے بعد اس کو لوہے کے گرزوں سے مارا جاتا ہے کہ اس کی چیخ و پکار کو سوائے جنوں اور انسانوں کے قرب و جوار کی تمام مخلوق سنتی ہے بخاری و مسلم۔ اور الفاظ اس حدیث کے بخاری کے ہیں۔

تشریح: قوله ان العبد اذا وضع ...... و تولى عنه اصحابه:

"عبد" سے مراد جنس ہے (پس مذکر و مؤنث دونوں کو شامل ہے) "اذا وضع" یہ شرط ہے اور "و اتاه" جواب ہے اور پورا جملہ "ان" کی خبر ہے۔ "و تولى" یعنی پیٹھ پھیر لیتے ہیں اور اعراض کر لیتے ہیں۔ اس سے یعنی اس کی قبر سے اور اعتبار اکثر کا ہوتا ہے یا اس کے رکھنے سے مطلب یہ ہے کہ اس کو دفن کر لیں گے اور ان کو اصحاب سے تعبیر کیا غالب کی طرف نظر کرتے ہوئے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے اس لئے کہ آگے آتا ہے کہ ان کے قدموں کی آہٹ سے سنے گا۔ "انه" یہ کسرہ کے ساتھ ہے اور یا یہ حال ہے واؤ کے حذف کے ساتھ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿ويوم القيامة ...... مسودة﴾ [الزمر: ٦٠] "اور قیامت کے دن تو دیکھے گا ظالموں کو اس حال میں کہ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے' کیا جہنم کافروں کا ٹھکانہ نہیں ہے" کی دو توجیہات میں سے ایک توجیہ میں ہے کہ رؤیت بمعنی ابصار کے ہے اور یہ عرب کے اس قول کی طرح ہے: "فوه الى فى" "اس کا منہ میرے منہ کی طرف تھا (یعنی بات کرتے وقت)" اور یا یہ جواب شرط ہے حذف فاء کے ساتھ تو اس صورت میں "اتاه"، "يسمع" کے فاعل سے حال ہوگا اور قد مقدر ہوگا اور یہ بھی احتمال ہے کہ اذا ظرف محض ہو اور "انه" تاکید ہو "ان العبد" والے قول کے لئے۔

قوله :يسمع قرع نعالهم:

"يسمع" لام کے فتحہ کے ساتھ ہے' تاکید کے لئے ہے "قرع نعالهم" نون کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یہ نعل کی جمع ہے۔ یعنی ان کے جوتوں کی آواز کو سنتا اگر وہ زندہ ہوتا اس لئے کہ جسم فرشتوں کے آنے سے قبل اور اس کو بٹھانے سے قبل مردہ ہوتا ہے کوئی چیز محسوس نہیں کرتا اور یہ قول ضعیف ہے اس لئے کہ احادیث سے ثابت ہو چکا ہے کہ میت اپنے کفن کے بارے میں جانتی ہے اور اس کو جو اس کی نمازِ جنازہ پڑھتا ہے اور جو اس کو اٹھاتا ہے اور جو اس کو دفن کرتا ہے ان سب کو جانتی ہے۔ ابن الملک نے کہا ہے یعنی اس کے قدم رکھنے کی آواز کو سنتا ہے اس میں قبر کے اندر میت کی حیات پر دلالت ہے' اس لئے کہ حیات کے بغیر احساس ممتنع ہے' عادۃ اور اس میں اختلاف ہے۔ پس بعض نے کہا ہے کہ یہ حیات روح کو لوٹانے کے ساتھ ہوگی اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں توقف فرمایا ہے اور شاید امام کا توقف اس وجہ سے ہو کہ اعادہ روح بدن کے جزء کے ساتھ تعلق رکھے گا یا کل کے ساتھ۔ شرح السنۃ میں کہا ہے کہ قبروں پر جوتے کے ساتھ چلنا جائز ہے۔

قوله :اتاه ملكان فيقعدانه:

یعنی زمانہ طویل گزرنے سے قبل اس کے پاس دو فرشتے آئے ہیں "يقعدانه" یہ اقعاد سے ہے اور بعض روایات میں "فيجلسانه" ہے جو اجلاس سے ہے اور یہ زیادہ بہتر ہے' اس لئے کہ قعود فصحاء کے ہاں قیام کے مقابلہ میں ہے اور جلوس "اضطجاع" اور "استلقا" کے مقابلہ میں ہے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے جو حکایت کیا گیا ہے کہ نضر بن شمیل نے مامون کے سامنے مثال پیش کی۔ پس اس نے کہا: "اجلس (بیٹھ جا)"۔ اس نے کہا: اے امیر المؤمنین! میں لیٹا ہوا نہیں تھا کہ

بیٹھوں۔ مامون نے کہا: میں کیسے کہتا اور اس نے کہا: "اقعد" کہتے۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ اقعاد سے مراد جگانا اور تنبیہ کرنا ہو اور وہ دونوں اس سے سوال کریں روح کے اعادہ کے بعد اور ممکن ہے کہ گھبراہٹ' خوف' ہیبت' دہشت اور حیرت سے کھڑا ہو جائے۔ پس وہ دونوں فرشتے اس کو بٹھائیں۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ شاید جس نے "یقعدانه" روایت کیا ہو اس نے یہ سمجھا ہو کہ یہ دونوں لفظ ایک معنی میں ہیں اور اس نے معنی کی باریکی کو فوت کر دیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سلف کی ایک بڑی جماعت نے روایت بالمعنی سے منع فرمایا ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ "قعود" کا استعمال "قیام" کے ساتھ اور "جلوس" کا "اضطجاع" کے ساتھ لفظی مناسبت سے ہے اور ہم اس کے موجب کا قول اس وقت کریں گے جب دونوں مذکور ہوں اور رہا یہ کہ جب صرف ایک مذکور ہو تو ہم نہیں کہتے کہ یہ ایسا ہے کیا آپ حدیث جبرئیل علیہ السلام کی طرف نہیں دیکھتے کہ اس میں "حتی جلس الی النبی ﷺ" ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قاموس میں تصریح ہے کہ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اس طرح کہا ہے: "القعود الجلوس......" یعنی قعود جلوس کو کہتے ہیں یا قعود قیام میں بیٹھنے کو کہتے ہیں اور جلوس لیٹنے سے اور سجدے سے بیٹھنے کو کہتے ہیں اور لغت ثانیہ کی تائید افعالِ نماز میں فقہاء کے قعدۂ اولیٰ اور قعدۂ اخری کے استعمال سے ہوتی ہے' واللہ اعلم۔

قولہ :فیقولان ...... لمحمد ﷺ :

یعنی وہ دونوں فرشتے اس میت سے کہتے ہیں کہ اس آدمی کے بارے میں یعنی اس کی شان میں کیا کہتا ہے اور لام عہد ذہنی کا ہے اور اشارہ میں حاضر معنوی کو مبالغۃً حاضر صوری کے درجہ میں رکھنے کی طرف اشارہ ہے۔ "

"لمحمد" کا لفظ راوی کی جانب سے "لرجل" کا بیان ہے۔ یہی طیبی اور مصابیح کے شراح نے کہا ہے اور سید جمال الدین نے کہا ہے کہ اولیٰ یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ "لمحمد" کا لفظ منجملہ قول رسول اللہ ﷺ سے ہے اور نبی اور رسول کے لفظ کو چھوڑ کر لفظ محمد کے ساتھ تعبیر اس کی تائید کرتی ہے۔ علامہ طیبی نے کہا ہے کہ "رجل" کے لفظ کے ساتھ پکارنا فرشتے کے کلام سے ہے۔ پس اس نے اس عبارت کے ساتھ تعبیر کیا جس میں تعظیم نہیں ہے۔ تاکہ مسئول کا امتحان ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ثابت قدم رکھے گا اور احمد اور طبرانی کی روایت میں ہے کہ (فرشتے سوال کریں گے) تو اس آدمی کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ تو وہ کہے گا کون آدمی؟ تو فرشتے کہیں گے محمد! پس وہ کہے گا......ابن حجر نے کہا ہے کہ اشارہ سے یہ لازم نہیں آتا ہے جو کہا گیا ہے کہ میت اور نبی اکرم ﷺ کے درمیان پردہ اٹھ جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ آپ کو دیکھے گی اور آپ ﷺ کے بارے میں سوال کیا جائے گا اس لئے کہ اس جیسی چیزیں احتمال سے ثابت نہیں ہوتیں۔ علاوہ ازیں یہ امتحان کا مقام ہے اور آنحضرت ﷺ کی عدم رویت امتحان میں زیادہ قوی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کو صحیح ماننے کی تقدیر پر یہ احتمال ہے کہ یہ بعض کے لئے مفید ہو اور بعض کے لئے مفید نہ ہو اور زیادہ ظاہر ہے کہ یہ مختص ہو اس آدمی کے لئے جس نے نبی اکرم ﷺ کو آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں پایا ہو اور آپ ﷺ کے دیدار سے مشرف ہوا ہو۔

قولہ :اما المؤمن فیقول ...... فیراهما جمیعًا۔

رہا مؤمن پس وہ ان کے جواب میں کہے گا توحید کا اعتراف کرنے کے ساتھ جیسا کہ گزر چکا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ

وہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں نہ کہ ایسے جیسے نصاریٰ نے اپنے نبی کی الوہیت کا قول کیا ہے اور نہ ہی ایسے جیسا کہ گمراہ فرقوں نے کہا کہ وہ اللہ کے رسول نہیں ہیں۔ پس اس سے کہا جائے گا اور ظاہر یہ ہے کہ یہ ان کی زبان پر ہوگا اس کی مسرت کے لئے جلدی کرتے ہوئے اور اس کی عظیم نعمتوں کی خوشخبری دیتے ہوئے کہ جہنم میں اپنے ٹھکانے کی طرف دیکھ یعنی اگر تو مؤمن نہ ہوتا اور فرشتوں کا جواب نہ دیتا (تو یہ تیرا ٹھکانہ ہوتا) اللہ تعالیٰ نے بدل دیا تیرے لئے تیرے اس ٹھکانے کے ساتھ جنت کا ٹھکانہ یعنی تیرے ایمان کی وجہ سے اور قعود یہاں بھی عام معنی میں استعمال ہوا ہے۔ پس وہ ان دونوں ٹھکانوں کو اکٹھا دیکھے گا تا کہ اس کی خوشی بڑھ جائے۔

قوله :اما المنافق والكافر فيقال ...... لا تليت ولا دريت:

تخصیص کے بعد تعمیم ہے۔ پس اس سے کہا جائے گا تو اس آدمی کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ پس وہ کہے گا میں نہیں جانتا یعنی اس کی حقیقت نہیں جانتا کہ وہ نبی ہیں یا نہیں؟ میں دنیا میں وہ کہتا تھا جو لوگ کہتے تھے یعنی مؤمنین اور یہ منافق کا قول ہوگا اس لئے کہ منافق دنیا میں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتا ہے تقیہ کرتے ہوئے نہ کہ اعتقاداً اور رہا کافر تو وہ قبر میں کچھ بھی نہیں کہے گا یا صرف "لا ادری" کہے گا۔ اس لئے کہ اس نے دنیا میں محمد رسول اللہ ﷺ نہیں کہا تھا اور یہ بھی احتمال ہے کہ کافر بھی اپنے آپ سے عذاب قبر کو دور کرنے کے لئے یہی کہے گا اور ابن حجر نے فرمایا ہے اگر وہ لوگوں سے مراد مسلمان لے تو یہ اس کی جانب سے جھوٹ ہوگا۔ یہاں تک کہ منافق کی جانب سے بھی اس لئے کہ مراد صرف زبان کا قول نہیں ہے بلکہ قلب کا اعتقاد ہے اور اگر اس سے مراد اپنے جیسے لوگ ہوں تو یہ جواب اس کے لئے نافع نہیں ہوگا اور دوسری بات زیادہ ظاہر ہے اور وہ یہ کہ "الناس" سے مراد کفار ہوں اور مراد بیانِ واقع ہے نہ کہ جواب نافع اور اس تقدیر پر کہ "الناس" سے مراد مسلمان ہوں تو بھی ان کے جھوٹ میں کوئی مانع نہیں ہے' اس لئے کہ یہ ان کی عادت ہے اور تحقیق اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی ہے' اپنے اس فرمان کے ذریعہ: ﴿ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ﴾ (المجادلة: ١٨) "جس دن اللہ پاک ان سب کو جمع کرے گا پس وہ قسمیں کھائیں گے اس کے سامنے جیسا کہ قسمیں کھاتے ہیں تمہارے سامنے اور گمان کریں گے کہ وہ کسی چیز پر ہیں۔ خبردار! یہ لوگ جھوٹے ہیں۔" یعنی اس قول میں کہ "ہمارے ربّ اللہ کی قسم! ہم شرک نہیں کرتے تھے" پس اس سے کہا جائے گا ایک نسخہ میں لہٗ بھی ہے تو نے نہ جانا اس کو جو حق اور درست ہے اور نہ تو نے نجات پانے والوں کی اتباع کی یعنی تیری جانب سے نہ تو تحقیق اور تسدید واقع ہوئی اور نہ تیری جانب سے متابعت اور تقلید پائی گئی۔

اور یہ بعید ہے جو سید جمال الدین نے کہا ہے یعنی تو نے تلاوت نہیں کی۔ پس اس کی اصل تلوت تھی واؤ کو یا سے تبدیل کیا گیا۔ "دریت" کے ساتھ جوڑ ملانے کے لئے۔ یعنی تو نے نظر اور استدلالِ عقلی کے ذریعہ بھی معلوم نہ کیا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کو بھی نہ پڑھا تا کہ تو جان لیتا یعنی دلیل نقلی کے ذریعہ اور اس کی تائید نبی اکرم ﷺ کے اس قول سے ہوتی ہے جو فصل ثالث میں ہے کہ مؤمن کہے گا کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ پس فرشتے اس سے کہیں گے تجھے کیا معلوم؟ پس وہ کہے گا کہ میں نے اللہ کی کتاب کو پڑھا ہے۔ پس اس پر ایمان لایا ہوں اور اس کی تصدیق کی آہ۔ اسی طرح "ازھار" میں ہے

اور کہا گیا ہے کہ "لا تلیت" کا مطلب ہے تو نے علماء کی تقلید نہیں کی' اتباع کے ساتھ اور ابن الملک نے کہا کہ اس کا قول "ولا تلیت' تلا یتلو" سے ہے یعنی پڑھنا۔ یعنی نہ تو کتاب کو پڑھے۔ اس پر ہمیشہ کی جہالت کی بددعا کرتے ہوئے یا یہ اخبار ہے اور کہا گیا ہے کہ "ولا تلیت" والی روایت خطاء ہے اور صحیح "ولا اتلیت" ہے۔ یہ اتلاہ سے ہے اس وقت بولتے ہیں جب کوئی اس کی اتباع کرے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ نہ تو تو نے نبوت کی حقیقت کو نظر اور استدلال کے ذریعہ جانا اور نہ علماء کی تقلید کے ذریعہ پس یہ اخبار ہوگا۔ اھ۔ اور قاموس میں ہے کہ "تلوته دعوته" کی طرح ہے اور "رميته' تبعته" کی طرح ہے اور مراد قرآن یا ہر وہ کلام ہے جس کو تو پڑھے یا اس کی اتباع کرے اور اس کے پیچھے چلے۔ پس اس سے بعض کا تکلف اور بعض کی خطاء اس مقام پر ظاہر ہوئی۔ واللہ اعلم پھر ازھار میں ذکر ہے کہ فرشتے کیسے تمام مکلفین سے کلام کریں گے اور کیسے ان سے سوال کریں گے۔ ایک ہی وقت میں آفاق واطراف میں ان کی کثرت کے ہوئے ہوئے اور مشرق ومغرب کی مسافت کی دوری کے ساتھ اور ایک ہی آدمی سے دو فرشتوں کے سوال کا کیا فائدہ۔ کہا گیا ہے کہ ان دونوں کے مددگار ہیں جیسا کہ ملک الموت کے ہیں اور کہا گیا ہے کہ پوری زمین ان کے سامنے کھول دی جاتی ہے اور ان کی نظر میں ہوتی ہے جیسا کہ ملک الموت کے لئے اور ان میں سے ایک مسلمانوں سے پوچھتا ہے اور دوسرا کافروں سے اھ۔ اور آخری قول میں نظر ہے اس لئے کہ یہ احادیث کے ظاہر مخالف ہے اور ممکن ہے کہ دو کی حکمت یہ ہے کہ یہ دونوں دو گواہوں کے مرتبہ میں ہیں یا کاتب فرشتوں (کراماً کاتبین) کے مرتبہ میں ہیں' واللہ اعلم۔

قولہ :ویضرب بمطارق من حدید ضربة۔

یعنی کافر کو ہتھوڑوں (گرز) کے ساتھ مارا جائے گا اور مصابیح میں ہے: **بمطرقة** اور یہ ضرب کا آلہ ہے لوہے کا ہے اس لئے کہ زمین کی دھاتوں میں یہ سب سے سخت ہے۔ اس کے کانوں کے درمیان مارے گا۔ ایسے ہی ابن الملک نے کہا ہے۔ علامہ طیبی نے کہا ہے کہ ضربة مفرد اور مطارق کو جمع ذکر فرمایا اس قول کی طرح "معي جياعا" تاکہ معلوم ہو کہ اس گرز کا ہر جزء بذاتہ ایک گرز ہے مبالغۃ اھ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ مطارق اپنی حقیقت پر جمعیت کے معنی میں ہے خواہ اس کے اقل عدد دو ہوں یا تین اور ضربۃ سے مراد ایک دفعہ کا مارنا ہے۔ واللہ اعلم پھر میں نے ابن حجر کو دیکھا انہوں نے فرمایا ہے کہ اس کے مفرد لانے کی وجہ سے مطارق کے جمع لانے کے ساتھ اشارہ کرنا ہے اس طرف کہ وہ سب اس پر ایک ہی وقت میں جمع ہوں گے پس وہ صورۃً ایک ضرب کی طرح ہو جائیں گے پھر کہا اور طیبی کے کلام میں نظر ہے اس لئے کہ اس میں مطارق کو اپنی حقیقت سے نکالنا ہے اور یہی جمع پر دلالت ہے جو کہ عبرتناک سزا اور عذاب میں زیادہ بلیغ ہے اس کی طرف کسی داعی کے بغیر۔

قولہ :فیصیح صیحة یسمعها من یلیه غیر الثقلین:

یعنی وہ اس ضرب کی وجہ سے رونے کے ساتھ اپنی آواز کو بلند کرے گا' ایسی چیخ مارے گا جس چیخ کو سنے گا ہر وہ جو اس کے قریب ہوگا جانوروں اور فرشتوں میں سے اور "من" کے ساتھ تعبیر ملائکہ کو غلبہ دیتے ہوئے کی ان کے شرف کی وجہ سے اور اس سے اس مفہوم کی طرف نہ جانا چاہیے کہ جو اور ہوگا وہ نہیں سنے گا اس لئے کہ فصل ثانی میں براء بن عازب کی حدیث میں وارد ہے کہ اس کو سنے گا جو مشرق ومغرب کے درمیان ہے اور مفہوم منطوق کا معارضہ نہیں کر سکتا۔ "غیر ثقلین" یعنی انسانوں اور جنوں

کے علاوہ۔ ان کو ثقلین اس لئے کہا گیا کہ یہ زمین پر بوجھ ہوتے ہیں اور "غیر" کو استثنیٰ کے طور پر نصب دیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ہدایت کے طور پر مرفوع ہے اور ان دونوں کس مستثنیٰ کیا گیا اس لئے کہ یہ دونوں اس کے سننے سے ہٹا دیئے گئے تاکہ ایمان بالغیب فوت نہ ہو جائے' اس لئے کہ اگر یہ اس کو سن لیتے تو ان کا ایمان بدیہی ہو جاتا اور ایمان بدیہی ثواب کا فائدہ نہیں دیتا۔ پس ابتلاء اور امتحان اٹھ جاتا اور کہا گیا ہے کہ اگر یہ سن لیتے تو تدابیر اور پیشوں وغیرہ سے اعراض کر لیتے۔ پس معاش منقطع ہو جاتا اور عالم کا نظام مختل ہو جاتا اور یہی وجہ ہے کہ کہا گیا ہے کہ اگر بیوقوف نہ ہوتے تو دنیا خراب ہو جاتی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ غفلت رحمت ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر امید نہ ہوتی تو عمل میں خلل نہ ہوتا۔ یہ روایت معنی کے اعتبار سے متفق علیہ ہے۔ میرک شاہ نے کہا ہے کہ اس میں اشکال ہے اس لئے کہ مسلم کی روایت: "فیراھما جمیعا" پر تمام ہو جاتی ہے پس اتفاق کو اکثر پر محمول کیا جائے گا' فتدبر۔

مردے کو جنت اور جہنم میں اپنا ٹھکانہ نظر آتا ہے

۱۲۷: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا مَاتَ عُرِضَ عَلَيْهِ مَقْعَدُهٗ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ اِنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَمِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاِنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ النَّارِ فَمِنْ اَهْلِ النَّارِ فَيُقَالُ هٰذَا مَقْعَدُكَ حَتّٰى يَبْعَثَكَ اللّٰهُ اِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی الصحیحه ۲۴۳/۳حدیث۱۳۷۹۔ومسلم فی صحیحه۲۱۹۹/۴حدیث رقم (۶۵۔۲۸۸۶) والترمذی ۳۸۴/۴حدیث رقم ۱۰۷۲۔وأخرجه النسائی ۱۰۶/۴حدیث رقم ۲۰۷۰۔وابن ماجة۱۴۲۷/۲حدیث رقم ۴۲۷۰۔ ومالك فی الموطا ۲۳۹/۱حدیث ۴۷من کتاب الجنائز ۔ وأحمد فی المسند۱۶/۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی مرتا ہے تو قبر کے اندر روزانہ صبح اور شام اس کو اس کا ٹھکانہ دکھایا جاتا ہے۔ اگر وہ جنتی ہے تو اس کو جنت میں اس کا ٹھکانہ دکھایا جاتا ہے اور اگر جہنمی ہے تو اس کو جہنم میں اس کا ٹھکانہ دکھایا جاتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ تیرا ٹھکانہ ہے' یہاں تک کہ جب قیامت آ جائے گی تو پھر تجھے اٹھا کر اللہ اس میں بھیجے گا۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: یعنی جنت یا جہنم میں سے جو اس کا خاص مکان ہو وہ اس پر ظاہر کیا جاتا ہے اور یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ دوسرا ٹھکانہ فرضی طور پر پیش کیا جائے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔ صبح و شام سے مراد دن کے دونوں طرفین ہیں یا اس سے مراد ہمیشہ ہے۔ اگر میت اہل جنت میں سے ہو تو وہ ٹھکانہ جو اس پر پیش کیا جاتا ہے وہ اہل جنت کے ٹھکانوں میں سے ہوتا ہے یا اہل جنت کے ٹھکانوں میں سے اس کا ٹھکانہ اس پر پیش کیا جاتا ہے۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ممکن ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ پس جو اہل جنت میں سے ہوتا ہے اس کو خوشخبری دی جاتی ہے اس طریق کے ساتھ جس کی کنہ اور حقیقت کا ادراک نہیں ہو سکتا اور اگر وہ اہل دوزخ میں سے ہو تو اس کے برعکس ہے اس لئے کہ جب شرط اور جزاء ایک ہوں تو فخامت پر دلالت کرتی

ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے جس نے ضمان پایا پس اس نے ضمان پایا۔ پس ان دونوں سے کہا جاتا ہے یہ جو ٹھکانہ تیرے اوپر پیش کیا جارہا ہے یہ تیراوہ ٹھکانہ ہے جس کے سازوسامان کی نعمتوں میں یا اس کی آگ میں مستقل اور ہمیشہ رہے گا۔

سید جمال الدین نے کہا ہے کہ الیہ کی ضمیر یا تو مقعد کی طرف راجع ہے پس معنی یہ ہوں گے کہ یہ تیرا ٹھکانہ ہے جس میں تو مستقل رہے گا۔ یہاں تک کہ جنت یا دوزخ میں سے اسی کے مثل ٹھکانے کی طرف اٹھایا جائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ہے: ﴿كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا وَلَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [البقرة:٢٥] ”جب کبھی ان کو پھلوں کا رزق دیا جائے گا تو وہ کہیں گے یہ وہی رزق ہے جو اس سے قبل ہمیں دیا گیا (یعنی اس کے مثل) اور اس کے مشابہ لایا جائے گا اور ان کے لئے اس میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔“ اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر اللہ کی طرف راجع ہو یعنی اس کی ملاقات کی طرف اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر راجع ہو پیش کئے جانے والے ٹھکانہ کی طرف یا اس ٹھکانے کی طرف جو قبر ہے اور "الی" بمعنی "من" ہو یعنی پیش کیا جانے والا ٹھکانہ بعد میں ہے اور تو اس وقت اس میں داخل نہیں ہوگا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تجھے اس کی طرف اٹھائے یا قبر تیرا ٹھکانہ ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تجھے اس سے اٹھائے گا تیرے دوسرے ٹھکانے کی طرف جو تیرے اوپر پیش کیا گیا ہے۔

علامہ طیبی نے کہا ہے کہ ضمیر راجع ہے یوم حشر کی طرف یعنی یہ اس وقت تیرا ٹھکانہ ہے یوم حشر تک۔ اس وقت تک یا تو تو عزت دیکھے گا یا ذلت۔ اس وقت تو اس ٹھکانہ کو بھول جائے گا۔

قوله :يوم القيامة:

منصوب ہے ظرفیت کی بناء پر۔ تورپشتی کہتے ہیں کہ یہ لفظ مصابیح کا ہے اور صحاح کی احادیث میں ہے: "**حتى يبعثك الي يوم القيامة**" اور ازھار میں ہے قیامت سے مراد یہاں نفخۂ اولیٰ ہے نہ کہ اخری۔ اس لئے کہ دونوں نفخوں کے درمیان کفار و مسلمین میں سے کسی کو عذاب نہیں دیا جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ اس تاویل کی حاجت نہیں اس لئے کہ "**هذا مقعدك**" مطلق ہے عذاب وغیرہ سب کو شامل ہے باوجودیکہ نفخۂ اولیٰ مخلوقات کے مرنے اور مردوں کی غشی کی حالت ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں اشکال ہے۔

عذابِ قبر حق ہے

۱۲۸ : وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ يَهُوْدِيَّةً دَخَلَتْ عَلَيْهَا فَذَكَرَتْ عَذَابَ الْقَبْرِ فَقَالَتْ لَهَا اَعَاذَكِ اللّٰهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ فَسَأَلَتْ عَائِشَةُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ عَذَابِ الْقَبْرِ فَقَالَ نَعَمْ عَذَابُ الْقَبْرِ حَقٌّ قَالَتْ عَائِشَةُ فَمَارَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدُ صَلّٰى صَلَاةً اِلَّا تَعَوَّذَ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ٢٣٢/٣ حديث رقم ١٣٧٢۔ وأخرجه مسلم فی صحيحه ٤١١/١ حديث رقم (١٢٥۔٥٨٦) وأخرجه النسائی فی سننه ١٠٥/٤ حديث رقم ٢٠٦٧ وأحمد فی المسند ١٧٤/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک یہودن ان کے پاس آئی اور اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے قبر کا ذکر کیا اور پھر اس نے حضرت عائشہؓ سے کہا۔ اے عائشہؓ اللہ تعالیٰ آپ کو عذاب قبر سے محفوظ رکھے۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عذاب قبر کے بارے میں پوچھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں، عذاب قبر برحق ہے ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس واقعہ کے بعد میں نے کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نماز پڑھی اور عذاب قبر سے پناہ نہ مانگی ہو۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قولہ :ان یھودیۃ دخلت:

ابن حجر کہتے ہیں کہ اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ یہودیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا ہو جو کہ ہمارے ہاں حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی بناء پر: ﴿أَوْ نِسَآئِهِنَّ﴾ [النور: ٣١] جو کہ مقتضی ہے کافرہ کے سامنے مسلمان عورت کے بدن کے کسی جزء کے کھلنے کی حرمت کو اس لئے کہ وہ کافر کے سامنے اس کو بیان کرے گی۔ پس وہ کافر اس (مسلمان عورت) کو فتنے میں ڈال دے گا اور ہمارے ہاں مفہوم مخالف معتبر نہیں اور کسی سے منقول نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یا صحابہ رضی اللہ عنہم کی عورتیں کفار کی عورتوں سے پردہ کرتی تھیں۔

قولہ :فذکرت عذاب القبر فقالت...... نعم عذاب القبر حق:

اور اس یہودیہ نے عذاب قبر کا ذکر کیا۔ پس اس نے کہا: "فقالت" اس میں احتمال ہے کہ یہ تفسیر ہو یا تفریع' اللہ تیری حفاظت کرے اور تجھے بچائے عذابِ قبر سے۔ جائز ہے کہ یہودیہ کو عذابِ قبر کا علم تورات کی تلاوت کی وجہ سے یا اس آدمی سے سن کر ہوا ہو جس نے تورات کو پڑھا ہو اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس کا علم نہ ہوا ہو اور انہوں نے یہ سنا نہ ہو۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا عذابِ قبر کے بارے میں کہ کیا وہ حق ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! عذابِ قبر حق ہے یعنی ثابت ہے' متحقق ہے' ہونے والا ہے۔

قولہ :قالت عائشہ فما رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

"بعد :ای بعد سوالی ذلك" (بعد کا مضاف الیہ محذوف ہے۔ چنانچہ مطلب یہ ہے کہ میرے اس سوال کے بعد)۔

قولہ :صلی صلاۃ الا تعوذ باللہ من عذاب القبر:

میں احتمال ہے کہ داخل صلاۃ مراد ہو یا خارجِ صلوٰۃ اور پہلا زیادہ ظاہر ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے اس کو واجب قرار دیا ہے اور کہا گیا ہے کہ آپ کو اس سے قبل علم نہ ہوا ہو یا علم ہوا ہو لیکن آپ نے پناہ نہ مانگی ہو۔ یہاں تک کہ یہودیہ سے سنا پس آپ نے پناہ مانگی یا یہ کہ پہلے پناہ مانگتے رہے ہوں مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس کی خبر نہ ہوئی ہو اور کہا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے قبل پوشیدہ پناہ مانگتے تھے پس جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے تعجب کو دیکھا تو اس بارے میں اعلانیہ پناہ مانگنے لگے ہر نماز کے بعد تاکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قلب میں پختہ ہو جائے اور امت اس کی اقتداء کرے اور یہ کہ امت کے درمیان مشہور ہو جائے اور ان کے عقائد میں راسخ ہو جائے اور وہ اس سے ڈرنے لگیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وحی نازل ہونے سے

قبل امت میں شفقت کرتے ہوئے خفیہ پناہ مانگتے ہوں۔ پھر اس سے اعلانیہ پناہ مانگنے لگے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے لطف و کرم سے اس سے بچائے۔ تورپشتی کہتے ہیں کہ طحاوی نے نقل کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیہ سے سنا کہ اس نے یہ کہا پس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیہ سے سنا کہ اس نے یہ کہا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خوف لاحق ہوا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف قبر کے فتنہ کے بارے میں نازل کیا اور ایک حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا میں نہیں جانتی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے قبل اس سے تعوذ کرتے تھے اور مجھے علم نہیں تھا یا یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیہ کے قول کے بعد تعوذ کرنا شروع کیا۔ علامہ طیبی نے کہا ہے کہ اس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بارے میں تواضع اور مخلوق کی اس طرف راہنمائی ہے کہ حق کو قبول کیا جائے۔ خواہ وہ کسی شخص سے ہو اس لئے کہ حکمت مؤمن کی گمشدہ چیز ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ یہ بعید ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ اعتقادیہ میں صرف یہودیہ کے قول پر اعتماد رکھا ہو بلکہ آپ نے وحی پر اعتماد کیا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے' واللہ اعلم۔ اور رہا ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ قول جو طحاوی نے نقل کیا ہے کہ محتاج ہے' تو یہ غریب ہے اس لئے کہ طحاوی کا نقل کرنا نقل ہے اس لئے کہ وہ ان محدثین میں سے ہیں جو ثقاہت' عدالت اور ضبط میں غایت درجہ مشہور و معروف ہیں خاص کر کے اس میں کہ یہ ان مسائل میں سے نہیں ہے جو رائے سے کہا جائے لہٰذا ان سے حسن ظن واجب ہے اور یہ بات عجیب ہے کہ اس کی مثل اگر وہ شخص روایت کرے جو طحاوی سے کم درجہ کا ہو ان کے مذہب کا تو وہ شخص ان کے ہاں سند ہو اور اس پر اعتماد کیا جائے۔ پھر حدیث میں تنبیہ ہے کہ مخلوق میں سے کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ اللہ کے عذاب سے بے خوف رہے۔

عذابِ قبر کا انکشاف

۱۲۹: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ بَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَائِطٍ لِبَنِي النَّجَّارِ عَلٰى بَغْلَةٍ لَهٗ وَنَحْنُ مَعَهٗ اِذْ حَادَتْ بِهٖ وَكَادَتْ تُلْقِيْهِ وَاِذَا اَقْبُرٌ سِتَّةٌ اَوْ خَمْسَةٌ فَقَالَ مَنْ يَعْرِفُ اَصْحَابَ هٰذِهِ الْاَقْبُرِ قَالَ رَجُلٌ اَنَا قَالَ فَمَتٰى مَاتُوْا قَالَ فِي الشِّرْكِ فَقَالَ اِنَّ هٰذِهِ الْاُمَّةَ تُبْتَلٰى فِيْ قُبُوْرِهَا فَلَوْلَا اَنْ لَّا تَدَافَنُوْا لَدَعَوْتُ اللّٰهَ اَنْ يُّسْمِعَكُمْ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِيْ اَسْمَعُ مِنْهُ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَقَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ قَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ قَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ قَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/ ٢١٩٩ حديث رقم(٦٧۔٢٨٦٧)وأخرجه أحمد في المسند ٥/ ١٩٠۔

ترجمہ: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنو نجار کے ایک باغ میں اپنے خچر پر سوار تھے اور ہم بھی آپ کے ساتھ تھے کہ اچانک خچر بدک گیا اور اس شدت سے کودا کہ قریب تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

گرادے۔ پھر اچانک وہاں پانچ چھ قبریں نظر آئیں۔ آپ ﷺ نے صحابہ سے پوچھا کہ ان قبر والوں کو کوئی جانتا ہے؟ ایک آدمی نے کہا اے اللہ کے رسول میں جانتا ہوں۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ کب فوت ہوئے ہیں۔ (یعنی کفر کی حالت میں مرے ہیں یا کہ ایمان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں)۔ اس آدمی نے جواب میں عرض کیا کہ یہ لوگ تو شرک اور کفر کی حالت میں مرے ہیں پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ امت اپنی قبروں میں آزمائی جاتی ہے۔ یعنی ان کو اپنی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے۔ اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ تم لوگ اپنے مردوں کو قبر میں دفن کرنا چھوڑ دو گے۔ تو میں ضرور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا کہ وہ تم کو بھی عذاب قبر کی آواز سنا دے، جس کو میں سن رہا ہوں۔ اس کے بعد آپ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ آگ کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو۔ صحابہ کرام نے عرض کیا ہم آگ کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ہم عذاب قبر سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ظاہری اور باطنی فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگو۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ہم ظاہری اور باطنی فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دجال کے فتنہ سے اللہ کی پناہ مانگو۔ صحابہ نے عرض کیا ہم دجال کے فتنہ سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

راوی حدیث:

زید رضی اللہ عنہ بن ثابت۔ یہ زید بن ثابت انصاری آنحضور ﷺ کے کاتب ہیں ان کی کنیت "ابو خارجہ" ہے اور جس وقت یہ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تھے تو ان کی عمر گیارہ (۱۱) سال کی تھی۔ ان کا شمار ایسے جلیل القدر فقہائے صحابہ میں سے ہوتا ہے جن پر "فرائض" کا مدار ہے۔ بڑے قراء میں سے تھے نیز یہ ان صحابہ میں سے ایک ہیں جنہوں نے تدوین قرآن میں بڑا حصہ لیا ہے اور انہوں نے خلافت ابوبکر رضی اللہ عنہ میں قرآن عظیم کی کتابت بھی کی ہے اور قرآن پاک کو مصحف سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں نقل کیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نیز دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین نے ان سے قرآن حکیم پڑھا' ان سے ایک بڑی جماعت نے روایت کی ہے۔ مدینہ طیبہ میں ۴۵ھ میں وفات پائی اور ان کی چھپن (۵۶) برس کی عمر ہوئی۔

تشریح: قوله :بینا رسول الله ﷺ فی حائط...... اذ حادت به:

یعنی آپ باغ میں موجود تھے۔ بنی نجار انصار کا قبیلہ ہے۔ علی بغلۃ حال ہے اس ضمیر سے جو خبر میں مستقر ہے و نحن معہ اور ہم آپ کے ساتھ تھے' یہ حال متداخل ہے اس لئے کہ یہ اس ضمیر سے حال ہے جو حال میں موجود ہے۔ "اذ حادت" یہ حاء مہملہ کے ساتھ ہے یعنی بغیر نقطے والی حاء صحیح قول کے مطابق اور کہا گیا ہے جیم کے ساتھ ہے۔ یہ جودت بالضمہ کے ساتھ ہے یعنی مائل ہوگئی اور بدک گئی۔ "بہ" یعنی اس کو لے کر پس "بہ" حال ہے اور "اذ" ذال کے سکون کے ساتھ ہے مناجات کے لئے ہے' بینا کے بعد۔ اس پر سیبویہ نے تصریح کی ہے جیسا کہ مغنی میں ہے۔

قوله :و کادت تلقیه و اذا قبر ستة او خمسة:

یہ القاء سے ہے یعنی آپ کو گرادے اور پیٹھ سے پھینک دے۔ اقبر ہمزہ کے ضمہ' قاف کے سکون اور باء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اذا الف کے ساتھ مفاجات کے لئے ہے اور واؤ حال کے لئے۔ یعنی ہم اس حالت میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ

تھے۔پس اچانک چند قبریں ہمارے سامنے ظاہر ہوئیں۔پس آپ ﷺ ہمیں ان پر لے گئے۔

قولہ :فقال :من یعرف اصحاب ھذہ الا قبر:

ان کو پہچاننے سے مراد ان کی ذات' صفات اور ان کی تاریخ وفات اور زندگی کے ایام کو پہچاننا ہے۔ایک آدمی نے کہا میں پہچانتا ہوں۔آپ ﷺ نے فرمایا: تو ان کو پہچانتا ہے تو یہ کب مرے ہیں' زمانہ جاہلیت میں یا بعد میں۔مشرک مرے ہیں یا مؤمن؟

قولہ :فقال رجل انا ۔ قال :فمتی ماتوا؟

یعنی شرک کے زمانہ میں یا اس کی صفت میں اور ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے یعنی آپ کی بعثت کے بعد اس دلیل کی وجہ سے کہ آپ کا فرمان ہے: ((**ان ھذہ الامة تبتلی فی قبورھا**)) (مشکوۃ: ۱۳۹) ''بے شک یہ امت اپنی قبور میں آزمائی جاتی ہے۔''

کہتے ہیں کہ میں نے اس کو اس پر اس لئے محمول کیا ہے تاکہ اصح قول کے موافق ہو جائے۔وہ یہ ہے کہ اہل فترت پر عذاب نہیں ہوگا۔اھ۔اور اس میں یہ بات ہے کہ اہل فترت جیسا کہ تحقیق کی گئی ہے نادر الوجود ہیں۔پس اس کو اہل شرک پر کیسے محمول کیا جائے گا۔

قولہ :فقال :ان ھذہ الامة......

یعنی جنس انسان۔پس **ھذہ** اشارہ اس کی طرف ہے جو زمین میں ہے اور خبر اس کا بیان ہے۔ "**ھذا اخوك**" کے قول کی طرح اور امت کی اصل یہ ہے کہ ہر وہ جماعت جن کو ایک امر جمع کرے دین ہو یا زمان یا مکان۔

قولہ :تبتلی فی قبورھا:

مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے یعنی امتحان لیا جاتا ہے' پھر ان کو انعام دیا جاتا ہے یا عذاب۔

قولہ :فلو لا ان تدافنوا لدعدت اللہ ان یسمعکم:

تدافنوا دو تاؤں میں سے ایک کے حذف کے ساتھ یعنی عدم تدافن کا خوف نہ ہوتا تمہارے سامنے حال کھل جانے کی صورت میں تو میں اللہ سے مانگتا "**یسمعکم**" یہ اسماع سے ہے مسألتہ کی تضمین پر مفعول ثانی ہے یعنی تم کو سننے والا بنادے۔

قولہ :من عذاب القبر:

احتمال ہے کہ من تبعیضیہ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ زائدہ ہو۔ازھار میں ہے کہ کہا گیا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ دعا سے مانع خوف' حیرت' دہشت' دِل کا اکھڑنا ہے اور کہا گیا ہے کہ مانع دفن میں ترک اعانت ہے اور تورپشتی نے کہا ہے کہ اگر وہ یہ سن لیتے تو ہر ایک کو اپنے نفس کی فکر ہوتی اور یہ عظیم بلاء سب کو عام ہو جاتی یہاں تک کہ ان کو ترکِ دفن اور خوف سے دِلوں کے اکھڑنے کی طرف لے جاتی۔یہاں تک کہ وہ مردے کی لاش کے قریب بھی نہ جائے۔

قولہ :الذی اسمع منہ:

یعنی جس کو میں قبر سے سنتا ہوں اور ابن حجر نے کہا ہے یعنی اس کے مثل جو میں سنتا ہوں۔ یہ **یسمع** کے لئے مفعول ثانی ہے یعنی تمہارے کانوں تک قبر میں عذاب دیئے جانے والے کی آواز پہنچتی اس لئے کہ اگر تم اس کو سن لیتے تو مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دیتے اس خوف سے کہ ان کی چیخوں کی آواز تمہارے دِل اکھاڑے یا قریبی رشتہ داروں میں ذلت کے خوف سے کہ کہیں وہ ان کے احوال سے مطلع نہ ہو جائیں اور یہ حدیث نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان کی طرح ہے: **((لو علمتم ما علمت لضحکتم قلیلا و لبکیتم کثیرا))** ''اگر تم جان لیتے جو میں جانتا ہوں تو کم ہنستے اور زیادہ روتے'' اور اس میں یہ بھی ہے کہ کشف طاقت کے اعتبار سے ہوتا ہے اور اگر کسی کے اتنا کشف ہو جائے جس کی وہ طاقت نہیں رکھتا تو تباہ و برباد ہو جائے اور ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس تلازم کی وجہ یہ ہے کہ اس عذاب سے کشف عام لوگوں کو ترک تدفین کی جہالت کی طرف لے جائے گا اس سے خوف کی وجہ سے اور خواص کو لے جائے گا اس عظیم گھبراہٹ کے تصور سے ان کی عقلوں کے اختلاط اور قلوب کے اکھڑ جانے کی طرف جس کے باعث وہ میت کی لاش کے قریب نہیں جائیں گے۔ پس اس تفصیل سے وہ اشکال رفع ہو گیا جو کہا گیا ہے کہ مؤمن کے لئے کیسے لائق ہے کہ وہ دفن کو چھوڑ دے جس کا حکم دیا گیا ہے عذاب قبر سے ڈر کر بلکہ اس کو تو یہ لازم ہے کہ وہ یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو عذاب دینے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس کو عذاب دیتے ہیں اگر چہ وہ مچھلیوں کے پیٹ میں ہو یا پرندوں کے پوٹوں میں۔

قولہ :ثم اقبل بوجھہ علینا:

یہ تاکید ہے اس قول کی طرح **رایتہ بعینی** :یعنی (میں نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے)۔

قولہ :فقال تعوّذ و باللہ قالوا نعوذ باللہ من عذاب النار:

''**تعوذ و باللہ**'' یعنی اللہ سے طلب کرو کہ وہ تم سے اس کا عذاب ہٹا دے۔ لوگوں نے کہا ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں دوزخ کے عذاب سے یعنی ہم اس کی مدد چاہتے ہیں اس کے مقابل۔

قولہ :قال :تعوذوا باللہ من عذاب القبر:

اور شاید کہ ذکر کرنے میں دوزخ کے عذاب کی تقدیم باوجودیکہ قبر کا عذاب وجود میں مقدم ہے اس وجہ سے ہو کہ دوزخ کا عذاب سخت ہے اور باقی رہنے والا ہے اور زیادہ بڑا ہے اور زیادہ قوی ہے۔

قولہ :قال :تعوذوا باللہ من الفتن:

فتن' **فتنہ** کی جمع ہے' امتحان کو کہتے ہیں اور یہ تدبیر اور ابتلاء کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہے۔

قولہ :ما ظھر منھا وما بطن......:

یہ فتن سے بدل ہے اور تمام فتنوں کو شامل ہے۔ اس لئے کہ فتنہ ان دو سے خالی نہیں یعنی جو ظاہر ہے اور جو پوشیدہ ہے اور کہا گیا ہے مراد ہے جو انسان کے ظاہری اعضاء پر جاری ہوتا ہے اور جو قلب میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ شرک' ریا' حسد وغیرہ دل کے مذمومات میں سے ہے۔

قوله :قالوا نعوذ بالله من الفتن:

یعنی ہر فتنہ جو عذابِ قبر کی طرف لے جائے یا عذابِ دوزخ کی طرف۔

قوله :قال :تعوذوا بالله من فتنه الدجال:

اس کو خاص کیا اس لئے کہ یہ سب سے بڑا فتنہ ہے۔ اس حیثیت سے کہ یہ کفر کی طرف کھینچ کر لے جائے گا جو ہمیشہ کے عذاب کی طرف مفضی ہے۔

الفصل الثانی:

قبر میں منکر نکیر کا سوال

١٣٠ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُقْبِرَ الْمَیِّتُ اَتَاهُ مَلَکَانِ اَسْوَدَانِ اَزْرَقَانِ یُقَالُ لِاَحَدِهِمَا الْمُنْکَرُ وَلِلْاٰخَرِ النَّکِیْرُ فَیَقُوْلَانِ مَاکُنْتَ تَقُوْلُ فِیْ هٰذَا الرَّجُلِ؟ فَاِنْ کَانَ مُؤْمِنًا فَیَقُوْلُ هُوَ عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ فَیَقُوْلَانِ قَدْکُنَّا نَعْلَمُ اَنَّکَ تَقُوْلُ هٰذَا ثُمَّ یُفْسَحُ لَهٗ فِیْ قَبْرِهٖ سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فِیْ سَبْعِیْنَ ثُمَّ یُنَوَّرُ لَهٗ فِیْهِ ثُمَّ یُقَالُ لَهٗ نَمْ فَیَقُوْلُ اَرْجِعُ اِلٰی اَهْلِیْ فَاُخْبِرُهُمْ فَیَقُوْلَانِ نَمْ کَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ الَّذِیْ لَایُوْقِظُهٗ اِلَّا اَحَبُّ اَهْلِهٖ اِلَیْهِ حَتّٰی یبعثهُ اللّٰهُ مِنْ مَضْجَعِهٖ ذٰلِكَ وَاِنْ کَانَ مُنَافِقًا قَالَ سَمِعْتُ النَّاسَ یَقُوْلُوْنَ قَوْلًا فَقُلْتُ مِثْلَهٗ لَااَدْرِیْ فَیَقُوْلَانِ قَدْکُنَّا نَعْلَمُ اَنَّکَ تَقُوْلُ ذٰلِكَ فَیُقَالُ لِلْاَرْضِ الْتَئِمِیْ عَلَیْهِ فَتَلْتَئِمُ عَلَیْهِ فَتَخْتَلِفُ اَضْلَاعُهٗ فَلَا یَزَالُ فِیْهَا مُعَذَّبًا حَتّٰی یَبْعَثَهُ اللّٰهُ مِنْ مَضْجَعِهٖ ذٰلِكَ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ)

أخرجه الترمذي في سننه ٣٨٣/٣ حديث رقم ١٠٧١۔ وقال حديث حسن غريب۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب مردہ کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو اس کے پاس سیاہ رنگ کے دو فرشتے نیلی آنکھوں والے آجاتے ہیں ان میں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہا جاتا ہے۔ وہ دونوں اس مردہ سے سوال کرتے ہیں کہ تو اس شخص یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دنیا میں کیا کہتا تھا اگر وہ شخص مؤمن ہو تو وہ جواب میں کہتا ہے کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور بیشک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں یہ سن کر وہ دونوں فرشتے کہتے ہیں کہ ہمیں معلوم تھا کہ تو یقیناً یہی جواب دے گا اس کے بعد اس کی قبر لمبائی اور چوڑائی میں ستر ستر گز کشادہ کر دی جاتی ہے اور اس مردہ سے کہا جاتا ہے کہ سو جاؤ مردہ کہتا ہے میں چاہتا ہوں کہ واپس اپنے اہل وعیال میں چلا جاؤں تا کہ ان کو اپنے اس حال کی خبر دوں فرشتے اس سے کہتے ہیں کہ تو اس دلہن کی طرح سو جا جس کو صرف وہی آدمی جگا سکتا ہے جو اس کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہو (مراد اس کا شوہر ہے کیونکہ ہر کسی کا جگانا اچھا نہیں لگتا اس لئے کہ اس سے وحشت پیدا ہوتی ہے البتہ

محبوب کا جگانا اچھا لگتا ہے) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس جگہ سے اٹھائے گا اور اگر وہ مردہ منافق ہے تو وہ جواب میں کہتا ہے کہ میں اس شخص کے بارے میں لوگوں کو جو کچھ کہتے سنتا تھا میں بھی وہی کہتا تھا لیکن میں اس کی حقیقت کو نہیں جانتا منافق کا یہ جواب سن کر فرشتے کہتے ہیں ہمیں معلوم تھا کہ یقیناً تو یہی جواب دے گا اس کے بعد زمین کو مل جانے کا حکم دیا جاتا ہے چنانچہ زمین اس مردہ کو اسطرح دباتی ہے کہ اس کی پسلیاں ایک دوسری میں گھس جاتی ہیں اور اسی طرح ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو جگہ سے اٹھائے اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔

تشریح: یعنی دفن کیا جاتا ہے اور یہ غالبی قید ہے ورنہ سوال تمام مردوں کو شامل ہے۔ یہاں تک کہ جو مر جائے اور اس کو درندے کھا جائیں۔ پس اللہ تعالیٰ اس کی روح کو متعلق رکھتے ہیں جس کو اس نے چھوڑا ہے اس کے جزو اصلی کے ساتھ اور یہ تعلق باقی رہتا ہے اول عمر سے آخر عمر تک برقرار رہتا ہے اپنی حالت پر نمو اور مرجھانے کی دونوں حالتوں میں۔ جس کے ساتھ روح متعلق ہوتی ہے اولاً پس وہ زندہ ہوتا ہے تو اس کی زندگی کے ساتھ بدن کے سارے اجزاء زندہ ہوتے ہیں تا کہ اس سے سوال کیا جائے۔ پس ثواب دیا جائے یا عذاب دیا جائے اور یہ بعید نہیں ہے۔ پس بے شک اللہ تعالیٰ جزئیات اور کلیات سب کو جاننے والے ہیں ان کی حیثیت پر جس پر وہ ہیں۔ پس وہ اجزاء کو ان کی تفاصیل کے ساتھ جاننے والے ہیں ان کی حیثیت پر جس پر وہ ہیں اور ان کے محل کو جانتے ہیں اور فرق کرتے ہیں اصل اور فصل کے درمیان اور قادر ہیں روح کو جزء اصلی کے ساتھ متعلق کرنے پر انفرادی حالت میں اور اجتماعی حالت میں۔ پس ہمارے نزدیک اجسام کا وجود شرط نہیں ہے حیات کے لئے بلکہ یہ بعید نہیں ہے کہ وہ روح شخصی واحد مشرق و مغرب میں بکھرے ہوئے تمام اجزاء میں سے ہر ایک کے ساتھ متعلق ہو جائے۔ اس لئے کہ ان اجزاء کے ساتھ متعلق ہونا حلول کے طور پر نہیں کہ یہ کہا جا سکے دوسرے جزء میں حلول منع ہے۔

قولہ :اتاہ ملکان اسودان ازرقان:

یعنی ان کا منظر سیاہ ہوگا اور ان کی آنکھیں نیلی ہوں گی اور بے شک اللہ تعالیٰ ان کو اس صفت پر بھیجے گا اس لئے کہ سیاہی اور آنکھوں کے نیلے ہونے میں خوف وحشت ہے اور ان کا خوف کفار پر زیادہ سخت ہوگا تا کہ وہ جواب میں حیران رہ جائیں۔ رہے مؤمن تو ان کا اس میں امتحان ہوگا۔ پس اللہ پاک ان کو ثابت قدم رکھے گا پس وہ نہ ڈریں گے اور امن میں رہیں گے اس کی جزاء کے طور پر جو وہ دنیا میں اللہ سے ڈرتے تھے۔

قولہ :یقال لاحدھما المنکر وللاخر النکیر:

منکر کا لفظ مفعول ہے انکر سے بمعنی نکر ہے اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ کسی کو نہ جانے اور نکیر فعیل بمعنی مفعول ہے۔ یہ نکِرَ بالکسر سے ہے اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کو کوئی نہ جانے۔ پس یہ دونوں معروف کی ضد ہیں۔ ان دونوں کو یہ نام اس لئے دیئے گئے ہیں کہ میت ان دونوں کو نہیں جانتی اور ان کی صورت جیسی صورت کو اس نے نہیں دیکھا۔ پھر یہ احتمال ہے کہ فرشتے حقیقتاً اس صورت میں آئیں اس لئے کہ وہ مبغوض ہیں اور نیلا رنگ عربوں کے ہاں سب سے زیادہ مبغوض رنگ ہے اس لئے کہ رومی ان کے دشمن تھے اور وہ اکثر نیلی آنکھوں والے تھے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد اندھا پن ہو۔ اللہ پاک فرماتے ہیں اور اس دن ہم مجرموں کو نیلی آنکھوں والے یعنی اندھا اٹھائیں گے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے جو دوسری

حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اس پر مقرر کیا جائے گا اندھے اور بہرے کو اور یہ بھی احتمال ہے کہ سیاہی سے مراد کنایہ کے طور پر قبیح صورت اور رسوا کن منظر ہو اور نیلی آنکھوں والے سے مراد اس میں آنکھوں کا پلٹنا ہے اور اس کی طرف نظر کا محدود ہو جانا ہے۔ کہا جاتا ہے: زرقت عینہ نحوی: جب آنکھ پلٹ جائے اور اس کی سفیدی ظاہر ہو جائے اور یہ کنایہ ہے شدتِ غصب سے۔

قولہ: فیقولان ما کنت تقول ...... فیقول عبداللّٰہ و رسول:

کہا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی صورت سامنے لائی جائے گی۔ اور اس کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔ پس وہ کہے گا کہ وہ اللہ کی بندے اور رسول ہیں اور شہادتیں کو وہ کلام کو لمبا کرنے کے لئے ذکر کرے گا۔ بطور فرحت' خوشی' فخر اور لذت حاصل کرنے کے طور پر۔

قولہ: اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمدًا عبدہ و رسولہ:

اور ایک نسخہ میں "وشھدان محمدًا" ہے۔

اور اس کی نظیر یہ قول ہے تیرے ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ! تو آپ نے فرمایا یہ میرا عصا ہے اس پر میں ٹیک لگاتا ہوں...... پس کلام کو لمبا کیا حق تعالیٰ کی مخاطبت سے لذت حاصل کرنے کے لئے اور اس کی نعمت کے تذکرہ کے طور پر ایسے ہی شراح نے فرمایا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ: **قولہ ھو عبداللہ و رسولہ** یہ جواب شرعی نہیں ہے اس لئے کہ وہ بعض کے نزدیک لفظ شہادت پر موقوف ہے اور توحید پر سب کے نزدیک موقوف ہے۔ پس اس نے دونوں کے درمیان جمع کیا ایمان پر دلالت کرتے ہوئے یقین کی جہت سے بخلاف منافق کے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے کہ وہ ایمان کا دعویٰ کرے گا بغیر سمجھے اور بغیر دلیل کے۔

قولہ: فیقولان قد لنا نعلم انک تقول ھذا:

یعنی وحدانیت اور رسالت کا اقرار اور اس کا علم یا تو ان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی خبر دینے سے ہوا یا اس کی پیشانی پر سعادت کا اثر اور ایمان اور عبادت کے نور کی شعاع دیکھ کر ہوا۔

قولہ: ثم یفسح:

"یفسح" مجہول کے صیغہ پر ہے اور مخفف ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مشدد ہے یعنی وسیع کر دی جائے گی۔

قولہ لہ فی قبرہ سبعون ذراعًا:

اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں ذراع سے مراد دنیا کا ذراع ہو جو مخاطبین کے ہاں معروف ہے اور ظاہر یہی ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ فرشتے کا ذراع ہو جو اس سے بہت بڑا ہو۔ طیبی کہتے ہیں کہ اس کی اصل عبارت یہ ہے کہ **یفسح قبرہ مقدار سبعین ذراعًا** کہ اس کی قبر ستر گز کی مقدار وسیع ہو جائے گی۔ اس میں قبر کو سبعین کے لئے ظرف بنایا ہے یا فعل کی اسناد سبعین کی طرف کی ہے وسعت میں مبالغہ کے طور پر۔

وفی سبعین:

یعنی ذراعًا جیسا کہ ایک نسخہ میں ہے: **ای فی عرض سبعین ذراعًا**۔ یعنی اس کا طول اور عرض اتنا ہوگا۔ کہا گیا ہے کہ

یہ اس لئے ہے کہ آپ علیہ السلام کی امت کی اکثر عمریں اتنی ہی ہیں۔ پس وسیع کیا جائے گا ہر سال کے بدلے‘ جس میں اس نے اللہ کی عبادت کی تھی ایک ذراع اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد کثرت ہے۔ اسی وجہ سے بعض روایات میں تا حد نگاہ آیا ہے اور ممکن ہے اشخاص کے اختلاف کے اعتبار سے مختلف ہو واللہ اعلم۔

قولہ :ثم ینور له فیه ثم یقال نم:

یعنی اس کی قبر جو اس پر وسیع ہوتی ہے اس میں اس کے لئے نور لایا جائے گا‘ پھر اس سے کہا جائے گا: **نم نام ینام** سے امر کا صیغہ ہے۔

قولہ فیقول ارجع الی اهلی فاخبرهم:

یعنی میت اس عظیم سرور کی وجہ سے جو اس نے دیکھا ہے کہے گا میں واپس لوٹنے کا ارادہ کرتا ہوں اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہاں استفہام مقدر ہے یعنی "ارجع" ہے **فاخبرهم**۔ یعنی اپنے اہل کی طرف لوٹوں۔ پس ان کو خبر دوں کہ میرا حال اچھا ہے اور کوئی غم نہیں ہے تا کہ وہ اس سے خوش ہوں۔ کہے گا اے کاش! میری قوم جان لیتی۔

قولہ :فیقولان نم کنومة العروس الذی لا یوقظه الا احب اهله الیه:

پس وہ اس کے جواب سے اعراض کرتے ہوئے کہیں گے اس کے محال ہونے کی وجہ سے ایسے ہی عسقلانی نے کہا ہے اور میں بھی یہی بات کہتا ہوں۔ کہیں گے سو جا۔ نم کا لفظ جواب کو متضمن ہے اور اطناب سے مستغنی ہے سو جا‘ دلہن کے سونے کی طرح۔ عروس کا لفظ مذکر اور مؤنث دونوں پر بولا جاتا ہے‘ ان کے اول اجتماع کے وقت اور کبھی مذکر کو عریس کہا جاتا ہے۔ "**الذی لا یوقظه**" یہ جملہ عروس کی صفت ہے اور اس کی نیند کو دلہن کی نیند کے مشابہ قرار دیا اس لئے کہ وہ اچھی زندگی میں ہوتی ہے اور کہا گیا ہے اس سے مراد اچھی زندگی ہے: "**الا احب اهله الیه**"۔ مظہر نے کہا ہے کہ یہ عبارت ہے اس کے گھر والوں کے ہاں اس کی عزت اور تعظیم سے کہ شب زفاف کو اس کے پاس وہی آتا ہے جو اس کے ہاں سب سے محبوب ہوتا ہے اور زیادہ شفیق ہوتا ہے۔ پس وہ اس کو نرمی اور شفقت سے جگاتا ہے۔

قولہ حتی بعثه اللہ۔

یہ فرشتوں کے مقولہ میں سے نہیں ہے بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے ہے اپنی امت کو بتلانے کے لئے کہ یہ نعمت اس کے ساتھ ہمیشہ رہے گی جب تک کہ وہ قبر میں رہے گا اور لفظ حی محذوف ہے متعلق ہے یعنی "**ینام طیب العیش حتی بعثه اللہ**"۔

قولہ :من مضجعه ذلك۔

میم اور جیم کے فتح کے ساتھ ہے ضجع کی جگہ کو کہا جاتا ہے اور ضجع نیند کو کہتے ہیں اور کہا گیا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ حتی نم کے ساتھ متعلق ہو‘ خطاب سے غیبت کی طرف التفات کے طور پر اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ ان سے پھر کر ان سے غائب ہو گیا۔

قولہ :وان کان منافقًا قال سمعت الناس:

اور ایک نسخہ میں قال کی جگہ فقال ہے۔ناس سے مراد مسلمان ہیں یا کفار ہیں اس لئے کہ وہی اکثر لوگ ہیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:﴿وَمَآ اَکْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ﴾[یوسف:۱۰۳]''اور بہت سے آدمی گو تم (کتنی ہی) خواہش کرو ایمان لانے والے نہیں''۔اور پہلا زیادہ ظاہر ہے۔

قولہ :یقولون قولا فقلت مثلہ لا ادری:

وہ ایک بات کہتے تھے یعنی یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور میں بھی انہی کے قول کے مثل کہتا ہوں۔میں نہیں جانتا کہ وہ حقیقت میں ہیں یا نہیں۔ **لا ادری** کا جملہ استنافیہ ہے۔یعنی میں اس قول کے علاوہ نہیں جانتا۔ابن الملک نے کہا ہے کہ اس کی ترکیب یہ ہے کہ یہ حال کی وجہ سے منصوب ہے یا مثلہ کی صفت ہے اور دوسری صورت میں اشکال ہے۔

قولہ :فیقولان قد کنا نعلم انک تقول ذلک:

اور وہ دونوں کہیں گے کہ تحقیق ہم جانتے تھے یعنی وحی کے ذریعہ یا تیرے چہرے پر بدبختی کی علامت اور کفر کی ظلمت دیکھ کر تو یہی بات کہے گا:

قولہ :فیقال للارض التئمی علیہ:

پس قبر سے کہا جائے گا کہ دونوں فرشتوں کی جانب سے یا دوسرے فرشتے کی جانب سے کہ اس کے اوپر جڑ جا اور جمع ہو جا اس کو بھینچتے ہوئے یعنی اس کے اوپر تنگ ہو جا اور یہ حقیقت خطاب ہے نہ کہ تخیل ہے اس کو عذاب دینے کے لئے اور اس کو دبانے کے لئے۔

قولہ :فتلتئم علیہ فتختلف اضلاعہ:

پس اس کے اجزاء اس پر جمع ہو جائیں گے یعنی قبر کی ہر جانب دوسری جانب کے قریب ہو جائے گی۔پس اس کو دبائے گی اور جوڑے گی۔ **اضلاعہ** کا لفظ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔یہ ضلع کی جمع ہے اور یہ پہلو کی ہڈی ہے یعنی اس درست ہیئت سے جس پر وہ تھیں ہٹ جائیں گی' شدت دباؤ کی وجہ سے اور شدت سے بھینچنے کی وجہ سے اور اعضاء کے بگڑنے کی وجہ سے اور پہلوؤں کے تجاوز کرنے کی وجہ سے ایک جانب سے دوسری جانب۔

قولہ :فلا یزال فیھا معذبا حتی یبعثہ اللہ من مضجعہ ذلک۔

وہ اس زمین میں اس حال میں رہے گا یا اس کی مٹی میں اور یہ جملہ نبی اکرم ﷺ کے قول سے ہے اس لئے کہ فرشتوں کی حکایت منقطع ہو گئی تھی۔

قبر کا سوال وجواب

۱۳۱ : وَعَنِ الْبَرَآءِ بْنِ عَازِبٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَاْتِیْہِ مَلَکَانِ فَیُجْلِسَانِہٖ

فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَنْ رَّبُّكَ فَيَقُوْلُ رَبِّيَ اللّٰهُ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَادِيْنُكَ فَيَقُوْلُ دِيْنِيَ الْاِسْلَامُ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَاهٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ فَيَقُوْلُ هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ وَمَا يُدْرِيْكَ فَيَقُوْلُ قَرَأْتُ كِتَابَ اللّٰهِ فَاٰمَنْتُ بِهٖ وَصَدَّقْتُ فَذٰلِكَ قَوْلُهٗ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ الْاٰيَةَ قَالَ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ مِنَ السَّمَآءِ اَنْ صَدَقَ عَبْدِيْ فَاَفْرِشُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَاَلْبِسُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَافْتَحُوْا لَهٗ بَابًا اِلَى الْجَنَّةِ فَيُفْتَحُ لَهٗ قَالَ فَيَاْتِيْهِ مِنْ رُوْحِهَا وَطِيْبِهَا وَيُفْسَحُ لَهٗ فِيْهَا مَدَّ بَصَرِهٖ وَاَمَّا الْكَافِرُ فَذَكَرَ مَوْتَهٗ قَالَ وَيُعَادُ رُوْحُهٗ فِيْ جَسَدِهٖ وَيَاْتِيْهِ مَلَكَانِ فَيُجْلِسَانِهٖ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَنْ رَّبُّكَ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِيْ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَادِيْنُكَ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِيْ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَاهٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ فَيَقُوْلُ هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِيْ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ مِنَ السَّمَآءِ اَنْ كَذَبَ فَاَفْرِشُوْهُ مِنَ النَّارِ وَاَلْبِسُوْهُ مِنَ النَّارِ وَافْتَحُوْا لَهٗ بَابًا اِلَى النَّارِ قَالَ فَيَاْتِيْهِ مِنْ حَرِّهَا وَسَمُوْمِهَا قَالَ وَيُضَيَّقُ عَلَيْهِ قَبْرُهٗ حَتّٰى تَخْتَلِفَ فِيْهِ اَضْلَاعُهٗ ثُمَّ يُقَيَّضُ لَهٗ اَعْمٰى اَصَمُّ مَعَهٗ مِرْزَبَّةٌ مِنْ حَدِيْدٍ لَوْضُرِبَ بِهَا جَبَلٌ لَصَارَ تُرَابًا فَيَضْرِبُهٗ بِهَا ضَرْبَةً يَسْمَعُهَا مَابَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اِلَّا الثَّقَلَيْنِ فَيَصِيْرُ تُرَابًا ثُمَّ يُعَادُ فِيْهِ الرُّوْحُ . (رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوُدَ)

أخرجه أحمد في المسند ٤/ ٢٨٧ ـ وأخرجه أبو داود في السنن ٥/ ١١٤ حديث رقم ٤٧٥٣ ـ

ترجمہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا قبر میں مردے کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اسے بٹھا کر اس سے سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے وہ جواب دیتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے پھر فرشتے سوال کرتے ہیں کہ تیرا دین کیا ہے وہ جواب میں کہتا ہے کہ میرا دین اسلام ہے پھر فرشتے اس سے پوچھتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ کون ہے وہ کہتا ہے کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں پھر فرشتے اس سے سوال کرتے ہیں یہ تجھے کس نے بتایا؟ وہ کہتا ہے میں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب پڑھی اور اس پر ایمان لایا اور اس کی تصدیق کی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا یہی مطلب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا: ﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ثابت قدم رکھتا ہے جو قول ثابت پر ایمان لائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آسمان سے پکارنے والا یعنی اللہ تعالیٰ یا اس کے حکم سے فرشتہ پکار کر کہتا ہے میرے بندے نے سچ کہا۔ لہٰذا اس کے لئے جنت کا بستر بچھاؤ اور اس کو جنت کا لباس پہناؤ اور اس کے لئے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دو۔ چنانچہ جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت کے اس دروازے سے اس کے پاس جنت کی ہوائیں اور خوشبوئیں آتیں ہیں اور تا حدنگاہ اس کے لئے قبر کو کشادہ کر دیا جاتا ہے۔ اب رہا کافر کا معاملہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی موت کا ذکر کیا اور اس کے بعد ارشاد فرمایا۔ پھر اس کی روح اس کے جسم میں ڈالی جاتی ہے اور پھر اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو اس کو بٹھا کر پوچھتے ہیں تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے ہائے ہائے میں نہیں جانتا۔ پھر وہ سوال کرتے ہیں تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے ہائے ہائے میں نہیں جانتا۔ پھر وہ سوال کرتے ہیں کہ یہ شخص کون ہے جو اللہ

تعالیٰ کی طرف سے تمہارے اندر مبعوث کیا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے ہائے ہائے میں نہیں جانتا۔ پھر آسمان کی طرف سے ایک پکارنے والا پکار کر کہے گا۔ یہ جھوٹا ہے۔ اس کے لیے آگ کا بستر بچھاؤ۔ آگ کا لباس اس کو پہناؤ اور اس کے لئے ایک دروازہ جہنم کی طرف کھول دو۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جہنم سے اس کے پاس گرم ہوائیں اور لوئیں آتی ہیں اور فرمایا کہ اس کی قبر اس کے لئے تنگ کر دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ پسلیاں ایک دوسری میں گھس جاتی ہیں۔ پھر اس پر ایک اندھا، بہرہ فرشتہ مقرر کر دیا جاتا ہے جس کے پاس لوہے کا ایسا گرز ہوتا ہے کہ اس کو پہاڑ پر مارا جائے تو وہ پہاڑ مٹی ہو جائے اور وہ فرشتہ اس کو اس گرز سے اس طرح مارتا ہے کہ اس کے چیخنے اور چلانے کی آواز مشرق سے مغرب تک تمام مخلوق سنتی ہے۔ سوائے جنوں اور انسانوں کے کہ وہ نہیں سنتے اور اس مار کی وجہ سے مردہ مٹی ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر اس کے اندر روح ڈالی جاتی ہے۔ اس حدیث کو امام احمدؒ اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: عن البراء ...... ياتيه ملكان:

ابن الملک نے فرمایا ہے یہ حدیث براء نے روایت کی ہے جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے مگر دونوں کے الفاظ مختلف ہیں، براء کی روایت میں **ياتيه** ہے یعنی مؤمن کے پاس دو فرشتے آئیں گے۔

قوله: فيجلسانه...... ما هذا الرجل الذي بعث فيكم:

"ربي الله" میں ربی یاء کے فتحہ کے ساتھ بھی ہے اور سکون کے ساتھ بھی اور اگر میت عجمی ہو تو بھی عربی ہو جائے گا۔ پس وہ اس سے کہیں گے تیرا دین کیا ہے؟ یعنی جس کو تو نے اختیار کیا ہے، ادیان میں سے تو وہ کہے گا میرا دین اسلام ہے، پس وہ کہیں گے یعنی اس سے جیسا کہ ایک نسخہ میں **له** کا لفظ بھی ہے۔ یہ آدمی کیا ہے۔ جس کو تمہارے درمیان بھیجا گیا ہے یعنی اس کا وصف کیا ہے اس لئے کہ لفظ ما کے ذریعہ وصف کے بارے میں سوال ہوتا ہے ایسا ہی طیبی نے کہا ہے اور اس کی اتباع کی ہے ابن حجر نے اور کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اس کا وصف کیا ہے، کیا وہ رسول ہے یا تیرا اس کے بارے میں کیا اعتقاد ہے اور زیادہ ظاہر ہے یہ کہ ما بمعنی من ہے تا کہ باقی روایات میں جو لفظ **من نبيك** کے ساتھ ہیں ان کے موافق ہو جائے۔

قوله: فيقول هو رسول الله...... و صدقت:

وہ کہے گا یہ اللہ کے رسول ہیں اور ایک نسخہ میں ﷺ بھی ہے۔ پس وہ فرشتے میت سے کہیں گے کس نے تجھے بتلایا اور خبر دی جو تو کہتا ہے ربوبیت کے بارے میں، اسلام کے بارے میں اور رسالت کے بارے میں اور کہا گیا ہے واؤ عاطفہ کے ذریعہ یہاں وصل کیا گیا ہے اس لئے کہ یہ ماقبل کے ساتھ متصل ہے بخلاف "**ما دينك**" اور "**ما هذا الرجل**" میں اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک مستقل ہے اور ماقبل سے منقطع ہے۔ پس وہ کہے گا کہ میں نے اللہ کی کتاب یعنی قرآن پڑھا ہے۔ پس اس قرآن پر ایمان لایا ہوں۔ پس اس پر ایمان لانا محمد ﷺ پر ایمان لانے کو مستلزم ہے۔ نبی پر ایمان لایا ہوں کہ بے شک آپ حق ہیں اور میں نے تصدیق کی ہے اس کی جو آپ نے فرمایا یا میں نے تصدیق کی اس کی جو قرآن میں ہے پس میں نے اس میں پایا۔ "پس جان لو کہ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے" اور "وہی تمہارا رب ہے ہر چیز کا خالق ہے" اور اس کے علاوہ دوسری آیات جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ بے شک میرا اور ساری مخلوق کا رب ایک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے اور اس میں یہ بھی ہے: "بے شک دین اللہ

کے ہاں اسلام ہی ہے اور جو اسلام کے علاوہ دین طلب کرے گا پس اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا" پس میں نے پہچان لیا کہ اللہ کے پاس اسلام کے علاوہ پسندیدہ دین نہیں ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ "محمد اللہ کے رسول" ہیں اور "(اے محمد) کہہ دیجئے اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف رسول ہوں" اور اس کے علاوہ بھی (آیات) ایسے ہی ہیں۔ ابن الملک نے کہا ہے اور طیبی نے بھی کہا ہے کہ میں نے اللہ کی کتاب پڑھی اور اس میں فصاحت و بلاغت دیکھی پس میں نے پہچان لیا کہ یہ معجز ہے۔ پس میں ایمان لے آیا اور میں نے اس میں غور و فکر کیا جو اس میں ترغیب دی گئی ہے۔ مکارم اخلاق بھی اور فضائل اعمال کی اور غیوب کا ذکر کیا گیا ہے اور گزشتہ امتوں کا ذکر کیا گیا ہے بغیر کسی سے سنے پس میں نے جان لیا کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے پس میں اس پر ایمان لے آیا۔

قوله :فذلك قوله يثبت الله الذين امنوا ......:

پس یہی اللہ پاک کے قول کا مصداق ہے یعنی ان کی زبانوں پر جواب مذکورہ جاری ہونا وہی تثبیت ہے جس کو اللہ پاک کا یہ قول: **يثبت الله......** متضمن ہے۔ آپ نے فرمایا:

قوله :فينادى مناد من السماء ان صدق عبدى فا فرشوه من الجنة:

یعنی ان دونوں فرشتوں کو دنیاوی آسمان کی جانب سے آواز دے گا کہ میرے بندے نے سچ بولا۔ **ان صدق** میں **ان** نداء کے لئے مفسر ہے اس لئے یہ القول کے منزلہ میں ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مصدر یہ ہو' مجرور ہو' لام کی تقدیر کے ساتھ اور یہ معنی صحیح نہیں ہے مگر یہ کہ اس کو آپ کے قول "**افرشوه**" سے متعلق مانا جائے اور معنی یہ ہوں گے کہ میرے بندے نے سچ کہا اس قول میں جو وہ کہتا ہے اس لئے کہ وہ دنیا میں اسی اعتقاد پر تھا لہٰذا وہ اکرام کا مستحق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو عبد کا نام دیا اور اس کو اپنے نفس کی طرف منسوب کیا' شرف دیتے ہوئے: "**فافشروه**" میں ہمزہ قطعی ہے اور فاء اس میں شرط مقدر کا جواب ہے یعنی میرے بندے نے سچ کہا پس اس کے لئے جنت کے بچھونوں میں سے بچھونا بچھاؤ۔ پس "**افرش**" یہاں فرش کے معنی میں ہے ایسے ہی کہا گیا ہے اور طیبی نے کہا ہے کہ مصادر میں افراش اس معنی میں نہیں ہے۔ "**افرش**" **افلع** یعنی اکھاڑنے کے معنی میں ہے۔ پس یہ لفظ اس معنی میں قیاس کے باب سے ہے۔ الف کو ثلاثی کے ساتھ ملحق کر کے۔ اگر وہ ثلاثی سے ہو تو الف ان میں وصل کے لئے ہوگا اور میں نے روایت نہیں پائی مگر ہمزہ قطعی کے ساتھ ہی اور لیکن قاموس میں ہے: "**افرش عنه اقلع عنه وافرشه عطاه فرشا**" اس کو بچھونا دیا اونٹ میں سے یعنی چھوٹے اونٹوں سے اور "**افرش فلان بساطًا**" کہ فلاں نے بچھونا بچھایا۔ **بسط له** اس کے لئے بچھونا لگایا۔ یہ **فرشه' فرشا** اور **فرشه تفريشا** کی طرح ہے (ان کا بھی یہی معنی ہے) سید جمال الدین نے کہا ہے کہ اس کی اصل "**افرشوا له**" ہے۔ پس لام جر کو حذف کیا گیا اور ضمیر کو فعل کے ساتھ ملایا گیا' وسعت دینے کے لئے اور کہا گیا معنی ہے اس کو بچھونا دو اس سے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کو جنت کے بچھونے والا بنا دو۔

قوله :والبسوه من الجنة:

البسوه میں ہمزہ قطعی ہے: **اى اكسوه** یعنی اس کو پہناؤ یا لباس دو جنت سے یعنی جنت کے جوڑوں سے اور اس کے لئے جنت کی طرف دروازہ کھول دو حقیقتاً یا بطور کشف کے از ہار میں ایسے ہی ہے اور زیادہ ظاہر پہلا ہے جیسا کہ آئے گا۔

قوله :فيفتح فياتيه من روحها و طيبها:

بعض نسخوں میں "یفتح" کی جگہ "یفسح" ہے یعنی اس کے لئے جیسا کہ ایک نسخہ میں لہ بھی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: پس اس کے پاس اس کی بعض ہوائیں آئیں گی۔ روح' راحہ اور بادِ نسیم کے معنی میں ہے اور آپ ﷺ نے اس لفظ یعنی من زوجها طيبها سے تعبیر صرف اس لئے کی ہے تا کہ اس کا فائدہ دے کہ وہ ان چیزوں میں سے ہے کہ جن کی انسان مقدار مقرر کرنے پر قادر نہیں ہوتا اور بالکنہ اس کی تعریف بھی نہیں کرسکتا اور ہر طیب روح ہے لیکن اس کا عکس نہیں ہے اور کہا گیا ہے من زائدہ ہے۔

قوله :و يفسح له مد بصره:

اور ایک نسخہ میں "یفتح" ہے اور یہ مد بصر کے لئے مناسب نہیں ہے۔ فیھا سے مراد اس کی مٹی یا اس کی قبر ہے اور اس پر دلالت کرتی ہے اس کے مقابل حالت جو آگے آ رہی ہے اور اس کی قبر اس پر تنگ ہو جاتی ہے۔ ابن الملک نے کہا ہے یعنی جنت میں اور یہ بعید ہے اور ابن حجر نے کہا ہے یعنی اس کی روایت میں اور یہ تکلف سے خالی نہیں ہے۔ "مد بصره" کا مطلب ہے کہ اس سے حجاب اٹھایا جائے گا پس وہ دیکھے گا جتنا اس کے لئے ممکن ہے کہ دیکھے کہا گیا ہے کہ مد ظرفیت کی بناء پر منصوب ہے اور یہ اس غایت کو کہتے ہیں جس کی طرف نظر منتہی ہوتی ہے اور زیادہ درست یہ ہے کہ اس کا نصب مصدر کے طور پر ہے یعنی اس کی نگاہ کی انتہاء تک وسیع ہو جائے گی اور اس کے اور "سبعون ذراعًا فی سبعین" کے درمیان تطبیق کا طریقہ یہ ہے کہ یہ وسعت سے عبارت ہے جو اس کے اوپر جنت میں سے پیش کیا جائے گا اور یہ اس کے مرقد کی توسیع میں سے ہے یا دونوں غیر محدود وسعت سے کنایہ ہیں اور ممکن ہے کہ یہ اشخاص کے احوال کے اختلاف کی وجہ سے ہو اعمال اور درجات میں اور ابن حجر نے فرمایا ہے مد بصره ایک نسخہ میں فتحہ کے ساتھ ہے۔

قوله :واما الكافر فذكر موته قال ويعاد روحه في جسده:

اور رہا کافر تو نبی اکرم ﷺ نے اس کی موت کا ذکر فرمایا یعنی کافر کی موت اور اس کی شدت کو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا یعاد لوٹائی جاتی ہے' تذکیر کے ساتھ ہے اور کہا گیا ہے تانیث کے ساتھ ہے یعنی تضاد ہے اس کی روح دفن کے بعد اس کے جسم میں یعنی بعض میں یا کل میں۔

قوله :وياتيه ملكان...... ما دينك:

اور اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں' پس اس کو بٹھاتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں تیرا رب کون ہے؟ پس وہ کہتا ہے: هاه هاه! الف کے بعدہ کے سکون کے ساتھ۔ یہ ایک کلمہ ہے جس کو متحیر آدمی کہتا ہے جو خوف کی وجہ سے حیرت سے قادر نہیں ہوتا یا عدم فصاحت کی وجہ سے قادر نہیں ہوتا کہ اس میں زبان استعمال کر سکے۔ "لا ادری" یہ لفظ گویا هاه هاه کا بیان ہے اور تفسیر ہے۔ پس معنی یہ ہیں کہ میں کوئی چیز نہیں جانتا اور نہیں جانتا کہ اس میں کیا جواب دوں؟ پس وہ اس سے کہتے ہیں تیرا دین کیا ہے' ادیان میں سے؟

قولہ :فیقول هاه هاه لا ادری فیقولان ما هٰذا الرجل الذی بعث فیکم:

پس وہ کہتا ہے ھاہ ھاہ میں نہیں جانتا پس وہ اس سے کہتے ہیں یہ آدمی کون ہے جو تمہارے درمیان مبعوث کیا گیا یعنی تو اس کے حق میں کیا کہتا ہے یہ نبی ہے یا نہیں؟

قولہ :فیقول هاه هاه لا ادری فینادی مناد من السمآء ان کذب:

پس وہ کہتا ہے کہ ھاہ ھاہ میں نہیں جانتا۔ اللہ پاک فرماتے ہیں جو اس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہے۔ پس آسمان سے ایک منادی آواز دیتا ہے کہ اس نے جھوٹ بولا۔ ان نداء کی تفسیر بھی آ رہا ہے یعنی اس کافر نے اپنے اس قول میں جھوٹ بولا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا دین اور محمد ﷺ کی نبوت مشرق ومغرب میں ظاہر ہے بلکہ اس نے آپ کی نبوت کا انکار کیا ہے' قول کے ذریعہ یا اعتقاد کے ذریعہ اس بناء پر کہ اس کا کفر جہالت ہے یا ہٹ دھرمی ہے۔

قولہ :فافرشوه من النار والبسوه من النار:

پس اس کے لئے بچھونا بچھاؤ آگ کا اور کپڑے پہناؤ آگ کے۔

اللہ پاک کا فرمان ہے کہ ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے۔

قولہ :وافتحوا له بابا الی النار قال فیاتیه من حرها و سمومها۔

اور اس کے لئے دوزخ کا دروازہ کھولو۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ پس اس کے پاس جہنم کی گرمی اور ہوا آئے گی۔

قولہ :قال ویضیق علیه قبره...... ثم یقیض له اعمی اصم:

اور اس پر اس کی قبر تنگ کر دی جائے گی یضیق یا کی تشدید کے ساتھ ہے یہاں تک کہ اس کی ہڈیاں ایک دوسرے میں گھس جائیں گی۔ پھر اس پر مسلط کیا جائے گا' سپرد کیا جائے گا' قدرت دی جائے گی۔ پس وہ اس کے اوپر تسلط جمائے گا جیسا کہ انڈے پر سفید چھلکا ہوتا ہے اور اس کی اصل قیض ہے اور وہ انڈے کے اوپر کے چھلکے کو کہتے ہیں (مسلط کیا جائے گا) اندھا اس کی آنکھ نہیں تاکہ اس پر رحم نہ کرے اور اس میں احتمال ہے کہ اس کی آنکھ ہی نہ ہو اسی وجہ سے یا یہ کنایہ ہو اس کی طرف نہ دیکھنے سے اصم بہرہ۔ یعنی اس کے رونے کی آواز اور مدد طلب کرنے کو نہ سنے گا نہ اس پر نرمی کرے۔

قولہ :معه مرزبة من حدید:

مرزبۃ کا لفظ حدیث میں باء کی تشدید کے ساتھ سنا گیا ہے اور اہل لغت اس کی تخفیف کے ساتھ پڑھتے ہیں اور یہ وہ چیز ہے جس کے ساتھ مٹی کے ڈھیلے کوٹتے ہیں اور توڑتے ہیں۔ ابن حجر کہتے ہیں مرزبہ محدثین کے ہاں باء کی فتحہ اور تشدید کے ساتھ ہے اور دیگر نے اعتراض کیا ہے کہ صحیح تخفیف کے ساتھ ہے اور شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مفعلۃ کا وزن لام کلمہ کی تشدید کے ساتھ میزان صرف کی انواع میں معروف نہیں اور طیبی کہتے ہیں رہا مرزبۃ تو محدثین باء کی تشدید کے ساتھ پڑھتے ہیں اور صحیح اس کی تخفیف ہے اور باء کی تشدید اس وقت ہوتی ہے جب ہمزہ میم سے تبدیل ہو اور وہ ارزبہ ہے اور فراء نے کہا ہے: "ضربك بالمرزبة العود النخر" تجھے اس نے لکڑی کے گرز سے سینے پہ مارا اور میں کہتا ہوں طیبی نے خطاء کی ہے محدثین کی غلطی بیان

کرنے میں اور لغویین کو درست کہنے میں اس لئے کہ پہلوں کا قول نقل کرنا بطور روایت عدول کے ہے اور آخرین کا نقل کرنا حکایت کی جہت پر فضول ہے۔ رہا فرا کے قول سے استشہاد تو یہ ضعیف ہے اس لئے کہ اس میں ضرورۃ تخفیف کا احتمال ہے یا دوسری لغت کا احتمال ہے اور صاحب قاموس نے ذکر کیا ہے کہ اللہ پاک ان کی روح کو ہمیشہ راحت میں رکھے وہ فرماتے ہیں کہ ارزبۃ اور مرزبہ دونوں مشدد ہیں یا صرف پہلا مشدد ہے یہ لوہے کا گرز ہے۔اھ۔ پس ظاہر ہوا کہ ان دونوں میں تشدید اکثر اہل لغت کے ہاں مشہور ہے پس اگر بعض لغات تمام محدثین کے موافق ہو جائیں تو بلا شک وشبہ وہ درست ہے تو اکثر کے ساتھ کیسے درست نہ ہوگا باوجودیکہ تعارض کے وقت محدثین کی جہت راجح ہوتی ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے اور اس سے زیادہ برا ہے بعض علماء کا قراءۃ متواترہ پر طعن کرنا۔ اس لئے کہ وہ ان کے سماع کے موافق نہیں ہیں اور یہ واضح کفر ہے اللہ پاک اپنے دین کا والی اور اپنی کتاب کا محافظ ہے اور ثواب اور عذاب پر قادر ہے۔

قولہ :لو ضرب بها جبل لصار ترابًا فيضربه بها ضربة:

اگر اس گرز کے ساتھ پہاڑ کو مارا جائے تو وہ مٹی ہو جائے یعنی اس کے اجزاء پس جائیں مٹی کی طرح۔ پس وہ اس کے ذریعہ مارے گا اور ایک نسخہ میں بها کا لفظ ساقط ہے۔

قولہ :ضربة يسمعها مابين المشرق والمغرب الا الثقلين:

ایسی ضرب جس کی آواز سنے گا اور محسوس کرے گا جو بھی مشرق اور مغرب کے درمیان ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہاں ما بمعنی من ہے سوائے جنوں اور انسانوں کے اور کیا مردے اس سے مستثنٰی ہیں یا اللہ ان کو بتلائے گا پس ظاہری اطلاق پہلی بات کی تائید کرتا ہے اور جو علت ذکر کی گئی ہے وہ دوسری بات ہے۔

قولہ :فيصير ترابًا ثم يعاد فيه الروح:

کافر کے بارے میں اعادہ روح کو مکرر لایا گیا۔ شدتِ عذاب کو بیان کرنے کے لئے اور اس لئے کہ وہ اعادہ کا منکر تھا پس اس سے کہا جائے گا اور اس کو چکھ۔ اس کی جزاء کے طور پر جو تو انکار کیا کرتا تھا اور بعید نہیں ہے کہ اس سے دلیل پکڑے وہ شخص جو کہتا ہے کہ قبر میں دو موتیں ہیں اور دو زندگیاں ہیں اللہ پاک کے اس قول کی تفسیر میں کہ:

﴿قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ﴾ [المؤمن : ١١]

''بولیں گے اے رب ہمارے تو موت دے چکا ہم کو دو بار اور زندگی دے چکا دو بار اب ہم قائل ہوئے اپنے گناہوں کے پھر اب بھی ہے نکلنے کو کوئی راہ۔''

حالانکہ تثنیہ سے مراد مکرر لانا اور تکثیر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ﴾ [الملك:٤] ''تو پھر نظر کو دوڑا دو مرتبہ'' اور لوگوں کا قول لبیک جس کا معنی ہے میں دو مرتبہ حاضر ہوں لیکن مفہوم ہے میں بار بار حاضر ہوں۔ اسی طرح سعدیک جس کا لفظی معنی ہے میں آپ کی خدمت کے لئے دو مرتبہ تیار ہوں لیکن مفہوم ہے کہ بار بار تیار و حاضر ہوں اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے حقیقت تثنیہ مراد ہو اور حدیث کا ظاہر یہی ہے اور ابن حجر کے قول کا معنی یہ ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ اس پر قبر میں عذاب ہمیشہ ہوگا۔ پس احتمال ہے کہ جب اس میں روح کا اعادہ کیا جائے گا تو دوسری مرتبہ مارا جائے گا پس وہ مٹی

ہو جائے گا پھر اس میں روح کا اعادہ کیا جائے گا اور اسی طرح کیا جائے گا اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اعادہ مکرر نہ ہو اور اس کا عذاب اس کے بغیر ہو اور حدیث کا ظاہر یہی ہے اور ابن الملک نے کہا ہے کہ ان سے عذاب ان کی موت کی وجہ سے منقطع نہیں ہوگا بلکہ ان کی موت کے بعد ان میں روح کا اعادہ کیا جائے گا تا کہ عذاب زیادہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اعادہ روح کنایہ ہو ان کی پہلی حالت کی طرف رجوع سے اور ان کے مٹی ہونے سے لازم نہیں آتا کہ ان سے روح نکل جائے اس لئے کہ آخرت کے موخرقِ عادت پر مبنی ہیں۔

قبر کے قریب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ عزوجل کے خوف سے رونا

۱۳۲: وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّهٗ كَانَ اِذَا وَقَفَ عَلٰى قَبْرٍ بَكٰى حَتّٰى يَبُلَّ لِحْيَتَهٗ فَقِيْلَ لَهٗ تَذْكُرُ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ فَلَا تَبْكِيْ وَتَبْكِيْ مِنْ هٰذَا فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْقَبْرَ اَوَّلُ مَنْزِلٍ مِنْ مَنَازِلِ الْاٰخِرَةِ فَاِنْ نَجَا مِنْهُ فَمَا بَعْدَهٗ اَيْسَرُ مِنْهُ وَاِنْ لَمْ يَنْجُ مِنْهُ فَمَا بَعْدَهٗ اَشَدُّ مِنْهُ قَالَ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا رَاَيْتُ مَنْظَرًا قَطُّ اِلَّا وَالْقَبْرُ اَفْظَعُ مِنْهُ۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ)

أخرجه أحمد في المسند ۱/۶۳۔وأخرجه الترمذي ۴/۴۷۹ حديث رقم ۲۳۰۸ وقال حسن غريب وأخرجه ابن ماجة ۲/۲/۱۴۴۶ حديث رقم ۴۲۶۷۔

ترجمہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ جب وہ کسی قبر کے پاس کھڑے ہوتے تو اللہ تعالیٰ کے خوف سے اس قدر روتے کہ ان کی داڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ ان سے کہا گیا کہ آپ جب جنت اور جہنم کا ذکر کرتے ہیں تو نہیں روتے اور اس مقام پر آپ کھڑے ہو کر روتے ہیں۔ اس کے جواب میں حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کہ آخرت کی منزلوں میں سے سب سے پہلی منزل قبر ہے۔ جس نے قبر میں نجات حاصل کر لی اس کو اس کے بعد بھی آسانی ہے اور جس نے اس منزل سے نجات حاصل نہیں کی اس کے لئے اس کے بعد سخت دشواری ہے۔ حضرت عثمانؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے کبھی کوئی منظر قبر سے زیادہ سخت گھبراہٹ والا نہیں دیکھا۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قولہ :انه اذا وقف على قبر بكى حتى يبل لحيته:

اور آپ یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہمیشہ یا اکثر جب قبر کے کنارے یا قبر کے پاس کھڑے ہوتے تو روتے یہاں تک کہ ان کے آنسوؤں سے ان کی داڑھی تر ہو جاتی۔

قولہ :فقيل له تذكر الجنة والنار فلا تبكي و تبكي من هذا۔

پس ان سے کہا گیا کہ آپ جنت اور دوزخ کا تذکرہ کرتے ہیں۔ پس دوزخ کے خوف اور جنت کے اشتیاق میں نہیں

روتے یعنی ہمیشہ نہیں روتے اور قبر سے یعنی قبر کے خوف سے روتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ روتے تھے حالانکہ آپ منجملہ ان صحابہ میں سے تھا جن کو جنت کی خوشخبری سنائی گئی تھی۔ یہ یا تو اس لئے تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی آپ کی عدم موجودگی میں ہوئی اور آپ تک اس کی خبر نہیں پہنچی یا آپ کے پاس آحاد کے طور پر پہنچی۔ پس اس سے یقین کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا یا اس لئے روتے تھے کہ معلوم ہو جائے کہ میں روتا ہوں باوجود عظمت شان کے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جنت کی گواہی کے۔ سو میرے علاوہ زیادہ لائق ہیں کہ اس سے خوف کریں اور اس سے بچیں اور ابن الملک کہتے ہیں کہ جواب میں زیادہ ظاہر یہ ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ جنت کی بشارت سے عذاب قبر کا نہ ہونا لازم نہیں آتا بلکہ مطلقاً دوزخ کے عذاب کا نہ ہونا بھی لازم نہیں آتا ساتھ اس احتمال کے کہ بشارت کسی معلوم یا مبہم قید کے ساتھ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت آپ کو بشارت بھول جاتی ہو شدتِ خوف کی وجہ سے یا آپ کا رونا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی کی وجہ سے ہو اور آپ کے صحابہ کی جدائی کی وجہ سے یا ظلم وستم کے زمانے کی آزمائش کی وجہ سے اور ممکن ہے خوفِ قبر کی وجہ سے ہو جیسا کہ سعد کی حدیث میں آئے گا جو دلالت کرتی ہے کہ اس سے کوئی نیک بخت بھی نہیں بچے گا سوائے انبیاء کے اور ممکن ہے آپ کا رونا مؤمنین کے لئے رحمت کے طور پر ہو۔

قوله :فقال ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قال ان القبر اول منزل من منازل الاخرة:

اوران منازل میں سے قیامت کی پیشی تک کا عرصہ ہے اور ان منازل میں سے میزان کے پاس کھڑا ہونا اور ان میں سے پل صراط سے گزرنا ہے اور ان میں سے ہی جنت یا دوزخ میں اور بعض روایات میں ہے کہ یہ قبر دنیا کی منازل میں سے آخری منزل ہے اور اسی وجہ سے اس کو برزخ کہتے ہیں۔

قوله :فان نجامنه فما بعده ايسر منه:

پس اگر قبر میں دفن کیا جانے والا عذابِ قبر سے بچ گیا تو بعد کی منازل زیادہ آسان اور سہل ہوں گی اس لئے کہ اگر اس پر گناہ ہوتا تو عذابِ قبر سے کفارہ ہو جاتا۔

قوله :وان لم ينج منه فما بعده اشدّ منه:

اور اگر وہ عذابِ قبر سے نہ بچ سکا اور اس کے ذریعہ اس کے گناہوں کا کفارہ نہ ہوا اور اس کے ذمہ کوئی چیز باقی رہی جس کے ذریعہ عذاب کا مستحق ہو تو بعد کا عذاب اس سے سخت ہے اس لئے کہ آگ زیادہ سخت عذاب ہے اور قبر آگ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ ابن حجر نے کہا ہے کہ مابعد ایسر اس لئے ہوگا کہ اس کا ایمان محقق ہو گیا جو دردناک عذاب سے بچانے والا ہے اور مابعد اشد اس لئے ہوگا کہ اس کا کفر محقق ہو گیا جو اس پر زائد شدائد کے پے در پے آنے کا موجب ہے اور اس میں واضح بحث ہے۔

قوله :قال و قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ما رأيت منظرا قط:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے کوئی منظر نہیں دیکھا منظر میم کے فتحہ اور ظا کے ساتھ ہے یعنی ایسی جگہ جس کی طرف دیکھا جائے اور مبالغۃً جگہ کو منظر کہتے ہیں اس لئے کہ جب کسی چیز کی نفی کی جائے اس کے لازم

کے ساتھ تو اس چیز کی نفی بطریق برہانی ہوتی ہے۔ قط کا لفظ قاف کے فتحہ کے ساتھ اور طاء کی تشدید اور ضم کے ساتھ ہے یعنی ہمیشہ اور یہ استعمال نہیں ہوتا مگر ماضی میں۔

قوله :الا و القبر افظع منه:

افظع کا لفظ فظع (ظاء کے ضمہ کے ساتھ) سے مشتق ہے۔ یعنی منکر ہو یعنی زیادہ شدید زیادہ گھبراہٹ والا اور زیادہ منکر ہے اس منظر سے۔ کہا گیا ہے کہ مستثنیٰ جملہ حالیہ ہے منظر سے اور وہ موصوف ہے جس کی صفت حذف کی گئی ہے یعنی میں نے کبھی رسوائی کے احوال میں سے کسی حال میں کوئی رسوا کن منظر نہیں دیکھا مگر یہ کہ قبر اس سے زیادہ قبیح ہے۔ پس استثناء مفرغ ہے اور زیادہ رسوا کن اس لئے ہے کہ یہ سزا کا مقدمہ ہے اور مال' اولاد اور ساتھیوں کے تعلق کی انتہا ہے اور ذلت' اندھیری' دہشت' حیرت' وحشت' اجنبیت' کیڑوں' مٹی اور عذاب کے فرشتوں کے آنے کی جگہ اور حساب کے مشاہدہ اور حجاب کے مراقبہ کی طرف رجوع کی غایت ہے اور ایسی جگہ ہے کہ فائدہ نہیں دے گا مگر رب الارباب۔

تدفین سے فارغ ہو کر میت کے لئے دُعا کرو

۱۳۳ : وَعَنْهُ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا فَرَغَ مِنْ دَفْنِ الْمَيِّتِ وَقَفَ عَلَيْهِ فَقَالَ اِسْتَغْفِرُوْا لِاَخِيْكُمْ ثُمَّ سَلُوْا لَهٗ بِالتَّثْبِيْتِ فَاِنَّهُ الْاٰنَ يُسْاَلُ . (رواہ ابوداود)

أخرجه أبو داؤد في السنن ۳/ ۵۵۰ حديث رقم ۳۲۲۱۔

ترجمہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے یہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب میت کو دفن کرنے سے فارغ ہوتے تو قبر کے پاس کھڑے ہو کر لوگوں سے فرماتے اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو اور اس کے لئے ثابت قدم رہنے کی دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس وقت اس کو ثابت قدم رکھے اس لئے کہ اس وقت اس سے سوال کیا جاتا ہے اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح :قوله :اذا فرغ من دفن الميت وقف عليه:

فرغ: معروف اور مجہول دونوں طرح ہے میت سے مراد جنس ہے اور یہ نکرہ کے قریب ہے وقف علیہ یعنی قبر کے کنارے کھڑے ہوئے۔

قوله :فقال استغفرو لاخيكم:

پس اپنے اصحاب سے کہتے کہ اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو یعنی مغفرت طلب کرو اپنے مؤمن بھائی کے گناہوں کے لئے اور اخ کا لفظ منفعت کے لئے اور دعا کی کثرت کو طلب کرنے کے لئے اور اس میں دلیل ہے کہ زندوں کی دعا مردوں کو فائدہ دیتی ہے اس میں معتزلہ کا اختلاف ہے۔

قوله :ثم سلوا له بالتثبيت:

پھر اس کے لئے ثابت قدمی کی دعا کرو۔ یہاں سوال کا لفظ دعا کو متضمن ہے یہی وجہ ہے کہ باء کے ذریعہ متعدی ہے جیسا

کہ اللہ پاک کا قول ہے: "سأل سائل بعذاب" (ایک سوال کرنے والے نے عذاب مانگا) یعنی اس کے لئے ثابت قدمی کی دعا کرو یعنی کہو: ثبته الله بالقول الثابت یا اللهم ثبته بالقول الثابت (اللہ پاک اس کو مضبوط رکھے مضبوط بات کے ساتھ یا اے اللہ اس کو مضبوط بات کے ساتھ مضبوط رکھ) اور یہ قول منکر نکیر کے سامنے کلمہ شہادت پڑھنا ہے اور یہ افضل ہے اس تلقین سے جس میں اختلاف ہے لیکن اکثر لوگ اس سے غافل ہیں۔

قوله :فانه الآن يسئال:

خطابی کہتے ہیں اس میں دفن کے وقت تلقین پر دلالت نہیں ہے جیسا کہ عادت ہے اور اس میں ہم حدیث مشہور نہیں پاتے اور اس میں بظاہر کوئی حرج بھی نہیں ہے اس لئے کہ اس میں نہیں ہے مگر اللہ کا ذکر اور میت پر اور حاضرین پر اعتقاد کا پیش کرنا اور میت کے لئے اور مسلمانوں کے لئے دعا کرنا اور حشر کے منکرین کو ذلیل کرنا اور یہ سب اچھا ہے اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء میں اور طبرانی نے کتاب الادعیہ میں دفن کے وقت تلقین میت کے بارے میں حدیث ذکر کی ہے اور بعض محدثین نے اس کو صحیح نہیں کہا ہے اور رہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کہ: "لقنوا موتاكم قول لا اله الا الله" کہ اپنے مردوں کو لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کرو۔ تو اس سے مراد موت کے وقت ہے نہ کہ دفن میت کے وقت اور ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے اس میں اشارہ ہے دفن کے اتمام کے بعد تلقین میت کی طرف اور اس کی کیفیت مشہور ہے اور یہ سنت ہے ہمارے مذہب میں معتبر ہے برخلاف اس آدمی کے جو کہتا ہے کہ یہ بدعت ہے کیسے بدعت ہے جبکہ اس میں حدیث صریح ہے جس پر فضائل میں بالاتفاق عمل کیا جاتا ہے بلکہ شواہد کے ذریعہ مضبوط ہو کر درجہ حسن تک پہنچ چکی ہے اور اذکار میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب سے منقول ہے کہ یہ مستحب ہے کہ اس کے پاس قرآن میں سے کوئی چیز پڑھی جائے۔ کہتے ہیں کہ اگر پورا قرآن پاک ختم کیا جائے تو حسن ہے اور سنن بیہقی میں ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اس کو پسند فرماتے تھے کہ میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر سورۂ بقرہ کا اول اور آخر پڑھا جائے۔ یہی طیبی نے کہا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ سورہ بقرہ کا اول میت کے سر کی جانب اور آخر پاؤں کی جانب پڑھا جائے۔

قبر میں ننانوے سانپ مسلط کئے جاتے ہیں

۱۳۴: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیُسَلَّطُ عَلَی الْکَافِرِ فِیْ قَبْرِہٖ تِسْعَۃٌ وَّ تِسْعُوْنَ تِنِّیْنًا تَنْہَسُہٗ وَتَلْدَغُہٗ حَتّٰی تَقُوْمَ السَّاعَۃُ لَوْ اَنَّ تِنِّیْنًا مِنْہَا نَفَخَ فِی الْاَرْضِ مَا اَنْبَتَتْ خَضِرًا رَوَاہُ الدَّارِمِیُّ وَرَوَی التِّرْمِذِیُّ نَحْوَہٗ وَقَالَ سَبْعُوْنَ بَدَلَ تِسْعَۃٌ وَّتِسْعُوْنَ۔

أخرجه الدارمي في السنن ۲/ ۴۲۶ حديث رقم ۲۸۱۵۔ وأخرجه أحمد في المسند ۳/ ۳۸ والترمذي بنحوه من حديث طويل وذكر "سبعين" بدل "تسعة وتسعون" ۴/ ۵۵۱ حديث رقم ۲۴۶۰۔

ترجمہ: حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قبر میں کافر پر ننانوے سانپ مسلط کئے جاتے ہیں جو اس کو قیامت تک کاٹتے اور ڈستے ہیں اور وہ سانپ ایسے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک سانپ اس زمین پر پھونک مار دے تو زمین سبزہ اگانا چھوڑ دے اس حدیث کو امام دارمی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ

سے بھی اسی قسم کی حدیث منقول ہے لیکن اس میں ننانوے کی بجائے ستر کی تعداد ذکر کی گئی ہے۔

تشریح: قوله :ليسلط على الكافر في قبره:

ليسلط :دونوں لاموں کے فتحہ اور دوسرے لام کی تشدید کے ساتھ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کے اوپر عذاب اور تکلیف دینے کے لئے مقرر کرے گا۔ تنینا تاء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور نون کی تشدید کے ساتھ ہے۔ بڑے سانپ کو کہتے ہیں جو بہت زہریلا ہوتا ہے اور تخصیص عدد کی وجہ نہیں معلوم ہوئی مگر وحی کے ساتھ اور احتمال ہے کہ یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں پس کافر نے اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا ہے جس کے لئے یہ نام ہیں پس ہر نام کے عدد کے بدلہ میں اس کے اوپر ایک اژدھا مسلط کرے گا یا یہ کہا جائے کہ مروی ہے کہ اللہ کے لئے سو رحمتیں ہیں ان میں سے ایک دنیا میں اتاری جو انسانوں، جنوں، جانوروں، کیڑے مکوڑوں کے درمیان ہے اس کے ذریعہ وہ ایک دوسرے پر شفقت کرتے ہیں اور رحم کرتے ہیں اور اس کے ذریعہ وحشی جانور اپنے بچے پر شفقت کرتا ہے اور ننانوے رحمتیں آخرت میں مؤمنین کے لئے مؤخر کی ہیں پس کافر پر مؤمنین کی رحمت کے بدلہ ایک اژدھا مسلط ہو جائے گا ایسے ہی ابن الملک نے کہا ہے اور حجۃ الاسلام نے کہا ہے کہ اژدھوں کی تعداد اخلاقِ ذمیمہ کی تعداد کے بدلہ میں ہے جو اس کافر میں ہیں اور وہ آخرت میں سانپوں کی طرف منقلب ہوں گے اس لئے کہ دنیا عالم صورت ہے اور آخرت عالم معنی ہے۔ طیبی کہتے ہیں کہ پہلا اژدھا جو شخص کے ساتھ نازل ہوگا وہ متبوعات اور مکروہات سے ہوگا (یعنی یہ اژدہے کی شکل میں آئیں گے) پس اس میں عربی طریق پر گنجائش ہے لیکن حدیث کے ظاہر کو لینا عقلمندوں کے ہاں اولیٰ ہے اور رہا عقل کے طریق پر اس کا محال ہونا پس یہ اس کا راستہ ہے جس کا دین میں حصہ نہیں۔ اللہ پاک ہمیں عقل کے پھسلنے اور سینے کے فتنہ سے محفوظ فرمائے۔

قوله :تنهسه:

تانیث کے ساتھ ہے اور کہا گیا ہے کہ تذکیر کے ساتھ ہے اور یہ سین کے ساتھ اور شین کے ساتھ بھی مروی ہے۔ پس نہایہ میں ہے نہس کہتے ہیں گوشت کو دانتوں کے اطراف سے لینے کو اور نہش کہتے ہیں پورے دانتوں سے لینے کو اور قاموس میں ہے نهس اللحم منع اور سمع کی طرح ہے سامنے کے دانتوں سے لینا اور اکھیڑنا اور نهشه منعه کی طرح ہے نہسہ دانتوں سے کاٹا لسعه، ڈسا عضه، ڈاڑھوں سے کاٹا یا ڈاڑھوں سے پکڑا اور سین کے ساتھ دانتوں کے اطراف سے لینے کے معنی میں آتا ہے۔

قوله :وتلدغهٗ:

دال کے فتح کے ساتھ ہے کہا گیا ہے کہ نہس اور لدغ ایک معنی میں ہے دونوں کے درمیان جمع کیا تاکید کے طور پر یا عذاب کی انواع کو بیان کرنے کیلئے اور کہا گیا ہے کہ نہس دانت کے ذریعہ کاٹنے کو کہتے ہیں، زہر کو بھیجے بغیر اور لدغ دانت مارنے کو کہتے ہیں بغیر کاٹے لیکن ساتھ اس میں زہر بھیجنے کے۔ ایسے ابہری نے ذکر کیا ہے۔

قوله :حتى تقوم الساعة لو ان تنيناً منها نفخ في الارض ما انبتت خضرا۔

نفخ : خاء کے ساتھ ہے اور کہا گیا ہے کہ حا (بغیر نقط) کے ساتھ ہے اس کے منہ کی ہوا یا حرارت زمین تک پہنچ جائے تو زمین سبزہ نہ اگائے۔ خضرا خاء کے فتحہ اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ ہے یعنی سبز نبات اور ضاد کے سکون اور الف ممدودہ کے ساتھ بھی

مروی ہے فولآ کے وزن پر جیسے حمراء اور اس سے مراد سبزہ ہے اور زیادہ ظاہر ہے کہ تقدیر عبارت حبة خضر آء ہو۔

الفصل الثالث:

قبر کا تنگ ہو جانا

۱۳۵ :عَنْ جَابِرٍ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ حِيْنَ تُوُفِّيَ فَلَمَّا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَوُضِعَ فِيْ قَبْرِهٖ وَسُوِّيَ عَلَيْهِ سَبَّحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَبَّحْنَا طَوِيْلًا ثُمَّ كَبَّرَ فَكَبَّرْنَا فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لِمَ سَبَّحْتَ ثُمَّ كَبَّرْتَ فَقَالَ لَقَدْ تَضَايَقَ عَلٰى هٰذَا الْعَبْدِ الصَّالِحِ قَبْرُهٗ حَتّٰى فَرَّجَهُ اللّٰهُ عَنْهُ. (رَوَاهُ اَحْمَدُ)

أخرجه أحمد في المسند۳/ ۳۶۰۔

ترجمه: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت سعد بن معاذ کے جنازہ میں شرکت کے لئے نکلے جب حضرت سعد کی وفات ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت سعد کو قبر میں اتار کر قبر کی مٹی کو برابر کر دیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کافی دیر تک سبحان اللہ پڑھتے رہے اور ہم بھی تسبیح کرتے رہے پھر آپ نے اللہ اکبر کہا اور ہم نے بھی ساتھ تکبیر کہی پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے تسبیح اور تکبیر کیوں کہی۔ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اس نیک بندے کی قبر تنگ ہوگئی تھی اللہ تعالیٰ نے ہماری تسبیح اور تکبیر سے اس کی قبر کو کشادہ کر دیا۔

تشریح: قوله :خرجنا مع رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم الی سعد بن معاذ حين توفي:

توفي تا اور واؤ دونوں کے ضمہ کے ساتھ ہے اور ان کی فتح بھی بیان کی گئی ہے اور وہ قراءت شاذہ توفی کا معنی ہے یعنی فوت ہوئے۔

قوله :فلما صلی علیه رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ووضع فی قبره وسوی علیه:

سوی علیه کا مطلب ہے اس پر مٹی ڈالی گئی اور دفن کیا گیا اور وضع اور سوی دونوں فعل مجہول ہیں۔

قوله :سبح رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم:

شاید یہ کہ تسبیح تعجب کے لئے ہو یا پاکی بیان کرنے کے لئے ہو اللہ تعالیٰ کی اس بات سے پاکی بیان کرنے کے ارادے سے کہ وہ کسی پر ظلم کریں پھر میں نے ابن حجر کو دیکھا وہ فرماتے ہیں کہ آپ کی تسبیح کی مناسبت ظاہری طور پر اس نیک بندے پر تنگی کے مشاہدہ کی وجہ سے ہے اس لئے کہ ایسے مشاہدہ سے انسان کو اللہ تعالیٰ کے جلال اور عظمت کے مقام استحضار ہو جاتا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے جس کے ساتھ چاہتا ہے کرتا ہے اور یہ مقام پاکی بیان کرنے کے مناسب ہے اس لئے کہ یہ عزت کبریٰ کا مقام ہے اور اس تنزہ کو مقتضی ہے پس تامل کرو۔

قوله :فسبحنا طويلًا ثم كبر فكبرنا:

پس ہم نے بھی آپ کے تابع ہو کر تسبیح بیان کی، طویل۔ طویل دونوں فعلوں (سبح اور سبحنا) کے لئے قید ہے۔ یعنی زمانہ طویل تک یا طویل یعنی کثیر تسبیح۔ پھر آپ نے تکبیر کہی، ہوسکتا ہے تکبیر کشادگی کے بعد ہو۔ پس ہم نے تکبیر کہی آپ کی تکبیر کے بعد آپ کی اقتداء کرتے ہوئے۔ ابن حجر کہتے ہیں اور طویلا نہیں کہا (یعنی کبرنا کے بعد) یا تو پہلے جو ذکر کیا گیا ہے اس پر اکتفاء کرتے ہوئے یا اس لئے کہ یہاں طویل نہ کی ہو اس لئے کہ تکبیر حضرت سعد پر کشادگی کے وقوع کے بعد کہی اور ظاہر یہی ہے اس لئے کہ تکبیر کا ذکر غالباً امر باہر کے مشاہدہ کے بعد ہوتا ہے۔

قوله :فقيل يا رسول الله ﷺ لم سبحت ثم كبرت:

پس کہا گیا ہے اے اللہ کے رسول! آپ نے کیوں تسبیح کی پھر تکبیر کہی حالانکہ مقام اس کا تقاضا نہیں کر رہا تھا۔

قوله :لقد تضايق على هذا العبد الصالح قبره:

یہ اشارہ ہے ان کے کمال تمیز کی طرف اور ان کے رتبہ کی بلندی کی طرف پھر اس کو عبد کے ساتھ موصوف کیا اور اس کی صفت صالح بیان کی مزید ڈرانے کے لئے اور اللہ کی طرف التجاء پر ابھارنے کے لئے اس رسوا کن منزل سے بچنے کے لئے یعنی جب اس عبد صالح کا یہ حال ہے تو غیر کا کیا حال ہوگا۔

قوله :حتى فرجه الله عنه:

فرج تشدید کے ساتھ ہے اور تخفیف کے ساتھ بھی ہے یعنی آپ ﷺ برابر تسبیح کے لئے کھڑے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس عذاب کو ہٹا لیا اور زائل کر دیا۔ طیبی کہتے ہیں حتی محذوف کے ساتھ متعلق ہے یعنی میں تکبیر کہتا رہوں گا اور تم بھی تکبیر کہتے رہو گے اور میں تسبیح کرتا رہوں گا اور تم بھی تسبیح کرتے رہو گے یہاں تک کہ اللہ اس سے عذاب ہٹائے۔ اھ۔ اور زیادہ مناسب یہ ہے کہ تسبیح و تکبیر کو اس پر مقدم کیا جائے غضب الٰہی کو بجھانے کے لئے یہی وجہ ہے کہ آگ کو دیکھتے وقت تکبیر کا مستحب ہونا وارد ہوا ہے۔

نیک آدمی کی وفات پر عرش حرکت میں آ جاتا ہے

۱۳۶ : وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هٰذَا الَّذِیْ تَحَرَّكَ لَهُ الْعَرْشُ وَفُتِحَتْ لَهُ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَشَهِدَهٗ سَبْعُوْنَ اَلْفًا مِّنَ الْمَلَآئِكَةِ لَقَدْ ضُمَّ ضَمَّةً ثُمَّ فُرِّجَ عَنْهُ ۔ (رَوَاهُ النِّسَائی)

أخرجه النسائي في السنن ٤/ ١٠٠ حديث رقم٢٠٥٥۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سعد بن معاذ وہ شخصیت ہے کہ جن کے لئے عرش الٰہی نے حرکت کی۔ یعنی جب ان کی پاکیزہ روح آسمان پر پہنچی تو اہل عرش نے خوشی اور مسرت کا اظہار کیا اور ان کے لئے آسمان کے دروازے کھولے گئے اور ان کے جنازہ میں ستر ہزار فرشتے شریک ہوئے لیکن ان کی قبر بھی تنگ کی گئی۔ پھر یہ تنگی رسول اللہ ﷺ کی تسبیح اور تکبیر کی برکت سے دور ہوئی۔ اس حدیث کو امام نسائیؒ نے

روایت کیا ہے۔

تشریح: **قوله :هذا الذى تحرك له العرش:**

هذا اشارہ ہے سعد مذکور کی طرف اور یہ تعظیم کے لئے ہے جیسا کہ حدیث اول میں ہے اور ایک روایت میں **تحدث** کے بجائے **اهتز** ہے۔ نہایہ میں ہے کہ **هز** کی اصل حرمت ہے اور **اهتنز** اس وقت کہتے ہیں جب حرکت کرے اور ارتیاح کے معنی میں مستعمل ہے یعنی اس کے چڑھنے سے ہو۔ اور اللہ کے ہاں اس کی کرامت سے خوش ہوا اور یہ وہ شخص جو کسی امر کے لئے خفیف ہو وہ ہلا یعنی حرکت کی۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ عرش اگرچہ جماد ہے لیکن بعید نہیں ہے' اللہ پاک اس میں ادارک ڈال دیں جس کی وجہ سے وہ ارواح اور ان کے کمالات کے درمیان تمیز کرے اور یہ امر ممکن ہے۔ شراح نے اس کو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی مزید فضیلت کے لئے بیان ذکر کیا ہے اور قبر کی تنگی سے لوگوں کے لئے ترہیب بنایا ہے لہٰذا اس کو اپنے ظاہر پر محمول کرنا متعین ہو گیا۔ یہاں تک کہ لوٹا دیا جائے گا اس کو جو اس سے پھیرے اور کہا گیا ہے کہ آپؓ کی موت اور آپ کی روح کے چڑھنے سے اہل عرش کی خوشی مراد ہے اور عرش کو حامل عرش کے قائم مقام کیا گیا یا یہ مضاف کی تقدیر کے ساتھ ہے اور سیوطی نے مختصر نہایہ میں کہا ہے: **اهتنز العرش لموت سعد** میں عرش سے مراد یہاں سعد کی چارپائی ہے اور اس کا ہلنا سعد کو اٹھانے کی خوشی سے ہے' مدفن کی طرف۔

قوله و فتحت له ابو اب السمآء:

فتحت تخفیف کے ساتھ ہے اور کہا گیا ہے کہ تشدید کے ساتھ ہے تکثیر کے لئے ہے' اس کے لئے آسمان کے دروازے کھلے نزولِ رحمت کے لئے اور فرشتوں کے نزول کے لئے یا ان کو مزین کیا گیا آپؓ کے آنے کی وجہ سے اور آپ کی روح کے آنے کی وجہ سے اس لئے کہ مؤمنین کی ارواح کا محل جنت ہے اور وہ ساتویں آسمان کے اوپر ہے یا دروازوں کے سامنے پیش کے طور پر کہ جس دروازہ سے چاہیں داخل ہو جائیں۔ آپ کے کمال کی عظمت کے باعث جیسا کہ بعض مؤمنین کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھل جائیں گے۔

قوله :وشهده سبعون الفا من الملائكة:

آپ کے جنازے پر ستر ہزار فرشتے حاضر ہوئے' آپ کی تعظیم کے لئے۔

قوله :لقد ضم ضمة ثم فرج عنه:

قسم مقدر کا جواب ہے۔ ضمّ **ضمة** کے ساتھ ہے۔ یعنی سعد کو قبر میں ایک مرتبہ بھینچا گیا۔ **ضمّة** میں تنوین کا احتمال ہے کہ تفخیم کے لئے ہو اور تقلیل کے لئے اور پہلا زیادہ ظاہر ہے' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسبیح کے طویل ہونے کی وجہ سے پھر اللہ پاک نے ان سے تنگی کو ہٹا لیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت سے۔

قبر کا فتنہ دجال کے فتنہ سے قریب تر ہے

۱۳۷ :وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ اَبِىْ بَكْرٍ قَالَتْ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطِيْبًا فَذَكَرَ فِتْنَةَ

الْقَبْرِ الَّتِیْ یُفْتَنُ فِیْهَا الْمَرْءُ فَلَمَّا ذَكَرَ ذٰلِكَ ضَجَّ الْمُسْلِمُوْنَ ضَجَّةً رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ هٰكَذَا وَزَادَ النَّسَائِیُّ حَالَتْ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اَنْ اَفْهَمَ كَلَامَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا سَكَنَتْ ضَجَّتُهُمْ قُلْتُ لِرَجُلٍ قَرِیْبٍ مِّنِّیْ اَیْ بَارَكَ اللّٰهُ فِیْكَ مَاذَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ اٰخِرِ قَوْلِهٖ قَالَ قَالَ قَدْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّكُمْ تُفْتَنُوْنَ فِی الْقُبُوْرِ قَرِیْبًا مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ ۔

أخرجه البخاري ٣/٢٣٢ حديث رقم١٣٧٣۔ والنسائي مع زيادة ٤/١٠٣ حديث رقم ٢٠٦٢۔

ترجمہ: حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور قبر کے فتنہ کا ذکر کیا جس میں انسانوں کو مبتلا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ لوگ آپ کے اس وعظ سے خوف زدہ ہو کر روتے اور چلاتے رہے۔ اس حدیث کو اس طرح امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے اور امام نسائی نے اتنا اضافہ اور زیادتی کی ہے۔ کہ خوف اور دہشت کی وجہ سے 'مسلمانوں کے رونے اور چلانے کی وجہ سے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز نہ سن سکی۔ جب یہ چیخنا اور چلانا ختم ہوا۔ تو میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص سے پوچھا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا کرے۔ آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ارشاد فرمایا؟ اس آدمی نے کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ پر یہ وحی آئی ہے کہ تم قبر کے اندر فتنہ میں ڈالے جاؤ گے۔ یعنی تم کو آزمایا جائے گا اور یہ امتحان دجال کے فتنہ کے قریب ہوگا۔

راویٔ حدیث:

اسماء بنت ابی بکر۔ یہ "اسماء" رضی اللہ عنہا ہیں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی۔ اور ان کو "ذات النطاقین" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے جس رات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی تھی اپنے پٹکے کو پھاڑ کر دو حصے کئے تھے۔ اس کے ایک حصہ میں توشہ دان کو باندھا اور دوسرے کو مشکیزہ پر باندھا۔ یا اس کا پٹکا بنا لیا تھا اور یہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں۔ مکہ میں اسلام لائی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک صرف سترہ (۱۷) آدمیوں نے اسلام قبول کیا تھا اور یہ اپنی بہن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دس برس بڑی تھیں۔ جب آپ کے بیٹے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی نعش کو (جو بعد قتل ایک لکڑی پر لٹکا دی گئی تھی) لکڑی پر سے اتار کر دفن کر دیا گیا تو اس سے دس سے بیس (۲۰) دن بعد بعمر ایک سو برس مکہ میں انتقال کیا۔ اس وقت ۷۳ ھ تھا۔ ان سے بہت لوگوں نے احادیث کی روایت کی ہے۔

اتنی عمر رسیدہ ہونے کے باوجود نہ ان کا کوئی دانت ٹوٹا' اور نہ عقل میں کچھ فرق واقع ہوا۔ اسماء غیر منصرف ہے علیت اور تانیث معنوی کی وجہ سے۔ کہا گیا ہے کہ اسماء اصل میں وسماء بروز فعلاء تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسماء اسم کی جمع ہو۔ عرض مرتب: "ذات النطاقین" اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کی تفصیل جلد دہم' باب مناقب قریش وذکر الفضائل' فصل ثالث حدیث ۶۰۰۳ کے تحت آئے گی۔

تشریح: قوله: فذكر فتنة القبر التی یفتن فیها المرأ:

یعنی قبر کے عذاب یا ابتلاء اور امتحان کو ذکر فرمایا۔ یفتن مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے یعنی آزمایا جائے گا۔ التی یفتن

فیها المرأ۔ یہ فتنہ کے لئے صفت ہے یعنی فتنہ کو اس کی تفاصیل کے ساتھ ذکر فرمایا جیسا کہ وہ آدمی پر جاری ہوتا ہے اس کی قبر میں۔

قوله :فلما ذكر ذلك ضجّ المسلمون ضجة:

پھر جب آپ نے مذکورہ بات کو ذکر فرمایا یا فتنہ یعنی آزمائش کو ذکر فرمایا تو مسلمان چیخنے اور چلانے لگے، بہت چلانا۔ ضجة میں تنوین تعظیم کے لئے ہے۔

قوله :فلمّا سكنت ضجّتهم قلت لرجل قريب منى اى بارك الله فيك۔

جب ان کا چیخنا اور آوازوں کا بلند ہونا ساکن ہوا تو میں نے ایک آدمی سے کہا جو میرے قریب تھا مکان کے اعتبار سے یا نسب کے اعتبار سے اور نسب کے اعتبار سے زیادہ مناسب ہے عورت کی طرف نسبت کرتے ہو۔ ای (حرفِ ندا ہے) اور منادی محذوف ہے یعنی اے فلاں! اللہ تجھے برکت عطا کرے علم کے اعتبار سے یا حلم کے اعتبار سے اور یہ من جملہ آدابِ متعلّم میں سے ہے۔

قوله :ماذا قال رسول الله ﷺ فى آخر قوله قال قال قد اوحى الى انكم تفتنون فى القبور قريبًا من فتنة الدجال:

فى آخر قوله یعنی چیخ و پکار کے بعد تو اس آدمی نے کہا کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ میری طرف جلی یا خفی وحی آئی ہے کہ اے امت تم فتنہ میں ڈالے جاؤ گے تفتنون صیغہ مجہول کے ساتھ ہے یعنی تمہارا امتحان ہوگا، قبروں میں فتنہ دجال کے قریب۔ طیبی کہتے ہیں قریبی فتنہ ہوگا اور ذکر کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول میں ہے: ان رحمة الله...... بے شک اللہ کی رحمت محسنین کے قریب ہے۔ یعنی عظیم فتنہ ہوگا، اس لئے کہ فتنوں میں کوئی فتنہ دجال کے فتنہ سے بڑا نہیں ہے۔

قبر میں نماز پڑھنے کی آرزو

۱۳۸ : وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا اُدْخِلَ الْمَيِّتُ الْقَبْرَ مُثِّلَتْ لَهُ الشَّمْسُ عِنْدَ غُرُوْبِهَا فَيَجْلِسُ يَمْسَحُ عَيْنَيْهِ وَيَقُوْلُ دَعُوْنِىْ اُصَلِّىْ. (رواه ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجة ۲/۱۴۲۸ حديث رقم۴۲۷۲۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب مؤمن مردہ کو قبر کے اندر دفن کر دیا جاتا ہے۔ تو اس کے سامنے غروب آفتاب کا وقت پیش کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ مردہ اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو ملتا ہوا اٹھ بیٹھتا ہے اور کہتا ہے مجھے چھوڑ دو تا کہ میں نماز پڑھ لوں۔ اس حدیث کو امام ابن ماجہؒ نے بیان کیا ہے۔

تشریح :قوله :اذا ادخل الميت القبر مثلت له الشمس:

قبر پر نصب ہے ظرفیت کے طور پر مثلت له الشمس یعنی سورج ان کے تصور اور خیال میں لایا جائے گا۔

قوله :عند غروبها:

یہ حال ہے شمس سے یعنی اس حال میں کہ وہ غروب کے قریب ہو۔ابن حجر کہتے ہیں یعنی اس حال میں کہ وہ غروب ہونے والا ہو۔مثلت کے لئے ظرف نہیں ہے اس لئے کہ اس کا تقاضا ہے کہ تمثیل نہ ہو مگر اس وقت کی۔حالانکہ ایسا نہیں ہے اس لئے کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ بات نزولِ ملائکہ کے وقت ہوگی یا سوال و جواب کے بعد ہوگی اور یہ اس وقت کے ساتھ مقید نہیں بلکہ یہ عام ہے دن اور رات کے تمام اجزاء میں۔پس متعین ہو گیا کہ تمثیل اس حالت کی ہے جب وہ غروب ہونے والا ہو۔یہی عام ہے تمام زمانوں کو اور یہ نہیں ہوگا مگر مؤمن کے حق میں اور شاید نزولِ ملائکہ کے وقت ایسا ہونا اشارہ ہو نیکی کے کاموں میں اس کی دوڑ کی طرف اور اشارہ ہو ان کے اس قول کی طرف کہ جیسے زندگی گزارو گے ویسے مرو گے اور جیسے مرو گے ویسے ہی جمع کئے جاؤ گے اور ممکن ہے کہ سوال و جواب کے بعد تنبیہ ہو اس کے آرام اور نعمت کے شکر کے طور پر کھڑے ہونے پر۔یہ طیبی رحمۃ اللہ کا قول ہے اور پہلی بات زیادہ ظاہر ہے اس قول کی وجہ سے (جو آگے آرہا ہے)۔

قوله فيجلس يمسح عينيه و يقول دعوني اصلي:

یجلس: صیغہ معلوم کے ساتھ ہے اور کہا گیا ہے کہ مجہول کے ساتھ ہے۔ **یمسح** یعنی اس حال میں کہ اپنی آنکھوں کو مَل رہا ہوگا۔نیند سے جاگنے والی کی ہیئت پر اس لئے کہ نیند موت کی بہن ہے اور وارد ہے :**الحمد لله**......تمام تعریفیں اس اللہ کی ہیں جس نے ہمیں زندہ کیا مرنے کے بعد اور کہے گا کہ مجھ سے کلام کو چھوڑ اور مجھ سے سوال کرنے کو چھوڑ۔میں نماز کا ارادہ کرتا ہوں موت سے پہلے فوت ہونے کے خوف سے۔گویا کہ وہ گمان کرے گا کہ دنیا میں چلا گیا ہے اور ادا کرتا ہے جو اس کے اوپر قرض ہے اور اس کے بعض ساتھی اس کو نماز کی طرف کھڑے ہونے میں رکاوٹ بن کر رہے ہیں اور یہ دنیا میں ادائیگی میں اس کے رسوخ اور مداومت کی وجہ سے ہے اور غروب کے ذکر کی تخصیص اس لئے ہے کہ یہ اجنبی کے مناسب ہے اس لئے کہ یہ پہلی منزل ہے جہاں وہ غروب کے وقت اترتا ہے۔طیبی رحمۃ اللہ کہتے ہیں ابن حجر نے کہا ہے اس لئے کہ غالب یہ ہے کہ سفر کی ابتداء دن کے شروع میں ہوتی ہے پس اس نے پہلا مرحلہ مؤخر کیا ہے غروب کے وقت اور ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ اس کی وجہ نمازِ عصر کی تاکید کی طرف اشارہ کرنا ہو اور یہ کہ وہی صلاۃِ وسطیٰ ہے۔پس اس کے لئے آخری وقت کی تمثیل لی گئی تاکہ وہ اس نماز کو طلب کرے۔اس کی مزید فضیلت کا اعلان کرتے ہوئے اور اس کی تاکید کا اعلان کرتے ہوئے یا منافقین کے احوال سے حفاظت کرتے ہوئے۔پس وہ بیٹھے رہتے ہیں غروبِ شمس کا انتظار کرتے ہیں' یہاں تک کہ سورج جب غروب ہونے کے قریب ہوتا ہے چار رکعتوں کی چٹکی مارتے ہیں۔ان میں ذکر نہیں کرتے مگر تھوڑا جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔پس میت جلدی کرے گا جب مانع زائل ہو جائے گا اور اس کے لئے اس وقت کی تمثیل دی نماز کی طرف تاکہ چھوٹ جائے اپنے عیب جوؤں سے اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ غروب اشارہ ہے اس کے دنیا سے کوچ کرنے کی طرف اور اس سے زائل ہونے اور اس سے غروب ہونے کی طرف۔اس لئے کہ قبر دنیا کی منزلوں میں سے آخری منزل ہے اور برزخ مشابہ ہے اس رات کے جو گزشتہ اور آنے والے دن کے درمیان فاصل ہوتی ہے اور تحقیق کہا گیا ہے کہ یہ تمثیل قبر کی ظلمت اور مؤمن کامل جو نماز کو اس کے اوقات میں ادا کرنے والا ہے کے نور کے ظہور کے مناسب ہے' اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔

قبر کے احوال

۱۳۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْمَیِّتَ یَصِیْرُ اِلَی الْقَبْرِ فَیُجْلَسُ الرَّجُلُ فِیْ قَبْرِهٖ مِنْ غَیْرِ فَزَعٍ وَلَا مَشْغُوْبٍ ثُمَّ یُقَالُ فِیْمَ کُنْتَ فَیَقُوْلُ کُنْتُ فِی الْاِسْلَامِ فَیُقَالُ مَا هٰذَا الرَّجُلُ فَیَقُوْلُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ جَآءَ نَا بِالْبَیِّنَاتِ مِنْ عِنْدِاللّٰهِ فَصَدَّقْنَاهُ فَیُقَالُ لَهٗ هَلْ رَاَیْتَ اللّٰهَ فَیَقُوْلُ مَا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ اَنْ یَرَی اللّٰهَ فَیُفَرَّجُ لَهٗ فُرْجَةٌ قِبَلَ النَّارِ فَیَنْظُرُ اِلَیْهَا یَحْطِمُ بَعْضُهَا بَعْضًا فَیُقَالُ لَهٗ انْظُرْ اِلٰی مَاوَقَاكَ اللّٰهُ ثُمَّ یُفَرَّجُ لَهٗ فُرْجَةٌ قِبَلَ الْجَنَّةِ فَیَنْظُرُ اِلٰی زَهْرَتِهَا وَمَافِیْهَا فَیُقَالُ لَهٗ هٰذَا مَقْعَدُكَ عَلَی الْیَقِیْنِ کُنْتَ وَعَلَیْهِ مُتَّ وَعَلَیْهِ تُبْعَثُ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰی وَیُجْلَسُ الرَّجُلُ السُّوْءُ فِیْ قَبْرِهٖ فَزِعًا مَشْغُوْبًا فَیُقَالُ لَهٗ فِیْمَ کُنْتَ فَیَقُوْلُ لَا اَدْرِیْ فَیُقَالُ لَهٗ مَا هٰذَا الرَّجُلُ فَیَقُوْلُ سَمِعْتُ النَّاسَ یَقُوْلُوْنَ قَوْلًا فَقُلْتُهٗ فَیُفَرَّجُ لَهٗ فُرْجَةٌ قِبَلَ الْجَنَّةِ فَیَنْظُرُ اِلٰی زَهْرَتِهَا وَمَافِیْهَا فَیُقَالُ لَهٗ اُنْظُرْ اِلٰی مَاصَرَفَ اللّٰهُ عَنْكَ ثُمَّ یُفَرَّجُ لَهٗ فُرْجَةٌ اِلَی النَّارِ فَیَنْظُرُ اِلَیْهَا یَحْطِمُ بَعْضُهَا بَعْضًا فَیُقَالُ هٰذَا مَقْعَدُكَ عَلَی الشَّكِّ کُنْتَ وَعَلَیْهِ مُتَّ وَعَلَیْهِ تُبْعَثُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی۔ (رَوَاهُ اَبْنُ مَاجَه)

أخرجه ابن ماجة ٢/١٤٢٨ حديث رقم ٤٢٧٢۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب مردہ قبر کے اندر پہنچتا ہے۔ یعنی اس کو دفن کر دیا جاتا ہے تو نیک انسان اس طرح قبر میں اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے کہ نہ تو وہ خوف زدہ ہوتا ہے اور نہ ہی اس پر کوئی گھبراہٹ ہوتی ہے پھر اس سے سوال کیا جاتا ہے۔ کہ تم کس دین پر تھے۔ وہ کہتا ہے کہ میں دین اسلام پر تھا پھر اس سے سوال کیا جاتا ہے کہ یہ شخص یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ جو اللہ کی طرف سے ہمارے لئے واضح اور روشن دلائل لے کر آئے ہیں اور ہم نے ان کی تصدیق کی ہے۔ پھر اس سے سوال کیا جاتا ہے کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے؟ وہ جواب میں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا پھر اس کے لئے جہنم کی جانب ایک کھڑکی کھولی جاتی ہے اور وہ آگ کے شعلے اس طرح دیکھتا ہے کہ گویا اس کی لپیٹیں ایک دوسرے کو کھا رہی ہیں اور اس کو کہا جاتا ہے۔ اس چیز کو دیکھو جس سے اللہ تعالیٰ نے تجھے بچایا ہے۔ پھر اس کے لئے جنت کی طرف ایک کھڑکی کھول دی جاتی ہے وہ جنت کی تروتازگی رونق اور اس کی چیزوں کو دیکھتا ہے پھر اس کو کہا جاتا ہے کہ یہ تمہارا ٹھکانہ ہے۔ کیونکہ تمہارا عقیدہ مضبوط اور اس پر تمہیں کامل یقین تھا اور اسی یقین اور اعتماد کی حالت میں تمہاری رحلت ہوئی اور اسی حالت میں تمہیں قیامت کے دن اٹھایا جائے گا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا اور بدکار انسان اپنی قبر میں خوف زدہ اور گھبرایا ہوا اٹھ کر بیٹھتا ہے اور اس سے سوال کیا جاتا ہے کہ تو کس دین پر تھا وہ کہتا ہے میں نہیں جانتا۔ پھر اس سے سوال کیا جاتا ہے۔ یہ شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون تھے؟ وہ جواب میں کہتا ہے میں لوگوں کو جو کچھ کہتے سنتا تھا وہی میں کہتا تھا۔ اس کے بعد اس کے لئے جنت کی طرف ایک کھڑکی کھول دی جاتی ہے جس سے وہ جنت کی تروتازگی اور اس کی چیزوں کو دیکھتا ہے پھر اس سے کہا

جاتا ہے۔اس چیز کی جانب دیکھو جس سے اللہ تعالیٰ نے تجھے محروم کردیا ہے۔ پھراس کے لئے دوزخ کی جانب ایک کھڑکی کھول دی جاتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ آگ کے شعلے ایک دوسرے کو کھا رہے ہیں اور اس کو کہا جاتا ہے کہ یہ تیرا ٹھکانہ ہے ۔اس شک اور تردد کی وجہ سے جس میں تو مبتلا تھا اور جس پر تیری موت واقع ہوئی اور اسی پر تو اٹھایا جائے گا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا۔اس حدیث کو امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله :ان الميت يصير الى القبر:

الميت :میں لام جنس کے لئے ہے اور قبر سے ہر وہ جگہ مراد ہے جہاں انسان موت کے بعد ٹھہرتا ہے۔

قوله :فيجلس الرجل في قبره غير فزع ولا مشغوب۔

کہا گیا ہے کہ يجلس صیغہ مجہول پر ہے الرجل سے رجل صالح مراد ہے جیسا کہ ایک نسخہ میں الرجل کے ساتھ الصالح بھی ہے۔ فزع زاء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور منصوب ہے حالیت کی بناء پر اور قوله ولا مشغوب تاکید ہے۔یہ شغب سے ہے اور یہ شر اور فتنہ کے ابھارنے کو کہتے ہیں۔ابن حجر نے کہا ہے کہ فزع صفت مشبہ ہے مبالغہ پر دلالت کرتا ہے ایسے ہی کہا گیا ہے اور اس میں نظر ہے یہاں اس کو لانے کی وجہ سے۔اس لئے اس کا مطلب جو ایسے ہو (یعنی مبالغہ پر دلالت کر رہا ہو) اصل فعل کے سلب پر دلالت نہیں کرتا' جیسا کہ کہا ہے: ﴿وما ربك بظلام للعبيد﴾ [فصلت: ٤٦] میں۔پس متعین ہوگیا کہ مراد غیر ذی فزع ہے جیسا کہ آیت کی تقدیر ذی ظلم کے ساتھ ہے۔میں کہتا ہوں آیت کی تقدیر مسلّم ہے۔رہی حدیث تو وہ تاویل کی محتاج نہیں' اس لئے کہ فزع کو اصل پر باقی رکھنا اس کے منافی نہیں ہے جیسا کہ اس پر احادیث دلالت کرتی ہیں بلکہ نفس شدۃ فزع پر سند ہے اور "ولا مشغوب" کے قول میں اس کے مدعا پر دلالت نہیں جیسا کہ ذکر کیا ہے۔

قوله :ثم يقال فيم كنت فيقول كنت في الاسلام:

ثم يقال کے بعد اس نسخہ میں له بھی ہے۔ فيم كنت یعنی تو کس دین میں تھا؟ تو وہ کہے گا میں اسلام میں تھا۔یہ اس کے اسلام میں انتہائی پختگی پر دلالت کرتا ہے' برخلاف منافق کے' اس لئے کہ ظاہری جواب یہ ہے کہ وہ صرف یہ کہتا: في الاسلام۔

قوله :فيقال ما هذا الرجل فيقول محمد رسول الله:

پس اس سے کہا جائے گا' یہ آدمی کون ہے؟ ما استفہامیہ مبتداء ہے اور هذا الرجل اس کی خبر ہے یعنی اس کا وصف اور صفت کیا ہے اور تیرا اس بارے میں کیا اعتقاد ہے؟ پس وہ کہے گا محمد ہیں یعنی اس عظیم مشہور نام والے محمد ہیں جو کسی پر مخفی نہیں پھر اپنے قول رسول اللہ سے آپ کا وصف بیان کرے گا اور اس میں احتمال ہے کہ یہ مبتداء محذوف کی خبر ہو یا خبر بعد خبر ہو اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ محمد کی خبر ہے اور جملہ منقول ہے اور یہ متضمن ہے وصف کے ذریعہ جواب کو۔

قوله :جآء نا بالبينات من عند الله فصدقنا:

بینات سے مراد واضح آیات ہیں یا کھلے ہوئے معجزات ہیں' یہ جملہ استنافیہ ہے۔پہلے جملہ کو بیان کرنے والا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ رسول اللہ صفت ہو اور جآء نا خبر ہو اور پہلا زیادہ بہتر ہے۔ من عندالله متعلق ہے جآء سے' یا صفت

ہے یا حال ہے۔ فصدقنا یعنی ہم نے اس سب کی تصدیق کی جو وہ اللہ کی جانب سے لے آئے۔

قوله :فيقال هل رأيت الله فيقول ما ينبغي لاحد ان يرى الله في الدنيا:

کہا گیا ہے کہ یہ سوال اس کے قول عند اللہ سے پیدا ہوا یعنی تو کیسے عند اللہ کہتا ہے کیا تو نے اللہ کو دنیا میں دیکھا ہے؟ پس وہ کہے گا کہ کسی کے لئے صحیح نہیں اعم سے جواب دیا' اس لئے کہ یہ مقصود میں زیادہ تمام ہے کہ وہ اللہ کو دیکھے یعنی آنکھ کے ذریعہ دیکھے' دنیا میں یا اس کی حقیقت کا احاطہ کرے مطلقاً۔

قوله :فيفرج له فرجة:

یفرج تشدید کے ساتھ ہے اور تخفیف کے ساتھ بھی کہا گیا ہے اور دونوں مفعول پر مبنی ہیں یعنی ظاہر کیا جائے گا اور کھولا جائے گا۔ فرجة فاء کے ضمہ کے ساتھ ہے اور کہا گیا ہے کہ اس کے فتحہ کے ساتھ ہے اور یہ نائب فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے اور بعض نسخوں میں اعنی کی تقدیر کے ساتھ منصوب ہے۔

قوله :قبل النار:

قاف کے کسرہ کے ساتھ اور باء کے فتحہ کے ساتھ ہے یعنی اس کی جہت سے منصوب ہے' ظرفیت کی بناء پر یعنی اس کے درمیان اور دوزخ کے درمیان حجاب ہٹا دیا جائے گا' یہاں تک کہ اس کو دیکھے گا۔

قوله :فينظر اليه يحطم بعضها بعضًا:

یعنی مؤمن اس کی طرف دیکھے گا۔ الیہ کی ضمیر نار کی طرف راجع ہے عذاب کی تاویل کے ساتھ اور یحطم بعضها بعضًا میں اس کو مؤنث رکھا گیا ہے لفظ کی طرف دیکھتے ہوئے اور حطم تنگ جگہ میں بند کرنے کو کہتے ہیں جس میں گھوڑے ایک دوسرے کو روندتے ہیں اور معنی یہ ہے کہ اس کو توڑے گا اور یہ غالب آ جائے گا اور اس کا بعض بعض کو کھائے گا۔ اس کے شعلوں کی لپٹوں کی شدت اور ایندھن کی کثرت کی وجہ سے۔

قوله :فيقال له انظر الى ما وقاك الله۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی حفاظت کے ساتھ تجھے کفر اور معاصی سے بچایا جو آگ کی طرف لے جاتے ہیں۔

قوله :ثم يفرج له فرجة قبل الجنة فينظر الى زهرتها ومافيها:

دوزخ کے فرجة کی تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ نقصان کے بعد مسرت زیادہ نفع بخش ہے اور نفس میں زیادہ واقع ہونے والی ہے اور اشارہ ہے اللہ کے فضل کی طرف اس کے عدل کے ظہور کے بعد۔ زهرتها میں زاء کے فتحہ کے ساتھ ہے یعنی اس کے حسن اور رونق کو دیکھے گا اور جو اس میں حوریں ہیں اور محلاوت وغیرہ خیر کثیر اور ملک کبیر میں سے ہے۔

قوله :فيقال له هذا مقعدك على اليقين:

پس اس سے کہا جائے گا کہ یہ تیرا ٹھکانہ ہے آخرت میں یقینی طور پر علی الیقین ہے حال ہے اور اس میں عامل حرف تنبیہ ہے جو فعل کے معنی میں ہے جو متضمن ہے صاحب حال کو اور الیقین میں لام تعریف جنس کے لئے ہے کنت اس کے لئے صفت ہے

اور اسی پر آپ کے قول علی الشك کو اتارا جائے گا اور تقدیر عبارت ہے کہ میں تجھے خبردار کرتا ہوں اس حال میں کہ تو ثابت تھا اپنے یقین پر یا شک پر۔ اس طرح طیبی نے تحقیق کی ہے اس میں تکلف ہے بلکہ بے راہ روی ہے اور ظاہر یہ ہے کہ علی الیقین کنت جملہ مستانفہ ہے متضمن ہے تعلیل کو یعنی یہ تیرا ٹھکانہ ہے اس لئے کہ تو دنیا میں دین کے معاملہ میں یقین پر تھا اور خبر کی تقدیم اہتمام اور اختصاص تمام کے لئے ہے۔ طیبی نے یہی توجیہ کی ہے لیکن اس میں تکلف و تعسف ہے۔

قوله :و علیه مت و علیه تبعث ان شاء الله تعالیٰ:

مت، میم کے ضمہ کے ساتھ بھی ہے اور کسرہ کے ساتھ بھی۔ یعنی جیسے جیسے زندگی گزارتا تھا' ویسے مرے گا اور جیسے مرے گا 'ویسے زندہ کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ کا قول برکت کے لئے ہے اور تحقیق کے لئے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ان شاء الله اٰمنین﴾ [یوسف : ۹۹] اگر اللہ چاہے امن والے ہوں گے۔

قوله:و یجلس الرجل السوء فی قبره ۔

یجلس دونوں طرح ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔ السوء سین کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ضمہ کے ساتھ بھی ہے۔ یہ صالح کی ضد ہے۔ فزعًا کا مطلب ہے خوفزدہ' انتہائی گھبراہٹ والا۔ مشغوبًا کا مطلب ہے ڈرا ہوا۔

قوله :فیقول فیم کنت فیقول لا ادری له:

برے آدمی سے کہا جائے گا کہ تو دین کے معاملہ میں کس پر تھا؟ تو وہ کہے گا کہ میں نہیں جانتا کہ دین کیا ہے یا ہیبت کی وجہ سے اپنا دین بھول جائے گا۔ ابن حجر کہتے ہیں یعنی وہ کیا چیز ہے جس پر تو تھا؟ اور یہ اس کی جانب سے کذب ہے اور جواب مطابق سے پھرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ کفر اور نفاق میں تھا اور پیچھے گزر چکا ہے کہ یہ کلام بے ہوش' متحیر آدمی کا ہے جو مطلق جواب نہیں جانتا جو مطابق ہو یا مطابق نہ ہو درست ہو یا غیر درست ہو۔

قوله :فیقول له ما هٰذا الرجل فیقول سمعت الناس۔

هٰذا الرجل یعنی جس کو تو دیکھتا ہے یا سنتا ہے۔ الناس سے مراد مؤمنین ہیں یا کفار یا دونوں سے عام ہے۔

قوله :یقولون قولا فقلته۔

یعنی اس کے حق میں ایک بات کہتے تھے حق یا باطل جو اس کے گمان میں ہو تو ان کی تقلید کرتے ہوئے میں نے بھی کہا نہ کہ تحقیقًا اور اعتقادًا۔

قوله :فیفرّج له قبل الجنّة فینظر الی زهرتها ومافیها۔

یعنی کھڑکی کھولی جائے گی جیسا کہ ایک نسخہ میں ہے: قبل الجنة جنت کی طرف دوزخ سے پہلے' اس لئے کہ تکلیف نعمت کے بعد زیادہ قوی ہوتی ہے اور زیادہ سخت ہوتی ہے۔ پس وہ اس کی رونق اور جو کچھ اس میں ہے دیکھے گا جیسا کہ وہ دنیا میں اللہ کی نشانیوں کو دیکھتا تھا جو اس کے نفس میں ہوں یا آفاق میں ہوں بغیر ان سے فائدہ اٹھائے۔

قوله :فیقول له انظر الی ما صرف الله عنك۔

پس اس سے کہا جائے گا کہ دیکھ اس کی طرف جو اللہ نے تجھ سے پھیر دی ہے۔ اس طور پر کہ تجھے ذلیل کیا ہے اور تجھے ہدایت نہیں دی اور تجھے توفیق نہیں دی' اس کی طرف جو تجھے جنت کی طرف لے جائے تو نے وہ عمل اور گناہ اختیار کئے جو تجھے جہنم کی طرف لے جائیں۔

قوله :ثم يفرج فرجة الى النار فينظر اليها يحطم بعضها بعضًا:

يفرج کے بعد ایک نسخہ صحیح میں یہ ہے۔ **اليها** میں یہاں مؤنث ضمیر ہے **يحطم** طاء کے کسرہ کے ساتھ ہے **بعضها بعضًا** سے آگ کی بڑھائی کی طرف اشارہ ہے۔

قوله :فيقال هٰذا مقعدك:

یعنی تیرا مکان لازم ہے اور ہمیشہ کا محل ہے۔

قوله :على الشك كنت و عليه مت و عليه تبعث ان شاء الله تعالٰى:

اور یہ سب کچھ اس کی قضاء اور قدر سے ہوگا اور اسی سے اس باب اور ماقبل کے باب میں مناسبت حاصل ہوگئی۔

قرآن وسنت پر اعتماد کرنے کا بیان

عصمہ کے معنی المنع ہے اسی سے اسم فاعل عاصم آتا ہے یہ باب افتعال کا مصدر ہے کسی چیز کو مضبوطی سے تھام کر تمسک کرنا قرآن کریم کی آیت : ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ [آل عمران : ۱۰۳] ''اور سب مل کر خدا (کی ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا'' میں اعْتَصِمُوْا کا یہی معنیٰ ہے کہ قرآن وسنت سے تمسک کرو، یہ ایک قول ہے۔

مشہور قول یہ ہے کہ حبل للہ سے مراد قرآن کریم ہے چنانچہ کچھ احادیث میں صراحتاً بھی آیا ہے۔ لیکن تمسک بالکتاب تمسک بالسنۃ کو مستلزم ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [الحشر : ۷] ترجمہ: (سو جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں اس سے باز رہو اور خدا سے ڈرتے رہو بے شک خدا سخت عذاب دینے والا ہے)۔

سنت سے مراد آنحضرت ﷺ کے اقوال، افعال، اور احوال ہیں جن کے مجموعہ کا نام حدیث ہے ان کو شریعت، طریقت، اور حقیقت کہتے ہیں، آنحضرت ﷺ کا خود ارشاد ہے بعثت لا تمم مکارم الاخلاق، کہ مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل ہی کیلئے بھیجا گیا ہے۔

قضاء وقدر کی بحث کے بعد متصلاً باب الاعتصام بالسنۃ کو مصنف رحمہ اللہ نے لا کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ قضاء وقدر کی بحث کی دلیل نقلی کے سمجھ میں نہیں آسکتی قضاء وقدر کے باب میں عقل کو دخل نہیں نہ عقل سے سمجھ میں آنے والی ہے۔

قدریہ اور جبریہ فرقے گمراہی کی ظلمت میں عقل استعمال کرتے ہیں' کر کے ڈھوبے اور ایسے ڈھوبے کہ حیران وسرگردان ہو کے رہ گئے۔ کیونکہ قضاء وقدر ہمارے نزدیک حکم مجہول میں سے ہے جو صاحب شریعت کے بغیر سمجھنا آسان نہیں کیونکہ مخلوق کا علم ناقص ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے : ﴿اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ [الاسراء ۸۵] کہ ''تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے''۔ حقوق ربوبیت کے قیام کیلئے تعبد محضہ ضروری ہے کیونکہ تعبد محضہ ہی کمال عبودیت ہے۔

الفصل الاول:

دین میں نئی بات ایجاد کرنا بدعت ہے

۱۴۰: عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ. (مُتَّفق عَلَيْه)

أخرجه البخاری فی الصحيح ٥/٣٠١حديث رقم ٢٦٩٧ـوأخرجه مسلم فی صحيحه ٣/١٣٤٣حديث رقم (١٧ـ١٧١٨) وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ٥/١٢حديث رقم ٤٦٠٦ـوأخرجه ابن ماجة فی السنن ١/٧حديث رقم١٤ وأخرجه أحمد فی المسند٦/٢٧٠ـ

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی نئی بات نکالی جو دین میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **قوله: قال: من احدث:** احداث کا معنی نیا دین بنانا، بدعت گھڑنا، یا فتنوں کو جنم دینا، جھوٹ بنانا۔

قوله: فی امرنا هذا ما لیس منه فهو رد: ضمیر کے بعد اسم اشارہ جو کہ بدل ہے یا صلہ ہے فائدہ تعظیم کیلئے لایا گیا ہے، نیز ہمارے دین کے تمام ادیان پر ممتاز ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے۔

(**فهو**): یہ خبر امور محدثہ کی طرف راجع ہے۔ (**ردٌّ**): یعنی وہ مردود علیہ ہیں۔ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کلمہ "ردٌّ" کو دال کی کسرہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ کسرہ والا معنی یہاں مراد نہیں لیا جا سکتا کیونکہ صاحب قاموس کی تحقیق کے مطابق "عماد" کے معنی میں بنتا ہے جو یہاں مقصود نہیں، یعنی جو شخص اپنی فہم اور رائے کے مطابق اسلام میں ایسی نئی چیزیں پیدا کرے جس کا ثبوت نہ تو قرآن وسنت سے ظاہراً ہو اور نہ معناً، اور نہ اس کی سند کسی اسلامی نظریہ سے مستنبط ہیں تو اس کو مردود قرار دیا جائے گا۔

دین کو امر سے اسلئے تعبیر فرمایا کہ دین وہ امر ہے کہ جس کے بارے میں ہمیں فکر مند رہنا چاہیئے دوسرے تمام کاموں سے ہٹ کر دین کے کام میں لگنا چاہیئے ۔لہٰذا کوئی قول وفعل دین سے ہٹ کر نہیں ہونا چاہیئے۔

علامہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: لفظ امر قول معمول بہا میں حقیقت اور فعل محض اور لفظ شان میں مجاز ہے، اور طریق (راہ) پر بھی مجازاً استعمال ہوتا ہے۔ یہاں دین کے معنی میں استعمال ہوا ہے کیونکہ ہمارے تمام امور شریعت کا تعلق دین ہی سے وابستہ ہیں۔

کچھ حضرات کہتے ہیں اس حدیث میں لفظ "امر" کے ساتھ اسم اشارہ هذا لا کر اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ دین اسلام مکمل ہو چکا ہے اور اس کے اصول خوب واضح ہو چکے ہیں کہ اہلِ بصیرت اور بصارت کیلئے اس میں کوئی چیز مخفی نہیں رہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس میں زیادتی کرتا ہے تو اس کی یہ بے جا زیادتی کبھی بھی قبول نہیں کی جائے گا، کیونکہ اس کو اس کی اپنی فہم کی نقص کی وجہ سے نظر آرہا ہے جس کو وہ دین میں نقص شمار کر رہا ہے اسلئے اس کی بات اور رائے کا کوئی اعتبار نہیں۔

جن لوگوں نے یہ تشریح بیان کی ہے اس کی روشنی میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ حدیث مبارک میں موجود ضمیر **فھو** لفظ **من** کی طرف راجع ہے، کہ وہ شخص ہمارے نزدیک ناقص اور دین میں مردود ہمارے دروازے سے دھتکارا ہوا ہے، کیونکہ دین نام ہے آیات واخبار کے آثار اور مستنبط شدہ احکام کو ماننے کا، نہ کہ نت نئی چیزیں پیدا کرنے کا۔ بہر کیف ضمیر کو من کے عدول شخص کی طرف لوٹانا زیادہ بلیغ ہے جبکہ لفظ امر کی طرف لوٹانا زیادہ واضح ہے۔

حدیث کے الفاظ: "**ما لیس منه**" سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسی چیزیں پیدا کرنا، یا ایسے نظریئے قائم کرنا جو کتاب وسنت کی منشا کے خلاف نہ ہوں ان پر کوئی مواخذہ نہیں،

تخریج: اس حدیث کو ابوداؤد اور ابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے نیز امام نووی رحمہ اللہ نے کتاب اربعین میں بھی اس کو نقل کیا ہے۔

مسلم کی ایک روایت میں ہے "**من عمل عملاً**" یعنی جو شخص بھی ایسا کوئی کام کرے جو ہمارے دین میں نہ ہو یا اس کی اجازت ہم نے نہیں دی اب چاہے وہ محدث ہو یا سابق ہو، چاہے طاعات میں سے ہو، یا امور دنیا واُخرویہ میں سے جو بھی چیز محض اپنی نفسانی خواہشات اور ذاتی اغراض کی بنا پر دین میں رائج کرے وہ مردود ہے اس کو ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

یہ حدیث مضبوط کڑے کو تھامنے میں عمود کی حیثیت رکھتی ہے اور اعتصام بحبل اللہ کی دلیل ہونے کے اعتبار سے بنیادی حیثیت رکھتی ہے، نیز مبتدعین اور نفس پرستوں کی کمر توڑنے میں یہ حدیث کوئی کسر نہیں چھوڑتی اسی مفہوم کو ان شعار میں بھی بیان کیا گیا ہے:

اذا ما دجا الیل البهیم و اظلما

جب اندھیری رات چھا جائے اور خوب تاریک ہو جائے

بامر فظیع شق اسود ادهما

ایک ایسے معاملے کے ساتھ جو گھبراہٹ میں ڈالنے والا ہے

فأعلی البرا من الی السنن اعتزی

مخلوق میں سب سے اعلیٰ وہ ہے کہ جو سنتوں کی طرف نسبت کرتا ہے۔

واعمی البرا ابا من الی البدع انتمی

اور مخلوق میں نابینا وہ شخص ہے کہ جو بدعتوں کی طرف منسوب ہے

فمنن ترك القرآن قد ضل سعیه

اور جس نے قرآن کو چھوڑ دیا، اس کی کاوش ضائع ہو چکی

وهل یترك القرآن من كان مسلمًا

اور کیا مسلمان قرآن (بھی) چھوڑتا ہے؟

کچھ عارفین کہتے ہیں: ہر انسان میں روح نورانی ایک چیز ہے جو عالم ملکوت سے آئی ہے اور نفس ظلمانیہ بھی ہے ان دونوں

میں ہمیشہ کشمکش اور نزاع رہتا ہے، ہر ایک کا میلان اپنے اپنے عالم کی طرف ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نفس مظلمہ کے تزکیہ اور آرائش کیلئے انبیاء علیہ الصلوۃ والسلام کو مبعوث فرمایا جو روح کے انوارات کے ذریعہ نفس کو روشن فرماتے تھے۔حتی کہ دل میں یہ یقین بیٹھ جائے کہ موجود حقیقی ذات باری تعالیٰ ہے جو اپنی ذات، صفات اور افعال کے اعتبار سے یکتا ہے کوئی اس میں شریک نہیں لہٰذا بندہ پر واجب ہے کہ وہ کلمہ توحید کے ہتھوڑے سے نفس کو اس طرح کوٹے کہ ما سویٰ اللہ سے بالکل صاف ہو جائے اور شیطان وطاغوت کی مکمل تکفیر کرے اسی کا نام دین حنیف ہے۔اب جو بھی شخص شیطانی وساوس اور مکاریوں کا شکار ہو کر حق سے ناامید ہو جائے اور اللہ کے کئے ہوئے وعدوں میں شک کرے اور اپنے دل کو غیر سے مشغول کرے شیطانی افعال واعمال سے جدا نہ ہو، اور انوارات باری تعالیٰ سے اپنے نفس کی تاریکیوں کو نہ مٹائے تو وہ مردود ہی ہے وہ شیطان مردود اور ملعون ہی کا تابع ہے۔

اسی وجہ سے ابوعبدہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام امور اخرویہ کو **من عمل عملاً** میں جمع فرمایا ہے، اور تمام امور دنیا کو جملہ **"انما الاعمال بالنيات"** میں جمع فرمایا، حضرت ابوعبیدہ نے اعمال کو افعال مباحہ پر محمول فرمایا ہے کیونکہ ان کا رتبہ اور ثواب نیت کے بدل جانے سے بدل جاتا ہے (واللہ اعلم)

بدعت گمراہی ہے

۱۴۱: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ وَشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ .(رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

أخرجه أحمد فى المسند٦/ ٢٧٠۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے یہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ کے دوران ارشاد فرمایا۔بہر حال اس کے بعد جاننا چاہئے کہ سب سے بہتر بات اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور سب سے بہترین راستہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے اور سب سے بدترین چیز وہ ہے کہ جس کو دین میں ایجاد کیا گیا ہو اور ہر بدعت یعنی اپنی طرف سے دین میں پیدا کی ہوئی نئی چیز گمراہی ہے۔(مسلم)

بہترین بات اور بدترین چیز:

قوله:قال رسول الله ﷺ اما بعد:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ **اما بعد** اثناء خطبہ فرمایا کیونکہ **اما بعد** فعل خطاب کیلئے ہے اکثر اس کا استعمال حمد وثناء اور درود وسلام یا قصہ کے بعد ہوتا ہے۔لفظ **بعد** مبنی علی الضم ہے کیونکہ اس کا مضاف محذوف منوی ہے، **ای بعد ما تقدم من الحمد والصلاۃ** ۔ یعنی حمد وصلوٰۃ کے بعد۔

قوله: فان خير الحديث كتاب الله: "فان" میں فا جزائیہ ہے اور اما کے معنیٰ میں ہے جو کہ بمعنیٰ شرط ہے اصل میں یوں ہے: **مهما يكن من شئى بعد ما ذكر فان خير الحديث**۔

''الحدیث'' یہاں کلام کے معنی میں ہے کہ سب سے بہتر بات کتاب اللہ کی ہے کیونکہ یہ کتاب فصاحت وبلاغت کے علوم کے دقائق پر مشتمل ہے اور ہر چیز کا بیان صراحتاً یا تلویحاً اس میں موجود ہے، چنانچہ خود باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ونزلنا عليك الكتاب تبيانا لكل شيء﴾ [النحل : ٨٩] امورِ دین امور دنیا اور عقبیٰ کے لحاظ سے انسان جس علم کا بھی محتاج ہو وہ اس میں موجود ہے۔ جیسے علوم اعتقادیہ اعمال شرعیہ اعلیٰ کریں، اخلاق بہیمیہ، احوال ماضیہ کیا چیز اس میں نہیں۔ چنانچہ مروی ہے: فضل كلام الله على سائر الكلام كفضل الله على خلقه۔

معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات باری کو تمام مخلوق کی ذات پر فضیلت حاصل ہے اللہ کے کلام کو بھی تمام کلاموں پر فضیلت حاصل ہے، نیز اس میں واضح اشارہ موجود ہے کہ کلام اللہ غیر مخلوق ہے۔

قوله: وخير الهدى هدي محمد: یہ اِنَّ کے اسم پر عطف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے رفع کے ساتھ بھی روایت موجود ہے اس صورت میں ان اور اس کے اسم کے محل پر عطف ہوگا۔

''هدي'' هاء کے فتحہ اور دال کے سکون کے ساتھ) سیرت کو کہتے ہیں۔ هدى هديه اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی کسی کی مکمل سیرت پر چلے اور هدي کا اطلاق طریق حسنہ پر ہی ہوتا ہے اس وجہ سے خیر کی اضافت اسی کی طرف ہے جبکہ اس کے مقابلے میں متشر ہے جسکی اضافت امور کے طرف ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے لفظ ''هدى'' کو هاء کے ضمہ اور دال کے فتحہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے، اور الهدى کے شروع میں جو لام ہے وہ استغراق کیلئے ہے کیونکہ اسم تفضیل خير اپنے جز کے طرف مضاف ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دین کا تمام ادیانِ سابقہ پر فضیلت رکھتا ہے۔

قوله: وشر الامور محدثاتها: (محدثاتها): لفظ محدث دال کے فتحہ کے ساتھ، بدعت اعتقادیہ، قولیہ اور فعلیہ سب کو شامل ہے۔ فان خير الحديث...... یہ تمہید ہے شر الامور محدثاتها کیلئے۔ وشر الامور منصوب ہے۔ بعض کہتے ہیں مرفوع ہے۔

قوله: وكل بدعة ضلالة: اس کے اعراب کے متعلق بھی وہی دو قول ہیں رفع اور نصب۔

کتاب الازھار میں لکھا ہے: ہر بدعت سیئہ گمراہی ہے بدعت حسنہ اس میں داخل نہیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''من سنَّ في الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها'' اسی وجہ سے حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے قرآن جمع کیا، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے مصحف میں اس کو لکھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مزید اس میں کام کر کے ایک اسم پر جمع کر دیا گیا۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: لغۃً ہر وہ عمل بدعت ہے جس کی مثال پہلے دور میں نہ پائی جائے اور اصطلاحِ شرع میں بدعت ان چیزوں کو کہتے ہیں جن کا وجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں نہ رہا ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مبارک: ''کل بدعة ضلالة'' عام مخصوص منہ البعض ہے۔

بدعت کی اقسام:

شیخ عزالدین بن سلام رحمہ اللہ اپنی کتاب ''القواعد'' کے آخر میں لفظ بدعت کے متعلق لکھتے ہیں:
بدعت کی دو قسمیں ہیں: بدعت واجبہ، بدعت محرمہ۔

بدعتِ واجبہ:

بدعتِ واجبہ کی مثال علم النحو کی تعلیم ہے کہ اس کے بغیر کلام اللہ سمجھنا ناممکن ہے اسلئے کہ قرآنی علوم ومعارف کو سمجھنے کے لئے علم نحو کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح سے اصول فقہ کی تدوین جرح وتعدیل کے قواعد کا مرتب کرنا یہ سب بدعت واجبہ میں داخل ہیں۔

بدعتِ محرمہ:

بدعتِ محرمہ کی مثال جبریہ وقدریہ کے مذاہب اور ان کے افکار ونظریات جو قرآن وسنت کے بالکل خلاف ہیں، اسی طرح سے مرجۂ مجسمہ کے مذاہب بدعات محرمہ میں داخل ہیں ان کا رد کرنا بدعتِ واجبہ ہے کیونکہ شریعت کی حفاظت کرنا ان بدعات محترمہ سے فرض کفایہ ہے۔

بعض بدعات مستحب ہیں:

جیسے فقراء کے لئے مکانوں کو وقف کرنا' مسلمان بچوں کی دینی تربیت کیلئے مدارس قائم کرنا، اسی طرح ایسے تمام کارِ خیر اور اچھی چیزیں جن کی فی الوقت ضرورت مسلم ہو اور وہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں موجود رہی ہو' اسی طرح وہ نیک اعمال جن پر آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں پابندی نہ کی گئی مثلاً نماز تراویح کا اہتمام کے ساتھ جماعت کے ساتھ پڑھنا صوفیاء کے دقیق علوم میں مہارت حاصل کرنا وغیرہ۔

کچھ بدعات مکروہ بھی ہیں:

مساجد کو مزین کرنا' کلام اللہ پر نقش ونگار بنانا' تزئین وآرائش کیلئے غیر مسنون طریقہ اختیار کرنا یہ شوافع کے ہاں مکروہ ہے جبکہ احناف کے ہاں مباح ہے۔

کچھ بدعات مباح ہیں:

جیسے صبح کی نماز کے بعد مصافحہ کرنا' آستینوں کو کشادہ کرنا' عصر کی نماز کے بعد مصافحہ کرنا یہ شوافع کے ہاں مباح ہے جبکہ احناف کے ہاں مکروہ ہے۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کی چیزوں میں توسع کرنا ایسی چیزیں ہیں جن کے بارے میں اختلاف ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے بہت اچھا تجزیہ فرمایا ہے' کہ جو بھی نئی بات پیدا کی جائے یعنی بدعت اگر وہ کتاب کے مخالف صحابہ

کے اقوال کے منافی اور اجماعِ اُمت کے برعکس ہو تو وہ ضلالت و گمراہی ہے، اور جو چیز ایسی نہ ہو اان میں کوئی حرج نہیں ہے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تراویح رمضان کو قائم فرمانے کے بعد فرمایا نعمت البدعة کیا ہی خوب بدعت ہے، یہ شیخ عزالدین بن سلام رحمہ اللہ کے کلام کا خلاصہ تھا جو انہوں نے اپنی کتاب ''تہذیب الاسماء واللغات'' میں ذکر کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ما رأوه المسلمون حسنا فهو عند الله، حسن ۔ایک اور حدیث مرفوع میں ہے: ''لا يجتمع امتی علی الضلالة'' کہ میری پوری اُمت گمراہی پر کبھی بھی جمع نہیں ہوسکتی۔

تخریج: ابن ماجہ، نسائی اور احمد نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے، البتہ ابن ماجہ کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

''اما بعد فان اصدق الحديث كتاب الله وان افضل الهدي هدي محمد' وشر الامور محدثاتها وكل محدثث بدعة وكل بدعة ضلالة وكل ضلالة في النار''۔

تین قسم کے لوگ مبغوض ہیں

۱۴۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبْغَضُ النَّاسِ اِلَى اللّٰهِ ثَلَاثَةٌ مُلْحِدٌ فِي الْحَرَمِ وَمُبْتَغٍ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَمُطَّلِبُ دَمَ امْرِئٍ مُّسْلِمٍ بِغَيْرِحَقٍ لِيُهْرِيْقَ دَمَهٗ۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۲/ ۲۱۰ حديث رقم ۶۸۸۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض یعنی جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے وہ تین قسم کے لوگ ہیں نمبر۱ حرم میں بے حرمتی اختیار کرنے والا نمبر۲ اسلام میں جاہلیت کے طریقوں کو اختیار کرنے والا نمبر۳ کسی مسلمان کے خون ناحق کا طلب گار تا کہ اس کے خون کو بہائے۔اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: أبغض الناس الى الله ثلاثة:

''أبغض'': تفصیل کا صیغہ ہے اسم مفعول کے معنی میں ہے۔اگرچہ اسم تفضیل کا بمعنی مفعول آنا شاذ ہے۔

''الناس'' کے شروع میں ''ال'' عہدی ہے، ناس سے مراد عاصی مسلمان ہیں۔کچھ کی رائے یہ ہے کہ الناس میں الف لام جنسی ہے لیکن یہ بات بہت بعید ہے کیونکہ کفر سے بڑھ کر کوئی معصیت والی چیز نہیں، زیادہ سے زیادہ اس کو تہدید پر ہی محمول کیا جاسکتا ہے۔

''الی اللہ'' کی قید میں اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ ممکن ہے وہ اشخاص جن کی تفصیل آگے آرہی ہے لوگوں کے ہاں محبوب ہوں لیکن مخلوق کے ہاں ظاہری طور پر محبوب ہونا اللہ کے ہاں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

''ثلاثة'': کی تمیز ''اشخاص'' محذوف ہے،

قوله: ملحد في الحرم: (یہاں کچھ عبارت مقدر ہے یا مبتدا محذوف ہے' یا خبر مقدر ہے) أي أحدهم او منهم۔

"ملحد" حدودِ حرم میں ظلم کا ارتکاب کرنے والا ہے یا حدودِ حرم میں معصیت کا مرتکب ہے کیونکہ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کا عاصی ہے اور حرمت حرم کو پامال کرنے والا ہے۔ الحاد کے معنی ہیں راہ صواب سے ہٹنا' کج روی اختیار کرنا' "لحد" بھی اسی سے ماخوذ ہے۔

ابہری رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر کوئی یہ سوال کرے کہ حرم میں گناہ صغیرہ کرنے والا غیر حرم کے گناہ کبیرہ کرنے والے سے زیادہ مبغوض ہوگا؟ تو میرا جواب یہی ہوگا کہ بالکل وہ شخص زیادہ مبغوض ہے جو حرم میں صغیرہ کا مرتکب ہو کیونکہ خود قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ ۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ [الحج : ۲۵] "اور جو اس میں شرارت سے کجروی (وکفر) کرنا چاہے اس کو ہم دردینے والے عذاب کا مزا چکھائیں گے"۔

آیت مبارکہ میں بظلم کی تفسیر بعض مفسرین نے شتم خادم سے کی ہے۔

قوله: مبتغ في الاسلام سنة الجاهليه:

مبتغ "طالب" کے معنی میں ہے۔ یہاں لفظ سنة کو افعالِ جاہلیت کیلئے استعمال کیا ہے' یا تو لغت محض کا لحاظ کرتے ہوئے یا پھر تحکم کے طور پر استعمال کیا ہے کہ جس شخص کو خداوند کریم نے ایمان واسلام کی دولت سے نوازا اور اس کے قلب کو یقین واعتقاد کی روشنی سے منور کیا مگر وہ اسلام میں ان چیزوں کو اختیار کرتا ہے جو خالص زمانہ جاہلیت کا طریقہ اور غیر اسلامی رسمی تھی، جیسے نوحہ کرنا، مصائب کے وقت گریبان چاک کرنا، بُرے شگون لینا، نوروز کرنا یا ایسی رسمیں کرنا جو خالص کفر کی علامت ہوں، نیز اولاد کو ضائع کرانا، بچیوں کی پیدائش کو عار سمجھنا ان سے نفرت کرنا، وارث نہ ہونے کے باوجود اپنے قبیلہ کے کسی شخص کی جنایت کا خون بہا وغیرہ لیکر کھانا وغیرہ۔

قوله: مطلب دم امرىء بغير حق ليهريق دمه:

"مطلب" تنوین کے ساتھ۔ لفظ دم نصب کے ساتھ، کچھ حضرات کہتے ہیں' مطلب مضاف ہے دم امر...... مضاف الیہ ہے۔ مطلب طاء کی تشدید کے ساتھ الاطلاب سے مشتق ہے۔

مراد وہ شخص ہے جو کسی مسلمان کا ناحق خون بہانے کا طلب گار ہو۔ سید جمال الدین (سیوطی) کہتے ہیں کہ: مطلب کا معنی مجتهد في الطلب ہے، یعنی بہت زیادہ لالچی ہونا، اور درپے ہونے والا۔ مطلب اصل میں متطلب تھا' تاء کو حذف کیا گیا اور طاء کو مشدد کر دیا گیا تاکہ تاء کے حذف ہونے اور مدغم ہونے پر دلالت کرے، زین العرب اور ازھار میں بھی اسی طرح ہی لکھا ہوا ہے۔

سید جمال الدین نے جو لکھا ہے اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ لام کلمہ بھی مشدد ہو جیسے المزمل میں ہے لیکن ہم نے اپنے مشائخ کے منہ سے یہی سنا ہے کہ طاء مشدد ہے لام مشدد نہیں۔ اسی صورت میں اس کا حال لفظ مدّ کر کے طرح ہوگا۔ دلیل یہ ہے کہ لفظ 'مطلب' اصل میں متطلب پر وزن مفتعل تھا تاء کو طا کر کے طاء کو طاء میں ادغام کیا گیا ہے اور یہ تعلیل بالکل قیاس کے موافق ہے جب کہ پہلی تعلیل قانون کے مطابق نہیں، واللہ اعلم۔ بعض صحیح نسخوں میں دم امرء کے بعد صفت "مسلم" بھی موجود ہے۔

چنانچہ قاتل دو ناپسندیدہ فعل کا مرتکب ہو جاتا ہے: ① ظلم، ② بندہ کے ساتھ بُرائی سے پیش آنا جو اللہ تعالیٰ کو نہایت نا

پسند ہے۔

"لیھریق" ھاء کے فتحہ اور سکون ہر دونوں کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔ یھریق' ھراق الماء سے بہانے کے معنی میں آتا ہے، اور خون کے بہانے کیلئے آیا ہے جو کہ اصل میں اراق ہے' ہمزہ کو ھاء سے بدل دیا گیا ہے اس میں ایک اور لغت اھراق بھی ہے جو ہمزہ کے فتحہ کے اور ھاء کے سکون کے ساتھ۔

تیسرا وہ شخص ہوا جو کسی مسلمان کا ناحق خون بہانے کا درپے ہو اور خون ریزی کرنا مقصود ہو، اگر چہ محض قتل ہی کوئی چھوٹا جرم نہیں ہے اس پر بھی بڑی وعید ہے مگر جب مقصد صرف خون ریزی ہو تو یہ جرم شریعت کی نظر میں اور زیادہ قابلِ نفرت ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں وہ تین طرح کے لوگ اللہ کو بہت زیادہ ناپسند ہیں جو حرم کی تعظیم نہ کریں، ظلم والحاد کے مرتکب ہوں، دین میں نئی نئی بدعتیں پیدا کریں، اور ایسی رسومات کا مرتکب ہو جو کفر اور زمانہ جاہلیت کی علامت ہوں، بغیر حق کے مسلمانوں کا خون بہائے جیسے آج کل ہمارے زمانے کے شطار عیار لوگوں کی عادت ہے، بہرکیف فریق اوّل میں قبح محل کی وجہ سے ہے ثانی میں قبح باعتبار فاعل کے ہے اور ثالث میں باعتبار فعل کے یہاں تو ناپسندیدگی محض ارادہ اور تمنی کی بناء پر بیان ہوئی ہے تو ان گناہوں کو کر گزرنا کتنا بڑا جرم ہوگا اور اس کی سزاء کتنی سخت ہوگی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نافرمان جنت میں نہیں جائے گا

۱۴۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ اُمَّتِیْ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰی قِیْلَ وَمَنْ اَبٰی قَالَ مَنْ اَطَاعَنِیْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ اَبٰی ۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۳/۲۴۹ حديث رقم ۷۲۸۰۔ وأحمد في المسند ۲/۳۶۱۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے یہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری تمام امت جنت میں داخل ہوگی۔ مگر وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس نے انکار کیا اور سرکشی کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ وہ کون آدمی ہے؟ جس نے سرکشی اور انکار کیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے میری اطاعت اور فرمانبرداری کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس آدمی نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا اور سرکشی کی اس حدیث کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: كل امتي يدخلون الجنة الا من ابى:

یدخلون: بصیغہ معروف ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ بصیغہ مجہول ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں: امت سے مراد امت اجابت ہو تو استثنیٰ منقطع ہے اور اگر امت دعوت مراد ہو تو استثنیٰ متصل ہے۔ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں امت دعوت مراد ہو تو "آبی" کافر ہے یا امت اجابت ہے تو "آبی" عاصی ہے۔ یہ استثناء زجر و تغلیظ کے لئے ہے۔

قوله: قيل ومن ابى؟:

اس کا عطف کلام محذوف پر ہے۔ جملہ کا عطف جملہ پر ہے۔ اى عرفنا الذين يدخلون الجنة ومن الذى أبى أى

الذی أبی لا نعرفه۔ جواب کا حق تو یہ تھا کہ اختصار کرتے ہوئے یوں فرماتے :من عصانی۔ ارادۂ تفصیل کے پیش نظر اس تعبیر سے عدول فرمایا۔

قوله:من اطاعنی دخل الجنة......الخ:

یہ کلام تنبیہ ہے کہ انہوں نے نہ اس کو پہچانا اور نہ اُس کو جانا یا عبارت کی تقدیر یوں ہے: **من أطاعنی و تمسك بالکتاب والسنة دخل الجنة ومن اتبع هواه وزل عن الصواب وضل عن الطریق فقد دخل النار۔** اس کی جگہ لفظ "ابی" ارشاد فرمایا اور حقیقت کو موضع سبب میں ذکر کیا ہے۔اسی وجہ سے اس حدیث کو اس باب میں ذکر فرمایا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال

۱۴۴ : وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ جَآءَتْ مَلآئِكَةٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ نَائِمٌ فَقَالُوْا اِنَّ لِصَاحِبِكُمْ هٰذَا مَثَلاً فَاضْرِبُوْا لَهٗ مَثَلاً قَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّهٗ نَائِمٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّ الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبُ يَقْظَانُ فَقَالُوْا مَثَلُهٗ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰى دَارًا وَّجَعَلَ فِيْهَا مَاْدُبَةً وَّبَعَثَ دَاعِيًا فَمَنْ اَجَابَ الدَّاعِيَ دَخَلَ الدَّارَ وَاَكَلَ مِنَ الْمَاْدُبَةِ وَمَنْ لَّمْ يُجِبِ الدَّاعِيَ لَمْ يَدْخُلِ الدَّارَ وَلَمْ يَاْكُلْ مِنَ الْمَاْدُبَةِ فَقَالُوْا اَوِّلُوْهَا لَهٗ يَفْقَهُهَا قَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّهٗ نَائِمٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّ الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبُ يَقْظَانُ فَقَالُوا الدَّارُ الْجَنَّةُ وَالدَّاعِيْ مُحَمَّدٌ فَمَنْ اَطَاعَ مُحَمَّدًا فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصٰى مُحَمَّدًا فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَمُحَمَّدٌ فَرْقٌ بَيْنَ النَّاسِ۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲۴۹/۱۳حدیث رقم ۷۲۸۱۔ وأخرج الترمذی بمعناه ۱۳۴/۵حدیث رقم ۲۸۶۰۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے یہ فرماتے ہیں کہ کچھ فرشتے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت آئے جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوئے ہوئے تھے۔فرشتوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ تمہارے اس ساتھی یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک مثال ہے۔اس کو ان کے سامنے بیان کرو۔دوسرے فرشتوں نے کہا وہ تو سوئے ہوئے ہیں۔لہٰذا بیان کرنے کا کیا فائدہ؟ ان میں سے بعض نے کہا۔بے شک ان کی آنکھیں تو سو رہی ہیں لیکن دل تو جاگتا ہے۔پھر اس نے کہا۔اس کی مثال اس آدمی کی طرح ہے۔جس نے گھر بنایا اور اس میں لوگوں کے کھانے کے لئے ایک دستر خوان لگایا اور پھر لوگوں کو دعوت دینے کے لئے ایک آدمی کو بھیجا۔لہٰذا جس نے بلانے والے کی بات کو قبول کرلیا۔وہ گھر میں داخل ہوگا اور اس دستر خوان سے کھانا کھائے گا اور جس آدمی نے اس بلانے والے کی بات کو قبول نہ کیا وہ نہ تو گھر میں داخل ہوگا اور نہ ہی اس دستر خوان سے کھانا کھائے گا۔یہ گفتگو سن کر فرشتوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا۔اس مثال کو وضاحت سے بیان کرو۔تاکہ وہ سمجھ لیں۔بعض فرشتوں نے کہا وہ تو سو رہے ہیں' دوسروں نے کہا بے شک آنکھیں تو سوئی ہوئی ہیں۔لیکن دل جاگ رہا ہے اور پھر کہا گھر سے مراد جنت ہے اور بلانے والے سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی

اطاعت کی۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی اور جس نے محمد ﷺ کی نافرمانی کی۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور محمد ﷺ لوگوں کے درمیان فرق کرنے والے ہیں۔ اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قولہ: جاء ت الملائکۃ الی النبی ﷺ وھو نائم:

"وھو نائم" یہ جملہ حالیہ ہے۔

علامہ سید جمال الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کے متعلق دو احتمال ممکن ہیں: ① حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے پھر اس کی حکایت کی ہے۔ ② خود حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اس کا مشاہدہ کیا اور یہ مثال ان کو خواب میں منکشف ہوئی۔

میرک شاہ فرماتے ہیں: پہلا احتمال ہی متعین ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے سن کر اس کی حکایت کی ہے کیونکہ ترمذی میں بھی یہ روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ہی منقول ہے، جس میں صراحتاً منقول ہے کہ "خرج علینا النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوما فقال انی رأیت فی المنام کان جبریل عند رأسی ومیکائیل عند رجلی" کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمانے لگے آج میں نے خواب میں کچھ فرشتوں کو دیکھا یوں لگ رہا تھا جبرائیلؑ میرے سرہانے اور میکائیلؑ میرے پاؤں کی جانب بیٹھے ہوئے ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کی سند یوں نقل کی ہے: "عن قتیبۃ بن سعید عن اللیث بن سعد عن خالد بن یزید المصری احد الثقات عن سعید بن ابی ھلال عن جابر، پھر لکھتے ہیں یہ حدیث مرسل ہے کیونکہ سعید بن ابی ھلال نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے نہ ان سے ان کی ملاقات ہوئی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں تعلیقاً سعید بن ابی ھلال کی روایت کی طرف اشارہ فرمایا ہے، لیکن یہی روایت ایک اور انداز سے اس سے زیادہ صحیح سند کے ساتھ بھی منقول ہے۔

اس باب میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت بھی منقول ہے: "ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم توسد فخذہ فرقد وکان اذا نام نفخ فبینا انا قاعد اذاتا برجال علیھم ثیاب بیض اللہ اعلم بما لھم من الجمال فجلست طائفۃ من ھم عند رأس النبی صلی اللہ علیہ وسلم وطائفۃ منھم عند رجلیہ"۔ اس سے آگے کا حصہ اسی طرح سے منقول ہے جیسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ہے حدیث ابن مسعود کو نقل کرنے کے بعد امام ترمذی لکھتے ہیں "ھذا صحیح۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: امام ترمذی رحمہ اللہ نے سعید بن ابی ھلال والی روایت کو جو مرسل کہا ہے اس سے منقطع مراد ہے اور یہ انقطاع حضرت سعید اور جابر رضی اللہ عنہ کے درمیان میں ہے، لیکن اس حدیث منقطع کو ربیعہ جرشی کی روایت سے تقویت حاصل ہوتی ہے جو فصل ثانی کی پہلی حدیث کے طور پر آگے آرہی ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ طبرانی میں یہ روایت عمدہ سند کے ساتھ ہے، باقی رہی ابن مسعودؓ کی روایت اس کو امام احمد رحمہ اللہ نے بھی نقل کیا ہے۔ ابن خزیمہ نے بھی نقل کرنے کے بعد اس کو صحیح قرار دیا ہے، بظاہر بھی دونوں روایتیں صحیح ہی معلوم ہوتی ہیں، واللہ اعلم۔ یہاں تک سارا میرک شاہ رحمہ اللہ کا کلام تھا۔

قولہ: فقالوا: ان لصاحبکم ھذا مثلاً فاضربوا لہ مثلاً:

اوراس طرح آنحضرت ﷺ کی مثال اسلیئے بیان کی گئی کہ محسوس اور معقول چیز تاثیر میں اوقع فی النفس ہوتی ہے۔

قولہ:قال بعضهم: ان العين نائمة والقلب يقظان: یہ "قال" بغیر فاء کے ہے۔: یہ فرشتے آنحضرت ﷺ کے احوال کی معرفت سے خوب واقف تھے بنسبت اوّل حضرات کے۔'' قلب'' نصب کے ساتھ، بعض کہتے ہیں رفع کے ساتھ ہے۔

'' یقظان'' یہ کلمہ غیر منصرف ہے الف نون زائدتان کے وجہ سے، بعض حضرات کہتے ہیں منصرف ہے، کیونکہ اس کی مؤنث فعلانة کے وزن پر آتی ہے۔علامہ زین العرب فرماتے ہیں، لفظ یقظان منصرف ہے کیونکہ اس کی مؤنث فعلانة کے وزن پر آتی ہے لیکن مصابیح کے کئی صحیح نسخوں میں غیر منصرف ہی منقول ہے۔یعنی جو بھی کہتے ہو ممکن ہے کیونکہ مدار ادراک باطنہ پر ہوتا ہے نہ حواس ظاہریہ پر۔

امام طیبی ؒ لکھتے ہیں: یہ مناظرہ فرشتوں کے مابین چلا یہ بیان تحقیق کے لئے تھا کیونکہ نفوس قدسیہ کا ادراک حواس ظاہریہ کے ضعف کی وجہ سے کمزور نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات حواس سیئہ کے کمزور ہونے کی وجہ سے ادراک باطنی مزید تیز ہو جاتی ہے ارباب صوفیہ کے ہاں اس کا بہت مشاہدہ رہا ہے۔

قولہ:فقالوا:مثله كمثل رجل بنى دارا: لفظ رجل کی صفت عظیم اور کریم محذوف ہے۔یعنی اس کا قصہ اس شخص کے قصہ جیسا ہے اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ ان کا حال اس شخص کے حال جیسا ہے کیونکہ یہ داعی کے مقابلہ میں ہے نہ کہ گھر بنانے والے کے۔آخری بات یہ کہی جاسکتی ہے، کہ یہاں مضاف محذوف مانا جائے اور عبارت یوں نکالی جائے كمثل داعى رجل بنى دارًا ۔

قولہ:وجعل فيها مأدبة وبعث داعيا اليها: مأدبة: دال کے ضمہ کے ساتھ فتحہ دینا بھی جائز ہے، دعوت عام کہ جس میں بلا امتیاز سارے لوگوں کو بلایا جائے جیسے ولیمہ وغیرہ۔کچھ حضرات کہتے ہیں: دال کے فتحہ کے ساتھ یہ مصدر میمی ہے بمعنی لأدب جو کہ کھانے کی طرف بلانا ہے جیسے معتبہ بمعنی عتبہ ہے، اس تحقیق کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ضمہ والی لغت متعین ہو جاتی ہے۔

اور داعی سے مراد وہ شخص ہے جو لوگوں کے اکرام کرنے کے واسطے انہیں بلائے، کھانے کی طرف۔اس سے اشارہ ہے باری تعالیٰ کے ارشاد :﴿رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ﴾ [ال عمران: ۱۹۳] ''اے پروردگار! ہم نے ایک ندا کرنے والے کو سنا کہ ایمان کے لیے پکار رہا تھا (یعنی اپنے) پروردگار پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لے آئے۔'' کی طرف۔

قولہ:فمن اجاب الدّاعى......من المادبة: یعنی جو بھی اس کی دعوت کو قبول کرے گا اور اس کے بلائے ہوئے اکرام کی چیز کی طرف آئے گا اور اپنی عزت واکرم اور نعمت خداوندی کو قبول کرے تو وہ کامیاب ہوگا۔

قولہ:ومن لم يجب......من المادبة: وہ دھتکارا گیا اور ثواب سے محروم ہو کر عتاب کا حقدار بنا۔

قولہ:فقالوا اولوها له يفقهها: یہ جملہ جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔

معنیٰ یہ ہے کہ اس حکایت تمثیلیہ کو محمد ﷺ خوب سمجھ لیں۔

قولہ: قال: بعضهم: انه نائم: پھر کچھ نے کہا کہ وہ اس کو نہ سمجھ پائیں گے۔

قولہ: وقال بعضهم ان العين نائمة والقلب يقظان: یعنی آنحضرت کی آنکھیں سوئی ہوگئی ہیں لیکن قلب بیدار ہے یہی بات آگے آرہی ہے۔ اس حکایت کے الفاظ کو مکرر اسلئے لایا گیا ہے تا کہ سامعین کو آنحضرت ﷺ کی منقبت عظیمہ کا علم ہو کہ آنحضرت ﷺ آنکھوں سے سوتے تھے لیکن دل کے اعتبار سے ہمیشہ بیدار ہوتے تھے۔

قولہ: فقالوا: الدار الجنة: جنت ہے کیونکہ جنت ہی متقین کا گھر ہے از روئے قرآن کریم اور مادبہ سے جنت کی نعمتیں مراد ہیں اس کا ذکر اسلئے صراحتاً نہیں فرمایا کہ معنیٰ واضح تھا۔ کچھ حضرات کہتے ہیں اس کو اسلئے نہیں بیان کیا کہ جنت کی نعمتیں کھانے کی نعمتوں پر مشتمل ہے، کیونکہ جنت دار المأدبہ ہے۔

قولہ: الداعي محمد فمن اطاع محمدًا فقد اطاع الله:

اللہ تعالیٰ نے خود آنحضرت ﷺ کے حق میں فرمایا: ﴿وداعياً الى الله باذنه﴾ [الأحزاب: ٤٦] "فمن" میں فاء سببیہ ہے کیونکہ داعی آنحضرت ﷺ ہی ہیں، پس جو کوئی آنحضرت ﷺ کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ امام طیبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: تشریح میں حسن ادب کی رعایت کی گئی ہے، کہ مشبہ بالرجل کی صراحت نہیں کی گئی لیکن اس کی طرف فقد اطاع الله سے اشارہ کیا۔

قولہ: ومن عصى محمدا فقد عصى الله: اور من عام ہے اور آنحضرت ﷺ کے اسم گرامی کو اس کی حمد اور تعظیم کیلئے ظاہر کر دیا۔

ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں نام مبارک ظاہر کرنے سے غیر کی شرکت ہی ختم ہوگئی۔

قولہ: ومحمد فرق بين الناس:

کلمہ فَرَق مشدد اور مخفف دونوں طرح منقول ہے مشدد ہونے کی صورت میں فعل ہوگا اور مخفف ہونے کی صورت میں مصدر، امام طیبی رحمہ اللہ نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔

علامہ سید جمال الدین رحمہ اللہ کہتے ہیں لفظ فَرق مصدر ہے یہاں مبالغہ کیلئے استعمال ہوا ہے، ای فارق بين المؤمن والكافر والصالح والفاسق۔ یعنی یعنی آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی مؤمن' کافر صالح اور فاسق لوگوں میں فرق کرنے والی ہے یعنی فرق کرنے والے ہیں۔ علامہ میرک شاہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: کلمہ فرق بخاری کے اکثر رواۃ کے نزدیک راء کے سکون اور قاف کی تنوین کے ساتھ ہے۔

نبی کی سنت سے اعراض نہ کرو

۱۴۵: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ جَآءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ اِلٰى اَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْاَلُوْنَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا اُخْبِرُوْا بِهَا كَاَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا فَقَالُوْا اَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَاَخَّرَ فَقَالَ اَحَدُهُمْ اَمَّا اَنَا فَاُصَلِّى اللَّيْلَ اَبَدًا

وَقَالَ الْآخَرُ اَنَا اَصُوْمُ النَّهَارَ اَبَدًا وَلَا اُفْطِرُ وَقَالَ الْآخَرُ اَنَا اَعْتَزِلُ النِّسَآءَ فَلَا اَتَزَوَّجُ اَبَدًا فَجَآءَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَيْهِمْ فَقَالَ اَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا اَمَا وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاكُمْ لَهٗ لٰكِنِّيْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّيْ وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَآءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ.

(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

أخرجه البخاري في صحيحه ۹/۱۰٤حديث رقم ۵۰٦۳وأخرج مسلم نحوه۲/۱۰۲۰حديث رقم (۵-۱۱۰۱٤)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ تین آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تاکہ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے متعلق دریافت کریں اور جب ازواج کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے بارے میں بتایا گیا۔ توانہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کو تھوڑا خیال کیا پھر باہم گفتگو کی اور کہا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر دئیے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا کہ اب میں ہمیشہ پوری رات قیام کروں گا اور نماز پڑھوں گا اور دوسرے نے کہا کہ میں دن کو ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی افطار نہیں کروں گا اور تیسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ عورتوں سے الگ رہوں گا۔ شادی بھی نہیں کروں گا۔ ان کے درمیان آپس میں یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور فرمایا کہ تم لوگوں نے ابھی ایسا ویسا کہا ہے۔ خبردار میں تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں اور تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور میں عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں۔ یہی میرا طریقہ ہے اور جو آدمی میری سنت سے اعراض کرے گا۔ وہ میرا نہیں۔ یعنی مسلمانوں کی جماعت سے خارج ہے۔

(بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: قال: جاء ثلاثة رهط...... عبادة النبي صلی اللہ علیہ وسلم: "رہط" اس جماعت کو کہا جاتا ہے جس کی تعداد ۱۰ سے کم ہو، کچھ حضرات کہتے ہیں: رہط اس جماعت کو کہتے ہیں جس کی تعداد چالیس افراد سے کم ہو۔

علامہ کرمانی رحمہ اللہ کہتے ہیں ثلاثہ کی تفسیر رہط سے کی گئی ہے اسلئے کہ رہط جماعت کے معنی میں ہے۔ گویا یوں کہا گیا ثلاثة انفس۔

لفظ رہط اور نفر میں فرق کرمانی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ رہط اور نفر دونوں جماعت کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں، فرق یہ ہے کہ لفظ رہط تین سے دس تک کی تعداد والی جماعت کیلئے استعمال ہوتا ہے، جبکہ لفظ نفر تین سے نو تک کی تعداد والی جماعت کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

یہ کون لوگ تھے؟

امام طیبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے یہ تین اشخاص تھے! حضرت علی، حضرت عثمان بن مظعون اور حضرت عبداللہ بن رواحہ۔ کچھ حضرات نے عبداللہ بن رواحہ کے جگہ حضرت مقداد ابن اسود کا نام لکھا ہے۔ ابن ملک نے اسی طرح نقل کیا ہے۔

شیخ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مصنف عبدالرزاق میں حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کے مراسیل میں سے ایک مرسل روایت میں منقول ہے کہ یہ تین اشخاص' حضرت علی بن ابی طالب حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت عثمان بن مظعون تھے، لیکن حضرت شیخ فرماتے ہیں عبداللہ بن عمرو کو ان میں شمار کرنے میں اشکال ہے' اسلئے کہ حضرت عثمان ابن مظعون کی وفات عبداللہ بن عمروؓ کی ہجرت سے پہلے ہو چکی تھی' وہ ان کے ساتھ کیسے ہوئے۔ ابہری نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ علامہ خلخالی رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ کی جگہ حضرت مقداد بن اسود کا نام لکھا ہے، واللہ اعلم۔

قولہ: فلما اخبروا بھا کأنھم تقالوھا......من النبی ﷺ :

اخبروا فعل مجہول کا صیغہ ہے۔ ''بھا'' کی ضمیر عبادت کی طرف راجع ہے۔ ''تقالوا'' القلة سے باب تفاعل کا صیغہ ہے۔

آنحضرت ﷺ کا یہ خیال ہوگا کہ آنحضرت ﷺ بہت زیادہ عبادت کرتے ہوں گے اتنی زیادہ کہ ازواجِ مطہرات سے بھی کم ملتے ہوں گے لیکن جب انہیں آنحضرت ﷺ کا معمول بتایا گیا تو اس کو اپنے حق میں بہت کم جانا کہ اتنی عبادت سے ہماری کہاں بخشش ہوسکتی ہے' ہمیں اس سے زیادہ کرنی ہوگی، رہی آنحضرت ﷺ کی بات تو ان کی اور ہی کچھ شان ہے۔

ہمارے اور ان کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے کہ وہ تو معصوم اور مأمون ہیں یا یہ کہ ان کا باطنی معاملہ اللہ کے ساتھ ایسا ہے کہ ان کی ایک گھڑی کی عبادت دوسروں کے سال کی ظاہری عبادت سے افضل ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے: ''تفکر ساعة خیر من عبادة سنة او ستین سنة'' کہ انبیاء کی ایک ساعت کا تفکر دوسروں کی ایک سال کی عادت سے بہتر ہے یا ان کی ایک ساعت کی غور فکر عام لوگوں کی ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے، کیونکہ ان کی فکر معلوم و معارف میں مشغول ہوتی ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں: مطلب یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ معصوم اور خاتمہ کے اعتبار سے مأمون ہیں، بخشے بخشائے ہوئے ہیں، جبکہ ہم گناہگار ہیں' مغفرت کے محتاج ہیں۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ رات بھر جاگیں اور رات دِن ہمارا دل عبادت میں مشغول ہو۔

قولہ: و قد غفر اللہ ...... تأخر: یہاں من ذنبہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ لفظ 'ذنب' کی نسبت آنحضرت ﷺ کی طرف جو کی گئی ہے وہ اس وجہ سے' ایک تو آپ کی عصمت کا تقاضہ یہ تھا کہ اولیٰ کو بھی ترک نہ کریں کیونکہ حسنات الابرار سیئات المقربین کہ نیک لوگوں کی حسنات مقربین کی سیئات ہوتی ہیں اس لئے ادنی کو ذنب سے تعبیر کیا۔

ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: انبیاء کے حق میں مغفرت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور معصیت کے درمیان ایسا پردہ حائل کیا ہے، کہ انبیاء سے معصیت کا صدور ممکن ہی نہیں، انبیاء علیہ السلام سے نبوت سے قبل کبائر کجا صغائر بھی صادر نہیں ہوتے، تو نبوت کے بعد کیا ہوں گے اسی کا نام مغفرت ہے۔ جبکہ دیگر کے حق میں مغفرت کا مفہوم یہ ہے: کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کی سزا نہیں دیں گے اُس کے اور ان کی سزا کے درمیان پردہ حائل فرمائیں گے۔

بعض محققین کہتے ہیں: تمام صحابہ کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال کی اتباع کرنا فرض اور ضروری ہے اور اس کے لئے آنحضرت ﷺ کی کسی حالت کی قید نہیں آنحضرت ﷺ نے جس حال میں کیوں نہ کہا ہو وہ تمام

افعال واقوال واجب الاتباع ہیں بغیر کسی بحث وتمحیص اور تردد کے، صحابہ کا یہ اجماع آنحضرت ﷺ کی عصمت اور تنزیہہ پر دلیل قاطع ہے اب اس کے خلاف کوئی بات بغیر دلیل کے قبول نہیں کی جائے گی۔

جمہور نے انبیاء علیہ الصلاۃ والسلام سے کبائر کا سہواً اور صغائر کا عمداً وقوع ہونے کو ممکن کہا ہے لیکن جمہور میں سے جو محققین ہیں وہ کہتے ہیں انبیاء جب کبائر وصغائر پر متنبہ ہو جائیں تو پھر ان کا وقوع ان سے نہیں ہوتا کیونکہ وہ دور ہو جاتے ہیں، اس لحاظ سے جمہور کا یہ قول صحابہ کے اجماع کے منافی نہیں۔

مظہر رحمہ اللہ کہتے ہیں: جب یہ تین صحابہ کرام آنحضرت ﷺ کے وظائف عبادت کو معلوم کرنے آنحضرت ﷺ کے گھر گئے تو ان کے ذہن میں یہ تھا کہ آنحضرت کے عبادت کے وظائف بہت سے ہوں گے، جب آنحضرت ﷺ کے معمولات کے بارے میں سنا تو اس کو کم سمجھا لیکن آنحضرت ﷺ کے ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے تقصیر کی نسبت آپ کی طرف نہیں کی بلکہ آپ کے کمال کو بیان کیا اور اپنے نفس کو ملامت کیا کہ ہم کہاں آنحضرت ﷺ کا مقابلہ کر سکتے ہیں، اس میں مرید سالک کے لئے تعلیم ہے کہ وہ اپنے شیخ کو اگر کبھی عبادت کم کرتے دیکھے تو شیخ کی طرف حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھے بلکہ اس کو معذور سمجھے، اپنے نفس کو ملامت کرے اگر کبھی اس طرح کا خیال دل میں پیدا ہو کیونکہ مرید اپنے شیخ پر معترض ہو اور ساتھ یہ امید رکھے کہ وہ کامیاب ہوگا ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ قلتِ وظائف اپنی اُمت پر مشقت کرتے ہوئے فرما رہے تھے کہ اقتداء کرتے ہوئے مشقت نہ پڑ جائیں' کیونکہ ان کے نفس کا بھی ان پر ہے، کیونکہ انسان کو اپنے قویٰ بحال رکھنے کیلئے کھانے کی ضرورت ہوتی ہے، نیز اُمت کی عورتوں کا اپنے شوہروں پر نفسانی حق ہے ویسے بھی انسان نسلی بقاء کیلئے عورت کا محتاج ہے اگر آنحضرت ﷺ عبادات میں حد سے زیادہ کثرت کرتے تو اُمت کے لوگوں کے تمام دنیاوی معاملات معطل ہو کے رہ جاتے۔

قوله: فقال احدهم: اما انا فاصلي الليل ابدا:

یعنی ایک کہنے لگا آنحضرت ﷺ تو مغفور ہیں آپ کو کثرت سے عبادت کرنے کی ضرورت ہی نہیں میں آپ کی طرح نہیں لہٰذا میں تو نماز ہی نماز پڑھتا رہوں گا' رات بھر جاگوں گا، یہ اس کا صرف عزم تھا، یا اس نے اپنے ساتھیوں کو خبر دی تھی دونوں باتیں ہو سکتی ہیں۔ ابدا: یا تو اس رات کیلئے یہ بات کہی تھی یا ہمیشگی کا ارادہ تھا کوئی مخصوص رات مراد نہیں تھی۔

قوله: قال الآخر انا اصوم النهار ولا افطر:

نہار کے بعد بھی ابداً کا لفظ محذوف ہے، جیسا کہ ایک نسخے میں ابداً کا لفظ موجود ہے اگر ابداً کا لفظ نہ ہو تو (ولا افطر) سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے، یہاں ایام منہیہ کے علاوہ ایام مراد ہیں، کیونکہ ایام منہیہ کا روزہ ہوتا ہی نہیں۔

قوله: قال الآخر انا اعتزل النساء فلا اتزوّج ابدا:

اعتزل: اجتنب کے معنیٰ میں ہے۔ کسی سے بھی نکاح نہیں کروں گا، کیونکہ بال بچوں کی وجہ سے ایک انسان عبادت بہت کم کر سکتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ دنیاء کی حرص اور طمع میں پڑ جاتا ہے' جو کہ اہلِ اللہ کے عادت کے خلاف ہے۔

قوله: فجاء النبي ﷺ اليهم...... كذا وكذا:

''انتم'' میں ''أأنتم'' ہے، ہمزہ استفہام انکاریہ کو حذف کر دیا، وہی فاعل معنوی ہے جو اپنے مقر سے جدا ہوا ہے، قرآنِ کریم میں ہے: ﴿ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾[المائدۃ: ۱۱۶] ''کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری والدہ کو معبود مقرر کرو؟'' یہاں ہمزہ استفہام انکار کو مبالغہ انکار کی غرض سے حذف نہیں کیا گیا ہے۔
''کذا و کذا'' یہ کنایہ ہے جو پہلے بیان ہوا ہے۔
آنحضرت ﷺ کو ان کے احوال کیسے معلوم ہوا؟ اس میں دو احتمال ہیں:
اوّل یہ کہ آنحضرت ﷺ کی جس زوجہ محترمہ کے پاس آئے تھے اس نے بتایا ہوگا، دوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کو وحی کے ذریعہ معلوم ہوا ہو۔

قولہ: اما واللہ انی لاخشاکم للہ واتقاکم لہ:

''اما'' یہ تخفیف کے ساتھ حرف استفتاح ہے جو 'الا' کی طرح تنبیہ کیلئے آیا ہے۔ اکثر قسم سے بچنے سے پہلے استعمال ہوتا ہے، بعض حضرات کہتے ہیں یہ حقاً کے معنی میں ہے۔ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں انوکھی بات لکھی ہے وہ لکھتے ہیں: انتم میں ہمزہ استفہام انکاری ہے اور 'ما' حرف تنبیہ ہے۔ للہ: یہ لا خشاکم کا مفعول بہ ہے کیونکہ افعل ظاہر اطرف کے علاوہ میں عمل نہیں کرتا۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: آنحضرت ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ ریاضت میں تمہارا یہ افراط والا راستہ اگر میرے اعتدال والے راستے سے بہتر ہوتا تو میں کبھی بھی اس پر اعراض نہ کرتا، لیکن اس افراط کا اللہ کے ہاں کوئی اعتبار نہیں وہ خوب جانتا ہے کہ اس کے ہاں کون زیادہ معزز و مکرم ہے، اور کس کا طریقہ بہتر ہے،
'' واتقاکم لہ'' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو خشیت تقوی سے خالی اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہوتا۔

قولہ: ولکن اصوم وافطر واصلی و ارقد و اتزوّج النساء:

لکن محذوف کے استدراک کیلئے ہے، اصل میں یوں ہے: **انا اخشاکم للہ فینبغی علی زعمکم' اوفی الحقیقۃ' أن أقوم فی الریاضۃ الی أقصی مداہ لکن اقصد واتوسط**، تمہارا خیال تو یہ ہے کہ میں اتنی ریاضت کروں کہ انتہائے رات تک قیام کروں لیکن میں اعتدال اختیار کرتا ہوں ایک طرف روزہ بھی رکھتا ہوں، تو ساتھ نہیں بھی رکھتا، یعنی ایک دن روزہ رکھتا ہوں تو دوسرے دن نہیں رکھتا۔ رات کے کچھ حصے میں نماز پڑھتا ہوں، اور کچھ حصہ آرام کرتا ہوں، جس سے میرے اعضاء مضمحل نہیں ہوتے، اور بتقاضائے فطرت عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ چنانچہ کمال انسانیت یہی ہے کہ بندہ علائق سے تعلق رکھے عورتوں سے نکاح بھی کرے لیکن اس شان کے ساتھ کہ ایک طرف تو ان کے حقوق میں ذرہ برابر کمی نہ ہو اور دوسری طرف حقوق اللہ میں بھی فرق نہ آئے اور نہ توکل کا دامن ہاتھ سے چھوٹے۔ اسی چیز کو آنحضرت ﷺ نے پورے کمال کے ساتھ عملی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کر دیا تا کہ اُمت بھی اسی طریقہ پر چلتی رہے۔

قولہ: فمن رغب عن سنتی فلیس منی: رغب اعراض کرنے کے معنیٰ میں ہے یعنی جو میری سنت سے بیزاری و بے رغبتی کرے وہ میری جماعت سے خارج ہے اُسے مجھ سے اور میری جماعت سے کوئی نسبت نہیں، اگر کوئی سستی برتے

بیزاری نہیں، تو وہ اس وعید میں شامل نہیں ہے۔ لفظ 'سنتی' آنحضرت ﷺ کے تمام سنتوں کو شامل ہے جن کا ذکر یہاں ہوا اور ان کو بھی شامل ہے، جن کا ذکر یہاں نہیں ہوا۔

علامہ ابہری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ سے نقل کیا ہے' وہ فرماتے ہیں: کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ علائق دنیا سے بالکل منہ موڑ لینا اور رہبانیت کا طریقہ اختیار کر لینا جائز نہیں ہے اسلئے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ انسانی زندگی کا شیرازہ بکھر جائے گا بلکہ حقوق اللہ کی ادائیگی میں بھی کوتاہی ہوگی اور عبادت کا اصلی جو حق ہے وہ ادا نہیں ہوگا اسلئے اللہ تعالیٰ نے رہبانیت کو پسند نہیں فرمایا کہ وہ اپنے وعدوں کو پورا نہ کر سکے تھے۔

امام علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: علامہ ابہری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ کے حوالے سے جو بات ذکر کی ہے وہ اصل میں امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ [المائدة : ۸۷] (مؤمنو! جو پاکیزہ چیزیں خدا نے تمہارے لئے حلال کی ہیں ان کو حرام نہ کرو اور حد سے نہ بڑھو کہ خدا حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا) کی جو تفسیر فرمائی ہے یہ اس کی تصریح ہے۔

مفسرین کرام نے اس آیت کے شانِ نزول میں لکھا ہے کہ ایک دِن آنحضرت ﷺ صحابہ کرام کو وعظ فرما رہے تھے جس میں قیامت کے احوال بیان فرمائے تو صحابہ کرام پر اس کا ایسا اثر ہوا کہ سب رو پڑے وعظ ختم ہونے کے بعد دس صحابہ کرام حضرت عثمانؓ بن مظعون جمحی کے گھر میں جمع ہوئے جن میں حضرت ابوبکر صدیق، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو، ابوذر غفاری، سالم مولی ابی حذیفہ، مقداد بن الاسود، سلمان فارسی، معقل بن مقرن حضرات رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین شامل تھے۔ سب مشورہ کرنے کے بعد اس بات پر متفق ہوئے کہ: رہبانیت اختیار کر لیتے ہیں، سب خصی ہو جاتے ہیں اور اون کے کپڑے پہن لیتے ہیں پھر سال بھر روزہ رکھیں گے راتوں کو مسلسل جاگیں گے، بستروں پر نہیں سوئیں گے، گوشت نہیں کھائیں گے، اور نہ کوئی چکنی چیز کہ جس سے بدن موٹا ہو جاتا ہے، نہ عورتوں کے پاس جائیں گے، نہ خوشبو استعمال کریں گے، ریاضت کیلئے جنگلوں میں نکل جائیں گے۔ آنحضرت ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آنحضرت ﷺ حضرت عثمان بن مظعون کے گھر تشریف لائے حضرت عثمان سے (آمنا سامنا) ملاقات نہیں ہوئی ان کی اہلیہ حضرت اُم حکیم بنت ابی امیہ سے پوچھا (جنکا اصل نام حولاء تھا اور یہ عطر بنایا کرتی تھیں)۔

ام حکیم یہ بتائیں میں نے آپ کے شوہر اور ان کے احباب کے بارے میں سنا ہے کہ وہ اور ان کے اصحاب کا یہ مشورہ ہوا ہے: کیا یہ بات سچ ہے؟ اب یہ بچاری پریشان ہوگئی کہ آیا سچ بات بتا دی جائے یا شوہر کا راز چھپایا جائے، کہنے لگی یا رسول اللہ! اگر عثمان بن مظعون نے آپ کو بتایا ہے تو سچ ہے یعنی اس نے سچ کہا ہے، آنحضرت ﷺ واپس تشریف لے گئے، آپ کے جانے کے بعد حضرت عثمان بن مظعون آئے' تو انہیں بتا دیا کہ آنحضرت ﷺ تشریف لائے تھے اور یوں پوچھ رہے تھے، حضرت عثمان اپنے ساتھیوں سمیت آنحضرت ﷺ کے پاس آئے، آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا: **الم انبأ انكم اتفقتم على كذا و كذا**، عرض کیا' ہوا تو بالکل ایسا ہی ہے لیکن ہمارا ارادہ اپنے اخروی بہتری کا ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا میں تمہیں اس کی بالکل اجازت نہیں دیتا، پھر فرمایا: "**ان لانفسكم عليكم حقًا فصوموا وافطروا وقوموا وناموا فانى اقوم وانام**

واصوم وافطر وآکل اللحم والدسم وآتی النساء ومن رغب عن سنتی فلیس منی"۔

''تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے نفس کا بھی خیال رکھو روزے رکھو لیکن ساتھ کچھ دن ناغہ بھی کرو، رات کو نماز پڑھو ساتھ ساتھ سونے کے وقت سو بھی لیا کرو، میں بھی عبادت کرتا ہوں سو بھی لیتا' روزے رکھتا ہوں افطار بھی کیا کرتا ہوں یعنی ناغہ بھی کر لیتا ہوں' گوشت اور چکنی چیزیں کھاتا ہوں، عورتوں کے پاس جاتا ہوں یعنی ان کے حقوق اداء کرتا ہوں لہٰذا سن لیں! یہ میرا طریقہ ہے جو میرے اس طریقہ سے بیزاری کا اظہار کرے گا وہ میری جماعت میں سے نہیں''۔

ان حضرات کو سمجھانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے عام لوگوں کو بلایا، انہیں خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: **"ما بال اقوام حرموا النساء والطعام والطیب والنوم وشهوات الدنیا انی لست آمرکم ان تکونوا قسیسین ورهباناً فانه لیس فی دینی......"**۔ ''کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ عورتوں کو اپنے اوپر حرام کر رہے ہیں کھانے کی چیزوں کو حرام کرتے ہیں، خوشبو نیند اور دنیا کی خواہشات کو حرام کر رہے ہیں، میں ہرگز تمہیں قسیس اور رہبان بننے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ یہ میرے دین میں جائز نہیں، اور نہ گوشت کھانے سے اعراض کرنا، عورتوں کے حقوق اداء نہ کرنا اور گرجا گھر بنانے کو جائز قرار دیتا ہے۔

یاد رکھو میری اُمت کی سیاحت روزہ رکھنا ہے، اور اس کی رہبانیت جہاد ہے، تم اللہ کی بندگی کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، حج کرو، عمرہ کرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ اداء کرو، رمضان کے روزے رکھو، ان تمام فرائض پر استقامت اختیار کرو، اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی تمہارے ساتھ ویسا ہی رہے گا، ماقبل کی اُمتیں بے جا تشدد کی وجہ سے ہی ہلاک ہوئیں جب انہوں نے اپنے نفس پر خود ساختہ تشدد کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے ساتھ سختی کا معاملہ کیا ان کی تباہ شدہ بستیاں اور عبادت گاہیں عبرت کا نشان بن کر تمہارے سامنے ویران نظر آ رہی ہیں اس سے عبرت حاصل کرو''۔ اس دوران ﴿**یا ایها الذین آمنوا......**﴾ آیت ہوئی۔

سنت پر عمل نہ کرنے سے رسول اللہ ﷺ ناراض ہوتے ہیں

۱۴۶: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَ صَنَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا فَرَخَّصَ فِيْهِ فَتَنَزَّهَ عَنْهُ قَوْمٌ فَبَلَغَ ذٰلِكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَطَبَ فَحَمِدَ اللّٰهَ ثُمَّ قَالَ مَا بَالُ اَقْوَامٍ يَتَنَزَّهُوْنَ عَنِ الشَّيْءِ اَصْنَعُهُ فَوَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَعْلَمُهُمْ بِاللّٰهِ وَاَشَدُّهُمْ لَهٗ خَشْيَةً ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ).

أخرجه البخاری فی صحیحه ۵۱۳/۱۰ حدیث ۶۱۰۱۔ واللفظ وأخرجه مسلم بالفاظ متقاربة ۱۸۲۹/۴ حدیث رقم (۱۲۷۔۲۳۵۶) وأخرجه أحمد فی المسند ۴۵/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک کام کیا اور اس کام کو کرنے کی اجازت دیدی مگر کچھ لوگوں نے اس سے احتراز کیا یعنی اس کام سے بچنے لگے جب رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی اور اس کے بعد فرمایا کہ لوگوں کا کیا حال اور معاملہ ہے کہ وہ اس

چیز کو کرنے سے احتراز کرتے ہیں جس کو میں کرتا ہوں اللہ کی قسم میں اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ چیز کو ان سے بڑھ کر اچھی طرح جانتا ہوں اور ان سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: صنع رسول الله ﷺ شيئاً...... رسول الله ﷺ ذلك:

شیئاً سے کوئی مباح کام مراد ہے جو آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس کی اجازت دی گئی تھی جس کی کچھ تفصیل آگے ائمہ بیان فرمارہے ہیں۔ امام راغب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: صنع کا معنی اجادة الفعل کام اور عمل کو کہتے ہیں، لیکن فعل کو صنع نہیں کہتے، اس طرح لفظ صنع کی نسبت حیوانات وجمادات کی طرف نہیں ہوتی جبکہ لفظ فعل ان چیزوں کی طرف منسوب ہوتا ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کہتے ہیں، اس حدیث میں لفظ قوم سے جن لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان کا علم نہ ہوسکا اور نہ ہی وہ عمل جس کی رخصت دی گئی تھی، البتہ ابن بطال رحمہ اللہ نے اشارۃً لکھا ہے کہ روزہ کی حالت میں بیوی کا بوسہ لینا اور سفر میں روزہ نہ رکھنے کی رخصت دی گئی تھی، اور شریعت میں اس کی اجازت ہے۔ علامہ ابہری رحمہ اللہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ وہی تھے جن کا ذکر پچھلی حدیث میں آیا تھا، اور عمل بھی وہی ہے جو پہلے گزرا ہے۔

قوله: فخطب فحمد الله ...... اصنعه:

یہ تفسیر ہے ماقبل کیلئے، امام طیبی رحمہ اللہ نے اسی طرح لکھا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے خطبہ کے دروان یا فراغت کے بعد ازراہِ شفقت فرمایا۔ ''ما'' استفہام انکار کیلئے آیا ہے جو بمعنی توبیخ ہے اور لفظ 'بال' حال کے معنی میں ہے۔

'' ينتزهون'' یہ جملہ لفظ اقوام کی صفت ہے لیکن حال کی جگہ واقع ہے، جیسے مَالَكَ قائمًا میں قائمًا ہے، اس کی مثال قرآنِ کریم میں یہ ہے: ﴿ لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا﴾ [نوح: ۱۳] (تم کو کیا ہوا ہے کہ تم خدا کی عظمت کا اعتقاد نہیں رکھتے) وقاراً کے معنی دور ہونے اور اعراض کرنے کے ہیں، (عن الشی): رات کو سونے سے اور دِن کو کھانے سے، (غیر رمضان میں) اور عورتوں سے صحبت کرنے سے یہ ابن ملک کا قول ہے۔ '' اصنعه'' یہ حال ہے الشی سے' اور الشئی میں الف لام عہدی ہے، جس سے شیئا میں بیان ہونے والی بات مراد ہے۔ کچھ حضرات کہتے ہیں: الشئی میں الف لام جنس کیلئے ہے اور'' اصنعه'' اس کی صفت ہے۔

قوله: فو الله انی ...... له خشية:

مظہر کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اگر تم اس نیت سے پرہیز کررہے ہو کہ کہیں اللہ کا عذاب نازل نہ ہوجائے تو یادرکھو! میں اپنے ربّ کے عذاب کی قدر کو تم سے زیادہ جانتا ہوں اور اس سے احتراز کرنے کا زیادہ حقدار ہوں، (واشدهم له خشية): اس جملہ سے قوتِ عملیہ کی طرف اشارہ ہے نیز علم کو خشیت پر مقدم فرمایا، اس لئے کہ خشیت علم کا نتیجہ ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ [فاطر: ۲۸] ''خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں......''

امام طیبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے: آنحضرت ﷺ کا یہ کلام خشیت رکھنے والوں کیلئے نہایت بلیغ کلام ہے کہ کوئی آنحضرت ﷺ کی سنت سے پرہیز کرے اور آنحضرت ﷺ کے عمل میں خشیت کی کمی محسوس کرے وہ خشیت نہیں، خشیت آنحضرت

ﷺ نے انی اعلمھم باللہ پہلے فرمایا، پھر اس کی تفسیر خشیت سے کی تاکہ دلیل ہو اس بات پر کہ آنحضرت ﷺ کے نفس میں خشیت سب سے زیادہ ہے اور خشیت کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ سب سے زیادہ جانتے ہیں۔

دین کے حکم پر عمل کرنا ضروری ہے

۱۴۷ :وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ قَالَ قَدِمَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ وَهُمْ يُؤَبِّرُوْنَ النَّخْلَ فَقَالَ مَا تَصْنَعُوْنَ قَالُوْا كُنَّا نَصْنَعُهُ قَالَ لَعَلَّكُمْ لَوْلَمْ تَفْعَلُوْا كَانَ خَيْرًا فَتَرَكُوْهُ فَنَقَصَتْ قَالَ فَذَكَرُوْا ذٰلِكَ لَهُ فَقَالَ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ اَمْرِ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهٖ وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِّنْ رَّأْيِيْ فَاِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ . (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

أخرجه مسلم فى صحيحه ۱۳۵/٤ حديث رقم (۱٤۰۔۲۳٦۲)۔

ترجمہ: حضرت رافع بن خدیج ؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لائے اس وقت مدینہ کے لوگ کھجور کے درختوں میں پیوند کاری کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ یہ تم کیا کرتے ہو اہل مدینہ نے عرض کیا کہ ہم ایسا ہی کرتے رہے ہیں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تم ایسا نہ کرو شاید بہتر ہو لوگوں نے آپ کا یہ ارشاد سن کر پیوند کاری کے عمل کو چھوڑ دیا تو اس سال پھل کم پیدا ہوا۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کا تذکرہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے کیا تو آپ نے فرمایا میں بھی ایک آدمی ہوں لہٰذا جب میں تمہیں دین کی کسی بات کا حکم دوں تو اسے قبول کر لو اور جب کوئی بات تمہیں دنیا کے معاملہ میں اپنی رائے سے کہوں تو تم سمجھ لو کہ میں بھی ایک انسان ہوں۔

راویٔ حدیث:

رافع بن خدیج۔ رافع بن خدیج کی کنیت ''ابوعبداللہ'' ہے۔ یہ حارثی انصاری اوسی ہیں۔ بدر صغریٰ میں شریک نہیں ہو سکے۔ جنگ احد میں ان کو تیر آ کر لگا جس پر آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ میں قیامت کے دن تمہارے اس تیر کا گواہ ہوں۔ ان کا یہ زخم عبدالملک بن مراون کے زمانہ تک چلا۔ اور ۷۳ھ میں مدینہ طیبہ میں وفات پائی۔ ان کی عمر چھیاسی (۸٦) سال کی ہوئی ایک بڑی جماعت نے ان سے روایت کی ہے۔

''خدیج'' خائے معجمہ کے فتحہ دال کے کسرہ اور آخر میں جیم معجمہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: قولہ: قال: قدم نبی اللہ ﷺ المدینۃ......النخل: ایک نسخہ میں نبی اللہ کے بجائے 'النبی ﷺ' کے الفاظ ہیں۔

'' یؤبرون النخل '' یہ جملہ حالیہ ہے ''یؤبرون'' باء کی تشدید کے ساتھ ہے ایک روایت میں 'یأبرون' باء مکسورہ کی تخفیف کے ساتھ ہے، کبھی ضمہ بھی دیتے ہیں۔ ابرالابار' تأبیر کا معنی اصلاح کرنے کے ہیں، اس کو اردو میں تابیر کرنا کہا جاتا ہے۔

طلحہ بن عبداللہ کی روایت ہے: مدینہ والے یہ کہا کرتے تھے کہ نر درخت کا پھول مادہ درختوں پر جھاڑتے یا ان میں لگا دیتے تھے

اس سے ان کا خیال تھا کہ پھل زیادہ آتے ہیں۔ روایت میں آتا ہے مادہ کھجور حضرت آدمؑ کی بچی ہوئی مٹی سے بنایا گیا ہے اسلئے انسانی فطرت کی طرح ان درختوں کی فطرت ہے کہ مذکر کا تنا یا جز مادہ کے ساتھ سے بچ ہو، کیونکہ انسانی نسل کیلئے مذکر و مؤنث کی منی کا اجتماع ضروری ہے۔

قولہ: فقال: ما تصنعون...... ذلك له: یہاں 'ما' استفہامیہ ہے۔ ایک نسخہ میں 'لكان' کے الفاظ ہیں۔
یعنی تم ایک ایسی چیز کے پیچھے لگے ہوئے ہو جس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آرہا ہے، چنانچہ ایک روایت میں ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا **ما اظن يغني ذلك شيئاً** کہ مجھے اس سے کوئی فائدہ نظر نہیں آرہا ہے۔

فنقصت: نقص لازمی و متعدی دونوں استعمال ہوتا ہے۔

قولہ: فقال: انما انا بشر: بشر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے مغیبات کا علم نہیں، آپ سے جو بات میں نے کہی تھی اپنے ظن کے مطابق کہی تھی' میں تو اللہ کے عجائبِ قدرت اور اس کی قوت کے غرائب میں مستغرق ہوں جس کی قدرت سبب کی محتاج نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے یہ مظاہر دنیا میں رکھے ہیں تا کہ انسان اس کی حکمت باہرہ کو سمجھ لے اور دیکھ لے اور دوسرا یہ کہ انسان عالمِ اسباب میں رہتے ہوئے اسباب کی رعایت ضرور کرے جو مسبب الاسباب نے بنائے ہیں اپنے کارخانۂ عالم میں، ان اسباب کو اپنائے اور اس کو توکل کے خلاف نہ سمجھے، اسی طرح جو اسباب آخرت کیلئے بنائے ہیں آخرت کیلئے ان کو اپنائے۔

قولہ: اذا امرتكم بشيء من دينكم فخذوه:
ایک نسخہ میں دونوں جگہ 'امرتم' کے الفاظ ہیں۔ ایک صحیح نسخے میں 'من امر دينكم' کے الفاظ ہیں، یعنی دینی امور میں جب میں تمہیں کوئی بات کہوں تو اس کو قبول کرو، کیونکہ اس میں ضرور تمہارا نفع ہے، کیونکہ دین کے متعلق میں جو کچھ کہتا ہوں وہ وحی کے ذریعہ مجھے پہنچتی ہے۔

قولہ: اذا امرتكم بشيء من رائي فانما انا بشر:
ایک نسخہ میں ایک ''یا'' کے ساتھ 'من رأي' کے الفاظ ہیں۔
مطلب وہ دنیائی امور جنکا دین سے کوئی ربط نہیں اگر اس میں میری رائے ٹھیک نہ آئے تو اس کو مستبعد نہ سمجھو بعض حضرات کہتے ہیں مطلب یہ تھا کہ چاہو تو اس کو قبول کرلو' چاہو تو چھوڑ دو بشر ہونے کے لحاظ سے صواب اور خطاء دونوں ممکن ہیں جیسا کہ احمد کی ایک روایت میں آیا ہے: **والظن يخطي ويصيب**۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو دنیا کی طرف التفات نہ تھا اور نہ آپ کی غرض دنیا تھی، بلکہ امورِ آخرت کے مسائل و احکام اور دینی معاملات میں آپ ﷺ کو زیادہ اہتمام تھا۔

مصابیح میں اس واقع کے بیان کے سلسلہ میں یہ الفاظ ہیں: **انتم اعلم بامر دنياكم** یعنی تم اپنی دنیا کے امور کو خوب جانتے ہو۔

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ دنیاوی امور کی طرف مجھے التفات نہیں ورنہ جہاں تک رائے وعقل کا معاملہ ہے اس میں ذرہ

برابر بھی شبہ نہیں، کہ آنحضرت ﷺ دینی اور دنیاوی دونوں معاملات میں سب سے زیادہ عقل مند صائب الرائے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی مثال

۱۴۸: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا مَثَلِیْ وَمَثَلُ مَا بَعَثَنِیَ اللّٰہُ بِہٖ کَمَثَلِ رَجُلٍ اَتٰی قَوْمًا فَقَالَ یَاقَوْمِ اِنِّیْ رَاَیْتُ الْجَیْشَ بِعَیْنَیَّ وَاِنِّیْ اَنَا النَّذِیْرُ الْعُرْیَانُ فَالنَّجَآءَ النَّجَآءَ فَاَطَاعَہٗ طَآئِفَۃٌ مِّنْ قَوْمِہٖ فَاَدْلَجُوْا فَانْطَلَقُوْا عَلٰی مَھْلِھِمْ فَنَجَوْا وَکَذَّبَتْ طَآئِفَۃٌ مِّنْھُمْ فَاَصْبَحُوْا مَکَانَھُمْ فَصَبَّحَھُمُ الْجَیْشُ فَاَھْلَکَھُمْ وَاجْتَاحَھُمْ فَذٰلِکَ مَثَلُ مَنْ اَطَاعَنِیْ فَاتَّبَعَ مَاجِئْتُ بِہٖ وَمَثَلُ مَنْ عَصَانِیْ وَکَذَّبَ مَاجِئْتُ بِہٖ مِنَ الْحَقِّ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٣/ ٢٥٠ حديث رقم ٧٢٨٣۔ ومسلم ٤/ ١٧٨٨ حديث رقم (١٦۔ ٢٢٨٣)۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری اور اس چیز کی مثال جسے دے کر اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے یعنی دین اسلام اور شریعت اس آدمی کی طرح ہے جو ایک قوم کے پاس آیا اور کہا اے قوم میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لشکر کو دیکھا ہے اور میں ننگا یعنی بے غرض تمہیں ڈرانے والا ہوں لہٰذا تم اپنی نجات کو تلاش کرو چنانچہ اس قوم میں سے ایک جماعت نے اس آدمی کی بات کو مان لیا اور راتوں رات آہستہ آہستہ وہاں سے نکل گئے اور نجات حاصل کر لی اور ان میں سے ایک جماعت نے اس کی تکذیب اور نافرمانی کی اور صبح تک اپنے گھروں میں رہا ،صبح کے وقت لشکر نے ان پر حملہ کر دیا اور ہلاک کر ڈالا یہاں تک کہ ان کی جڑ کاٹ ڈالی یعنی ان کی نسل کو ختم کر دیا یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے میری اطاعت کی اور جو احکام میں لے کر آیا ہوں ان کی پیروی کی اور اس شخص کی جس نے میری نافرمانی کی اور جو حق بات یعنی اسلامی احکامات میں لے کر آیا ہوں اس کی تکذیب کی۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قولہ: انمامثلی ......اتی قوما :

"مثلی" میم اور ثاء دونوں کے فتحہ کے ساتھ صفت عجیبہ کو کہتے ہیں، اصل کے اعتبار سے اس کا وہی معنیٰ ہوتا ہے جو لفظ نظیر کا ہے پھر اس کو مشہور کلام کیلئے استعمال کیا جانے لگا، اس کا ممثل لہ اپنے مورد کے اعتبار سے بنتا ہے، اکثر اس کا ممثل وہ قول ہوتا ہے جو باعتبار حال، قصہ اور صفت کے نہایت انوکھا ہو تعجب خیز ہو۔ لفظ 'بہ' سے مراد ہے کہ دین وشریعت دے کر خدا نے آنحضرت ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ بعض حضرات کہتے ہیں: یہاں لفظ 'ما' ، من کے معنی میں ہے اس صورت میں معنی ہوگا میری اور اس شخص کی مثال ایسی ہے جس کی طرف اللہ نے مجھے بھیجا ہے (یعنی میری اُمت)۔

کمثل رجل: بعض حضرات کہتے ہیں: یہ تشبیہ تشبیہات مفروقہ میں سے ہے، اور تشبیہاتِ مفروقہ یہ ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ دونوں کو ذکر کیا جائے پھر ان کے متعلقات کو یکے بعد دیگرے ذکر کیا جائے، اس کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔ (اتی قوما) : قوم کے پاس آنے کا مقصد یہ ہے کہ قوم کو ایسے دشمن کی خبر دے جو سر پر آن پہنچا ہے اور ہے اتنی قوت والا کہ قوم میں اس کے مقابلہ کی سکت نہیں دشمن سے بچنے کی صرف ایک ہی تدبیر ہے کہ وہ لوگ اس دشمن سے بھاگ کے جان بچالیں، ادھر خبر دینے

والے کی اپنی حیثیت قوم میں یہ ہے کہ وہ ان سب کا بڑا ہے اور اس کی ہر بات کی تصدیق کی جاتی ہے امین ہونے کی وجہ سے۔

قولہ: یاقوم انی رأیت الجیش بعینی و انی انا النذیر العریان:

رأیت بمعنی "ابصرت" ہے پھر عینی کا لفظ مزید تاکید اور توہم مجاز کو دفع کرنے کی غرض سے لایا ہے، یہ تثنیہ کا صیغہ ہے آخر والی یاء مشدد ہے۔ ایک روایت میں مفرد استعمال ہوا ہے نیز آخر والی یاء بغیر تشدید کے ساتھ ہے۔

"وانی انا النذیر" اس جملہ میں حصر ہے۔

"النذیر العریان" کی اصل یہ ہے کہ عرب میں قاعدہ تھا کہ جب کوئی شخص کسی لشکر کو اپنی قوم پر حملہ کیلئے آتا ہوا دیکھتا تو کپڑے اتار کر سر پر رکھ لیتا اور چلاتا ہوا اپنی قوم کی طرف آتا تا کہ لوگ خبردار ہو جائیں اور دشمن سے بچاؤ کی تدبیر پیدا کر سکیں۔

بعض حضرات کہتے ہیں: یہ ضرب المثل اس طرح مشہور ہوئی کہ ایک شخص کو اس کے دشمنوں نے پکڑ لیا تھا، جو کہ اپنی قوم کا جاسوس تھا۔ دشمن نے اس شخص کو اس کے کپڑے اتار کر اسی کے کپڑوں کے ساتھ باندھ دیا تھا یہ آدمی ان کے ہاتھوں سے کسی طریقہ سے چھوٹ کر ننگے بدن اپنی قوم کے پاس آ پہنچا اور دشمن کی اطلاع دی جب انہوں نے اس کو اس خاص حالت کے ساتھ قربانی دیتے دیکھا تو یہاں سے کوچ کر گئے اور ان کی جان بچ گئی اس طرح اس کی وفا ضرب المثل بن گئی۔

بعض لوگوں نے اس حکایت کو یوں بیان کیا ہے کہ دشمن نے قوم کے اس جاسوس شخص کے کپڑے اتار لئے وہ ننگے بدن قوم کے پاس پہنچا اور انہیں دشمن کی آمد کی خبر دی، قوم نے اس کی سچائی کے ظاہر آثار کو دیکھ کر اس کی تصدیق کر لی اور اس کا لقب عریان رکھا۔

قولہ: فالنجاء النجاء:

اکثر نسخوں میں لفظ "نجاء" مکرر ہے، جبکہ ایک نسخہ میں صرف ایک بار منقول ہے۔ لفظ نجاء الف ممدودہ کے ساتھ زیادہ صحیح لغت ہے، مصدر ہے تیز چیز کیلئے استعمال ہوتا ہے، چنانچہ عرب تیز اونٹنی کو ناقۃ ناجۃ کہتے ہیں۔ ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: لفظ نجا کے شروع میں تو فاء ہے، آخر کے اعتبار سے الف ممدودہ و مقصورہ دونوں کے ساتھ جائز ہے، مصدر یا اغراء کی وجہ سے منصوب ہے بطور تاکید مقرر استعمال فرمایا ہے۔

شرح السنہ میں بعض حضرات کا یہ قول منقول ہے کہ لفظ 'نجا' مصابیح کے کچھ نسخوں میں ایک بار منقول ہے جبکہ اکثر نسخوں میں دو بار منقول ہے۔ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: امام بخاری نے قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ اگر نجاء ایک مرتبہ ہے تو پھر الف ممدودہ کے ساتھ ہے (لیکن ابوزید رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ ہو بھی تو الف مقصورہ کے ساتھ ہی پڑھنے کی حکایت کی ہے) اور اگر مکرر ہو تو مد و قصر دونوں کے ساتھ جائز ہے۔ ابہری رحمۃ اللہ علیہ شیخ عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے دونوں صورتوں میں مد نیز اوّل کے مد اور ثانی کے قصر کے ساتھ اور دونوں کے قصر کے ساتھ نقل کرتے ہیں اغراء کی سب منصوب، معنی یہ ہے دشمن سے اپنے آپ کو بچانے کیلئے بھاگ جائیں۔ اس سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دشمن اتنا طاقتور ہے کہ اس کے مقابلہ کی سکت تم میں نہیں۔

قولہ: فاطاعہ طائفۃ من قومہ......فنجوا:

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: لفظ 'طاعۃ' کے مادے میں صدق کا معنیٰ خود بخود پایا جاتا ہے، (فادلجوا): 'ادلج' ہمزہ

قطعی اور دال کے سکون کے ساتھ، چنانچہ وہ لوگ رات کی ابتدائی حصے میں یا پوری رات چلتے رہے مراد کے اعتبار سے دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہمزہ صلی اور جیم کی تشدید کے ساتھ پڑھیں اور یہ مراد لیں کہ یہ چلنا رات کے آخری حصہ میں رہا تو یہ معنی یہاں کے مقام کے مناسب نہیں، امام ابہری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ اس کا معنی لکھتے ہیں: چنانچہ وہ اندھیرے میں چل پڑے (**دلجه** سے انہوں نے اندھیرا مراد لیا ہے) یعنی مطلق رات بغیر کسی حصے کے متعین۔ سید جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **دلجه** کا لفظ مطلق رات کو چلنے اور رات کے آخری حصے میں چلنے ہر دو معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، چاہے مجرد سے ہو یا مزید سے۔

"**مهل**" میم اور ھاء دونوں کے فتحہ کے ساتھ نیز میم کے فتحہ اور ھاء کے سکون کے ساتھ۔ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ لفظ مہل میم کے فتحہ اور ھاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: مسلم کے نسخے میں لفظ مھل میم کے ضمہ اور ھاء کے سکون اور آخر میں تاء مدورہ کے ساتھ منقول ہے، لیکن بخاری میں حذف تاء کے ساتھ، فتح میم اور ھاء کے ساتھ ہے، ہر دونوں لغت صحیح ہیں۔ لیکن صاحب مشکوٰۃ نے بخاری کے اتباع کرتے ہوئے ایک تاء کے ساتھ نقل کیا ہے کیونکہ بخاری اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔

"**فنجوا**" وہ ڈرانے والے کی تصدیق کرنے کے سبب نجات پائے۔

قوله: وكذبت طائفة منهم...... واجتاحهم: امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: تکذیب نافرمانی اور معصیت کو شامل ہے اس سے بھی اسی کے طرف اشارہ ہوتا ہے جو ہم نے پہلے کہا۔

فاصبحوا :أي دخلوا وقت الصباح في مكانهم "فصبحهم"

"صبح" باب تفعیل سے ہے" اجتاح" جیم اور حاء مہملہ کے ساتھ، یعنی اس لشکر نے ان کا استیصال کر کے سب کا صفایا کر دیا وجہ ان کی تکذیب کی نحوست کی وجہ سے، **فذلك** اسم اشارہ کا مشار الیہ مثال مذکور ہے۔

قوله: فذلك مثل من اطاعني...... من الحق: "فاتبع" : ایک نسخہ میں جمع کے صیغہ کے ساتھ منقول ہے۔

"ما" سے مراد آپ کا لایا ہوا پورا سچا دین ہے اس سے یہ معلوم ہوا، کہ جب تک کوئی شخص آپ کے لائے ہوئے پورے دین پر نہ چلے متبع نہیں کہا جا سکتا۔

سید جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یہ جملہ بھی تشبیہات مفروقہ سے ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتِ گرامی کو رجل سے تشبیہ دی ہے جس انداز کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اُمت کی طرف بھیجا ہے اس کو اس شخص کے انداز سے تشبیہ دی جو اپنی قوم کو صبح کے لشکر سے ڈرانے آیا تھا، اور اُمت کے متبعین لوگوں کو تشبیہ دی اس قوم کے مصدقین لوگوں کے ساتھ اور اُمت کے نافرمان لوگوں کو تشبیہ دی ہے اس قوم کے مکذبین کے ساتھ جو اپنے محسن کی بات کی تکذیب کر کے صفحہ ہستی سے مٹ گئے تھے۔

امام سید جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں امرؤ القیس کے اس شعر میں بھی اسی طرح کی تشبیہ پائی جاتی ہے:

كان قلوب الطير رطبًا ويابسًا ☆ لدى وكرها العناب والحشف البالي

"قلوب رطبہ کو عناب کے ساتھ اور قلوب یابسہ کو حشف کے ساتھ علیحدہ علیحدہ لف نشر ومرتب کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔"

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال

۱۴۹ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَثَلِیْ كَمَثَلِ رَجُلٍ اِسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا اَضَاءَ تْ مَا حَوْلَهَا جَعَلَ الْفَرَاشُ وَهٰذِهِ الدَّوَآبُّ الَّتِیْ تَقَعُ فِی النَّارِیَقَعْنَ فِیْهَا وَجَعَلَ یَحْجُزُهُنَّ وَیَغْلِبْنَهٗ فَیَتَقَحَّمْنَ فِیْهَا فَاَنَا اٰخِذٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ وَاَنْتُمْ تَقَحَّمُوْنَ فِیْهَا (هٰذِهٖ رِوَایَةُ الْبُخَارِیِّ وَلِمُسْلِمٍ) نَحْوَهَا وَقَالَ فِیْ اٰخِرِهَا قَالَ فَذٰلِكَ مَثَلِیْ وَمَثَلُكُمْ اَنَا اٰخِذٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ هَلُمَّ عَنِ النَّارِ هَلُمَّ عَنِ النَّارِ فَتَغْلِبُوْنِیْ تَقَحَّمُوْنَ فِیْهَا. (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

أخرجه البخاری فی الصحیح ۳۱٦/۱۱ حدیث رقم٦٤٨٣۔ ومسلم فی صحیحه ۱۷۸۹/٤حدیث رقم(۱۸۔۲۲۸٤) وأخرجه الترمذی بنحوه٥/١٤٢حدیث رقم٢٨٧٤وأحمد فی المسند٢٤٤/٢۔

ترجمہ:حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری مثال اس انسان کی طرح ہے کہ جس نے آگ کو جلایا اور جب آگ نے چاروں طرفوں کو روشن کر دیا تو پروانے اور دوسرے وہ جانور جو آگ میں گرتے ہیں وہ آخر اس آگ میں گرنے لگے آگ جلانے والے انسان نے ان کو روکنا شروع کیا لیکن وہ نہیں رکتے بلکہ اس کی تمام کوشش اور محنت پر غالب رہتے ہیں اور آگ میں گر جاتے ہیں اسی طرح میں بھی تمہاری کمر سے پکڑ کر تمہیں آگ میں گرنے سے بچاتا ہوں اور تم لوگ آگ میں گرتے ہو یہ روایت بخاری کی ہے اور مسلم میں بھی ایسی ہی روایت ہے البتہ مسلم کی روایت کے آخر کے الفاظ اس طرح ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بالکل اسی طرح میری اور تمہاری مثال ہے کہ میں تمہاری کمر کو پکڑے ہوئے ہوں تا کہ تمہیں آگ سے بچاؤں اور یہ کہتا ہوں کہ جہنم کی آگ سے بچو میری طرف آؤ دوزخ سے بچو میری طرف آؤ لیکن تم مجھ پر غالب آ جاتے ہو اور آگ میں گر پڑتے ہو۔ (بخاری ومسلم)

تشریح:قولہ:مثلی کمثل رجل استوقد نارا :"استوقد" اوقد کے ہی معنی میں ہے 'سین' بطور تاکید ملایا۔

نارا:اس کی صفت عظیمۃ یہاں محذوف ہے۔

قولہ:فلما اضاء ت ما حولها :لفظ اضاء ہ زیادہ مقدار کی روشنی کیلئے استعمال ہوتا ہے یہ خود متعدی ہے، متعدی کہا نہیں جاتا۔ یہاں بھی متعدی ہے الف لام استعمال کرنا بھی جائز ہے اضاء ت کا فاعل "ما حولها" ہے، ما حولها سے اماکن مراد ہیں اس لئے فعل کو مؤنث لایا گیا ہے۔امام زین العرب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں آپ "ما" کو زائدہ یا اس خبر کا بدل بنا سکتے ہیں جو اضاءت میں ہے، لیکن "ما" کو زائد یا بدل بنانے میں شبہ ہے۔

ماحولها یہ مسلم کی روایت کے الفاظ ہیں اس میں ضمیر ھا النار کی طرف راجع ہے کہ وہ آگ اپنے ارد گرد کو روشن کرتی ہے۔ بخاری کی روایت میں ما حولها کی جگہ ما حولہ کے الفاظ ہیں، اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ ضمیر مجرور مستوقد کی طرف راجع ہے امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

صاحب مشکوٰۃ نے بخاری کی روایت کو چھوڑ کر مسلم کی روایت کی طرف عدول کیا اس کی وجہ مجھے سمجھ نہیں آئی باوجود اس کے

کہ بخاری کی روایت اصح ہونے کے ساتھ ساتھ قرآنِ کریم الفاظ فصیحہ کے موافق بھی ہے اس کی دلالت مقصود پر واضح طور پر ہے اور حدیث کے آخر میں پھر لکھا ہے ھٰذا روایۃ البخاری۔ لہٰذا خوب تأمل کریں کیونکہ یہاں صاحب مشکوۃ سے غلطی ہوگئی ہے۔

قولہ: جعل الفراش وھٰذا الدواب...... فیتقحمن فیھا:

لفظ فراش' فاء کے فتحہ کے ساتھ چھوٹا سا پرندہ ہ جو آگ پر گرتا ہے جس کو فارسی مین پروانہ کہا جاتا ہے، (وھٰذا الدواب): بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ لفظ فراش کیلئے عطف تفسیر ہے اس کو خبر کی رعایت کرتے ہوئے مؤنث لایا گیا ہے یہ لفظ فراش اسم جنس ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے: ﴿و اوحی ربك النحل ان اتخذی﴾ [النحل: ٦٨]

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ھٰذا الدواب سے فراش کے علاوہ دیگر جو جانور آگ پر گرتے ہیں وہ مراد ہیں، (التی تفع فی النار): ان کی عادت ہے کہ اپنے آپ کو آگ میں گرادیتے ہیں جیسے پسو مچھر وغیرہ، لیکن ان کا آگ کے عاشق ہونے کی کہانی اتنی مشہور نہیں البتہ ان کے علاوہ کچھ ٹڈیوں کی عادت ہے کہ وہ بھی آگ پر گرتی ہیں، (یحجزھن): جیم کے ضمہ کے ساتھ یعنی وہ ان کو آگ میں گرنے سے روکتا ہے۔ امام ابہری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: بخاری کی روایت میں یزعھن کے الفاظ ہیں جس کے معنی ہٹانے کے ہیں، (و یغلبنّہ): کہ وہ بار بار اس میں گر جاتے ہیں کہ جس کی وجہ سے بچانے والا عاجز آجاتا ہے، "یتقحمن" بعض حضرات سے منقول ہے کہ قحم کا مادہ اس وقت استعمال ہوتا جب بغیر سوچے سمجھے اندھوں کی طرح کسی کام میں داخل ہوجائیں؛ جس کو ہلاکت و بربادی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں تقحم کا مطلب ہے: کسی امر شاق کا اقدام کرنا یا کسی امر شاق میں کود پڑھنا۔

قولہ: فانا آخذ بحجزکم:

یہاں فصیحہ ہے مطلب یہ ہے کہ اگر یہ تمثل صحیح ہو ہے کہ میں مستوقد کی طرح ہوں اور تمہاری مثال پروانہ کی ہو تو یاد رکھو فانا آخذ کم...... امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کلمہ آخذ دو طرح روایت کیا گیا ہے:: ① اسم فاعل کے صیغہ کے ساتھ یعنی خاء کی کسرہ ذال کی تنوین کے ساتھ۔ ② فعل مضارع واحد متکلم کے صیغہ (خاء کے ضمہ کے) ساتھ لیکن پہلی روایت زیادہ مشہور ہے اگرچہ دونوں روایتیں صحیح ہیں۔

"حجز" حاء کے ضمہ جیم کے فتحہ جیم کے بعد زاء ہے حجزۃ کی جمع ہے ازار باندھنے کی جگہ۔

امام ابہری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں جیم کے ضمہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔ یہاں حجز کو اسلئے مخصوص کیا کہ محل زنا جو کہ افحش الفواحش ہے اس کے نیچے ہے، یا اس لئے کہ حجز کمر کو کہتے ہیں اور کمر جسم کا وسط ہے جو اخذ کے لحاظ سے اقویٰ اور اوثق ہے بنسبت کسی ایک جانب کو پکڑنے کے ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے پہلی جو توجیہ بیان کی گئی ہے وہ بہتر نہیں دوسری توجیہ محل کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔

قولہ: وانتم تقحمون فیھا: 'تقحمون' باب تفعیل سے ہے ایک تاء کو حذف کیا گیا ہے، ایک صحیح نسخے میں "تقحمون" منقول ہے، جو کہ باب افتعال سے بنتا ہے۔

قوله:هذه رواية البخاري ولمسلم نحوها:

اشارہ یا تو الفاظ کی طرف ہے، یا اس پورے کلام کی طرف ہے جو حدیث کی شروع سے اس مقام تک ہے، البتہ یہاں اسم اشارہ خبر کی رعایت کرتے ہوئے مؤنث لایا گیا ہے، ایک نسخہ میں ھذہ کے بجائے 'ھذا' ہے اس صورت میں ھذا سے الفاظ ہی مراد ہوں گے۔

"نحوها" کی "ھا" ضمیر روایت بخاری کی طرف راجع ہے یعنی مسلم کی روایت معنیً بخاری کی روایت جیسی ہے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شرح میں 'نحوھا' کی جگہ "مثلھا" نقل کیا ہے جو کہ نہ روایتاً نہ درایتاً صحیح ہے۔

قوله:فذلك مثلي ومثلكم :مثل مذکور کی طرف اشارہ ہے، (**مثلي ومثلكم**): ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: یہ جملہ تاکید ہے کلام کے طویل ہوجانے کی بناء پر اس کو دوبارہ ذکر فرمایا گیا ہے وگرنہ تو اس کا مطلب اوّل کلام **آنا اخذ انح** سے واضح ہو چکا ہے، ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی بات یہاں تک لکھنے کے بعد ملاعلی قاری لکھتے ہیں: یہ اصل میں دونوں روایتوں کے درمیان فرق کرنے کیلئے لایا گیا ہے، تفصیل یہ کہ بخاری کی روایت کے الفاظ ہیں : **فانا اخذ**...... جبکہ مسلم کے الفاظ یوں ہیں: **فذلك مثلي ومثلكم انا آخذ بحجزكم عن النار** قول **آنا ' آخذ**...... میں دونوں وجہیں ممکن ہیں۔

قوله:انا آخذ بحجزكم......هلم عن النار :لفظ **هلم** کو غایت اہتمام کیلئے مکرر ذکر کیا، اہلِ حجاز کی لغت میں یہ واحد جمع مذکر مؤنث سب کے لئے استعمال ہوتا ہے معنیٰ ہے میرے طرف لپکو جہنم سے دور بھاگو اور اپنے نفس کو ہلاکت سے بچاؤ۔

امام خلیل فرماتے ہیں: **هلم** اصل میں 'لم' تھا، **أي لم أنفسكم الينا بالقرب منا** "ھا" تنبیہ کیلئے ہے۔ پھر الف کو کثرت استعمال کی وجہ سے خذف کر کے ایک ہی اسم بنادیا، اس میں واحد جمع مذکر مؤنث سب برابر ہیں اور اسی حجازی لغت میں قرآن کریم میں بھی استعمال ہوا ہے۔

کچھ حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ اصل میں '**هل اَمّ**' تھا، جس کا مطلب ہوتا ہے تجھے اس کام میں کوئی رغبت ہے؟ پھر دونوں حکموں کو ملا کر ایک کر دیا گیا اس کو لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھنا بہتر نہیں سمجھا گیا ہے۔

کچھ حضرات 'ھلم' کا معنی یہ لکھتے ہیں میرے قریب ہو جاؤ اور جہنم سے دور ہو جاؤ، یہ خطاب عام ہے، لفظ 'ھلم' محلاً حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، کہ میں تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر تمہیں روکتا ہوں اور **هلم** کی صدائیں لگاتا ہوں۔

قوله:فتغلبوني تقحمون فيها:

"**فتغلبوني** "میں نون مشدد ہے کیونکہ یہ اصل میں تغلبونني ہے پھر نون جمع کو نون وقایہ میں مدغم کر دیا۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ یہاں بھٹک گئے ہیں وہ لکھتے ہیں نون اعرابی کو نون تاکید میں مدغم کر دیا گیا ہے۔ ایک نون کو خذف کر کے تخفیف کے ساتھ بھی اس کو نقل کیا گیا شاطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں : **تغلبوني** میں 'فاء' سببیت کیلئے ہے جیسے آیت مبارکہ: **ليكون لهم عدواً** میں لام سبب بتانے کیلئے آیا ہے۔

"**تقحمون فيها**" یہ جملہ **تغلبوني** کے ضمیر سے حال ہے، کچھ حضرات کی رائے یہ ہے کہ حال نہیں بلکہ ماقبل سے بدل ہے۔

وحی کی مثال

۱۵۰ :وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ مَا بَعَثَنِیَ اللّٰهُ بِهٖ مِنَ الْهُدٰی وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَیْثِ الْكَثِیْرِ اَصَابَ اَرْضًا فَكَانَتْ مِنْهَا طَآئِفَةٌ طَیِّبَةٌ قَبِلَتِ الْمَآءَ فَاَنْبَتَتِ الْكَلَأَ وَالْعُشْبَ بِالْكَثِیْرِ وَكَانَتْ مِنْهَا اَجَادِبُ اَمْسَكَتِ الْمَآءَ فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا وَسَقَوْا وَزَرَعُوْا وَاَصَابَ مِنْهَا طَآئِفَةً اُخْرٰی اِنَّمَا هِیَ قِیْعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَآءً وَلَا تُنْبِتُ كَلَأً فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ وَنَفَعَهٗ مَابَعَثَنِیَ اللّٰهُ بِهٖ فَعَلِمَ وَعَلَّمَ وَمَثَلُ مَنْ لَّمْ یَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَأْسًا وَلَمْ یَقْبَلْ هُدَی اللّٰهِ الَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِهٖ. (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

أخرجه البخاری فی الصحیح ١/١٧٥حدیث رقم٧٩۔وأخرجه مسلم فی صحیحه ٤/١٧٨٧حدیث رقم (١٥۔٢٢٨٢)۔ وأخرجه أحمد فی المسند٤/٣٩٩۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس چیز کی مثال جسے دے کر مجھ کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے یعنی علم اور ہدایت موسلا دھار بارش کی طرح ہے جو زمین پر ہوئی۔ چنانچہ زمین کے اچھے حصہ نے اس کو قبول کیا۔ یعنی اپنے اندر جذب کرلیا اور اس کے ذریعہ سے بہت زیادہ گھاس اور چارہ پیدا ہوا اور زمین کا ایک حصہ ایسا زیادہ سخت تھا کہ اس کے اوپر پانی جمع ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔ لوگوں نے اسے پیا اور پلایا اور کھیتی کو سیراب کیا اور اس بارش کا پانی زمین کے ایک ایسے حصہ پر بھی پہنچا جو چٹیل میدان تھا۔ نہ تو اس نے پانی کو روکا اور نہ گھاس کو اگایا اور یہ اس آدمی کی مثال ہے جس نے اللہ کے دین کو سمجھا اور جو چیز اللہ تعالیٰ نے میرے واسطے سے بھیجی تھی۔ اس نے اس سے فائدہ حاصل کیا۔ کہ اس نے خود سیکھا اور دوسروں کو سکھایا اور اس آدمی کی مثال ہے کہ جس نے اللہ کے دین کو سمجھنے کے لئے سر نہیں اٹھایا' تکبر کیا اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو جو میری وساطت سے بھیجی گئی ہے اس کو قبول نہیں کیا۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قولہ: **مثل ما بعثنی الله ......اصاب ارضا:** "الغیث" موسلا دھار بارش۔ **الغیث** میں الف لام جنس یا زائدہ ہو تو یہ جملہ لفظ غیث کی صفت ہوگی' وگرنہ حال، اور لفظ (ارضًا): کی صفت **صالحة** یہاں محذوف ہے۔

یہاں ہدیٰ سے دو معنیٰ مراد ہو سکتے ہیں: ① **دلالة علی الخیر**۔ ② **ایصال الی الحق**

ہدایت کی پہلی قسم کی مثال قرآنِ کریم کی آیت مبارکہ میں یوں ہے: ﴿وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَیْنٰهُمْ﴾ [فصلت : ١٧] دوسرے معنی کی مثال ﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ﴾ [القصص : ٥٦] اور علم سے یہاں ظاہری اور باطنی دونوں طرح کا علم مراد ہے اور ہدایت علم کا وسیلہ ہے' اسی وجہ سے اس کو مقدم کیا ہے علم پر۔

علم معرفت اور ہدایت کا جوڑ:

علم اللہ کی ایک ایسی نعمت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قلوب کی آبیاری کا ذریعہ بنایا ہے معرفت اس میں مزید تمیز کا نام ہے اور ہدایت وجدانِ قلب کا نام ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں' العلم صفة توجب تمییزاً لا تحتمل النقیض علم کا عطف ہدایت پر اس لئے کیا کہ لرجوعه للنفس، ورجوعها للغیر یا اسلئے عطف کیا گیا ہے کہ ہدایت دلالت ہے اور علم اس کا مدلول یا ہدایت راستہ ہے اور علم اس کا عمل ہے ہدایت بڑھتی نہیں بغیر علم کے۔

آنحضرت ﷺ نے خود کو غیث سے تشبیہ دی اس کی وجہ یہ ہے کہ بارش مردہ زمین کو زندگی بخشتی ہے اور زمین ہمیشہ بارش کی محتاج ہوتی ہے، آنحضرت ﷺ سے قبل فترہ انبیاء کی وجہ سے اللہ کی مخلوق بھی آپ کے بعثت کی محتاج تھی جس طرح زمین بارش کی محتاج ہوتی ہے۔

④ علم کو بمنزل غیث اس لئے فرمایا جس طرح بارش بنجر زمین کو زندہ کرتی ہے' اسی طرح علم مردہ قلوب کو زندہ کرتا ہے۔

قوله: فكانت منها طائفة ...... والعشب الكثير:

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مسلم کے تمام نسخوں میں طائفة' طیبة کے الفاظ ہیں جبکہ بخاری کے نسخے میں **فكانت منها نقية** کے الفاظ ہیں جو کہ طیبة کے ہی معنیٰ میں ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کے علاوہ بھی کچھ الفاظ منقول ہیں لیکن یہاں مقام کے لحاظ سے غیر مناسب ہیں۔

'' الكلأ '' کاف اور لام کے فتحہ کے ساتھ،، الف لام ممدودہ کے ساتھ ہے۔'' العشب'' عین کے ضمہ کے ساتھ، گھاس کیلئے تین طرح کے لفظ استعمال ہوتے ہیں حشیش ' کلاء' عُشب فرق ان میں صرف یہ ہوتا ہے کہ حشیش خشک گھاس کو کہتے ہیں اور کلاء اور عشب تروتازہ گھاس کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔

قوله: وكانت منها اجادب امسكت...... وزرعوا:

جمہور کی روایت میں جیم ہی کے ساتھ منقول ہے، ''اجدب'' کی جمع ہے، سخت زمین جو بارش کے پانی کو روک نہیں سکتی، **جدب** کا اصل معنیٰ قحط ہے اس کو 'اجادب' اس لئے کہتے ہیں کہ سخت زمین ہونے کی وجہ سے وہ سبزہ پیدا نہیں کر پاتی۔ حضرت ابوذرؓ کی روایت میں 'إخاذات' کے الفاظ منقول ہے، اخاذات' اخاذة کی جمع ہے وہ زمین جو پانی کو روک سکے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں بعض محدثین نے اسی کو صحیح قرار دیا ہے جبکہ کچھ نے اجاذب کے الفاظ نقل کیا ہے۔ اس کا معنی اِخاذہ کے قریب ہے، ایک اور روایت بھی ہے لیکن وہ مردود ہے۔

''وزرعوا'': امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مسلم کے تمام نسخوں میں 'ورعوا' کے الفاظ ہیں جو کہ ''رعی'' سے ہے جبکہ بخاری میں زرعو کے الفاظ ہیں، دونوں لفظ اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ مشکاۃ کے نسخ بخاری کے موافق ہیں۔

امام ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن حجر رحمہ اللہ نے جو یہ کہا ہے کہ اصل لفظ رعو ' ارعی سے اور ایک روایت ''زرعوا'' کی ہے، بعض کے نزدیک یہ تصحیف ہے یہ کہتے ہیں بالفرض رعوا ہے تو بھی یہ زرعو کے معنی میں ہے، لیکن ان حضرات کے سوال و جواب میں ربط نہیں ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ روایتوں کے اختلاف سے تین طرح کے لوگوں کی نشاندہی ہوتی ہے شرب اور سقی یہ قسم ثانی میں داخل ہے اور رعی، قسم اوّل میں داخل ہے کیونکہ حصول زرع' وصول الرعی کا ذریعہ ہے بخلاف اس کے عکس کے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا

ہے کہ قسم ثانی والے تمام تر نعمتوں سے متصف ہیں جو خود بھی کھاتے ہیں دوسروں پر بھی خرچ کرتے ہیں یہ کاملین و مکملین ہیں بخلاف قسم اوّل کے۔

قوله: واصاب منها طائفة اخرى ...... ولاتنبت كلأ:

قيعان: قاف کے کسرہ کے ساتھ قاع کی جمع ہے چٹیل میدان۔

قوله: فذلك مثل من فقه ...... فعلم وعلم :

"**فقه**" قاف کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ جائز ہے البتہ ضمہ والی لغت زیادہ مشہور اور بہتر ہے کیونکہ اس صورت میں فقہ شرعی مراد ہوگا جو کہ کتاب وسنت کے فہم کیلئے ہے۔ لفظ "علم" باب تفعیل سے

ایک قسم کے لوگ وہ ہیں جو دین سے فائدہ اٹھانے والے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو دین سے فائدہ نہیں اٹھاتے اسی طرح اس مثال میں ذکر کی گئی زمین دو قسم کی بتائی گئی ہیں زمین کی ایک قسم تو وہ ہے جو پانی سے فائدہ اٹھاتی ہے اور دوسری وہ جو پانی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی پھر فائدہ اٹھانے والی زمین کی دو قسمیں ہیں ایک پیداوار اگانے والی اور دوسری نہ اگانے والی۔

بالکل اسی طرح علم سے فائدہ اٹھانے والے دو طرح کے ہوتے ہیں پہلے وہ ہیں جو عالم بھی ہیں اور عابد وفقیہہ بھی اس پر زمین کے اس ٹکڑے کے مثال صادق آتی ہے جس نے پانی کو اپنے اندر جذب کیا خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی نفع پہنچایا اور گھاس پھونس بھی اگائی اسی طرح اُس شخص نے بھی علم سے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی علم سے مستفید کیا دوسرا وہ شخص ہے جو عالم اور معلم ہے مگر عابد اور فقیہہ نہیں تو وہ خود عبادت میں مشغول ہوتا ہے اور نہ اس نے اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا ہے اُس کی مثال زمین کے اس حصہ کی سی ہے جس میں پانی جمع ہو گیا اور لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا پھر زمین کا وہ حصہ ہے جس نے پانی کو جذب بھی کیا اور گھاس بھی اگائی اور یہ مثال اس مجتہد کی ہے جس نے علم حاصل کیا اور اس سے بہت سے مسائل استنباط کئے خود فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو فائدہ پہنچایا اس طرح کی مثالیں دے کر آپ ﷺ نے اپنی امت کے لوگوں کی تفہیم کرانے کی کوشش کی ہے تاکہ آپ کی امت کے لوگ نہ صرف یہ کہ علم حاصل کریں بلکہ علم حاصل کر کے اس سے خود بھی مستفید ہوں اور دوسروں کو بھی مستفید کریں اور اس شور زمین کی طرح نہ ہو جائیں جس نے پانی کو قبول تو کیا لیکن اپنے اندر جذب نہ ہونے دیا اور نہ کچھ اگایا۔

کج رو لوگ متشابہات کی پیروی کرتے ہیں

۱۵۱: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ تَلَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ اٰيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ وَقَرَأَ اِلٰى وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُو الْاَلْبَابِ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِذَا رَاَيْتِ وَعِنْدَ مُسْلِمٍ رَاَيْتُمُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ سَمَّاهُمُ اللّٰهُ فَاحْذَرُوْهُمْ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

أخرجه البخاري في الصحيح ٢٠٩/٨ حديث رقم ٤٥٤٧ ـ وأخرجه مسلم صحيحه ٢٠٥٣/٤ حديث رقم

(١-٢٦٦٥)۔ وأخرجه أبوداؤد في السنن ٥/٦حديث رقم٤٥٩٨۔وأخرجه ابن ماجة ١/١٨حديث رقم٤٧۔والدارمي في السنن ١/٦٦ حديث رقم١٤٥۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی: هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ ۔ یہ آیت: وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ تک پڑھی۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب نازل کی اس کی آیات دو قسم کی ہیں محکمات اور متشابہات اور اس آیت کا آخر الا اولوا الالباب ہے کہ نصیحت عقل مند لوگ حاصل کرتے ہیں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ یہ آیت تلاوت کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس وقت تو دیکھے اور مسلم شریف کی روایت میں ہے جب تم دیکھو کہ لوگ ان آیات کے پیچھے پڑتے ہیں جو متشابہ ہیں تو تم جان لو کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا نام اللہ تعالیٰ نے کجرو اور گمراہ رکھا ہے۔ لہٰذا ان لوگوں سے بچتے رہو۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: تلا رسول الله ﷺ ﴿هو الذى ......اولوا الالباب﴾:

مکمل آیت یوں ہے: ﴿هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ [آل عمران:٧] ”وہی تو ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی جس کی بعض آیتیں محکم ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ ہیں، تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کا اتباع کرتے ہیں تاکہ فتنہ برپا کریں اور مراد اصلی کا پتہ لگائیں حالانکہ مراد اصلی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے۔ یہ سب ہمارے پروردگا کی طرف سے ہیں اور نصیحت تو عقلمند ہی قبول کرتے ہیں۔“

اس آیت میں اختصار حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا کردہ ہے یا نیچے کے کسی اور راوی کا ہے۔

﴿وما يعلم تأويله الا الله﴾ مذہب صحیح کے مطابق یہاں وقف ہے۔

﴿والراسخون في علم يقولون آمنا به﴾: یعنی علم دین میں رسوخ رکھنے والے علماء آیات متشابہات کے بارے میں یہی کہتے ہیں' آمنا به چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے استواء کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا: ”الاستواء معلوم والكيف مجهول والايمان به واجب والسؤال عنه بدعة۔

قوله: فاذا رأيت الذين يتبعون ما تشابه منه ......فاحذروهم :رایت تاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں خطاب عام ہوگا۔ أی: أيها الرائی، تاء کے کسرہ کے ساتھ بھی مروی ہے اس صورت میں خطاب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ہوگا، اگرچہ مراد عام ہو۔ مسلم کی روایت میں رأيتم کے الفاظ ہیں، جس سے پہلے کی تائید ہوتی ہے۔

”الذين يتبعون ما تشابه“: سے مراد وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو متشابہات کے تتبع پر اقتصار کرتے ہیں اور سد للباب اطلاق کا احتمال بھی ہے۔

”فأولٰئك“ کاف کے فتحہ کے ساتھ ہے، اور بعض کا کہنا ہے کہ کاف کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

”الذين سماهم الله“ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا ذکر اس آیت: ﴿في قلوبهم زيغ﴾ میں ہے۔

''فاحذروھم'': ایسے لوگوں سے بچو، نہ ان کے ہم نشین بنو، اور نہ ان سے ہم کلام ہو۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: صحیح البخاری کے اور مصابیح کے بعض نسخوں میں رأیتُ تاء کے فتحہ کے ساتھ ہے، خطاب عام ہے چنانچہ اسی وجہ سے فاحذروھم جمع کا صیغہ لایا گیا، اور بعض نسخوں میں تاء کے کسرہ کے ساتھ ہے اس صورت میں اس کلام کی مخاطب صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ اس کو حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بیان فضیلت اور کمال علمی کا اظہار سمجھا جائے گا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: یا فلان افعلوا کیت و کیت قوم کے بڑے سے جب کلام کیا جائے اور اس کا اعزاز واکرام مقصود ہوتا ہے تو یوں ہی خطاب کیا جاتا ہے۔ اسی قبیل سے یہ ارشادِ گرامی ہے: ﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللَّهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا﴾ [الطلاق : ۱] (اے پیغمبر (مسلمانوں سے کہہ دو کہ) جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو اور عدت کا شمار رکھو اور خدا سے جو تمہارا پروردگار ہے ڈرو (نہ تو تم ہی) ان کو (ایام عدت میں) ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ (خود ہی) نکلیں ہاں اگر وہ صریح بے حیائی کریں (تو نکال دینا چاہیے) اور یہ خدا کی حدیں ہیں جو خدا کی حدوں سے تجاوز کریگا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔ (اے طلاق دینے والے) تجھے کیا معلوم شاید خدا اس کے بعد کوئی (رجعت کی) سبیل پیدا کردے) ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ، طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی گرفت کرتے ہوئے فرماتے ہیں اس تحقیق کا تقاضا تو یہ ہے کہ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد گرامی ارشاد فرمایا تھا اس وقت وہاں صحابہ کرام کی جماعت موجود تھی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ جمع مذکر کے خطاب کو حضرت عائشہ صدیقہؓ کی تعظیم پر محمول کیا جائے، بایں طور کہ ان کو کمال عقل کی وجہ سے بمنزلہ رجال کے رکھتے ہوئے خطاب فرمایا، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں: ﴿وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ﴾ [التحریم : ۱۲]، واللہ اعلم۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس اختلاف سے ڈرایا ہے جو مفضی الی الکفر یا مفضی الی البدعۃ ہو جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے اختلاف کیا مثلاً نفس قرآن میں اختلاف کرنا، یا قرآنِ کریم کی کسی آیت کے ایسے معنی بیان کرنا جس میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو یا مشکوک ہوں یا فتنہ وخصومت کا باعث ہوں البتہ ایسا اختلاف ممنوع نہیں جو دین کی فروعات میں استنباط کیلئے ہو، یا اہلِ علم کا فروعی مسائل مثلاً بطلان الوضوء بالمس میں کسی فائدہ کے پیش نظر یا اظہارِ حق کیلئے مناظرہ کرنا۔ تو یہ مامور بہ ہے اور اس کی فضیلت بیان کی محتاج نہیں، عہدِ صحابہ سے لے کر آج تک اس پر اجماع چلا آ رہا ہے، اھ۔

کتاب اللہ میں اختلاف ہلاکت ہے

۱۵۲: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ هَجَّرْتُ إِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا قَالَ فَسَمِعَ أَصْوَاتَ رَجُلَيْنِ اخْتَلَفَا فِيْ آيَةٍ فَخَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْرَفُ فِيْ وَجْهِهِ الْغَضَبُ فَقَالَ إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِاخْتِلَافِهِمْ فِي الْكِتَابِ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/ ٢٠٥٣ حديث رقم (٢-٢٦٦٦)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دو پہر کے وقت حاضر ہوا حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دو آدمیوں کی آوازیں سنیں جو متشابہ آیت کے بارے میں اختلاف کررہے تھے یعنی اس کے معنی میں جھگڑ رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ گھر سے باہر نکلے اور ہمارے پاس تشریف لائے اس وقت آپ ﷺ کے چہرہ مبارک پر غصہ کے آثار نمایاں تھے آپ نے فرمایا تم سے پہلے لوگ اللہ کی کتاب میں اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئے اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: هجرت الى رسول الله ﷺ يوما......في آية :

"هجرت" از باب تفعیل، واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ **تهجیر** کا مطلب ہوتا ہے: **السير في الهاجرة۔ أي الظهيرة۔** دو پہر کو چلنا۔

(يوما): تنوین تنکیر کیلئے ہے، یا تعظیم کیلئے ہے۔

مظہر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بھری دو پہر میں یوں نکلنا ممکن ہے طلب علم کیلئے ہو کہ آنحضرت ﷺ جب اپنے حجرۂ مبارکہ سے باہر تشریف لائیں تو ان کا کوئی قول یا فعل میرے علم میں آنے سے نہ رہ جائے۔ چنانچہ اس سے طلب علم اور مسجد کی طرف جلد جانے کی اور مشقت اٹھانے کی ترغیب معلوم ہوتی ہے۔

رضی نے تصریح کی ہے کہ جب دو اجزاء کی اضافت اپنی شئی متضمن کی طرف ہو، اور وہ دونوں اشیاء متضمنہ ایک ہی لفظ ہوں، تو مضاف میں صیغہ مفرد کا لانا، مثنی لانے سے اولیٰ ہے اور جمع کا صیغہ لانا مفرد کا صیغہ لانے سے اولیٰ ہے لیکن اصوات کو اجزاء میں شمار کرنا محلِ نظر ہے، اور بظاہر یہی وجہ ہے کہ لفظ **اصوات** کو جمع لانا اپنی حقیقت کے مطابق ہے، چونکہ دونوں شخصوں کے کلمات کا ہر حرف صوت معتمد علی مخرجہ ہے۔ تفسیر جلالین میں اس آیت کریمہ: ﴿فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا﴾ [التحريم: ٤] کے تحت لکھتے ہیں: قلبین پر قلوب کا اطلاق ہوا ہے۔

یہ دونوں آدمی کسی آیت متشابہہ کے معنی میں اختلاف کررہے تھے، اور ممکن ہے کہ ان کا کسی آیت میں قراءت کا اختلاف ہو۔

قوله: فخرج علينا رسول الله ﷺ يعرف في وجهه الغضب: "**يعرف**" صیغہ مجہول کے ساتھ ہے اور یہ جملہ حال ہے، خرج کی ضمیر سے۔

سوال سے سختی ہو سکتی ہے

١٥٣ : وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِىْ وَقَّاصٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَعْظَمَ الْمُسْلِمِيْنَ فِى الْمُسْلِمِيْنَ جُرْمًا مَنْ سَاَلَ عَنْ شَيْءٍ لَمْ يُحَرَّمْ عَلَى النَّاسِ فَحُرِّمَ مِنْ اَجْلِ مَسْاَلَتِهٖ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٣/ ٢٦٤ حديث رقم ٧٢٨٩۔ وأخرجه مسلم في صحيحه ٤/ ١٨٣١ حديث رقم

(۱۳۲-۲۳۵۸) وأخرجه أبو داوٗد فى السنن ۵/۱۶ حديث رقم ۴۶۱۰ وأخرجه أحمد فى المسند ۱/۱۷۹۔

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں میں سب سے بڑا گناہ گار وہ آدمی ہے کہ جس نے کسی ایسی چیز کے بارے میں سوال کیا ہو جو حرام نہ تھی مگر اس کے سوال کرنے کی وجہ سے حرام کردی گئی ہو۔ (بخاری و مسلم)

راویٔ حدیث:

سعد بن ابی وقاص:

نام و نسب:

یہ سعد بن ابی وقاص ہیں۔ ان کی کنیت ''ابو اسحاق'' ہے۔ اور ان کے والد ''ابو وقاص'' کا نام مالک بن وہیب ہے۔ زہری ہیں قبیلہ قریش میں سے۔

فضائل: یہ ان دس (۱۰) میں سے ایک ہیں جن کو حضور ﷺ نے جنت کی بشارت دی تھی' یہ شروع اسلام ہی میں ایمان لے آئے تھے جب کہ ان کی عمر سترہ (۱۷) سال کی تھی۔ ''ان کا بیان ہے کہ میں اسلام لانے والوں میں سے تیسرا شخص ہوں اور میں ہی وہ پہلا شخص ہوں کہ جس نے اللہ کے راستہ میں تیراندازی کی''۔ تمام غزوات میں آنحضور ﷺ کے ساتھ برابر شریک رہے بڑے مستجات الدعوات تھے۔ ان کی اس بات کی لوگوں میں بڑی شہرت تھی' ان کی بد دعا سے لوگ ڈرتے تھے اور ان سے دعا خیر کی تمنا رکھتے تھے اور یہ بات اس لیے تھی کہ آنحضور ﷺ نے ان کے حق میں یہ دعا کی تھی کہ ''اے اللہ ان کے تیر کو سیدھا پہنچا دے اور ان کی دعا کو قبول فرمالے'' ان کے لیے اور زبیر رضی اللہ عنہ کے لیے آنحضور ﷺ نے اپنے ماں باپ دونوں کو جمع کر کے اس طرح فرمایا: ((ارم فداك ابى وامى)) ایسے الفاظ ان دونوں کے علاوہ کسی اور سے نہیں فرمائے۔

یہ کوتاہ قامت اور مضبوط ہوئے بدن والے تھے گندمی رنگ تھا اور جسم پر بال زیادہ تھے۔ ۵۵ میں مقام عقیق جو مدینہ سے قریب ہے اپنے محل میں وفات پائی اور لوگوں کے کاندھوں پر مدینہ لے جائے گئے۔ مروان بن حکم نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اس وقت مروان مدینہ کا حاکم تھا۔ ان کی عمر کچھ اوپر ستر (۷۰) سال کی ہوئی۔ عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم میں سے ان کی موت سب سے آخر میں واقع ہوئی۔ حضرت عمرؓ و عثمان رضی اللہ عنہما نے ان کو کوفہ کا گورنر بنایا تھا۔ ان سے ایک بڑی جماعت صحابہ اور تابعین کی روایت کرتی ہے۔

سعد بن مالک رضی اللہ عنہ کے بارے میں ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مؤلف رحمہ اللہ نے ان کا اسم گرامی ذکر نہیں فرمایا۔

تشریح: قوله: ان اعظم المسلمين فى المسلمين:

في المسلمين: یہاں مضاف محذوف ہے، ای فی حق المسلمین ''جرما'' تمیز ہے۔ ای ذنبا و ظلما کائنا فیھم: ''سأل'' فعل کا مفعول بہ محذوف ہے، ای: نبیّہ۔ ''شئی'' کی تنوین برائے تنکیر ہے۔ ''لم یحرم'' باب تفعیل سے فعل مجہول کا صیغہ ہے۔ لم یحرم علی الناس' یہ جملہ محل جر میں ''شئی'' مجرور کی صفت ہے۔

مسلمانوں کے حق میں سب سے بڑا ظالم وگناہ گار وہ شخص ہے جس نے اپنے نبی سے کسی ایسی چیز کے بارے میں سوال کیا جو بوقت سوال تک تو حرام نہ تھی، مگر اس کے سوال کرنے کی وجہ سے وہ چیز حرام ہوگئی۔ اصل الاشیاء الاباحة قبل ورود الشرع حتی یقوم دلیل الحظر کے قائلین نے بھی اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔

ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (اگر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سوال کے جواب میں) خاموشی اختیار کریں تو ایسا کرنا سائل کو روکنے کے مترادف ہے، اور اگر جواب عنایت فرماتے ہیں تو سائل کے حق میں سختی لازم آئے گی، لہٰذا یہ سائل اپنے اس سوال کرنے کی وجہ سے دوسرے لوگوں کے حق میں سختی کرنے کا باعث بنا، اور سب سے بڑا مجرم اس اعتبار سے ٹھہرا کہ اس کی جنابت کا اثر تمام مسلمانوں تک پہنچا، البتہ اگر کسی شخص کو کسی مسئلہ کا حکم شرعی معلوم نہیں اور وہ یہ پوچھتا ہے کہ یہ چیز واجب ہے یا مندوب ہے، یا مباح ہے تو وہ اس وعید میں داخل نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل: ٤٣] (اور ہم نے تم سے پہلے مردوں ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجا تھا جن کی طرف ہم وحی بھیجا کرتے تھے۔ اگر لوگ نہیں جانتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو)۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ وعید اس شخص کے بارے میں ہے جو عبث سوال کرے یا غیر پیش آمدہ مسئلہ میں ازراہِ تصنع سوال کرے جیسا کہ بنی اسرائیل نے گائے کے بارے میں موسیٰ علیہ السلام سے خوامخواہ کے سوالات کئے، البتہ اگر کسی حاجت کے بارے میں سوال کرتا ہے تو اس کو ثواب ملے گا۔

توضیح: بعض کا کہنا ہے کہ بخاری کی روایت میں فی المسلمین، اور علی الناس کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔

آخری زمانے میں کذاب اور دجال ہونگے

۱۵۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكُوْنُ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ دَجَّالُوْنَ كَذَّابُوْنَ يَأْتُوْنَكُمْ مِنَ الْاَحَادِيْثِ بِمَا لَمْ تَسْمَعُوْا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَاؤُكُمْ فَاِيَّاكُمْ وَاِيَّاهُمْ لَا يُضِلُّوْنَكُمْ وَلَا يَفْتِنُوْنَكُمْ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

أخرجه مسلم في مقدمة صحيحه ١/١٢ حديث رقم(٧) وأخرجه أحمد في المسند ٢/٣٤٩۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آخری زمانہ میں مکار اور دھوکہ دینے والے اور جھوٹے لوگ ہونگے جو تمہارے پاس ایسی حدیثیں لائیں گے جن کو نہ تم نے سنا ہوگا اور نہ تمہارے آباء واجداد نے سنا ہوگا لہٰذا ایسے لوگوں سے بچو اور ان کو اپنے آپ سے بچاؤ کہیں وہ تمہیں گمراہ نہ کردیں اور فتنہ میں نہ ڈال دیں اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: یکون فی آخر الزمان دجالون ......ولا آبائکم:

"فی آخر الزمان" یہاں کچھ عبارت مقدر ہے۔ ای آخر زمان هذه الامة...... "دجالون" دجل سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: تلبیس دجالون، دجال کی جمع ہے، بہت ہی فریبی، دھوکہ باز۔

اس حدیث میں بعض ایسے فریبی اور مکار لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اُمتِ محمدیہ کے آخری زمانہ میں ظاہر ہوں گے، یہ دھوکہ باز لوگ، عوام کو باور کرائیں گے کہ ہم علماء اور مشائخ ہیں اور تمہیں دین کی طرف دعوت دیتے ہیں حالانکہ وہ پرلے درجہ کے جھوٹے ہوں گے وہ تمہارے پاس ایسی باتیں لائیں گے جنہیں نہ تم نے سُنا ہوگا اور نہ تمہارے آباء واجداد نے۔ اِن اَن سُنی باتوں سے کیا مراد ہے؟ اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔

① ان باتوں سے مراد احادیث کاذبہ وموضوعہ ہیں۔
② ان باتوں سے مراد احکامِ باطلہ ہیں۔
③ ان باتوں سے مراد اعتقاداتِ فاسدہ ہیں۔
④ ان باتوں سے مراد علم الکلام کے مسائل ہیں۔

شرح السنہ میں لکھتے ہیں: اہل السنّت کے علماء سلف کا اتفاق ہے کہ صفات باری تعالیٰ میں جدال اور علم کلام میں غور وخوض اور اس کا سیکھنا ممنوع ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بدعت سے بچو۔ ان سے پوچھا گیا بدعات کیا ہیں؟ فرمایا اہل بدعت وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات، اس کے کلام، اس کے علم، اس کی قدرت کے بارے میں کلام کرتے ہیں، اور اس چیز کی بابت خاموشی اختیار نہیں کرتے کہ جس کے بارے میں صحابہ اور تابعین نے سکوت کیا ہے۔ اگر کلام کوئی علم ہوتا تو یہ حضرات اس بارے میں کلام فرماتے جیسا کہ ان حضرات نے احکام کے سلسلہ میں کلام فرمایا۔ سفیان ثوری سے علم کلام کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا باطل کو چھوڑ دے، تو حق سے کہاں ہے؟ سنت کی اتباع کر اور بدعت کو چھوڑ دے اور کہہ میں نے امر کو اتباع میں پایا اور فرمایا تم پر کتاب اللہ کے سلسلہ میں وہی کچھ لازم ہے جو اونٹ والوں پر، اور عورتوں پر گھروں میں اور بچوں پر کتاب میں لازم ہے۔ یعنی اقرار وعمل۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آدمی کا شرک کے علاوہ کسی گناہ میں مبتلا ہو جانا علم کلام میں مبتلا ہونے سے بہتر ہے۔ اور ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: کہ اللہ کے ساتھ سوائے شرک کے ہر گناہ کے ساتھ ملنا مجھے آسان لگتا ہے بنسبت اس کے کہ میں علم کلام میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ سے ملوں۔ اور فرمایا کہ میری رائے اور میرا حکم علم کلام والوں کے بارے میں یہ ہے کہ ان کو چھڑی سے مارا جائے اور بازاروں کا چکر لگوایا جائے یا خاندانوں اور قبائل میں چکر لگوایا جائے اور یہ اعلان کیا جائے کہ یہ سزا ہے اس شخص کی جو کتاب وسنت کو چھوڑ کر علم کلام میں مشغول ہوا۔

قولہ: فایاکم وایاھم لا یضلونکم ولا یفتنونکم:

"لا یضلونکم" یہ جملہ مستانفہ ہے، سوال مقدر کا جواب ہے۔ فرمایا گیا کہ فایاکم وایاھم تو مخاطب نے پوچھا لم نبعدھم؟ ہم ان سے درو کیوں رہیں؟ تو جواب ملا: لئلا یضلوکم حرف جار کو حذف کر دیا گیا، لہٰذا فعل مرفوع ہو گیا۔ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، سوال مقدر ماذا یکون بعد الحذر؟ ہے، اھ۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، اس کی نظیر یہ آیت کریمہ ہے: ﴿عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ﴾ [المائدۃ: ۱۰۵] (اے ایمان والوں! اپنی جانوں کی حفاظت کرو جب تم ہدایت پر ہو تو کوئی گمراہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔) اس قراءت میں رفع کے ساتھ ہے، اھ۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات پر اعتراض وارد کیا ہے، وہ یہ کہ یہ دلیل مقصود کیلئے صریح نہیں ہے، چونکہ اس کا مرفوع ہونا

جملہ مستانفہ ہونے کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ مجزوم علی الجواب یا مجزوم علی النہی بھی ہو سکتا ہے اور قیاس یہ ہے کہ مفتوح ہو۔ لیکن راء کو ضاد کے ضمہ کی اتباع میں ضمہ دیا گیا، اور یہ ضمہ راء مدغمہ سے منقول آ رہا ہے اور اس کی تائید نصاب کی قراءت سے بھی ہوتی ہے کہ قراء نے یضر کم کو راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اگر مرفوع سے مراد اثبات نون ہے تو وہ محفوظ نہیں ہے، واللہ اعلم۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اکلونی البراغیث والی لغت ہو یا خبر بمعنی نہی ہو اور نہی میں مبالغہ مقصود ہو، چنانچہ حکم بالحذر کی تاکید ہوگا اور چونکہ نون موجود ہے لہٰذا جواب امر بھی نہیں ہو سکتا۔

اہل کتاب مسلمانوں کے سامنے تورات کی تفسیر عربی میں کرتے تھے

۱۵۵: وَعَنْهُ قَالَ كَانَ اَهْلُ الْكِتَابِ يَقْرَأُوْنَ التَّوْرَاةَ بِالْعِبْرَانِيَّةِ وَيُفَسِّرُوْنَهَا بِالْعَرَبِيَّةِ لِاَهْلِ الْاِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُصَدِّقُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ وَقُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا الاية ...... (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۳/۵۱۶ حديث رقم ۷۵۴۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھتے تھے اور مسلمانوں کے لئے اس کی تفسیر عربی زبان میں کیا کرتے تھے رسول اللہ ﷺ نے ان کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر صحابہ کرام سے فرمایا کہ تم نہ اہل کتاب کی تصدیق کرو اور نہ ان کی تکذیب کرو اور صرف یہ کہہ دو کہ ہم اللہ پر اور اس چیز پر جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے ایمان لائے ...... ر تک آیت پڑھی اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔

تشریح: رسولِ اکرم ﷺ کے اس ارشادِ گرامی کا مطلب یہ ہے کہ جب اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ تمہارے سامنے انجیل یا تورات کی کوئی عبارت پڑھیں، یا اس کا ترجمہ سنائیں یا اس کی تشریح بیان کریں تو ذرا سوچ سمجھ سے کام لو، بایں طور کہ اگر وہ ایسی چیز پیش کریں کہ جس کا صدق تم پر عیاں نہیں، تو ہو سکتا ہے کہ وہ بات جھوٹی ہو، جیسا کہ ان کی عادت بھی یہی ہے۔ نیز اگر وہ ایسی چیز پیش کریں کہ جس کا کذب تم پر عیاں نہیں' تو ہو سکتا ہے کہ وہ' وہ بات سچی ہو، اگر چہ ایسا شاذ و نادر ہی ہے۔ چونکہ جھوٹا بھی کبھی سچ بول جاتا ہے۔ اس حدیث سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ جن امور یا علوم میں کوئی اشکال ہو اس پر جواز یا بطلان کا حکم نہیں لگانا چاہئے۔ سلف کا طرزِ عمل یہی رہا ہے، وہ نامعلوم چیز کے بارے میں فرمایا کرتے تھے: **لا أدري**۔

زیر نظر حدیث میں پیش کردہ سورۃ بقرہ کی وہ آیت یوں ہے:

﴿قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَا اُنْزِلَ اِلٰى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَا اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَا اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ [البقرة:۱۳۶] (۔ (مسلمانو!) کہو کہ ہم خدا پر ایمان لائے اور جو (کتاب) ہم پر اتری اس پر اور جو (صحیفے) ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے ان پر اور جو (کتابیں) موسیٰ اور عیسیٰ کو عطا ہوئیں ان پر اور جو اور پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ملیں ان پر (سب پر ایمان لائے) ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے اور ہم اسی (خدائے واحد) کے

فرمانبردار ہیں۔) اس حدیث میں محل شاہد یہی آیت کریمہ ہے اور مقصود یہ ہے کہ نزاع نہ کیا جائے، اور اجمالی ایمان لایا جائے۔

سنی سنائی بات کو آگے پھیلانے والا جھوٹا ہے

۱۵۶ : وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَاسَمِعَ۔

(رَوَاهُ مُسْلِم)

أخرجه مسلم فى صحيحه فى المقدمة ١/ ١٠ حديث رقم(٥-٥)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ جس بات کو سنے تحقیق کے بغیر اس کو آگے پھیلائے۔ اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: كفى بالمرء كذبا أن يحدث:

المرء' لفظاً مجرور، محلاً مفعول ہے اور باء زائدہ۔ كذبا (کاف کے فتحہ اور دال کے کسرہ کے ساتھ، نیز کاف کے کسرہ اور دال کے سکون) کے ساتھ تمیز ہے اور ایک روایت میں كذبا کے بجائے "اثما" کا لفظ ہے۔

"أن يحدث": بتاویل مصدر ہو کر "كفى" کا فاعل ہے۔

جو شخص جان بوجھ کر جھوٹ نہ بولتا ہو لیکن اس کی عادت میں یہ بات داخل ہو جائے کہ وہ جو کچھ سنے بغیر تحقیق کے دوسروں تک پہنچا دے یا اس بات کو مشہور کر دے تو اس کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنی بات ہی کافی ہے کیونکہ سنی سنائی بات پر اعتماد کر لینا اور بغیر تحقیق کے اس کو آگے پھیلا دینا جھوٹ کا پہلا زینہ ہے ظاہر ہے کہ جس شخص کی عادت میں یہ بات داخل ہو جائے گی وہ عنقریب جھوٹ کی لعنت میں گرفتار ہو جائے گا کیونکہ ہر سنی سنائی بات سچ نہیں ہوتی اس لئے جب وہ سچ کے ساتھ جھوٹ بولنے کا عادی ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ جھوٹ اس کی طبیعت میں رچ جاتا ہے مختصر یہ کہ ہر سنی ہوئی بات آگے نہیں پہنچانا چاہئے بلکہ پہلے اس کی تحقیق کرنی چاہئے اسی طرح یہ بھی ہے کہ بات جتنی اہم ہو گی اتنی ہی تحقیق اس کی ضروری ہو گی' چنانچہ احادیثِ نبویہ میں تو انتہائی احتیاط و تحقیق کی ضرورت ہے۔ اسی وجہ سے مصنف رحمہ اللہ نے یہ روایت اس باب میں ذکر کی ہے۔

ہر نبی کے لئے حواری ہوتے ہیں

۱۵۷ : وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِىْ اُمَّتِهٖ قَبْلِىْ اِلَّا كَانَ لَهٗ مِنْ اُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَاَصْحَابٌ يَّاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَيَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَالَايَفْعَلُوْنَ وَيَفْعَلُوْنَ مَا لَايُؤْمَرُوْنَ فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَآءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ

خَرْدَلٍ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۶۹ حدیث رقم (۸۰۔ ۵۰)۔ وأخرج بعضه أحمد فی المسند ۱/۴۵۸۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کسی قوم میں کوئی ایسا نبی نہیں بھیجا جس کے حمایتی اور دوست اس قوم سے نہ ہوں۔ جو اس نبی کے طریقہ کو اختیار کرتے ہیں اور اس کے احکام کی اتباع کرتے ہیں۔ پھر ان حمایتیوں اور دوستوں کے بعد ایسے نالائق جانشین پیدا ہوتے ہیں جو لوگوں سے ایسی بات کہتے ہیں جس کو خود نہیں کرتے اور وہ کام کرتے ہیں جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا۔ جیسے علماء سوء اور امراء اور سرداروں کا طریقہ ہے۔ لہٰذا تم میں سے جو ایسے آدمی سے اپنے ہاتھ کے ساتھ جہاد کرے وہ مؤمن ہے اور جو آدمی ان لوگوں کے ساتھ اپنی زبان سے جہاد کرے وہ مؤمن ہے اور اس کے علاوہ جو آدمی ان کے خلاف اتنا بھی نہ کر سکے ۔اس میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **قوله: ما من نبی بعثه الله فی امته ...... ویقتدون بامره**: مِنْ زائدہ، استغراق نفی کیلئے ہے۔ ایک نسخہ میں "فی أمة" کے الفاظ ہیں۔ أمته کی روایت کی صورت میں قبلی کا تعلق بعث کے ساتھ ہوگا، یا یہ أمته سے حال ہوگا۔

قال التوربشتی: نحن نروی من کتاب مسلم وغیره "فی أمة" بغیرهاء وفی بعض نسخ المصابیح بالهاء بعد التاء والاول هو الصواب والأمثل فی فصیح الکلام، قال المؤلف: وقد وجدت فی کتاب الحمیدی والجامع والمشارق بغیرهاء وفی صحیح مسلم کما فی المصابیح، وقال المظهر' الروایة بالهاء أصح۔

ان حضرات کی عبارت کا یک حرفی خلاصہ یہی ہے کہ بعض نسخوں یا بعض روایات میں "فی أمة" کے الفاظ آئے ہیں۔

تورپشتی ؒ اور مظہر ؒ نے فی أمته والی روایت ونسخ کو صواب، اصح اور کلام عرب کے اعتبار سے اَمثل قرار دیا ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ نبی نکرہ ہے، مناسب یہ تھا کہ أمة بھی نکرہ ہو، چونکہ عبارت کی معنوی تقدیر یوں ہے: "ما من نبی من الانبیاء فی أمة من الأمم"۔ 'ما' نافیہ ہے، اور "من" استغراقیہ ہے۔ علاوہ ازیں من أمته میں أمته معرفہ ہے، گویا کہ معرف باللام ہے۔

حواریون: اس لفظ پر سیر حاصل تحقیق پیچھے گزر چکی۔

واصحاب: میں دوسری ترکیبی احتمال یہ ہے کہ یہ عطف "تفسیری" ہے۔

قوله: انها تخلف من بعدهم ...... مالایؤمرون: ضمیر قصہ ہے۔

خلوف: اس لفظ کی مکمل تحقیق' جلد اوّل، کتاب العلم، حدیث: ۲۴۸ کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

قوله: فمن جاهدهم فهو مؤمن: شرط محذوف کی جزاء ہے۔ أی: **اذا تقرر ذلك فمن حاربهم وأنكر عليهم۔** "مؤمن" کی تنوین برائے تنویع ہے۔ یعنی مؤمن کی انواع کی طرف اشارہ ہے۔ أمة کی تقدیر پر قبلی "أمة" کی صفت ہوگا۔

قوله: ولیس وراء ذلك من الایمان حبة خردل: خردل' لیس کا اسم ہے، من الایمان اصل کے اعتبار سے

خردل کی صفت ہے، مگر مقدم ہونے کی وجہ سے حال ہے، وراء ذلك ' ليس کی خبر ہے۔

یہ حدیث غالب احوال پر محمول ہے، چونکہ حدیث میں آتا ہے: "ان نبیا یجیئ یوم القیامة ولم یتبعه من أمته الا واحد"۔

پچھلے انبیاء کے ساتھ معاملہ یہ رہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کے مددگار اور دوست پیدا فرمائے کہ جو اس نبی کے طریقہ اور سنت کو اختیار کرتے رہے، اپنے نبی کے احکام کی پیروی کرتے رہے، امتثال اوامر اور اجتناب از نواہی کرتے رہے پھر ان دوستوں اور مددگاروں کے بعد ایسے نااہل لوگ پیدا ہوئے جو لوگوں سے ایسی باتیں کہتے جو خود نہ کرتے اور وہ کام کرتے جن کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کے ارشادِ گرامی کا یہ حصہ درحقیقت ان آیاتِ کریمہ کی طرف اشارہ ہے:

① ﴿لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ﴾

[آل عمران : ۱۸۸]

"جو لوگ اپنے (ناپسند) کاموں سے خوش ہوتے ہیں اور (پسندیدہ کام) جو کرتے نہیں ان کے لیے چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے ان کی نسبت خیال نہ کرنا کہ وہ عذاب سے رستگار ہو جائیں گے اور انہیں درد دینے والا عذاب ہوگا۔"

② ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ [الصف : ۲، ۳]

مؤمنو! تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے۔ خدا اس بات سے سخت بیزار ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں

آنحضرت ﷺ کے ارشادِ گرامی کا دوسرا حصہ فمن جاهدهم...... یہ بتاتا ہے کہ اس اُمت میں بھی اس طرح کے لوگ ہوں گے۔ لہٰذا اُمت کا جو شخص بھی ان لوگوں کے ساتھ جہاد کر سکے وہ جہاد کرے۔ جو شخص ان لوگوں سے اپنے ہاتھ سے جہاد کرے گا وہ کامل مؤمن ہے اور جو شخص ان لوگوں سے اپنی زبان سے جہاد کرے گا (یعنی ان لوگوں کے غلط اقوال وافعال پر ان کو تنبیہ کرے اور زبان سے روکے) وہ درمیانہ درجہ کا مؤمن ہے اور جو شخص ان لوگوں سے اپنے دِل سے جہاد کرے یعنی ایسی غلط چیزوں کو دِل سے بُرا جانے دِلی نفرت کا اظہار کرے، پھر جس شخص میں یہ بات بھی نہ پائی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس شخص کا احساس مردہ ہو چکا ہے، اس کے دِل سے معاصی کا بُرا ہو جانے کا خیال نکل چکا ہے، وہ اللہ کے محارم کو حلال سمجھتا ہے اور اللہ کے احکام کو باطل سمجھتا ہے، ان صفات سے متصف شخص دائرہ ایمان سے خارج ہے۔

اس حدیث مبارکہ میں کسی نہ کسی درجہ میں ایمان کے تین مراتب کی طرف اشارہ بھی ہے۔

ہدایت کے داعی کے لئے اجر اور ضلالت کے داعی کے لیے گناہ ہوتا ہے

۱۵۸ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ دَعَا اِلٰى هُدًى كَانَ لَهٗ مِنَ الْاَجْرِ مِثْلَ اُجُوْرِ مَنْ تَبِعَهٗ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْئًا دَعَا اِلٰى ضَلَالَةٍ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْاِثْمِ مِثْلَ اٰثَامِ مَنْ تَبِعَهٗ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ اٰثَامِهِمْ شَيْئًا . (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ٤/ ٢٠٦٠ حدیث رقم (١٦-٢٦٧٤)۔وأخرجه أبوداوٗد فی السنن ٥/ ١٥ حدیث رقم ٤٦٠٩۔ وأخرجه الترمذی فی السنن ٥/ ٤٢ حدیث رقم ٢٦٧٤۔وابن ماجة ١/ ٧٥ حدیث رقم ٢٠٦ والدارمی فی مقدمة سننه ١/ ١٤١ حدیث رقم ٥١٣ و أحمد فی المسند ٢/ ٣٩٧۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے کسی کو ہدایت کی طرف دعوت دی تو اس کو بھی اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ اس کی پیروی اختیار کرنے والے کو ملے گا اور اس اتباع کرنے والے کے ثواب میں کچھ بھی کمی نہیں ہوگی اور جو آدمی کسی کو گمراہی کی طرف دعوت دے تو اس کو بھی اتنا ہی گناہ ہوگا ۔ جتنا کہ اس کی پیروی اختیار کرنے والے کو ہوگا اور ان پیروی کرنے والوں کے گناہوں میں کمی نہیں ہوگی۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: من دعا الی هدی ......من اجورهم شیئا:

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہدایت کے دو معنیٰ ہیں: ① دلالت موصلہ اور مطلق دلالت ۔ ہدایت کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ من دعا الی الله وعمل صالحا اور ہدایت کا ادنیٰ درجہ من دعا الی اماطة الاذی عن طریق المسلمین۔ ذلك کا اشارہ، کان کے مصدر کی طرف ہے۔ ② زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اجر کی طرف ہے۔ ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: شیئاً مفعول بہ ہے، یا تمیز ہے چونکہ نقص لازمی ومتعدی ہر دو طرح مستعمل ہے۔ ای شیئاً من النقص۔

جو شخص کسی دوسرے کیلئے نیکی اور بھلائی کا سبب بنے گا وہ اتنے ہی اجر کا مستحق ہوگا جتنا کہ اس نیکی اور بھلائی کا کرنے والا ہوگا، خواہ نیکی کرنے والے نے وہ نیکی اس دوسرے شخص کے بتانے کی وجہ سے کی ہو۔ خواہ امتثالِ امر کی وجہ سے کی ہو بہرحال اجر ملے گا۔

قوله: من دعا الی ضلالة ......من آثامهم شیئا:

اسی طرح جو شخص کسی دوسرے کو بُری عادات مین مبتلا کرنے کا سبب بنے گا وہ بھی اتنے ہی گناہ کا مستحق ہوگا جتنا کہ اس بدی اور بُرائی کرنے والا ہوگا۔ خواہ وہ بری عادت چھوٹی ہو کہ بڑی، خواہ اس بُری بات کا اس نے حکم دیا ہو یا اعانت کی ہو۔ بہرحال جو دوسروں کو بُری عادات پر لگائے گا، تو جتنے لوگ اس کی وجہ سے بُرائی کا ارتکاب کریں گے اور ان کو ان کے بُرائی کرانے کا گناہ ہوگا اتنا ہی گناہ بُرائی پر لگانے والے کو بھی ہوگا۔

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: افعالِ عباد اگرچہ مؤجب ثواب وعقاب نہیں مگر اللہ سبحانہ تعالیٰ کی عادت مبارکہ ہے کہ افعال عباد کو ثواب وعقاب کے ساتھ یوں جوڑ رکھا ہے جیسا کہ مسبب کو سبب کے ساتھ، فعل عبد کے صدور میں بندہ کی تاثیر کسی بھی طور پر نہیں ہے، تو جیسے ثواب وعقاب کا ترتب فعل کی انجام دہی پر ہوتا ہے اسی طرح مسبب پر بھی ہوتا ہے، مثلاً جیسا کہ اشارہ کرنا، اور بحث وتحیص ......لہٰذا اس (فاعل) کے اجر سے اس (دالّ) کے اس اجر میں بالکل کمی واقع نہیں ہوئی، اھ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُمتِ محمدیہ کے اعمال کے تضاعف سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ثواب اس قدر مضاعف ہوتا ہے کہ جس کا کوئی شمار نہیں، کوئی حد نہیں۔ یہی معاملہ سابقین واوّلین مہاجر وانصار صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا ہے بطریق سلف کو اپنے خلف سے، اور علماء مجتہدین کو اپنے اتباع سے ہے۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر طبقہ کے متقدمین کا فضل، متاخرین کے ہر طبقہ سے کس قدر بڑھ کر ہے۔ اگر گناہوں کا داعی کوئی شخص سچی توبہ کر لے، اور اس کا وہ گناہ چلتا رہے کہ جس پر اس نے دلالت کی تھی تو کیا اس توبہ کے ذریعہ سے اس کا دلالت کرنے کا گناہ ختم ہو جائے گا کیونکہ توبہ، پہلے گناہوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکتی ہے، چونکہ توبہ کی شرط یہ ہے کہ ظلم کو ختم کرے اور معصیت سے بالکل نکل جائے اور جب تک وہ عمل موجود ہے، وہ اس دلالت کرنے والے کی طرف منسوب رہے گا، تو گویا کہ توبہ کی مذکورہ بالا دونوں شرطیں نہیں پائی گئیں۔ اس مسئلہ میں کوئی صریح نقل میری نظر سے نہیں گزری، دونوں باتوں کا احتمال ہے۔..........

دین قبول کرنے کی وجہ سے غریبوں کے لئے خوشخبری ہے

۱۵۹: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱۳۰/۱ حديث (۲۳۲-۱۴۵) وأخرجه الترمذي ۱۹/۵ حديث رقم (۲۶۲۹) وابن ماجة ۱۳۱۹/۲ حديث رقم ۳۹۸۶۔ وأحمد في المسند ۳۸۹/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام غریبوں میں شروع ہوا اور آخر میں بھی غریبوں میں ہوگا۔ لہٰذا غرباء کے لئے بڑی خوشخبری ہے اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: بدأ الاسلام: لفظ بدأ کے ضبط میں محدثین کا اختلاف ہے۔ چنانچہ ان کی عبارات ملاحظہ فرمائیے:

في الأزهار: بدا بلا همزة أي: ظهر، لكن قال النووي: ضبطناه بالهمزة من الابتداء، كذا نقله الأبهري، وفي شرح الطيبي قال محي السنة: بدأ بالهمزة من الابتداء كذا ضبطناه۔

خلاصہ الآراء:

یہ لفظ دو طرح سے کہا گیا ہے: ① **بدا** يبدو، ناقص واوی، بمعنی **اظهر**۔ ② **بدأ** يبدأ، مهموز اللام، بمعنی **ابتداء** اور یہ صحیح ہے۔

قوله: بدأ الاسلام غريبا، وسيعود كما بدأ۔

① تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسلام کے آغاز میں صحابہؓ کی تعداد قلیل تھی، چنانچہ اقامت و اشاعتِ دین کی خاطر اپنے علاقوں سے نکل کھڑے ہوئے اور راہِ غربت اختیار کر لی۔

② مسلمان الگ تھلگ ہوگا مجبور ہو کر پردیسیوں کی طرح ہو جائے گا، پھر ایک دور آئے گا کہ وہی ابتدائی حالت عود کر آئے گی کہ گنتی کے افراد میں رہ جائے گا۔

③ اسلام کی حالت اولیٰ اور اخیرہ میں مماثلت بیان کرنا مقصود ہے، کہ جیسے اسلام کے ابتدائی دور میں دین کے نام لیوا

تھوڑے تھے اسی طرح آخری دور میں دین پر عمل پیرا ہونے والوں کی تعداد تھوڑی ہوگی۔

④ ابتدائے اسلام میں اہلِ دین کے ساتھ اوپرا سلوک کیا جاتا تھا، دوسرے لوگ ان کے ساتھ گھلنے ملنے کو پسند نہیں کرتے تھے، تو آخری دور میں بھی اسی طرح ہوگا۔

قوله: فطوبى للغرباء:

وجہ تسمیہ: دنیا اور دنیا داروں کے ساتھ ان کا تعلق ایک اجنبی اور پردیسی جیسا ہوگا۔

① خوشخبری ہے دین کا دامن مضبوطی سے تھام کر اس کے سات چمٹ جانے والوں کیلئے کہ آغاز اسلام اور آخری دور میں دین پر عمل پیرا ہونا مشقتیں سہے بغیر ممکن نہیں۔

② اس سے مراد مہاجرین ہیں کہ جنہوں نے اللہ کی طرف ہجرت کی۔

③ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد مصلحین سنت ہیں، یعنی وہ لوگ جو کہ سنتوں کو ان کی اصل پر لائیں گے، جیسا کہ ترمذی کی اگلی حدیث میں صراحت کے ساتھ آ رہا ہے۔

④ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اسلام استعارہ ہے مسلمین کیلئے، اور قرینہ غربۃ ہے۔ چنانچہ وحدت و وحشت کے معنیٰ کا تعلق خود مسلمانوں کے ساتھ ہوگا۔

یا اسلام کو اس کی حقیقت پر رکھیں، تو کلام میں تشبیہ مانیں، اور یہ کہیں کہ اسلام کی قلت وضعف کو غربۃ سے تعبیر کیا گیا ہے، چونکہ عبارت کی معنوی تقدیر یوں ہوگی: أی: **بدأ الاسلام مشابها للغريب** یا یہ ہوگی: **بدأ الاسلام ظهور الغرباء فريد وحيدا لامأوى له حتى تبوّا دار الايمان۔**

مسلمان سمٹ کر مدینہ منورہ چلے جائیں گے

۱۶۰: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الْاِيْمَانَ لَيَأْرِزُ اِلَى الْمَدِيْنَةِ كَمَا يَأْرِزُ الْحَيَّةُ اِلٰى جُحْرِهَا (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَسَنَذْكُرُحَدِيْثَ اَبِيْ هُرَيْرَةَ ذَرُوْنِيْ مَا تَرَكْتُكُمْ فِيْ كِتَابِ الْمَنَاسِكِ وَحَدِيْثَيْ مُعَاوِيَةَ وَجَابِرٍ لَايَزَالُ مِّنْ اُمَّتِيْ وَالْاٰخِرُ لَايَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِيْ فِيْ بَابِ ثَوَابِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى).

أخرجه البخارى فى صحيحه ٩٣/٤حديث رقم١٨٧٦ومسلم ١٣١/١حديث رقم(٢٣٣-١٤٧)وأخرج الترمذى نحوه وهو ١٧٠من المشكاة-وأخرجه ابن ماجة فى السنن ١٠٣٨/٢حديث رقم٣١١١-وأخرجه أحمد فى المسند ٢٨٦/٢-

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایمان اس طرح مدینہ منورہ کی طرف سمٹ کر آجائے گا جس طرح سانپ اپنے سوراخ کی طرف سمٹ جاتا ہے۔ (بخاری و مسلم) اور حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث: ذَرُوْنِيْ مَا تَرَكْتُكُمْ ہم اس کو مناسک حج میں ذکر کریں گے نیز حضرت معاویہؓ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی

دو حدیثیں ایک لَا یَزَالُ مِنْ اُمَّتِیْ......اور دوسری لَا یَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ...... بَابِ ثَوَابِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ میں ہم ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ یعنی ان دونوں حدیثوں کو صاحب مصابیح نے اسی باب میں ذکر کیا ہے لیکن ہم نے ان حدیثوں کو کِتَابِ الْمَنَاسِكِ اور بَابِ ثَوَابِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ میں ذکر کیا ہے۔

تشریح: (لیارز):اس لفظ کو از روئے باب تین طرح ضبط کیا گیا ہے:① اکثر نے راء کے کسرہ کے ساتھ۔② راء کے فتحہ کے ساتھ۔③ راء کے ضمہ کے ساتھ۔

لفظ "تارز" کے بارے میں اہل لغت کی تحقیق:

① - أرز ـِ ، أرزاً و أروزاً :سکڑنا، سمٹنا۔ أرز الحیوان: جانور کا مضبوط ہونا، گھٹا ہوا ہونا، هوا آرزٌ ، الی المکان۔ پناہ لینا۔(القاموس الوحید)

قوله:ان الایمان لیارز...... الحیة الی جحرها...... :

وجہ تشبیہ: سانپ دوسری مخلوقات کے مقابلے میں زیادہ تیزی اور پھرتی سے اپنے مسکن کی طرف لوٹتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان اپنے ایمان کی حفاظت کی خاطر مدینہ بھاگیں گے، یا یہ کہ ایمان کا وطن اصلی مدینہ ہے، بایں طور کہ ایمان کا ظہور اور اس کو تقویت یہیں سے ملی۔

اور یہ درحقیقت پیشنگوئی ہے کہ آخر زمانہ میں اہلِ اسلام کی تعداد گھٹ جائے گی۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس فرمان کا تعلق آنحضرت ﷺ کی حیاتِ مبارکہ سے ہے چنانچہ صحابہ کرامؓ کا اجتماع مدینہ میں ہی رہا۔

اس کا ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ آخری زمانہ میں جب کہ طرح طرح کے فتنہ نمودار ہو چکے ہوں گے، اور اسلامی شہروں پر کافر و ظالم لوگوں کا غلبہ ہوگا، تو اس وقت دین حجاز کی طرف اسی طرح واپس لوٹے گا جس طرح سے یہاں سے نکل کر سارے جہان میں پھیلا تھا۔

اس روایت میں اسلام کا لفظ آیا ہے اور دوسری روایت میں دین کا لفظ آیا ہے۔ تطبیق یوں ہوگی کہ دین اور اسلام مترادف ہیں، کہ دین پہلے سمٹ کر سارے کے سارے حجاز میں رہ جائے گا اور پھر مزید سکڑ کر مدینہ میں باقی رہ جائے گا۔ چونکہ اسلام کا پہلا مستقر مدینہ تھا لہٰذا آخری مستقر بھی یہی ہوگا، اس لئے کہ **النهایة هی الرجوع الی البدایة** اور اس وجہ سے بھی کہ مدینہ ہی میں آفتابِ نبوت غروب ہوا، لہٰذا آفتابِ شریعت بھی یہیں غروب ہوگا۔

یہاں "مدینہ" سے کیا مراد ہے؟ اس کی تعیین میں متعدد اقوال ہیں:

۱۔ مدینہ منورہ مراد ہے۔۲۔ شام مراد ہے، کیونکہ مدینہ منورہ بھی شام کا حصہ ہے، اور مدینہ کا ذکر اس کی فضیلت و خصوصیات کے باعث ہے۔۳۔ مدینہ منورہ، اور اس کے اطراف، حتی کہ مکّہ وغیرہ بھی مراد ہیں، اس مراد کی صورت میں آگے والی روایت حدیث: ۱۷۰ کے ساتھ بھی تطبیق ہو جائے گی کہ جس میں "مدینہ" کے بجائے حجاز کا ذکر ہے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ علیہ نے اسی مراد کو اظہر قرار دیا ہے، واللہ اعلم۔

قوله:سیذکر حدیث ابی هریرة :......

فی كتاب المناسك یہ جار مجرور سند کر کے متعلق ہے۔ ''حدیثی'' منصوب ہے اور اس کا عطف حدیث ابی ھریرۃ پر ہے۔ ''جابر'' مجرور ہے اس کا عطف ''معاویۃ'' پر ہے۔

''وسند کر حدیث...... ''یہ عبارت ایک طرف اعتذار اور دوسری طرف متضمن اعتراض ہے۔

الفصل الثانی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ سوتی ہے دِل جاگتا ہے

۱۶۱: وَعَنْ رَبِيْعَةَ الْجُرَشِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ اُتِيَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيْلَ لَهٗ لِتَنَمْ عَيْنُكَ وَلْتَسْمَعْ اُذُنُكَ وَلْيَعْقِلْ قَلْبُكَ قَالَ فَنَامَتْ عَيْنَایَ وَسَمِعَتْ اُذُنَایَ وَعَقَلَ قَلْبِيْ قَالَ فَقِيْلَ لِيْ سَيِّدٌ بَنٰى دَارًا فَصَنَعَ فِيْهَا مَأْدُبَةً وَّاَرْسَلَ دَاعِيًا فَمَنْ اَجَابَ الدَّاعِيَ دَخَلَ الدَّارَ وَاَكَلَ مِنَ الْمَأْدُبَةِ وَرَضِيَ عَنْهُ السَّيِّدُ وَمَنْ لَّمْ يُجِبِ الدَّاعِيَ لَمْ يَدْخُلِ الدَّارَ وَلَمْ يَأْكُلْ مِنَ الْمَأْدُبَةِ وَسَخِطَ عَلَيْهِ السَّيِّدُ قَالَ فَاللّٰهُ السَّيِّدُ وَمُحَمَّدٌ الدَّاعِيْ وَالدَّارُ الْاِسْلَامُ وَالْمَأْدُبَةُ الْجَنَّةُ۔ (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ)

أخرجه الدارمی فی السنن ۱/ ۱۸ حدیث رقم ۱۱۔

ترجمہ: حضرت ربیعہ الجرشیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خواب میں فرشتے بھیجے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا۔ یعنی فرشتوں نے کہا۔ چاہئے کہ آپ کی آنکھیں سوئیں اور آپ کے کان سنیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل سمجھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میری آنکھیں سوئیں۔ میرے کانوں نے سنا اور میرے دل نے سمجھا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ مجھ سے کہا گیا۔ یعنی فرشتوں نے میرے سامنے بطور مثال کے بیان کیا۔ کہ ایک سردار نے گھر بنایا اور کھانے کا دستر خوان لگایا اور پھر ایک بلانے والے کو بھیجا۔ تا کہ وہ سب لوگوں کو بلا کر لائے۔ لہٰذا جس نے اس بلانے والے کی دعوت کو قبول کر لیا۔ وہ اس گھر میں داخل ہوا۔ کھانا کھایا اور سردار اس سے خوش ہوا اور جس نے بلانے والے کی دعوت کو قبول نہ کیا۔ وہ نہ گھر میں داخل ہوا اور نہ ہی کھانا کھایا اور نہ ہی سردار اس سے خوش ہوا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس مثال میں سردار سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ داعی سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ گھر سے مراد اسلام ہے اور کھانے سے مراد جنت کی نعمتیں ہیں۔ اس حدیث کو امام دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

ربیعہ بن عمرو۔ یہ ربیعہ ''جرشی'' ابن عمرو رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع کیا ہے۔ ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ یہ صحابی نہیں ہیں۔ واقدی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ یہ ربیعہ راہط کے خروج کے دن قتل کر دیئے گئے۔ ''جرشی'' جیم کے ضمہ' راء مہملہ کے فتحہ کے ساتھ ''یمن'' کا ایک علاقہ ہے۔

تشریح: قوله: أتی نبی الله ﷺ......ولیعقل قلبك: مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

مطلب اس کا یہ ہے کہ آپ ﷺ کچھ نہ دیکھیں نہ کسی بات پر کان رکھیں اور نہ آپ کے دل میں کوئی دوسرا سوال جائے مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ خوب غور کریں اور ہماری بات کو دل سے سنیں جو ہم مثال بیان کرتے ہیں اس کو اچھی طرح ذہن نشین کریں آپ ﷺ نے فرمایا "میری دونوں آنکھیں سوئیں" جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ تم نے مجھے کہا میں اس کو اسی طرح سننے کو تیار ہوں اور سمجھنے کے لئے بھی۔

قصہ مختصر یہ کہ ہم جو کہنا چاہتے ہیں اس کو مکمل طور پر سمجھنے کیلئے ہمہ تن متوجہ ہو جائیں۔ چنانچہ اگلے جملہ میں امتثال اوامر کا بیان ہے کہ تم نے جیسے کہا میں نے ویسے ہی کر لیا۔

قوله: فنامت عيني وسمعت اذناى وعقل قلبي:

۲۔ بعض کا کہنا ہے کہ تینوں اوامر کا تعلق جوارح سے ہے ظاہراً، اور آنحضرت ﷺ کے لئے حقیقت ہے کہ وہ یہ تینوں کام بجا لائیں، آنکھ سو جائے، قلب وسمع ہمہ تن متوجہ ہوں اور اگلا جملہ فنامت امتثال اوامر کا بیان ہے، کہ آنکھیں سو گئیں اور دل اور کان متوجہ ہیں۔

۳۔ سوال وجواب کا اس قسم کا کوئی قضیہ پیش ہی نہیں آیا، بلکہ اس آیت کے قبیل سے ہے: **﴿أتيا طوعا أو كرها قالتا أتينا طائعين﴾** **﴿اذ قال له ربه أسلم قال أسلمت لرب العالمين﴾**[البقرة: ۱۳۱] صاحب کشاف اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: أخطر ببالك النظر فى الدلائل المؤدية الى المعرفة والاسلام فقال: أسلمت فنظر فعرف۔ اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام میں یہ معانی پائے جائیں، چنانچہ وہ معانی آپ ﷺ میں جمع ہو گئے۔ (الطیبی): ابن حجر رحمہ اللہ اس کی تردید میں فرماتے ہیں کہ اس کو ظاہر معنیٰ پر محمول کرنے سے کوئی مانع نہیں ہے، بایں طور کہ جماد میں بھی عقل ہو اور پھر اسے خطاب کیا جائے، اور أسلم کا مطلب ہے **استسلم لأمري استسلاما يليق بخلتك** اور نوم کو اس کی حقیقت پر محمول کیا جائے اور یہ امر بمعنیٰ اخبار ہو، أي: **أنت نائم سامع واع**، چونکہ جس وقت فرشتہ آیا تھا اس وقت آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام سوئے ہوئے تھے، تو اس موقع پر یہ فرمایا: میں کہتا ہوں: زیادہ ظاہر یہ ہے کہ امر ان امورِ ثلاثہ میں استمرار کیلئے ہے۔

فرمایا: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کی نیند جیسے ان کے دِل پر قابض نہیں ہوتی اسی طرح ان کے کانوں پر غالب نہیں آتی۔ اس کی توجیہہ میں یہ بات ہے کہ انبیاء کی نیند ان کے ظاہر بدن پر طاری ہوتی ہے، اور آنکھ بھی ظاہر بدن میں سے ہے' تاکہ وہ "لطیفہ" کہ جو سنتا ہے، کیونکہ وہ جوف رأس میں ہوتا ہے، چنانچہ یہ دِل کی طرح، باطن کے حکم میں ہے، اھ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ انبیاء سے سماع باطنی سلب نہیں ہوتا، چونکہ وہ بھی احوالِ قلب میں سے ہے البتہ سماع ظاہری تو سماع حقیقی ظاہری پر موقوف ہوتا ہے، چونکہ وہ ظاہر کے احکام میں سے ہے۔

قوله: فقيل لي: سيد بنى ......ورضى عنه سيد:

قوله: ومن لم يجب داعى......و سخط عليه السيد:

ناراضگی کے مراتب:

بعض لوگوں نے ناراضگی کے مراتب یوں بیان کئے ہیں:

ایک مرتبہ غضب کا ہے، پھر غضب سے بڑھ کر سخط، اور پھر سخط سے بڑھ کر "مقت" کا درجہ ہے۔

قوله: قال: فالله السيد ومحمد الداعي، والدار الاسلام والمأدبة الجنة :

یہاں عبارت مقدر ہے: **أي ان أردت بيان هذا المثال فالله السيد، السيد** کا مطلب: **الباني المرسل**۔

مقام تفسیر وتاویل کے ظاہر کا مقتضی تو یہ تھا کہ تمثیل میں مذکور امور کو مبتداء اور ان کے صفات متمیزہ کو خبر بنایا جاتا، اس اسلوب میں تفسیر کی وجہ شاید یہ ہے کہ "اللہ" اور "محمد" دونوں علم ہیں، اور علم چونکہ معرف باللام کے مقابلہ میں "أعرف" ہونے کی وجہ سے محکوم علیہ بننے کا زیادہ حقدار ہوتا ہے اور اس کے قریب قریب اہلِ معانی کی ذکر کردہ یہ مثال ہے: **زيد أخوك وعمرو المنطلق**۔ اہلِ معانی ان دونوں مثالوں میں فرق بتلاتے ہیں کہ تقدیم کے بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ جب کسی شئی کی دو صفات ہوں اور سامع کو کسی ایک صفت کے ساتھ اس کا موصوف ہونا معلوم ہو اور دوسری کے ساتھ متصف ہونا معلوم نہ ہو تو بعض حالات میں اس کو مبتداء بناتے ہیں اور کبھی اس لفظ دال کو مؤخر کرتے ہوئے خبر بنانا واجب ہوتا ہے۔

تعارض:

اس حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں: .... **الدار الاسلام، والمأدبة الجنة** جبکہ پچھلی روایت میں :...... **الدار الجنة** کے الفاظ گذرے ہیں۔

تشریح تعارض:

پہلا تعارض یہ ہے کہ دار "اسلام" ہے یا "جنت" ہے؟ پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے "دار" "اسلام" ہے، اور دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دار "جنت" ہے۔

دوسرا تعارض یہ ہے کہ جنت "مأدبہ" ہے یا "دار" ہے؟ پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت "**مأدبه**" ہے، اور دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت "دار" ہے۔

جواب:

چونکہ دخولِ جنت کا سبب اسلام ہے، لہٰذا سبب کی جگہ مسبّب کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا اور دعوت الی الجنۃ، دعوۃ الی الاسلام کے بغیر مکمل نہیں ہوتی، لہٰذا دونوں کو ایک دوسرے کی جگہ ذکر کیا گیا، اور چونکہ جنت اور اس کی سج دھج مطلوب اصلی ہے لہٰذا نفسِ جنت کو بطورِ مبالغہ **مأدبة** قرار دیا۔ (كذا حققه الطيبي)

فوائد حدیث:

① ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام جنت سے زیادہ وسیع ہے۔

② ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث درحقیقت اس حدیث کی طرف اشارہ ہے:

" ما وسعني أرضي، ولا سمائي، ولكن يسعني قلب عبدي المؤمن"

③ "فالله السيد" سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ پر "سید" کا اطلاق درست ہے۔

منکرین حدیث کی تردید

۱۶۲ : وَعَنْ اَبِیْ رَافِعٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاَاُلْفِیَنَّ اَحَدَکُمْ مُتَّکِئًا عَلٰی اَرِیْکَتِہٖ یَأْتِیْہِ الْاَمْرُمِنْ اَمْرِیْ مِمَّا اَمَرْتُ بِہٖ اَوْنَہَیْتُ عَنْہُ فَیَقُوْلُ لَآ اَدْرِیْ مَا وَجَدْنَا فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ اتَّبَعْنَاہُ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَ ابْنُ مَاجَۃَ وَالْبَیْہَقِیُّ فِیْ دَلَائِلِ النُّبُوَّۃِ)

أخرجه أحمد فی المسند۶/۸بغیر هذه الألفاظ ـوأخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱۲/۵ حدیث رقم۴۶۰۵وأخرجه الترمذی فی السنن ۳۶/۵حدیث رقم۲۶۶۳وقال حسن صحیح وأخرجه ابن ماجة فی سننه ۶/۱حدیث رقم۱۳ـ

ترجمہ: حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ اپنے تخت پر تکیہ لگائے ہو اور میرے احکام سے جن کا میں نے حکم دیا ہے یا جن سے میں نے منع کیا ہے کوئی حکم اس تک پہنچے اور وہ اسے سن کر یہ کہہ دے کہ میں کچھ نہیں جانتا ہم نے جو کچھ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں پایا ہے ہم اس کی اتباع کریں گے اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ اور امام ترمذی رحمہ اللہ امام ابوداوٗد رحمہ اللہ امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور امام بیہقی رحمہ اللہ دلائل النبوۃ میں بیان کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

ابورافع ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ہیں' ان کا نام "اسلم" تھا۔ ان کے نام سے ان کی کنیت زیادہ مشہور ہے' یہ "قبطی" تھے پہلے عباس رضی اللہ عنہ کے غلام تھے انہوں نے یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور ہبہ دیدیئے تھے جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اسلام کی بشارت دی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خوشی میں ان کو آزاد کر دیا' غزوۂ بدر سے پہلے اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ ان سے ایک بڑی جماعت نے روایت کی ہے۔ جن میں ان کے بیٹے عبداللہ بھی شامل ہیں جو علی بن طالب رضی اللہ عنہ کے کاتب تھے۔ ابورافع کی وفات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے کچھ دن قبل ہوئی۔

تشریح: قولہ: لا ألفین احدکم ......اونهیته عنه:

"لا ألفین" از باب افعال۔ الالفاء مصدر سے مضارع منفی بانون تاکید ثقلیہ کا صیغہ ہے۔ (متکئا): ۱۔ حال ہے، ۲۔

مفعول ہے۔ یأتیه الامر: بعض کا کہنا ہے کہ ''ال'' زائدہ ہے۔ من أمری: الأمر کا بیان ہے۔ بما أمرت به: أمری سے ''بدل'' ہے' أو نهیت عنه کا عطف امرت به پر ہے۔

میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ اپنے چھپرکھٹ پر تکیہ لگائے ہوئے ہو جیسا کہ دلہن اپنی سجی دھجی خلوت گاہ میں ہو اور مراد یہ ہے کہ میں اس حال میں نہ پاؤں کہ کوئی گھر میں بیٹھا ہوا ہو اور طلب علم بھی نہ کرے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس صفت سے مراد یہ ہے کہ متکبرین کی طرح نہ ہو جانا کہ انہیں دین کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا۔

قوله: لا أدری ما وجدنا فی کتاب الله اتبعناه:

فیقول: مفعول سے حال ہے' نہی کا تعلق پورے مجموعہ سے ہے۔ أی: لا ألفین أحدکم والحال أنه متکئ ویاتیه الأمر فیقول ''ما وجدنا'' اس میں ''ما'' موصولہ ہے، ۲۔ موصوفہ ہے۔

میں قرآن کے علاوہ کسی چیز کو نہیں جانتا، میں نہیں جانتا کہ قول رسول کیا چیز ہے، میں قرآن کے علاوہ کسی چیز کی اتباع نہیں کرتا، اور یہ جس بات کو تم رسول کی طرف منسوب کر کے مجھے بتا رہے ہو کہ رسول نے اس کا حکم دیا، رسول نے اس چیز سے منع کیا ہے چونکہ کتاب اللہ میں یہ چیز موجود نہیں ہے لہٰذا میں اس کی اتباع نہیں کروں گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ حدیث نبوی سے اعراض درست نہیں ہے، چونکہ حدیثِ نبوی سے اعراض قرآن سے اعراض ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [الحشر: ۷] ''سو جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں (اس سے) باز رہو۔'' اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ [النجم: ۳] ''اور نہ خواہش نفس سے مُنہ سے بات نکالتے ہیں یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے جو (ان کی طرف) بھیجا جاتا ہے۔''

دارمی، یحییٰ بن کثیر سے روایت کرتے ہیں: قال: کان جبریل ینزل بالسنة کما ینزل بالقرآن (کذا فی الدر) : جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجتہد تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس قول کے قائل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد کو بمنزلہ وحی کے رکھا، چونکہ آپ خطا نہیں کرتے تھے، اور جب آپ سے خطا ہوتی تھی تو آپ کو متنبہ کیا جاتا تھا، بخلاف دوسروں کے۔

قوله: رواه احمد...... والبیهقی فی دلائل النبوة :

''فی دلائل النبوة'' جار کا تعلق بیہقی کے ساتھ ہے بایں طور کہ اس کا متعلق مقدر ہے۔

قرآن کی طرح حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی واجب العمل ہے

۱۶۳ : وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَ لَا اِنِّيْ اُوْتِيْتُ الْقُرْاٰنَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ اَ لَا يُوْشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانَ عَلٰى اَرِيْكَتِهٖ يَقُوْلُ عَلَيْكُمْ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ فَمَا وَجَدْتُّمْ فِيْهِ مِنْ حَلَالٍ فَاَحِلُّوْهُ وَمَا وَجَدْتُّمْ فِيْهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْهُ وَاِنَّ مَاحَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا حَرَّمَ اللّٰهُ اَلَا لَا يَحِلُّ لَكُمُ الْحِمَارُ الْاَهْلِيُّ وَلَا كُلُّ ذِيْ نَابٍ مِّنَ السِّبَاعِ وَلَا لُقَطَةُ

مُعَاهِدٍ اِلَّا اَنْ يَّسْتَغْنِيَ عَنْهَا صَاحِبُهَا وَمَنْ نَزَلَ بِقَوْمٍ فَعَلَيْهِمْ اَنْ يَّقْرُوْهُ فَاِنْ لَّمْ يَقْرُوْهُ فَلَهٗ اَنْ يُّعْقِبَهُمْ بِمِثْلِ قِرَاهُ) رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَرَوَى الدَّارِمِيُّ نَحْوَهٗ وَكَذَا ابْنُ مَاجَةَ اِلٰى قَوْلِهٖ كَمَا حَرَّمَ اللّٰهُ

أخرجه داوٗد في السنن ٥/١٠حديث رقم ٤٦٠٤وروى الترمذي نحوه في السنن ٥/٣٧حديث رقم ٢٦٦٤وكذلك ابن ماجة ١/٦حديث رقم ١٢والدارمي أيضاً ١/١٥٣حديث رقم ٥٨٦۔وأحمد في المسند ٤/١٣٢۔

ترجمہ: حضرت مقدام بن معد یکرب ؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ خبردار مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کا مثل دیا گیا ہے۔ خبردار عنقریب اپنے تخت پر پڑا ہوا ایک آدمی جس کا پیٹ بھرا ہوا ہوگا کہے گا کہ قرآن کو اپنے اوپر لازم پکڑلو۔ یعنی صرف قرآن کو سمجھو اور اس پر عمل کرو اور جس چیز کو تم قرآن میں حلال پاؤ اس کو حلال سمجھو اور جس چیز کو تم قران میں حرام پاؤ اس کو حرام جانو۔ حالانکہ جس چیز کو رسول اللہ ﷺ نے حرام بتایا ہے وہ اسی طرح حرام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے خبردار تمہارے لئے گھریلو گدھا حلال نہیں ہے اور نہ ہی کچلیوں والا درندہ حلال ہے اور نہ ہی تمہارے لئے معاہدہ کرنے والے کا لقطہ حلال ہے لیکن وہ لقطہ حلال ہے کہ جس کا مالک اس سے مستغنی ہو اور جو انسان کسی قوم کا مہمان ہو۔ اس قوم پر لازم اور ضروری ہے کہ اس کی ضیافت کریں اور اگر وہ اس کی ضیافت نہ کریں۔ تو اس انسان کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے حق ضیافت کے مثل ان سے حاصل کرے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور امام دارمی رحمہ اللہ نے بھی ایسی روایت نقل کی ہے اور اسی طرح امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے کما حرمہ اللہ تک حدیث نقل کی ہے۔

راویٔ حدیث:

المقدام بن معد یکرب۔ یہ مقدام معد یکرب کے بیٹے ہیں۔ ان کی کنیت ''ابوکریمہ'' ہے۔ یہ کندی ہیں۔ ان کو صحابہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اہل شام میں ان کا شمار ہے۔ وہاں ہی ان کی حدیث پائی جاتی ہے۔ کندہ سے آنے والے اس وفد میں شامل تھے جو آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تھا۔ ان سے بہت سے لوگوں نے روایت کی۔ شام میں بعمر اکانوے (۹۱) سال ۸۷ھ میں انتقال ہوا۔

تشریح: قولہ: الا انی أوتیت القرآن ومثلہ معہ:

یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے قرآنِ کریم اور اس کے ساتھ اسی کے مثل اور بھی دیا ہے۔

مثلہ معہ میں دو احتمال ہیں:

① اللہ تعالیٰ نے مجھے ظاہری وحی متلو کے علاوہ اسی کے مثل غیر متلو وحی باطنی بھی عطا کی ہے۔

② اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اپنی کتاب وحی کی اور اسی کے مثل تاویل بھی عنایت فرمائی، یعنی مجھے یہ اجازت دی گئی ہے کہ میں کتاب اللہ کو کھول کر بیان کروں، مناسب حال تعمیم و تخصیص کروں، لہٰذا وجوب عمل اور لزوم قبول کے اعتبار سے یہ قرآنِ کریم کی ظاہری وحی متلو کی مانند ہے۔

یعنی: أوتیت القرآن وأحکاما ومواعظ وامثالا تماثل القرآن فی کونها واجبة القبول أوفی المقدار۔

قوله: ألا یوشك رجل شبعان علی أریکته یقول:

ألا کا مکرر لانا، کتاب اللہ پر اکتفاء کرتے ہوئے، سنت اور عمل بالحدیث کے ترک پر آنے والے غیظ وغضب کا اظہار ہے۔ اسی سے خود سمجھ لینا چاہئے کہ رائے کو حدیث پر ترجیح دینے والے شخص کا یہ عمل کیسا ہوگا۔ (کذا ذکره الطیبی)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: چنانچہ اسی وجہ سے ہمارے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ حدیث کو اگر چہ وہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو، رائے پر ترجیح دیتے ہیں، اگر چہ رائے کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو۔

قاضی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: رجل کو شبعان کے ساتھ متصف کرنا اصل سبب کی طرف اشارہ ہے، کہ اس فعل قبیح کا باعث یا تو بلادۃ ہوتی ہے یا سوءِ فہم، اور ان دونوں چیزوں کے اسباب میں ایک سبب شکم سیری ہے اور دوسرا کثرت طعام، علی أریکته کے الفاظ سے اس شخص کی حماقت وتکبر کا بیان ہے کہ تنعم، مال وجاہ پر غرور اور شکم سیری اسباب حماقت وتکبر ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ اس جملہ سے قائل کی حماقت، اس کے متکبر ہونے کے بیان کی تاکید ہے، اور ممکن ہے کہ شبعان کنایہ ہو اس کے غرور وتکبر سے، یعنی اس شخص کا یہ فعل قبیح اپنے کثرت علم کی وجہ سے ہوگا' علاوہ ازیں اس جملہ میں اشارہ ہے کہ "سالک" ہمیشہ علم کا حریص رہے، جیسے کہ بھوکا شخص طلبِ رزق میں رہتا ہے' ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا﴾ [طٰہٰ: ۱۱۴] نیز حضور ﷺ کا فرمان ہے: منهو مان لا یشبعان؛ طالب العلم وطالب الدنیا۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں نسبت "تباین" کا ہے۔

یعنی مجھے قرآن' احکام' مواعظ وامثال دیئے گئے ہیں جو واجب القبول ہیں' قرآن کے مثل میں یا ان کی مقدار قرآن کے برابر ہے۔

قوله: ألا لا یحل لکم الحمار الأهلی ولا کل ذی ناب من السباع:

عرض مرتب: حدیث کے اس جملہ سے متعلق تفصیلی بحث مرقات جلد پنجم "باب ما یحل اکله وما یحرم" فصل اوّل کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

قوله: ولا لقطة معاهد الا أن یستغنی عنها صاحبها:

عرضِ مرتب: اس جملہ کی تشریح' مرقات جلد: ۶، "کتاب اللقطة" فصل ثانی کی آخری حدیث کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

قوله: ومن نزل بقوم، فعلیهم أن یقروه، فان لم یقروه فله أن یعقبهم بمثل قراه:

عرضِ مرتب: حدیث مبارکہ کے اس جملہ کی تشریح' مرقات جلد نمبر ۸، "کتاب الاطعمه' باب الضیافة" فصل اوّل وثانی میں ملاحظہ فرمائیے' حدیث: ۴۲۴۳، ۴۲۴۵، ۴۲۴۷۔

احکامِ حدیث کی مقدار احکامِ قرآن کی مقدار سے زیادہ ہے

۱۶۴: وَعَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِیَةَ قَالَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَیَحْسَبُ اَحَدُکُمْ

مُتَّكِئًا عَلٰى اَرِيْكَتِهٖ يَظُنُّ اَنَّ اللّٰهَ لَمْ يُحَرِّمْ شَيْئًا اِلَّا مَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ؟ اَلَا وَاِنِّيْ وَاللّٰهِ قَدْ اَمَرْتُ وَوَعَظْتُ وَنَهَيْتُ عَنْ اَشْيَاءَ اِنَّهَا لَمِثْلُ الْقُرْاٰنِ اَوْاَكْثَرُوَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ يُحِلَّ لَكُمْ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا بِاِذْنٍ وَلَا ضَرْبَ نِسَآءِ هِمْ وَلَا اَكْلَ ثِمَارِهِمْ اِذَا اَعْطَوْكُمُ الَّذِيْ عَلَيْهِمْ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَفِيْ اِسْنَادِهٖ اَشْعَثُ بْنُ شُعْبَةَ الْمِصِّيْصِيُّ قَدْ تُكُلِّمَ فِيْهِ .

أخرجه أبوداوٗد من حديث طويل ٤٣٦/٣ حديث رقم ٣٠٥٠۔

ترجمہ: حضرت عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ کیا تم میں سے کوئی آدمی اپنے تخت پر تکیہ لگائے ہوئے یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہی چیزیں حرام کی ہیں جو قرآن میں ذکر کی گئی ہیں۔ خبردار! اللہ کی قسم بے شک میں نے حکم دیا ہے۔ میں نے نصیحت کی ہے اور میں نے منع کیا ہے چند چیزوں سے جو قرآن کے مثل ہیں۔ بلکہ اس سے زیادہ ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے یہ تمہارے لئے حلال نہیں کیا کہ تم لوگ اہل کتاب کے گھروں میں اجازت لئے بغیر چلے جاؤ اور نہ ہی تمہارے لئے ان کے پھلوں کو کھانا حلال ہے۔ جب کہ وہ مقدار ادا کریں جو ان کے ذمہ لازم ہے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں اشعث بن شعبہ مصیصی ہے اس راوی کے بارے میں کلام کیا گیا ہے۔ بعض نے ثقہ کہا ہے اور بعض نے ضعیف کہا ہے۔

راویٔ حدیث:

عرباض بن ساریہؓ۔ عرباض بن ساریہ اصحاب صفہ میں سے ہیں۔ ان کی کنیت "ابونجیح" سلمی ہے۔ بکثرت رویا کرتے تھے۔ اللہ جل شانہ سے ملاقات کے انتہائی مشتاق تھے ان کی یہ دعا مشہور ہے: **كبرت سني ووهن غطمي فاقبضني اليك**۔ شام میں قیام کیا اور وہیں ۷۵ھ میں انتقال فرمایا۔ ان سے ابوامامہ اور تابعین کی ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

تشریح: **قوله: ايحسب احدكم متكئا على اريكته يظن ......هذا القرآن ؟ :**

"یحسب" سین کے کسرہ اور فتحہ ہر دو کے ساتھ درست ہے۔ (متکئًا): حال ہے۔ "یظن": اشرف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "یحسب" سے "بدل" ہے۔ بدل الفعل من الفعل ہے۔ بطور بیان تفسیر کیلئے لایا گیا ہے اور امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، ممکن ہے تکرار برائے تاکید ہو، اس آیت کی طرح: ﴿لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ [آل عمران: ١٨٨] (جو لوگ اپنے (ناپسند) کاموں سے خوش ہوتے ہیں اور (پسندیدہ کام) جو کرتے نہیں ان کے لیے چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے ان کی نسبت خیال نہ کرنا کہ وہ عذاب سے رستگار ہو جائیں گے اور انہیں درد دینے والا عذاب ہوگا۔)

قوله: ألا واني والله قد امرت ......او اكثر :

"الا" برائے تنبیہ ہے، وانی کا واؤ حالیہ ہے، اس جملہ میں کئی تاکیدات ہیں۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا یہ واؤ، بمنزلہ اس واؤ کے ہے جو پچھلی حدیث میں وانما میں ہے، چونکہ أيحسب کا ہمزہ انکاریہ ہے۔ عبارت کی معنوی تقدیر یوں ہوگی: **أيحسب أحدكم أن الله تعالى حصر المحرمات في القرآن والحال اني قد حرمت**۔

حرف تنبیہ متضمن معنیٰ انکار تھا، حال اور اس کے عامل کے درمیان واقع ہوا، یہ حرف تنبیہ یہاں "مقحم" ہے، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں حرف "انکار" مبتداء اور خبر کے درمیان واقع ہے اور "مقحم" ہے: ﴿أَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۖ أَفَأَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ﴾ [الزمر : ١٩] "بھلا جس شخص پر عذاب کا حکم صادر ہو چکا تو کیا تم (ایسے) دوزخی کو مخلصی دے سکو گے؟" کہ ہمزہ مؤکدہ ہے، من متضمن معنیٰ شرط کے مبتداء ہے اور أنت تنقذ...... خبر ہے۔ اس ہمزہ کو مبتداء خبر کے درمیان دوبارہ لایا گیا ہے۔ (ذکرہ الزجاج) "عن أشياء" : کا متعلق نهيت ہے اور أمرت و وعظت کا متعلق باشیاء محذوف ہے۔

"أو اكفر" میں "أو" بمعنیٰ "بل" ہے۔ مظہر رحمہ اللہ اس أو کے بارے میں فرماتے ہیں: **"أو" فى قوله: أو أكثر ليس للشك بل أنه عليه الصلوٰة والسلام لا يزال يزاد علما طورا بعد طور، الهاما من قبل الله، مكاشفة لحظة فلحظة، فكوشف له أن ما أملى من الأحكام غير القرآن مثله، ثم كوشف له بالزيادة متصلا به ذكره الأبهرى، وفيه تأمل**

اس آیت کریمہ سے اشکال ہوتا ہے: ﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ [النحل : ٨٩] "ہم نے تم پر (ایسی) کتاب نازل کی ہے کہ (اس میں) ہر چیز کا بیان (مفصل) ہے" بایں طور کہ اس آیت کو اگر اس کے عموم پر رکھا جائے اور **لكل شيء** سے مراد **فيما يحتاج اليه فى الدين** ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت سے ارشاد فرمائی گئی، کیونکہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام قرآن سے استنباط و استخراج کیا کرتے تھے۔ چنانچہ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **كل ما حكم به رسول الله صلى الله عليه وسلم فهو بما فهمه من القرآن**۔ اس کی تائید میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی نقل کیا ہے: **انى لا أحل الا ما أحل الله فى كتابه ولا أحرم الا ما حرم الله فى كتابه** اور فرمایا ائمہ جو بھی فرماتے ہیں وہ سنت کی شرح ہے، اور سنت ساری کی ساری قرآن کی شرح ہے۔ مزید فرماتے ہیں: جو بھی دینی مسئلہ پیش آتا ہے وہ کتاب اللہ میں موجود ہوتا ہے۔ ابن ابی حاتم، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کرتے ہیں: **اذا حدثتكم بحديث أنبأتكم بتصديقه من كتاب الله**۔

ابن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہے: **ما بلغني حديث على وجهه الا وجدت مصداقه فى كتاب الله**۔

قوله: وان الله لم يحل لكم أن تدخلوا بيوت اهل الكتاب الا باذن :

عرض مرتب: حدیثِ مبارکہ کے اس جملہ کی تشریح "کتاب الجزیہ" کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

قوله: ولا ضرب نسائهم :

عرض مرتب: حدیثِ مبارکہ کے اس جملہ کی تشریح "کتاب الجزیہ" کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

قوله: ولا اكل ثمارهم اذا اعطوكم الذى عليهم:

عرض مرتب: حدیثِ مبارکہ کے اس جملہ کی تشریح "کتاب الجزیہ" کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

سنت کو لازم پکڑو اور بدعت سے بچو

۱۶۵ :وَعَنْهُ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَوَعَظَنَا مَوْعِظَةً بَلِيْغَةً ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ وَوَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ فَقَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ كَاَنَّ هٰذِهٖ مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَاَوْصِنَا فَقَالَ :اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَاِنْ كَانَ عَبْدًا حَبَشِيًّا فَاِنَّهٗ مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِىْ فَسَيَرٰى اِخْتِلَافًا كَثِيْرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِىْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ وَتَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَاِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَالتِّرْمِذِىُّ وَابْنُ مَاجَةَ اِلَّا اَنَّهُمَا لَمْ يَذْكُرَا الصَّلَاةَ۔

أخرجه أحمد فى المسند ٤/١٢٦۔وأخرجه أبوداوٗد ٥/١٣حديث رقم٤٦٠٧۔والترمذى فى السنن ٥/٤٣ حديث رقم ٢٦٧٦۔وابن ماجة في سننه ١/١٥ حديث رقم ٤٢۔ والدارمي في سننه ١/٥٧حديث رقم٩٥۔

ترجمہ:حضرت عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی اور پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ہمیں نہایت ہی مؤثر انداز میں وعظ اور نصیحت کی کہ ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور دل خوف زدہ ہو گئے ایک آدمی نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ آج کے وعظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نصیحت کرنے والے کی جانب سے یہ آخری نصیحت ہے۔لہٰذا ہمیں کوئی وصیت فرما دیجئے۔رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور تمہیں مسلمانوں کے حکمران اور سردار کی بات سننے اور ماننے کی وصیت کرتا ہوں۔اگر چہ وہ سردار حبشی غلام ہو تم میں سے جو آدمی میرے بعد زندہ رہے گا۔وہ بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا۔ایسی صورت حال میں تم پر لازم ہے کہ میری اور میرے خلفاء راشدین جو کہ ہدایت یافتہ ہیں کی سنت کو لازم پکڑو اور اسی پر اعتماد کرو اور اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑے رہو اور تم دین میں ہر نئی بات ایجاد کرنے سے بچو کیونکہ دین میں ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اس حدیث کو امام احمد اور امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے مگر امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے نماز پڑھنے کا ذکر نہیں کیا۔یعنی ان کی حدیث میں صلی بنا رسول اللہ ﷺ کے الفاظ مذکور نہیں ہیں ان کی بیان کردہ حدیث:فو عظنا موعظة سے شروع ہوتی ہے۔

تشریح:اسنادی حیثیت:امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔

قوله:صلی بنا رسول الله ﷺ ذات يوم ......موعظة مودع فاوصنا:

اربعین کی روایت میں الفاظ یوں ہیں: **قلنا یا رسول الله! کانها۔**

"یوم" کا لفظ مجازی معنیٰ کے احتمال کو ختم کرنے کیلئے لایا گیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ واقعہ دن کا ہے۔"بوجهه" تاکید ہے اور "موعظة بليغة" کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

أى:تامة فى الانذار قال السيد جمال الدين:أى وجيزة اللفظ كثيرة المعنٰى، أو بالغ فيها بالانذار

والتخویف اھ۔

وقال التوربشتی: أی بالغ فیھا بالانذار والتخویف کقولہ تعالیٰ: ﴿وَقُلْ لَّهُمْ فِيْ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا مبَلِيْغًا......﴾ [النساء: ٦٣] ''ان لوگوں کے دلوں میں جو جو کچھ ہے خدا اس کو خوب جانتا ہے تم ان (کی باتوں) کا کچھ خیال نہ کرو اور انہیں نصیحت کرو اور ان سے ایسی باتیں کہو جو ان کے دلوں پر اثر کر جائیں۔'' ولیس المراد وجازۃ اللفظ وکثرۃ المعنٰی مع البیان کما قالہ القاضی لأن قولہ: ذرفت منھا العیون بدل علیہ اھ۔ وفیہ أنہ لا یلزم من ارادۃ وجازۃ اللفظ عدم افادۃ الانذار الذی سبب البکاء، واللہ اعلم۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہمیں ایسا وعظ فرمایا جس میں الفاظ کم مگر مفہوم بہت وسیع تھا، آنحضرت ﷺ کا یہ وعظ انذار و تخویف سے پُر تھا' گویا کہ اس آیت کریمہ کا امتثال تھا: ﴿وقل لھم فی أنفسھم قولا بلیغا......﴾ (ان لوگوں کے دلوں میں جو جو کچھ ہے خدا اس کو خوب جانتا ہے تم ان (کی باتوں) کا کچھ خیال نہ کرو اور انہیں نصیحت کرو اور ان سے ایسی باتیں کہو جو ان کے دلوں پر اثر کر جائیں) یہ وعظ سن کر ہماری آنکھیں بہ پڑیں، دِلوں پر خشیت کا غلبہ تھا۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ذرفت ای سالت ، ذرفت، کا اسناد آنکھوں کی طرف بطور مبالغہ ہے، وجلت کو مقدم اور ذرفت کو مؤخر کرنے کے بجائے برعکس کرنا، درحقیقت اشارہ ہے کہ یہ وعظ اس قدر مؤثر تھا کہ اس کا اثر ہمارے جسم کے ظاہر و باطن دونوں پر تھا۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام پر گرفت کرتے ہوئے فرماتے ہیں' ولا یخفی أن العلۃ المذکورۃ انما ھی للجمع بنیھما لتأخیر۔ ویمکن أن یقال: وجھہ أن الظاھر عنوان الباطن، یستدل بالدمعۃ علی الخشیۃ وان کانتا ھی موجبۃ للدمعۃ، واللہ اعلم۔

اس جگہ جو اس وعظ و نصیحت کو خصوصاً ذکر کیا گیا ہے تو محض اس لئے کہ یہ کوئی خاص مؤثر وعظ تھا جس کے متعلق راوی کا بیان ہے کہ: كَاَنَّ هٰذِهٖ مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ ۔ گویا کہ یہ نصیحت کرنے والے کی آخری نصیحت ہے جس کا مطلب واضح ہے کہ آپ ﷺ کا یہ وعظ ایسا تھا گویا کہ کوئی رخصت کرنے والا آخری نصیحت کر رہا ہو یعنی کہنے والا جو کچھ کہہ رہا ہے نہایت بلیغ طریقہ سے کہہ رہا ہے کہ یہ نصیحتیں یاد رہیں اور ان کے مطابق عمل ہوتا رہے اور جن کو نصیحت کی جا رہی ہے وہ اس کو اچھی طرح یاد رکھیں گویا کہ آپ ﷺ نے سمجھانے کی بہت کوشش کی تاکہ بات کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے جس سے سامعین میں سے بعض اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ آپ ﷺ اس انداز میں نصیحت فرما رہے ہیں کہ گویا آپ ﷺ کو اس بات کا یقین ہے کہ اب رحلت کا وقت قریب ہے معلوم نہیں پھر یہ ملاقات ہو سکے گی یا نہیں؟ اس لئے آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ آپ ﷺ نے اسی طرح کی مزید نصیحتیں ہم کو کہیں جو دین و دنیا میں ہمارے کام آئیں۔

قولہ: أوصیکم بتقوی اللہ۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس فرمائش پر چند مزید نصائح ارشاد فرمائیں۔ سب سے پہلے اہم ترین چیز یعنی تقوی کی وصیت فرمائی کہ میں تمہیں اللہ سے اور اس کی معصیت سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ......﴾ [النساء: ١٣١] (اور جو کچھ آسمانوں میں اور

جو کچھ زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے اور جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی ان کو بھی اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو بھی ہم نے حکم تاکیدی کیا ہے کہ خدا سے ڈرتے رہو اور اگر کفر کرو گے تو (سمجھ رکھو کہ) جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے اور خدا بے پروا اور سزاوار حمد وثنا ہے) تقویٰ سے مراد اس کی تینوں اقسام ہیں: ۱۔ **تقوی الشرك**، ۲۔ **تقوی المعصية**، ۳۔ **تقوی ماسوی الله**۔ آنحضرت ﷺ کی یہ پہلی وصیت جوامع الکلم میں سے ہے۔

قوله: والسمع والطاعة، وان كان عبدا حبشيا،......اختلافا كثيرا:

عرض مرتب: حدیث مبارکہ کے اس جملہ کی تشریح مرقات جلد ہفتم، کتاب الامارۃ والقضاء، الفصل الاول، الحدیث رقم: ۳۶۶۲، ۳۶۶۳ کے تحت ملاحظہ فرمایئے۔

قوله: فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الرشدين المهديين:

بعض کا کہنا ہے کہ الخلفاء الرشدین سے مراد ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم ہیں۔ کیونکہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے: **الخلافة بعدی ثلاثون سنة**۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر پہنچ کر ۳۰ سال پورے ہو جاتے ہیں، بایں طور کہ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت ۲ سال، ۳ ماہ اور ۱۰ دن رہی، پھر آپؓ کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت ۱۰ سال ۶ ماہ اور ۱۰ دن رہی اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت ۱۲ سال رہی اور پھر آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد منصب خلافت پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ جلوہ افروز ہوئے، آپ رضی اللہ عنہ کی خلافت کی انتہاء پر ۳۰ سال پورے ہو جاتے ہیں۔

بعض کا کہنا ہے کہ خلفائے راشدین سے مراد مذکورہ بالا خلفائے راشدین کے ساتھ ساتھ وہ ائمہ مجتہدین بھی مراد ہیں جنہوں نے آپ ﷺ کا راستہ اور سنت اختیار کیا، چونکہ یہ حضرات بھی نبی کے خلیفہ ہیں، بایں طور کہ یہ حضرات بھی احیائے حق، ارشادِ خلق اعلائے دین اور اعلائے کلمۃ اللہ میں پیش پیش رہے۔

امام تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے اپنی سنت کے ساتھ خلفائے راشدین کی سنت کا ذکر دو وجوہ سے فرمایا۔
پہلی وجہ تو یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ بھانپ چکے تھے کہ میری سنت کے استنباط میں یہ چاروں حضرات غلطی نہیں کریں گے۔
دوسری وجہ یہ کہ کئی سنتیں ان حضراتِ اربعہ کے دور ہی میں مشہور ہوئیں۔

اس حدیث سے باقی خلفاء کی نفی پر استدلال درست نہیں، کہ یوں کہا جائے کہ یہ حدیث باب ایک، اور دوسری حدیث: **يكون في أمتي اثنا عشر خليفة** کے منافی ہے۔ کیونکہ حدیث باب سے خلفائے اربعہ کے علاوہ کی خلافت کا انتفاء مقصود نہیں، بلکہ ان حضرات کی تصویب رائے اور جلالت شان کا اظہار مقصود ہے۔

قوله: تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ: بعض کا کہنا ہے کہ یہ دونوں فعل ماضی ہیں، اور خلفاء کی صفت ہیں۔

قوله: وإياكم ومحدثات الأمور......الخ:

"**وایاکم و محدثات الامور**"

یہ جملہ برائے تقریر وتاکید ہے اور اس کا عطف **فعليكم** پر ہے۔ ای: **احذروا عن الأمور التي أحدثت على**

خلاف أصل من أصول الدين، واتقوا أحداثها۔

'' كل بدعة ضلالة'' یہ جملہ ماخص عنہ البعض کی قبیل سے ہے۔'' کل '' منصوب ہے، اور بعض کا کہنا ہے کہ مرفوع ہے۔

صراطِ مستقیم کی مثال

۱۶۶: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطًّا ثُمَّ قَالَ هٰذَا سَبِيْلُ اللّٰهِ ثُمَّ خَطَّ خُطُوْطًا عَنْ يَّمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ وَقَالَ هٰذِهٖ سُبُلٌ عَلٰى كُلِّ سَبِيْلٍ مِّنْهَا شَيْطَانٌ يَدْعُوْا إِلَيْهِ وَقَرَأَ (وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ الْآيَةُ)۔ (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ وَالدَّارِمِيُّ)

أخرجه أحمد في المسند ۱/ ۴۳۵۔ والدارمی ۱/ ۷۸حدیث رقم ۲۰۲ وأخرج ابن ماجة نحوه ۱/ ۶حدیث رقم ۱۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سمجھانے کے لئے ایک سیدھا مستطیل خط کھینچا اور ارشاد فرمایا کہ یہ اللہ کا راستہ ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اس خط کے دائیں اور بائیں کئی خطوط کھینچے اور فرمایا یہ بھی راستے ہیں۔ جن میں سے ہر راستہ پر شیطان بیٹھا ہوا ہے۔ جو اپنے راستہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ...... اور بے شک یہ میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا اسکی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کی پیروی نہ کرو۔ تاکہ متعدد راستے تمہیں منتشر نہ کردیں۔ اس حدیث کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ اور امام دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ کرامؓ کی تعلیم وتفہیم اور تقریب الی الفہم کیلئے بذریعہ تمثیل دلنشیں انداز میں وضاحت فرمائی، کسی معنوی مقصود چیز کو محسوس شاہد چیز کے ساتھ تمثیل دے کر سمجھانا ''اوقع فی النفس'' ہوتا ہے۔

قوله: ثم قال: هذا سبيل میں عبارت کی معنوی تقدیر یوں ذکر فرمائی ہے: ای: هذا الرأى القويم والصراط المستقيم وهما الاعتقاد الحق والعمل الصالح وهذا الخط لما كان مثالاً سماه سبيل الله (كذا قاله ابن الملك)

هذا کا مشارٌ الیہ ''الخط المستقيم'' ہونا اظہر ہے عبارت کی تقدیر یوں ہے: هذا مثل سبيل الله يا هذا سبيل الله مثلاً۔

بعض کا کہنا ہے کہ تشبیہ بلیغ معکوس ہے۔ ای سبیل الله الذی هو عليه وأصحابه مثل الخط فی كونه على غاية الاستقامة۔ اس صورت میں معنیٰ یوں ہونگے: وہ راستہ کہ جس پر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین گامزن ہیں، غایت استقامت میں اس خطِ مستقیم کی طرح ہے۔

قوله: ثم خط خطوطا عن يمينه...... يدعوا اليه:

پھر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس خط مستقیم کے دائیں اور بائیں چھوٹے خطوط کھینچے اور پھر ان چھوٹے خطوط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا یہ چھوٹے خطوط غیر سبیل اللہ ہیں، شیطان کے راستے ہیں، ہر راستہ کے سرے پر ایک شیطان بیٹھا ہے وہ شیطان لوگوں کو ان راستوں کی طرف دعوتِ عام دیتا ہے۔

قوله: وقرأ: ﴿وأن هذا صراطي مستقيما﴾:

"ان" ہمزہ کے فتحہ اور نون کی تشدید کے ساتھ ہے۔ تقدیری عبارت یوں ہوگی: واتل علیھم ، یا لام مقدر ہے۔ ہمزہ مکسورہ پڑھنے کی صورت میں جملہ مستانفہ ہوگا۔ ہمزہ مفتوحہ اور نون کی تشدید کے ساتھ ضمیر قصہ ہوگی، هذا مرفوع صراطي خبر ہے' یاء کو ساکن اور مفتوح دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ مستقيما: حال ہے، اور عامل معنیٰ تنبیہ ہے یا اشارہ ہے۔

یہ مثال بیان فرمانے کے بعد نبی کریم ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی' ایک احتمال یہ ہے کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے تلاوت فرمائی ہو۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا راستہ بیچوں بیچ ہے' اس میں افراط و تفریط نہیں' اس راست میں توحید استقامت اور جادۂ حق میں جانبین کی رعایت ہے، اور اہلِ بدعت کے راستے آڑے ٹیڑھے ہیں، ان راستوں میں تقصیر، غلو، راہِ حق سے انحراف، تعدّد و اختلاف ہے، جیسا کہ قدریہ' جبریہ' خوارج' روافض معطلہ اور مشبّہہ میں یہ سب خرابیاں موجود ہیں۔

دین اطاعت کا نام ہے

۱۶۷ : وَ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبْعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ قَالَ النَّوَوِيُّ فِيْ اَرْبَعِيْنِهٖ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ رَوَيْنَاهُ فِيْ كِتَابِ الْحُجَّةِ بِاِسْنَادٍ صَحِيْحٍ۔

أخرجه البغوي في شرح السنة ١/ ٢٠٢ حديث رقم ١٠٤۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی انسان اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہشات اس دین کے تابع نہ ہو جائیں جس کو میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آیا ہوں اس حدیث کو شرح السنۃ میں روایت کیا گیا ہے اور امام نووی رحمہ اللہ نے اس کو اپنی چہل حدیث میں لکھا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے جس کو ہم نے کتاب الحجۃ میں صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: لا يؤمن أحدكم حتى يكون هواه تبعا لما جئت به :

"هواه": مصدر ہے هوى يهوى هوًى اذا سقط الهوى: مصدر ہے، هواه اذا أحبه۔

شریعت کی نگاہ میں ھواء نام ہے: ميل النفس الى خلاف ما يقتضيه الشرع۔ نفس هواء کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ اپنے پیروکار کو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بربادی کے گڑھے میں گراتی ہے۔

اس کو اصلِ ایمان کی نفی پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے، بایں طور کہ تبعالما جئت به کا مطلب یہ بیان کیا جائے: حتی

يكون تابعا مقتدا يا لما جئت به من الشرع عن اعتقاد لا عن اكراه و خوف سيف كالمنافقين۔

۲۔ یہ کمال ایمان کی نفی پر محمول ہے۔ أي: لا يكمل ايمان أحدكم حتى يكون انح۔

بعض عارفین فرماتے ہیں: اى حتى يكون هواه الذى من اصل صفاته النفسانية بل المعبود الباطل والمطاع والمحبوب الاتباع تبعا لما جئت به من السنة الزهراء والملة النقية البيضاء ...... من الله)۔

یہاں ایک اشکال ہوتا ہے، یہ کہ آنحضرت ﷺ کی لائی ہوئی ہدایات تو نور وضیاء ہیں اور ھوی نام ہے اس ظلمت کا جو خاکی طبائع کے نفوس میں پیدا ہوتی ہے، تو خواہشِ نفسانی ایک ظلمت ہے یہ دین نورانی کے تابع کیسے ہوسکتی ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے: امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بدن انسانی میں نفس کی مثال اس مجاہد کی طرح ہے کہ جو کسی سرحد کی حفاظت پر مامور کیا گیا ہو اور اس کی عقل اس کے مولیٰ کے خلیفہ کے قائم مقام ہے، اس کا بدن بمنزلہ سواری کے ہے اور اس کی خواہشات نفسانی ایک خبیث سائس ہیں اور قرآن بمنزلہ اس کتاب کے ہے جو اس کو اس کے مولیٰ نے دی ہے جس میں ہر چیز کی وضاحت ہے اور سراپا ہدایت ورحمت ہے اور نبی وہ پیغمبر ہے جو اس کتابِ مبین کو لایا ہے۔ لہٰذا اگر یہ مجاہد اپنے دشمنوں سے جہاد کرے اور ان پر قہر بن کر ٹوٹے، اور اپنی عقل وسلطنت سے تعاون حاصل کرے تو لائقِ ستائش ہے، اور جب واپس لوٹے گا تو یقیناً کامیاب واپس لوٹے گا اور جس نے سرحدوں کو ضائع کر دیا، رعیت کو مہمل چھوڑ دیا، اور اپنی ہمت وارادہ اپنی سواری کی تلاش میں لگا دی، اور سواری کے سائس کو اپنے ربّ کے خلیفہ کے قائم مقام کر دیا تو ایسا شخص آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہے۔

سنت کو زندہ کرنے کا ثواب

۱۶۸ : وَعَنْ بِلَالِ بْنِ حَارِثٍ الْمُزَنِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحْيَا سُنَّةً مِّنْ سُنَّتِيْ قَدْ اُمِيْتَتْ بَعْدِيْ فَاِنَّ لَهٗ مِنَ الْاَجْرِ مِثْلَ اُجُوْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْقُصَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْئًا وَّ مَنِ ابْتَدَعَ بِدْعَةً ضَلَالَةً لَا يَرْضَاهَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْاِثْمِ مِثْلَ اٰثَامِ مَنْ عَمِلَ بِهَا لَا يَنْقُصُ مِنْ اَوْزَارِهِمْ شَيْئًا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ۔

أخرجه الترمذى ٥/ ٤٤ حديث رقم ٢٦٧٧ وهو عنده من طريق كثير بن عبدالله عن أبيه عن جده أن النبى ا قال لبلال بن الحرث "اعلم قال : ماأعلم يارسول الله" وذكر الحديث۔

ترجمہ: حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس انسان نے میری کسی ایسی سنت کو زندہ کیا۔ یعنی باعتبار عمل کے رائج کیا جو کہ میرے بعد چھوڑی گئی تھی۔ تو اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا۔ جتنا کہ اس سنت پر عمل کرنے والوں کو دیا جائے گا اور ان سنتوں پر عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور جس انسان نے ضلالت اور بدعت کی کوئی چیز ایجاد اور نافذ کی جو اللہ اور اس کا رسول ﷺ کو پسند نہیں تو اس کو اتنا ہی گناہ ہوتا ہے جتنا کہ اس بدعت پر عمل کرنے والوں کو گناہ ہوتا ہے اور عمل کرنے والوں کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں

کی جاتی۔اس حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

بلال بن الحارث۔ بلال بن حارث ابوعبدالرحمٰن مزنی و مدنی ہیں۔ مدینہ سے کچھ دور اشعری میں رہتے تھے۔ان سے اس کے بیٹے حارث اور علقمہ بن وقاص روایت کرتے ہیں۔۶۰ھ میں بعمر اسّی (۸۰) سال وفات ہوئی۔

۱۶۹ :وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ كَثِيْرِ بْنِ عَبْدِاللهِ بْنِ عَمْرٍو عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ۔

ترجمہ: اور اس حدیث کو امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے کثیر بن عبداللہ بن عمرو سے اور عمرو نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

عمرو بن عوف المزنی۔ عمرو بن عوف مزنی قدیم الاسلام صحابہ میں سے ہیں۔ یہ ان صحابہ میں سے ہیں جن کی شان میں یہ آیت: ﴿تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ......﴾ [التوبۃ : ۹۲] نازل ہوئی تھی۔ مدینہ میں قیام فرمایا اور مدینہ میں ہی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے آخر دورِ امارت میں وفات پائی۔ان سے ان کے بیٹے عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں۔

کثیر بن عبداللہ۔ یہ کثیر ہیں۔عبداللہ ابن عمرو بن عوف کے بیٹے ہیں۔قبیلہ ''مازن'' سے تعلق رکھتے ہیں۔''مدین'' کے رہنے والے ہیں۔ان کے دادا ''عمرو بن عوف'' قدیم الاسلام صحابی ہیں۔ان کے حالات اپنے موقع محل پر آئیں گے۔اپنے والد وغیرہ سے حدیث کی سماعت کی۔ان کے ضعف پر محدثین کا اتفاق ہے۔حتیٰ کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ کذاب ہے۔مروان ابن معاویہ وغیرہ نے ان سے روایت کی۔

تشریح: قوله: من أحيا سنة من سنتي قد أميتت بعدي......ان ينقص من أجورهم شيئا:

آگے ایک اور روایت اس کے ہم معنیٰ آ رہی ہے اس کے یہ الفاظ ہیں: **من تمسك بسنتي عند فساد أمتي، فله أجر مائة شهيد۔**

''ينقص'' فعل لازم کے طور پر بھی ہو سکتا ہے اور فعل متعدی کے معنیٰ میں بھی ہو سکتا ہے۔ **من أجورهم:** ''من'' تبعیضیہ ہے۔ **شيئاً:** مفعول بہ ہے یا مفعول مطلق ہے۔

جس شخص نے میری سنت کو ظاہر و نمایاں کیا، خواہ قول کے ذریعہ، خواہ عمل کے ذریعہ۔سنت سے مراد ہر وہ قول و عمل جو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف منسوب ہو، خواہ وہ واجب ہو یا مندوب ہی کیوں نہ ہو، خواہ منصوص ہو خواہ استنباط سے معلوم ہوا ہو، لوگوں نے اس پر عمل ترک کر دیا ہو، **فان له الأجر ...... شيئا:** چنانچہ ایسی حالت میں جو شخص میری سنت کو اپنے عمل یا قول و ترغیب کے ذریعہ پھیلائے گا تو اس شخص کو کامل ثواب ملے گا، دلالت کا، احیاء کا، ترغیب کا اور متمسکین کے تمسک کا۔

قوله: ومن ابتدع بدعة ضلالة......الخ :

''بدعة ضلالة'': ترکیب اضافی کے ساتھ مروی ہے اور ایک احتمال مرکب توصیفی ہونے کا ہے۔ **لا يرضاها الله**

ورسولہ: یہ جملہ صفت کاشفہ ہے ضلالۃ کی، یا بدعۃ کیلئے صفت احترازیہ ہے۔

بدعت ضلالت میں وہ بدعات جن کو ائمہ نے منکر قرار دیا ہے مثلاً قبروں پر تعمیر کرنا اوران کو پختہ کرنا وغیرہ اور ضلالت کی قید سے بدعۃ حسنہ خارج ہوگئی، مثلاً منارہ وغیرہ۔ (کذا ذکرہ ابن الملک)

احیائے سنت پر ثواب اور ابداع بدعت میں گناہ کی حکمت:

احیائے سنت اور ابداع بدعت میں گناہ وثواب کی حکمت یہ ہے کہ جو شخص ایجاد شئی کا سبب ہوتا ہے اسکی طرف اس شئی کی دوام کے ساتھ نسبت کرنا درست ہوتا ہے اور دوام نسبت کی وجہ سے ثواب وعقاب مضاعف ہوتے ہیں، کیونکہ اصل تو یہی ہے۔

دین سمٹ کر مدینہ منورہ میں چلا جائے گا

۱۷۰: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الدِّیْنَ لَیَارِزُ اِلَی الْحِجَازِ کَمَا تَأْرِزُ الْحَیَّۃُ اِلٰی جُحْرِھَا وَلَیَعْقِلَنَّ الدِّیْنُ مِنَ الْحِجَازِ مَعْقِلَ الْاُرْوِیَّۃِ مِنْ رَأْسِ الْجَبَلِ اِنَّ الدِّیْنَ بَدَاَ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَاَ فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَآءِ وَھُمُ الَّذِیْنَ یُصْلِحُوْنَ مَآ اَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ بَعْدِیْ مِنْ سُنَّتِیْ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۱۹/۵ حدیث رقم ۲۶۳۰ وقال حسن صحیح۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن عوفؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بے شک دین اسلام سمٹ کر ارض حجاز یعنی مکہ اور مدینہ میں چلا جائے گا۔ جیسے سانپ سمٹ کر اپنے سوراخ کی طرف آ جاتا ہے اور دین ارض حجاز میں سمٹ کر اسی طرح آ جائے گا اور جگہ پکڑے گا جس طرح پہاڑی بکرا پہاڑ کی چوٹی پر جگہ پکڑتا ہے اور دین ابتداء اور شروع میں غریب تھا اور آخر میں بھی ایسا ہی ہو جائے گا جس طرح کہ ابتداء اور آغاز میں تھا پس غریبوں کے لئے خوشخبری ہے اور غرباء سے مراد وہ لوگ ہیں کہ میرے بعد لوگوں نے میری سنت میں جو فساد ڈالا ہوگا اس کی اصلاح کر دینگے۔ اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قولہ: ان الدین لیارز الی الحجاز کما تأرز الحیۃ الی جحرھا:

عرض مرتب: اس جملہ سے متعلقہ کلام ماقبل میں حدیث: ۱۶۰ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

قولہ: ولیعقلن الدین......من رأس الجبل:

ولیعقلن الدین...... : یہ جملہ قسم محذوف کا جواب ہے۔ أی واللہ لیعقلن أی لیعتصمن۔ ابن حجر رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ اس کا عطف لیأرز پر ہے، یا ''ان'' اور اس کے معمول پر ہے۔ أی لیتحصنن و ینضم و یلتجیٔ الدین۔ مقتضی یہ تھا کہ الدین اسم ظاہر کی جگہ ضمیر لائی جاتی مگر شرافت وفخامت کے باعث نا صرف اسم ظاہر ذکر کیا بلکہ ادوات تاکید لا کر مؤکد کر دیا گیا، اور قسم مقدر بھی لائی گئی۔ عقل الوعل یعقل عقولا: (کسی کی پناہ میں آنا) پہاڑی بکرے کا اونچے اونچے پہاڑوں کی پناہ میں آنا۔ (معقل: مصدر بمعنی عقل، یا اسم مکان ہے۔ بمعنی پناہ گاہ، بلند قلعہ پہاڑ۔ الأرویۃ: ہمزہ کے ضمہ اور کسرہ یا مشددہ کے

ساتھ۔

وعل کے بجائے أرویہ کا ذکر کرنا اس وجہ سے ہے کہ دشوار گزار پہاڑوں پر نر کے مقابلہ میں زیادہ بہتر طور پر چڑھ سکتی ہے۔

قوله: ان الدين بدأ غريباً...... :

عرض مرتب: اس حصہ کی شرح ماقبل میں حدیث: ۱۵۹ کے تحت گزر چکی ہے۔

یہ اُمت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی

۱۷۱ : وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى أُمَّتِيْ كَمَا أَتٰى عَلٰى بَنِيْ إِسْرَآئِيْلَ حَذْوَا لنَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰى إِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ أَتٰى أُمَّهٗ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِيْ أُمَّتِيْ مَنْ يَصْنَعُ ذٰلِكَ وَإِنَّ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ تَفَرَّقَتْ عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ مِلَّةً وَتَفْتَرِقُ أُمَّتِيْ عَلٰى ثَلَاثٍ وَّسَبْعِيْنَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا مِلَّةً وَّاحِدَةً قَالُوْا مَنْ هِيَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ؟ قَالَ مَآأَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِيْ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ۔

أخرجه الترمذي ٥/٢٦ حديث ٢٦٤٢ وقال مفسر غريب۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بے شک میری امت پر ایک ایسا وقت آئے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا تھا اور دونوں میں ایسی مماثلت ہوگی جیسے دونوں جوتے آپس میں برابر ہوتے ہیں یہاں تک کہ بنی اسرائیل میں سے اگر کسی آدمی نے اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب کیا ہوگا۔ تو میری امت میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو اسی طرح کی بدفعلی کریں گے اور بنی اسرائیل ۷۲ فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور میری امت ۷۳ فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی اور وہ تمام فرقے جہنمی ہوں گے۔ ان میں سے صرف ایک فرقہ جنتی ہوگا۔ صحابہ کرام نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ وہ جنتی فرقہ کونسا ہوگا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو فرقہ میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر ہوگا اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: ليأتين على أمتي كما أتى على بني اسرائيل :

ليأتين على أمتي یہاں أتی کے صلہ میں علیٰ لائے ہیں کیونکہ یہ غلبہ مفضی الی الهلاک کے معنی ہیں۔ اسی قبیل سے یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ﴾ [الذاریات : ٤٢] اور لیأتین کا فاعل مقدر ہے، جس پر سیاق کلام دلالت کر رہا ہے۔

جمہور کے نزدیک "کما" کا یہ کاف منصوب علی المصدر ہے۔ چنانچہ عبارت کی معنوی تقدیر یوں ہے: **ليأتين على أمتي زمان اتيانا مثل الاتيان على بني اسرئيل**۔ دوسری تقدیر یوں ہو سکتی ہے: **ليأتين على أمتي مخالفة لما أنا عليه مثل المخالفة التي أتت على بني اسرائيل** اور یہ درست ہے کہ "کاف" کو فاعل بنا دیا جائے۔ اس صورت میں عبارت کی تقدیر یہ ہوگی: **ليأتين على أمتي مثل ما أتى على بني اسرائيل** ۔

"امتی" سے مراد اُمت دعوت کے بعض افراد ہیں۔ اہلِ قبلہ کے مراد ہونے کا قرینہ یہ ہے کہ اُمت کی اضافت اپنی ذاتِ گرامی کی طرف فرمائی ہے اور اگر مطلق مراد لیا جائے تو کفریہ ملتیں بھی شامل ہوں گی۔

قوله: حذو النعل بالنعل۔ حذو منصوب علی المصدر ہے۔ ای: یحذونهم حذوًا مثل حذو النعل بالنعل۔

" حذو النعل بالنعل" یہ استعارۃ فی التساوی ہے اور بعض کا کہنا ہے: الحد والقطع 'کاٹنا'۔ حذوت النعل بالنعل یہ اس وقت کہا جاتا ہے، جب دونوں جوتے بالکل برابر، سرابر ہوں۔

آنحضرت ﷺ کی اس حدیث مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ بھی بنی اسرائیل کی مکمل موافقت اختیار کرو گے جیسا کہ جوتے کا جوڑا، کہ دونوں جوتے بالکل برابر، برابر ہوتے ہیں ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

قوله: حتى ان كان منهم من أتى أمه علانية:

"حتى" ابتدائیہ ہے اور اس کا مابعد جملہ شرطیہ ہے۔" لكان" قسمِ مقدر کا جواب ہے اور مجموعہ کلام جواب شرط ہے۔

'ان' بمعنی "لو" ہے۔

بعض کا زعم ہے کہ یہ 'ان' مخففہ من المثقلہ ہے، حالانکہ یہ بات درست نہیں (كذا نقله السيد جمال الدين عن زين العرب)۔ الازہار میں لکھا ہے ہمزہ کے کسرہ اور نون مخففہ کے سکون کے ساتھ ہے۔ ای حتی انه (كذا ذكره أبهري) یہ اختلاف دراصل ایک اور اختلاف پر مبنی ہے، وہ یہ کہ 'ان' مکسورۃ کے آخر سے ضمیر شان کا حذف جائز ہے، کہ نہیں؟ ابن الحاجب عدم جواز اور ابن مالک جواز کے قائل ہیں۔

"اتيان أم" کنایہ ہے کہ ماں سے زنا کرے گا۔ ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے، کہ ماں سے مراد حقیقی ماں نہیں بلکہ باپ کی بیوی، یعنی سوتیلی ماں ہے اور ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ماں سے مراد باپ کی موطوءۃ یا وہ خواتین ہیں کہ جن سے اس کا رضاعت یا مصاہرت کا تعلق ہے۔ پہلا احتمال اظہر ہے چونکہ غرابت و استبعاد پہلے احتمال میں زیادہ ہے۔ اسی لئے "علانية" کی قید بھی لگائی۔

قوله: وان بني اسرائيل تفرقت على ثنتين وسبعين ملة:

"بني اسرائيل" بنی اسرائیل سے مراد نصاریٰ ہیں یا اہلِ کتاب ہیں۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر فرما کر بنی اسرائیل کے اس فعل شنیع کی قباحت بتانا مقصود ہے اور یہ کہ فعلِ بد ان کی پرانی عادت راسخہ ہے اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ضمیر لانے کی صورت میں کسی درجہ میں مرجع کچھ اور ہونے کا احتمال ہوسکتا تھا، اس لئے اس ازالہ وہم کی خاطر ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر فرمایا۔

ثنتين وسبعة ملة: ہر فرقہ کو "ملت" سے تعبیر کرنا توسُّعًا ہے۔ لفظ ملت کسی پیغمبر کی طرف یا جملہ شرائع کی طرف مضاف ہوتا ہے مثلاً ملة محمد ﷺ یا ملتهم۔ پھر اس کے استعمال میں توسع ہوا اور ملل باطلہ کیلئے بھی مجازاً استعمال ہونے لگا۔ بعض کا کہنا ہے: الملة كل فعل وقول جتمع عليه جماعة وهو قد يكون حقا وقد يكون باطلا۔

قوله: تفترق أمتي على ثلاث وسبعين ملة:

بعض کا کہنا ہے کہ یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اُمت ارتکابِ بدعات میں بنی اسرائیل وغیرہ سے ایک درجہ بڑھ کر ہوگی۔ بعض کا کہنا ہے کہ اُمت سے مراد امت دعوت ہے، چنانچہ اس صورت میں ۷۳ کے عدد میں وہ ملتیں بھی شامل ہو جائیں گی جو ہمارے قبلہ پر نہیں ہیں اور ایک احتمال یہ ہے کہ امت سے مراد امّت اجابت ہے۔ اس صورت میں ۷۳ کا عدد ہمارے اہل قبلہ کے ساتھ مخصوص ہوگا۔ دوسری بات زیادہ ظاہر ہے۔ ابہری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ اکثر کے نزدیک اس سے مراد امت اجابت ہے۔

قوله: كلهم في النار الا ملة واحدة : "ملة" منصوب ہے، اور مضاف محذوف ہے، ای: **الاّ أهل ملة**۔ کیونکہ یہ ایسے اعمال کا ارتکاب کریں گے جو موجب نار ہوں گے۔

اپنے غلط عقائد اور بداعمالیوں کی بناء پر دوزخ میں داخل ہوں گے لہٰذا جس کے عقائد و اعمال اس حد تک فساد انگیز نہ ہوں گے وہ دائرہ کفر میں نہیں آئیں گے اور اپنی سزا کی مدت گزارنے کے بعد دوزخ سے نکال لئے جائیں گے۔

قوله: ما أنا عليه واصحابي : "ما" خبر ہے اور مبتدا محذوف ہے۔ ای: **هي ما انا عليه الخ**۔

زیر نظر حدیث میں جنتی گروہ کو "الجماعت" کہا گیا ہے اور اس سے مراد اہل علم اور صحابہ ہیں ان کو "الجماعت" کے نام سے اس لئے موسوم کیا گیا ہے کہ یہ سب کلمہ حق پر جمع ہیں اور دین و شریعت پر متفق ہیں رہے باقی ۷۲ فرقے اُن کی تفصیلات اہل اسلام نے جمع کی ہیں جن میں زیادہ معروف آٹھ ہیں اور باقی ان کی مختلف شاخیں ہیں اور وہ جو آٹھ معروف ہیں وہ اس طرح ہیں: ① معتزلہ ② شیعہ ③ خوارج ④ مرجیہ ⑤ نجاریہ ⑥ جبریہ ⑦ مشبہہ ⑧ ناجیہ ۔

۷۲: فرقوں کی تفصیل:

① معتزلہ:	۲۰	② شیعہ:	۲۲	③ خوارج:	۲۰
④ مرجیہ:	۰۵	⑤ نجاریہ:	۰۳	⑥ جبریہ:	۰۱
⑦ مشبہہ:	۰۱	⑧ حلول:	۰۱		

اس کا ایک ظاہر ہے جس کو شریعت کہا جاتا ہے، یہ عام لوگوں کیلئے ہے۔ اس کا ایک باطن ہے جس کو طریقت کہا جاتا ہے، یہ خاص لوگوں کیلئے ہے۔

آگے فرماتے ہیں: **وخلاصة خصت باسم الحقيقة معراجا لأخص الخاصة، فالأول نصيب الأبدان من الخدمة، والثاني نصيب القلوب من العلم والمعرفة والثالث نصيب الأرواح من المشاهدة والرؤية**۔

قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: شریعت نام ہے التزام عبودیت کا اور حقیقت نام ہے مشاہدۂ ربوبیت کا۔ چنانچہ ہر وہ شریعت جو "حقیقت" کی تائید سے خالی ہو غیر مقبول ہے، اور ہر وہ حقیقت جو "شریعت" کے ساتھ مقیّد نہ ہو غیر محصول ہے۔ پس شریعت مامور بہ کے قیام کا نام ہے اور حقیقت نام ہے قضاء وقدر اور مخفی وظاہر کے شہود کا اور شریعت حقیقت ہے اس حیثیت سے کہ اس کے امر سے واجب ہوئی ہے اور حقیقت شریعت ہے اس اعتبار سے کہ اللہ جل شانہ کے معارف بھی اس کے امر سے واجب

ہوئے ہیں۔ بعض اربابِ حال نے کیا خوب کہا:

الا فالزموا سنة الأنبياء　　الا فاحفظو سيرة الأصفياء

آ گاہ انبیاء کی سنت کو لازم پکڑو آ گاہ اصفیاء کی سیرت کو یاد کرو

ومن يبتدع بدعة لم يكرم　　بوجدانه رتبة الاتقياء

اور جو شخص کوئی بدعت گھڑے گا تو اس کے جذبہ کے باعث اس کو اتقیاء کے رتبہ والا اعزاز و اکرام حاصل نہیں ہوگا

۱۷۲: وَفِیْ رِوَایَةِ اَحْمَدَ وَاَبِیْ دَاوٗدَ عَنْ مُعَاوِیَةَ ثِنْتَانِ وَسَبْعُوْنَ فِی النَّارِ وَوَاحِدَةٌ فِی الْجَنَّةِ وَهِیَ الْجَمَاعَةُ وَاِنَّهٗ سَیَخْرُجُ فِیْ اُمَّتِیْ اَقْوَامٌ تَتَجَارٰی بِهِمْ تِلْكَ الْاَهْوَآءُ كَمَا یَتَجَارَی الْكَلْبُ بِصَاحِبِهٖ لَا یَبْقٰی مِنْهُ عِرْقٌ وَّلَا مَفْصِلٌ اِلَّا دَخَلَهٗ۔

ترجمہ: اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے جو روایت حضرت معاویہؓ سے روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ ۷۲ فرقے دوزخ میں جائیں گے اور ایک فرقہ جنت میں جائے گا اور وہ فرقہ میری جماعت ہے اور میری امت میں کئی قومیں ظاہر ہونگی جن میں خواہشاتِ نفسانیہ عقائد و اعمال اور بدعات میں اس طرح سرایت کر جائیں گے۔ جس طرح ہڑک والے کتے میں ہڑک سرایت کر جاتی ہے۔ کوئی رگ اور جوڑ اس سے خالی نہیں ہوتا۔ ہر رگ وریشہ میں داخل ہو جاتی ہے۔

راویٔ حدیث:

معاویۃ بن ابی سفیان۔ یہ معاویہ ہیں۔ ابوسفیان کے بیٹے ہیں۔ یہ دونوں باپ بیٹے صحابی ہیں۔ قرشی اور اموی ہیں۔ ابو سفیان بن صخر بن حرب واقعہ فیل سے دس سال پہلے پیدا ہوئے اور جاہلیت میں قریش کے معزز لوگوں میں سے تھے۔ اور حنین میں شریک ہوئے۔ ان کی والدہ کا نام ہند بنت عتبہ ہے۔ یہ خود اور ان کے والد فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہونے والوں میں سے ہیں اور مؤلفۃ القلوب میں داخل تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کتابت کرنے والوں میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے وحی بالکل نہیں لکھی البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مراسلات لکھتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابوسعید رضی اللہ عنہ نے ان سے روایت کی۔ اپنے بھائی یزید رضی اللہ عنہ کے بعد شام کے حاکم مقرر ہوئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے وفات تک حاکم ہی رہے۔ یہ کل مدت چالیس (۴۰) سال ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں تقریباً چار سال اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پوری مدتِ خلافت اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی مدتِ خلافت یہ کل بیس سال ہوئے۔ اس کے بعد حضرت حسن ابن علی رضی اللہ عنہما نے ۴۱ھ میں خلافت ان کو سپرد کر دی تو حکومت مکمل طور پر ان کو حاصل ہوگئی اور مسلسل بیس سال تک زمامِ سلطنت ان کے ہاتھ میں رہی۔ بمقام دمشق رجب ۶۰ھ میں ۷۸ سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور بقیع میں دفن کیے گئے۔ آخر عمر میں ان کو لقوہ کی بیماری لاحق ہوگئی تھی۔ اپنی زندگی کے آخر ایام میں کہا کرتے تھے کاش کہ وادی ذی طویٰ میں قریش کا ایک آدمی ہوتا اور یہ حکومت وغیرہ کا منہ بھی نہ دیکھتا۔ ان کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر قمیص اور ازار اور کچھ موئے مبارک اور ناخن موجود تھے۔ انہوں نے وصیت کی

تھی کہ مجھے آپ ﷺ کی قمیص' ازار اور چادر میں کفن دیا جائے اور میری ناک اور منہ اور ان اعضاء میں جن سے سجدہ کیا جاتا ہے آنحضرت ﷺ کے بال مبارک اور ناخن بھر دیے جائیں اور مجھے ارحم الراحمین کے سامنے تنہا چھوڑ دیا جائے (وہ میرے ساتھ جو معاملہ مناسب سمجھیں کریں)۔

نبی علیہ السلام نے جنگ حنین کے غنائم میں سے جو انہوں نے مؤلفۃ القلوب کو عطا فرمائے' ان کو کئی اوقیہ دیئے۔ ان کی آنکھ طائف کے دن پھوٹ گئی تھی اور جنگ یرموک تک وہ کانہ تھے' پھر ان کی آنکھ پر پتھر لگا تو وہ آنکھ اندھی ہو گئی۔

تشریح: قوله: وفي رواية احمد...... الا دخله:

امام احمد بن حنبل کی روایت میں وان هذه الأمة ستفترق على ثلاث وسبعين کے بعد، ثنتان وسبعون الخ کے الفاظ ہیں۔

شریح رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: ان السنة قد سبقت قياسكم، فاتبع ولا تبتدع فانك لن تضل ما أخذت بالأثر۔

شعبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: انما رأيي بمنزلة الميتة اذا احتجت اليها أكلتها۔

سفیان رحمۃ اللہ سے مروی ہے: لو أن فقيها على رأس الجبل لكان هو الجماعة۔

قوله: وانة سيخرج فى أمتى:

ایک نسخہ میں من أمتى کے الفاظ ہیں۔ مصابیح میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: وزاد فى رواية: وانه سيخرج۔

"الأهواء": هوى کی جمع ہے، ہوی کہتے ہیں اپنی پسندیدہ چیز کی طرف نفس کے مائل ہونے کو، یہاں بدعت مراد ہے۔

بدعت کی جگہ ھوی کا ذکر کرنا، وضع السبب موضع المسبّب کے قبیل سے ہے، چونکہ خواہشاتِ نفسانی ہی انسان کو بدعتِ قولی و فعلی پر مجبور کرتی ہیں اور لفظ أهواء کا جمع لانا ہوی اور بدعت کی انواع واقسام کے اختلاف کی طرف اشارہ ہے۔

قوله: كما يتجارى الكلب...... الا دخل:

یہ ایک خوفناک بیماری ہے۔ جو مجنون کتے کے کاٹنے سے پیدا ہوتی ہے، اور اس کا اثر سارے جسم میں پھیل جاتا ہے۔ یہ ایک مہلک بیماری ہے جو مالیخولیا کے مشابہ ہوتی ہے۔ اس بیماری میں مبتلا شخص کو پانی نہیں دیتے، حتی کہ وہ پیاس کی شدت میں چل بستا ہے۔ عرب کا اجماع ہے کہ اس بیماری کی دوا ایک قطرہ خون ہے کہ جس میں پانی ملایا گیا ہو، اس کو پلایا جائے۔

اجماعِ امت دلیل ہے

۱۷۳: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ لَايَجْمَعُ اُمَّتِىْ اَوْ قَالَ اُمَّةَ مُحَمَّدٍ عَلٰى ضَلَالَةٍ وَّ يَدُاللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ وَمَنْ شَذَّ شُذَّ فِى النَّارِ (رواه الترمذى)

أخرجه الترمذى ٤/٤٠٥ حديث رقم ٢١٦٧۔

ترجمه: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میری امت کو

یہ فرمایا کہ امت محمدیہ کو ضلالت اور گمراہی پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت پر ہے اور جو آدمی جماعت سے الگ ہے وہ اہل جنت سے الگ کر کے اکیلا جہنم میں ڈال دیا جائے گا اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان الله لا يجمع امتی او قال أمة محمد علی ضلالة

بعض کا کہنا ہے کہ راوی کو الفاظ میں شک ہے۔ ازروئے درایت یہی اظہر ہے۔ اُمت سے مراد اُمت اجابت ہے، ای: لا يجتمعون علی ضلالة غير الكفر۔ اسی وجہ سے بعض حضرات کا مذہب ہے کہ اُمت نا صرف کفر پر مجتمع ہو سکتی ہے، بلکہ مجتمع ہوئی ہے، مگر یہ کہ کفر کے بعد وہ اُمت، اُمتِ محمدیہ نہیں، اور حدیث میں منفی اجتماع اُمتِ محمدیہ علی الضلالۃ کی ہے۔ اُمت سے اُمتِ اجابت مراد ہونے کی دلیل یہ روایت ہے: ان الساعة لا تقوم الا علی الكفار۔ پس حدیث دلالت کر رہی ہے کہ مسلمین کا اجتماع برحق ہے اور اجماع سے مراد علماء کا اجماع ہے، عوام کے اجماع کا کوئی اعتبار ہی نہیں، چونکہ عوام کا اجماع (اگر ہوا بھی تو) بغیر علم کے ہوتا ہے۔

مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ حدیث اجماعِ اُمت کی حقانیت کی دلیل ہے۔ اھ۔

یہاں ضلالت سے کیا مراد ہے؟ ابہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ضلالت سے مراد خطا ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ کفر و معصیت مراد ہے۔

قوله: ويد الله علی الجماعة:

يد الله نصرت و غلبہ سے، یا حفاظت و رحمت سے کنایہ ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ استنباط احکام کیلئے احسان و توفیق مراد ہے۔ الجماعة سے مراد مجتمعين علی الدين ہیں۔

قوله: ومن شذ شذ فی النار:

یعنی جو شخص ان اصحاب کے اعتقاد، قول و فعل سے ہٹ کر کوئی نیا اعتقاد یا قول و فعل اختیار کرے گا وہ شخص جہنم میں جائے گا۔

سوادِ اعظم کا اتباع کرو

۱۷۴: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ فَاِنَّهٗ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ۔

(رواه ابن ماجة من حديث كتب السنة)

أخرجه ماأخرجه ابن ماجة من حديث أنس "أن أمتي لا تجتمع على ضلالة فاذا رأيتم اختلافا فعليكم بالسواد الأعظم" ٢/١٣٠٣ حديث رقم ٣٩٥٠۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بڑی جماعت کی پیروی کرو۔ اس لئے کہ جو جماعت سے الگ ہو گیا تو وہ تنہا جہنم کی آگ میں ڈالا جائے گا۔ اس حدیث کو امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب السنۃ سے حضرت انس اور حضرت ابن عاصم رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: اتبعوا السواد الأعظم :

سواد اعظم سے مراد الجماعۃ الکثیرۃ ہے اور اس بڑی جماعت سے کونسی جماعت مراد ہے؟ اس میں متعدد اقوال ہیں۔

① اس سے مراد وہ جماعت ہے جو کسی ایسے امام کی مطیع ہو جو سلطانِ اعظم ہو۔
② اس سے مراد اہلِ ایمان ہیں۔
③ اس سے مراد کتاب وسنت ہے، کیونکہ یہ معانی کثیرہ پر مشتمل ہیں۔
④ اس سے مراد ہر وہ عالم ہے جو کتاب وسنت پر عامل ہو۔
⑤ اس سے مراد وہ جماعت ہے جو ان چیزوں پر گامزن ہو کہ جس پر مسلمانوں کی اکثریت ہو۔

بعض کا کہنا ہے کہ ما علیہ اکثر المسلمین سے مراد اصولِ اعتقاد ہیں، مثلاً ارکانِ اسلام اور فروعی مسائل میں اجماع کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ائمہ مجتہدین میں سے ہر ایک کی اتباع جائز ہے مثلاً ائمہ اربعہ اور ماتریدیہ اور اشعریہ کے مابین جن مسائل میں اختلاف ہے سو وہ حقیقۃً فروعی اختلاف ہے، اور فروع مسائل ظنیات کے قبیل سے ہیں۔ لہٰذا اعتقادات کے قبیل سے نہ ہوئے، جبکہ اعتقادیات یقینیات پر مبنی ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض محققین کا کہنا ہے کہ یہ سارا اختلاف لفظی ہے۔

الازہار میں لکھتے ہیں: اتبعوا السواد العظم دلالت کرتا ہے کہ "اعاظم الناس" علماء ہیں۔ اگر چہ ان کی تعداد تھوڑی ہی کیوں نہ ہو، اکثر الناس کا لفظ ارشاد نہیں فرمایا، چونکہ معاشرہ میں زیادہ تعداد جاہلوں کی ہوتی ہے۔

قولہ: ومن شذ شذ فی النار: اس جملہ کی تشریح پچھلی حدیث کے ذیل میں گذری ہے۔

توضیح: رواہ کے بعد بیاض ہے۔ میرک شاہ رحمہ اللہ نے رواہ کے بعد ابن ماجہ من حدیث أنس کا اضافہ کیا ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس روایت کو ابن عاصم نے "کتاب السنۃ" میں نقل کیا ہے۔

رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے محبت کرنے والا جنت میں آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ ہوگا

۱۷۵ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَابُنَیَّ اِنْ قَدَرْتَ اَنْ تُصْبِحَ وَتُمْسِیَ وَلَیْسَ فِیْ قَلْبِكَ غِشٌّ لِاَحَدٍ فَافْعَلْ ثُمَّ قَالَ یَابُنَیَّ وَذٰلِكَ مِنْ سُنَّتِیْ وَمَنْ اَحَبَّ سُنَّتِیْ فَقَدْ اَحَبَّنِیْ وَمَنْ اَحَبَّنِیْ كَانَ مَعِیَ فِی الْجَنَّةِ ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذی ٥/٤٤ حدیث رقم ٢٦٧٨۔ وقال حسن غریب من هذا الوجه۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا اے میرے پیارے بیٹے! اگر تم اس پر قدرت رکھتے ہو کہ اس حال میں صبح وشام کرو کہ کسی کے بارے میں تمہارے دل میں کینہ نہ ہو تو ایسا ہی کرو پھر فرمایا اے میرے پیارے بیٹے یہی میری سنت ہے لہٰذا جس آدمی نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں داخل ہوگا۔ اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

ایک سنت کو زندہ کرنا سو شہیدوں کا ثواب ہے

۱۷۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِیْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِیْ فَلَهٗ اَجْرُ مِائَةِ شَهِیْدٍ. رواہ البیهقی فی کتب الزهد له من حدیث ابن عباس

لم یذکر من أخرجه۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں فساد کے وقت جس آدمی نے میری سنت کو مضبوطی سے اپنایا اس کو سو (۱۰۰) شہیدوں کا ثواب ملے گا۔ اس روایت کو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب الزہد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔

تشریح: یعنی جس شخص نے میری اُمت کے بگاڑ کے وقت، میری سنت پر عمل کیا تو اس کو سو شہیدوں کا اجر عطا ہوگا، جتنا بگاڑ سخت ہوگا اس کا مقابلہ بھی اتنا ہی سخت ہوگا، لہٰذا اس شخص کو ثواب کفار کے ساتھ احیائے دین کی خاطر قتال کر کے شہید ہو جانے والے سو افراد کا ثواب بلکہ اس سے بڑھ کر ہوگا۔

عرض مرتب: مرقات کے بالائی متن میں ''رواہ احمد'' ہے۔ مرقات کے محشیٰ کا لکھنا ہے کہ تینوں نسخوں میں بیاض ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کے مشکوۃ کے متن میں ''رواہ'' کے بعد بیاض ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میرک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے یہاں پر البیهقی فی کتاب الزهد له من حدیث ابن عباس کا الحاق کر دیا ہے۔ ۲۔ اس حدیث کے قریب قریب دو حدیثیں ماقبل میں بھی گزر چکی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے، حدیث: ۱۶۸،۱۵۸۔

اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو محمد ﷺ کی اتباع کرتے

۱۷۷: وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ حِیْنَ اَتَاهُ عُمَرُ فَقَالَ: اِنَّا نَسْمَعُ اَحَادِیْثَ مِنْ یَهُوْدَ تُعْجِبُنَا اَفَتَرٰی اَنْ نَكْتُبَ بَعْضَهَا؟ فَقَالَ اَمُتَهَوِّكُوْنَ اَنْتُمْ كَمَا تَهَوَّكَتِ الْیَهُوْدُ وَالنَّصَارٰی ؟ لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَیْضَآءَ نَقِیَّةً وَلَوْ كَانَ مُوْسٰی حَیًّا مَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ (رواہ احمد والبیهقی فی کتاب شعب الایمان)

أخرجه أحمد فی السمند۳/۳۸۷۔ وذکره البیهقی تعلیقًا فی شعب الایمان فی الحدیث ۱۷۶ وأورده بطرق أخری حدیث ۱۷۷۔ (۱/۱۹۹۔۲۰۰)۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے یہ رسول اللہ ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم لوگ یہودیوں سے احادیث سنتے ہیں اور وہ ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ کیا آپ ﷺ ہمیں اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ ہم ان میں سے بعض کو لکھ لیا کریں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم بھی اس طرح حیران ہو جس طرح یہود و نصاریٰ حیران ہیں اور تم اس بات کو اچھی طرح جان لو کہ میں تمہارے پاس صاف اور واضح شریعت اور دین لے کر آیا ہوں۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو وہ بھی میری ہی اتباع اور پیروی

کرتے۔اس حدیث کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله:انا نسمع احاديث من يهود تعجبنا ......اليهود والنصارى :

لفظ ''یہود'' کی تحقیق:

زمخشری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لفظ یہود اور مجوس میں اصل یہ ہے کہ ان کو معرف بالام نہ پڑھا جائے، چونکہ یہ دو قوموں کے علم ہیں، اور جنہوں نے ان دونوں کو معرف پڑھا، تو بمنزلہ شعیر اور شعیرہ کے پڑھا۔

ابہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہود علیت اور تانیث کی وجہ سے غیر منصرف ہے، چونکہ یہ قبیلہ کے قائم مقام ہے۔بعض کا کہنا ہے کہ اولیٰ یہ ہے کہ علیت اور وزن فعل ہے۔ چونکہ قبائل کے ان اسماء کہ جن میں تانیث لفظی نہ ہو، کو "حی" کی تاویل میں منصرف اور "قبیلة" کی تاویل میں مان کر غیر منصرف دونوں طرح پڑھنا درست ہے اور یہود کو صرف غیر منصرف پڑھنا ہی درست ہے۔

قوله:لقد جئتكم بها بيضاء نقية ......الا اتباعي:

'' لقد جئتكم ''قسمِ محذوف کا جواب ہے۔ بیضاء : بہا کی ضمیر سے حال ہے۔بمعنی واضحة۔امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بیضاء نقیہ دونوں حال مترادفہ ہیں، 'بہا' کی ضمیر سے۔

'گزشتہ انبیاء کرام اس دنیا میں تشریف لائے اپنی اپنی امتوں کو اللہ کا دین سمجھایا بعض نے مانا اور اکثریت نے انکار کردیا پھر جن لوگوں نے مانا وہ امت قرار پائے لیکن آہستہ آہستہ انہوں نے جو مانا اور تسلیم کیا تھا اس سے انحراف کرنا شروع کردیا تا آنکہ اللہ نے دوسرے نبی کو مبعوث فرمادیا اور اس کی امت نے بھی وہی کچھ کیا جو اس سے پہلے آنے والے نبی ورسول کی امت نے کیا تھا اس طرح ہوتے ہوتے آج یہود ونصاریٰ جو اس وقت موجود ہیں نام تو اپنے نبی کا استعمال کرتے ہیں لیکن اپنے نبی کی تعلیم کو مکمل بھول چکے ہیں اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں حیران وپریشان ہیں جیسا کہ حقیقت میں صحیح بات کے گم ہو جانے سے انسان کی حالت ہوتی ہے وہ تو حیران وپریشان ہیں ہی کہ ان کے نبی ورسول اُن کے پاس موجود نہیں اور وہ اس تعلیم کو ماننے کے لئے تیار نہیں جو میں لایا ہوں حالانکہ میری تعلیم بھی من وعن وہی ہے جو وہ لائے تھے اور جس کو ان کی قوم میں گم کر کے حیران وششدر ہیں کیا تم میری موجودگی ہی میں وہ حالت اختیار کرنا چاہتے ہو کہ ان بناوٹی باتوں کو سنو اور ان پر اکتفا کرو اور ان کو سچ جانو حالانکہ ان میں سچ نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر جب میں بنفس نفیس ابھی تمہارے اندر موجود ہوں تو تم آج ہی اس طرح کی باتیں کررہے ہو تو آنے والے کل کیا ہوگا جب میں تم میں موجود نہ رہا فرمایا سن لو اور کان کھول کر سن لو کہ جو کچھ میں تمہارے پاس لایا ہوں وہ بالکل صاف اور شفاف ہے۔اگر اس وقت موسیٰ علیہ السلام دنیا میں موجود ہوتے تو وہ ان باتوں کو قبول کرتے اور ان پر کان دھرتے اور ان کو یہ باتیں بھلی معلوم ہوتیں اور تعجب ہے کہ تم ان حقیقی اور اصل باتوں کو چھوڑ کر اس جھوٹ پر کان دھرنے کے لئے تیار ہو جو جھوٹ اہل کتاب نے اپنے انبیاء کرام کے بعد اپنے دین میں داخل کیا اور اس کو بطور دین وہ تمہارے سامنے بیان کرتے ہیں حالانکہ وہ خود اپنے اصل اور حقیقی دین سے واقف نہیں ہیں بلکہ انہوں نے دین کی حقیقی روح کو ضائع کردیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ......﴾ [ال عمران: ۸۱] ''اور جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور دانائی عطا کروں پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرے تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا۔'' حضرت علیؓ بن ابی طالب فرماتے ہیں:

لم يبعث الله تعالىٰ آدم ومن بعده الا أخذ عليه العهد فى أمر محمد ﷺ ، أخذ العهد على قومه ليؤمنن به، ولئن بعث وهم أحياء لينصرنه۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بات کا مطلب یہی ہے (كذا فى تفسير البغوى)۔ رسول کی تنکیر برائے تعظیم ہے لہٰذا وہ نبی الانبیاء اور امام الرسل ٹھہرے، اس وجہ سے فرمایا: **آدم ومن دونه تحت لوائى يوم القيامة**۔

اسنادی حدیث: ابہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کے راوی مجالد بن سعید ضعیف ہیں۔ ابن حبان رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ یہ ردیٔ الحفظ تھے، اسانید میں قلب کیا کرتے تھے، اور مراسیل کو مرفوع بنا دیا کرتے تھے، ان کی روایات سے احتجاج درست نہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حرام بن عثمان سے أخذ حدیث ''حرام'' ہے اور مجالد سے أخذ حدیث **''تجالد''** (کھیلنا، لڑنا) ہے اور أبوالعالیہ الریاحی سے أخذ حدیث ''ریاح'' ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حديث مجالد حلم، یہ حدیث چونکہ مجالد کے علاوہ دوسرے راویوں سے بھی مروی ہے، اس سے اس حدیث کو تائید ہوتی ہے۔

جس کی زیادتیوں سے لوگ امن میں ہوں وہ جنت میں داخل ہوگا

۱۷۸: وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ نِالْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَكَلَ طَيِّبًا وَّعَمِلَ فِیْ سُنَّةٍ وَّاَمِنَ النَّاسُ بَوَائِقَهٗ دَخَلَ الْجَنَّةَ فَقَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ هٰذَا الْيَوْمَ لَكَثِيْرٌ فِی النَّاسِ؟ قَالَ : وَسَيَكُوْنُ فِیْ قُرُوْنٍ بَعْدِیْ ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذى ٤/٥٧٧ حديث رقم ٢٥٢٠۔ وقال حديث غريب لا تعرفه۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس انسان نے رزق حلال کھایا اور سنت کے مطابق عمل کیا اور اس کی زیادتیوں سے لوگ امن میں ہوں تو وہ انسان جنت میں داخل ہوگا ایک آدمی نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایسے لوگ تو آج کل بہت ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے بعد بھی ایسے لوگ ہوں گے۔ اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: **من أكل طيبا وعمل فى سنة** :

من أكل طيبا : یعنی جس شخص کی روزی حلال ہے **عمل فى سنة** : اس کا عمل سنت کے موافق ہے۔ اس کا ہر ہر قول وفعل

شریعت کے مطابق ہے۔ ہر کام میں سنت کا دامن گیر ہو، خواہ سنت کیسی ہی کیوں نہ ہو، حتی کہ قضائے حاجت اور اماطۃ الأذی میں بھی سنت کا متبع ہو، قصہ مختصر یہ کہ یہاں سنت سے مراد عام ہے۔ تمام سنتیں مراد ہیں۔ کوئی خاص سنت مراد نہیں ہے۔

حلال روزی کو مقدم کیا گیا، چونکہ عمل صالح اسی کے مرہونِ منت صادر ہوتا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا﴾ [المؤمنون:٥١] ''پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو جو عمل تم کرتے ہو میں ان سے واقف ہوں''۔

ان هذا: مشار الیہ محذوف ہے اور مراد رجل مذکور ہے۔ (الیوم): 'ان' کی خبر کیلئے ظرف ہے۔

قوله: وأمن الناس بوائقة: ''بوائق'' بائقة کا جمع ہے۔ ایک حدیث میں اس کی تشریح ظلمه وغشه مروی ہے۔ یہاں بوائق سے مراد شرور ہیں۔ اس جملہ کی مکمل تشریح، مرقات جلد ہشتم، حدیث: ۶۳/۴۹۶۲ کے تحت ملاحظہ فرمایئے۔

قوله: دخل الجنة: یعنی ان صفات سے متصف شخص کو جنت میں دخول اولیٰ حاصل ہوگا۔

قوله: یارسول الله ان هذا ...... قرون بعدی:

صاحب الازہار لکھتے ہیں: القرن اهل العصر۔ وقیل اهل کل مدة وطبقة، وقیل: ثلاثون سنة، وقیل: أربعون، وقیل: ثمانون، وقیل: مائة اھ۔

اصح یہ ہے کہ قرن سے مراد اہلِ عصر ہیں۔ کیونکہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ سے دور ہونے والے ہر زمانہ میں صلحاء کی تعداد اپنے سے پچھلے زمانہ کے صلحاء سے کم ہوتی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم۔ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی صحابہ کرامؓ کے استجاب کی نفی ہے۔ (کذا قیل)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس جملہ میں بعد والوں کو (یعنی تابعین اور ان کے بعد قیامت تک آنے والے مؤمنین) کو تسلی دی ہے۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ ارشادِ گرامی اللہ جل شانہ کی حمد اور تحدیث بالنعمہ کے طور پر ارشاد فرمایا ہو۔ لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس صفت سے متصف افراد اس زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ بعد کے زمانوں میں بھی ہوں گے۔

دین کے دسویں حصے پر بھی عمل نہ کرنا ہلاکت ہے

۱۷۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّكُمْ فِیْ زَمَانٍ مَنْ تَرَكَ مِنْكُمْ عُشْرَ مَا اُمِرَ بِهٖ هَلَكَ ثُمَّ یَاْتِیْ زَمَانٌ مَنْ عَمِلَ مِنْهُمْ بِعُشْرِ مَا اُمِرَ بِهٖ نَجَا. (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/٤٥٩ حدیث رقم ٢٢٦٧ وقال غریب لانعرفه الامن حدیث نعیم بن حماد بن سفیان بن عیینة۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ ایسے

زمانے میں ہو کہ اگر تم میں سے کوئی آدمی ان احکام کا دسواں حصہ بھی ترک کر دے جو مجھے عطا کیے گئے ہیں تو وہ ہلاک ہو جائے گا لیکن آئندہ ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ اگر کوئی آدمی ان احکام کے دسویں حصہ پر بھی عمل کرے گا تو وہ نجات پا جائے گا۔ اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: انكم في زمان من ترك منكم عشر ما أمر به هلك :

تم ایسے عظیم دور سے گزر رہے ہو کہ جس میں اسلام کو شان و شوکت حاصل ہے، اہلِ اسلام کو امن و سکون حاصل ہے، وحی کا سلسلہ جاری وساری ہے اور اپنے نبی سے وحی کا سماع کرتے ہو، چنانچہ ایسے سنہری دور میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اگر دسواں حصہ بھی چھوڑ و گے تو تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ چونکہ دین کو غلبہ حاصل ہے، حق ظاہر ہو چکا ہے، اس کے مددگار بڑی تعداد میں ہیں، لہٰذا امر بالمعروف، نہی عن المنکر کا ترک تمہاری کوتاہی شمار ہوگا، اس تہاون کے باعث تمہیں معذور قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ما مور بہ کی راجح تشریح وہی ہے جو پچھلی سطروں میں گزری۔ البتہ شراح کا کلام حسب ذیل ہے۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ما أمر به سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مراد ہے۔ عام ما مورات مراد لینا درست نہیں، کیونکہ ان کے سلسلہ میں یہ بات معروف ہے کہ کسی بھی فرضِ عین میں کوتاہی کسی بھی مسلمان کے حق میں عذر نہیں ہے۔ (هكذا قاله الشراح)

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: شاید کہ یہ (کلام) باب التمسك بالكتاب والسنة، کے ساتھ مناسبت نہ رکھتا ہو۔ اھ لیکن یہ محل نظر ہے چونکہ امر بالمعروف کا پتہ چلتا ہی ان دونوں کے ذریعہ ہے۔ مزید فرماتے ہیں: بل لو حمل على مامرّ في الحديث السابق، وهو من عمل في سنة على ما بيّنا كان أنسب ويدخل فيه الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر بالطريق الأولى، ويجري معنى قوله: ما امر به في امر الندب اھ ''اگر اس کو اس معنی پر معمول کیا جائے جو پچھلی حدیث میں گزرا کہ جس نے سنت پر عمل کیا...... جیسا کہ ہم نے تفصیل ذکر کی ہے اور اس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بطریق اولی داخل ہوگا اور ''ما امر به'' امر ندب پر محمول ہوگا۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ اس عبارت پر نقد فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: یہ محلِ نظر ہے، چونکہ ترک مندوب پر ہلاکت کی وعید تو سرے سے نہیں، چہ جائیکہ دسواں حصّہ چھوڑنے پر ہلاکت کی وعید ہو۔ ابن حجر رحمہ اللہ کا کلام بھی ان دونوں جگہوں پر اسی کے موافق ہے۔

ثم يأتي زمان من عمل منهم...... : یعنی پھر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ جس میں دینِ اسلام کمزور پڑ جائے گا۔ ظلم و بربریت کا دور دورہ ہوگا، فساق کا راج ہوگا، دین کے حمایتی تھوڑے ہوں گے، چنانچہ ان حالات میں اگر مسلمان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دسویں حصہ پر بھی عمل کریں گے، تو ان کے عدیم القدرۃ ہونے کی وجہ سے انہیں معذور سمجھا جائے گا، نہ کہ تقصیر کی وجہ سے۔

عرض مرتب: اس حدیث مبارکہ کی ایک تشریح حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس سرہ سے بھی مروی ہے۔ فرمایا: یہ دسواں حصّہ کمیت کے اعتبار سے نہیں (بلکہ) کیفیت کے اعتبار سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ما مور بہ جس کیفیت خلوصیہ

کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا اگر اس کا دسواں حصہ بھی اداء ہو جائے گا تو نجات کیلئے کافی ہوگا۔

(بحوالہ اشرف الاحکام ص: ۱۵۰، عنوان: ۲۰۷، اوامر کے دسویں حصہ پر عمل کا مفہوم)

دینی معاملات میں جھگڑا نہیں کرنا چاہیئے

۱۸۰: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ هُدًى كَانُوْا عَلَيْهِ اِلَّا اُوْتُوا الْجَدَلَ ثُمَّ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ مَاضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة)

أخرجه أحمد في المسند ٥/٢٥٢ وأخرجه الترمذی ٥/٣٥٣ حديث ٣٢٥٣ وقال حسن صحيح ۔ وأخرجه ابن ماجة ١/١٨ حديث رقم ٤٨ ۔

ترجمہ: حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہدایت حاصل کرنے اور ہدایت پانے کے بعد کوئی قوم گمراہ نہیں ہوئی مگر اس وقت جب کہ اس میں جھگڑا ظاہر ہوا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی ماضر بوہ لك الا جدلا بل هم قوم خصمون ۔ کہ وہ تمہارے لئے نہیں بیان کرتے مثال مگر جھگڑنے کے لئے بلکہ وہ شدید جھگڑا کرنے والی قوم ہے۔ اس حدیث کو امام احمدؒ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: ما ضل قوم بعد......اوتوا الجدل:

أوتوا الجدل: حال ہے، اور "قد" مقدر ہے، مستثنیٰ منه أعم عام الأحوال ہے اور ذوالحال خبر کان' میں مستتر ضمیر ہے۔ عبارت کی معنوی تقدیر یوں ہے: ما كان ضلالتهم ووقوعهم في الكفر الا بسبب الجدال۔

ابن الزبعری نے رسول ﷺ سے اس آیت کریمہ: ﴿انكم وما تعبدون من دون الله حصب جهنم﴾ [الانبياء: ۹۸] میں جھگڑا کیا، اور کہنے لگا کہ تمہارے نزدیک ہمارے آلہہ یعنی ملائکہ بہتر ہیں یا عیسیٰ؟ پس اگر وہ آگ میں جائیں گے تو ہمارے آلہہ بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ اللہ اعلم۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس سے ملتی جلتی بات ذکر کی ہے۔

اس شبہ کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ "ما" غیر ذوی العقول کیلئے استعمال ہوتا ہے، چنانچہ اس اشکال کا منشاء قواعد عربیہ سے ناواقف ہونا ہے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور ملائکہ اس حکم سے مخصوص ہیں اور دلیل مخصص یہ آیت کریمہ ہے: ﴿ان الذين سبقت لهم منا الحسنى أولئك عنها مبعدون﴾۔

اپنے آپ کو مشقت میں نہ ڈالو

۱۸۱: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ لَا تُشَدِّدُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ فَيُشَدِّدُ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاِنَّ قَوْمًا شَدَّدُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ فَشَدَّدَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ فَتِلْكَ بَقَايَاهُمْ فِی الصَّوَامِعِ وَالدِّيَارِ

رَهْبَانِيَّةً اِبْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداؤد من حديث طويل ٥/٢٠٩ حديث رقم ٤٩٠٤۔

ترجمه: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ تم اپنی جانوں پر سختی اور مشقت نہ کرو۔ اس لئے کہ پھر اللہ تعالیٰ بھی سختی کرے گا اور بنی اسرائیل کی قوم نے اپنے اوپر سختی کی تھی۔ پھر اس کے نتیجہ میں اللہ نے بھی ان پر سختی کی۔ پس آج جو لوگ گرجوں اور کنیسوں میں پائے جاتے ہیں یہ ان ہی لوگوں نے اختراع کر لیا ہے، ہم نے ان پر فرض نہیں کیا۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: كان يقول: لا تشددوا على انفسكم: "كان" سے اشارہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کوئی ایک آدھ بار نہیں فرمائی بلکہ یہ بات مسلسل فرمایا کرتے تھے کہ تم اپنے نفس پر اعمال شاقہ، مثلاً صوم الدہر، شب بیداری بیویوں سے علیحدگی وغیرہ کے ذریعہ سختی مت کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ عبادت میں کمزوری آ جائے، حقوق و فرائض کی ادائیگی میں سستی آ جائے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر یہ اعمال فرض کر دے اور تم سختی میں پڑ جاؤ، یا یہ کہ اعمالِ شاقّہ کی بدولت تمہارے فرائض چھوٹنے لگیں۔ (كذا قاله الشراح)

حدیث مبارکہ کے اس جملہ کے یہ معنی زیادہ ظاہر ہیں کہ اپنی جانوں پر سختی مت کرو، بایں طور کہ یمین و نذر کے ذریعے اپنے اوپر ہر مشقت عبادات لازم کرتے چلے جاؤ، اگر تم ایسا کرو گے تو اللہ تعالیٰ بھی تم پر سختی کریگا۔ بایں طور کہ جو چیز تم نے خود اپنے اوپر لازم کی ہے اللہ بھی وہ چیز تم پر لازم کر دیگا۔ پھر تم اس کی بجا آوری میں کمزوری کے سبب ان اعمال سے اکتا جاؤ گے اور سستی کرنے لگو گے پھر ایک وقت ایسا آئے گا کہ تم ان اعمال کے تارک ہو جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ یہ بیان کردہ تشریح اگلی تعلیل **فإن قوما شددو......** کے پیش نظر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

قوله: فان قوما شددوا على أنفسهم فشدد الله عليهم:

قوم سے مراد بنی اسرائیل ہے، یعنی بنی اسرائیل نے اپنے نفس پر سختی کی بایں طور کہ مجاہدے اور پر مشقت ریاضتیں اور عبادات شاقّہ اپنے اوپر لازم کر لیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی بجا آوری کے سلسلے میں ان پر سختی کی، بعض حضرات نے ایک اور تشریح ذکر کی ہے وہ یہ کہ جب انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی، اس گائے کا رنگ کیا ہو؟ اس کی عمر کیا ہو وغیرہ وغیرہ۔ تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی کہ ایک ایسی گائے ذبح کرنے کا حکم دیا کہ اسی طرح کی صرف ایک ہی گائے پائی جاتی تھی، اور پھر وہ گائے ملی بھی اس قدر مہنگی کہ گائے کے مالک نے گائے کی کھال کی بھرائی کے بقدر سونا مانگا۔

حدیث مبارکہ کے اس جملہ کی پہلی تشریح کی تائید اگلے کلام **فتلك بقاياهم** سے بھی ہوتی ہے۔

قوله: فتلك بقاياهم في الصوامع والديار:

"**تلك**" سے ذہن میں موجود اس جماعت کے متشدد افراد کے تصور کی طرف اشارہ ہے، اس کی تفسیر "**بقايا هم**" سے فرمائی۔

"**الصوامع**": **صومعة** کی جمع ہے، نصاریٰ راہبوں کی عبادت گاہ کو کہا جاتا ہے۔ بعض کا کہنا ہے صومعہ، دائرہ نما چھوٹی سی

عمارت کو کہا جاتا ہے۔

''الدیار'': دیر کی جمع ہے، ''دیر'' کنیسہ کو کہتے ہیں، یعنی یہود کی عبادت گاہ۔ بعض کا کہنا ہے کہ ''دیر'' اس وسیع وعریض عمارت کو کہتے ہیں جس میں عبادت کیلئے ایک جگہ ہو اور باقی حصہ راہ گیروں اور مسافروں کے قیام کیلئے ہو۔

قوله: ﴿ رهبانية ابتدعوها ما كتبناها عليهم﴾:

''رهبانية'' منصوب ہے، اس کا ناصب مابعد فعل مقدر ہے۔ أي: ابتدعوا رهبانية ابتدعوها۔ رهبانية: راء کے فتحہ کے ساتھ، رہبان کی طرف منسوب ہے۔ رہبان بروزن ہمدان، ہے۔ رهب رهبة بمعنی خوف سے مشتق ہے اور رُهبان راء کے ضمہ کے ساتھ، راہب کی جمع ہے۔ قراءت شاذہ میں ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ بعض کا کہنا ہے: الرهبة الخوف والمبالغة في العبادة والرياضة والانقطاع عن الناس، ويطلق على عبادة الرهبان؛ وهو جمع الراهب أي: عابد النصارٰى وهي ما يفعلون من تلقاء انفسهم۔ (رہبۃ کے معنی خوف عبادت وریاضت میں مبالغہ اور لوگوں سے کٹ جانا ہے۔ اس کا اطلاق رہبان کی عبادت پر بھی ہوتا ہے۔ رہبان راہب کی جمع ہے۔ راہب نصرانی عابد کو کہتے ہیں۔ رہبۃ ان امور کو بھی کہا جاتا ہے جو یہ لوگ اپنی طرف سے بجالاتے ہیں۔ ان کے خودساختہ امور کو بھی کہتے ہیں۔

قرآن پانچ قسم کی آیات پر مشتمل ہے

۱۸۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَزَلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰى خَمْسَةِ اَوْجُهٍ حَلَالٍ وَّحَرَامٍ وَّمُحْكَمٍ وَمُتَشَابِهٍ وَّاَمْثَالٍ فَاَحِلُّوا الْحَلَالَ وَحَرِّمُوا الْحَرَامَ وَاعْمَلُوا بِالْمُحْكَمِ وَاٰمِنُوْا بِالْمُتَشَابِهِ وَاعْتَبِرُوْا بِالْاَمْثَالِ هٰذَا لَفْظُ الْمَصَابِيْحِ. (وَروى البيهقي في شعب الايمان) ولفظه: فَاعْمَلُوْا بِالْحَلَالِ وَاجْتَنِبُوا الْحَرَامَ واتَّبِعُوا الْمُحْكَمَ......۔

مصابيح السنة ١/١٦٤ حديث رقم ١٤٤۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قرآن کریم پانچ قسم کی آیتوں پر نازل ہوا ہے۔ نمبر۱ حلال نمبر۲ حرام نمبر۳ محکم نمبر۴ متشابہ نمبر۵ امثال لہٰذا تم حلال کو حلال جانو اور حرام کو حرام سمجھو۔ محکم پر عمل کرو متشابہ پر ایمان لاؤ اور امثال سے عبرت حاصل کرو۔ یہ الفاظ مصابیح کے ہیں اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے جو روایت شعب الایمان میں نقل کی ہے اس کے یہ الفاظ ہیں۔ لہٰذا حلال پر عمل کرو۔ حرام سے اجتناب کرو اور محکم کی پیروی کرو۔

تشریح: قوله: نزل القرآن على خمسة اوجه......وامثال:

''حلال'': مجرور ہے۔ اپنے معطوفات سے مل کر قبل از ربط بدل ہے۔

جیسا کہ یہ آیات کریمہ: ① ﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾ [البقرة: ١٧٢] ''جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو عطا فرمائی ہیں ان سے کھاؤ'' ② ﴿اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ﴾ [المائدة: ٤] ''(ان سے) کہہ دو کہ سب پاکیزہ

چیزیں تم کو حلال ہیں۔"
اور ان جیسی دیگر آیات۔

حرمت میں نازل ہونے والی آیات: ① ﴿إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ [البقرة: ۱۷۳] "اس نے تم پر مرا ہوا جانور اور لہو اور سور کا گوشت اور جس چیز پر خدا کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے حرام کر دیا ہے، ہاں جو نا چار ہوئے (بشرطیکہ) خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک خدا بخشنے والا (اور) رحم کرنے والا ہے" اور اس جیسی کئی آیات۔

اور آیاتِ محکمہ کی مثال یہ آیت ہے: ﴿قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ﴾ [الانعام: ۱۵۱] "کہہ کہ (لوگو) آؤ میں تمہیں وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جو تمہارے پروردگار نے تم پر حرام کی ہیں۔"

علاوہ ازیں امر و نہی اور موعظہ۔ آیاتِ متشابہ کی ایک مثال یہ آیت ہے: ﴿وَجَاءَ رَبُّكَ﴾ [الفجر: ۲۲] علاوہ ازیں بے شمار مثالیں ہیں۔

امثال سے مراد بعض کے نزدیک سابقہ اُمتوں کے قصے ہیں، مثلاً قومِ نوح اور صالح وغیرہ کے قصص اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ امثال سے مراد اس جیسی آیات ہیں: ﴿مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ ۖ﴾ [العنکبوت: ۴۱] "جن لوگوں نے خدا کے سوا (اوروں کو) کارساز بنا رکھا ہے ان کی مثال مکڑی کی سی ہے" امثال سے اس جیسی آیات مراد ہونے پر دلیل اس آیت کا مابعد یہ حصہ ہے: ﴿وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ﴾ [العنکبوت: ۴۳] "ہم یہ مثالیں لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے بیان کرتے ہیں اور اسے تو اہلِ دانش ہی سمجھتے ہیں۔"

قولہ: فاحلوا الحلال، وحرموا الحرام...... واعتبروا بالامثال:

قولہ: هذا لفظ المصابيح......:

دینی اُمور کی تین قسمیں ہیں

۱۸۳ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاَمْرُ ثَلَاثَةٌ اَمْرٌ بَيِّنٌ رُشْدُهٗ فَاتَّبِعْهُ وَاَمْرٌ بَيِّنٌ غَيُّهٗ فَاجْتَنِبْهُ وَاَمْرٌ اُخْتُلِفَ فِيْهِ فَكِلْهُ اِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ . (رواہ احمد)

لیس عند أحمد فی المسند وقد أخرجه الطبرانی فی الکبیر۔ مع بعض التغییر۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ دینی امور تین قسم کے ہیں۔ ① وہ امر جس کی ہدایت واضح ہو اس کی پیروی اور اتباع کرو۔ ② وہ امر جس کی گمراہی ظاہر ہو اس سے اجتناب کرو ③ وہ امر جس میں اختلاف ہو اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرو۔ اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قولہ: قال رسول اللہ ﷺ الامر ثلاثة :

قوله: امر بین رشده فاتبعه......:

"اختلف": صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے، اور سید کے نسخہ میں ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ضبط کیا گیا ہے۔ لیکن اُولیٰ یہ تھا کہ ضمہ لکھا ہوا نہ ہوتا۔ یا سرخی کے ساتھ لکھا ہوتا، تا کہ ہمزہ وصلی اور قطعی کے درمیان فرق ہو جاتا۔ حتیٰ کہ مصحف میں بھی، مثلاً ان آیات میں: ﴿القارعة﴾ [القارعة : ١] ﴿الهاكم التكاثر﴾ [التكاثر: ١] ہمزہ مضمومہ اگر ابتداء میں ہو تو اختلاف ہے اور جب "درج" میں ساقط ہو تو کسرہ اور ضمہ کی تنوین بھی درست ہوتی ہے۔ **قوله : فكله** : امر کا صیغہ ہے و کل یکل سے۔

احکامِ شریعہ تین طرح کے ہیں:

① وہ امور کہ جن کا درست وہدایت ہونا ظاہر ہے۔ مثلاً اصولی عبادات، جیسا کہ نماز روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ کا وجوب۔

② وہ امور کہ جن کا گمراہی ہونا واضح ہے، مثلاً اہلِ کتاب کے ساتھ ان کی عید میں موافقت کرنا (قاله ابن الملك) اور زیادہ مناسب یہ تھا کہ پہلے کی مثال اصول عقائد مثلاً توحید، نبوت وقیامت وغیرہ دیتے اور دوسرے کی مثال قتلِ نفس اور زنا وغیرہ دیتے۔

③ وہ امور جو مختلف فیہ ہوں۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ممکن ہے کہ اس سے مراد امر مشتبہ اور مخفی الحکم ہو۔ ایک احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد اختلاف علماء یعنی ادلہ کا اختلاف ہو۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس حدیث کی تشریح میں وہی بات کہنا اُولیٰ ہے جو فصل ثالث کے آخر میں اُبوثعلبہ کی روایت میں آ رہی ہے۔ اھ۔

بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد وہ امورِ شرعیہ ہیں جن کو شریعت نے (کھول کر) بیان نہیں کیا، مثلاً متشابہات۔ ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس سے مراد وہ مختلف فیہ امور ہیں کہ جن میں لوگوں نے اپنی طرف سے اختلاف کیا، نہ ان کو اللہ نے بیان کیا اور نہ اللہ کے رسول نے مثلاً قیامت کے وقت کی تعیین۔ کفار کے (نابالغ) بچوں کا (دخولِ جنت ونار کے اعتبار سے) حکمِ شرعی۔

مختلف فیہ امور کو اللہ کے سپرد کرو کا مطلب یہ ہے کہ ان امور میں نفیاً یا اثباتاً کوئی بھی بات مت کرو۔

الفصل الثالث:

شیطان انسان کے لئے بھیڑیا ہے

۱۸۴: عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الشَّيْطَانَ ذِئْبُ الْاِنْسَانِ كَذِئْبِ الْغَنَمِ يَأْخُذُ الشَّاذَّةَ وَالْقَاصِيَةَ وَالنَّاحِيَةَ وَاِيَّاكُمْ وَالشِّعَابَ وَعَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَالْعَامَّةِ (رواه احمد)

أخرجه أحمد في المسند ٥/٢٤٣۔

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان آدمی کا بھیڑیا ہے جس طرح بکری کا بھیڑیا ہوتا ہے کہ وہ اس بکری کو پکڑ لیتا ہے جو ریوڑ سے بھاگ گئی ہو یا ریوڑ سے دور چلی گئی ہو یا

ریوڑ کے کنارے پر ہو اور تم لوگ ضلالت کی گھاٹیوں سے بچو۔ نیز جماعت اور عام لوگوں کو پکڑے رہو۔ اس حدیث کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قولہ: ان الشیطان ذئب الانسان کذئب الغنم :

ہمزہ کے ساتھ ہے، یاء کے ساتھ بدل کر بھی پڑھا جاتا ہے۔

قولہ: یأخذ الشاذة و القاصیة و الناحیة :

"یأخذ": ظاہر یہ ہے کہ جملہ مستانفہ مبینہ ہے۔ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ صفت ہے، الذئب بمنزلہ نکرہ کے ہے، کمثل الحمار کی طرح اور یہ بھی ممکن ہے کہ حال ہو، اور عامل معنیٰ تشبیہ ہو۔ اھ۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: آیت کے بارے میں بیان کردہ بات تو درست ہے، البتہ حدیث میں مطلق رکھنا مقید سے بہتر ہے۔

"الشاذة": ذال معجمہ کی تشدید کے ساتھ ہے۔ وہ بکری جو دوسری بکریوں کے ساتھ مأنوس نہ ہونے کی وجہ سے ان سے علیحدہ رہتی ہو۔

"القاصیة": وہ بکری جو چارہ وغیرہ چرنے کیلئے ریوڑ سے علیحدہ ہو، نا کہ عدمِ انس کی وجہ سے۔

الناحیة: وہ بکری جو ریوڑ کے کنارے پر ہو اور چرواہے کی توجہ بھی اس کی طرف نہ ہو۔

ابہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ تحقیق امام طیبی کی تھی۔ ان کے کلام کا ظاہر یہ ہے کہ الناحیة حائے مہملہ کے ساتھ ہے۔ صاحب النہایہ باب النون مع الجیم کے تحت لکھتے ہیں: النجاء، السرعة، یقال: نجاینجو اذا أسرع، ونجا من الامر اذا خلص وانجی وغیرہ۔ ومنه انما یأخذ الذئب القاصیة والشاذة والناجیة، ای السریعة، ھکذا روی عن المحربی بالجیم اھ۔ مذکورہ بالا کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ معتمد علیہ روایت حاء کے ساتھ ہے، اور جیم والی روایت شاذ ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے مشکوۃ کے تمام نسخے "حاء" کی روایت پر متفق ہیں۔ واللہ اعلم

قولہ: وایاکم والشعاب: "شعاب" کو مجرور و منصوب دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے۔ شعاب "شعب" کی جمع ہے۔ پہاڑوں کی گھاٹیاں (عام طور پر) درندوں، حشرات الارض، ڈاکوؤں، چوروں، اور جنات کی آماجگاہ ہوتی ہیں۔

قولہ: وعلیکم بالجماعة و العامة :

تمہارے اوپر جمہور اہلِ سنت والجماعت کی متابعت لازم ہے، یا یہ کہ عام مسلمانوں کے ساتھ گھل مل کر رہو، ان سے علیحدگی اختیار کرنے سے بچو، ایسا نہ کرنا کہ آبادیوں کو چھوڑ کر دور دراز پہاڑوں اور ان کی گھاٹیوں پر ڈیرے ڈالنے لگو۔ یہ مفہوم، تمثیل کے الفاظ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے اور پہلا مفہوم معنیٰ کے اعتبار سے زیادہ موافقت رکھتا ہے، واللہ اعلم۔

جو جماعت سے الگ ہوا اس نے اسلام کا پٹہ گردن سے اتار دیا

۱۸۵: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهٖ ۔ (رواہ احمد وابوداود)

أخرجه أبو داؤد في السنن ٥/١١٨ حديث رقم ٤٧٥٨ وأحمد في المسند ٥/١٨٠۔

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی جماعت سے ایک بالشت بھی الگ ہوا (یعنی ایک گھڑی کے لیے بھی) اس نے اسلام کا پٹہ اپنی گردن سے اتار دیا۔ اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ اور امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **قوله: من فارق الجماعة شبرا:**

یعنی جو شخص اہلِ سنت والجماعت سے گھڑی بھر کیلئے باہر نکلے اگرچہ شریعت کے قلیل مسائل میں ہی نکلے' گویا اس نے اپنے گلے سے اسلام کا پٹا اُتار دیا۔ ابہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مفارقتِ جماعت سے مراد سُنت کو ترک کر کے بدعت کو اختیار کرنا ہے۔ اھ اور ظاہر یہ ہے کہ مفارقتِ جماعت سے مراد جماعت کے اجماع کا ترک ہے اور اس کی تائید اس اگلے جملہ سے بھی ہوتی ہے۔

قوله: فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه:

الا یہ کہ اسلام کو کمالِ اسلام پر محمول کیا جائے۔ یا مبالغہ فی التخویف ہو اور مفارقت جماعت سے ڈرانا اور نفرت دلانا مقصود ہے اور یہ کہ اس عمل پر مداومت خلع حقیقی کی طرف مفضی ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **الربقة: عروة في حبل تجعل في عنق البهيمة أويدها تسكها۔** ''ربقہ رسّی کے اس پھندے کو کہتے ہیں جو جانور کے گلے میں یا پاؤں میں ڈالا جاتا ہے پھر اس کو استعارۃً استعمال کیا۔ احکامِ شریعت کے انقیاد واستسلام کیلئے اور پٹہ اُتار دینے کو ارتداد اور **خروجه عن طاعة الله وطاعة رسوله** سے تعبیر کیا ہے۔

جس نے کتاب اللہ اور سنت کو لازم پکڑا وہ گمراہ نہیں ہوگا

۱۸۶: **وَعَنْ مَالِكِ بْنِ اَنَسٍ مُرْسَلاً قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّةُ رَسُوْلِهِ** (رواه في المؤطا)

أخرجه مالك في الموطا ٢/٨٩٩ ٣ من كتاب القدر۔

ترجمہ: حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے مرسلاً روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ جب تک تم ان کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہیں ہو سکتے اور وہ ہے کتاب اللہ یعنی قرآن مجید اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث کو امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں روایت کیا ہے۔

تشریح: **قوله: كتاب الله وسنة رسول الله:**

''کتاب'' منصوب علی البدلیت ہے یا أعنی فعل مقدر کیلئے مفعول بہ ہے۔ بعض کا کہنا ہے مبتداء محذوف کیلئے خبر ہے۔

یعنی میں تمہارے درمیاں دو ایسی چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں جو عظیم الشان بھی ہیں' اور حُکم کا درجہ بھی رکھتی ہیں۔ جب تک تم ان دونوں چیزوں کو بیک وقت تھامے رہو گے' گمراہی میں نہیں پڑو گے۔

اسلوب کا تقاضا یہ تھا کہ کلام یوں ہوتا: کتاب اللہ و سنتی۔ مگر یہ عدول سنت کی اہمیت وفضیلت میں مبالغہ کے پیشِ نظر اختیار فرمایا اور ساتھ ساتھ تمسکِ سنت کا سبب بھی ذکر فرمایا۔ کہ میری سنت کو اس وجہ سے تھامنا ہے کہ میں اللہ کا خلیفہ ہوں، اور اس کا رسول ہوں اور یہ کہ میری سنت میری اپنی طرف سے نہیں ہے بلکہ از روئے رسالت کے ہے۔

قولہ: رواہ فی المؤطا: یہاں تقدیری عبارت یوں بنتی ہے: **رواہ مالك عن مالك فی المؤطا۔**

مصنف رحمۃ اللہ علیہ کو یہ چاہئے تھا کہ حدیث کی ابتداء میں مالک کی جگہ تابعی کا ذکر کرتے اور حدیث کے آخر میں رواہ مالک مرسلا فرماتے۔ چونکہ امام مالک اس حدیث کے "مخرجین" میں سے ہیں۔ یا یوں کہتے: **کذا فی المؤطا۔**

یہاں ایک اور مناقشہ بھی ہے وہ یہ کہ "عن" کا تقاضا یہ ہے کہ ایک راوی اور بھی ہو حالانکہ امام مالک سے روایت کرنے والا یہاں کوئی راوی نہیں ہے۔

بدعت کی نحوست

۱۸۷: وَعَنْ غُضَيْفِ بْنِ الْحَارِثِ الثُّمَالِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَةً اِلَّا رُفِعَ مِثْلُهَا مِنَ السُّنَّةِ فَتَمَسُّكٌ بِسُنَّةٍ خَيْرٌ مِّنْ اِحْدَاثِ بِدْعَةٍ (رواہ احمد)

أخرجه أحمد في المسند ٤/١٠٥۔

ترجمہ: حضرت غضیف بن حارث ثمالیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی قوم دین میں نئی بات یعنی بدعت ایجاد کرتی ہے۔ جو کہ سنت کے مقابل ہو۔ تو اس کے مثل ایک سنت اٹھالی جاتی ہے لہٰذا سنت کو مضبوطی سے پکڑنا بدعت ایجاد کرنے کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے۔ اس حدیث کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

غضیف بن الحارث۔ "غضیف" حارث بن زنیم الثمالی کے بیٹے ہیں۔ "ابو اسماء" کنیت ہے اور ان کا وطن شام ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا۔ ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے۔ لیکن خود ان کا بیان ہے کہ میری پیدائش آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوئی۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے مصافحہ فرمایا۔ حضرت عمر وابوذر رضی اللہ عنہم وعائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث کی سماعت فرمائی اور ان سے مکحول اور سلیم بن عامر نے روایت کی۔

"غضیف" میں غین معجمہ پر ضمہ، ضاد معجمہ پر فتحہ، یاء ساکن اور اخر میں فاء ہے "ثمالی" میں ثاء (۳ نقطوں والی) مضموم اور میم بغیر تشدید کے ہے۔ ثمالہ کی طرف منسوب ہے، جو قبیلہ ازد کی ایک شاخ ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ ضاد معجمہ نہیں بلکہ ظاء معجمہ کے ساتھ ہے۔ بعض محدثین کا کہنا ہے کہ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ روای ہیں اور "غطیف" تابعی ہیں اور یہی بات درست ہے۔ (کذا فی التقریب) "زنیم" زاء معجمہ کے ضمہ اور نون کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: **قولہ: ما أحدث قوم بدعة الارفع مثلها من السنة :**

یعنی جب کوئی دین میں کوئی ایسی نئی بات نکالتی ہے جو سنت کے بالکل خلاف ہو تو اس نئی بات کی کمیت یا کیفیت کے بقدر ایک سنت اٹھالی جاتی ہے اور بدعت کی نحوست کے باعث وہ بدعتی لوگ سنت کی برکات سے محروم ہو جاتے ہیں۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنت کی ضد کو مثل سے تعبیر کیا چونکہ ان دونوں میں مناسبت تامّہ ہے، بایں طور کہ سنت کی ضد کے طور پر متبادر الی الدین یہی چیز ہے، نیز اس وجہ سے کہ جب سُنت مرتفع ہوتی ہے تو اس کی ضد متحقق ہو جاتی ہے۔

قوله: فتسمك بسنة خير من احداث بدعة:

یہ جملہ شرط محذوف کا جواب ہے، أی: اذا عرفت ذلك فتمسّك۔

سنت خواہ چھوٹی ہو، خواہ بڑی ہو، مثلاً بیت الخلاء کے آداب کو حسب منقول بجا لانا حسنہ عظیمہ سے افضل ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس ارشاد سے مقصود اتباع سُنت میں مبالغہ ہے اور یہ کہ سُنت من حیث انها سنة، بدعت سے افضل ہے۔ اگر چہ بدعت مستحسن ہی کیوں نہ ہو۔ قطع نظر اس سے کہ وہ متعدی ہو یا قاصر ہو یا دائمی ہو یا منقطع۔ واضح سی بات ہے کہ کسی بھی سُنت کو تکاسلا چھوڑنا موجب ملامت وعتاب ہے اور استخفافاً چھوڑنا موجب عصیان وعقاب ہے، اور سُنت کا انکار کرنے والا بلا شبہ بدعتی ہے اور بدعت اگر چہ مستحسن ہی کیوں نہ ہو اس کے ترک پر کسی بھی قسم کا ذرہ برابر بھی مؤاخذہ نہیں۔

اسنادی حیثیت: میرک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند جید ہے۔

جب بدعت سے سنت اُٹھ جاتی ہے تو قیامت تک لوٹتی نہیں

۱۸۸: وَعَنْ حَسَّانَ قَالَ: مَا ابْتَدَعَ قَوْمٌ بِدْعَةً فِيْ دِيْنِهِمْ اِلَّا نَزَعَ اللّٰهُ مِنْ سُنَّتِهِمْ مِثْلَهَا ثُمَّ لَا يُعِيْدُهَا اِلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ. (رواه الدارمی)

أخرجه الدارمی ۱/۵۸ حدیث رقم ۹۸۔

ترجمہ: حضرت حسانؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی قوم اپنے دین میں بدعت ایجاد کر لیتی ہے۔ یعنی ایسی بدعت سیئہ جو سنت کے خلاف ہو۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی سنت میں سے اس کے مثل سنت دنیا سے اٹھا لیتا ہے اور پھر وہ سنت قیامت تک اس کی طرف واپس نہیں کی جاتی۔ اس حدیث کو امام دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ۔ ان کی کنیت ''ابوالولید'' الانصاری خزرجی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار کے شاعر ہیں اور یہ بڑے پایہ کے شعراء میں سے ہیں۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ تمام عرب کا اتفاق ہے کہ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ تمام صحراء کے بہترین شعراء میں سے ہیں۔ ان سے حضرت عمر بن الخطاب، ابو ہریرہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم نے روایت حدیث کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلافت کے زمانہ میں ۴۰ھ سے پہلے وفات پائی اور بعض نے بتلایا ہے کہ ۵۰ھ میں اور ان کی عمر ایک سو بیس (۱۲۰) سال کی ہوئی۔ ساٹھ سال جاہلیت کے دور میں زندہ رہے اور ساٹھ ہی سال اسلام کے زیر سایہ گزارے۔ حسان بروزن فعلان ہو تو غیر

منصرف ہے، اور بروزن فعال ہو تو منصرف ہے دونوں طرح پڑھا جاتا ہے

تشریح: امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس کی وضاحت یہ ہے کہ سنت اپنے موقع محل میں جڑ پکڑے ہوئے تھی، جب وہ اکھاڑ دی گئی تو اس کو اسی طرح سے دوبارہ کبھی بھی نہیں لگایا جاسکتا۔ اس کی مثال اس درخت کی مانند ہے کہ جو زمین کے اندر مضبوطی کے ساتھ جڑیں پکڑے ہوئے ہو، چنانچہ جب اسے ایک بار اکھاڑ دیا جاتا ہے تو پھر اس کو پہلے کی طرح کبھی بھی نہیں لگایا جاسکتا۔

اسنادی حیثیت: امام دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو موقوفاً روایت کیا ہے۔ لیکن امور غیبیہ سے متعلق اس قسم کی بات چونکہ اپنی ذاتی رائے کی بنیاد پر نہیں کہی جاسکتی لہٰذا یہ روایت حدیث مرفوع کے حکم میں ہے۔ اس حدیث میں وہ امر غیبی آخری جملہ ہے۔ **ثم لایعیدها الیهم الی یوم القیامة ۔**

بدعی کی تعظیم درست نہیں

۱۸۹ : وَعَنْ اِبْرَاهِيمَ بْنِ مَيْسَرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ اَعَانَ عَلٰى هَدْمِ الْاِسْلَامِ (رواه البيهقي في شعب الايمان مرسلا)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٧/٦١ حديث رقم ٩٤٦٤۔

ترجمہ: حضرت ابراہیم بن میسرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے بدعتی کی تعظیم اور عزت کی اس نے اسلام کے ستون کو گرانے میں اس کی اعانت اور مدد کی۔ اس حدیث کو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے مرسل طریق سے۔

راویٔ حدیث:

ابراہیم بن میسرۃ۔ یہ ابراہیم بن میسرہ طائف کے رہنے والے ہیں۔ تابعین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی احادیث اہل مکہ میں مشہور ہیں۔ ثقہ تھے اور صحیح احادیث روایت کرتے تھے۔ میسرہ سین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: قوله: من وقر صاحب بدعة......:

جس شخص نے کسی بدعتی کی تعظیم کی' بایں طور کہ اپنی جگہ کھڑا ہوا اور اس بدعتی کو نمایاں مقام پر جگہ دی یا بلا وجہ اس کی خدمت کی، یا مدد و نصرت کی، خواہ بدعتی بدعت کا داعی تھا یا نہیں تھا، تو اس نے اسلام کے گرانے میں مدد کی۔

اسلام کے گرانے میں مدد کرنے کے متعدد مطالب بیان کیے گئے ہیں: ① اسلام سے مراد اس کا اسلام ہے۔ ② اسلام سے کمال اسلام مراد ہے۔ ③ اسلام سے مراد اہلِ اسلام ہیں۔ ④ اسلام سے سنت مراد ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: (آنحضرت ﷺ کا) یہ ارشادِ گرامی "تغلیظ" کے باب سے ہے۔ چنانچہ جب مؤقر کا حال یہ ہے تو بدعتی کا کیا حال ہوگا؟ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس نے سُنت کے پیروکار کسی شخص کی تعظیم کی تو اس کا حکم اس کے برعکس ہوگا، اور اس طرح یہ کہ جس نے کسی بدعتی کی توہین کی اس کا حکم بھی برعکس ہوگا۔

قوله :رواه البيهقي في شعب الايمان مرسلاً۔
روایت سے مرسل ہونا بالکل واضح ہے بایں طور کہ سند سے صحابی کا نام ساقط ہے۔

کتاب اللہ کی اتباع کرنے والا دنیا' آخرت میں کامیاب ہے

۱۹۰: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَنْ تَعَلَّمَ كِتَابَ اللّٰهِ ثُمَّ اتَّبَعَ مَافِيْهِ هَدَاهُ اللّٰهُ مِنَ الضَّلَالَةِ فِي الدُّنْيَا وَ وَقَاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سُوْءَ الْحِسَابِ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ مَنِ اقْتَدٰى بِكِتَابِ اللّٰهِ لَايَضِلُّ فِي الدُّنْيَا وَلَا يَشْقٰى فِي الْاٰخِرَةِ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (رواه رزين)

رواه رزين۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جس انسان نے کتاب اللہ کا علم حاصل کیا اور پھر اس چیز کی اتباع کی جو اس کتاب میں ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں ضلالت سے ہٹا کر ہدایت کے راستہ پر لگائے گا۔ یعنی اس کو صراط مستقیم پر ثابت قدم رکھے گا اور گمراہی سے بچائے گا اور قیامت کے دن اس کو برے حساب سے بچائے گا۔ یعنی اس کی گرفت نہیں ہوگی اور ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ جس آدمی نے کتاب اللہ کی پیروی کی نہ تو دنیا میں گمراہ ہوگا اور نہ آخرت میں بدبخت ہوگا یعنی آخرت میں اس کو عذاب نہیں ہوگا۔ اس کے بعد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیت تلاوت کی۔ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى۔ کہ جس شخص نے میری ہدایت یعنی قرآن کی اتباع کی نہ تو وہ دنیا میں گمراہ ہوگا اور نہ آخرت میں ناکام و بدبخت ہوگا۔ اس حدیث کو رزین نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: من تعلم كتاب الله ثم اتبع مافيه هداه الله من الضلالة:

من تعلم كتاب الله : کتاب اللہ کے سیکھنے سے مراد یہ ہے کہ کتاب اللہ کو دیکھ کر پڑھنا سیکھا یا کتاب اللہ کو حفظ کیا اس کے معانی کا علم سیکھا اور پھر امتثال اوامر اور اجتناب عن النواہی کرتا رہا هداه الله من الضلالة فى الدنيا: "هدى" آمن کے معنی کو متضمن ہے اسی لئے "من" کے ساتھ متعدی ہوا ہے۔ "اى آمنه الله من ارتكاب المعاصى۔ یعنی تو اللہ اس شخص کو ارتکاب معاصی سے مأمون فرما دیں گے۔ (كذا قاله الطيبى)

اس سے زیادہ ظاہر معنٰی یہ ہیں کہ جو شخص قرآن کی اتباع کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت پر ثابت قدم رکھیں گے، اور اس کو موت تک گمراہی میں پڑنے سے بچائیں گے۔

" سوء الحساب" سے مراد حساب میں مناقشہ ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے: من نوقش فى الحساب عذب۔ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سعادتِ دارین کتاب اللہ کے اتباع پر موقوف ہے۔ اھ اور کتاب اللہ کا اتباع' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی معرفت و اتباع پر موقوف ہے، لہٰذا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شرعاً متلازم ہیں، ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

قوله: وفى رواية قال:......الخ:

ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ظاہر کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ نفی ضلالت کا تعلق دنیا، اور نفی تعب کا تعلق آخرت کے ساتھ ہے۔ جمہور مفسرین کا موقف بھی یہی ہے۔ عبداللہ بن سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: من اتبع الهدى وهو ملازمة الكتاب والسنة لا يضل عن طريق الهدى ولا يشقى في الآخرة والأولىٰ۔ تو گویا کہ انہوں نے دنیاوی تعب کو اخروی نعمتوں کو سامنے رکھتے ہوئے تعب شمار نہیں کیا۔ یا کہ شرح صدر، اطمینانِ قلب اور رضا بقضا کی صفات سے متصف ہونے کی وجہ سے تعب کلی طور پر رفع ہو گیا۔ واللہ اعلم۔

مؤمن کے دل پر ایک فرشتہ ہوتا ہے جو خیر کی راہنمائی کرتا ہے

۱۹۱: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا وَعَنْ جَنْبَتَيِ الصِّرَاطِ سُوْرَانِ فِيْهِمَا اَبْوَابٌ مُفَتَّحَةٌ وَعَلَى الْاَبْوَابِ سُتُوْرٌ مُرْخَاةٌ وَعِنْدَ رَأْسِ الصِّرَاطِ دَاعٍ يَقُوْلُ اِسْتَقِيْمُوْا عَلَى الصِّرَاطِ وَلَا تَعَوَّجُوْا وَفَوْقَ ذٰلِكَ دَاعٍ يَدْعُوْ كُلَّمَا هَمَّ عَبْدٌ اَنْ يَفْتَحَ شَيْئًا مِنْ تِلْكَ الْاَبْوَابِ قَالَ: وَيْحَكَ لَاتَفْتَحْهُ فَاِنَّكَ اِنْ تَفْتَحْهُ تَلِجْهُ ثُمَّ فَسَّرَهُ فَاَخْبَرَ اَنَّ الصِّرَاطَ هُوَ الْاِسْلَامُ وَاَنَّ الْاَبْوَابَ الْمُفَتَّحَةَ مَحَارِمُ اللّٰهِ وَاَنَّ السُّتُوْرَ الْمُرْخَاةَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَاَنَّ الدَّاعِيَ عَلٰى رَأْسِ الصِّرَاطِ هُوَ الْقُرْاٰنُ وَاَنَّ الدَّاعِيَ مِنْ فَوْقِهٖ هُوَ وَاعِظُ اللّٰهِ فِيْ قَلْبِ كُلِّ مُؤْمِنٍ۔ (رواہ رزین و احمد)

أخرجه أحمد في المسند ۱۸۲/٤۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی ہے وہ یہ کہ ایک سیدھا راستہ ہے اور اس راستہ کے دونوں طرف دیواریں ہیں اور ان دیواروں میں دروازے کھلے ہوئے ہیں اور ان دروازوں پر پردے لٹک رہے ہیں اور اس راستہ کے کنارہ پر ایک داعی کھڑا ہے جو پکار پکار کر کہتا ہے کہ سیدھے راستہ پر چلو غلط راستہ پر نہ چلو اور اس پکارنے والے کے اوپر ایک اور پکارنے والا ہے۔ جب کوئی انسان ان دروازوں میں سے کوئی دروازہ کھولنا چاہتا ہے۔ تو وہ دوسرا داعی پکار کر کہتا ہے۔ تجھ پر افسوس اس کو نہ کھول۔ اگر تو اس دروازہ کو کھولے گا تو اس میں داخل ہو جائے گا (اور وہاں سخت تکلیف اُٹھائے گا) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مثال کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے۔ جس پر چل کر انسان جنت میں پہنچتا ہے اور ابواب مفتوحہ سے مراد وہ چیزیں ہیں۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ جن پر عمل کرنا تکمیل ایمان کے خلاف ہے اور دروازوں پر لٹکے ہوئے پردوں سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے قائم کردہ حدود ہیں اور راستے کے سرے پر داعی سے مراد قرآن کریم ہے اور دوسرے داعی سے مراد جو پہلے داعی کے آگے کھڑا ہونے والا ہے۔ وہ ایک فرشتہ ہے جو ہر مؤمن کے دل پر ہے اور اس کو نصیحت کرتا ہے۔ اس حدیث کو رزین اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قولہ: ضرب الله مثلاً صراطا مستقیما: "صراطا"، "مثلاً" سے بدل ہے۔ جیسا کہ اس مثال میں:

زید رأیت غلامه رجلا صالحا۔

قوله: وعن جنبتي الصراط سوران فيهما أبواب مفتحة:

" وعن جنبتي الصراط سوران" یہ جملہ صراطاً سے حال ہے۔

" فيهما أبواب مفتحة" یہ جملہ سوران کی صفت ہے۔

قوله: وعلى الأبواب ستور مرخاة:

یہ جملہ حال ہے، مفتحة میں مستتر ضمیر سے جو ابواب کی طرف راجع ہے، اور افادۂ تفخیم کے پیش نظر موضع ضمیر میں اسم ظاہر کو ذکر کیا گیا ہے۔

قوله: وعند رأس الصراط داع يقول: اس جملہ کا عطف وعن جنبتي الصراط پر ہے۔

قوله: استقيموا ولا تعوجوا:

" ولا تعوجوا" یہ جملہ ماقبل کی تاکید ہے اور امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ اس کا عطف 'استقيموا پر ہے على الطرد والعكس۔ چونکہ دونوں جملوں میں سے ہر ایک کا مفہوم دوسرے کے منطوق میں پختگی پیدا کر رہا ہے اور اس کے برعکس۔

قوله: وفوق ذلك داع يدعو ......تلجه

" وفوق ذلك" کا عطف وعند رأس الصراط پر ہے اور ذلك کا مشار الیہ محذوف ہے جو" الصراط" یا "الداعي" ہے۔

" كلّما" ظرف ہے۔ جواب کا مقتضی ہے، اور وہ جواب: قال: ويحك...... ہے۔

اس حدیث مبارکہ میں حلال وحرام، جائز وناجائز، اور صحیح وغلط کے ارتکاب کو مثال کے ذریعہ سے سمجھایا گیا ہے کہ صراط مستقیم کے دونوں طرف گمراہی ہی گمراہی ہے۔ صراط مستقیم کی دونوں جانبوں کو فصیل شہر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں ارشادِ باری کی طرف اشارہ ہے: ﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ﴾ [الحديد: ۱۳]

واللہ اعلم بالصواب۔

جب کوئی بندہ محرمات کے دروازوں میں سے کوئی دروازہ کھولتا ہے تو وہ دوسرا پکارنے والا پکارتا ہے کہ تجھ پر افسوس ہے اس دروازے کو مت کھول اگر تم نے کوئی دروازہ کھول لیا، تو اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پاؤ گے اور داخل ہو کر ہی رہو گے۔ پھر تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا: صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے، اور اس پر استقامت مقصود ہے اور کھلے ہوئے دروازوں سے مراد اللہ کے محارم ہیں' ان ابواب میں داخل ہونے والا شخص عذاب اور ملامت میں داخل ہو جاتا ہے اور کمال اسلام اور استقامت سے خارج ہو جاتا ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: الحد الفاصل بين العبد ومحارم الله كما قال الله تعالى: ﴿تلك حدود الله فلا تقربوها﴾ اھ۔ ستور سے مراد بظاہر وہ امور دینہ غیر مبیّنہ ہیں جن کو دوسری مشہور حدیث میں شبہات سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قولہ: وان الداعي على رأس الصراط هو القرآن: ایک نسخہ میں بغیر أنّ کے ہے، یعنی الداعي مرفوع ہے۔

قوله: وأن الداعي من فوقه واعظ الله في قلب كل مؤمن:

"فوقه" کی ضمیر غائب صراط کی طرف راجع ہے یا الداعی الاول کی طرف راجع ہے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: مؤمن کے دل میں آنے والا پہلا وسوسہ فرشتہ کی طرف سے ہے اور دوسرا وسوسہ شیطان کی طرف سے ہے۔ اھ۔ شیطان کے وسوسہ کا اثر رنج وغم اور فکر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور زیادہ واضح یہ تھا کہ طیبی یوں کہتے: "والهم لمة الشيطان"۔

۱۹۲ : وَالْبَيْهَقِي فِي شُعَبِ الْإِيْمَانِ عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ وَكَذَا الترمذی عَنْهُ إِلَّا اَنَّهٗ ذَكَرَ اَخْصَرَ مِنْهُ......۔

ترجمہ: اور امام بیہقی رحمۃ اللہ نے اس روایت کو شعب الایمان میں حضرت نواس بن سمعان سے نقل کیا ہے اور امام ترمذی نے بھی انہی سے نقل کیا ہے مگر امام ترمذی نے الفاظ مختصر ذکر کیے ہیں۔

راوئ حدیث:

النواس بن سمعان۔ یہ نواس 'سمعان' کے بیٹے ہیں۔ بنوکلاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اصحاب صفہ میں ہیں۔ شام میں سکونت پذیر ہوگئے اور اہل شام میں شمار ہوتے ہیں۔ جبیر بن نفیر اور ابوادریس خولانی نے ان سے روایت کی۔ "نواس" میں نون پر فتحہ اور واؤ مشدد ہے۔ 'سمعان' میں سین مہملہ پر کسرہ اور کہا گیا کہ اس پر زبر ہے اور میم ساکن اور عین مہملہ ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اتباع کرو

۱۹۳ : وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ : مَنْ كَانَ مُسْتَنًّا فَلْيَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْمَاتَ فَاِنَّ الْحَيَّ لَاتُؤْمَنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ اُولٰئِكَ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ ﷺ كَانُوْا اَفْضَلَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَبَرَّهَا قُلُوْبًا وَاَعْمَقَهَا عِلْمًا وَاَقَلَّهَا تَكَلُّفًا اِخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ وَ لِاِقَامَةِ دِيْنِهٖ فَاعْرِفُوْا لَهُمْ فَضْلَهُمْ وَاتَّبِعُوْهُمْ عَلٰى اٰثَارِهِمْ وَتَمَسَّكُوْا بِمَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ اَخْلَاقِهِمْ وَسِيَرِهِمْ فَاِنَّهُمْ كَانُوْا عَلَى الْهُدَى الْمُسْتَقِيْمِ ۔ (رواه رزين)

البيهقي في شعب الايمان ٥/٤٤٥ حديث رقم ٧٢١٦۔ والترمذي مختصرا ١٣٣/٥ حديث رقم ٢٨٥٩۔ وقال حديث غريب۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جو انسان کسی طریقہ کی اتباع کرنا چاہتا ہے، تو اس کو چاہئے کہ وہ ان لوگوں کا طریقہ اختیار کرے جو فوت ہوگئے ہیں، کیونکہ زندہ آدمی دین میں فتنہ سے محفوظ نہیں ہوتا اور وہ لوگ جو فوت ہوگئے ہیں اور جن کی اتباع کرنی چاہئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام ہیں جو اس امت کے بہترین لوگ ہیں اور دلوں کے اعتبار سے انتہائی درجہ کے نیک لوگ ہیں اور علم کے اعتبار سے انتہائی کامل درجہ کے لوگ ہیں اور بہت تھوڑا تکلف کرنے والے تھے اور ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی رفاقت اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ لہٰذا تم لوگ ان کی بزرگی کو پہچانو اور ان کے نقش قدم کی اتباع کرو اور جس قدر ممکن ہو ان کے اخلاق اور عادات کو اپناؤ۔ کیونکہ یہی

لوگ ہدایت اور صراط مستقیم پر تھے۔اس حدیث کو رزین نے بیان کیا ہے۔

تشریح: قوله: من كان مستنافليستن بمن قد مات:

یعنی جو شخص کسی طریقہ کی پیروی کرنا چاہے تو اس کو چاہیئے کہ ان لوگوں کی راہ اختیار کرلے جو مرتے دم تک علم وعمل کی راہ پر گامزن رہے، کہ جن کی زندگی اور ان کے کمالات کسی پر مخفی نہیں، غرض یہ کہ ساری زندگی جادۂ حق پر استقامت کے ساتھ گزاری۔ مرے ہوئے لوگوں سے مراد آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ ہیں اور زندوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو صحابہؓ کے بعد کے دور کے لوگ ہیں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اشارہ انہی لوگوں کی طرف ہے جو تابعینؒ کہلائے جو اس وقت زندہ موجود تھے اور یہ کہہ کر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے آنے والے لوگوں کو بتادیا کہ پیروی کے قابل وہ لوگ ہیں جو نیکی اور بھلائی کی پیروی کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوگئے کیونکہ صحابہؓ کے دور کے بعد جو ادوار بھی آتے جائیں گے ان ادوار میں زندہ لوگوں سے مختلف طرح کی کوتاہیاں ہوتی رہیں گی اور کوئی انسان ایسا کامل نہیں ہوگا کہ اس سے کسی وقت بھی کوئی غلط کام سرزد نہ ہو اس لئے صرف اور صرف صحابہ کرامؓ ہی ہیں جو امت کے بہترین انسان تھے اس لئے زندوں کے لئے ضروری ہے کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کی اتباع کرتے رہیں اور کسی دوسرے پر نظر نہ رکھیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کی جماعت ہی وہ مقدس جماعت تھی جس نے براہِ راست آپ ﷺ کی آواز پر لبیک کہا اور اللہ تعالیٰ کے دین کو پھیلانے کے لئے آپ ﷺ کے معین ومددگار رہے اور اس راستہ میں جن مصائب سے بھی ان کو دوچار ہونا پڑا اور مخالفین نے ان پر جس قدر ظلم وستم کیا وہ سب کچھ برداشت کرتے ہوئے اسلام کی اشاعت وبقا کے لئے قربانیاں دیتے رہے اور ان ہی کا دور اسلامی تاریخ کا سب سے تابناک باب ہے۔

قوله: فان الحی لا تؤمن علیه الفتنة:

یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن کریم میں یہ شہادت دی گئی ہے کہ: ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ﴾ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے ہر لحاظ سے جانچ لیا ہے اگر علم وفضل کی کسوٹی پر ان ہستیوں کو پرکھا جائے تو بلا مبالغہ نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ہر صحابی علم، معرفت، فہم وفراست، تدبر وتفکر اور عقل ودانش کا مینارۂ نور تھا جن سے دنیا نے ظلم وجہل کے اس ماحول میں تعلیم وترقی تہذیب وشرافت اور انسانیت کی روشنی حاصل کی مختصر یہ کہ عبادات ہوں یا معاملات، اخلاق و عادات ہوں یا معیشت ومعاشرت زندگی کے ہر پہلو میں ان کے یہاں خلوص اور بے تکلفی وسادگی تھی انہوں نے اپنے نظام حیات کو ایسے سانچے میں ڈھال رکھا تھا جو خالص اسلامی، دینی اور اخلاقی تھا اور یہ سب نگاہِ نبوت کی کرشمہ سازی تھی اور نبی اعظم وآخر ﷺ کی صحبت کا اثر تھا۔اس لئے تمام مسلمانوں کو آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ کی اتباع کا حکم دیا گیا اور آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کے علاوہ کسی دوسرے کی اتباع کا حکم نہیں دیا گیا اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری آپ ﷺ ہی کی فرمانبرداری کا دوسرا نام ہے اس لئے کہ آپ ﷺ کی فرمانبرداری اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہے۔

قوله: اولئك اصحاب محمد...... واقلها تكلفا:

"اولئك" سے اشارہ ان صحابہ کرام کی طرف ہے جو دنیا سے رخصت ہوچکے تھے، لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے قد مات

میں ضمیر مفرد لائی گئی، اور معنیٰ کا لحاظ کرتے ہوئے اولئك اسم اشارہ جمع لایا گیا۔ (کذا ذکرہ الطیبی)

''اعمقها علما'': صحابہ کرام کے علم میں گہرائی تھی، دقت فہم وبصیرت ان پر ختم تھی۔ علوم مختلفہ کا وافر ترین حصہ رکھنے والے تھے، ان کے سینے تفسیر، حدیث، فقہ، قراءت، فرائض، تصوف اپنے اندر سموئے ہوئے اور قلوب کو انشراح حاصل تھا۔ ان میں سے ہر ہر شخص ''اُمت'' کا مصداق تھا، اعلیٰ قسم کے ایسے ایسے شمائل سے آراستہ اور فضائل سے پیراستہ تھے کہ غالب احوال کے اعتبار سے عام لوگوں میں خال خال ہی کوئی متصف ملتا ہے۔ صحابہ کرام کے بعد پھر یوں ہونے لگا کہ لوگ علوم کے اعتبار سے متفرق ہونے لگے، بعض لوگ مفسّر ہوگئے، بعض صرف محدّث بن گئے، چونکہ ان کے بعد کے لوگوں میں وہ کامل استعداد وقابلیت عظمی نہ تھی۔

''اقلها تكلفا'': یعنی کام کاج میں تکلف نہیں کرتے تھے۔ ننگے پاؤں چلا کرتے تھے، نماز زمین پر ہی اداء کرلیا کرتے تھے، ہر طرح کے برتنوں میں کھالیا کرتے تھے، ایک دوسرے کا جوٹھا پی لیتے تھے، یہی حال ان کا علم میں تھا، لایعنی امور میں بات چیت نہیں کرتے تھے، نامعلوم مسائل کے بارے میں صاف صاف کہہ دیا کرتے تھے **لا ادری** کوئی مستفتی آجاتا تو اپنے سے زیادہ بڑے عالم کی طرف راہنمائی کردیتے، خود فتویٰ دینے سے بچتے تھے، یہی حال تلاوت قرآن کا تھا کہ قرآن کی تلاوت کا حق اداء کیا کرتے تھے۔ قرآن اہلِ عرب کے لہجہ میں پڑھا کرتے تھے، گا گا کر، لہک لہک کر قرآن پڑھنے سے اجتناب کیا کرتے تھے۔ احوالِ باطنیہ بھی احوال ظاہرہ کی مانند تھے، نہ چیخ وپکار کرتے تھے۔ نہ گانے باجے کی محفلیں سجاتے تھے، نہ ''اذکار'' کیلئے حلقے لگایا کرتے تھے، نہ نمازوں کیلئے حلقے لگایا کرتے تھے، نہ درود وسلام اپنی مساجد میں اونچی آواز سے پڑھتے اور نہ اپنے گھروں میں۔ ظاہری اعتبار سے مخلوق سے کٹے ہوئے، مگر باطنی اعتبار سے خدائے وحدہ لاشریک کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ جو لباس میسّر آجاتا' زیب تن فرمالیتے، اس کی پرواہ نہ ہوتی کہ صوف ہے کہ قطن وکتان، کپڑوں کی تراش خراش میں انہیں فیشن سے کوئی سروکار نہ تھا، حلال اور مستلذات میں سے جو چیز دستیاب ہوتی تناول فرمالیتے، دودھ، پھل اور گوشت وغیرہ سے احتراز نہیں کیا کرتے تھے، اور یہ سب کا سب اس مربی کامل ومکمل کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ جو مربیّ اعظم فرمایا کرتے تھے: **ادبنی ربی فأحسن تأديبي**۔ اگلے جملہ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

قوله: اختارهم الله لصحبة بنيه ولا قامة دينه:

اللہ تعالیٰ نے بھرے جہان میں سے صحابہ کرام کو اپنے نبی کی صحبت وہم نشینی کیلئے چنا، چنانچہ پھر انہی لوگوں نے اللہ کے نبی کی سنتیں' اقوال وافعال چار دانگ عالم میں پھیلائے، اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر نہ صرف جہاد کیا بلکہ جہاد کا حق اداء کیا، فتوحات کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوگیا، اور اسلام کا ٹھیک ٹھیک پرچار کیا، باوجودیکہ دنیاوی حاجات بھی ساتھ ساتھ تھیں مگر ہمیشہ فکر معاد میں لگے رہے۔

قوله: فاعرفوا لهم فضلهم:

یعنی صحابہ کو غیر صحابہ سے افضل وبالا شمار کرو، اگرچہ بعض صحابہ بعض صحابہ سے زیادہ فضیلت رکھتے ہیں، کوئی علم وعمل میں بڑھا ہوا ہے تو کوئی جہاد وانفاق میں بڑھا ہوا ہے، اور یہی معاملہ ان کے اخروی ثواب کا ہے، کہ بعض کا اجر بعض سے زیادہ ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ......﴾ [الحدید: ۱۰] ''اور تم کو کیا ہوا ہے کہ خدا کے راستے میں خرچ نہیں کرتے؟ حالانکہ آسمانوں اور زمین کی وراثت خدا ہی کی ہے، جس شخص نے تم میں سے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور لڑائی کی وہ (اور جس نے یہ کام پیچھے کیے وہ) برابر نہیں ان لوگوں کا درجہ ان لوگوں سے کہیں بڑھ کر ہے جنہوں نے بعد میں خرچ (اموال) اور (کفار سے) جہاد وقتال کیا اور خدا نے سب سے (ثواب) نیک (کا) وعدہ تو کیا ہے اور جو کام تم کرتے ہو خدا ان سے واقف ہے''۔

واتبعوهم علی اثرهم:

ان کے علم وعمل کی اتباع کرو، چونکہ یہ لوگ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال، افعال واحوال کا مشاہدہ کیے ہوئے ہیں، اسی وجہ سے تو یہ فرمایا: **اصحابی كالنجوم بايهم اقتديتم اهتديتم۔**

قوله: وتمسكوا بما استطعتم......الخ:

اس جملہ میں اشارہ ہے کہ تم لوگ کامل اتباع سے عاجز ہو، لیکن **مالا يدرك كله لا يترك كله**، اور محبت بقدر متابعت ہے اور متابعت بقدر محبت ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ......﴾ [آل عمران: ۳۱] ''(اے پیغمبر لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور خدا بخشنے والا مہربان ہے''۔

اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو شریعتِ محمدیہ کی اتباع کرتے

۱۹۴: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَتٰی رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِنُسْخَةٍ مِنَ التَّوْرَاةِ فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هٰذِهٖ نُسْخَةٌ مِّنَ التَّوْرَاةِ فَسَكَتَ فَجَعَلَ یَقْرَاُ وَوَجْهُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ یَتَغَیَّرُ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ ثَكِلَتْكَ الثَّوَاكِلُ مَاتَرٰی مَابِوَجْهِ رَسُوْلِ اللّٰهِ فَنَظَرَ عُمَرُ اِلٰی وَجْهِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ اللّٰهِ وَغَضَبِ رَسُوْلِهٖ رَضِیْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ لَوْ بَدَالَكُمْ مُوْسٰی فَاتَّبَعْتُمُوْهُ وَتَرَكْتُمُوْنِیْ لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ وَلَوْ كَانَ حَیًّا وَاَدْرَكَ نُبُوَّتِیْ لَاتَّبَعَنِیْ۔ (رواه الدارمی)

أخرجه الدارمی ۱/۱۲۶ حدیث رقم ۴۳۵۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ بن خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تورات کا ایک نسخہ لائے اور عرض کیا اے اللہ کے رسول یہ تورات کا نسخہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات سن کر خاموش رہے۔ پھر حضرت عمرؓ نے تورات کو پڑھنا شروع کر دیا اور دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ غصہ سے متغیر ہونے لگا۔ یہ تغیر دیکھ کر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ارشاد فرمایا۔ اے عمرؓ گم کرنے والیاں تمہیں گم کریں۔ کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کے تغیر کو نہیں

دیکھتے۔ پھر حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کے چہرہ انور کی طرف آنکھ اٹھائی اور غصہ کے آثار کو دیکھ کر کہا کہ میں اللہ کے غضب اور اللہ کے رسول ﷺ کے غصہ سے پناہ مانگتا ہوں۔ ہم اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر راضی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام تمہارے درمیان ظاہر ہو جائیں پھر تم ان کی اتباع کرنے لگ جاؤ اور مجھے چھوڑ دو تو اس کے نتیجہ میں تم صراط مستقیم سے بھٹک کر گمراہ ہو جاؤ گے۔ حالانکہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پالیتے تو وہ بھی یقیناً میری ہی اتباع کرتے اس حدیث کو امام دارمی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **قوله :اتى رسول الله ﷺ بنسخة......الى وجه رسول الله ﷺ:**

"**نسخة**": نون کے ضمہ کے ساتھ، "**نسخ**" بمعنی "**نقل**" سے ماخوذ ہے۔ **فجعل**: فعلِ شروع کے معنی میں ہے۔

"**ثكلتك الثواكل**": اس کے لفظی معنی ہیں کہ "گم کرنے والیاں آپ کو گم کردیں" یہ ایک محاورہ ہے جو اپنے اصلی معنوں میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ ایسے مواقع پر بولا جاتا ہے جب کوئی شخص اپنے کسی بے تکلف دوست سے تعجب کے اظہار کے طور پر بات کرنا چاہے

یعنی تیری ماں، بہن، بیٹی تجھے روئیں۔ اسی قبیل سے عرب کے یہ محاورات بھی ہیں: ① **تربت يمينه**۔ ② **رغم أنفه** وغیرہ۔

"**ما ترى**": "ما" نافیہ ہے اور ہمزہ استفہامیہ مقدر ہے۔ **ما بوجه**: یہ "ما" موصولہ ہے یا موصوفہ ہے۔ **بدا**: الف کے ساتھ ہے، نا کہ ہمزہ کے ساتھ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقصود یہ تھا کہ اگر کوئی حرج کی بات نہ ہو تو میں تورات کے اس نسخہ کا مطالعہ کرلوں کہ اس میں کیا ہے؟ سابقہ اُمتوں کے حال کیا تھے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے بارے میں آگاہی ہو جائے وغیرہ۔ قصہ مختصر حضرت عمر فاروقؓ کی یہ بات سن کر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے کمالِ حلم، طبیعت کی نرمی اور اپنے رحمت للعالمین ہونے کے ناطے خاموش ہو گئے تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خاموشی کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اذن اور علامت رضا سمجھتے ہوئے تورات کے اس نسخہ کو پڑھنا شروع کر دیا، (حضرت عمر فاروقؓ کی تمام تر توجہ اس وقت اس نسخہ کو پڑھنے میں تھی، اور دائیں بائیں کا دھیان کچھ خاص نہ تھا حتی کہ وہ سرکار دو عالم ﷺ کے چہرے کے بدلتے زاویے بھی نہ دیکھ پائے) چنانچہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے بطور تعجب کہا ہے کہ آپؓ ایک چیز کو مسلسل پڑھے جا رہے ہیں اور آپ ﷺ نہیں دیکھتے کہ آپ ﷺ کے چہرے کے تاثرات کیا کہہ رہے ہیں مطلب یہ ہے کہ آپ کی پڑھی ہوئی عبارت کو آپ ﷺ اچھا نہیں سمجھ رہے جوں ہی سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یہ علم ہوا تو انہوں نے پڑھنا روک دیا اور فوراً اس بات کا اعتراف کیا کہ ہم اللہ اس کے رسول اور اس کے دین کو سچ مانتے ہیں۔ اس لئے ہم اس بات سے معذرت خواہ ہیں کہ ہم نے آپ ﷺ کو ناجائز تکلیف دی اور یہ بات سن کر آپ ﷺ کی ناگواری ختم ہوگئی۔

قوله: فقال :اعوذ بالله من غضب الله وغضب رسول الله:

غضب اللہ و غضب رسول اللہ سے پہلے غضب اللہ کا ذکر بطور توطیہ و تمہید کے ہے۔ یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ کا غضب بھی اللہ کے غضب کی طرح ہے (کذا قالہ الطیبی) اور اشارہ تھا کہ حقیقت میں تعوذ تو اللہ کے غضب سے ہے اور اللہ کے رسول کا غضب اللہ کے غضب کا سبب ہے، اس لئے اللہ کے رسول کے غضب سے بھی پناہ چاہتا ہوں۔

قولہ: رضینا باللہ ربا و بالاسلام دینا و بمحمد نبیا:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ عذر خواہی کا ہے کہ انہوں نے اپنے اس فعل سے معذرت چاہی اور جمع کی ضمیر ارشاد للسامعین کیلئے استعمال فرمائی۔ (کذا قالہ الطیبی) یا یہ کہ دوسرے حاضرین کے ساتھ میں بھی اللہ کی رضا کا طالب ہوں، اور غضب سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔

قولہ: نفس محمد بیدہ: اللہ کے ہاتھ سے کیا مراد ہے؟ اس کی تشریح و تحقیق متعدد مقامات پر گزر چکی ہے۔

قولہ: لو بدا لکم موسی...... لاتبعنی:

"بداء" الف کے ساتھ ہے نا کہ ہمزہ کے ساتھ۔ "**فاتبعتموہ و ترکتمونی**: فقط اتباع پر اکتفاء نہیں چونکہ مجرد اتباع میں کوئی محذور نہیں' اصل محذور تو ایسی اتباع میں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے ترک کا باعث ہو۔

اگر بالفرض و التقدیر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس وقت روئے زمین کے اوپر جیتے ہوتے اور تم صرف ان کی اتباع کرتے اور میری اتباع چھوڑ دیتے تو یقیناً گمراہ ہو جاتے۔ چہ جائیکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی روئے زمین پر موجود نہیں' ان کی کتاب بھی منسوخ ہو چکی، موجودہ نسخہ کو تحریف سے پاک کہنا بھی مشکل ہے، اور میں اس وقت تمہارے درمیان موجود ہوں، تو اب بھی اگر مجھ سے دین کے معاملہ میں اعراض کرو گے، تو ہدایت کیسے پاؤ گے؟ علاوہ ازیں اگر موسیٰ علیہ السلام روئے زمین پر موجود ہوتے تو ان کیلئے بھی میری اتباع کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا، چونکہ ان کا دین منسوخ ہو چکا، مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے بشمول دوسرے انبیاء کے اس بات پر عہد لیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾[آل عمران: ۸۱] "اور جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور دانائی عطا کروں پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرے تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اسکی مدد کرنی ہوگی اور (عہد لینے کے بعد) پوچھا کہ بھلا تم نے اقرار کیا اور اس اقرار پر میرا ذمہ لیا (یعنی مجھے ضامن ٹھہرایا) انہوں نے کہا (ہاں) ہم نے اقرار کیا (خدا نے) فرمایا کہ تم (اس عہد و پیمان کے) گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں" بعض کا کہنا ہے کہ "رسول" یہاں عام ہے، اور تنوین تنکیر کیلئے ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ "رسول" خاص ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مراد ہے، اور تنوین تعظیم کیلئے ہے۔ واللہ اعلم۔ اس حدیث سے کتاب اللہ اور سنت سے عدول کر کے حکماء اور فلاسفہ وغیرہ کی کتب کا مطالعہ ممنوع ہے۔

ناسخ اور منسوخ کا مسئلہ

۱۹۵: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَلَامِيْ لَايَنْسَخُ كَلَامَ اللّٰهِ وَكَلَامُ اللّٰهِ

يَنْسَخُ بَعْضُهُ بَعْضًا۔ (رواه الدارقطنی)

أخرجه الدارقطنی فی سننه ٤/١٤٥ "النوادر" حديث رقم٩۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرا کلام کتاب اللہ کو منسوخ نہیں کرتا اور اللہ کا کلام میرے کلام کو منسوخ کر دیتا ہے اور کلام اللہ کا بعض، بعض حصہ کو منسوخ کر دیتا ہے۔

تشریح: قوله: كلامي لا ينسخ كلام الله:

ملا علی قاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **النسخ: لغة التبديل و شرعا بيان لانتهاء الحكم الشرعي المطلق۔**

کتاب اللہ کا نسخ حدیث سے درست ہے یا نہیں؟ امام ثوری، امام شافعی، اور امام احمد کی ایک روایت یہ ہے کہ جائز نہیں ہے۔ امام احمد کی ایک روایت، اور امام ابوحنیفہ و مالک کا مذہب جواز کا ہے۔ والدین اور اقربین کیلئے وصیت کے حکم کیلئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی ناسخ ہے۔ **لا وصية لوارث:** اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ناسخ آیت میراث ہے۔ یہ بات محلِ نظر ہے، چونکہ کلام، نفسِ وصیت کے بارے میں ہے، نا کہ موصیٰ بہ کی مقدار کے بارے میں اور اسی قبیل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی ہے: **نحن معاشر الانبياء لا نورث۔**

و كلام الله ينسخ كلامه: یہ جملہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کا مؤید ہے اور اس کی مثال بیت اللہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کے منسوخ ہونا ہے۔ کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کیا کرتے تھے، پھر بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے پڑھنا شروع کر دی۔ یہ تبدیلی سُنت کے ذریعہ ہوئی، پھر یہ حکم کتاب اللہ کے ذریعے منسوخ ہو گیا:

﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرة : ١٤٤] ''تو اپنا منہ مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لو''۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان دونوں میں اصولیین کا اختلاف ہے اور اصح یہ ہے کہ دونوں کا نسخ ایک دوسرے کے ساتھ درست ہے، چونکہ دونوں ظنی الدلالت ہیں۔ علاوہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ......﴾ [النحل : ٤٤] ''(اور ان پیغمبروں کو) دلیلیں اور کتابیں دے کر (بھیجا تھا) اور ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تا کہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دو تا کہ وہ غور کریں'' اور یہ حدیث باب بھی ان کے مخالف نہیں، چونکہ اس کا مدار اس کی صحت و تحسین پر ہے، علاوہ ازیں یہ تاویل بھی ممکن ہے کہ یہ اس کے الفاظ کو منسوخ نہیں کرتی۔

قوله: و كلام الله ينسخ بعضه بعضا:

یہ مسئلہ اتفاقی ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، مثلاً آیات مسالمہ کا آیات قتال کے ذریعہ نسخ۔

منسوخ کی کئی اقسام ہیں:

① تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہوں۔ اس کا مصداق قرآنِ کریم کا وہ تمام حصہ ہے جو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ مبارکہ میں ''اِنساء'' کے ذریعے منسوخ ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ مروی ہے کہ سورۂ احزاب سورۃ بقرہ کے مثل و برابر تھی۔

② تلاوت باقی رہے، حکم منسوخ ہو۔ جیسا کہ یہ آیت کریمہ: ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ -[الكافرون : ٦] ''تم اپنے دین پر میں اپنے دین پر۔''

③ تلاوت منسوخ ہو جائے اور حکم منسوخ ہو۔ جیسا کہ آیت رجم: الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما البتة نکالاً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۔

④ سنت سے سنت کا نسخ۔ اسکا جواز بھی متفق علیہ ہے۔ اسکی مثال یہ حدیث مبارکہ ہے: کنت نهیتکم عن زیارة القبور الا! فزوروها: اس حدیث میں ناسخ و منسوخ دونوں یکجا ہیں۔ نسخ کی چوتھی قسم اگلی حدیث سے مستفاد ہوتی ہے۔

حدیث کا حدیث سے نسخ جائز ہے

۱۹۶: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَادِیْثَنَا یَنْسَخُ بَعْضُهَا بَعْضًا کَنَسْخِ الْقُرْاٰنِ ۔ (رواہ الدارقطنی)

أخرجه الدارقطنی فی سننه ٤/١٤٥ "النوادر" حدیث رقم ١٠۔

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہماری بعض احادیث بعض کو اس طرح منسوخ کرتی ہیں جس طرح قرآن کا بعض حصہ بعض کو منسوخ کر دیتا ہے۔

تشریح: بعض احادیث بعض کو منسوخ کرتی ہیں بشرطیکہ حدیث صحیح ہو اور ناسخ و منسوخ کی تاریخ (یعنی وقت) کا علم ہو۔ واضح رہے کہ تشبیہ صرف نسخ میں ہے انواع و اقسام میں تشبیہ مراد نہیں ہے۔

فرائض محرمات اور حدود کی رعایت رکھو

۱۹۷: وَعَنْ اَبِیْ ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِیِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ فَرَآئِضَ فَلَا تُضَیِّعُوْهَا وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَهِکُوْهَا وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَسَکَتَ عَنْ اَشْیَآءَ مِنْ غَیْرِ نِسْیَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْهَا۔ (روی الاحادیث الثلثة الدارقطنی)

أخرجه الدارقطنی فی سننه ٤/١٨٣ حدیث رقم ٤٢ من کتاب الرضاع وأخرج عن الدرداء معناه ٤/٢٩٧۔

ترجمہ: حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے چند فرائض کو مقرر کیا ہے لہٰذا تم ان کو ضائع نہ کرو۔ یعنی ان فرائض یا ان کے ارکان اور شرائط کو نہ چھوڑو اور چند چیزیں اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں۔ ان کی حرمت کو نہ توڑو اور چند حدود اللہ تعالیٰ نے مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور بعض امور کے بارے میں عمداً خاموشی اختیار کی ہے بغیر بھول جانے کے ان کے متعلق بحث نہ کرو۔ ان تینوں حدیثوں کو دارقطنی نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

ابو ثعلبہ۔ یہ ابو ثعلبہ جرہم بن نشب خشنی ہیں اور یہ اپنی کنیت سے مشہور ہیں۔ انہوں نے رضوان میں آنحضرت ﷺ سے بیعت

کی۔ آپ ﷺ نے ان کو قوم کے لوگوں کے پاس (تبلیغ اسلام کے لئے) بھیجا جو اسلام لے آئے۔ ابوثعلبہ شام میں آ گئے اور وہیں ۵۷ھ میں انتقال ہوا۔ ان سے مروی احادیث کی تعداد چالیس (۴۰) ہے۔ جرہم میں جیم اور ہاء دونوں مضموم ہیں۔

عرض مرتب: ملا علی قاری لکھتے ہیں جرثوم بن ناشر کے بیٹے ہیں۔ قضاعہ کے بطن خشن سے تعلق رکھتے ہیں۔ خشنی میں خاء معجمہ پر ضمہ اور شین معجمہ پر فتحہ ہے۔

تشریح: قوله: ان الله فرض فرائض فلا تضيعوها :

"فرائض": ہمزہ کے ساتھ، فریضة کی جمع ہے، بمعنی مفروضة، اور "تاء" وصفیت سے اسمیت کی طرف نقل کیے ہے۔

اس حدیث میں فرض کے اصطلاحی نہیں بلکہ عام معنیٰ مراد ہیں۔ یعنی وہ احکام شرعیہ جو قطعی ہیں۔ جیسا کہ ایمان، اسلام، نماز، زکوٰۃ، اور تمام فرائض علمیہ وعملیہ، خواہ وہ فرضِ کفایہ ہوں کہ فرض عین، خواہ ان کا لزوم کتاب اللہ سے معلوم ہوا ہو کہ رسول کی زبان سے۔

"فلا تضيعوها": تم ان کو ضائع نہ کرو۔ ضائع کرنے کی متعدد صورتیں ہیں، لہٰذا ضیاع کی ہر صورت ممنوع ہوگی۔

① فرائض کو بالکلیہ ترک کر دیا جائے۔ ② فرائض کی شرائط کو ترک کر دیا جائے۔ ③ فرائض کے ارکان کو ترک کر دیا جائے۔ ④ نیتِ سمعہ وریاء کے ذریعہ ضائع کر دیا جائے۔ (۵) عُجب وغرور کے ذریعہ ضائع کر دیا جائے۔

بعض محققین فرماتے ہیں:

قوله: و حرم حرمات فلا تنتهكوها :

چند چیزیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دی ہیں ان کے قریب بھی مت جاؤ چہ جائیکہ ان کا ارتکاب کرو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى﴾ [الاسراء: ۳۲] "اور زنا کے پاس بھی نہ جانا۔"

صاحب الصحاح لکھتے ہیں: انتهاك الحرمة کا مطلب ہے، غیر حلال چیزوں کا ارتکاب کرنا، اور بعض کا کہنا ہے انتهاك نام ہے محارم شرع کو چاک کرنے کا، (کذا ذكره السيد جمال الدين) میرک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صوفیہ کی ایک جماعت کے نزدیک انتهاك نام ہے، خواہشات شیطانی ونفسانی کی متابعت، دنیا کی طرف متوجہ ہونے، عقبیٰ سے اعراض کرنے کا، چونکہ محبّ پر لازم ہے کہ وہ ہر مطلوب سے کٹ جائے بلکہ اپنے محبوب کے علاوہ سب سے کٹ جائے۔

قوله: وحد حدودا فلا تعتدوها:

اللہ نے مختلف افعال واعمال کی حدود مقرر کی ہیں، مثلاً قتل وضرب وغیرہ کی، ان حدود سے تجاوزت مت کرو، ان حدود میں نہ کمی کرو، نہ زیادتی کرو۔ مرتب عرض کرتا ہے کہ حدود کی لغوی، اصلاحی تعریف، وجہ تسمیہ اور اس کی مشروعیت کے محاسن کیلئے مرقات جلد ہفتم کتاب الحدود کا ابتدائیہ ملاحظہ فرمائیے۔

قوله: وسكت عن اشياء من غير نسيان فلا تبحثوا عنها:

"نسیان" کہتے ہیں ترکِ فعل بلا ارادہ، بعد از حصول علم کو، بخلاف سہو کے۔

بعض چیزوں کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے بایں طور کہ ان اشیاء کا حکم شرعی، وجوب، حرمت وحلت وغیرہ کا ذکر نہیں کیا، اور یہ عدم ذکر اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ بھول گیا (بلکہ اپنے قصد وارادہ سے ایسا کیا ہے)۔تم ان چیزوں میں اپنی طرف سے بحث مت کرو، حدیث مبارکہ کا یہ جملہ ایک بہت بڑے اصول کی اصل ہے، وہ اصول ہے: أن الاصل فی الأشياء الاباحة اس اصول کی ایک دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا......﴾: [البقرة: ٢٩] ''وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لئے پیدا کیں پھر آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو ٹھیک سات آسمان بنادیا اور وہ ہر چیز سے خبردار ہے''۔

بعض عارفین فرماتے ہیں:

اسنادی حیثیت:قال النووی فی الأخیر: حدیث حسن، رواہ الدارقطنی وغیرہ۔

امام نووی رحمہ اللہ آخری حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے اس کو دارقطنی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔
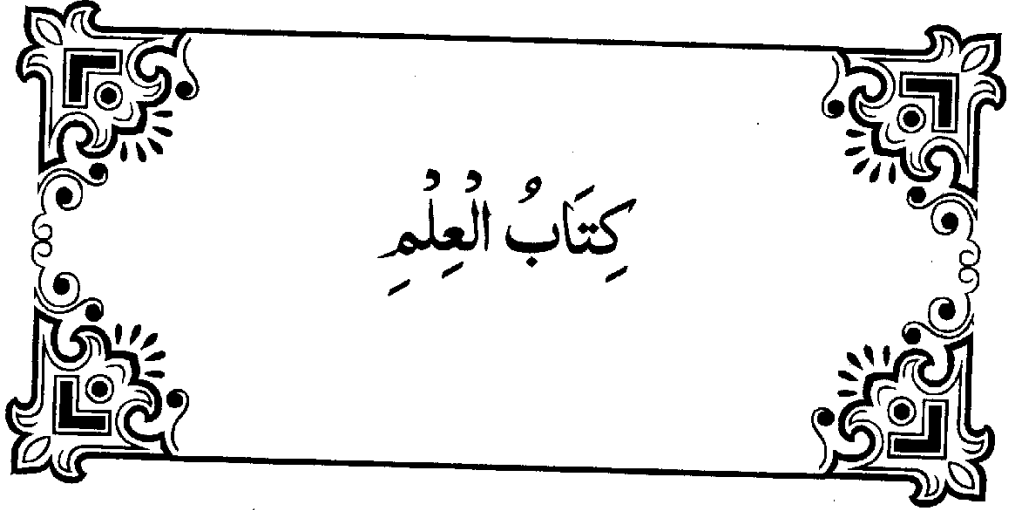
یہ کتاب علم اور اس کے سیکھنے سکھانے کی فضیلت اور شرعی علم کے بیان کے بارے میں ہے۔ "علم" کتاب وسنت سے "اعم" ہے۔ لہٰذا "باب الاعتصام" کو ذکر کرنے کے بعد اس کا ذکر تعمیم بعد از تخصیص کی قبیل سے ہے۔

علم کیا ہے؟

علم مشکوٰۃِ نبوت کے چراغ سے حاصل ہونے والا وہ نور ہے جو مؤمن کے قلب میں جاگزین ہوتا ہے۔ اور مشکوٰۃِ نبوت (نبوت کے چراغدان) سے مراد وہ اقوالِ محمدیہ، افعالِ احمدیہ اور احوالِ محمودیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) ہیں، جن کے ذریعے مؤمن اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے افعال واحکام (کی معرفت) کی طرف راہنمائی پاتا ہے۔

علم کی اقسام:

اگر علم کسی انسان کے واسطے حاصل ہو تو کسبی ہے ورنہ علم لدنی ہے، جس کی قسمیں وحی، الہام اور فراست ہیں۔

ایک دوسرے اعتبار سے علم کی تین قسمیں ہیں: ① علم الیقین ② عین الیقین ③ حق الیقین ۔

چنانچہ لکھتے ہیں: علم اليقين ما كان من طريق النظر والاستدلال وعين اليقين ما كان بطريق الكشف والنوال، وحق اليقين ما كان بتحقيق الانفصال عن لوث الصلصال لورود الوصال

وحی کی لغوی اصلاحی تعریف:

وحی، لغت میں تیزی کے ساتھ اشارہ کرنے کو کہتے ہیں۔

اور اصطلاحاً اُس کلامِ الٰہی کو کہتے ہیں جو قلبِ نبی علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔

اور ایسا کلام جس کے معنی شارع علیہ السلام پر نازل کیے جاتے ہیں اور پھر نبی علیہ السلام اسے اپنے الفاظ میں تعبیر فرماتے ہیں وہ حدیث نبوی ہے۔

یہ کلام کبھی کبھار محل مشہود میں بغیر کسی واسطہ کے ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى﴾ ''پھر خدا نے اپنے بندے کی طرف جو بھیجا سو بھیجا۔'' [سورة النجم: ١٠]

اور کبھی فرشتے کو نازل فرما کر ہوتا ہے، یعنی اسے فرشتوں کی شکل سے انسانی شکل میں منتقل کر کے بھیجا جاتا ہے۔ اسکی تحقیق یہ ہے کہ متکلم حقیقی تو حق تعالیٰ شانہٗ ہی ہوتے ہیں لیکن اوّلاً حضرت جبرئیلؑ کے واسطے سے حضرت محمد ﷺ کے واسطے سے اور ثانیاً حضور ﷺ کے واسطے سے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اور ثالثاً صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واسطے سے تابعین سے تکلم فرماتے ہیں اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

اور کبھی (اس کلام کا القاء) نبی اکرم ﷺ کے قلب مبارک پر حضرت جبریل علیہ السلام کے پھونکنے سے ہوتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام بغیر کسی صورت میں متمثل ہوئے اس کلام کے معنی نبی اکرم ﷺ کے قلب انور میں القاء فرما دیتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: **ان روح القدس نفث فی روعی۔**

الہام کی تعریف:

الہام لغت میں پہنچا دینے کو کہتے ہیں۔ اور یہ وہ علم ہوتا ہے، جسے اللہ تعالیٰ غیب سے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿قُلْ اِنَّ رَبِّىْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ......﴾ [سورة سبا: ٤٨] ''کہہ دو کہ میرا پروردگار اوپر سے حق اتارتا ہے اور وہ غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔''

فراست کی تعریف:

فراست ایسا علم ہے جو غیب سے صورتوں کے آثار کے ظاہر ہونے کے سبب منکشف ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: **اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله**۔ مؤمن کی فراست سے بچو، چونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

الہام اور فراست میں فرق:

الہام اور فراست میں فرق یہ ہے کہ فراست صورتوں کے آثار و علامات کے ظہور کے واسطے سے امور کو منکشف کرتی ہے۔ اور الہام بغیر کسی واسطے کے امور کو کھولتا ہے۔

الہام اور وحی میں فرق:

الہام اور وحی کے درمیان فرق یہ ہے کہ الہام وحی کے تابع ہوتا ہے۔ لیکن اس کا عکس نہیں ہوتا۔

علم کی کچھ خاص اقسام:

علم کی قسمیں: امام نوویؒ فرماتے ہیں: علوم دو طرح کے ہیں: ① علوم شرعیہ، ② علوم غیر شرعیہ۔

علوم غیر شرعیہ میں سے بعض علوم حرام، بعض مکروہ اور بعض مباح ہیں۔ مثلاً فلسفہ، شعبدہ بازی، رمل، علوم طبیعیہ اور جادو

وغیرہ حرام ہیں۔ البتہ تحریم کے درجات مختلف ہیں۔ علوم مکروہہ کی مثال مولدین کے غزلیہ اشعار، اور بہادری کے اشعار اور مباح جیسا کہ ان کے وہ اشعار کہ جن میں گھٹیا پن نہ ہو۔ شبہ کی طرف لے جانے والے نہ ہوں اور خیر سے روکنے والے نہ ہوں۔
(ماخوذ از شرح حدیث ۳۵۵۱)

الفصل الاول:

علم کو عام کرو

۱۹۸: عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَةً وَحَدِّثُوْا عَنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ وَلَا حَرَجَ وَمَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ۔

(رواہ البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ٤٩٦/٦ حدیث رقم ٣٤٦١۔ وأخرجه الترمذی فی السنن ٣٩/٥ حدیث رقم ٢٦٦٩۔ وأحمد۔ فی المسند ١٥٩/٢۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری طرف سے پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت اور حکم ہو اور بنی اسرائیل سے جو باتیں سنو ان کو آگے بیان کر سکتے ہو اس میں کوئی حرج نہیں اور جو آدمی قصداً میری طرف جھوٹ کی نسبت کرے اس کو چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں تلاش کرے۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: بلغوا عنی:

اس کا مطلب ہے کہ مجھ سے جو بات بھی تم سنو اور میرے اقوال و افعال اور تقریرات میں سے جو بھی بالواسطہ یا بلا واسطہ تم حاصل کرو اسے لوگوں تک پہنچاؤ۔ اور جس قدر ممکن ہو اپنی استطاعت کے مطابق اس کے ذریعے انہیں فائدہ پہنچاؤ۔

"ایة" لغت میں علامتِ ظاہرہ کو کہتے ہیں۔

یعنی جو بات پہنچائی جا رہی ہے، وہ چاہے ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔ علامہ زین العرب فرماتے ہیں کہ آیت اس لیے فرمایا کہ تبلیغ کے باب میں یہ کم سے کم چیز ہے جو فائدہ مند ہو سکتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "حدیثا" اس لئے نہیں فرمایا کہ وہ تو بطریق اولیٰ سمجھ میں آ رہی ہے۔ اس لئے کہ آیات کی نشر و اشاعت ان کے تواتر کی وجہ سے حاملین کی کثرت اور باری تعالیٰ کے ارشاد: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ [سورۃ الحجر: ۹] "بیشک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں" کے بموجب ان کو ضائع ہونے اور تحریف سے بچانے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُٹھانے کے باوجود جب آیات کی تبلیغ واجب ہے تو حدیث جبکہ اس کیلئے مذکورہ باتیں نہیں، وہ تبلیغ کے زیادہ لائق ہے۔ یا تمام معجزات میں سے چونکہ آیات کے باقی رہنے کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے نقل کا بہت زیادہ اہتمام تھا، اور آیات میں ان کے الفاظ کا متواتر ہونا بھی ضروری تھا، اس لئے ان کو نقل کرنے اور یاد رکھنے کی ضرورت بھی تھی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ایة" فرمایا۔ آیت

(قرآنِ کریم کے اس حصے) کو کہتے ہیں جس پر سورت منقسم ہوتی ہے۔ دوسرا قول زیادہ ظاہر ہے۔ جیسا کہ یہ بات مخفی نہیں۔

مظہرؒ کہتے ہیں کہ آیت سے مراد کلام مفید ہے۔ جیسے کہ من صمت نجا' والدین النصیحة مطلب یہ ہے کہ میری طرف سے لوگوں تک میری احادیث پہنچاؤ۔ اگر چہ وہ تھوڑی ہی ہوں۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ (جب یہ بات ہے تو) پھر ولو ایة کیوں فرمایا اور ولو حدیثاً کیوں نہیں فرمایا، حالانکہ مراد یہی تھا۔ تو ہم کہیں گے کہ اس کی دو وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی اس میں داخل ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی طبائع قراءت قرآن، تعلم قرآن، تعلیم ونشر کی طرف مائل ہیں اور اس لئے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔

اور زیادہ قوی بات یہ ہے کہ اس سے مراد کلامِ مفید ہے اور وہ آیت اور حدیث سے اعم ہے۔ البتہ آیت کا لفظ اس کی شرافت کی وجہ سے اختیار کیا گیا۔

یا اس وجہ سے کہ آیت سے مراد آپ ﷺ کی طرف وحی کیا گیا حکم ہے۔ جو کہ متلو اور غیر متلو سے اعم ہے۔ کیونکہ وحی عام ہے خواہ وہ جلی ہو یا خفی۔

یا ایة اس لئے فرمایا کہ آپ ﷺ کے قلب مبارک سے جو بات بھی صادر ہوئی وہ آپ ﷺ کی رسالت پر دال ہے۔ اس لئے کہ کسی اُمی سے اس طرح کے علوم کا ظہور ایک معجزہ ہے۔ واللہ اعلم۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث شریف میں بہت سے فوائد ہیں:

① علم کی اشاعت پر ابھارا گیا ہے۔ ② حدیث کے کچھ حصے کی تبلیغ کا جواز بتلانا، جیسا کہ یہ صاحب مصابیح اور صاحب مشارق کی عادت ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس لئے کہ مقصود حدیث کے لفظ کی تبلیغ ہے جبکہ وہ مفید ہو، خواہ حدیث پوری ہو یا نہ ہو۔

قوله: وحدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج:

"حرج"، تنگی کو اور گناہ کو کہتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بنی اسرائیل پر جھوٹ بولنے کے مباح ہونے کے معنی میں ہے بلکہ ان سے بات نقل کرنے میں گناہ کے وہم کو دور کرنے کیلئے ہے۔ اگر چہ اس بات کی صحت اور اس کی اسناد بُعد زمان کی وجہ سے معلوم نہ ہو۔ شرح السنہ میں اسی طرح ہے۔ اور علامہ زین العرب نے بھی اس بات میں صاحبِ شرح السنہ کی پیروی کی ہے۔ اور علامہ مظہرؒ نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن یہ اس صورت کے ساتھ مقید ہے جبکہ ہم یقینی یا ظنی طور پر ان کے قول کو جھوٹا نہ سمجھیں۔

علامہ سید جمال الدینؒ فرماتے ہیں کہ ان کی مرویات میں اشتغال سے منع کرنے اور اس حدیث سے سمجھ آنے والی رخصت میں مطابقت کی صورت یہ ہے کہ یہاں پر ان سے باتیں نقل کرنے کی اجازت سے مراد آیاتِ عجیبہ کے قصوں کا نقل کرنا ہے۔ جیسے عوج بن عنق کی حکایت، بچھڑے کی پوجا کی وجہ سے بطور توبہ کے بنی اسرائیل کے اپنے آپ کو قتل کرنے کی حکایت اور قرآنِ کریم میں مذکور قصوں کی تفصیل ہے۔ اس لئے کہ ان چیزوں میں عقل والوں کیلئے عبرت اور موعظت کا سامان ہے۔ اور وہاں جو نہی ہے اس سے مراد ان کی کتابوں کے احکام کو نقل کرنے سے منع کرنا ہے۔ اس لئے کہ تمام شریعتیں اور ادیان ہمارے

نبی ﷺ کی شریعت کے ذریعے منسوخ کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن ابن قتیبہ فرماتے ہیں جیسا کہ ابہریؒ نے اس کو نقل کیا ہے کہ عوج سے جو یہ بات مروی ہے کہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لشکر (جب کہ وہ تین لاکھ کی تعداد میں تھے) کی بقدر ایک پہاڑ بلند کیا' تا کہ اسے ان پر گرا دے تو ایک ہدہد نے اس میں اپنی چونچ سے ٹھونگیں ماریں اور اس میں سوراخ کر دیا۔ تو وہ پہاڑ اس کی گردن میں پڑ گیا۔ یہ بالکل جھوٹ ہے، جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

''تنبیہ الغافلین'' میں حضرت فقیہ ابو اللیث سمرقندی نے اپنی سند سے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''بنی اسرائیل سے روایت بیان کرو، (اس میں کوئی) حرج نہیں۔ اس لئے کہ ان میں بہت سے عجیب واقعات گزرے ہیں''۔ پھر آپ ﷺ یہ حدیث بیان فرمانے لگے کہ ''بنی اسرائیل کا ایک گروہ اپنے گھروں سے چلا یہاں تک کہ وہ ایک قبرستان میں پہنچے اور کہنے لگے کہ ''اگر ہم نماز پڑھ کر اپنے پروردگار سے دعا کریں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے کسی مردے کو قبر سے (زندہ حالت میں) نکالے جو ہمیں موت کے بارے میں بتائے تو یہ بہتر ہوگا''۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر انہوں نے اپنے پروردگار سے دُعا مانگنی شروع کی، اسی دوران اچانک ایک آدمی نے اپنی قبر سے سر بلند کیا اس کی حالت یہ تھی کہ بالوں کی سفید جو کالے رنگ کے ساتھ ملی ہوئی تھی اس کے علاوہ اس کا رنگ بالکل سیاہ تھا۔ وہ کہنے لگا۔ ''اے لوگو! تم کیا چاہتے ہو، اللہ کی قسم! میں ستر سال پہلے مرا تھا لیکن ابھی تک گویا کہ مجھ سے موت کی کڑواہٹ نہیں گئی۔ سو تم دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی حالت کی طرف لوٹا دے''۔ اس آدمی کی دونوں آنکھوں (پیشانی) پر سجدوں کے نشانات تھے۔

قولہ: ومن كذب علي متعمدًا فليتبوّا مقعده من النار :

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''**كذب عليه**'' کا معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ کی طرف جھوٹی بات منسوب کی جائے، خواہ وہ آپ ﷺ کے فائدے کیلئے ہو یا نقصان کیلئے۔ اھ۔

اس تشریح سے ان لوگوں کے خیال کا دفعیہ ہو گیا جو عبادت پر شوق دلانے کیلئے احادیث وضع کرنے کو جائز کہتے ہیں۔ جیسا کہ بعض جاہل صوفیوں سے سورتوں کے فضائل بیان کرنے اور دن اور رات کی نمازوں وغیرہ کے بارے میں احادیث وضع کرنے کی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ اور زیادہ قوی قول یہ ہے کہ علیٰ کے ساتھ کذب کو متعدی کرنا افتراء کے معنی کی تضمین کیلئے ہے۔

متعمدًا: یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ لیکن حال مؤکدہ نہیں اس لئے کہ بعض اوقات جھوٹ کا وقوع بغیر ارادے کے بھی ہوتا ہے۔ اور اس قید میں غیر تعمد کی صورت میں عدم دخول نار پر تنبیہ ہے۔

''**تبوّء الدار**'': اس وقت کہا جاتا ہے جب اس گھر کو وہ اپنا مسکن بنالے۔

''**فليتبوّا مقعده من النار**'' یہ ہے تو امر لیکن خبر کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں ٹھکانہ دیں گے۔ اور اس کی تعبیر صیغۂ امر کے ساتھ اہانت کیلئے ہے۔ اسی لئے ایک قول یہ ہے کہ اس میں امر تحکم اور تہدید کیلئے ہے۔ اس لئے کہ اس میں تغلیظ اور تشدید زیادہ ہے بنسبت اس کے کہ یوں کہا جاتا، **كان مقعده من النار**۔ اسی وجہ سے یہ کبیرہ گناہ ہے۔

بلکہ شیخ ابو محمد جوینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نبی پر جھوٹ باندھنا کفر ہے۔ اس لئے کہ اس پر استخفاف بالشریعۃ مترتب ہوتا ہے۔ اور اسی حدیث سے یہ مسئلہ بھی لیا گیا کہ جو شخص حدیث اس حالت میں پڑھتا ہے کہ اسے علم ہے کہ وہ اس میں غلطی کر

رہا ہے، خواہ وہ غلطی حدیث کی ادائیگی میں ہو یا اس کے اعراب میں، وہ اس وعید شدید میں داخل ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی غلطی کی وجہ سے حضور ﷺ پر جھوٹ بولنے والا ہے۔

اس حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو شخص کوئی حدیث نقل کرتا ہو حالانکہ اسے اس حدیث کا جھوٹ ہونا معلوم ہو وہ آگ کا مستحق ہوگا۔ الا یہ کہ وہ توبہ کرے۔ البتہ وہ شخص جو حدیث حضور ﷺ سے کسی راوی کے ذریعے نقل کرے یا کسی کتاب میں دیکھے لیکن اس کا جھوٹ اسے معلوم نہ ہو تو وہ اس وعید میں داخل نہیں۔

امام طیبی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ باندھنے سے بچنے کو واجب قرار دیا گیا ہے۔ بایں طور کہ نبی ﷺ سے نقل سند کے ساتھ صرف وہی حدیث بیان کرے جو صحیح ہو۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شارح (امام طیبی) کے کلام میں ضعیف حدیث بیان کرنے کی مطلقاً حرمت کا جو وہم پیدا کیا ہے، وہ مردود ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ امام طیبی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے قول **الّا بما یصح** الخ میں صحت سے مراد لغوی صحت ہے، جس کا معنی ثبوت ہے نہ کہ اصطلاحی صحت۔ ورنہ اس سے حدیثِ حسن کی تحدیث کی حرمت کا وہم بھی پیدا ہوگا۔ حالانکہ نہ تو وہ اس معنی کو اچھا سمجھتے ہیں اور نہ ہی ان سے اس کا گمان کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ بات (سب کو) معلوم ہے کہ فروع (احکام) پر دلالت کرنے والی اکثر احادیث حسن ہیں۔ اور یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف احادیث بھی معمول بہ ہوتی ہیں۔ لہٰذا امام طیبی رحمہ اللہ علیہ کے کلام کو اس معنی پر محمول کرنا جو ہم نے بیان کیے ہیں، متعین ہے۔ اور ان کا کلام بھی اسی کی طرف مشعر ہے اس لئے کہ انہوں نے بنقل الاسناد الصحیح نہیں فرمایا۔ لیکن ان کے کلام سے اس بات کا وہم ضرور پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اسناد کا ذکر ضروری ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ آپ ﷺ سے کوئی ایسی حدیث روایت کی جائے، جس کا معنی صحیح ہو لیکن اس کی سند نہ ہو تو اس کو آپ ﷺ کی طرف سے بیان کرنا جائز نہیں۔

"**الاسناد**": میں لام عہد کا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اسناد جو محدثین کے ہاں معتبر ہو۔ ورنہ تو حدیث موضوع کی بھی سند ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر سند نہ ہوتی تو جس کے جی میں جو آتا وہ کہہ گزرتا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سند اس لئے ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے موضوع حدیث کی غیر موضوع سے پہچان و امتیاز ہو، اس کی معرفت فرائض کفایہ میں سے ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ "**بلغوا عنی**" میں دو جہتوں کا احتمال ہے:

پہلی جہت یہ ہے کہ سند کا اتصال اس کے آخر تک اس طرح ہو کہ ثقہ اپنے ہم مثل (ثقہ) سے روایت کرے۔ اس لئے کہ "**التبلیغ**" بلوغ سے ہے۔ اور اس کے معنی ہیں شئی کو اس کی غایت تک پہنچانا۔

دوسری جہت یہ ہے کہ لفظ کو جس طرح سنا بغیر کسی تبدیلی کے اسی طرح اداء کرنا۔ اور حدیث میں یہ دونوں جہتیں مطلوب ہیں۔ اسلئے کہ **بلغوا** آپ ﷺ کے ارشاد "**حدثوا عن بنی اسرائیل**" کے مقابل واقع ہوا ہے۔

تخریج: اسی طرح امام احمد اور ترمذی نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ البتہ آپ ﷺ کے ارشاد **من کذب علی الخ** کو

امام احمد، شیخین، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابوداؤد، حاکم طبرانی، دارقطنی، خطیب (بغدادی) اور ابن عدی رضی اللہ عنہ وغیرہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت سے نقل کیا ہے۔

اسنادی حیثیت: اس حدیث کی اسنادی حیثیت کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں:

① علامہ ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث "من كذب علي" متواتر ہے۔ اور احادیث میں سے کوئی بھی حدیث تواتر میں اس کے مرتبے کی نہیں۔ اس لئے کہ صحابہ میں اس کے نقل کرنے والوں کی ایک بڑی جماعت ہے۔

② ایک قول یہ ہے کہ عشرہ مبشرہ سمیت ستر صحابہ اس حدیث کے راوی ہیں۔

③ ایک قول یہ ہے کہ اس حدیث کے علاوہ ہمیں اور ایسی کوئی حدیث معلوم نہیں جس (کی روایت) میں عشرہ مبشرہ اکھٹے ہوں۔ اس کے بعد ہر زمانے میں اس کے راویوں کی تعداد بڑھتی ہی رہی۔

جانتے ہوئے جھوٹی حدیث بیان کرنے والا جھوٹا ہے

۱۹۹: وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ وَالْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَا: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَدَّثَ عَنِّيْ بِحَدِيْثٍ يَرٰى اَنَّهٗ كَذِبٌ فَهُوَ اَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ . (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في مقدمة صحيحه ٩/١۔ وأخرجه الترمذي عن المغيرة في سننه ٣٥/٥ حديث رقم ٢٦٦٢ وابن ماجة في مقدمة سننه ١٥/١ حديث رقم ٣٩ عن سمرة۔ وحديث رقم ٤١ عن المغيرة وأخرجه أحمد في المسند عن سمرة ١٤/٥ وعن المغيرة ٢٥٠/٤۔

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص میری طرف نسبت کر کے کوئی ایسی حدیث بیان کرے جس کے بارے میں اس کا یہ خیال ہو کہ وہ حدیث جھوٹی ہے تو وہ جھوٹے آدمیوں میں سے ایک جھوٹا شخص ہے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

المغیرۃ بن شعبۃ۔ یہ مغیرہ شعبہ کے بیٹے ہیں۔ خاندانی اعتبار سے "ثقفی" ہیں۔ غزوۂ خندق کے سال مسلمان ہوئے۔ ہجرت کر کے مدینہ پہنچے پھر کوفہ میں رہ پڑے، وہاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے کوفہ کے امیر مقرر ہوئے۔ اور وہیں ۵۰ھ میں بعمر ستر سال وفات پائی۔ اس وقت یہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی جانب سے امیر تھے۔ چند لوگ ان سے روایت کرتے ہیں۔ مغیرہ میم کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ ہے۔ ضمہ زیادہ مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے زمانۂ اسلام میں تین سو عورتوں سے شادی کی ہے۔

تشریح: قوله: من حدث عني بحديث يرى انه كذب ...... :

"یری": "الاراءۃ" سے یاء کے ضمہ کیساتھ منقول ہے۔ یعنی "یظن" وہ گمان کرتا ہے۔ اور الرأی سے یاء کے فتحہ سے منقول ہے، جو "یعلم" کے معنی میں ہے۔

علامہ سید جمال الدین رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "یری" بمعنی "یعلم" میں یاء پر فتح کو جائز قرار دیئے جانے میں تأمل ہے۔ شاید تامّل کی وجہ یہ ہے کہ اس مقام پر "ظن" بھی کافی ہے، بلکہ مقصد کا فائدہ دینے میں زیادہ ابلغ ہے لہٰذا یہاں پر علم تام کی طرف احتیاج نہیں۔ اور اس تامّل کا دفعیہ بھی ممکن ہے بایں طور کہ علم کو بمعنی اعم مراد لیا جائے خواہ علم یقینی ہو یا ظنی۔ واللہ اعلم۔

امام محی الدین النووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "یری" کو ہم نے یاء کے ضمہ کے ساتھ اور "الکاذبین" کو جمع ہونے کی وجہ سے باء کے کسرہ اور نون کے فتح کے ساتھ ضبط کیا ہے۔ اور ان دونوں لفظوں میں یہی مشہور قول ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک روایت جمع کے صیغے کے ساتھ ہے۔ اور ابونعیم اصفہانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے مستخرج میں حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو تثنیہ کے صیغہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور اس کی اس بات پر استدلال کیا ہے اس (جھوٹی) حدیث کو روایت کرنے والا اس شخص کے ساتھ شریک ہے جس نے اس جھوٹ کی ابتداء کی۔ اس کے بعد ابونعیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے "الکاذبین او الکاذبین" تثنیہ اور جمع میں شک کے ساتھ اس حدیث کو روایت کیا۔

بعض ائمہ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے "یری" جبکہ یعلم کے معنی میں ہو تو اس میں یاء کے فتح کو جائز قرار دیا ہے۔ اور یہ بات زیادہ ظاہر اور اچھی ہے۔ البتہ اگر یاء کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس وقت اس کا معنی یظن ہوگا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ فتح کے ساتھ بھی بمعنی یظن کے ہو۔ اس لئے کہ "رأی" بظن کے معنی میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ ایسی حدیث کا راوی گنہگار نہیں ہوگا اِلَّا یہ کہ وہ اس حدیث کو یقینی طور پر یا ظنی طور پر جھوٹا سمجھتا ہو۔ لیکن اگر یقینی اور ظنی طور پر اس کے جھوٹ کا اس کو علم نہ ہو تو اس کو روایت کرنے میں اس پر کوئی گناہ نہیں اگرچہ اس کے علاوہ کوئی اور شخص اس حدیث کو جھوٹا ہونے کا علم یا گمان رکھتا ہو۔ (انتہی کلام النووی)

انہ: یعنی حدیث۔ کذب: یہ کاف کے فتح اور ذال کے فتحہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ اور ذال کے کسرہ اور ذال کے سکون کو بھی جائز قرار دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اس حدیث کے کذب کو بیان نہ کرے۔ فھو: یہ ھاء کے ضمہ اور سکون دونوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ یعنی اگرچہ ایک حدیث ہی بیان کرے۔

"الکاذبین": ناقلین کی کثرت کا اعتبار فرما کر جمع کا صیغہ استعمال کیا۔ علامہ اشرف رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ (جھوٹی حدیث) روایت کرنے والے کو جھوٹا اس لئے فرمایا کہ وہ اس حدیث کو پھیلانے میں (حضور ﷺ پر) افتراء کرنے والے کی مدد کرتا ہے، اور اس کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ وہ اس شخص کی مانند ہے جو ظلم کرنے میں کسی ظالم کی مدد کرے۔

جس کو اللہ خیر سے نوازنا چاہتے ہیں اس کو دین کی سمجھ دی جاتی ہے

۲۰۰: وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَاِنَّمَآ اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِيْ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۶۴/۱ حدیث رقم ۷۱ ومسلم الی قوله "ویعطی اللّٰه" ۷۱۹/۲ حدیث

رقم(۱۰۰-۱۰۳۷) والدارمی فی سننه ۱/۸۵حدیث رقم۲۲٤- ومالك بعضه فی الموطأ ۲/۹۰۰حدیث ۸-وأحمد فی المسند عن معاویة٤/۹۲-ورواه عن ابن عباس الترمذی ٥/۲۸حدیث رقم ۲٦٤٥وقال حسن صحیح وأحمد فی مسنده ۱/۳۰٦والدارمی ۱/۸۵حدیث رقم ۲۲۵- وأخرجه ابن ماجة عن أبی هریرة۱/۲۲۰حدیث رقم۲۲۰-

ترجمہ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی کیلئے اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ کرتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے اور میں علم کو تقسیم کرنے والا ہوں اور علم دینے والا تو اللہ ہی ہے۔(بخاری و مسلم)

تشریح: قوله من یرد الله به خیرا یفقهه فی الدین:

" خیرا "میں تنوین 'تفخیم " کیلئے ہے۔"ای خیرا کثیرا"۔

" یفقه": قاف کی تشدید کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ اس کو عالم بنا دیتے ہیں۔دین سے مراد شریعت وطریقت اور حقیقت کے احکام ہیں۔"تفقه"اصطلاحی فقہ جو کہ شریعت کے عملی احکام کے ساتھ خاص ہے، اس کے ساتھ مختص نہیں، جیسا کہ یہی گمان کیا جاتا ہے۔چنانچہ امام دارمی رحمۃ اللہ علیہ حضرت عمران سے روایت بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے ایک دن ان کے قول میں ایک چیز کے بارے میں ان سے عرض کیا کہ "اے ابوسعید! کیا فقہاء کرام نے اس طرح فرمایا ہے"۔انہوں نے فرمایا:"تیرا ناس ہو، کیا تو نے کبھی کسی کو دیکھا ہے۔فقیہ تو وہ ہوتا ہے جو دنیا سے بے رغبت ہو، آخرت کی طرف رغبت رکھتا ہو، دین کے معاملے میں صاحبِ بصیرت ہو، اپنے پروردگار کی عبادت پر دوام رکھتا ہو۔ایک روایت میں ہے کہ "فقیہ تو وہ ہوتا ہے جو دِل کی آنکھ رکھتا ہو، اور اپنے ربّ کو دیکھتا ہو۔اس قول کی تائید اس مضمون سے ہوتی ہے جو اس روایت میں وارد ہوا ہے:

"من یرد الله به خیرا یفقهه فی الدین ویلهمه رشده"

اس کو ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے حلیۃ میں نقل کیا ہے۔

قوله: وانما انا القاسم والله یعطی :

یعنی میں علم کو تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ علم کی بنیاد پر اس کی فہم، معانی میں غور و تفکر اور اس کے مقتضی پر عمل عطا کرنے والے ہیں۔طیبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں "وانما" میں واؤ "یفقه" کے فاعل یا اس کے مفعول کے حال کو بتانے کیلئے ہے۔معنی یہ ہے کہ میں تمہارے درمیان علم تقسیم کرتا ہوں اور تم سب میں ہر ایک اس کے مناسب دیتا ہوں۔اور اللہ تعالیٰ تم میں سے جس کو چاہتے ہیں اس علم کی فہم کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔

• حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسی وجہ سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عقل وفہم میں فرق تھا، باوجود اس کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سب کیلئے برابر تھی بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد آنے والے بعض حضرات فہم اور استنباط میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فائق تھے، جیسا کہ آگے آنے والی حدیث "رب حامل فقه لیس بفقیه ورب حامل فقه الی من هو افقه منه"اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ آپ ﷺ کے ارشاد "أنا قاسم الخ" کا معنی یہ ہے کہ میں تمہارے درمیان مال تقسیم کرتا ہوں جبکہ اللہ تعالیٰ مال عطا فرماتے ہیں۔ لہٰذا تقسیم میں تفاضل کی وجہ سے تمہارے دِلوں میں ناراضی اور بدحالی نہیں ہونی چاہئے اسلئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ جیسا کہ بعض شراح نے کہا ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں تمہارے درمیان علم تقسیم کرتا ہوں جبکہ اللہ تعالیٰ علم عطا فرمانے والے ہیں۔ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ دونوں باتوں کو جمع کرنے میں کوئی ممانعت نہیں، اگرچہ یہ مقام علم مراد لینے تقاضہ کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ ﷺ نے "معطی" نہیں فرمایا اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کی عطاء میں ہر ہر گھڑی تجدد پایا جاتا ہے۔

دین کی سمجھ رکھنے والے بہتر ہیں

۲۰۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلنَّاسُ مَعَادِنُ كَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْاِسْلَامِ اِذَا فَقِهُوْا۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم من حديث طويل ٤/٢٠٣١ حديث (١٦٠-٢٦٣٨)۔ أما لفظ "خيارهم في الجاهلية خيارهم في الاسلام اذا فقهوا" فهو متفق عليه من حديث أبي هريرة "قيل يارسول الله من أكرم الناس......أخرجه البخاري في صحيحه ٦/٣٨٧ حديث رقم ٣٣٥٣۔ ومسلم في صحيحه ٤/١٨٤٦ حديث (١٦٨-٢٣٧٨)۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انسانوں کی اسی طرح کانیں ہیں جس طرح سونے اور چاندی کی کان ہوتی ہے جو لوگ زمانہ جاہلیت میں بہتر تھے وہ اسلام کے زمانہ میں بھی بہتر ہیں اگر وہ دین میں سمجھ حاصل کرلیں اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: الناس معادن كمعادن الذهب والفضة:

''معادن'': یہ معدن کی جمع ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ المعدن، مستقر کے معنی میں ہے۔ اور یہ عدنت البلد اذا توطنته سے مأخوذ ہے۔ یعنی عدنت البلد میں نے شہر میں اقامت اختیار کرلی اس وقت کہا جاتا ہے جب آپ اس کو اپنا وطن بنالیں۔ اور اسی سے ہیرے جواہرات کے مستقر کو معدن کہتے ہیں۔ اور "معادن" مبتداء کی خبر ہے۔

دو توجیہات میں سے کسی ایک کو اختیار کیے بغیر ''معادن'' کا حمل ''الناس'' پر درست نہیں ہوسکتا۔

① یہ کلام تشبیہ پر مبنی ہے۔ جیسے کہ آپ کہیں "زید اسد" اس صورت میں "کمعادن الذھب" اس سے بدل واقع ہو گا۔ معنی ہوگا "الناس کمعادن" لوگ کانوں کی طرح ہیں۔

② یا اس بات پر مبنی ہے کہ "معادن" مجاز ہے تفاوت سے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ لوگ مکارمِ اخلاق اور عمدہ صفات میں اس طرح تفاوت ہے جس طرح سونے کی کانوں میں تفاوت اور فرق ہوتا ہے۔ اور یہاں پر تفاوت سے مراد نسب شرافت اور رذالت میں فرق ہے۔ جس پر آپ ﷺ کا یہ اشاد جو کہ ایک اور حدیث میں وارد ہے دلالت کرتا ہے: "فعن

معادن العرب تسالونني؟" الخ یعنی فرمایا تم مجھ سے عرب کے معادن کے بارے میں پوچھتے ہو؟ قالوا: نعم! صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا جی ہاں!۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عرب کی وہ بنیادیں اور جڑیں جن کی طرف وہ منسوب ہیں اور انکی وجہ سے ایک دوسرے پر فخر کرتے ہیں۔ ان انسابکا لوگوں کو معادن اس لئے قرار دیا گیا کہ ان میں مختلف استعدادیں پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا ان میں سے تو بعض وہ ہیں جو معادن کے مراتب کے لحاظ سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فیض کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور بعض قبول کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

معادن سے مراد جیسا کہ ابہریؒ نے ذکر کیا ہے اخلاق کا مستقر ہے۔

چنانچہ جس کی استعداد قوی تر ہے اس کی فضیلت بھی اتم ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ طبیعتوں کی کانوں میں جو مکارم اخلاق کے ہیرے جواہر ہیں چاہئے کہ انہیں نفس کی ریاضت کے ساتھ نکالا جائے۔ جیسا کہ حقیقی کانوں سے تکالیف اور مشقت برداشت کرکے ہیرے نکالے جاتے ہیں۔ ابن الملکؒ نے یہ قول ذکر کیا ہے۔

قولہ: خیارھم فی الجاھلیۃ الخ:

یہ جملہ لوگوں کو کانوں کے ساتھ تشبیہ دینے پر مبنی ہے، اس اعتبار سے کہ وہ کانیں نفیس جواہرات اور قیمتی دھاتوں کے گویا برتن ہوتے ہیں۔ اور جواہرات اور قیمتی دھاتوں سے مراد علوم وحِکَم ہیں۔ چنانچہ جاہلیت میں ایک دوسرے میں تفاوت نسب کے اعتبار سے ہوتا تھا، اور اسلام میں حسب کے اعتبار سے ہوتا ہے اور اوّل یعنی نسب دوسرے یعنی حسب کے بغیر معتبر نہیں۔ لہٰذا معنی یہ ہوں گے کہ لوگوں میں جو جاہلیت میں مکارمِ اخلاق کی وجہ سے بہتر تھے۔ وہ زمانۂ اسلام میں بھی مکارم اخلاق کی وجہ سے بہتر ہیں بشرطیکہ دین کی سمجھ حاصل کرلیں۔

"**فقھوا**": یہ قاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ کسرہ کے ساتھ ہے۔ نہایہ میں فرمایا ہے کہ **فقه الرجل** قاف کے کسر کے ساتھ اس وقت کہا جاتا ہے، جب آدمی جان لے۔ اور **فقه** قاف کے ضمہ کے ساتھ اس وقت بولا جاتا ہے، جب آدمی فقیہ وعالم بن جائے۔ عربوں نے اس لفظ کو علمِ شریعت خصوصاً فروع کے علم کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اھ۔

معنیٰ یہ ہے کہ جب وہ سب فقہ میں برابر ہوں۔ ورنہ شرافت اسی کیلئے ہوگی جو زیادہ فقیہ ہو۔

دو چیزوں میں حسد جائز ہے

۲۰۲: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا حَسَدَ اِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَسَلَّطَهُ عَلٰى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ وَرَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِيْ بِهَا وَيُعَلِّمُهَا۔

(متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١/١٦٥ حديث رقم ٧٣۔ وأخرجه مسلم في صحيحه ١/٥٥٩ حديث رقم (٢٦٨۔٨١٦) وأخرجه أحمد في المسند ١/٤٣٢۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صرف دو

چیزوں کے بارے میں حسد کرنا جائز ہے ایک وہ آدمی کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو حق کے راستہ میں خرچ کرنے کی توفیق عطا کی دوسرا وہ انسان جس کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا اور وہ اس علم کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قولہ: لا حسد:

حسد کہتے ہیں کسی کی نعمت کے زائل ہو کر اپنی طرف منتقل ہونے کی تمنا کرنا۔لیکن حق بات یہ ہے کہ اس کا معنی اس سے اعم ہے۔جب اس کے مقتضاء پر پختہ ارادے، قول یا فعل کے اعتبار سے عمل کرے تو یہ جذبہ مذموم ہے۔اس لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿ومن شر حاسد اذا حسد﴾[سورۃ الفلق: ٥]

جب نعمت کسی کافر یا فاسق کے پاس ہو جن کے ذریعے وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر مدد حاصل کرتا ہو تو علماءِ کرام نے اس کو مذمت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔یہاں پر حسد سے مراد غبطہ ہے۔غبطہ دوسرے کی نعمت کے مثل اپنے لئے اس کے ہونے کی خواہش کو کہتے ہیں۔اور غبطہ پر حسد کا اطلاق مجازاً ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اس میں رخصت نہیں۔ظاہر بات یہ ہے کہ اس کا معنی ہے کہ اگر حسد جائز ہوتا تو مذکورہ چیزوں کے علاوہ کسی میں جائز نہ ہوتا۔بہر حال یہ مقولہ کہ دینی منفعت کو متضمن ہونے کی وجہ سے حسد کی ایک نوع کی اباحت مأخوذ کی جا سکتی ہے، یہ صحیح نہیں۔

قولہ: الا فی اثنتین: رجل ...... فی الحق:

"فی اثنتین" یہاں مضاف محذوف ہے۔أی فی شأن اثنتین "اثنتین" سے مراد نفیستین (دو مرغوب چیزیں) یا خصلتین (دو عادتیں ہیں) ایک روایت میں یہ لفظ تذکیر کے ساتھ بھی مروی ہے۔یعنی فی شأن اثنین۔

"رجل": یہ بدل ہونے کی بناء پر حالتِ جر کے ساتھ روایت کیا گیا ہے جو کہ تمام روایات میں سب سے مضبوط اور قابلِ اعتماد روایت ہے۔اور ایک روایت میں مبتداء ہونے کی وجہ سے مرفوع بھی مروی ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ لا حسد فی اثنین (تذکیر کے ساتھ) بھی مروی ہے۔اس صورت میں رجل اثنین سے بدل واقع ہوگا۔اور اثنتین بھی مروی ہے یعنی خصلتین اثنتین۔لہٰذا معنی کو درست رکھنے کیلئے مضاف کو مقدر ماننا ضروری ہوگا۔چنانچہ جب "اثنتین" کے صیغے کے ساتھ مروی ہو تو اس وقت "فی شان اثنتین" مقدر ہوگا۔اور جب "اثنتین" کے ساتھ مروی ہو تو "خصلۃ رجل" مقدر ہوگا۔

"آتاہ": ہمزہ کے مد کے ساتھ مروی ہے۔ (مالا): اس مراد مال کثیر ہے، یا مال کی کوئی بھی قسم مراد ہے۔لیکن اس مال کا حلال ہونا ضروری ہے۔

"فسلطہ": یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کے حوالے کر دیا ہو اور اسے خرچ کرنے اور ختم کرنے کی توفیق دی ہو۔

"ھلکتہ": ہاء اور لام کے فتح کے ساتھ مروی ہے۔

یہ اندازِ تعبیر اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ اس مال میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔اور پھر اس کی تکمیل کرتے ہوئے

آپ ﷺ نے ''في الحق'' کی قید کا اضافہ فرمایا تا کہ اسراف مذموم اور ریاء جو قابلِ ملامت ہے وہ زائل ہو جائے۔(اس لئے کہ) خیر کے کام میں اسراف فضول خرچی نہیں ہوتا، جیسا کہ فضول خرچی میں کوئی خیر نہیں ہوتی۔

قوله: ورجل آتاه الله الحكمة فهو يقضي:

اس ''رجل'' میں بھی عطف کی وجہ سے دونوں وجوہ اعراب محتمل ہیں۔

علامہ کرمانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ لفظِ حکمت کو معرفہ لائے اس لئے کہ حکمت سے مراد ان اشیاء کی معرفت ہے جنہیں شریعت لے کر آئی۔ اور تعریف کا ارادہ آپ ﷺ نے لام عہد کے ساتھ فرمایا۔

علم وعمل کے ذریعے حق کو پانے یا احکامِ دین کے علم کو ''حکمت'' کہتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ دوسرا وہ شخص قابل رشک ہے جسے اللہ تعالیٰ نے صحیح علم دیا اور وہ علم کے مطابق فیصلہ کرتا ہے، دوسروں کو سکھاتا ہے، اور خود عمل کرتا ہے۔

تین قسم کا عمل مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے

۲۰۳: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَامَا تَ الْاِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ اِلَّا مِنْ ثَلَاثَةِ اَشْيَاءَ: صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ اَوْعِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهٖ اَوْوَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْلَهٗ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۳/۱۲۵۵حديث (۱۴۔۱۶۳۱)وأخرجه أبو داوٗد ۳/۳۰۰حديث رقم ۲۸۸۰وأخرجه النسائي في السنن ۶/۲۵۱حديث رقم ۳۶۵۱۔ وأخرجه الترمذي ۳/۶۶۰حديث رقم ۱۳۷۶۔وأخرجه أحمد في المسند ۲/۳۷۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل کے ثواب کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں کے ثواب کا سلسلہ مرنے کے بعد جاری رہتا ہے۔ صدقہ جاریہ وہ علم جس سے نفع حاصل کیا جائے اور نیک اولاد جو مرنے کے بعد اس کے لئے دعا کرے۔

تشریح: قوله: اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة:

''ثلاثة'': اس کی تمیز ''اشیاء'' محذوف ہے۔

دلیل استثناء کی بناء پر عمل سے مراد اعمال ہے۔ اور مراد اس سے عمل کے انقطاع کی وجہ سے عمل کا فائدہ ہے۔ یعنی اس کے عمل میں سے کسی چیز کا اجر وثواب اس کو نہیں پہنچے گا۔ مگر تین طرح کے اعمال ایسے ہیں کہ انسان کے مرنے کے بعد اُن کا عمل باقی رہتا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جب یہ بات ثابت ہے کہ وہ مکلّف کو ہر اس فعل کا ثواب عطا فرماتا ہے جس کا وجود کسی بھی درجے میں اس مکلف کے کسب پر موقوف ہو خواہ وہ کام بذاتِ خود کرے یا اس کام کا سبب بنے تو اس عمل کا فائدہ اس سے منقطع نہ ہوگا۔

قوله: الا من صدقة جارية:

امام طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ ''مصابیح'' کے بعض نسخوں میں فرماتے ہیں کہ لوگوں نے ''الا'' کو ساقط کر دیا، حالانکہ یہ لفظ مسلم، کتاب الحمیدی، جامع الاصول اور مشارق میں ثابت ہے۔ اور یہ آخر عبارت تک آپ ﷺ کے ارشاد ''الا من ثلاثة'' سے بدل ہے۔ اور تکرار کے احتمال پر اس میں مزید پختگی اور اس کے معاملے کا قابلِ توجہ ہونا پایا جاتا ہے۔

علامہ ابہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر ''من'' زائدہ ہے، اور تنوین ''الاعمال'' کے عوض میں ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ''عنه'' میں ضمیر زائدہ ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ یوں کہا جائے کہ یہ دونوں یعنی ''عنه'' کی ضمیر اور ''من'' اصلی ہوں۔

''جارية'': جس کا نفع جاری ہو تو اس کا اجر دائم رہتا ہے۔ جیسے خیر کے کاموں میں وقف۔ ''ازھار'' میں لکھا ہے کہ اکثر علماء کا قول ہے کہ صدقہ جاریہ اور وقف اور اس کے مشابہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا نفع ہمیشہ رہتا ہے رہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس سے مراد نہریں اور بہتے ہوئے چشمے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ قول پہلے قول کے عموم میں داخل ہے۔ شاید دوسرے قول والوں نے یہی خاص مراد لیا ہو لیکن تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔

قوله: او علم ينتفع به :

یعنی ایسا علم جس سے لوگ اس کی موت کے بعد نفع حاصل کر رہے ہیں۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ علم کو منتفع بہ کی قید کے ساتھ مقید فرمایا' اس لئے کہ اس کے علاوہ پر اجر نہیں ملتا۔ اور قابلِ انتفاع علم سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے افعال اور فرشتوں کا علم اس میں علم کلام یعنی عقائد کا علم بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتابوں کا علم، جس میں تفسیر کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ اور ملکوتِ ارض وسماء کا علم ہے جس میں علم ریاضی بھی شامل ہے۔ اھ۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں: اس میں تامّل ہے۔

قوله: او ولد صالح يدعوا له:

نیک اولاد سے مراد مؤمن اولاد ہے، جیسا کہ علامہ ابن حجر مکی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی صراحت فرمائی ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ ولد کو صالح ہونے کے ساتھ مقید کیا اس لئے کہ اس کے علاوہ سے اجر حاصل نہیں ہو سکتا۔ باقی کا ذکر تو محض بیٹے کو والد کیلئے دُعا کی ترغیب دلانے کیلئے فرمایا۔ حتیٰ کہ یہاں تک بھی فرمایا کہ والد کو اس کی نیک اولاد کے عمل کا ثواب اسی طرح ملتا ہے' خواہ بیٹا اس کیلئے دُعا کرے یا نہ کرے۔ جیسے درخت لگانا درخت لگانے والے کیلئے اس کا پھل کھائے جانے کی وجہ سے ثواب کا سبب بنتا ہے' خواہ کھانے والا اس کیلئے دُعا کرے یا نہ کرے۔

امام طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ استثناء متصل ہے۔ تقدیری عبارت یہ ہے: ينقطع عنه ثواب اعماله من كل شيء كالصلاة والزكاة ولا ينقطع الخ یعنی آدمی سے اس کے تمام اعمال جیسے نماز، زکوٰۃ وغیرہ منقطع ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے اعمال میں سے ان تین کا ثواب منقطع نہیں ہوتا۔ یعنی جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے اعمال کا اجر نہیں لکھا جاتا اس لئے کہ یہ تو عمل کا بدلہ ہوتا ہے جو کہ اس کی موت کی وجہ سے منقطع ہو چکا سوائے ایسے فعل کے جس کی بھلائی دائم ہو، اور اس کا نفع جاری ہو۔ جیسے کسی زمین کو وقف کر دینا یا کوئی کتاب تصنیف کرنا، یا کسی کو کوئی ایسا مسئلہ سکھا دینا جس پر عمل کیا جائے، یا نیک اولاد چھوڑنا۔ اولاد کو اس کے عمل میں سے اس لئے قرار دیا گیا کہ وہ اس کے وجود کا سبب ہے۔

اس حصر اور ان فرامین نبوی میں تعارض ہے:

① "من سن فی الاسلام
"جس شخص نے اسلام میں اچھا طریقہ جاری کیا تو اس کیلئے اس کے اس عمل کا بھی اجر ہے اور قیامت تک جو بھی اس طریقے پر عمل کرے گا اس کا ثواب بھی ملتا رہے گا۔"

② کل میت یختم
"ہر مرنے والا اپنے اعمال کو ختم کر دیتا ہے سوائے اللہ تعالیٰ کی راہ میں پہرہ دینے والے کے کہ اس کا عمل قیامت تک بڑھتا رہتا ہے۔"

(تعارض بایں طور ہے کہ حصر کا تقاضا ہے کہ یہ ثواب صرف ان تین اعمال کے ساتھ مخصوص ہے۔ جب کہ اس دوسری حدیث سے ایک چوتھی چیز کا حکم بھی یہی معلوم ہو رہا ہے۔)

جواب: اس میں کوئی منافات نہیں، اس لئے کہ اچھی سنت کا اجراء بھی دیگر منتفع بہ چیزوں میں سے ایک ہے۔ نیز مرابط کا وہ عمل بڑھتا رہتا ہے جو اس نے اپنی زندگی میں انجام دیا جبکہ مذکورہ تینوں چیزیں ایسے اعمال ہیں جو اس کی وفات کے بعد پیدا ہوتے ہیں، لہٰذا وہ اس سے منقطع نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ وہ ان اعمال کا سبب بنا ہے۔ چنانچہ یہ چیزیں، جن کی وجہ سے اس کو ثواب ملتا رہتا ہے ان اعمال سے مختلف ہو گئیں جن پر اس کی موت واقع ہوئی۔ یا (ان میں منافات نہیں) اس لئے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جب آدمی مر جاتا ہے تو جو عمل اس نے کیے ان کا ثواب نہ زیادہ ہوتا ہے اور نہ اس میں کچھ کمی ہوتی ہے سوائے غازی کے کہ پہرے داری کا ثواب بڑھتا رہتا ہے۔

اس حدیث میں ایسی کوئی بات نہیں جو اس پر دلالت کرتی ہو کہ اس کا عمل کسی دوسری چیز کے ملانے سے بڑھتا ہے یا نہیں بڑھتا۔

ایک قول یہ ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ مرابطہ (پہرے داری) کو صدقہ جاریہ میں داخل قرار دیا جائے۔ اس لئے کہ اس سے مقصود مسلمانوں کی نصرت ہے۔ اور یہ قول زیادہ ظاہر ہے۔

امورِ اسلام کی تعلیمات

۲۰۴: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ وَمَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهٗ بِهٖ طَرِيْقًا اِلَى الْجَنَّةِ وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِيْ بَيْتٍ مِنْ بُيُوْتِ اللّٰهِ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَيَتَدَارَسُوْنَهٗ بَيْنَهُمْ اِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهٗ وَمَنْ بَطَّاَبِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۴/۲۰۷۴حديث رقم (۳۸-۲۶۹۹)وأخرج البخاري بعض الفاظه ۵/۹۷حديث رقم۲۴۴۲-وأخرجه أبوداوٗد الى "والله في عون العبد......"۵/۲۳۴حديث رقم ۴۹۴۶وأخرجه الترمذي ۵/۱۷۹حديث رقم۲۹۴۵-وابن ماجة ۱/۸۲حديث ۲۲۵وأحمد في المسند ۲/۲۵۲-

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو آدمی دنیا کی مصیبتوں میں سے کوئی مصیبت کسی مؤمن سے دور کردے۔تو اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کے دن کی مصیبتوں میں سے مصیبت کو دور کر دے گا اور جس آدمی نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی۔تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا اور اللہ تعالیٰ اس وقت تک اپنے بندے کی مدد کرتا رہتا ہے۔جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرتا ہو اور جو انسان علم کی تلاش میں کسی راستہ پر چل نکلتا ہے۔تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کے راستہ کو آسان اور سہل کر دیتا ہے اور جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے گھر' مسجد وغیرہ میں کتاب اللہ یعنی قرآن کریم کو پڑھے پڑھائے' تو اس قوم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسکین نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اس پر چھا جاتی ہے اور فرشتے اس کو اپنے احاطے اور گھیرے میں لے لیتے ہیں اور ان کا ذکر اللہ تعالیٰ اس مخلوق میں کرتے ہیں۔جو اللہ کے پاس ہے یعنی ملائکہ اور جس نے عمل میں تاخیر اور سستی کی اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکے گا۔اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **قوله :من نفس عن مؤمن...... كرب يوم القيامة:**

"نفس" تشدید کے ساتھ ہے۔یعنی دور کرنا، زائل کرنا۔امام طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ گویا کہ یہ کشادگی کی راہوں کو کھولنا ہے۔اور یہ عربوں کے قول انت في نفس سے ماخوذ ہے۔یعنی تو کشادگی میں ہے۔جیسے کوئی شخص تنگی و مشقت میں ہو تو اس پر کشادگی کی راہیں بند کر دی جاتی ہیں۔چنانچہ جب اس سے مشقت کو دور کر دیا جائے۔تو وہ راہیں کھل جاتی ہیں۔

"كربة": کا مطلب ہے غم' مشقت اور سختی، خواہ بہت حقیری ہو۔اور اسکی تنوین برائے تعظیم ہے۔

"من كرب الدنيا": "مِنْ" تبعیضیہ یا ابتدائیہ ہے۔

یعنی جو شخص کسی بھی مؤمن سے اس کے ایمان کی رعایت کرتے ہوئے۔اگرچہ وہ فاسق ہی ہو۔اس کی کوئی سختی اور تنگی دور کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن وہاں کی سختیاں اور تنگیاں اس سے دور کرے گا جو باقی رہنے والی اور غیر متناہی ہیں۔چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ [سورة الانعام:۱۶۰] "جو کوئی (خدا کے حضور) نیکی لے کر آئے گا اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی" سے اشکال نہیں ہوتا۔اس لئے کہ اس کا مفہوم عام ہے، کہ یہ اضافہ کیت میں ہو یا کیفیت میں۔

جب تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے اور مشقتوں کو دور کرنا احسان ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے اس ارشاد کے بموجب اس شخص کو پورا پورا بدلہ عنایت فرمائیں گے: ﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ﴾ [سورة الرحمن:۶۰] "نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا کچھ نہیں۔"

قوله : ومن يسر على معسر......في الدنيا والآخرة:

یعنی جو شخص کسی فقیر پر آسانی کا معاملہ کرے۔مثلاً کسی شخص کا قرض کسی فقیر کے ذمے لازم ہو اور وہ اس کو مہلت دے دے یا کچھ قرض یا پورا قرض معاف کر کے اس پر نرمی کرے، خواہ فقیر کافر ہو، خواہ مؤمن ہو۔تو اللہ تعالیٰ اسی جنس سے بدلہ مرحمت فرما کر

اپنے بندے پر اس شخص کی نرمی کے بدلے اس پر دونوں جہانوں میں یا دونوں جہانوں کے معاملات میں آسانی فرمائیں گے۔

بعض عارفین فرماتے ہیں کہ "یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اصل میں تنگدست اور مشقت میں مبتلا تو وہ شخص ہے جو انجان وادی کا راہی ہو، اور نفسانی گھاٹیوں اور ظلمت و نور والی منازل کو قطع کرنے کا احتیاج رکھتا ہو" ۔ جیسا کہ علامہ کتانی رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول مشہور ہے کہ "بے شک بندے اور حق تعالیٰ شانہٗ کے درمیان نور اور ظلمت کے ایک ہزار مقامات ہیں۔ (اور اس راہ میں) اسے وسوسے اور اندیشے بھی پیش آتے ہیں۔ لہٰذا اس کے شیخ پر لازم ہے کہ اسے ان وساوس کی طرف توجہ و دھیان کو ترک کرنے اور اگر وہ اہلیت رکھتا ہو تو اسے دلائلِ عقلیہ نقلیہ میں غور کرنے' ذکر اور اپنے مولیٰ کے سامنے آہ وزاری کرنے پر مداومت کا حکم دے کر اس سے وساوس کی مشقت کو دور کرے۔ اور اس کیلئے سیدھے راستے کو آسان کرے اور اسے تحقیق کی حلاوۃ کا مزہ چکھائے، یہاں تک کہ اس کے دِل میں قلوب کے انوار روشن ہو جائیں، اور اس کی ذات میں محبوبِ حقیقی تک پہنچنے کے سورج طلوع ہونے لگیں۔

قوله: ومن ستر مسلما ستره الله في الدنيا والآخرة:

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

① کسی سے اگر قبیح حرکت کا ارتکاب ہو جائے تو اس کے بارے میں اسے رسوا نہ کرے۔

② کسی مسلمان کو کپڑے پہنائے۔

مسلم شریف کی شرح میں ہے کہ "یعنی لباس پہنا کر اس کے بدن کو چھپائے یا اس کی غیبت نہ کرکے اور اس کے عیوب اس سے دور کرکے اس کے عیوب کو چھپائے" ۔ (لیکن) یہ اس وقت ہے جبکہ وہ شخص مفسد مشہور نہ ہو۔ یا وہ شخص جو فسادی مشہور ہو تو مستحب یہ ہے کہ اس کے قصے کو حاکم کے سامنے پیش کر دے۔ اور اگر اس کو کسی گناہ میں دیکھے تو حسبِ قدرت اس کو اس سے روکے۔ اور اگر اس سے عاجز ہو تو اس کا معاملہ حاکم کے پاس لے جائے۔ جبکہ اس پر کوئی مفسدہ مرتب نہ ہو۔

محققین فرماتے ہیں اس میں اشارہ ہے کہ جو شخص اس میں اصل عرفان کے مقامات میں سے کسی مقام کو اور اہلِ یقین کی کسی کرامت کو جانتا ہو، وہ ان کے راز کی حفاظت کرے اور غیروں سے ان کے معاملے کو پوشیدہ رکھے۔ اس لئے غیروں کے سامنے رازوں کو کھولنا مہربانی' عنایت و بخشش کے دروازے کو بند کر دیتا ہے اور محرومی اور ہلاکت کا باعث بنتا ہے۔

من اطلعوه على سرفباح به ☆ لم يأمنوه على الأسرار ماعاشا

قوله: والله في عون العبد......عون اخيه:

یہ واؤ استینافیہ ہے۔ اور وہ سابقہ کلام کیلئے مزید اضافہ ہوتا ہے۔ "ما" بمعنی مادام ہے۔ ایک نسخہ میں "المسلم" وارد ہوا ہے۔

اس میں بھائی کے معاملات میں اس کی مدد کی فضیلت اور اس پر رحمتِ الٰہیہ سے اس کی جنس سے ملنے والے بدلے کی طرف اشارہ ہے، خواہ وہ مدد اپنے دِل سے یا جسم سے یا دونوں کے ذریعے اس سے نقصان کو دور کرنے کیلئے یا سہولت کے حصول کیلئے ہو۔ اس لئے کہ یہ سب مدد ہے۔

جب آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت کی ترغیب سے فارغ ہوئے تو اس کے بعد ایسی بات ارشاد فرمائی جو اللہ تعالیٰ

کے حکم کی تعظیم کا پتہ دیتی ہے۔اس لئے کہ علم عمل کا وسیلہ ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا۔

ایک قول یہ ہے کہ تنوین تعمیم کیلئے ہے۔اس لئے کہ نکرہ جب اثبات میں ہو تو وہ کبھی کبھی عموم کا فائدہ دیتا ہے۔یعنی تعلیم وتعلم ،تصنیف، مفارقت وطن اور اس راہ میں خرچ کرنے والے اسباب میں سے جو سبب بھی ہو۔

قوله: ومن سلك طريقا يلتمس فيه......الى الجنة:

"**يلتمس فيه**" یہ جملہ یا تو حال ہے یا صفت ہے۔

"**علما**": یہ نکرہ ہے تا کہ علوم دینیہ کی تمام انواع کو شامل ہو، خواہ قلیل ہو یا کثیر جب ثواب کی نیت سے ہو اور نفع حاصل کرنے اور دوسروں کو نفع پہنچانے کی نیت سے ہو۔اس ارشاد سے طلب علم کیلئے سفر کرنے کا استحباب بھی ثابت ہے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت حضر علیہ السلام کے پاس گئے اور ان سے فرمایا: "**هل اتبعك على ان تعلمن مما علمت رشدا**" یعنی میں آپ کے ساتھ اس لئے چل سکتا ہوں کہ آپ مجھے اس ہدایت میں سے کچھ سکھائیں گے جو آپ کو سکھائی گئی۔اور اسی طرح حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ایک حدیث کیلئے حضرت عبداللہ بن قیس رضی اللہ عنہ کے پاس ایک مہینہ کی مسافت قطع کر کے تشریف لے گئے۔یہ بات ابن الملک ؒ نے اس طرح نقل کی ہے۔

"**سهل الله به**": یعنی اس چلنے یا اس راستے یا اس تلاش یا اس علم کی بدولت اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے ورے پر مشقت گھاٹیوں کو قطع کرنے کے ساتھ آسان فرما دیں گے۔

قوله: وما اجتمع قوم فى بيت من بيوت الله:

"بیت" کی تنوین تعظیم کیلئے ہے۔"**بيوت**" باء کے کسرہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

"بیوت اللہ" کی قید کے ذریعے یہود ونصاریٰ کی عبادت گاہوں سے احتراز فرمایا اس لئے کہ ان میں داخل ہونا ہی مکروہ ہے۔

اور لفظ "مساجد" سے "بیوت اللہ" کی طرف عدول اس لئے فرمایا تا کہ یہ لفظ مساجد، مدارس اور خانقاہوں میں سے ہر جگہ کو جو اللہ تعالیٰ کے تقرب کی نیت سے بنائی گئی ہو، شامل ہو جائے۔

ایک قول یہ ہے کہ اشارہ کی زبان میں "بیوت اللہ" اس مقام سے عبارت ہے جس میں دل وجان وروح سے اور سر وخفی میں حق تعالیٰ کا ذکر کیا جائے۔چنانچہ نفس کے گھر کا ذکر طاعات ہیں اور دل کے بیت کا ذکر توحید اور معرفت ہے، روح کے بیت کا ذکر کرنا شوق ومحبت ہے سر کے بیت کا ذکر مراقبہ ومشاہدہ ہے، خفاء کے بیت کا ذکر اپنے وجود کو خرچ کر ڈالنا اور موجودات کو ترک کرنا ہے۔

قوله: يتلون كتاب الله:

"**يتلون**" قوم سے حال ہے۔"**كتاب الله**" سے مراد قرآن کریم ہے۔اور تلاوت سے مراد صرف الفاظ کا زبان پر جاری کرنا نہیں، بلکہ بندے کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس بات پر قادر ہو کہ وہ جیسے اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہو کر اللہ تعالیٰ کو سنا رہا ہے، اور وہ اسے دیکھ رہا ہے، بلکہ اس کا دل یہ گواہی دے کہ گویا اس کا پروردگار اس سے مخاطب ہے۔بلکہ (اس سے بھی بڑھ کر

اس کی کیفیت یہ ہو کہ) وہ متکلم کے مشاہدے میں اس طرح مستغرق ہو کہ اس کا کلام سنتے ہوئے اس کے علاوہ کی طرف بالکل دھیان نہ دے۔ جیسا کہ امام صادق نے فرمایا جبکہ ان سے نماز میں لاحق ہونے والی حالت جس میں وہ غش کھا کر گر پڑے تھے، کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: کہ "میں اپنے دِل پر وارد ہونے والی آیت کو برابر دہراتا رہا یہاں تک کہ میں نے اس کو اس کے متکلم سے سنا۔ پس میرا جسم اس کی قدرت کے معاینہ کی وجہ سے ثابت قدم نہ رہ سکا"۔

تلاوت کرنے والے کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے افعال میں غور وفکر کرے اور اللہ تعالیٰ کے جلال اور عظمت اور ان دشمنوں کو ہلاک کرنے سے متعلق امور کی معرفت حاصل کرے اور اللہ تعالیٰ کے زبردست ہونے اس کے استغناء اور فناء کرنے کی صفات اور ان امور کی معرفت جن کا تعلق انبیاء اور اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کے احوال سے ہے اور اس کے لطف وکرم، فضل اور اس کی نعمتوں کی معرفت حاصل کرے۔ اور ان آیات میں غور کرے جو بندوں کو مکلّف بنانے اور ان کی راہنمائی پر دلالت کرتی ہیں اور اس کی مہربانی اور اس کے حکم کی معرفت حاصل کرے اور اس کے مقتضاء پر عمل کرے۔

قوله: ويتدارسونه بينهم:

"تدارس" کے کئی مطلب بیان کیے گئے ہیں: ① کہتے ہیں بعض افراد کا بعض افراد سے اس طور پر پڑھنا کہ وہ الفاظ کی تصحیح کرے یا اس کے معانی کو بیان کرے، جیسا کہ ابن لملکؒ نے فرمایا۔

② ممکن ہے کہ تدارس سے مراد "مدارسہ" ہو کہ مثلاً بعض لوگ دس پڑھیں اور دوسرے لوگ دوسرے دس پڑھیں وغیرہ۔ یہ صورت تلاوت سے اُخص یا مقابل ہوگی۔ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ قرآنی تعلیم وتعلّم کی تمام صورتوں کو جامع ہے۔

قوله: الا نزلت عليهم السكينة:

اس جیسی ترکیب میں اکثر ھاء کو کسرہ اور میم کو ضمہ دیا جاتا ہے۔ اور دونوں کو ضمہ اور دونوں کو کسرہ دینا بھی جائز ہے۔

"السكينة" وقار اور خشیت کو کہتے ہیں یہاں "سکینت" سے کیا مراد ہے؟ اس میں کئی اقوال ہیں:

① سکینت سے مراد وہ چیز ہے جس سے دِل کو سکون واطمینان اور وقار حاصل ہو اور انوار کا نزول ہو۔

② دِل کے نور کی وجہ سے اس کی صفائی حاصل ہو اور ظلمتِ نفسانیہ بھاگے اور ذوق وشوق حاصل ہو۔

③ السكينة ایک فرشتہ ہے جو مؤمن کے قلب کو سکون اور اطمینان دیتا ہے اور اسے خیر کا حکم دیتا ہے۔

④ امام طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر فرمائی ہے:

"سکینہ ایک غنیمت ہے اور اسے ترک کر دینا نقصان اٹھانا ہے۔"

آپ ﷺ کے اس ارشاد: "الا نزلت ......" میں تلاوت کے ثمرات کی طرف اشارہ ہے۔ جو کہ اللہ کے ساتھ تعلق اور اس کا دھیان اور انبیاء وملائکہ اور ارواحِ مقدسہ کا لطیف صورتوں میں مشتمل ہونا ہے۔ نیز بشری پستیوں سے ملکوتِ اعلیٰ کی چوٹی کی طرف چڑھنا ہے، بلکہ وہ بقاء کی بدولت حاصل ہونے والی خوشی، فناء کے تحت دخولِ لاہوت سے قربت اور ناسوت سے براءت حاصل ہونا ہے۔ اور یہ مقام ایسا ہے کہ جس کے اعلان واظہار سے قوتِ گویائی کے کمربند تنگ پڑ جاتے ہیں اور حروف کے ظہور کی صورت میں اس کو ظاہر کرنے کی گنجائش نہیں۔

قوله: غشيتهم الرحمة وحفتهم الملائكه:

یعنی رحمت وبرکت کے فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں، ان کے گرد حلقہ بنا لیتے ہیں، یا ان کے گرد چکر لگاتے ہیں، آسمان دنیا تک دائرہ بنا کر قرآنِ کریم اور ان کا درس سنتے ہیں، آفات سے ان کی حفاظت کرتے ہیں، ان سے ملاقات اور مصافحہ کرتے ہیں اور ان کی دُعاؤں پر آمین کہتے ہیں۔

شیخ ابوسعید خراز رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''جب اللہ تعالیٰ اس بات کا ارادہ فرماتے ہیں کہ وہ اپنے کسی بندے کو اپنا ولی بنائیں تو اس پر اپنے ذکر و یاد کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ اگر وہ ذکر سے لذت محسوس کرے تو اس پر اپنے قرب کا دروازہ کھول دیتے ہیں، پھر اسے اپنی محبت والی مجالس کی طرف بلند فرماتے ہیں، پھر اسے توحید کی کرسی پر بٹھاتے ہیں پھر اس سے پردے کو اٹھا دیتے ہیں اور اسے دارِ فردانیہ میں داخل کر دیتے ہیں اور اس کیلئے جلال اور عظمت کے پردے کو کھول دیتے ہیں۔ پس جب اس کی نظر جلال اور عظمت پر پڑتی ہے تو وہ اپنی ذات سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس وقت بندہ اللہ تعالیٰ کے انوار کے حفظ میں گزرا ہوا زمانہ بن جاتا ہے اور اپنے نفس کے دعوؤں سے بَری ہو جاتا ہے''۔

قوله: وذكرهم فيمن عنده:

اور اپنے پاس موجود لوگوں سے مراد ملأ اعلیٰ اور ملائکہ کا طبقۂ اولیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ سبحانہ اپنے بندوں کی وجہ سے فخر فرماتے ہوئے فرشتوں سے فرماتے ہیں: ''میرے بندوں کی طرف دیکھو وہ مجھے یاد کر رہے ہیں، اور میری کتاب کی تلاوت کر رہے ہیں''۔

قوله: ومن ببطا به عمله لم يسرع به نسبه:

''بطأ'' طاء کی تشدید کے ساتھ' تبطئة سے ہے، جو تعجل (جلدی) کی ضد ہے۔ جیسا کہ ابطاء ہے۔ اور البطء (سستی)، السرعة (تیزی) کی ضد ہے۔ ''به'' میں باء تعدیہ کیلئے ہے۔ ''لم يسرع'' اسراع سے ہے۔

یعنی جس کو اس کا عمل آخرت میں یا اس کی کوتاہی دنیا میں عمل صالح کرنے سے اور سعادت کے درجے کو پہنچنے سے مؤخر کر دے، اور سست کر دے۔ تو اس کا نسب اسے آگے نہیں لائے گا۔ یعنی اس کی کوتاہی کا ازالہ اپنی قوم میں اس کے اچھے نسب والا ہونے کی وجہ سے نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی قربت نسب کی وجہ سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اعمالِ صالحہ کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ کا فرمان ہے: ﴿ان اكرمكم عند الله اتقاكم﴾ [سورة الحجرات:۱۳]

''بیشک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے سب سے متقی ہو''۔

اور اس بات کی شہادت اس سے ملتی ہے کہ اکثر علماءِ سلف وخلف کے ایسے نسب نہ تھے جن کے ذریعے وہ فخر کرتے بلکہ بہت سے علماءِ سلف آزاد کردہ غلام تھے۔ اس کے باوجود وہ اُمت کے سردار اور رحمت کے چشمے تھے۔ جبکہ بڑے بڑے نسب والے جو اس طرح نہ تھے وہ اپنی جہالت کے میدانوں میں نسیاً منسیاً ہو گئے۔ اسی لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس دین کی بدولت بہت سی قوموں کو بلندی عطاء فرماتے ہیں اور اسی کے ذریعے دوسری قوموں کو پستی میں گرا دیتے ہیں''۔ اور اس کی تائید نبی اکرم ﷺ کا حدیث میں وارد ہونا' ارشاد کرتا ہے (جس میں آپ ﷺ نے فرمایا) ''اے صفیہ! محمد کی پھوپی! اے

فاطمہ بنتِ محمد! قیامت کے دِن میرے پاس اپنے اعمال کے ساتھ آنا نہ کہ اپنے نسب کے ساتھ، اس لئے کہ میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا سکتا"۔

حضرت ابو یزید قدس اللہ سرہ کے بارے میں منقول واقعہ بھی اس کی تائید کر رہا ہے کہ ان کا ایک مرید ان کے پیچھے ان کے نشاناتِ قدم پر چل رہا تھا۔ آپؒ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: "اللہ کی قسم! اللہ کی قسم! اگر تم ابو یزید کی جلد اُتار لو اور اسے اپنے جسم پر پہن لوتب بھی تم اس کے مقامات میں سے رائی کے دانے کے برابر بھی حصہ نہیں حاصل کر سکتے جب تک تم اس جیسے اعمال اختیار نہ کرو۔ پھر انہوں نے یہ شعر پڑھے:

مابال نفسك ان ترضى تدنسها	وثوب جسمك مغسول من الدنس
تیرے نفس کا کیا حال ہے جبکہ تو اسکے میلا ہونے پر راضی ہے	حالانکہ تیرے جسم کے کپڑوں سے میل دھو دی گئی ہے۔
ترجو النجاة ولم تسلك مسالكها	ان السفينة لاتجرى على اليبس
تو نجات کی اُمید کرتا ہے حالانکہ تو نجات کے راستوں پر چلتا نہیں ہے	بے شک کشتی خشکی پر نہیں چل سکتی

قیامت کے دن شہید، عالم اور مالدار کا حساب پہلے ہوگا

۲۰۵: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ النَّاسِ يُقْضٰى عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ اُسْتُشْهِدَ فَاُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعَمَهٗ فَعَرَفَهَا فَقَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا؟ قَالَ قَاتَلْتُ فِيْكَ حَتّٰى اُسْتُشْهِدْتُّ قَالَ كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِاَنْ يُّقَالَ جَرِيْءٌ فَقَدْ قِيْلَ ثُمَّ اُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ حَتّٰى اُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَعَلَّمَهٗ وَقَرَاَ الْقُرْاٰنَ فَاُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعَمَهٗ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا قَالَ تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَعَلَّمْتُهٗ وَقَرَاْتُ فِيْكَ الْقُرْاٰنَ قَالَ كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِيُقَالَ اِنَّكَ عَالِمٌ وَقَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ لِيُقَالَ اِنَّكَ قَارِئٌ فَقَدْ قِيْلَ ثُمَّ اُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ حَتّٰى اُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ وَسَّعَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَعْطَاهُ مِنْ اَصْنَافِ الْمَالِ كُلِّهٖ فَاُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعَمَهٗ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا قَالَ مَا تَرَكْتُ مِنْ سَبِيْلٍ تُحِبُّ اَنْ يُّنْفَقَ فِيْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْفَقْتُ فِيْهَا لَكَ قَالَ كَذَبْتَ لٰكِنَّكَ فَعَلْتَ لِيُقَالَ هُوَ جَوَادٌ فَقَدْ قِيْلَ ثُمَّ اُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ثُمَّ اُلْقِيَ فِي النَّارِ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱۵۱۳/۳ حديث (۱۵۲۔۱۹۰۵) وأخرجه النسائي في سننه ۲۳/۶ حديث رقم ۳۱۳۷۔ وأخرجه أحمد في المسند ۳۲۲/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے پہلا وہ آدمی جس کے بارے میں اخلاص نیت کو چھوڑنے کا حکم لگایا جائے گا۔ وہ شخص ہوگا جس کو دنیا میں شہید کر دیا جائے گا۔ جب وہ میدان محشر میں اللہ کی عدالت میں پیش کر دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو عطا کی ہوئی نعمتیں یاد کرائے گا

اور وہ اس کو یاد آ جائیں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو نے دنیا میں ان نعمتوں کے شکریہ میں کیا عمل کیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں یاد کرا کر بطور الزام ارشاد فرمائے گا کہ تو نے ان نعمتوں کے شکریہ میں کیا کام کیا۔ وہ جواب میں کہے گا کہ میں نے تیرے راستے میں جہاد اور قتال کیا۔ یہاں تک کہ میں شہید کر دیا گیا اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو جھوٹ کہتا ہے۔ تو نے تو اس لئے قتال کیا تھا تا کہ تجھ کو جرأت مند اور بہادر کہا جائے اور وہ تیرا مقصد دنیا میں پورا کر دیا گیا ہے۔ اب مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ پھر کہا جائے گا کہ اس کو منہ کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دو۔ چنانچہ اس کو آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر ایک دوسرا شخص اللہ تعالیٰ کی عدالت میں لایا جائے گا۔ جس نے علم حاصل کیا اور دوسروں کو تعلیم دی اور قرآن مجید کو پڑھا اور اللہ تعالیٰ اس کو اپنی دی ہوئی نعمتیں یاد دلائے گا اور اس کو یاد آ جائیں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ تو نے ان نعمتوں کے شکریہ میں کیا عمل کیا وہ جواب دے گا کہ میں نے علم حاصل کیا اور پھر دوسروں کو اس کی تعلیم دی اور تیری رضا جوئی کے لئے قرآن کریم پڑھا اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تو جھوٹ کہتا ہے۔ تو نے علم اس لئے حاصل کیا تھا تا کہ تجھے دنیا میں بڑا عالم کہا جائے اور قرآن اس لئے پڑھا تھا تا کہ تجھے قاری کہا جائے اور یہ تیرا مقصد دنیا میں پورا کر دیا گیا ہے کہ تجھے دنیا میں عالم اور قاری کہا گیا۔ پھر حکم دیا جائے گا اور اس کو گھسیٹ کر جہنم کی آگ میں ڈال دیا جائے گا پھر ایک مال دار کو اللہ کی عدالت میں لایا جائے گا۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال کی وسعت عطا کی ہوگی اور ہر طرح کا مال دیا ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس کو اپنی دی ہوئی نعمتیں یاد کرائے گا اور وہ اس کو یاد آ جائیں گی پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو نے ان نعمتوں کے شکریہ میں کیا عمل کیا۔ تو وہ آدمی کہے گا کہ میں نے تیری رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہر اس راستے میں مال خرچ کیا جہاں خرچ کرنے کو تو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ تو جھوٹ کہتا ہے تو نے مال اس لئے خرچ کیا تھا تا کہ تجھے دنیا میں سخی کہا جائے چنانچہ دنیا میں تجھے سخی کہہ دیا گیا ہے پھر حکم دیا جائے گا اس کو بھی منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: پھر اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ جن دنوں میں وہ نعمتیں تجھے حاصل تھیں ان نعمتوں کا شکر تو نے کیسے ادا کیا؟ (تو نے ان نعمتوں کے مقابلے میں ان کے شکر کے طور پر کیا کیا؟ تا کہ آج تجھے وہ عمل نفع دے۔)

قوله: ان اوّل الناس یقضی علیه......القی فی النار:

''الناس'' کی ایک صفت ہے اس لئے کہ یہ نکرہ کے معنی میں ہے۔ ''استشهد'': یہ مبنی بر مفعول ہے۔

یعنی قیامت کے دِن لوگوں میں سے سب سے پہلے جن کا فیصلہ کیا جائے گا۔ تین آدمِی ہوں گے۔ پہلے پہل جس کا حساب کیا جائے گا اور اس کے افعال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اس سے یہ نکتہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ وہ شخص لوگوں میں سے سب سے پہلا فیصلہ ہونے کے اعتبار سے ہوگا' نہ کہ مطلقاً پہلا۔

''نعمته'': یہاں پر مفرد کا صیغہ ہے۔ اور باقی دو جگہ پر جمع کے صیغے ہیں۔ مسلم شریف' حمیدی' جامع الاصول' امام نووی کی ریاض الصالحین اور مصابیح کے بعض نسخوں میں اسی طرح آیا ہے۔ شاید پہلی نعمت میں مفرد ہونے کا اعتبار کی وجہ سے اور دوسری دو میں جمع کے اعتبار کی وجہ سے فرق ہو۔ امام طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ اور شاید کثرت سے مراد علوم اور احوال کی مختلف قسمیں ہیں۔ واللہ اعلم بالحال۔

اور مفرد لانے سے نعمت شہادت مراد نہیں جیسا کہ اس سے وہم ہوتا ہے اس لئے کہ اس کے بعد آنے والا کلام اس کے مناسب نہیں۔ بلکہ اس سے مراد جنسیتِ نعمت کا مفرد ہونا ہے۔اس لئے کہ مفرد مضاف عموم کیلئے ہے، بخلاف دوسری دو کے کہ ان میں انواع کے بیان کے ارادے سے جمع کا صیغہ لایا گیا۔یا یہ کہ پہلی میں فقط بدنی نعمت کی وجہ سے مفرد کا صیغہ لائے بخلاف دوسری دو نعمتوں میں کہ ان میں بدنی نعمت کے ساتھ مالی یا علمی نعمت بھی ملی ہوئی ہے۔گویا کہ وہ ہولناکی اور وحشت کی وجہ سے ان کو بھول گیا تھا اور ان کے بارے میں اسے ذھول ہو گیا تھا۔

امام طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی طرح بیان کیا ہے۔مطلب یہ ہے کہ تیری وجہ سے جنگ کرتا رہا۔لہٰذا یہ "فی" تعلیلیہ ہے۔

"حتی استشهدت": بظاہر یہ بات اس سے اس کے زعم کے مطابق صادر ہوگی۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا﴾ [الكهف:١٠٤] "وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں"

یا مبالغہ فی التمویہ پر محمول ہے، اس کی نظیر یہ روایت ہے: کما یعیشون یموتون و کما یموتون یحشرون۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ﴾ [المجادلة: ١٨] "جس دن خدا ان سب کو جلا اٹھائے گا تو جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں (اسی طرح) خدا کے سامنے قسمیں کھائیں گے اور خیال کریں گے کہ ایسا کرنے سے کام لے نکلے ہیں۔دیکھو یہ جھوٹے (اور برسرِ غلط) ہیں۔"

"جری": یہ جراءۃ سے فعیل کے وزن پر، جو مہموز اللام ہے، اور مدغم ہے۔

قوله: ورجل تعلم العلم وعلّمه......القى فى النار:

"وقرأ القران": یہ تخصیص بعد التعمیم ہے۔اس سے مراد قرآنِ کریم کی تلاوت محض ہے۔

شاید اختصار کی وجہ سے اور قیاس پر اکتفاء کرتے ہوئے "ليقال انك معلم" نہیں فرمایا۔یا اس لئے کہ جب کسی چیز کی بنیاد اخلاص پر نہ ہو تو یہ بعید ہے کہ اس کی عمارت اختصاص کے طریقے پر ہو۔

قوله ورجل وسع الله عليه..................القى فى النار:

"ثم امر به": اس جگہ پر نسخوں میں سے "ثم" کے ساتھ ہی صحیح اور اصل ہے۔اور ہمارے نسخے میں بھی یہی ہے۔

"واعطاه": عطف بیان ہے۔"ما ترك من سبيل" میں "مِنْ" زائدہ نفی کے استغراق کیلئے ہے۔

فائدہ: "فقد قيل" میں اشارہ ہے کہ عمل چاہے جس غرض سے بھی کیا جائے اللہ تعالیٰ اس کا اجر ضائع نہیں فرماتے۔

علم اُٹھ جائے گا علماء کو قبض کرنے کے ساتھ

۲۰۶: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ اِنْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهٗ مِنَ الْعِبَادِ وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَآءِ حَتّٰى اِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اِتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوْسًا جُهَّالًا فَسُئِلُوْا فَاَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١/١٩٤حديث ١٠٠ومسلم في صحيحه ٤/٢٠٥٨حديث رقم (١٣-٢٦٧٣) وأخرجه الترمذي في سننه ٥/٣٠حديث رقم ٢٦٥٢- وابن ماجة في السنن ١/٢٠حديث رقم ٥٢-وأحمد في المسند ٢/١٦٢-

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ علم کو آخری زمانہ میں اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ لوگوں کے دل ودماغ سے کھینچ کر اس کو نکال دے۔ بلکہ علم اس طرح اٹھالے گا کہ علماء کو اس دنیا سے قبض کرلے گا۔ یہاں تک کہ جب کوئی بھی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو امام بنالیں گے اور ان سے مسائل دریافت کیے جائیں گے اور وہ لوگوں کو بغیر علم کے فتویٰ دیں گے۔ لہٰذا وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله:ان الله لا يقبض العلم......بقبض العلماء:

"انتزاعا": یہ يقبض کے معنی پر مفعول مطلق ہے۔ جیسے رجع القهقری۔

"ينتزعه من العباد": نوع کو بیان کرنے کیلئے ہے۔ جیسا کہ سید جمال الدینؒ نے فرمایا۔

ابن الملک کہتے ہیں کہ انتزاعًا مابعد بعل کیلئے مفعول مطلق ہے۔ اور یہ جملہ حالیہ ہے۔

یہاں علم سے مراد کتاب وسنت اور اس کے متعلقات کا علم ہے۔

قوله: حتى اذا لم يبق ...... واضلوا: یہ وہ حتی ہے جو جملہ پر داخل ہوتا ہے۔ اور وہ یہاں شرط اور جزاء ہے۔

"يبق": الابقاء سے ہے۔ اس نسخے کی تائید مسلم شریف کی یہ روایت "حتى اذا لم يترك عالما" کرتی ہے۔

اور مشکوۃ کے ایک نسخہ میں "حتى اذا لم يبق" یاء اور قاف کے فتحہ کے ساتھ۔ اور "عالم" کے رفع کے ساتھ ہے۔

"جهالا": جاہل کی جمع ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ہم نے "جهالاً" کو بخاری میں ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ اور تنوین کے ساتھ رأس کی جمع کے طور پر یاد کیا۔ جبکہ محدثین نے مسلم شریف میں یہاں دو طریقوں سے اسے روایت کیا ان میں سے پہلا طریقہ یہی ہے (یعنی جو مشکوۃ میں ہے) اور دوسرا رؤساء جو کہ رئیسٌ کی جمع ہے، کو محفوظ کیا۔ اور دونوں لغات صحیح ہیں۔ البتہ پہلا طریقہ زیادہ مشہور ہے۔

وعظ اور نصیحت میں اعتدال کرو

٢٠٧ : وَعَنْ شَقِيْقٍ قَالَ:كَانَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ يُذَكِّرُ النَّاسَ فِيْ كُلِّ خَمِيْسٍ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ يَا اَبَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ! لَوَدِدْتُّ اَنَّكَ ذَكَّرْتَنَا فِيْ كُلِّ يَوْمٍ قَالَ اَمَا اِنَّهُ يَمْنَعُنِيْ مِنْ ذٰلِكَ اِنِّيْ اَكْرَهُ اَنْ اُمِلَّكُمْ وَاِنِّيْ اَتَخَوَّلُكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ كَمَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَوَّلُنَا بِهَا مَخَافَةَ السَّاٰمَةِ عَلَيْنَا۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱/۱٦۲حدیث رقم ٦۸۔وأخرجه مسلم فی صحیحه ٤/۲۱۷۳حدیث رقم (۸۳۔۲۸۲۱) وأخرج الترمذی نحوه ٥/۱۳۰حدیث رقم ۲۸٥٥وأحمد فی المسند۱/۳۷۸۔

ترجمہ: حضرت شقیق رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہر جمعرات کو لوگوں کو وعظ اور نصیحت کرتے تھے۔ایک دن ایک شخص نے عرض کیا۔اے ابوعبدالرحمٰن۔میری تمنا اور خواہش ہے کہ آپ ہمیں روزانہ وعظ و نصیحت کیا کریں۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تمہیں روزانہ اس لئے وعظ نہیں کرتا کہ تم لوگ اس سے تنگ آ جاؤ گے میں وعظ و نصیحت کے معاملہ میں تمہاری خبر گیری اس طرح کرتا ہوں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعظ میں ہماری خبر گیری کرتے تھے اور ہمارے تنگ ہو جانے کا بھی خیال کرتے تھے۔(بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: کان عبد الله بن مسعود یذکر...... کل یوم:

جمعرات کی تخصیص کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کی برکت جمعہ کے دن تک پہنچتی ہے۔

قوله: قال: أما انه...... السآمة علینا:

یہ ''اما'' الاتنبیه کے معنی میں ہے۔''انه'': ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے، اور ضمیر ''ضمیر شان'' ہے۔''أنی أکره'': ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ یمنعنی کا فاعل ہے۔ ''أن أملکم'': یہ ''أکره'' کا مفعول ہے۔تھکانا، اکتاہٹ میں مبتلا کرنا۔ ''وانی'': ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ اس کا عطف انه پر ہے یا یہ حال ہے۔

''اتخولکم'' : یہ تخوّل سے ہے اور اس کا معنی نگہبانی کرنا اور اچھی طرح دیکھ بھال کرنا۔'' یتخولنا'': یہ تخوّل سے ہے۔ اور بعض روایات میں حاء مہملہ کے ساتھ ہے اور اس کا معنی حال معلوم کرنا ہے۔اور ایک روایت میں یتخوننا خاء معجمہ اور نون کے ساتھ یتخولنا کے معنی میں بھی ہے۔ایک قول یہ ہے لام والی روایت اکثر ہے۔اور بعض لوگوں کا گمان ہے کہ یتحولنا حاء مہملة والی روایت درست ہے۔لیکن صحاح کی روایت خاء معجمہ کے ساتھ ہے۔ابوعمرو کہا کرتے تھے وہ یہ یتخوننا ہے، اور ''تخون'' کہتے ہیں ''تعهد'' کو اور انہوں نے اعمش پر لام کے ساتھ روایت کرنے کی وجہ سے رد بھی کیا ہے۔اصمعی فرمایا کرتے تھے کہ ابوعمرو نے ان پر ظلم کیا۔اور ایک روایت یہ ہے کہ یتخولنا اور یتخوننا دونوں طرح ہے۔جیسا کہ امام طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا۔اور ایک ہی حدیث میں راویوں کا اختلاف اسی پر دلالت کرتا ہے۔

''بها'': ضمیر کا مرجع ''موعظة'' ہے۔

مصابیح میں ''مخافة السآمة علینا'' کے بجائے ''کراهة السآمة'' کے الفاظ ہیں۔(اکتاہٹ)

علامہ ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یعنی ہمیں کسی دن نصیحت فرماتے تھے اور کسی دن نہیں کرتے تھے کسی وقت وعظ فرماتے تھے کسی وقت نہیں فرماتے تھے۔''

حاء مہملہ کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے۔اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری اس حالت کے بارے میں غور فرماتے تھے جس میں ہم وعظ کیلئے چست ہوتے تھے تو ہمیں وعظ فرماتے تھے۔اسی طرح مشائخ اور واعظین اپنے مریدین کی تربیت کیلئے بھی کرتے ہیں۔

بات کو تین مرتبہ دہرانا

۲۰۸ :وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ:كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ اَعَادَهَا ثَلَاثًا حَتّٰى تُفْهَمَ عَنْهُ وَاِذَا اَتٰى عَلٰى قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلَاثًا ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱/۱۸۸حدیث رقم ۹۵۔وأخرجه الترمذی مع تقدیم وتأخیر فی سننه ۵/۶۸ حدیث رقم۲۷۲۳۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات ارشاد فرماتے۔ تو اس کو تین مرتبہ فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ لوگ اس کو اچھی طرح سمجھ لیتے تھے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی جماعت کے پاس آتے تھے تو ان کو تین مرتبہ سلام کرتے تھے اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله:كان النبی ﷺ اذا تكلم ......تفهم عنه:

یعنی خوب مضبوطی سے سمجھا کہ نفس میں راسخ ہو جائے۔ اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کلمہ سے مراد وہ کلام ہے جو بغیر اعادہ کے سمجھ میں نہیں آتا۔

اور تین مرتبہ پر اقتصار کی وجہ واللہ اعلم لوگوں کی فہم کے مراتب یعنی اولیٰ، اوسط اور اعلیٰ مقتضاء ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ جو تین مرتبہ میں بھی نہ سمجھ سکے وہ کبھی نہیں سمجھ سکتا۔

قوله:واذا اتی علی قوم فسلم علیهم ......الخ:

ابن القیم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت اس کثیر مجمع پر سلام کرنے کے بارے میں ہو جنہیں ایک سلام کی آواز نہ پہنچ سکتی ہو۔ اھ۔ اور یہ اس طرح ہوتا کہ پہلے سامنے والوں کو سلام کرتے پھر دائیں طرف، پھر بائیں طرف۔

ایک قول یہ ہے کہ یہ طریقہ اجازت طلب کرتے وقت ہوا کرتا تھا۔ یعنی جب ایک مرتبہ یا دو مرتبہ میں جواب نہ آتا تو تیسری مرتبہ ان پر سلام کرتے اور پھر بھی جواب نہ آتا تو واپس لوٹ جاتے۔

ایک قول یہ ہے کہ ایک سلام اندر داخل ہونے کی اجازت کیلئے دیتے ایک تحیہ کیلئے اور واپس جاتے ہوئے الوداعی سلام دیتے۔ اور یہ تینوں سلام ہر اس شخص کیلئے سنت ہیں جو کسی شخص یا قوم کے پاس آئے۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام اس پر مواظبت فرمایا کرتے تھے جیسا کہ یہ کان سے مستفاد ہو رہا ہے، جو کہ ایک جماعت کے نزدیک وضعاً تکرار فعل کیلئے ہے اور ایک کے نزدیک عرفاً، اور علامہ ابن حجرؒ کے فرمان کے مطابق یہ زیادہ صحیح ہے۔

اَلدَّالُّ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهِ

۲۰۹ :وَعَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِيِّ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّهُ اُبْدِعَ بِيْ فَاحْمِلْنِيْ فَقَالَ مَاعِنْدِيْ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنَا اَدُلُّهُ عَلٰى مَنْ يَّحْمِلُهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ دَلَّ عَلٰى خَيْرٍ فَلَهٗ مِثْلُ اَجْرِ فَاعِلِهٖ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٣/١٥٠٦ حديث رقم (١٣٣-١٨٩٣)۔ وأخرجه أبو داوٗد في سننه ٥/٣٤٦ حديث رقم ٥١٢٩۔ وأخرجه الترمذي في السنن ٥/٤٠ حديث رقم ٢٦٧١۔ وأخرجه أحمد في المسند ٤/١٢٠۔

ترجمہ: حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول میری سواری چلنے سے تھک گئی ہے اور عاجز ہو گئی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی سواری دیدیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے پاس تو کوئی سواری نہیں ہے۔ کہ میں تمہیں دے سکوں ایک آدمی نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک ایسا آدمی بتاتا ہوں جو اس کو سواری دیدے گا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی کی خیر اور بھلائی کی طرف راہنمائی کرے۔ تو اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا۔ جتنا کہ خیر کا کام کرنے والے کو ملے گا۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

ابو مسعود بن عمرو۔ یہ ''ابو مسعودؓ'' ہیں۔ ان کا نام عقبہ ہے۔ ''عمروؓ'' کے بیٹے ہیں اور انصاری و بدری ہیں۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں حاضر تھے اور اکثر واقف کارانِ سیر و تاریخ کے نزدیک یہ بدر میں شریک نہیں ہوئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بدر میں شرکت کی۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ ان کو بدری کہنے کی وجہ غزوۂ بدر میں شرکت نہیں بلکہ وجہ یہ ہے کہ یہ چاہ بدر پر ٹھہرے تھے۔ پھر یہ کوفہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ ۴۱ھ یا ۴۲ھ میں وفات ہوئی۔ ان سے ان کے بیٹے ''بشیر'' اور دوسرے لوگوں نے روایت کی۔

تشریح: قوله: فقال: انه ابدع بی:

''انه'' یہ ضمیر شان ہے۔ ابدع بی: یہ مبنی بر مفعول ہے۔ کہا جاتا ہے **أبدعت الراحلة** جبکہ سواری تھکاوٹ کی وجہ سے چلنے سے عاجز آ جائے۔ جس کام پر مسلسل کاربند تھی (یعنی سفر) اس سے اس کے منقطع ہونے کو ابداع (نئی چیز پیدا کرنا) بنا دیا۔ یعنی جو بات اس کی عادت تھی اس سے خارج کسی کام کو پیدا کرنا۔ اور **أبدع بالرجل** کا معنی ہے کہ اس کے سواری اس سے منقطع ہو گئی۔ جیسا کہ امام طیبیؒ نے اس بات کی تحقیق فرمائی ہے۔ یعنی مجھ سے میری سواری منقطع و جدا ہو گئی۔ جب اس کو مفعول کی طرف پھیرا گیا تو ظرف اس کا نائب فاعل ہو گیا۔ جیسے **سیر بعمرو**۔

قوله: من دل على خير فله مثل أجر فاعله:

خیر سے مراد وہ علم و عمل ہے کہ جو باعث اجر و ثواب ہو۔

روایاتِ باب:

جامع صغیر میں ہے کہ اس حدیث کو بزاز نے ابن مسعود سے اور طبرانی نے سھل بن سعد اور ابو مسعود سے ان الفاظ میں نقل کیا:

''الدال على الخير كفاعله''

احمد وعبدالرزاق نے الجامع میں اور ضیاء نے بریدہ سے اور ابن ابی الدنیا نے انس سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:
"الدال على الخير كفاعله، والله يحب اغاثة اللهفان"

جس نے اسلام میں اچھا طریقہ ایجاد کیا اس کو ثواب ملتا رہتا ہے

۲۱۰: وَعَنْ جَرِيْرٍ قَالَ كُنَّا فِيْ صَدْرِ النَّهَارِ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَآءَ قَوْمٌ عُرَاةٌ مُجْتَابِي النِّمَارِ اَوِ الْعَبَاءِ مُتَقَلِّدِي السُّيُوْفِ عَامَّتُهُمْ مِنْ مُضَرَ بَلْ كُلُّهُمْ مِنْ مُضَرَ فَتَمَعَّرَ وَجْهُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَا رَاٰى بِهِمْ مِنَ الْفَاقَةِ فَدَخَلَ ثُمَّ خَرَجَ فَاَمَرَ بِلَالًا فَاَذَّنَ وَاَقَامَ فَصَلّٰى ثُمَّ خَطَبَ فَقَالَ (يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ الاية اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا وَالْاٰيَةُ الَّتِيْ فِي الْحَشْرِ اِتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ) تَصَدَّقَ رَجُلٌ مِّنْ دِيْنَارِهٖ مِنْ دِرْهَمِهٖ مِنْ ثَوْبِهٖ مِنْ صَاعِ بُرِّهٖ مِنْ صَاعِ تَمْرِهٖ حَتّٰى قَالَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ قَالَ فَجَآءَ رَجُلٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ بِصُرَّةٍ كَادَتْ كَفُّهٗ تَعْجِزُ عَنْهَا بَلْ قَدْ عَجَزَتْ ثُمَّ تَتَابَعَ النَّاسُ حَتّٰى رَاَيْتُ كَوْمَيْنِ مِنْ طَعَامٍ وَثِيَابٍ حَتّٰى رَاَيْتُ وَجْهَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَهَلَّلُ كَاَنَّهٗ مُذْهَبَةٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَنَّ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهٗ اَجْرُهَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْقُصَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْءٌ وَمَنْ سَنَّ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْقُصَ مِنْ اَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ. (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في الصحيح ۲/ ۷۰۴ حديث رقم (۶۹-۱۰۱۷) وأخرجه النسائي في السنن ۵/ ۷۵ حديث رقم ۲۵۵۴ وأخرج نحوه الترمذي في السنن ۵/ ۴۲ حديث رقم ۲۶۷۵ وأحمد في المسند ۴/ ۳۵۹۔

ترجمه: حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ایک روز دن کے شروع حصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود اور حاضر تھے۔ کہ ایک قوم کے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لائے جو ننگے جسم والے تھے اور اپنے اوپر عبا یا کمبل لپیٹے ہوئے تھے اور گلے میں تلواریں لٹکائی ہوئی تھیں اور ان میں سے اکثر بلکہ سب ہی قبیلہ مضر کے لوگ تھے ان پر فقر و فاقہ کے اثرات دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ اور چہرہ انور متغیر ہونا شروع ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے کھانے کی تلاش میں گھر تشریف لے گئے اور جب اپنے گھر میں کچھ نہیں ملا واپس تشریف لائے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کہی اور اقامت پڑھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں یہ آیت تلاوت کی: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ...... اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کیا ہے۔ پوری آیت کریمہ تلاوت کی جس کا آخری حصہ ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا۔ کہ بے شک اللہ تعالیٰ تمہارا محافظ ہے۔ پھر

سورۂ حشر کی آیت تلاوت کی۔ اِتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّاقَدَّمَتْ لِغَدٍ الایۃ۔ کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور ہر شخص اچھی طرح غور وفکر کرلے کہ کل یوم قیامت کے لئے آگے کیا ذخیرہ بھیجا ہے پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ صدقہ کرے ہر آدمی اپنے دینار سے اپنے درہم سے، اپنے کپڑے سے اور اپنی گندم اپنی کھجور کے پیمانے سے یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ صدقہ کرے اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ اس حدیث کے راوی فرماتے ہیں کہ ایک انصاری آدمی دراہم یا دنانیر سے بھری ہوئی تھیلی لایا۔ جس کے بوجھ اور وزن سے اس کا ہاتھ تھک کر عاجز ہونے کے قریب تھا۔ بلکہ تھک ہی گیا تھا۔ پھر تو لوگوں نے لگاتار یکے بعد دیگر اشیاء کو لانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ میں نے غلے اور کپڑے کے جمع شدہ دو ڈھیر دیکھے۔ پھر میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کا چہرہ انور سنہری چیز کی طرح چمک اٹھا۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اسلام میں کسی اچھے طریقے کو رائج کرے تو اسے اس کا بھی ثواب ملے گا اور اس کا بھی جو اس کے بعد اس پر عمل کرے اور عمل کرنے والے کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی اور جس آدمی نے اسلام میں کسی برے طریقہ کو رائج کیا تو اسے اس کا بھی گناہ ہوگا اور اس شخص کا بھی جو اس کے بعد اس پر عمل کرے گا اور عمل کرنے والے کے گناہ میں کوئی کمی نہ ہو گی۔ اس حدیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

جریر بن عبداللہ۔ ان کی کنیت ''ابو عمرو'' ہے آنحضرت ﷺ کی وفات کے سال اسلام لائے ہیں۔ جریر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں آنحضور ﷺ کی وفات سے چالیس (۴۰) دن پہلے ایمان لایا۔ ''کوفہ'' میں تشریف لائے اور ایک زمانہ تک وہاں رہے۔ پھر وہاں سے ''قرقیسیا'' کی طرف منتقل ہوئے اور وہاں ہی ۵۱ھ میں وفات پائی۔ ان سے ایک بڑی جماعت نے روایت کی ہے۔

تشریح: قولہ: کنا فی صدر النھار......من مضر:

''مجتابی'' جیم کے ساتھ ہے اور الف کے بعد باء ہے۔ ''النمار'': نون کے کسرہ کے ساتھ۔ یہ اون کے دھاری دار کمبل ہوتے ہیں اور اس کا واحد نمرۃ ہے نون کے فتح کے ساتھ۔ جیسا کہ امام طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا۔

''او العباء'': ظاہر یہ ہے کہ یہ راوی کا شک ہے یا ''اَوْ'' تنویع کیلئے ہے۔

قاموس میں ہے یہ معروف چادر کمبل ہے۔ اور نمرۃ اس چادر کو کہتے ہیں جس میں سفید و سیاہ دھاریاں ہوں۔ اون کے اس کمبل و چادر کو کہتے ہیں جو بدو (دیہاتی) پہنتے ہیں۔

پہلی صورت میں یہ حال متداخلہ یا مترادفہ ہے، اور اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے اپنے پہلوؤں میں تلواریں لٹکائی ہوئی تھیں۔

''ومتقلدی السیوف'': سید جمال الدین کے نسخے میں اسی طرح واؤ کے ساتھ ہے۔ لیکن بعض نسخوں میں یہ واؤ موجود نہیں اور اس پر ایک ہی حدیث میں راویوں کا اختلاف دلالت کرتا ہے۔

''مضر'': یہ عُمَر کی طرح پڑھا جاتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا قبیلہ ہے۔

''بل کھم من مضر'': فرمانا مبالغے کے طور پر تھا۔

قوله: فتمعر وجه رسول الله ﷺ لما راى بهم من الفاقة ......فصلى:

''مِنْ''(ما) کا بیان ہے۔

یعنی اس لئے کہ آپ ﷺ کے پاس کوئی مال نہ تھا جوان کی شکستہ حالت کی تلافی کرتا اوران کومحتاجی سے چھٹکارا دلاتا، انہیں آپ لباس عطا فرماتے اور اتنا دیتے کہ جو انہیں مالدار بنا دیتا۔ یہ آپ ﷺ کی اپنی اُمت کے حق میں کمال شفقت ورحمت ہے۔

چنانچہ آپ ﷺ اٹھے اپنے گھر میں تشریف لے گئے کہ شاید ازواجِ مطہرات کے نفقہ سے زائد کوئی چیز مل جائے' یا طہارت کی تجدید کیلئے داخل ہوئے' یا یہ تشریف لے جانا وعظ ونصیحت کی تیاری کیلئے تھا۔

''**فاذن واقام فصلى**'': یعنی فرض نمازوں میں سے کوئی نماز اداء کی، اور قرینہ یہ ہے کہ اذان اور اقامت کہی گئی۔ راوی کے قول **فی صدر النهار** کی وجہ سے زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ظہر یا جمعہ کی نماز تھی۔

قوله: ثم خطب...... ان الله كان عليكم رقيبا:

پوری آیت یوں ہے:

''**يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ**'': یہاں ''**ايها الناس**'' سے مؤمنین مراد ہیں۔ چنانچہ بعض سلف نے جو یہ فرمایا ہے کہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کے وہ تمام فرمان جو ''**ايها الناس**'' کے ساتھ آئے ہیں' وہ کفار کو خطاب ہے، یہ حکم غالبی ہے۔

یعنی اے لوگو! اپنے پروردگار (کے عذاب سے یا اس کی مخالفت کرنے) سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان (یعنی آدم) سے (بالواسطہ) پیدا کیا۔ اور ان دونوں کی اولاد کو واسطے یا بغیر واسطے کے متفرق کر دیا اور انکی پسلی سے حواء کو نکالا۔

''**وخلق منها**'': یہ واؤ مطلق جمع کیلئے ہے یا حال کیلئے ہے۔ اور کبھی یہ مقدر ہوتی ہے اور کبھی مقدر نہیں ہوتی۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی صلب سے ان کے چالیس بچے بیس دفعہ حمل میں ہوئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے چالیس بچے پیدا ہوئے، جن سے بیس لڑکے اور بیس لڑکیاں تھیں۔

''**رجالاً كثير اونساء**'': عورتوں کے ساتھ کثرت کا وصف ذکر کرنے کی بجائے مردوں کے ساتھ کثرت کے وصف کو بیان کرنے پر اکتفاء فرمایا اسلئے کہ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ زیادہ ہوں۔ اور کثیر کو مذکر لانا محل ہے جمع پر نہ کہ جماعت پر اور فعیل کے وزن میں تذکیر وتانیث برابر ہیں۔

''**واتقوا الله الذى تساء لون به والارحام**: تشدید وتخفیف دونوں کے ساتھ ہے۔

به یعنی اللہ کے ذریعے

''**والارحام**'': جمہور کے نزدیک اسم **جلالة** پر اس کا عطف ہونے کی وجہ سے یہ منصوب ہے۔ یعنی اس کو قطع کرنے سے ڈرو۔ اور جَر کے ساتھ یہ بغیر اعادہ جار کے ضمیر مجرور پر اس کا عطف ہے اور وہ جائز اور فصیح ہے اور جس نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے اس نے خطاء کی ہے۔ اہلِ عرب ایک دوسرے کو کہا کرتے تھے، **اسألك بالله وبالرحم كذا**۔ میں تجھ سے اللہ تعالیٰ اور رحم کے واسطے سے فلاں چیز کا سوال کرتا ہوں۔

"ان الله كان عليكم رقيبا": یعنی وہ تمہارے اقوال وافعال اور احوال پر مطلع ہے لہٰذا تم ان کاموں میں اللہ تعالیٰ کا دھیان رکھو۔

قوله: والآية التي في الحشر......ماقدمت لغد:

"والاية": امام طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اس کا عطف من حیث المعنی اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا﴾ پر ہے، قال کو" قرأ " کی تاویل میں کرنے کی بناء پر۔ یعنی قرأ هذه الاية والاية التي في الحشر۔

پوری آیت یوں ہے:

﴿يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا﴾ [النساء: ۱]

"لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا (یعنی اول) اس نے اس کا جوڑا بنایا۔ پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد وعورت (پیدا کر کے روئے زمین پر) پھیلا دیئے اور خدا سے جس کے نام کو تم اپنی حاجت براری کا ذریعہ بناتے ہوڈرو اور (قطع مودت) ارحام سے (بچو) کچھ شک نہیں کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔"

" نفس": نفس نکرہ ہے جو کہ عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی ہر نفس، جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ﴾ [التکویر: ۱۴]

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص کو غور وفکر کرنا چاہئے کہ اس نے کل کے زمانے یعنی قیامت کے نفع کیلئے کیا ذخیرہ بھیجا ہے۔ یعنی ان عبادات اور بھلائیوں کے بارے میں غور کرے جن کو انہوں نے آخرت کی طرف بھیجا ہے۔

" واتقوا الله" یہ تاکید کیلئے تکرار ہے۔ پہلے" واتقوا الله" کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے ڈرو، بچو اور دوسرے" و اتقوا الله" کا معنی ہے اس کی گرفت سے بچو، ڈرو۔ یا اس کا الٹ ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ ان الله خبير بما تعلمون﴾ [سورة المائدة: ۸] کی وجہ سے زیادہ ظاہر ہے۔ یعنی وہ اعمال کو جاننے والا ہے۔ چنانچہ وہ تمہیں ان کے بارے میں خبر دے گا اور ان کے بدلے تمہیں جزاء بھی دے گا۔ یہ فرمان وعدہ اور وعید دونوں پر مشتمل ہے۔

اس حدیث سے آیت اور حدیث کو ٹکڑے کرنے کا جواز بھی ثابت ہوتا ہے، بایں طور کہ ان میں سے ہر ہر ایک کا بعض حصہ حسب حاجت لایا جائے۔ واللہ اعلم۔

قوله: تصدق رجل......ولو بشق تمرة:

" تصدق" قاف کے فتح اور سکون کے ساتھ۔ امام طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ شاید ظاہری عبارت یوں تھی: ليتصدق رجل اور لام امر جو کہ غائب کیلئے ہے محذوف ہے۔ ابن انباری نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ اور بعض اہل لغت سے نقل کیا کہ قفا نبك میں" نبك" امر کی تاویل کی وجہ سے مجزوم ہے یعنی فلنبك۔ اور اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کے ان فرامین سے استدلال کیا ہے:

① ﴿ ذرهم يأكلوا﴾ [سورہ الحجر: ۳] یعنی فليأكلوا۔

۴ ﴿قل للذين امنوا يغفروا﴾[سورة الجاثية:١٤]یعنی فليغفروا۔

اگر "تصدق" کو فعل ماضی پر محمول کیا جائے تو آپ ﷺ کے فرمان: "ولو بشق تمرة" اور "فجاء رجل الخ" اس کی موافقت نہیں کرتا۔ اس لئے کہ صدقہ پر ابھارنے کے بعد یہ آپ ﷺ کے حکم کی بجا آوری کا بیان ہوگا۔ اور جن لوگوں نے اس کو اخبار پر جاری کیا ہے ان کی بھی ایک توجیہ ہے، لیکن اس میں غیر مخفی تعسف ہے جو کسی پر مخفی نہیں۔

ابہریؒ کہتے ہیں کہ حرفِ مضارعت کا نہ ہونا اس کو لام کے حذف پر محمول کرنے سے انکاری ہے۔ اھ۔ لہٰذا اس کا حمل لفظاً خبر پر اور معنیً امر پر متعین ہے۔ اور خبر کو انشاء کے معنی میں لانا کلام میں کثیر ہے۔ لہٰذا اس میں کوئی تکلف نہیں چہ جائیکہ تعسف ہو۔ اسی کے قبیل سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے: ﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ......﴾ [الصف: ١١]
"(وہ یہ کہ) خدا پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔ اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔"

ایک قول یہ ہے کہ یہ امنوا وجاهدوا کے معنی میں ہے اور اسی کی قبیل سے وہ عبارت بھی ہے جو حدیث تعبد الله میں گذر چکی جو کہ اعبدوا الله کے معنی میں ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ یہ زیادہ بلیغ ہے۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم دیا اور وہ اس کو بجا لایا' تب اللہ تعالیٰ اس کی خبر دے رہا ہے۔ واللہ اعلم۔

یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ یہ خبریں تو مضارع میں ہیں، جبکہ ہمارا کلام ماضی کے بارے میں ہے۔ اس لئے کہ خبر بحیثیت خبر' اس میں کوئی فرق نہیں خواہ ماضی ہو یا مضارع، جبکہ جس زائد بلاغت کا ذکر کیا گیا وہ ماضی میں زیادہ ظاہر ہے، اس لئے کہ اس کی دلالت مخبر بہ کے تحقق اور وقوع پر ہوتی ہے۔ اس لئے کہ آنے والی حدیث: "فمن اخذه اخذ بحظ وافر" میں دوسرے "اخذ" کو بعض علماء نے امر کے معنی پر محمول کیا ہے۔

"من صاع تمرة: عامل کا اعادہ استقلال کا فائدہ دیتا ہے اور اس بات کو دفع کرتا ہے کہ ایک صاع ان دونوں میں سے ہو۔ امام طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ رجل نکرہ کو افراد میں استغراق کا فائدہ دینے کیلئے جمع معروف کی جگہ پر رکھا گیا اگرچہ یہ نفی کے سیاق میں نہ ہو۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿ولو ان فی الارض من شجرة اقلام﴾ میں شجرہ ہے۔ اس لئے کہ یہ شجرہ' الأشجار کی جگہ واقع ہے۔ اسی لئے حدیث میں کئی دفعہ بغیر حرفِ عطف کے تکرار ہے۔ یعنی چاہیئے کہ ہر آدمی اپنے دینار میں سے صدقہ کرے اور ہر آدمی اپنے درہم میں سے صدقہ کرے، اسی طرح آخر تک۔

"مِنْ" تبعیضیہ ہے، یعنی چاہیئے کہ اس جنس میں جو کچھ اس کے پاس ہے اس میں سے صدقہ کرے۔ یا ابتدائیہ ہے جو کہ فعل کے ساتھ متعلق ہے۔ اس صورت میں اضافت بمعنی لام ہوگی، یعنی اس سے صدقہ کرے جو اس کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ اس کا حاجتمند ہے، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح :﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ [الحشر:٩]
"اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو۔"

قوله: فجاء رجل من الانصار بصرة ...... كانه مذهبة:

''تعجز'': یہ جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔اور کبھی فتح بھی دیا جاتا ہے۔

''من طعام'': بظاہر غلہ سے یہاں مراد دانے ہیں، اور نقود کا ذکر نہ کرنے اور صرف غلہ کا تذکرہ پر اقتصار کی وجہ غلہ کا بکثرت صدقہ کرنا ہے۔

'' حتی رأیت'': پہلے حتّٰی سے بدل ہے۔یا اس کی غایت ہے یعنی یہاں تک کہ میں نے دیکھا۔

''مذھبة'': ضمہ میم اور ذال کے سکون کے ساتھ اس کے بعد باء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ایسی چیز کو کہتے ہیں جس میں بنایا جائے / رکھا جائے۔امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ ذال معجمہ (نقطے والی) اور باء کے فتحہ اور باء موحدۃ کے ساتھ ہے۔ اور علامہ قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے اس میں تصحیف کی مدھنة دال مہملہ اور ھاء کے ضمہ اور نون کے ساتھ پڑھا، اور اسی طرح امام حمیدی نے ضبط کر لیا، لیکن صحیح اور مشہور قول وہ پہلا ہی ہے۔(البتہ) دو صورتوں میں اس سے مراد صفائی اور چمک ہے۔علامہ سید جمال الدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی طرح بیان فرمایا ہے۔

قوله:من سن في الاسلام سنة حسنة......من اجورهم شيء:

یعنی ایسا پسندیدہ طریقہ ایجاد کیا جس میں اس کی اقتداء کی جائے۔تو اس کو اس سنت کا اجر یعنی اس طریقے پر عمل کرنے کا ثواب۔اور ایک نسخہ میں ہے ''أجره''،یعنی جس شخص نے وہ طریقہ اختیار کیا اس کا اجر یعنی اس کے عمل کا اجر۔

تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ مصابیح کے اکثر نسخوں میں فله أجرها ہے، حالانکہ یہ روایۃً و درایۃً درست نہیں اس لئے اجره (والی روایت) ہی درست ہے۔اور (اجره میں) ضمیر صاحبِ طریقہ کیلئے ہے، یعنی اس کیلئے اس کے عمل کا اجر ہوگا اور اس کا اجر بھی ہوگا جو اس کی سنت پر عمل کرے گا۔بعض لوگوں کا یہ گمان ہے کہ یہ ضمیر السنة کی طرف راجع ہے۔اور اس کے بارے میں ان دونوں کتابوں کے راویوں میں سے بعد میں آنے والے بعض لوگوں کو وہم ہوا ہے حالانکہ حضرت مولف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نہیں لائے بلکہ یہ عرف امام مسلم رحمہ اللہ کے افراد میں سے ہے۔مسلم کے متعدد نسخوں میں اجرها پایا گیا ہے۔اور اسی نسخے کی بنیاد پر امام نووی نے اس کی تشریح کی ہے۔اس میں اضافت ادنی ملابست کیلئے ہے۔اس لئے کہ سنت ثبوتِ اجر کا سبب ہے۔لہٰذا اضافت جائز ہے۔(کذا ذکرہ الطیبی)

میں کہتا ہوں کہ وزدها پر تمام نسخوں کا اتفاق اس بات کی تائید کرتا ہے جو حضرت مؤلف رحمہ اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمائی ہے۔واللہ اعلم۔

''من بعده'':''مِنْ''(مَنْ) کا بیان ہے۔مصابیح میں'' واجر من عمل بعده'' کے الفاظ ہیں۔

ابن عبد الملک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''من بعده'' مراد یہ ہے کہ جس شخص نے وہ اچھا طریقہ ایجاد کیا اس کے مرنے کے بعد اس لئے کہ یہ وہم ہوتا ہے کہ مذکورہ اجر اس کیلئے اس وقت تک لکھا جائے گا جب تک وہ زندہ رہے۔اھ۔

میں کہتا ہوں کہ اس صورت میں یہ وہم ہوگا کہ جب تک وہ زندہ رہے اس کیلئے اجر نہیں لکھا جائے گا، اس لئے زیادہ بہتر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ (من بعده سے مراد یہ ہے کہ) جس وقت اس طریقے کو جاری کیا اس کے بعد سے۔

''ان ینقص'': یہ مبنی بر مفعول ہے۔اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبنی بر معلوم ہو اس لئے کہ یہ فعل لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔

قوله: ومن سن في الاسلام سنة سيئة......:

یعنی ایسی بدعت مذمومہ جس پر عمل کیا جانے لگے۔ "مَنْ" کے معنی کے اعتبار کی وجہ سے دونوں جگہ (اجورهم اور اوزارهم) جمع کا صیغہ لائے، اور لفظ "مَنْ" کا اعتبار کرتے ہوئے "ينقص" مفرد کا صیغہ لائے۔

قابیل کو ہر قتل کا گناہ ہوگا

۲۱۱: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُقْتَلُ نَفْسٌ ظُلْمًا اِلَّا كَانَ عَلَى ابْنِ اٰدَمَ الْاَوَّلِ كِفْلٌ مِّنْ دَمِهَا لِاَنَّهٗ اَوَّلُ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ (متفق عليه) وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ مُعَاوِيَةَ لَا يَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِيْ فِيْ بَابِ ثَوَابِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔

أخرجه البخاري ٦/٣٦٤ حديث رقم ٣٣٣٥۔ وأخرجه مسلم في صحيحه ٣/١٣٠٣ حديث رقم (٢٧-١٦٧٧) وأخرجه الترمذي في السنن ٥/٤١ حديث رقم ٢٦٧٣۔ وأخرجه ابن ماجة في السنن ٥/٤١ حديث رقم ٢٦٧٣۔ وأخرجه ابن ماجة في السنن ٢/٨٧٣ حديث رقم ٢٦١٦۔ وأحمد في المسند ١/٣٨٣۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی کو بھی ظلم سے قتل کیا جاتا ہے تو اس کے خون اور قتل کا ایک حصہ حضرت آدم علیہ السلام کے پہلے بیٹے قابیل پر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ پہلا شخص ہے جس نے قتل کا طریقہ ایجاد کیا۔ (بخاری و مسلم) اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث جس کے شروع میں لَا يَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِهٖ ہے ہم اس کو ان شاء اللہ بَابِ ثَوَابِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ میں بیان کریں گے۔

تشریح: قوله: لا تقتل نفس ظلما الا كان على ابن ادم الاوّل......الخ:

"ظلما" تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ "الاوّل" ابن کی صفت ہے۔

جس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تھا وہ قابیل ہے۔ یہ قتل اس وقت ہوا تھا کہ جب ان میں سے ہر ایک اپنی اس بہن کے ساتھ شادی کرتا تھا جو دوسرے کے ساتھ ایک ہی بطن سے پیدا ہوتی تھی۔ اس لئے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت میں حضرت حوّاء علیہا السلام کے بطون بمنزلہ دور کے رشتہ داروں کے ہوتے تھے۔ اس کی حکمت تعذر تزوّج تھی، چنانچہ مصلحت کا تقاضا تھا کہ نسل انسانی کے بقاء کیلئے اس کو جائز قرار دیا جائے۔ اس وقت قابیل نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا اس لئے کہ اس کی بیوی زیادہ خوبصورت تھی۔ اس قصے کی تفصیل تفسیر میں ہے۔

تورپشتی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اوّل کی قید اس لئے لگائی گئی تا کہ اشتباہ نہ ہو۔ اس لئے کہ بنی آدم میں بہت کثرت ہے۔ یہ بات اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قابیل حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سب سے پہلا مولود تھا۔ امام طیبیؒ نے یہی فرمایا اور علامہ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی اتباع کی۔ لیکن اس قول میں اشکال ہے اس لئے کہ مفسرین فرماتے ہیں کہ ان دونوں کا یہ معاملہ کئی بطون کے بعد پیش آیا۔ واللہ اعلم۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ لام عہد کیلئے ہے، یعنی قتل کرنے والوں میں سب سے پہلا۔

الفصل الثانی:

تعلیم و تعلّم کے فضائل

۲۱۲ :عَنْ كَثِيْرِ بْنِ قَيْسٍ قَالَ:كُنْتُ جَالِسًا مَعَ اَبِي الدَّرْدَآءِ فِي مَسْجِدِ دِمَشْقَ فَجَآءَ رَجُلٌ فَقَالَ يَا اَبَا الدَّرْدَآءِ اِنِّي جِئْتُكَ مِنْ مَدِيْنَةِ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِحَدِيْثٍ بَلَغَنِي اَنَّكَ تُحَدِّثُهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاجِئْتُ لِحَاجَةٍ قَالَ فَاِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَطْلُبُ فِيْهِ عِلْمًا سَلَكَ اللّٰهُ بِهٖ طَرِيْقًا مِنْ طُرُقِ الْجَنَّةِ وَاِنَّ الْمَلَآئِكَةَ لَتَضَعُ اَجْنِحَتَهَا رِضًى لِّطَالِبِ الْعِلْمِ وَاِنَّ الْعَالِمَ لَيَسْتَغْفِرُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالْحِيْتَانُ فِيْ جَوْفِ الْمَآءِ وَاِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عَلٰى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ وَاِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ وَاِنَّ الْاَنْبِيَآءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا وَّاِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ فَمَنْ اَخَذَهٗ اَخَذَ بِحَظٍّ وَّافِرٍ۔

(رواہ احمد و الترمذی و ابوداود و ابن ماجة و الدارمی و سماہ الترمذی قیس بن کثیر)

۲۱۲ : أخرجه أحمد فی المسند ۱۹۶/۵ وأخرجه الترمذی ۴۷/۵ حدیث ۲۶۸۲۔وسماہ قیس بن کثیر وأخرجه أبوداوٗد ۵۷/۴حدیث رقم ۳۶۴۱۔وأخرجه ابن ماجة فی مقدمة لسننه ۸۱/۱حدیث رقم۲۲۳۔وأخرجه الدارمی ۱۱۰/۱حدیث رقم ۳۴۲۔

ترجمہ: حضرت کثیر بن قیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ صحابی رسول حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کے پاس ملک شام کے شہر دمشق کی مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا اور عرض کیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر سے آپ کی خدمت میں ایک حدیث حاصل کرنے کے لئے آیا ہوں۔ جس کے متعلق مجھے معلوم ہوا کہ آپ اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں۔ آپ کے پاس آنے کی میری اس کے علاوہ اور کوئی غرض نہیں ہے۔ یہ سن کر حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے۔ کہ جو انسان علم طلب کرنے کے لئے کوئی راستہ اختیار کرے چاہے وہ طویل ہو یا مختصر ہو۔ تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے راستوں میں سے کسی راستہ پر چلا دیتا ہے اور جنت کا راستہ اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے اور فرشتے طالب علم کی رضا مندی کے لئے اپنے پروں کو جھکاتے ہیں اور عالم کے لئے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے۔ یعنی ملائکہ اور جو چیز زمین کے اوپر ہے۔ یعنی جنات اور انسان وغیرہ اور مچھلیاں پانی کے اندر استغفار کرتی ہیں اور عابد زاہد پر عالم کو ایسے ہی فضیلت حاصل ہے جیسے کہ چودھویں رات کے چاند کو دوسرے ستاروں پر فضیلت ہے اور علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء علیہم السلام درہم اور دینار کے وارث نہیں بناتے۔ ان کی وراثت علم ہے لہٰذا جس نے علم حاصل کیا۔ اس نے کامل اور وافر حصہ حاصل کر لیا۔ اس حدیث کو امام احمدؒ امام ترمذیؒ امام ابوداؤدؒ امام ابن ماجہؒ اور امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے راوی کا نام قیس

بن کثیر ذکر کیا ہے۔حالانکہ صحیح کثیر بن قیس ہے جیسے کہ صاحب مشکوٰۃ نے ذکر کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

قیس بن کثیر۔ یہ قیس ہیں جو کثیر کے بیٹے ہیں۔ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے حدیث کی سماعت کی ہے۔ان سے داؤد بن جمیل نے روایت کرتے ہیں۔

ملاحظہ

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی حدیث کی اپنی کتاب میں ''قیس ابن کثیر'' کے حوالہ سے تخریج کی اور فرمایا کہ اسی طرح ہم سے ''محمود بن خداش'' نے حدیث بیان کی' حالانکہ یہ کثیر بن قیس کے حوالہ سے ہے نہ کہ قیس بن کثیر کے ذریعہ سے۔اور اسی طرح ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا نام ''کثیر بن قیس'' بیان کیا ہے۔اور بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کا ذکر ''کثیر'' کے باب میں کیا ہے۔ ''قیس'' کے باب میں نہیں۔(مروی ہے کہ یہ نام قیس بن کثیر نہیں بلکہ کثیر بن قیس ہے)۔

کثیر بن قیس۔ یہ کثیر ہیں۔قیس کے بیٹے ہیں یا قیس ابن کثیر ہیں۔ان کا ذکر حرف قاف میں آ چکا ہے۔

تشریح: **قوله:كنت جالسا مع ابى الدرداء ......لحاجة:**

''دمشق'': دال کے کسرہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ۔اور میم کو مکسور بھی پڑھا جاتا ہے۔دمشق ملک شام میں واقع ہے۔

''فقال:يا ابا الدرداء'': حرف نداء کے بعد ہمزہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، لیکن رسم الخط میں لکھا نہیں جاتا۔

''انى جئتك من مدينه الرسول ﷺ'': علامہ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس طرح کہنے کو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ناپسند فرمایا ہے اس لئے کہ یہ لفظ (الرسول) رسول اللہ اور ان کے علاوہ کے درمیان مشترک ہے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ﴾ [المائدة:٤١] کی وجہ سے اشکال وارد نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی کو مخاطب کرنا جس لفظ کے ذریعے بھی ہو، نبی کیلئے باعث شرف ہے۔اسی لئے اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾ [النور:٦٣] ''مؤمنو! پیغمبر کے بلانے کو ایسا خیال نہ کرنا جیسا تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔'' سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کو آپ ﷺ کے نام کے ساتھ یا محمد کہہ کر پکارنا یا آپ ﷺ کی کنیت کے ساتھ ''یا ابا القاسم'' کہہ کر پکارنا حرام ہے۔فرمایا کہ آپ ﷺ کو صرف یارسول اللہ، یا، یا نبی اللہ جیسے الفاظ سے پکارا جائے۔اھ۔

نیز (یہاں پر) معنی مشترک کے مراد لینے سے روکنے والا قرینہ موجود ہے، اس لئے کہ مدینۃ الرسول سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کا شہر ہونا سمجھ میں نہیں آتا، بلکہ اس کا وہم بھی نہیں ہوتا۔خاص کر جبکہ اس کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس جیسے کلمات بھی ملے ہوئے ہوں۔

''عن رسول الله ﷺ'': اس میں احتمال ہے کہ اس شخص نے وہ حدیث اجمالاً سنی ہو، اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس نے یہ حدیث سنی ہو، لیکن وہ علم کا فائدہ حاصل کرنے کیلئے اور یقین کی زیادتی کیلئے یا علو اسناد کیلئے کہ اسناد دین میں سے ہے، بغیر واسطہ کے حدیث سننا چاہتا ہو۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے جو حدیث بیان فرمائی، اس کے بیان فرمانے میں یہ احتمال ہے کہ وہ اس شخص کا بعینہٖ مطلوب ہو یا اس بات کو بیان کرنے کیلئے ہو کہ اس کی کوشش اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابلِ قدر ہے۔ یہاں پر یہ بیان نہیں کیا گیا کہ اس کا مطلب کونسی حدیث تھی۔ پہلا احتمال غریب ہے، اور دوسرا احتمال زیادہ قریب (الفہم) ہے۔

قوله: قال فانی سمعت رسول الله ﷺ يقول: من سلك طريقا ......من طرق الجنة:

امام طیبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ''الطریق'' اور ''العلم'' کو مطلق ذکر فرمایا' تا کہ یہ دونوں کی جنس کو شامل ہو چاہے جو بھی راستہ ہو، وطنوں کو چھوڑنے اور شہروں میں گھومنے سے لے کر اس کے علاوہ تک، جیسا کہ پہلا گزر چکا اور علومِ دین میں جو بھی علم ہو، خواہ کم ہو یا زیادہ، عالی شان ہو یا غیر عالی شان۔

شرح السنۃ میں امام ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ میں آج کل طلب علم سے افضل کسی چیز کو نہیں جانتا۔ ان سے کہا گیا کہ طلبہ کی کوئی نیّت تو ہوتی نہیں ہے۔ امام ثوریؒ نے فرمایا' طلبہ کا علم کو طلب کرنا ہی ان کی نیت ہے، یعنی طلب علم کا سبب نیّت ہی ہے۔ اسی وجہ سے بعض علماء فرماتے ہیں: **طلبنا العلم لغير الله، أبى أن يكون الا الله۔**

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ طلب علم، نفل نماز سے افضل ہے۔ اھ۔ اس لئے کہ طلب علم یا تو فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ۔ اور وہ دونوں نفل سے افضل ہیں۔

مام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ علم، دانائی ہے، اور وہ ایسا نور ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں ہدایت عطاء فرماتے ہیں۔ اور وہ کثرتِ مسائل سے نہیں آتا۔ اور شاید اس قول سے امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت کے معنی کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہوں۔: ﴿يوتى الحكمة من يشاء﴾

''**سلك الله به**'': ضمیر مجرور مَنْ کی طرف لوٹ رہی ہے اور باء تعدیہ کیلئے ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ اس کو سالک بناتے ہیں اور یہ توفیق بخشتے ہیں کہ وہ جنت کے راستے پر چلے۔

ایک قول یہ ہے کہ ضمیر مجرور علم کی طرف لوٹ رہے ہے اور باء سببیت کیلئے ہے۔ اور سلك بمعنی سهل کے ہے۔ اور مَن کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے۔ (اس صورت میں) معنی ہوگا' اللہ تعالیٰ اس کیلئے علم کی بدولت آسان فرمادیتے ہیں۔

پہلے قول کے اعتبار سے سلک' السلوک سے ماخوذ ہے۔ اور دوسرے قول کے لحاظ سے السلک سے ماخوذ ہے اور مفعول محذوف ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ﴿يسلكه عذابا صعدا﴾۔ ایک قول یہ ہے کہ عذاباً مفعول ثانی ہے۔ (بہر حال) دونوں تقدیروں پر سلک کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف علی طریق المشاکلۃ ہے۔ (کذا ذکرہ الطیبی)

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جنت کے راستے بہت سے ہیں اور ہر عمل صالح جنت کے راستوں میں سے ایک راستہ ہے اور علم کا راستہ جنت کے قریب ترین اور عظیم تر راستوں میں سے ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جنت کے راستے' علم کے راستوں میں منحصر ہیں، اس لئے کہ عمل صالح کا بغیر علم کے تصور نہیں ہوسکتا۔ واللہ اعلم۔ چنانچہ صوفیہ کا یہ قول کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جانے والے راستے مخلوقات کی سانسوں کی بقدر ہیں، معرفت پر مبنی ہے جو کہ علم کی مختلف انواع میں سے ایک نوع ہے، نیز اس لئے کہ علم کے علاوہ دوسرا راستہ

جہالت کا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جاہل کو اپنا ولی نہیں بناتے۔ اگر کسی کو اپنا ولی بناتے ہیں تو اس کے علم کی وجہ سے بناتے ہیں۔

قوله: وان الملائكة لتضع اجنحتها رضا لطالب العلم :

"الملائكة": لام یا تو جنس کا ہے یا عہد کا۔ یعنی ملائکہ رحمت۔ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس میں احتمال ہے کہ تمام ملائکہ مراد ہوں۔ اور یہ آپ ﷺ کے ارشاد لتضع اجنحتها رضا میں پائے جانے والے معنی مجازی کے زیادہ مناسب ہے۔ "رضا" حال ہے یا ارادۃ رضا (کے معنی پر) مفعول لہ ہے، تاکہ فعل معلل کے فاعل کا فعل بنے۔

"لطالب العلم: لام رضا سے مطلق ہے۔ اس عبارت کی معنوی تقدیر میں دو توجیہات ہیں:

① لأجل الرضا الواصل منها اليه۔ ② لأجل ارضائها الطالب العلم بما يضع۔

"وان الملائكه لتضع اجنحتها رضی لطالب العلم" کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں:

① ملائکہ طالب علم کیلئے واضع اختیار کرتے ہیں، اس کے علم کی توقیر کی وجہ سے یہ ارشادِ گرامی اس آیتِ کریمہ کی طرح ہے: ﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ [الاسراء:٢٤] اس آیت کی تفسیر "تواضع لهما" کے ساتھ کی گئی ہے۔

② ملائکہ اُڑنا چھوڑ کر ذکر کی مجالس میں نازل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ پچھلی حدیث میں گزرا: وحفت بهم الملائكة۔

③ طلب علم میں طالب علم کی مدد و نصرت کرتے ہیں۔

④ ملائکہ طالب علم کے ساتھ نرمی اور شفقت کا معاملہ رکھتے ہیں۔

⑤ اس حدیث کے حقیقی معنی مراد ہیں، اگرچہ ہمیں اس کا مشاہدہ نہیں ہوتا۔ ملائکہ اپنے پر پھیلا کر طالب علم کو اپنے پروں پر سوار کر کے لے جاتے ہیں۔

ایک عبرت:

ابن قیم احمد بن شعیب سے نقل کرتے ہیں کہ ہم بصرہ میں کسی محدث کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، کہ انہوں نے ہمیں یہ حدیث بیان کی۔ اسی مجلس میں ایک معتزلی بھی موجود تھا، اس نے یہ حدیث سن کر ٹھٹھا کیا اور کہا: اللہ کی قسم میں کل نعلین پہن کر آؤں گا اور ملائکہ کے پروں کو روندوں گا، چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا کہ نعلیں پہن کر چلا تو اس کی ٹانگوں میں تکلیف شروع ہوگئی، اور ٹانگوں کو ایسی خارش لاحق ہوگئی کہ ٹانگیں ختم ہو کر رہ گئیں۔

طبرانیؒ فرماتے ہیں: میں نے ابن یحییٰ ساجی کو فرماتے ہوئے سنا کہ ہم بصرہ کی گلیوں سے تیزی کے ساتھ گزرتے ہوئے کسی محدث کے گھر جا رہے تھے، ہم تیزی سے چل رہے تھے، ہمارے ساتھ ایک ماجن (شوخ، بے حیاء، تمسخر آمیز باتیں کرنے والا) بھی تھا، جو دین کے معاملہ میں متہم تھا، وہ کہنے لگا: اپنے پاؤں کو ملائکہ کے پروں کے اوپر سے اُٹھالو، ملائکہ کے پروں کو مت توڑو، وہ شخص گویا کہ اس حدیث کا مذاق اڑا رہا تھا، وہ ابھی اپنی جگہ سے ہلنے نہیں پایا تھا کہ اس کی ٹانگوں میں تکلیف شروع ہوگئی، اور وہ زمین پہ گر پڑا۔ اھ۔

صفوان بن عسال سے روایت ہے: **قال: قلت: یا رسول الله! جئت أطلب العلم، قال: "مرحبا بطالب العلم، ان طالب العلم لتحف به الملائکة وتظله باجنحتها فیرکب بعضها علی بعض حتی تبلغ السماء الدنیا من حبهم لما یطلب"**(روایة فی السنن والمسانید، نقله الشیخ ابن القیم)۔ امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

قوله: وان العالم لیستغفر له...... والحیتان فی جوف الماء:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں اس کے مجازی معنی مراد ہیں۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ حقیقی معنی مراد لینا اولیٰ ہے۔

ان مخلوقات کے استغفار کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں:

آسمان والے اس وجہ سے استغفار کرتے ہیں کہ عالم کی بدولت ہی اہلِ آسمان کا علم اہلِ زمین کو ہوا، اور علماء ہی نے اہلِ آسما کی عظمت کا پرچار کیا۔ زمین والے اس وجہ سے استغفار کرتے ہیں کہ اہلِ زمین کی بقاء وصلاح علماء کے فتویٰ اور رائی کے ساتھ مربوط ہے، چنانچہ موجودات میں سے ہر زندہ مردہ چیز میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور موجود ہے۔ جس کا پتہ بغیر علم کے ممکن نہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں مچھلیوں کی تخصیص اس بنیاد پر کی گئی ہے کہ آسمانوں سے بارش کا نزول علماء کی برکت سے ہوتا ہے، تو گویا کہ علماء مچھلیوں کی حیات کا سبب ہیں۔ اھ۔ ایک حدیث میں آتا ہے: **بهم تمطرون وبهم ترزقون۔**

قوله: ون فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلة البدر علی سائر الکواکب:

یہ فضیلت 'عالم محض یا عابد محض کو حاصل نہیں ہوگی، جو کہ عالم محض اور عابد محض تو معذّب فی النار ہوں گے، چونکہ صحتِ عمل "علم" پر موقوف ہے، اور کمالِ علم "عمل" پر موقوف ہے۔ چنانچہ مروی ہے: **ویل للجاهل مرة وویل للعالم سبع مرات۔**

چنانچہ ایک اور روایت میں آتا ہے: **اشد الناس عذاباً یوم القیامة عالم لم ینفعه الله بعلمه۔**

چونکہ ایسا عالم ضالّ اور مُضِلّ ہوتا ہے۔

حدیث باب میں مذکور عالم وعابد سے مراد وہ عابد ہے جس کی عبادت پر اس کا علم غالب ہو بایں طور کہ فرائض اور سنن مؤکدہ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ علم کی نشر واشاعت کرتا ہو، لوگوں کو عبادت، زہد، مجاہدہ، صبر قناعت وغیرہ کی تعلیم دیتا ہو، خواہ یہ تعلیم بذریعہ درس وتدریس ہو، خواہ بذریعہ تصنیف تالیف ہو، خواہ بذریعہ وعظ ونصیحت ہو۔ اور عابد سے مراد وہ عابد ہے کہ جس پر عبادت غالب ہو بایں طور کہ صحتِ عبادت کے ضروری مسائل کا علم رکھتا ہوئے اپنے اوقات کو عبادت میں مشغول رکھے۔

عالم چاند عابد ستارہ:

قاضیؒ فرماتے ہیں: عالم کو چاند کے ساتھ اور عابد کو کواکب کے ساتھ تشبیہ دی ہے، چونکہ عبادت کا کمال اور نور صرف عابد کی ذات تک محدود رہتا ہے، متعدی نہیں ہوتا، اور عالم کا نور متعدی ہوتا ہے، چنانچہ عالم کے اس نور سے دوسرے لوگ روشنی حاصل کرتے ہیں جو نور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مستفاد ہے۔ جیسا کہ چاند کہ وہ سورج سے نور حاصل کرتا ہے اور سورج اپنے

خالق سے نور حاصل کرتا ہے۔اھ۔ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: اس سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام مراد ہیں، یعنی مشبہ بہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں باایں طور کہ نور تو آنحضرت ﷺ ہیں۔گویا فضل العالم میں اس ارشادِ گرامی کی طرف تلمیح ہے: **کفضلي علی أدناکم**، اور سائر الکواکب میں "**اصحابی کالنجوم بأیهم اقتدیتم اهتدیتم**" کی طرف اشارہ ہے۔اگر مؤمن عابد نہ ہوتو اس کا نور ضعیف ہی ہوتا ہے۔

قوله: وإن العلماء ورثة ...... ولا درهما:

ورثۃ الانبیاء فرمایا، ورثۃ الرسل نہیں فرمایا، تا کہ تمام کو شامل رہے۔ابن الملک نے کہا ہے یعنی بعض علماء رسولوں کے وارث ہیں، مثلاً اصحاب مذاہب، اور باقی علماء انبیاء کے وارث ہیں حسب مراتب۔یعنی انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰت والتسلیمات کی وراثت کوئی دنیاوی چیز نہیں ہوتی۔

دراہم ودینار کا خصوصی طور پر ذکر اس لئے فرمایا کہ مال عام طور پر انہی صورتوں میں ہوتا ہے۔آنحضرت ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی دنیا کے فانی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔انبیاء نے دنیا کو بقدر ضرورت ہی رکھا، لہٰذا کوئی شئی ورثہ میں نہیں چھوڑی تا کہ انبیاء کے بارے میں یہ وہم نہ ہو سکے کہ انبیاء کرام بھی ایسی چیز کی طلب رکھتے تھے کہ جو ان کی میراث بن سکے۔

ایک جماعت کا کہنا ہے کہ یہ کلام مبالغہ فی التنزیہ پر محمول ہے۔چنانچہ کہا جاتا ہے: **الصوفي لا يملك ولا يملك**۔ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی دو باتوں کی طرف اشارہ ہے:

① انبیاء کرام علیہم السلام اپنے بارے میں اور اپنے اہل عیال کے بارے میں کمال درجہ کا توکل رکھتے ہیں۔② دنیا کا طالب انبیاء کا وارث نہیں۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں: اُقل علم بلکہ اُقل ایمان یہ ہے کہ آدمی کو بات کی معرفت حاصل ہو جائے کہ دنیا "فانی" ہے، اور عقبیٰ "باقی" ہے، اور اس علم کا نتیجہ یہ ہے کہ "فانی" سے اعراض کیا جائے اور "باقی" کی طرف توجہ کی جائے، دھیان دیا جائے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: درہم کا خصوصی طور پر ذکر کیا، چونکہ نفی دینار نفی درہم کو لازم نہیں۔"**لا درهما**" میں 'لا' زائدہ ہے جو تاکید نفی اور مبالغہ کیلئے لایا گیا ہے۔

ایک اشکال: یہاں ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس بنی نضیر، فدک، خیبر کے صفایا تھے۔ شعیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس بہت زیادہ بکریاں تھیں، حضرت ایوب علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس تو اللہ کی عطا کردہ بے تحاشا نعمتیں تھیں۔

جواب یہ ہے کہ انبیاء کرام نے اپنی کوئی بھی چیز بطور میراث نہیں چھوڑی کہ جو ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد وازواج میں تقسیم ہوتی، بلکہ ان کا سارا ترکہ ان کی وفات کے بعد مسلمانوں کی ضروریات کیلئے استعمال ہوا۔اھ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ بازار سے گزر رہے تھے دیکھا کہ لوگ تجارت میں مشغول ہیں، آپ نے لوگوں سے کہا: "تم لوگ یہاں ہو! حالانکہ مسجد میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی میراث تقسیم ہو رہی ہے۔" لوگ جلدی سے

مسجد کی طرف لپکے، وہاں پہنچے تو دیکھا کہ لوگ قرآن، ذکر اور علم میں مشغول ہیں۔ لوگ کہنے لگے: تم جو کہہ رہے تھے، وہ چیز کہاں ہے؟ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ان کی یہ بات سن کر فرمایا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث یہی تو ہے جو ان کے ورثہ میں تقسیم ہو رہی ہے۔ ان کی میراث تمہاری دنیاوی چیزیں نہیں ہے۔

قوله: وانما ورثوا العلم فمن اخذه أخذ بحظ وافر:

باء زائدہ، برائے تاکید ہے ای: أخذ حظا وافرا یعنی نصیبا تاما ای: لا حظ أوفر منه۔

یا محذوف کے متعلق ہے۔ أی: أخذه متلبّسا بحظ وافر من میراث النبوة۔

یا أخذ امر کے معنی میں ہے۔ أی: فمن أراد أخذه فلیأخذ بحظ وافر ولا یقتنع بقلیل۔

عالم کی فضیلت عابد پر

۲۱۳: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ الْبَاهِلِیِّ قَالَ ذُكِرَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلَانِ: اَحَدُهُمَا عَابِدٌ وَالْاٰخَرُ عَالِمٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِيْ عَلٰى اَدْنَاكُمْ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَآئِكَتَهٗ وَاَهْلَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ حَتَّى النَّمْلَةَ فِیْ جُحْرِهَا وَحَتَّى الْحُوْتِ لَيُصَلُّوْنَ عَلٰى مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَيْرَ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٥/٤٨ حدیث رقم ٢٦٨٥ وقال حدیث غریب۔

ترجمہ: حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو آدمیوں کا ذکر کیا گیا۔ ان میں سے ایک عابد تھا اور دوسرا عالم۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ عالم کو عابد پر اس طرح فضیلت حاصل ہے۔ جس طرح کہ مجھے تم میں سے ادنیٰ شخص پر فضیلت ہے۔ پھر اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اور آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوق یہاں تک چیونٹیاں اپنے سوراخوں میں اور مچھلیاں اس شخص کے لئے مغفرت اور خیر کی دعائیں کرتی ہیں جو لوگوں کو دین کا علم سکھاتا ہے۔

تشریح: قوله: ذکر لرسول الله صلی الله علیه وسلم رجلان:

یہاں دونوں احتمال ہیں:

① یہ تمثیلی بات ہے۔ ② یہ دونوں افراد واقعی موجود تھے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے تھے۔

قوله: أحدهما عابد والآخر عالم: یہاں بھی وہی عالم و عابد مراد ہیں، جن کا ذکر پچھلی حدیث میں ہوا۔

قوله فضل العالم علی العابد کفضلی علی أدناکم:

اس الف لام کے بارے میں دو احتمال ہیں: پہلا احتمال یہ ہے کہ دونوں جگہ الف لام جنس کا ہے لہٰذا حکم عام ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ "الف لام" عہد کا ہے اس صورت میں باقی افراد کا حکم قیاس کے ذریعے ثابت ہوگا۔

اس کلام میں مبالغہ ہے۔ چونکہ اگر فقط اتنا فرما دیتے'' کفضلی علی اعلاکم''تو علم کی فضیلت کیلئے اتنی بات بھی کافی تھی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی اس ارشادِ گرامی کی نظیر ہے: واحشرنی فی زمرة المساکین، یہ جملہ آنحضرت ﷺ کی انتہائی تواضع کو ظاہر کرتا ہے۔

قولہ: ان اللہ و ملائکتہ...... :

یہ جملہ مستانفہ تعلیلیہ ہے۔'' ملائکته واهل السماوات'': یہ تعمیم بعد از تخصیص ہے۔''حتی النملة'':اگر''حتی'' عاطفہ ہو تو النملة منصوب، اگر جارہ ہو تو مابعد مجرور، اور اگر ابتدائیہ مانیں تو مابعد مرفوع پڑھا جائے گا۔''حتی'' کو عاطفہ ماننا اصح ہے۔

''جحر''جیم کے ضمہ اور حاء کے سکون کے ساتھ ہے۔

''ملائکة'' سے مراد حاملینِ عرش، اور اہلِ ارض سے مراد انس و جن اور تمام حیوانات ہیں۔ خشکی کے حیوانات میں سے چیونٹی، اور بحری مخلوق میں سے مچھلی کا ذکر بطور غایت کے ہے۔ چیونٹی کا ذکر خصوصی طور پر اس وجہ سے کیا گیا کہ خشکی کے حیوانات میں سے سب سے زیادہ ذخیرہ اندوز مخلوق چیونٹی ہے، لہٰذا دوسری مخلوقات کے مقابلے میں چیونٹی علماء کے برکات کی زیادہ حاجت مند ہوتی ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ ان دونوں چیزوں کا خصوصی طور پر ذکر کرنا، حلال اور حرام کی جنس کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ ان دونوں چیزوں کا خصوصی طور پر ذکر کرنا ان جانوروں کی جنس کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جن کو مارنا ممنوع ہے۔

''یصلون'': میں تغلیب ہے کہ عقلاء کو غیر عقلاء پر غلبہ دیا گیا ہے۔

''الخیر'': خیر سے مراد علمِ دین اور ذریعہ نجات ہے۔

معلم کے ساتھ خیر کی قید لگائی تا کہ معلوم ہو جائے کہ اس دُعا کے استحقاق کا باعث وہ علم ہے جو''خیر'' پہنچائے۔ اھ۔ اس میں سبب افضلیت کی طرف اشارہ ہے کہ علم کا نفع''متعدی'' ہے۔ اور عبادت کا نفع''قاصر'' ہے، نفسِ علم بہرحال فرض ہے، خواہ فرضِ عین ہو، خواہ فرضِ کفایہ ہو، اور عبادات میں فرض کے علاوہ کی جانے والی عبادت نفل ہے اور فرض کا ثواب نفل کے ثواب سے زیادہ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

۲۴ : وَرَوَاهُ الدَّارِمِيُّ عَنْ مَكْحُولٍ مُرْسَلًا وَلَمْ يَذْكُرْ رَجُلَانِ وَقَالَ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلٰى اَدْنَاكُمْ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَة (اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَآءُ) وَسَرَدَ الْحَدِيْثَ اِلٰى اٰخِرِهٖ - (ترمذی)

ترجمہ: اس روایت کو امام ترمذی اور امام دارمی نے مکحول سے مرسل طریقہ پر روایت کیا ہے اور اس میں۔ رَجُلَانِ کا لفظ ذکر نہیں کیا ہے اور کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عابد پر عالم کو ایسے ہی فضیلت حاصل ہے جیسے مجھے تم میں سے ادنیٰ درجہ کے آدمی پر فضیلت حاصل ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی۔ (اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ

عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا)۔ کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے علماء ہی اللہ سے ڈرتے ہیں اور پھر پوری حدیث آخر تک اسی طرح بیان کی۔

راویٔ حدیث:

مکحول بن عبداللہ۔ مکحول ''عبداللہ'' کے بیٹے ہیں۔کنیت ابوعبداللہ ہے۔یہ سیاہ فام تھے۔شام کے باشندہ ہیں۔کابل سے قید کر کے لائے گئے۔بنوقیس کی ایک عورت کے یا بنی لیث کے غلام تھے۔امام اوزاعی کے استاذ تھے۔امام زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ علماء چار ہیں۔شہر مدینہ میں ابن مسیّب' کوفہ میں شعبی' بصرہ میں حسن بصری شام میں مکحول۔فتوے میں مکحول سے زیادہ کوئی صاحب بصیرت نہ تھا۔جب فتویٰ دیتے تو کہتے: لا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ' یہ میری رائے ہے' رائے کبھی غلط ہوتی ہے کبھی درست۔ایک جماعت سے انہوں نے حدیث کی سماعت کی جن میں انس بن مالک' واثلہ بن اسقع اور ابو ہندوان رضی اللہ عنہم وغیرہ شامل ہیں اور ان سے بہت سے لوگوں نے روایت کی۔چنانچہ زہری' اوزاعی' یحیٰ بن عسال' ابن جریج' مالک بن انس وغیرہ آپ سے روایت کرتے ہیں۔۱۱۸ھ میں انتقال فرمایا۔

تشریح: قولہ:ولم یذکر رجلان:

'' رجلان'': مرفوع علی الحکایۃ ہے۔ ولم یذکر رجلان کا مطلب یہ ہے کہ مکحول نے حدیث کا اتنا ٹکڑا: ذکر لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجلان: أحدھما عابد والآخر عالم، ذکر نہیں کیا ہے۔

قولہ: فضل العالم علی العابد: سے اس احتمال کی تائید ہوتی ہے کہ پچھلی روایت میں العالم اور العابد کا ''ال'' جنس کا ہے۔

قولہ: کفضلی علی ادناکم: اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں:

① عالم کو عابد پر ایسی فضیلت ہے جیسی کہ میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ درجہ کے صحابی پر ہے۔

② میری فضیلت اس شخص پر ہے جو تم سب مسلمانوں میں سے (یعنی غیر صحابہ میں سے) سب سے ادنیٰ درجہ کا ہے، اس دوسرے مفہوم میں پہلے مفہوم کے مقابلے میں بے انتہاء مبالغہ ہے۔

قولہ: ثم تلا ھذہ الآیۃ:

یہاں بھی دو احتمال ہیں کہ اس آیت کریمہ کی تلاوت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمائی، یا حضرت مکحول نے فرمائی۔ اس آیت کریمہ کی تلاوت فرمانا بطور استشہاد کے تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ بطور تصدیق تلاوت فرمائی ہو۔

قولہ: ﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ [فاطر : ۲۸] ''خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔''

اس آیت کریمہ میں دو قراءتیں ہیں:

① قراءت متواترہ میں لفظ جلالہ منصوب، اور لفظ علماء مرفوع ہے۔

② قراءت شاذہ میں لفظ جلالہ مرفوع، اور لفظ علماء منصوب ہے ای یعظم اور اس صورت میں تجرید ہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس موقع پر اس آیتِ کریمہ کی تلاوت فرمانا فضیلتِ علم کی علت کے بیان کے استشہاد کے طور پر تھا۔ کہ عالمِ حقیقی اللہ جل شانہٗ کی ذاتِ گرامی اور جلال و کبریاء کی معرفت اس عابد کے مقابلے میں زیادہ ہے کہ جس پر عبادت کا غلبہ ہے، چنانچہ ''عالم'' اتقی ٹھہرا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ﴾ [الحجرات:۱۳]۔ ''اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔''

''خشیت'' اس خوف کو کہتے ہیں جس میں تعظیم بھی ہو۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ علم خشیت پیدا کرتا ہے، اور خشیت کا نتیجہ تقویٰ ہے، اسی قلم کا علم ہی ''اکرم'' اور ''افضل'' ہونے کا موجب ہے۔ جس آدمی کے پاس اس قسم کا علم نہیں ہے وہ شخص جاہل کی مانند ہے، بلکہ سراسر جاہل ہے۔ چنانچہ اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ **ویل للجاهل مرة، وویل للعالم سبع مرات**، سلف کا اتفاق ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے وہ ''جاہل'' ہے، اور اس کی دلیل یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ﴾ [النساء:۱۷] ''خدا انہیں لوگوں کی توبہ قبول فرماتا ہے جو نادانی سے بری حرکت کر بیٹھتے ہیں۔''

حدیث حاصل کرنے والوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرو

۲۱۵: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ النَّاسَ لَكُمْ تَبَعٌ وَاِنَّ رِجَالاً یَأْتُوْنَكُمْ مِنْ اَقْطَارِ الْاَرْضِ یَتَفَقَّهُوْنَ فِی الدِّیْنِ فَاِذَا اَتَوْكُمْ فَاسْتَوْصُوْا بِهِمْ خَیْرًا. (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۵/ ۳۰حدیث رقم ۲٦۵۰۔وأخرجه ابن ماجة فی مقدمته ۱/ ۹۱حدیث ۲۴۹۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بے شک لوگ تمہارے یعنی صحابہ کے تابع ہیں اور کثیر تعداد میں لوگ تمہارے پاس دین کا علم حاصل کرنے کے لئے اطراف عالم سے آئیں گے۔ لہٰذا جب وہ تمہارے پاس آئیں تو ان کے ساتھ بھلائی اور شفقت کا معاملہ کرنا۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **قوله: ان الناس لكم تبع:**

الناس کا ''ال'' جنس ہے۔ تبع: میں دو احتمال ہیں: ① تابع کی جمع ہے، جیسا کہ خدم، ''خادم'' کی جمع ہے۔

② بعض کا کہنا ہے کہ مصدر ہے، موضع ''فاعل'' میں ہے، مبالغہ پر محمول ہے، جیسا کہ **رجل عدل**۔

اس کلام کے مخاطبین صحابہ کرام تھے۔ اس لئے کہ وہی لوگ اُس وقت آپ ﷺ سے علم سیکھنے والے موجود تھے، لہٰذا آپ ﷺ نے ان کو یہ ہدایت فرما کر اُمت کے سارے لوگوں کو یہ سبق سکھایا۔ کہ اے صحابہ! لوگ تمہارے اقوال و افعال کی اتباع کریں گے، چونکہ تم لوگوں نے مکارمِ اخلاق کا سبق مجھ سے سیکھا ہے، ''شریعت'' میرے اقوال ہیں، ''طریقت'' میرے افعال ہیں، ''حقیقت'' میرے احوال ہیں۔

قوله: یتفقهون فی الدین: اس جملہ میں دو ترکیبی احتمال ہیں:

① جملہ مستانفہ ہے، علت اتیان کا بیان ہے۔
② یاتون کی ضمیر سے حال ہے۔ یہ دوسرا احتمال ذوق کے زیادہ قریب ہے۔ (قالہ الطیبی)

قولہ: فاستوصوابھم خیرا: اس جملہ کی وضاحت اہل علم نے مختلف انداز سے کی ہے۔

① اطلبوا الوصیة والنصیحة بھم من انفسکم ۔ اس مطلب کے مطابق "استوصوا" کا سین طلب کیلئے ہے۔ اور یہ کلام از باب تجرید ہے۔ ای لیجرد کل منکم شخصا من نفسه ویطلب منه التوصیة فی حق الطالبین ومراعاة احوالهم۔

② بعض کا کہنا ہے کہ "استیصاء" کا مطلب ہے: طلب الوصیة من نفسه او من غیره باحداو بشیء۔ کہا جاتا ہے: استوصیت زیدا بعمرو خیراً ۔ ای طلبت من زید ان یفعل بعمرو خیرا اور "بھم" کی باء تعدیہ کیلئے ہے۔

③ بعض نے کہا ہے کہ "استیصاء" کا مطلب ہے وصیت قبول کرنا۔ چنانچہ مطلب یہ ہوا کہ اقبلوا الوصیة منی بایتائهم خیرا۔

④ بعض کا کہنا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مروهم بالخیر وعظوهم خیرا وعلموهم ایاه۔

حکمت کی بات مؤمن کی گم کردہ متاع ہے وہ اس کا زیادہ حقدار ہے

۲۱۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْحَكِیْمِ فَحَیْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا۔ (رواه الترمذی وابن ماجة وقا ل الترمذی هذاحدیث غریب وابراهیم بن الفضل الراوی یُضَعَّفُ فِی الحدیث)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤٩/٥حدیث رقم ٢٦٨٧۔وأخرجه السنن بنفس اللفظ ١٣٩٥/٢حدیث رقم ٤١٦٩وتکلم الترمذی فی مسنده۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دانائی اور حکمت کی بات دانش مند آدمی کا گم کردہ سامان ہے جو اس کو مطلوب ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ جہاں اس کو پالے وہ اس کا حق دار ہے۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس حدیث کی سند میں ابراہیم بن فضل راوی کو روایت حدیث میں ضعیف قرار دیا گیا ہے۔

تشریح: قولہ: الکلمة الحکمة ضالة الحکیم : یہاں کلمہ سے مراد "جملہ مفیدہ" ہے۔

"الکلمة الحکمة" کی متعدد تفسیریں کی گئی ہیں۔:

① امام مالکؒ فرماتے ہیں: اس سے مراد تفقه فی الدین ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یُؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ﴾ [سورة البقرة:٢٦٩] "وہ جس کو چاہتا ہے دانائی بخشتا ہے۔"

② بعض کا کہنا ہے: **التی احکمت مبانیھا بالنقل والعقل، دالة علی معنی فیه دقة مصونة معانیھا عن الاختلال والخطأ والفساد۔**

سید جلال الدینؒ فرماتے ہیں: کلمہ کو نفس حکمت قرار دیا ہے۔ اس میں ”**رجل عدل**“ کی طرح مبالغہ ہے۔ بعض روایتوں میں ”**کلمة الحکمة**“ کے الفاظ ہیں، یہ اضافة الموصوف الی الصفت کی قبیل سے ہے۔ بعض روایتوں میں ”**الکلمة الحکیمة**“ کے الفاظ ہیں۔ اس میں اسناد مجازی ہے چونکہ اصل ”حکم“ (یعنی حکیم) تو اس کلمہ کا قائل ہے۔ یہ الفاظ اس آیتِ کریمہ کی قبیل سے ہیں: **یٰسٓ والقرآن الحکیم** ۔ (کذا فی شرح الطیبی)

بیضاویؒ اس آیتِ کریمہ: ﴿**تلك آیات الکتاب الحکیم**﴾[سورة یونس:١] کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ کتاب کو حکیم کے وصف سے متصف اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ یہ کتاب ”حکم“ پر مشتمل ہے۔ لہٰذا یہی توجیہ اس حدیث میں بھی ہوسکتی ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ **الحکیمة** کے معنی **محکمة** ہیں یا **حاکمة** ہیں۔ ”**الحکیم**“ کی تعریف یہ کی گئی ہے: **ھو المتقن للأمور الذی له فیھا غور۔**

قوله: فحیث وجدھا فھو أحق بھا۔

① دانشمند، دانشمندی کی بات جہاں بھی پائے وہ اس کو قبول کرنے کا زیادہ حقدار ہے۔

② سید جمال الدینؒ فرماتے ہیں: دانش مند تو دانش مندی کی بات کی تلاش میں رہتا ہے، چنانچہ وہ دانش مندی کی بات جہاں بھی پائے وہ اس بات پر عمل پیرا ہونے اور اس کی اتباع کا زیادہ حقدار ہے۔

③ دانش مندی کی بات بسا اوقات کسی غیر دانش مند کے مُنہ سے بھی نکل جاتی ہے، پھر ہوتے ہوتے وہ بات دانش مند تک پہنچ جاتی ہے، دانشمند کو چاہئے کہ اس بات کو یعنی کھوئی ہوئی میراث سمجھے، اس بات کے کہنے والے کو نہ دیکھے کہ یہ بات نہایت ادنیٰ، کم ظرف یا گھٹیا آدمی کے منہ سے نکلی ہے۔ اس لئے کہ خوبی کی بات جس آدمی کے پاس ہو خواہ وہ آدمی کتنا ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو اس کی وجہ سے وہ خوبی کی بات ادنیٰ نہیں ہو جاتی بلکہ ہر خوبی کی بات اعلیٰ سمجھی جاتی ہے اور کوئی اعلیٰ بات کسی ادنیٰ کے کہنے سے ادنیٰ نہیں ہوتی

④ لوگوں کی عقل وفہم مختلف ہوتی ہے۔ فہم معانی، استنباط مسائل اور کشف الاسرار ہر آدمی کی بس کی بات نہیں ہوتی۔ لہٰذا جس آدمی کی فہم اس قدر قاصر ہو کہ آیات کے حقائق، اور احادیث کے دقائق کا ادراک کرنے سے قاصر ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ ہوش مند کی تحقیقات پر ردّ وقدح کرنے سے اجتناب کرے کہ جو ذی ہوش ان دقائق وحقائق کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بالکل اسی طرح کہ جس طرح گم شدہ چیز کا مالک جب اپنی گم شدہ چیز کو پالے تو اس سے جھگڑا نہیں جاتا، یا جیسا کہ جب کوئی گم شدہ چیز ضائع ہو رہی ہو تو اس کو یونہی پڑا ہوا چھوڑ نہیں دیا جاتا، بلکہ اٹھالیا جاتا ہے، اور پھر اس کے مالک کو تلاش کیا جاتا ہے، حتی کہ وہ چیز مالک تک پہنچ جاتی ہے۔

اسی طرح سامع جب کوئی ایسی بات سنے کہ جس کا مفہوم وحقیقت سمجھنے سے اس سامع کی عقل قاصر ہے تو اس کو چاہئے کہ اس بات کو ضائع نہ کرے بلکہ کسی سمجھ دار کے پاس لے جائے، ہوسکتا ہے کہ وہ دوسرا شخص اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے، اور پھر

استنباط بھی کر لے۔ یا یہ کہ جس طرح گمشدہ چیز کا مالک اپنی گمشدہ چیز کو جب پالیتا ہے تو کسی شخص کیلئے درست نہیں کہ وہ مالک کو اپنی گم شدہ چیز لے جانے سے روکے' چونکہ وہ مالک ہی اس گم شدہ چیز کا زیادہ حقدار ہے، لہٰذا اسی طرح جب کسی عالم سے کوئی بات پوچھی جائے تو اس کیلئے بات چھپانا جائز نہیں بشرطیکہ سائل میں اس بات کو سمجھنے کی استعداد ہو۔

تخریج: اس روایت کو ابن عساکرؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

فائدہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً مروی یہ جملہ: انظر الی ما قال، ولا تنظر الی من قال، بظاہر اسی حدیث باب سے مأخوذ ہے۔

ایک عالم شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ سخت ہے

۲۱۷: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيْهٌ وَاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ . (رواه الترمذی وابن ماجة)

أخرجه الترمذی فی السنن ٥/٤٦ حديث رقم ٢٦٨١ ـ وقال غريب لا نعرفه الامن هذا الوجه ـ وأخرجه ابن ماجة ١/٨١ حديث رقم ٢٢٢ ـ

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایک فقیہ یعنی دین کا عالم شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے زیادہ سخت ہے۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: فقیہ شیطان پر زیادہ سخت ہوتا ہے چونکہ:

① فقیہ شیطان کے مکر و فریب میں نہیں آتا۔ ② فقیہ لوگوں کو خیر کی دعوت دیتا ہے، جبکہ شیطان شر کی طرف بلاتا ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ ''ہزار'' سے تعیین عدد نہیں بلکہ تکثیر مراد ہے۔ ایک فقیہ کا ہونا ہزار عابدوں سے زیادہ سخت ہے چونکہ شیطان جب بھی کوئی مکر و فریب کی کوشش کرتا ہے، لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو فقیہ جو کہ شیطان کے داؤ پیچ سے بخوبی واقف ہوتا ہے، لوگوں کو متنبہ کرتا ہے، اور شیطان کے مکر و فریب سے لوگوں کو آگاہ کرتا ہے۔

جب کہ عابد کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو گمراہی سے کیا آگاہ کرے جب کہ وہ خود ہی شیطان کے جال میں پھنسا ہوا ہوتا ہے، کہ شیطان نے اس عبادت گزار کو اپنے شیطانی طریقے کے مطابق عبادت میں الجھایا ہوا ہوتا ہے، اور وہ بیچارا اس کام کو اللہ کی عبادت سمجھے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ نہ عبادت ہے نہ اللہ اس سے خوش ہوتا ہے اور نہ اللہ نے یہ سکھایا ہے یہ محض شیطان کی کارستانی ہے کہ اس نے ایک انسان سے جو عقل و دانش نہیں رکھتا تھا اپنی گھڑی ہوئی بات کو عبادت منوالیا جبکہ وہ عبادت نہیں تھی اگر وہ شخص صاحب دانش ہوتا تو یقیناً وہ خیال کرتا۔

تخریج و اسنادی حیثیت:

ربیع فرماتے ہیں: لفقیه واحد أشد علی الشیطان من ألف عابد کو بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں، طبرانی نے

''اوسط'' میں، اور دیگر حضرات نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ اور طبرانی کا کہنا ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے، البتہ اس روایت کے کئی شواہد ہیں اگر چہ ان کی اسانید بھی ضعیف ہیں۔ اھ۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کثرت طرق کی وجہ سے روایت ''ضعیف'' نہ رہی، خصوصاً جب کہ اس روایت کی تائید ترمذی اور ابن ماجہ میں موجود ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی ہو رہی ہے۔

علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے

۲۱۸: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰی كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ وَوَاضِعُ الْعِلْمِ عِنْدَ غَيْرِ اَهْلِهٖ كَمُقَلِّدِ الْخَنَازِيْرِ الْجَوْهَرَ وَاللُّؤْلُؤَ وَ الذَّهَبَ (رواه ابن ماجة وروى البيهقي فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ اِلٰی قَوْلِهٖ مُسْلِمٍ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ مَتْنُهٗ مَشْهُوْرٌ وَاِسْنَادُهٗ ضَعِيْفٌ وَقَدْ رُوِيَ مِنْ اَوْجُهٍ كُلِّهَا ضَعِيْفٌ).

أخرجه ابن ماجة ۸۱/۱ حديث رقم ۲۲۴ ـ والبيهقي في شعب الايمان لعند لفظ "مسلم" ۲/۲۵۴ حديث رقم ۱۶۶۶ ـ

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ چاہے مرد ہو یا عورت اور نا اہل کو علم کی تعلیم دینا ایسے ہے جیسے کوئی شخص خنزیر کے گلے میں جواہرات، موتی اور سونے کا ہار ڈال دے۔ اس حدیث کو امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس روایت کو شعب الایمان میں لفظ۔ مسلم۔ تک نقل کیا ہے اور فرمایا کہ اس حدیث کا متن مشہور ہے اور اس کی سند ضعیف ہے اور یہ حدیث مختلف سندوں سے نقل کی گئی ہے اور وہ سب ضعیف ہیں۔

تشریح: قوله: طلب العلم فريضة على كل مسلم:

فریضة: یہ تاء برائے مبالغہ ہے۔ ایک روایت میں "مسلم" کے بعد "ومسلمة" کے الفاظ بھی ہیں۔

حدیث کے پہلے جملے کا مطلب یہ ہے کہ علم شرعی کا سیکھنا فرض ہے، بعض کیلئے بعض مسائل کا سیکھنا فرضِ عین اور بعض کیلئے بعض مسائل کا سیکھنا فرضِ کفایہ ہے۔

ابہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ علم کہ جس کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، اس کی تعیین میں علماء کا اختلاف ہے۔ چنانچہ علماء ۲۰ سے زیادہ جماعتوں میں بٹ گئے، ہر فریق نے اسی علم کا حاصل کرنا فرض قرار دیا جس علم میں وہ فریق خود مشغول تھا۔ اھ۔

شیخ عارف ربانی سہروردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس علم کی تعیین میں علماء کا اختلاف ہے:

① کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اخلاص کا علم، اور نفس کی آفتوں اور اعمال کو مفسد کرنے والے امور کی معرفت مراد ہے۔ چونکہ اخلاص مامور بہ ہے، چنانچہ اس کا علم ایک دوسرا (مستقل) فرض ہے۔

② کہا گیا ہے کہ خواطر کی معرفت، اور اس کی تفصیل فرض ہے۔ چونکہ خواطر ہی فعل کا منشأ ہے۔ اور اسی سے شیطانی وسوسہ اور

فرشتہ کے الہام میں فرق ہوتا ہے۔

③ بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد طلبِ علم حلال ہے، چونکہ حلال کھانا واجب ہے۔

④ بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد بیع وشراء اور نکاح کا علم ہے، جب کہ یہ کام سرانجام دینے کا ارادہ ہو۔

⑤ بعض کا کہنا ہے کہ علم الفراض الخمس۔علم میراث کا پانچواں حصہ ہے۔

⑥ بعض کا کہنا ہے اس سے مراد علم توحید کو نظر واستدلال اور نقل کے ساتھ طلب کرنا ہے۔

⑦ بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد علم باطن کا طلب کرنا ہے یعنی وہ علم کہ جس کے ذریعے بندہ کا اللہ کی ذات پر یقین بڑھتا ہے، یہ وہ علم ہے جو صالحین اور زھاد کی صحبت میں حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی لوگ انبیاءِ کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کے وارث ہیں۔اھ۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ فرض سے پہلے کونسا فریضہ ہے؟ تو اس کا جواب ہے کہ اپنے عمل سے پہلے علم۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ فرض میں کیا فرض ہے؟ تو اس کا جواب ہے علم وعمل میں اخلاص۔

اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ عمل کے بعد کیا فرض ہے؟ تو اس کا جواب ہے' خوف ورجاء۔

قوله: واضع العلم عند غير أهله:

غیر اہل سے کون مراد ہے؟ اس میں مندرجہ ذیل اقوال ہیں:

① غیر اہل سے مراد وہ شخص ہے جو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

② وہ شخص مراد ہے جو دنیاوی غرض رکھتا ہے۔

③ وہ شخص مراد ہے جو غیر اللہ کیلئے سیکھتا ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ ہر علم کے سیکھنے کے لئے جدا استعداد اور جدا افراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ نا اہلوں کو علم دینا' وضع الشئی فی غیر محله ظلم کا مصداق ہے۔ چنانچہ اس مثال کا مفہوم یہ نکلا کہ گھٹیا ترین مخلوق یعنی سور کو قیمتی ترین چیز جواہرات پہنانا انتہائی نا مناسب فعل ہے۔ اسی وجہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں: حدثوا الناس بما يفهمون او يعرفون، اتحبون أن يكذب الله ورسوله۔

اسنادی حیثیت کے بارے میں محدثین رحمۃ اللہ علیہم کی آراء:

① منذری کی ''الترغیب والترھیب'' میں ہے کہ اس حدیث کو ابن ماجہ کے علاوہ دیگر محدثین نے بھی مکمل طور پر روایت کیا ہے۔

② الجامع الصغیر کی شرح میں علقمی فرماتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کے پچاس طرق دیکھے ہیں۔ میں نے ایک ''جزء'' میں ان کو جامع کیا ہے۔ اور میں نے ان پر صحیح لغیرہ کا حکم لگایا ہے۔

③ امام جزری فرماتے ہیں: اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔اھ۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اصل صحیح نہیں ہے۔لہٰذا اس

حدیث کو بالکل بے اصل کہنا درست نہیں۔ ابن صلاح نے اس مشہور جو صحیح نہ ہو، کی مثال کے طور پر اسی روایت کو ذکر کیا ہے۔

④ بدایۃ الجزری میں لکھا ہے کہ یہ حدیث بہت سے لوگوں کی زبان پر ہے، اور ایسی حدیث مشہور ہے جو صحیح نہیں ہے۔

⑤ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اسنادی طور پر ضعیف ہے اگر چہ معنوی طور پر درست ہے۔

⑥ امام نووی کے شاگرد ''مزی'' فرماتے ہیں اس حدیث کے طرق حسن کے رتبہ تک پہنچتے ہیں۔

⑦ عراقیؒ فرماتے ہیں اس حدیث کے بعض طرق کو بعض ائمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ بعض مصنفین نے اس حدیث کے آخر میں ''مسلمة'' کا اضافہ بھی ملحق کیا ہے لیکن کسی بھی طریق میں اس اضافہ کا ذکر موجود نہیں ہے۔

منافق میں دو خصلتیں جمع نہیں ہو سکتیں اچھی خصلت اور دین کی سمجھ

۲۱۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَصْلَتَانِ لَا تَجْتَمِعَانِ فِیْ مُنَافِقٍ حُسْنُ سَمْتٍ وَلَا فِقْهٌ فِی الدِّيْنِ ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ٤٨/٥ حديث رقم ٢٦٨٤ وقال غريب لا نعرفه الا من حديث ابن أيوب العامري ولا أدري كيف هو۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دو خصلتیں ایسی ہیں جو منافق میں جمع نہیں ہو سکتیں ایک اچھے اخلاق اور دوسری دین کی سمجھ۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: خصلتان لاتجتمعان:

تشریح: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

① کسی بھی منافق میں ان دونوں خصلتوں میں سے کوئی بھی خصلت کسی بھی وقت ہو ہی نہیں سکتی۔

② کسی بھی منافق میں یہ دونوں خصلتیں بیک وقت اکٹھی نہیں ہو سکتی، ہاں کسی ایک وقت میں ایک ہو سکتی ہے۔

''لاتجتمعان'' کے الفاظ لا کر مسلمانوں کو دونوں خصلتوں پر ابھارنا مقصود ہے، کہ مؤمنین ان دونوں صفات کو اپنائیں، اور دوسری طرف سخت زجر ہے کہ مؤمن ہو اور یہ دونوں صفات میں سے کوئی بھی صفت نہ ہو، یا ایک ہو دوسری نہ ہو یہ منافق کی علامت ہے، لہٰذا نفاق سے بچو، منافق ہی ان صفات سے عاری ہوتا ہے۔ یہ حدیث اس آیتِ کریمہ کی نظیر ہے: ﴿فويل للمشركين الذين لا يؤتون الزكوٰة﴾ [سورة فصلت:٦۔٧] کہ مسلمانوں کو ادائے زکوۃ پر ابھارا جا رہا ہے، اور اس بات سے ڈرایا جا رہا ہے کہ تم زکوۃ کی عدم ادائیگی کرنے والے مت ہو، زکوۃ کی عدم ادائیگی مشرکین کا کام ہے۔

قوله: حسن سمت: اى خلق وسيرة وطريقة ۔قال الطيبى: هوالتزى بزى الصالحين ۔قال ميرك: السمت بمعنى الطريق اعنى المقصد ،وقيل المراد هيئة اهل الخير۔ والأحسن ماقاله ابن حجر: انه تحرى طرق الخير والتزى بزى الصالحين مع التنزه عن المعايب الظاهرة والباطنة۔

مرتب عرض کرتا ہے اس وصف کا حاصل یہ ہے کہ: ① آدمی کے اخلاق اچھے ہوں۔ ② طور طریقہ درست ہو۔ ③ ظاہری حلیہ صالحین جیسا ہو۔ ④ طرق خیر کا جویا ہو۔ ⑤ ظاہری اور باطنی عیوب سے منزّہ ہو۔

قوله: ولا فقه فقه فی الدین : ''لا'' تاکید نفی کیلئے ہے۔

عرض مرتب: ''فقه فی الدین'' کی وضاحت ماقبل روایات میں گزر چکی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے: حدیث: ۲۰۰۔

طالبعلم اللہ کے راستہ میں ہوتا ہے

۲۲۰ : وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ خَرَجَ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَرْجِعَ ۔ (رواه الترمذی و الدارمی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۵/۲۹ حدیث رقم ۲۶۴۷ وقال حسن غریب۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو آدمی علم حاصل کرنے کیلئے اپنے گھر سے نکلا وہ جب تک واپس نہ آ جائے وہ اللہ کی راہ میں ہے۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: من خرج فی طلب العلم : یہاں علم سے مراد وہی علم ہے جو حدیث: ۲۱۸ میں مذکور ہوا۔

جو شخص گھر سے علم حاصل کرنے کے لئے نکلے تو وہ اللہ کی راہ میں ہے وہ ''جہاد'' میں مصروف ہے، بایں طور کہ طلب علم میں بھی:

① دین کا احیاء ہے۔ ② شیطان کی ذلت و رسوائی ہے۔ ③ مشقت اور نفس کا مجاہدہ ہے۔

قوله: حتی یرجع:

اس قید میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ طلب علم کے بعد اس شخص کو ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے چونکہ اب یہ انبیاء کا وارث ہے کہ ''ناقصون'' کو ''مکمل'' کرے گا۔ گویا کہ ''ناقصاں را پیر کامل''۔

چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں اسی کا حکم ہے: ﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴾ [التوبة: ۱۲۲] ''تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تا کہ دین (کا علم سیکھتے اور اس) میں سمجھ پیدا کرتے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈر سناتے تا کہ وہ حذر کرتے۔''

علم حاصل کرنا گناہ کا کفارہ ہے

۲۲۱ وَعَنْ سَخْبَرَةَ الْاَزْدِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ كَانَ كَفَّارَةً لِّمَا مَضٰى۔ (رواه الترمذی والدارمی وقال الترمذی هذا حدیث ضعیف الاسناد وابوداود الراوی یضعف)

أخرجه الترمذی فی السنن ۵/۲۹ حدیث رقم ۲۶۴۸۔ وقال حدیث ضعیف الاسناد وأخرجه الدارمی فی السنن

١/١٤٩ حديث رقم ٥٦١۔

ترجمہ: حضرت سخبرہ ازدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو آدمی علم حاصل کرتا ہے تو اس کے گزشتہ گناہوں کے لئے کفارہ ہو جاتا ہے یعنی صغیرہ گناہوں کے لئے اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کی سند کمزور ہے اس حدیث کی سند میں ایک راوی ہے ابوداؤد اس کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔

راویٔ حدیث:

سخبرۃ۔ سخبرہ صحابی ہیں۔ ان کی کنیت ''ابوعبداللہ الازدی'' ہے 'ازدی' ازدکی طرف منسوب ہے۔ ان سے ان کے بیٹے ''عبد اللہ'' روایت کرتے ہیں۔ ان کی ایک روایت ''کتاب العلم'' میں ہے۔ ''سخبرہ'' میں سین پر فتحہ اور خاء معجمہ ساکن و باء موحدہ مفتوح ہے۔ قاموس میں لکھا ہے کہ ازد بن غوث سین کے ساتھ زیادہ صحیح ہے۔ یمن کے ایک قبیلہ کا باپ ہے تمام انصار ان کی اولاد میں سے ہیں۔ اھ ازد میں زاء ساکن ہے

تشریح: قوله: من طلب العلم كان كفارة : ''كفارة'' كفر بمعنی ''ستر'' سے ماخوذ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو شخص عمل کرنے کی نیت سے علم حاصل کرتا ہے تو یہ علم حاصل کرنا اس کے گزرے ہوئے گناہوں کیلئے کفارہ ہو جاتا ہے۔

اعتراض: بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ کفارات اور حدود کے مسئلہ میں کتاب اللہ اور سننِ مشہورہ کے مخالف بھی ہے۔

اس اعتراض کے متعدد جواب دیئے گئے ہیں:

① ما مضی سے مراد گناہ صغیرہ ہیں۔

② ما مضی سے مراد وہ حقوق اللہ ہیں کہ جن کا کوئی تدارک ہی نہیں ہے۔

③ ما مضی سے مراد وہ حقوق اللہ ہیں کہ جن کے تدارک کی صورت تو ہے، مگر (اس وقت) ممکن نہیں۔

④ یہاں وسیلة مضاف محذوف ہے۔ ای: كان وسيلة الى ما يكفر به ذنوبها كلها

کہ وہ علم اس کے گزرے ہوئے گناہوں کیلئے کفارہ کا سبب بن جاتا ہے، بایں طور کہ حصولِ علم کے بعد توبہ کر لیتا ہے۔ یا ایسے اعمال بجا لیتا ہے جو کفارۃ ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

مؤمن علم سے سیر نہیں ہوتا

٢٢٢ : وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَنْ يَّشْبَعَ الْمُؤْمِنُ مِنْ خَيْرٍ يَّسْمَعُهٗ حَتّٰى يَكُوْنَ مُنْتَهَاهُ الْجَنَّةَ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ٥/٤٩ حديث رقم ٢٦٨٦ وقال حسن غريب۔

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن علم حاصل کرنے سے سیر نہیں ہوتا وہ اس کو سنتا یعنی حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی انتہاء جنت ہوتی ہے اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: حتی یکون منتهاه الجنة: "الجنة" میں دو ترکیبی احتمال ہیں:

① خبر "کان" ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ② خبر ہونے کی بناء پر مرفوع ہے۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن کامل بھلائی یعنی علم سے سیراب نہیں ہوتا' علم حاصل کرتا رہتا ہے' کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ مر کر جنت میں پہنچ جاتا ہے۔

علم چھپانے والے کو قیامت کے دن آگ کی لگام ڈالی جائے گی

۲۲۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ عَلِمَهٗ ثُمَّ کَتَمَهٗ اُلْجِمَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ بِلِجَامٍ مِّنْ نَارٍ ۔ (رواہ احمد وابوداود والترمذی)

أخرجه أحمد في المسند ۲/۲۶۳۔ وأخرجه أبوداوٗد في السنن ۵/۶۷ حدیث رقم ۳۶۵۸ وأخرجه الترمذی فی السنن ۵/۲۹ حدیث رقم ۲۶۴۹ وقال حدیث حسن۔ ولابن ماجة نحوه ۱/۹۶ حدیث رقم ۲۶۱۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس آدمی سے علم کی کوئی بات پوچھی گئی اور وہ اس کو جانتا تھا۔ مگر اس نے اس کو چھپایا یعنی بتایا نہیں تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔ اس حدیث کو امام احمدؒ امام ابوداوٗدؒ اور امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور امام ابن ماجہؒ نے اس حدیث کو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

تشریح: واضح رہے کہ یہ وعید چند شرائط کے ساتھ مخصوص ہے۔

① سوال کسی دینی مسئلہ کے بارے میں ہو۔

② سائل کو اس جواب کی ضرورت بھی ہو۔ مثلاً کوئی کافر اسلام کے بارے میں جاننا چاہتا ہے، یا کوئی نومسلم ہے اور وہ درپیش فرض نماز کے بارے میں تعلیم کا محتاج ہے، یا کوئی شخص حلال' حرام کے بارے میں سوال کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ ان صورتوں میں جواب دینا ضروری ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں: "ثم" استبعاد کیلئے ہے، چونکہ تحصیلِ علم کی غرض علم کی نشر و اشاعت اور لوگوں کو نفع پہنچانا ہے، چھپانے کے نتیجے میں یہ غرض مکمل طور پر فوت ہو جاتی ہے، لہٰذا علماء سے یہ بات بعید ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ علم سے مراد یہاں "علم شہادت" ہے۔

تشبیہ کی وضاحت:

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس عالم کے منہ میں ڈالی جانے والی چیز کو جانور کے منہ میں ڈالی جانے والی لگام سے تشبیہ دی

ہے اور یہ لگام درحقیقت مکافاتِ عمل کے طور پر ڈالی جائے گی چونکہ اس عالم نے اپنے منہ میں سکوت کی لگام ڈالی ہوئی تھی۔ مشبہ بہ وہ اڑیل جانور ہے جو اپنی من مانی کرنا چاہتا ہے اور اس کو روکا جارہا ہو۔ عالم کی شان تو یہ ہوتی ہے کہ وہ حق کا داعی ہوتا ہے۔

۲۲۴: ورواه ابن ماجة عَنْ اَنَسٍ

ترجمہ: اور ابن ماجہ نے اس روایت کو سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

تخریج: الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام احمد نے اصحاب کتب اربعہ اور امام حاکمؒ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ اھ۔ اس روایت کو ابن حبان اور ابو یعلی نے بھی روایت کیا ہے۔

اسنادی حیثیت:

زین العربؒ خطابی کی اتباع کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اس حدیث کو بعض علماء نے ضعیف بلکہ موضوع قرار دیا ہے۔ اھ۔

سخاوی کی کتاب مقاصدِ حسنہ میں لکھا ہے: **من کتم علما یعلمه ألجم یوم القیامة بلحام من نار**۔ اس حدیث کو محدثین کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذیؒ نے اس کو حسن قرار دیا ہے۔ امام حاکمؒ نے اس کو صحیح بتلایا ہے۔ یہ وعید اس صورت کو بھی شامل ہے کہ طالب علم سے کتاب کو روکے رکھا جائے، خصوصاً جب کہ کتاب کے کئی نسخہ موجود نہ ہوں۔ اھ۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: خصوصاً جب کہ کتاب بھی وقف کی ہو۔

غلط نیت سے علم حاصل کرنے والا جہنم میں داخل ہوگا

۲۲۵: وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُجَارِيَ بِهِ الْعُلَمَآءَ اَوْ لِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَآءَ اَوْ يَصْرِفَ بِهٖ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْهِ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ النَّارَ.

(رواه الترمذی ورواه ابن ماجة عن ابن عمر)

أخرجه الترمذی فی السنن ۵/۳۲ حدیث رقم ۲۶۵۴ وقال حدیث لا نعرفه الا من هذا الوجه واسحاق بن یحیی بن طلحة لیس بذاك القوی عندهم۔

ترجمہ: حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے علم اس نیت سے حاصل کیا کہ علم کے ذریعہ سے علماء پر فخر کرے۔ یا اس کے ذریعے بیوقوفوں سے جھگڑے یا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کی آگ میں داخل کرے گا۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور امام ابن ماجہؒ نے اس حدیث کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

کعب بن مالک۔ یہ کعب ہیں جو مالک کے بیٹے ہیں۔ یہ انصاری اور خزرجی ہیں۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں حاضر تھے۔ اس میں اختلاف ہے کہ ''بدر'' میں شرکت فرمائی یا نہیں۔ ''تبوک'' کے علاوہ دیگر غزوات میں بھی شریک ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

شعراء میں سے ہیں۔عہد رسالت کے معروف شعراء حسان بن ثابت‘ عبداللہ بن رواحہ اور کعب بن مالک ہیں۔حضرت کعب بن مالک کی شان نمایاں تھی‘ یہ اپنے اشعار کے ذریعہ کفار کو جنگ سے خوفزدہ کیا کرتے تھے۔ابن سرین کہتے ہیں کہ ہمیں یہی بات پہنچی ہے کہ ''دوس'' کعب بن مالک کے اشعار سے خوفزدہ ہو کر مسلمان ہوئے تھے۔یہ ان تین صحابہ میں سے ہیں جو غزوۂ تبوک میں شریک ہونے سے رہ گئے تھے۔ان تینوں کے نام یہ ہیں: کعب بن مالک‘ ہلال بن امیہ‘ مرارہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہم۔ان سے ایک جماعت نے روایت کی۔۵۰ھ میں بعمر ستتر (۷۷) سال نابینا ہونے کے بعد انتقال فرمایا۔

تشریح: قوله: من طلب العلم ليجاري به العلماء ......الخ:

ليجاري: از باب مفاعلہ۔ المجاراة المعارضة في الجرى: دوڑ میں مقابلہ کرنا۔بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد مفاخرت ہے۔

ليماري: از باب مفاعلہ ہے۔ المماراة: جھگڑنا، مناظرہ کرنا، بحث مباحثہ کرنا، حجت بازی کرنا۔''مماراة'' اس کے مادہ میں دو احتمال ہیں۔مری سے ماخوذ ہے۔''مری'' کے معنی ہیں شک۔وجہ مناسبت بالکل واضح ہے کہ بحث و مباحثہ کرنے والے افراد میں سے ہر ایک دوسرے کی بات میں شک کر رہا ہوتا ہے اور اسکی پیش کردہ دلیل شک و شبہ میں ڈال رہا ہوتا ہے۔''مری'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں جانور کے تھن پر ہاتھ پھیرنا دودھ دوہنے کے لئے اور مناظرہ کرنے والوں میں سے ہر شخص بھی اپنے پاس موجود دلائل نکال رہا ہوتا ہے۔اھ۔(كذا حققه الطيبي)

السفهاء: ''سفیہ'' کی جمع ہے، کم عقل، اور یہاں جاہل مراد ہے۔

اہل علم کے اقوال کی روشنی میں روایت کا حاصل یہ ہے کہ وہ شخص جہنم کی آگ میں داخل ہو گا جو علم اس لئے حاصل کرتا ہے:

① غیر اللہ کو راضی کرے۔② علماء سے مقابلہ کرے۔③ مفاخرت کرے۔④ عوام کو اپنی طرف متوجہ کرے۔⑤ طلبہ کو اپنی طرف متوجہ کرے۔⑥ لوگ اس کی تعظیم کریں اور مال سے نوازیں۔⑦ شہرت حاصل ہو۔

آنحضرت ﷺ کے اس ارشادِ گرامی میں دو احتمال ہیں:

پہلا احتمال یہ ہے کہ یہ کلام ''اخبار'' ہے۔دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ جملہ دُعائیہ ہو، چنانچہ یہ بددعا پر محمول ہو گا۔

۲۲۶ ورواه ابن ماجة عن ابن عمر۔

ترجمہ: اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

دنیا کے لئے علم حاصل کرنے والا جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھے گا

۲۲۷ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا يُبْتَغٰى بِهٖ وَجْهُ اللّٰهِ لَا يَتَعَلَّمُهٗ اِلَّا لِيُصِيْبَ بِهٖ عَرَضًا مِنَ الدُّنْيَا لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَعْنِيْ رِيْحَهَا۔

(رواه احمد وابوداود اوابن ماجة)

أخرجه أحمد فى المسند ۳۳۸/۲۔وأخرجه أبوداوٗد في السنن ۷۱/٤حديث رقم ۳٦٦٤وأخرجه ابن ماجة

۱/ ۹۲ حدیث رقم ۲۵۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا علم کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے حاصل کیا جاتا ہے اور جس نے اس کو اس غرض اور مقصد کے لئے سیکھا کہ وہ اس کے ذریعہ دنیا کا مال و متاع حاصل کرے تو قیامت کے دن اس کو جنت کی خوشبو بھی نصیب نہیں ہوگی اس حدیث کو امام احمدؒ امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **قوله: من تعلم علما مما يبتغى:**

''مِن'': بیانیہ ہے۔ ''لا یتعلمه'': یہ جملہ ''تعلّم'' کے فاعل یا مفعول سے حال ہے۔ یا ''علما'' کی صفتِ ثانی ہے۔

''علما'': نکرہ ہے چنانچہ علم کی تمام انواع اور قلیل وکثیر سب کو شامل ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے دنیاوی غرض کے ساتھ ساتھ اللہ کی رضا کا پہلو بھی مدِ نظر رکھا وہ شخص اس وعید میں داخل نہیں ہوگا۔ ابتغاء بوجه الله کی قید میں دو احتمال ہیں: ① یہ قید برائے تفصیل وتمیز ہے چنانچہ بعض علوم سے پناہ چاہی گئی ہے، حدیث میں آتا ہے: أعوذ بالله من علم لا ينفع۔ ② یہ قید بطورِ مدحت اور وعید ہے۔

میں نے بعض علماء زاہدین کو فرماتے ہوئے سنا: من طلب الدنيا بالعلوم الدنيوية كان أهون عليه من ان يطلبها بغيرها من العلوم، فهو كمن جر جيفة بآلة من آلات اللهو، وذلك كمن جرّها بأوراق تلك العلوم اھ۔

اس کی تائید حسن بصریؒ کے اس قصہ سے بھی ہوتی ہے، مروی ہے کہ انہوں نے پہاڑ کے اوپر ایک شخص کو کھیل کود کرتے ہوئے دیکھا، فرمایا: یہ شخص ہمارے ساتھیوں سے بہتر ہے چونکہ یہ شخص دنیا کو دنیا کے ذریعے کھا رہا ہے، اور ہمارے ساتھی دنیا کو دین کے ذریعے کھا رہے ہیں۔ اھ۔ لیکن علماء کا کہنا ہے کہ جو شخص دُنیا حاصل کرتا ہے تاکہ آخرت کے عمل کیلئے فارغ ہو جائے اور جو شخص عملِ آخرت کرتا ہے تاکہ دُنیا حاصل کرے۔ ان دونوں افراد کے درمیان فرق ہے۔

قوله: لم يجد عرف الجنة يوم القيامة:

''عرف'' عین کے فتحہ اور راء کے سکون کے ساتھ ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جنت کی خوشبو پانچ سو سال کی مسافت سے محسوس ہوگی۔

تورپشتیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو مبالغہ پر محمول کیا گیا ہے، مثلاً جیسا کہ عرب کہتے ہیں: ماشممت قتار مدره یہ جملہ اُس وقت استعمال کرتے ہیں کہ جب یہ بتلانا مقصود ہو کہ متکلم کا مقصود طعام تناول کرنے سے براءت کا اظہار ہو، یعنی میں نے تو کھانے کی خوشبو تک نہیں سونگھی کھانا کھانا تو کجا۔ حالانکہ حقیقتِ حال ایسی نہیں ہوتی۔

اِس وعید کا مستحق شخص اگر مؤمن ہے تو وہ لامحالہ جنت میں ضرور جائے گا، جیسا کہ بے شمار نصوص صحیحہ اس پر دال ہیں، لہٰذا اِس حدیث میں تاویل کرتے ہوئے اِس وعید کو تہدید وزجر پر محمول کیا جائے گا، کہ جو شخص بھی اعمالِ آخرت کے ذریعے سے دنیا طلب کرنے والے ہوں۔

دوسری بات یہ قابلِ غور ہے کہ اس حدیث میں یوم القیامہ کی قید لگی ہوئی ہے اور قیامت کے دن کی ابتداء حشر سے ہو کر جنت یا جہنم میں پہنچ جانے کے ساتھ اختتام پذیر ہو جائے گی، لہٰذا قیامت کے دن جنت کی خوشبو کا نہ سونگھ پانا اس بات کو لازم نہیں کہ جنت کی خوشبو مطلقاً پائے گا ہی نہیں۔

قوله :یعنی ریحها: یہ جملہ راوی کی طرف سے بطور تفسیر کے ہے۔

حدیث یاد کرنے والے کے لئے بشارت

۲۲۸ :وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِيْ فَحَفِظَهَا وَوَعَاهَا وَاَدَّاهَا فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيْهٍ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰى مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ ثَلَاثٌ لَا يَغُلُّ عَلَيْهِنَّ قَلْبُ مُسْلِمٍ اِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلّٰهِ وَالنَّصِيْحَةُ لِلْمُسْلِمِيْنَ وَلُزُوْمُ جَمَاعَتِهِمْ فَاِنَّ دَعْوَتَهُمْ تُحِيْطُ مِنْ وَرَآئِهِمْ (رواه الشَّافِعِيُّ والبيهقي فِي الْمَدْخَلِ۔

أخرجه الترمذي في السنن ٥/٣٤ حديث رقم ٢٦٥٨۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ اس بندے کو تر و تازہ رکھے۔ یعنی اس کی بہت قدر و منزلت ہو اور اللہ تعالیٰ اس کو دین و دنیا کی خوشی اور مسرت کے ساتھ رکھے جس نے میری کوئی بات سنی اور اس کو یاد کیا اور یاد رکھا اور اس کو جس طرح سنا بعینہٖ اسی طرح لوگوں تک پہنچایا۔ کیونکہ بعض علم دین کو حاصل کرنے والے فقیہ یعنی سمجھدار نہیں ہوتے اور بعض علم حاصل کرنے والے ان لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ جو ان سے زیادہ فقیہ اور سمجھدار ہوتے ہیں اور تین چیزیں ایسی ہیں کہ جن میں مسلمانوں کا دل خیانت نہیں کرتا ایک تو یہ کہ عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کرنا۔ دوسرا یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ بھلائی اور خیر خواہی کرنا۔ تیسرا یہ کہ مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑنا اسلئے کہ جماعت کی دعا ان کو چاروں اطراف سے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔

تشریح: **قوله: نضر الله عبدا سمع مقالتي**:

تورپشتیؒ کا کہنا ہے کہ "نضرة" کے معنی حسن و رونق کے ہیں۔ متعدی و غیر متعدی ہر دو طرح مستعمل ہے۔ مخفف و مثقل دونوں طرح مروی ہے۔ اکثر تشدید کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، (نووی)۔ ابہریؒ کا کہنا ہے کہ ابو عبیدہ نے تخفیف کے ساتھ روایت کیا ہے، اور لازم و متعدی بتایا ہے۔ اُصمعیؒ نے تشدید کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مخفف ہو تو لازم اور مشدّد ہو تو متعدی استعمال ہوتا ہے۔

قوله: فحفظها ووعاها واداها: یہاں حفظ کے کئی مطلب بیان کئے گئے ہیں:

① دِل سے یاد رکھا۔ ② لکھ کر یاد کیا۔ ③ زبان سے یاد کیا۔ ④ بات کے موجب پر عمل کیا۔

"وعاها": اس کے بھی کئی مطلب بیان کئے گئے ہیں:

① مسلسل یاد رکھا، بھولا نہیں۔ ② یاد کرنے کے بعد اس کا تکرار و تذکرہ کرتا رہا، تاکہ بھول نہ جائے۔

③ روایت کرتا رہا اور تبلیغ کرتا رہا۔ (چونکہ لفظ ''حفظ'' بھی کبھی ''عمل'' کے معنی میں مستعار ہوتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿والحافظون لحدود الله﴾ کہ ''الحافظون'' کی تفسیر ''العاملون بفرائضه'' کی گئی ہے۔اھ)۔

مصابیح کے نسخہ میں ''واداها كما سمعها'' کے الفاظ ہیں، اور الأربعین کی روایت میں سمع مقالتی فوعاها فأداها كما سمعها کے الفاظ ہیں۔

قوله: فرب حامل فقه غير فقيه:

لفظ غیر مجرور ہے اور ''حامل'' کی صفت ہے بعض کا کہنا ہے کہ مرفوع ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے: هو غير فقيه ورب حامل فقه الى من هو: جار مجرور محذوف کے متعلق ہو کر ''ربّ'' کے مدخول کی صفت ہے، اس صفت کی وجہ سے جواب سے مستغنی ہے۔ أي: ربِ حامل فقه أداه الى من هو أفقه منه۔

قوله: ثلاث لا يغل عليهن قلب مسلم: ''ثلاث'' کی تمیز محذوف ہے۔ أي: ثلاث خصال۔

لا يغل: اس کو دو طرح سے پڑھا گیا ہے: ① از باب سمع، غلّ بمعنی حقد (بغض و کینہ) سے۔ ② از باب افعال بمعنی خیانت سے۔ ابن حجرؒ کا کہنا ہے کہ یہ لفظ یاء کے فتحہ غین کے ضمہ اور لام کی تشدید کے ساتھ ہے۔ غلول سے مشتق ہے۔ غلول کا مطلب ہے مالِ غنیمت سے کوئی چیز خفیہ طور پر خیانت کر کے حاصل کی جائے۔

عليه: موضع حال میں ہے۔ أي: لا يغل قلب مؤمن كائنا عليهن۔ نکرہ ذوالحال سے حال بننا درست ہے، چونکہ وہ مقدم ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ نفی نہی کے معنی میں ہے۔ أي: لا يتركها بل يأتي بها۔ بعض نے تقدیری عبارت یوں ذکر کی ہے: أي: ثلاث لا يغل قلب مسلم حال كونه ثابتا عليهن۔

ساری بات کا حاصل یہ ہے کہ مؤمن کامل کا دِل ان تین باتوں میں خیانت نہیں کرتا۔ ان باتوں کے سلسلے میں اپنے دِل میں کینہ اور بغض نہیں رکھتا، راہِ حق نہیں چھوڑتا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ جن سے دِلوں کی اصلاح ہوتی ہے، چنانچہ جو شخص ان خصلتوں کو مضبوطی سے تھام لیتا ہے اُس کا دِل خیانت اور فتنہ فساد سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔

قوله: اخلاص العمل لله:

اس کی تین ترکیبیں ہو سکتی ہیں: ① خبر محذوف کیلئے مبتداء ہے۔ أي: منها اخلاص العمل۔ ② مبتداء محذوف کی خبر ہے۔ أي: احدها اخلاص العمل۔ ③ ''ثلاث'' سے بدل ہے۔

اخلاص کا مطلب:

اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ عمل سے صرف اور صرف اللہ کی رضامندی وخوشنودی مطلوب ہو، اس کے علاوہ نہ کوئی دنیاوی غرض ہو اور نہ کوئی اخروی غرض ہو مثلاً جنت اور جنت کی نعمتوں کا حصول۔ یا یہ کہ کوئی بھی دنیاوی غرض ہو نہ شہرت، نہ دکھلاوا۔ پہلی صورت کو ''اخلاص الخاصۃ'' اور دوسری صورت کو ''اخلاص العامۃ'' کہتے ہیں۔

فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں: غیر اللہ کیلئے عمل بجالانا شرک ہے، اور غیر اللہ کیلئے ترکِ عمل ''ریاکاری'' ہے اور اخلاص یہ ہے کہ عمل کا کرنا نہ کرنا اللہ تعالیٰ ہی کی رضاء کیلئے ہو۔

قوله: و لزوم جماعتهم :مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑنے کا مطلب ہے کہ اعتقادات اور اعمالِ صالحہ نمازِ جمعہ باجماعت نماز وغیرہ میں مؤمنین کی موافقت کرے۔

قوله: فان دعوتهم تحيط من ورائهم: "من" جارّہ ہے، اور بعض نسخوں میں مَنْ موصولہ ہے۔

حدیث کے اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی دعائیں اس شخص کو اپنی امان میں لیتے ہوئے مکرِ شیطانی اور ضلالت سے حفاظت فرماتی ہیں، نیز اس میں تنبیہ ہے کہ جو شخص مسلمانوں کی جمعیت کو چھوڑے گا وہ مسلمانوں اور ان کی دعاؤں کی برکت سے محروم ہو جائے گا۔ اور اس حدیث سے عزلت نشینی کے مقابلہ میں خلطۃ کی زندگی کا فضل ہونا معلوم ہوتا ہے۔

قوله: رواه الشافعي: لیکن یہ معلوم نہیں کہ کونسی کتاب میں روایت کیا ہے۔

۲۲۹ :ورواه احمد والترمذی وابوداود وابن ماجة والدارمی عن زيد بن ثابت الا ان الترمذی وابا داود لَمْ يَذْكُرَا ثَلَاثٌ لَايَغُلُّ عَلَيْهِنَّ اِلٰى اٰخره......۔

ترجمہ: اور اس حدیث کو روایت کیا ہے امام احمدؒ امام ترمذیؒ اور امام ابوداؤدؒ امام ابن ماجہؒ اور امام دارمیؒ نے حضرت زید بن ثابتؓ سے۔ مگر اس میں امام ترمذی اور امام ابوداؤد نے ثَلَاثٌ لَا يَغُلُّ عَلَيْهِن سے آخر تک کے الفاظ ذکر نہیں کئے۔

تشریح: قوله: رواه احمد...... :اولیٰ یہ تھا کہ آغاز حدیث میں یوں فرماتے: "عن زيد"۔ واللہ اعلم۔

حدیث کے سامع اور مبلغ کے لئے بشارت

۲۳۰ :وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فَبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعَهُ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰى لَهُ مِنْ سَامِعٍ۔ (رواه الترمذى اوابن ماجة ورواه الدارمى عن ابى الدرداء)

أخرجه الترمذى فى السنن ٣٣/٥ حديث رقم ٢٦٥٧۔ وقال حديث حسن صحيح وأخرجه ابن ماجة فى السنن ٨٥/١ حديث رقم ٢٣٢۔ وأخرجه أحمد فى المسند ٤٣٧/١۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس آدمی کو ترو تازہ رکھے یعنی خوش و خرم رکھے کہ جس نے مجھ سے کوئی بات سنی اور جس طرح سنی بالکل اسی طرح دوسروں تک پہنچا دی۔ کیونکہ اکثر اوقات جن لوگوں تک بات پہنچائی جاتی ہے۔ وہ سننے والے کے مقابلے میں زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں اس حدیث کو امام ترمذی اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے اور امام دارمیؒ نے اس حدیث کو حضرت ابوداؤد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: يقول نضر الله امرأ ......:

یہ جملہ محل نصب میں حال ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ مفعول ثانی ہے۔ كما سمعه: اس میں دو ترکیبی احتمال ہیں:

① بلغ کے فاعل یا مفعول سے حال ہے۔ ② مفعول مطلق ہے۔ 'ما': موصولہ ہے یا مصدریہ ہے۔

ابہریؒ فرماتے ہیں: نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مبلغ الحدیث کما سمعه کیلئے یہ دُعا ارشاد فرمائی چونکہ یہ مبلغ نضارۃ علم اور تجدید سنت کی کوشش کی ہے، لہٰذا اس کے عمل کے مناسب حال دعا ارشاد فرمائی، یہ حدیث علم حدیث کے شرف وفضیلت اور طلبہ حدیث کے رتبہ پر دلالت کرتی ہے کہ یہ ایسی مخصوص دعا ہے کہ اس دُعا میں سوائے ان افراد کے اُمتِ محمدیہ کا کوئی ایک فرد بھی شامل نہیں ہے۔ طلبِ حدیث' حفظ حدیث' اور تبلیغ حدیث کا سوائے اس حدیث میں موجود دُعا سے مستفید ہونے کے کوئی اور فائدہ نہ بھی ہوتا' تو تب بھی اتنا فائدہ غنیمت سے کم نہیں۔

حدیث بالمعنی روایت کرنا:

محی السنہ فرماتے ہیں: حدیث بالمعنی روایت کرنے کے مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ علماء کی ایک جماعت کے نزدیک روایت بالمعنی حرام ہے اور اکثر حضرات کے نزدیک جائز ہے، اور اَولیٰ یہ ہے کہ اجتناب کیا جائے۔ مجوزین میں حسن شعبی اور نخعی سرِ فہرست ہیں۔ امام مجاہدؒ فرماتے ہیں نقص من الحديث ماشئت ولا تزد۔ سفیانؒ فرماتے ہیں: ان قلت حدثتكم كما سمعت فلا تصدقوني فانما هوا المعنى۔ ''اگر میں یہ کہوں کہ میں نے اسی طرح حدیث بیان کی ہے جس طرح میں نے سنی ہے تو تم میری تصدیق نہ کرو اس لئے کہ وہی معنی ہے۔ وکیعؒ فرماتے ہیں: ان لم يكن المعنى واسعا فقد هلك الناس۔ ایوبؒ، ابن سیرینؒ کے حوالے سے فرماتے ہیں: كنت أسمع الحديث عن عشرة واللفظ مختلف والمعنى واحد۔ جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ لفظ کی اتباع ضروری ہے، ان میں سے ایک ابن عمر ہیں، قاسم بن محمد، ابن سیرین، مالک بن اُنس اور ابن عیینہ کا بھی یہی قول ہے۔

تخریج: صاحب الجامع الصغیر کا بیان ہے کہ اس روایت کو امام احمد اور ابن حبان نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ضیاء نے اس حدیث کو زید بن ثابت سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

نضر الله امرء سمع منا حديثا فحفظه حتى يبلغه غيره ضرب حامل فقه الى من هو أفقه منه' ورب حامل فقه ليس بفقيه۔ اس حدیث کے الفاظ کا اختلاف خود روایت حدیث بالمعنی کے جواز کی دلیل ہے، چونکہ بظاہر یہ اختلاف راویوں سے پیدا ہوا ہے۔ واللہ اعلم۔

۲۳۱: رواه الدرامي عن ابى الدرداء۔

ترجمہ: ''اور دارمی نے اس حدیث کو ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔''

جھوٹی حدیث بیان کرنے سے بچو

۲۳۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِتَّقُوا الْحَدِيْثَ عَنِّيْ اِلَّا مَا عَلِمْتُمْ فَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (رواه الترمذی ورواه ابن ماجة عن ابن مسعود وجابر ولم يذكر) اِتَّقُوا الْحَدِيْثَ عَنِّيْ اِلَّا مَا عَلِمْتُمْ۔

أخرجه الترمذی فی السنن ۱۸۳/۵ حدیث رقم ۲۹۵۱ وزاد "من قال فی القرآن برأیه فلیتبوا مقعده من النار" وقال حدیث حسن۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری طرف سے حدیث بیان کرنے سے بچو۔ مگر صرف اس حدیث کو بیان کرو جس کے متعلق تمہیں یقین ہو کہ یہ سچ ہے اور جس آدمی نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ کی نسبت کی۔ اس کو چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم کی آگ میں تلاش کرے۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور امام ابن ماجہؒ نے اس حدیث کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس میں حدیث کا ابتدائی حصہ۔ اِتَّقُوا الْحَدِیثَ عَنِّیْ اِلَّا مَاعَلِمْتُمْ۔ کے الفاظ ذکر نہیں کئے۔

تشریح: قوله: اتقوا الحدیث عنی الا ماعلمتم:

''ماعلمتم'': کا مفعول بہ محذوف ہے: أی: أنه من حدیثی۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ممکن ہے کہ یہاں ''حدیث'' سے مراد اسم ہو اور مضاف محذوف ہو، أی: احذروا روایة الحدیث۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''فعیل'' بمعنی ''مفعول'' ہو، اور ''عنّی'' اس کے متعلق ہو، اور مستثنیٰ منقطع ہو۔ أی: احذروا مما لا تعلمونه من التحدیث عنی، لکن لا تحذروا مما تعلمونه۔ بظاہر ''علم'' ظن کو بھی شامل ہے، چونکہ ظن کی بنیاد پر جب شہادت دینا جائز ہے باوجود یہ کہ شہادت کے معاملہ میں سیت روایت کے ترجمہ ہے، تو روایت بطریق اولیٰ جائز ہوگی اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ روایت میں ''اعتماد علی الخط'' جائز ہے، بخلاف شہادت کے عند الجمہور۔

قوله: فمن کذب علی ......:

عرض مرتب: حدیث کے اس جملے کی شرح حدیث: ۱۹۸ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

۲۳۳ : ورواه ابن ماجة عن ابن مسعود وجابر ولم یذکر: اِتَّقُوا الْحَدِیْثَ عَنِّیْ اِلَّا مَا عَلِمْتُمْ.

ترجمہ: اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو عبداللہ بن مسعود اور جابر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور اس حدیث کے پہلے جز: اِتَّقُوا الْحَدِیْثَ عَنِّیْ اِلَّا مَا عَلِمْتُمْ کو ذکر نہیں کیا۔

تشریح: یعنی ان حضرات کی روایت کے الفاظ فقط اتنے ہیں: **فمن کذب علی متعمدا لیتبوأ مقعده من النار۔**

یہ ''فاء'' تفریعیہ ہے، ماقبل کلام پر تفریع ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں: مؤلف کی یہ بات محل نظر ہے۔ اس لئے کہ ابن ماجہ نے جب یہاں یہ الفاظ ذکر نہیں کئے تو یہ بخاری کی وہی روایت ٹھہری جو فصل اول میں مذکور ہو چکی ہے۔ لہٰذا اس کو ذکر کرنیکی ضرورت نہیں تھی اور نہ اس کی نسبت ابن ماجہ کی طرف کرنے کی ضرورت تھی۔ اھ۔ یہ محل نظر ہے۔ چونکہ یہ روایت بخاری کی نہیں ہے بلکہ بخاری کی روایت کا ایک حصہ ہے۔ واضح رہے کہ فصل اول کی پہلی حدیث ایک مکمل حدیث ہے، جو بخاری نے روایت کی ہے۔ اور یہ حدیث ایک مستقل روایت ہے جو ابن ماجہ نے روایت کی ہے۔

قرآن کی تفسیر بالرائے کرنے والے کا انجام

۲۳۴ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ فِي الْقُرْاٰنِ بِرَاْيِهٖ فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ وَفِيْ رِوَايَةٍ مَنْ قَالَ فِي الْقُرْاٰنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۵/۱۸۳ حدیث رقم ۲۹۵۰ وقال حدیث حسن صحیح۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے اور عقل سے کی۔ اس کو چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم کی آگ میں تلاش کرے اور دوسری ایک روایت میں الفاظ اس طرح ہیں کہ جس آدمی نے بغیر علم کے قرآن کریم کی تفسیر کے بارے میں کچھ کہا اس کو چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم کی آگ میں تلاش کرے اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **قوله: وعن ابن عباس:** ایک نسخہ میں "وعنه" ہے، وہ اس وجہ سے کہ پچھلی روایت مستقلاً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

قوله: من قال فی القرآن برأیه......من النار:

قرآنِ کریم کی کسی آیت کا مفہوم ومعنیٰ، یا کسی آیت میں کوئی قراءت اپنی طرف سے محض انکل پچو کے طور پر کہنا، تکے چلانا انتہائی قبیح فعل ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اہلِ لغت اور عربی کے ائمہ کے ان اقوال کا تتبع کیا جائے جو قواعدِ شرعیہ کے مطابق ہوں، بلکہ عقل کے مقتضیٰ کے مطابق بھی ہوں، یہ ایسا معاملہ ہے کہ جو نقل پر موقوف ہے چونکہ ان مسائل میں عقل کی کیا مجال، مثلاً اسبابِ نزول، ناسخ ومنسوخ، قصص اور احکامات علاوہ ازیں نصوص کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے تفسیر کرنا یہ بھی ممنوع ہے چونکہ یہ بھی عقل پر موقوف ہوتے ہیں، مثلاً متشابہات' کہ فرقہ مجسمہ نے ان آیات کے ظاہر کو لیا ہے۔ اور اس بات سے صَرفِ نظر کرتے رہے' کہ عقلی طور پر یہ محال ہے۔

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں: من تکلم فی القرآن برأیه میں رائے بلا دلیل مراد ہے۔ البتہ رائے مؤید بالبرہان ممنوع نہیں ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ علم التفسیر مندرجہ ذیل امور سے مأخوذ ہے: ① نقل ② اقوالِ ائمہ ③ مقاییس عربیہ ④ وہ قواعد اصولیہ کہ جن سے علم اُصولِ فقہ یا علم اصولِ دین میں بحث کی جاتی ہے جس کا تعلق نقل سے ہو اس کو تفسیر کہا جاتا ہے۔ اور جس کا تعلق استنباط سے ہوتا ویل کہلاتا ہے۔

قوله: من قال فی القرآن بغیر علم:

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں کوئی ایسی بات کہنا کہ جس کی دلیل یقینی، دلیل ظنی نقلی، یا دلیل عقلی جو شرعی کے مطابق نہ ہو۔

قوله: فلیتبوا مقعده من النار:

بعض نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایسے آدمی کے بارے میں کفر کا اندیشہ ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اس وعید کے سب سے بڑھ کر حقدار وہ اہلِ بدعت ہیں کہ جنہوں نے الفاظِ قرآنیہ کے مدلول کو سلب کرلیا، اور ایسا معنی پر محمول کیا کہ جن معانی پر الفاظِ قرآنی کی سرے سے کوئی دلالت نہیں۔ چنانچہ وہ مخطی فی الدلیل اور مخطی فی المدلول بھی ہیں، مثلاً عبدالرحمٰن بن کیسان الاصم، جبائی، عبدالجبار، رمانی، زمخشری اور ان جیسے دوسرے لوگوں کی تفاسیر۔ اور ان میں سے بعض لوگوں نے اپنے کلام میں بدعات اور تفسیر باطلہ کو چنانچہ وہ چیزیں اکثر اہل سنت میں......

تفسیر ابن عطیہ کا معاملہ بھی اس کے قریب قریب ہے۔ امام ابن عرفہ مالکی تو اس کی تردید میں انتہائی مبالغہ کرتے ہوئے فرماتے تھے: انه أقبح من صاحب الكشاف۔ کہ ''یہ تو صاحب کشاف سے بھی زیادہ قبیح ہے۔'' چونکہ صاحبِ کشاف کے اعتزال کا ہر شخص کو معلوم ہے، اس لئے ہر شخص اس سے احتراز کرتا ہے، بخلاف اس کے کہ یہ لوگوں کو اس وہم میں مبتلا کرتا ہے کہ وہ اہلِ سنت میں سے ہے۔

تفسیر بالرائے اگر چہ درست ہو پھر بھی خطأ ہے

۲۳۵ :وَعَنْ جُنْدُبٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ فِي الْقُرْاٰنِ بِرَاْيِهٖ فَاَصَابَ فَقَدْ اَخْطَاَ۔ (رواہ الترمذی و ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ٦٣/٤ حديث رقم ٣٦٥٢ ـ وأخرجه الترمذي في سننه ١٨٣/٥ حديث رقم ٢٩٥٢ ـ

ترجمہ: حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے قرآن کی تفسیر بالرائے کی اگرچہ صحیح اور درست ہو۔ تو پھر بھی اس نے غلطی کی اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور امام ابوداوٗدؒ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

جندب بن عبداللہ۔ یہ جندب' عبداللہ کے بیٹے ہیں سفیان بجلی وعلقی کے پوتے ہیں۔ علقہ قبیلہ بجیلہ کی ایک شاخ ہے بجیلہ حنیفہ کی طرح ہے اور بجیلہ میں کچھ لوگ ہیں جن کو ''قسر'' کہا جاتا ہے' قاف کے زبر' سین کے جزم کے ساتھ۔ یہ لوگ خالد ابن عبداللہ القسر ی کے خاندان سے ہیں۔ فتنہ عبداللہ بن زبیر میں وفات پائی۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔ جندب کے جیم پر ضمہ اور فتحہ دونوں درست ہیں۔ نون کے جزم کے ساتھ ہے دال پر پیش اور زبر دونوں صحیح ہیں۔

لفظ جندب کو کئی طرح پڑھا جا سکتا ہے ① جندب ② جندب ③ جندب ④ جندب ⑤ جندب۔ اس آخری ضبط کو قاضی نے رد کیا ہے کہ یہ وزن کلام عرب میں موجود نہیں ہے۔ لہٰذا یہ ضبط درست نہیں ہے۔ مرتب عرض کرتا ہے کہ اس وزن پر بھی کلام عرب میں اسماء موجود ہیں البتہ وہ کلمات انتہائی قلیل ہیں اس لیے ان کو شاذ قرار دے دیا گیا ہے ملاحظہ فرمایئے: (الطمع الکبیر فی التقریب ص ۵۶) ان کا نام احادیث میں مختلف انداز سے آیا ہے: ① جندب بجلی ② جندب علقی ③ جندب بن سفیان ④ ابن ام جندب ⑤ جندب اچھی ⑥ جندب اسلمی ⑦ جندب قسری ⑧ جندب قیشری۔ یہ سب انہی کے نام کے مختلف

عنوانات ہیں لیکن ان کو قیشری کہنا غلط ہے۔

تشریح: قرآنِ کریم کی تفسیر کیلئے جو اصول اجماعی طور پر مسلم اور طے شدہ ہیں، ان کو نظر انداز کر کے جو تفسیر محض رائے کی بنیاد پر کی جائے گی وہ ناجائز ہوگی، اور اگر اس طرح تفسیر کے معاملہ میں دخل دے کر کوئی شخص اتفاقاً کسی صحیح نتیجہ پر بھی پہنچ جائے تو وہ خطا کار ہے، کیونکہ اس نے غلط راستہ اختیار کیا۔ اصولِ تفسیر کو نظر انداز کرنے کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ البتہ تفسیر کے اصولوں اور اسلام کے اجماعی طور پر طے شدہ ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے اگر تفسیر میں کسی ایسی رائے کا اظہار کیا جائے جو قرآن وسنت کے خلاف نہ ہو تو وہ اس حدیث کی وعید میں داخل نہیں ہے۔ البتہ اس قسم کا اظہارِ رائے بھی قرآن وسنت کے وسیع وعمیق علم اور اسلامی علوم میں شہادت کے بغیر ممکن نہیں، اور علماء نے اس کیلئے بھی کچھ کارآمد اصول مقرر فرمائے ہیں، جو اصولِ فقہ اور اصولِ تفسیر میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

مفسر میں مندرجہ ذیل ۱۵ علوم میں مہارت ضروری ہے: لغت۔ ۲ نحو۔ ۳ تصریف۔ ۴ اشتقاق۔ ۵ معانی۔ ۶ بیان۔ ۷ بدیع۔ (۸) قراءت۔ ۹ اصلین۔ ۱۰ اسبابِ نزول۔ ۱۱ قصص۔ ۱۲ ناسخ منسوخ۔ ۱۳ فقہ۔ ۱۴ وہ احادیث کہ جو مجمل ومبہم کی تفسیر کا درجہ رکھتی ہوں۔ ۱۵ علم موہبہ۔

سلف میں بعض علوم بالفعل موجود تھے، اور بعض علوم بغیر تعلّم کے ہی بالطبع موجود تھے۔ چنانچہ وہ غور وحوض کے باعث ماجور ہیں، اگرچہ ان سے خطا ہی کیوں نہ ہوئی ہو، چونکہ ان کی طرف سے کوئی تعدی نہیں تھی، چنانچہ وہ دوہرے اجر کے حقدار ٹھہرے، جیسا کہ ایک روایت میں منقول ہے، یا دس اجروں کے حقدار ٹھہرے جیسا کہ ایک دوسری روایت میں مروی ہے۔

صوفیاء کرام کی تفسیریں:

صوفیاء کرامؒ سے قرآنِ کریم کی آیات کے تحت کچھ ایسی باتیں منقول ہیں جو بظاہر تفسیر معلوم ہوتی ہیں، مگر وہ آیت کے ظاہری اور ماثور معنی کے خلاف ہوتی ہیں، مثلاً قرآنِ کریم کا ارشاد ہے: ﴿قاتلوا الذین یلونکم من الکفار﴾ ''قتال کرو ان کافروں سے جو تم سے متصل ہیں'' اس کے تحت بعض صوفیاء نے کہا: قاتلوا النفس فانها تلی الانسان نفس سے قتال کرو، کیونکہ وہ انسان سے سب سے زیادہ متصل ہے۔ اس قسم کے جملوں کو بعض حضرات نے قرآنِ کریم کی تفسیر سمجھ لیا، حالانکہ درحقیقت وہ تفسیر نہیں، صوفیاء کرام کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ قرآنِ کریم کی اصل مراد یہ ہے اور جو مفہوم ظاہری الفاظ سے سمجھ میں آ رہا ہے وہ مراد نہیں ہے، بلکہ وہ قرآنِ کریم کے ظاہری مفہوم پر جو اس کے اصل ماخذ سے ثابت ہو پوری طرح ایمان رکھتے ہیں، اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی تفسیر وہی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے ان وجدانی استنباطات کو بھی ذکر کر دیتے ہیں جو اس آیت کی تلاوت کے وقت ان کے قلوب پر وارد ہوئے، چنانچہ مذکورہ بالا مثال میں صوفیاء کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس آیت میں کفار کے مقابلے میں ہر جہاد وقتال کا حکم مراد نہیں، بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ کفار سے جہاد وقتال کا حکم تو اس آیت کا اصلی تقاضا ہے ہی، لیکن اس آیت سے وجدانی طور پر انسان کو یہ بھی سوچ لینا چاہیئے کہ سب سے قریبی نافرمان اس کا نفس ہے، جو اُسے بُرائیوں پر آمادہ کرتا رہتا ہے، لہٰذا کفار سے جہاد کے ساتھ ساتھ اس سے بھی جہاد ضروری ہے۔ ماضی قریب

کے معروف مفسر علامہ محمود آلوسیؒ جن کی تفسیر میں اس قسم کے وجدانی استنباطات بکثرت ملتے ہیں، صوفیاء کے منشاء کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ''قرآنِ کریم میں مساواتِ صوفیاء سے جو کلام منقول ہے، وہ درحقیقت ان دقیق امور کی طرف اشارے ہوتے ہیں جو اربابِ سلوک پر منکشف ہوتے ہیں، اور ان اشارات میں اور قرآنِ کریم کے ظاہری مفہوم میں جو حقیقتاً مراد ہوتا ہے تطبیق ممکن ہے، صوفیاء کا اعتقاد یہ نہیں ہوتا کہ ظاہری مفہوم مراد نہیں ہے، اور باطنی مفہوم مراد ہے، اس لئے کہ یہ تو باطنی ملحدوں کا اعتقاد ہے جسے انہوں نے شریعت کی بالکلیہ نفی کا زینہ بنایا ہے۔ ہمارے صوفیاء کرام کا اس اعتقاد سے کوئی واسطہ نہیں، اور ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ جبکہ صوفیاء نے تاکید کی ہے کہ قرآنِ کریم کی ظاہری تفسیر کو سب سے پہلے حاصل کیا جائے، لیکن صوفیاء کرام کے اس قسم کے اقوال کے بارے میں مندجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:۔

① ان اقوال کو قرآنِ کریم کی تفسیر قرار نہ دیا جائے، بلکہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ قرآنِ کریم کی اصل مراد وہی ہے جو تفسیر کے اصل مأخذ سے سمجھ میں آتا ہے، اور یہ اقوال محض وجدانی استنباط کی حیثیت رکھتے ہیں، لہٰذا اگر ان اقوال کو قرآنِ کریم کی تفسیر سمجھ لیا جائے تو یہ گمراہی ہے۔ چنانچہ امام ابوعبدالرحمٰن سلمیؒ نے ایک کتاب ''حقائق التفسیر'' کے نام سے لکھی تھی جو اسی قسم کے اقوال پر مشتمل تھی۔ اس کے بارے میں امام واحدیؒ نے فرمایا: ''جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ یہ تفسیر ہے تو وہ کافر ہو جائے گا''۔

② اس قسم کے اقوال میں بھی صرف اُن اقوال کو درست سمجھا جا سکتا ہے جن سے قرآنِ کریم کی کسی آیات کے ظاہری مفہوم یا شریعت کی کسی مسلمہ اصول کی نفی نہ ہوتی ہو اور اگر اِن وجدانیات کے پردے میں دین کے مسلّم اصول و قواعد کی خلاف ورزی کی جانے لگے تو یہ صریح الحاد ہے۔

③ اس قسم کے وجدانیات صرف اُس وقت معتبر ہو سکتے ہیں، جب وہ قرآنِ کریم کی تحریف کی حد تک نہ پہنچتے ہوں، اور اگر قرآنِ کریم کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر کوئی بات کہی جائے تو وہ بھی الحاد اور گمراہی ہے، مثلاً ایک شخص نے قرآنی آیات ﴿من ذالذی یشفع﴾ کے تحت یہ کہا (کہ اصل میں من ذل ذی یشفع ہے' ذی سے مراد ''نفس'' ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو شخص نفس کو ذلیل کرے گا وہ شفا پائے گا)۔ اِس بات کو یاد رکھو علامہ سراج الدین بلقینیؒ سے اِس کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ ''ایسا کہنے والا ملحد ہے''۔

④ قدیم زمانے میں ملحدوں کا ایک فرقہ باطنیہ کے نام سے گزرا ہے جس کا دعویٰ یہ تھا کہ قرآنِ کریم سے ظاہری طور پر جو مطلب سمجھ میں آتا ہے حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے' بلکہ ہر لفظ سے ایک باطنی مفہوم کی طرف اشارہ ہے اور وہی قرآن اصل تفسیر ہے یہ اعتقاد باجماع اُمّت کفر والحاد ہے لہٰذا صوفیاء کے کسی قول کے بارے میں اس قسم کا اعتقاد رکھا جائے تو وہ باطنیت ہوگا اِن چار اُصولوں کی رعائت کے ساتھ صوفیاء کرام کے اقوال کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، اور بلاشبہ بعض مخصوص واردات واحوال رکھنے والوں کو اِن اقوال سے فائدہ بھی پہنچا ہے اسی وجہ سے علامہ آلوسیؒ اپنی تفسیر ''روح المعانی'' میں آیات کی مکمل تفسیر لکھنے کے بعد ایک مستقل عنوان ''من باب الشارہ فی الآیات'' قائم کرتے ہیں اور اِس میں اس قسم کے وجدانیات ذکر فرماتے ہیں۔ مذکورہ بالا گذارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ صوفیاء کرام نے قرآنِ

کریم کے تحت اپنے جو وجدانیات ذکر فرمائے ہیں وہ قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہیں اور بعض لوگوں نے اُن پر باطنیت کا جو الزام عائد کیا ہے وہ درست نہیں اس کے باوجود ہم حافظ ابن الصلاحؒ کے اِس ارشاد کو نقل کئے بغیر نہیں رہ سکتے:

"ومع ذلك فياليتهم لم يتساهلوا بمثل ذلك لما فيه من الايهام والالباس"۔

''اس کے باوجود اے کاش کہ یہ حضرات اِس قسم کے اقوال نقل کرنے میں اتنے تساہل سے کام نہ لیتے کیونکہ اِن میں غلط فہمی اور اشتباہ کی بڑی گنجائش ہے۔''

تاویل اور تفسیر:

قدیم زمانے میں تفسیر کیلئے ایک اور لفظ ''تاویل'' بھی بکثرت استعمال ہوتا تھا، اور خود قرآنِ کریم نے بھی اپنی تفسیر کیلئے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے: ﴿وما يعلم تأويله الا الله﴾ اس لئے بعد کے علما میں یہ بحث چھڑ گی کہ آیا یہ دونوں لفظ بالکل ہم معنی ہیں، یا ان میں کچھ فرق ہے؟

امام ابوعبیدؒ وغیرہ نے فرمایا کہ یہ دونوں لفظ بالکل مترادف ہیں، اور دوسرے حضرات نے ان دونوں میں فرق بیان کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن دونوں میں فرق بتانے کیلئے اتنی مختلف آراء ظاہر کی گئی ہیں کہ ان سب کو نقل کرنا بھی مشکل ہے، مثلاً چند اقوال یہ ہیں:

① ''تفسیر'' ایک ایک لفظ کی انفرادی تشریح کا نام ہے، اور ''تاویل'' جملے کی مجموعی تشریح کا۔

② ''تفسیر'' الفاظ کے ظاہری معنی بیان کرنے کو کہتے ہیں، اور ''تاویل'' اصل مراد کی توضیح کو۔

③ تفسیر اس آیت کی ہوتی ہے جس میں ایک سے زیادہ معنی کا احتمال نہ ہو اور ''تاویل'' کا مطلب یہ ہے کہ آیت کی جو مختلف تشریحات ممکن ہیں ان میں سے کسی ایک کو دلیل کے ساتھ اختیار کر لیا جائے۔

④ ''تفسیر'' یقین کے ساتھ تشریح کرنے کو کہا جاتا ہے، اور ''تاویل'' تردّد کے ساتھ تشریح کرنے کو۔

⑤ ''تفسیر'' الفاظ کا مفہوم بیان کر دینے کا نام ہے، اور ''تاویل'' اس مفہوم سے نکلنے والے سبق اور نتائج کی توضیح کا، وغیرہ وغیرہ۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ابوعبید ہی کی رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں لفظوں میں استعمال کے لحاظ سے کوئی حقیقی فرق نہیں، جن حضرات نے فرق بیان کرنے کی کوشش کی ہے، اُن کے شدید اختلاف آراء پر غور کرنے سے ہی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کوئی معیّن اور اتفاقی اصطلاح نہیں بن سکی، اگر ان میں حقیقتاً فرق ہوتا تو ایسے شدید اختلاف کے کوئی معنی نہیں تھے واقعہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہلِ علم نے ''تفسیر'' اور ''تاویل'' کو الگ الگ کر کے اصطلاحات قرار دینے کی کوشش کی ہو گی، لیکن اس میں ایسا اختلاف رونما ہوا کہ کوئی بھی اصطلاح عالمگیر قبولیت حاصل نہ کر سکی، یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے سے لے کر آج تک کے مفسرین ان الفاظ کے ساتھ عموماً ہم معنی الفاظ کا سا معاملہ کرتے آئے ہیں، اور ایک کو دوسرے کی جگہ بلا تکلف استعمال کیا جاتا رہا ہے، لہٰذا اس بحث میں وقت کھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔

قرآن میں جھگڑنا کفر ہے

۲۳۶ :وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْمِرَاءُ فِی الْقُرْاٰنِ كُفْرٌ
(رواه ابوداود واحمد)

أخرجه أحمد في المسند ٢/٢٨٦۔ وأخرجه أبو داوٗد في السنن حديث رقم ٤٦٠٣۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قرآن میں جھگڑنا کفر ہے۔اس حدیث کوامام ابوداؤد اور امام احمدؒ روایت کیا ہے۔

تشریح: " المراء'' کے کئی معنی بیان کئے ہیں:

① **المجادلة فی متشابه القرآن المؤدی الی الجحود کفر سماه کفرًا باسم ما یخشی عاقبته۔**

یعنی قرآن کی آیات متشابہات میں ایسا جھگڑا جو مفضی الی الجحود ہو،ایسے جھگڑے کے نتیجے میں کفر کا اندیشہ ہے،لہٰذا اس کو کفر قرار دے دیا۔مثلاً ایک شخص اپنی بات کی دلیل قرآنِ کریم کی کسی آیت سے پکڑتا ہے اور دوسرا شخص اپنی بات کے دفاع کے طور پر قرآنِ کریم کی کوئی اور آیت پڑھتا ہے،اور وہ سمجھتا ہے کہ تمہاری پیش کردہ دلیل میرے متدل کی نقیض ہے۔

② زین العربؒ فرماتے ہیں: "المراء فی القرآن" سے مراد قرآنِ کریم میں شک کرنا ہے،جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فلاتاب فی مریة منه﴾ "أی:"فی" شک اور مطلب یہ ہے کہ قرآن کے کلام اللہ ہونے میں شک کرنا "کفر" ہے۔

مراء:اس چیز میں مجادلہ کو کہتے ہیں ، جس میں شک وشبہ ہو۔

③ بیضاویؒ فرماتے ہیں: "المراء فی القرآن سے مراد "تدارُء" ہے،مثلاً کوئی شخص تکذیب القرآن بالقرآن کرے۔

قرآن میں نظروفکر کرنے والے شخص کا حق ہے کہ آیاتِ متعارضہ میں تطبیق کی بھرپور کوشش کرے،چونکہ قرآن کا بعض حصہ قرآن کے دوسرے بعض حصوں کی تصدیق کرتا ہے،اگر کسی جگہ کوئی اشکال پیش آئے اور تطبیق نہ دے سکے تو اسے چاہئے کہ وہ یہی اعتقاد رکھے کہ یہ اس کی سہوء فہم کا قصور ہے۔اور اس آیت کی مراد کو اللہ اور اس کے رسول کے سپرد کردے۔جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ [النساء:٥٩]۔ "اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اگر خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں خدا اور اسکے رسول کے حکم کی طرف رجوع کرو۔"

④ شرح السنہ میں فرماتے ہیں: بعض کا کہنا ہے کہ المراء فی قراء ته کا مطلب یہ ہے کہ قراءات مرویہ کا انکار کیا جائے،حالانکہ اللہ جل شانہٗ نے قرآنِ کریم کو سبعة أحرف پر نازل کیا ہے،لہٰذا کفر کی وعید سنا کر اس بات سے ڈرایا گیا ہے کہ لوگ اس کی قراءات میں جھگڑا مت کریں،اس کی تکذیب کے مرتکب مت ہوں،چونکہ یہ احرف سبعہ تمام کے تمام قرآن منزل ہیں،لہٰذا اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔

جب قرآن کی آیت کا معنی سمجھ نہ آئے تو علماء سے پوچھ لیا جائے

۲۳۷ : وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ سَمِعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَوْمًا يَتَدَارَؤُوْنَ فِي الْقُرْاٰنِ فَقَالَ اِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِهٰذَا ضَرَبُوْا كِتَابَ اللّٰهِ بَعْضَهٗ بِبَعْضٍ وَاِنَّمَا نَزَلَ كِتَابُ اللّٰهِ يُصَدِّقُ بَعْضُهٗ بَعْضًا فَلَا تُكَذِّبُوْا بَعْضَهٗ بِبَعْضٍ فَمَا عَلِمْتُمْ مِّنْهُ فَقُوْلُوْا وَمَا جَهِلْتُمْ فَكِلُوْهُ اِلٰى عَالِمِهٖ۔ (رواه احمد وابن ماجة)

أخرجه أحمد في المسند ۲/۱۸۵۔ولابن ماجة نحوه ۱/۳۳ حديث رقم ۸۵۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک قوم کے بارے میں سنا کہ وہ آپس میں قرآن کے بارے میں جھگڑا کر رہے ہیں اور بحث کرر ہے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بے شک تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے اللہ کی کتاب کے بعض حصہ کو بعض پر مارا۔ یعنی کتاب اللہ کی آیات میں اختلاف اور تضاد ثابت کر دیا کہ فلاں آیت اس آیت کے خلاف ہے اور یہ آیت فلاں آیت کے مخالف ہے اور جب کہ اللہ تعالیٰ قرآن کو اس طرح نازل کیا ہے کہ قرآن کا بعض حصہ بھی حصہ کی تصدیق کرتا ہے۔ لہٰذا تم قرآن کے بعض حصہ کی بعض کے ساتھ تکذیب نہ کرو اور اس کے بارے میں جتنا جانتے ہو اس کو آگے بیان کرو اور جس کو نہیں جانتے اس کو اس کے جاننے والے کی طرف حوالے کر دو۔ اس حدیث کو امام احمدؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: يتدارؤن في القرآن:

"یتدارؤن": تدارء سے مشتق ہے، التدرؤ دفع كل من المتخاصمين قول صاحبه بما يقع من القول۔ أی: يدفع بعضهم دليل بعض منه۔ لڑائی جھگڑے میں دھکم دھکا ہونا، جھگڑے کی بات ایک دوسرے پر ڈالنا، باہم جھگڑنا۔

مظہرؒ اس کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں: جیسا کہ اہلسنّت والجماعت کا کہنا ہے کہ خیر وشر اللہ کی جانب سے ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ [النساء:۷۸] کہ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ نعمت اور مصیبت سب اللہ کی طرف سے ہے میرا اس میں کوئی دخل نہیں اور قدری کہتے ہیں: نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ اور اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾ [النساء:۷۹] "(اے آدم زاد!) تجھ کو جو فائدہ پہنچے وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی (شامت اعمال کی) وجہ سے ہے" اور اس قسم کا اختلاف منہی عنہ ہے۔ اس قسم کی آیات کا وہی مطلب اختیار کرنا چاہئے کہ جس پر اجماع اُمت ہے، اور دوسری آیت میں تاویل کی جائے۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ سب کچھ من جانب اللہ ہونے پر اجماع ہے۔ رہی بات اس دوسری آیت کریمہ کی تو مفسرین کا کہنا ہے کہ اس آیت کا مضمون ماقبل سے متصل ہے: ﴿فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا﴾ [النساء:۷۸] "ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ بات بھی نہیں سمجھ سکتے ؟"

أی:أن المنافقين لا يعلمون ما هو الصواب، ويقولون ما أصابك......۔

۲۔بعض کا کہنا ہے کہ (ما أصابك......) جملہ مستأنفہ ہے اور ﴿قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾[النساء:۷۸]کہ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ نعمت اور مصیبت سب اللہ کی طرف سے ہے میرا اِس میں کوئی دخل نہیں۔ یہ آیت مسئلہ قدر وقضاء کے بارے میں نہیں ہے۔

عرض مرتب :مذکورہ بالا مثال کی تفصیل یہ ہے:مدینہ میں منافقین کو جب خوشحالی آتی تھی تو کہتے تھے کہ اللہ کی طرف سے آئی ہے، اور جب کوئی مصیبت اور بدحالی پیش آتی تھی تو اُس کو حضور ﷺ کی طرف منسوب کر کے کہتے تھے کہ یہ مصیبت اور بدحالی نعوذ باللہ آپ ﷺ کی نحوست سے آئی ہے حق تعالیٰ نے فرمایا : ﴿قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾[النساء:۷۸] کہ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ نعمت اور مصیبت سب اللہ کی طرف سے ہے میرا اِس میں کوئی دخل نہیں' اِس آیات سے معلوم ہوا کہ نعمت ومصیبت، راحت وتکلیف سب اللہ کی طرف سے آتی ہیں اور آیاتِ ثانیہ میں ارشاد ہے کہ راحت ونعمت تو اللہ کی طرف سے ہے اور مصیبت، پریشانی خود بندے کی طرف سے آتی ہے پس اِن دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہو رہا ہے۔

دفع تعارض:

آیات اولیٰ میں اجمال اور دوسری آیات میں اِس کی تفصیل ہے اور تفصیل بعد الاجمال کو تعارض نہیں کہا جاتا ہے۔ وضاحت اِس کی یہ ہے کہ آیاتِ اولیٰ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ خوشحالی وبدحالی ہر چیز کا خلق وایجاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے البتہ خوشحالی تو حق تعالیٰ بلاواسطہ محض اپنے فضل سے عطا فرماتے ہیں اور بدحالی بواسطہ معاصی عباد نازل فرماتے ہیں، لیکن بلا واسطہ اور بالواسطہ کی تفصیل اِس آیات میں بیان نہیں کی گی بلکہ : ﴿قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾[النساء:۷۸] کہ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ نعمت اور مصیبت سب اللہ کی طرف سے ہے میرا اِس میں کوئی دخل نہیں کہہ کر اس کو مجمل طور پر ذکر کر دیا، آیاتِ ثانیہ میں اِس کی تفصیل بیان فرما دی، ﴿مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ جو نعمت وخوشحالی تم کو پہنچتی ہے وہ بالواسطہ محض اللہ کے فضل وکرم سے پہنچتی ہے اور ﴿وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾ جو مصیبت وبدحالی آتی ہے یہ تمہارے گناہوں کے واسطے سے آتی ہے، حقیقت یہی ہے کہ نعمتوں اور راحتوں کی نزول میں بندے کی عبادات کو کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی نعمتیں تو اِس قدر ہیں کہ بندہ اپنی تمام عبادات سے اِس کا حق شکر ادا نہیں کر سکتا، حق تعالیٰ نے بندے کو وجود بخشا اور اِس کو عبادت کرنے کی توفیق عطا فرمائی، یہ وجود اور توفیقِ عبادات خود اتنی بڑی بڑی نعمتیں ہیں کہ بندے کی تمام عبادات وطاعات ان ہی کی مکافات نہیں کر سکتی ہیں، چہ جائیکہ دیگر نعمتوں کا حق اداء کر سکیں، بلکہ حق تو یہ ہے کہ بندے کی پوری زندگی کے اعمالِ حسنہ اور عبادتیں خدا کی ایک چھوٹی سے چھوٹی نعمت کا حق ادا نہیں کر سکتیں، پس معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہر لحہ اور ہر آن جو بندوں پر رحمتوں اور نعمتوں کی بارش ہوتی رہتی ہے، اِس کا سبب بندوں کی عبادات نہیں ہیں بلکہ یہ محض اللہ کا فضل واحسان ہے۔ اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا:

"لن يدخل احدا عمل الجنه' قيل:ولا أنت يا رسول الله قال:ولا أنا إلا ان يتمدانى الله منه بفضل ورحمه "۔

(رواه بخاری)

ترجمہ: ''کسی شخص کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا' عرض کیا گیا یا رسول اللہ آپ بھی اپنے عمل کی طرف سے داخل نہیں ہوں گے، آپ ﷺ نے فرمایا: اور میں بھی نہیں مگر یہ کہ اللہ مجھے اپنے فضل و رحمت میں چھپالیں''۔

البتہ مصائب و آلام کا آنا بندوں کی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ نے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾ [الشوریٰ: ۳۰] ''اور جو مصیبت تم پر واقع ہوتی ہے سو تمہارے اپنے فعلوں سے اور وہ بہت سے گناہ تو معاف ہی کر دیتا ہے۔'' حدیث میں بھی یہی مضمون وارد ہوا ہے:

''عن ابی موسیٰ ان رسول ﷺ اللہ، قال: لا تعیب عبدا لکبۃ فما فوقها وما دونها الا بذنب وما یعفوا کثیر''

ترجمہ: ''حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بندے کو جو کوئی ہلکی یا سخت مصیبت لاحق ہوتی ہے تو وہ اِس کے گناہوں کی وجہ سے ہوتی ہے اور جن گناہوں کو اللہ معاف فرمادیتے ہیں وہ زیادہ ہیں''۔

قوله: فقال انما هلك من كان قبلكم بهذا:

''بهذا'' باءِ سببیہ ہے، اور مشارٌ الیہ ''التدارؤ'' ہے: أی: بسبب التدارؤ۔ اسم اشارہ تحقیر کیلئے ہے یا بیان تعظیم ضرر کیلئے ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے اسم اشارہ سے پہلے مضاف محذوف ہے: أی بمثل هذا الاختلاف المذموم بعضه بدالبعض ہے۔

قوله: ضربوا كتاب الله بعضه ببعض: یہ جملہ اسم اشارہ کا بیان ہے۔

حدیث مبارکہ کے اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ تم سے پہلے لوگوں' یہود و نصاریٰ نے اپنی کتابوں تورات و انجیل کو خلط کر دیا، اہلِ تورات انجیل اور اہل انجیل تورات بے ساتھ۔ اہلِ تورات کو جو باتیں اپنی مرضی کے خلاف معلوم ہوتیں ان میں تضاد اور اختلاف ثابت کرنے لگے کہ فلاں آیت فلاں کے مخالف ہے۔ اہلِ انجیل نے بھی یونہی کیا۔

بعض کا کہنا ہے کہ کتاب اللہ سے مراد قرآن ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان لوگوں نے قرآن کو خلط ملط کر دیا، محکم متشابہہ، ناسخ منسوخ اور مطلق مقید میں تمیز نہیں کی، گویا کہ ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکا۔

قوله: وانما نزل كتاب الله يصدق بعضه بعضه:

کتاب اللہ میں نظر کرنے والے شخص کو چاہئے کہ کتاب اللہ کے درمیان ظاہری تعارض میں تطبیق کی کوشش کرے، چونکہ کتاب اللہ کا بعض حصہ دوسرے بعض حصہ کی تصدیق کرتا ہے۔ کتاب اللہ سے مراد جنس ہے۔ یعنی مثلاً انجیل یہ بیان کرتی ہے کہ تورات کلام اللہ ہے، برحق ہے، اور قرآن یہ بیان کرتا ہے کہ تمام منزل کتب برحق ہیں، اور اس طرح ناسخ یہ بیان کرتا ہے کہ منسوخ پر عمل نہ کیا جائے، محکم یہ بیان کرتا ہے کہ متشابہہ پر عمل نہ کیا جائے، اور مؤول بالدلیل یہ بیان کرتا ہے کہ ظاہر پر عمل نہ کیا جائے، خاص یہ بیان کرتا ہے کہ عام پر عمل نہ کیا جائے اور مقید یہ بتاتا ہے کہ مطلق پر عمل نہ کیا جائے۔

قوله: فلا تكذبوا بعضه ببعض:

قرآن کے بعض حصہ کے ذریعہ بعض حصہ کی تکذیب مت کرو بلکہ یوں کہو: اللہ نے جو بھی نازل کیا ہے وہ برحق ہے۔ فما

علمتم منه فقولوا، وما جهلتم فكلوه الٰى عالمه، یعنی جو قواعد کے موافق معلوم ہو وہ بیان کر دو، اور جس سے تم ناواقف ہو مثلاً متشابہات وغیرہ تو اس کو اس کے عالم کی طرف، یعنی اللہ تعالیٰ یا کبار علماء کے سپرد کر دو، اپنی طرف سے رائے زنی مت کرو۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قرآنِ کریم کی چند ایسی مقدس آیات کے بارے میں سوال کیا گیا کہ جن کے درمیان ظاہری تعارض تھا، تو آپؓ نے ان کے جوابات ارشاد فرمائے۔ ان میں سے بعض سوالات یہ ہیں:

(عرض مرتب: سوال و جواب کی عبارت انتہائی مختصر ہے، نیز آیات متعارضہ کو بھی ذکر نہیں کیا، اس لئے ہم نے اس بحث کو نسبتاً جامع انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔)

تشریح تعارض:

آیت نمبر ۱ تا ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دِن لوگوں سے ان کے اعمال وغیرہ کے متعلق سوال کیا جائے گا اور آیات نمبر ۷، ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دِن کسی انسان یا جن سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے؛

رفع تعارض:

اِس تعارض کے چار جواب ہیں:

① سوال دو قسم کا ہوتا ہے: ① سوال استعلام یعنی کسی نامعلوم شئے کو معلوم کرنے کیلئے سوال کرنا۔ ② سوال توبیخ: یعنی ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکانے کے طور پر سوال کرنا پہلی چھ آیتوں میں سوال توبیخ کا اثبات مراد ہے، اور اخیر کی دو آیتوں میں اِستعلام کی نفی ہے یعنی یہ معلوم کرنے کیلئے کسی سے کوئی سوال نہیں ہوگا۔ اسلئے کہ حق تعالیٰ کو مخلوق کے تمام اعمال وافعال کا علم ہے معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، البتہ زجر و توبیخ کے طور پر حق تعالیٰ مخلوق سے سول کریں گے کہ تم نے فلاں گناہ کیوں کیا؟ فلاں نیکی کیوں نہیں کی؟ وغیرہ (حمل وغیرہ) پہلی آیات میں جو، ﴿ولنسئلن المرسلين﴾ فرمایا گیا ہے کہ ہم رسولوں سے بھی سوال کریں گے وہ سوال یہ ہوگا کہ جب تم نے اپنی قوم کو دعوتِ ایمان دی تو تمہاری قوم نے کیا جواب دیا تمہارا کہنا مانا یا نہیں اور اِس سوال کا مقصود رسولوں کو توبیخ کرنا نہیں بلکہ ان کی اُمتوں کے کفار کو زجر و توبیخ کرنا مقصود ہوگا۔ (روح المعانی)

② اختلاف اوقات پر محمول ہے قیامت کا دِن بہت طویل ہوگا ایک وقت ایسا ہوگا کہ کسی سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا پھر دوسرے وقت میں سوالات شروع ہو جائیں گے، پس کوئی تعارض نہیں (جلالین شریف)۔

③ اختلاف مکان پر محمول ہے یعنی میدانِ حشر میں ایک موقف میں تو کسی سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا جب دوسرے موقف یعنی موقف حساب میں پہنچیں گے تو وہاں سوال کیا جائے گا حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اور حضرت قتادہؒ نے یہی توجیہ فرمائی ہے (روح المعانی)

④ اخیر کی دونوں آیتوں سے اعمال کے بارے میں سوال کی نفی ہے، اور جن آیتوں میں سوال کا ذکر ہے وہاں سوال عن الدواعي والموانع مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ اعمال کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا بلکہ دواعي الى الاعمال السيئة اور موانع عن الاعمالِ حسنه کے متعلق سوال ہوں گے کہ کون سا داعیہ پیدا ہوا تھا جو تم نے فلاں گناہ کیا اور کونسا مانع پیش آ گیا تھا، جو تم نے فلاں عمل صالح نہیں کیا پس کوئی تعارض نہیں کیونکہ جس سوال کی نفی ہے اُس کا کوئی اثبات نہیں جس کا اثبات ہے اُس کی نفی نہیں۔ (تفسیر کبیر)

تشریح تعارض:

آیت نمبر ا سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین قیامت کے دِن اللہ کے سامنے کوئی بات نہیں چھپائیں گے ہر بات صحیح صحیح بتا دیں گے اور آیات نمبر ۴ میں ہے کہ حق تعالیٰ قیامت کے دِن مشرکین سے فرمائیں گے، اين شركاء كم الذين كنتم تزعمون۔ تمہارے وہ شرکاء کہاں ہیں جن کے بارے میں تم اللہ کے شرکاء ہونے کا گمان کرتے تھے تو مشرکین کا جواب سوائے اِس کے کچھ نہیں ہوگا کہ وہ یوں کہیں گے کہ "والله ربنا ما كنا مشركين" ہمارے خدائے پروردگار کی قسم ہم تو کسی کو بھی آپ کا شریک نہیں ٹھہراتے تھے، اِس لئے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین اللہ کے سامنے جھوٹی قسم کھا کر اپنے شرک کو چھپائیں گے، پس دونوں آیاتوں میں بظاہر تعارض ہے کیوں کہ آیاتِ اولیٰ میں کتمان کی نفی اور دوسری آیات میں کتمان کا اثبات ہے۔

رفع تعارض:

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ اختلاف اوقات پر محمول ہے، ایک وقت تو وہ اپنا شرک چھپائیں گے لیکن دوسرے وقت میں چھپا نہیں پائیں گے بلکہ صحیح صحیح بیان کر دیں گے یعنی ابتداء تو وہ اپنا شرک قسم کھا کر چھپائیں گے مگر جب حق تعالیٰ ان کی زبانوں پر مہر لگا کر اِن کے اعضاء وجوارح سے گواہی دلوائیں گے تو اعضاء وجوارح اِن کا کفر وشرک صحیح صحیح بیان کر دیں گے اِس وقت یہ لوگ کوئی بھی بات چھپا نہیں پائیں گے اعضاء وجوارح کی گواہی کے وقت وہ کسی بات کو چھپانے اور انکار کرنے پر قادر نہیں ہوں گے یہ توجیہ بخاری شریف کی روایت سے ثابت ہے: عن ابن عباس رضى الله عنهما فى قوله تعالىٰ ﴿ولا يكتمون الله حديثا﴾ وقوله تعالىٰ ﴿والله ربنا ما كنا مشركين﴾، انه قال: ان المشركين لما رأ ويوم القيامة ان الله يغفر اهل الاسلام، ويغفر الذنوب، ولا يغفر الشرك جحدوا رجاء ان يغفر لهم، فقالوا: والله ربنا ما كنا مشركين، فيختم الله على افواههم، وتكلمت ايديهم وأرجلهم لما كانوا يعملون، فعند ذلك يود الذين كفروا وعصوا الرسول لوتسوى بهم الارض، ولا يكتمون الله حديثا۔

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ کے قول: ولا يكتمون الله حديثا اور اللہ کے قول: والله ربنا ما كنا مشركين کے بارے میں روایت ہے' فرمایا کہ مشرکین جب قیامت کے دِن دیکھیں گے کہ حق تعالیٰ اہلِ اسلام کی مغفرت فرما رہے ہیں اور گناہوں کو بخش رہے ہیں مگر شرک کی مغفرت نہیں فرما رہا ہے، تو مشرکین اس امید پر کہ ان کی مغفرت ہو جائے اپنے شرک کا انکار کر دیں گے اور کہہ دیں گے کہ اللہ کی قسم ہمارے رب کی قسم ہم مشرک نہیں تھے، پس حق تعالیٰ ان کی زبانوں پر مہر لگا

دیں گے اور اِن کے ہاتھ پاؤں بولیں گے ان کا کفر وشرک اور ان کے اعمال صحیح صحیح بیان کر دیں گے، پس اس وقت کفار اور رسول کے نافرمان تمنا کریں گے کہ کاش! ہم کو زمین کی مٹی میں ملا کر زمین کو ہموار کیا جاتا اور اس وقت وہ لوگ اللہ سے کوئی بات چھپا نہیں پائیں گے۔ بخاری شریف کی ایک روایت ہے کہ حضرت مشہد بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قرآن کی چند آیات کے درمیان تعارض کے متعلق سوال کیا جن میں سے دو آیتیں یہ ہیں تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہی جواب دیا جو ابھی اوپر گزر رہا ہے۔ (تفسیر مظہری)

تشریح تعارض:

آیات نمبر ا، ۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اولاً زمین کو پیدا کیا اِس کے بعد آسمان بنایا اور آیات نمبر ۳ اِس کے برعکس دلالت کرتی ہے کہ تخلیق سماء مقدم ہے تخلیق ارض پر کیونکہ اس میں ارشاد ہے: ﴿والارض بعد ذلك دحٰها﴾ کہ زمین کو آسمان کے بنانے کے بعد بچھایا، پس ان آیات میں بظاہر تعارض ہے۔

رفع تعارض:

اس تعارض کے دفعیہ کے تین طریقے ہیں:

① تقدم خلق ارض والی آیات کو اصل قرار دے کر تقدیم سموات والی آیات میں تاویل کی جائے۔ ② تقدیم سمٰوت والی آیات کو اصل قرار دے کر تقدیم ارض والی آیات میں تاویل کی جائے۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ایسی توجیہ اختیار کی جائے جن سے دونوں قسم کی آیات اصل پر رہیں اور تعارض ختم ہو جائے ان طریقِ مذکورہ کے پیشِ نظر اِس تعارض کے بظاہر چار جواب ہیں مگر پہلے دو جوابوں کے تحت مذکورہ تأویلات کو مستقل جواب شمار کر کے آٹھ ہو جائیں گے۔ تقدیم خلقِ ارض والی آیات اصل اور اپنے ظاہر پر محمول ہے یعنی حق تعالیٰ نے اولاً ارض وما فیہا کو پیدا فرمایا، اس کے بعد آسمانوں کی تخلیق فرمائی جیسا کہ پہلی دو آیتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ روایت مرفوعہ صحیحہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

نیز عقلاً بھی یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ زمین بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور آسمان چھت کے درجہ میں ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا﴾ [الانبياء: ٣٢] ''اور آسمان کو محفوظ چھت بنایا'' اور بنیاد پہلے قائم کی جاتی ہے، چھت بعد میں ڈالی جاتی ہے، لہٰذا تخلیق ارض مقدم ہے تخلیقِ ساوات پر، اکثر مفسرین نے اس کو اختیار کیا ہے۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش کے متعلق دریافت فرمایا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ نے یکشنبہ اور دوشنبہ کے دِن زمین کو پیدا فرمایا اور پہاڑ کو اور جو اِن میں منافع رکھے ہیں اِن سب کو سہ شنبہ کے دِن پیدا فرمایا اور چہار شنبہ کے دن درختوں' پانی' شہروں آبادیوں اور کھنڈرات کو پیدا فرمایا، پس یہ چار دِن ہو گئے اسی کو حق تعالیٰ نے فرمایا'' کہ تم لوگ ایسے خدا کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو روز میں پیدا فرمایا اور تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو یہی سارے جہان کا ربّ ہے اور اسی نے زمین میں پہاڑ' نباتات اور اس

میں فائدے کی چیزیں رکھ دیں اور اس میں اس کی غذائیں تجویز کر دیں چار دن میں''۔ پورے ہیں پوچھنے والوں کیلئے اور پنج شنبہ کے دن آسمانوں کو پیدا کیا اور جمعہ کے دن چاند سورج ستارے اور فرشتے پیدا کیے۔

اِس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ تخلیقِ ارض مقدم ہے تخلیق سماوات پر، اسی طرح ایک اور مرفوع روایت ہے۔

ترجمہ کہ اللہ نے یکشنبہ اور دوشنبہ کے روز زمین کو پیدا کیا اور سہ شنبہ کے دن پہاڑوں اور ٹیلوں کو بنایا اور چہار شنبہ کے دن درختوں کو اور پنج شنبہ اور جمعہ کے دن آسمانوں کو پیدا کیا۔

نیز عقلاً بھی یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ زمین بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور آسمان چھت کے درجہ میں ہے جیسا کہ ارشادِ باری ہے: ﴿وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا﴾ [الانبياء: ٣٢] ''اور آسمان کو محفوظ چھت بنایا'' اور بنیاد قائم کی جاتی ہے اور چھت بعد میں ڈالی جاتی ہے لہٰذا تخلیق ارض مقدم ہے، تخلیق سماوات پر، اکثر مفسرینؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے رہی سورہ نازعات کی آیت کو: ﴿وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا﴾ [النازعات: ٣٠] ''اور اس کے بعد زمین کو پھیلا دیا'' سو اس میں دو طرح کے تاویل کی گئی ہے۔

① الارض سے پہلے تدبّر یاتذکر یااذکر فعل محذوف ہے، اور **بعد ذلك** اس فعل محذوف کا ظرف ہے اور **دحٰها** جملہ مستانفہ ہے اور آیت شریفہ سے یہ بتانا مقصود ہی نہیں کہ زمین کی تخلیق آسمان کی تخلیق کے بعد ہوئی بلکہ اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا اور یاد دلانا مقصود ہے، مطلب یہ ہے کہ جب آپ کو ساری نعمتوں کی معلومات ہوگئی تو اس کے بعد نعم ارضیہ کو یاد کیجیے، ان میں تدبر وفکر کیجیے کہ حق تعالیٰ نے زمین کو بچھایا اس میں سمندروں، دریاؤں اور نہروں کو جاری کیا اس سے چشمے نکالے اور اس سے نباتات اور اشجار کو نکالا اور اس میں پہاڑ جمادیئے **بعد** "**مع**" کے معنی میں ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے "**بعد ذلك**" کی تفسیر "**مع ذلك**" سے نقل کی ہے۔ آیاتِ شریفہ کا مطلب یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ نے کیسی کیسی نعمتیں عطاء فرمائی ہیں کہ آسمان بنایا' اس کی چھت کو بلند کیا اس کو درست کیا' اس کی رات کو تاریک بنایا یہ سب چیزیں حق تعالیٰ نے تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے نفع کیلئے پیدا فرمائیں ہیں، پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں تخلیق ارض کے تأخر کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے ان دونوں تأویلات کے بعد آیات میں کوئی تعارض نہیں رہتا۔

② تقدیم خلق سماوات والی اصل اور اپنے ظاہر پر محمول ہے یعنی حق تعالیٰ نے اولاً آسمان کو پیدا کیا اس کے بعد زمین کو پیدا کیا جیسا آیت نمبر۴ میں ﴿**والارض ذلك دحٰها**﴾ سے معلوم ہوتا ہے۔ امام واحدی نے البسیط میں حضرت مقاتلؒ سے ہی نقل کیا ہے۔ محققین میں بہت سے حضرات نے اسی کو نقل کیا ہے اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ اکثر ان آیات میں جن میں آسمان وزمین کا ذکر آیا ہے اور سمٰوٰت کو ارض پر مقدم کیا گیا ہے جیسا کہ: ﴿**ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف الیل والنهار' لئن سالتهم من خلق السمٰوٰت والارض الذی خلق السمٰوٰت والارض وما بینهما فی ستة ایام' ان ربکم الذی خلق السمٰوٰت والارض**﴾ جب اکثر آیات میں ذکر سموات مقدم ہے ذکر ارض پر، تو معلوم ہوتا ہے کہ تخلیقِ سموات بھی مقدم ہے تخلیق ارض پر، دوسری دلیل یہ ہے کہ حکمت کا تقاضا بھی یہی

ہے کہ اشرف کو غیر اشرف پر مقدم کیا جائے اور آسمان ذاتاً صفتاً دونوں اعتبار سے افضل ہے آسمان مقدار میں بھی زمین سے بڑا ہے اور مکان سے بھی اعلیٰ وارفع ہے، پس اشرف یعنی آسمان کی تخلیق کا غیر اشرف یعنی زمین کی تخلیق پر مقدم ہونا مطابق مقتضائے حکمت ہے۔

رہی آیت نمبر ا،۴ سو ان میں چار طرح سے تاویل کی گئی ہے:

① ثم استوی میں 'ثم' واؤ کے معنی میں ہے جو مطلق جمعیت کیلئے آتی ہے مقصود آسمان وزمین دونوں کی محض تخلیق کو بیان کرنا ہے، تقدیم وتاخیر کے اعتبار سے ترتیب بیان کرنا مقصود نہیں ہے، پس کوئی تعارض نہیں ہے۔

② لفظ ثمَّ اگر چہ ترتیب مع التراخی کیلئے آتا ہے لیکن تراخی کی دو قسمیں ہیں: تراخی فی الزمان اور تراخی فی الرتبہ، 'ثم' کا استعمال حقیقتاً تو تراخی فی الزمان کیلئے ہوتا ہے، کبھی کبھار مجازاً تراخی في الرتبه کیلئے استعال ہوا ہے جس سے آسمان کے بعد ہی کو بیان کرنا مقصود ہے کہ آسمان کا مرتبہ زمین سے بعید اور اونچا ہے بعد زمانی اور تاخر زمانی کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے جیسا کہ آیت شریفہ: ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾ [البلد: ۱۱ تا ۱۷] میں لفظ ثمتراخی في الرتبه کیلئے مستعمل ہے کہ اس انسان کافر نے گھاٹی کو پار کیوں نہیں کیا اور آپ کو معلوم ہے کہ گھاٹی کیا ہے؟ وہ کسی گردن کا غلامی سے چھڑا دینا ہے یا فاقہ کے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو کھانا کھلانا یا کسی خاک نشین محتاج کو کھانا کھلانا پھر ان لوگوں میں سے ہو جاتا ہے جو ایمان لائے (الخ)۔

اگر یہاں ثم کو تراخی فی الزمان کے لئے مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ پہلے اِن اعمالِ مذکورہ کو کرنا چاہئے تھا اس کے بعد ایمان لانا چاہئے تھا، حالانکہ ایمان تو اعمال پر مقدم ہے اس لئے ثم یہاں مجازاً تراخی فی الرتبہ کیلئے ہے جس سے ایمان کے بعد مرتبت اور تعظیم شان کو بتلانا مقصود ہے کہ ایمان کا مرتبہ اعمال سے برتر واعلیٰ ہے، پہلے ایمان لانا چاہئے اس کے بعد اعمالِ مذکورہ کا پابند ہونا چاہئے، پس اسے ہی ثم السوى الى السماء میں سمجھ لیا جائے کہ آسمان کے بُعدِ رُتبی کو بیان کرنا مقصود ہے لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

③۔ تیسری تاویل یہ ہے کہ لفظ خلق ایجاد وتکوین کے معنی میں نہیں ہے بلکہ مجازاً تقدیر اور قضاء کے معنی میں مستعمل ہے، مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ارض وما فیہا کے پیدا کرنے کا فیصلہ فرمادیا کہ عنقریب ارض وما فیہا کو پیدا کر دیں گے، ابھی پیدا نہیں فرمایا' اس کے بعد آسمانوں کو پیدا کر دیا آسمانوں کے بعد زمین وما فیہا کو جن کے پیدا کرنے کا فیصلہ پہلے فرما چکے تھے پیدا کر دیا، اس کو فرمایا: ''والارض بعد ذلك دحها'' اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آیت شریفہ: ﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ [آل عمران: ۵۹] ''عیسیٰ کا حال خدا کے نزدیک آدم کا سا ہے کہ اس نے (پہلے) مٹی سے ان کا قالب بنایا پھر فرمایا کہ (انسان) ہو جاؤ تو وہ (انسان) ہو گئے'' میں خلق بمعنی قدر وقضی مستعمل ہوا ہے۔ یہاں اگر خلق کو ایجاد وتکوین کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ آدم کو مٹی سے پیدا کیا، ''کن'' پس وہ پیدا ہو گئے اور ظاہر ہے کہ یہ مطلب درست نہیں ہے اِس لئے پیدا کر دینے کے بعد کلمہ ''کن'' سے خطاب کرنا بے سود وبے معنی ہے اس لئے یہاں خلق

قدر اور قضٰی کے معنی میں ہے اِس صورت میں مطلب بالکل دُرست ہے کہ حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کرنے کا فیصلہ فرمایا پھر کہا' "کن" پیدا ہو جاؤ، پس وہ پیدا ہو گئے۔

۴۔ چوتھی تاٗویل یہ ہے کہ خلق سے پہلے اراد محذوف یعنی: **هو الذى اراد ان يخلق لكم ما فى الارض جميعا' قل انكم لتكفرون بالذى خلق الارض فى يومين**" جیسا کہ "**اذا قمتم الى الصلوٰة فاغسلو وجوهكم**" میں **اذا اردتم القيام الى الصلوٰة** مراد ہے اور "**واذا قرات القرآن فاستغذ بالله**" میں **اذا اردت القراءة** مراد ہے۔ اِس صورت میں مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے آسمان سے قبل زمین کی تخلیق نہیں فرمائی بلکہ تخلیق کا ارادہ فرمایا کہ عنقریب ارض ومافیہا کو پیدا کریں گے، پھر آسمانوں کو پیدا کر دینے کے بعد زمین کی تخلیق کے اِرادے کی تکمیل فرمائی یعنی ارض ومافیہا کو پیدا کر دیا جس کو آیاتِ ثالثہ میں فرمایا: ﴿**والارض بعد ذلك دحها**﴾ **فاندفع تعارض** یہ تاویل تیسری تاٗویل کے قریب قریب ہے۔

تعارض کا تیسرا جواب یہ ہے کہ دونوں قسم کی آیتوں کو اپنے اصل اور ظاہر پر رکھتے ہوئے ایسی توجیہ کی جائے کہ تعارض دور ہو جائے سو وہ توجیہ یہ ہے کہ ہر جسم کا ایک مادہ ہوتا ہے اور ایک شکل وصورت ہوتی ہے مادہ کے اعتبار سے خلق ارض مقدم ہے خلق سماوات پر جیسا کہ پہلی دو آیتوں میں ہے اور صورت وشکل کے اعتبار سے تخلیق سماوات مقدم ہے تخلیق ارض پر جیسا کہ آیت نمبر ۳ میں ہے۔ حاصل اس کا یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے اولاً زمین کو پیدا کیا جو ایک کھرل کی شکل میں تھا جیسا کہ حضرت حسنؒ سے مروی ہے اِس کے بعد آسمان کا مادہ بنایا جو دخان کی شکل میں تھا، جیسا کہ آیت نمبر۴ میں ہے پھر آسمان کی موجودہ صورت بنائی اور اِس کے سات طبقات بنا دیئے اِس کے بعد زمین کے مادہ کو دراز کر کے اِس کو موجودہ شکل وصورت عطاء فرما دی، اور اس کو بچھا کر اس کے اوپر جبال واشجار، انہار وغیرہ پیدا فرما دیئے، پس آیات نمبر۱،۴ کا مطلب یہ ہوگا کہ پہلے زمین کا مادہ پیدا کیا پھر آسمان کا مادہ بنایا اور آیات نمبر۳ کا مطلب یہ ہوگا کہ پہلے آسمان کی صورت بنائی پھر زمین کی صورت وشکل بنائی اس توجیہ کے بعد اِن آیات میں کوئی تعارض نہیں رہتا۔

حضرت تھانویؒ نے بیان القرآن میں اسی کو اختیار کیا ہے اِس توجیہ کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے ہوتی ہے:

"**عن سعيد بن جبير قال: جاء رجل الى ابن عباس رضى الله تعالىٰ عنهما، فقال: فأية أشياء تختلف على فى القرآن، قال: هات ما اختلف عليك من ذلك، فقال: اسمع الله قول: انكم لتكفرون بالذى خلق الأرض (حتى بلغ) طائعين، فبدأ بخلق الأرض فى هذه الآية قبل خلق السماء، ثم قال سبحانه فى الآية الاخرىٰ: أسم السماء بناها ثم قال: والأرض بعد ذلك دحها فبدأجل شانه بخلق السماء قبل خلق الارض، فقال ابن عباس رضى الله عنهما: أما خلق الأرض فى يومين فان الأرض خلقت قبل السماء، وكانت السماء دخانا، فسوّاهن سبع سموات فى يومين بعد خلق الأرض وأما قوله تعالىٰ: والأرض بعد ذلك دحها، يقول: جعل فيها جبلا، وجعل فيها نهر و جعل فيها شجرا و جعل منها بحورا**"۔

سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ مجھے کچھ چیزیں قرآن مجید میں متعارض نظر آتی ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا' بتاؤ، کونسی چیز تم کو متعارض نظر آتی ہے اُس نے عرض کیا میں سنتا ہوں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں' ﴿انکم لتکفرون بالذی خلق الأرض﴾ یہاں تک کہ اُس نے طائفین تک پڑھا، ان آیات میں حقِ تعالیٰ نے آسمان کی تخلیق سے قبل زمین کی تخلیق کو بیان فرمایا، پھر حقِ تعالیٰ نے دوسری آیات میں فرمایا ﴿ام السمآء بناها﴾ اس کے بعد فرمایا' ﴿والأرض بعد ذلك دحها﴾ اِس میں حقِ تعالیٰ نے تخلیق زمین سے پہلے تخلیق آسمان کو بیان کیا، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا بہرحال ''خلق الأرض فی یومین'' تو اس کا مطلب تو یہ ہے کہ زمین آسمان سے پہلے پیدا کی اور آسمان ایک دھواں تھا، تو زمین کے پیدا کرنے کے بعد (یعنی زمین کا مادہ اور اِس کے بعد آسمان کا مادہ بشکل دخان پیدا کرنے کے بعد) دو دِن میں سات آسمان بنائے، بہرحال حقِ تعالیٰ کا ارشاد ﴿والأرض بعد ذلك دحها﴾ اِس کا مطلب یہ ہے کہ زمین میں پہاڑ بنائے نہریں بنائی درخت بنائے سمندر بنائے۔

علامہ خفاجیؒ اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ''اخرج منها ماء ها ومرعها والجبال ارساها'' یہ دحها سے بدل یا عطف بیان ہے جس سے دحها کی تفسیر اور اِس سے مراد کو بیان کرنا مقصود ہے، پس اِس آیات میں زمین کو آسمان سے مؤخر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین ذات کے اعتبار سے آسمان سے مؤخر ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مافی الارض کے پیدا کرنے کے اعتبار سے زمین متاخر ہے زمین کی تکمیل گویا بعد میں ہوئی زمین میں مافی الارض کو پیدا کر کے اِس قابل بنا دیا کہ اس سے انفاع اور تمتع کیا جائے ورنہ زمین کی نفس ذات کا وجود آسمان سے پہلے ہو چکا تھا۔

لیکن اس پر اشکال یہ ہوسکتا ہے کہ اِس توجیہ سے یہ معلوم ہے کہ زمین کا بچھانا اِس پر جبال' اشجار' انہار کا پیدا کرنا آسمان کے بعد ہوا اور آیات نمبر ۱، ۴ اور روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما جو اوپر گزر چکی ہے اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جبال واشجار اور انہار کی تخلیق آسمان سے پہلے ہوئی آیات نمبر ۱ میں جو فرمایا اس سے صاف ظاہر ہے کہ جمیع مافی الارض (جبال، اشجار، انہار) کی تخلیق آسمان سے پہلے ہوئی اور ان سب چیزوں کی تخلیق زمین کے بچھائے بغیر ناممکن ہے، پس معلوم ہوا کہ زمین کا بچھانا بھی آسمان سے قبل ہوا اور آیت میں جو فرمایا اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق جبال وغیرہ تخلیق آسمان پر مقدم ہے اور روایت سابقہ میں ہے کہ پہاڑوں کو سہ شنبہ کے دِن درختوں اور نہروں کو چہار شنبہ کے دِن اور آسمانوں کو پنجشنبہ کے دِن پیدا فرمایا۔ اس میں صاف تصریح ہے کہ خلقِ جبال وغیرہ مقدم ہے خلقِ سماء پر، پس یہ توجیہ مذکورہ آیات وروایت کے خلاف ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیات وروایت میں جمیع مافی الارض (جبال، اشجار، وانہار) کے پیدا کرنے سے مراد اِن کے اُصول اور مادوں کو پیدا کرنا ہے کہ حق تعالیٰ نے زمین کا مادہ پیدا کرنے کے بعد جمیع مافی الارض کے مادوں کو بھی پیدا کر دیا مگر اِس کی تکمیل آسمان کی تخلیق کے بعد فرمائی، اور جمیع مافی الارض کے صرف مادوں کی تخلیق زمین کے بچھائے بغیر بھی ممکن ہے، لہٰذا زمین کا بچھانا آسمان سے قبل لازم نہیں آئے گا۔ حاصل یہ نکلا کہ اولاً زمین کا مادہ پیدا کیا پھر مافی الارض (جبال، اشجار، وانہار) وغیرہ کا مادہ بنایا، اس کے بعد آسمان کا مادہ بنایا' پھر آسمان کی صورت بنائی اور سات آسمان بنا دیئے اِسکے بعد زمین کی صورت بنائی' اس کو

بچھا کر اس پر جبال، اشجار، اور انہار کی صورتیں پیدا فرما کر زمین کی تکمیل مکمل کر دی اور اس کو قابلِ انتفاع بنا دیا، اب تخلیق کی ترتیب یوں ہو گی۔

④۔ تعارض کا چوتھا جواب بعض محققین رحمہم اللہ نے توجیہ مذکورہ کے برعکس صورت اختیار کر کے دیا ہے کہ مادے کے اعتبار سے آسمان کی تخلیق مقدم ہے اور صورت کے اعتبار سے تخلیق ارض مقدم ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اولاً آسمان کا مادہ بنایا، پھر زمین کا مادہ پیدا کیا اس کے بعد زمین کی شکل وصورت بنائی پھر آسمان کی صورت بنائی۔ (روح المعانی پارہ ۱۶)

قرآن سات لغات پر نازل ہوا

۲۳۸: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ لِكُلِّ اٰيَةٍ مِّنْهَا ظَهْرٌ وَّبَطْنٌ وَّلِكُلِّ حَدٍّ مُّطَّلَعٌ۔ (رواه في شرح السنة)

وقد أخرجه البزار والطبراني في الأوسط۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قرآن سات لغات پر نازل کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر آیت کے لئے ظاہر اور باطن ہے اور ہر حد کے لئے ایک خبردار ہونے کی جگہ ہے۔ شرح السنۃ۔

تشریح: مذکورہ بالا حدیث معنی کے اعتبار سے متواتر ہے۔ چنانچہ مشہور محدث امام ابوعبید قاسم بن سلام نے اس کے تواتر کی تصریح کی ہے، اور حدیث وقرآت کے معروف امام علامہ ابن الجزریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مستقل کتاب (جزء) میں اس حدیث کے تمام طرق جمع کئے ہیں۔ ابن حجر کا کہنا ہے کہ اس حدیث کا پہلا جملہ ۲۱ صحابہ سے مروی ہے۔ اھ۔
علامہ جزریؒ کے بیان کے مطابق یہ حدیث مندرجہ ذیل صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے مروی ہے: ① حضرت عمر بن خطاب ② ہشام بن حکیم بن حزام ③ عبدالرحمٰن بن عوف ④ ابی بن کعب ⑤ عبداللہ بن مسعود ⑥ معاذ بن جبل ⑦ ابوہریرہ ⑧ عبداللہ بن عباس ⑨ ابوسعید خدری ⑩ حذیفہ بن یمان ⑪ ابوبکرہ ⑫ عمرو بن عاص ⑬ زید بن ارقم ⑭ انس بن مالک ⑮ سمرہ بن جندب ⑯ عمرو بن ابی سلمہ ⑰ ابوجہم ⑱ ابوطلحہ اور ⑲ اُم ایوب انصاریہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

صاحب مناہل العرفان محمد عبدالعظیم زرقانیؒ نے اپنی کتاب مناہل العرفان فی علوم القرآن میں اس موقع پر مذکورہ بالا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ چند دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسماء گرامی بھی ذکر کئے ہیں جو یہ ہیں: ① حضرت عثمان ② ابوبکر ③ سلمان بن صرد ④ عمرو بن ابی سلمۃ رضی اللہ عنہم۔
حافظ ابویعلیٰ اپنی مسند ”کبیر“ میں نقل کرتے ہیں:

أن عثمان رضي الله عنه، قال يوما وهو على المنبر أذكر الله رجلا سمع النبي صلى الله عليه وسلم، قال: ”ان القرآن انزل على سبعة احرف كلها شافٍ كافٍ“ لما قام، فقاموا حتى لم يحصوا، فشهدوا أن

رسول الله صلى عليه وسلم قال: "أنزل القرآن على سبعة حروفٍ كلها شافٍ۔ فقال عثمان رضى الله عنه أنا أشهد معهم"۔ ایک مرتبہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے منبر پر یہ اعلان فرمایا' کہ وہ تمام حضرات کھڑے ہو جائیں جنھوں نے آنحضرت ﷺ سے یہ حدیث سنی ہو کہ: قرآن کریم سات حروف پر نازل کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک شافی اور کافی ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام کی اتنی بڑی جماعت کھڑی ہوگئی جسے شمار نہیں کیا جاسکا۔

عرض مرتب: محمد عبدالعظیم زرقانیؒ لکھتے ہیں: ومأن هذه الجموع التى يؤمن تواطؤها على الكذب هى التى جعلت الامام أبا عبيد ابن سلاّم يقول بتواتر الحديث لكنك خبير بأن من شروط التواتر، توافر جمع يؤمن تواطؤهم على الكذب فى كل طبقة من طبقات الرواية، وهذا الشرط اذا كان موفوراهنا فى طبقة الصحابة كما رأيت' فليس بموفور لدينا فى الطبقات المتأخرة۔

مذکورہ بالا عبارت کے آخری جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کے طبقہ کے بعد والے طبقات میں تواتر نہیں ہے۔ اھ۔

قوله: انزل القرآن على سبعة احرف:

عرض مرتب: اس حدیث میں سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے سات حروف پر نازل ہونے سے کیا مراد ہے؟ یہ بڑی معرکۃ الآرا اور طویل الذیل بحث ہے اور بلاشبہ علوم قرآن کے مشکل ترین مباحث میں سے ہے۔ اس سلسلہ میں آراء و نظریات کا شدید اختلاف ملتا ہے۔ علامہ ابن عربیؒ وغیرہ نے اس باب میں ۳۵ اقوال شمار کئے ہیں: (الزرکشی، البرھان فی علوم القرآن، ص۲۱۲ ج۱)

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ۴۰ اقوال ہیں۔ یہاں ان میں سے چند اقوال پیش خدمت ہیں:

① والله أعلم بمراده۔

② بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد سات مشہور قاریوں کی قراءتیں ہیں۔ لیکن یہ خلاف غلط اور باطل ہے، کیونکہ قرآنِ کریم کی متواتر قراءتیں ان سات قراءتوں میں منحصر نہیں ہیں۔ بلکہ اور بھی متعدد قراءتیں تواتر کے ساتھ ثابت ہیں یہ سات قراءتیں تو محض اس لئے مشہور ہوگئیں کہ علامہ ابن مجاہدؒ نے ایک کتاب میں ان سات مشہور قراء کی قراءتیں جمع کردی تھیں، نہ ان کا یہ مقصد تھا کہ قراءتیں سات/ ۷ میں منحصر ہیں، اور نہ وہ حروفِ سبعہ کی تشریح ان سات قراءتوں سے کرنا چاہتے تھے۔

③ بعض کا خیال ہے کہ حروف سے مراد تمام قراءتیں ہیں، لیکن "سات" کے لفظ سے "سات" کا مخصوص عدد مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد کثرت ہے، اور عربی زبان میں سات کا لفظ محض کسی چیز کی کثرت بیان کرنے کیلئے اکثر استعمال ہوتا ہے۔ یہاں بھی حدیث کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قرآنِ کریم جن جن حروف پر نازل ہوا وہ مخصوص طور پر "سات" ہی ہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ قرآنِ کریم "بہت سے" طریقوں پر نازل ہوا۔ قصہ مختصر یہ کہ سات کا عدد کثرت کیلئے ہے نہ کہ حصر کیلئے۔

عرض مرتب: صاحب علوم القرآن لکھتے ہیں: علماء متقدمین میں سے قاضی عیاضؒ کا یہی مسلک ہے، اور آخری دور میں

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے بھی یہی قول اختیار فرمایا ہے۔ لیکن یہ قول اس لئے درست معلوم نہیں ہوتا کہ بخاریؒ اور مسلمؒ کی ایک حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے:

"اقرانی جبریل علی حرفٍ فراجعته، فلم ازل أستزیده یزید فی حتی انتهی الی سبعة أحرفٍ"۔

"مجھے جبرائیل علیہ السلام نے قرآنِ کریم ایک حرف پر پڑھایا، تو میں نے ان سے مراجعت کی اور میں زیادتی طلب کرتا رہا، اور وہ (قرآنِ کریم کے حروف) میں اضافہ کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ سات حروف تک پہنچ گئے"۔

اس کی تفصیل صحیح مسلمؒ کی ایک روایت میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے اس طرح ہے: **عن أبی بن کعب أن النبی صلی الله علیه وسلم' کان عند أضاة بنی غفار، قال: "فأتاه جبریل علیه السلام فقال ان الله یأمرك ان تقرأ أمتك القرآن علی حرف، فقال: أسأل الله معافاته ومغفرته، وان أمتی لا تطیق ذلك ثم أتاه الثانیة فقال: ان الله یأمرك ان تقرأ أمتك القرآن علی حرفین، فقال: أسأل الله معافاته ومغفرته، وان أمتی لا تطیق ذلك، ثم جاء ه الثالثة فقال: ان الله یأمرك أن تقرأ أمتك القرآن علی ثلاثة أحرف، فقال: أسأل الله معافاته ومغفرته، وان أمتی لا تطیق ذلك ثم جاء ه الرابعة فقال: ان الله یأمرك ان تقرأ أمتك القرآن علی سبعة أحرف۔ أیما حرفٍ قرء وا علیه فقد أصابوا۔ اھ۔**

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو غفار کے تالاب کے پاس تھے، پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے اور عرض کیا کہ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی (ساری) اُمت قرآنِ کریم کو ایک ہی حرف پر پڑھے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اللہ سے عافیت اور مغفرت مانگتا ہوں، میری اُمت میں اس کی طاقت نہیں ہے، پھر جبرئیل علیہ السلام دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا: اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت قرآنِ کریم کو دو حرفوں پر پڑھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ سے عافیت اور مغفرت مانگتا ہوں، میری اُمت میں اس کی طاقت نہیں ہے، پھر وہ تیسری بار آئے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت قرآنِ کریم کو تین حروف پر پڑھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: میں اللہ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں، میری اُمت میں اس کی طاقت نہیں ہے، پھر وہ چوتھی بار آئے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ آپ کی اُمت قرآن کو سات حروف پر پڑھے، پس وہ جس حرف پر پڑھیں گے، ان کی قراءت درست ہوگی"۔

ان روایات کا سیاق صاف بتا رہا ہے کہ یہاں سات سے مراد محض کثرت نہیں بلکہ سات کا مخصوص عدد ہے۔ اس لئے ان احادیث کی روشنی میں یہ قول قابلِ قبول معلوم نہیں ہوتا، چنانچہ جمہور نے اس کی تردید کی ہے۔

بعض دوسرے علماء مثلاً حافظ ابن جریر طبریؒ وغیرہ نے فرمایا کہ مذکورہ حدیث میں سات حروف سے مراد قبائلِ عرب کی سات لغات ہیں، چونکہ اہلِ عرب مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے، اور ہر قبیلہ کی زبان عربی ہونے کے باوجود دوسرے قبیلہ سے تھوڑی تھوڑی مختلف تھی، اور یہ اختلاف ایسا ہی تھا جیسے ایک بڑی زبان میں علاقائی طور پر تھوڑے تھوڑے اختلاف پیدا ہو جاتے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان مختلف قبائل کی آسانی کیلئے قرآنِ کریم سات لغات پر نازل فرمایا، تاکہ ہر قبیلہ اُسے اپنی لغت کے مطابق پڑھ سکے، امام ابو حاتم سجستانی نے ان قبائل کے نام بھی معین کر کے بتا دیئے ہیں، اور فرمایا ہے کہ قرآنِ کریم ان سات

قبائل کی لغات پر نازل ہوا ہے:

① قریش ② ھُذیل ③ تیم الرباب ④ ازد ⑤ ربیعہ ⑥ ہوازن ⑦ سعد بن بکر۔

اور حافظ ابن عبدالبرؒ نے بعض حضرات سے نقل کر کے ان کی جگہ یہ قبائل بتائے ہیں:

① ھُذیل ② کنانہ ③ قیس ④ ضبّہ ⑤ تیم الرباب ⑥ اسد بن خزیمہ ⑦ قریش۔

لیکن بہت سے محققین مثلاً حافظ ابن عبدالبرؒ، علامہ سیوطیؒ، اور علامہ ابن الجزریؒ وغیرہ نے بھی اِس قول کی تردید کی ہے، اوّل تو اس لئے کہ عرب کے قبائل بہت سے تھے ان میں سے صرف ان سات کے انتخاب کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، دوسرے یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ کے درمیان قرآنِ کریم کے تلاوت میں اختلاف ہوا' جس کا مفصل واقعہ صحیح بخاری میں مروی ہے، حالانکہ یہ دونوں حضرات قریشی تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی تردید فرمائی اور وجہ یہ بتائی کہ قرآنِ کریم سات حروف پر نازل ہوا، اگر سات حروف سے مراد سات مختلف قبائل کی لغات ہوتیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ میں اختلاف کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہئے تھی، کیونکہ وہ قریشی تھے اگرچہ علامہ آلوسیؒ نے اِسکا یہ جواب دیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے علاوہ کسی اور لغت میں قرآن پڑھایا ہو لیکن یہ جواب کمزور ہے کیونکہ مختلف لغات میں قرآنِ کریم کے نازل ہونے کا منشاء تو یہی ہے کہ ہر قبیلے والا اپنی لغت کے مطابق آسانی سے اُس کو پڑھ سکے اِس لئے یہ بات حکمتِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعید معلوم ہوتی ہے کہ ایک قریشی کو دوسری لغت پر قرآنِ کریم پڑھایا گیا۔

اِس کے علاوہ امام طحاویؒ نے بھی یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ مان لیا جائے کہ سات حروف سے مراد سات قبائل کی لغات ہیں تو یہ اُس آیت کے خلاف ہوگا جس میں ارشاد ہے: ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِۦ﴾ [ابراهيم : ٤] ''اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اِس کی قوم کی زبان میں'' اور یہ بات طے شدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم قریش تھی اِس لئے ظاہر ہی ہے کہ قرآن صرف قریش کی لغت پر نازل ہوا ہے۔

امام طحاویؒ کی اِس بات کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآنِ کریم کی جمع ثانی کا ارادہ فرمایا اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کو مصحف تیار کرنے کا حکم دیا اُس وقت اُنہیں یہ ہدایت فرمائی تھی:

''اذا اختلفتم انتم فی شئی من القرآن فاکتبوہ بلسان قریش فانما نزل بلسانھم''۔

''جب قرآن کی کتابت میں تمہارے درمیان کوئی اختلاف ہو تو اُسے قریش کی لغت پر لکھنا کیونکہ قرآن اِنہی کی زبان میں نازل ہوا ہے''۔ اس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تصریح فرما دی ہے کہ قرآن صرف قریش کی زبان میں نازل ہوا۔

(انتھی کلام الشیخ تقی عثمانی)

۴۔ چوتھا قول تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم نازل تو صرف لغتِ قریش پر ہوا تھا، لیکن چونکہ اہلِ عرب مختلف علاقوں اور مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور ہر ایک کیلئے اس ایک لغت پر قرآنِ کریم کی تلاوت بہت دشوار تھی اسلئے ابتداءِ اسلام میں یہ

اجازت دیدی گئی تھی) کہ وہ صرف اپنی علاقائی زبان کے مطابق مترادف الفاظ کے ساتھ قرآنِ کریم کی تلاوت کرلیا کریں، چنانچہ جن لوگوں کیلئے قرآنِ کریم کے اصلی الفاظ سے تلاوت مشکل تھی، ان کیلئے خود آنحضرت ﷺ نے ایسے مترادفات متعین فرما دیئے تھے جن سے وہ تلاوت کرسکیں۔ یہ مرادفات قریش اور غیر قریش دونوں کی لغات سے منتخب کئے گئے تھے، اور یہ بالکل ایسے تھے جیسے تَعَالَ کی جگہ ھَلُمَّ یا اَقْبِلْ یا اُدْنُ پڑھ دیا جائے، معنی سب کے ایک ہی رہتے ہیں، لیکن یہ اجازت صرف اسلام کے ابتدائی دور میں تھی، جبکہ تمام اہلِ عرب قرآنی زبان کے پوری طرح عادی نہیں ہوئے تھے، پھر رفتہ رفتہ اس قرآنی زبان کا دائرہ اثر بڑھتا گیا اور اہلِ عرب اس کے عادی ہوگئے، اور ان کیلئے اس اصلی لغت پر قرآن کی تلاوت آسان ہوگئی، تو آنحضرت ﷺ نے وفات سے پہلے رمضان میں حضرت جبرائیل علیہ السلام سے قرآنِ کریم کا آخری دور کیا، جسے "عرضه اخيره" کہا جاتا ہے، اس موقع پر یہ مرادفات سے پڑھنے کی اجازت ختم کردی گئی، اور صرف وہی طریقہ باقی رہ گیا جس پر قرآن نازل ہوا تھا۔

اس قول کے مطابق "سات حروف" والی حدیث اسی زمانے سے متعلق ہے جب تلاوت میں مرادفات استعمال کرنے کی اجازت تھی، اور اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ قرآنِ کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے بلکہ مطلب یہ تھا کہ وہ اس وسعت کے ساتھ نازل ہوا ہے کہ اسے ایک مخصوص زمانے تک سات حروف پر پڑھا جاسکے گا، اور سات حروف سے بھی مراد یہ نہیں ہے کہ قرآنِ کریم کے ہر کلمہ میں سات مرادفات کی اجازت ہے، بلکہ مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ جتنے مرادفات استعمال کئے جاسکتے ہیں ان کی تعداد سات ہے، اور اس اجازت کا مفہوم بھی یہ نہ تھا کہ ہر شخص اپنی مرضی سے جو الفاظ چاہے استعمال کرلے، بلکہ متبادل الفاظ کی تعین بھی خود آنحضرت ﷺ نے فرمادی تھی، اور ہر شخص کو آپ ﷺ نے اس طرح قرآن سکھلایا تھا جو اس کیلئے آسان ہو، لہٰذا صرف ان مرادفات کی اجازت دی گئی تھی، جو حضور ﷺ سے ثابت تھے۔ امام طحاویؒ کے علاوہ حضرت سفیان عیینہؒ، ابن وہبؒ اور حافظ ابن عبدالبرؒ نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے، بلکہ حافظ بن عبدالبرؒ نے تو اس قول کو اکثر علماء کی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ قول پچھلے تمام اقوال کے مقابلہ میں زیادہ قرین قیاس ہے، اور اس کے قائلین اپنی دلیل میں مسند احمدؒ کی وہ روایت پیش کرتے ہیں جو حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ان جبرئيل عليه السلام قال: يا محمد! اقرا القرآن على أحرف، قال ميكائيل استزده حتى بلغ سبعة أحرفه' قال: كل شافٍ كافٍ ما لم تخلط اية عذب برحمة اورحمة بعذاب، نحو قولك تعال واقبل وهلم واذهب، وأسرع، وعجل۔

"جبرئیل علیہ السلام نے (حضور ﷺ سے) کہا کہ اے محمد! قرآنِ کریم کو ایک حرف پر پڑھئے، میکائیل علیہ السلام نے (حضور ﷺ سے) کہا، اس میں اضافہ کروائیے، یہاں تک کہ معاملہ سات حروف تک پہنچ گیا، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: ان میں سے ہر ایک کافی شافی ہے، تاوقتیکہ آپ عذاب کی آیت کو رحمت سے یا رحمت کو عذاب سے مخلوط نہ کردیں، یہ ایسا ہی ہوگا جیسے آپ تَعَال (آؤ) کے معنی کو اقبل، هلم اذهب، أسرع، عجل کے الفاظ سے اداء کریں"۔

سبعة أحرف کی راجح ترین تشریح:

ہمارے نزدیک قرآنِ کریم کے "سات حروف" کی سب سے بہتر تشریح اور تعبیر یہ ہے کہ حدیث میں "حروف کے

اختلاف'' سے مراد ''قراء کا اختلاف'' ہے۔ اور سات حروف سے مراد ''اختلاف قراءات'' کی سات نوعیتیں ہیں، چنانچہ قراء تیں تواگر چہ سات سے زائد ہیں، لیکن ان قراءتوں میں اختلاف پائے جاتے ہیں وہ سات اقسام میں منحصر ہیں۔

قوله: لكل آية منها ظهر وبطن ولكل حد مطلع:

لكل آية منها: یہ جملہ سبعة کی صفت ہے۔ اور ضمیر مؤنث برائے ''رابطہ'' ہے' أي: من تلك السبعة الاحرف۔ ابن حجرؒ کا کہنا ہے کہ ضمیر مؤنث قرآن کی طرف راجع ہے باعتبار جملہ قرآن کے۔ چونکہ کسی بھی قول کی بنیاد پر آیت ان احرف سبعہ میں سے نہیں ہے۔ ملا علی قاریؒ نے ابن حجرؒ کی بات کی تردید کی ہے۔ **مطلع:** طاء کی تشدید اور لام کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

عرض مرتب: حدیث کے اس جملہ کی تشریح میں بھی علماء کا شدید اختلاف ہے، مرقات میں یہ بحث کافی پھیلی ہوئی ہے۔

① **قيل: الظهر ما ظهر تأويله وعرف معناه، والبطن ما خفي تفسيره والشكل فحواه۔**

② **قيل: الظهر اللفظ والبطن المعنىٰ۔**

③ **قال محي السنة في معالم التنزيل: قيل الظهر لفظ القرآن، والبطن تأويله، والمطلع الفهم، وقد يفتح الله على المتدبر والمتفكر من التأويل والمعاني ما لا يفتحه على غيره وفوق كل ذي علم عليم، والتفهم يكون الصدق النية وتعظيم الحرمة وطيب الطعمة۔**

④ **قال زين العرب: الظهر ما ظهر معناه من غير رؤية والبطن بخلافه۔ اھ۔**

⑤ **قال الطيبي: الظهر ما يبينه العقل، والبطن ما يستكشفه التأويل۔**

⑥ **الظهر الايمان به و عمل بمقتضاه والبطن التفاوت في فهمه على حسب مراتبهم في الفضيلة۔**

⑦ **الظهر المعنى الجلي والبطن الخفي وهو سر بين الله وعباده المصطفين۔**

⑧ **قيل: لكل حد وطرف من الظهر والبطن مطلع أي: مصعد أي موضع يطلع عليه بالترقي اليه، فمطلع الظهر، تعلم العربية وتتبع ما يتوقف عليه معرفة الظاهر من أسباب النزول والناسخ والمنسوخ وغير ذلك، ومطلع الباطن تصفية النفس والرياضة بآداب الجوارح واتعابها في اتباع مقتضى الظاهر والعمل بمقتضاه، وقال ابن مسعود: ما من آية الاعمل بها قوم ولها قوم سيعملون بها۔**

⑨ **قيل: ان ما قصه عمن سبق ظاهرها الاخبار باهلاكهم، وباطنها وعظ السامعين۔**

⑩ **قيل: ظاهرها معناه الظاهر لعلماء الظاهر وباطنها من الأسرار لعلماء الباطن۔**

⑪ **قيل: ظاهر التلاوة ومعناها الفهم۔**

⑫ **الظهر ما يبيّنه النقل، والبطن ما يستكشفه التأويل والحد هو المقام الذي يقتبض اعتبار كل من الظهر والبطن فيه فلا محيد عنه، والمطلع المكان الذي يشرف منه على توفيقه خواص كل مقام حده، وليس للحد والمطلع انتهاء، لأن غايتهما طريق العارفين بالله، وما يكون سرا بين الله وبين أنبيائه وأوليائه۔** (كذا حققه الطيبي):

۞ ولكل حد مطلع۔ الحد: المنع وسميت حدود الله بها لمنع مرتكبيها من العود، والمطلع مكان الاطلاع عن موضع عال، يقال: مطلع هذا الجبل من مكان كذا أي: مأتاه ومصعده منه، والمعنى أن لكل حد من حدود الله تعالىٰ وهي احكام الدين التي شرع للعباد موضع اطلاع من القرآن، فمن وفق أن يرتقي لكلك المرتقى اطلع منه على ذلك الحد المتعلق بذلك المطلع ـ (كذا نقله السيد)

علم کی تین اقسام ہیں

۲۳۹ :وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعِلْمُ ثَلَاثَةٌ اٰيَةٌ مُّحْكَمَةٌ اَوْ سُنَّةٌ قَائِمَةٌ اَوْ فَرِيْضَةٌ عَادِلَةٌ وَمَا كَانَ سِوٰى ذٰلِكَ فَهُوَ فَضْلٌ۔ (رواه ابوداود وابن ماجة)

أخرجه أبوداوٗد في السنن مع تقديم وتاخير ۳۰۶/۳ حديث رقم ۲۸۸۵ وكذلك ابن ماجة ۲۱/۱ حديث رقم ۵۴۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ علم تین قسم کا ہے: ① محکم۔ ② سنت قائمہ۔ ③ فریضہ عادلہ۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ زائد ہے اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔

تین آدمی قصہ بیان کریں گے

۲۴۰ :وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ الْاَشْجَعِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقُصُّ اِلَّا اَمِيْرٌ اَوْ مَاْمُوْرٌ اَوْ مُخْتَالٌ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۷۱/۴ حديث رقم ۳۶۶۵۔ وأخرجه أحمد في المسند ۲۷/۶۔

ترجمہ: حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا تین آدمی قصہ بیان کریں گے: ① حاکم ② محکوم اور ③ تکبر کرنے والا۔ (ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

عوف بن مالک۔ یہ عوف بن مالک رضی اللہ عنہ ''اشجعی'' صحابی رسول ہیں۔ وہ غزوہ جس میں یہ سب سے پہلے شریک ہوئے ''خیبر'' ہے۔ فتح مکہ کے دن ان کے ساتھ ''بنو اشجع'' کا جھنڈا تھا۔ یہ ملک شام میں رہائش پذیر ہو گئے تھے اور وہیں پر ان کا انتقال ۷۳ھ میں ہوا۔ ان سے صحابہ وتابعین کی ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

تشریح: قوله: لا يقص الا امير او مأمور او مختال:

'قص' سے ماخوذ ہے، قصص اخبار ومواعظ بیان کرنا۔ مختال: فائے معجمہ کے ساتھ، 'اختیال' سے ماخوذ ہے بمعنی تکبر، اور حائے مہملہ کے ساتھ حیلۃ سے ماخوذ ہے۔ جمہور پہلے کے قائل ہیں اور ابہریؒ فرماتے ہیں: شرح السنہ میں حائے مہملہ کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔ لا يقص: نفی ہے نہ کہ نہی، (كذا قاله السيد)۔

اس کی وجہ امام طیبیؒ نے یہ ذکر کی ہے کہ اگر نہی صریح پر محمول کیا جائے تو لازم آئے گا کہ مختال ''مامور بالقص'' ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد خاص طور ''خطبہ'' ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ یہ فعل ان تین افراد کے علاوہ کسی اور سے صادر نہ ہو۔ امیر سے مراد حاکم، مامور سے مراد حاکم کی طرف سے ماذون شخص یا مامور من عنداللہ، جیسا کہ بعض علماء اور اُولیاء۔ اور مختال سے مراد وہ مفتخر و متکبر شخص ہے جو جاہ کا طالب ہو۔

۲۴۱: ورواه الدارمي عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده وَفِيْ رِوَايَةٍ اَوْ مُرَآءٍ بَدَلَ اَوْمُخْتَالٍ۔

ترجمہ: ''اور دارمی نے اس حدیث کو عمرو بن شعیب سے روایت کیا ہے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے۔

تشریح: دارمی کی روایت میں لفظ مُخْتَالٌ یعنی تکبر کرنے والا کی بجائے اَوْمُرَآءٍ ہے جس کا مطلب ہے ریاکار۔''

قوله: وفى رواية:

مرقات کے تحتانی وفوقانی متن میں ''وفى روايته'' کے الفاظ ہیں۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں کچھ نسخوں میں ''وفى رواية'' ہے (جیسا کہ ہمارے نسخہ میں یہی الفاظ ہیں)۔

بغیر علم فتویٰ دینا گناہ ہے اور غلط مشورہ دینا خیانت ہے

۲۴۲: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ اُفْتِيَ بِغَيْرِ عِلْمٍ كَانَ اِثْمُهٗ عَلٰى مَنْ اَفْتَاهُ وَمَنْ اَشَارَ عَلٰى اَخِيْهِ بِاَمْرٍ يَّعْلَمُ اَنَّ الرُّشْدَ فِيْ غَيْرِهٖ فَقَدْ خَانَهٗ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد فى سننه ٦٦/٤حديث رقم ٣٦٥٧۔وأخرج أوله ابن ماجة ٢٠/١ حديث رقم ٥٣وكذلك الدارمي ٦٩/١ حديث رقم ١٥٩۔ وبنحوه أحمد فى المسند٣٢١/٢۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص کو بغیر علم کے فتویٰ دیا گیا ہو۔ تو اس کا گناہ مفتی پر ہوگا۔ جس نے اس کو غلط فتویٰ دیا ہے اور جس آدمی نے اپنے مسلمان بھائی کو ایسے کام کا مشورہ دیا جس کے بارے میں اس کو علم ہے کہ بھلائی اور خیر اس کے غیر میں ہے تو اس نے خیانت کی اس حدیث کو امام ابوداوٗد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: من أفتى بغير علم ......على من افتاه:

''اُفتی'' صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ صیغۂ معروف کے ساتھ ہے۔ أفتاه: بمعنی استفتٰی ہے، اور

أفتي معروف ہے۔ أي: كان اثمه على من استفتاه فانه جعله في معرض الافتاء بغير علم۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مجہول ہو أي: فا ثم افتائه على من أفتاه أي: الاثم على المفتي دون المستفتي۔ اھ۔

دوسرا احتمال زیادہ ظاہر ہے، اور نسخوں کی روشنی میں یہی اصح ہے۔

حدیث مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ جس جاہل نے بھی کسی مفتی سے کوئی مسئلہ پوچھا، اور عالم نے جواب غلط دیا اور سائل نے اس کے فتویٰ پر عمل کر لیا اور اس کو یہ معلوم نہ تھا کہ مجھے غلط فتویٰ دیا گیا ہے، تو اس کا گناہ مفتی پر ہوگا، اگر اُس نے اِس اجتہاد میں کوتاہی کی ہے۔

قوله: ومن أشار على ......:

طیبیؒ فرماتے ہیں: أشار جب "على" کے ذریعہ متعدی ہو تو بمعنی "مشورہ" ہوتا ہے، أي: استشاره وسأله كيف أفعل هذا الامر؟ صاحب قاموس لکھتے ہیں: أشار عليه بكذا أمره، واستشار طلبه المشورة ۔ اس تحقیق کے بعد معنی یہ ہوئے: من أشار على أخيه وهو متشير، وأمر المستشير بأمر۔ ایک روایت میں آتا ہے: أن المستشار مؤتمن، ومن غشنا فليس منّا۔

مغالطہ دینے سے بچو

۲۴۳ وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الْاُغْلُوْطَاتِ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ٤/٦٥ حديث رقم ٣٦٥٦۔

ترجمہ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو مغالطہ دینے سے منع کیا ہے۔ اس حدیث کو امام ابوداودؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: "الا غلوطات": أغلوطه (ہمزہ کے ضمہ، اور لام کے ساتھ) کی جمع ہے۔ ایسے سوالات کرنا کہ جس میں علماء کو کسی اشکال کے باعث مغالطہ ہوتا ہے، ممنوع فرمایا، چونکہ اس میں ایذاء مسئول ہے، سائل کی فضیلت اور مسئول کی تنقیص ہوتی ہے۔ صاحب الازہار لکھتے ہیں: النهي التحريم اذا كان ابتداء لانه سبب الايذاء والايذاء حرام وتهييج للفتنه والغداوة، وفيه اظهار فضل النفس ونقص الغير۔ وأما ان كان جوابا وجزاء فلايكون حراما لقوله تعالى: ﴿وجزاء سيئة سيئة مثلها﴾۔

ہارون الرشید کی مجلس میں امام شافعیؒ سے کئی مشکل مسائل پوچھے گئے، آپؒ تیزی سے ان کے جوابات دیتے رہے۔ پھر امام شافعیؒ نے اس سائل سے ایک سوال پوچھا کہ ایک شخص چھ سو درہم چھوڑ کر مرا، اور اس کی بہن کے حصہ میں صرف ایک درہم آیا۔ وہ شخص یہ سوال سن کر کافی دیر تک خاموش رہا اور بالآخر عاجز آگیا۔ چنانچہ ہارون الرشید نے صورتِ مسئلہ بیان کی اور فرمایا: اس شخص کی دو بیٹیاں، ماں، بیوی، بارہ بھائی اور ایک بہن تھی۔ اور کل ترکہ ۶۰۰ درہم تھا۔ (كذا نقله الأبهري)

فرائض اور قرآن کو سیکھو اور لوگوں کو تعلیم دو

۲۴۴ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَعَلَّمُوا الْفَرَآئِضَ وَالْقُرْآنَ وَعَلِّمُوا النَّاسَ فَاِنِّیْ مَقْبُوْضٌ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ٤/٣٦٠ حديث رقم ٢٠٩١ وقال فيه اضطراب وقد ضعفه أحمد بن حنبل۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم فرائض یعنی احکام اسلام یا وراثت کا علم اور قرآن سیکھو اور دوسروں کو بھی سکھاؤ اس لئے کہ میں قبض کیا جاؤں گا۔ یعنی اس جہان سے اٹھا لیا جاؤں گا اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: عرض مرتب: اس حدیث کی مکمل تشریح، کتاب العلم، حدیث: ۲۷۹ کے تحت ملاحظہ فرمایئے۔

یہ وحی بند ہونے کا وقت ہے

۲۴۵: وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ قَالَ کُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَشَخَصَ بِبَصَرِهٖ اِلَی السَّمَآءِ ثُمَّ قَالَ هٰذَا أَوَانُ یُخْتَلَسُ فِیْهِ الْعِلْمُ مِنَ النَّاسِ حَتّٰی لَا یَقْدِرُوْا مِنْهُ عَلٰی شَیْءٍ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن من حديث طويل ٥/٣١ حديث رقم ٢٦٥٣ وقال حسن غريب ورواه الدارمي في سننه ١/٩٩ حديث رقم ٢٨٨۔

ترجمہ: حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی اور ارشاد فرمایا یہ وقت ہے کہ علم لوگوں کے درمیان سے اٹھا لیا جائے گا یہاں تک کہ وہ علم کے ذریعے سے کسی چیز پر قدرت نہ رکھیں گے اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: هذا اوان یختلس فیه العلم من الناس:

یہ جملہ محل رفع میں اوان کی صفت ہے، (کذا قاله الطیبی) اور ایک نسخہ میں اضافت کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں یختلس فیه کے الفاظ ہیں۔

ابن الملکؒ کا کہنا ہے کہ اس علم سے مراد علم الوحی ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اظہر یہ ہے کہ علم ہی مراد ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: گویا کہ جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آسمان کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا' تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر منکشف ہوا کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کا وقت قریب آ چکا ہے، چنانچہ اس حدیث مبارکہ میں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ کرام کو یہ خبر سنائی۔

قوله: حتی لایقدروا منه علی شیء:

ابن الملک فرماتے ہیں کہ "منہ" کی ضمیر کا مرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اھ۔ زیادہ واضح یہ ہے کہ اس ضمیر کا مرجع "العلم" ہے۔

عالم مدینہ کون ہے؟

۲۴۶ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رِوَايَةً يُوْشِكُ اَنْ يَّضْرِبَ النَّاسُ اَكْبَادَ الْإِبِلِ يَطْلُبُوْنَ الْعِلْمَ فَلَا يَجِدُوْنَ اَحَدًا اَعْلَمَ مِنْ عَالِمِ الْمَدِيْنَةِ (رواه الترمذی وفی جامعه) قَالَ ابْنُ عُيَيْنَةَ اَنَّهٗ مَالِكُ بْنُ اَنَسٍ وَمِثْلُهٗ عَنْ عَبْدِالرَّزَّاقِ وَقَالَ اِسْحٰقُ بْنُ مُوْسٰى وَسَمِعْتُ ابْنَ عُيَيْنَةَ اِنَّهٗ قَالَ هُوَ الْعُمَرِیُّ الزَّاهِدُ وَاسْمُهٗ عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ ۔

أخرجه الترمذی فی السنن ٤٦/٥ حديث رقم ٢٦٨٠ وقال حديث حسن۔وأخرجه أحمد فی المسند ٢٩٩/٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ وقت قریب ہے کہ جب لوگ علم حاصل کرنے کے لئے اونٹوں کے جگروں کو پھاڑ ڈالیں گے اور اس وقت مدینہ کے عالم سے بڑا کوئی عالم نہیں پائیں گے اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور جامع ترمذی میں ابن عیینہؒ سے منقول ہے کہ عالم مدینہ سے مراد حضرت مالک بن انسؒ ہیں اور عبدالرزاق سے بھی یہی منقول ہے اور حضرت اسحٰق بن موسیٰ نے فرمایا کہ میں نے ابن عیینہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ عالم مدینہ سے مراد عمری زاہد ہے یعنی وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خاندان سے ہے جن کا اسم گرامی حضرت عبدالعزیز بن عبداللہ ہے۔

تشریح: قوله:وعن ابی هريرة رواية :

''رواية'' بنا بر تمیز منصوب ہے۔حدیث کے مرفوع ہونے سے کنایہ ہے، وگرنہ یہ روایت موقوف ہوتی۔

قوله:يوشك ان يضرب الناس اكباد الابل:

''يوشك'' شین کے کسرہ کے ساتھ ہے، شین کے فتحہ والی لغت ردی ہے۔''ان يضرب الناس'': محل رفع میں ''یوشك'' کا اسم ہے۔اور خبر کی حاجت نہیں چونکہ اسم، مسند اور مسند الیہ دونوں پر مشتمل ہے۔

يضرب الناس أكباد الابل: اس جملہ کی متعدد وضاحتیں کی گی ہیں:

① وهو كناية عن اسراع الابل واجهادها فی السير، فتستضر بذلك فتقطع اكبادها من قطع المسافة، ويمسها الادواء من شدة العطش، فتصير كأنها ضربت أكبادها مكان ضربها علی السير۔

② قيل يجهدون الابل ويركضونها كنى بضرب الأكباد عن السير والركض، لأن اكباد الابل والفرس وغيرها تتحرك عند الركض ويلحقها ضرر قطع۔

③ قال الطيبی: ضرب أكباد الابل كناية عن السير السريع، لأن من أراد ذلك يركب الابل ويضرب علی أكبادها بالرجل۔

تشریح: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی کا حاصل یہ ہے کہ وہ وقت بھی آئے گا کہ لوگوں کے درمیان علم کا چرچا بڑھ جائے گا اور تحصیل علم کا شوق پیدا ہوگا' تو لوگ دور دراز سے بہت تیزی سے سفر طے کر کے علم کی خاطر دنیا میں پھیل جائیں گے، اور مدینہ کے عالم سے زیادہ بڑا عالم کسی کو نہیں پائیں گے۔

قولہ: فلا یجدون احدا اعلم من عالم المدینۃ:

مدینہ کے اس عالم سے کون مراد ہے؟ صفیان بن عیینہ اور ان کے بہت سے دوسرے ساتھی کہتے ہیں کہ اس سے مراد امام مالکؒ کی ذات گرامی ہے اور عبدالرزاق جو حدیث کے جلیل القدر اور مشہور امام ہیں وہ بھی صفیان بن عیینہ کی بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اس سے مراد امام مالک ہیں لیکن ابن عیینہ کے ایک اور شاگرد جن کا نام اسحاق بن موسیٰ ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عیینہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ عالم مدینہ سے مراد "عمری زاہد" ہیں جن کا اسم گرامی عبدالعزیز بن عبداللہ ہے اور ان کا تعلق سیدنا فاروق رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہے۔ اس لئے وہ عمری کہلاتے ہیں اور زاہد اُن کی کنیت ہے اس لئے کہ وہ اپنے زمانے کے ایک جلیل القدر عالم اور بڑے پائے کے زاہد و متقی تھے ان کا نسب اس طرح بیان کیا گیا ہے عبدالعزیز بن عبداللہ بن عمرو بن حفص بن عاصم بن عمر بن خطاب

بعض کا کہنا ہے کہ علمائے راسخین میں سے تھے، اور مالک بن انسؒ کے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔

مجدّد کون ہوتا ہے

۲۴۷ : وَعَنْهُ فِيْمَا اَعْلَمُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُ لَهَادِيْنَهَا۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ٤/ ٤٨٠ حديث رقم ٤٢٩١۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھے جو کچھ معلوم ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس امت کے نفع کے لئے ہر صدی پر ایک شخص کو بھیجتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے دین میں تجدید کرتا ہے اس حدیث کو امام ابوداوٗد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **قولہ: فیما اعلم عن رسول اللہ ﷺ:** اس جملہ کی توضیح میں شراح کا اختلاف ہے، چنانچہ شراح کی عبارات

کا خلاصہ ذکر کیا جارہا ہے:

خلاصۃ الآراء:

① **أعلم** کو دو طرح سے ضبط کیا گیا ہے: ① میم کے ضمہ کے ساتھ، بصیغۂ مضارع۔ ② میم کے فتحہ کے ساتھ، بصیغۂ ماضی۔ اور صحیح یہ ہے کہ صیغۂ مضارع کے ساتھ ہے۔

② "اعلم" کس کا قول ہے؟ اس میں اختلاف ہے: ① یہ مصنف کا قول ہے، عبارت کی معنوی تقدیر یوں ہے:

(ا) أی فی علمی، أو فی جملة ما أعلم أن أبا هريرة روى هذا الحديث عن رسول الله ﷺ لا عن غيره وقد شك بعض الناس فيه۔

(ب) هذا الحديث كائنا فى علمي هو عن أبى هريرة رواية، او كائنا فى اعلام أبى هريرة سائر الصحابة۔

واضح رہے کہ مصنف کا قول قرار دینا غیر واضح ہے، (الف) چونکہ یہ بعید از فہم ہے۔ (ب) ابوداؤد کے نسخہ میں عن أبى علقمة: عن أبى هريرة فيما أعلم، عن رسول الله ﷺ...... مروی ہے۔ چنانچہ یہ عبارت نص ہے کہ قول مذکور مصنف کا نہیں بلکہ راوی یعنی ابوعلقمہ کا ہے۔

بضم المیم کی صورت میں ابو ہریرہ کے قول کی حکایت ہے۔ اور بفتح المیم فعل کی حکایت ہے۔ تو واضح رہے کہ بضم المیم یہ ابو علقمہ راوی کا قول ہے، اور فعل کی حکایت کہنا مسامحت و تامّل سے خالی نہیں۔

قوله: قال ان الله عز و جل يبعث لهذه الأمة:

اللہ تعالیٰ اس اُمت کے نفع کی خاطر ہر سو برس کے بعد ایک شخص کو بھیجتا ہے جو دین کی تجدید کرتا ہے۔ اُمت سے مراد اُمّتِ اجابت بھی ہوسکتی ہے اور اُمت دعوت بھی۔ اور اس مجدد کی آمد کبھی صدی کی انتہاء پر اور کبھی ابتداء میں ہوتی ہے۔ اور مجدّد کی آمد ایسی صورتِ حال میں ہوتی ہے جب علم کا بازار سرد پڑ رہا ہوتا ہے، اور سنت ماند پڑتی جاتی ہو، جہالت بکثرت ہو اور بدعات کا دور دورہ ہو، چنانچہ ان حالات میں مجدّد آ کر بدعت کو مٹاتا ہے، اور سنت کو زندہ کرتا ہے۔ اہلِ علم کو عزت دیتا ہے اہلِ بدعت کا قلع قمع کر دیتا ہے۔

صاحبِ جامع الأصول لکھتے ہیں: علماء نے اس حدیث کی مختلف تشریحات بیان کی ہیں۔ ہر شخص نے اس کا مصداق اپنے مذہب کے مختلف علماء کو قرار دیا ہے۔ حالانکہ اولیٰ یہ ہے کہ اس حدیث کو اس کے عموم پر ہی محمول کیا جائے۔ چونکہ لفظ ''مَن'' واحد اور جمع دونوں کیلئے بولا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کو فقہاء کے ساتھ مخصوص کرنا بھی درست نہیں، چونکہ اُمت کو اگرچہ فقہاء سے انتفاع بکثرت ہے لیکن دوسری طرف اُولی الامر' اصحاب حدیث' قراء، واعظین اور زاہدوں سے بھی بکثرت نفع اُٹھاتے ہیں۔ دین کی حفاظت، قوانینِ سیاست، عدل وانصاف یہ سارے کام اولی الامر کے ہیں۔ یہی معاملہ اہلِ علم کا ہے، مثلاً قراء، قرآنِ کریم کو ضبط تام کے ساتھ اُمت کو پہنچا رہے ہیں۔ اور محدثین قرآن وحدیث کی مدد سے اُصول شرع اخذ کرتے ہیں اور دلائل سے مؤید کرتے ہیں، واعظین اپنے مواعظ کے ذریعے تقویٰ طہارت پر ابھارتے ہیں، لیکن مجدّد کہلوانے کا حقدار وہی ہے جو اپنے متعلقہ علم وفن میں ''مشارٌ الیہ'' کی حیثیت رکھتا ہو، (نقله السيد)۔

ابن حجرؒ نے بڑی عجیب بات کہی اور مجدّد دین کو فقہاء شافعیہ پر محصور ومحمول کیا ہے۔ اور شیخ زکریا پر اس سلسلہ کو منتہی قرار دیا ہے، حالانکہ شیخ زکریا' علومِ شرعیہ میں سے کسی بھی علم میں ''مجدّد'' ہونا معروف نہیں ہے۔ ہاں علامہ سیوطیؒ مجدّد ہیں کہ انہوں نے علم التفسیر الماثور فی الدر المنثور کا احیاء کیا، اور الجامع میں تمام احادیثِ متفرقہ کو جامع کیا۔ اور کوئی ایسا فن نہیں چھوڑا کہ جس میں کوئی متن، یا شرح نہ لکھی ہو۔ بلکہ اُن کے اور بھی کئی گرانقدر علمی خدمات ہیں' جن کے پیش نظر وہ مجدّد فی القرآن کہلوانے کے حقدار ہیں۔

میرے نزدیک زیادہ ظاہر مفہوم یہ ہے کہ مجدّد سے مراد کوئی ایک شخص متعین نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد وہ تمام جماعتیں

ہیں جو مختلف علاقوں میں مختلف علوم شرعیہ وغیرہ میں حسب استطاعت، تقریر و تحریر کے ذریعے تجدید کر رہے ہیں۔ اور اُن کی یہ کوشش علوم شرعیہ کے بقاء کا سبب بنیں حتیٰ کہ قیامت آجائے۔ بلاشبہ ''تجدید'' ایک امر اضافی ہے، چونکہ علم بھی سالہا سال تنزل کا شکار ہوتا جا رہا ہے، اور جہالت میں ہر لحہ ترقی ہوتی جا رہی ہے، اور ہمارے دور کے علماء کی ترقی کا سبب ہمارے دور کے علم کا تنزل ہے، وگرنہ تو متقدمین اور متاخرین کے علم و عمل، حلم و فضل، اور تحقیق و تدقیق میں کوئی مناسبت ہی نہیں۔ آنحضرت ﷺ کے دور سے دوری کا تقاضا بھی یہی ہے جیسا کہ کسی نورانی جگہ سے جوں جوں دور ہوتے چلے جائیں، تو اندھیرا بڑھتا چلا جاتا ہے۔
اس کی تائید بخاری شریف میں مروی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث سے بھی ہوتی ہے: **"لا یأتی علی أمتی زمان الا الذی بعده شر منه"**۔ طبرانی ''کبیر'' میں ابو الدرداء سے مرفوعاً نقل کرے ہیں: **"ما من عام الا وینتقص الخیر فیه ویزید الشر"**۔ طبرانی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں: **"ما من عام الا ویحدث الناس بدعة ویمیتون سنة حتی تمات السنن وتحیا البدع"**۔ اور یہ جو بھی کچھ ہے ان ہی حضرات کی برکات ہیں۔ چنانچہ ہم پر واجب ہے کہ ہم قیامت کی صبح تک ان متقدمین کے فضل و شرف کے معترف رہیں۔
تخریج واسنادی حیثیت: اس روایت کو امام طبرانیؒ نے ''اوسط'' میں نقل کیا ہے۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے اور سارے کے سارے رجال ثقات ہیں۔ اسی طرح امام حاکمؒ نے بھی اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

حفاظتِ دین

۲۴۸: **وَعَنْ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ الْعُذْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَتَاْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ** (رواه البیهقی وسنذکر حدیث جابر) **فَاِنَّمَا شِفَاءُ الْعَيِّ السُّؤَالُ فِيْ بَابِ التَّيَمُّمِ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ تعالٰی۔**

أخرجه البیهقی فی المدخل الی السنن والأخری۔

ترجمہ: حضرت ابراہیم بن عبد الرحمٰن عذری سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر آئندہ آنے والی جماعت میں سے نیک ثقہ اور با اعتماد لوگ اس علم کو قرآن وسنت سے حاصل کریں گے اور وہ لوگ اس علم کے ذریعہ قرآن کریم کی آیات اور احادیث میں تحریف کرنے والوں کی تحریف کو اور اہل باطل کے جھوٹ اور افتراء کو اور جاہلوں کی تاویلات کو ختم کر دیں گے اس حدیث کو امام بیہقیؒ نے اپنی کتاب مدخل میں بقیہ بن ولید سے نقل کیا ہے اور انہوں نے معان بن رفاعہ سے نقل کیا ہے اور انہوں نے ابراہیم بن عبد الرحمٰن عذری سے نقل کیا ہے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت جس کی ابتداء انما شفاء العی السوال ہے۔ اس کو ہم باب التیمم میں ان شاء اللہ ذکر کریں گے یہاں اصل نسخے میں رواہ البیہقی سے العذری تک بیاض ہے۔

راوئ حدیث:

قوله: ابراهیم بن عبد الرحمن العذری:

''العذری'' عین کے ضمہ اور ذال معجمہ کے ساتھ، قبیلہ خزاعہ کے جدامجد عذرہ بن سعد کی طرف منسوب ہیں۔ (کذا فی فی جامع الاصول) مؤلفؒ نے ان کا ذکر نہ صحابہ میں کیا ہے اور نہ تابعین میں۔

قوله: يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله:

هذا العلم: اسم اشارہ برائے تعظیم ہے۔ علم سے مراد کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ مراد ہے۔ یعنی نیک لوگ اس علم کو اُٹھائیں گے یعنی کتاب وسنت کا علم حاصل کر کے اسے یاد رکھیں گے۔ ابن حجرؒ نے فقہ کو بھی داخل کیا ہے۔ لیکن یہ دو وجہ سے صحیح نہیں، چونکہ اوّلاً تو فقہ خود ان ہی دو علوم سے مأخوذ ہے، ثانیاً اس وجہ سے کہ ''فقہ'' ایک اصطلاح حادث ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد تک اس اصطلاح کا وجود ہی نہ تھا۔

''عدول'' بمعنی ثقہ قابل اعتبار۔

''خلف'': لام کے فتحہ کے ساتھ، السلف جماعة الماضية۔ (گزری ہوئی جماعت) لام کے فتحہ کے ساتھ اِس رجل صالح کو بھی کہتے ہیں جو کسی کے بعد آئے اور اس کا قائم مقام ہو جائے۔ ''خلف'' لام کے فتحہ کے ساتھ، یہ لفظ واحد، تثنیہ، جمع تینوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

قوله: ينفون عنه تحريف الغالين...... :

ينفون عنه: جملہ حالیہ ہے۔ أی: نافين عنه یا جملہ مستانفہ ہے۔ گویا کہ یہاں سوال مقدر ہے: لم خصّ هؤلاء بهذه المنقبة العلية؟ فأجيب: ينفون عنه تحريف الغالين' وانتحال المبطلين، وتأويل الجاهلين۔

''الغالين'' غلو سے مشتق ہے۔ غلو يغلو۔ حدود سے تجاوز کرنا۔

''الانتحال'': ادعاء قول أوشعر، ويكون قائله غيره بانتسابه الى نفسه قيل: هو كناية عن الكذب، وقال الطيبی فی النهاية: الانتحال من النحلة وهی التشبه بالباطل، وقال الراغب: الانتحال ادعاء الشئی بالباطل، وقيل لعل الأول أنسب لمعنى الحديث۔ اھ۔ امام راغب فرماتے ہیں: ادعاء قول اوشعر، ويكون قائله غيره بانتسابه الى نفسه قيل، هو كناية عن الكذب۔

خلاصۃ الآراء:

① انتحال، نحلہ سے مشتق ہے۔ نحلة کے معنٰی ہیں التشبه بالباطل۔

② انتحال کے مختلف معانی ہیں: ① جھوٹ سے کنایہ ہے۔ ② باطل سے تشبیہ اختیار کرنا۔ ③ کسی شئی کے بارے میں باطل دعوی کرنا۔

امورِ نحویہ: من كل: ''من'' تبعیضیہ يحمل کا فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، اور عدولہ ''بدل'' ہے۔ یا ''من'' بیانیہ ہے اور اسلوب کے اعتبار سے اس جملہ کی طرح ہے: يلقنی منك أحد۔ اور کلام میں صنعت تجرید ہے۔ جیسا کہ یہ ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿ولتكن منكم أمة يدعون الى الخير﴾ ہر تقدیر پر اس میں تجم ہے۔

یہ حدیث باب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اِس فرمان کے ہم معنی ہے: "لا یزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق لا یصرهم منخالفهم حتی یأتیهم أمر الله وهم ظاهرون"۔
اس روایت کو بخاری و مسلم نے حضرت مغیرہ سے نقل کیا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ روایت معناً متواتر ہے۔

قوله: رواه البيهقي:

عرض مرتب: مرقات کے فوقانی متن میں رواه البیهقی ہے۔ اور تحتانی متن میں رواہ کے بعد بیاض ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: والحق البيهقي في المدخل۔ مدخل: میم کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں فی کتاب المدخل من حديث بقية بن الوليد، عن معان بضم الميم ابن رفاعة بكسر الراء، عن ابراهيم بن عبد الرحمن العذری ہے۔

سیدؒ فرماتے ہیں: رواه البيهقي في كتاب المدخل الى السنن في باب تبيين حال من وجد منه ما يوجب ردّ خبره من طريق بقية بن الوليد، عن معاذ بن رفاعة، عن ابراهيم بن عبد الرحمٰن العذري، عن النبي ﷺ يرث هذا العلم من كل خلف عدوله، وذكره ثم قال: تابعه اسماعيل بن عياش عن معاذ۔ ورواه الوليد بن مسلم، عن ابراهيم بن عبد الرحمٰن عن الثقة من اشياخهم، عن النبي ﷺ، وروى ايضا من اوجه أخر ضعيفة۔ ومعان: بالنون دمشقي قال ابو حاتم وغيره لا يحتج به كذا في التحريج۔

قوله: وسنذكر حديث جابر:

حدیثِ جابر کو باب التیمم میں اس وجہ سے ذکر کیا ہے کہ وہ اُس باب سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ بہر حال یہ اعتذار بھی ہے اور اعتراض بھی۔ اور "ان شاء الله تعالٰی" کا تعلق "سنذكر" کے ساتھ ہے۔

الفصل الثالث:

طالب علم کی فضیلت

۲۴۹: وَعَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلًا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الْإِسْلَامَ فَبَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّيْنَ دَرَجَةٌ وَّاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ۔ (رواه الدارمی)

أخرجه الدارمي في السنن ۱/۱۱۲ حديث رقم ۳۵۴۔

ترجمہ: حضرت حسن بصریؒ سے بطریق مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جس آدمی کی موت اس حال میں آئے کہ وہ علم حاصل کر رہا ہو اور علم حاصل کرنے کی غرض یہ ہو کہ وہ اس کے ذریعہ سے اسلام کو رائج کرے گا۔ تو جنت میں اس کے اور انبیاء علیہم السلام کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا۔ اس سے مراد نبوت اور رسالت کا درجہ ہے۔ اس حدیث کو امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

الحسن البصری۔ یہ حسن بصری ''ابوالحسن'' کے بیٹے ہیں۔ ان کی کنیت ''ابوسعید'' ہے۔ (سعید بن ابی حسن کے بھائی ہیں۔ جو مشہور راوی حدیث ہیں)۔ زید بن ثابت انصاری کے آزاد کردہ ہیں۔ ان کے والد کا نام ''یسار'' ہے۔ یہ قبیلہ بنی سبئی عیسان سے ہیں۔ ''یسار'' کو ربیع بنت نصر نے آزاد کیا تھا یہ حسن جب کہ خلافت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دو سال باقی تھے مدینہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ سے ان کی ''تحنیک'' کی۔ ان کی والدہ امّ المؤمنین حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت کرتی تھیں۔ بسا اوقات ان کی والدہ کہیں چلی جاتی تھیں تو ان حسن بصری کے بہلانے کے لئے امّ المؤمنین امّ سلمہ اپنی چھاتی ان کو دے دیتی تھیں۔ ان کی چھاتی میں دودھ بھر آتا تھا اور یہ حسن بصری اس کو پی لیا کرتے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ جس علم و حکمت پر حضرت حسن بصری پہنچے یہ اسی کا طفیل ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد بصرہ چلے آئے۔ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دیکھا اور کہا گیا ہے کہ یہ حضرت علی سے بھی مدینہ میں ملے ہیں۔ لیکن بصرہ میں ان کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات کرنا صحیح طور پر ثابت نہیں ہے اس لئے کہ حضرت حسن بصری جس وقت بصرہ کو جا رہے تھے۔ تو وادی قریٰ میں ہی تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت بصرہ میں تشریف لا چکے تھے۔ انہوں نے ابوموسیٰ اشعری، انس بن مالک، ابن عباس رضی اللہ عنہم اور ان کے علاوہ بھی دوسرے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے اور ان سے بھی ایک بڑی جماعت تابعین اور تبع تابعین نے روایت کی ہیں۔ وہ اپنے زمانہ میں علم و فن زہد و تقویٰ، عبادت و ورع کے امام تھے۔ رجب ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔

فائدہ: علم حدیث میں جب مطلقاً حسن بولا جائے تو بصری مراد ہوتے ہیں۔

تشریح: قوله: من جاء ه الموت وهو يطلب العلم:

''وهو يطلب العلم'' یہ جملہ اسمیہ جاء ہ کی ضمیر مفعول سے حال ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کی موت اس حال میں آئی کہ وہ علم حاصل کر رہا تھا اور اس کی غرض علم حاصل کر لینے کے بعد اللہ کے دین اور اس کی مخلوق کی خدمت تھی کہ وہ اپنے علم کو رواج دے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق جنت میں وہ انبیاء کے بالکل قریب ہوگا اتنا قریب کہ انبیاء اور اس کے درمیان صرف ایک درجہ قائم ہوگا اور وہ درجہ نبوت و رسالت کا درجہ ہے۔

ماقبل میں یہ بات گزر چکی ہے کہ انبیاء کرام کے وارث صرف وہی علماء ہیں جو زاہد ہیں۔ جو داعی الی الحق ہیں، یہی لوگ اسلام کی نشاۃ کریں گے۔ (کذا قال الطیبی)

عالم کو عابد پر فضیلت ہے

۲۵۰: وَعَنْهُ مُرْسَلاً قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ رَجُلَيْنِ كَانَا فِيْ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ اَحَدُ هُمَا كَانَ عَالِمًا يُصَلِّى الْمَكْتُوْبَةَ ثُمَّ يَجْلِسُ فَيُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَيْرَ وَالْاٰخَرُ يَصُوْمُ النَّهَارَ وَيَقُوْمُ

اللَّيْلَ اَيُّهُمَا اَفْضَلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضْلُ هٰذَا الْعَالِمِ الَّذِىْ يُصَلِّى الْمَكْتُوْبَةَ ثُمَّ يَجْلِسُ فَيُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَيْرَ عَلَى الْعَابِدِ الَّذِىْ يَصُوْمُ النَّهَارَ وَيَقُوْمُ اللَّيْلَ كَفَضْلِىْ عَلٰى اَدْنَاكُمْ۔ (رواه الدارمی)

أخرجه الدارمی فی السنن ۱/ ۱۰۹ حدیث رقم ۳۴۰۔

ترجمہ: حضرت حسن بصریؒ سے بطریق مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے بنی اسرائیل کے دو آدمیوں کے متعلق سوال کیا گیا۔ ان میں سے ایک تو عالم تھا۔ جو فرض نماز پڑھتا تھا۔ اور پھر بیٹھ کر لوگوں کو علم کی تعلیم دیتا تھا اور دوسرا آدمی وہ تھا جو دن کو روزہ رکھتا تھا اور رات کو اللہ کی عبادت کے لئے قیام کرتا تھا۔ چنانچہ ان کے بارے میں آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ ان دونوں میں سے کون افضل ہے رسول اللہ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا۔ اس عالم کو کہ جو فرض نماز پڑھتا ہے اور پھر بیٹھ کر لوگوں کو علم کی تعلیم دیتا ہے۔ اس عابد پر جو دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات میں عبادت کرتا ہے ایسی فضیلت حاصل ہے جیسے کہ مجھے تمہارے ادنیٰ آدمی پر فضیلت حاصل ہے اس حدیث کو امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: سائل کے جواب میں الاول یا العالم نہیں فرمایا، بلکہ ''اطناب'' کا اسلوب اختیار فرمایا، دو وجہ سے:

① عالم کی تعظیم شان کے پیشِ نظر۔ ② ذہن سامع میں تقریر کیلئے۔

قوله: كفضلى على ادناكم:

یعنی جیسی مجھے تم میں سے ہر ایک ادنیٰ آدمی پر فضیلت حاصل ہے۔ چونکہ میں عالم بھی ہوں اور معلّم بھی ہوں، اور تم میں سے ادنیٰ شخص فقط عابد ہوگا، عالم نہیں ہوگا۔

عرض مرتب: اس حدیث میں بھی عالم اور عابد کا بعینہ وہی مفہوم معتبر ہے جو ماقبل میں حدیث: ۲۱۲ کے تحت گزرا ہے، اور **يعلم الناس الخير** کا وہی مفہوم ہے جو حدیث: ۲۱۳ میں '' **معلم الناس الخير** '' کے تحت گزرا ہے۔

عالم کو لوگوں سے مستغنی رہنا چاہیے

۲۵۱: وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نِعْمَ الرَّجُلُ الْفَقِيْهُ فِى الدِّيْنِ اِنِ احْتِيْجَ اِلَيْهِ نَفَعَ وَاِنِ اسْتُغْنِىَ عَنْهُ اَغْنٰى نَفْسَهٗ۔ (رواه رزین)

أخرجه رزین وفی اسناده مقال۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ آدمی اچھا ہے جو دین کی سمجھ رکھتا ہو۔ اگر اس کی طرف لوگوں کو ضرورت پڑے تو نفع پہنچائے اور اگر اس سے استغناء اختیار کیا جائے۔ تو وہ اپنے آپ کو لوگوں سے بے نیاز رکھے۔ اس حدیث کو رزین نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: نعم الرجل الفقيه فى الدين: ''الرجل'' میں ''ال'' ''کمالیہ'' ہے، أى: الكامل فى الرجولية۔

"الفقیہ" مخصوص بالمدح ہے، جار مجرور اس کے متعلق ہے۔مرتب عرض کرتا ہے کہ "فقیہ" کی تعریف ماقبل میں گزر چکی ہے۔

قوله: ان احتیج الیه نفع :

نون کو مکسور و مضموں دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔یہ جملہ شرطیہ مستانفہ ہے۔ الیه: یہاں مضاف محذوف ہے أی: الی فقهه۔

قوله: وان استغنی عنه أغنی نفسه: فعل مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: نفع کے مقابلے میں أغنی نفسه ارشاد فرمایا، یہ تعمیم کے فائدہ کا بیان ہے، بایں طور کہ اگر لوگ اس کے پاس اپنا کوئی مسئلہ لائیں گے، تو وہ انہیں نفع پہنچائے گا۔اور اگر لوگ اس سے اعراض کرتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو نفع پہنچائے گا، مثلاً قیام اللیل کرے گا، کتاب اللہ کی تلاوت میں مشغول ہوگا، وغیرہ۔

زیادہ وعظ نہ کرو

۲۵۲ : وَعَنْ عِكْرِمَةَ اَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ قَالَ حَدِّثِ النَّاسَ كُلَّ جُمُعَةٍ مَرَّةً فَاِنْ اَبَيْتَ فَمَرَّتَيْنِ فَاِنْ اَكْثَرْتَ فَثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَلَا تُمِلَّ النَّاسَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَلَا اُلْفِيَنَّكَ تَاْتِي الْقَوْمَ وَهُمْ فِيْ حَدِيْثٍ مِّنْ حَدِيْثِهِمْ فَتَقُصُّ عَلَيْهِمْ فَتَقْطَعُ عَلَيْهِمْ حَدِيْثَهُمْ فَتُمِلُّهُمْ وَلٰكِنْ اَنْصِتْ فَاِذَا اَمَرُوْكَ فَحَدِّثْهُمْ وَهُمْ يَشْتَهُوْنَهٗ وَانْظُرِ السَّجْعَ مِنَ الدُّعَاءِ فَاجْتَنِبْهُ فَاِنِّيْ عَهِدْتُّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابَهٗ لَا يَفْعَلُوْنَ ذٰلِكَ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاری : ۱۱/۱۳۸ حدیث رقم ۶۳۳۷۔ وأخرجه أحمد فی المسند ۶/۲۱۷ عن عائشة رضی اللّٰہ عنها۔

ترجمہ: حضرت عکرمہؒ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت عکرمہؒ سے فرمایا تم ہر جمعہ کو ایک مرتبہ لوگوں کے سامنے وعظ و نصیحت کی بات بیان کیا کرو اور اگر تمہیں اس سے انکار ہو۔یعنی ہفتہ میں ایک مرتبہ وعظ کو کافی نہ سمجھو تو ہفتہ میں دو یا تین مرتبہ وعظ کر دیا کرو اور تم قرآن سے لوگوں کو تنگ نہ کیا کرو۔یعنی ہفتہ میں دو یا تین بار سے زیادہ وعظ کر کے لوگوں کو تنگ مت کرو اور میں تمہیں اس حال میں نہ پاؤں کہ تم کسی قوم کے پاس جاؤ اور وہ لوگ اپنی باتوں میں مصروف ہوں اور تم ان کی گفتگو میں مخل ہو کر ان کے سامنے وعظ و نصیحت شروع کر دو۔اس طرح تم ان کو پریشان اور تنگ کر دو ایسے موقع پر مناسب ہے کہ تم خاموش رہو ہاں البتہ اگر وہ تم سے وعظ و نصیحت کی فرمائش اور مطالبہ کریں اور جب تک ان کی تمنا ہو تو تم ان کے سامنے وعظ و نصیحت کی باتیں بیان کرو اور تم اپنی دعا میں قافیہ بندی سے اجتناب کرو۔چنانچہ میں نے معلوم کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ایسا نہیں کرتے تھے اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔

راوی حدیث:

عکرمۃ۔عکرمہ "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما" کے آزاد کردہ ہیں۔"ابوعبداللہ" کنیت ہے۔اصل میں "بربری" ہیں۔مکہ کے فقہاء اور جلیل القدر تابعین میں سے ہیں۔ابن عباس اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے حدیث کی سماعت فرمائی۔ایک بڑی جماعت نے

ان سے روایت کی۔ ۱۰۷ھ میں بعمر اسّی (۸۰) سال انتقال فرمایا۔ سعید بن جبیر سے لوگوں نے پوچھا تم سے بڑا عالم کوئی اور ہے ؟ تو انہوں نے فرمایا: عکرمہ۔

تشریح: قوله: ولا تمل الناس هذا القرآن:

"ولا تمل" باب افعال سے نہی کا صیغہ ہے، لام پر فتحہ اور کسرہ دونوں درست ہیں۔ یہ فعل مجرد سے بواسطہ حرف جر اور بلاواسطہ ہر دو طرح مستعمل ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں: مللته و مللت منه، میں اس سے اُکتا گیا، دِل اُچاٹ ہوگیا۔

قوله: فلا ألفينك تأتي القوم ......لكن انصت :

"فلا ألفينك" باب افعال سے متکلم کا صیغہ ہے۔ یہ جملہ "لا أرينك" کی قبیل سے ہے۔ **تأتي القوم**: مفعول سے حال ہے۔ اور ظاہر یہ ہے "القوم" سے حال ہے۔

"وهم في حديث من حديثهم" امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ جملہ "تأتی" کی ضمیر مرفوع سے حال ہے اور ظاہر یہ ہے کہ "القوم" سے حال ہے۔ **أى والحال انهم مشغولون عنك۔**

فتقص عليهم اور **فتقطع عليه حديثهم** ان دونوں جملوں کا عطف "تأتي" پر ہو رہا ہے، اور ظاہر بھی یہی ہے۔ لیکن اکثر نسخوں میں یہ دونوں فعل منصوب ہیں، اس صورت میں یہ "جواب نہی" ہونے کی وجہ سے منصوب ہوں گے۔ "**فتملهم**": یہ تمام نسخوں میں "جواب نہی" ہونے کی وجہ سے منصوب ہی ہے۔

قوله: فاذا امروك فحدثهم وهم يشتهونه: یہ جملہ "حال مقیدہ" ہے۔

قوله: وانظر السجع من الدعاء فاجتنبه:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث میں سجع کی ممانعت وارد ہوئی ہے، حالانکہ اکثر و بیشتر اُدعیہ ماثورہ سجع کے ساتھ وارد ہوئی ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر سجع مذموم نہیں، بلکہ وہ سجع مذموم ہے، جو بتکلف ہو، جیسا کہ کاہنوں کے کلام میں وارد ہے اور فصیح کلام میں اگر سجع بغیر تکلّف کے آجائے تو وہ مذموم نہیں، چنانچہ قرآنِ کریم کے بہت سے فواصل آیت سجع ہیں۔

زیرِ نظر حدیث کا مطلب بھی یہی ہے کہ دعا میں بتکلف سجع بندی سے بچو، چونکہ دُعائیں اس قسم کا سجع خشوع و خضوع اور عاجزی کے منافی ہے۔ کاہنوں کے مسجع کلام کے مذموم ہونے کی دلیل یہ حدیث ہے: **أسجع كسجع الكهان۔** حضور ﷺ نے یہ کلام اس وقت ارشاد فرمایا تھا کہ جب ایک کاہن نے یہ مسجع کلام کہا تھا: **آدي لمن لاشرب ولا أكل ولا نطق ولا استهل۔**

قوله: فاني عهدت رسول الله ﷺ واصحابه لايفعلون ذلك :

ابہریؒ فرماتے ہیں: بخاری میں **لا يفعلون الا ذلك** کے الفاظ ہیں، یعنی "الا" کی زیادتی کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں **ذلك** کا مشارٌ الیہ "**ترك السجع**" مانا جائے گا۔

اسماعیلی کے نسخہ میں **عن القاسم بن زكريا، عن يحي بن محمد شيخ البخاري بسنده: لا يفعلون ذلك**

کے الفاظ ہیں، یعنی الاّ کے بغیر، یہ الفاظ واضح ہیں۔ (كذا أخرجه البزار و الطبراني)

طالب علم کو اجر ملے گا

۲۵۳ : وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ فَاَدْرَكَهُ كَانَ لَهُ كِفْلَانِ مِنَ الْاَجْرِ فَاِنْ لَمْ يُدْرِكْهُ كَانَ لَهُ كِفْلٌ مِّنَ الْاَجْرِ ۔ (رواه الدارمي)

أخرجه الدارمي في سننه ۱/ ۱۰۸ حديث رقم ۳۳۵۔

ترجمہ: حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو انسان علم کا طالب ہو اور اس کو علم حاصل بھی ہو جائے تو اس کو ڈبل ثواب ملے گا اور اگر اس کو علم حاصل نہ ہو تو اس کو ایک حصہ اجر ملے گا اس حدیث کو امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

واثلة بن الاسقع۔ یہ واثلہ ''اسقع'' کے بیٹے ہیں اور خاندانی اعتبار سے لیثی ہیں۔ یہ اس وقت مسلمان ہوئے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک کے لئے سامان تیار کر رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تین سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی۔ یہ اصحاب صفہ میں سے ہیں۔ پہلے بصرہ میں ٹھہرے پھر شام میں سکونت اختیار کی۔ ان کا مکان دمشق سے نو ۹ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ''بلاطہ'' میں تھا۔ پھر بیت المقدس منتقل ہو گئے اور وہیں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر سو (۱۰۰) سال تھی۔ ان سے ایک گروہ نے حدیث نقل کی ہے۔

''اسقع'' میں ہمزہ پر زبر سین مہملہ ساکن' قاف پر زبر اور آخر میں عین ہے۔

تشریح: دو ثواب اس کو اس طرح ملیں گے کہ ایک ثواب علم حاصل کرنے کا اور اس راستہ میں محنت و مشقت اٹھانے کا جو اس نے اس سلسلہ میں اٹھائی اور دوسرا اجر علم حاصل ہو جانے کا اور دوسروں کو علم سکھانے کا اور سیکھے ہوئے علم کے مطابق عمل کرنے کا حاصل ہو گا ہاں وہ شخص جس نے علم حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن کسی کمزوری کے باعث وہ اس کو سیکھ نہ سکا لیکن اس کے باوجود محنت و مشقت اس کو اٹھانا پڑی اس لئے اس کو ایک اجر ضرور ملے گا گویا اس کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی اگر علم حاصل ہو گیا تو نور علی نور اور اگر علم حاصل نہ ہو سکا تو پھر بھی وہ سعادت مند ٹھہرا۔ گویا کہ فائز طالب علم مجتہد مصیب کی طرح ہے۔ اور تکمیل کو نہ پہنچنے والا طالب علم مجتہد مخطی کی طرح ہے۔ چنانچہ ایک حدیث صحیح میں آتا ہے: "اذا اجتهد المجتهد فأصاب فله أجران، وان أخطا فله أجر واحد"۔

صدقہ جاریہ کے کام

۲۵۴ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِمَّا يَلْحَقُ الْمُؤْمِنَ مِنْ عَمَلِهٖ

وَحَسَنَاتِهٖ بَعْدَ مَوْتِهٖ عِلْمًا عَلِمَهٗ وَنَشَرَهٗ وَوَلَدًا صَالِحًا تَرَكَهٗ اَوْمُصْحَفًا وَرَّثَهٗ اَوْمَسْجِدًا بَنَاهُ اَوْبَيْتًا لِابْنِ السَّبِيْلِ بَنَاهُ اَوْنَهْرًا اَجْرَاهُ اَوْصَدَقَةً اَخْرَجَهَا مِنْ مَالِهٖ فِيْ صِحَّتِهٖ وَحَيَاتِهٖ تَلْحَقُهٗ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهٖ

. (رواه ابن ماجة والبيهقي في شعب الايمان)

أخرجه ابن ماجة في السنن ۸۸/۱حديث رقم ۲٤۲ ـأخرجه البيهقي في شعب الايمان ۲٤۷/۳حديث رقم ۳٤٤۸ـ

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مؤمن کو اس کے جس عمل یا جن نیکیوں کا ثواب مرنے کے بعد ملتا ہے۔اس میں سے ایک تو علم ہے جس کو اس نے سیکھا اور اس کی اشاعت کی اور نیک اولاد ہے جس کو اپنے مرنے کے بعد چھوڑا اور قرآن مجید ہے جس کو وارثوں کے لئے چھوڑا اور مسجد ہے جس کو اپنی زندگی میں بنایا ہو اور مسافر خانہ ہے جس کو اس نے بنایا ہو اور پانی کی نہر جس کو اس نے جاری کیا ہو اور وہ صدقہ ہے جس کو اس نے اپنی زندگی میں نکالا ہو اپنے مال سے صحت اور تندرستی کی حالت میں ان تمام امور کا ثواب مرنے کے بعد ملتا ہے۔اس حدیث کو ابن ماجہؒ نے اور امام ترمذیؒ نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان مما يلحق المؤمن:

"مما" جار مجرور محذوف سے مل کر 'ان' کی خبر مقدم ہے، أی: كائن مما يحلق ـ "علما": "ان": کا اسم مؤخر ہے۔ "من" کا تبعیضیہ ہونا درست نہیں چونکہ اس حصر کے منافی ہے:" ينقطع عمله الا من ثلث" ـ" من عمله": یہ ما کا بیان ہے۔

"وحسنانه": یہ عطف تفسیری ہے۔ بعد موته: "یلحق" کا ظرف ہے۔

قوله: علماعلمه ونشره:

"علمه" بعض نسخوں میں مجرد ہے اور بعض میں مزید فیہ سے ہے۔"نشره" عمله کے مقابلہ میں اُعم ہے، چونکہ نشر تالیف اور وقف کتب کو بھی شامل ہے۔

قوله: وولدا صالحاتركه: تركه کی قید سے "فرط" سے احتراز ہوگیا۔

قوله: أو مصحفا ورثه: " مصحف": میم مثلث الحرکات ہے، ضمہ مشہور ہے۔

کتب علوم شرعیہ کا بھی یہی حکم ہے، میّت کو ذریعہ وسبب بننے کا ثواب ملے گا۔

قوله: أو مسجدا بناه: مدارسِ دینیہ کا قیام اور صلحاء کیلئے قیام گاہ یا مسافر خانہ بھی اسی حکم میں ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں "اَوْ" کے ساتھ شروع ہونے والے صدقہ جاریہ کی اقسام کا بیان ہیں، اور یہ "اَوْ" برائے تنویع اور تفصیل ہے۔

قوله: اونهرا اجراه: ہاء کے فتحہ، نیز سکون کے ساتھ۔

قوله: أو صدقة أخرجها من ماله في صحته وحياته......:

یہ صورت بھی صدقہ جاریہ میں داخل ہے۔اور اس بات کا قرینہ اگلا جملہ ہے۔ في صحته پر حياته کا عطف کرنا ایک

اور حدیث کی طرف اشارہ کرتا ہے، کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا گیا: أی الصدقة أعظم أجرا، تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: أن تصدق وأنت صحیح تخشی الفقر وتأمل الغنی، (الحدیث)۔اھ۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ اشارہ تو لفظ و صحته ہی سے مفہوم ہو رہا ہے نہ کہ عطف سے۔ الا یہ کہ یوں کہا جائے کہ یہ مفہوم صحت کو حیات پر مقدم کرنے کی وجہ سے مستفاد ہو رہا ہے اور حیاته میں مرض الموت کی صورت بھی شامل ہے۔ لہٰذا واؤ بمعنی ''او'' ہے اور اخرجه کا مطلب یہ ہے کہ نکالنے کی وصیت کی ہو۔

اور ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: ''سبع یجری للعبد أجرهن بعد موته وهو فی قبره، من علم علما' او أجری نهرا، أو حفر بئرا، أوغرس نخلا، او بنی مسجدا، اوترك ولدا یستغفر له من بعد موته، او ورث مصحفا''۔

دین کی جڑ پرہیزگاری ہے

۲۵۵ :وَعَنْ عَآئِشَةَ اَنَّهَا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اَوْحٰى اِلَيَّ اَنَّهٗ مَنْ سَلَكَ مَسْلَكًا فِیْ طَلَبِ الْعِلْمِ سَهَّلْتُ لَهٗ طَرِيْقَ الْجَنَّةِ وَمَنْ سَلَبْتُ كَرِيْمَتَيْهِ اَثَبْتُهٗ عَلَيْهِمَا الْجَنَّةَ وَفَضْلٌ فِیْ عِلْمٍ خَيْرٌ مِّنْ فَضْلٍ فِیْ عِبَادَةٍ وَمِلَاكُ الدِّيْنِ الْوَرَعُ ۔ (رواہ البیهقی فی شعب الایمان)

أخرجه البیهقی فی شعب الایمان ۵/۵۳ حدیث رقم ۵۷۵۱۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری طرف یہ وحی بھیجی ہے۔ یعنی وحی غیر متلو۔ کہ جو آدمی علم طلب کرنے کے لئے کوئی راستہ تلاش کرے۔ تو میں اس کے لئے جنت کے راستہ کو آسان کر دوں گا اور جس آدمی کی دو آنکھیں میں نے چھین لی ہوں۔ یعنی اس کو نابینا کر دیا ہو تو اس نعمت سے محرومی اور اس صبر و شکر کے صلہ میں اس کو جنت دوں گا اور علم کے اندر زیادتی عبادت کے اندر زیادتی سے بہتر ہے اور دین کی جڑ پرہیزگاری ہے اس حدیث کو امام بیہقیؒ نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله:سمعت رسول الله ﷺ یقول......الی :

''یقول'' جملہ حالیہ ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ ''سمع'' دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔

یہ وحی کیسے آئی؟ اس میں دو احتمال ہیں: ① براہِ راست آئی، جبرائیل وغیرہ کے واسطے کے بغیر آئی۔ ② بالواسطہ آئی، حضرت جبرائیل علیہ السلام کے واسطے سے آئی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے حدیثِ قدسی کو نقل بالمعنی کرنا جائز تھا۔

قوله:انه من سلك مسلكا فی طلب العلم سهلت له طریق الجنة: أنه: ضمیر شان ہے۔

جو طالب علم، علم شرعی کی تحصیل کیلئے اسبابِ علم میں سے کوئی سبب اختیار کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو معرفت اور عبادت کی توفیق عطا فرما کر جنت کا راستہ آسان فرما دیتے ہیں، اور پھر یہ راستہ جنت کے دروازوں سے ہوتے ہوئے اس کے مخصوص

قصور و محلات تک لے جاتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طرقِ علم کا ہر راستہ جنت کا راستہ ہے۔ جنت کے راستے بند ہیں، جنت میں جانے کیلئے علم کے دروازے ہیں، اِلا یہ کہ اخلاصِ نیت کے ساتھ کما حقہ اعمال بجالائے جائیں۔

قوله: ومن سلبت كريمتيه اثبته عليهما الجنة :

الجنة: مفعول ثانی ہے۔ امام طیبیؒ کا کہنا ہے کہ منصوب بنزع الخافض ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ان دونوں ترکیبوں میں تکلف ہے۔ حدیث کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضیلت غیر مادرزاد نابینا کیلئے ہے، چنانچہ یہ فضیلت مادرزاد اندھے کیلئے تو بطریق اولیٰ ہوگی۔

قوله: وفضل فی علم خير من فضل فی عبادة : امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ کہنا مناسب لگتا ہے کہ پہلے " فضل " میں تنوین تقلیل کیلئے ہے اور دوسرے " فضل " میں تنوین تکثیر کیلئے ہے۔

قوله: و ملاك الدين الورع: "ملاك" میم کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ، دونوں طرح پڑھا جاتا ہے، اس کا مطلب ہوتا ہے قوام الشئی ونظامه، وما يعتمد عليه فيه ۔ "ملاك الدين" بھی اسی سے ماخوذ ہے۔ (نہایہ)

"ورع": سے مراد محرمات و مشتبہات، اور اس طمع سے بچنا کہ جو عبادات میں شہرت وریاکاری کا باعث ہے۔ "ورع" اصل میں محارم و تحرج سے رکنے کو کہتے ہیں۔ پھر ورع کا استعمال استعارۃً مباح و حلال سے رُکنے کیلئے ہونے لگا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، شاید کہ اس سے مراد وہ مباح و حلال ہے جو مفضی الی شبہ ہو، وگرنہ تو بقدر ضرورت سے زیادہ ترک شبہات کو "ورع" نہیں بلکہ "زہد" کہتے ہیں۔ واللہ اعلم

رات کی ایک گھڑی تدریسی مشغلہ میں گزارنا پوری رات عبادت سے افضل

۲۵۶ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ تَدَارُسُ الْعِلْمِ سَاعَةً مِّنَ اللَّيْلِ خَيْرٌ مِّنْ اِحْيَائِهَا۔ (رواه الدارمی)

أخرجه الدارمی فی مقدمة سننه ۱/۱۵۷ حديث رقم ۱٤۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رات کی ایک گھڑی علم کا درس اور تدریس پوری رات عبادت کرنے سے بہتر ہے اس حدیث کو امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حصولِ مقصود کی خاطر رات کو تھوڑی دیر کی عملی مصروفیت (استاد کا طلبہ کو پڑھانا، سمجھانا، یاد کرانا، لکھوانا، مناقشہ کرنا' نیز طلبہ کا باہمی تکرار کرنا، مذاکرہ کرنا، یاد کرنا، کتاب کا پڑھنا لکھنا) تمام رات کو اپنی عبادت سے زندہ رکھنے سے بہتر ہے۔

ابن حجرؒ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے' ...... اس گھڑی کو نماز کے ذریعے زندہ کرنے سے بہتر ہے، حالانکہ نماز نفوس کی حیات ہے۔ ملا علی قاریؒ نے ابن حجرؒ کی اس تشریح کو "دُور از کار" قرار دیا ہے۔

علماء ذاکرین سے افضل ہیں

۲۵۷ : وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِمَجْلِسَيْنِ فِىْ مَسْجِدِهٖ

فَقَالَ كِلَاهُمَا عَلٰى خَيْرٍ وَاَحَدُهُمَا اَفْضَلُ مِنْ صَاحِبِهٖ اَمَّا هٰؤُلَآءِ فَيَدْعُوْنَ اللّٰهَ وَيَرْغَبُوْنَ اِلَيْهِ فَاِنْ شَآءَ اَعْطَاهُمْ وَاِنْ شَآءَ مَنَعَهُمْ وَاَمَّا هٰؤُلَآءِ فَيَتَعَلَّمُوْنَ الْفِقْهَ اَوِ الْعِلْمَ وَيُعَلِّمُوْنَ الْجَاهِلَ فَهُمْ اَفْضَلُ وَاِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ثُمَّ جَلَسَ فِيْهِمْ.

أخرجه الدارمی ١/١١١ حديث رقم ٣٤٩۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں منعقد دو مجلسوں کے پاس سے گزرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دونوں خیر اور بھلائی کے کام پر ہیں لیکن ان میں سے ایک نیکی اور خیر میں دوسری سے افضل اور بہتر ہے ایک جماعت عبادت اور دعا میں مصروف ہے اور اس سے اپنی رغبت کا اظہار کر رہی ہے۔ یعنی اپنے مقصد کے حصول کے لئے اللہ سے امید وابستہ کئے ہوئے ہے۔ اگر اللہ چاہے تو انہیں عطا کرے اور اگر چاہے تو عطا نہ کرے اور دوسری جماعت فقہ اور علم حاصل کر رہی ہے اور جاہلوں کو علم کی تعلیم دے رہی ہے اور یہ لوگ افضل ہیں اور میں بھی معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی ان میں بیٹھ گئے اس حدیث کو امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: كلاهما على خير:

یہ کلام مبالغہ پر محمول ہے۔ یا یہاں مضاف محذوف ہے: أي أهل كلا المجلسين على خير۔ محذوف سے مل کر کلاهما کی خبر ہے' أي: جالسان على الخير، أو ثابتان على خير۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ '' خير '' سے پہلے مضاف محذوف ہو أي: على عمل خير۔

قوله: أحدهما أفضل من صاحبه: یعنی ایک جماعت کا ثواب دوسری سے زیادہ ہے۔

قوله: أما هؤلاء فيدعون الله ......ان شاء منعهم :

پچھلے جملہ میں لفظ مجلس کا اعتبار کرتے ہوئے احدهما فرمایا، اور یہاں اصحاب مجلس کا اعتبار کرتے ہوئے هؤلاء فرمایا۔

'' فان شاء اعطاهم '': اس کا مفعول ثانی محذوف ہے' أي: ما عنده من الثواب۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ اگر چاہے تو انہیں وہ سب کچھ دیدے، جو وہ مانگ رہے ہیں، اس کی یہ عطا اس کا فضل ہے، اور اگر نہ دے تو (یہ کوئی ظلم کی بات نہیں بلکہ) عدل ہے۔

'' اعطاهم '': کو منعهم سے مقدم ارشاد فرمانا درحقیقت سبقت رحمتي على غضبي کی طرف اشارہ ہے۔ یہ حدیث معتزلہ پر ردّ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ثواب کا عطا کرنا اللہ پر لازم وواجب ہے۔

قوله: واما هؤلاء فيتعلمون الفقه او العلم ويعلمون الجاهل فهم أفضل:

راوی کو شک ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ''الفقه'' ارشاد فرمایا تھا یا العلم ارشاد فرمایا تھا۔

ان میں دو خوبیاں ہیں پہلی تو یہ کہ علم حاصل کر رہے ہیں، دوسری یہ کہ علم سے ناآشنا لوگوں کو تعلیم دے رہے ہیں، لہٰذا یہ دوہری عبادت میں مشغول ہیں، چنانچہ یہ افضل ٹھہرے۔

قوله: انما بعثت معلما ثم جلس فيهم۔

مجھے اللہ تعالیٰ نے معلم بنا کر بھیجا ہے، تاکہ میں لوگوں کو اللہ کی تعلیمات پہنچاؤں، لہٰذا میں اس مجلس میں بیٹھوں گا کہ جس میں میرا مقصد بعثت پورا ہوتا ہے، چنانچہ آپ ﷺ اہلِ علم کی مجلس میں جلوہ افروز ہوگئے چونکہ ان لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی تعلیم کی احتیاج تھی۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے بعثت معلما فرما کر اس کی طرف اشارہ فرمایا۔ واللہ اعلم۔

چالیس احادیث کا حافظ فقیہ ہے

۲۵۸ : وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مَاحَدُّ الَّذِیْ اِذَا بَلَغَہُ الرَّجُلُ کَانَ فَقِیْھًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ حَفِظَ عَلٰی اُمَّتِیْ اَرْبَعِیْنَ حَدِیْثًا فِیْ اَمْرِ دِیْنِھَا بَعَثَہُ اللّٰہُ فَقِیْھًا وَّکُنْتُ لَہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ شَافِعًا وَّشَھِیْدًا۔ (رواہ البیهقی فی شعب الایمان)

أخرجه البیهقی فی شعب الایمان ۲ / ۲۷۰ حدیث رقم ۱۷۲۶۔

ترجمہ: حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا۔ کہ اس علم کی مقدار کیا ہے کہ جس کو حاصل کرنے سے انسان فقیہ اور عالم ہو جائے اور عالم آخرت میں اس کا شمار علماء کی جماعت میں ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو انسان میری امت کو فائدہ پہنچانے کے لئے دین سے متعلق چالیس احادیث کو یاد کرلے۔ تو قیامت کے دن اس کو اللہ تعالیٰ فقیہ اٹھائے گا اور میں قیامت کے دن اس کی سفارش کروں گا اور اس کی اطاعت کی گواہی دوں گا۔

تشریح: **قوله: ما حد العلم...... کان فقیها:**

حد سے مراد یہاں مقدار ہے۔ امام طیبیؒ بحوالہ امام راغب فرماتے ہیں: **الحد ہو وصف الشئی المحیط بمعناہ التمییز عن غیرہ۔** اھ۔ یہ تعریف اس حدیث میں مراد نہیں ہوسکتی، چونکہ یہ اصطلاح بعد کی ہے۔

قوله: من حفظ علی أمتی...... امر دینها:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "حفظ" رقب کے معنی کو متضمن ہونے کی وجہ سے بواسطہ "علی" متعدی ہوا ہے۔ عرب کہتے ہیں: **احفظ علی عنان فرسی ولا تغفل عنی۔** ملاعلی قاریؒ نے **حفظ علی أمتی** کی وضاحت **شفقة علیهم او لأجل انتفاعهم** کے ساتھ کی ہے۔ (ممکن ہے کہ حفظ کی ضمیر مرفوع سے حال ہو ای: **من جمع أحادیث متفرقة مراقبا ایاها بحیث تبقی مسندة علی أمتی** اھ)۔ ملاعلی قاریؒ نے اس توجیہ کو "تکلفات" قرار دیا ہے، نیز متفرقہ کی قید کو بلا دلیل قرار دیا ہے۔

ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں؛ ۴۰ دینی مسائل بھی اسی حکم میں ہے، اور **فی امر دینها** کی قید سے وہ احادیث اخبار خارج ہوگئیں کہ جن کا تعلق دین کے ساتھ نہ اعتقاداً ہو، نہ علماً ہو، نہ عملاً ہو۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: یاد کرنے سے مراد یہ ہے کہ چالیس احادیث مسلمانوں تک نقل کردے، اگرچہ نہ یاد ہوں، اور نہ ان کا مطلب و مفہوم سمجھتا ہو۔ اس (حدیث) کے معنی کی حقیقت یہی ہے۔

ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں: 'مطلب و مفہوم نہ سمجھتا ہو' یہ قید محلِ نظر ہے، چونکہ یہ مفہوم اس حدیث سے میل نہیں کھاتا، چونکہ

یہاں علم کی وہ مقدار پوچھی جا رہی ہے کہ جس کی بنیاد پر آدمی کا شمار فقہاء میں ہو، مفہوم سمجھے بغیر صرف یاد کرنے کی صورت میں وہ آدمی حاملِ حدیث تو ہو جائے گا، لیکن فقیہ نہیں ہوگا، جیسا کہ ماقبل کی ایک حدیث میں گزر چکا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: سوال و جواب میں مطابق معنوی اعتبار سے بایں طور ہے کہ گویا آپ ﷺ نے جواب یوں ارشاد فرمایا: 'معرفة أربعين حديثاً بأسانيدها مع تعليمها الناس" اھ۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: اسانید کی معرفت شرط نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ کا یہ طرزِ جواب حکیمانہ اسلوب ہے، کہ فقہ کی اس حد کے بارے میں مت پوچھو، چونکہ وہ (خدا کا) عطیہ و بخشش ہے، تم فقیہ ہو، فقیہ وہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ علم کی نشر و اشاعت اور لوگوں کو تعلیم دینے کیلئے اُٹھا کھڑا کرے۔ اور پھر وہ شخص لوگوں کو اپنے علم و عمل کی تعلیم دے کہ جو انہیں دین اور دنیا دونوں میں نفع پہنچائے۔ اھ۔ ملا علی قاریؒ نے اس کو بھی **فيه ما فيه** قرار دیا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہ روایت بھی سنداً ضعیف ہے اگرچہ یہ روایت بہت سے طریقوں سے بیان کی گئی ہے لیکن ہر طریقہ بیان میں کچھ نہ کچھ کمزوری پائی جاتی ہے اگرچہ جو کچھ اس میں بیان ہوا ہے وہ بالکل حقیقت ہے۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اس روایت کے تمام طرق میں نے ایک (جز) رسالہ میں اکھٹے کئے ہیں، لیکن کوئی بھی طریق علتِ قادحہ سے خالی نہیں۔

ابن حجر مکیؒ فرماتے ہیں: اس وجہ سے امام نوویؒ کا کہنا ہے کہ اس حدیث کے ضعف پر حافظ نے اتفاق کیا ہے، اگرچہ اس کے طرق بہت زیادہ ہیں، اور دوسری طرف حفاظ کا اتفاق ہے کہ فضائل اعمال کے باب میں حدیث ضعیف پر عمل کرنا جائز ہے۔ اھ۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ فن حدیث کے جس قاعدہ کا ذکر ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ ضعف کا حکم ہر ہر طریق پر علیحدہ علیحدہ نظر کرتے ہوئے لگایا گیا ہے، البتہ مجموعہ طرق پر نظر ڈالی جائے تو یہ حدیث حسن لغیرہ ہے۔ لہٰذا یہ حدیث ضعیف نہیں بلکہ حسن ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: "وليس له اسناد صحيح" میں اسی طرف اشارہ ہے۔

عرض مرتب: اس حدیث کی اسنادی حیثیت پر کلام مرقات میں حدیث: ۲۶۰ کے تحت مذکور ہے۔ ہم نے اس کو مقدم ذکر کیا ہے وجہ تقدیم واضح ہے۔

سب سے بڑا سخی کون ہے؟

۲۵۹: وَعَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَنْ اَجْوَدُ جُوْدًا قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ اللّٰهُ اَجْوَدُ جُوْدًا ثُمَّ اَنَا اَجْوَدُ بَنِىْ اٰدَمَ اَجْوَدُهُمْ مِنْ بَعْدِىْ رَجُلٌ عَلِمَ عِلْمًا فَنَشَرَهٗ يَاْتِىْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَمِيْرًا وَّحْدَهٗ اَوْ قَالَ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ (رواه البيهقى فى شعب الايمان)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ۲/ ۲۸۱ حديث رقم ۱۷٦۷۔

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کیا تم لوگ جانتے ہو کہ سب سے بڑا سخی کون ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر

جانتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے بڑا سخی اللہ تعالیٰ ہے اور آدم کی اولاد میں سے بڑا سخی میں ہوں پھر لوگوں میں میرے بعد سب سے بڑا سخی وہ ہے جس نے خود علم سیکھا اور دوسری کو سکھایا۔ وہ انسان قیامت کے دن امیر یا فرمایا ایک جماعت کی طرح آئے گا۔

راویٔ حدیث:

حکیم بن معاویہ۔ یہ حکیم معاویہ قشیری اعرابی کے بیٹے ہیں۔ حدیث کی روایت میں اچھے سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے والد سے حدیث کو روایت کیا ہے اور ان سے ان کے بیٹے بہز اور جریری روایت کرتے ہیں صاحب ''اکمال'' لکھتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ ان کا صحابی ہونا محل نظر ہے اور ان سے ان کے بھتیجے معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ اور قتادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں مؤلف علیہ السلام نے ان کا نام الاکمال میں ذکر نہیں کیا ہے۔

تشریح: قوله: من اجود جودا؟: أجود' "جودة" سے ماخوذ ہے، أی: أحسن جودا۔ یا "جود" سے ماخوذ ہے، ای: جوده أجود، جیسا کہ عرب کہتے ہیں: نهاره صائم۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں: الجود بذل المقتنيات مالاً كان أو علماً۔ ملا علی قاریؒ نے أجود جوداً کی وضاحت "اكثر كرما" کے ساتھ کی ہے۔

قوله: الله تعالٰى أجود جودا: اسم تفضیل یہاں مبالغہ کیلئے ہے۔

قوله: ثم انا أجود بنی آدم: یہ علی الاطلاق ہے کہ تمام بنی آدم میں سب سے سخی حضور ﷺ ہیں، چنانچہ حدیث میں آتا ہے: أنا سيد ولد آدم ...... عن أبی سعید۔ اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ تمام ملائکہ وغیرہ سے بھی افضل ہیں، چونکہ جنس بشر جنس ملائکہ سے افضل ہے۔

قوله: اجودهم من بعدی رجل علم علما فنشره۔ واجودهم۔ تحتانی متن میں "واجوده" ہے۔ اس کے مطابق ضمیر مفرد جنس بنی آدم کی طرف راجع ہے۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ضمیر بنی آدم کی طرف عائد ہے۔ ''انسان'' کی تاویل میں ہو کر یا یہ ضمیر ''جود'' کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ابہریؒ فرماتے ہیں بعض نسخوں میں "اجودهم" یعنی فی زمانہ ہے۔ ''علم'' بالاتفاق تخفیف کے ساتھ ہے۔ ''علما'' کی تنوین تعظیم کے لئے ہے۔ ای علما عظيما نافعا في الدين۔

بعدیة یہ باعتبارِ رتبہ بھی مراد ہو سکتی ہے، اور باعتبار زمان بھی، پہلا احتمال زیادہ ظاہر ہے۔ علم کی نشر و اشاعت میں تدریس، تصنیف، علم کی ترغیب بھی شامل ہے۔ امام طیبیؒ کا کہنا ہے کہ کتب کا وقف کرنا، اور اہل لوگوں کو کتب عاریۃً دینا بھی اسی حکم میں شامل ہے۔

قوله: يأتي يوم القيامة أميرا وحده:

پہلا احتمال یہ ہے کہ عزت وعظمت میں یہ شخص ایک ایسی جماعت کی طرح ہوگا کہ جس میں امیر بھی ہو اور مأمور بھی ہو۔
دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ شخص ایک مستقل امیر کی حیثیت سے آئے گا جس کے ساتھ اس کے متبعین بھی ہوں گے۔

قوله: او قال: أمة واحدة:

"أو قال": راوی کو شک ہے کہ آنحضرت ﷺ کے الفاظ مبارکہ کیا تھے امیرا وحده کے الفاظ تھے یا أمة واحدة کے

الفاظ تھے۔ ممکن ہے کہ یہ شک حضرت علیؓ کو ہوا اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ شک حضرت انسؓ کے علاوہ کسی اور راوی کو ہو۔

یہ الفاظ درحقیقت اس آیتِ کریمہ کی نظیر ہیں: ﴿ان ابراھیم کان أمة﴾ یہاں فردِ واحد پر أمة کا اطلاق بایں طور کیا گیا ہے کہ اس فردِ واحد میں وہ تمام خصلتیں پائی جاتی ہیں۔ جو عام طور پر ایک فرد میں نہیں بلکہ ایک پوری جماعت میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے:

لیس من اللہ بمستنکر أن یجمع العالم فی واحد

مروی ہے کہ ایک موقع پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حضرت معاذؓ کے بارے میں فرمایا: **کان أمة قانتا للہ،** بعض لوگوں نے کہا' وہ تو ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے یہ سُن کر فرمایا: **الأمة الذی یعلم الخیر،** اس کی تائید دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت معاذؓ کی اس فضیلت کا سبب یہ ہے کہ وہ حرام حلال کا بہت زیادہ علم رکھنے والے تھے۔

دو حریصوں کا پیٹ نہیں بھرتا

۲۶۰: وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْهُوْمَانِ لَایَشْبَعَانِ مَنْهُوْمٌ فِی الْعِلْمِ لَا یَشْبَعُ مِنْهُ وَمَنْهُوْمٌ فِی الدُّنْیَا لَایَشْبَعُ مِنْهَا (رَوَی البیهقی الاحادیث الثلاثة فی شعب الایمان وقال قال الامام احمد فی حدیث ابی الدردآء) هٰذا مَتْنٌ مَشْهُوْرٌ فِیْمَا بَیْنَ النَّاسِ وَلَیْسَ لَهٗ اِسْنَادٌ صَحِیْحٌ۔

أخرجه البیهقی فی شعب الایمان ۷/۲۷۱ حدیث رقم ۱۰۲۷۹۔ والدارمی نحوه ۱/۱۰۸ حدیث رقم ۳۳۴ أخرجه عن ابن عباس۔

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دو حریص ایسے ہیں جن کا پیٹ نہیں بھرتا ایک علم کا حریص کہ وہ علم سے کبھی سیر نہیں ہوتا اور دوسرا دنیا کا حریص کہ اس کا پیٹ دنیا سے کبھی سیر نہیں ہوتا۔ مذکورہ تینوں حدیثوں کو امام بیہقیؒ نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ امام احمدؒ نے امام ابوداؤدؒ کی حدیث کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس کا متن لوگوں میں مشہور ہے۔ مگر اس کی سند صحیح نہیں۔

اسنادی حیثیت: امام احمدؒ نے ابودرداء کی حدیث کے متعلق بیان کیا ہے کہ اس کا متن لوگوں میں بہت مشہور ہے مگر اس کی اسناد صحیح نہیں۔

قوله: منهو مان لا یشبعان...... لایشبع منها: "منهوم" نهمة سے مشتق ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ دو حریص ایسے ہیں جو کبھی بھی قناعت نہیں کرتے۔ ایک وہ لوگ ہیں، جو علم کے حریص ہیں، چونکہ یہ لوگ: ﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا﴾ [طه: ۱۱٤] "اور دعا کرو کہ میرا پروردگار مجھے اور زیادہ علم دے" کے بموجب ہمیشہ زیادت علم کی طلب میں لگے رہتے ہیں، اور علم کی کوئی انتہاء نہیں ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَفَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ

عَلِيمٌ﴾ [یوسف: ۷٦] ''اور ہر علم والے سے دوسرا علم والا بڑھ کر ہے''۔

اور دوسرا دنیادار ہے جو دنیا کی حرص رکھتا ہے، اور اس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا، جیسا کہ استسقاء کا مریض ہوتا ہے۔

علم اور دُنیا کے حریص برابر نہیں

۲٦۱: وَعَنْ عَوْنٍ قَالَ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ مَنْهُوْمَانِ لَا يَشْبَعَانِ صَاحِبُ الْعِلْمِ وَصَاحِبُ الدُّنْيَا وَلَا يَسْتَوِيَانِ اَمَّا صَاحِبُ الْعِلْمِ فَيَزْدَادُ رِضًى لِلرَّحْمٰنِ وَاَمَّا صَاحِبُ الدُّنْيَا فَيَتَمَادٰى فِي الطُّغْيَانِ ثُمَّ قَرَاَ عَبْدُاللّٰهِ كَلَّا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى قَالَ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ (رواه الدارمي)

أخرجه الدارمي ۱/۱۰۸ حديث رقم ۳۳۲۔

ترجمه: حضرت عونؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا دو حریص کبھی سیر نہیں ہوتے۔ ایک عالم اور دوسرا دنیادار لیکن یہ دونوں درجہ میں برابر نہیں ہیں۔ کیونکہ عالم اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کو زیادہ کرتا ہے اور دنیادار سرکشی میں زیادتی کرتا ہے۔ پھر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے دنیادار کے حق میں بطور دلیل کے یہ آیت پڑھی۔ كَلَّا اِنَّ الْاِنْسَا نَ لَيَطْغٰى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى۔ خبردار انسان البتہ سرکشی کرتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو کثرت مال کی وجہ سے لوگوں سے مستغنی دیکھتا ہے۔ حضرت عون فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے دوسرے یعنی عالم کے متعلق یہ آیت تلاوت کی۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ اللہ کے بندوں میں سے علماء اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اس حدیث کو امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: منهومان لايشبعان:

قوله: قال: قال الآخر: ﴿انما يخشى الله من عباده العلماء﴾:

''الآخر'' مرفوع ہے، أى الاستشهاد الآخر۔ بعض کا کہنا ہے کہ منصوب ہے۔ ای: وذكر الاستشهاد الآخر۔

﴿انما يخشى الله من عباده العلماء﴾ اس آیت میں قراءات کا اختلاف ماقبل میں گزر چکا ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ دو حریص ایسے ہیں جن کا پیٹ کبھی بھی نہیں بھرتا، ایک علم کا طالب اور دوسرا دنیادار، لیکن نتیجہ اور عاقبت کے اعتبار سے دونوں برابر نہیں، کیونکہ علم کا طالب اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا جویا (طالب) ہوتا ہے۔

اور رحمٰن کی تخصیص شاید اس بات کو بتلانے کیلئے ہے کہ یہ رحمٰن کی رحمت کا مظہر ہے، بایں طور کہ تحصیلِ علم کے ذریعے اپنے پر بھی اور دوسروں پر بھی رحم کھاتا ہے۔ اور دنیادار سرکشی میں بڑھتا چلا جاتا ہے، چنانچہ سرکشی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ترکِ طاعت وعبادت کے باعث اللہ کی رحمت سے دور ہو جاتا ہے۔

اگر علماء امراء کے پاس جائیں گے تو نقصان ہوگا

۲۶۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اُنَاسًا مِنْ اُمَّتِیْ سَیَتَفَقَّهُوْنَ فِی الدِّیْنِ وَیَقْرَأُوْنَ الْقُرْاٰنَ یَقُوْلُوْنَ نَاْتِی الْاُمَرَآءَ فَنُصِیْبُ مِنْ دُنْیَاهُمْ وَنَعْتَزِ لُهُمْ بِدِیْنِنَا وَلَایَكُوْنُ ذٰلِكَ كَمَا لَا یُجْتَنٰی مِنَ الْقَتَادِ اِلَّا الشَّوْكُ كَذٰلِكَ لَایُجْتَنٰی مِنْ قُرْبِهِمْ اِلَّا قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ الصَّبَّاحِ كَاَنَّهُ یَعْنِی الْخَطَایَا.

أخرجه ابن ماجة ۹۳/۱ حدیث رقم ۲۵۵۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری امت میں بہت سے لوگ دین کا علم حاصل کریں گے اور قرآن مجید پڑھیں گے اور کہیں گے کہ ہم امراء کے پاس جا کر ان کی دولت اور دنیا میں سے اپنا حصہ حاصل کریں گے اور اپنے دین کو ان سے بچا کر رکھیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوسکتا کہ دین اور دنیا ایک جگہ جمع ہو جائیں کیونکہ امراء کی مجلس میں فائدہ کے بجائے نقصان ہوتا ہے جس طرح کہ خاردار درخت سے کانٹا ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ اسی طرح امراء کی رفاقت اور مجلس سے نہیں حاصل ہوتا مگر حضرت محمد بن صباح فرماتے ہیں کہ گویا رسول اللہ ﷺ کی مراد لفظ الا کے بعد خطایا تھی۔ اس حدیث کو امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **قوله: ان اناسا من امتی سیتفقهون فی الدین**: ''سیتفقهون'' کے دو ترجمے کئے گئے ہیں:

① **سیدّعون الفقه**۔ (کذا قاله الطیبی)۔ ② **یطلبون الفقه**۔

قوله: یقرأون القرآن: اس جملے کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں:

① قرآن کی تلاوت مختلف قراءتوں میں کرتے ہوں گے۔ ② آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر کریں گے۔

قوله: یقولون: نأتی الامراء...... الخ: ایک نسخہ میں واؤ کے ساتھ، **ویقولون** ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے علماء کرام کا امراء کے پاس آنا جانا کبھی پسند نہیں فرمایا بلکہ علماء کی شان کے بالکل خلاف ہے کہ وہ وزیروں کی کوٹھیوں کا طواف کریں اور ان سے دنیوی زندگی کے معاملات وابستہ رکھیں بلکہ علماء کی شان یہی ہے کہ اپنے علم کی حفاظت کرتے ہوئے امراء کے ہاں آنے جانے سے پرہیز کریں اور ان کو اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول کے پیغامات پہنچانے کی سعی و کوشش جاری رکھیں اور اس میں کوتاہی بالکل نہ کریں۔ اس جگہ آپ ﷺ نے جو فرمایا ہے کہ ''امراء کی صحبت نہیں حاصل ہوتا مگر!'' اور پھر مگر کے بعد کچھ ارشاد نہیں فرمایا بالکل خاموشی اختیار فرمائی ہے اور بعد میں محمد بن صباح جو امام بخاری و مسلم کے استاد ہیں انہوں نے الا کے بعد الخطایا کے لفظ کا اضافہ فرمایا ہے اور اس کے متعلق جو حتمی طور پر بیان کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ آپ ﷺ نے خاموش رہ کر واضح کر دیا ہے کہ امراء کی صحبت میں جانے سے اتنا نقصان ہے کہ اس کو زبان سے بیان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ زبان سے بیان کی جانے والی بات کی ایک حد مقرر ہو جاتی ہے اور اس نقصان کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔

محمد بن سلمہ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: **الذباب علی العذرة احسن من قارئ علی باب هؤلاء الظلمه**۔

''گندگی پر بھنبھناتی ہوئی مکھی اس قاری سے، بہت بہتر ہے جو ان ظالموں کے دروازوں پر آتا ہے۔''

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: میرے والد مجھ سے فرماتے تھے: **ما أريد أن تصير من العلماء خشية ان تقف على باب الامراء۔**

''میں نہیں چاہتا کہ تیرا شمار علماء میں ہو، اندیشہ ہے کہ کہیں تو بھی امراء کے دروازوں پر کھڑا نظر آئے۔''

اگر علماء علم کی حفاظت کریں گے تو سرداری کریں گے

۲۶۳: **وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَوْاَنَّ اَهْلَ الْعِلْمِ صَانُوا الْعِلْمَ وَوَضَعُوْهُ عِنْدَ اَهْلِهٖ لَسَادُوْابِهٖ اَهْلَ زَمَانِهِمْ وَلٰكِنَّهُمْ بَذَلُوْهُ لِاَهْلِ الدُّنْيَا لِيَنَالُوْا بِهٖ مِنْ دُنْيَاهُمْ فَهَانُوْاعَلَيْهِمْ سَمِعْتُ نَبِيَّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَاحِدًا هَمَّ اٰخِرَتِهٖ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ وَمَنْ تَشَعَّبَتْ بِهِ الْهُمُوْمُ فِيْ اَحْوَالِ الدُّنْيَا لَمْ يُبَالِ اللّٰهُ فِيْ اَيِّ اَوْدِيَتِهَا هَلَكَ** (رواه ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجة ۱/ ۹۵ حديث رقم ۲۵۷ ـ والبيقهي في شعب الايمان ۲/ ۳۰۶ حديث رقم ۱۸۸۸ ـ

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا اگر علماء علم کی حفاظت کریں اور علم قدر دانوں کے پاس رکھیں تو وہ یقیناً اپنے علم کی وجہ سے اہل دنیا کے سردار بن جائیں گے۔ لیکن اگر علماء نے ایسا نہ کیا۔ یعنی علم کو دنیاداروں پر خرچ کیا۔ تاکہ اس سے دنیا کا جاہ و جلال اور رعب و دبدبہ حاصل کریں اور علم کے اصلی اور حقیقی مقصد دنیا والوں کی راہنمائی اور نصیحت کی طرف توجہ نہ دی تو وہ دنیا والوں کے ہاں ذلیل و خوار ہوں گے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس انسان نے اپنے مقصد میں سے صرف ایک مقصد یعنی آخرت کے مقصد کو اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے دنیاوی مقاصد کو پورا کر دے گا اور جس انسان کے مقاصد مختلف ہوں جیسے دنیا کے حالات ہیں۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ کسی جنگل اور دنیا کی کسی وادی میں مرے۔ اس حدیث کو امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **قوله: لو ان اهل العلم صانوا العلم ...... اهل زمانهم:**

علم کی حفاظت کریں بایں طور کہ ان امور کا خیال رکھیں: ① اپنے آپ کو مواقع ذلت میں مت ڈالیں۔ ② ظالموں سے یاریاں نہ پالیں۔ ③ جاہ و مال کے لالچ میں دنیاداروں کی ہم نشینی اختیار نہ کریں۔ ④ باہم حسد نہ کریں۔

علم کے اہل وہ لوگ ہیں جو آخرت کی فکر رکھتے ہیں۔ علم کی قدر پہچانتے ہیں علماء کی صحبت میں رہتے ہیں۔

سادوا به اهل زمانهم:

جب اہلِ علم، علم کی حفاظت کریں گے اور علم کو علم کے اہل ہی کے پاس رکھیں گے، تو معزز و مکرم ہو جائیں گے۔ اہلِ علم کی شان تو بہت اعلیٰ و بالا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ [المجادلہ: ۱۱] ''جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے خدا ان کے درجے بلند کرے گا۔'' امام طیبیؒ

فرماتے ہیں: اور یہ اس وجہ سے ہے کہ علم ایک ایسی رفیع القدر چیز ہے، کہ جو اپنی رفعت کو برقرار رکھنے والے کو رفیع القدر بنا دیتی ہے۔

امام زہریؒ فرماتے ہیں: **العلم ذکر لا یحبه الا ذکور الرجال، ای الذین یحبون معالی الامور ویتنزهون عن سفسافها۔** اھ۔ امام زہریؒ کے کلام میں بطور مفہوم مخالف یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ **الدنیا انثی لا یحبها الا ناقص العقل والدین فانهم یحبون المراتب الدنیة۔** واللہ اعلم

قوله: ولکنهم بذلوه لأهل الدنیا......علیهم:

بعض نسخوں میں **علیهم** کے بجائے **علمهم** ہے، یہ تصحیف ہے۔ چونکہ **هان** فعل لازم ہے بمعنی **ذلّ**، لہٰذا متعدی نہیں ہے، الّا یہ کہ اس کو منصوب بنزع الخافض قرار دیا جائے، ای: **فی علمهم۔**

انہوں نے علم کو دنیاداروں کے سامنے پیش کیا' علم کے ذریعے دنیاداروں سے راہ و رسم بڑھائے، دین کی خاطر نہیں، ان کو وعظ و نصیحت کی خاطر نہیں، کسی کی جائز شفاعت کیلئے نہیں، بلکہ اس لئے کہ اس کے ذریعے وہ دنیا کو حاصل کریں۔ اس طرح وہ دنیاداروں پر بوجھ بننے لگے اور دنیاداروں کی نظروں میں بھی ذلیل و خوار ہوئے۔

قوله: سمعت نبیکم ﷺ یقول: یہ کلام توبیخ پر مشتمل ہے، بایں طور کہ ان لوگوں نے اپنے نبی کے حکم کی خلاف ورزی کی۔

قوله: من جعل الهموم هما واحدا......هم دنیاه:

یعنی جس شخص نے تمام مقاصد و مطالب کو چھوڑ دیا، اور صرف آخرت کی فکریں اپنائی گویا کہ اس شخص کو فکرِ آخرت کے علاوہ کوئی فکر نہیں۔

قوله: ومن تشعبت به الهموم ......الخ: ایک نسخہ میں **تشعب** ہے۔

۲۶۴: **ورواه البیهقی فی شَعب الایمان عن ابن عمر من قوله مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ اِلٰی اٰخِرِهٖ۔**

ترجمہ: اور امام بیہقیؒ نے اس حدیث کو شعب الایمان میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ان کے قول۔ **مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ**۔ سے آخر تک روایت کیا ہے۔

تشریح: یعنی ابن عمر کی یہ حدیث **مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ** کے الفاظ سے شروع ہو رہی ہے۔ نیز یہ روایت موقوفاً نہیں بلکہ مرفوعاً مروی ہے۔

علم کی آفت بھولنا ہے

۲۶۵: **وَعَنِ الْاَعْمَشِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٰفَةُ الْعِلْمِ النِّسْيَانُ وَاِضَاعَتُهٗ اَنْ تُحَدِّثَ بِهٖ غَيْرَ اَهْلِهٖ۔** (رواه الدارمی مرسلا)

أخرجه الدارمی فی السنن ۱/۱۵۸ حدیث رقم ۶۲۴۔

ترجمہ: حضرت اعمشؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علم کی آفت بھولنا ہے اور نا اہل کے سامنے علم بیان کرنا اس کو ضائع کرنا ہے اس حدیث کو امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے مرسل طریق سے۔

راویٔ حدیث:

الاعمش ۔ یہ "اعمش" ہیں۔ ان کا نام "سلیمان ابن کاہلی اسدی" ہے۔ ان کا شمار کبار تابعین میں ہوتا ہے۔ بنی کاہل کے آزاد کردہ تھے۔ بنی کاہل بنی اسد خزیمہ کی ایک شاخ ہے۔ یہ ۶۰ ھ میں "لے" میں پیدا ہوئے وہاں سے کوفہ میں لائے گئے تو بنی کاہل کے ایک شخص نے خرید کر آزاد کر دیا۔ یہ جلیل القدر علماء حدیث وقراءت کے مشہور بزرگوں میں سے ہیں۔ ان پر اکثر کوفیین کی روایات کا مدار ہے۔ ان سے بہت لوگوں نے روایت کی ہے۔ ۱۴۸ھ میں وفات ہوئی۔

تشریح: اسنادی حیثیت: سیدؒ فرماتے ہیں: مرسل سے مراد مرسل لغوی (یعنی منقطع) ہے، چونکہ اعمش نے کسی بھی صحابی سے سماع نہیں کیا، اور اگر حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ان کا سماع ثابت ہو تو یہ مرسل اصطلاحی ہوگی۔

ہر شئ کیلئے آفت ضرور ہوتی ہے، اور علم کیلئے ایک نہیں بلکہ کئی آفتیں ہوتی ہیں، ان آفتوں میں سے ایک آفت یہ ہے کہ حصولِ علم کے بعد علم کو بھول جائے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اسباب نسیان سے بچنا چاہئے، ان اسباب میں سے علم کو متحضر کرنے سے اعراض کرنا، دنیا کے ایسے غیر ضروری کام جو دِل کو علم سے ہٹا کر دوسری چیزوں میں مشغول کر دیں، اور شہوت پرستی۔ اور نا اہل لوگ وہ ہیں جن کو عقل وفہم کی روشنی حاصل نہیں، اور وہ لوگ جو ارباب دنیا ہیں۔

لالچ علم کو دل سے نکال دیتی ہے

۲۶۶ :وَعَنْ سُفْيَانَ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ لِكَعْبٍ مَنْ اَرْبَابُ الْعِلْمِ؟ قَالَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ بِمَا يَعْلَمُوْنَ قَالَ فَمَا اَخْرَجَ الْعِلْمَ مِنْ قُلُوْبِ الْعُلَمَآءِ قَالَ الطَّمْعُ ۔ (رواه الدارمی)

أخرجه الدارمی فی السنن ۱/۱۵۲ حدیث رقم ۵۸٤۔

ترجمہ: حضرت سفیانؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ تمہارے نزدیک صاحب علم کون ہے؟ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جو لوگ اپنے علم کے مطابق عمل کریں وہ اہل علم ہیں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ کونسی چیز علماء کے دل سے علم کو نکال دیتی ہے؟ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے جواب میں ارشاد فرمایا۔ کہ وہ لالچ ہے۔ اس حدیث کو امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

سفیان ثوری۔ یہ سفیان بن سعید ثوری کوفی ہیں۔ تبع تابعین میں سے ہیں۔ مسلمانوں کے پیشوا اور مخلوق پر اللہ کی "حجت کاملہ" ہیں۔ اپنے زمانہ میں فقہ اور اجتہاد کے جامع تھے، حدیث کے بڑے عالم، زاہد وعابد، متقی اور ثقہ تھے اور خصوصاً علم حدیث وغیرہ علوم کے مرجع تھے۔ تمام لوگ ان کی دینداری، زہد، پرہیز گاری اور ثقہ ہونے پر متفق ہیں اور کوئی بھی ایسا نہیں کہ جو اس میں

اختلاف کرتا ہو۔ ائمہ مجتہدین میں سے ایک یہ بھی ہیں۔ قطب اسلام نیز ارکانِ دین میں ان کا بھی شمار ہیں۔ ۹۹ھ میں سلمان بن عبدالملک کے زمانہ میں ان کی پیدائش ہوئی۔ انہوں نے محدثین کی ایک بڑی جماعت سے روایات حاصل کیں۔ ان سے معمرؒ اوزاعیؒ ابن جریجؒ مالکؒ شعبہؒ ابن عیینہؒ فضیل بن عیاض اور ان کے علاوہ بہت سے آدمی روایت کرتے ہیں۔ ۱۶۱ھ میں ''بصرہ'' میں ان کا انتقال ہوا۔

انتقال کے وقت:

آپ رضی اللہ عنہ کی عمر تریسٹھ (۶۳) سال کی تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ پینسٹھ (۶۵) سال اور بعض نے ستر (۷۰) سال اور بعض نے اٹھاون (۹۸) سال بتلائی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی مدتِ خلافت چار سال نو ماہ کچھ دن ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ سے آپ کے صاحبزادے حسن وحسین رضی اللہ عنہما اور محمد رضی اللہ عنہ اور بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ روایت کرتے ہیں۔

کعب الاحبار۔ کعب الاحبار اضافت کے ساتھ ہے۔ ''مانع'' کے بیٹے ہیں۔ کنیت ''ابواسحاق'' ہے۔ جلیل القدر کبار تابعین میں سے ہیں۔ ''کعب احبار'' کے نام سے معروف ہیں۔ ان کو ''کعب حبر'' بھی کہا جاتا ہے۔ اصل میں بنو حمیر سے ہیں۔ زمانہ اسلام سے پہلے یہود کے بڑے علماء میں سے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا لیکن زیارت سے مشرف نہیں ہوئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلام قبول کیا۔ عمر۔ صہیب رضی اللہ عنہم اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں بمقام حمص ۳۲ھ میں انتقال فرمایا۔

''احبار'' حائے مہملہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: قوله: قال لكعب من ارباب العلم ...... بما يعملون:

حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت کعب سے سوال کرنا خصوصاً اس وجہ سے تھا کہ وہ اچھے خاصے صاحبِ علم تھے۔ تورات وغیرہ کا علم بھی رکھتے تھے۔

اس سوال سے ان کی مراد بظاہر یہ تھی کہ آپ نے جو کتابیں تورات وغیرہ پڑھی ہیں، ان کی رُو سے ''اربابِ علم'' کہلوانے کا حقدار کون ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: ''اربابِ علم وہ ہیں جو اپنے علم کے موافق عمل کریں''۔ قرآن نے ان اربابِ علم کو ''حکماء'' کا نام دیا ہے: ﴿وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ [البقرة : ٢٦٩] ''اور جس کو دانائی ملی اس کو بڑی نعمت ملی'' اور اپنے علم کے موافق عمل نہ کرنے والوں کو گدھے کی مانند قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا﴾ [الجمعة : ٥] ''جن لوگوں (کے سر) پر تورات لدوائی گئی پھر انہوں نے اس (کے بارِ تعمیل) کو نہ اٹھایا ان کی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں''۔

قوله: فما اخرج العلم من ...... الطمع:

''ما'' استفہامیہ بمعنی ای شئی مبتداء ہے، ای: أي شيء أخرج العلم۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: فاء جزائیہ ہے، شرط محذوف ہے، اور ''العلم'' کا ''ال'' عہد خارجی کا ہے، أي: اذا كان أرباب العلم من جمع بين العلم والعمل فلما ترك العامل للعمل، وما الذى دعاه الى ترك العمل ليعزل عن هذا الاسم؟ قال: الطمع في الدنيا والرغبة

فیھا۔ واللہ اعلم۔

• اس دوسرے سوال وجواب کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے دوسرا سوال یہ کیا کہ علماء کے دِلوں سے علم کا نور، عظمت وبرکت نکالنے والی چیز کونسی ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ سوال باعمل علماء کے بارے میں تھا، چونکہ بے عمل "عالم" ہی نہیں۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ لالچ ہے، چونکہ لالچ وہ بُری بلا ہے جو شہرت وریا کاری پر اکساتی ہے، اور علم وعمل اخلاص سے خالی ہوں تو سالک مقام اختصاص تک پہنچ ہی نہیں سکتا، چنانچہ اس کے مفہوم مخالف سے معلوم ہوا کہ "ورع" علماء کے دلوں میں علم کو داخل کرنے والی چیز ہے۔

علماء کی دو قسمیں ہیں علماء خیر اور علماء شر

۲۶۷: وَعَنِ الْاَحْوَصِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ سَاَلَ رَجُلٌ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الشَّرِّ فَقَالَ لَا تَسْئَلُوْنِىْ عَنِ الشَّرِّ وَاسْئَلُوْنِىْ عَنِ الْخَيْرِ يَقُوْلُهَا ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ اَلَا اِنَّ شَرَّ الشَّرِّ شِرَارُ الْعُلَمَاءِ وَاِنَّ خَيْرَ الْخَيْرِ خِيَارُ الْعُلَمَاءِ۔ (رواه الدارمی)

أخرجه الدارمی فی السنن ۱/۱۱۶ حدیث رقم ۳۷۰۔

ترجمہ: حضرت احوص بن حکیم اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شر کے بارے میں سوال کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے شر کے بارے میں نہ پوچھو بلکہ خیر کے بارے میں سوال کرو اور ان جملوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ ارشاد فرمایا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سنو برے لوگوں میں بدترین علماء شر ہیں اور اچھے لوگوں میں سب سے اچھے علماء خیر ہیں اس حدیث کو امام دارمی نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

انس بن النضر۔ یہ انس بن نضر بخاری انصاری ہیں۔ یہ انس بن مالک کے چچا ہیں اُحد کے روز جب یہ شہید ہوئے ہیں تو اس وقت ان کے جسم پر تلوار اور نیزے اور برچھے کے ۸۰ سے زیادہ نشان دیکھے گئے تھے۔ انہیں کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی تھی: مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ...... [الأحزاب: ۲۳]

قولہ: لا تسئلونی عن الشر: نون کی تخفیف کے ساتھ ہے۔ "لا" ناہیہ ہے۔ ألا: حرف تنبیہ ہے۔

"یقولھا ثلاثا": قال کے فاعل کی ضمیر سے حال ہے۔ اور "ھا" ضمیر منصوب متصل جملۂ لا تسالونی کی طرف راجع ہے۔ ملا علی قاریؒ کا کہنا ہے کہ یہ ضمیر قریبی جملہ کی طرف عائد ہے۔

عرض مرتب: بظاہر وہ قریبی جملہ واسئلونی عن الخیر ہے۔

تشریح: اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کو برائی کے متعلق سوال کرنے سے منع فرمایا۔ اس ممانعت کا مطلب یہ تھا کہ مجھ سے صرف بُرائی اور بُرے لوگوں کے متعلق ہی مت پوچھا کرو، بلکہ نیکی اور نیک لوگوں کے

بارے میں بھی سوال کیا کرو، وگرنہ آنحضرت ﷺ کی اس ممانعت کا منشاء یہ ہرگز نہیں تھا کہ شر کے بارے میں سوال مت کیا کرو، چونکہ شر سے بچنے کیلئے سوال کرنا واجب ہے اور بعض احوال میں فرضِ عین ہوتا ہے، لہٰذا یہ کہنا قطعاً درست نہیں ہوگا، کہ آنحضرت ﷺ نے بُرائی کے بارے میں سوال کرنے سے مطلقاً منع فرمایا ہے۔ بُرائی کے بارے میں سوال کی ممانعت کا سبب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نبی رحمت ہیں، رؤف ورحیم ہیں۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وما ارسلناك الا رحمة للعالمين﴾۔ لہٰذا اس شان کا تقاضا سمجھتے ہوئے سوال کرنا چاہئے۔

قوله: ان شر الشر شرار...... الخير خيار العلماء:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: وجہ یہ ہے کہ علماء جہاں بھر کیلئے باعثِ صلاح وفساد ہیں۔ دین ودنیا کے امور ان ہی کے سپرد ہوتے ہیں۔ اور یہی ارباب حل وعقد ہوتے ہیں۔ اھ۔ یا اس وجہ سے کہ بدترین علماء کا عذاب آخرت کے عذاب کے اعتبار سے سب سے سخت ہوگا۔ اور بہترین علماء کے مراتب ودرجات سب سے بہتر ہوں گے۔

جو عالم اپنے علم سے نفع حاصل نہ کرے وہ بدترین ہے

۲۶۸ :وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ اِنَّ مِنْ اَشَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً یَوْمَ الْقِیَامَةِ عَالِمٌ لَا یَنْتَفِعُ بِعِلْمِهٖ.

أخرجه الدارمی ۹۳/۱ حدیث رقم ۲۶۲۔

ترجمہ: حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرتبہ میں سب سے بدتر وہ عالم ہے۔ جس نے اپنے علم سے فائدہ حاصل نہ کیا ہو۔ اس حدیث کو امام دارمی نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان من اشر الناس...... :

جوہریؒ کا کہنا ہے کہ یہ لغت ضعیف ہے، اور ''من'' زائدہ ہے۔ اور عالم' انَّ کی خبر ہے۔ (کذا قاله الطيبي)۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: یہ لغت قلیل ہے، یا ردی ہے۔ اھ۔ درست بات یہ ہے کہ یہ لغت قلیل ہے، اور ''من'' زائد نہیں بلکہ تبعیضیہ ہے۔ عبارت کی معنوی تقدیر أن بعض أشرارهم ہے۔ منزلة: تمیز ہے۔

تشریح: علم سے فائدہ نہ اُٹھانے کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ کوئی ایسا علم سیکھا جو نافع نہیں۔ یا یہ کہ علم شرعی سیکھا لیکن اس پر عمل پیرا نہ ہوا، چنانچہ نہ خود علم سے نفع حاصل کیا اور نہ دوسرے لوگوں کو نفع پہنچایا تو اس عالم کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ قیامت کے روز مرتبہ کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ سب سے برا آدمی ہوگا بلکہ ان جاہلوں سے بھی برا ہوگا جن کے پاس علم نہیں ہے اس لئے جو عذاب اس پر مسلط کیا جائے گا وہ جاہلوں کے عذاب سے بھی سخت ہوگا ایسے علم اور ایسے عالموں سے اللہ کی پناہ اس لئے کہ ایسے لوگوں سے سات مرتبہ ان کی بربادی کی دعا کی گئی ہے اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو سخت سے سخت تر عذاب میں مبتلا کیا جائے گا

ایک روایت میں آتا ہے: ''أشد الناس عذابا يوم القيامة عالم لم ينفعه الله بعلمه''۔

عالم کا پھسلنا اسلام کی عمارت کو گرا دیتا ہے

۲۶۹ :وَعَنْ زِيَادِ بْنِ حُدَيْرٍ قَالَ قَالَ لِي عُمَرُ هَلْ تَعْرِفُ مَا يَهْدِمُ الْإِسْلَامَ قُلْتُ لَا قَالَ يَهْدِمُهُ زَلَّةُ الْعَالِمِ وَجِدَالُ الْمُنَافِقِ بِالْكِتَابِ وَحُكْمُ الْأَئِمَّةِ الْمُضِلِّينَ ۔ (رواه الدارمی)

أخرجه الدارمی فی السنن ۱/۸۲ حدیث رقم ۲۱۴۔

ترجمہ: حضرت زید بن حدیر رحمہ اللہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ اسلام کی عمارت کو گرانے والی چیز کونسی ہے؟ میں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عالم کا پھسلنا۔ (یعنی کسی مسئلہ میں عالم سے غلطی ہو جانا) اور منافق کا اللہ کی کتاب میں جھگڑا کرنا اور گمراہ سرداروں کا حکم جاری کرنا اسلام کی عمارت کو گرا دیتا ہے اس حدیث کو امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

زیاد بن حدیر۔ زیاد بن حدیر ان کی کنیت ''ابو مغیرہ'' ہے۔ یہ ''بنو اسد'' میں سے ہیں۔ کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ تابعی ہیں۔ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے حدیث کو سنا ہے۔ ان سے ایک جماعت نے حدیث کی روایت کی ہے جن میں شعبی بھی ہیں۔ ''حدیر'' حائے مہملہ کے پیش اور دال مہملہ کے زبر یائے تحتانی کے سکون اور راء مہملہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: **قوله: ما يهدم الاسلام ؟** : ہدم سے مشتق ہے۔ اس کے اصل معنی ہیں: ''اسقاط البناء'' عمارت گرانا۔

قوله: وحكم الائمة المضلين: اس لفظ کو ۲ طرح سے پڑھا جاتا ہے ① ہمزہ کے ساتھ **أئمة** ② یاء کے ساتھ **أيمة**

اسلام کی عمارت کو ڈھانے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے وہ پانچ بنیادی ارکان یعنی کلمۂ توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج سب کے سب بیکار ہو جاتے ہیں اور ان کا کوئی اجر باقی نہیں رہتا وہ اس طرح کہ جب عالم اپنے حقیقی فرائض یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ادائیگی کو اپنی خواہشات نفسانی کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے تو ان چیزوں میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ شخص جو نفاق سے بھرا پڑا ہے لیکن بظاہر وہ مسلمان ہے جب قرآن کریم کو پڑھتا ہے تو اس سے جھگڑا پیدا کرتا ہے کیونکہ قرآن کریم کی تحویلات وہ اس طرح کرتا ہے کہ اس کے پیٹ کی آگ بجھتی رہے اور ارکان اسلام میں سستی آتی ہے تو آتی رہے اور اس کے پیٹ کا مسئلہ حل ہوتا رہے اور اس سے دین میں فساد پیدا ہوتا ایک فطری امر ہے۔

قوله: يهدمه زلة العالم:

عالم کے پھسلنے کو مقدم ذکر کیا، چونکہ عالم کا پھسلنا مؤخر الذکر دونوں خصلتوں کا سبب ہے جیسا کہ مروی ہے: **زلة العالم زلة العالم۔** ''عالم کا پھسلنا جہاں کا پھسلنا ہے۔'' (یعنی عالم کا ایک غلطی کرنا ایسا ہے گویا سارے جہاں نے غلطی کی ہے۔ از مرتب)

علم کی دو قسمیں ہیں قلبی اور لسانی

۲۷۰ : وَعَنِ الْحَسَنِ قَالَ الْعِلْمُ عِلْمَانِ عِلْمٌ فِي الْقَلْبِ فَذَاكَ الْعِلْمُ النَّافِعُ وَعِلْمٌ عَلَى اللِّسَانِ

فَذٰلِكَ حُجَّةُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ عَلَى ابْنِ اٰدَمَ۔ (رواہ الدارمی)

أخرجه الدارمی ۱/۱۱٤ حدیث رقم ۳٦٤۔

ترجمہ: حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ علم کی دو قسمیں ہیں ایک وہ علم جو دل میں ہوتا ہے اور دوسرا وہ علم جو زبان کے اوپر ہوتا ہے اور یہ علم انسان پر اللہ تعالیٰ کی حجت اور دلیل ہوتا ہے اس حدیث کو امام دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: العلم علمان...... فذاك العلم النافع:

فعلم میں فاء تفصیلیہ ہے، فذاك میں فاء سببیّہ ہے۔ فعلم اور وعلم، دونوں جگہ مبتدا باوجود یکہ نکرہ ہے۔ چونکہ دونوں جگہ مبتدا نوع پر دلالت کر رہا ہے۔ ایک نسخہ میں "فذاك" کے بجائے" فذلك" ہے۔

یہاں علم سے مراد معرفت ہے یا علم شرعی ہے۔ علم کی ایک نوع تو وہ ہے جو دِل کے اندر جگہ کئے ہوئے ہے، اس پر غیر اللہ کا مطلع ہونا تو ممکن نہیں، دِل کا معاملہ صاحبِ دِل اور اللہ کے درمیان ہے۔ یہ علم نہایت اعلیٰ وارفع ہے، اس علم کا حصول ہر آدمی کے بس کی بات نہیں۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ آدمی اس علم کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرے اور علم کی دوسری قسم سے دور رہنے کی کوشش کرے۔ دِل تو اللہ تعالیٰ کی محبت کی آماجگاہ ہے، لہٰذا دِل میں علم نافع کے ٹھہرانے کا سبب اس علم کا دونوں جہانوں میں نافع ہونا ہے۔

علم کی دوسری قسم وہ ہے جو زبان پر جاری ہے۔ یہ قسم خطرناک ہے، چونکہ علم کی اس قسم کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہے، لہٰذا ہر لحظہ شہرت وریاکاری اور امراء کی مداہنت کا خدشہ رہتا ہے۔

لوگوں نے علم کی قسمِ اوّل کا محمل علم باطن، اور قسمِ ثانی کا محمل علم ظاہر کو قرار دیا ہے۔

حسن بصریؒ نے علم کی دو قسمیں بیان کی ہیں آپ کے بعد آنے والے لوگوں نے اس کو علم باطن اور علم ظاہر سے تعبیر کیا ہے اور یہ بات حقیقت ہے کہ جب تک ظاہر کی اصلاح نہیں ہوتی باطن کی اصلاح ممکن نہیں ہوتی جس طرح ایمان اور اسلام ایک دوسرے کے بغیر صحیح نہیں ہوتے اسی طرح دل اور جسم بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے اور اس طرح ان دونوں قسموں کا بھی آپس میں ایک خاص تعلق ہے جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتا۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں: "جس نے فقاہت حاصل کی، تصوف کو اختیار نہیں کیا تحقیق وہ فاسق ہوگیا، اور جس نے تصوف کو اختیار کیا اور فقاہت حاصل نہیں کی تحقیق وہ زندیق ہوگیا، اور جس نے دونوں کو جمع کیا وہ محقق ہوگیا۔"

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ہر حدیث کے آخر میں" رواہ الدارمی" فرمانے کے بجائے، اختصار کرتے ہوئے مناسب یہ تھا کہ یوں فرماتے: روى الأحاديث الستة الدارمی۔

علم کے دو برتن

۲۷۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وِعَائَيْنِ فَاَمَّا اَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهٗ فِيْكُمْ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهٗ قُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ يَعْنِىْ مَجْرَى الطَّعَامِ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ١/٢١٦ حديث رقم ١٢٠۔

ترجمه: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم کے دو برتن یعنی دو طرح کا علم حاصل کیا ہے اور میں نے اس کو یاد کیا ہے۔ ان میں سے ایک کو میں نے تمہارے درمیان پھیلا دیا ہے اور دوسرے علم کو اگر میں تمہارے درمیان پھیلاؤں اور بیان کروں۔ تو میرا گلا کاٹ دیا جائے اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **قوله: حفظت من رسول الله ﷺ وعائين :** میں حذف مضاف ہے: **أي: من كلام رسول الله ﷺ۔**

ابہریؒ کا کہنا ہے کہ اکثر روایات میں عن آیا ہے۔ اور کشمینی کی روایت میں عن کے بجائے من آیا ہے۔ اور من والی روایات اس مسئلہ میں صریح ہیں، کہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست سنی ہے۔

قوله: فأما احدهما فبثثته فيكم ......هذا البلعوم :

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے دو طرح کے علوم کے متعلق جو بیان کیا ہے ان میں سے ایک علم تو وہی ہے جس کو ظاہری علم کہا جاتا ہے جس کا تعلق ارکانِ اسلام کے اظہار سے ہے اور دوسرے علم کے دو مفہوم لئے جاسکتے ہیں ایک یہ کہ اس سے مراد وہ باطنی علم ہے جو انسان کے دل میں اثر پذیر ہوتا ہے اور اُسے وہی انسان جانتا ہے جس کے دل پر اثر پذیر ہوتا ہے یا اس کا اللہ جانتا ہے۔

چونکہ حقیقت توحید کے اسرار و رموز کو کما حقہ تعبیر کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ چنانچہ جس نے بھی اس موضوع پر لب کشائی کی وہ حلول اور الحاد کے وہم میں مبتلا ہو گیا۔ اس لئے کہ عقول حقیقتِ حال کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں۔ صوفیاء کا کہنا ہے: **صدور الاحرار قبور الأسرار۔**

دوسرے معنی یہ لئے جاسکتے ہیں کہ منافقین کے بارے میں علم تھا۔

تیسرا مطلب: بنی امیہ میں ظالم جابر لوگوں کے پیدا ہونے کا علم تھا۔ چوتھا مطلب: بعد میں ظاہر ہونے والے فتنوں کے بارے میں علم تھا۔ ابہریؒ فرماتے ہیں: علم کی دوسری قسم کی علماء نے تشریح کی ہے اس سے مراد وہ احادیث ہیں جن میں ظالم و جابر حکمرانوں کے نام، احوال اور ان کے خصائلِ بد کا ذکر تھا۔ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ ان میں سے بعض لوگوں کا کنایۃً ذکر کرتے تھے۔ اپنی جان چلے جانے کے خوف سے صراحۃً ذکر نہیں فرماتے تھے۔ جیسا کہ وہ فرماتے تھے: **أعوذ بالله رأس الستين وامارة الصبيان۔**

ان کا واضح اشارہ یزید بن معاویہ کی خلافت کی طرف تھا۔ چونکہ یہ ۶۰ ہجری کا واقعہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یزید کی خلافت سے ایک سال قبل ہی اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

قوله: يعني مجرى الطعام:

"**مجرى الطعام**" **بلعوم** کی تفسیر ہے۔ یہ تفسیر کس نے کی؟ عسقلانیؒ کا کہنا ہے کہ مستملی کی روایت میں یہ اضافہ ہے:

قال ابو عبد الله: البلعوم مجری الطعام ۔تو گویا کہ یہ تفسیر امام بخاریؒ سے مروی ہے، نا کہ کسی اور راویؒ حدیث سے۔ واللہ اعلم

صاحبِ مشکوٰۃ کے انداز سے تو یوں لگتا ہے کہ یہ عبارت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے، یا کسی اور راوی کی۔اس سے کم از کم یہ ہرگز نہیں لگتا کہ یہ عبارت امام بخاریؒ کی ہے۔

علم نہ ہونے کے وقت اللہ اعلم کہنا بھی علم ہے

۲۷۲ :وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ يَآ يُّهَا النَّاسُ مَنْ عَلِمَ شَيْئًا فَلْيَقُلْ بِهٖ وَمَنْ لَّمْ يَعْلَمْ فَلْيَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ فَاِنَّ مِنَ الْعِلْمِ اَنْ تَقُوْلَ لِمَا لَا تَعْلَمُ اَللّٰهُ اَعْلَمُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِنَبِيِّهٖ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ۔ (سورة ص ۸٦ : متفق عليه)

أخرجه البخاری من حديث طويل ۸/۵٤۷ حديث رقم ٤۸۰۹ ۔وكذلك مسلم ٤/۲۱۵۵ حديث رقم (۳۹-۲۷۹۸) وأخرجه الدارمی بلفظ المشكاة ۱/۷۳ حديث رقم ۱۷۳۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! جو شخص کسی بات کو جانتا ہو تو چاہئے کہ وہ اس کو بیان کردے اور جو نہ جانتا ہو تو چاہئے کہ وہ کہہ دے: اَللّٰهُ اَعْلَمُ کہ اللہ تعالیٰ اچھی طرح جانتا ہے کیونکہ اللہ اعلم کہنا بھی علم ہے۔یعنی معلوم اور غیر معلوم کے درمیان امتیاز کرنا بھی ایک علم ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ارشاد فرمایا۔ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ۔(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! فرما دیجئے کہ میں اس قرآن کو سنانے پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا اور میں تکلف کرنے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں۔)

تشریح: قوله:قال یا ایها الناس ...... الله أعلم۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ خطاب علماء وغیر علماء دونوں سے ہے۔ان کے اس بیان کا حاصل ہے کہ علومِ دینیہ کے حامل کسی شخص سے کوئی سائل سوال کرلے اور وہ سائل اس سوال کے جواب کو سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو تو چاہئے کہ جواب دیا جائے۔چونکہ اس طرح کی صورتحال میں جواب نہ دینے کی صورت میں کتمانِ علم لازم آتا ہے، جو باعثِ گناہ ہے۔لہٰذا چاہئے کہ جواب دے کر ثوابِ عظیم حاصل کرلے، اور جو شخص سائل کے سوال کا جواب نہ جانتا ہو اسے چاہئے کہ فرشتوں کی طرح جواب دے۔چنانچہ فرشتوں نے کہا تھا: ﴿لا علم لنا الا ما علمتنا﴾۔یہ کہتے ہوئے شرم محسوس نہ کرے کہ مجھے نہیں معلوم، چونکہ انسان کا جہل اس کے علم سے زیادہ ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وما أوتيتم من العلم الا قليلا﴾ ای الله اكثر علما۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اللہ ہی کا علم زیادہ ہے۔ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اعلم بمعنی عالم ہے، چونکہ مشارکت محال ہے۔ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: مشارکت استقلالیہ محال ہے۔

قوله:فإن من العلم ......الله اعلم:

"فإن من العلم" یہاں مضاف محذوف ہے۔ أی من آداب العلم۔ یا تقدیری عبارت یوں ہے: فإن من جملة العلم کہ یہ خبر "ان" ہوگا اور "ان تقول" اس کا اسم ہوگا۔ "أن تقول لما لا تعلم" دونوں فعل بصیغہ خطاب ہیں اور بعض کا کہنا ہے کہ بصیغہ غائب ہیں۔ أی لا جله أو عند۔

جو آدمی اہلِ علم میں شمار ہوتا ہو اُسے چاہئے کہ جو نہ جانتا ہو، اسے اللہ کے سپرد کردے، کہ یہ بات بھی آداب علم میں سے ہے۔ اس کا لحاظ ہر شخص کو ہر لحظہ رہنا چاہئے۔ ابہریؒ فرماتے ہیں: شی معلوم کو شی مجہول سے تمیز کر لینا یہ بھی ایک قسم کا علم ہے۔ یہ بات اس جملہ کے مناسب حال ہے: لا أدری نصف العلم۔ جو شخص اتنی تمیز بھی نہ کر سکتا ہو، اس کے جہل کو جہل مرکب کہتے ہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے علماءِ سلف فتویٰ کے معاملہ میں انتہائی خائف ہوتے تھے، وہ بکثرت جواب نہیں دیتے تھے۔

قوله: قال الله لنبیه :......الخ:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنی بات کو مدلل کرنے کیلئے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ اس آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اے میرے پیغمبر! آپ لوگوں سے کہہ دیں کہ اللہ نے جو کچھ علم مجھے دیا ہے اور جتنا مجھے سکھایا ہے اور دوسرے لوگوں کو سکھانے کا حکم دیا ہے میں اس کو لوگوں تک پہنچاتا ہوں اور ان کو سکھاتا ہوں اور اس کے علاوہ میں کسی دوسری چیز کا دعویٰ اپنی طرف سے نہیں کرتا اور نہ ان چیزوں کے متعلق بحث کرتا ہوں اور محبت ہونے کی وجہ سے عوام کے فہم سے بلند و بالا ہیں کیونکہ ایسا کرنا خواہ مخواہ کا تکلف ہے اور میں تکلف کرنے والا نہیں۔ (کذا قالہ میرک)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اظہار لاعلمی:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے آیتِ کریمہ: ﴿فاكهة وأبا﴾ کے بارے میں پوچھا گیا کہ ابّاً سے کیا مراد ہے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: أی سماءٍ تظلنی وأی أرض تقلنی اذا قلت فی کتاب الله ما لا علم لی به۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اظہار لاعلمی:

زمخشریؒ ذکر کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ منبر پر تشریف فرما تھے، کہ ان سے سوال کیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں لا أدری ارشاد فرمایا۔ کہا گیا کہ آپ رضی اللہ عنہ منبر پر بیٹھ کر لا أدری کیسے کہہ رہے ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: میں تو اپنے علم کے بقدر بلند ہر کر بیٹھا ہوں، اگر اپنے جہل کے بقدر بلند ہو کر بیٹھا' تو آسمان تک پہنچ جاتا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا اظہار لاعلمی:

امام مالکؒ سے ۴۰ مسائل پوچھے گئے، انہوں نے چار کا جواب دیا، اور باقی سوالوں کے جواب میں لا أدری ارشاد فرمایا۔

قابل اعتماد آدمی سے علم حاصل کرو

۲۷۳: وَعَنِ ابْنِ سِيْرِيْنَ قَالَ اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/١٤ في المقدمة۔ وأخرجه الدارمي في السنن ١/١٢٤ حديث رقم ٤١٩۔

ترجمہ: حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ قرآن وسنت کا علم دین ہے۔ لہٰذا جب تم اس کو حاصل کرو۔ تو غور وفکر کر لیا کرو کہ کس سے اپنا دین حاصل کر رہے ہو اس کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

محمد بن سیرین۔ یہ ''محمد'' ہیں۔ ''سیرین'' کے بیٹے ہیں۔ کنیت ''ابوبکر'' ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اختتام سے دو سال پہلے پیدا ہوئے۔ تیس (۳۰) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا زمانہ پایا۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ ہیں۔ انہوں نے انس بن مالک، ابن عمر، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اور ان سے بہت سے لوگوں نے روایت کی۔ یہ فقیہ، عالم، عابد وزاہد، متقی پرہیزگار اور محدث تھے۔ تعبیر الرؤیا کے معلم وامام تھے اور مشہور وجلیل القدر تابعین میں سے تھے۔ علوم شریعت کے فنون میں شہرت پائی۔ ''مورق العلم عجلی'' کا بیان ہے کہ میں نے کوئی شخص نہیں دیکھا جو پرہیزگاری کے معاملات میں ان سے زیادہ صاحب فقہ اور مسائل فقہیہ میں ان سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

خلف بن ھشام نے کہا کہ ابن سیرین کو ایک خاص سیرت اور کچھ خاص علامات اور خاص مقام خشوع عطا کیا گیا تھا۔ لوگ ان کو دیکھتے تو خدا یاد آتا۔

اشعث کہتے ہیں کہ جب ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے حلال وحرام کے متعلق فقہ کا سوال کیا جاتا تو ان کا رنگ اڑ جاتا اور اس طرح بدل جاتا کہ وہ پہلے ابن سیرین نہیں معلوم ہوتے تھے۔

مہدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ ہم محمد بن سیرین کے پاس نشست وبرخاست رکھتے ہیں وہ ہم سے باتیں کرتے ہیں۔ اور وہ ہمارے پاس بکثرت آتے ہیں اور ہم ان کے پاس بکثرت جاتے ہیں لیکن جب موت کا ذکر ہوتا ہے تو ان کا رنگ بدل جاتا ہے اور زرد ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ یہ وہ شخص نہیں جو پہلے تھے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ جوزاء (سیارہ) ثریا سے آگے بڑھ گیا ہے تو فرمایا: پہلے حسن بصری کی وفات ہوگی اور میری وفات ان کے بعد ہوگی۔ چونکہ وہ مجھ سے اشرف ہیں۔ چنانچہ ان کی وفات ان سے سو (۱۰۰) دن پہلے ہوئی۔ ۱۱۰ھ میں بعمر ۷۷ سال وفات پائی۔

واضح رہے کہ سیرین رحمۃ اللہ علیہ غیر منصرف ہے' ایک سبب علمیت ہے' اور دوسرا سبب یاء اور نون کی زیادتی ہے۔ عصام الدین شرح شمائل میں لکھتے ہیں کہ سیرین بظاہر غسلین کی طرح ہے' اور منصرف ہے چونکہ سوائے علمیت کے کوئی اور سبب موجود نہیں ہے۔ لیکن بعض اصول میں فتحہ کے ساتھ ضبط کیا ہے' لیکن اس کی کوئی وجہ واضح نہیں عجمہ کا نہ ہونا بھی واضح ہے۔ چونکہ یہ بلاد عرب سے تعلق رکھتے تھے۔ تو صحیح بات یہ ہے کہ شرح کے تمام نسخوں اور اصول حاضرہ میں فتحہ کے ساتھ ہے۔ کوفیوں میں سے ابوعلی کے نزدیک مطلق دو حروف کی زیادتی کافی ہے جیسا کہ ''حمدون'' اور ''علیون'' اور عام نحویوں کے نزدیک الف نون کی زیادتی معتبر ہے

تشریح: **قوله: ان هذا العلم دين:** لام عہد کا ہے۔ اور علم سے مراد کتاب سنت کا وہ علم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق کی تعلیم کیلئے لے کر آئے ہیں۔ کتاب اللہ اور سنت اصول دین ہیں۔

قوله: فانظروا عمن تاخذون دينكم۔

''عن'': تاخذون کے متعلق ہے۔'' تاخذون'' میں ترووون کے معنی کی تضمین ہے۔حرف جر اسم استفہام پر داخل ہے، اس کی نظیر یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ﴾ [الشعراء: ۲۲۱] ''(اچھا) میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں؟''

'' فانظروا'': علم کے معنی کو متضمن ہے، اور جملہ استفہامیہ تعلیقاً، دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔(کذا حققه الطيبى)

اے قاریوں کی جماعت سیدھے رہو

۲۷۴ : وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ يَامَعْشَرَ الْقُرَّآءِ اِسْتَقِيْمُوْا فَقَدْ سَبَقْتُمْ سَبْقًا بَعِيْدًا وَاِنْ اَخَذْتُمْ يَمِيْنًا وَّشِمَالًا لَقَدْ ضَلَلْتُمْ ضَلَالًا بَعِيْدًا۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری ۱۳/ ۲۵۰ حديث رقم ۷۲۸۲۔

ترجمہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے قاریوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ اے قاریوں کی جماعت سیدھے رہو۔ اس لئے کہ تم سبقت لے گئے ہو دور کی سبقت۔ اگر تم سیدھے راستہ سے ہٹ کر ادھر ادھر ہو گئے تو بڑی گمراہی میں پڑ جاؤ گے۔ اس کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: يا مشعر القراء ! استقيموا:

معشر القراء کے بارے میں امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس سے مراد حفاظ کرام ہیں۔ ابہریؒ کہتے ہیں: شیخ نے فرمایا' اس سے مراد قرآن وسنت کا علم رکھنے والے علماء ہیں۔ اھ۔

قصہ مختصر یہ کہ اس میں ایک طرح کی تغلیب ہے۔ یا یہ کہ اس زمانہ کے قراء قرآن وسنت دونوں کے جامع ہوتے تھے۔ چنانچہ اولی بالامامۃ کے مسئلہ میں اُقرأ کی ترجیح مروی ہے۔ ملا علی قاریؒ نے ابن حجرؒ کی اس بات کی تردید کی ہے کہ اس سے مراد صرف وہ قراء ہیں جو صرف قرآن کے حافظ ہیں۔

'' استقيموا'': کا صلہ محذوف ہے۔ أي: على جادة الشريعة والطريقة والحقيقة۔

استقامت کیا ہے؟

استقامت کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں۔ ابہریؒ فرماتے ہیں: الاستقامة كناية عن أمر الله فعلا وتركا۔

دوسرے بعض حضرات نے اس کی تفسیر یوں کی ہے: وهى الثبات على العقيدة الصحيحة، والمداومة على العلم النافع والعمل الصالح، والاخلاص الخالص، والحضور مع الله والغيبة عن شهود ما سواه۔

قوله: فقد سبقتم سبقا بعيد:

بعض روایات میں یہ لفظ صیغہ معروف کے ساتھ ہے، اور مشہور روایت کے مطابق صیغہ مجہول کے ساتھ مروی ہے۔ بہر بقدیر معنی جدا جدا ہیں۔ معروف پڑھنے کی صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ راہِ استقامت اختیار کرو، چونکہ تم لوگوں نے اسلام

کا ابتدائی زمانہ پایا ہے، اگر تم کتاب وسنت کو مضبوطی کے ساتھ تھامو گے تو خیر میں سبقت کر جاؤ گے۔ چونکہ تمہارے بعد آنے والے لوگ بھی اگرچہ تمہارے والے اعمال بجالائیں گے، لیکن وہ تمہاری گرد کو بھی نہ پہنچ پائیں گے، چونکہ تم لوگ اسلام میں سبقت لے جاچکے ہو۔ اور متبوع کا رتبہ تابع سے بلند ہوتا ہے۔

مجہول پڑھنے کی صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ استقامت سے متصف لوگ اللہ کی طرف بڑھنے میں تم پر سبقت لے جاچکے ہیں، تم اپنے لئے اس پیچھے رہ جانے کو کیسے گوارا کر رہے ہو، حالانکہ یہ تخلّف راہِ استقامت سے ہٹا کر دائیں بائیں بھٹکانے والا ہے، ابدی ہلاکت کا موجب ہے۔

قوله: وان أخذتم يمينا وشمالا......الخ :

یعنی اگر تم جادۂ حق سے اعراض کرنے لگے اور راہِ ضلالت کے راہی ہوگئے تو تحقیق تم اس قدر دور کی گمراہی میں جا پڑو گے کہ واپسی بھی ممکن نہیں ہوگی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ [الانعام:١٥٣] ”اور یہ کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے تو تم اسی پر چلنا اور راستوں پر نہ چلنا کہ (ان پر چل کر) خدا کے راستے سے الگ ہو جاؤ گے۔“

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: لوگوں کو عبادت کیلئے پیدا کیا گیا ہے، اور عبادت بغیر اخلاص کے تام نہیں ہوتی، عبادت اخلاص سے اصل مقصود تقرب الی اللہ ہے۔ تو گویا کہ بندہ راہِ عبادت واخلاص میں اللہ کی طرف راستہ ڈھونڈتا ہے، چنانچہ جو آدمی راستہ پر چل پڑتا ہے اور ثابت قدم ہو جاتا ہے، دائیں بائیں نہیں ہوتا، وہ آدمی کامیاب ہو گیا۔ اور جو شخص ریاء کاری کی سواری پر سوار ہو گیا وہ آدمی راہِ حق سے دائیں بائیں ہٹ گیا، اور پھر جب ریاء کار اپنی ٹیڑھی روش پر برقرار رہتا ہے اور صراطِ مستقیم کی طرف لوٹنے کی کوشش نہیں کرتا تو گمراہی کی وادیوں میں حیران وپریشان سرگرداں ہو جاتا ہے، اور کرتے کرتے شرکِ اصغر اس کو شرکِ اکبر تک پہنچا دیتا ہے۔ أعاذنا الله منه۔

جب الحزن سے پناہ مانگو

۲۷۵ :وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعَوَّذُوْا مِنْ جُبِّ الْحُزْنِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَاجُبُّ الْحُزْنِ قَالَ وَادٍ فِيْ جَهَنَّمَ تَتَعَوَّذُمِنْهُ جَهَنَّمُ كُلَّ يَوْمٍ اَرْبَعَ مِائَةِ مَرَّةٍ قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَنْ يَّدْخُلُهَا قَالَ الْقُرَّآءُ الْمُرَاءُوْنَ بِأَعْمَالِهِمْ (رواه الترمذی و كذا ابن ماجة) زَادَفِيْهِ وَاِنَّ مِنْ اَبْغَضِ الْقُرَّآءِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى اَلَّذِيْنَ يَزُوْرُوْنَ الْاُمَرَآءَ قَالَ الْمُحَارِبِيُّ يَعْنِي الْجَوَرَةَ۔

(رواه الترمذی و ابن ماجة)

أخرجه الترمذي في السنن ٥١٢/٤ حديث رقم ٢٣٨٣ وقال حسن غريب ۔ وأخرجه ابن ماجة ٩٤/١ حديث رقم ٢٥٦۔

ترجمه: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا صحابہ کرام کو خطاب

کرتے ہوئے۔تم جب الحزن یعنی جہنم کے کنویں سے پناہ مانگو صحابہ کرام نے عرض کیا۔اے اللہ کے رسول ﷺ جب الحزن کیا چیز ہے۔آپ نے فرمایا وہ جہنم کی ایک وادی ہے جس سے جہنم دن میں چار سو مرتبہ پناہ مانگتی ہے۔صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔اے اللہ کے رسول ﷺ اس میں کون داخل ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا وہ قاری جو دکھلاوے کے لئے اعمال کرتے ہیں۔اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن ماجہ کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین وہ قاری ہیں جو امیروں سے ملاقات کرتے ہیں اس حدیث کے راوی محاربی نے کہا ہے۔کہ امراء سے مراد ظالم سردار ہیں۔

تشریح: قوله:تعوذوا بالله من جب الحزن......اربعمائة مرة :

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: جب الحزن ''علم'' ہے۔اور اس میں وہی اضافت ہے، جو ''دار السلام'' میں پائی جاتی ہے۔

''یتعوذ'': اس کو صیغۂ مذکر کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔چونکہ درمیان میں فاصلہ ہے۔

''کل یوم'': اس سے مراد دِن کا وقت بھی ہوسکتا ہے اور مطلقاً وقت بھی۔

تشریح: دوزخ کی ایک وادی کا نام ''جب الحزن'' ہے۔یعنی ایسا کنواں کہ جس میں غم کے سواء کچھ نہیں۔اگر چہ یہ ہے تو وادی مگر کنواں کی مانند بہت گہری ہے۔اس وادی کا عذاب اس قدر شدید ہے کہ خود جہنم بھی ایک دن میں چار سو مرتبہ پناہ طلب کرتی ہے۔جہنم کی ہر جانب سو سو مرتبہ پناہ مانگتی ہے، عدد برائے تحدید بھی ہوسکتا ہے، اور برائے تکثیر بھی اور یہ بھی ممکن ہے کہ مضاف محذوف ہو، ای: یتعوذ زبانیتها او اهلها یعنی جہنم کے فرشتے اور خود اہلِ جہنم بھی اس سے پناہ مانگتے ہیں۔

جہنم کی اس وادی کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا تا کہ اس کے دردناک عذاب کا سب کو اندازہ ہو جائے اور اپنے کانوں سے سُننے والا اس کے خوف سے ڈر کر اللہ تعالیٰ کی اس سے پناہ طلب کرے۔

درزخ کے پناہ مانگنے کا مطلب:

اس جملے کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: جہنم کا پناہ چاہنا بالکل یوں ہے جیسا کہ اس کا تکلم کرنا، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿هل من مزيد﴾ اور ایک دوسری جگہ جہنم کے غیض وغضب کا ذکر ہے: ﴿تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۖ﴾ [الملك : ٨] ''گویا مارے جوش کے پھٹ پڑے گی'' بظاہر یہاں متعارف معنی ہی مراد ہیں، اللہ تعالیٰ ہر شئی پر قادر ہے۔

صاحبِ کشاف لکھتے ہیں: جہنم کا سوال وجواب کرنا ''باب تخیل'' سے ہے۔کہ اس معنی کو دِل میں اُتارنا مقصود ہے۔جہنم کا کفار کو دیکھ کر غیظ وغضب کا اظہار کرنے کو تشبیہ دی گئی ہے، اس شخص سے جو کسی دوسرے پر انتہائی غضبناک ہو۔

قوله: ومن يدخلها؟قال: القراؤن المراؤن بأعمالهم: ''ومن يدخلها'' : اس کا عطف کلام محذوف پر ہے اور ضمیر منصوب متصل تاویلاً ''جب الحزن'' کی طرف ہے۔أى ذلك شئ عظيم هائل فمن الذى يستحق تلك البقعة المسماة بجب الحزن التى ذكر شدتها ومن الذى يدخل فيها۔''

القرا: قاف کے ضمہ کے ساتھ۔اس کی جمع ''قراؤون'' آتی ہے اور کبھی ''قراء'' قاری کی جمع کے طور پر آتا ہے۔(کذا

قال الطیبی)اور قاموس میں ہے کہ قرا' "کتان" کی طرح ہے۔ بمعنی الحسن القراء ۃ اور بروزن "رمان" بمعنی الناسك المتعبد جب کہ القاری والمقری۔

قوله: وان من أبغض القراء الى الله تعالىٰ:

یعنی مذکورہ بالا قراء میں سے اللہ کے نزدیک سب سے مبغوض ترین قراء وہ ہیں جو بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات کرتے ہیں، محض ان کے مال وجاہ میں طمع کی وجہ سے۔ چنانچہ کہنے والوں نے کیا خوب کہا: بئس الفقیر علی باب الأمیر، ونعم الأمیر علی باب الفقیر۔

چونکہ اوّل الذکر شخص کا یہ عمل اس کے دنیا کی طرف متوجہ ہونے کو ظاہر کرتا ہے، اور دوسرے شخص کا یہ عمل اس کے آخرت کی طرف متوجہ ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔

قوله: قال المحاربی یعنی الجورة:

محاربیؒ کا یہ فرمانا اس بنیاد پر ہے کہ مطلقاً امراء کی زیارت باعث مذمت نہیں ہے چونکہ امیر عادل کی زیارت تو عبادت ہے۔

علماءِ سوء فساد پیدا کر کے اپنے ذاتی اغراض کی تکمیل کریں گے

۲۷۶: وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْشِكُ اَنْ يَّأْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدٰى عُلَمَاءُ هُمْ شَرٌّ مَنْ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَآءِ مِنْ عِنْدِ هِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيْهِمْ تَعُوْدُ...... (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ۲/ ۳۱۱ حدیث رقم ۱۹۰۸۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا عنقریب لوگوں پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ اسلام کا صرف نام باقی رہ جائے گا اور قرآن کے صرف نقوش باقی رہ جائیں گے ان کی مسجدیں بظاہر آباد ہوں گی۔ مگر درحقیقت ہدایت سے ویران ہوں گی۔ ان کے علماء آسمان کے نیچے کی مخلوق میں سب سے بدتر ہوں گے۔ ظالموں کی حمایت کی وجہ سے ان ہی سے دین میں فتنے پیدا ہوں گے اور ان ہی میں لوٹیں گے یعنی ان پر ہی ظالم مسلط کر دیے جائیں گے اس حدیث کو امام بیہقیؒ نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: یوشك ان یأتی علی الناس زمان:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: أتی ایک مفعول کی طرف بغیر حرف جر کے متعدی ہوتا ہے، مگر یہاں علی کے ذریعہ سے متعدی کیا گیا ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ اس وقت سے پہلے تک تو زمانہ لوگوں کے حق میں سازگار رہوگا، اور اس علامت کے بعد زمانہ لوگوں کے حق میں ناسازگار ہو جائے گا۔

امام میرکؒ فرماتے ہیں: زیادہ ظاہر یہ ہے کہ أتی میں اقبال ومرور کے معنی کی تضمین کی وجہ سے علی کے ساتھ متعدی کیا

گیا ہے۔ اھ۔ صاحبِ قاموس کے کلام سے طیبیؒ کی بات کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات تضمین کے منافی بھی نہیں۔ یہ کہنا بھی درست نہیں ہوگا۔ یوشك ان یقبل علی الناس زمان کی تعبیر مقام مدحت ہی میں استعمال ہوتی ہے اور ''مرور'' اکثر باء کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔

قوله: لا یبقی من الاسلام:

یہاں ''شعائر'' مضاف محذوف ہے۔ یعنی شعائر اسلام نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ صرف نام کی حد تک باقی رہ جائیں گے۔

قوله: ولا یبقی من القرآن الا رسمه:

یہاں بھی عبارت میں حذف ہے، اور مطلب یہ ہے کہ قرآنی علوم وآداب میں سے صرف ظاہری چیز باقی رہ جائے گی، مثلاً قرآنِ کریم کے الفاظ کی تلاوت اور اس کی کتابت محض بطورِ رسم ورواج کے رہ جائے گی تحصیل علم وعبادت کے طور پر نہیں ہو گی۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: قرآن کے ساتھ لفظ رسم، اور اسلام کے ساتھ لفظ اسم کا ذکر کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ الفاظِ قرآنی کی ادائیگی کی رعایت برتی جائے گی، قرآن تجوید کے ساتھ مخارج حروف کی رعایت کے ساتھ خوش الحانی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ قرآن کے معانی میں تفکر نہیں ہوگا، امتثالِ اوامر اور اجتناب نواہی سے روگردانی ہوگی حالانکہ اسلام تو ایسا نہیں ہے، اسم باقی اور مسمّٰی مٹ جائے گا، چنانچہ زکوٰۃ کہ جس کی مشروعیت مخلوقِ خدا کے فائدہ کے پیش نظر کی گئی ہے یہ سلسلہ مٹ جائے گا۔ اس کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہے گا، اکثر لوگ نمازوں سے غافل ہوں گے۔ تارکِ صلاۃ ہوں گے، اے کاش! کہ اس وقت کوئی امر بالمعروف کرنے والا ہو، کہ لوگ اقامت صلوٰۃ پر آجائیں، کوئی ایسا نہی عن المنکر کرنے والا ہو کہ لوگ منکرات کو چھوڑ دیں۔ اھ۔

قوله: مساجدهم عامرة: یعنی مسجدیں کثرت سے ہوں گی، بلند وبالا ہوں گی، ان کی دیواریں منقش ہونگی، قندیلیں اور چراغ روشن ہوں گے، قالینیں بچھی ہوئی ہوں گی۔ ائمہ اور مؤذن کو مال حرام سے وظائف دیئے جائیں گے، غرض یہ کہ مساجد میں منکرات کی بھرمار ہوگی۔

قوله: وهی خراب من الهدی: اس کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں۔

پہلا مطلب یہ ہے کہ مساجد ہدایت یافتہ علماء سے خالی ہوں گے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ مساجد علماء سوء اور ائمہ مبتدعہ کی وجہ سے تباہ ہو چکی ہوں گی۔

قوله: علماء هم شر من تحت أدیم السماء:

یہ جملہ مستانفہ ہے، ماقبل کی علت کا بیان ہے۔ کہ مساجد کی تباہی کا سبب یہ ہوگا کہ ان کے علماء آسمان کے نیچے کی مخلوق میں سب سے زیادہ بدتر ہوں گے اور ان ہی کی وجہ سے دین میں فتنہ پیدا ہوگا، چونکہ: **فساد العالم فساد العالم۔**

قوله: من عندهم تخرج الفتنة وفیهم تعود:

''عود'' کے صلہ میں ''فی'' کے استعمال کی نظیر یہ آیت کریمہ ہے: ﴿أَوْ لَتَعُودُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا﴾ [الاعراف:۸۸] ''یا تم

ہمارے مذہب میں آجاؤ۔"

اگر علم کے مطابق عمل نہ ہوا تو علم ختم ہو جائے گا

۲۷۷: وَعَنْ زِيَادِ بْنِ لَبِيْدٍ قَالَ ذَكَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا فَقَالَ ذٰلِكَ عِنْدَ اَوَانِ ذَهَابِ الْعِلْمِ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَيْفَ يَذْهَبُ الْعِلْمُ وَنَحْنُ نَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ وَنُقْرِئُهٗ اَبْنَآءَ نَا وَيُقْرِئُهٗ اَبْنَآءَ هُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَقَالَ ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ زِيَادُ اِنْ كُنْتُ لَاَرَاكَ مِنْ اَفْقَهِ رَجُلٍ بِالْمَدِيْنَةِ اَوَلَيْسَ هٰذِهِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى يَقْرَاُوْنَ التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ لَا يَعْمَلُوْنَ بِشَيْءٍ مِّمَّا فِيْهِمَا۔ رواه احمد وابن ماجة و روى الترمذى عَنْهُ نَحْوَهٗ۔

أخرجه أحمد في المسند٤/١٦٠۔ وأخرجه ابن ماجة في سننه ٢/١٣٤٤حديث رقم ٤٠٤٨وأخرج الترمذى نحوه عن أبى فى السنن ٥/٣١حديث رقم ٢٦٥٣۔

ترجمہ: حضرت زیاد بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ فتنہ اور فساد کے بارے میں ذکر فرمایا اور پھر ارشاد فرمایا کہ یہ اس وقت ہوگا جب کہ علم ختم ہو جائے گا۔ یہ سن کر میں نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول علم کس طرح ختم ہو جائے گا۔ حالانکہ ہم قرآن پڑھتے ہیں اور اپنے بچوں کو بھی پڑھائیں گے اور ہمارے بچے اپنے بچوں کو پڑھائیں گے اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری وساری رہے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ زیاد تمہیں تمہاری ماں گم کردے۔ میں تو تجھے مدینے کے لوگوں میں بڑا سمجھ دار جانتا تھا۔ کیا یہود ونصاری تورات اور انجیل کو نہیں پڑھتے ہیں۔ لیکن ان کی کتابوں میں جو کچھ ہے (یعنی احکام) ان میں سے وہ کسی چیز پر عمل نہیں کرتے۔ اس حدیث کو امام احمد اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے بھی حضرت زیاد سے اس جیسی روایت نقل کی ہے۔

راویٔ حدیث:

زیاد بن لبید۔ یہ زیاد لبید کے بیٹے ہیں ان کی کنیت "ابو عبداللہ" ہے۔ انصاری ہیں۔ مکہ میں رہائش اختیار کی' پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ہجرت کی۔ اسی وجہ سے ان کو مہاجری انصاری کہا جاتا ہے۔ تمام غزوات میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہے۔ ان کو "حضرموت" کا گورنر بھی بنادیا گیا تھا۔ ان سے عوف ابن مالک اور ابوالدرداء نے روایت حدیث کی ہے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے شروع دور امارت میں وفات پائی۔

تشریح: قوله: فقال: ذلك عند......الى يوم القيامة: اور ایک نسخہ میں ذاك ہے۔

"وكيف يذهب العلم": واؤ عاطفہ ہے، عبارت کی معنوی تقدیر یوں ہے: متى يقع ذلك المهول وكيف يذهب العلم۔

ونحن نقراء القرآن: یہ جملہ محل نصب میں "حال" ہے۔

حضرت زیاد بن لبید رضی اللہ عنہ کی بات کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ [الحجر:

۹] ''بیشک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔'' کہ جب یہ مسلمہ بات ہے کہ قرب قیامت تک قرآن کا وجود باقی رہے گا تو کیسے ہوگا کہ علم اُٹھالیا جائے گا۔

قوله: ثكلتك امك زياد: ثكلتك أملك:

اصل میں معنوی اعتبار سے اگرچہ یہ بددعا ہے، مگر تعجب کے موقع پر استعمال کی جاتی ہے۔

''زیادُ'': منادیٰ ہے، حرفِ ندا محذوف ہے۔

قوله: ان كنت لاراك من أفقه رجل بالمدينة:

ان محففه من المثقله ہے، اور دلیل یہ ہے کہ آگے ''لام فارقہ'' آرہا ہے۔ اور اس کا اسم ضمیر شان ہے جو محذوف ہے۔ من أفقه رجل بالمدينة: مفعولِ ثانی ہے، لأراك کیلئے، اور من زائدہ ہے۔ اگرچہ کلام مثبت ہے۔ یہ اخفش کا مذہب ہے۔ ﴿۲﴾ جار مجرور کا متعلق کائناً محذوف ہے۔ (کذا قالہ الطیبی) دوسری ترکیب زیادہ ظاہر ہے۔ لفظ رجل اگرچہ مفرد ہے مگر یہاں استغراق کے معنی مراد ہیں۔

قوله: أو ليس هذه اليهود ...... والانجيل: تقدیری عبارت یوں ہے: **أتقول هذا الكلام و ليس هذا......**۔ یہود و نصاریٰ تورات و انجیل کو پڑھتے ہیں، لیکن ان کتابوں کے اُوامر و نواہی میں سے کسی بھی چیز پر عمل پیرا نہیں۔ تو ان کو اس پڑھنے نے فائدہ نہیں دیا۔ مسلمانوں کی بھی یہی حالت ہو جائے گی۔

قوله: لا يعلمون مما فيها: لا يعلمون شيء مما فيها: یہ جملہ یقرأون کی ضمیر سے حال ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے اس کلام میں بے عمل عالم کو بمنزلہ غیر عالم یعنی جاہل کے قرار دیا ہے۔ بلکہ وہ ان آیات کا مصداق ہے: ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ [الجمعة : ٥] ''انکی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں''۔ اور ﴿كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ [الاعراف : ١٧٩] ''(بالکل) چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے۔''

۲۷۸: وَكَذَا الدَّارِمِیُّ عن ابی امامة۔ (رواه احمد وابن ماجة)

ترجمہ: اور اسی طرح امام دارمی نے حضرت ابوامامہ سے نقل کی ہے۔

علم ختم ہو جائے گا اور فتنے ظاہر ہو جائیں گے

۲۷۹: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ وَعَلِّمُوْهُ النَّاسَ تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوْهُ النَّاسَ تَعَلَّمُوا الْقُرْاٰنَ وَعَلِّمُوْهُ النَّاسَ فَاِنِّي امْرُءٌ مَقْبُوْضٌ وَالْعِلْمُ سَيُقْبَضُ وَتَظْهَرُ الْفِتَنُ حَتّٰى يَخْتَلِفَ اثْنَانِ فِيْ فَرِيْضَةٍ لَايَجِدَانِ اَحَدًا يَفْصِلُ بَيْنَهُمَا۔ (رواه الدارمی والدارقطنی)

أخرجه الدارمي ١/٨٣ حديث رقم ٢٢١ ـ وأخرجه الدارقطني ٤/٨١ حديث ٤٥ ـ

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا علم کو سیکھو اور دوسروں کو سکھلاؤ۔ علم وارثت یا فرض احکام کو سیکھو اور دوسروں کو سکھلاؤ۔ قرآن کو سیکھو اور دوسروں کو سکھاؤ اس لئے

کہ میں ایک شخص ہوں کہ جو اٹھا لیا جاؤں گا اور علم بھی اٹھا لیا جائے گا اور فتنے ظاہر ہوں گے۔ یہاں تک کہ دو آدمی ایک فرض میں اختلاف کریں گے اور کوئی شخص ایسا موجود نہ ہوگا جو ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرے یعنی علم کے کم ہو جانے اور فتنوں کے بڑھ جانے سے یہ صورت حال ہو جائے گی۔ اس حدیث کو امام دارمی اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: قال لي رسول الله ﷺ تعلموا العلم وعلموه الناس: ایک صحیح نسخہ میں **علموها الناس** ہے۔

"**قال لي**" سے پتہ چلتا ہے کہ حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جس وقت یہ ارشاد فرمایا تھا اس وقت صرف عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہی موجود تھے اور **تَعَلَّمُوا الْعِلْم** کا خطاب بھی ان ہی کو تھا۔ جمع کا صیغہ برائے تعظیم ذکر فرمایا۔

نبی اعظم و آخر ﷺ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو علم کے سیکھنے، علم فرائض کے حاصل کرنے اور قرآن کریم کے سیکھنے اور ان سب کو لوگوں کو سکھلانے کی جو تاکید فرمائی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کا یہ حکم صرف ان کے لئے خاص ہے بلکہ جو کچھ ان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے وہ سب کچھ آپ ﷺ کی پوری امت کے لئے یکساں حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔

قوله: تعلموا الفرائض وعلموه الناس:

ضمیر غائب کا مرجع مضاف ہے جو محذوف ہے۔ **أي: تعلموا علم الفرائض**۔

فرائض سے یہاں کیا مراد ہے؟ اس بارے میں متعدد اقوال ہیں:

① اس سے مراد فرائضِ اسلام ہیں۔ ② ممکن ہے کہ فرائض میراث (علم میراث) مراد ہو۔ اس علم کا خصوصی طور پر ذکر کرنا اس کی اہمیت کے پیشِ نظر ہے۔ ③ بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد وہ فرائض ہیں جو من جانب اللہ بندہ پر لازم ہیں۔ ④ بعض کا کہنا ہے کہ فرائض سے مراد اوامر ونواہی کا مجموعہ ہے۔ ⑤ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ممکن ہے کہ فرائض سے مراد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ سنن ہوں جو اوامر ونواہی پر مشتمل ہیں۔ گویا کہ آپ ﷺ کا ارشاد یوں ہے: **تعلموا الكتاب والسنة**۔ ⑥ صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد ان تمام چیزوں کی معرفت ہے، جو بندوں پر واجب ہیں۔ اور عقاب کا تعلق بھی اسی کے ساتھ ہے۔

قوله: تعلموا القرآن وعلموه الناس:

یہ کلام "من وجہ تخصیص" اور "من وجہ تعمیم" ہے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا تعلم قرآن پر خصوصی طور پر ابھارنا درحقیقت اس ارشاد باری تعالیٰ کے امتثال کی خاطر تھا: ﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ [النحل: ۸۹] "اور ہم نے تم پر (ایسی) کتاب نازل کی ہے کہ (اس میں) ہر چیز کا بیان (مفصل) ہے" یہ (قرآن) وہ اصل ہے جس کا حاصل کرنا انتہائی ضروری ہے۔

قوله: والعلم سيقبض حتى يختلف:

ہمارے متن میں سیقبض صیغۂ مجہول کے ساتھ۔ مرقات کے بالائی متن میں **والعلم سينقبض** ہے۔ اور زیریں متن میں **والعلم سينتقص بعدي** ہے۔ اور "**حتى يختلف**" کا متعلق ما قبل دونوں افعال میں ہے ہر فعل ہو سکتا ہے۔

ممکن ہے کہ فتنوں کا سبب علم کا اُٹھایا جانا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ فتنوں کی وجہ سے علم اُٹھا لیا جائے۔ اور قلتِ علم یا فتنوں

کی کثرت کے باعث صورتِ حال یہ ہوگی کہ دو اشخاص کا فرائضِ اسلام میں سے کسی مسئلہ میں اختلاف ہوگا، یا دو وارثوں کا مسئلہ میراث میں اختلاف ہوگا تو کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ملے گا۔

قوله: فاني امرؤ مقبوض:
یعنی میں ایک شخص ہوں جو اٹھالیا جاؤں گا اور میرے بعد علم بھی اٹھالیا جائے گا، چنانچہ یہ سلسلہ منقطع ہوجائے گا۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی درحقیقت: ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ [الكهف: ۱۱۰] ''کہہ دو کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں'' کی نظیر ہے۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی امت کے تمام افراد کے لئے انتباہ ہے کہ جب مجھے موت سے دوچار ہونا ہے تو ظاہر ہے کہ آپ سب لوگوں نے بھی موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ رہی بات علم کے اُٹھائے جانے کی تو ہر کمال کے بعد زوال ہے۔

غیر نافع کی مثال

۲۸۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ عِلْمٍ لَّا یُنْتَفَعُ بِهٖ كَمَثَلِ كَنْزٍ لَّا یُنْفَقُ مِنْهُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۔ (رواه احمد والدارمی)

أحمد في مسنده ۲/ ۴۹۹ ـ وأخرجه الدارمي ۱/ ۱۴۸ حديث رقم ۵۵۶ ـ

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس علم کی مثال جس سے نفع حاصل نہ کیا جائے۔ یعنی نہ تو اس پر خود عمل کیا جائے اور نہ ہی دوسروں کو پڑھایا جائے اس مال اور خزانہ کی طرح ہے جس میں سے اللہ کے راستہ میں کچھ نہ خرچ کیا جائے اس حدیث کو امام احمد اور امام دارمی نے روایت کیا ہے۔

تشریح: علم اگرچہ فی نفسہٖ نافع ہے، لیکن اگر اس سے نفع نہ اٹھایا جائے تو گویا وہ ایسا ہے جیسا کہ ایک بہت بڑا خزانہ جو بند کر کے رکھ دیا گیا اور اس کو بند کر کے رکھنے والا نہ تو خود فائدہ اٹھائے اور نہ اللہ کی راہ میں اس کو خرچ کرے کہ دوسرے لوگ اس خزانہ سے مستفید ہوں۔ کیونکہ یہ خزانہ بھی ایسی ہی چیز ہے کہ یہ اس کے کام آتا ہے جو اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے اور اس طرح غریب لوگ بھی اس سے فائدہ حاصل کرتے ہیں اور خرچ کرنے والے کے لئے بھی محفوظ ہوتا جاتا ہے کیونکہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ رب العزت کو قرض دینا جس نے دینے والے کو واپس لوٹانے کا وعدہ کیا ہے اور اللہ کبھی اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا اور نہ خلاف ہونے دیتا ہے۔
امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہاں تشبیہ صرف عدم نفع، عدم انتفاع اور عدم انفاق میں ہے۔ واضح بات ہے کہ:

العلم يزيد بالانفاق والكنز ينقص، والعلم باق والكنز فان ـ

''علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے، اور خزانہ خرچ کرنے سے گھٹتا ہے، علم باقی رہنے والی چیز ہے، اور خزانہ فنا ہونے والی چیز ہے۔''